سیرت

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

مصنفہ

حضرت مرزا بشیر احمد ایم۔ اے

بیادگار مقدس

حضرت اقدس حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی
مسیح موعود و مہدی معہود جری اللہ فی حلل الانبیاء علیہ
و علی مطاعہ محمد الصلوٰۃ و السلام جن کی بعثت کے
ذریعہ سے اس زمانہ میں اللہ کے حکم کے ساتھ دوبارہ
جمال محمدی کا ظہور ہوا۔

از طرف احقر الخدام
خاکسار مرزا بشیر احمد
قادیان مورخہ ۱۲ شوال ۱۳۳۸ھ
مطابق یکم جولائی ۱۹۲۰ء

پیش لفظ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح پر آج تک ہزاروں کتب لکھی گئی ہیں۔ لیکن حضرت مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ عنہ کی تصنیف سیرت خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم اس لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں تمام واقعات کی صحت کا مدار سب سے اوّل قرآن کریم اور دوسرے نمبر پر صحاح ستہ پر رکھا گیا ہے اور کتب تاریخ میں متأخرین کی بجائے ابتدائی مورخین اور سیرت نگاروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ غیر مستند مواد سے پاک ہے اور اس کی صحت اور مستند ہونے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

حضرت میاں صاحب نے اپنی اس تصنیف میں اس امر کا خاص طور پر اہتمام فرمایا ہے کہ مغرب کے متعصب مستشرقین نے جن مقامات پر تاریخ اسلام کے بعض واقعات کو قابل اعتراض ٹھہرایا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کی کوشش کی ہے آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے علم کلام کی روشنی میں ان کا رد فرمایا ہے۔ آپ نے اپنی اس کتاب میں علاوہ تاریخی مواد کے آج کل زیر بحث آنے والے بہت سے علمی مسائل مثلاً" جمع و ترتیب قرآن کریم' معجزہ کی حقیقت' جہاد بالسیف' غیر مسلموں سے رواداری' جزیہ' غلامی' عورتوں کے حقوق' تعدّد ازدواج' شادی اور طلاق کے متعلق اسلامی قوانین اور اسلام کی عادلانہ جمہوری طرز حکومت پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔

حضرت میاں صاحب نے کمال عشق اور محبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور کردار کو موجودہ دور کے ذوق کے مطابق انتہائی دلنشین رنگ میں پیش فرمایا ہے اور فرط عقیدت کے باوجود سند اور درایت کے لحاظ سے ضعیف روایات کو اس مجموعہ میں راہ نہیں پانے دی اور واقعات کو مستند ماخذ سے ان کے صحیح تناظر میں پیش فرمایا ہے۔

انہی خصوصیات کی بناء پر یہ تصنیف بہت مقبول ہوئی۔ حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق فرمایا ہے۔

"میں سمجھتا ہوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی سیرتیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے یہ بہترین کتاب ہے۔ اس تصنیف میں ان علوم کا بھی پرتو ہے جو

اعتراضات اور طرز تحریر کو مدنظر رکھنے کے واسطے میں نے لائف آف محمد(ﷺ) مصنفہ سرولیم میور، محمد (ﷺ) مصنفہ پروفیسر مارگولیس اور بعض دیگر تصنیفات کو زیر مطالعہ رکھا ہے۔ جغرافیہ عرب کے واسطے معجم البلدان کو میں نے نہایت کار آمد اور قابل اعتبار رفیق پایا ہے۔ جامعیت کے لحاظ سے تاریخ خمیس اور سیرة الحلبیه کا میں نے جواب نہیں دیکھا مگر افسوس تحقیق سے خالی ہیں۔

غرض میں نے اپنی طرف سے پوری تحقیق اور چھان بین سے کام لیا ہے مگر **الانسان مرکب من الخطاء و النسیان فارجو ممن طالع کتابی هذا ان یسامحنی اذا وقف علی خطاء او سهو فیه و یدعوا الله ان یهدینی الی الصراط المستقیم فانه لامضل لمن هداه و لاهادی لمن اضله بیده الخیر کله و هو المستعان۔**

اس کتاب کی تیاری میں جن احباب کی طرف سے مجھے کسی قسم کی مدد پہنچی ہے ان سب کا میں دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خصوصاً استاذی المکرم حضرت مولوی شیر علی صاحب بی اے۔ ایڈیٹر ریویو آف ریلیجنز قادیان کا جن کے مفید مشورہ سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اور مکرمی جناب مولوی فضل دین صاحب وکیل قادیان کا جنہوں نے مسودوں کے مطالعہ کے علاوہ مجھے ضروری حوالجات کی تلاش میں بہت مدد دی۔ اور مکرمی ماسٹر احمد حسین صاحب فرید آبادی ثم قادیانی کا جنہوں نے ادبی لحاظ سے مضمون میں مناسب اصلاح کی۔

خاکسار

مرزا بشیر احمد

۱۴ شوال ۱۳۳۸ھ مطابق یکم جولائی ۱۹۲۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

عرض حال

جلد اوّل

آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری جو "ہمارا آقا" کے نام سے رسالہ ریویو آف **ریلیجنز** قادیان کے اردو ایڈیشن میں ۱۹۱۹ء کے ابتدا سے شائع ہو رہی ہے اس وقت اس کا پہلا حصہ جو آپ کی مکی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے بعد نظر ثانی کتابی صورت میں ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں صرف آنحضرت ﷺ کے سوانح تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اس زمانہ کی عام تاریخ اور صحابہ کرامؓ کے حالات پر بھی ہر مناسب موقعہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے گویا مضمون کے لحاظ سے اس کتاب کا نام دراصل تاریخ اسلام حصہ اول سمجھنا چاہئے۔

میرا ارادہ ہے **و اللہ الموفق** کہ آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کو تین حصوں میں تقسیم کروں۔

پہلا حصہ وہ ہے جو بعض ابتدائی امور' جغرافیہ عرب' بعثت نبویؐ کے وقت قبائل عرب کی تقسیم اور ان کی مذہبی' تمدنی اور سیاسی حالت' تاریخ کعبہ و مکہ' تاریخ قریش' آنحضرت ﷺ کے قبیلہ کے حالات' آپ کی پیدائش و حالات زندگی تا بعثت' دعویٰ نبوت و اشاعت اسلام اور حالات زندگی بعد بعثت تا ہجرت تحریر کئے گئے ہیں۔ یہ وہ حصہ ہے جو بعد نظرثانی و مناسب تغیرو تبدل اب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

دوسرا حصہ جو ابھی معرض تحریر میں ہے۔ آنحضرت ﷺ کی مدنی زندگی کے حالات اور اس زمانے کی اسلامی تاریخ پر مشتمل ہو گا۔

اور تیسرا حصہ آنحضرت ﷺ کی سیرت کے متعلق ہو گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ - **و ھو الموفق۔**

اس کتاب کی تصنیف سے میری یہ غرض ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو جو عموماً آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی اور ابتدائی اسلامی تاریخ سے بالکل بے خبر ہیں۔ مختصر طور پر عام فہم اور سادہ مگر دلچسپ پیرایہ میں صحیح حالات سے واقف کیا جاوے اور نیز یہ بھی کہ تا اس ذریعہ سے خدا چاہے تو میرے لئے سعادت اخروی کا سامان پیدا ہو۔

یہ ایک نہایت تکلیف دہ منظر ہے کہ ہمارے نوجوان دیگر اقوام و مذاہب کے بادشاہوں' جرنیلوں اور مدبروں کے حالات سے تو واقف ہیں اور ان کی سوانح عمریاں پڑھتے ہیں مگر اپنے آقا اور مقتدا آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی سے قطعاً ناواقف ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں مگر ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی تک اردو زبان میں آنحضرت ﷺ کی کوئی بھی ایسی سوانح عمری نہیں لکھی گئی جو اس زمانہ کی طبائع کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

مولانا شبلی کی تصنیف جس کے بعض حصے ابھی تک معرض طبع میں نہیں آئے میرے اس ریمارک سے مستثنیٰ ہے مگر بعض وجوہات سے وہ بھی عام اسلامی پبلک کے دائرہ تمتع میں نہیں آ سکتی۔ بہرحال میری طبیعت نے اردو لٹریچر میں ایک کمی کو محسوس کیا ہے جسے پورا کرنے کی میں نے حتّی الوسع کوشش کی ہے اگر میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا ہوں تو زہے قسمت اور اگر نہیں تو خدا سے دعا ہے کہ میری یہ ادھوری اور ناقص کوشش کسی ایسے نیک دل میں تحریک کرے کہ جو اس کمی کو پورا کر سکے۔

میں نے اس کتاب کی تیاری کے لئے کسی ایک کتاب پر پورا بھروسہ نہیں کیا خصوصاً متأخرین کی تصنیفات کو بغیر اپنی مستقل تحقیق کے ہرگز قابل اعتماد نہیں سمجھا۔ متقدمین میں سے چار کتب تاریخی طور پر آنحضرت ﷺ کے سوانح کے لئے اصل مآخذ سمجھی گئی ہیں۔ اوّل سیرۃ ابن ہشام جو سیرۃ ابن اسحاق سے ماخوذ ہے۔ دوسرے طبقات ابن سعد۔ تیسرے طبری اور چوتھے واقدی۔ ان سب کا میں نے حتّی الوسع باقاعدہ مطالعہ کیا ہے اور سب سے فائدہ اٹھایا ہے ان کتب کے بیان کردہ واقعات کی چھان بین اور تحقیق کے واسطے میں نے قرآن شریف اور کتب احادیث خصوصاً صحاح ستہ کو حتّی الوسع ہمیشہ اپنے سامنے رکھا ہے۔ متأخرین کی کتب میں سے زرقانی۔ شرح مواہب اللدنیہ۔ تاریخ الکامل ابن اثیر۔ اسد الغابہ اور اصابہ فی معرفۃ الصحابہ اور سیرۃ النبی مصنفہ مولانا شبلی سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ یورپ کے

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ اس کے ذریعہ انشاء اللہ اسلام کی تبلیغ میں بہت آسانی پیدا ہو جائے گی۔"

سیرت خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کا موجودہ ایڈیشن ان تین جلدوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۲۰ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی تھیں (پہلی جلد پر حضرت میاں صاحب نے بعد میں نظر ثانی بھی فرمائی تھی)۔ اس طرح یہ مجموعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے لیکر ے ہجری تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ افسوس ہے کہ حضرت میاں صاحب رضی اللہ عنہ باوجود انتہائی خواہش کے اپنی زندگی میں اس معہتم بالشان علمی شاہکار کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ حضرت میاں صاحب نے سیرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حصہ کے لئے مجوزہ عنوانات بھی اپنے مخصوص انداز میں مرتب فرما کر شائع کر دیئے تھے۔ یہ عنوانات بھی موجودہ ایڈیشن میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ اس کام کی تکمیل جماعت کے تعلیم یافتہ طبقہ پر ایک قرض ہے۔ خدا تعالیٰ کرے کہ ہم اس کو ادا کر سکیں۔

حضرت میاں صاحبؓ نے اس گرانقدر تصنیف کو محض ایک تاریخ کی حیثیت سے نہیں لکھا بلکہ آپ کا اول ترین مقصد اس سے یہ تھا کہ قوم کے نوجوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنے لئے مشعل راہ قرار دیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> "اے اللہ! تو اپنے فضل سے ایسا کر کہ تیرے بندے اسے پڑھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں اور تیرے برگزیدہ رسولؐ کے پاک نمونہ پر چل کر تیری رضا حاصل کریں۔"

جماعت کے ہر فرد کو یہ کتاب پڑھ کر حضرت میاں صاحب رضی اللہ عنہ کی اس نیک خواہش کو پورا کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہیے اور دوسروں کو اسے تحفہ میں دینا چاہیے کیونکہ یہ تصنیف ایک مثبت دلیل ہے اس عقیدت و ارادت کی جو جماعت احمدیہ کا ہر فرد حضرت خاتم النبیّین محمد مصطفٰے احمد مجتبیٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے رکھتا ہے۔

آخر میں ان واقف زندگی احباب کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے اس ایڈیشن کی تیاری میں مختلف خدمات سرانجام دی ہیں۔ مولوی محمد اعظم اکسیر۔ مولوی سلطان احمد شاہد۔ مولوی فضل کریم تبسم۔ مولوی مقصود احمد قمر۔ مولوی مبارک احمد نجیب۔ طاہر محمود احمد اور رانا محمود احمد شاہد۔

احباب انہیں بھی اور خاکسار کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

والسلام

سید عبد الحی

فہرست مضامین

سیرۃ خاتم النّبیّن صلی اللہ علیہ وسلم

حصہ اول

ابتدائی زندگی ۹۳

ابتدائی زندگی پر ایک سرسری نظر ۱۱۳

توسیع اشاعت

حصہ دوم

مدینہ کا محاصرہ اور مسلمانوں کی نازک حالت۔ کفار کی نامرادی۔ حقیقت معجزہ

حصہ سوم

اسود و احمر کے نام اسلام کا پیغام

سیرتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

حصّہ اوّل

نقشۂ عرب
شمال
مشرق
مغرب
جنوب
فارس
خلیج عمان
تبوک
تیماء
خیبر
المدینۃ المنورۃ
مکۃ المکرمۃ
جدہ
الطائف
نجران
الاحقاف
ثمود
حضرموت
مأرب
صنعاء
عدن
الحبشۃ
اکسوم
عمان
بحر العرب
الربع الخالی
نجد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

سیرتِ نبوی اور تاریخِ اسلام کے ابتدائی ماخذ

اسلام کا آغاز ایک ایسے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جو اکثر ملکوں کے لیے ایک غیر تاریخی زمانہ تھا جبکہ نہ صرف ابھی مطبع کی ایجاد عالمِ وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ فنِ تحریر و تصنیف بھی ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں تھا معروف مسیحی سنہ کی رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ۵۷۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک قرار دیا گیا ہے۔ یہ وُہ زمانہ ہے جبکہ اکثر اقوامِ عالم فنِ تصنیف سے بالکل ناآشنا تھیں اور صرف ایسی قوموں میں کسی حد تک اس کا رواج پایا جاتا تھا جو کسی نہ کسی جہت سے علمی یا سیاسی رنگ میں ترقی یافتہ تھیں، لیکن جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا، اسلام سے پہلے عرب کا ملک نہ صرف بیرونی دُنیا سے بالکل منقطع تھا بلکہ اندرونی تحریکات کے لحاظ سے بھی ہر قسم کی علمی اور سیاسی اور تمدنی تحریک سے کلیتہً خالی تھا، اس لیے گو اسلام سے پہلے بھی عرب میں بعض لکھے پڑھے لوگ پائے جاتے تھے مگر ان کا مبلغِ علم محض نوشت و خواند تک محدود تھا اور اسلام سے پہلے زمانہ کی کوئی عربی تصنیف یا اس زمانہ کے متعلق عرب کی تاریخ کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ہے۔ بیشک بعض قدیم اقوامِ عرب کے آثار و کتبات موجود ہیں، لیکن عرب جیسے مُلک کی تاریخ کے لیے یہ ماخذ کسی صورت میں مربوط اور تفصیلی معلومات کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

دوسرے درجہ پر ان قوموں اور حکومتوں کا ریکارڈ ہے جو اس زمانہ میں عرب کے پہلو میں واقع تھیں۔ جن میں سلطنت ہائے رُوم و فارس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ چونکہ عرب کی حدود ملتی تھیں اس لیے ان حکومتوں کی تاریخ میں کہیں کہیں عرب کا ذکر بھی آجاتا ہے مگر لازماً یہ ذکر بہت مختصر ہے اور صرف جزوی اُمور سے تعلق رکھتا ہے اور مُلک کے اندرونی حالات کے متعلق اس ضمنی تذکرہ سے کوئی بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی ذیل میں یہودی اقوام کی تاریخ اور بائیبل کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جن میں کہیں کہیں عرب کے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں۔

قبل از اسلام روایات و اشعار

تیسرے درجہ پر خود عرب کی اندرونی روایات ہیں اور دراصل عرب کی تاریخ قبل از اسلام کے لیے یہی روایات بطور بنیاد کے ہیں۔ عرب میں فنِ تحریر و تصنیف کا رواج نہیں تھا لیکن زبانی روایات کو سینہ بہ سینہ محفوظ رکھنے کی طرف عام توجہ تھی اور اس غرض کے لیے عربوں کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ اس کی مثال کسی دوسری قوم میں نظر نہیں آتی۔[1] ہر قبیلہ میں ایک خاص طبقہ ایسے لوگوں کا ہوتا تھا جو اپنے قبیلہ بلکہ آس پاس کے ہمسایہ قبیلوں کی تاریخ کو بھی پوری صحت اور وفاداری کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ اس فن کو عربوں میں علمِ انساب یعنی نسب ناموں کا علم کہتے تھے۔ تاریخ میں زمانہ قبل از اسلام کے کئی لوگوں کا نام اس فن کے ماہرین کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اسی طرح یہ علم ایک نسل سے دوسری نسل تک۔ اور دوسری سے تیسری تک چلتا چلا جاتا تھا اور ہر قبیلہ کی تاریخ اس کے راویوں کے سینوں میں محفوظ رہتی تھی۔

اسی ضمن میں ایک خاص ذریعہ قدیم تاریخ عرب کی حفاظت کا وہ اشعار بھی ہیں جو قبل از اسلام شاعروں نے کہے ہیں کیونکہ اُن میں بھی خاص خاص حصے قبائلِ عرب کی تاریخ کے آجاتے ہیں۔ اسلام سے پہلے زمانہ میں عربوں میں شعر کا فن اس کمال کو پہنچا ہوا تھا کہ بعض ناقدینِ شعر کی رائے میں باوجود اسلامی شعراء کی ترقی کے اسلامی زمانہ بھی بعض جہت سے اس کی مثال پیش نہیں کرتا۔ عربوں کی زندگی قبائلی تمدن کا رنگ رکھتی تھی۔ اور قریباً ہر قبیلہ میں کوئی نہ کوئی شاعر ہوتا تھا جو اپنے قبیلہ کے خاص خاص حالات کو اپنے زوردار بدویانہ اشعار میں محفوظ رکھتا تھا۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ ان اشعار کو یاد رکھتے اور اپنی مجالس میں سُناتے رہتے تھے۔[2] زمانہ جاہلیت کے شعراء[3] میں امراء القیس، نابغہ ذبیانی، زہیر، طرفہ، عنترہ، علقمہ، اعشیٰ، عمرو بن کلثوم، امیہ بن ابی صلت، کعب بن زہیر، لبید، حسان بن ثابت، خنساء وغیرہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔ جن کے بہت سے اشعار آج تک محفوظ ہیں اور اس قدر حیرت انگیز فصاحت اور زورِ بیان اور قلمی مصوری کا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ وہ اُس زمانہ کی کسی قوم اور کسی مُلک کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔ مذکورہ بالا شعراء میں سے مؤخر الذکر چار شاعر جن میں آخر الذکر ایک مشہور شاعرہ کا نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے تھے۔[4]

---

[1] "لائف آف محمدؐ" مصنفہ سر ولیم میور ایڈیشن ۱۸۹۴ء صفحہ ۶ دیباچہ۔ [2] "لائف آف محمدؐ" میور دیباچہ صفحہ ۴۶۔

[3] اسلامی اصطلاح میں عرب کا زمانہ قبل از اسلام جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے۔

[4] کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔

ہمارا یہ بیان کہ عربوں کی تاریخ قبل از اسلام زبانی روایتوں میں محفوظ تھی بعض ناواقف لوگوں کو تعجب میں ڈالے گا کہ ایک وسیع ملک کی تاریخ جو سینکڑوں سالوں پر پھیلی ہوئی ہو محض زبانی روایتوں میں کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے؟ لیکن ہمارے ناظرین کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ اقوامِ عالم کی تاریخ اسی قسم کی زبانی روایات تک محدود ہوتی تھی۔ صرف فرق یہ ہے کہ جہاں بہت سی قوموں میں یہ روائتیں ایک غیر محفوظ صورت میں زبان زدِ خاص و عام تھیں اور بعد میں تاریخی زمانہ میں آکر وُہ جس صورت میں پائی گئیں، جمع کر لی گئیں۔ وہاں اس غیر تاریخی زمانہ میں بھی عربوں میں ان روایتوں کی حفاظت کا بہت سی دُوسری قوموں کی نسبت بہتر انتظام تھا۔ کیونکہ ان میں یہ دستور تھا کہ اپنے قبیلہ کی تاریخ کو روایات یا اشعار کے ذریعہ یاد رکھتے تھے اور یہ بتایا جاچکا ہے کہ عربوں کا حافظہ اس غرض کے لیے خاص طور پر ترقی یافتہ تھا۔ بہرحال عرب کی قبل از اسلام تاریخ کیلئے عربوں کی زبانی روایات جو بعد میں تحریری طور پر بھی ضبط میں آگئیں، سب سے بڑا ماخذ ہیں۔ اور چونکہ ان کی مدد کے بغیر قدیم تاریخ عرب کا ڈھانچہ تیار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کوئی مؤرخ انہیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ان روایات کا تحریری ضبط بعد کی کئی کتابوں میں موجود ہے، مگر سب سے زیادہ مکمل صُورت میں مشہور اسلامی مؤرخ ابو جعفر محمدؐ ابنِ جریر طبری[1] کی تاریخ میں پایا جاتا ہے جس میں اس منتشر مواد کے بیشتر حصّہ کو ایک مربُوط صورت میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اور بعد کی اکثر کتابیں کم و بیش اسی مجمُوعہ کی خوشہ چین ہیں۔

اسلام کی آمد سے عرب کی تاریخ میں ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہوا۔ مُحمّد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز نے عرب کی سوئی ہوئی طاقتوں کو اس طرح بیدار کر دیا تھا، جیسے ایک گہری نیند سویا ہوا شخص کسی اچانک شور سے چونک کر بیدار ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت سے عرب کی تاریخ میں بھی ایک انقلابی صورت پیدا ہو گئی۔ جیسے کہ ایک تاریکی میں چُھپی ہوئی چیز یک لخت سُورج کی تیز روشنی کے سامنے آجائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح اور آغازِ اسلام کی تاریخ کے متعلق اس قدر مضبوط تاریخی مواد موجود ہے کہ یقیناً اس سے بڑھ کر آج تک کسی مذہب اور کسی بانی مذہب کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ مواد متعدد صورتوں میں پایا جاتا ہے اور ہم ان مختلف صورتوں کا ایک اجمالی نقشہ ذیل کے اوراق میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

قرآن شریف سب سے اوّل نمبر پر اسلامی تاریخ کا وہ مضبوط قلعہ ہے جو قرآن شریف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مُسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق قرآن شریف کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف خُدا کا کلام ہے، جو محمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر بصورت وحی نازل ہوا۔ یہ نزول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تئیس ۲۳ سالہ نبوّت کی زندگی پر پھیلا ہوا تھا۔ یعنی الہام سے ہی آپ کے دعوٰی کی ابتداء ہوئی اور قرآن شریف کا آخری حصّہ اُس وقت نازل ہوا جبکہ آپؐ کی وفات بالکل قریب تھی۔ اس طرح اگر آپؐ کی

---

[1] ۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ

نبوّت کے مجموعی ایام کے مقابلہ پر قرآنی آیات کی مجموعی تعداد کو رکھ کر دیکھا جائے تو روزانہ نزُول کی اوسط ایک آیت سے بھی کم بنتی ہے کیونکہ جہاں آپ کی نبوت کے ایام کم و بیش ساٹھ ہزار نو سو ستر بنتے ہیں، وہاں قرآنی آیات کی تعداد صرف چھ ہزار دو صد چھتیس ہے اور چونکہ قرآنی الفاظ کی مجموعی تعداد ستتر ہزار نو سو چونتیس ہے[1] اس لیے فی آیت بارہ الفاظ کی اوسط ہوئی جس سے روزانہ نزُول کی اوسط کم و بیش نو لفظ بھی جا سکتی ہے۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ قرآن شریف بہت ہی آہستہ آہستہ نازل ہوا تھا۔ اور گو یہ دُرست ہے کہ قرآن شریف کے نزول میں بعض اوقات ناغے بھی آجاتے تھے اور بعض دُوسرے ایام میں ایک ہی وقت میں متعدد آیات اکٹھی نازل ہو جاتی تھیں لیکن پھر بھی قرآن شریف کبھی بھی ایک وقت میں اتنی مقدار میں نازل نہیں ہوا کہ اُسے لکھ کر محفوظ کرنے یا ساتھ ساتھ یاد کرتے جانے میں کوئی مشکل محسوس ہوئی ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ جو جو آیات قرآن شریف کی نازل ہوتی جاتی تھیں انھیں ساتھ ساتھ لکھواتے جاتے اور خدائی تفہیم کے مطابق ان کی ترتیب بھی خود مقرر فرماتے جاتے تھے۔ اس بارے میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل حدیث بطور مثال کے پیش کی جا سکتی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا نَزَلَ عَلَیْہِ شَیْءٌ دَعَا بَعْضَ مَنْ کَانَ یَکْتُبُ فَیَقُوْلُ ضَعُوْا ھٰؤُلَاءِ الْاٰیَاتِ فِیْ سُوْرَۃِ الَّتِیْ یُذْکَرُ فِیْھَا کَذَا وَکَذَا فَاِذَا نَزَلَتْ عَلَیْہِ الْاٰیَۃُ فَیَقُوْلُ ضَعُوْا ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ فِی السُّوْرَۃِ الَّتِیْ یُذْکَرُ فِیْھَا کَذَا وَکَذَا۔[2]

"یعنی حضرت ابن عباس جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان خلیفہ ثالث (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کاتب وحی رہ چکے تھے) فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیات اکٹھی نازل ہوتی تھیں تو آپ اپنے کاتبانِ وحی میں سے کسی کو بُلا کر ارشاد فرماتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورۃ میں فلاں جگہ لکھو اور اگر ایک ہی آیت اُترتی تھی تو پھر بھی اسی طرح کسی کاتبِ وحی کو بُلا کر اور جگہ بتا کر اسے تحریر کروا دیتے تھے۔"

جن صحابہ سے کاتبِ وحی کا کام لیا جاتا تھا اُن کے نام اور حالات تفصیل و تعیین کے ساتھ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اُن میں سے زیادہ معروف صحابہ یہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت علیؓ۔ زبیر بن العوام شرجیل بن حسنہ۔ عبداللہ بن رواحہ۔ ابی بن کعب اور زید بن ثابت[3]۔ اس فہرست سے ظاہر ہے کہ آنحضرت

---

[1] کتاب الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی جزو اوّل صفحہ ۶۶، ۷۲۔ [2] ترمذی و ابو داؤد و مسند احمد بحوالہ مشکوٰۃ ابواب فضائل القرآن
[3] فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹ و زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۱۱ تا ۳۲۶۔

صلی اللہ علیہ وسلّم کو ابتدائے اسلام سے ہی ایک معتبر جماعت قرآنی وحی کے قلمبند کرنے کے لیے میسّر رہی تھی اور اس طرح قرآن شریف نہ صرف ساتھ ساتھ تحریر میں آ گیا تھا بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس کی موجودہ ترتیب بھی جو بعض مصالح کے ماتحت نزول کی ترتیب سے جُدا رکھی گئی ہے قائم ہوتی گئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد جبکہ نزولِ قرآن مکمل ہو چکا تھا حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ اوّل نے حضرت عمرؓ کے مشورہ سے زید بن ثابت انصاری کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے کاتبِ وحی رہ چکے تھے حکم فرمایا کہ وُہ قرآن شریف کو ایک باقاعدہ مصحف کی صُورت میں اکٹھا لکھوا کر محفوظ کر دیں۔ چنانچہ زید بن ثابت نے بڑی محنت کے ساتھ ہر آیت کے متعلق زبانی اور تحریری ہر دو قسم کی پختہ شہادت مہیا کر کے اسے ایک باقاعدہ مصحف کی صورت میں اکٹھا کر دیا۔[1] اس کے بعد جب اسلام مختلف ممالک میں پھیل گیا، تو پھر حضرت عثمانؓ خلیفۂ ثالث کے حکم سے زید بن ثابت کے جمع کردہ نسخہ کے مطابق قرآن شریف کی متعدد مستند کاپیاں لکھوا کر تمام اسلامی ممالک میں بھجوا دی گئیں[2]۔

دُوسری طرف قرآن شریف کے حفظ کرانے کا ایسا انتظام تھا کہ اس کے نزُول کے ساتھ ساتھ صحابہ کی ایک جماعت اُسے مقرر کردہ ترتیب کے مطابق حفظ کرتی جاتی تھی اور گو جُزوی طور پر حفظ کرنے والوں کی تعداد تو بہت زیادہ تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں سارے قرآن کے حافظ بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ جن میں سے کم از کم چار ایسے تھے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود تجربہ کر کے اور ہر طرح قابلِ اعتماد پاکر دُوسرے صحابہ کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا[3]۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد تو جبکہ قرآن شریف مکمل ہو کر ایک مصحف کی صُورت میں آ چکا تھا، حفاظِ قرآن کی تعداد نے ایک حیرت انگیز رفتار کے ساتھ ترقی کی کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں صرف ایک جگہ کی اسلامی فوج میں تین سو سے زائد حافظِ قرآن موجود تھے[4]۔ ان اسباب کے نتیجہ میں جن کے پیچھے خدائی حفاظت کا ہاتھ کام کر رہا تھا، ابتدائے اسلام سے ہی قرآن شریف کا متن ہر قسم کی تحریف اور دست بُرد کے خطرہ سے محفوظ ہو گیا تھا۔ اور اس زمانہ کے بعد تو اس کے مستند نسخے اس طرح مختلف ممالک میں پھیل گئے اور حفاظِ قرآن کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ تحریف کا امکان ہی باقی نہیں رہا۔ اور جیسا کہ دوست و دشمن سب نے تسلیم کیا ہے اس بات میں ذرہ بھر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آج کا قرآن بغیر کسی زیر و زبر کے فرق کے وہی ہے جو آج سے تیرہ سو سال قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا تھا۔ اس بارہ میں مثال کے طور پر بعض عیسائی محققین کی رائے درج ذیل کی جاتی ہے:

سر ولیم میور لکھتے ہیں:۔

"دُنیا کے پردے پر غالباً قرآن کے سوا کوئی اور کتاب ایسی نہیں جو بارہ سو سال کے طویل

---

[1] بخاری کتاب فضائل القرآن باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلّم ۔ [2] بخاری کتاب فضائل القرآن باب جمع القرآن و فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۸۱

[3] بخاری فضائل القرآن ۔ [4] کنز العمال باب فی القرآن فصل فی فضائل القرآن ۔

عرصہ تک بغیر کسی تحریف اور تبدیلی کے اپنی اصلی صُورت میں محفوظ رہی ہو"

پھر لکھتے ہیں :

"ہماری اناجیل کا مُسلمانوں کے قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنا جو بالکل غیر محرّف و مبدّل چلا آیا ہے۔ دو ایسی چیزوں کا مقابلہ کرنا ہے جنھیں آپس میں کوئی بھی نسبت نہیں"

پھر لکھتے ہیں :

"اس بات کی پوری پوری اندرونی اور بیرونی ضمانت موجود ہے کہ قرآن اب بھی اُسی شکل و صورت میں ہے جس میں کہ محمدؐ نے اُسے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا"

پھر لکھتے ہیں :

"ہم یہ بات پُورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی ہر آیت محمدؐ سے لے کر آج تک اپنی اصلی اور غیر محرّف صورت میں چلی آئی ہے[1]"

نولڈکی جو جرمنی کا ایک نہایت مشہور عیسائی مستشرق گذرا ہے اور جو اس فن میں گویا اُستاد مانا گیا ہے۔ قرآن شریف کے متعلق لکھتا ہے کہ :

"آج کا قرآن بعینہٖ وہی ہے جو صحابہ کے وقت میں تھا"

پھر لکھتا ہے :

"یُورپین علماء کی یہ کوشش کہ قرآن میں کوئی تحریف ثابت کریں قطعًا ناکام رہی ہے[2]"

اِس خصوصیت کے علاوہ کہ قرآن شریف اپنے زمانہ نزول سے لے کر آج تک بالکل محفوظ چلا آیا ہے۔ ایک بڑی خصوصیت قرآن شریف میں یہ بھی ہے کہ بوجہ اس کے کہ وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تیئیس سالہ نبوّت کی زندگی کے دَوران میں آہستہ آہستہ کر کے نازل ہوا تھا۔ آپؐ کی نبوّت کی زندگی کا کوئی حِصّہ ایسا نہیں ہے جس پر قرآن شریف کے کسی نہ کسی حِصّہ سے براہِ راست روشنی نہ پڑتی ہو اور یہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کی عملی تفسیر ہے کہ کَانَ خُلُقُہٗ الْقُرْاٰنُ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ساری سیرت قرآن میں آجاتی ہے[3]۔ گویا قرآن شریف وُہ کتاب ہے جس میں آپؐ کے اخلاق و عادات اور آپؐ کی روزانہ زندگی کے حالات ہر روز ساتھ ساتھ قلمبند ہوتے جاتے تھے اور یقیناً دُنیا کی تاریخ میں اور کوئی ایسا شخص نہیں گذرا جس کی سیرت کے متعلق اس قدر مضبوط اور مستند عصری ریکارڈ محفوظ ہو۔ بیشک بعض ایسے لوگ گذرے ہیں اور اس زمانہ میں بھی پائے جاتے ہیں جن کی سوانح عمریاں ان کی زندگی میں ہی یا ان کی وفات کے جلد بعد شائع ہو گئی ہیں

---

[1] لائف آف محمدؐ دیباچہ صفحہ ۲۱، ۲۲، ۲۵، ۲۶ ٭ [2] انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن

[3] صحیح مسلم و ابوداؤد و نسائی بحوالہ تفسیر ابنِ کثیر زیر تفسیر (سورۃ القلم: ۵) اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ٭

مگر جو خصوصیت قرآن شریف کے وجود میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ گویا آپ کی روزانہ زندگی ہر روز ساتھ ساتھ ضبط میں آتی گئی ہے وُہ آج تک کسی اور فرد بشر کو نصیب نہیں ہوئی۔ مغربی محققین نے قرآن شریف کی اس خصوصیت کا بھی کھلے الفاظ میں اقرار کیا ہے؛ چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے:

"قرآن کی یہ خصوصیت اس قدر اہم ہے کہ اس میں کسی مبالغہ کی گنجائش نہیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے محمدؐ کی سیرت و سوانح اور آغاز اسلام کی تاریخ کے لیے قرآن ایک بنیادی چیز قرار پاتا ہے جس سے ان ہر دو کے متعلق تمام تحقیق طلب اُمور کو پوری صحت کے ساتھ جانچا جا سکتا ہے۔ قرآن شریف میں ہمیں وُہ ذخیرہ میسّر ہے جس میں محمدؐ کے الفاظ خود آپ کی زندگی میں محفوظ کر لیے گئے تھے۔ اور یہ ریکارڈ آپ کی زندگی کے ہر حصہ سے یعنی آپ کے مذہبی خیالات سے آپ کے پبلک افعال سے آپ کی خانگی سیرت سے یکساں تعلق رکھتا ہے ..... حقیقتًہ محمدؐ کی سیرت کیلئے قرآن ایک ایسا سچا آئینہ ہے کہ اسلام کے سارے ابتدائی زمانہ میں یہ بات بطور ایک مثل اور کہاوت کے مشہور تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری سیرت قرآن میں ہے۔"[1]

پھر انگلستان کا مشہور مسیحی مستشرق پروفیسر نکلسن اپنی انگریزی تصنیف "عرب کی ادبی تاریخ" میں لکھتا ہے:

"اسلام کی ابتدائی تاریخ کا علم حاصل کرنے کے لیے قرآن ایک بے نظیر اور ہر شک و شبہ سے بالا کتاب ہے اور یقینًا بدھ مذہب یا مسیحیت یا کسی قدیم مذہب کو اس قسم کا مستند عصری ریکارڈ حاصل نہیں ہے، جیسا کہ قرآن میں اسلام کو حاصل ہے۔"[2]

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح کے لیے قرآن شریف نہ صرف اسلامی لٹریچر میں سب سے زیادہ مستند اور صحیح ریکارڈ ہے بلکہ آپ کی سیرت کے تعلق میں اسے وہ پوزیشن حاصل ہے جو دُنیا کی کسی اور کتاب کو دُنیا کے کسی اور فرد کے متعلق حاصل نہیں ہے۔ اور اس کی صحت بھی اس پایہ کی ہے کہ دوست تو دوست کسی بدترین دشمن کو بھی اس کے متعلق حرف گیری کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

تاریخ اسلام کا روایتی ماخذ

تاریخ ابتدائے اسلام اور سیرتِ رسولؐ کے لیے دُوسرا بڑا ماخذ وہ روایات ہیں جو بصورت حدیث یا تفسیر یا سیرت و مغازی ابتدائے اسلام میں ایک منظّم سلسلہ روایت کے ذریعہ صحابہ سے تابعین تک اور تابعین سے تبع تابعین تک اور تبع تابعین سے ان کے بعد آنے والے لوگوں تک پہنچیں اور پھر باقاعدہ کتابوں کی صُورت میں ضبطِ تحریر میں آکر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئیں۔ اس ذخیرہ کا پایہ بھی دُوسری اُمتوں کی تاریخ کے مقابلہ پر بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] لائف آف محمدؐ دیباچہ۔ صفحہ ۲۶

[2] "عرب کی ادبی تاریخ" صفحہ ۱۴۳

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسی جماعت عطا فرمائی تھی جس نے اپنے اخلاص اور جوشِ محبت میں آپ کی ہر حرکت وسکون کا نظرِ غور کے ساتھ مطالعہ کیا اور اپنی عدیم المثال قلمی مصوری میں آپ کی ایک ایسی کامل ومکمل تصویر پیچھے چھوڑی جس کے کمال کی نظیر دنیا کی کسی اور تصویر میں نظر نہیں آتی۔ حدیث میں صحابہ کے اقوال پڑھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ کس طرح صحرائے عرب کے ان ناخواندہ بادیہ نشینوں نے اپنے آقا وسردار کی ہر حرکت وسکون کو لوحِ تاریخ پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح سوتے تھے اور کس طرح جاگتے تھے۔ کس طرح کھاتے تھے اور کس طرح پیتے تھے۔ کس طرح اُٹھتے تھے اور کس طرح بیٹھتے تھے اور کس طرح چلتے تھے۔ اور کس کھڑے ہوتے تھے۔ کس طرح بولتے تھے اور کس طرح خاموش رہتے تھے۔ کس طرح ہنستے تھے۔ اور کس طرح روتے تھے۔ کس طرح خوش ہوتے تھے اور کس طرح ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے۔ کس طرح گھر میں رہتے تھے اور کس طرح سفر میں وقت گذارتے تھے کس طرح بیویوں سے ملتے تھے اور کس طرح بچوں سے ہمکلام ہوتے تھے۔ کس طرح عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور کس طرح غیروں کے ساتھ معاملہ رکھتے تھے۔ کس طرح دوستی نبھاتے تھے اور کس طرح دشمنوں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ کس طرح صلح میں کام کرتے تھے اور کس طرح جنگ میں لڑتے تھے۔ کس طرح بندوں کا حق ادا کرتے اور کس طرح خدا کا حق بجالاتے تھے۔ کس طرح اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے اور کس طرح اسے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ غرض آپ کی زندگی کی تصویر کا ہر پہلو اپنی پوری پوری تفصیل میں اور اپنے باریک در باریک خط وخال کے ساتھ ہمارے سامنے محفوظ ہے۔ حدیث کی کسی کتاب کو ہاتھ میں لے کر اس کی ورق گردانی کریں اس کے ہر صفحہ پر آپ کی تصویر کا کوئی نہ کوئی پہلو زندگی کی اصل آب وتاب میں چمکتا ہوا نظر آئے گا۔ اور یُوں محسوس ہوگا کہ ایک جیتی جاگتی تصویر اپنی پوری دلکشی کے ساتھ ہمارے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔

روایت کا طریقہ

اس جگہ غیر مسلم ناظرین کی واقفیت کے لیے یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ روایت بیان کرنے کا طریق مسلمانوں میں اس طرح رائج تھا کہ نیچے کے راوی سے شروع ہوکر درجہ بدرجہ ہر راوی کا نام لیتے ہوئے اُوپر کو چلتے جاتے تھے حتّٰی کہ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یا آپ کے کسی صحابی پر جاکر ختم ہو جاتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے والی روایت حدیث کہلاتی ہے اور صحابی تک پہنچ کر ختم ہو جانے والی روایت اثر کہلاتی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کی بہت سی صُورتیں ہیں۔ طریقِ بیان عموماً یوں ہوتا تھا کہ۔ مجھ سے الف نے بیان کیا اور الف نے ب سے سُنا تھا۔ اور ب سے ت نے روایت کی تھی اور ت کو ج نے خبر دی تھی کہ ایک مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سامنے فلاں امر کے متعلق یہ الفاظ بیان فرمائے تھے یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہمارے سامنے یہ یہ واقعہ پیش آیا تھا وغیر ذالک۔ روایت کا یہ ایک بہت سادہ سا نقشہ ہے ورنہ عملاً بیان کرنے کے کئی طریقے تھے اور فنِ اصولِ حدیث کے علماء نے ہر طریق کے متعلق مفصل بحث کرکے ان کے مدارج قائم کر دیئے ہیں۔ بہرحال طریقِ روایت کی تفصیلی صُورت جو بھی ہو یہ ایک ایسا محفوظ طریقہ ہے جس سے ہر روایت کی قدر ومنزلت

اس کے ہر درجہ پر جانچی جا سکتی ہے اور دلکشی کے لحاظ سے بھی اس میں ایک ایسا ذاتی عنصر داخل ہے کہ جس سے نہ صرف وُہ مجلس جس میں کوئی روایت بالآخر بیان کی گئی تھی بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی مجلس بھی جس سے روایت کا آغاز ہوتا ہے ایک زندہ تصویر کے طور پر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

جیساکہ اس مضمون کے شروع میں بیان کیا گیا ہے روایت کا یہ علم قبل از اسلام زمانہ میں بھی عربوں میں ایک حد تک رائج تھا، مگر اسلام میں آکر وہ ایک نہایت منظّم اور سائنٹیفک علم بن گیا جس کی امداد کے لیے کئی ضمنی علوم کی ایجاد بھی وقوع میں آئی۔ اس جگہ اس علم کی ساری تفصیلات کے بیان کرنے کی تو گنجائش نہیں، مگر مختصر طور پر اس علم کا ڈھانچہ بصورت ذیل سمجھا جا سکتا ہے۔

روایت و درایت کے اُصول

اصل الاصول اس علم کا یہ ہے کہ ہر واقعہ کی صحت دُو طریق پر آزمائی جا سکتی ہے اور جبتک ان دونوں طریق سے کسی واقعہ کی صحت پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ جاوے اس پر پُورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پہلا طریق روایت ہے۔ یعنی یہ دیکھنا کہ جو واقعہ ہم تک پہنچا ہے، اس کی صحت کے متعلق بیرونی شہادت کیسی میسّر ہے یعنی جس واسطہ سے وہ ہم تک پہنچا ہے۔ وُہ واسطہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے۔ دُوسرا طریق درایت ہے یعنی یہ دیکھنا کہ واقعہ کی صحت کے متعلق اندرونی شہادت کیسی موجود ہے۔ یعنی قطع نظر واسطہ کے کیا وہ واقعہ اپنی ذات میں اور اپنے ماحول کی نسبت سے ایسا ہے کہ اُسے دُرست اور صحیح یقین کیا جائے۔ یہ وُہ دُو بنیادی اصول ہیں جو مُسلمانوں نے اپنے ہر روایتی اور تاریخی علم کی پڑتال کے لیے ایجاد کیے۔ اور ابتدائے اسلام سے ان کا اس پر عمل رہا ہے۔ ان ہر دو اصول کے ماتحت بہت سے قابلِ لحاظ اُمور قرار دیئے گئے ہیں جن میں سے زیادہ معروف امور کو ہم اپنے الفاظ میں درج ذیل کرتے ہیں:

روایت کے اصول کے ماتحت یہ باتیں زیادہ قابلِ لحاظ قرار دی گئی ہیں:

(۱) راوی معروف الحال ہو۔

(۲) راوی صادق القول اور دیانت دار ہو۔

(۳) بات کو سمجھنے کی اہلیّت رکھتا ہو۔

(۴) اس کا حافظہ اچھا ہو

(۵) اُسے مبالغہ کرنے یا خلاصہ نکال کر رپورٹ کرنے یا روایت میں کسی اور طرح تصرّف کرنے کی عادت نہ ہو۔

(۶) روایتِ بیان کردہ میں راوی کا کوئی اپنا ذاتی تعلق نہ ہو جس کی وجہ سے یہ خیال کیا جا سکے کہ اُس کی روایت متاثر ہو سکتی ہے۔

(۷) دو اُوپر نیچے کے راویوں کا آپس میں ملنا زمانہ یا حالات کے لحاظ سے قابلِ تسلیم ہو۔

(۸) روایت کی تمام کڑیاں محفوظ ہوں اور کوئی راوی اوپر سے یا درمیان سے یا نیچے سے چُھٹا ہوا نہ ہو۔

(۹) مذکورہ بالا اوصاف کے ماتحت کسی روایت کے راوی جتنے زیادہ معتبر اور قابلِ اعتماد ہوں گے اتنی ہی وُہ روایت زیادہ پختہ سمجھی جائے گی۔

(۱۰) اسی طرح ایک روایت کے متعلق معتبر راویوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی وُہ روایت زیادہ مضبوط قرار دی جائے گی۔

درایت کے اصول کے ماتحت مندرجہ ذیل امور زیادہ قابلِ لحاظ سمجھے گئے ہیں:

(۱) روایت کسی معتبر اور مستند عصری ریکارڈ کے خلاف نہ ہو۔ اس اصل کے ماتحت ہر روایت جو قرآن شریف کے خلاف ہے قابلِ ردّ ہوگی۔

(۲) کسی مسلّمہ اور ثابت شدہ حقیقت کے خلاف نہ ہو۔

(۳) کسی دُوسری مضبوط تر روایت کے خلاف نہ ہو۔

(۴) کسی ایسے واقعہ کے متعلق نہ ہو کہ اگر وُہ صحیح ہے تو اس کے دیکھنے یا سُننے والوں کی تعداد یقیناً زیادہ ہونی چاہیئے لیکن پھر بھی اس کا راوی ایک ہی ہو۔

(۵) روایت میں کوئی اور ایسی بات نہ ہو جو اسے عقلاً یقینی طور پر غلط یا مشتبہ قرار دیتی ہو[1]۔

درایت کے متعلق بعض ابتدائی مثالیں

یہ وُہ اصول ہیں جو مُسلمان محققین نے اپنی روایات کی چھان بین کے لیے آغازِ اسلام میں مقرر کیے اور انہی کے مطابق وُہ اپنی روایات کی تحقیق و تدقیق کرتے رہے ہیں۔ اور ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ روایات کی پڑتال کے لیے ان سے بڑھ کر کوئی کسوٹی نہیں ہو سکتی۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں لازماً ہر مسلمان محدّث یا مؤرخ کے پیشِ نظر رہی ہیں مگر اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ وُہ اصول ہیں جو مسلمان محققین نے ابتدائے اسلام میں اپنی روایات کی تحقیق کے لیے وضع کیے اور جنھیں وُہ بالعموم اپنی تصانیف میں ملحوظ رکھتے رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ذاتی میلان کی وجہ سے ایک محقق کسی بات کو زیادہ وزن دیتا ہو اور دُوسرا کسی اور کو یا کوئی مصنف اپنے مجموعہ کو زیادہ جامع بنانے کے لیے یا بعض روایات کی امکانی صحت کے خیال سے کمزور روایتوں کو بھی لے لیتا ہو یا کوئی مصنف ایسے ہی غیر محتاط ہو، کیونکہ کسی طبقہ کے سب لوگ ایک درجہ کے نہیں ہوتے مگر بہرحال روایت و درایت دونوں کے اصول کو ابتدائی مسلمانوں نے بالعموم اپنے مدِّنظر رکھا ہے اور زیادہ محتاط مصنفین پوری سختی کے ساتھ ان پر کاربند رہے ہیں۔ روایت کے اصول کے متعلق تو ہمیں مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اسلامی

---

[1] ان اصول کے لیے دیکھو فتح المغیث مصنفہ حافظ زین الدین عبدالرحیم ابن الحسین العراقی اور موضوعات کبیر مصنفہ ملّا علی بن محمد سلطان قاری اور مقدمہ ابن صلاح وغیرہ۔

تحقیق کا یہ پہلو دوست و دشمن سب کے نزدیک مسلّم ہے؛ البتہ چونکہ بعض مغربی محققین نے جن میں سرولیم میور بھی شامل ہیں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مُسلمانوں نے درایت کے پہلو کو مدِّنظر نہیں رکھا اور صرف روایت کے اصول کے ماتحت اپنی روایتوں کی پڑتال کرتے رہے ہیں[1]۔ اس لیے درایت کے پہلو کے متعلق اس جگہ بعض مثالیں درج کی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کو اس بات کا اندازہ کرنے کا موقعہ ملے کہ یہ اعتراض کس قدر غلط اور بے بنیاد ہے۔

سب سے پہلے خود قرآن شریف اس بات کو پیش کرتا ہے کہ محض روایت پر بنیاد رکھنا ہر صورت میں کافی نہیں بلکہ کسی خبر کو صحیح سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کے متعلق اچھی طرح تحقیق کر لی جائے چنانچہ فرماتا ہے:

اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا[2]

"یعنی اگر تمھارے پاس کوئی خبر پہنچے تو یہ دیکھ لیا کرو کہ خبر لانے والا کیسا آدمی ہے۔ پھر اگر یہ راوی قابلِ اعتماد نہ ہو تو اچھی طرح سارے پہلوؤں پر نظر ڈال کر سوچ لیا کرو۔"

اس آیت سے گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف روایت کی صحت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مگر غور کرنے سے یہ بات مخفی نہیں رہتی کہ دراصل یہ آیت روایت و درایت دونوں پہلوؤں کی حامل ہے؛ چنانچہ فاسق کے لفظ میں تو روایت کے پہلو کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ دیکھ لیا کرو کہ خبر لانے والا کیسا ہے اور تبیّنوا کے لفظ میں درایت کا پہلو مدِّنظر ہے یعنی دُوسری جہت سے بھی خبر کی اچھی طرح چھان بین کر لیا کرو۔

پھر فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ..... لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ..... وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ[3]

"یعنی جو لوگ رسُولِ خُدا کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ کے خلاف بہتان لگانے میں شریک ہوتے ہیں وُہ اے مُسلمانو! تمھیں میں سے ایک پارٹی ہیں مگر تمھیں چاہیئے تھا کہ آپس میں ایک دُوسرے کے متعلق نیک گمان کرتے۔ پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ تم نے اس بہتان کو سُنتے ہی یہ کہہ دیا کہ خدا تعالےٰ پاک و بے عیب ہے۔ یہ تو ایک صاف بہتان نظر آتا ہے۔"

اس آیت میں صراحت کے ساتھ درایت کے اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ صحابہ کو اس بات پر توبیخ کی گئی ہے کہ خواہ حضرت عائشہ پر الزام لگانے والے بظاہر مسلمان ہی تھے، مگر جب تم حضرت عائشہ

---

[1] دیکھو لائف آف محمدؐ مصنفہ سر ولیم میور دیباچہ XXXVIII [2] (الحجرات آیت ۷)

[3] سورۃ نور آیت ۱۲، ۱۷

کے حالات سے اچھی طرح آگاہ تھے اور تم جانتے تھے کہ وُہ خدا تعالیٰ کے رسولؐ کی بیوی اور دن رات آپ کی صُحبت میں رہنے والی ہے تو تمہیں چاہیے تھا کہ ان ساری باتوں کو دیکھتے ہوئے اس خبر کو سنتے ہی بہتان اور افتراء قرار دے کر ٹھکرا دیتے۔ گویا اس آیت میں ضمناً یہ بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک روایت کے متعلق صرف یہ دیکھ کر اس کے راوی بظاہر اچھے لوگ ہیں اسے نہیں مان لینا چاہیئے بلکہ خداداد عقل کے ماتحت دُوسری باتیں بھی دیکھنی ضروری ہیں۔ اور اگر دُوسری باتیں روایت کو مشتبہ قرار دیں تو اُسے قبول نہیں کرنا چاہیئے۔

اسی قرآنی اصل کے ماتحت حدیث میں بھی یہ تاکید آتی ہے کہ محض کسی بات کو سُن کر اُسے سچا نہیں سمجھ لینا چاہیئے بلکہ ہر جہت سے تحقیق کر کے معلوم کرنا چاہیئے کہ حقیقت کیا ہے؟ چنانچہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ[1]

"یعنی ایک انسان کے جھوٹا ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ وُہ جو بات بھی سُنے اُسے بلا تحقیق آگے روایت کرنا شروع کر دے"

اِس حدیث میں گو روایتی تحقیق کی طرف بھی اشارہ ہے مگر اصل مقصود درایتی تحقیق ہے جیسا کہ بِكُلِّ مَا سَمِعَ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں یعنی محض کسی بات کا سُننا اس کے قبول کیے جانے کا باعث نہیں بننا چاہیے بلکہ دُوسری جہات سے بھی غور کرنا چاہیئے کہ آیا جو خبر ہمیں پہنچی ہے وُہ قابلِ قبول ہے یا نہیں، بلکہ اس حدیث میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ جو شخص تحقیق کرنے کے بغیر یُونہی ہر سُنی سنائی بات آگے روایت کر دیتا ہے وُہ جھوٹ کی اشاعت کا ایسا ہی ذمہ دار ہے جیسا کہ جھُوٹ بولنے والا شخص۔

الغرض قرآن شریف و حدیث دونوں اس اصول کو بیان کرتے ہیں کہ ہر خبر کی تصدیق کے متعلق روایتاً و درایتاً دونوں پہلو مدِّنظر رہنے چاہئیں، چنانچہ اس اصل کے ماتحت حدیث میں کثرت کے ساتھ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ صحابہ اور ان کے بعد آنے والے مُسلمان محققین نے ہمیشہ روایت کے پہلو کے ساتھ درایت کے پہلو کو بھی مدِّنظر رکھا ہے اور بسا اوقات روایتی لحاظ سے ایک روایت کے مضبوط ہونے کے باوجود درایت کی بنا پر اُسے ردّ کر دیا ہے۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلْعَم اَلْوُضُوْءُ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ فَقَالَ لَهٗ ابْنُ عَبَّاسٍ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ اَنَتَوَضَّأُ مِنَ الدُّهْنِ اَنَتَوَضَّأُ مِنَ الْحَمِيْمِ ..... فَقَالَ اَبُوْ عِيْسٰى وَاَكْثَرُ اَهْلِ الْعِلْمِ عَلٰى تَرْكِ الْوُضُوْءِ[2]

"یعنی ایک مجلس میں ابوہریرہ نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جس چیز کو آگ نے

---

[1] صحیح مُسلم جلد ۱ باب اَلنَّهْيُ عَنِ الْحَدِيْثِ ٭ [2] ترمذی کتاب الطہارۃ باب مَاغَيَّرَتِ النَّارُ

چھُوا ہو اس کے استعمال سے وضو ضروری ہو جاتا ہے۔ اس پر ابن عباس نے ابو ہریرہ کو ٹوک کر کہا کہ کیا پھر ہم گھی یا تیل کے استعمال کے بعد بھی وضو کیا کریں۔ اور کیا ہم گرم پانی کے استعمال کے بعد بھی وضو کیا کریں؟ یہ روایت درج کر کے ترمذی علیہ الرحمۃ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے اکثر علماء کا اسی پر عمل ہے کہ آگ پر تیار کی ہوئی چیز کے استعمال سے وضو ضروری نہیں ہو جاتا۔

اس حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ تک کی روایت کو جن کی روایات کی تعداد سارے صحابہ سے زیادہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے اس عقلی دلیل سے رد کر دیا کہ اوّل تو محض آگ پر کسی چیز کا تیار ہونا اس بات سے کوئی جوڑ نہیں رکھتا کہ اس کے استعمال سے وضو ضروری ہو جائے۔ دُوسرے یہ کہ جب دین کی بناء یُسر اور آسانی پر ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول کس طرح منسوب ہو سکتا ہے کہ بس جس چیز کو بھی آگ چھُو جائے اُس سے وضو واجب ہو جاتا ہے اور اسی لیے باوجود حضرت ابو ہریرہ کی اس صریح حدیث کے اکثر ائمہ حدیث وفقہ کا یہی مذہب ہے کہ آگ والی چیز کے استعمال سے وضو واجب نہیں ہوتا۔ اور بعض دوسری حدیثوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ حضرت ابن عباس یا بعد کے ائمہ حدیث کے نزدیک ابو ہریرہ نے جو روایت بیان کی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو ہے، مگر وہ قابلِ عمل نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ابنِ عباس اور دُوسرے محققین کے نزدیک اس روایت میں ابو ہریرہ کو غلط فہمی ہوئی ہے یا آپؐ کا ارشاد بعض خاص قسم کے حالات کے متعلق ہو گا جسے ابو ہریرہ نے عام سمجھ کر اُسے وسعت دے لی۔ بہر حال باوجود اس کے کہ اصولِ روایت کے لحاظ سے یہ حدیث بالکل صحیح قرار پاتی ہے، مسلمان محققین نے درایت کی بنا پر اسے صحیح تسلیم نہیں کیا۔ اور جب ابو ہریرہ جیسے کہنہ مشق راوی کی روایت درایت کی جرح سے محفوظ نہیں سمجھی گئی تو میور صاحب کے اس قول کی حقیقت ظاہر ہے کہ مُسلمان صرف روایتی پہلو کو دیکھ کر ہر بات کو صحیح مان لیا کرتے تھے اور درایت کو کام میں نہیں لاتے تھے۔

پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے:

عَنْ اَبِي اِسْحٰقَ قَالَ كُنْتُ مَعَ الْاَسْوَدِ بْنِ يَزِيْدَ فَحَدَّثَ الشَّعْبِيُّ عَنْ حَدِيْثِ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلّعم لَمْ يَجْعَلْ لَهَا سُكْنٰى وَلَا نَفَقَةً فَاَخَذَ الْاَسْوَدُ مِنْ حَصًى فَحَصَبَهُ بِهٖ فَقَالَ وَيْلَكَ تُحَدِّثُ بِمِثْلِ هٰذَا وَقَالَ عُمَرُ لَا نَتْرُكُ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَوْلِ امْرَأَةٍ لَا نَدْرِيْ حَفِظَتْ اَوْ نَسِيَتْ[1]

"یعنی ابو اسحاق سے روایت ہے کہ ایک دفعہ مَیں ایک مجلس میں اسود بن یزید کے ساتھ بیٹھا تھا

---

[1] مُسلم کتاب الطلاق باب المطلقہ ثلاثًا لا نفقۃ لہا۔

کہ شعبی نے یہ روایت بیان کی کہ فاطمہ بنت قیس صحابیہ بیان کرتی ہے کہ جب اس کے خاوند نے اُسے طلاق دیدی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے مکان اور خرچ نہیں دلایا۔ اس پر اسود نے ایک کنکروں کی مٹھی اُٹھا کر شعبی کو ماری اور کہا کیا تم یہ حدیث بیان کرتے ہو؟ حالانکہ حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی تو اُنھوں نے فرمایا کہ ہم ایک عورت کے بیان پر قرآن اور سنّتِ رسول کو نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ نہیں معلوم کہ اصل بات کیا تھی اور اس نے کیا سمجھا یا اصل بات کیا تھی اور اُسے کیا یاد رہا۔"

اس حدیث میں گویا حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی ایک صحابیہ کی روایت کو اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ وہ ان کی رائے میں قرآنی تعلیم اور سُنّتِ رسولؐ کے خلاف ہے اور اس کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہو گا اُسے یا تو وہ سمجھی نہیں ہو گی یا بعد میں بھول گئی ہو گی۔ بہرحال حضرت عمرؓ نے درایت کی بنا پر ایک روایتی لحاظ سے صحیح حدیث کو رد کر دیا اور جمہورِ اسلام کا یہی فتویٰ ہے کہ فاطمہ کی روایت غلط تھی اور حضرت عمرؓ کا خیال دُرست ہے۔

پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے:

عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ أَنَّهُ سَمِعَ عِتْبَانَ بْنَ مَالِكٍ الْأَنْصَارِيَّ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِيْ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ قَالَ مَحْمُوْدٌ فَحَدَّثْتُهَا قَوْمًا فِيْهِمْ أَبُوْ أَيُّوْبَ صَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلعم فَأَنْكَرَهَا عَلَيَّ أَبُوْ أَيُّوْبَ وَقَالَ وَاللّٰهِ مَا أَظُنُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَا قُلْتَ قَطُّ [1]

"یعنی محمود بن الربیع روایت کرتے ہیں کہ مَیں نے عتبان بن مالک سے یہ سُنا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ہوئی ہے جو سچی نیت سے خدا کی رضا کی خاطر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اقرار کرتا ہے، لیکن جب مَیں نے یہ روایت ایک ایسی مجلس میں بیان کی جس میں ابوایوب انصاری صحابی بھی موجود تھے تو ابوایوب نے اس روایت سے انکار کیا اور کہا خدا کی قسم مَیں ہرگز نہیں خیال کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہو۔"

اس حدیث میں حضرت ابوایوب انصاریؓ نے ایک ایسی حدیث کو جو اصولِ روایت کے لحاظ سے صحیح تھی اپنی درایت کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور گو یہ ممکن ہے کہ حضرت ابوایوبؓ کا استدلال دُرست نہ ہو مگر بہرحال یہ حدیث اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ صحابہ یونہی کورانہ طور پر ہر روایت کو قبول نہیں کر لیتے تھے، بلکہ درایت و روایت ہر دو کے اصول کے ماتحت پوری تحقیق کر لینے کے بعد قبول کرتے تھے۔

پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے:

---

[1] بخاری ابواب التطوع باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ ۔

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَلَمَّا مَاتَ عُمَرُ ذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِعَائِشَةَ فَقَالَتْ يَرْحَمُ اللّٰهُ عُمَرَ وَاللّٰهِ مَا حَدَّثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلْعَم اَنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ وَلٰكِنْ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَزِيْدُ الْكَافِرَ عَذَابًا بِبُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ قَالَ وَقَالَتْ عَائِشَةُ حَسْبُكُمُ الْقُرْاٰنُ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى [1]

"یعنی ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ یہ روایت بیان کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میّت پر رونے سے میّت پر عذاب ہوتا ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد مَیں نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے بیان کی تو فرمانے لگیں۔ اللہ تعالیٰ عمرؓ پر رحم فرماتے۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہرگز نہیں فرمایا بلکہ یہ کہا تھا کہ ایک کافر کے مرنے کے بعد اگر اس کے ورثاء اس پر روئیں تو اس وجہ سے اس کا عذاب اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ (کیونکہ جب وہ زندہ تھا تو ان کے اس فعل میں ان کا مؤید ہوا کرتا تھا) اور پھر حضرت عائشہؓ کہنے لگیں کہ ہمیں قرآن کا یہ قول کافی ہے کہ کوئی نفس دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔"

اس حدیث سے بھی درایت کے پہلو کا استعمال نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے یعنی حضرت عائشہؓ نے حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر انسان کی روایت کو صرف ایک بالمقابل روایت بیان کر دینے سے ہی ردّ نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اپنے خیال میں اس کے غلط ہونے کی قرآن شریف سے ایک دلیل بھی دی۔ ہمیں اس جگہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آیا حضرت عائشہ کا خیال دُرست تھا یا کہ حضرت عمرؓ کا۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ الزام بالکل غلط ہے کہ مُسلمان محققین صرف ایک روایت کو سُن کر اُسے قبول کر لیتے تھے۔ کیونکہ حق یہ ہے کہ وہ پوری طرح درایت کو کام میں لاتے اور ہر چیز کو اپنی عقلِ خداداد کے ساتھ تول کر پھر قبول کرتے تھے اور اس بناء پر بعض اکابر صحابہ تک میں باہم اختلاف ہو جاتا تھا۔

درایت کے کمزور پہلو

یہ چار مثالیں جو ہم نے اُوپر بیان کی ہیں اور جو صرف نمونہ کے طور پر درج کی گئی ہیں ورنہ اس قسم کی مثالیں اسلامی تاریخ میں کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار جلیل القدر صحابیوں کے فعل سے یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ ابتدائے اسلام سے ہی درایت کا پہلو روایت کے پہلو کے ساتھ ساتھ چلا آیا ہے اور مسلمان محققین پُوری دیانتداری اور آزادی کے ساتھ درایت کے اصول کو اپنی روایات کی تحقیق اور پڑتال میں استعمال کرتے رہے ہیں اور اسی قسم کی مثالیں بعد کے زمانوں کے متعلق بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر ہم اپنے اس مضمون کو زیادہ لمبا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ایک عقلمند انسان کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ بہرحال میور صاحب اور ان کے ہم عقیدہ اصحاب کا یہ اعتراض

---

[1] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البکاء علی المیّت

بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ مسلمان محققین صرف روایت کے پہلو کو دیکھتے تھے اور درایت سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ ہاں اگر ہمارے معترضین کا یہ منشاء ہے کہ ہر حال میں درایت کے پہلو کو ترجیح اور غلبہ ہونا چاہیئے اور خواہ ایک بات اصول روایت کے لحاظ سے کیسی ہی پختہ اور مضبوط ہو وہ اگر درایت کے پہلو کے لحاظ سے مشکوک نظر آتی ہے تو بہر صورت اسے رد کر دینا چاہیئے تو یہ خیال نہ صرف بالکل غلط ہے بلکہ علمی ترقی کے لیے بھی سخت مضر اور نقصان دِہ ہے۔ درایت خواہ کیسی ہی اچھی چیز ہو مگر اس کے ساتھ دو خطرناک کمزوریاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کا تعلق استدلال کے ساتھ ہوتا ہے اور استدلال ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں اختلاف رائے کی بہت گنجائش ہے۔ دُوسرے یہ کہ درایت کی بنا زیادہ تر انسان کے سابقہ تجربہ اور معلومات پر ہوتی ہے اور تجربہ اور معلومات ایسی چیزیں ہیں کہ روز بدلتی رہتی ہیں کیونکہ ان میں ہر وقت وسعت اور ترقی کی گنجائش ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر درایت کے پہلو پر زیادہ بھروسہ کرنا اپنے اندر ایسے خطرات رکھتا ہے جنہیں کوئی دانا شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک شخص کسی روایت کو قرآن شریف کی کسی آیت کے خلاف سمجھ کر رد کر دیتا ہے مگر ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرا شخص اُسے کسی قرآنی آیت کے خلاف نہ پائے بلکہ وُہ دونوں کی ایسی تشریح کر دے کہ ان کے درمیان کوئی تضاد نہ رہے۔ یا مثلاً ایک شخص ایک روایت کو کسی ثابت شدہ حقیقت کے خلاف سمجھتا ہے مگر ہو سکتا ہے کہ ایک دُوسرے شخص کے نزدیک وہ چیز جسے ایک ثابت شدہ حقیقت سمجھا گیا ہے، وہ ثابت شدہ حقیقت نہ ہو۔ یا ایک شخص ایک روایت کو انسانی تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف سمجھتا ہے مگر ہو سکتا ہے کہ ایک دُوسرا شخص جس کا تجربہ اور مشاہدہ زیادہ وسیع ہے وہ اسے اس کے خلاف نہ سمجھے وغیر ذالک۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ درایت کے پہلو پر زیادہ زور دینا نہ صرف اصولاً غلط ہے، بلکہ علمی ترقی کے لیے بھی ایک بہت بھاری روک ہے اور اس پر زیادہ زور دینا انہی لوگوں کا کام ہے جو اپنے محدود علم اور محدود تجربہ اور محدود مشاہدہ اور محدود استدلال سے ساری دنیا اور سارے زمانوں کے علم کو ناپنا چاہتے ہیں۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ نظریہ دنیا کی علمی ترقی کے لیے ایک سمّ قاتل سے کم نہیں۔ اگر ابتدائی مسلمان محدث یا مؤرخ درایت پر اس قدر زور دیتے جتنا میور صاحب اور ان کے ہم عقیدہ اصحاب چاہتے ہیں کہ دینا چاہیئے تھا تو یقیناً بانیٔ اسلام کے متعلق بہت سے مفید معلومات کا ذخیرہ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا، کیونکہ اس صورت میں ان میں سے کوئی مصنّف کسی بات کو اور کوئی کسی کو اپنی درایت کے خلاف پا کر ترک کر دیتا حالانکہ بالکل ممکن ہے کہ وہ صحیح درایت کے خلاف نہ ہوتیں، چنانچہ ہم عملاً دیکھتے ہیں کہ کئی باتیں جو گذشتہ زمانوں میں سمجھ نہیں آتی تھیں آج انکا سمجھنا آسان ہو رہا ہے۔ پس پختہ اور صحیح اصول وہی تھا جو ابتدائی مسلمان مصنفین نے اختیار کیا کہ انہوں نے اصل بنیاد روایت کے اصول پر رکھی مگر روایت کی مدد کے لیے ایک حد تک درایت کو بھی کام میں لاتے رہے۔ اور اس طرح انہوں نے اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک عمدہ ذخیرہ روایات کا جمع کر دیا۔ اور اب یہ ہم لوگوں کا کام ہے کہ روایت و درایت کے اصول کے مطابق اس ذخیرہ کی چھان بین کر کے صحیح کو سقیم سے جُدا کریں۔

روایات کا قلمبند ہونا

گو اصول روایت کے لحاظ سے کسی روایت کا لکھا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے اور اسلامی روایات میں ایک بڑا حصّہ ایسی روایتوں کا شامل ہے جو کم از کم ابتداء میں صرف زبانی طور پر سینہ بہ سینہ مروی ہوئی ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابتدائے اسلام سے ہی بعض راویوں کا یہ طریق رہا ہے کہ جو حدیث بھی وہ سُنتے تھے یا جو روایت بھی ان تک پہنچتی تھی اُسے وہ فوراً لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے اور جب کسی کو آگے روایت سُناتے تھے تو اس لکھی ہوئی یادداشت سے پڑھ کر سُناتے تھے۔ جس سے ان روایات کو مزید مضبوطی حاصل ہو جاتی تھی۔ اس قسم کے لوگ صحابہ کرام میں بھی پائے جاتے تھے اور بعد میں بھی۔ بلکہ بعد میں جُوں جُوں علم ترقی کرتا گیا اور فن تحریر زیادہ پھیلتا گیا، ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی گئی حتی کہ اس زمانہ میں آکر جبکہ روایات کتابی صورت میں جمع ہونے لگیں اور موجودہ کتب حدیث وغیرہ کے مجموعے عالم وجود میں آنے شروع ہوئے جس کا آغاز دوسری صدی ہجری سے سمجھا جا سکتا ہے روایات کو لکھ کر محفوظ کر لینے کا طریق عام طور پر رائج ہو چکا تھا اور راوی لوگ اپنی روایات کو دوسروں تک پہنچاتے ہوئے اپنی تحریری یادداشتوں سے کثرت کے ساتھ مدد لینے لگ گئے تھے، لیکن چونکہ محض کسی تحریری یادداشت کا موجود ہونا اسے قابل سند نہیں بنا سکتا جبتک کہ اس کی تائید میں معتبر زبانی تصدیق بھی موجود نہ ہو اور اسی لیے آج تک ہر مہذب ملک کی عدالتوں میں ہر دستاویز کی تصدیق کے لیے زبانی شہادت ضروری قرار دی جاتی ہے اس لیے بالعموم محدثین نے زبانی اور تحریری روایت کے امتیاز کو اپنے مجموعوں میں ظاہر نہیں کیا۔ لیکن اس میں ہرگز کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اب جو احادیث کے مجموعے ہمارے سامنے ہیں ان سب میں ایک معتدبہ حصّہ ایسی روایتوں کا شامل ہے جو زبانی انتقال کے ساتھ ساتھ تحریری طور پر بھی ایک راوی سے دوسرے راوی تک منتقل ہوتی ہوئی نیچے اُتری ہیں۔ اس دعویٰ کی تصدیق میں ہم اس جگہ اختصار کی غرض سے صرف صحابہ کے زمانہ کی چند مثالیں درج کریں گے کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خود صحابہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور روایات کو لکھ کر محفوظ کر لیا کرتے تھے اور پھر اُسی مجموعہ سے آگے سلسلہ روایت چلاتے تھے تو یہ ایک قطعی ثبوت اس بات کا ہوگا کہ یہ طریق بعد کے زمانہ میں (جبکہ فن تحریر بہت زیادہ وسیع ہو گیا اور روایات کے لکھنے کے لیے ہر قسم کی سہولت میسّر آگئی) بدرجہ اولیٰ جاری رہا۔ سب سے پہلی اور اصولی حدیث ہم اس معاملہ میں وہ درج کرنا چاہتے ہیں جن میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تحریک فرمائی ہے کہ جس شخص کو میری باتیں یاد نہ رہتی ہوں اُسے چاہیئے کہ انہیں لکھ کر محفوظ کر لیا کرے، چنانچہ ترمذی میں یہ روایت آتی ہے کہ:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَانَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ یَجْلِسُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَیَسْمَعُ مِنَ النَّبِیِّ الْحَدِیْثَ وَلَا یَحْفَظُهٗ فَشَکَا ذَالِکَ اِلَی النَّبِیِّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِسْتَعِنْ بِیَمِیْنِکَ وَاَوْمَأَ بِیَدِهٖ لِلْخَطِّ۔ (ترمذی ابواب العلم باب ماجاء فی الرخصۃ فیہ)

"یعنی ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک انصاری شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کی باتیں سنتا ہوں مگر مجھے وہ یاد نہیں رہتیں۔ آپ نے فرمایا: تم اپنے دائیں ہاتھ کی مدد حاصل کر کے میری باتوں کو لکھ لیا کرو۔"

اس حدیث سے ہمیں یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تحریک فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو میری باتیں یاد نہ رہتی ہوں، وہ انہیں لکھ کر محفوظ کر لیا کرے اور آپؐ کے اس فرمان کے ہوتے ہوئے اگر ہمیں تاریخ میں صراحت کے ساتھ یہ ذکر نظر نہ بھی آوے کہ فلاں فلاں صحابی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے تو بھی قیاس یہی ہوگا کہ بعض صحابی ضرور حدیثیں لکھا کرتے تھے، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت سے صحابہ جیسی جماعت میں سے کسی فرد نے بھی فائدہ نہ اُٹھایا ہو اور بہرحال جس صحابی کو آپؐ نے براہِ راست مخاطب کر کے یہ الفاظ فرمائے تھے اُس نے تو ضرور اس ارشاد کی تعمیل کی ہوگی۔ مگر یہ صرف قیاس ہی نہیں ہے بلکہ حدیث میں صراحت کے ساتھ یہ ذکر آتا ہے کہ بعض صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو بھی سُنتے تھے وہ لکھ لیا کرتے تھے۔ اس پر بعض لوگوں نے انہیں منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی خوش ہوتے ہیں کبھی غصہ میں ہوتے ہیں، تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرو نے اس پر لکھنا چھوڑ دیا، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا:

اُكْتُبْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا الْحَقُّ[1]

"یعنی تم بیشک لکھا کرو کیونکہ خدا کی قسم میری زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق اور راست نکلتا ہے۔"

اس کے بعد عبداللہ بن عمرو آپؐ کی باتیں لکھ کر محفوظ کر لیا کرتے تھے؛ چنانچہ بخاری میں آتا ہے:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ مَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَدٌ اَكْثَرَ حَدِيْثًا عَنْهُ مِنِّيْ اِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو فَاِنَّهٗ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا اَكْتُبُ[2]

"یعنی ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کی مجھ سے زیادہ حدیث محفوظ نہیں ہے سوائے عبداللہ بن عمرو کے کیونکہ ان کی عادت تھی کہ حدیث سُن کر لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔"

پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے:

عَنْ اَبِيْ جُحَيْفَةَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِيٍّ هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ قَالَ لَا اِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ اَوْ فَهْمٌ اُعْطِيَهٗ

---

[1] ابوداؤد کتاب العلم باب کتابۃ العلم۔

[2] بخاری کتاب العلم باب کتابۃ العلم۔

رَجُلٌ مُسْلِمٌ اَوْ مَا فِی هٰذِهِ الصَّحِیْفَةِ قُلْتُ مَا فِی هٰذِهِ الصَّحِیْفَةِ قَالَ الْعَقْلُ وَفِکَاکُ الْاَسِیْرِ وَلَا یُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِکَافِرٍ[1]

"یعنی ابو جحیفہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ حضرت علی سے یہ دریافت کیا کہ کیا آپ کے پاس کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اس پر حضرت علی نے فرمایا کہ سوائے قرآن شریف کے اور کچھ نہیں۔ ہاں ایک مسلمان کی خداداد عقل ہے جس سے وہ خود سوچ کر اور قیاس کر کے فتویٰ معلوم کر سکتا ہے، البتہ میرے پاس یہ ایک لکھا ہوا صحیفہ ضرور موجود ہے۔ میں نے پوچھا اس صحیفہ میں کیا ہے فرمانے لگے کہ اس میں فلاں فلاں مسئلہ کے متعلق چند حدیثیں لکھی ہیں"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کا بھی یہی طریق تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خاص باتوں کو لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ پھر ایک اور حدیث آتی ہے کہ:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ خَطَبَ النَّبِیُّ صلعم عَامَ فَتْحِ مَکَّةَ فَقَالَ ..... فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْیَمَنِ فَقَالَ اُکْتُبْ لِیْ فَقَالَ اُکْتُبُوْا لِاَبِیْ فُلَانٍ[2]۔

"یعنی ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا جس میں یہ یہ کچھ فرمایا۔ اس پر ایک یمنی شخص نے آگے بڑھ کر عرض کیا یا رسول اللہ! یہ خطبہ مجھے لکھ دیجئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ وہ خطبہ اُسے لکھ کر دے دیا جائے"

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ صحابہ کے زمانہ سے ہی حدیثوں کے لکھنے کا رواج شروع ہو چکا تھا اور بعض صحابہ اس پر کاربند تھے اور یقیناً اس کے بعد جُوں جُوں زمانہ گذرتا گیا حدیثوں کو لکھ کر محفوظ کر لینے کا رواج زیادہ ہوتا گیا مگر جیسا کہ ہم اُوپر کہہ چکے ہیں اس مختصر نوٹ میں بعد کے زمانہ کی مثالیں درج کرنے کی گنجائش نہیں، البتہ صرف اس اظہار کے لیے کہ بعد میں حدیثوں کے قلمبند کرنے کے طریق میں کس قدر وسعت ہو گئی تھی اس جگہ صرف ایک مثال پر اکتفاء کی جاتی ہے یحییٰ بن معین ایک مشہور راوی گذرے ہیں جن سے امام بخاری اور امام مسلم اور ابوداؤد سجستانی وغیرہ بڑے بڑے محدثین نے روایت لی ہے ان کے متعلق یہ روایت آتی ہے کہ اُن کے پاس چھ لاکھ حدیث لکھی ہوئی محفوظ تھی جس سے وہ آگے روایت کیا کرتے تھے؛ چنانچہ وفیات الاعیان میں لکھا ہے کہ:

سُئِلَ یَحْیٰی کَمْ کَتَبْتَ مِنَ الْحَدِیْثِ فَقَالَ کَتَبْتُ بِیَدِیْ هٰذِهٖ سِتَّ مِائَةِ اَلْفِ حَدِیْثٍ[3]

---

[1] بخاری کتاب العلم باب کتابة العلم ۔ [2] بخاری کتاب العلم باب کتابة العلم ۔

[3] وفیات الاعیان مصنفہ ابن خلکان حالات یحییٰ بن معین ۔

"یعنی یحییٰ بن معین سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے کتنی حدیثیں لکھی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنے ہاتھ سے چھ لاکھ حدیث لکھی ہے۔"

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یحییٰ بن معین جامعین حدیث میں سے نہیں ہیں۔ جنھوں نے امام بخاری اور مسلم وغیرہ کی طرح کوئی مجموعہ حدیث پیچھے چھوڑا ہو بلکہ ان کا حدیث لکھنا صرف ایک راوی کی حیثیت میں تھا۔ اسی پر دوسرے رُواۃِ حدیث کا قیاس ہو سکتا ہے۔

الغرض اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ صحابہ کے زمانہ سے ہی احادیث وروایات کا ضبطِ تحریر میں آنا شروع ہو چکا تھا اور بعد میں یہ سلسلہ زیادہ وسیع ہوتا گیا حتیٰ کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں ایک معتد بہ حصّہ ایسی روایتوں کا موجود ہے جو زبانی روایتوں کے ساتھ ساتھ تحریری طور پر بھی مروی ہوتی ہوئی جامعین حدیث تک پہنچی ہیں۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اکثر صحابہ حدیث لکھنے کے عادی تھے یا یہ کہ بعد کے راوی سب کے سب لازماً حدیث لکھ لیا کرتے تھے۔ ایسا دعویٰ یقیناً واقعات کے خلاف ہوگا، بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی بعض نے حدیث لکھنے کا طریق شروع کر دیا تھا اور بعد کے زمانہ میں یہ طریق زیادہ وسیع ہو گیا گو پھر بھی یقیناً احادیث کا ایک معتد بہ حصّہ زبانی روایت پر ہی مبنی رہا ہے اور موجودہ مجموعوں میں ہر دو قسم کی روایات شامل ہیں۔

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان ہوا ہے کہ میری طرف منسوب کر کے سوائے قرآن شریف کے اور کچھ نہ لکھا کرو۔[1] اور اس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ صحابہ حدیث نہیں لکھتے ہوں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو واقعات کے مقابل پر کوئی استدلال قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ جب واقعہ یہ ہے کہ بعض صحابہ حدیث لکھا کرتے تھے تو کوئی استدلالی دلیل اس کے مقابل پر کیا وزن رکھ سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ان احادیث کی حقیقت کے متعلق جن میں لکھنے سے منع کیا گیا ہے غور نہیں کیا گیا۔ دراصل یہ احادیث خاص زمانہ اور خاص حالات کے متعلق ہیں اور صرف ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتے تھے اور اس حکم سے غرض یہ تھی کہ تا قرآنی وحی کے ساتھ کوئی دوسری چیز مخلوط نہ ہونے پائے۔ عام لوگوں کے لیے یا عام حالات میں کوئی روک نہیں تھی۔ واللہ اعلم۔

حدیث وسیرۃ کی روایتوں میں ایک بنیادی فرق

اس اصولی بحث کے ختم کرنے سے قبل یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ گو مسلمان مصنفین نے اپنی روایات کی پڑتال میں روایت و درایت ہر دو قسم کے اصول کو علیٰ قدر مراتب ملحوظ رکھا ہے مگر انہوں نے ہر قسم کی روایت کے لیے ایک ہی معیار نہیں رکھا بلکہ وہ ایک دانشمند محقق کی طرح اس غرض و غایت کے

---

[1] مثلاً دیکھو مسلم اور ترمذی وغیرہ۔

مناسبِ حال جس کے لیے کوئی روایت مطلوب ہوتی تھی اپنے معیار کو نرم یا سخت کرتے رہتے ہیں۔ یعنی بعض علوم میں اُنھوں نے اپنا معیار سخت رکھا ہے اور بعض میں نرم۔ مثلاً حدیث میں جہاں عقائد و اعمال کا تعلق تھا محدثین نے بڑی سختی کے ساتھ روایات کو پرکھا ہے اور اپنے معیار کو بہت بلند رکھا ہے۔ لیکن سیرۃ و تاریخ وغیرہ میں اتنی سختی نہیں کی۔ چنانچہ علامہ علی بن برہان الدین حلبیؒ اپنی سیرۃ میں لکھتے ہیں کہ :

لَا يَخْفٰى اَنَّ السِّيَرَ تَجْمَعُ الصَّحِيْحَ وَالضَّعِيْفَ وَالْمُرْسَلَ وَالْمُنْقَطِعَ[1]

"یعنی یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ سیرۃ کی روایتوں میں صحیح اور ضعیف اور مرسل اور منقطع سبھی قسم کی روایتیں شامل ہیں۔"

اور پھر امام احمد بن حنبلؒ اور دُوسرے آئمہ حدیث کی زبانی اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ :

اِذَا رَوَيْنَا فِي الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ شَدَّدْنَا وَاِذَا رَوَيْنَا فِي الْفَضَائِلِ وَ نَحْوِهَا تَسَاهَلْنَا[2]

"یعنی ہمارا اصول یہ ہے کہ جب ہم حلال و حرام کے مسائل کے لیے کوئی روایت بیان کرتے ہیں تو ہم اس کی تحقیق میں بڑی سختی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن فضائل اور سیرۃ میں اپنے معیار کو نرم کر دیتے ہیں"

اور اس اصول کی مزید تشریح یُوں کرتے ہیں کہ :

"اَلَّذِيْ ذَهَبَ اِلَيْهِ كَثِيْرٌ مِنْ اَهْلِ الْعِلْمِ اَلتَّرَخُّصُ فِي الرَّقَائِقِ وَمَا لَا حُكْمَ فِيْهِ مِنْ اَخْبَارِ الْمَغَازِيْ وَمَا يَجْرِيْ مَجْرٰى ذٰلِكَ وَاَنَّهُ يُقْبَلُ فِي الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ لِعَدَمِ تَعَلُّقِ الْاَحْكَامِ بِهَا[3]

"یعنی اکثر اہلِ علم نے یہی طریق رکھا ہے کہ ایسی باتیں جن میں شرعی احکام نہ بیان ہوں جیسے سیرۃ مغازی وغیرہ اُن میں اپنے معیار کو نرم رکھنا چاہیے، کیونکہ ان اُمور میں ہم ایسی روایتوں کو بھی قبول کر سکتے ہیں جنہیں دینی اور فقہی احکام کے معاملہ میں قبول نہیں کر سکتے"

امام احمد بن حنبلؒ نے اس اصول کی تشریح میں ایک لطیف مثال بھی بیان کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

اِبْنُ اِسْحَاقَ رَجُلٌ نَكْتُبُ عَنْهُ هٰذِهِ الْاَحَادِيْثَ يَعْنِي الْمَغَازِيْ وَ نَحْوَهَا وَ اِذَا جَاءَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ اَرَدْنَا قَوْمًا هٰكَذَا وَ قَبَضَ اَصَابِعَ يَدَيْهِ الْاَرْبَعِ[4]

"یعنی ابن اسحاق صاحب سیرۃ و مغازی بیشک اس رتبہ کے آدمی ہیں کہ ہمیں ان سے سیرۃ و تاریخ

---

[1] سیرۃ حلبیہ جلد اصفحہ ۱ ۔ [2] سیرۃ حلبیہ جلد اصفحہ ۱
[3] سیرۃ حلبیہ جلد اصفحہ ۲ ۔ [4] فتح المغیث صفحہ ۱۲۰

میں روایت لیتے ہوئے تامل نہیں ہونا چاہیئے، لیکن جب حلال وحرام کے مسائل کا سوال ہو تو ہمیں ایسے آدمی چاہئیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی چار انگلیاں مضبوطی کے ساتھ ملا کر باہم جفت کرلیں۔ جس سے مراد یہ تھی کہ حدیث میں ایسے راوی درکار ہیں جن میں کوئی رخنہ نہ نکالا جاسکے۔

الغرض حدیث وسیرۃ کی روایتوں کے معیار میں ہمیشہ سے ایک اصولی فرق مدِ نظر رکھا گیا ہے اور یہی ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ حدیث میں جس کی روایت نے دین کی بنیاد بننا تھا سخت معیار رکھنا ضروری تھا تاکہ کوئی کمزور روایت حدیث کے ذخیرہ میں راہ پاکر دینی فتنہ کا باعث نہ بنے، لیکن سیرۃ وتاریخ میں یہ پہلو ایسا خطرناک نہیں تھا۔ بلکہ سیرۃ وتاریخ میں زیادہ قابلِ توجہ یہ بات تھی کہ اساسی مواد جمع ہو جائے جس میں بعد میں اصولِ مقررہ کے ماتحت چھان بین کی جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی کُتب حدیث کا روایتی پہلو کتب سیرۃ ومغازی وغیرہ کی نسبت بہت زیادہ مضبوط اور بلند سمجھا گیا ہے۔ مگر یہ کوئی نقص نہیں ہے بلکہ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا تاکہ جہاں ایک طرف دین کو فتنہ واختلاف سے بچایا جاتا وہاں تاریخ میں جامعیت قائم رہتی۔ خوب سوچ لو کہ تاریخ کے لیے یہی پالیسی مناسب تھی۔ سوائے اس کے کہ کوئی روایت بالبداہت غلط اور باطل ہو ہر وہ روایت لے لی جاوے تاکہ بعد کی تحقیق اور ریسرچ کے لیے ایک بنیادی ذخیرہ محفوظ ہو جائے مگر حدیث کے لیے یہ پالیسی سخت نقصان دہ تھی، کیونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ معیار کو ایسا سخت رکھا جائے کہ خواہ کوئی مضبوط روایت گر جائے مگر بہرحال جو حدیث لی جائے وہ پختہ اور قابلِ اعتماد ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ احادیث کا سارا مجموعہ غلطی سے پاک ہے یا یہ کہ سیرت وتاریخ کا مجموعہ کمزور روایات پر مبنی ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ بالعموم حدیث کا معیار سیرت وتاریخ سے بالا وبلند ہے۔ اور اسی لیے مسلمان مؤرخین میں سے جو لوگ زیادہ محقق گذرے ہیں انہوں نے سیرۃ وتاریخ کے واقعات کے لیے ان روایات کو ترجیح دی ہے جو دینی مسائل کے ضمن میں کتب حدیث میں مروی ہوئی ہیں۔ اور مصنف کتاب ہٰذا کا بھی اس تصنیف میں یہی مسلک رہا ہے۔

کتب اصولِ حدیث

روایت کا جو علم مسلمانوں نے ایجاد کیا جس کے اندر اصول روایت و درایت دونوں شامل ہیں وہ عموماً علم اصولِ حدیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس علم کے متعلق بہت سی تصنیفات پائی جاتی ہیں جن میں متقدمین اور متاخرین ہردو کی تصانیف شامل ہیں مگر آجکل جو کتب اس فن میں زیادہ معروف ومتداول ہیں جن میں اکثر متقدمین کی تحریرات کا خلاصہ آگیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) علوم الحدیث المعروف بمقدمہ ابن صلاح مصنفہ حافظ ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمٰن المعروف بابن صلاح المتوفی ۶۴۳ھ۔

(۲) فتح المغیث فی اصول الحدیث مصنفہ حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی المتوفی ۸۰۵ھ
(۳) شرح الفیۃ العراقی فی اصول الحدیث مصنفہ محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی المتوفی ۹۰۲ھ
(۴) موضوعات کبیر مصنفہ نورالدین ملا علی بن محمد سلطان القاری المتوفی ۱۰۱۶ھ

ان کتب میں روایت و درایت ہر دو کے اصول پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور ہر پہلو کے متعلق متعدد مثالیں دے دے کر بات کو واضح کیا گیا ہے۔ مؤخرالذکر کتاب حقیقۃً موضوع روایتوں کے بیان میں ہے مگر ضمناً اصولِ حدیث کی بحث بھی آجاتی ہے۔

مصطلحاتِ حدیث

فنِ اصولِ حدیث یا علمِ روایت کے ضمنی علوم میں دو علم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اؤلیٰ علم مصطلحات حدیث اور علم اسماء الرجال۔ مقدم الذکر علم میں حدیث کی اصطلاحات کا بیان ہوتا ہے جن سے یہ پتہ لگتا ہے کہ مختلف اعتبار سے حدیث کی کتنی قسمیں ہیں اور ان کے کیا کیا نام ہیں اور ہر حدیث کی ایک قسم دوسری اقسام کے مقابل پر کیا وزن رکھتی ہے۔ اس علم کے ماتحت حدیث کی جو اقسام مختلف جہات سے مقرر کی گئی ہیں، ان میں سے زیادہ معروف یہ ہیں:

متواتر۔ مشہور۔ عزیز۔ غریب۔ شاذ۔ منکر۔ صحیح۔ حسن۔ ضعیف۔ متروک۔ موضوع۔ مرفوع
موقوف۔ مقطوع۔ متصل۔ منقطع۔ معلق۔ مرسل۔ معضل۔ معلل۔ مدلس۔ مضطرب۔ مدرج
قولی۔ فعلی۔ تقریری۔ قدسی وغیرہ وغیرہ۔

اس علم میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں اس وقت زیادہ معروف و متداول یہ ہیں:

(۱) نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر مصنفہ ابوالفضل احمد ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ۔
(۲) الیواقیت والدرر مصنفہ شیخ عبدالرؤف المناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ۔

اسماء الرجال

فنِ اسماء الرجال اس علم کا نام ہے جس میں حدیث و سیرت وغیرہ کے راویوں کے حالاتِ زندگی کو تنقیدی نظر کے نیچے لاکر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے تاکہ جب بھی کوئی روایت سامنے آوے تو اس کے سلسلہ رواۃ کا امتحان کیا جاسکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ علم بہت وسیع اور پھیلا ہوا ہے حتیٰ کہ بقول سر ولیم میور اس علم کے ذریعہ چالیس ہزار راویوں کے حالاتِ زندگی ضبط میں آگئے ہیں[۱] ۔ جو یقیناً دنیا کی تاریخ میں ایک بےنظیر ریکارڈ ہے۔ یہ مجموعہ سرسری حالات کا ذخیرہ نہیں ہے بلکہ صحیح تنقیدی اصول کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ جس میں ہر راوی کی تاریخ ولادت تاریخ وفات، جائے رہائش، حالاتِ زندگی، عادات واطوار، علمی قابلیت، ذہن حافظہ اور سمجھ، دیانت و امانت، طریق روایت کی خصوصیات، استادوں کے نام، شاگردوں کے نام، ہمعصروں کے نام وغیرہ وغیرہ پوری صحت اور تعیین کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

---

[۱] دیباچہ لائف آف محمد صفحہ ۳۸ ۔

سب سے پہلا شخص جس نے اس علم کی طرف باقاعدہ فن کے رنگ میں توجہ کی وہ شعبہ بن الحجاج المتوفی ۱۶۰ھ تھے۔ ان کے بعد امام یحیٰی بن سعید القطان المتوفی ۱۹۸ھ نے اس علم کو اور ترقی دی اور سب سے پہلا مجموعہ تیار کیا۔ بعدہٗ علامہ احمد بن عبداللہ العجلی المتوفی ۲۶۱ھ نے اور امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ نے اس فن میں مفید کتابیں لکھیں اور موخر الذکر نے اپنی تصانیف کا نام کتاب الجرح والتعدیل رکھا۔ مگر اس فن میں متقدمین کی کتب میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتروکین مصنفہ ابو احمد عبداللہ بن محمد ابن عدی المتوفی ۳۶۵ھ تھی۔[1] ان کے علاوہ حافظ عقیلی اور امام دارقطنی وغیرہ نے بھی اس فن میں کتابیں لکھی ہیں مگر افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر کتب اب ناپید ہو چکی ہیں گو بعد کی کتب میں ان سب کے کثرت سے ساتھ حوالے آتے ہیں۔

بعد کی کتب میں سے جو ابتدائی کتب پر مبنی ہیں مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ معروف و متداول ہیں:

(۱) الکمال فی معرفۃ الرجال مصنفہ حافظ عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسی المتوفی ۶۰۰ھ

(۲) تہذیب الکمال فی معرفۃ الرجال مصنفہ حافظ جمال الدین یوسف بن زکی المزی۔ المتوفی ۷۴۲ھ

(۳) میزان الاعتدال فی نقد الرجال (تین جلد) مصنفہ حافظ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد الذہبی۔ المتوفی ۷۴۸ھ

(۴) تہذیب التہذیب (بارہ جلد) مصنفہ حافظ ابو الفضل احمد بن علی بن محمد بن علی بن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ

(۵) استیعاب فی معرفۃ الاصحاب (۲ جلد) مصنفہ حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر القرطبی المتوفی ۴۶۳ھ

(۶) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (۵ جلد) مصنفہ حافظ عزالدین ابو الحسن علی بن محمد بن عبدالکریم المعروف ابن اثیر الجزری المتوفی ۶۳۰ھ۔

(۷) اصابہ فی معرفۃ الصحابہ (۱۰ جلد) مصنفہ حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اوپر کی فہرست میں مؤخر الذکر تین کتابیں دراصل فن اسماء الرجال سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ محض صحابہ کے حالات میں ہیں لیکن چونکہ یہ دونوں علوم آپس میں بڑی حد تک ملتے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کتب کو اس فہرست میں شامل کر لیا ہے۔

کتب حدیث

اقسام کے لحاظ سے روایات کا علم تین قسموں میں منقسم ہے۔ یعنی (۱) حدیث (۲) تفسیر اور (۳) سیرۃ و تاریخ۔ موخر الذکر علم کے ایک حصّہ کو مغازی بھی کہتے

---

[1] کشف الظنون جلد ۲ صفحہ ۳۹۱ ۔

ہیں۔ حدیث روایات کے ایسے مجموعے کا نام ہے جن کی اصل غرض و غایت دینی مسائل کا ضبط ہے خواہ ضمنی طور پر اس میں تفسیری اور تاریخی حصہ بھی آجا دے۔ حدیث میں عموماً وہ روایات درج ہوتی ہیں جن کی سند بالآخر کسی نہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ یعنی آخری راوی یہ بیان کرتا ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یُوں فرماتے سُنا یا یُوں کرتے دیکھا۔ یا میرے سامنے آپ کے سامنے کسی نے یُوں کیا اور آپ نے اُسے نہیں روکا۔ مگر کتب حدیث میں کچھ حصہ ایسی روایات کا بھی آجاتا ہے جو صرف صحابہ کے اقوال و اعمال تک محدود ہوتا ہے جنھیں اصطلاحی طور پر آثار کہتے ہیں۔ حدیث کی کتابیں بے شمار ہیں جو زیادہ تر دوسری اور تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں۔ مگر یہ سب ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ کیونکہ سب محدثین نے ایک سا سخت معیار نہیں رکھا اور نہ ایک سی احتیاط برتی ہے۔ حدیث کی زیادہ معروف کتابیں مع ان کے مختصر حالات و کوائف کے درج ذیل کی جاتی ہیں:

(۱) صحیح بخاری	مصنفہ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری ۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ	یہ سب کتب حدیث میں صحیح ترین کتاب سمجھی گئی ہے۔ امام بخاری صاحب نے چھ لاکھ روایات کے مجموعہ میں سے صرف چار ہزار احادیث چُن کر اس مجموعہ میں درج کی ہیں اور انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے۔ بلاریب ان کا معیار سب محدثین سے بالا و ارفع ہے ؛
(۲) صحیح مُسلم	مصنفہ امام مُسلم بن حجاج ۲۰۴ھ تا ۲۶۱ھ	اس کا درجہ بخاری سے نیچے مگر باقی کتب حدیث سے اوپر سمجھا جاتا ہے۔ جس روایت میں بخاری اور مسلم اتفاق کر لیں اسے متفق علیہ کہتے ہیں جو سب سے مضبوط سمجھی جاتی ہے ؛
(۳) جامع ترمذی (۴) سُنن ابُو داؤد	مصنفہ ابو عیسٰی محمد بن عیسٰی ترمذی ۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ مصنفہ ابو داود سلیمان بن اشعث ۲۰۲ھ تا ۲۷۵ھ	صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے ساتھ اگلی چار کتابیں مل کر صحاح ستہ کہلاتی ہیں اور یہ سب معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا درجہ قریباً اسی ترتیب کے مطابق سمجھا جاتا ہے

(۵) سُنن نسائی	مصنفہ احمد بن شعیب النسائی سنہ ۲۱۵ھ تا سنہ ۳۰۶ھ	جو اس فہرست میں ملحوظ رکھی گئی ہے ۔
(۶) سُنن ابن ماجہ	مصنفہ محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینی سنہ ۲۰۹ھ تا سنہ ۲۷۳ھ	
(۷) مؤطا امام مالک	مصنفہ امام مالک ابن انسؒ سنہ ۹۵ھ تا سنہ ۱۷۹ھ	یہ کتاب بہت بلند پایہ ہے بلکہ بعض نے اسے بخاری کے برابر قرار دیا ہے مگر چونکہ اس کے بیشتر حصّہ کا اسلوب فقہ کے طریق پر ہے، اس لیے اسے حدیث کی کتاب کے طور پر صحاح میں شمار نہیں کیا گیا ورنہ اپنے مرتبہ کے لحاظ سے وہ کسی مجموعہ حدیث سے کم نہیں ۔ امام مالکؒ فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں ۔
(۸) مسند امام ابوحنیفہؒ	مصنفہ امام نعمان بن ثابت ابوحنیفہؒ سنہ ۸۰ھ تا سنہ ۱۵۰ھ	فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے سب سے بلند تر ہیں یہ محدث نہیں تھے اور نہ انھوں نے اس طرف توجہ کی مگر بعض احادیث اپنی فقہ کی بنیاد کے لیے جمع کی ہیں ۔
(۹) مسند امام شافعیؒ	مصنفہ امام محمد بن ادریس شافعیؒ سنہ ۱۰۵ھ تا سنہ ۲۰۴ھ	یہ بھی فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں اور ان کی کتاب اپنی فقہ کی تائید میں چند احادیث کا مجموعہ ہے ۔
(۱۰) مسند احمد	مصنفہ امام احمد بن محمد بن حنبلؒ سنہ ۱۶۱ھ تا سنہ ۲۴۱ھ	یہ بھی فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں مگر ان کی احادیث کا مجموعہ بھی نہایت شاندار ہے اور حدیث کی کتابوں میں غالباً سب سے بڑا ہے مگر صحت

		روایت کا میعار صحاح کے برابر نہیں ہے
(۱۱) سُنن دارمی	مصنفہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی سنہ ۱۸۱ھ تا سنہ ۲۵۵ھ	صحاح ستہ کے بعد اس کا مرتبہ اچھا ہے
(۱۲) معجم کبیر واوسط وصغیر	مصنفہ سلطان بن احمد طبرانی سنہ ۲۶۰ھ تا سنہ ۳۶۰ھ	مشہور محدّث ہیں
۱۳ سنن دارقطنی	مصنفہ علی بن محمد دارقطنی سنہ ۳۰۶ھ تا سنہ ۳۸۵ھ	〃
(۱۴) مستدرک حاکم	مصنفہ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم۔ سنہ ۳۲۱ھ تا سنہ ۴۰۵ھ	〃
(۱۵) متفرق کتب حدیث وسیرۃ	مصنفہ احمد بن حسین بیہقی سنہ ۳۸۴ھ تا سنہ ۴۵۸ھ	〃

مذکورہ بالا محدّثین کے علاوہ بھی ایسے محدّث گذرے ہیں جنھوں نے باوجود بُعدِ زمانہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپؐ کے صحابہ تک روایت کا سلسلہ پہنچا کر احادیث نقل کی ہیں[۱]۔ مگر ہم نے زیادہ معروف محدّثین کے نام بعد کی فہرست میں درج کر دیئے ہیں اور اس فہرست میں بھی متاخرالذکر محدّثین کے مجموعوں میں کیا بوجہ بُعدِ زمانہ اور کیا بوجہ احتیاط کی کمی کے کمزور اور ضعیف روایات کا حصّہ زیادہ آگیا ہے، مگر بہرحال حدیث کا یہی مجموعہ ہے جس سے ایک مؤرخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ و سوانح اور آغازِ اسلام کی تاریخ کے متعلق علی قدر مراتب فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ فی الجملہ احادیث کا مجموعہ سیرت و

[۱] مثلاً ابن حبان۔ سعید بن منصور۔ ابن ابی شیبہ۔ عبدالرزاق۔ ابویعلی۔ ابن عدی۔ عقیلی۔ خطیب بغدادی۔ بزار۔ ابن عساکر۔ ابن ابی حاتم۔ ابن مردویہ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے بعض مؤرخ بھی ہیں ؂

تاریخ کی روایات سے زیادہ پختہ اور زیادہ قابلِ اعتبار ہے اور احادیث کی جو اعلیٰ کتابیں ہیں مثلاً بخاری اور مسلم ان کے مقابلہ پر تو سیرۃ کی روایات کی حیثیت بہت ہی کم ہے ۔

سنّت اور حدیث میں فرق

حدیث کی بحث ختم کرنے سے پہلے سنّت کے متعلق ایک مختصر نوٹ درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ سو جاننا چاہیئے کہ یہ جو عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حدیث اور سنّت ہم معنی الفاظ ہیں، یہ دُرست نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ حدیث اور سُنّت دُو مختلف چیزیں ہیں کیونکہ جہاں حدیث ان لفظی روایات کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے متعلق صحابہ سے تابعین تک اور تابعین سے تبع تابعین تک اور تبع تابعین سے ان کی بعد کی نسل تک پہنچیں اور پھر ائمہ حدیث کی تحقیق و تدقیق کے بعد کتابی صورت میں جمع ہوگئیں وہاں سُنّت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل یعنی تعامل کا نام ہے جو کسی لفظی روایت کے ذریعہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے متحدہ تعامل کے ذریعہ ایک نسل سے دوسری نسل تک اور دُوسری سے تیسری تک اور تیسری سے چوتھی تک پہنچا ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔ مثلاً قرآن شریف میں نماز کا حکم ہے اور اب قطع نظر اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفاصیل کے متعلق کوئی زبانی ہدایات دی تھیں یا نہیں آپؐ نے صحابہ کے سامنے اپنے عمل سے اس کی ساری تفصیلات کرکے دکھا دیں اور عمر بھر اس تعامل کو تکرار کے ساتھ دُہرا دُہرا کر ان کے ذہن نشین کرادیا اور خود اپنی نگرانی میں ان کو نماز کی تفصیلات پر قائم کردیا اور پھر صحابہ کے ذریعہ یہ تعامل تابعین تک پہنچا۔ جنھوں نے صحابہ کی کسی زبانی تشریح سے نہیں بلکہ عملی تعامل سے اس کو صحابہ سے سیکھا اور اسی طرح یہ سلسلہ نیچے چلتا چلا گیا۔ اسی طرح دوسرے مسائل کا حال ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد قرآن شریف اور سنّت پر ہے جو ابتداء سے ہی ایک دُوسرے کے پہلو بہ پہلو چلے آئے ہیں اور حدیث صرف ایک زائد چیز ہے جو علمی تشریح یا ضمنی تائید وغیرہ کے لیے کام آسکتی ہے ورنہ اس پر اسلام کی اصل بنیاد نہیں ہے لیکن غلطی سے بعض لوگوں نے حدیث اور سُنّت کو ایک ہی چیز سمجھ رکھا ہے۔ اس بحث کو ہمارے اس مضمون کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ مگر ہم نے خیال کیا کہ حدیث کے متعلق اس عام غلط فہمی کو اسجگہ دُور کردیا جائے تاکہ ناواقف لوگوں کے دلوں میں یہ شُبہ نہ پیدا ہو کہ گویا اسلام کی بنیاد ایک ایسی چیز پر ہے جو ڈیڑھ دو سو سال بعد ضبط میں آئی ہے۔

کتبِ تفسیر

روایات کا دُوسرا مجموعہ روایتی تفسیر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں چونکہ قرآن شریف کی تشریح کا تعلق ہے جو زیادہ تر علمی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس علم میں بھی حدیث کے برابر احتیاط نہیں برتی گئی۔ مگر بہرحال یہ بھی ایک مفید مجموعہ ہے جس کے متعلقہ حصّوں سے سیرۃ و تاریخ کی تدوین میں فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ کی زیادہ معروف کتابیں جن میں منقولی اور روایتی طریق پر قرآن شریف کی تفسیر درج کی گئی ہے یہ ہیں :

(۱) تفسیر ابن جریر (۲۰ جلد)	مصنفہ امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری ۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ	منقولی تفسیر میں یہ سب سے جامع مجموعہ ہے، مگر اس مجموعہ میں کمزور روایات بھی شامل ہوگئی ہیں۔
(۲) تفسیر ابن کثیر (۱۰ جلد)	مصنفہ حافظ عماد الدین اسمٰعیل بن عمر ابن کثیر ۷۰۰ھ تا ۷۷۴ھ	یہ تفسیر نہایت معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہے جس کے متعلق علامہ زرقانی کا قول ہے کہ اس جیسی اور کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔
(۳) الدر المنثور فی التفسیر بالماثور (۶ جلد)	مصنفہ شیخ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی ۸۴۹ھ تا ۹۱۱ھ	یہ بعد کی تصنیف ہے جس میں رطب و یابس سب کچھ جمع ہوگیا ہے۔

سیرت و تاریخ کی ابتدائی کتب

تیسرا سلسلہ سیرۃ و تاریخ و مغازی کا ہے۔ اس سلسلہ کی غرض و غایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و سوانح اور ابتدائی اسلامی جنگوں اور ابتدائی اسلامی تاریخ کے متعلق روایات جمع کرنا تھی مگر جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ روایتیں بحیثیتِ مجموعی حدیث کی روایتوں سے کمزور ہیں کیونکہ اس سلسلہ کے جمع کرنے والوں کی غرض سیرت و تاریخ کے سارے مواد کو ایک جگہ جمع کر دینا تھی تاکہ کوئی بات ضبط میں آنے سے رہ نہ جائے اور پھر بعد میں آنے والے اس کی چھان بین خود کر لیں جو قرآن شریف اور صحیح احادیث کو سامنے رکھ کر مشکل نہیں ہے۔ اس سلسلہ کی ابتدائی تصنیفات جن میں ہم نے جغرافیہ اور تاریخِ عرب کی کتب بھی شامل کر لی ہیں یہ ہیں؛

(۱) کتاب المغازی	مصنفہ محمد بن مسلم بن شہاب زہری ۵۱ھ تا ۱۲۴ھ	یہ کتاب غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی اور ابتدائی جنگوں کی تاریخ میں سب سے پہلی تصنیف ہے۔ امام زہری تابعین میں سے تھے اور متعدد صحابہ کو دیکھا اور ان کی باتوں کو سُنا تھا۔ نہایت ثقہ

		اور وسیع العلم انسان تھے مگر افسوس کہ ان کی کتاب اب ناپید ہو چکی ہے۔ البتہ بعض کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں اور امام زہری کی زبانی روایات تو اکثر کتابوں میں آتی ہیں اور نہایت معتبر خیال کی جاتی ہیں۔
(۲) المغازی	مصنفہ موسیٰ بن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ	موسیٰ بن عقبہ امام زُھری کے شاگردانِ رشید میں سے تھے اور بعض صحابہ کو دیکھا تھا۔ نہایت محتاط مصنّف تھے اور جو کچھ لیتے تھے جانچ تول کر لیتے تھے۔ حدیث میں امام مالکؒ ان کے شاگرد تھے مگر افسوس کہ ان کی کتاب بھی ناپید ہے۔
(۳) سیرۃ ابن اسحاق	مصنفہ محمد بن اسحاق المتوفی ۱۵۱ھ	ابنِ اسحاق بھی امام زہری کے شاگردوں میں سے تھے اور سیرۃ میں بڑا پایہ رکھتے ہیں۔ انکی کتاب سیرۃ و مغازی میں بطور بنیاد کے سمجھی گئی ہے اور اکثر بعد کے مؤرخین ان کے خوشہ چین ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کی ثقاہت پر شبہ کیا ہے مگر یہ دُرست نہیں؛ البتہ چونکہ اُن کا طبعی میلان سیرۃ کی طرف تھا، اس لیے حدیث کے سخت معیار کے مطابق وہ پورے نہیں اُترتے۔ اسی لیے امام بخاری نے حدیث میں ان سے روایت نہیں لی، لیکن تاریخ میں آزادی سے لی ہے۔ ان کی کتاب عام طور پر نہیں ملتی لیکن ابنِ ہشام کی سیرۃ میں اس کا بیشتر حصّہ اس

		طرح آگیا ہے کہ اصل کتاب کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔
(۴) سیرۃ ابنِ ہشام	مصنفہ عبدالمالک بن ہشام المتوفی ۲۱۳ھ	یہ بہت پائے کے مؤرخ تھے اور نہایت ثقہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی سیرت جو بیشتر طور پر سیرت ابنِ اسحاق پر مبنی ہے۔ بہت جامع اور مکمل تصنیف ہے۔ سیرت کی کتابوں میں ان کی سیرت سب سے زیادہ مقبول و متعارف ہے۔
(۵) کتاب السیرۃ و کتاب المغازی	مصنفہ محمد بن عمر الواقدی ۱۳۰ھ تا ۲۰۷ھ	یہ صاحب بہت وسیع المعلومات مؤرخ تھے۔ مگر چونکہ جھوٹ سچ اور صحیح و سقیم میں کوئی پرہیز نہیں تھا اس لیے اکثر محققین کے نزدیک ان کی تصنیفات بالکل ناقابلِ اعتبار اور ناقابلِ سند سمجھی گئی ہیں ان کے متعلق ہم ایک علیحدہ نوٹ دیں گے۔
(۶) طبقاتِ کبیر	مصنفہ محمد ابن سعد ۱۶۸ھ تا ۲۳۰ھ	ابنِ سعد، واقدی کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور ان کے سیکرٹری بھی تھے مگر باوجود اس نسبت کے خود ثقہ اور معتبر سمجھے گئے ہیں ان کی کتاب بارہ جلدوں میں ہے اور بہت تفصیلی معلومات کا ذخیرہ ہے پہلی دو جلدیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہیں اور باقی آپؐ کے صحابہ کے حالات میں۔ اگر واقدی کی روایتوں کو الگ کر دیا جائے تو یہ کتاب بہت اچھی اور مستند ہے۔

(۷) تاریخ الامم والملوک	مصنفہ ابو جعفر محمد ابن جریر الطبری ۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ	یہ کتاب سیرۃ کی کتاب نہیں بلکہ تاریخ کی کتاب ہے، مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ بھی اس کے اندر شامل ہے، اس لیے اسے سیرت کی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ طبری اسلام کے مشہور اور مستند علماء میں سے تھے اور ان کی کتاب جو بارہ جلدوں میں ہے نہایت جامع تاریخ سمجھی گئی ہے۔ اُنھوں نے ابن اسحاق اور واقدی اور ابن سعد کی بیشتر روایتوں کو جمع کرنے کے علاوہ بہت سی نئی روایتیں بھی درج کی ہیں اور سیرت و تاریخ میں ایک نہایت عمدہ ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔
(۸) شمائل ترمذی	مصنفہ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی ۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ	ترمذی کی حدیث کا ذکر حدیث کی ذیل میں گذر چکا ہے، مگر انہوں نے شمائل نبوی پر ایک علیحدہ رسالہ بھی لکھا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک اور ذاتی عادات و خصائل میں ایک مختصر مگر عمدہ تصنیف ہے۔
(۹) کتاب المعارف	مصنفہ عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ ۲۱۳ھ تا ۲۷۶ھ	یہ کتاب تاریخ عرب اور اسلام کے متعلق معلومات عامہ پر مشتمل ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاص خاص اصحاب کے حالات بھی درج ہیں۔
(۱۰) فتوح البلدان	مصنفہ ابو جعفر احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری۔ المتوفی ۲۷۹ھ	اس کتاب میں اُن فتوحات کا ذکر ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے

		خلفاء کے ہاتھ پر ہوئیں۔ مشہور اور متداول کتاب ہے۔
(۱۱) کتاب الخراج	مصنفہ قاضی ابویوسف یعقوب بن ابراہیم المتوفی ۱۸۲ھ	ابویوسف مشہور فقیہہ گذرے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے ان ٹیکسوں وغیرہ کے مسائل اور تاریخ بیان کی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کی طرف سے مفتوح قبائل پر لگائے جاتے تھے۔
(۱۲) مُروج الذہب	مصنفہ ابوالحسن علی بن حسین مسعودی المتوفی ۳۴۶ھ	اس کتاب میں دُنیا کی مختلف اقوام و ممالک کی تاریخ سے ابتداء کر کے بالآخر عرب کے حالات درج کرتے ہوئے خلفائے بنو عباس تک اسلامی تاریخ کو مکمل کیا گیا ہے۔
(۱۳) تاریخ مکہ	مصنفہ ابوالولید محمد بن عبدالکریم ازرقی۔ المتوفی ۲۲۳ھ	مکہ کی مستند اور ابتدائی تاریخ ہے۔
(۱۴) صفۃ جزیرۃ العرب	مصنفہ ابو محمد حسن بن احمد بن یعقوب الہمدانی المعروف بابن حائک[1] المتوفی ۳۳۴ھ	جغرافیہ عرب کی ابتدائی اور مُستند کتاب ہے۔

یہ وہ ذخیرہ ہے جو تاریخی لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ابتدائی اسلامی تاریخ کا اصل مأخذ اور

[1] اس مصنف کی ایک کتاب اکلیل بھی ہے جو دس جلدوں میں ہے اور قبیلۂ حمیر کے حالات اور تاریخ یمن کے علاوہ بہت سے دُوسرے مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ دیکھو کشف الظنون زیر نام اکلیل ؎

منبع ہے اور بعد کی سب کتابیں اسی منبع کی خوشہ چین ہیں، لیکن جیسا کہ اُوپر ظاہر کر دیا گیا ہے یہ سب کتب سیرت کی کتابیں نہیں اور نہ ہی صحیح معنی میں وہ سب کی سب تاریخ کی کتابیں ہیں مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور آغازِ اسلام کی تاریخ کے ساتھ ان کتب کے مضامین کو ایک طبعی جوڑ ہے، اس لیے ہم نے انہیں سیرۃ کی کتابوں میں شامل کر لیا ہے۔ باقی جیسا کہ اوپر اشارہ کر دیا گیا ہے خالص سیرت کی اصل ابتدائی کتابیں جو اس وقت پائی جاتی ہیں، وہ صرف چار ہیں۔ یعنی سیرت ابن ہشام۔ کتاب السیرت والمغازی لواقدی۔ طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری۔ لیکن ان میں سے چونکہ واقدی مطعُون و متروک ہے، اس لیے عملاً ماخذ صرف تین رہ جاتے ہیں۔ یعنی ابنِ ہشام۔ ابنِ سعد اور طبری۔ اور اس میں شُبہ نہیں کہ قرآن و حدیث کو چھوڑ کر سیرت کی حقیقی بنیاد انہیں تین کتابوں پر ہے۔

واقدی کے متعلق ایک مختصر نوٹ

واقدی کے متعلق ہمیں کچھ علیٰحدہ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن بدقسمتی سے یورپین مصنفین نے اسے اتنا نوازا ہے کہ اس کی حقیقت کے اظہار کے لیے ایک علیٰحدہ نوٹ ضروری ہو گیا ہے۔ جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے، واقدی کا زمانہ سنہ ۱۳۰ھ سے لیکر سنہ ۲۰۷ھ تک تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ کے لحاظ سے وہ کسی دُوسرے موٴرخ سے کم محفوظ پوزیشن میں نہیں تھا۔ مگر یہ بات کسی شخص کے ذاتی صفات و عادات کا رُخ بدل نہیں سکتی اور حقیقت یہ ہے کہ واقدی اپنی وسعتِ علم کے باوجود ایک بالکل ناقابلِ اعتبار اور غیر ثقہ شخص تھا اور محققین نے اسے بالاتفاق جھوٹا اور دروغ گو قرار دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی ساری روایتیں غلط اور جھوٹی ہوتی تھیں۔ دُنیا میں جھوٹے سے جھوٹا انسان بھی ہمیشہ جھوٹ نہیں بولتا بلکہ حق یہ ہے کہ ایک جھوٹے آدمی کی بھی اکثر باتیں سچی اور واقعہ کے مطابق ہوتی ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس بات میں بھی ہرگز کوئی شُبہ نہیں ہو سکتا کہ جو شخص جھُوٹ بولنے کا عادی ہو اس کی کوئی بات بھی قابلِ حجت نہیں رہتی۔ واقدی کے متعلق یہ مسلّم ہے کہ وہ ایک بہت عالم انسان تھا اور اس کے تاریخی معلومات اتنے وسیع تھے کہ اس زمانہ میں کسی اور موٴرخ کے کم ہوں گے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وسعتِ معلومات نے ہی اس کے سر کو پھرا دیا تھا کہ وہ کسی بات کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرنے کی بجائے خود اپنی طرف سے بات بنا کر بیان کر دیا کرتا تھا؛ چنانچہ اس کے متعلق ایک محقق کا یہ بہت اچھا مقولہ ہے کہ "اگر واقدی سچا ہے تو بے نظیر ہے۔ اور اگر جھوٹا ہے تو تب بھی عدیم المثال ہے۔"[1] مگر بدقسمتی سے واقدی کی یہی طلاقتِ لسان اور یہی وسعتِ علم ہمارے یورپین مصنفین کو اس کا دلدادہ بنا رہی ہے۔ انہیں اس بات سے غرض نہیں کہ واقدی سچا تھا یا جھوٹا۔ اس کی عادت ایک محتاط محدث کی طرح تحقیق کر کے بات کرنے کی تھی یا کہ یُونہی واہی تباہی کہتے جانے کی۔ ان کو صرف اس بات سے غرض ہے کہ واقدی

---

[1] تہذیب التہذیب حالاتِ واقدی۔

جو کچھ کہتا ہے تفصیل سے کہتا ہے اور یوں کہتا ہے جیسے کوئی شخص پاس بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ اگر اس کا کوئی قول کسی صحیح اور مضبوط روایت کے خلاف ہے تو ہوا کرے اُن کے لیے سب روایتیں برابر ہیں اور سوائے اپنے دماغ کی شہادت کے اور کوئی شہادت قابلِ قبول نہیں۔ مُسلمان محققین نے جو اپنی عمریں کھپا کھپا کر ہر روایت سے بال کی کھال نکالی ہے اور ہر راوی کے صحیح صحیح حالات معلوم کرکے علمِ روایت کے لیے ایک سچا ترازو مہیا کر دیا ہے اہلِ مغرب کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ بہرحال ہم کسی کے قلم اور زبان کو تو روک نہیں سکتے مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ واقدی کے متعلق ان مُسلمان محققین نے جن کی دیانت و امانت اور اصابتِ رائے کو سب نے تسلیم کیا ہے کیا رائے دی ہے:

نام رائے دہندہ	الفاظ جن میں رائے کا اظہار کیا گیا ہے	ترجمہ اُردو
امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ ۱۶۱ھ تا ۲۴۱ھ	هُوَ كَذَّابٌ يُقَلِّبُ الْحَدِيْثَ	واقدی ایک پرلے درجہ کا جھوٹ بولنے والا شخص ہے جو روایتوں کو بگاڑ بگاڑ کر بیان کرتا ہے
ابو احمد عبداللہ بن محمد المعروف بابن عدی ۲۷۷ھ تا ۳۶۵ھ	أَحَادِيْثُهُ غَيْرُ مَحْفُوْظَةٍ وَالْبَلَاءُ مِنْهُ	واقدی کی روایتیں قابلِ اعتبار نہیں ہیں اور یہ خرابی خود اس کے نفس کی طرف سے ہے۔
ابو حاتم محمد بن ادریس ۱۹۵ھ تا ۲۷۷ھ	يَضَعُ الْحَدِيْثَ	واقدی اپنے پاس سے جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر بیان کیا کرتا تھا۔
علی بن عبداللہ بن جعفر المعروف بابن المدینی ۱۶۱ھ تا ۲۳۴ھ	يَضَعُ الْحَدِيْثَ لَا أَرْضَاهُ فِيْ شَيْءٍ	واقدی جھوٹی روایتیں بناتا تھا میرے نزدیک وہ کسی جہت سے بھی قابلِ قبول نہیں۔
امام علی بن محمد دارقطنی ۳۰۶ھ تا ۳۸۵ھ	فِيْهِ ضُعْفٌ	واقدی کی روایتیں ضعیف ہوتی ہیں۔
اسحاق بن ابراہیم المعروف بابن راہویہ ۱۶۱ھ تا ۲۳۸ھ	هُوَ عِنْدِيْ مِمَّنْ يَضَعُ الْحَدِيْثَ	میرے نزدیک واقدی جھوٹی روایتیں گھڑنے والوں میں سے ایک ہے[1]

[1] میزان الاعتدال فی نقد الرجال لعلامہ ذہبی۔

امام بخاری علیہ الرحمۃ سنہ ۱۹۴ھ تا سنہ ۲۵۶ھ	مَتْرُوْكُ الْحَدِيْثِ	واقدی اس قابل نہیں ہے کہ اس سے کوئی روایت لی جائے۔
امام یحییٰ بن معین سنہ ۱۸۵ھ تا سنہ ۲۳۳ھ	لَيْسَ بِشَيْءٍ كَانَ يُقَلِّبُ	واقدی اہلِ علم کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ وُہ حدیثوں کو بگاڑ بگاڑ کر بیان کیا کرتا تھا۔
امام شافعی علیہ الرحمۃ سنہ ۱۵۰ھ تا سنہ ۲۰۴ھ	كُتُبُ الْوَاقِدِيْ كُلُّهَا كِذْبٌ كَانَ يَضَعُ الْأَسَانِيْدَ	واقدی کی سب کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں۔ وُہ اپنے پاس سے جھوٹی سندیں گھڑ لیا کرتا تھا۔
امام ابوداؤد سجستانی سنہ ۲۰۲ھ تا سنہ ۲۷۵ھ	لَا أَكْتُبُ حَدِيْثَهُ۔ إِنَّهُ كَانَ يَفْتَعِلُ الْحَدِيْثَ	میرے نزدیک واقدی کی روایات مقبول نہیں، وُہ اپنے پاس سے حدیثیں گھڑ لیا کرتا تھا
امام نسائی علیہ الرحمۃ سنہ ۲۱۵ھ تا سنہ ۳۰۳ھ	اَلْوَاقِدِيْ مِنَ الْكَذَّابِيْنَ الْمَعْرُوْفِيْنَ بِالْكِذْبِ	واقدی ایسے جھوٹے لوگوں میں سے تھا، جن کا جھوٹ ظاہر اور عیاں ہے اور اُسے سب جانتے ہیں۔
محمد بن بشار بندار سنہ ۱۶۷ھ تا سنہ ۲۵۲ھ	مَا رَأَيْتُ أَكْذَبَ مِنْهُ	مَیں نے واقدی سے بڑھ کر کوئی جھوٹا نہیں دیکھا۔
امام نووی المتوفی سنہ ۶۷۶ھ	ضَعِيْفٌ بِاتِّفَاقِهِمْ	واقدی سب محققین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف الروایت ہے۔

علامہ ذہبی۔ المتوفی ۷۴۸ھ	اِسْتَقَرَّ الْاِجْمَاعُ عَلٰی وَهْنِ الْوَاقِدِی	سب محققین نے واقدی کے کمزور ہونے کے متعلق اجماع کیا ہے[1]۔
قاضی احمد بن محمد بن ابراہیم المعروف بابن خلکان۔ المتوفی ۶۸۱ھ	ضَعَّفُوْهُ فِی الْحَدِیْثِ وَ تَکَلَّمُوْا فِیْهِ	محققین نے واقدی کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور اس پر بہت اعتراض کئے ہیں[2]۔
علامہ زرقانی المتوفی ۱۱۲۲ھ	اَلْوَاقِدِی لَا یُحْتَجُّ بِهٖ اِذَا انْفَرَدَ فَکَیْفَ اِذَا خَالَفَ۔	واقدی اگر کسی بات کے بیان کرنے میں اکیلا ہو تو محققین کے نزدیک اس کی روایت قابلِ حجت نہیں ہے۔ پھر اس پر خود قیاس کر لو کہ ایسی بات میں اس کی روایت کا کیا وزن ہو سکتا ہے جو وُہ دُوسروں کے خلاف کہتا ہو[3]۔

یہ وُہ شہادت ہے جو مسلمان محققین نے جن میں بہت سے خود واقدی کے ہمعصر تھے۔ پوری پوری تحقیق کے بعد دی ہے۔ اب ہمارے یُورپین مصنفین خود سوچ لیں کہ ان کا دل پسند مؤرخ کس شان کا انسان ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ واقدی کی ہر روایت غلط ہے۔ یقیناً اس کی روایتوں کا بیشتر حصہ صحیح ہوگا۔ مگر جس شخص کی صداقت و عدالت کا یہ حال ہے جو اُوپر بیان کیا گیا ہے وہ اپنی کسی روایت میں بھی جس میں وہ اکیلا راوی ہے یا جس میں وُہ دُوسرے راویوں کے خلاف بات کہتا ہے کسی عقلمند کے نزدیک قابلِ حجت نہیں سمجھا جا سکتا۔ واللہ اعلم۔

بہرحال ہماری تحقیق میں محمد بن عمر واقدی باوجود ابتدائی مؤرخوں میں ہونے کے ہرگز قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ اور جہاں تک خالص سیرۃ کی کتب کا تعلق ہے صرف ابنِ ہشام اور ابنِ سعد اور ابنِ جریر طبری ہی، وُہ تین ابتدائی مؤرخ ہیں جن کی کتب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ و سوانح کی بنیاد سمجھی جانی چاہیے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ان مؤرخین کی ہر روایت دُرست اور صحیح ہے ایسا دعویٰ مؤرخین تو درکنار محدثین کے متعلق بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ یہ تین مؤرخ عموماً اپنی ذات میں قابلِ اعتماد ہیں اور

[1] تہذیب التہذیب لعلامہ ابن حجر ۔ [2] وفیات الاعیان لقاضی ابن خلکان ۔ [3] شرح مواہب اللدنیہ لعلامہ زرقانی جلد ا

خواہ بے احتیاطی یا سَند کی کمزوری کی وجہ سے ان کی بعض روایتیں بھی غلط اور نادُرست ہوں مگر بہرحال وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اصل حالل سمجھے جا سکتے ہیں؛ البتہ ان کی تائید میں یا بعض ضمنی مسائل کے حل کے لیے مذکورہ بالا فہرست کی دُوسری تاریخی کتب بھی کام دے سکتی ہیں۔

متاخرین کی کتب

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ باقی جتنی بھی کتابیں سیرۃ و تاریخ اسلام کے متعلق پائی جاتی ہیں وُہ خواہ کیسی ہی مفید اور جامع ہوں وہ سیرت میں اصل ماخذ نہیں سمجھی جا سکتیں، کیونکہ انھوں نے جو کچھ لیا ہے مندرجہ بالا کتب سے لیا ہے پس انہیں کسی تشریح کی تائید میں یا سہولت کی غرض سے تو پیش کیا جا سکتا ہے، مگر سَند کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف کتاب ہذا نے بھی اپنی اس تصنیف میں جہاں کہیں کسی بعد کی کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ صرف سہولت کے خیال سے دیا ہے تاکہ متفرق حوالہ جات کی بجائے ایک حوالہ پر ہی اکتفا ہو سکے، لیکن ایسا حوالہ ہمیشہ اس تسلی کے بعد دیا گیا ہے کہ اس کا اصل ابتدائی کتب میں موجود ہے باایں ہمہ متاخرین کی کتب بھی بڑی قدر و قیمت کی چیز ہیں، کیونکہ اُن میں نہایت محنت و جانفشانی سے اصل کتب تاریخ و حدیث کی انتہائی وَرق گردانی کے بعد ایک قیمتی ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے اور بعض صُورتوں میں ایسا بھی ہے کہ ایک اصل کتاب تو اب ناپید ہے، لیکن کسی بعد کے مؤرخ کی کتاب میں اس کی کسی روایت کے آجانے سے اس کا یہ حصّہ محفوظ رہ گیا ہے اسی طرح ایک محدود دائرہ کے اندر بعض متاخرین کی کتب بھی اصل ماخذ کا کام دے جاتی ہیں بشرطیکہ وُہ خود معتبر اور مستند ہوں۔ بہرحال متاخرین کی کتب سیرۃ و تاریخ میں سے مندرجہ ذیل کتب قابل ذکر ہیں:

کتاب	مصنف	کیفیت
(۱) الروض الانف	مصنفہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ سہیلی ۵۰۸ھ تا ۵۸۱ھ	یہ کتاب دُو جلدوں میں ہے اور سیرۃ ابنِ ہشام کی شرح کے طور پر لکھی گئی ہے نہایت معتبر اور مستند کتاب ہے۔
(۲) تاریخ الکامل	مصنفہ حافظ ابن اثیر الجزری ۵۵۵ھ تا ۶۳۰ھ	یہ کتاب بارہ ضخیم جلدوں میں ہے اور زیادہ تر طبری سے ماخوذ ہے اور عمدہ صورت میں مُرتّب شدہ ہے۔ اصل سیرۃ کا حصّہ صرف دُو جلد میں آجاتا ہے۔

کتاب	مصنف	کیفیت
(۳) تاریخ الخمیس فی احوال انفس النفیس	مصنفہ حسین بن محمد بن حسن دیار بکری۔ المتوفی ۹۶۶ھ	یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور بہت سی کتب کے معلومات کا مجموعہ ہے جو دلکش صورت میں مُرتب کیا گیا ہے۔
(۴) شرح مواہب اللدنیہ	مصنفہ علامہ محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی المتوفی ۱۱۲۲ھ	یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے جو سب کی سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ سے متعلق ہیں۔ نہایت جامع اور مستند کتاب ہے اور انتہائی تحقیق سے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں سیرۃ کی روایتوں کے علاوہ احادیث کے حوالے بھی کثرت کے ساتھ درج ہیں۔ خاکسار کی رائے میں اس کتاب سے بڑھ کر کوئی جامع اور محققانہ مجموعہ سیرۃ میں نہیں پایا جاتا۔
(۵) انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون	مصنفہ علی بن برہان الدین الحلبی ۹۷۵ھ تا ۱۰۴۴ھ	یہ کتاب جو تین جلدوں میں ہے اور عرف عام میں سیرۃ حلبیہ کے نام سے مشہور ہے نہایت جامع کتاب ہے مگر افسوس کہ ترتیب چنداں دلکش نہیں ہے۔
(۶) مُعجم البلدان	مصنفہ ابوعبداللہ یاقوت بن عبداللہ الحموی المتوفی ۶۲۳ھ	یہ کتاب دس جلدوں میں ہے اور جغرافیہ کے نہایت مفصل معلومات پر مشتمل ہے۔

ان کے علاوہ سیرۃ کازرونی ۶۹۴ھ، سیرۃ مغلطائی ۷۶۲ھ، سیرۃ دمیاطی ۷۰۵ھ، سیرۃ خلاطی ۷۰۸ھ سیرۃ ابن ابی طی ۶۳۰ھ، شرف المصطفیٰ نیشاپوری ۴۰۶ھ، اکتفاء ۶۳۴ھ۔ عیون الاثر لابن سید الناس ۷۳۴ھ، نور النبراس شرح عیون الاثر ۸۴۱ھ، کشف اللثام ۸۵۵ھ، مواہب اللدنیہ ۹۲۳ھ، سیرۃ ابن عبدالبر ۴۶۳ھ، شرف المصطفیٰ ابن جوزی ۵۹۷ھ، تاریخ ابوالفداء ۷۳۲ھ وغیرہ بہت سی اور کتابیں ہیں مگر

ان میں سے کئی ناپید ہیں اور جو موجود ہیں وہ عموماً اس حیثیت کی نہیں ہیں کہ مندرجہ بالا کُتب کے ہوتے ہوئے کسی سند یا تشریح میں پیش کی جا سکیں۔

خلاصہ بحث خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ابتدائی تاریخ اسلام کے لیے مندرجہ ذیل اصول ماخذ سمجھے جاتے ہیں :

(۱) قرآن شریف (۲) کُتب تفسیر منقولہ (۳) کتب حدیث (۴) کتب سیرۃ و تاریخ و مغازی[1]۔

ان کے باہمی مدارج اسی ترتیب سے واقع ہیں جس میں کہ انہیں اُوپر درج کیا گیا ہے یعنی سب سے زیادہ مضبوط اور سب سے زیادہ یقینی ماخذ جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن شریف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں آہستہ آہستہ کر کے نازل ہوا اور ساتھ ساتھ ضبطِ تحریر میں آ تا گیا۔ یہ وُہ کلید عمومی (ماسٹر کی[2]) ہے جس سے سیرۃ رسُولؐ اور تاریخ اسلام کی ہر اُلجھن یقینی صحت کے ساتھ کھولی جا سکتی ہے۔ دُوسرے درجہ پر حدیث ہے جس کے سلسلہ روایت میں محدثین نے اپنی طرف سے بڑی احتیاط کے ساتھ کام لیا ہے مگر پھر بھی بہرحال وہ قرآن شریف کی قطعیت کو نہیں پہنچتی اور بعض کمزور روایتیں اس مجموعہ میں راہ پا گئی ہیں۔ تیسرے درجہ پر وہ تفسیری روایات ہیں جو قرآن شریف کی تشریح و توضیح میں وارد ہوئی ہیں، مگر ان میں کمزور روایتوں کا حصّہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ چوتھے درجہ پر سیرۃ و تاریخ کی ابتدائی کتابیں ہیں جو تاریخی لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کی اصل بنیاد ہیں مگر بدقسمتی سے یہی وہ ذخیرہ ہے جس میں کمزور اور ضعیف روایتوں نے زیادہ دخل پایا ہے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار کا یہ پہلا فرض ہے کہ سیرۃ و تاریخ کی روایتوں کی جرح و تعدیل کے لیے قرآن شریف و حدیث کی شمع کو ہر وقت اپنے ہاتھ میں رکھے ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح کا صحیح مُرقّع کبھی بھی تیار نہیں ہو سکے گا۔ اس اصولی بنیاد کے قائم کرنے کے بعد ہم اپنے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

وما توفیقنا الّا باللہ و نرجو منہ خیرًا

---

[1] مختلف علوم و فنون میں اسلامی تصنیفات اور ان کے مصنفین کے حالات معلوم کرنے کے لیے دو کتابیں بہت مفید اور قابلِ قدر ہیں۔ یعنی کتاب الفہرست مصنفہ ابن ندیم اور کتاب کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون مصنفہ علامہ ملا کاتب چلپی۔ ان کتب سے اکثر اسلامی تصنیفات کا خواہ وہ کسی فن میں ہوں اور خواہ وہ ابتک محفوظ ہوں یا ناپید ہو چکی ہوں اور ان کے مصنفین کے حالات کا پتہ چل سکتا ہے۔ اسی قسم کی ایک مُستند کتاب وفیات الاعیان مصنفہ قاضی احمد بن محمد بن ابراہیم ابن خلکان ہے جس میں جملہ مشاہیر اسلام کے مختصر حالات ترتیب وار درج کئے گئے ہیں۔

[2] MASTER KEY

عرب کا مُلک اور اُس کے باشندے

محلِ وقوع اور حُدودِ اربعہ

برِاعظم ایشیا کے نقشہ پر اگر آپ نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے جنوب مغرب میں ایک جزیرہ نما واقع ہے جو وسعتِ رقبہ کے لحاظ سے دُنیا کے تمام جزیرہ نماؤں میں سب سے بڑا ہے۔ یہ عرب کا ملک ہے، جہاں اسلام پیدا ہوا اور جہاں اس نے اپنی طفولیّت کے ایام گذارے۔ عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا نام عرب اس لیے پڑا ہے کہ عربی زبان اصول فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض محققین عربی کو اُمّ الالسنہ یعنی تمام زبانوں کی ماں قرار دیتے ہیں[1]۔ اور چونکہ لفظ عرب کے روٹ میں فصاحت و بلاغت کے معنے پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس زبان کے بولنے والی قوم اور ملک کا نام عرب مشہور ہو گیا ہے۔ ایک دُوسرے گروہ کا خیال ہے کہ غیر آباد اور جنگلی حصّہ کی زیادتی کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا ہے۔ کیونکہ عرب کے معنے ایک غیر ذی زرع علاقہ کے بھی ہیں۔

جائے وقوع کے لحاظ سے عرب کا ملک قریبًا نصف منطقہ حارہ میں واقع ہے اور نصف منطقہ معتدلہ میں۔ گویا خطِ سرطان اس کے وسط سے گذرتا ہے۔ عرب کی جنوبی اور شمالی حدود علی الترتیب ۱۳ عرض بلد شمالی اور ۳۲ عرض بلد شمالی ہیں اور غربی اور شرقی حدود علی الترتیب ۳۳ اور ۶۰ طول بلد شرقی ہیں۔

حدودِ اربعہ عرب کی یہ ہیں۔ مشرق میں خلیج فارس اور خلیج عمّان۔ مغرب میں بحرِ احمر ہے۔ جنوب میں بحرِ ہند ہے اور شمال میں شام اور عراق ہیں۔

شکل اور رقبہ

عرب کی شکل ایک بے قاعدہ مستطیل کی ہے جس کے تین طرف پانی ہے اور ایک طرف خشکی۔ ساحل کی لمبائی، ملک کی وسعت کے لحاظ سے بہت کم ہے جس کا لازمی نتیجہ عمدہ بندرگاہوں کی کمی ہے۔

عرب کا رقبہ تقریبًا بارہ لاکھ مربع میل ہے اور طول اوسطًا سولہ سو میل ہے اور عرض اوسطًا سات سو میل ہے۔ گویا وسعت کے لحاظ سے عرب دُنیا کے بڑے مُلکوں میں سے ہے لیکن آبادی پر نظر ڈالیں تو بعض چھوٹے سے

---

[1] دیکھو منن الرحمٰن مصنفہ مقدس بانی سلسلہ احمدیہ قادیان۔

چھوٹے ملک بھی اس سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں؛ چنانچہ موجودہ زمانہ میں بھی عرب کی مجموعی آبادی اسّی لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ آگے ظاہر ہو جائے گی۔

سطح زمین سطح زمین اور نوعیتِ اراضی کے لحاظ سے ماہرانِ جغرافیہ عرب کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اوّل۔ ساحلی علاقہ جو ہموار زمین پر مشتمل ہے اور باقی علاقوں کی نسبت معتدل ہے۔ دُوسرے پہاڑی علاقہ جس کے درمیان کی وادیاں گویا ملک کی جان ہیں۔ اور تیسرے صحرائی علاقہ جو بوجہ ریگستان ہونے کے عموماً بنجر اور غیر آباد ہے۔

عرب کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ شمالاً جنوباً پہاڑوں کا ایک وسیع سلسلہ چلا گیا ہے جسے جبل السراۃ کہتے ہیں۔ اس پہاڑی سلسلہ کی بعض چوٹیاں آٹھ ہزار بلکہ دس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچتی ہے مگر اوسطاً بلندی بہت کم ہے۔ اس سلسلہ کے قریباً وسط سے ایک اور پہاڑی سلسلہ جو دراصل کئی پہاڑی سلسلوں سے مرکب ہے اور شمالاً جنوباً بھی دُور تک پھیلا ہوا ہے، عرب کو دو ٹکڑوں میں کاٹتا ہوا ملک کے مشرقی ساحل کی طرف نکل گیا ہے۔ اس وسیع علاقہ کو جو عرب کے وسط میں واقع ہے اور سطح سمندر سے خاصہ اونچا ہے۔ سطح مرتفع نجد کہتے ہیں۔ اس کی اوسط بلندی چار ہزار فٹ سمجھی جا سکتی ہے۔ سطح مرتفع نجد کے شمال اور جنوب اور کچھ مشرق میں نہایت وسیع صحرا واقع ہیں۔ عرب کا شمالی صحرا بالآخر شمال میں صحرائے شام سے جا ملتا ہے اور جنوبی صحرا جو وسعت میں بہت بڑا ہے اور خالص ریگستان ہے الربع الخالی کے نام سے مشہور ہے۔ عرب کے جنوب اور جنوب مشرق میں بھی خاصے اونچے پہاڑی سلسلے ہیں چنانچہ عمان کی بعض چوٹیاں دس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچتی ہیں۔

عرب میں قابلِ ذکر دریا کوئی بھی نہیں ہاں وادیاں اور برساتی نالے ہیں جو بارش کے وقت بہہ نکلتے ہیں اور بعض اوقات سیلاب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، مگر عام طور پر پانی کی اس قدر قلت ہے کہ بعض جگہ سینکڑوں میل تک پانی نہیں ملتا۔ کہیں کہیں چشمے ہیں اور انہی پر تمام آبادی کی سیرابی کا دارو مدار ہے۔ ایسے چشمے جن کے اردگرد درخت اور باغات لگائے جاتے ہیں اور ان کے چاروں طرف میل ہا میل تک بنجر صحرا ہوتا ہے نخلستان کہلاتے ہیں جو عرب میں ایک خاص نعمت سمجھے جاتے ہیں۔ عرب میں یمن کا علاقہ سب سے زیادہ زرخیز اور شاداب ہے اور دُوسرے علاقہ جات کی نسبت اس میں نالوں اور چشموں کی بھی کثرت ہے۔ اسی طرح مکہ سے جنوب مشرق کی طرف بیس میل کے فاصلہ پر طائف کا علاقہ بھی ایک زرخیز اور خوشگوار علاقہ ہے جس میں اعلیٰ درجہ کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

آب و ہوا ماہرینِ جغرافیہ جانتے ہیں کہ عرب کو بیرونی ہوائیں دو ہی طرف سے پہنچ سکتی ہیں۔ یعنی شمال مشرق اور جنوب مغرب سے۔ مگر عرب کی ان دونوں طرفوں میں گویا خشکی ہی خشکی ہے، اس لیے یہ ہوائیں بھی لازماً خشک ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں عموماً بارش کی بہت قلت ہے۔ ہاں پہاڑی علاقے کچھ نہ کچھ پانی ان ہواؤں سے بھی نچوڑ لیتے ہیں۔ اور اس طرح ان علاقوں میں کچھ بارش ہو جاتی ہے۔

خطِ سرطان کا ملک کے وسط سے گذرنا بھی اس کی صحرائی حالت اور کمی بارش کی وجہ بتلا رہا ہے کیونکہ جیسا کہ جغرافیہ دانوں سے مخفی نہیں ایسا علاقہ دائمی ہواؤں کے لحاظ سے سکون کا منطقہ ہوتا ہے پس عام طور پر یہی کہا جائے گا کہ عرب ایک بہت خشک ملک ہے اور چونکہ کیا بوجہ اپنے محلِ وقوع کے اور کیا بلحاظ نوعیتِ اراضی کے عرب عموماً ایک بہت گرم ملک ہے۔ اس لیے اس کی آب و ہوا بحیثیت مجموعی گرم اور خشک کہلائے گی۔

عرب میں رات اور دن کے درجہ حرارت میں بہت فرق ہوتا ہے جس کا باعث ریت کی کثرت ہے جو دن کے وقت خوب تپتی ہے اور رات کو بہت جلد اپنی گرمی چھوڑ کر خوب ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ شبنم کی کثرت بھی اسی وجہ سے ہے۔ عرب میں بعض اوقات ایک قسم کی گرم ہوا چلتی ہے جسے سموم کہتے ہیں۔ جب یہ ہوا چلتی ہے تو بالکل اندھیرا کر دیتی ہے اور اس میں اس قدر ریت اُڑتی ہے کہ بعض اوقات اسکی وجہ سے جان اور مال کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ موسم سرما میں ملک کے بعض حصّوں میں کافی سردی پڑتی ہے؛ چنانچہ ہم آگے چل کر پڑھیں گے کہ جس موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ خندق پیش آیا اس میں مدینہ میں سردی کی اس قدر شدّت تھی کہ لوگ سردی سے ٹھٹھرے جاتے تھے اور رات کو بستر سے اُٹھنا غیر معمولی ہمّت چاہتا تھا۔ مگر یہی علاقہ گرمیوں میں بھٹی کی طرح تپتا تھا۔

پیداوار

نباتاتی پیداوار کے لحاظ سے عرب کا ملک ایک نہایت ہی غریب ملک ہے بعض جگہ سینکڑوں میل تک سبزی کا نشان تک نہیں ملتا اور ملک کا بیشتر حصّہ خشک پہاڑیوں اور بنجر صحراؤں سے بھرا ہوا ہے۔ سب سے بڑی پیداوار کھجور ہے جو قریباً سارے آباد ملک میں ہوتی ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔ عربوں کی اصل اور بڑی خوراک جس پر ان کا گذارہ ہے یہی ہے اور اس سے وُہ کئی قسم کی اشیاء تیار کرتے ہیں۔ عرب کے بعض حصّوں میں دُوسرے پھل بھی ہوتے ہیں اور جہاں پانی میسّر ہے لوگوں نے اپنے باغ لگا رکھے ہیں۔ حجاز میں طائف اپنے باغات کے لیے خاص شہرت رکھتا تھا اور اب بھی رکھتا ہے۔

وُہ علاقے جہاں کھیتی باڑی ہو سکتی ہے مثلاً بعض ساحلی علاقے اور پہاڑوں کی وادیاں وغیرہ۔ وہاں بعض قبائل کھیتی باڑی کر کے اپنے لیے کچھ غلّہ پیدا کر لیتے ہیں؛ چنانچہ جَو اور جوار کہیں کہیں بوئے جاتے ہیں۔ کچھ گندم بھی ہو جاتی ہے۔ لوبیا اور دالیں اکثر جگہ ہوتی ہیں۔ بعض ترکاریاں بھی پیدا کی جاتی ہیں اور قہوہ اور گرم مصالحہ جات بھی ہوتے ہیں۔ بارانی علاقوں میں گھاس وغیرہ اچھا اُگ آتا ہے۔ یہ علاقے جانوروں کے واسطے چراگاہ کا کام دیتے ہیں۔ تمام قبائل کی اپنی اپنی چراگاہیں الگ الگ مقرر ہیں۔ سطح مرتفع نجد خصوصاً چراگاہوں کا مرکز ہے۔

حیوانی پیداوار کے ضمن میں تین جانور خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ یعنی اُونٹ، گھوڑا، اور گدھا۔ اونٹ تو گویا عرب کی ضروریاتِ زندگی کا حصّہ ہے۔ اس کے بغیر عرب جیسے ملک میں سفر کرنا قریباً محال ہے۔ ضرورت کے وقت اس کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ عرب کا گھوڑا بعض خوبیوں کی وجہ سے دُنیا کے گھوڑوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ عرب لوگ اسے بہت عزیز رکھتے ہیں اور عام طور پر اس کی نسل باہر جانے نہیں دیتے۔

نجدی گھوڑا عرب میں خاص قدر و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ گدھا بھی عام ہے اور سواری کے کام میں استعمال ہوتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب اس کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ عرب میں بھیڑ بکریاں بھی بہت ہوتی ہیں اور امراء ان کے گلّے کے گلّے رکھتے ہیں۔ گائے بیل بھی ہوتے ہیں، مگر کم۔ بھینس عرب میں نہیں ہوتی۔
جنگلی جانوروں میں شیر، چیتا بعض علاقوں میں ملتا ہے۔ بھیڑیئے، لگڑبگڑ، بندر اور گیدڑ وغیرہ کافی ہوتے ہیں۔ ہرن بھی ملتا ہے اور جنگلی بکری بھی پہاڑوں میں پائی جاتی ہے۔ گورخر (جنگلی گدھا) بھی ہوتا ہے جس کا عرب لوگ شوق سے شکار کھیلتے ہیں۔
پرندوں میں عام پرندوں کے ذکر کو ترک کرتے ہوئے صرف شتر مُرغ قابلِ ذکر ہے۔ یہ ایک بہت بڑا جانور ہوتا ہے جس کی لمبی لمبی ٹانگیں ہوتی ہیں اور ایسا تیزی سے بھاگتا ہے کہ گھوڑے کو بھی پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔
رینگنے والے جانوروں میں سے صرف گرگٹ کی قسم کے جانوروں کی کثرت ہے باقی کم ہیں۔ گو سانپ وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔
ٹڈی جس کا گوشت کھایا جاتا ہے کثرت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور باغات اور فصلوں وغیرہ کا بڑا نقصان کرتی ہے۔ ساحل کے قریب مچھلی بھی ملتی ہے اور لوگ اسے پکڑتے ہیں۔
معدنی پیداوار عرب کی بہت کم ہے۔ قیمتی اور کارآمد دھاتیں تو گویا بالکل ہی نہیں ہیں کچھ سیسہ اور تانبا ملتا ہے اور کچھ کچھ چاندی اور لوہا۔ کوئلہ۔ گندھک اور نمک بھی پائے جاتے ہیں۔ سونا بھی کہیں کہیں موجود ہے۔ اور ایک انگریز مسٹر برٹن نے مدین میں اس کی تلاش بھی کی تھی، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بحرین میں سمندر کے کناروں سے موتی بھی نکالے جاتے ہیں اور ان کی خاصی تجارت ہے۔ اب تو پٹرول کے بڑے بڑے ذخائر عرب میں دریافت ہو چکے ہیں۔

ملکی تقسیم ملکی تقسیم کے لحاظ سے عرب کئی حصوں میں منقسم ہے جن میں بڑے بڑے حصے یہ ہیں:

۱۔ مغرب میں حجاز ہے جو بحرِ احمر کے ساتھ ساتھ یمن سے لے کر شام تک پھیلے ہوئے ساحلی علاقے کا نام ہے۔ اس میں مکّہ اور طائف اور مدینہ اور جدّہ وغیرہ بڑے بڑے شہر آباد ہیں۔ ظہورِ اسلام کے وقت عرب مستعربہ میں سے قبائل بنو کنانہ قبائل ھذیل اور قبائل ہوازن اور بنو قحطان میں سے بعض قبائل ازد وغیرہ اس علاقہ میں آباد تھے۔
حجاز کے جنوب میں اور بعض کے نزدیک اُس کے اندر شامل تہامہ بھی ایک مشہور علاقہ ہے جو بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔

۲۔ عرب کے جنوب مغرب میں یمن ہے جو ایک بہت مشہور اور نہایت شاداب علاقہ ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ ایک اچھی طاقتور اور متمدن سلطنت کا مرکز تھا اور ظہورِ اسلام سے قبل حبشہ کے اور ظہورِ اسلام کے وقت

فارس کے ماتحت تھا۔ اس کا بڑا شہر صنعا کسی زمانے میں بہت مشہور اور سلطنت یمن کا پایۂ تخت تھا۔ سبا کی قوم جس کا قرآن شریف میں ذکر آتا ہے۔ ایک زمانہ میں اسی جگہ آباد تھی۔ بنو قحطان کا مولد و مسکن بھی یمن تھا۔ اور یہیں سے اکثر قبائل بنو قحطان نے عرب کے شمال کی طرف رحلت کی تھی، چنانچہ مدینہ کے اوس اور خزرج بھی جنھوں نے اسلام میں انصار کا لقب پایا، یہیں سے گئے تھے۔

یمن کے ساتھ ہی ملا ہوا ایک اور علاقہ نجران ہے جو یمن کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ علاقہ عرب کے عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مباہلہ کے لیے جس کا ذکر قرآن شریف میں بھی آتا ہے انہی لوگوں کو بلایا تھا۔

۳۔ عرب کے جنوب میں یمن کے مشرق کی طرف حضر موت ہے اور حضر موت کے مشرق کی طرف مہرہ ہے۔ یہ ہر دو مشہور علاقے ہیں۔

۴۔ عرب کے جنوب مشرق میں عمان ہے جس کا دار الخلافہ مسقط ایک مشہور شہر ہے۔

۵۔ مشرق میں خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ الحسا کا علاقہ ہے جس کے قرب میں بحرین کے جزائر ہیں اور اسی وجہ سے بعض اوقات الحسا کو بحرین بھی کہہ لیتے ہیں۔ بحرین کے ساحل سے موتی نکالے جاتے ہیں۔

۶۔ وسط عرب میں نجد ہے جو ایک نہایت وسیع اور مشہور علاقہ ہے اور کئی چھوٹے چھوٹے علاقوں میں جن میں سے بعض عرب کے شاداب حصوں میں شمار ہوتے ہیں منقسم ہے۔ قبائل غطفان اور سلیم وغیرہ اس جگہ آباد تھے۔ یمامہ جو نجد کے جنوب مشرق میں ہے بنو حنیفہ یعنی مسیلمہ کذاب کے قبیلے کا مسکن تھا۔

۷۔ یمامہ اور حضر موت کے درمیان الاحقاف ایک معروف علاقہ ہے۔ قوم عاد کا جن کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے، یہی مسکن تھا۔ مگر آجکل یہ بالکل ویران و غیر آباد ہے۔

۸۔ نجد کے شمال مشرق میں حجاز کے ساتھ ملا ہوا خیبر بھی ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جو قدیم زمانہ میں یہود کا ایک بڑا مرکز تھا اور قلعوں کے ساتھ مستحکم کیا گیا تھا۔ خیبر کے شمال مشرق میں تیما بھی یہود کا ایک مرکز تھا۔ تیما کے قریب ہی حجر کی بستی ہے جس میں ثمود کی قوم آباد تھی جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے تھے۔ حجر کے غربی جانب ساحلِ سمندر کی طرف مدین کا علاقہ ہوتا تھا جہاں حضرت موسیٰؑ اپنی بعثت سے پہلے حضرت شعیبؑ کے پاس آکر ٹھہرے تھے۔

باشندے عرب ایک بہت کم آباد ملک ہے۔ بارش کی کمی، ریگستان کی زیادتی۔ نباتاتی اور معدنی پیداوار کی قلت وغیرہ کئی باتوں نے مل ملا کر اس کی آبادی کو بڑھنے نہیں دیا۔ پھر بھی آج کل ستر اسی لاکھ کے قریب اس کی آبادی بتائی جاتی ہے جو ملک کے حالات کے ماتحت کم نہیں ہے۔

تقسیم اقوام کے لحاظ سے مؤرخین نے قبائلِ عرب کو دو اور ایک لحاظ سے تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

اوّل - عرب عاربہ - یعنی مُلک کے قدیم اور اصلی باشندے جو آگے پھر دو حصّوں میں تقسیم کئے گئے ہیں :

(الف) عرب کے وہ قدیم ترین باشندے جو اسلام سے بہت عرصہ پہلے فنا ہو چکے تھے۔ بُعدِ زمانہ کی وجہ سے ہمیں اُن کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہیں، مگر اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ کئی قبائل تھے اور مُلک کے مختلف حصّوں میں آباد تھے اور ان میں سے بعض قبائل کی اچھی اچھی زبردست اور متمدن ریاستیں تھیں۔ عاد، ثمود، طسم، جدیس اور جرہم الاولیٰ وغیرہ انہی میں سے چند مشہور قبائل کے نام ہیں۔ عاد کا وطن احقاف میں تھا اور ثمود حجاز کے شمال میں جوف میں آباد تھے۔ ان قدیم ترین قبائل کو اُن کے فنا ہو جانے کی وجہ سے عرب بائدہ بھی کہتے ہیں۔

(ب) وُہ قبائل جو بنو قحطان کہلاتے ہیں اور بعض روایتوں سے پتہ لگتا ہے کہ وُہ حضرت ھوؐد کی اولاد سے تھے[1]۔ بہرحال یہ عرب بائدہ کے بعد ملک میں پھیلے۔ ان کا اصل وطن یمن تھا جہاں سے یہ سارے عرب میں پھیل گئے۔ اور ان کی کئی شاخیں ہو گئیں۔

عرب کے شمال میں سلطنت فارس و روم کے ساتھ علی الترتیب ملی ہوئی حیرہ اور غسان دو مشہور ریاستیں تھیں۔ ان کے فرماں روا بھی بنو قحطان سے تھے۔ ظہورِ اسلام کے وقت بنو قحطان بہت پھیل چکے تھے اور ملک میں ان کا کافی زور تھا۔ اور مُلک کا ایک بڑا حصہ اُن سے آباد تھا۔ مدینہ کے قبائل اوس و خزرج بھی بنو قحطان میں سے تھے۔

بعض اوقات عرب عاربہ کی اصطلاح صرف بنو قحطان کے واسطے استعمال کی جاتی ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عرب کے قدیم اور اصلی باشندوں میں سے یہی وُہ قوم تھی جو مستقل طور پر مُلک میں قائم رہی۔ بنو قحطان کے مشہور قبائل کا شجرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(دیکھئے اگلا صفحہ)

---

[1] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۹۲

حضرت نوح علیہ السلام
سام
قحطان
یعرب
سبا
جرہم
مضاض
حمیر
اشعر
عمرہ
کہلان
بنوعاملہ
بنوشعبان
تبابع
قضاعہ
جذام
لخم
جشم
حرام
مناذرۃ
بنوالدار
(ملوک حیرہ)
عقیب
بنوعذرۃ
بنونہد
تنوخ
لُحیٰ
کلب
بہرا
جُہینہ
بنوسلیح
انمار
مراد
کندۃ
مذحج
ہمدان
طی
ازد
خثعم
بجیلہ
سکون
سکاسک
بنوسعدالعشیرہ
عبس
النخع
اود
خولان
جنب
زبید
جعف
سدوس
معنی
سلامان
بولان
نبہان
جدیلۃ
بنوبحتر
بنوالجلندی (ملوک عمان)
دوس
غافق
عتیق
بارق
خزاعہ
خزرج
اوس
غسان
بنوالمصطلق

دوم - عرب مستعربہ یعنی باہر سے آئے ہوئے لوگ جو عرب میں آکر آباد ہوئے۔ اُن میں زیادہ تر حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم علیہما السّلام کی اولاد تھی جو حجاز میں آکر آباد ہوئی۔ ان کو عدنانی بھی کہتے ہیں، کیونکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں بڑا شخص جس سے یہ لوگ پھیلے عدنان تھا۔ بنو عدنان بھی آہستہ آہستہ کئی شاخوں میں منقسم ہوگئے۔ اور ملک کے مختلف حصّوں میں پھیل گئے۔ قریش جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے بنو عدنان ہی کی ایک شاخ تھے۔ اور جیساکہ آگے ظاہر ہو جائے گا ظہورِ اسلام کے وقت عرب مستعربہ میں سب سے زیادہ طاقتور اور صاحبِ اثر قریش ہی کا قبیلہ تھا۔

عرب مستعربہ کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عدنان حضرت اسمٰعیل سے کئی پُشت بعد پیدا ہوئے تھے۔ مگر چونکہ عدنان اور حضرت اسمٰعیل کی درمیانی کڑیوں کے متعلق روایات میں کچھ اختلاف ہے اس وجہ سے بعض غیر مُسلم مؤرخین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسلِ اسمٰعیل میں ہونے کے متعلق اعتراض کا موقعہ مِل گیا ہے حالانکہ جس صُورت میں عرب کی متفقہ روایات کی رُو سے حضرت اسمٰعیلؑ کا عرب میں آکر آباد ہونا ثابت ہوتا ہے اور دُوسری طرف عدنان کے متعلق عرب کی تمام روایات متفق ہیں کہ وُہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے تھا تو درمیانی کڑیوں کے متعلق اختلاف اصل مسئلے پر ہرگز کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔[1]

بہرحال مشہور عدنانی قبائل کا شجرہ درج ذیل ہے:۔

(دیکھئے اگلا صفحہ)

---

[1] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۸۰

حضرت ابراہیم خلیل اللہ

- اسمٰعیل
  - عدنان
    - معد
      - نزار
        - معز
          - قیس عیلان
            - خصفہ
              - محارب
            - سلیم
              - رعل
              - ذکوان
              - عصیہ
            - غطفان
              - ذبیان
                - ثعلبہ
                - فزارہ
              - عبس
                - اشجع
                - مرة
            - باہلہ
            - ہوازن
              - صعصعہ
                - بنو عامر
                  - بنو نمیر
                  - ربیعہ
                  - بنو ہلال
              - جشم
              - بنو سعد
              - بنو بکر
              - بنو ثقیف
            - بنو کلاب
            - مازن
            - عقیل
            - عدوان
          - الیاس
            - طابخہ (خندف)
              - بنو تمیم
                - ثعلبہ
                - ریاح
              - رباب
                - تیم
                - عکل
                - ثور
              - ضبہ
              - بنو مزینہ
            - مدرکہ
              - خزیمہ
                - کنانہ
                  - عبد مناة
                    - بنو بکر
                      - دُئل
                    - بنو غفار
                    - بنو لیث
                    - بنو الحارثہ
                    - بنو مدلج
                    - بنو ضمرة
                  - عمرو (عمرویان)
                  - عامر (عامریان)
                  - نضر
                    - مالک
                      - فہر (قریش)
                  - احابیش
                  - ملکان
                  - مالک
                    - بنو فراس
                - ہون
                  - دیش
                    - قارہ
                    - عضل
                - اسد
                  - دودان
                  - کاہل
              - ہذیل
                - لحیان
        - ایاد
        - انمار
        - ربیعہ
          - لمازم
          - سدوس
          - عجل
          - لجیم
          - نمر
          - ضبیعہ
          - اسد
            - جدیلہ
              - وائل
                - بکر
                  - بنو حنیفہ
                  - بنو شیبان
                - تغلب
            - بنو عبد القیس
            - عنزة
              - قارضان

ظہورِ اسلام سے پہلے عرب کا تہذیب و تمدن

ظہورِ اسلام سے پہلے عرب کا ملک سوائے چند ساحلی علاقوں کے بیرونی دُنیا سے ایک بالکل منقطع حالت میں تھا۔ حتّٰی کہ نہ اُس پر کبھی کسی بیرونی قوم یا سلطنت کا اثر ہؤا اور نہ عرب لوگ خود کبھی مستقل طور پر اپنے وطن سے باہر نکلے۔ خود مُلک کے اندر بھی اسلام سے پہلے کبھی کوئی متمدن مرکزی سلطنت قائم نہیں ہوئی ــ بیشک بعض اوقات بعض علاقہ جات میں بعض ریاستیں قائم ہوئیں مگر اُن کا اثر صرف مقامی تھا اور تمام ملک کبھی بھی کسی ایک تاجدار کے سامنے نہیں جھکا، بلکہ عموماً ہر قبیلہ آزاد تھا اور اپنا الگ الگ سردار رکھتا تھا۔ مگر عرب میں سرداری کسی کو باقاعدہ ورثہ میں نہ ملتی تھی اور نہ ہی یہ سرداری کوئی باقاعدہ حکومت کے رنگ میں ہوتی تھی، بلکہ عموماً کسی قبیلہ میں جو شخص سب سے زیادہ قابل ہوتا تھا، اُس کی مرضی پر لوگ چلتے تھے اور وہ قوم کا سردار سمجھا جاتا تھا۔

طرزِ زندگی کے لحاظ سے عربوں کی خوراک و لباس اور عام بُود و باش نہایت سادہ اور ابتدائی تھی۔ عام خوراک عربوں کی اُونٹوں اور بکریوں کا دُودھ اور کھجور تھی۔ جَو کے سَتّو بھی عموماً استعمال ہوتے تھے۔ ذی ثروت لوگ گوشت بھی کھاتے تھے اور اُونٹ یا بکری کے بُھنے ہوئے گوشت کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ شوربے میں روٹی کو بھگو کر کھانا ایک اعلیٰ قسم کی غذا سمجھی جاتی تھی جسے عرب لوگ ثرید کہتے تھے۔ لباس میں بھی یہی سادگی اور غربت کا عالم تھا۔ عام لوگوں کے پاس ایک چادر سے زائد کپڑا نہ ہوتا تھا جو وُہ تہہ بند کے طور پر باندھے پھرتے تھے۔ قمیص صرف خاص خاص لوگ استعمال کرتے تھے اور جُبّہ تو گویا ایک بڑی نعمت تھی۔ گھروں میں عموماً فرش یا چارپائی نہیں ہوتے تھے۔ لوگ عموماً کھجور کی چٹائیوں پر سوتے تھے؛ البتہ ذی ثروت لوگوں میں لکڑی کے تخت استعمال ہوتے تھے۔ اوڑھنے کو عموماً اُونٹ کی اُون کے بنے ہوئے بھدّے سے کمبل ہوتے تھے۔ باقاعدہ مکان کم تھے عموماً خیمے یا پھُوس کے چھپّر یا کچّے مکان استعمال ہوتے تھے؛ البتہ بعض خاص خاص عمارتیں پتھروں کی بھی بنائی جاتی تھیں۔

تقسیم آبادی کے لحاظ سے عرب دو حصّوں میں منقسم تھے۔ الحضر اور البدو یعنی شہروں میں رہنے والے اور جنگل میں رہنے والے۔ شہروں میں رہنے والے چونکہ ایک جگہ جم کر سکونت اختیار کرتے تھے۔ اس لیے اُن کا ایک خاص تمدّن تھا اور اُن میں ایک مدنیت کا رنگ تھا مگر بدوی لوگوں کی زندگی جنگلی اور خانہ بدوشوں کی سی زندگی تھی۔ وہ خیموں اور عارضی گھروں میں رہتے تھے اور اپنے بال بچّوں اور مویشیوں کو لے کر ایک وسیع علاقہ میں اِدھر اُدھر آزادانہ پھرتے رہتے تھے۔ جہاں پانی اور سبزی پاتے وہیں ڈیرہ لگا دیتے۔ پھر کسی اور طرف نکل جاتے۔ اسی طرح اُن کی ساری عمر بسر ہو جاتی تھی۔ اس طرزِ زندگی کے نقشے قدیم شاعروں نے اپنے کلام میں نہایت خوبی کے ساتھ کھینچے ہیں۔ ان لوگوں کی زبان شہری لوگوں کی نسبت زیادہ صاف اور خالص تھی اور ان میں اصل عربی فطرت اور عربی عادات کی تصویر زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کا پیشہ زیادہ تر ایک چرواہے کا سمجھنا چاہیے۔

عربوں میں لین دین عموماً جنس کا جنس سے ہوتا تھا، لیکن سونے اور چاندی کے بھدّے سے سکّے بھی چلتے تھے۔ چنانچہ چاندی کے دُو سکّے رائج تھے۔ درہم اور اوقیہ۔ ایک اوقیہ کی قیمت چالیس درہم کے برابر سمجھی

جاتی تھی۔ سونے کا مروّج سکّہ دینار تھا۔ ترازو سے تولنے کا رواج کم تھا۔ عموماً ماپ کا دستور تھا، چنانچہ مُدّ اور صاع عرب کے دو مشہور پیمانے تھے۔ ناپنے کا آلہ صرف ذراع یعنی ہاتھ تھا جسے گویا ڈیڑھ فٹ کے برابر سمجھنا چاہیئے۔

ختنہ کی رسم عربوں میں عام تھی۔ حتّٰی کہ بعض اوقات عورتیں بھی ختنہ کرواتی تھیں۔ مُردوں کو غسل دینے اور کفن میں لپیٹ کر دفن کرنے کا رواج تھا۔ عرب لوگ داڑھی رکھتے اور عموماً مونچھیں کترواتے تھے۔ سُود لینے دینے کا رواج بھی کم و بیش پایا جاتا تھا۔

عربوں کی تجارت

عربوں کے قومی پیشے صرف تین تھے۔ اوّل زراعت جو ملک کے ایک نہایت قلیل حصّہ تک محدود تھی۔ دوسرے مویشیوں کا پالنا جسے انگریزی میں پاسچر نگ کہتے ہیں۔ یہ بھی مُلک کے صرف خاص خاص حصّوں میں ہی ممکن تھا۔ تیسرے تجارت جسے گویا ملک کا سب سے بڑا پیشہ سمجھنا چاہیئے۔ عرب کے لوگ ہمیشہ سے تجارت پیشہ رہے ہیں۔ خصوصاً وہ قبائل جو ساحل سمندر کے پاس یا متمدن ملکوں کے قرب میں آباد تھے قدیم سے تجارت میں مصروف چلے آئے ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں تو مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی مال لانے اور لے جانے کا بڑا ذریعہ عرب لوگ ہی تھے؛ چنانچہ ایک طرف شام و مصر اور دُوسری طرف سواحل بحرِ ہند کے درمیان ان کے تجارتی قافلے برابر آتے جاتے تھے جو گویا ہندوستان اور شام و مصر کے درمیان ایک تجارتی کڑی کا کام دیتے تھے۔ مگر سمندر کا راستہ کھل جانے سے عربوں کی اس تجارت کو سخت نقصان پہنچا اور اس قدیم راستہ پر جو شام سے حجاز اور پھر یمن اور پھر حضرموت کے اندر سے ہوتا ہوا عرب کے مشرقی ساحل کی طرف جاتا تھا تجارتی قافلوں کی آمدورفت عملاً بالکل رُک گئی اور صرف مُلک کے اندر کی معمولی تجارت باقی رہ گئی۔ یہ اندرونی تجارت حجاز، یمن، بحرین اور نجد وغیرہ کے اندر اندر محدود تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قریباً ایک سو سال پہلے شام کے ساتھ حجاز و یمن کی تجارت کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ گو اس پہلے پیمانہ پر تو نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن پھر بھی ملک میں اس سے کچھ جان آگئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قریشِ مکّہ کے تجارتی قافلے باقاعدہ شام اور یمن کی طرف آتے جاتے تھے اور بعض اوقات عرب کے دُوسرے حصّوں کی طرف بھی جاتے تھے مگر اس زمانہ میں قریش مکّہ کی بڑی تجارت شام سے تھی۔ مکّہ سے شام کی طرف جانے کا زیادہ مستعمل راستہ بحرِ احمر کے ساتھ ساتھ شمال کو جاتا تھا۔ یثرب کا شہر جس نے بعد میں مدینہ کا نام پایا اسی راستہ کے قرب میں واقعہ تھا۔ شامی راستہ پر وہ مقام جہاں سے مدینہ کا راستہ مشرق کی طرف الگ ہو جاتا تھا بدر ہے جہاں مُسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان سب سے پہلی لڑائی ہوئی۔

برآمد کا مال عموماً قیمتی دھاتوں، موتیوں، جانوروں کی کھالوں، گرم مصالحہ جات اور خوشبودار چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور جیسا کہ قیاس کیا جا سکتا ہے۔ درآمد بالعموم غلّہ۔ پارچات۔ سامانِ حرب۔ شراب اور کھانے کی خشک چیزوں پر مشتمل تھی۔

عرب میں قاعدہ تھا کہ سال کے مختلف حصّوں میں ملک کے مختلف مقاموں میں تجارتی میلے لگا کرتے تھے

جن میں دُور دراز سے تاجر لوگ آکر شامل ہوتے اور تجارت کرتے تھے۔ ان میلوں کے لیے قرب شام میں دومۃ الجندل بحرین میں مشقر، عمان میں دبا، یمن میں صنعا اور حجاز میں عکاظ خاص شہرت رکھتے تھے۔

تعلیم اور قدیم شاعری

تعلیم عرب میں تھی تو سہی مگر بہت ہی کم تھی۔ سوائے خاص خاص اشخاص کے سارا ملک اَن پڑھ تھا اور یہ چند خواندہ لوگ بھی زیادہ تر شہروں میں آباد تھے، مگر باوجود اس جہالت کے عربوں کو اپنی فصاحت اور بلاغت پر بڑا گھمنڈ تھا حتیٰ کہ عرب اپنے سوا باقی تمام دُنیا کو عجمی یعنی گنگ کہتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ زبان کی فصاحت میں عرب کو واقعی عمدہ درجہ کمال حاصل تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے شعراء کا کلام آجتک محفوظ ہے اس کے اندر جو فصاحت و بلاغت جو زور اور جوش وخروش جو آزادانہ زندگی کی جھلک اور طبعی بہاؤ کی لہریں نظر آتی ہیں وُہ کسی اور قوم اور کسی اور وقت کی شاعری میں کم ملیں گی۔ اور ان لوگوں میں یہ ایک خصوصیت تھی کہ اپنے دلی خیالات کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ بالکل ننگی زبان میں کہہ جاتے تھے کوئی تصنع نہیں کوئی بناوٹ نہیں طبیعت پر کوئی زور نہیں۔ اسی لیے اُن کا کلام ان کے خیالات ۔ جذبات اور عادات کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے۔

عرب قوم اپنی اس خُوبی کو خود بھی خوب سمجھتی تھی؛ چنانچہ ایک مورّخ نے لکھا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب ایک دُوسرے کو صرف تین موقعوں پر مبارکباد کہتے تھے۔ اوّل کسی لڑکے کی ولادت پر۔ دُوسرے کسی شاعر کے سر نکالنے پر اور تیسرے عمدہ بچھیرے کے پیدا ہونے پر[1]۔ اس مختصر فقرہ میں عربی زندگی کا پُورا نقشہ آجاتا ہے۔

عرب میں شعراء گویا ملک کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ اُن کو یہ طاقت حاصل تھی کہ اپنے کلام کے زور سے دو قبائل کے درمیان جنگ کرادیں اور ملک میں آگ لگادیں۔ عرب کے خاص خاص مقامات میں شعراء جمع ہو کر طبع آزمائیاں کرتے تھے۔ عکاظ جو نخلہ اور طائف کے درمیان مکّہ سے مشرق کی طرف ایک شاداب جگہ ہے ایسے میلوں کے لیے زمانہ جاہلیت میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ یہاں ہر سال ذیقعدہ میں میلہ لگتا تھا اور دُور دراز سے لوگ جمع ہوتے تھے اور علاوہ دُوسری باتوں کے مختلف قبائلِ عرب کے درمیان فصاحت و بلاغت اور شاعری کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔

فتح مکّہ کے بعد جب تمام اطراف عرب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مختلف قبائل کے وفد حاضر ہوئے تو اُن میں سے بنو تمیم نے جو معیار صداقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا اس سے ملک عرب میں شاعری کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ اُنہوں نے بجائے اور دلیلوں میں پڑنے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم تو صرف اس لیے آئے ہیں کہ آپ کے اور اپنے شاعر کا مقابلہ کرا کے دیکھیں؛ چنانچہ انھوں نے اپنا شاعر کھڑا کر دیا جس نے اپنے قبیلہ کی تعریف میں چند اشعار کہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی طرف

---

[1] المزہر مصنفہ امام سیوطی

سے حسان بن ثابتؓ انصاری کو کھڑے ہونے کا ارشاد فرمایا جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کی تعریف میں چند زوردار شعر کہے جن کی فصاحت کا لوہا بنوتمیم کو ماننا پڑا اور اس کے بعد یہ قبیلہ مُسلمان ہوگیا۔[1]

عادات اور قومی خصائل

عرب کے گندے خصائل میں سے ان کی تین عادتیں خاص امتیاز رکھتی تھیں شراب خوری۔ قمار بازی اور زنا۔ ملک میں اُن کی اتنی کثرت تھی کہ خدا کی پناہ۔ اور اس پر تعجب یہ ہے کہ عموماً ان کو جائے فخر سمجھا جاتا تھا؛ چنانچہ زمانۂ جاہلیت کے شاعر بڑے مزے لے لے کر ان سیہ کاریوں کے متعلق اپنے کارنامے سُناتے ہیں بلکہ اس قسم کے ذکر کے بغیر عربوں میں شعر کی کچھ حقیقت ہی نہ سمجھی جاتی تھی؛ چنانچہ یہ ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ قصیدہ کے شروع میں خواہ وُہ کسی غرض سے کہا گیا ہو شاعر چند کُھلی کُھلی باتوں میں اپنی اصل یا مفروضہ معشوقہ کا ذکر کرے اور اس کے ساتھ اپنی چند مجلسوں کے کارنامے سُناتے۔ کعب بن زہیر ایک مشہور شاعر تھا وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کی مدح میں ایک قصیدہ کہہ کر لایا جو آجکل بَانَتْ سُعَاد کے نام سے مشہور ہے۔ اُس کے شروع میں بھی شاعر اپنی محبوبہ ہی کی جدائی کا دُکھڑا روتا ہے۔ بے حیائی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات خود مالک اپنی لونڈیوں سے بدکاری کرواتے اور اُس کی آمد وصول کرتے تھے۔ یہ بھی گویا ایک آمد کا ذریعہ تھا، مگر شرفا کا دامن اس قسم کی انتہائی بے حیائی سے پاک تھا۔

جہالت اور بے جا جوش وخروش کا عرب میں یہ حال تھا کہ بات بات پر تلوار چل جاتی تھی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات ایک ذرا سی بات پر دو قبیلوں میں جنگ شروع ہوئی پھر آہستہ آہستہ بعض دوسرے قبائل بھی شریک ہوگئے اور سالہا سال تک قتل وغارت کا سلسلہ جاری رہا۔ ذیل کا واقعہ ایامِ عرب کی تاریخ کا ایک معمولی ورق ہے۔

پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں کلیب بن ربیعہ ایک بڑا طاقتور اور صاحبِ اثر رئیس گذرا ہے یہ قبیلہ بنو تغلب بن وائل کا سردار تھا جو عرب کے شمال مشرق میں رہتے تھے۔ کلیب کی بیوی جلیلہ بنت مرۃ قبیلہ بنو بکر بن وائل سے تھی۔ اس جلیلہ کا ایک بھائی تھا جس کا نام جساس تھا جو اپنی خالہ بسوس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اب اتفاق ایسا ہوا کہ بسوس کے پاس ایک شخص سعد نامی بطور مہمان آکر ٹھہرا۔ سعد کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام سراب تھا۔ . . . . . جو بوجہ تعلقات رشتہ داری کے کلیب کی چراگاہ میں جساس کی اونٹنیوں کے ساتھ مل کر چرا کرتی تھی۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ کلیب ایک درخت کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ درخت کے اُوپر سے اُس کو ایک پرندے کی آواز آئی۔ کلیب نے اُوپر نظر اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک پرندے نے اس درخت پر ایک گھونسلا بنا کر اُس میں انڈے دے رکھے تھے۔ کلیب نے اس پرندے کی طرف اپنے سردارانہ بدوی انداز میں دیکھا اور بولا "کسی سے مت ڈریں تیری حفاظت کروں گا" دوسرے دن جب کلیب وہاں سے گذرا تو اس نے دیکھا

---

[1] ابن ہشام ذکر وفد بنو تمیم۔

کہ انڈے درخت سے نیچے گرے پڑے ہیں اور کسی جانور کے پاؤں سے مسلے ہوئے ہیں اور پرندہ اُوپر دردبھری آواز نکال رہا ہے۔ کلیب کو اپنی کل کی بات یاد آئی اور اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر کی تو سعد کی اُونٹنی چر رہی تھی۔ کلیب نے خیال کیا کہ ضرور انڈے اسی اُونٹنی نے توڑے ہوں گے غصّہ سے مغلوب ہو کر وہ اپنے سالے جسّاس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔"دیکھو جسّاس! اس وقت میرے دماغ میں ایک خیال ہے اگر مجھے اس کا یقین ہو تو مَیں کچھ کر گذروں۔ مگر دیکھو آئندہ سعد کی یہ اُونٹنی اس گلّے کے ساتھ یہاں نہ چرا کرے۔" جسّاس کی رگوں میں بھی عرب کا بدوی خون تھا اس نے سامنے سے جواب دیا۔" یہ ہمارے مہمان کی اُونٹنی ہے جہاں میری اُونٹنیاں چریں گی وہیں یہ بھی چرے گی۔" کلیب نے کہا۔" اچھا تو اگر مجھے یہ اُونٹنی پھر یہاں نظر آئے گی تو مَیں اس کے پِستان میں تیر مار کر اُسے ہلاک کر دُوں گا۔" جسّاس بولا۔" اگر تُو نے ایسا کیا تو مجھے بھی وائل کے بُتوں کی قسم ہے کہ مَیں خود تیرا سینہ تیر سے چھید کر رکھ دُوں گا۔" یہ کہہ کر جسّاس وہاں سے چلا گیا اور کلیب سخت غضب کی حالت میں اپنے گھر آیا اور اپنی بیوی جلیلہ سے کہنے لگا۔" کیا تو کسی ایسے آدمی کو جانتی ہے جو میرے مقابل پر اپنے پڑوسی کی حفاظت کی جرأت کرے گا؟" اس نے کہا۔" ایسا تو کوئی نہیں مگر ہاں میرا بھائی جسّاس ہے اگر وُہ اپنے مُنہ سے کوئی بات کہہ بیٹھے تو وُہ اُسے ضرور پورا کرے گا۔"

اس کے بعد جلیلہ نے اپنی طرف سے اس جھگڑے کو روکنے کی بہت کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکی آخر ایک دن جب کلیب اپنے اُونٹوں کو پانی پلا رہا تھا، اتفاقاً جسّاس بھی اُوپر سے اپنے اُونٹ لے آیا اور مزید اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے گلّے سے وُہی سعد کی اُونٹنی چھوٹ کر کلیب کے اُونٹوں میں آکر پانی پینے لگ گئی۔ کلیب نے اُسے دیکھا اور خیال کیا کہ جسّاس نے دیدہ دانستہ اُسے چھوڑا ہے اس پر اُس نے اپنی کمان لی اور اُس کے پِستان میں تیر مارا جو سیدھا اپنے نشانہ پر بیٹھا اور سعد کی اُونٹنی تڑپتی اور چلاّتی ہوئی دوڑی اور جسّاس کی خالہ بسوس کے دروازے کے سامنے پہنچ کر گر گئی۔ بسوس نے یہ نظارہ دیکھ کر اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ اور زور سے چلاّ چلاّ کر کہا۔" شرم شرم! ہم ذلیل کئے گئے اور ہمارے مہمان کی اُونٹنی ماردی گئی۔" جسّاس نے یہ الفاظ سُنے تو شرم اور غیرت سے کٹ گیا اور غضب میں آکر اُس نے کلیب کو قتل کر دیا۔ کلیب کے قتل نے قبیلہ تغلب میں آگ لگادی اور اپنے سردار کے انتقام کے لیے وُہ ایک جان ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجہ میں قبائل تغلب اور بکر میں وہ خطرناک لڑائیاں ہوئیں اور اتنا قتل و خون ہوا کہ خدا کی پناہ۔ آخر چالیس سال کے بعد جب دونوں قبائل کٹ کٹ کر کمزور ہو گئے تو ریاست حیرہ کے بادشاہ مُنذر ثالث کے ذریعہ سے اُن میں پھر صُلح ہوئی۔ یہ جنگ تاریخِ عرب میں جنگِ بسوس کے نام سے مشہور ہے۔[1]

عرب کے جنگوں میں عام طور پر ثار یعنی انتقام کا بڑا دخل ہوتا تھا۔ ثار کا عقیدہ گویا عرب کے دین و مذہب کا جزوِ اعظم تھا۔ اُن کا ایمان تھا کہ جب تک بدلہ نہ لے لیا جاوے مقتول کی رُوح ایک جانور کی صورت اختیار

---

[1] تاریخ کامل ابنِ اثیر

کر کے ہوا میں نوحہ کرتی پھرتی ہے۔ اُس جانور کو عرب لوگ صَدیٰ کہتے تھے۔ جب کسی قبیلے کا کوئی آدمی مارا جاتا تو اس کے رشتہ داروں اور اہلِ قبیلہ کا یہ فرض ہو جاتا تھا کہ قاتل یا اُس کے کسی رشتہ دار یا اس کے قبیلہ کے کسی آدمی کو اُس کے بدلے میں قتل کریں۔ مقتول کے بدلے میں دیت یعنی خون بہا لینے کا بھی رواج تھا، مگر اس میں مالی پہلو اتنا متصور نہ تھا جتنا یہ کہ قاتل کا قبیلہ ذلیل اور شرمندہ ہو کر مقتول کا خون بہا ادا کرے، لیکن عموماً جبتک مقتول کا بدلہ قتل کے ساتھ نہ لے لیا جاتا۔ اُس وقت تک اُس کے رشتہ داروں کے دلوں میں ایک آگ سی لگی رہتی تھی جسے صرف قاتل کا خون ہی بجھا سکتا تھا، لیکن جب ایک طرف کی آگ بجھ جاتی تھی تو دُوسری طرف بھی آگ بھڑک اٹھتی تھی اور اس طرح یہ سلسلہ ایسا وسیع ہوتا چلا جاتا تھا کہ بعض اوقات قبیلے کے قبیلے اس میں بھسم ہو جاتے تھے۔

صرف قاتل کو مار دینے تک مقتول کا انتقام ختم نہ ہوتا تھا بلکہ مُردوں کے ہاتھ پاؤں کان ناک وغیرہ کاٹ کر بھی اپنے دل کو ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ اِس طریق کو عربوں میں مُثلہ کہتے تھے اور عرب کی جنگوں میں اس کا عام رواج تھا۔ چنانچہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جنگِ اُحد میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کے ساتھ جنھوں نے جنگِ بدر میں اس کے باپ عُتبہ کو قتل کیا تھا یہی سلوک کیا بلکہ نہایت بیدردی کے ساتھ آپ کا جگر نکال کر چبا گئی۔ عورتیں اور بچے جو جنگ میں قید ہو کر آتے تھے ان کو قتل کر ڈالنے میں بھی عربوں کو دریغ نہ ہوتا تھا۔ انتقام پُورا کرنے کے واسطے مُردوں کی کھوپڑیوں میں شراب پینا۔ نیزہ مار کر حاملہ عورتوں کا حمل گرا دینا۔ غفلت کی حالت میں سوتے ہوئے آدمیوں پر حملہ کر کے مار دینا وغیر ذالک یہ ایسی باتیں تھیں جن کو عرب کی سوسائٹی عموماً ناجائز نہیں سمجھتی تھی۔

جنگوں میں عرب کا دستور تھا کہ ایک اونچی جگہ پر آگ جلا دیتے تھے اور دورانِ جنگ میں اسے برابر جلتا رکھتے تھے اور اس کے بجھ جانے کو بُری فال خیال کرتے تھے؛ چنانچہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جب جنگ احزاب میں کسی وجہ سے ایک افسر کی آگ بجھ گئی تو وہ گھبرا کر رات کے وقت اکیلا ہی میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ جس کی وجہ سے باقی فوج میں بھی بھاگڑ پڑ گئی۔

جنگ میں عموماً عورتیں بھی ساتھ جاتی تھیں جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ غیرت اور جوش دلانے کے شعر پڑھ پڑھ کر آتشِ غضب کو بھڑکاتی رہیں۔ زخمیوں کی نگہداشت بھی عموماً عورتیں ہی کرتی تھیں؛ چنانچہ یہ رسم ایک حد تک اسلام میں بھی قائم رہی۔

لڑائی میں یہ عام دستور تھا کہ پہلے ایک ایک آدمی کا انفرادی مقابلہ ہوتا تھا اور پھر عام دھاوا ہو جاتا تھا۔ جنگ میں عرب لوگ عموماً تین قسم کے ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ تیر کمان۔ نیزہ اور تلوار۔ بچاؤ کے واسطے زرہ اور خود استعمال کی جاتی تھیں۔ عرب لوگ جنگ گھوڑے پر بھی کرتے تھے اور پیدل بھی۔ لیکن بہادروں کے درمیان یہ بہادری کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ لڑائی کے وقت گھوڑے سے اُتر کر اپنے عزیز گھوڑے کی کونچیں کاٹ کر اُسے نیچے گرا دیں تاکہ یہ ثابت ہو کہ ہم نے اپنے واسطے بھاگنے کا کوئی راستہ کھلا نہیں رکھا۔ جنگوں میں بار برداری

کے لیے اُونٹ استعمال ہوتا تھا۔

عربوں میں بہادری اور شجاعت نہایت اعلیٰ وصف سمجھے جاتے تھے اور عرب شاعر اپنی اور اپنے قبیلہ کی بہادری کے کارنامے دلی جوش و خروش کے ساتھ منظوم کرتے تھے اور بہادری گویا اُن کے قومی خصائل میں سب سے نمایاں تھی۔ موت کے ڈر کو ایک سخت قابل شرم بات خیال کیا جاتا تھا اور موت سے ڈرنے والا سب کی نظروں میں مطعون ہو جاتا تھا۔ دراصل بہادری عربوں کی زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم تھی۔

عربوں کی غیرت اور غرور کے قصے بھی بہت مشہور ہیں۔ عمرو بن کلثوم کا مشہور مُعلّقہ جس میں وہ عمرو بن ہند کو خاص عربی انداز میں مخاطب کرتا ہے، عربوں کی غیرت کی ایک عام مثال ہے۔ عموماً عرب لوگ اپنے مفاد کے مقابلہ میں عہد و پیمان کا زیادہ پاس نہ کرتے تھے، تاہم عربوں کے اندر وفاداری کی بعض مثالیں حیرت انگیز ہیں۔ سموئل بن عادیہ نے امرؤالقیس کی امانت کی حفاظت میں اپنے جوان بیٹے کے قتل کی پروا نہیں کی۔

عربوں میں سخاوت ایک نہایت اعلیٰ وصف سمجھا جاتا تھا۔ اور پڑوسی اور مہمان کی حفاظت ان کے دین و مذہب کا حصّہ تھی۔ مہمان نوازی تو عربوں کی فطرت میں تھی۔ رات کو کسی اونچی جگہ آگ جلا رکھتے تھے تاکہ اُسے دیکھ کر مصیبت زدہ مُسافر اُن تک پہنچ سکے۔ مہمان کی خاطر گھر کا سب کچھ خرچ کر ڈالنے میں دریغ نہ تھا۔ اس ضمن میں عرب کے مشہور ہیرو حاتم طائی کی سخاوت و مہمان نوازی کے قصے زبان زد خلائق ہیں۔

قبیلہ کی پاسداری عربوں کا فرض عین تھا۔ ایک شاعر فخریہ کہتا ہے کہ "میں تو قبیلہ غزیہ سے ہوں۔ اگر وہ غلطی کریں تو میں بھی غلطی کروں گا اور اگر غزیہ ٹھیک راستہ پر چلیں تو میں بھی ٹھیک راستہ پر چلوں گا"[1]

عرب میں اپنے حسب نسب پر فخر کرنے کی عادت عام تھی اور اپنے باپ دادوں کے کارناموں کا فخریہ لہجہ میں ذکر کرنا اُن کا خاصہ تھا۔ یہ اسی تکبّر کا نتیجہ تھا کہ عرب لوگ غلاموں اور خادموں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

دشمن کے ساتھ معاملہ کرنے میں عرب لوگ عموماً ظالم اور سخت گیر تھے۔ ثار کا خونی عقیدہ اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ یہ گویا عرب کے دین و مذہب کا جزوِ اعظم تھا۔ ثار کے مقابلہ میں خدائی قضاء و قدر کی بھی پروا نہ تھی۔ ایک شاعر کہتا ہے :-

سَأَغْسِلُ عَنِّي الْعَارَ بِالسَّيْفِ جَالِبًا ❊ عَلَيَّ قَضَاءُ اللّٰهِ مَا كَانَ جَالِبًا

"میں اپنے اُوپر سے شرم و عار کو مزہ تلوار کیساتھ دھوؤنگا، پھر اللہ کی قضاء مجھ پر جو چاہے لادے مجھے پروا نہیں"[2]

عرب لوگ نہایت ذکی اور ذہین تھے اور اُن کا حافظہ غضب کا تیز تھا چنانچہ قدیم سے اُن کا دستور تھا کہ اپنی تمام قومی اور خاندانی روایات کو یاد رکھتے تھے اور مختلف موقعوں پر سُناتے رہتے تھے۔ جنگ میں جب

---

[1] : دیوان الحماسہ۔ [2] : دیوان الحماسہ۔

دُو جانباز سپاہی مقابلہ کے واسطے آگے بڑھتے تھے تو پہلے ایک دُوسرے کا حسب نسب ضرور دریافت کرتے تھے اور اگر کوئی پنیچ ذات کا ہوتا تھا تو اُس کو اپنے مقابلہ میں آنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

عربوں میں سال اور ماہ چاند کی گردش کے حساب سے شمار کئے جاتے تھے اور بارہ مہینوں میں سے پہلا۔ ساتواں اور آخری دُو مہینے عزت کے مہینے سمجھے جاتے تھے جن میں ہر قسم کا قتال ممنوع تھا، لیکن بعض اوقات اپنی سہولت کے واسطے عرب انہیں آگے پیچھے بھی کر لیتے تھے تاکہ اگر کوئی ضرورت آپڑے تو ان مہینوں میں بھی بلا خوفِ گناہ جنگ و جدال کر سکیں۔ اس رسم کو نسئی کہتے تھے[1]

عورت کی حیثیت

عرب میں عورت کی حالت بحیثیت مجموعی اچھی نہ تھی۔ بیشک عموماً عورت کو اپنا خاوند خود انتخاب کرنے کا اختیار تھا مگر اس اختیار کے بعد وہ عملاً بے اختیار تھی۔ ہاں ہوشیار عورتیں اپنے خاوندوں پر اچھا اثر رکھتی تھیں۔ جنگ میں عورتوں کے ساتھ جانے کا بیان کیا جا چکا ہے۔ اُن کا کام مردوں کو غیرت دلانا اور زخمیوں کی خبر گیری کرنا تھا۔ عورتیں شعر بھی کہتی تھیں؛ چنانچہ خنساء زمانہ جاہلیت کی ایک مشہور شاعرہ ہے جو بعد میں مُسلمان ہو گئی تھی[2]

عورتوں میں پردے کی رسم نہ تھی بلکہ وہ کھُلی پھرتی تھیں۔ تعدد ازدواج کی کوئی حد نہ تھی اور جتنی بیویاں کوئی شخص رکھنی چاہتا تھا رکھتا تھا۔ بعض اوقات باپ کی منکوحہ پر بیٹا وارث کے طور پر قبضہ کر لیتا تھا۔ اور دو حقیقی بہنوں سے بھی ایک وقت میں شادی کر لیتے تھے۔ مگر ان باتوں کو اشرافِ عرب اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ عرب میں طلاق کا عام رواج تھا اور خاوند جب چاہتا بیوی کو الگ کر سکتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی رسم بھی عرب میں تھی۔ مگر یہ رسم خاص خاص قبائل میں تھی۔ عام نہ تھی۔

لڑکیوں کو ورثہ نہ ملتا تھا اور نہ ہی بیوی کو حتّٰی کہ اگر کسی شخص کی نرینہ اولاد نہ ہوتی تھی تو اس کے مرنے پر سب ترکہ اُس کا بھائی لے جاتا تھا اور اس کی بیوی اور لڑکیاں یُونہی خالی ہاتھ رہ جاتی تھیں۔

رُسوم اور رُسوم پرستی

یہ ابھی بیان کیا جائے گا کہ ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں بہت سے مذاہب پائے جاتے تھے جو مختلف عقائد اور مختلف خیالات کے پَیرو تھے، لیکن عادات اور قومی اخلاق کے لحاظ سے تمام عرب گویا ایک قوم کے حکم میں تھا اور جو جو عادات اور اخلاق ہم نے اُوپر بیان کی ہیں وہ سب میں نمایاں طور پر پائی جاتی تھیں؛ چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں یثرب میں ایک یہودی رئیس فطیون تھا اس کمبخت کا یہ عام حکم تھا کہ شہر میں جس لڑکی کی بھی شادی ہو وہ پہلے اُس کے گھر میں آوے۔ چنانچہ مدینہ کے اکثر یہودی اپنی ناکتخدا لڑکیاں شادی کے وقت پہلے اس کے گھر بھیجتے تھے اور اس کے بعد وُہ کسی اور کے واسطے جائز ہوتی تھیں۔ آخر ایک غیرت مند شخص نے فطیون کو قتل کر ڈالا[3] اسی طرح اس زمانہ

---

[1] ابن ہشام؛ [2] اسد الغابہ؛ [3] وفاء الوفاء بحوالہ سیرۃ النبی؛

میں عیسائیوں کی حالت بھی بہت خراب تھی جیسا کہ میور صاحب نے بھی اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے[1]۔ غرض عرب میں کیا بُت پرست، کیا یہودی اور کیا نصاریٰ سب اخلاق و عادات اور قومی خصائل کے لحاظ سے ایک ہی رنگ میں رنگین تھے اور قتل و غارت، قمار بازی، زنا، شراب خوری کا بازار ہر طرف گرم تھا۔

اسی طرح رسوم کی پابندی بھی سب میں مشترک تھی اور رسُوم پرستی اس درجہ کی تھی کہ مذہب بھی اس کے سامنے ہیچ تھا۔ عجیب عجیب رسوم مُلک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مثلاً ایک تقسیم بالازلام کی رسم تھی۔ یعنی ایک قربانی میں دس لوگ حصّہ ڈالتے تھے اور پھر اس کی تقسیم حصّہ رسدی سے نہ کرتے تھے بلکہ قربانی کے تیروں سے ایک قسم کا قرعہ ڈالا جاتا تھا اور پھر اس طرح جو جو کسی کا حصّہ نکلتا تھا وُہ اُسے مل جاتا تھا اور بعض خالی بھی رہ جاتے تھے۔ ہر تیر کا نام اور الگ الگ حصّہ مقرر ہوتا تھا۔

تیروں سے فال لینے کی رسم بھی عام تھی۔ ہر کام کرتے ہوئے تیر سے فال لیتے تھے۔ کعبہ میں بھی فال کے تیر رکھے ہوئے تھے اور وہاں جا کر لوگ فال نکال لیتے تھے۔ پرندوں کی اڑان سے بھی فال لینے کا دستور تھا۔

ایک عجیب رسم عرب کے بعض قبائل میں یہ تھی کہ جب کسی سفر کے ارادے سے گھر سے نکلتے تھے تو اگر راستہ میں کسی وجہ سے واپس آنا پڑتا تھا، تو دروازوں کے ذریعہ اندر نہ داخل ہوتے تھے بلکہ پُشت کی طرف سے آتے تھے۔ قرآن شریف[2] میں بھی اس کی طرف اشارہ آتا ہے۔

بعض قبائل میں یہ رواج تھا کہ اگر کوئی آدمی مرجاتا تھا تو اس کی قبر کے پاس اُس کے اُونٹ کو باندھ دیتے تھے حتیٰ کہ وُہ بھوک پیاس سے مرجاتا تھا۔ عورتوں میں سخت نوحہ کرنے کی عادت تھی۔ سال سال تک ماتم چلا جاتا تھا۔

عرب میں بالعموم عورتیں جانوروں کا دُودھ نہ دوہتی تھیں اور اسے عورت کے لیے ایک عیب سمجھا جاتا تھا۔ اگر کسی خاندان میں کوئی عورت ایسا کرتی دیکھی جاتی تھی تو وُہ خاندان دُوسروں کی نظروں میں گر جاتا تھا۔

جانوروں کو بُتوں وغیرہ کے نام پر یا کسی نذر وغیرہ کے نتیجہ میں آزاد چھوڑ دینے کی بھی رسم تھی اور اس تعلق میں چار قسم کے جانور زیادہ معروف تھے۔ اوّل سائبہ جو ایسی اونٹنی کو کہتے تھے جس نے پے در پے دس مادہ بچّے جنے ہوں ایسی اُونٹنی پر سواری ترک کر دی جاتی تھی۔ اور اس کا دُودھ بھی سوائے مہمانوں کے استعمال کے حرام سمجھا جاتا تھا اور اس کی اُون بھی نہیں کاٹی جاتی تھی۔ دوسرے بحیرہ جو سائبہ اُونٹنی کے گیارھویں مادہ بچّہ کو کہتے تھے۔ بحیرہ کو اس کے کان درمیان میں کاٹ کر اس کی ماں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ تیسرے حام جو ایسے اُونٹ کا نام رکھا جاتا تھا جو اُوپر تلے دس مادہ بچوں کا باپ ہو اُسے سانڈ کے طور پر کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ چوتھے وصیلہ جو ایسی بکری کو کہتے تھے جو پانچ جھولوں میں مسلسل دس مادہ بچے جنتی تھی۔ ایسی بکری کی بعد کی اولاد کا گوشت صرف مرد

---

[1] لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دیباچہ صفحہ ۸۸ داصل کتاب صفحہ ۲۰ و [2] سورۃ بقرہ: ۱۹۰

کھاتے تھے عورتوں کے لیے حرام تھا۔ البتہ اگر ان میں سے کوئی بچہ مرجاتا تھا تو اس کا گوشت عورتیں بھی کھا سکتی تھیں[۱]۔ قرآن شریف[۲] میں بھی اِن جانوروں کا ذکر آتا ہے۔

نکاح کے متعلق بھی عجیب عجیب رسوم رائج تھیں۔ عموماً نکاح کی صورتیں چار تھیں جن میں سب سے عجیب اور سب سے گندی صورت یہ تھی کہ ایک عورت کے پاس یکلخت چند آدمی پہنچ جاتے تھے اور وہاں یکے بعد دیگرے اپنا مُنہ کالا کرتے تھے اور جب وہ کوئی بچہ جنتی تھی تو پھر یہ لوگ دوبارہ اس کے پاس جمع ہوتے تھے اور وُہ عورت جس شخص کے متعلق کہہ دیتی تھی کہ بچہ اس کا ہے، اسی کی طرف وُہ منسوب ہوتا تھا۔ مگر شرفاء کا دامن اس قسم کی بے حیائیوں سے پاک تھا[۳]۔

یہ چند رُسوم صرف مثال کے طور پر لکھی گئی ہیں ورنہ عرب میں رسوم کی بیحد کثرت تھی اور عجیب عجیب رسومات کا وجود پیدا ہو گیا تھا۔ اسلام نے سب گندی رسوم کو یک قلم منسوخ کر دیا۔

قدیم مذاہب عرب

عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب کے پیرو پائے جاتے تھے، جن میں سے زیادہ ممتاز بُت پرست۔ دہریہ۔ مجوسی، صابی، عیسائی اور یہودی تھے۔ اِن مذاہب میں سب سے زیادہ عام اور سارے مُلک میں پھیلا ہوا بُت پرستی کا مذہب تھا جسے گویا ملک کا اصل مذہب کہنا چاہیئے۔ بُت پرست اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بھی قائل تھے، مگر اس تک پہنچنے کا وسیلہ بتوں کو سمجھتے تھے، لیکن اس درمیانی واسطہ میں وہ ایسے اُلجھے ہوئے تھے کہ اصل معبود کا خیال دل سے نکل گیا تھا۔ مشترک بُتوں کے علاوہ عموماً ہر قبیلہ کا اپنا اپنا خاص بُت بھی تھا۔ چنانچہ مکہ میں اساف اور نائلہ قریش کے بُت تھے۔ جن کے سامنے قُربانیاں ذبح کی جاتی تھیں۔ عُزّیٰ نخلہ میں قریش اور بنو کنانہ کا مشترکہ بُت تھا۔ طائف میں لات بنو ثقیف کا بُت تھا۔ منات اوس اور خزرج کا بُت تھا۔ دومۃ الجندل میں وُدّ بنو کلب کا بُت تھا۔ قبیلہ ھذیل کا بُت سواع تھا۔ یغوث قبائل مذحج اور طَی کا بُت تھا۔ نسر ذوالکلاع کا بُت تھا اور یعوق یمن میں ہمدان کا بُت تھا وغیرہ وغیرہ۔ سب سے بڑا بُت ھبل تھا جو کعبہ میں نصب تھا۔ جنگ میں فتح کے موقعہ پر اسی کے نام کے نعرے لگتے تھے[۴]۔

عرب کے بُت پرستوں کا مذہبی مرکز کعبہ تھا۔ جہاں اُنھوں نے بہت سے بُت جمع کر رکھے تھے[۵] اور عرب کے مُشرک لوگ مُلک کے تمام حصّوں سے ہر سال حج کے واسطے مکہ میں جمع ہوتے تھے۔ یہ گویا ابراہیمی تعلیم کی ایک بقیہ نشانی تھی۔ مگر مراسم حج میں بھی ان لوگوں نے کئی قسم کی مشرکانہ باتیں شامل کر لی تھیں جو اسلام نے خارج کر دیں۔ مکہ کی اسی مذہبی خصوصیت کی وجہ سے مکہ اور اس کے اردگرد کا علاقہ حرم کا علاقہ تھا جہاں ہر قسم کا کشت و خُون سخت ممنوع تھا۔ اسی طرح حج اور عمرہ کے لیے لوگوں کی آمد و رفت میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے

---

[۱] سیرت ابن ہشام و سورۃ انعام ۱۴۰ [۲] سورۃ مائدہ آیت ۱۰۴ [۳] بخاری کتاب النکاح [۴] ابن ہشام
[۵] بخاری کتاب وجوب الحج

سال میں چار مہینے یعنی محرّم ۔ رجب ۔ ذیقعدہ ذی الحجہ خاص عزت کے مہینے سمجھے جاتے تھے جن میں کُشت و خون رُک جاتا تھا اور لوگ امن کے ساتھ اِدھر اُدھر آجا سکتے تھے۔

بُت پرستی کے علاوہ عرب میں دہریت بھی تھی۔ اِس کے پَیرو خُدا کی ہستی ۔ بعث بعدالموت ۔ جزا سزا وغیرہ کے قائل نہ تھے۔ قرآن شریف میں بھی اِس کا ذکر آتا ہے۔

پھر عرب میں مجوسی بھی تھے جو آتش پرست اور ستارہ پرست تھے ، مگر یہ لوگ خُدا کی ہستی کے بھی قائل تھے۔ اور عبادات کا بھی ان کے مذہب میں دستور تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ مذہب جو اپنی اصل کے لحاظ سے ایرانی ہے درحقیقت الہامی مذاہب میں سے تھا مگر آہستہ آہستہ بگڑ گیا۔ قرآن شریف[1] میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ موجودہ پارسی قوم اسی مذہب کی تابع ہے۔

ایک مذہب صابی تھا جس کا ذکر قرآن شریف میں بھی آتا ہے۔ یہ مذہب مجوسیت اور یہودیت کا مجموعہ تھا ، مگر معلوم ہوتا ہے کہ عرب لوگ عام طور پر صابی کا لفظ ہر اُس شخص پر بول دیتے تھے جس نے اپنا قدیم مذہب ترک کر کے توحید سے ملتا جلتا مذہب اختیار کر لیا ہو۔ چنانچہ بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو بھی صابی کہہ کر پکارتے تھے۔

عیسائیت عرب میں ظہورِ اسلام سے بہت عرصہ پہلے داخل ہو چکی تھی اور بعض قبائل اُسے اختیار کر چکے تھے۔ عرب میں نجران کا علاقہ اس مذہب کا بڑا مرکز تھا۔

عرب کے یہودی ابتداءً شام کی طرف سے آئے تھے اور پھر اُس کی اتباع میں بعض دُوسرے قبائل بھی یہودی بن گئے تھے۔ یہود کے بڑے مرکز یثرب ۔ خیبر اور تیما تھے۔

ایک مذہب اور تھا جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہوتا تھا اور توحید کا مدعی تھا اس کا نام بعض لوگوں نے مذہب حنیفی رکھا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوائل زمانہ میں اور اس سے کچھ پہلے بعض لوگ عرب کی انتہائی بُت پرستی سے متنفر ہو کر اور آفتابِ رسالت کی طلوع کرنے والی کرنوں کی پیشگی طور پر روشنی پاتے ہوئے اس مذہب کی طرف مائل تھے مگر ان کی تعداد تمام عرب میں چند نفوس سے زیادہ نہ تھی اور یہ لوگ قریباً سب کے سب مکّہ اور اُس کے آس پاس کے رہنے والے تھے۔ حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی زید بن عمرو جن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی تعلقات تھے انہی لوگوں میں سے تھے ، مگر بعثتِ نبویؐ سے پہلے ہی اُن کا انتقال ہو گیا۔ سعیدؓ بن زید جو مشہور صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں ، انہی کے صاحبزادے تھے۔ زید کو بُت پرستی سے اس درجہ نفرت تھی کہ وُہ بتوں کے چڑھاوے کا کھانا تک نہ کھاتے تھے اور لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ یہ کیا چیزیں ہیں جنھیں تم پُوجتے ہو[2] ۔ طائف میں اُمیّہ بن ابی صلت ایک مشہور شاعر اور معزز رئیس تھا وہ بھی بُت پرستی

---

[1] سورہ حج آیت ۱۸ [2] بخاری حدیث زید بن عمرو

ترک کرکے مذہب حنیفی اختیار کر چکا تھا۔ اُمیہ جنگ بدر کے بعد تک زندہ رہا مگر اسلام لانا اس کی قسمت میں نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بڑے شوق سے اس کے مواحدانہ اشعار سُنے اور افسوس کے ساتھ فرمایا کہ "امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا"[1]

ایک اور شخص ورقہ بن نوفل تھا جو حضرت خدیجہؓ کا چچازاد بھائی تھا اور مکہ میں رہتا تھا۔ یہ بُت پرستی ترک کرکے بعد میں عیسائی ہو گیا تھا اور توریت و انجیل سے واقف تھا اور ان کا مطالعہ رکھتا تھا مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر الٰہی فرشتہ نازل ہوا تو اُس نے آپؐ کی تصدیق کی اور اسی تصدیق کی حالت میں فوت ہوا[2]۔

ایک شخص قس بن ساعدہ جو بکر بن وائل کے علاقہ میں رہتا تھا اور نہایت فصیح و بلیغ خطیب تھا چنانچہ بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عکاظ کے میلے میں اُس کا ایک خطبہ سُنا تھا؛ چنانچہ ایک دفعہ آپؐ زمانۂ نبوت میں فرماتے تھے کہ میں نے عکاظ میں قس بن ساعدہ کا ایک خطبہ سُنا تھا جو اُس نے اُونٹ پر چڑھے چڑھے دیا تھا اور آپؐ اُس کی فصاحت کی تعریف فرماتے تھے۔ قس بھی شرک ترک کرکے توحید اختیار کر چکا تھا مگر اسلام سے پہلے ہی فوت ہو گیا[3]۔

ایک اور شخص عثمان بن حویرث تھا۔ یہ مکہ کا رہنے والا تھا اور بُت پرستی ترک کرکے دین حنیفی کا متبع ہو گیا تھا، لیکن بعد میں جب وہ قیصرِ رُوم کے دربار میں پہنچا تو عیسائی ہو گیا اور اسی مذہب پر اس کی وفات ہوئی۔ یہ اسلام سے پہلے کی بات ہے[4]۔

غرض عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب پائے جاتے تھے مگر باوجود ان مختلف مذاہب کے عرب کا اصل اور عام مذہب بُت پرستی تھا اور دُوسرے لوگ اتنے بھی نہ تھے جیسے آٹے میں نمک۔ اور وہ بھی سخت بگڑی ہوئی اور ناکامی کی حالت میں تھے جیسا کہ خود یورپین مؤرخین کو بھی اقرار ہے؛ چنانچہ قدیم مذاہب عرب پر ریویو کرتے ہوئے سرولیم میور لکھتے ہیں:۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جوانی کے زمانہ میں عرب ایک بندھی لیک پر چلنے والے لوگ تھے اور مُلک کی حالت ہر قسم کے تغیر و اصلاح کے سخت مخالف تھی بلکہ اس کی تمام تاریخ میں شاید اس زمانہ سے بڑھ کر کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ جب اس کی اصلاح اس وقت سے زیادہ مشکل اور مایوس کُن ہو .... عیسائی مذہب کی پانچ سو سال کی تبلیغی کوششوں کا یہی نتیجہ تھا کہ ملک میں خال خال عیسائی نظر آتے تھے اور بس۔ یہودی مذہب زیادہ طاقتور تھا۔ لیکن ایک تبلیغی مذہب کے طور پر وہ بھی اب گویا بالکل رہ چکا تھا لیکن بُت پرستی اور بنو اسمٰعیل کے توہمانہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش مارتا

---

[1] شمائل ترمذی ۞ [2] بخاری ۞ [3] اصابہ ذکر قس بن ساعدہ قسم ۴ ۞
[4] سیرۃ حلبیہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۸ ۞

ہوا کعبہ کی دیواروں سے آ آ ٹکراتا تھا۔[1]

یہ حالت صرف عرب ہی کی نہ تھی بلکہ یہ وقت ساری دُنیا پر ایک سخت تاریکی کا وقت تھا اور تمام مذاہب بگڑ چکے تھے اور گمراہی چاروں طرف اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھی۔ اسی طرف یہ آیتِ قرآنی اشارہ کرتی ہے کہ :۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[2]

"یعنی اسوقت خشکی اور تری ہر دو میں فساد ظاہر ہو چکا ہے"

یعنی الہامِ الٰہی پر بنیاد رکھنے والے مذاہب بھی خراب ہو چکے ہیں اور وہ مذاہب بھی جن کی بنیاد الہام پر نہیں ہے۔ اب دیکھو کہ جب دُنیا میں اندھیرا چھا جاتا ہے تو سُورج نکلتا ہے۔ اور جب زمین تپ جاتی ہے تو وُہ بارش کو کھینچتی ہے۔ تو کیا رُوحانی اندھیرے کے بعد رُوحانی سُورج نہ نکلتا؟ اور کیا رُوحانی زمین کی تپش رُوحانی بارش کو نہ کھینچتی؟ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :

يُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ[3]

"یعنی اللہ تعالیٰ رات اور دن کی حالت کو آپس میں بدلتا رہتا ہے"

نیز فرماتا ہے :

اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[4]

"جان لو! اس وقت وُہ زمین کو زندہ کر رہا ہے بعد اسکے کہ وہ مر چکی تھی"

پس ناگہاں اس تاریکی کے زمانہ میں ایک سُورج نکلا جس نے اپنی شعاعوں سے اطرافِ عالم میں اُجالا کر دیا۔ اور اس شدید گرمی کے وقت میں اچانک ایک بادل اُٹھا جس نے پیاسی زمین پر رحمت کی بارشیں برسائیں۔ اور ندی نالے جو خشک پڑے تھے پانی سے بہہ نکلے۔ یہ سُورج کس اُفق سے طلوع ہوا اور کس طرح نصف النہار پر پہنچا اور یہ بادل کس دامنِ کوہ سے اُٹھا اور کس طرح ساری دُنیا پر چھا گیا؟ ان سوالات کا جواب انشاء اللہ ذیل کے اوراق میں ملے گا۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ

---

[1] دیباچہ لائف آف محمدؐ صفحہ ۸۴، ۸۵ ؛ [2] سورۃ روم : ۴۲ ؛ [3] سورۃ نور : ۴۵ ؛ [4] سورۃ حدید : ۱۸ ؛

مکّہ، کعبہ اور قریش

ابوالانبیاء خلیل اللہ حضرت ابراہیم کا نام نامی کسی معرفی کا محتاج نہیں۔ کون ہے جو ابوالانبیاء خلیل اللہ کو نہیں جانتا۔ مسلمان، عیسائی، یہودی سبھی ان کو مانتے ہیں۔ آپ کا زمانہ موٹے طور پر اکیس۲۱ بائیس۲۲ سو سال قبل مسیح قرار دیا گیا ہے۔ یعنی آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریباً ستائیس۲۷ اٹھائیس۲۸ سو سال پہلے گذرے ہیں۔ آپ نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور عراق کے رہنے والے تھے مگر بعد میں مصر وغیرہ میں سے ہوتے ہوتے بالآخر جنوبی فلسطین میں آباد ہو گئے۔ آپ نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا نام سارہ تھا۔ دُوسری کا نام ہاجرہ تھا۔ اور تیسری کا نام قطورا۔ ان میں سے مؤخر الذکر کے ذاتی حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں اور نہ ہی ہمیں اس جگہ ان سے تعلق ہے مگر اس قدر ذکر غیر مناسب نہ ہوگا کہ وہ قوم مدین کی نسل سے تھی۔ حضرت ابراہیم کی پہلی دو بیویوں میں سے سارہ حضرت ابراہیمؑ کے قریبی عزیزوں میں سے تھیں مگر ہاجرہ ایک غیر خاندان سے تھیں اور مصر کی رہنے والی تھیں۔ ان دونوں کے بطن سے اولاد ہوئی اور اس قدر پھیلی کہ آج دُنیا کے ہر گوشہ میں پائی جاتی ہے۔ حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیمؑ کے بڑے لڑکے تھے۔ اور حضرت سارہ سے اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ یہ دونوں بچے خُدا کی خاص بشارات کے ماتحت پیدا ہوئے تھے اور دونوں کے ساتھ خدا تعالےٰ کی طرف سے خاص برکت کے وعدے تھے[1] اور اُن کے نام بھی خدائی الہام کے ماتحت رکھے گئے تھے[2] اور اسمٰعیل کے متعلق تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہ کی خاص دُعا بھی تھی[3] جیسا کہ اُن کا نام بھی جو دراصل سمع ایل ہے[4] ظاہر کرتا ہے؛ چنانچہ ان دونوں بچوں کو خدا تعالیٰ نے عظیم الشان برکات کا وارث بنایا اور حسب وعدہ ان دونوں کی نسل کو دُنیا میں ہر قسم کے انعام سے مالا مال کیا۔ چنانچہ بنو اسرائیل جن میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ اور حضرت مسیح ناصریؑ جیسے عالی مرتبہ نبی پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاقؑ کی اولاد سے ہیں۔ مگر اس جگہ ہمارا تعلق بنو اسمٰعیل سے ہے جو عرب میں آباد ہوئے اور جن سے فخر اوّلین و آخرین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود نکلا۔

---

[1] پیدائش باب ۱۶ آیت اور باب ۱۷ آیت ۲۰ و باب مذکور آیت ۱۶ و ۱۹۔ [2] پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۱ و باب ۱۷ آیت ۱۹۔
[3] قرآن شریف سورۃ صافات آیت ۱۰۲ و پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۱۔ [4] یعنی خدا نے دُعا سن لی۔

سکونت حجاز اور مکّہ کی آبادی

اسمٰعیلؑ ابھی بچہ ہی تھے کہ اُن کی سوتیلی ماں سارہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو۔ ابراہیمؑ کو طبعاً اس قول پر بہت رنج پیدا ہوا۔ مگر خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے فرمایا کہ رنجیدہ مت ہو اور اس بات کو بُرا نہ جان بلکہ جیسے سارہ کہتی ہے ویسے ہی کر۔ اسحاقؑ بھی تیری اولاد ہے مگر مجھے ہاجرہ کے فرزند اسمٰعیل سے ایک قوم بنانا ہے[1]۔ چنانچہ اس الٰہی ارشاد کے ماتحت حضرت ابراہیمؑ نے سینکڑوں میل کا سفر اختیار کر کے حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ ہاجرہ کو عرب کے علاقہ حجاز کے اندر وادیٔ بکّہ میں لاکر آباد کیا۔ یہ وُہ وادی ہے جہاں اب مکّہ آباد ہے۔ اُس وقت یہ ایک بالکل غیر آباد اور ویران وادی تھی۔ اس وادی میں صَفا اور مروَہ کی گھاٹیوں کے پاس ان دو بے کس اور بے بس جانوں کو تھوڑے سے زاد کے ساتھ جنگل میں چھوڑ کر حضرت ابراہیم اپنے وطن کو واپس روانہ ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ کو واپس جاتے دیکھ کر حضرت ہاجرہ اُن کے پیچھے پیچھے آئیں اور نہایت درد آمیز الفاظ میں کہنے لگیں "آپ کہاں جاتے ہیں۔ اور ہم کو اس طرح کیوں اکیلا چھوڑ کر جارہے ہیں؟" حضرت ابراہیم خاموشی کے ساتھ قدم بڑھاتے گئے اور کوئی جواب نہ دیا۔ آخر ہاجرہ نے کہا۔ آپ کچھ تو بولیں "کیا خُدا نے آپ سے ایسا فرمایا ہے؟" حضرت ابراہیمؑ نے کہا "ہاں" اور پھر خاموشی کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ اس پر ہاجرہ بولیں "اگر اللہ کا حکم ہے، تو پھر آپ بیشک جائیں۔ اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا" یہ کہہ کر ہاجرہ واپس لوٹ آئیں[2]۔ قرآن شریف میں اس واقعہ کا حضرت ابراہیمؑ کے ان الفاظ میں ذکر آتا ہے:۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ[3]

یعنی جب حضرت ابراہیمؑ ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو وادیٔ مکّہ میں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو اُنھوں نے تھوڑی دُور جا کر پیچھے نظر ڈالی اور خدا کے حضور یوں دُعا کی کہ:

> "اے ہمارے ربّ! مَیں نے اپنی نسل کے ایک حِصّے کو اس غیر آباد بنجر وادی میں تیرے عزّت والے گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے ربّ! مَیں نے یہ کام اس لئے کیا ہے کہ تا وُہ تیری عبادت کو قائم کریں اور تیرے لیے ان کی زندگی وقف ہو۔ پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکا دے اور ان کو اچھے اچھے ثمرات کا رزق عطا کر تا کہ وہ تیرے شکر گزار ہوں۔"

عام مؤرخین بیان کرتے ہیں اور حدیث میں بھی ذکر آتا ہے کہ جب حضرت ہاجرہ کا زاد ختم ہو گیا تو لوازماتِ بشری

---

[1] پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۲ و ۱۳ و خمیس جلد ۱ صفحہ ۱۰۵۔ [2] بخاری و تاریخ خمیس۔ [3] سورۃ ابراہیم آیت: ۳۸۔

کے ماتحت ان کو اپنے بیٹے کے متعلق سخت فکر پیدا ہوا اور وُہ اِدھر اُدھر پانی کی تلاش میں پھریں مگر پانی کی ایک بوند تک نہ ملی اور بچے کی حالت پیاس سے جلد جلد اَبتر ہوتی گئی۔ آخر ہاجرہ سے اسمٰعیل کی حالت زار دیکھی نہ گئی، اس لیے وُہ وہاں سے اُٹھیں تاکہ اپنے بچے کی پیاس کی موت کو نہ دیکھیں اور آسمان کی طرف مُنہ کر کے روئیں اور پانی کی تلاش میں پھر اِدھر اُدھر بھاگیں اور اردگرد کے علاقہ پر اچھی طرح نظر ڈالنے کی غرض سے صَفا کی پہاڑی پر چڑھ گئیں۔ لیکن وہاں سے بھی جب کوئی چیز نظر نہ آئی تو بھاگتی ہوئی مَروہ کی پہاڑی پر آئیں۔ وہاں سے پھر دوڑتی ہوئیں صَفا کی طرف گئیں اور اس طرح اُنھوں نے ایک نہایت گھبراہٹ اور بیتابی کی حالت میں اِن پہاڑیوں پر ساتْ چکر لگائے اور ساتھ ساتھ زار زار روتی بھی جاتی تھیں اور اللہ سے دُعا بھی کرتی جاتی تھیں۔ مگر نہ تو کوئی پانی کا پتہ ملتا تھا اور نہ ہی کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ آخر جب ہاجرہ کا کرب انتہا کو پہنچ گیا تو ساتویں چکر کے بعد ہاجرہ کو ایک غیبی آواز سنائی دی کہ "اے ہاجرہ اللہ نے تیری اور تیرے بچے کی آواز سُن لی ہے۔" یہ آواز سُن کر وہ واپس آئیں تو جس جگہ بچہ شدتِ پیاس کی وجہ سے بے تابی کی حالت میں تڑپ رہا تھا وہاں ایک خدائی فرشتہ کو کھڑا پایا جو اپنے پاؤں کی ایڑی اس طرح زمین پر مار رہا تھا کہ گویا کوئی چیز کھود کر نکال رہا ہے۔ حضرت ہاجرہ آگے بڑھیں تو جس جگہ وہ ایڑی مار رہا تھا وہاں اُنھوں نے ایک چشمہ پایا جس میں سے پانی پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ ہاجرہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے فوراً اپنے بچے کو پانی دیا اور اس خوف سے کہ پانی ضائع نہ ہو جائے اس کے اردگرد پتھر رکھ دیئے اور اسے ایک حوض کی صورت میں بنا دیا۔ حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ "خدا ہاجرہ پر رحم کرے۔ اگر وہ اس پانی کو نہ روکتی تو وُہ ایک بہنے والا چشمہ ہو جاتا۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ حج میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا ہاجرہ ہی کی مقدس یادگار ہے۔[1] اِن واقعات کی ایک اجمالی اور کسی قدر محرف و مبدّل نقشہ بائیبل میں بھی مذکور ہے۔[2]

حضرت ہاجرہ کی مقدس یادگار کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا پاس تھا کہ ایک دُوسری روایت سے پتہ لگتا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ جب خُدا تمھارے ہاتھ پر مصر کا ملک فتح کرائے تو اہلِ مصر سے نیکی اور احسان کا سلوک کرنا کیونکہ بوجہ ہماری ماں ھاجرہ کے (جو مصری تھیں) تم پر اہلِ مصر کا خاص حق ہے۔" بہرحال حضرت ابراہیمؑ کے حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل کو مکہ کی ویران آبادی میں آباد کر کے واپس چلے جانے پر ایک غیبی چشمہ کا وجود ظہور میں آیا اور اس کے بعد اس چشمہ کی وجہ سے جو اسلامی تاریخ میں چاہِ زمزم کے نام سے مشہور ہے وادیٔ بکّہ میں اور لوگ بھی آباد ہونے لگے اور مکّہ کی آبادی شروع ہوئی۔ لکھا ہے کہ اس جگہ سب سے پہلے آباد ہونے والا قبیلہ جرھم تھا جو بنو قحطان کی ایک شاخ تھا۔ یہ قبیلہ یمن سے آیا تھا اور پہلے وادیٔ بکّہ سے کچھ فاصلے پر آباد تھا۔ لیکن جب اُن کو زمزم کے وجود سے اطلاع ہوئی تو ان کے رئیس

---

[1] بخاری کتاب بدء الخلق و سیرۃ ابن ہشام ۔ [2] پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۴ تا ۲۱ ۔ [3] مسلم جلد ۲ باب وصیۃ النبی صلعم باہل مصر ۔

مضاض بن عمرو جرہمی نے حضرت ہاجرہ سے چشمہ کے پاس ڈیرہ لگانے کی اجازت چاہی۔ حضرت ہاجرہ نے بخوشی اجازت دیدی اور اس طرح قبیلہ جرہم کے لوگ وادیٔ بکہ میں آباد ہو گئے۔

اسمٰعیل ذبیح اللہ

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو وادیٔ بکہ میں آباد کرنے کے بعد حضرت ابراہیم گاہے گاہے مکہ آیا کرتے تھے اور پھر واپس چلے جاتے تھے۔ جب حضرت اسمٰعیل کی عمر کچھ بڑی ہوئی یعنی بعض روایات کی رُو سے وہ تیرہ سال کے ہو گئے تو حضرت ابراہیمؑ نے ایک خواب دیکھا کہ وُہ حضرت اسمٰعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ چونکہ ابھی تک حضرت ابراہیمؑ پر یہ تعلیم نازل نہیں ہوئی تھی کہ انسانی قربانی ظاہری صورت میں جائز نہیں ہے اور مُلک میں انسانی قربانی کا دستور تھا، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اس خواب کو ظاہر میں پُورا کرنا چاہا اور حضرت اسمٰعیل سے اس کا ذکر کیا۔ اسمٰعیل نے کہا کہ آپ بیشک اپنی خواب کو پُورا کریں، مَیں خدا کے حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیل کو باہر لے گئے۔ اور اسمٰعیل کو زمین پر لٹا کر ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور وفادار بیٹے نے خاموشی اور خوشی کے ساتھ اپنی گردن باپ کے سامنے رکھ دی۔ قریب تھا کہ حضرت ابراہیمؑ چھری چلا دیتے، مگر اُس وقت خدائی فرشتہ نے آواز دی کہ اے ابراہیم! تُو نے اپنی طرف سے اپنی خواب کو پُورا کر دیا۔ اب اسمٰعیل کو چھوڑ اور اس کی جگہ ایک مینڈھا لے کر خُدا کے راستے میں قربان کر دے کہ ظاہر میں یہی اس کی علامت ہے لیکن خواب کا جو حقیقی منشاء ہے وُہ اور طرح پورا ہوگا[1]۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا اور اُس کی یادگار میں مُسلمانوں میں حج کے موقعہ پر قربانی کی رسم قائم ہوئی۔

اِس خواب کے حقیقی منشاء کے متعلق اختلاف ہے لیکن ہمارے نزدیک صحیح معنے یہی ہیں کہ ذبح کرنے سے خُدا کے رَستے میں وقف کرنا مراد ہے جو گویا دنیوی لحاظ سے زندگی کا خاتمہ کر دینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو بکہ میں آباد کرنے کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر ہو اور اُس کی خدمت اور توحید کے قیام کے لیے حضرت اسمٰعیل کی زندگی وقف ہو جائے اور پھر جب مرورِ زمانہ سے بُت پرستی نے توحید پر غلبہ پا لیا تو اسی مقدس خواب کی تعبیر میں خُدا نے حضرت اسمٰعیل کی نسل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو پیدا کیا جنھوں نے اپنے حلقہ بگوشوں کے ساتھ توحید کی اشاعت کے لیے اپنی زندگیوں کو حقیقی معنوں میں قربان کر دیا۔ اور یہی وہ ذبحِ عظیم یعنی عظیم الشان قُربانی ہے جس کی طرف قرآن شریف[2] میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اسمٰعیل کی ظاہری قربانی کے بدلہ میں ایک عظیم الشان قربانی کو مقرر کر دیا اور حج کے موقعہ پر جانور قربان کرنے کی رسم بھی مُسلمانوں میں اِسی مقدس یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ہے کہ انہیں خدا کے رستے میں قربان ہونے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔

---

[1] قرآن شریف سورۃ صافات ۱۰۲تا۱۱۵ و تفسیر ابن جریر شرح سورۃ مذکور [2] سورۃ صافات : ۱۰۸

حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ کے متعلق بعض اعتراضات کا جواب

اس جگہ یہ ذکر ضروری ہے کہ بعض عیسائی مورخین کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل کے عرب میں آباد ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے اور اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسلِ اسمٰعیل میں سے ہونا بھی ان کے نزدیک غیر مسلّم ہے۔ نیز ان کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس بیٹے کو ذبح کرنا چاہا تھا وہ جیسا کہ بائیبل میں بیان ہوا ہے حضرت اسحاقؑ تھے۔ نہ کہ حضرت اسمٰعیل۔ ان ہردو اعتراضات کا جواب مختصر طور پر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ:

۱۔ حضرت اسمٰعیل کا عرب میں آکر آباد ہونا اور قریش مکہ کا حضرت اسمٰعیل کی نسل میں سے ہونا عرب کی متعدد روایات سے قطعی طور پر ثابت ہے اور عرب کی کوئی ایک روایت بھی اس کے خلاف نہیں پائی جاتی۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد[1]۔ اور چونکہ کسی قوم کی تاریخ کے متعلق سب سے مقدم شہادت اس کی اپنی صحیح روایات ہی ہوتی ہیں، اس لیے مذکورہ بالا شہادت کے ہوتے ہوئے کوئی غیر متعصب شخص اس بات میں شک نہیں کر سکتا کہ حضرت اسمٰعیل عرب میں آکر آباد ہوئے اور قریش کا قبیلہ آپ ہی کی مبارک نسل میں سے تھا۔

۲۔ قرآن شریف نے بھی جس کی تاریخی اسناد دوست و دشمن میں مسلّم ہے قریش کو نسلِ ابراہیم میں شمار کیا ہے[2]۔

۳۔ خود بائیبل سے یہ ثابت ہے کہ حضرت سارہ کی ناراضگی کی وجہ سے حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ وطن سے بے وطن ہوئے تھے[3]۔ اب اگر حجاز وہ ملک نہیں جہاں وہ آکر آباد ہوئے تو پھر وہ جگہ کونسی ہے جہاں اُن کی نسل پائی جاتی ہے۔

۴۔ بائیبل سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسمٰعیل اور اُن کی والدہ ایسی جگہ جاکر آباد ہوئے تھے جو غیر آباد اور بیابان جگہ تھی۔ جہاں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی اور نہ کوئی آبادی تھی[4] اور یہ نقشہ مکہ کی وادِ غیر ذی زرع پوری پوری مطابقت رکھتا ہے۔

۵۔ پھر بائیبل سے ہی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وطن سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل فاران میں جاکر آباد ہوئے تھے[5] اور قطع نظر اس کے کہ فاران کے معنے ہی ایک غیر آباد بنجر جگہ کے ہیں[6] عرب کے جغرافیہ دان اس بات پر متفق ہیں کہ فاران مکہ یا حجاز کی پہاڑیوں کا

---

[1] دیکھو بخاری و مسلم و طبری و ابن ہشام و ابن سعد و زرقانی و خمیس وغیرہ۔ [2] قرآن شریف سورۃ حج آیت ۷۹۔

[3] پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۴۔ [4] پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۴ تا ۲۱۔ [5] پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۱۔

[6] فصل الخطاب جلد ۲ صفحہ ۳۸۔

نام ہے[1]۔ اور جو لوگ عرب میں ہو آئے ہیں وُہ جانتے ہیں کہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان وادی فاطمہ میں جو پتّے گُلِ جذیمہ پیچھے نظر آتے ہیں، اُن سے اگر یہ پُوچھا جاوے کہ یہ پھُول کہاں سے لاتے گئے ہیں تو اُن کا جواب یہ ہوتا ہے کہ مِنْ بَرِیَّۃِ فَارَان یعنی دشتِ فاران[2] سے۔ اس شہادت کے ہوتے ہوئے اگر فارآن کسی اور جگہ کا بھی نام ہے تو بیشک ہو لیکن جبکہ حجاز میں بھی فارآن کا ہونا ثابت ہے تو لامحالہ نسلِ اسمٰعیل سے تعلق رکھنے والا فارآن یہی حجاز والا فاران سمجھا جائے گا نہ کہ کوئی اور۔

۶- بائیبل میں یہ بھی مذکور ہے کہ وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسمٰعیل کی نسل "حویلہ سے بیکر شور تک بستی تھی[3]۔" اور خود عیسائی محققین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ حویلہ اور شور سے عرب کی مقابل کی اطراف مراد ہیں[4]۔

۷- بائیبل میں حضرت اسمٰعیل کے متعلق وحشی یعنی جنگل میں رہنے والے کے الفاظ بھی آتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ بات بطور پیشگوئی کے مذکور ہے کہ اسمٰعیل جنگل میں بسنے والا ہوگا[5]۔ اور یہ بات حضرت اسمٰعیل کے مکّہ میں آباد ہونے کے ساتھ بالکل مطابقت کھاتی ہے۔ اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ خود لفظ عرب کے معنے بھی جنگل اور ویران علاقہ کے ہیں۔ جیسا کہ اعراب کے لفظ سے ظاہر ہے جس کے معنے جنگل کے رہنے والوں کے ہیں[6]۔

۸- مسیحیوں کے مشہور امام پُولس یعنی سینٹ پال نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ کو عرب سے نسبت ہے[7]۔

۹- قیدار جو مسلّمہ طور پر حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے تھا۔ اس کے متعلق بائیبل سے یہ بات ثابت ہے کہ اُس کی نسل عرب میں آباد تھی[8]۔

۱۰- اسی قیدار بن اسمٰعیل کے متعلق انسائیکلوپیڈیا میں یہ الفاظ درج ہیں کہ "وہ اسمٰعیل کا بیٹا تھا، جس کی نسل عرب کے جنوبی حصّہ میں آباد ہوئی[9]۔"

مندرجہ بالا دلائل سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت اسمٰعیل عرب میں آباد ہوئے اور عرب کی آبادی کا ایک حصّہ اُنہی کی نسل سے ہے اور جب یہ ثابت ہے تو عرب کی ان زبردست روایات

---

[1] معجم البلدان جلد ۶ صفحہ ۳۲۳ ٭ [2] فصل الخطاب جلد ۲ صفحہ ۳۰ ٭ [3] پیدائش باب ۲۵ آیت ۱۸ ٭
[4] انسائیکلوپیڈیا ببلیکا مطبوعہ لنڈن ۱۸۹۳ء بحوالہ ریویو آف ریلیجنز جلد ۲۳ ٭ [5] پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲ ٭
[6] تاج و اقرب الموارد وغیرہ ٭ [7] گلتیوں باب ۴ آیت ۲۲ تا ۲۵ ٭ [8] یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۸ ٭
[9] انسائیکلوپیڈیا ببلیکا مطبوعہ لنڈن ۱۸۶۲ء بحوالہ ریویو آف ریلیجنز جلد ۲۳ ٭

کہ جن سے قریش کا حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہونا ظاہر ہوتا ہے رد کرنا ہرگز انصاف پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا۔

دُوسرا سوال یہ ہے کہ ذبیح کون تھا؟ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد میں سے کس کو خدا کی راہ میں قُربان کر دینے کا تہیّہ کیا تھا۔ سو اس کے متعلق پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ سوال کوئی خاص اہمیّت نہیں رکھتا۔ کیونکہ خواہ حضرت اسمٰعیلؑ ذبیح ثابت ہوں یا اسحاقؑ اس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے دعاوی پر یا اسلام کے کسی بنیادی اصول پر اثر نہیں پڑتا۔ مگر ایک تاریخی واقعہ کے لحاظ سے یہ بات ضرور قابلِ تحقیق ہے کہ ذبیح کون ہے؟ سو جیسا کہ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے ہماری رائے میں دُرست بات یہی ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ تھے نہ کہ حضرت اسحاقؑ۔ بے شک بائبل میں حضرت اسحاق کو ذبیح بیان کیا گیا ہے مگر اول تو بائبل کی تاریخی حیثیت زیادہ معتبر نہیں ہے۔ دُوسرے خود بائبل ہی کے بیان سے یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے اور اسلامی روایات کی شہادت مزید برآں ہے۔ بہرحال اس مسئلہ میں ہمارے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابراہیمؑ نے ہم سے نیک اور صالح اولاد کی دُعا کی اور ہم نے اُسے ایک حلیم بیٹے کی بشارت دی۔ اور جب وہ لڑکا کچھ بڑا ہوا تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے اس بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس پر ابراہیمؑ اپنے اس بیٹے کو خدا کی راہ میں جسمانی طور پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گئے اور بیٹے نے بھی خدائی حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا لیکن عین اس وقت جبکہ ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو گرا کر اس کے گلے پر چھُری پھیرنے لگے خدائی فرشتہ نے اُنہیں اِس فعل سے روک دیا۔ الخ۔ اور پھر اس کے بعد آگے چل کر آتا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰق کی بشارت دی[1]۔ اس بیان سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ جس بیٹے کے ذبح کرنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ تیار ہوتے تھے وہ اسمٰعیل تھے نہ کہ اسحٰق۔ کیونکہ قرآن شریف نے حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے کا ذکر کر کے اُس کے ساتھ ذبح کے واقعہ کو جوڑا ہے اور اسحٰق کی پیدائش کا اس کے بعد ذکر کیا ہے، حالانکہ اگر حضرت اسحٰق ذبیح ہوتے تو ذبح کا ذکر اسحٰق کے ساتھ ملا کر ہونا چاہیئے تھا نہ کہ حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے کے ساتھ۔

(۲) قرآن شریف میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ خُدا نے جب حضرت ابراہیم کو حضرت اسحاق کی بشارت دی تو اس کے ساتھ ہی اسحاق کے بیٹے یعقوب کی بھی بشارت دی یعنی ایک ہی وقت میں بیٹے اور پوتے دونوں کی بشارت دی گئی[2]۔ اب جب شروع سے ہی حضرت اسحاق کے ساتھ ساتھ حضرت یعقوب کی بشارت بھی موجود تھی تو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ حضرت ابراہیم اسحاق کو جسمانی طور پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے جبکہ وہ جانتے تھے کہ اس کی زندگی کم از کم اس وقت تک مقدر ہے کہ اس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہو۔

(۳) حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم فرمایا کرتے تھے کہ اَنَا ابْنُ الذَّبِیْحَیْنِ یعنی میں دو

---

[1] سورۃ صافات آیت ۱۰۱ تا ۱۱۳ ۔ [2] سورۃ ہود آیت ۷۲ ۔

ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔[1] یعنی ایک حضرت اسمٰعیل اور دوسرے عبداللہ بن عبدالمطلب جنہیں آپؐ کے دادا نے ایک نذر کے نتیجہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور وہ اس کے لیے تیار ہوگئے تھے۔ اس حدیث سے کم از کم اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک محقق بات یہی تھی کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل تھے نہ کہ حضرت اسحاق۔

(۴) بائبل سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں یہ طریق رائج تھا کہ سب سے بڑا بچہ خُدا کے لیے وقف کر دیا جاتا تھا۔[2] اور چونکہ وقف بھی رُوحانی رنگ میں ذبح کا ہم معنے ہے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں اس رسم کے پائے جانے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل تھے، کیونکہ وہ حضرت ابراہیم کے بڑے لڑکے تھے اور اسحاق چھوٹے۔

(۵) ذبح کے متعلق قومی رنگ میں جتنی بھی رُسوم تھیں وُہ سب عربوں میں پائی جاتی تھیں اور اب بھی پائی جاتی ہیں اور اُن میں سے کوئی بھی بنواسرائیل میں نہیں پائی جاتی جو اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل تھے نہ کہ حضرت اسحاق۔ کیونکہ اگر ذبیح حضرت اسحاق ہوتے تو یہ رسوم بنواسمٰعیل کی بجائے بنواسرائیل میں پائی جانی چاہیئے تھیں، مگر معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ مثلاً بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ لوگ جن کی زندگی خدا کے لیے وقف ہو جو ذبح کا حقیقی مفہوم ہے وُہ بال منڈوانے سے باز رہتے تھے۔[3] مگر باوجود اس کے کہ بائبل حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کی مدعی ہے۔ بنواسرائیل میں ایسی کوئی رسم نہیں پائی جاتی جو اس قربانی کی یادگار بھی جا سکے۔ لیکن اس کے بالمقابل عربوں میں جو نسلِ اسمٰعیل میں سے ہونے کے دعویدار ہیں یہ رسم اسلام سے پہلے بھی پائی جاتی تھی اور اسلام کے بعد بھی جاری رہی۔ چنانچہ حج کے موقعہ پر قربانی سے پہلے عربوں میں بال منڈانے یا کترانے سے باز رہنے کا دستور تھا جو اسلام میں بھی قائم رہا۔ اِسی طرح عربوں میں حج کے موقعہ پر جانوروں کی قربانی کا دستور تھا، جو اس مینڈھے کی قربانی کی یادگار تھا جو حضرت اسمٰعیل کے بدلے میں قربان کیا گیا۔ اور یہ دستور اسلام میں بھی قائم رہا۔ مگر بنواسرائیل میں یہ رسم کہیں نظر نہیں آتی۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ قربانی کا ورثہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد نے پایا ہے نہ کہ حضرت اسحاق کی اولاد نے۔ اور ظاہر ہے کہ جس قوم نے یہ ورثہ پایا ہے اُسی کا جدِ اعلیٰ ذبیح سمجھا جانا چاہیے۔

(۶) بائبل میں مقامِ ذبح یعنی قربان گاہ "موریا" کو ظاہر کیا گیا ہے، مگر یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ جگہ کہاں واقع ہے۔ البتہ یہ ذکر ہے کہ یہ ایک پہاڑی جگہ ہے۔[4] بائبل میں اس جگہ کے متعلق تصریح نہ ہونے کی وجہ سے خود یہودی اور مسیحی علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ جگہ کہاں اور کونسی ہے، لیکن غور کریں تو مکہ کے پاس کی پہاڑی

---

[1] خمیس جلد ا صفحہ ۱۰۸ ۔ [2] گنتی باب ۸ آیت ۱۷ و استثناء باب ۲۱ آیت ۱۵ تا ۱۷ ۔
[3] قاضیوں باب ۱۳ آیت ۴ ۔ [4] پیدائش باب ۲۲ آیت ۲ ۔

"مروہ" کے ساتھ یہ نام اور یہ تشریح بالکل منطبق ہو جاتی ہے۔ اور نام میں جو خفیف سا فرق ہے وہ زبانوں کے اختلاف کی بنا پر قابلِ لحاظ نہیں ہے۔ بیشک یہ دُرست ہے کہ اب حج کے موقعہ پر قربانی مروہ کے پاس نہیں ہوتی بلکہ مِنیٰ میں ہوتی ہے لیکن اوّل تو منیٰ اور مروہ ایک دُوسرے کے پاس ہی ہیں۔ دُوسرے حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اصل قربانی گاہ مروہ ہی تھی[1]۔ مگر بعد میں حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے آبادی سے فاصلہ پر مقرر کردی گئی۔

(۷) بائیبل نے باوجود اس کے کہ ذبیح حضرت اسحٰق کو بیان کیا ہے اس واقعہ کی تفصیل میں ایسی باتیں درج کی ہیں کہ وہ حضرت اسحٰق پر نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیل پر صادق آتی ہیں۔ قربانی کا ذکر بائیبل میں کتاب پیدائش[2] میں کیا گیا ہے مگر اس بیان میں جہاں اسحٰق کو ذبیح کہا گیا ہے وہاں ساتھ ہی انہیں حضرت ابراہیمؑ کا اکلوتا بیٹا کہہ کر پکارا گیا ہے، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسحٰق کسی صورت میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے اکلوتے بیٹے نہیں کہلا سکتے بلکہ اکلوتا کہلانے کا حق اگر کسی کے لیے سمجھا جا سکتا ہے تو وہ حضرت اسمٰعیل ہیں۔ کیونکہ حضرت اسمٰعیل تیرہ چودہ سال کی عمر تک حقیقۃً حضرت ابراہیمؑ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ مگر حضرت اسحٰق کو کبھی بھی یہ پوزیشن حاصل نہیں ہوئی۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ابتداءً بائیبل میں بھی اسمٰعیل کو ہی ذبیح بیان کیا گیا تھا مگر بعد میں قومی رقابت کے جذبات سے متاثر ہو کر یہودی علماء نے اس نام کو بدل کر اسحاق کر دیا مگر تفصیلات میں بعض ایسی باتیں باقی رہ گئیں جو اس تحریف کو بے نقاب کر رہی ہیں۔ اسی طرح بائیبل کے اس بیان میں یہ مذکور ہے کہ بیٹے کے ذبح سے روک دینے کے بعد خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے فرمایا کہ "تُو نے میرے رستے میں قربانی کے لیے اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا اب مَیں تیری اولاد میں بہت برکت دُوں گا اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی۔" ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ ذبیح وہ لڑکا ہے جس کی نسل میں وہ عظیم الشان نبی پیدا کیا جانا مقدر تھا جو بلا امتیاز قوم و ملت ساری دُنیا کے لیے مبعوث ہونے والا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں آکر پورا ہُوا، کیونکہ آپؐ ہی وہ نبی ہیں جو ساری دُنیا کے لیے مبعوث ہوئے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ مجھ سے پہلے نبی صرف خاص خاص قوموں کی طرف آتے تھے مگر مَیں سب اقوامِ عالم کی طرف بھیجا گیا ہوں[3]۔ اس کے مقابل پر بنی اسرائیل کے آخری نبی یعنی حضرت مسیح ناصری کے یہ الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں کہ "مَیں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا[4]" اور یہ کہ "مَیں بچوں (یعنی بنی اسرائیل) کی روٹی کتوں (یعنی غیر قوموں) کے آگے نہیں ڈال سکتا[5]" اسرائیلی نبیوں کی یہ محدود رسالت اور اس کے مقابل پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمگیر دعوت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ساری

---

[1] موطا امام مالکؒ ۔ [2] پیدائش باب ۲۲ ۔ [3] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِداً ۔
[4] متی باب ۱۵ آیت ۲۴ ۔ [5] مرقس باب ۷ آیت ۲۷ ۔

قوموں کو برکت دینے کا وعدہ جو بیٹے کے ذبح کے انعام میں حضرت ابراہیمؑ سے کیا گیا وہ حضرت اسحاق کی اولاد میں نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں پورا ہوا۔ اور یہ کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل تھے نہ کہ اسحاق۔

اِس بحث کے ختم کرنے سے قبل ایک اور اعتراض کا جواب دینا بھی ضروری ہے جو بعض متعصّب مسیحیوں کی طرف سے حضرت ہاجرہ کے متعلق کیا جاتا ہے اور وُہ یہ کہ حضرت ہاجرہ محض ایک لونڈی تھیں اور حضرت ابراہیمؑ کی اصل بیوی حضرت سارہ تھیں اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک لونڈی کی اولاد سے ہیں۔ اس اعتراض کے متعلق پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ اعتراض محض حسد اور عداوت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے ورنہ ایک ہی مُنہ سے ایک ہی وقت میں یہ دو اعتراض نہیں نکل سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نسلِ اسمٰعیل میں سے نہیں ہیں اور یہ کہ آپ ایک لونڈی کی نسل سے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ لیکن چونکہ غرض یہ ہے کہ اگر ایک اعتراض نشانہ پر نہ بیٹھے، تو دُوسرا اس کی جگہ لینے کے لیے تیار ہو۔ اس لیے ایک ہی سانس سے یہ گرم و سرد ہوا نکالی جا رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر دو اعتراض غلط اور غیر مؤثر ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسلِ اسمٰعیل میں سے ہونے کی بحث تو اُوپر گذر چکی ہے اور حضرت ہاجرہ کے متعلق اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو کسی یقینی دلیل سے ان کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ عربی نسخوں میں ان کے متعلق عموماً جاریۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنے لونڈی اور لڑکی ہر دو کے ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت ہاجرہ کبھی غلامی کی قید میں رہی تھیں تو پھر بھی اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے انہیں اپنے عقد میں لے لیا تو انہیں بیوی کے طور رکھا تھا نہ کہ لونڈی کے طور پر۔ اور اگر محض ایک عرصہ کے لیے قیدِ غلامی میں رہنا قابلِ اعتراض ہے تو ہمارے معترضین کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس داغ سے حضرت سارہ بھی محفوظ نہیں رہیں۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ مصر میں تشریف لے گئے تو مصر کے بادشاہ نے حضرت سارہ کو حضرت ابراہیمؑ سے چھین کر اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا اور پھر انہیں کچھ عرصہ کے بعد رہائی نصیب ہوئی تھی[1] اور بنو اسرائیل کے جدِّ امجد حضرت یوسف بن یعقوب کا مصر میں غلام بن کر فروخت ہونا اور ایک عرصہ دراز تک اسی حالت میں زندگی گذارنا تو ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس سے سکولوں کے کم سن بچے بھی واقف ہیں۔ پس اگر حضرت ہاجرہ کی زندگی کا کوئی حصّہ قیدِ غلامی میں بسر بھی ہوا تو یہ کوئی طعن کی بات نہیں ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ کا لونڈی ہونا ہی غیر ثابت ہے بلکہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ جب مصر کا بادشاہ اپنے فعلِ شنیع کے بعد حضرت ابراہیم اور ان کی بیوی سارہ سے مرعوب ہوا تو اس نے نہ صرف حضرت سارہ کو آزاد کر دیا بلکہ اپنے حرم سے ایک شریف اور ہونہار لڑکی بھی حضرت سارہ اور حضرت ابراہیم کے پیش کی اور وُہ لڑکی یہی حضرت ہاجرہ ہیں۔ بائیبل اور اسلامی روایات ہر دو میں جس طرح شاہِ مصر کا حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ سے مرعوب ہونا اور اُن کی بزرگی اور قوت

---

[1] پیدائش باب ۱۲ آیت ۱۴ تا ۲۰ نیز چیمبرس انسائیکلو پیڈیا ایڈیشن ۱۹۳۰ء جلد ۱ صفحہ ۱۸ کالم ۲

رُوحانی کا قائل ہوتا بیان ہوا ہے۔ اس سے یہ ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ ہاجرہ خود شاہ مصر کے قریبی عزیزوں میں سے ایک لڑکی ہوں۔ جو اُس نے اپنے اس فعل کی تلافی میں جو حضرت سارہ کے بارے میں اُس سے سرزد ہوا حضرت ابراہیمؑ اور سارہ کی خدمت میں پیش کر دی تھی جس کی وجہ سے وُہ بعد میں لونڈی قرار دے دی گئی۔ یہ صرف قیاس ہی نہیں ہے بلکہ بعض پرانے محققین نے اسے بطور ایک حقیقت کے بیان کیا ہے۔ چنانچہ ایک یہودی عالم جس کا نام ربی شلوم ہے اپنی تورات کی تفسیر میں یہاں تک لکھتا ہے کہ ہاجرہ خود شاہِ مصر کی اپنی لڑکی تھی جو اُس نے سارہ کی کرامت دیکھ کر اس کی خدمت کے لیے پیش کر دی تھی[1]۔

الغرض لونڈی ہونے کا الزام بالکل غلط اور نادرست ہے۔ لیکن اگر بالفرض غلامی ثابت بھی ہو تو یقیناً ایسی غلامی کسی داغ کا باعث نہیں ہے کہ ایک بے گناہ شخص کو جبراً اُس کی آزادی سے محروم کر کے قید میں ڈال لیا جائے جیسا کہ عموماً اس زمانہ میں ہوتا تھا۔ اگر یہی غلامی ہے تو دُنیا کی کوئی شریف اور آزاد قوم بھی اس غلامی کے داغ سے محفوظ نظر نہیں آتی۔ خود بنی اسرائیل کی قوم ایک بڑے لمبے عرصہ تک یعنی ابتداءً مصر میں اور پھر بابل میں غلامی کی قید میں محبوس رہی ہے[2] مگر یقیناً اس وجہ سے بنی اسرائیل کے نبی اور بادشاہ غلام زادے نہیں کہلا سکتے اور نہ ہی حضرت سارہ کا شاہِ مصر کے حرم میں عارضی طور پر محبوس رہنا یا حضرت یوسف کا عزیز مصر کے گھر میں بطور غلام کے زندگی بسر کرنا کسی اسرائیلی فرزند کے لیے باعثِ طعن سمجھا جا سکتا ہے۔ فافہم۔

تعمیر کعبہ

اِس ضمنی مگر ضروری بحث کے بعد ہم اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدائی حکم کے ماتحت حضرت ہاجرہ اور اُن کے فرزند دلبند کو مکّہ کی وادیٔ غیر ذی زرع میں لا کر آباد کیا۔ اور پھر واپس تشریف لے گئے۔ جب حضرت ابراہیم عرب میں دوبارہ سہ بارہ تشریف لائے تو حضرت ہاجرہ فوت ہو چکی تھیں۔ اور اتفاق سے دونوں دفعہ حضرت اسمٰعیل بھی کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور اس وجہ سے باپ بیٹے کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ چوتھی دفعہ پھر عرب میں تشریف لائے اور اس دفعہ دونوں نے مل کر مکّہ میں ایک عبادت خانہ کی تعمیر شروع کی۔ یہ عبادت خانہ دراصل بہت پُرانا تھا۔ مگر اس کے نشان مٹ چکے تھے۔ اور حضرت ابراہیم نے خُدا سے علم پا کر اسے نئے سرے سے تعمیر کرنے کی تجویز کی تھی۔ حضرت اسمٰعیل تعمیر کے کام میں آپ کے مددگار تھے اور آپ کو پتھر لا لا کر دیتے تھے[3]۔ جب دیواریں کچھ اونچی ہو گئیں تو حضرت ابراہیمؑ نے ایک خاص پتھر لیکر کعبہ کے ایک کونہ میں نصب کیا تاکہ وہ لوگوں کے لیے بطور نشان کے ہو کہ بیت اللہ کا طواف یہاں سے شروع کرنا چاہیئے[4]۔ یہ حجرِ اسود ہے جسے حج میں طواف کے وقت مُنہ سے یا ہاتھ کے اشارہ سے بوسہ دیتے ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ حجرِ اسود کوئی بالذات مقدس چیز

---

[1] ارض القرآن جلد ۲ صفحہ ۴۱ [2] بائبل وانسائیکلوپیڈیا۔ [3] ازرقی وزرقانی وخمیس
[4] خمیس۔

نہیں ہے۔ اور نہ ہی طواف کے وقت اسے بوسہ دینا کسی طرح شرک سمجھا جا سکتا ہے بلکہ وہ محض علامت کے طور پر ہے اور اصل تقدس صرف ان پاک روایات کو حاصل ہے جو خانہ کعبہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے، تو آپ نے حجرِ اسود کی طرف مُنہ کر کے فرمایا کہ "اے پتھر! میں جانتا ہوں کہ تو صرف ایک پتھر ہے اور تجھے نفع یا نقصان کی کوئی طاقت حاصل نہیں ہے۔ اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے ہرگز بوسہ نہ دیتا[1]۔" علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ طواف میں صرف حجرِ اسود والے کونے کو ہی بوسہ نہیں دیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ والے دُوسرے کونے کو بھی بوسہ دیا جاتا ہے اور باقی دو کونوں کو بوسہ دینا اس لیے ترک کیا جاتا ہے کہ بوجہ حطیم کی جگہ چھوٹ جانے کے وہ اپنی اصلی جگہ پر قائم نہیں رہے۔ اس طرح بھی حجرِ اسود کی کوئی خصوصیت نہیں رہتی[2]۔ غرض حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے مِل کر ان گھڑت پتھروں کا ایک بے چھت چوکور کوٹھا تیار کیا جس کی بلندی نو ہاتھ تھی اور طول ۳۲ ہاتھ تھا اور عرض ۲۲ ہاتھ[3]۔ یہی خانہ کعبہ ہے جو آج مرجعِ خلائق ہے۔

<u>دُعائے خلیل</u> قرآن شریف میں اس تعمیر کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ[4]
وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ
اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ
اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ
وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ[5]

"بیشک پہلا گھر جو لوگوں کے فائدہ کی غرض سے خُدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا وُہ وہی ہے جو وادیٔ بکہ میں ہے جو برکت دیا گیا ہے اور ہدایت کا باعث بننے والا ہے سارے جہان کے لیے۔ اور یاد کر جب ابراہیم اور اسمٰعیل اس گھر کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے اُس وقت وُہ اللہ سے دُعائیں کرتے تھے کہ اے ہمارے رب تُو ہماری طرف سے اس خدمت کو قبول کر۔ بیشک تُو بہت سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب تُو ہم دونوں کو اپنے فرمانبردار بندے بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک فرمانبردار

---

[1] بخاری کتاب وجوب الحج ۔ [2] بخاری کتاب الحج ۔ [3] تاریخ مکہ ازرقی ۔ [4] سورۃ آلِ عمران: ۹۷
[5] سورۃ بقرہ آیت ۱۲۸ تا ۱۳۰ ۔

جماعت پیدا کر اور ہم کو عبادت اور حج کے طریقے بتا اور ہماری طرف رجوع برحمت ہو۔ بیشک تو رحمت کے ساتھ رجوع کرنے والا اور بہت مہربان ہے۔ اے ہمارے رب تو مبعوث کیجیو ان میں اپنا ایک رسول انہی میں سے جو تیری آیات اُن کو سنائے اور انکو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک وصاف کرے۔ بیشک تو غالب اور حکیم ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اسی دردمندانہ دعا کا نتیجہ تھی؛ چنانچہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اَنَا دَعْوَةُ اِبْرَاهِیْمَ یعنی میں ابراہیم کی دعا کا ثمرہ ہوں[1]

اعلانِ حج جب کعبہ کی تعمیر مکمل ہو چکی تو ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کو ارشاد ہوا:

" وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ[2]"

میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے پاک وصاف رکھ۔ اور اعلان کر لوگوں میں کہ وہ اس کے حج کے لیے آئیں۔ وہ آئیں گے تیرے پاس پیدل چل کر اور دُبلی دُبلی یعنی لمبے لمبے سفر کرنے والی اُونٹنیوں پر سوار ہو کر جو ہر دُور دراز رستے سے آئیں گی۔

یہ اعلان کعبۃ اللہ کے مرکز بننے کی بنیاد ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد جلدی ہی کعبہ تمام عرب کا مذہبی مرکز بن گیا اور عرب کے دُور دراز حصّوں سے اُس کے حج کے لیے لوگ آنے لگے۔

تولیتِ کعبہ یہ بتایا جا چکا ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے آباد ہونے والا قبیلہ جرہم الثانیہ تھا ان کے رئیس مضاض بن عمرو کی لڑکی سے حضرت اسمٰعیلؑ کی شادی ہوئی جس سے بارہ بچے پیدا ہوئے۔ جن میں سے بڑے کا نام نابت اور اُس سے چھوٹے کا نام قیدار تھا۔ اہلِ عرب زیادہ تر قیدار بن اسمٰعیل کی اولاد ہیں۔ اور قریش بھی قیدار کی نسل سے ہیں۔ جب تک حضرت اسمٰعیل زندہ رہے، وہ خود کعبہ کے متولّی تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے نابت متولی ہوئے۔ جب یہ بھی وفات پا گئے تو کعبہ کی تولیت نابت کے نانا مضاض بن عمرو کے پاس آ گئی اور پھر ایک بڑے لمبے عرصہ تک قبیلہ جرہم ہی کے پاس رہی۔

مگر ایک طویل زمانہ کے بعد بنو قحطان کی ایک شاخ قبیلہ خزاعہ نے قبیلہ جرہم پر غلبہ پا لیا اور کعبہ کی تولیت اُن سے چھین لی۔ قبیلہ جرہم کو مکہ سے نکالے جانے کا سخت صدمہ ہوا اور وہ یہاں سے نکل کر پھر یمن کی طرف

---

[1] ابن عساکر بحوالہ جامع الصغیر ٭ [2] سورۃ حج آیت ۲۷، ۲۸ ٭

ہجرت کر گئے لیکن مکہ سے نکلنے سے پہلے اُن کے رئیس عمرو بن الحرث نے اپنے قومی اموال کو چاہِ زمزم میں ڈال کر اُسے اُوپر سے بند کر دیا اور اس طرح جب قبیلہ خزاعہ کے لوگ مکہ میں داخل ہوئے تو یہ مقدس چشمہ غائب تھا اور پھر یہ سینکڑوں سال تک بند رہا حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے اس کا نشان پتہ لگا کر اسے پھر جاری کیا۔ بہرحال قبیلہ جرہم کے بعد قبیلہ خزاعہ مکہ کا حاکم اور کعبہ کا متولی ہوا[1]۔ کعبہ میں بُت پرستی کی آمد اسی قبیلہ خزاعہ کے رئیس عمرو بن لحی کی طرف منسوب کی جاتی ہے[2]۔ جسے شام میں بُت پرستوں کو بُت پُوجتے دیکھ کر یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کعبہ میں بھی ایسے بُت ہوں اور لوگ انہیں پُوجیں۔ چنانچہ اس نے چند بُت شام سے لا کر کعبہ کے آس پاس قائم کئے[3]۔ چونکہ اس وقت کعبہ عرب کا مذہبی مرکز بن چکا تھا اور لوگ ہر سال یہاں حج کے واسطے جمع ہوتے تھے اس لیے اس ذریعہ سے تمام ملک میں بُت پرستی پھیل گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے عرب کے کسی حصّہ میں بُت پرستی نہ تھی بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ کعبہ میں بتوں کی آمد عرب کے ہر حصّہ میں بُت پرستی کے پھیل جانے اور مستحکم ہوجانے کا بڑا باعث ہوئی؛ چنانچہ اس کے بعد آہستہ آہستہ صرف کعبہ میں بتوں کی تعداد ۳۶۰ تک پہنچ گئی۔ ایک بڑے عرصہ کے بعد کعبہ کی تولیت قبیلہ خزاعہ کے ہاتھ سے بھی نکل گئی۔ اس کی وجہ لکھتے ہوئے مؤرخین ایک عجیب قصّہ بیان کرتے ہیں، جس کا یہاں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

فہر بن مالک کی اولاد یعنی قبیلہ قریش میں پانچویں صدی عیسوی کے نصف کے قریب ایک شخص گذرا ہے جس کا نام قصیّؓ بن کلاب تھا۔ یہ بہت سمجھدار شخص تھا اور نوجوانی کے ایام میں ہی اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ مکہ کی حکومت اور کعبہ کی تولیت اسماعیلؑ کی اولاد کا وِرثہ ہے جو کسی اور قوم کے ہاتھ میں نہیں رہنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ مکہ آیا اور آہستہ آہستہ رسوخ پیدا کر کے حلیل بن حبشیہ خزاعی کی لڑکی حبّی سے شادی کر لی جو اس زمانہ میں قبیلہ خزاعہ کا رئیس تھا۔ اور اس وقت اُسی کے ہاتھ میں کعبہ کی تولیت تھی۔ حلیل جب مرنے لگا تو اُس نے یہ وصیت کی کہ میرے بعد کعبہ کی تولیت میری لڑکی حبّی زوجہ قصیؓ کے سپُرد ہو۔ اس طرح کعبہ کی تولیت عملاً قصیؓ کے ہاتھ میں آگئی۔ مگر قصیؓ کا دل صرف ایک مختار کی حیثیت پر تسلی نہیں پا سکتا تھا بلکہ وہ ایک اصل حقدار کے طور پر مکہ کا حاکم اور کعبہ کا متولی بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ اپنا حق جمانا شروع کیا۔ جب قبیلہ خزاعہ کے لوگوں کو اس کا علم ہوا تو وہ سخت برہم ہوئے اور لڑائی پر آمادہ ہوگئے۔ اُدھر قصیؓ نے بھی اپنی قوم کے لوگ جمع کر لیے اور دونوں قبیلوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ آخر اس بات پر صلح ہوئی کہ کسی شخص کو ثالث مقرر کیا جاوے۔ جو فیصلہ یہ ثالث کرے اُسے فریقین قبول کریں۔ چنانچہ ایک شخص عمرو بن عوف ثالث مقرر ہوا جس نے یہ فیصلہ دیا کہ کعبہ کی تولیت کا اصل حقدار قصیؓ ہے۔ اور یہ کہ جتنے آدمی

---

[1] ابن ہشام ۔ [2] بخاری باب قصّہ خزاعہ ۔ [3] ابن ہشام

قبیلہ خزاعہ کے مارے گئے ہیں ان کا کوئی فدیہ نہیں لیکن قصی کے تمام مقتولوں کا فدیہ قبیلہ خزاعہ ادا کرے۔ اس طرح ایک بڑے لمبے عرصہ کے بعد کعبہ کی تولیت پھر بنو اسمٰعیل میں آگئی[1] اور چونکہ کعبہ کی تولیت دنیوی جاہ و اقتدار کا ذریعہ بھی تھی کیونکہ وہ قبیلہ جس کے ہاتھ میں یہ تولیت ہوتی تھی تمام عرب میں خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اس لیے قریش اس ذریعہ سے بہت معزز و محترم ہو گئے۔

کعبہ کی دوبارہ سہ بارہ تعمیر ہر دنیوی چیز کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ لگا ہوا ہے؛ چنانچہ کعبہ بھی حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کے بعد کئی دفعہ گرا اور کئی دفعہ بنا۔ بعض اوقات کسی سیلاب کے زور سے جو مکہ کی وادی میں کبھی کبھی آ جاتا تھا اس کی عمارت کو نقصان پہنچ جاتا تھا۔ اور اس کے متولی اسے گرا کر پھر تعمیر کرتے تھے اور بعض اوقات آگ یا کسی اور حادثہ کے نتیجہ میں ایسا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ہر اس قوم کو کعبہ کی تعمیر کرنی پڑی جس کے ہاتھ میں اس کی تولیت گئی۔ بنو جرہم، خزاعہ اور قریش سبھی نے اپنے اپنے وقت میں اس کی تعمیر کی۔ قصی نے بھی ایک دفعہ اس کی تعمیر کی اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قریش نے اسے دوبارہ تعمیر کیا اور انھوں نے اس کے اندر کچھ ترمیمات بھی کیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کی بلندی کو زیادہ کر کے اس کے اوپر چھت ڈالی اور اس کے اندر چھ ستون بناتے اور چھت میں ایک روشندان بنایا۔ اور کعبہ کے دروازے کو اونچا کر دیا۔ مگر چونکہ ان کے پاس سامان تھوڑا تھا اس لیے وہ کعبہ کو اس کی اصل ابراہیمی بنیادوں پر کھڑا نہ کر سکے، بلکہ انہوں نے ایک طرف کو قریباً ساٹھ ہاتھ جگہ چھوڑ دی۔ اس چھوڑے ہوئے حصہ کو حطیم یا حجر کہتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کعبہ کا حصہ ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ طواف کے وقت اس حصہ کے باہر سے ہو کر گذرنا ضروری ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ عائشہ سے فرمایا کہ "حطیم خانہ کعبہ کا ہی حصہ ہے اور قریش نے اسے اس لیے باہر چھوڑ دیا تھا کہ ان کے پاس خرچ تھوڑ گیا تھا اور انہوں نے کعبہ کے دروازے کو اس لیے اونچا کر دیا تھا کہ تا وہ جسے چاہیں اندر آنے دیں اور جسے چاہیں روک دیں اور اے عائشہ اگر تیری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی اور مجھے ان کے تزلزل کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ان کی تعمیر کردہ عمارت کو گرا کر پھر اصل ابراہیمی بنیادوں پر ساری عمارت کو تعمیر کرتا اور حطیم کو اس کے اندر شامل کر دیتا اور اس کے دروازہ کو نیچا کر دیتا اور اس کے موجودہ دروازے کے مقابل پر ایک اور دروازہ بھی لگواتا۔"[2] چنانچہ ۶۴ھ میں جب کسی وجہ سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا تو عبداللہ بن زبیرؓ نے جو اس وقت مکہ کے حاکم تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کو پورا کیا اور کعبہ کے اندر بجائے چھ ستونوں کے صرف تین ستون بنوائے، لیکن عبدالملک بن مروان نے جب مکہ پر غلبہ پایا تو غالباً اس خیال سے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو نہیں کیا تو اور کسی کو بھی اس کا حق نہیں ہے۔ حجاج بن یوسف کو حکم دیا

---

[1] : ابن ہشام و طبری۔

[2] : بخاری کتاب الحج باب وجوب الحج وفضلہ

کہ عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر کو گرا کر پھر اسی رنگ میں عمارت بنوا دی جاوے جس طرح وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی؛ چنانچہ حجاج نے ایسا ہی کیا مگر تین ستونوں والی تبدیلی کو بحال رکھا[1]

کسوۂ کعبہ

شروع شروع میں کعبہ پر کوئی غلاف وغیرہ نہ ہوتا تھا لیکن بعد میں یمن کے ایک بادشاہ تبع اسد نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ وہ کعبہ کو غلاف چڑھا رہا ہے چنانچہ اس نے کعبہ پر غلاف چڑھوا دیا۔ اس کے بعد غلاف چڑھانے کی رسم جاری ہوگئی۔ چنانچہ قریش کعبہ پر ہمیشہ غلاف چڑھایا کرتے تھے[2] اسلام میں بھی یہ رسم جاری رہی۔ چنانچہ آج تک کعبہ پر باقاعدہ ہر سال نیا قیمتی غلاف چڑھایا جاتا ہے اور پرانا غلاف اتار کر حاجیوں میں تقسیم یا فروخت کر دیا جاتا ہے۔ آجکل جو غلاف چڑھایا جاتا ہے وہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور اس پر جگہ جگہ کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔

حرمتِ کعبہ

زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں کعبہ کی عزت غالباً کچھ اس سے بھی زیادہ تھی جو مسلمانوں کے دلوں میں ہے کیونکہ وہ کعبہ کو گویا ایک قسم کا معبود سمجھتے تھے اور اس پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ یہ چڑھاوے ایک زمین دوز خزانہ میں کعبہ اور اس کے پجاریوں اور حجاج کی ضروریات کے واسطے محفوظ رکھے جاتے تھے۔ کعبہ خود تو حرم تھا ہی اس کے طفیل سے مکہ بلکہ مکہ کے آس پاس کا علاقہ بھی حرم قرار دیا گیا تھا جہاں ہر قسم کا کشت وخون ممنوع تھا اَشْہُرِ حُرُم کی خصوصیت بھی کعبہ ہی کی وجہ سے تھی تاکہ حاجی لوگ امن کے ساتھ بغیر کسی خوف وخطر کے حج کے واسطے آجاسکیں۔ یہ بھی دستور تھا کہ جس چیز کی خاص طور پر حُرمت ظاہر کرنی ہو وہ کعبہ پر آویزاں کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت کی سات مشہور نظمیں کعبہ پر آویزاں کئے جانے کی وجہ سے ہی سبع معلقات کہلاتی ہیں۔

کعبہ کے اردگرد مکانات کی تعمیر

اس موقعہ پر یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ قُصَیّ کے زمانہ تک کسی قوم نے کعبہ کے پاس مکان نہیں بنائے تھے بلکہ اس سے کچھ ہٹ کر عارضی گھروں اور خیموں میں رہتے تھے لیکن قصی کی تحریک سے قریش نے کعبہ کے چاروں طرف مکانات تیار کر لیے اور مکہ گویا باقاعدہ شہر ہوگیا۔ لیکن یہ مکانات کعبہ کے ساتھ ملحق نہ تھے بلکہ حاجیوں کے طواف کے واسطے کعبہ کے چاروں طرف کافی جگہ درمیان میں چھوڑ دی گئی تھی۔ یہ جگہ گویا مسجد حرام کا صحن تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس جگہ کی تنگی محسوس کی گئی اور اردگرد کے مکانات گرا کر مسجد حرام کا صحن وسیع کر دیا گیا۔ کعبہ اور مسجد حرام کا نقشہ جس حالت میں کہ وہ اب ہے یہ ہے :-

(دیکھئے اگلا صفحہ)

---

[1] ازرقی وطبری وتاریخ کامل ابن اثیر وخمیس ؛ [2] ازرقی ؛

نقشہ کعبہ و مسجدِ حرام
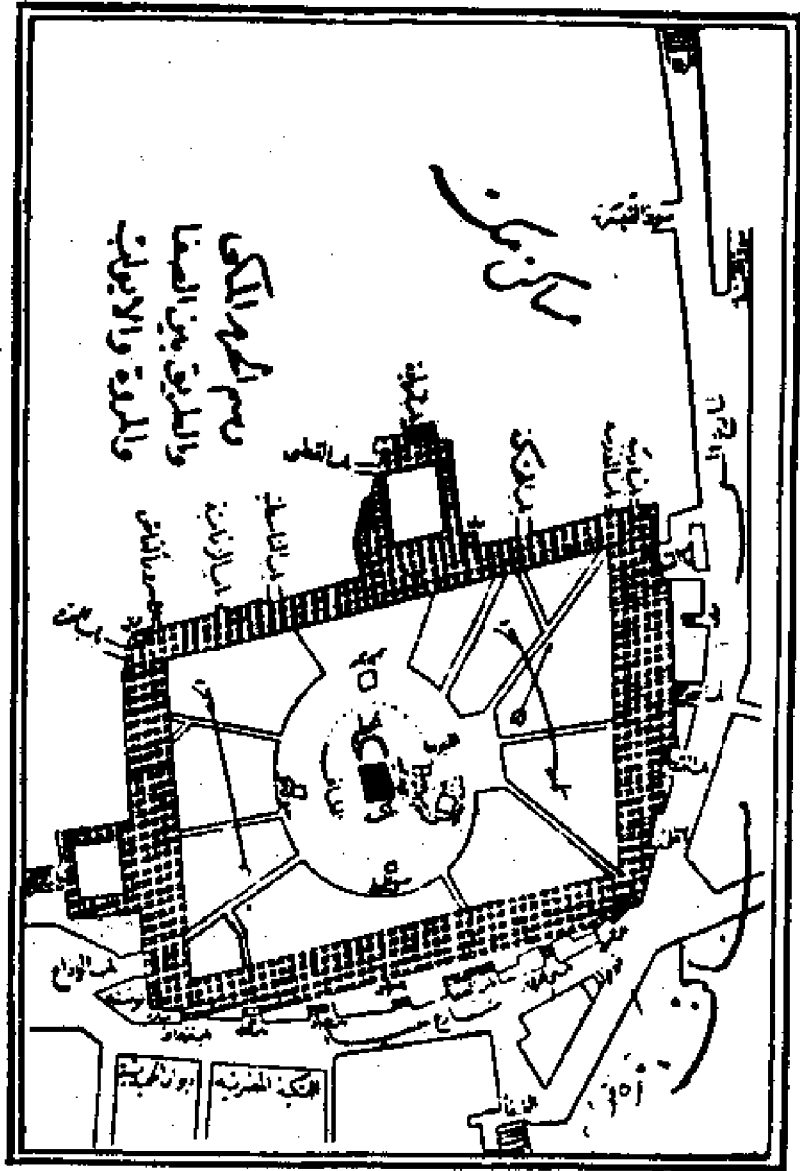
اس نقشہ میں کعبہ کے اردگرد جو سفید جگہ دکھائی گئی ہے وُہ مطاف یعنی طواف کرنے کی جگہ ہے۔ اس کے اردگرد جو سیاہ خطوط ہیں وُہ نماز ادا کرنے کی جگہ ہے۔ اس کے ساتھ ملحق چاروں طرف کھُلا میدان ہے جس میں کہیں کہیں سیاہ خطوط میں رستے دکھائے گئے ہیں۔ اس میدان کے اردگرد قبّے یعنی مسجد کے احاطہ کی مسقف عمارت ہے ۔

قریش

قریش اس قبیلہ کا نام ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور جو اس زمانہ میں مکہ میں آباد تھا۔ یہ قبیلہ عرب کی متفقہ روایات کی رُو سے حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے ہے اور عدنانی قبائل کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

قبیلہ قریش کے بانی کے متعلق روایات مختلف ہیں بعض روایات میں نضر بن کنانہ کو اس کا بانی قرار دیا گیا ہے اور بعض میں فہر بن مالک کو۔ مگر یہ اختلاف عملاً واقعات پر کوئی اثر نہیں ڈالتا کیونکہ نضر بن کنانہ کے ہاں مالک بن نضر کے سوا کوئی لڑکا نہیں ہوا جس کی نسل چلی ہو اور اسی طرح مالک کے ہاں سوائے فہر کے کوئی لڑکا نہیں ہوا۔ گویا نضر کی اولاد بھی عملاً وہی ہے جو فہر کی ہے[1]

قریش کی وجہ تسمیہ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ اس قبیلہ کو قریش کا نام ایک مچھلی کی مشابہت میں دیا گیا تھا جو بہت بڑی ہوتی ہے اور باقی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے۔ اور جسے عربی زبان میں قریش کہتے ہیں۔ گویا اس لفظ میں قریش کی طاقت اور اقتدار کی طرف اشارہ تھا۔ لیکن دُوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جب قصی نے کعبہ کی تولیت حاصل کرنے کے بعد اس قبیلہ کی مختلف شاخوں کو جمع کر کے مکہ میں آباد کیا تو اس وقت ان کا نام قریش ہوا۔ کیونکہ عربی زبان میں قریش کے روٹ میں جمع کرنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے[2]

قبیلہ قریش کی اندرونی شاخیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قریش کئی قبائل میں تقسیم ہو چکے تھے جن کا بعض اوقات آپس میں فساد بھی ہو جاتا تھا۔ گو باقاعدہ لڑائی کی نوبت کبھی نہیں پہنچی۔

ان قبائل میں سے بعض قبائل اور بعض مشہور افراد کا شجرہ درج ذیل ہے۔ اس شجرہ میں جن ناموں کے ساتھ بنو کا لفظ لگایا گیا ہے وُہ ایسے لوگوں کے نام ہیں جن کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشہور قبائل قریش خاص طور پر منسوب ہوتے تھے اور جن کے ساتھ یہ لفظ درج نہیں وہ صرف مشہور افراد ہیں۔ اور جو اسماء خطوط کے اندر درج ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مشہور لوگوں کے نام ہیں۔ ان میں سے مسلمانوں کے نام گول دائرہ میں دکھائے گئے ہیں اور کفار کے نام چوکور خطوط میں۔ لیکن چونکہ اس شجرہ میں سب نام نہیں دکھائے گئے اس لیے ایک ہی لائن میں درج شدہ ناموں کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وُہ ایک ہی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

(دیکھئے اگلا صفحہ)

---

[1] زرقانی جلد ا صفحہ ۷۶
[2] ابن سعد و سہیلی و زرقانی

عدنان

فہر بن مالک

محارب — غالب — حارث

تیم الادرم — لوی — الخلج

کعب — ★ ابو عبیدۃ الجراح

ھصیص — مرۃ — بنو عدی

بنو جمح — بنو سہم — ★ حضرت عمر بن الخطاب — ★ سعید بن زید

امیہ بن خلف — ابی بن خلف — عاص بن وائل — ★ عبداللہ بن عمر

★ صفوان بن امیہ — ★ عمرو بن العاص

بنو تیم — کلاب — یقظہ

★ حضرت ابوبکر — ★ طلحہ بن عبیداللہ — بنو مخزوم

★ حضرت عائشہ — ولید بن مغیرہ — ابوجہل بن ہشام

بنو زہرہ — قصی — ★ عکرمہ بن ابی جہل — ★ خالد بن ولید

آمنہ والدہ آنحضرت ★ عبدالرحمٰن بن عوف ★ سعد بن ابی وقاص

بنو عبدالدار — عبدمناف — عبدالعزیٰ

نضر بن الحارث — بنو اسد

★ حضرت خدیجہ — ★ زبیر بن العوام

★ عبداللہ بن زبیر

بنو نوفل — عبد شمس — بنو ہاشم — مطلب

مطعم بن عدی — ★ عبیدہ بن الحارث

★ جبیر بن مطعم — بنو امیہ — عتبہ بن ربیعہ — شیبہ بن ربیعہ

★ ابو حذیفہ

★ حضرت عثمان — ★ ابو سفیان — عقبہ بن ابی معیط

★ معاویہ

ابو صیفی — عبدالمطلب — اسد — فضلہ

حارث — زبیر — ابو طالب — عبداللہ — ابولہب — ★ عباس — ★ حمزہ

★ عبداللہ بن عباس

طالب ★ عقیل ★ جعفر ★ حضرت علی — ★ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

★ امام حسن ★ امام حسین ★ حضرت فاطمہ

★ نشان شدہ افراد کو اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا

بعض افراد اس شجرہ میں ایسے نظر آئیں گے جن کی طرف کوئی قبیلہ منسوب نہیں حالانکہ وہ قریش میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ عرب کی اقوام میں یہ دستور تھا کہ جبتک تو ایک شخص کی اولاد میں اتحاد و اتفاق رہتا تھا وہ اس کی طرف منسوب ہوتی تھی لیکن جب آپس میں عداوت اور رقابت ہو جاتی تھی تو طرفین ایک واحد مورث کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے اپنے قبیلہ کے واسطے مشترک مورث کے نیچے کسی اور مشہور آدمی کا نام اختیار کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قصیؔ کی اولاد قصیؔ کی طرف منسوب نہیں بلکہ اُن میں سے کوئی بنو ہاشم بن گئے اور کوئی بنو امیہ اور کوئی بنو عبدالدار وغیرہ۔ حالانکہ ان میں سے کوئی شخص بھی قصیؔ کی سی شہرت کا نہ تھا۔

قصیؔ بن کلاب

نضر بن کنانہ اور فہر بن مالک اپنے اپنے زمانہ میں بہت نامور اور صاحب اقتدار اشخاص گذرے ہیں۔ ان کے بعد پانچویں صدی عیسوی میں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریباً سو ڈیڑھ سو سال پہلے قصی بن کلاب نے قریش میں بہت اقتدار حاصل کیا۔ یہ شخص ایک غیر معمولی قابلیت کا مالک تھا۔ قبیلہ خزاعہ سے اس کے کعبہ کی تولیت چھین لینے کا ذکر اُوپر گذر چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ قصی نے تمام قبائل قریش کو اکٹھا کر کے مکہ میں آباد کیا۔ اسی واسطے اُسے مُجَمِّع یعنی جمع کرنے والا بھی کہتے ہیں۔ مگر قصی کا کام اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس نے اپنی قوم کی ایک باقاعدہ تنظیم کی اور مکہ میں گویا ایک جمہوری سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ قصی نے کعبہ کی تولیت اور قبیلہ قریش کے دُوسرے انتظامی کاموں کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے ان فرائض کی ادائیگی قریش کے مختلف قبائل کے رؤسا کے سپرد کر دی۔

تولیتِ کعبہ کے مناصب کی تقسیم

اس انتظام کے ماتحت کعبہ کی تولیت کے کام یہ مقرر کئے گئے:

(۱) **سقایہ** یعنی ایام حج میں حاجیوں کے واسطے پانی کا انتظام چونکہ مکہ میں پانی کی بہت قلت تھی کیونکہ زمزم کا چشمہ ایک عرصہ سے اٹ کر گم ہو چکا تھا۔ اور اگر وہ ہوتا بھی تو چونکہ حج کے موقعوں پر غیر معمولی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے اس لیے یہ کام خاص انتظام چاہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں یہ کام بنو ہاشم میں تھا اور عباس بن عبدالمطلب کے سپرد تھا۔

(۲) **رفادہ** یعنی ایام حج میں غریب حاجیوں کی اعانت کا انتظام۔ اس کام کے لیے قریش میں ہر سال چندہ جمع ہوتا تھا۔ زمانہ نبوی میں یہ کام بنو نوفل میں تھا اور حارث بن عامر کے سپرد تھا۔

(۳) **حجابہ** یعنی کعبہ کی دربانی اور کلید برداری۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ کام بنو عبدالدار میں تھا۔ اور عثمان بن طلحہ کے سپرد تھا۔ یہ تینوں کام قصی نے اپنی زندگی میں خود اپنے پاس رکھے تھے۔

تقسیم نظامِ قبیلہ

قریش کے عام انتظامی کاموں کی تقسیم یہ تھی:

(۱) **عقاب** یعنی جنگوں وغیرہ کے موقعہ پر علمبرداری۔ یہ کام بھی قصی کے اپنے پاس تھا اور اس کے بعد بنو عبدالدار میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں یہ کام طلحہ بن ابی طلحہ کے سپرد تھا۔

اسی کا دوسرا نام لِواء تھا۔

(۲) **قیادہ** یعنی جنگوں اور قافلوں میں کمان۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ کام بنو امیّہ میں تھا اور ابوسفیان کے سپرد تھا۔

(۳) **سفارت** یعنی قریش کی طرف سے بوقت ضرورت کسی دُوسرے قبیلہ یا حکومت کی طرف سفیر ہو کر جانا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں یہ کام بنو عدی میں تھا اور حضرت عمرؓ کے سپُرد تھا۔

(۴) **دیات اور مغارم** یعنی باہم لڑائیوں میں خُون بہا وغیرہ کا فیصلہ کرنا۔ یہ کام بنو تیم میں تھا اور حضرت ابوبکرؓ کے سپُرد تھا۔

(۵) **قبّہ** یعنی جنگوں میں سوار فوج کی افسری اور کیمپ کا انتظام۔ یہ منصب خاندان مخزوم میں تھا اور ولید بن مغیرہ کے سپُرد تھا۔

(۶) **ازلام** یعنی فال کشی کا انتظام۔ یہ کام بنو جمح میں تھا اور صفوان بن امیّہ کے سپُرد تھا۔

(۷) **مشورہ** یعنی اہم اجتماعی کاموں میں بین القبائل مشورہ کا انتظام۔ یہ کام بنو اسد میں تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں یزید بن ربیعۃ الاسود کے سپُرد تھا۔

(۸) **قضاء** یعنی مقدمات کا فیصلہ۔ یہ کام بنو سہم میں تھا اور حارث بن قیس کے سپُرد تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

دارالندوۃ قصی نے کعبہ کے پاس ایک دارالندوۃ بھی بنایا جس میں قریش اپنے تمام قومی کام سرانجام دیتے تھے اور یہیں سردارانِ قریش باہم مشورہ کے لیے جمع ہوتے تھے۔ یہ گویا قریش کا کونسل ہال تھا۔ ہجرت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے قتل کا فیصلہ بھی سردارانِ قریش نے دارالندوۃ میں ہی کیا تھا۔ دارالندوۃ کے مشورہ میں شریک ہونے کے لیے یہ ایک شرط تھی کہ عمر چالیس سال سے کم نہ ہو۔ بیاہ شادی کے لیے بھی قریش دارالندوۃ میں ہی جمع ہوتے تھے۔ اور یہیں اپنی رسوم ادا کرتے تھے۔ اگر کہیں جنگ پر باہر جانا ہوتا تھا یا کسی تجارتی قافلہ کو روانہ ہونا ہوتا تو لوگ یہیں سے جمع ہو کر روانہ ہوتے تھے۔ دارالندوۃ کا انتظام قصی نے خود اپنے پاس رکھا تھا۔

قصی کے اِن غیر معمولی کارناموں نے اسے تمام اطرافِ عرب میں مشہور کر دیا تھا۔ اور قریش کا تو گویا وہ ایک قسم کا بادشاہ تھا، مگر اس انتظام سلطنت سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قریش کے اندر کوئی باقاعدہ سلطنت تھی یا یہ کہ افراد کی آزادی پر کوئی خاص پابندیاں تھیں بلکہ یہ انتظام صرف اہم قومی معاملات کو آسانی کے ساتھ طے کرنے کے واسطے کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ فرائض کی یہ تفصیلی تقسیم سب کی سب قصی کے اپنے ہاتھ سے مکمل ہوئی ہو بلکہ ممکن ہے کہ کوئی شاخ اس سے پہلے کی ہو یا کوئی شاخ بعد میں حسب ضرورت قائم کی گئی ہو مگر بہرحال اس کام کی اصولی داغ بیل قصی ہی کے ہاتھ سے قائم ہوئی تھی۔

عبدمناف قصی کے چار بیٹے تھے۔ عبدالدار۔ عبدالعزیٰ۔ عبدمناف اور عبدقصی۔ عبدالدار چونکہ

بڑا تھا اس لیے قصی نے مرتے ہوئے اپنے تمام کام یعنی کعبہ کی تولیت کے تینوں مناصب اور دارالندوۃ اور لواء اس کے سپرد کئے۔ مگر عبدالدار اپنے باپ کی قابلیت کا آدمی نہ تھا اس لیے قریش کی عام ریاست عبدمناف نے حاصل کی جو بہت لائق اور قابل آدمی تھا۔ عبدمناف کے چار بیٹے تھے۔ عبدشمس۔ مطلب۔ ہاشم اور نوفل۔ یہ چاروں باپ ہی طرح قابل تھے۔ چنانچہ عبدمناف کی وفات کے بعد ان سب نے مل کر اس بات کی کوشش کی کہ عبدالدار کی اولاد سے کعبہ کی تولیت چھین لیں۔ اس پر طرفین کا باہم جھگڑا ہوگیا۔ قریش کے بعض قبائل ایک طرف ہوگئے اور دوسرے دوسری طرف۔ اور قریب تھا کہ جنگ شروع ہو جاتی۔ مگر آخر صلح صفائی کے ساتھ فیصلہ ہو گیا۔ اور دو مناصب یعنی رفادہ اور سقایہ بنوعبدمناف کو مل گئے اور باقی تین مناصب یعنی دارالندوۃ کا انتظام لواء اور حجابہ بنوعبدالدار کے پاس رہے۔ بنوعبدمناف نے آپس میں مشورہ کے ساتھ سقایہ اور رفادہ کا متولی ہاشم کو مقرر کر دیا[1]۔

ہاشم

ہاشم نہایت قابل، معاملہ فہم اور سخی آدمی تھا۔ اُس نے حاجیوں کو بہت آرام پہنچایا اور قریش کے سامنے بہت زوردار اپیلیں کر کر کے اُن کی مختلف ضروریات کے واسطے سامان مہیا کئے۔ اُس کے زمانہ میں ایک دفعہ سخت قحط پڑا تو اس نے اپنے پاس سے اخراجات کر کے قحط کے ایام میں غُربا کو کئی طرح سے مدد دی۔ ان فیاضیوں کی وجہ سے ہاشم کا نام بہت شہرت پاگیا۔ اس کے علاوہ ہاشم نے خود جا کر رُومی اور غسانی فرمانرواؤں سے قریش کے تجارتی قافلوں کے لیے حقوق حاصل کئے اور ہاشم کے دوسرے بھائیوں نے بھی کم وبیش اسی قسم کی خدمات انجام دیں۔ چنانچہ قریش کے تجارتی قافلوں کی شام اور یمن وغیرہ کی طرف آمد و رفت ہاشم ہی کے زمانہ میں شروع ہوئی۔ عموماً سردیوں میں تجارتی قافلے یمن کی طرف جاتے تھے اور گرمیوں میں شام کی طرف اور یہ دونوں سلسلے رِحْلَۃُ الشِّتَاء اور رِحْلَۃُ الصَّيْف کہلاتے تھے[2]۔

امیہ کی رقابت

ہاشم کی اس ترقی کو دیکھ کر ہاشم کے بھتیجے امیہ بن عبدالشمس کے دل میں حسد پیدا ہوا اور اس نے ہاشم کا مقابلہ کرنا چاہا۔ اور اسی کی طرح لوگوں میں سخاوت کر کے نام پیدا کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ اس ناکامی سے اُلٹا قریش کے ہنسی مذاق کا نشانہ بن گیا۔ آخر امیہ کو اتنا جوش آیا کہ اُس نے ہاشم کو کھُلا چیلنج دے کر اپنے مقابلہ کے لیے بُلایا۔ ہاشم نے پہلے تو توجہ نہ کی لیکن آخر قریش کے کہنے سُننے سے جو اس قسم کا تماشہ دیکھنے کے خواہشمند رہتے تھے، ہاشم راضی ہوگیا اور شرط یہ ٹھہری کہ کوئی ثالث ان کی بڑائی کا فیصلہ کرے اور جو ہارے وہ دُوسرے کو پچاس اُونٹ دے۔ اور دس سال کے لیے مکہ سے جلا وطن کیا جاوے۔ ایک کاہن جو قبیلہ خزاعہ سے تھا ثالث مقرر ہوا۔ اُس نے اپنی کاہنی زبان کے دو چار فقرے بول کر ہاشم کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ چنانچہ امیہ نے پچاس اُونٹ ہاشم کے حوالے کئے اور

---

[1] ابن سعد ‎ [2] ابن سعد

مکہ سے نکل گیا اور دس سال تک شام وغیرہ میں پھرتا رہا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ پہلی عداوت اور رقابت ہے جو بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان پیدا ہوئی۔ ہاشم کے بعد عبدالمطلب بن ہاشم نے بھی اپنے زور کے ساتھ بنو ہاشم کو بنو امیہ پر غالب رکھا، لیکن عبدالمطلب کی وفات کے بعد ہاشم کے پوتوں میں کوئی اس جیسا صاحب اثر شخص نہ نکلا اس لیے بنو امیہ آہستہ آہستہ زور پکڑ گئے اور ہاشم کا خاندان غربت کی حالت میں مبتلا ہو کر کمزور ہو گیا۔

ہاشم ایک دفعہ شام کی طرف بغرض تجارت نکلا تو راستہ میں یثرب یعنی مدینہ بھی ٹھہرا۔ وہاں ہاشم نے قبیلہ خزرج کی شاخ بنو نجار کی ایک لڑکی سلمیٰ سے شادی کی جس سے مدینہ میں ہی سلمیٰ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیبہ رکھا گیا۔

مُطّلِب

کچھ عرصہ کے بعد ہاشم کا باہر سفر میں ہی انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت اُس کے چار لڑکے تھے۔ ابوصیفی، اسد، فضلہ اور شیبہ۔ مگر یہ چاروں چونکہ کم عمر تھے اور شیبہ تو مدینہ میں ہی تھا اس لیے ہاشم کی وفات پر اس کی جگہ اس کے بڑے بھائی مطلب نے لی یعنی سقایہ اور رفادہ کے کام اس کے سپرد ہوتے۔ جب مطلب کو کسی شخص نے اس کے بھتیجے شیبہ بن ہاشم کی ہوشیاری اور ہونہاری کی خبر دی تو وُہ فوراً مدینہ جا کر شیبہ کو لے آیا۔ مکہ میں جب چچا بھتیجے داخل ہوئے تو لوگوں نے خیال کیا کہ شاید مطلب کوئی غلام لڑکا لایا ہے۔ اسی لیے شیبہ کا نام عبدالمطلب یعنی مطلب کا غلام مشہور ہو گیا۔[1] یہ وہی عبدالمطلب ہیں جو ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ہیں اور جن کی آغوش میں آپؐ نے اپنی عمر کے ابتدائی آٹھ سال گذارے۔

عَبْدُالمُطّلِب

مطلب کی پوزیشن چونکہ صرف ایک گارڈین کی تھی اس لیے اس کی تولیت کے وُہ مناصب جو عبدمناف کے گھرانے میں تھے اس کی وفات کے بعد عبدالمطلب کو ملے کیونکہ اپنے بھائیوں میں یہی سب سے ہوشیار تھا۔ عبدالمطلب نہایت سمجھدار اور قابل شخص تھا مگر چونکہ اس وقت وہ نوجوان تھا اور اپنی عمر کا ایک حصہ باہر گذار کر آیا تھا اس لیے شروع شروع میں اُسے اپنی پوزیشن کو قائم رکھنے کے لیے بہت مشکلات کا سامنا ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو عبدالمطلب کی وراثت میں اس کے چچا نوفل بن عبدمناف نے جھگڑا کیا۔ عبدالمطلب نے قریش سے اپیل کی لیکن قریش نے اس معاملہ میں دخل دینے سے انکار کر دیا جس پر عبدالمطلب نے یثرب میں اپنی ننھیال بنو نجار کو کہلا بھیجا کہ میرا چچا میری وراثت میں بے جا مداخلت کرتا ہے۔ وہاں سے فوراً اسّی بہادر اپنے نواسے کی مدد کو مکہ پہنچ گئے۔ جس وقت یہ لوگ مکہ میں پہنچے تو اس وقت نوفل چند آدمیوں کے ساتھ مسجد حرام میں بیٹھا تھا۔ اُنہوں نے آتے ہی اُسے کہا کہ ہمارے نواسے شیبہ بن ہاشم کو اس کا سارا ورثہ دے دو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ نوفل مرعوب ہو گیا اور اُس نے مداخلت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بنو عبدالشمس اور بنو ہاشم کے درمیان رنجش پیدا ہو جانے کا ذکر اُوپر گذر چکا ہے۔ اب بنو نوفل کے تعلقات بھی کشیدہ ہو گئے۔

---

[1] ابن ہشام

گویا عبد مناف بن قصی کے باقی بیٹوں میں سے بنو ہاشم کے ساتھ صرف بنو مطلب کے تعلقات اچھے رہے اور اسطرح اس خاندان میں دُو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک طرف بنو ہاشم اور بنو مطلب تھے اور دوسری طرف بنو نوفل اور بنو عبد شمس۔ اس جتھہ بندی کا یہاں تک اثر تھا کہ جب بنو ہاشم اور دیگر مسلمانوں کو کفار مکّہ نے شعب ابی طالب میں محصور کر دیا تو اس وقت بھی بنو مطلب نے بنو ہاشم کا ساتھ دیا اور قریش سے الگ رہے مگر بنو نوفل اور بنو عبد شمس نے کفار کا ساتھ دیا اور بنو ہاشم کی مخالفت کی۔ مطلب نے جو حُسنِ سلوک کا معاملہ عبدالمطلب سے کیا تھا وہ بھی بنو مطلب اور بنو ہاشم کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا موجب ہوا اور بنو مطلب ہمیشہ بنو ہاشم کے ساتھ ایک جان ہو کر رہے، چنانچہ اسی رشتۂ اتحاد کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ خمس کی تقسیم میں سے (یعنی مالِ غنیمت میں سے وُہ پانچواں حصّہ جو اللہ اور اُس کے رسُول اور رسُول کے قریبی رشتہ داروں اور مشترک اسلامی ضروریات کے لیے الگ کیا جاتا تھا) بنو ہاشم کے ساتھ بنو مطلب کا حصّہ بھی نکالتے تھے۔ اور جب بنو نوفل اور بنو عبد شمس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برابری رشتہ کی بنا پر درخواست کی کہ بنو مطلب کی طرح اُن کو بھی خمس سے حصّہ ملا کرے تو آپ نے انکار کیا اور فرمایا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب تو ایک ہی ہیں[1]

چاہِ زمزم کی تلاش

چاہِ زمزم جو مکّہ کی آبادی کا پہلا سبب تھا صدیوں سے بند ہو کر گُم ہو چکا تھا۔ جب عبدالمطلب کے ہاتھ میں سقایۃ الحاج کا کام آیا تو اُس نے ایک خواب کی بنا پر اس کھوئے ہوئے چشمہ کا نشان تلاش کرنا چاہا۔ چنانچہ وہ اور اس کا لڑکا حارث اس کی تلاش میں مصروف ہوئے لیکن قریش میں سے کسی نے بنو ہاشم کی مدد نہ کی۔ بلکہ بعض نے اُلٹا باپ بیٹے کا مذاق اڑایا۔ عبدالمطلب نے اس وقت اپنی کمزوری پر شرم و غیرت کے جوش میں آکر نذر مانی کہ اگر خُدا اُسے دس بچّے دے گا اور وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے جوان ہو جائیں گے تو اُن میں سے ایک کو وُہ خدا کی راہ میں قربان کر دے گا۔ کچھ عرصہ کی محنت کے بعد عبدالمطلب کو زمزم کی جگہ کا نشان مِل گیا جسے کھودنے سے یہ پُرانا چشمہ پھر نکل آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی وُہ دفینہ بھی برآمد ہوا جو قبیلہ جرہم نے مکّہ چھوڑتے ہوئے اُس میں دفن کر دیا تھا۔ اِس غیر مترقبہ واقعہ نے تمام قریش پر عبدالمطلب کا سِکّہ بٹھلا دیا اور گو انہوں نے شروع میں عبدالمطلب کے ساتھ دفینہ کے بارے میں جھگڑا کرنا چاہا، لیکن بالآخر مرعوب ہو کر خاموش ہو گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی بڑائی کے اس قدر قائل ہو گئے کہ بالآخر عبدالمطلب کی یہ حالت تھی کہ تمام قریش اُسے اپنا نہایت واجب الاحترام سردار جانتے تھے[2]

عبدالمطلب کا بڑا ہم مجلس ابوسفیان کا والد حرب بن امیۃ تھا لیکن بالآخر عبدالمطلب کی ترقی نے اس کے دل میں بھی حسد کی چنگاری پیدا کر دی اور اُس نے اپنے باپ کی طرح بنو ہاشم سے مقابلہ کرنا چاہا۔ لیکن ناکام رہا۔

---

[1] بخاری باب مناقب قریش ۔ [2] ابن سعد ذکر نذر عبدالمطلب ۔ [3] ابن سعد و ابن ہشام ۔

اِس منافرت کے بعد عبدالمطلب کی مجلس زیادہ تر عبداللہ بن جدعان تیمی کے ساتھ رہی جو مکہ کا ایک شریف مزاج رئیس تھا[1]

عبداللہ

چاہِ زمزم کے واقعہ کے بعد عبدالمطلب بڑا صاحبِ اثر ہوگیا اور خُدا کی قدرت کہ اس کی اولاد بھی جلد جلد بڑھنے لگی۔ حتیٰ کہ آخر اُن کی تعداد دسؔ تک پہنچ گئی۔ جب یہ لڑکے جوان ہو گئے اور ایفائے نذر کا وقت آگیا تو عبدالمطلب اُن سب کو اپنے ساتھ لیکر کعبہ کی طرف گیا اور وہاں جاکر ھبل کے سامنے قرعہ اندازی کی۔ اللہ کی قدرت کہ قرعے کا تیر سب سے چھوٹے لڑکے عبداللہ کے نام نکلا جو عبدالمطلب کو سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اس وقت عبدالمطلب کی جو حالت تھی وہ بیان میں نہیں آسکتی، مگر عبدالمطلب قول کا پکّا تھا اور نذر بہرحال پوری کرنی تھی اس لیے وُہ عبداللہ کو لے کر ذبح کرنے کے واسطے روانہ ہوا اور عبداللہ بھی سرِ تسلیم خم کئے اپنے باپ کے ساتھ ہولیا جب رؤسائے قریش کو اس کا علم ہوا تو اُنھوں نے عبدالمطلب کو اس سے روکا اور آخر ایک واقف کار کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ عبداللہ اور دسؔ اُونٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا جائے اور اگر اُونٹوں کے نام قرعہ نکلے تو عبداللہ کی جگہ دسؔ اُونٹ قربان کردیئے جاویں کہ یہی اس زمانے میں ایک آدمی کا خُون بہا تھا چنانچہ عبدالمطلب نے عبداللہ اور دسؔ اُونٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا، مگر پھر بھی تیر عبداللہ ہی کے نام نکلا۔ عبدالمطلب نے دسؔ اور زائد کئے اور بیسؔ پر قرعہ ڈالا، لیکن اب کی دفعہ بھی عبداللہ ہی کا نام نکلا۔ دسؔ اور زائد کئے گئے، لیکن پھر بھی عبداللہ ہی کا نام تھا۔ چالیسؔ، پچاسؔ، ساٹھؔ، ستّرؔ، اسّیؔ، نوّےؔ مگر ہر دفعہ عبداللہ کا نام آتا تھا۔ آخر سوؔ تک نوبت پہنچی اور اب کی مرتبہ قرعہ اُونٹوں کے نام نکلا۔ لیکن اس پر بھی عبدالمطلب نے مزید تسلی کے واسطے پھر دُو دفعہ قرعہ ڈالا مگر دونوں دفعہ اونٹوں کا نام نکلا۔ جس پر سوؔ اُونٹ ذبح کئے گئے اور عبداللہ کی جان بچی[2] اس وقت سے قریش میں ایک آدمی کا خون بہا سوؔ اُونٹ مقرر ہو گئے[3]

اصحاب الفیل

عبدالمطلب کے زمانہ میں یمن کا علاقہ افریقہ کے ملک حبشہ کے ماتحت تھا جو ان ایّام میں ایک طاقتور حکومت کا مرکز تھا۔ اور چونکہ حبشہ ایک عیسائی ملک تھا اس لیے یمن کا گورنر بھی عیسائی ہوا کرتا تھا۔ عبدالمطلب کے زمانہ میں یمن کے والی کا نام ابرہۃ الاشرم تھا۔ یہ شخص کعبہ سے سخت دشمنی رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح عرب کے لوگوں کو کعبہ سے پھیر دے۔ چنانچہ اُس نے کعبہ کے مقابلہ پر یمن میں ایک معبد تیار کیا اور لوگوں میں تحریک کی کہ وہ بجائے کعبہ کے اس عبادت گاہ کے حج کے لیے آیا کریں۔ عرب کی فطرت بھلا اس بات کو کس طرح برداشت کرسکتی تھی کہ عرب کی سرزمین میں کعبہ کے مقابلہ پر کوئی اور معبد قائم ہو۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ایک عرب نے جوش میں آکر اس معبد میں جاکر پاخانہ کردیا۔ ابرہہ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے غصّہ میں آکر ارادہ کیا کہ مکہ پر فوج کشی کرکے کعبہ کو مسمار کردے۔ چنانچہ اُس نے حبشہ کے بادشاہ

---

[1] ابن سعد ذکر عبدالمطلب ۔ [2] ابن ہشام و ابن سعد و زرقانی ۔ [3] ابن سعد ۔

نجاشی سے اجازت لی۔ اور ایک بڑے بھاری لشکر کے ساتھ جس کی تعداد بعض روایات سے ساٹھ ہزار پتہ لگتی ہے اور بہرحال وُہ ہزاروں پر مشتمل تھا، یمن سے نکلا اور راستہ میں مختلف قبائل عرب کو شکست دیتا ہوا مکہ کے قریب پہنچ گیا اور شہر کے سامنے اپنی فوجیں ڈال دیں۔ جب قریش کو اس کا علم ہوا تو وہ سخت پریشان ہوتے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وُہ اس کے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے۔ چنانچہ اُنھوں نے عبدالمطلب کو ابرہہ کے پاس بطور وفد کے روانہ کیا۔ عبدالمطلب کی وجیہہ شکل اور نجابت نے ابرہہ پر بہت اچھا اثر کیا۔ اور وُہ اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا۔ اور اپنے ترجمان سے کہا کہ ان سے پُوچھو کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ عبدالمطلب نے جو شاید پہلے سے اس گفتگو کے طریق کو سوچ کر آیا تھا کہا کہ آپ کی فوج نے میرے اُونٹ پکڑ لیے ہیں وہ مجھے دلوا دیے جائیں۔ اُس نے اُونٹ تو واپس دلوا دیے، مگر جو اثر اس کے دل پر عبدالمطلب کی وجاہت اور قابلیت کا ہوا تھا وہ سب جاتا رہا اور اُس نے منہ بنا کر کہا "میں تمہارے کعبہ کو مسمار کرنے کے واسطے آیا ہُوں، مگر تم نے اس کی فکر نہ کی اور اپنے اُونٹوں کی فکر کی" عبدالمطلب نے بے پروائی کے انداز میں کہا "اَنَا رَبُّ الْاِبِلِ وَلِلْبَيْتِ رَبٌّ يَمْنَعُهُ۔ یعنی "میں تو صرف اُونٹوں کا مالک ہوں، اس لیے مجھے ان کا فکر ہے۔ مگر اس گھر کا بھی ایک مالک ہے وہ خود اس کی حفاظت کریگا"

ابرہہ نے یہ جواب سُنا تو بہت بگڑا اور کہا کہ "اچھا پھر میں دیکھوں گا کہ اس گھر کا مالک مجھے اس سے کس طرح روکتا ہے" چنانچہ وہ اپنے لاؤ لشکر کو لے کر آگے بڑھا مگر خدائی تصرّف ایسا ہوا کہ جونہی کہ اس ہاتھی کا رُخ جس پر ابرہہ سوار تھا مکہ کی طرف کرکے اُسے چلایا گیا تو وہ چلنے سے رک گیا اور باوجود انتہائی کوشش کے آگے نہ بڑھا اور پھر اس لشکر پر ایسی آفت آئی کہ لشکر کا لشکر تباہ ہو کر پرندوں کی خوراک بن گیا۔ اس کی تفصیل روایات میں یُوں بیان ہوئی ہے کہ جب یہ لشکر مکہ کی طرف بڑھنا چاہتا تھا، تو اُس وقت خدائی تصرّف کے ماتحت اُن کے اُوپر سے ایسے پرندوں کے غول گذرے جن کے پنجوں میں ایسی زہر آلود مٹی کے ریزے لگے ہوتے تھے کہ جس جس کے اوپر یہ ریزے گرتے تھے وہ ایک چیچک کی سی مہلک اور متعدی بیماری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اور جب لشکر میں ایک دفعہ یہ بیماری پھوٹی تو پھر بڑی سُرعت سے ایک سے دوسرے کو لگتی چلی گئی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ متعدی بیماریاں بسا اوقات مٹی کے ذرات یا دُوسرے ذرائع سے پھیل جاتی ہیں۔ پس بالکل ممکن ہے کہ یہ پرندے کسی ایسی جگہ سے اُڑ کر آئے ہوں جو کسی متعدی بیماری کے جراثیم سے ملوث ہو اور اس طرح اُن کے واسطے سے لشکر میں کوئی چیچک وغیرہ کی مہلک بیماری پھیل گئی ہو۔ چنانچہ ابرہہ کے متعلق تو خاص طور پر ذکر آتا ہے کہ اُسے کوئی ایسی بیماری ہوئی تھی، جس سے اس کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گیا تھا۔[1] قرآن شریف میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۞ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ

---

[1] ابن ہشام و زرقانی

فِیْ تَضْلِیْلٍ ۙ وَّ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۙ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۠[1]

"کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اصحابِ فیل کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا اُس نے اُن کی تجاویز کو خاک میں نہیں ملا دیا؟ اس نے ان پر پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ بھیجے جو اُن پر مٹی کے پتھریلے ریزے مارتے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک بوسیدہ بھوسے کی طرح کر دیا۔"

ابرھہ کا یہ حملہ تاریخ میں 'اصحاب الفیل' کا حملہ کہلاتا ہے یعنی ہاتھی والوں کا حملہ جس کی وجہ یہ ہے کہ ابرہہ کی فوج میں ایک ہاتھی یا بعض روایتوں کی رُو سے متعدد ہاتھی بھی تھے۔ چونکہ قریش مکّہ کے لیے ہاتھی ایک عجیب اور نئی چیز تھی جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، اس لیے انہوں نے نہ صرف حملہ آوروں کا نام اصحاب الفیل رکھا بلکہ اس سال کا نام بھی 'عام الفیل' رکھ دیا۔ اصحاب الفیل کی تباہی سے کعبۃ اللہ کی عزت اور قریش کا رُعب بہت بڑھ گیا اور دُوسرے قبائلِ عرب انہیں آگے سے بھی زیادہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھنے لگے۔[2]

عبداللہ کی شادی

اصحاب الفیل کے واقعہ سے چند ماہ پیشتر عبدالمطلب نے آمنہ بنت وہب سے جو قریش کے قبیلہ بنو زہرہ میں سے ایک معزز گھرانے کی نہایت شریف لڑکی تھی اپنے لڑکے عبداللہ کی شادی کی۔ اُس وقت عبداللہ کی عمر پچیس سال کی یا بعض روایتوں کی رُو سے سترہ سال کی تھی۔[3] اسی موقعہ پر آمنہ کی ایک چچا زاد بہن ہالہ بنت وہب سے عبدالمطلب نے خود بھی شادی کی۔ حمزہ اسی ہالہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔

عبداللہ کی وفات

عبداللہ کو نکاح کے بعد مصلحتِ الٰہی سے زیادہ مہلت نہیں ملی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جب وہ تجارت کے لیے شام کو گئے تو واپسی پر بیمار ہو کر یثرب میں ٹھہر گئے اور وہیں انتقال کیا اور اپنے رشتہ دار قبیلہ بنو نجار کے درمیان دفن ہوئے۔ اُس وقت اُن کی زوجہ آمنہ حمل سے تھیں۔[4] اپنے اس بچّہ کے لیے جو ابھی اپنی ماں کے بطن میں ہی تھا عبداللہ نے جو ترکہ چھوڑا وہ قابلِ ذکر ہے۔ یعنی "پانچ اُونٹ، چند بکریاں اور ایک لونڈی اُمّ ایمنؓ"[5] یہ ترکہ اس کے لیے تھا جس نے ہر دو عالم کا بادشاہ بننا تھا۔

عبدالمطلب کو جب اپنے فرزند عبداللہ کی بیماری کی خبر پہنچی تو اُس نے فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو

---

[1] سورۃ الفیل آیت ۲تا۶ [2] ابن ہشام ؍ [3] خمیس و زرقانی ؍ [4] ابن سعد و زرقانی جلد اول صفحہ ۱۰۹

[5] طبقات ابن سعد ؍

مدینہ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ مدینہ جاکر عبداللہ کو اپنے ساتھ لے آوے مگر جب حارث مدینہ پہنچا، تو عبداللہ فوت ہو چکے تھے۔ اُس نے واپس آکر بڈھے باپ کو خبر دی کہ تیرا عزیز لڑکا اس جہان فانی سے گذر چکا ہے۔ اس وقت عبدالمطلب کو جو صدمہ ہوا وُہ قیاس ہی کیا جاسکتا ہے مگر اس صدمہ سے بہت بڑھ کر وہ صدمہ ہوگا جو آمنہ کے دل کو پہنچا جس کا شوہر اس غریب الوطنی کی حالت میں شادی سے تھوڑے ہی عرصہ بعد اسے داغ ہجرت دے گیا۔ نئی نئی شادی کی حالت میں کم عمر لڑکیاں جو طبعاً اپنے اندر شرم وحیا کا زیادہ مادہ رکھتی ہیں ایسے موقعوں پر اپنے غم والم کا اظہار نہیں کرسکتیں۔ اس لیے اُن کو اندر ہی اندر صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس سے اس تکلیف کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس موقعہ پر حضرت آمنہ کو اٹھانی پڑی ہوگی۔ مگر خُدا کی تسلی جلد ہی آمنہ کے سہارے کے لیے آئی۔ چنانچہ انہی ایام میں آمنہ نے ایک خواب دیکھا کہ اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے اور انہیں خواب میں ہی بتایا گیا کہ اس لڑکے کا نام محمدؐ رکھنا۔ نیز انہوں نے یہ بھی خواب دیکھا کہ ان کے اندر سے ایک چمکتا ہوا نور نکلا ہے اور دُور دراز ملکوں میں پھیل گیا ہے۔[1]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام و زرقانی

ابتدائی زندگی

ولادت باسعادت

آمنہ کے نُور کے ظہور کا وقت نزدیک آرہا تھا اور وضعِ حمل کے دن قریب تھے۔ وُہ شعبِ بنی ہاشم میں رہتی تھیں۔ اور اس وقت کے انتظار میں تھیں کہ جب اُن کے مرحوم شوہر کی یاد کو زندہ رکھنے والا بچہ دُنیا کی روشنی میں آوے اور ان کے صدمہ رسیدہ دل کے لیے تسکین وراحت کا موجب ہو۔ چنانچہ واقعہ اصحاب الفیل کے پچیس ۲۵ روز بعد ۱۲ ربیع الاول مطابق ۲۰ اگست ۵۷۰ء عیسوی کو یا ایک جدید اور غالباً صحیح تحقیق کی رُو سے ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء بروز پیر بوقت صبح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔[۱] واقعہ فیل کے اس قدر متصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ہونا اپنے اندر یہ خدائی اشارہ رکھتا تھا کہ جس طرح خدا نے کعبہ کے خلاف اس ظاہری حملہ کو خائب و خاسر کیا ہے اسی طرح اب وقت آتا ہے کہ دینِ الٰہی کے مقابل پر باطل پرستی کا سر کچلا جائے۔ اور قرآن شریف میں اصحاب الفیل کے حملہ کا ذکر بھی بظاہر اسی غرض و غایت کے ماتحت نظر آتا ہے۔ بہرحال بچہ کے پیدا ہوتے ہی آمنہ نے عبدالمطلب کو اطلاع بھجوا دی۔ جو سُنتے ہی فوراً خوشی کے جوش میں آمنہ کے پاس چلے آئے۔ آمنہ نے اُن کے سامنے لڑکا پیش کیا اور کہا کہ میں نے ایک خواب میں اس کا نام محمدؐ دیکھا تھا۔ عبدالمطلب بچے کو اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر بیت اللہ میں لے گئے اور وہاں جا کر خدا کا شکر ادا کیا اور بچے کا نام محمدؐ رکھا جس کے معنے ہیں "بہت قابلِ تعریف" اور پھر اسے واپس لا کر خوشی خوشی ماں کے سپرد کر دیا۔[۲]

مؤرخین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے متعلق بعض عجیب عجیب واقعات لکھے ہیں مثلاً یہ کہ اس وقت کسریٰ شہنشاہِ ایران کے محل میں سخت زلزلہ آیا اور اس کے چودہ کنگرے گر گئے اور فارس کا مقدس آتشکدہ جو صدیوں سے برابر روشن چلا آتا تھا دفعۃً بجھ گیا۔ اور بعض دریا اور چشمے خشک ہو گئے اور یہ کہ آپ کے اپنے گھر میں بھی رنگا رنگ کے کرشمے ظاہر ہوئے وغیرذالک۔ مگر یہ روایتیں عموماً کمزور ہیں۔ یہ بھی روایت آتی ہے جو غالباً صحیح ہے کہ آپ کے ولادت کے زمانہ میں آسمان پر غیر معمولی کثرت سے

---

۱ محمود پاشا مصری ۔ ۲ ابن ہشام

ساتھ ستارے ٹوٹتے ہوئے نظر آتے تھے[1]۔ اسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدرتی طور پر مختون پیدا ہوئے[2] اگر یہ درست ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ بعض اوقات بچوں میں اس قسم کی قدرتی باتیں دیکھی گئی ہیں۔ ایک اور بات بھی آپ میں قدرتی طور پر تھی اور وہ یہ کہ آپ کی پُشت پر بائیں جانب ایک گوشت کا اُبھا ہوا ٹکڑا تھا جو عام طور پر مسلمانوں میں ختمِ نبوت یعنی مُہرِ نبوت کے نام سے مشہور ہے[3]

رضاعت اور ایامِ طفولیت

مکہ کے شرفاء میں یہ دستور تھا کہ مائیں اپنے بچوں کو خود دُودھ نہ پلاتی تھیں بلکہ عام طور پر بچے شہر سے باہر بدوی لوگوں میں دائیوں کے سپرد کر دیتے جاتے تھے اس کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ جنگل کی کھلی ہوا میں رہ کر بچے تندرست اور طاقتور ہوتے تھے اور زبان بھی عمدہ اور صاف سیکھتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں آپ کی والدہ نے اور پھر ثویبہ نے دُودھ پلایا۔ ثویبہ آپ کے چچا ابولہب کی لونڈی تھی جسے ابولہب نے اپنے یتیم بھتیجے کی ولادت کی خوشی میں آزاد کر دیا تھا۔ اسی ثویبہ نے حضرت حمزہؓ کو بھی دُودھ پلایا تھا۔ گویا اس طرح حمزہ جو آپؐ کے حقیقی چچا تھے دُودھ کے رشتہ سے آپ کے بھائی بن گئے۔ ثویبہ کی یہ چند دن کی خدمت آنحضرت صلعم کبھی نہیں بھولے جب تک وہ زندہ رہی آپؐ ہمیشہ اس کی مدد فرماتے رہے اور اس کے مرنے کے بعد بھی آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا اس کا کوئی رشتہ دار باقی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ کوئی نہ تھا۔

ثویبہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعت مستقل طور پر حلیمہ کے سپرد ہوئی جو قوم ہوازن کے قبیلہ بنی سعد کی ایک خاتون تھی اور دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر مکہ میں دایہ کے طور پر کسی بچے کی تلاش میں آئی تھی۔ ایک یتیم بچے کو اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے حلیمہ ابتداءً خوش نہ تھی کیونکہ اس کی خواہش تھی کہ کوئی زندہ باپ والا بچہ ملے جہاں زیادہ انعام واکرام کی اُمید ہو سکتی تھی۔ چنانچہ شروع میں اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ لے جانے سے تأمل کیا مگر جب کوئی اور بچہ نہ ملا اور اس کے ساتھ کی سب عورتوں کو بچے مل چکے تھے تو وہ خالی ہاتھ جانے سے بہتر سمجھ کر آپؐ کو اپنے ساتھ لے گئی۔ لیکن جلد ہی حلیمہ کو معلوم ہو گیا کہ جو بچہ وہ اپنے ساتھ لائی ہے۔ اس کا ستارہ بہت بلند ہے۔ چنانچہ اُس کی اپنی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے ہم پر بہت تنگی کا وقت تھا مگر آپ کے آنے کے ساتھ یہ تنگی فراخی میں بدل گئی۔ اور ہماری ہر چیز میں برکت نظر آنے لگی۔ حلیمہ کا وہ لڑکا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دودھ پیتا تھا اس کا نام عبداللہ تھا اس کی ایک بڑی بہن بھی تھی جس کا نام شیما تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز رکھتی تھی۔

---

[1] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۱۲۲ و خمیس جلد ۱ صفحہ ۲۲۳-۲۲۸ [2] زرقانی و خمیس [3] زرقانی

دُو سال کے بعد جب رضاعت کی مدّت پوری ہوئی تو دستور کے مطابق حلیمہ آپؐ کو لے کر مکّہ میں آئی مگر اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت ہو چکی تھی کہ اُس کا دل چاہتا تھا کہ اگر ممکن ہو تو آپ کی والدہ سے اجازت لے کر آپؐ کو پھر واپس لے جاوے۔ چنانچہ اُس نے باصرار کہا کہ ابھی اس بچّہ کو کچھ عرصہ اور میرے پاس رہنے دو۔ میں اس کا ہر طرح خیال رکھوں گی۔ آمنہ نے پہلے تو انکار کیا، مگر پھر اس کے اصرار کو دیکھ کر اور یہ خیال کر کے کہ مکّہ کی آب و ہوا سے باہر کی آب و ہوا اچھی ہے اور ان ایام میں مکّہ کی آب و ہوا کچھ خراب بھی تھی آمنہ نے مان لیا اور حلیمہ آپؐ کو لے کر پھر خوش خوش اپنے گھر لوٹ گئی اور اس کے بعد قریباً چار سال کی عمر تک آپؐ حلیمہ کے پاس رہے اور قبیلہ بنو سعد کے لڑکے لڑکیوں میں کھیل کُود کر بڑے ہوتے۔ اس قبیلہ کی زبان خاص طور پر صاف اور فصیح تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی زبان سیکھی۔

حلیمہ آپؐ کو بہت عزیز رکھتی تھی۔ اور قبیلہ کے تمام لوگ آپؐ کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن جب آپ کی عمر چار سال کی ہوئی تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے حلیمہ خوفزدہ ہو گئی۔ اور آپؐ کو واپس مکّہ میں لاکر آپؐ کی والدہ کے سپرد کر دیا۔ یہ واقعہ تاریخ میں اس طرح پر مذکور ہے کہ ایک دفعہ آپؐ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ مل کر کھیل رہے تھے اور کوئی بڑا آدمی پاس نہ تھا کہ اچانک دو سفید پوش آدمی نظر آئے اور انہوں نے آپؐ کو پکڑ کر زمین پر لٹا دیا اور آپؐ کا سینہ چاک کر دیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر آپؐ کا رضاعی بھائی عبداللہ بن حارث بھاگا ہوا گیا اور اپنے ماں باپ کو اطلاع دی کہ میرے قریشی بھائی کو دُو آدمیوں نے پکڑ لیا ہے اور اس کا سینہ چاک کر رہے ہیں۔ حارث اور حلیمہ یہ سُنتے ہی بھاگے آئے تو دیکھا کہ کوئی آدمی تو وہاں نہیں ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک خوفزدہ حالت میں کھڑے ہیں اور چہرہ کا رنگ متغیّر ہو رہا ہے۔ حلیمہ نے آگے بڑھ کر آپؐ کو گلے سے لگا لیا اور پُوچھا "بیٹا کیا بات ہوئی ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا ماجرا بتایا اور کہا کہ وہ کوئی چیز میرے سینہ میں تلاش کرتے تھے[1] جسے اُنہوں نے نکال کر پھینک دیا۔ پھر حلیمہ اور حارث آپؐ کو اپنے خیمہ میں لے گئے۔ اور حارث نے حلیمہ سے کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے[2]۔ پس مناسب ہے کہ تُو اسے فوراً لے جا اور اس کی والدہ کے سپُرد کر آ۔" چنانچہ حلیمہ آپ کو مکّہ میں لائی اور آمنہ کے سپُرد کر دیا۔ آمنہ نے اس جلدی کا سبب پُوچھا اور اصرار کیا تو حلیمہ نے انہیں یہ سارا قصّہ سُنا دیا اور یہ ڈر ظاہر کیا کہ شاید یہ لڑکا کسی جنّ وغیرہ کے اثر کے نیچے آگیا ہے۔ آمنہ نے کہا: "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میرا بیٹا بڑی شان والا ہے۔ جب یہ حمل میں تھا تو مَیں نے دیکھا تھا کہ میرے اندر سے ایک نُور نکلا ہے جو

---

[1] اس جگہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حلیمہ اور حارث نے وہاں کوئی خُون بہا ہوا نہیں پایا اور نہ شقِ صدر کی کوئی اور علامت دیکھی اور نہ ہی کوئی باہر پھینکی ہوئی چیز انہیں نظر آئی۔ [2] یعنی یہ کسی جنّ وغیرہ کے اثر کے نیچے آگیا ہے۔

دُور دراز ملکوں تک پھیل گیا ہے[1]

اس واقعہ کی فی الجملہ تائید صحیح مسلم کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں اُنسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض بچوں کے ساتھ مِل کر کھیل رہے تھے آپؐ کے پاس جبرائیلؑ آئے اور آپؐ کو زمین پر لِٹا کر آپؐ کا سینہ چاک کر دیا اور پھر آپؐ کے سینہ کے اندر سے آپؐ کا دل نکالا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر باہر پھینک دی اور ساتھ ہی کہا کہ یہ کمزوریوں کی آلائش تھی جو اَب تم سے جُدا کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد جبرائیل نے آپؐ کے دل کو مصفّیٰ پانی سے دھویا اور سینہ میں واپس رکھ کر اُسے پھر جوڑ دیا۔ جب بچوں نے جبرائیل کو آپؐ کو زمین پر گراتے اور سینہ چاک کرتے ہوئے دیکھا تو وہ گھبرا کر دَوڑے ہوئے آپؐ کی دائی کے پاس گئے اور کہا کہ محمدؐ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ جب یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو فرشتہ غائب تھا اور آپؐ ایک خوفزدہ حالت میں کھڑے تھے[2]

صحیح مسلم کی تصدیق کے بعد ابنِ ہشام کی روایت کو ایک ایسی تقویت حاصل ہو جاتی ہے کہ بلا کسی قوی دلیل کے ہم اسے کمزور کہہ کر ردّ نہیں کر سکتے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ایک کشفی نظارہ[3] تھا۔ چنانچہ شقِّ صدر کی ظاہری علامات کا مفقود ہونا یعنی اس وقت آپؐ کی دائی وغیرہ کو اُس کی کسی ظاہری علامات کا نظر نہ آنا بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک کشف تھا جس کا دائرہ دوسرے بچوں تک بھی وسیع ہو گیا۔ اور جیسا کہ خود اس کشف کے اندر یہ تصریح ہے اس سے مراد یہ تھی کہ خدائی فرشتہ نے متمثّل ہو کر عالمِ کشف میں آپؐ کا سینہ چاک کیا اور تمام کمزوریوں کی آلائش آپ کے اندر سے نکال دی۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ معراج کی رات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی قسم کے شقِّ صدر کا واقعہ ہوا اور فرشتوں نے آپ کا دل نکال کر زمزم کے مصفّا پانی سے دھویا اور پھر اپنی جگہ پر رکھ دیا[4]

اس جگہ یہ ذکر کرنا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ سر ولیم میور نے اس واقعہ کا ذکر کر کے طعن کے رنگ میں

---

[1] ابن ہشام ؛ [2] مسلم جلد ۱ باب الاسراء ؛ [3] بعض ناظرین شاید کشف کی اصطلاح سے واقف نہ ہوں، اس لیے ان کی واقفیت کی غرض سے لکھا جاتا ہے کہ جس طرح انسان کو رات کے وقت سوتے ہوئے کوئی نظّارہ دکھایا جاتا ہے جسے وہ اُس وقت اصلی سمجھتا ہے حالانکہ وہ دراصل خواب ہوتا ہے اِسی طرح بعض اوقات ایسے نظارے خدا کے خاص بندوں کو بیداری کی حالت میں بھی نظر آجاتے ہیں۔ یعنی عالمِ بیداری میں اُن پر ایک ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ ظاہری حواس سے الگ ہو کر (یا بعض اوقات ظاہری حواس کے ہوتے ہوئے بھی) کوئی خاص نظارہ دیکھتے ہیں اور ایسی حالت میں جو نظارہ وہ دیکھتے ہیں وُہ اصطلاح میں کشف کہلاتا ہے۔ کشف میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ آدمیوں تک اس کا اثر پہنچتا ہے یعنی صاحبِ کشف کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ایسے نظارہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ منہ

[4] بخاری باب المعراج ؛

یہ ریمارک کیا ہے کہ نعوذ باللہ یہ ایک مرگی کا دورہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا۔ ہم کسی کی زبان کو تو نہیں روک سکتے مگر یقیناً میور صاحب نے یہ اعتراض کرتے ہوئے پرلے درجے کے تعصب سے کام لیا ہے۔ کیونکہ اوّل تو سب لوگ جانتے ہیں کہ مرگی کا بیمار ایک کمزور دماغ والا انسان ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خود میور صاحب کو اقرار ہے کہ آپ بہترین قوائے جسمانی کے مالک تھے۔ علاوہ ازیں خود یہ روایت بھی جس کی بناء پر یہ اعتراض کیا گیا ہے اس اعتراض کو رد کرتی ہے۔ کیونکہ روایت میں یہ صاف لکھا ہے کہ اس نظارہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی نے بھی دیکھا اور اُسی نے بھاگ کر اپنے والدین کو اطلاع دی کہ میرے قریشی بھائی کو دو سفید پوش آدمی زمین پر گرا کر اس کا سینہ چاک کر رہے ہیں۔ کیا دُنیا میں کوئی مرگی ایسی بھی ہوتی ہے جس کے متعلق دُوسرے لوگ اس قسم کے نظارہ کی شہادت دیں۔ بیشک وُہ شخص جسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے وُہ خود اپنے خیال میں یہ گمان کر سکتا ہے کہ اُسے کسی نے پکڑ کر زمین پر دے مارا ہے لیکن یہ کہ اُسے دیکھنے والے لوگ بھی اِس قسم کا نظارہ دیکھیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جسے سوائے ایک متعصب انسان کے کوئی شخص زبان پر نہیں لاسکتا۔

بہرحال جب آپ کی عمر چار سال کی ہوئی تو حلیمہ آپ کو واپس لا کر آپ کی والدہ کے سپرد کر گئی۔ یہ چار سالہ خدمت حلیمہ کی کوئی معمولی خدمت نہ تھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو چھوٹی سے چھوٹی خدمت کو بھی فراموش نہ کرتے تھے؛ چنانچہ آپ نے عمر بھر حلیمہ کی یہ خدمت یاد رکھی اور ہمیشہ اس کے ساتھ نہایت اعلیٰ سلوک کیا۔ چنانچہ جب مُلک میں ایک دفعہ قحط پڑا اور حلیمہ مکہ میں آئی تو آپ نے اُسے چالیس بکریاں اور ایک اُونٹ عطا فرمایا۔ زمانۂ نبوت میں وُہ ایک دفعہ آئی تو آپ نے اُسے دیکھتے ہی "میری ماں، میری ماں!" کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اپنے اُوپر کی چادر اُتار کر اُس کے نیچے بچھائی۔ پھر جب ایک جنگ (یعنی جنگِ حُنین) میں قبیلہ ہوازن کے ہزار ہا قیدی پکڑے ہوئے آئے تو آپ نے اسی رشتہ کی خاطر ان سب کو رہا کر دیا۔ اور ایک پائی بھی اُن قیدیوں کے فدیہ میں نہیں لی[1] اور اپنی ایک رضاعی بہن کو جو اُن قیدیوں میں آئی تھی انعام سے مالا مال کر کے واپس کیا۔ حلیمہ اور اس کے خاوند حارث کے اسلام لانے کے متعلق اختلاف ہے، مگر راجح قول یہی ہے کہ وُہ دونوں مُسلمان ہو گئے تھے اور اسلام کی حالت میں فوت ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی عبداللہ اور بہن شیما نے بھی اسلام پر وفات پائی۔

والدہ کی کفالت اور سفرِ یثرب

جب حلیمہ آپ کو آپ کی والدہ کے پاس واپس لائی تو آپ کی عمر کم و بیش چار سال کی تھی۔ اس کے بعد آپ اپنی والدہ کی کفالت میں رہے۔ جب آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو اپنے رشتہ دار بنو نجار سے ملنے کی غرض سے آمنہ یثرب گئیں اور آپ کو بھی ساتھ لے گئیں۔ ام ایمن بھی ساتھ تھی۔ ممکن ہے اس سفر میں آمنہ کو اپنے مرحوم شوہر کے مزار

---

[1] ابن سعد ذکر مَنْ اَرْضَعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ۔

دیکھنے کا بھی خیال ہو۔ بہرحال وُہ یثرب گئیں اور وہاں تقریباً ایک مہینہ تک قیام کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ زمانہ آخر عمر تک یاد رہا۔ قریباً پچاس سال کے بعد جب آپؐ ہجرت کرکے مدینہ گئے تو آپؐ نے صحابہ کو وہ مکان بتایا جہاں آپؐ اپنی والدہ کے ساتھ ٹھہرے تھے اور وہ جگہ بتائی جہاں آپؐ مدینہ کے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلا کرتے تھے۔ اور وُہ تالاب بھی دکھایا جہاں آپؐ نے تیرنے کی مشق کی تھی[1]

والدہ کی وفات

قریباً ایک ماہ کے قیام کے بعد آمنہ واپس روانہ ہوئیں مگر اپنے شوہر کی طرح اُن کی موت بھی غریب الوطنی میں ہی مقدر تھی چنانچہ راستہ میں ہی بیمار ہوگئیں اور مقام ابواء میں انتقال کیا اور یہیں دفن کی گئیں[2]۔ زمانہ نبوت میں جب آپؐ ایک دفعہ اس مقام پر سے گذرے تو اپنی والدہ کی قبر پر بھی تشریف لے گئے اور اُسے دیکھ کر چشم پُرآب ہو گئے۔ صحابہ نے یہ نظارہ دیکھا تو وہ بھی رونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا " اللہ نے مجھے یہ تو اجازت دی کہ میں اپنی والدہ کی قبر کو دیکھوں لیکن دُعا کرنے کی اجازت نہیں دی[3]۔" اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ آپ کی والدہ کی مغفرت نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہوگا۔ اور کیا نہ ہوگا۔ لیکن اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور موقعوں پر فرمایا ہے کہ جو شخص شرک کی حالت میں فوت ہو اُس کے لیے دُعا مانگنا دُرست نہیں ہے بلکہ اس کے معاملہ کو خُدا کے سپرد کرنا چاہیئے۔

والدہ کی وفات ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یُتم کی پوری پوری حالت میں آ گئے۔ اور چھوٹی عمر میں وطن سے باہر عزیز و اقرباء سے دُور ماں کی جدائی کا صدمہ ایسی حالت میں کہ باپ پہلے ہی گذر چکا ہو کوئی معمولی صدمہ نہیں؛ چنانچہ ان باتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر ایک گہرا اور مستقل اثر ڈالا۔ بے شک آپؐ اللہ کی طرف سے رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کیے گئے۔ مگر ظاہری اسباب کے لحاظ سے ان باتوں کا بھی آپؐ کی طبیعت پر بہت اثر ہُوا اور ایک حد تک یہ انہی ابتدائی صدموں کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کے اخلاق میں غرباء کی محبت اور مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی نے ایک خاص ممتاز رنگ اختیار کیا۔ قرآن شریف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یُتم کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے :-

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ○ .... فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ[4]

"یعنی کیا ہم نے تجھے یتیم پاکر پناہ نہیں دی۔ پس اب تیرا فرض ہے کہ تُو بھی یتیموں کے ساتھ شفقت اور نرمی کا سلوک کرے۔"

---

[1] ابن ہشام و ابن سعد و طبری ۔ [2] یہ عام مؤرخین کی روایت ہے۔ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آمنہ بنت وہب مکہ میں فوت ہوئی تھیں اور ان کی قبر مکہ کی وادی حجون میں ہے۔ واللہ اعلم ۔

[3] مسلم و ابن ماجہ ۔ [4] سورۃ الضحٰی : آیت ۷ ، ۱۰ ۔

عبدالمطلب کی کفالت

والدہ کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خادمہ ام ایمن کے ساتھ مکہ پہنچے۔ یہ اُمّ ایمن وہی ہے جو آپؐ کے والد کی وفات پر ایک لونڈی کی حیثیت میں آپؐ کو ورثہ میں پہنچی تھی۔ بڑے ہو کر آپؐ نے اسے آزاد کر دیا تھا اور اس کے ساتھ بہت احسان کا سلوک فرماتے تھے۔ بعد میں ام ایمن کی شادی آپ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے ساتھ ہوگئی اور اس کے بطن سے اسامہ بن زید پیدا ہوئے۔ اُمِ ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تک زندہ رہی۔ بہرحال والدہ کی وفات کے بعد آپؐ اُمّ ایمن کے ساتھ مکہ پہنچے اور وہاں پہنچ کر آپ کو عبدالمطلب نے براہ راست اپنی کفالت میں لے لیا۔ عبدالمطلب آپؐ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ خانہ کعبہ کا طواف کرتے تو آپؐ کو اپنے کندھے پر بٹھا لیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُن کے ساتھ بہت بے تکلف ہو گئے۔ عبدالمطلب کی عادت تھی کہ صحن کعبہ میں فرش بچھا کر بیٹھا کرتے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس فرش پر ان کے ساتھ بیٹھ سکے۔ حتیٰ کہ عبدالمطلب کے اپنے لڑکے بھی ہٹ کر بیٹھتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی محبت کے جوش میں سیدھے عبدالمطلب کے پاس جا بیٹھتے تھے اور وہ آپؐ کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آپؐ کے چچا بعض اوقات آپؐ کو فرش پر بیٹھنے سے روکتے تو عبدالمطلب ان کو منع کر دیتے اور کہتے کہ اسے تم کچھ نہ کہو۔

عبدالمطلب کی وفات

اسی محبت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دن گذر رہے تھے کہ عبدالمطلب کو بھی پیغام اجل آگیا۔ جب ان کا جنازہ اُٹھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ ساتھ تھے اور روتے جاتے تھے۔ یہ تیسرا صدمہ تھا جو آپ کو بچپن میں اُٹھانا پڑا۔ اس وقت آپؐ کی عمر آٹھ سال کی تھی اور عبدالمطلب کی عمر اختلاف روایات کے ساتھ اسّی سال سے لے کر ایک سو چالیس سال کی تھی[1]

مختلف بیویوں سے عبدالمطلب کے کئی بیٹے تھے جن میں سے زیادہ معروف کے نام یہ ہیں۔ حارث۔ زبیر ابوطالب۔ ابولہب۔ عبداللہ۔ عباس اور حمزہ۔ ان میں ابوطالب اور عبداللہ کی ماں ایک تھی۔ اور غالباً اسی نسبت سے عبدالمطلب نے مرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب کی کفالت میں دیا اور ان کو آپؐ کا خاص خیال رکھنے کی وصیت کی۔ چنانچہ اس وقت سے آپؐ اپنے چچا ابوطالب کی کفالت میں رہنے لگے۔ قومی کاموں میں سے سقایہ اور رفادہ کا کام جو عبدالمطلب کے پاس تھا وہ اُنہوں نے اپنے زندہ لڑکوں میں سے بڑے لڑکے زبیر کے سپرد کیا۔ مگر چونکہ یہ کام بہت سا روپیہ چاہتا تھا اِس لیے زبیر نے اپنی طاقت سے زیادہ دیکھ کر یہ دونوں کام ابوطالب کے سپرد کر دیئے۔ لیکن ابوطالب بھی غریب آدمی تھے اس لیے رفادہ کا کام بنو نوفل کی طرف منتقل ہو گیا اور سقایہ کا کام ابوطالب نے بالآخر عباس کے سپرد کر دیا جو نسبتاً ایک امیر آدمی تھے۔

---

[1] ابن سعد

اس موقعہ پر یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ عبدالمطلب کی زندگی تک تو بنو ہاشم نہایت معزز و مکرم تھے اور گویا تمام قبائل قریش میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد بنو ہاشم میں سے کوئی ایسا شخص نہ نکلا جو اس اعزاز کو قائم رکھ سکے اس لیے قریش کی عام سرداری ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور بنو ہاشم کے رقیب بنو امیہ آہستہ آہستہ بہت زور پکڑ گئے۔

ابوطالب کی کفالت

ابوطالب نے اپنے والد کی وصیت پر نہایت دیانت اور خوبی سے عمل کیا اور اپنے بچوں سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھا۔ ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے تھے اور رات کے وقت بھی عموماً اپنے ساتھ ہی سلاتے تھے۔

سفرِ شام اور واقعہ بحیرا راہب

جب آپؐ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو ابوطالب کو ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام کا سفر پیش آگیا۔ چونکہ سفر لمبا اور کٹھن تھا اس لیے اُنہوں نے ارادہ کیا کہ آپؐ کو مکّہ ہی میں چھوڑ جائیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب کی جدائی نہایت شاق تھی۔ چنانچہ روانگی کے وقت جوشِ محبت میں آپؐ ابوطالب سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر ابوطالب کا دل بھر آیا اور وُہ آپؐ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

شام کے جنوب میں بُصریٰ ایک مشہور مقام ہے، وہاں پہنچے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہاں ایک عیسائی راہب رہتا تھا جس کا نام بحیرا تھا۔ جب قریش کا قافلہ اُس کی خانقاہ کے پاس پہنچا تو اس راہب نے دیکھا کہ تمام پتھر اور درخت وغیرہ یکلخت سجدہ میں گر گئے۔ اُسے معلوم تھا کہ الٰہی نوشتوں کی رُو سے ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے اس لیے اُس نے اپنی فراست سے سمجھ لیا کہ اس قافلے میں وہی نبی موجود ہوگا۔ چنانچہ اُس نے اپنے قیافہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا۔ اور اس نے ابوطالب کو اطلاع دی۔ اور ابوطالب کو نصیحت کی کہ آپؐ کو اہلِ کتاب کے شر سے محفوظ رکھیں۔

علمِ روایت کی رُو سے اس واقعہ کی سند کمزور ہے۔ لیکن اگر فی الحقیقت ایسا واقعہ گذرا ہو تو کچھ تعجب بھی نہیں۔ درختوں وغیرہ کا سجدہ کرنا راہب کا ایک کشفی نظارہ سمجھا جائے گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کے لحاظ سے کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

کیا اسلام مسیحیت سے متاثر ہوا ہے؟

اس جگہ یہ ذکر ضروری ہے کہ میور صاحب اور بعض دُوسرے غیر مسلم مؤرخین نے بحیرا راہب کے واقعہ اور اسی قسم کے دُوسرے واقعات سے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ سے پہلے کسی عیسائی سے ملنا بیان ہوا ہے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ مسیحیت سے متاثر ہو کر کیا تھا اور آپؐ کی تعلیم اسی اثر کا نتیجہ تھی۔ مگر یہ خیال بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے اور جس شخص کو آپؐ کی تعلیم اور سوانح کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ ہے اور تعصب نے اُس کی آنکھ پر پردہ نہیں ڈال رکھا وہ اس اعتراض سے کبھی دھوکا

نہیں کہا سکتا۔ بے شک یہ دُرست ہے کہ ہر ذی عقل انسان اپنی استعداد کے مطابق اپنے ماحول کا مطالعہ کرتا ہے اور ماحول کے حسن و قبح کے نتیجہ میں اچھے یا بُرے تاثرات کا قائم ہونا بھی ایک فطری امر ہے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی عیسائی کے ساتھ بعثت سے پہلے ملے ہوں گے اور آپ کو عیسائیت کی تعلیم کے سُننے کا موقعہ میسّر آیا ہوگا تو طبعاً آپ کے دل میں اس کے اچھے اور بُرے حصّوں کے متعلق تأثرات بھی پیدا ہوتے ہوں گے۔ مگر یہ خیال قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ آپ کی نبوّت اور تعلیم ان تأثرات کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ اوّل تو بعثت سے پہلے آپ کا کسی عیسائی سے ایسے حالات میں ملنا ثابت نہیں کہ جس کے متعلق یہ سمجھا جا سکے کہ اُس نے آپ کی طبیعت پر کوئی گہرا اور مستقل اثر چھوڑا ہو۔ لیکن اگر بالفرض اس قسم کا کوئی اثر تھا بھی تو یقیناً وہ کوئی اچھا اثر نہیں تھا۔ کیونکہ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ آپ کی لائی ہوئی تعلیم میں عیسائیت کے اکثر اصولی مسائل سے شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً موجودالوقت عیسائی مذہب کی بنیاد زیادہ تر اُلوہیتِ مسیح۔ تثلیث اور کفّارہ کے عقائد پر ہے۔ مگر ایک بچّہ بھی جانتا ہے کہ قرآن شریف میں اِن تینوں مسائل کے خلاف نہایت سختی سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مسیح کی مزعومہ خدائی اور ابنیت کے متعلق یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ یہ ایسا عقیدہ ہے کہ قریب ہے کہ اس سے زمین و آسمان پھٹ جائیں[1]۔ اندریں حالات اسلام کی تعلیم کو عیسائیت کی طرف منسوب کرنا ایک مجنونانہ کوشش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

باقی رہا یہ امر کہ قرآن شریف میں حضرت مسیح ناصری کی تعریف کی گئی ہے۔ سو اس سے بھی مندرجہ بالا اعتراض کی تائید میں کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اوّل تو حضرت مسیح کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بطور ایک نبی کے ہے نہ کہ بطور ابن اللہ یا خدا ہونے کے جو عیسائی مذہب کا دعویٰ ہے۔ دوسرے یہ تعریف حضرت مسیح کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن شریف نے سارے گذشتہ انبیاء کی تعریف کی ہے اور انہیں نہایت بزرگ اور قابلِ احترام ہستیاں قرار دیا ہے بلکہ قرآن شریف نے بڑے زور کے ساتھ اس اصول کو پیش کیا ہے کہ دُنیا کی ساری قوموں میں خُدا کے رسول گذرے ہیں[2]۔ اور اس طرح اُس نے مسلمانوں کے دلوں میں تمام اقوامِ عالم کے بزرگوں کی عزت قائم کر دی ہے مگر یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ حضرت مسیح کی خدائیت اور عیسائی مذہب کے دوسرے اصولی عقائد کو اسلام نے نہایت سختی کے ساتھ ردّ کیا ہے اور حضرت مسیح کو ایک انسان رسول سے زیادہ حیثیت نہیں دی جو اپنی زندگی کے دن گذار کر دوسرے رسولوں کی طرح وفات پا گئے۔ پس مسیحی مذہب سے متاثر ہونے کا اعتراض بالکل غلط اور باطل ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ مسیحی مذہب کی بعض دینی اور اخلاقی تعلیمات اسلام میں بھی پائی جاتی ہیں جس سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اِن تعلیمات کو مسیحیت سے اخذ کیا ہے تو یہ بھی ایک فضول اعتراض ہوگا کیونکہ

---

[1] سورۃ مریم آیت ۹۱ تا ۹۳ ؛ [2] سورۃ فاطر: ۲۴

اوّل تو جب کہ اسلام اور موجودالوقت مسیحیت کی بہت سی اصولی تعلیمات ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہیں تو کسی ضمنی حصہ میں ان دو تعلیموں کا آپس میں متشابہ ہونا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں سمجھا جا سکتا کہ ایک تعلیم دُوسرے سے ماخوذ ہے۔ دُوسرے جب کہ اسلام حضرت مسیح کو خُدا کا ایک برگزیدہ رسُول قرار دیتا ہے اور خود بھی خُدا کی طرف سے ہونے کا مدعی ہے تو یہ لازمی تھا کہ بوجہ ایک ہی منبع سے نکلی ہوئی چیزیں ہونے کے اسلام اور مسیحیت کی بعض تعلیمیں ایک دوسرے کے متشابہ ہوتیں۔ کیونکہ بہرحال ہدایت کے اصول ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے ایک ہی ہیں۔ تیسرے قرآن شریف خود اس بات کا مدعی ہے کہ اس نے سب گذشتہ تعلیموں کی دائمی صداقتوں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ[1] یعنی قرآن کے اندر تمام گذشتہ صُحُف کی پختہ اور مستقل باتیں جمع کر دی گئی ہیں پس اس جہت سے بھی مسیحیت کی کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔

اِس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن شریف نے اپنے اس خاصہ کو کہ اس میں گذشتہ تعلیمات کی سب دائمی صداقتیں اور پختہ اور مستقل باتیں شامل کر دی گئی ہیں۔ ایک کمال کے رنگ میں پیش کیا ہے اور اس پہلو سے اسے گویا ایک شہد کی مکھی سے تشبیہہ دی ہے[2]۔ جو ہر قسم کے پھل اور پھول سے اُس کا جوہر لے کر باریک در باریک کیمیائی رنگ میں ایک نہایت لطیف چیز تیار کر دیتی ہے جو باوجود مختلف پھلوں اور پھولوں کا جوہر ہونے کے ایک بالکل ہی نئی چیز ہوتی ہے جسے کسی خاص پھل یا پھُول کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں قرآن شریف نے صرف گذشتہ صحف ہی سے اُن کی پختہ تعلیمات کو اخذ نہیں کیا بلکہ چونکہ وہ ایک دائمی شریعت کا حامل ہے اس لیے اس نے قیامت تک کی ضروریات کے پیشِ نظر بہت سی نئی باتوں کو بھی زائد کر کے ایک کامل اور اَبدی شریعت پیش کی ہے اور خدا کی طرف سے اس میں ایسے خواص ودیعت کر دیئے گئے ہیں کہ اس ظاہری عالم کی طرح وہ قیامت تک کے لیے بنی نوع انسان کی دینی ضروریات کا سامان اپنے اندر مخفی رکھتا ہے جو حسبِ ضرورت ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ دراصل قرآن شریف مندرجہ ذیل تعلیمات کا مجموعہ ہے :

اوّل گذشتہ صحف کے وہ حصّے جو ایک دائمی اور عالمگیر شریعت کا جزو بن سکتے تھے۔

دوم آئندہ کے لیے مختلف اقوام عالم کی ضروریات کے مناسبِ حال مستقل تعلیم جو حقوق العباد اور حقوق اللہ کی کامل ادائیگی اور ہر قسم کی اخلاقی اور رُوحانی ترقی کے لیے قیامت تک کے لیے ضروری تھی۔

بہرحال یہ خیال کہ قرآن شریف یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت مسیحیت یا کسی اور مذہب کی تعلیم کا نتیجہ تھی، بالکل غلط اور باطل ہے۔ اور ایسا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جو اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیم سے

---

[1] سورۃ بیّنہ: آیت ۴ [2] سورۃ نحل: آیت ۶۹

قطعاً نابلد ہے۔ اور بالخصوص بحیرا راہب وغیرہ کی ملاقات کی طرف اسلامی تعلیمات کو منسوب کرنا تو ایک بالکل ہی مضحکہ خیز بات ہے جو کسی دانا شخص کی زبان پر نہیں آسکتی۔

آپؐ کا بکریاں چرانا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب شام کے سفر سے واپس آئے تو بدستور ابوطالب کے پاس ہی رہتے تھے مگر چونکہ عرب میں بچوں کو عموماً مویشی چرانے کے کام پر لگا دیتے تھے اس لیے اس زمانہ میں آپؐ نے بھی کبھی کبھی یہ کام کیا اور بکریاں چرائیں۔ زمانۂ نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ بکریاں چرانا بھی انبیاء کی سنت ہے[1] اور میں نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر سفر میں آپؐ کے اصحاب جنگل میں پیلو جمع کر کے کھانے لگے تو آپؐ نے فرمایا۔ کالے کالے پیلو تلاش کر کے کھاؤ۔ کیونکہ جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا تو اس وقت کا میرا تجربہ ہے کہ کالے رنگ کے پیلو زیادہ عمدہ ہوتے ہیں[2]۔

بدیوں سے خدائی حفاظت

اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات اپنے ساتھی سے کہا جو بکریاں چرانے میں آپؐ کا شریک تھا کہ تم میری بکریوں کا خیال رکھو تاکہ میں ذرا شہر جا کر لوگوں کی مجلس دیکھ آؤں۔ ان دنوں میں دستور تھا کہ رات کے وقت لوگ کسی مکان پر جمع ہو کر کہانیاں سناتے اور شعر و غزل کا شغل کیا کرتے تھے اور بعض اوقات اسی میں ساری ساری رات گذار دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بچپن کے شوق میں یہ تماشہ دیکھنے گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو اس لغو کام میں خاتم النبیینؐ کی شرکت پسند نہ آئی؛ چنانچہ ایک جگہ آپؐ گئے مگر راستے میں ہی نیند آگئی اور سو گئے اور صبح تک سوتے رہے۔ ایک دفعہ اور آپؐ کو یہی خیال آیا مگر پھر بھی دستِ غیبی نے روک دیا۔ زمانۂ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں نے ساری عمر میں صرف دو دفعہ اس قسم کی مجلس میں شرکت کا ارادہ کیا، مگر دونوں دفعہ روک دیا گیا[3]۔

حرب فجار

عرب ایک نہایت جنگجو قوم تھی اور لڑنے مرنے کو یہ لوگ فخر سمجھتے تھے۔ اسی لیے بات بات پر تلوار کھنچ جاتی تھی اور جب کبھی ایسا موقعہ آتا تو ایک بڑے پیالے میں خون بھر کر سب اس کے اندر انگلیاں ڈبو کر قسم کھاتے تھے کہ لڑ کر مر جائیں گے مگر پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ مختلف قبائل کی آپس میں عداوت رہتی تھی کیونکہ ہر قبیلہ کو اپنی عزت اور بڑائی کا از بس خیال تھا۔ ایسی صورت میں میلوں وغیرہ میں جہاں مختلف قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں لڑائی کی وجوہات پیدا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

---

[1] اس کی معلوم ہوتی ہے کہ انبیاء کا کام بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے گلہ بانی کا رنگ رکھتا ہے پس اللہ تعالیٰ ان سے ان کی ابتدائی عمر میں چرواہے کا کام لے کر تصویری زبان میں یہ اشارہ کر دیتا ہے کہ اب تم انسانوں کی گلہ بانی کیلئے بھی تیار ہو جاؤ۔

[2] بخاری کتاب بدء الخلق باب یعکفون علی اصنام ❊ [3] طبری ❊

چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابھی بچپن ہی تھا تو عکاظ کے میلہ کے موقعہ پر جو مکہ سے جانب شرق تین دن کی مسافت پر ایک خوشگوار وادی میں لگا کرتا تھا، قبائل قیس عیلان اور بنو کنانہ کے درمیان کچھ چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ اس زمانہ میں قیس عیلان کے مختلف قبائل مکہ سے جنوب مشرق میں طائف اور مکہ کے درمیان آباد تھے۔ ایک عرصہ تک تو دونوں طرف کے رؤساء نے جنگ کی نوبت آنے سے بچائے رکھا، مگر آہستہ آہستہ تعلقات کشیدہ ہوتے گئے اور بالآخر لڑائی تک نوبت پہنچ گئی۔ اس جنگ کو تاریخ میں حرب فجار کہتے ہیں جس کے معنے ناجائز جنگ کے ہیں۔ کیونکہ اس جنگ کی ابتداء شہر حرم میں ہوئی تھی جس کے اندر لڑنا عرب کے قدیم دستور کے مطابق ممنوع تھا۔

غرض یہ جنگ ہوئی اور ایسے زور شور سے ہوئی کہ زمانہ جاہلیت کی جنگوں میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ بنو کنانہ بشمولیت قبیلہ قریش ایک طرف تھے اور قیس عیلان بشمولیت قبیلہ ہوازن دوسری طرف۔ اس جنگ کی سب سے خطرناک آخری لڑائی تھی جو حرب فجار کی چوتھی لڑائی کہلاتی ہے۔ اس میں جوش کا یہ عالم تھا کہ بعض سرداروں نے اپنے آپ کو رسّوں سے بندھوا دیا تھا کہ اگر بھاگنا چاہیں بھی تو نہ بھاگ سکیں۔ دن کے شروع حصہ میں قیس عیلان کا پلہ بھاری رہا لیکن آخر میں بنو کنانہ نے دبا لیا۔ اور قیس عیلان کی شکست کے بعد ہر دو فریق میں صلح ہو گئی۔

اس لڑائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے۔ مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے خود قتال نہیں کیا بلکہ آپؐ کی شرکت صرف اس حد تک محدود تھی کہ آپ فوج میں شامل تھے اور اپنے چچاؤں کو تیر پکڑاتے جاتے تھے۔ اس وقت آپؐ کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ اس لڑائی میں ہر قبیلہ کا افسر الگ تھا۔ چنانچہ بنو ہاشم زبیر بن عبدالمطلب کے ماتحت تھے مگر بنو کنانہ کی ساری فوج کا افسر حرب بن امیہ تھا جو ابوسفیان کا والد اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔[۱]

حلف الفضول قدیم زمانہ میں عرب کے بعض شریف دل اشخاص کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ باہم مل کر عہد کیا جاوے کہ ہم ہمیشہ حقدار کو اس کا حق حاصل کرنے میں مدد دیں گے اور ظالم کو ظلم سے روکیں گے۔ اور عربی میں چونکہ حق کو فضل بھی کہتے ہیں جس کی جمع فضول ہے، اس لیے اس معاہدہ کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ بعض روایتوں کی رُو سے چونکہ اس تجویز کے محرک ایسے شخص تھے جن کے ناموں میں فضل کا لفظ آتا تھا، اس لیے یہ عہد حلف الفضول کے نام سے مشہور ہو گیا۔[۲] بہر حال حرب فجار کے بعد اور غالباً اسی جنگ سے متاثر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب کے دل میں یہ تحریک

---

[۱] ابن ہشام ۔

[۲] روض الانف مصنفہ امام سہیلی جلد ۱ صفحہ ۱۱ ۔

پیدا ہوئی کہ اس حلف کو پھر تازہ کیا جاوے؛ چنانچہ اس کی تحریک پر بعض قبائل قریش کے نمائندگان عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے جہاں عبداللہ بن جدعان کی طرف سے ایک دعوت کا انتظام تھا۔ اور پھر سب نے اتفاق کر کے باہم قسم کھائی کہ ہم ہمیشہ ظلم کو روکیں گے اور مظلوم کی مدد کریں گے۔ اس عہد میں حصہ لینے والوں میں بنو ہاشم۔ بنومطلب[1]۔ بنو اسد۔ بنو زہرہ اور بنو تیم شامل تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس موقعہ پر موجود تھے اور شریک معاہدہ تھے؛ چنانچہ آپؐ ایک دفعہ نبوت کے زمانہ میں فرماتے تھے کہ مَیں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسی قسم میں شریک ہوا تھا کہ اگر آج اسلام کے زمانہ میں بھی مجھے کوئی اس کی طرف بلائے، تو مَیں اس پر لبیک کہوں گا اور شاید اسی خیال کا اثر تھا کہ جب ایک دفعہ امیر معاویہ کے زمانہ میں ان کے بھتیجے ولید بن عتبہ بن ابوسفیان نے جو اس وقت مدینہ کے امیر تھے حضرت حسینؓ بن علیؓ ابن ابی طالب کا کوئی حق دبالیا تو حضرت حسینؓ نے کہا کہ ”خدا کی قسم اگر ولید نے میرا حق نہ دیا تو مَیں تلوار نکال کر مسجد نبوی میں کھڑا ہو جاؤں گا اور حلف الفضول کی طرف لوگوں کو بلاؤں گا۔“ جس وقت عبداللہ بن زبیر نے یہ سُنا تو کہا کہ اگر حسینؓ نے اس قسم کی طرف بلایا تو مَیں اس پر ضرور لبیک کہوں گا اور ہم یا تو اس کا حق دلوائیں گے اور یا اس کوشش میں سب مارے جائیں گے۔ بعض اور آدمیوں نے بھی اسی قسم کے الفاظ کہے جس پر ولید دب گیا اور اس نے حضرت حسینؓ کا حق ادا کر دیا۔[2] یہ خیال رہے کہ عبداللہ بن زبیر بنو اسد میں سے تھے جو حلف الفضول میں شریک تھے۔

حُلیہ مبارک

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جوان تھے اور جسمانی نشوونما مکمل ہو چکا تھا۔ اس لیے اس موقعہ پر آپؐ کا حُلیہ بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ لکھا ہے کہ آپؐ میانہ قد تھے۔ رنگ بہت خوبصورت تھا یعنی نہ تو بہت ہی سفید جو بُرا لگے اور نہ ہی گندم گوں بلکہ گندم گوں سے کچھ سفید تھا۔ سَر کے بال بالکل سیدھے کُوکدار نہ تھے بلکہ کسی قدر خمدار تھے۔ داڑھی گھنی اور خوبصورت تھی۔ جسم درمیانہ تھا۔ جلد نازک اور ملائم تھی اور آپؐ کے جسم اور پسینہ میں ایک قسم کی خوشبو پائی جاتی تھی۔ سَر بڑا تھا۔ سینہ فراخ۔ ہاتھ پاؤں بھرے بھرے۔ ہتھیلیاں چوڑی۔ چہرہ گول۔ پیشانی اور ناک اونچی۔ آنکھیں سیاہ اور روشن۔ اور پلکیں دراز تھیں۔ چلنے میں وقار تھا۔ مگر عموماً تیزی کے ساتھ قدم اُٹھتا تھا۔ گفتگو میں آہستگی ہوتی تھی۔ حتّٰی کہ اگر سُننے والا چاہے تو آپؐ کے الفاظ کو گن سکتا تھا۔ ناراضگی کے وقت چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ اور خوشی کے موقعہ پر بھی چمک اُٹھتا تھا۔[3] انگلستان کا مشہور مؤرخ سر ولیم میور آپؐ کا حُلیہ بیان کر کے لکھتا ہے کہ:

”آپؐ کا سردارانہ رنگ ڈھنگ ایک اجنبی شخص کے دل میں کچھ ایسا رُعب پیدا کر دیتا

---

[1] یاد رکھنے کا مقام ہے کہ بنو نوفل اور بنو امیہ اس موقعہ پر بھی بنو ہاشم سے الگ رہے۔

[2] ابن ہشام ؛ [3] بخاری کتاب صفۃ النبیؐ و شمائل ترمذی۔

تھا جو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب اُسے آپؐ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا اور وہ آپ سے واقف ہو جاتا تھا تو اُس کے دل میں بجائے ڈر اور خوف کے عقیدت اور محبت کے جذبات پیدا ہونے لگتے تھے۔"[1]

مشاغلِ تجارت

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب جوان تھے اور کاروبارِ زندگی میں مصروف ہونے کا وقت آگیا تھا۔ اور چونکہ ابوطالب کی مالی حالت بھی اچھی نہیں تھی اس لیے بھی اس بات کی ضرورت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مناسب کام شروع کر کے اُن کے بوجھ کو ہلکا کریں؛ چنانچہ ابوطالب کی خواہش اور تحریک پر آپؐ نے تجارت کا کام شروع فرما دیا۔

مکہ سے تجارت کے قافلے مختلف علاقوں کی طرف جاتے تھے۔ جنوب میں یمن اور شمال میں شام کی طرف تو باقاعدہ تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے علاوہ بحرین وغیرہ کے ساتھ بھی تجارت تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غالبًا ان سب ملکوں میں تجارت کی غرض سے گئے[2] اور ہر دفعہ نہایت دیانت و امانت اور خوش اسلوبی اور ہنرمندی کے ساتھ اپنے فرض کو ادا کیا۔ مکہ میں بھی جن لوگوں کے ساتھ آپؐ کا معاملہ پڑا وہ سب آپؐ کی تعریف میں رطب اللسان تھے؛ چنانچہ سائب ایک صحابی تھے۔ وہ جب اسلام لائے تو بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کی تعریف کی۔ آپؐ نے فرمایا "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔" سائب نے عرض کی "ہاں یا رسول اللہ! آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ آپؐ ایک دفعہ تجارت میں میرے شریک تھے اور آپؐ نے ہمیشہ نہایت صاف معاملہ رکھا۔"[3] عبداللہ بن ابی الحمساء ایک اور صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کوئی کاروباری معاملہ کیا اور میرے ذمہ آپؐ کا کچھ حساب باقی رہ گیا جس پر میں نے آپؐ سے کہا کہ آپ یہیں اسی جگہ ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔ مگر مجھے بھول گیا اور تین دن کے بعد یاد آیا۔ اس وقت جب میں اس طرف گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہیں کھڑے تھے۔ مگر آپؐ نے سوائے اس کے مجھے کچھ نہیں کہا کہ "تم نے مجھے تکلیف میں ڈالا ہے۔ میں یہاں تین دن سے تمہارے انتظار میں ہوں۔" اس سے غالبًا یہ مراد نہیں کہ آپؐ مسلسل تین دن تک اسی جگہ ٹھہرے رہے بلکہ منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ مناسب اوقات میں کئی کئی دفعہ اس جگہ جا کر دیر دیر تک عبداللہ کا انتظار فرماتے ہوں گے تاکہ عبداللہ کو آپؐ کی تلاش کی وجہ سے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔[4]

---

[1] میور صفحہ ۲۵ ۔ [2] زرقانی اور مسند حنبل بحوالہ سیرۃ النبیؐ ۔

[3] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۱۷ ۔

[4] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۳۴ ۔

اسی قسم کے واقعات سے مکّہ والوں میں آپؐ کا نام امین مشہور ہوگیا تھا اور آپؐ کی دیانت اور امانت کی وجہ سے سب لوگ آپؐ کی بہت عزت کرتے تھے اور آپؐ کو نہایت راستباز اور صادق القول یقین کرتے تھے۔[1]

تجارتی کاروبار کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس سال کے قریب ہوئی تو خدیجہؓ بنت خویلد نے جو قبیلہ بنو اسد کی ایک نہایت شریف اور مالدار خاتون تھی اور مکّہ کی تجارت میں اسکا بہت بڑا حصہ تھا آپؐ کو تجارتی مال دے کر شام کی طرف تجارت کی غرض سے بھیجا۔ اور اپنے غلام میسرہ کو آپؐ کے ساتھ کر دیا۔ اس سفر میں آپؐ کی محنت اور برکت اور دیانتداری کے طفیل اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت نفع ہوا اور آپؐ نہایت کامیاب ہوکر واپس آئے۔ اسی طرح آپؐ نے دو تین تجارتی سفر دوسرے علاقوں کی طرف بھی کئے۔

حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی

حضرت خدیجہؓ ایک بیوہ اور صاحبِ اولاد عورت تھیں اور یکے بعد دیگرے دو خاوند کرچکی تھیں۔ مگر دونوں فوت ہوچکے تھے۔ چونکہ نہایت معزز اور دولتمند اور شریف تھیں حتیٰ کہ اُن کی شرافت کی وجہ سے اُن کا نام طاہرہ مشہور ہوگیا تھا۔[2] اس لیے مکّہ کے کئی لوگوں نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا، مگر اُنھوں نے سب کا انکار کیا۔ اب جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا معاملہ پڑا اور اُنھوں نے آپؐ کے اخلاقِ فاضلہ اور قابلیت کو دیکھا اور اپنے خادم میسرہ کو بھی آپؐ کی تعریف میں رطب اللسان پایا تو اُنھوں نے خود آپؐ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کے مشورہ کے بعد قبول کرلیا۔ چنانچہ آپؐ کے رشتہ دار اور خدیجہؓ کے قریبی رشتہ دار جمع ہوئے اور ابوطالب نے پانسو درہم مہر پر خدیجہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح پڑھ دیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال کی تھی۔ گویا خدیجہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ اس نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد بن اسد فوت ہوچکے تھے۔ اس لیے خدیجہؓ کی طرف سے اُن کے چچا عمرو بن اسد نے شرکت کی۔[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی بھی اولاد ہوئی وہ سب سوائے ابراہیم کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئے۔ لڑکوں کے نام قاسم۔ طاہر اور طیّب تھے۔ بعض روایتوں میں ایک چوتھا بیٹا عبداللہ بھی بیان ہوا ہے۔ مگر عام خیال یہ ہے کہ طیّب کا دوسرا نام عبداللہ تھا۔ لڑکیوں کے نام زینبؓ، رقیہؓ۔ اُمِّ کلثومؓ اور فاطمہؓ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اولاد جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہوئی

---

[1] ابن ہشام [2] زرقانی [3] ابن سعد و روض الانف جلد ۱ صفحہ ۱۲۲

آپ کے دعویٰ نبوت سے پہلے پیدا ہو چکی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم آپ کے بڑے بیٹے قاسم کے نام پر تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نرینہ اولاد سب بچپن میں ہی فوت ہو گئی۔ مگر لڑکیاں سب بڑی ہوئیں اور اسلام لائیں، لیکن سوائے چھوٹی لڑکی فاطمۃ الزہراؓ کے باقی کسی لڑکی کی نسل نہیں چلی۔ بڑی لڑکی زینبؓ ابوالعاص بن ربیع کے ساتھ بیاہی گئیں جو حضرت خدیجہؓ کے عزیزوں میں سے تھے۔ ابوالعاص کے ہاں زینبؓ کے بطن سے ایک لڑکا علی اور ایک لڑکی امامہ پیدا ہوتے۔ لڑکا تو بچپن میں ہی فوت ہو گیا، مگر لڑکی بڑی ہوئی اور حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے عقد میں آئی، مگر اس کی نسل نہیں چلی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امامہ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ابوالعاص ہجرت کے کئی سال بعد تک اسلام نہیں لائے۔ جس کی وجہ سے زینبؓ کو بھی بعض تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ زینبؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی فوت ہو گئیں۔

رقیہؓ اور اُمِّ کلثومؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ابولہب کے دو لڑکوں عُتبہ اور عُتیبہ کے عقد میں آئیں مگر اسلام کے زمانہ میں جب ابولہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی تو پیشتر اس کے کہ رُخصتانہ ہوتا یہ دونوں نکاح فسخ ہو گئے۔ اس کے بعد رقیہؓ اور اُمِّ کلثومؓ یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ بن عفان کے نکاح میں آئیں جس کی وجہ سے اُن کو ذوالنورین یعنی دو نُوروں والا کہتے ہیں۔ مگر ان دونوں کی نسل نہیں چلی یعنی رقیہؓ کے بطن سے تو ایک لڑکا عبداللہ پیدا ہو کر فوت ہو گیا اور اُمِّ کلثومؓ کے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی۔ رقیہؓ کا جنگِ بدر کے زمانہ میں اور اُمِّ کلثومؓ کا فتح مکہ کے بعد انتقال ہو گیا۔

سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ عزیز تھیں۔ یہ ہجرت کے بعد حضرت علیؓ کے عقد میں آئیں اور انہی کے بطن سے حضرت امام حسنؓ اور حسینؓ پیدا ہوئے جن کی اولاد سیّد کہلاتی ہے۔ حضرت فاطمہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چھ ماہ بعد فوت ہوئیں۔[1]

حضرت خدیجہؓ کی اولاد جو اُن کے پہلے دو خاوندوں سے تھی وہ دو لڑکوں ہند اور ہالہ اور ایک لڑکی ہند پر مشتمل تھی جو خدا کے فضل سے سب مُسلمان ہو گئے تھے۔

کعبہ کی جدید تعمیر

تعمیر کعبہ کا واقعہ باب دوم میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے چونکہ کعبہ کی عمارت کو کسی وجہ سے نقصان پہنچ گیا تھا، اس لیے قریش نے اسے گرا کر پھر از سرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر گرانے کا کام شروع کرنے سے سب ڈرتے تھے کہ خُدا کا گھر ہے کوئی آفت نہ آ جاوے۔ آخر ولید بن مغیرہ نے جو معمر اور سرداران قریش میں سے تھا اس کام کو شروع کیا اور جب لوگوں نے ایک رات انتظار کر کے دیکھ لیا کہ ولید پر اس وجہ سے کوئی آفت نہیں آئی تو پھر سب

---

[1] ابن ہشام و ابن سعد و زرقانی۔

شامل ہو گئے۔ جب پُرانی عمارت کو گراتے گراتے حضرت ابراہیم کی بنیادوں پر پہنچے تو رک گئے اور ان کے اُوپر نئی تعمیر شروع کی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ساحل کے پاس ایک بڑی کشتی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی لکڑی قریش نے خرید لی۔ لیکن چونکہ یہ لکڑی ساری چھت کے لیے ناکافی تھی اس واسطے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ قریش کعبہ کی اس جدید تعمیر کو ابراہیم خلیل اللہ کی بنیادوں پر کھڑا نہیں کر سکے، بلکہ ایک طرف سات ہاتھ جگہ چھوڑ دی۔ بعض اور تبدیلیاں بھی قریش نے کیں مگر ان کا بیان اُوپر گذر چکا ہے اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

جب قریش کعبہ کی تعمیر کرتے ہوتے حجرِ اسود کی جگہ پر پہنچے تو قبائلِ قریش کے اندر اس بات پر سخت جھگڑا ہوا کہ کون قبیلہ اسے اس کی جگہ پر رکھے۔ ہر قبیلہ اس عزت کو اپنے لیے چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ لوگ آپس میں لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے اور بعض نے تو زمانۂ جاہلیت کے دستور کے موافق ایک خُون سے بھرے ہوئے پیالے میں اُنگلیاں ڈبو کر قسمیں کھائیں کہ لڑ کر مر جائیں گے مگر اس عزت کو اپنے قبیلہ سے باہر نہ جانے دیں گے۔ اس جھگڑے کی وجہ سے تعمیر کا کام کئی دن تک بند رہا۔ آخر ابو امیہ بن مغیرہ نے تجویز پیش کی کہ جو شخص سب سے پہلے حرم کے اندر آتا دکھائی دے وہ اس بات میں حکم ہو کر فیصلہ کرے کہ اس موقعہ پر کیا کرنا چاہیے۔ اللہ کی قدرت لوگوں کی آنکھیں جو اُٹھیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر سب پکار اُٹھے "امین امین" اور سب نے باتفاق کہا کہ "ہم اس کے فیصلہ پر راضی ہیں"۔ جب آپ قریب آئے تو انھوں نے آپ سے حقیقتِ امر بیان کی اور فیصلہ چاہا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ایسا فیصلہ فرمایا کہ سب سردارانِ قریش دنگ رہ گئے اور آفرین پکار اُٹھے۔ آپ نے اپنی چادر لی اور اس پر حجرِ اسود کو رکھ دیا۔ اور تمام قبائلِ قریش کے رؤساء کو اس چادر کے کونے پکڑوا دیئے اور چادر اُٹھانے کا حکم دیا۔ چنانچہ سب نے مل کر چادر کو اُٹھایا اور کسی کو بھی شکایت نہ رہی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تصویری زبان میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل جو اب برسرِ پیکار ہیں وہ اس پاک وجود کے ذریعہ سے ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے۔ جب حجرِ اسود کی اصلی جگہ کے محاذ میں چادر پہنچی تو آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اُسے چادر پر سے اُٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا[۱] یہ جیسا کہ پہلے کہا گیا تھا تصویری زبان میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ عنقریب نبوت کی عمارت کے "کونے کا پتھر" آپ کے وجود سے اپنی جگہ پر قائم ہوگا[۲]۔

عام مؤرخین کعبہ کی اس تعمیر کی تاریخ کے متعلق صرف اتنا لکھ دیتے ہیں کہ یہ آپ کی پینتیس ۳۵ سال کی عمر کا واقعہ ہے۔ حالانکہ اگر اس زمانہ کے حالات کو مدِنظر رکھ کر دیکھا جاوے تو دراصل نئی عمارت کے واسطے سامان جمع کرنے اور پُرانی عمارت کو گرانے وغیرہ کا کام ایک کافی لمبا وقت چاہتا تھا۔ لہٰذا قرین قیاس یہ ہے کہ

۱؎ طبری و ابنِ ہشام و ابنِ سعد و زرقانی و تاریخ خمیس ۲؎ زبور ۱۱۸ آیت ۲۲

اس کام کی تیاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ اور نئی عمارت کے واسطے سامان یعنی پتھر لکڑی وغیرہ آہستہ آہستہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ ایک صحیح روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعمیر کعبہ کے واسطے پتھر اٹھا اٹھا کر جمع کر رہے تھے تو آپؐ کے چچا عباسؓ نے آپؐ سے کہا۔ بھتیجے اپنا تہ بند اپنے شانہ پر رکھ لو تاکہ پتھروں کی رگڑ وغیرہ نہ لگے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیل حکم تو کی مگر چونکہ اس سے آپؐ کے جسم کا کچھ ستر والا حصّہ ننگا ہوگیا۔ آپؐ شرم کے مارے زمین پر گر گئے اور آپؐ کی آنکھیں پتھرا گئیں اور آپؐ بے تاب ہوکر "میرا تہ بند میرا تہ بند" پکارنے لگ گئے۔ حتّٰی کہ پھر آپؐ نے جلدی سے اپنا تہ بند درست کر لیا۔[1] یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جو صرف ابتدائی عمر کی طرف ہی منسوب ہوسکتا ہے، چنانچہ بعض گذشتہ مؤرخین نے بھی لکھا ہے کہ یہ صغر سنی کا واقعہ ہے۔[2] ہاں حجرِ اسود کے متعلق حکَم بن کر فیصلہ کرنے کا واقعہ بیشک بعد کا ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ روایت ہے کہ آپؐ کو آتا دیکھ کر سب لوگ امین امین پکار اُٹھے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ امین کا لقب آپؐ نے اسوقت پایا جب معاملات میں پڑ کر آپؐ کی امانت و دیانت روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوکر مسلّم ہوگئی۔

زید بن حارثہ کا آپؐ کی خدمت میں آنا

حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے تھے جن کا نام حکیم بن حزام تھا۔ یہ بڑے تاجر آدمی تھے اور ہمیشہ تجارتی قافلوں کے ساتھ اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ یہ کہیں تجارت کے لیے گئے تو چند ایک غلام خرید کر لائے۔ اور اُن میں سے ایک غلام اپنی پھوپھی کی نذر کیا۔ اُس کا نام زید بن حارثہ تھا۔ زید دراصل ایک آزاد خاندان کا لڑکا تھا مگر کسی لوٹ مار میں قید ہوکر غلام بنالیا گیا تھا۔ خدیجہؓ نے زید کو ایک ہوشیار اور ہونہار لڑکا پاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ یہ دستور تھا کہ اپنے غلاموں اور خادموں کو نہایت محبت اور پیار کے ساتھ رکھتے تھے۔ اور اُن سے اپنے رشتہ داروں کی طرح سلوک کرتے تھے، چنانچہ زید کے ساتھ بھی آپؐ کو محبت تھی۔ اور زید چونکہ ایک وفادار دل رکھتا تھا، اس لیے اُسے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ارادت ہوگئی۔ اُسی زمانہ میں زید کا باپ حارثہ اور اُس کا چچا کعب زید کا پتہ لیتے لیتے مکّہ آنکلے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اُنھوں نے عاجزی سے استدعا کی کہ زید کو رہا کر کے اُن کے ساتھ بھیج دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں اگر زید جانا چاہے تو میری طرف سے بخوشی اجازت ہے۔" اِس پر زید کو بلایا گیا اور آپؐ نے اُسے کہا "زید تم ان کو پہچانتے ہو کہ یہ کون ہیں؟" اُس نے عرض کی "ہاں یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "یہ تم کو لینے آئے ہیں۔ اگر تم جانا

---

[1] بخاری باب بنیان الکعبۃ۔ [2] ابن ہشام زرقانی و سہیلی۔

چاہتے ہو تو میری طرف سے تم کو بخوشی اجازت ہے۔" زید نے جواب دیا۔" میں آپ کو چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔ آپ میرے لیے میرے چچا اور باپ سے بڑھ کر ہیں۔" زید کا باپ غصہ میں بولا۔" ہیں! تُو غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے؟" زید نے کہا۔" ہاں! کیونکہ میں نے ان میں ایسی خوبیاں دیکھی ہیں کہ اب میں کسی کو ان پر ترجیح نہیں دے سکتا۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب زید کا یہ جواب سُنا، تو فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور زید کو خانہ کعبہ کے پاس لے جا کر بلند آواز سے فرمایا۔" لوگو! گواہ رہو کہ آج سے میں زید کو آزاد کرتا اور اسے اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ یہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا۔" زید کے والد اور چچا نے یہ نظارہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اور زید کو بخوشی آپ کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ اُس دن سے زید بجائے زید بن حارثہ کے زید بن محمدؐ کہلانے لگے۔[1] لیکن ہجرت کے بعد جب خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم اترا کہ مُنہ بولا بیٹا بنانا جائز نہیں ہے[2] تو زید کو پھر زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک اور پیار اس وفادار خادم کے ساتھ وہی رہا جو پہلے تھا، بلکہ دن بدن ترقی کرتا گیا اور زید کی وفات کے بعد زید کے لڑکے اسامہ بن زید سے بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ امّ ایمن کے بطن سے تھے آپؐ کا وہی سلوک اور وہی پیار تھا۔

زید کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ تمام صحابہ میں سے صرف انہی کا نام قرآن شریف میں صراحت کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔[3]

علی بن ابی طالب کا آنحضرتؐ کے گھر آنا

ابو طالب ایک بہت باعزت آدمی تھے مگر غریب تھے اور بڑی تنگی سے اُن کا گذارہ چلتا تھا۔ خصوصاً ان ایام میں جبکہ مکہ میں ایک قحط کی صورت تھی اُن کے دن بہت ہی تکلیف میں کٹتے تھے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے چچا کی اس تکلیف کو دیکھا تو اپنے دُوسرے چچا عباس سے ایک دن فرمانے لگے۔ چچا! آپ کے بھائی ابو طالب کی معیشت تنگ ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اُن کے بیٹوں میں سے ایک کو آپ اپنے گھر لے جائیں اور ایک کو میں لے آؤں۔" عباس نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ اور پھر دونوں مل کر ابو طالب کے پاس گئے اور اُن کے سامنے یہ درخواست پیش کی۔ اُن کو اپنی اولاد میں عقیل سے بہت محبت تھی۔ کہنے لگے عقیل کو میرے پاس رہنے دو اور باقیوں کو اگر تمہاری خواہش ہے تو لے جاؤ! چنانچہ جعفر کو عباس اپنے گھر لے آئے اور علیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاس لے آئے۔ حضرت علیؓ کی عمر اس وقت قریباً چھ سات سال کی تھی۔ اس کے بعد علیؓ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہے۔[4]

---

[1] اسد الغابہ و ابن ہشام ۔ [2] سورۃ احزاب: ۵، ۶ ۔ [3] سورۃ احزاب: ۳۸ ۔
[4] ابن ہشام و اسد الغابہ ۔

صُبح کی سفیدی

اب آپؐ کی عمر چالیس سال کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اور وقت آگیا تھا کہ صبح کی سفیدی اُفقِ مشرق میں نمودار ہو۔ یُوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی مکہ کی عام سوسائٹی میں زیادہ خلا ملا نہیں کیا مگر ان ایام میں خصوصاً آپؐ کی طبیعت کا یہ حال تھا کہ دن رات اللہ تعالیٰ کی طلب اور اُس کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ مکہ کے پاس شہر سے تین میل کے فاصلہ پر منیٰ کی طرف جاتے ہوئے بائیں جانب کوہِ حرا میں ایک غار ہے جس کو غارِ حرا کہتے ہیں۔ ان ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام دستور تھا کہ وہاں جاتے اور غور و فکر اور یادِ خدا میں مشغول رہتے۔ عام طور پر کئی کئی دن کا کھانا ساتھ لے جاتے اور شہر میں نہ آتے۔ بعض اوقات حضرت خدیجہؓ بھی ساتھ جاتی تھیں یہی وہ زمانہ ہے جسے قرآن شریف میں تلاشِ حق کا زمانہ کہا گیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛

وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۔ [1]

"یعنی اللہ نے تجھے اپنی تلاش میں سرگرداں و حیران پایا۔ پس اُس نے تجھ کو اپنی طرف آنے کا راستہ بتا دیا۔"

اِسی زمانہ میں رؤیا رصالحہ کا آغاز ہوا جس کا عرصہ چھ ماہ کا بیان ہوا ہے [2] گویا نبوت کی ابتدائی سیڑھی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ؛

اَوَّلَ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ۔ وَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ وَحُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ اَنْ يَنْزِعَ اِلٰى اَهْلِهٖ وَيَتَزَوَّدُ لِذَالِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى خَدِيْجَةَ۔ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتّٰى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِيْ غَارِ حِرَاءٍ [3]

یعنی شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جس رنگ میں وحی کی ابتداء ہوئی وہ رؤیا صالحہ کی صورت میں تھی جو آپؐ نیند کی حالت میں دیکھتے تھے۔ ہر ایک رؤیا جو آپؐ دیکھتے تھے وہ صُبح کی سفیدی کی طرح پوری ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں آپؐ کو خلوت و تنہائی میں رہنا بہت محبوب تھا۔ آپؐ غارِ حرا میں جاتے اور وہاں کئی کئی رات عبادت کرتے رہتے پھر گھر آتے اور اپنے ساتھ کچھ اور زاد لے جاتے۔ جب وُہ ختم ہو جاتا تو پھر خدیجہؓ سے آکر لے جاتے۔ آپؐ اسی حالت میں تھے کہ آپؐ کے پاس خُدا کی طرف سے حق آگیا۔ اس وقت آپؐ غارِ حرا میں تھے۔

---

[1] سورۃ ضحیٰ: ۸ [2] بیہقی بحوالہ زرقانی باب مبعث النبی صلعم [3] بخاری باب بدء الوحی

ابتدائی زندگی پر ایک سرسری نظر

واقعات کی قلت

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا پہلا دور ختم ہوا لیکن طبیعت سیر نہیں اور ہاتھ سے قلم رکھنے کو جی نہیں چاہتا اور دل یہ محسوس کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی چالیس سالہ زندگی کے واقعات اس تفصیل کے ساتھ محفوظ نہیں ہیں جیسا کہ بعد کے زمانہ کے محفوظ ہیں۔ ایک حد تک یہ ایک طبعی امر ہے کیونکہ جس نظر سے آپ کو نبوت کے زمانہ میں دیکھا جاتا تھا، وُہ پہلے زمانہ میں موجود نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اگر ابتدائی مؤرخین کی طرف سے آپ کی قبل از بعثت زندگی کے حالات پر زیادہ توجہ کے ساتھ نظر ڈالی جاتی اور زیادہ محنت اور زیادہ کوشش کے ساتھ واقعات کی تلاش کی جاتی تو بعض مزید حالات دریافت ہو سکتے تھے۔ تاہم جو کچھ بھی موجود ہے وُہ دوسرے سابقہ نبیوں کی نسبت بہت زیادہ ہے اور وُہ اس عظیم الشان پاک و بے لوث زندگی کا کافی و شافی ثبوت ہے جو آپ نے بعثت سے پہلے گذاری۔

آپ کی اُمیّت

ناظرین نے یہ بات نوٹ کی ہوگی کہ اس چالیس سالہ زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ دراصل عرب میں تعلیم بہت ہی کم تھی اور اس لحاظ سے شرفاء اور عوام میں بہت کم امتیاز تھا بلکہ بڑے بڑے سردار بھی عموماً اسی طرح اَن پڑھ اور ناخواندہ ہوتے تھے جس طرح عوام تھے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ملک میں پڑھے لکھے لوگ بھی کہیں کہیں پائے جاتے تھے اور ایسے لوگ مکہ میں دوسرے مقامات کی نسبت قدرے زیادہ تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ثابت ہے کہ آپ بالکل ناخواندہ اور اُمّی تھے[1]۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کی اُمیّت میں خدائی تصرّف کا بھی ہاتھ تھا۔ تاکہ دُنیا میں آپ کے علمی معجزہ کی شان دوبالا ہو کر چمکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ نبوت میں چونکہ اکثر مراسلات اور معاہدات وغیرہ آپ کے سامنے تیار ہوتے اور آپ کی نظر سے گذرتے رہتے تھے۔ اس لیے آپ کو اپنی عمر کے آخری حصّہ میں کچھ حروف شناسی ہو گئی تھی، چنانچہ ایک حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ صُلح حدیبیہ کے موقعہ پر معاہدہ لکھے جانے کے وقت آپ نے کفّار کی طرف سے اعتراض ہونے پر اپنے نام کے ساتھ سے "رسُول اللہ" کے الفاظ خود اپنے ہاتھ سے کاٹ کر ان کی جگہ "ابن عبداللہ" کے الفاظ لکھ دیئے[2]۔

---

[1] قرآن شریف سورۃ اعراف: ۱۵۹ وسورۃ عنکبوت: ۴۹۔ [2] بخاری کتاب الصلح۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ اس موقعہ پر جو مجرد کتب کا لفظ حدیث میں لکھ دینے کے لیے استعمال ہوا ہے اُس سے مراد لکھا دینے کے ہوں۔ کیونکہ بعض اوقات عام محاورہ میں لکھنے اور لکھوانے ہر دو کے لیے ایک ہی لفظ بول دیتے ہیں۔ اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کا جو حصّہ کاٹا وہ خود اپنے ہاتھ سے کاٹا مگر کاٹنے کے بعد جو کچھ لکھا گیا وہ آپؐ نے اپنے کاتب سے لکھوایا۔ لیکن بہر حال جو بھی مُراد لی جاوے اس سے یقیناً آپؐ کی اُمیّت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حلقہ احباب

بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستانہ تعلقات کا دائرہ بہت ہی محدود نظر آتا ہے۔ دراصل شروع سے ہی آپؐ کی طبیعت علیحدگی پسند تھی اور آپؐ نے اپنی عمر کے کسی حصّہ میں بھی مکّہ کی عام سوسائٹی میں زیادہ خلا ملا نہیں کیا۔ تاہم بعض ایسے لوگ بھی تھے جن کے ساتھ آپؐ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان سب میں ممتاز حضرت ابوبکرؓ یعنی عبداللہ بن ابی قحافہ تھے۔ جو قریش کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی شرافت اور قابلیت کی وجہ سے قوم میں بڑی عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ دُوسرے درجہ پر حکیم بن حزام تھے جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ یہ نہایت شریف الطبع آدمی تھے۔ شروع شروع میں یہ اسلام نہیں لائے۔ لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبّت اور اخلاص رکھتے تھے۔ آخر سعادتِ طبعی اسلام کی طرف کھینچ لائی۔ پھر زید بن عمرو سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات تھے۔ یہ صاحب حضرت عمرؓ کے قریبی رشتہ دار تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے زمانۂ جاہلیت میں ہی شرک تُرک کر رکھا تھا۔ اور اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی کی طرف منسوب کرتے تھے مگر یہ اسلام کے زمانہ سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔

بعثت سے پہلے آپؐ کا مذہب

اسلام اپنے تفصیلی مسائل کے ساتھ تو بہر حال بعد میں ہی اُترا ہے اس لیے بعثت سے پہلے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاربند ہونے کا تو کوئی شخص مدعی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کوئی ہوا ہے۔ لیکن یہ بات تاریخ سے پایۂ ثبوت تک پہنچی ہوئی ہے کہ بمقتضائے فطرتِ صحیحہ آپؐ ہمیشہ عرب سوسائٹی کی گندی رسوم سے مجتنب رہے اور شرک بھی آپؐ نے کبھی نہیں کیا؛ چنانچہ زمانۂ نبوت میں آپؐ حضرت عائشہؓ سے فرماتے تھے کہ میں نے بتوں کے چڑھاوے کا کھانا کبھی نہیں کھایا[1]۔ اور ایک روایت میں حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ یا رسُول اللہ! کیا آپؐ نے کبھی بتوں کو پُوجا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ نہیں۔ پھر لوگوں نے پوچھا کیا آپؐ نے کبھی شراب پی ہے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ پھر فرمایا کہ مَیں ہمیشہ سے ان باتوں کو قابلِ نفرت سمجھتا رہا ہوں، لیکن اسلام سے پہلے مجھے شریعت اور ایمان کا کوئی علم نہیں تھا[2]۔

---

[1] سیرۃ حلبیہ جلد ۱ باب ماحفظہ اللہ ؛ [2] سیرۃ حلبیہ باب ماحفظہ اللہ ؛

آپؐ کے اخلاق و عادات

یہ بتایا جا چکا ہے کہ بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اندر امین کے لقب سے مشہور تھے جو آپؐ کی امانت و دیانت اور اخلاق فاضلہ کا بیّن ثبوت ہے آپؐ کی راست گفتاری کا یہ حال تھا کہ ابوجہل جیسا معاند جو آپؐ کے خون کا پیاسا تھا ایک دفعہ زمانۂ نبوّت میں آپؐ کو مخاطب ہو کر کہنے لگا :

اِنَّا لَا نُكَذِّبُكَ وَلٰكِنْ نُكَذِّبُ بِمَا جِئْتَ بِهٖ[1]

"اے محمدؐ! ہم تجھے جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اس بات کو جھوٹا کہتے ہیں جو تُو لایا ہے"

ابوسفیان ہرقل شہنشاہ روم کے سامنے پیش ہوا۔ تو ہرقل نے اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا :

هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْكَذِبِ قَبْلَ اَنْ يَّقُوْلَ مَا قَالَ ؟

"کیا تم نے اس دعویٰ سے پہلے کبھی اس شخص کا کوئی جھوٹ دیکھا ؟"

ابوسفیان اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برسرِ پیکار تھا۔ لیکن اس سوال کے جواب میں اُسے بھی بجز لا یعنی "نہیں" کے کوئی جواب نہیں بن پڑا[2]۔ امیّہ بن خلف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن تھا۔ لیکن جب حضرت سعد بن معاذ نے اس کو یہ خبر سُنائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیری موت کی پیشگوئی کی ہے تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور اس نے گھر جا کر اپنی بیوی سے یہ ذکر کیا اور کہا :

وَاللّٰهِ مَا يَكْذِبُ مُحَمَّدٌ اِذَا حَدَّثَ[3]

"خدا کی قسم۔ محمدؐ جب کوئی بات کہتا ہے تو جھوٹ نہیں بولتا"

پھر النضر بن الحارث اشد ترین معاندینِ اسلام میں سے تھا۔ لیکن جب اس نے کسی شخص سے یہ کہتے سُنا کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹا ہے تو بے اختیار ہو کر بولا :

قَدْ كَانَ مُحَمَّدٌ فِيْكُمْ غُلَامًا حَدَثًا اَرْضَاكُمْ فِيْكُمْ وَ اَصْدَقُكُمْ حَدِيْثًا وَ اَعْظَمُكُمْ اَمَانَةً حَتّٰى اِذَا رَاَيْتُمْ فِيْ صُدْغَيْهِ الشَّيْبَ وَ جَاءَكُمْ بِمَا جَاءَكُمْ بِهٖ قُلْتُمْ سَاحِرٌ لَا وَاللّٰهِ مَا هُوَ بِسَاحِرٍ[4]

"یعنی محمدؐ تم میں ہی ایک چھوٹا سا بچہ ہوتا تھا اور وہ تم سب میں سے زیادہ پسندیدہ اخلاق والا تھا اور سب سے زیادہ راست گو تھا اور سب سے زیادہ امین تھا اور اس کے متعلق تمہاری یہی رائے رہی حتّٰی کہ جب تم نے اس کی زلفوں میں سفیدی دیکھی اور وہ

---

[1] ترمذی ٭ [2] بخاری باب بدء الوحی ٭ [3] بخاری کتاب المغازی ٭

[4] شفا قاضی عیاض و ابن ہشام ٭

بڑھاپے کو پہنچا اور وہ تمہارے پاس وہ کچھ لایا جو کہ وہ لایا تو تم یہ کہنے لگے کہ وہ ساحر ہے اور جھوٹا ہے۔ خدا کی قسم وُہ جھوٹا اور ساحر تو ہرگز نہیں "

اِس سے النضر بن الحارث کی بھی وہی مراد تھی جو ابوجہل نے کہا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اُس کے لائے ہوئے دین کو جھوٹا کہتے ہیں۔

پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام شروع کی۔ اور ایک پہاڑی پر چڑھ کر قریش کو جمع کیا۔ اور اُن سے کہا کہ "اگر مَیں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کی پچھلی وادی میں ایک بڑا لشکر جمع ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات مان لوگے"؟ تو باوجود اس کے کہ بظاہر یہ بات بالکل بعید از امکان تھی، سب نے کہا:

نَعَمْ مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ إِلَّا صِدْقًا[1]

"ہاں! ہم مانیں گے۔ کیونکہ ہم نے تجھ کو ہمیشہ صادق پایا ہے"

آپؐ نے فرمایا:

"تو پھر مَیں تم کو بتاتا ہوں کہ اللہ کا عذاب تمہارے قریب آ رہا ہے جس سے اپنے بچاؤ کا سامان کرلو"

یہ سب شہادتیں اشد ترین دشمنوں کی ہیں۔ اور مومنوں کی طرف سے تو کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اُن کا ایمان لانا ہی ایک زبردست مجسم شہادت ہے لیکن مَیں اس موقعہ پر آپؐ کی زوجہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شہادت درج کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہلی دفعہ خدائی فرشتہ وحی لے کر آیا اور آپؐ نے سخت گھبرا کر خدیجہؓ سے کہا کہ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ تو خدیجہؓ نے جو محرمِ حال تھی بے ساختہ طور پر یہ الفاظ کہے کہ:

كَلَّا وَاللهِ مَا يُخْزِيْكَ اللهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ[2]

"ہرگز نہیں ہرگز نہیں! خدا کی قسم! اللہ آپؐ کو کبھی رسوا نہیں کریگا۔ آپؐ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ اور صادق القول ہیں۔ اور لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں۔ اور آپؐ نے گمشدہ اخلاق کو اپنے اندر جمع کیا ہے۔ اور آپؐ مہمان نواز ہیں۔ اور حق کی راہ میں لوگوں کے مددگار ہوتے ہیں"

یہ اس معزز خاتون کی شہادت ہے جو دن رات اُٹھتے بیٹھتے۔ کھاتے پیتے۔ سوتے جاگتے آپؐ کو دیکھتی تھی۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

---

[1] بخاری و مسلم ۔ [2] بخاری باب بدء الوحی ۔

آغازِ رسالت

طلوعِ آفتاب صبح کی سفیدی اُفقِ مشرق میں نمودار ہو رہی تھی۔ اور آفتاب عالمتاب طلوع کرنے کو تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسب معمول غارِ حرا میں تشریف لیجاتے اور اپنے رنگ میں عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ رؤیا صالحہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ ماہ گذارے[1]

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عُمر چالیس[2] سال کی تھی اور طبیعت نبوّت و رسالت کی پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ رمضان کا مبارک مہینہ تھا اور اس کے آخری عشرہ کے ایّام تھے اور پیر کا دن تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسب معمول غارِ حرا میں عبادتِ الٰہی میں مصروف تھے کہ یکلخت آپؐ کے سامنے ایک غیر مانوس ہستی نمودار ہوئی۔ اُس ربانی رسُول نے جو خدائی فرشتہ جبرائیل تھا آپؐ سے مخاطب ہو کر کہا۔ اِقْرَأْ "پڑھ" یعنی مُنہ سے بول یا لوگوں تک پہنچا[3]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔ "میں تو نہیں پڑھ سکتا" یعنی میں تو یہ کام نہیں کر سکتا[4]

فرشتہ نے یہ جواب سُنا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑا اور اپنے سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر چھوڑ کر کہا اِقْرَأْ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پھر وہی جواب تھا۔ فرشتہ نے پھر پکڑا اور زور سے بھینچا اور پھر چھوڑ کر کہا اِقْرَأْ۔ مگر اِدھر سے پھر وہی تامّل تھا۔ اس پر اُس ربانی رسُول نے آپؐ کو تیسری دفعہ پکڑا اور نہایت زور سے بھینچا گویا اپنی انتہائی کوشش سے اس معانقہ کے ساتھ آپؐ کے قلب پر اثر ڈالتا تھا۔ اور پھر اس تسلّی کے بعد کہ اب آپؐ کی طبیعت اس پیغام کے لینے کے لیے آمادہ ہو چکی ہے اس نے آپؐ کو چھوڑ کر کہا :

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝[5]

"پڑھ یعنی مُنہ سے بول یا لوگوں تک پہنچا اپنے ربّ کا نام[6]۔ جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا اس

---

[1] بیہقی بحوالہ زرقانی باب مبعث النبی صلعم ۔ [2] قرءٌ کے معنے پیغام پہنچانے کے بھی ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں اِقْرَأْ مِنِّي السَّلَامَ یعنی میرا سلام اسے پہنچا دو۔ دیکھو اقرب الموارد ۔ [3] یہ ایسا ہی جواب تھا جیسا کہ حضرت موسیٰؑ نے دیا تھا کہ میں نبوّت کا اہل نہیں ہوں یہ کام کسی اور کے سپرد فرمایا جاوے۔ مگر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اس بات کو کون جانتا ہے کہ رسالت کا اہل کون ہے۔

[4] بخاری کتاب بدء الوحی ۔ [5] اس جگہ نحوی ترکیب میں لفظ اسم اقرأ کا مفعول ہے۔ عربی قواعد نحو کی رُو سے اقرأ کے مفعول پر بعض اوقات ب زائد آجایا کرتی ہے۔ دیکھو اقرب الموارد ۔

نے انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے۔ ہاں پڑھ۔ تیرا رب بہت عزت و شان والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ سکھایا اس نے انسان کو وہ کچھ جو وُہ جانتا نہ تھا۔"[1]

یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہوگیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سخت گھبراہٹ اور اضطراب کی تھی اور دل دھڑک رہا تھا کہ خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ اسی حالت میں آپ جلدی جلدی غارِ حرا سے نکل کر گھر کی طرف لوٹے اور خدیجہؓ سے فرمایا" زَمِّلُوْنِیْ۔ زَمِّلُوْنِیْ" مجھ پر کوئی کپڑا اڑا دو۔ مجھ پر کوئی کپڑا اڑا دو۔ حضرت خدیجہؓ اپنے محبوب خاوند کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں اور جلدی سے آپ کو کپڑا اوڑھا دیا۔ جب ذرا اطمینان ہوا۔ اور گھبراہٹ کچھ کم ہوئی تو آپ نے سارا ماجرا حضرت خدیجہؓ کو سُنایا اور آخر میں فرمایا۔ لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ" مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہوگیا ہے" مگر خدیجہؓ جو آپ کی حالت سے خوب واقف تھیں بولیں:

كَلَّا اَبْشِرْ فَوَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ۔

"نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آپ خوش ہوں۔ خُدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رُسوا نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں اور صادق القول ہیں اور لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں اور معدُوم اخلاق کو آپ نے اپنے اندر جمع کیا ہے اور آپ مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی باتوں میں لوگوں کے مددگار بنتے ہیں۔"

اِس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو شرک کا تارک ہو کر عیسائی مذہب کا پیرو ہو چکا تھا۔ اور گذشتہ صحفِ انبیاء سے کسی قدر واقف تھا اور اب بوڑھا تھا حتّٰی کہ اس کی آنکھوں کی بینائی تک بھی جا چکی تھی۔ اس کے پاس آپ کو لے جا کر حضرت خدیجہؓ نے کہا" بھائی ذرا اپنے اس بھتیجے کی بات تو سُن لو" اُس نے کہا" ہاں کیا معاملہ ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب ماجرا سُنا دیا۔ جب وَرقہ ساری کیفیت سُن چکا تو بولا" یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسٰیؑ پر وحی لاتا تھا۔ اے کاش! مجھ میں طاقت ہوتی۔ اے کاش! مَیں اس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھے وطن سے نکال دے گی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حیران ہو کر پُوچھا۔ اَوَمُخْرِجِيَّ هُمْ "کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟" وَرقہ نے کہا" ہاں کوئی رسُول نہیں آیا کہ اس کے ساتھ اُس کی قوم نے عداوت نہ کی ہو۔ اور اگر مَیں اس وقت تک زندہ رہا تو مَیں اپنی پوری طاقت کے ساتھ تیری مدد کروں گا" مگر وَرقہ کو یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوئے کیونکہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔[2]

---

[1] یعنی اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ انسان کو قلم کے ذریعہ سے نئے نئے علوم سکھائے جائیں۔

[2] بخاری باب بدءالوحی۔

فترۃِ وحی

اس کے بعد وحی کا سلسلہ رُک گیا[1]۔ اور ایک عرصہ تک جس کا اندازہ ابن عباسؓ کی ایک روایت کے مطابق چالیس[2] یوم بیان ہوا ہے۔ یہ سلسلہ رُکا رہا۔ اس زمانہ کو فترۃ کا زمانہ کہتے ہیں۔ گویا آفتاب رسالت کی روشنی ایک دفعہ نظر آئی اور پھر غائب ہو گئی۔ آپؐ کے پیاسے تشنہ پر بارش کا ایک چھینٹا پڑا اور پھر بادل پھٹ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایام سخت گھبراہٹ اور بے چینی کی حالت میں گذارے۔ دن رات اُٹھتے بیٹھتے یہی خیال تھا کہ خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے اور کیا ہونے والا ہے اور اس غیر مانوس غیبی رسُول کا آنا کیا معنے رکھتا ہے اور کیا یہ پیام وسلام خُدا کی طرف سے ہے یا میرے اپنے نفس کا ہی کوئی مخفی پرتَو ہے؟ ان سوالات نے آپؐ کو سخت بے چین کر رکھا تھا حتیٰ کہ حدیث میں آتا ہے کہ ان ایام میں آپؐ کو اتنی گھبراہٹ تھی کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ آپؐ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اور ارادہ کیا کہ وہاں سے اپنے آپ کو گرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیں مگر ہر ایسے موقعہ پر الٰہی فرشتہ آواز دیتا: "دیکھو محمدؐ ایسا نہ کرو تم واقعی اللہ کے رسُول ہو"۔ یہ آواز سُن کر آپؐ رُک جاتے مگر پھر بے چینی اور اضطراب کی حالت پیدا ہوتی تو بے اختیار ہو کر پھر اپنے آپ کو ہلاک کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے[3]۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ میں ظاہری معنے مُراد نہ ہوں اور اپنے آپ کو بلندی سے گرا کر زندگی کا خاتمہ کر دینے کا یہ مطلب ہو کہ چونکہ آپؐ کو یہ ڈر تھا کہ کہیں اس غیبی فرشتہ کا نظر آنا نفس ہی کا پرتو نہ ہو۔ یا یہ سب نظارہ خدا کی طرف سے بطور امتحان کے ہو، اس لیے آپؐ نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے نفس کو مزید گرا کر اور پست ومغلوب کر کے گویا خدا کی راہ میں اسے بالکل ہی ماردیں۔ اس صورت میں پہاڑ پر سے اپنے آپ کو گرا دینے کے الفاظ گویا بطور استعارہ کے سمجھے جائیں گے۔ بہرحال خواہ کوئی بھی معنے ہوں آپؐ کے لیے یہ دن بڑی کش مکش کے دن تھے اور اسی کش مکش کی حالت میں آپؐ ایک دن غارِ حرا سے گھر کی طرف واپس آ رہے تھے کہ اچانک ایک آواز آئی۔ گویا کوئی شخص آپؐ کو مخاطب کر رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے پیچھے، دائیں بائیں سب طرف دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ آخر آپؐ نے اُوپر نظر اُٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک عظیم الشان کُرسی پر وہی فرشتہ بیٹھا ہے جو غارِ حرا میں آپؐ کو نظر آیا تھا۔ آپؐ نے یہ نظارہ دیکھا تو سہم گئے اور گھبراتے ہوتے جلدی جلدی گھر آئے۔ اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: دَثِّرُوْنِیْ ! دَثِّرُوْنِیْ ! "مجھ پر کوئی کپڑا ڈھانک دو"۔ خدیجہؓ نے جلدی سے کپڑا اوڑھا دیا۔ اور آپؐ لیٹ گئے۔ آپؐ کا لیٹنا تھا کہ ایک پُرجلال آواز آپؐ کے کانوں میں آئی :

---

[1] بخاری باب مذکور

[2] زرقانی جلد ۱ باب مراتب الوحی

[3] بخاری باب بدء الوحی

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝

"یعنی اے چادر میں پلٹے ہوئے شخص! اُٹھ کھڑا ہو۔ اور لوگوں کو خدا کے نام پر بیدار کر۔ اُٹھ اور اپنے رب کی بڑائی کے گیت گا اور اپنے نفس کو پاک و صاف کر اور ہر قسم کے شرک سے پرہیز کر"

اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری ہو گیا۔[1]

آغازِ تبلیغ اب آپؐ کی طبیعت میں یکسوئی اور اطمینان تھا؛ چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو توحید باری تعالےٰ کی طرف بلانا شروع کیا اور شرک کے خلاف تعلیم دینے لگے مگر شروع شروع میں آپؐ نے اپنے مشن کا کھُلم کھُلا اظہار نہیں فرمایا۔ بلکہ نہایت خاموشی کے ساتھ کارروائی شروع کی اور صرف اپنے ملنے والوں کے حلقہ تک اپنی تعلیم کو محدود رکھا۔[2]

اسلام کا پیغام گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم کا ڈھانچہ بیان کرنے کے لیے اصل موقعہ آگے آئے گا لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ بھی ایک مختصر سا خاکہ اسلام کا درج کر دیا جائے تاکہ ہمارے ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن کیا تھا اور اس کے اصول کیا تھے۔ سو جاننا چاہیئے کہ جو مذہب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کے سامنے پیش کیا اس کا نام اِسلام ہے جس کے معنے اپنے آپ کو خُدا کے سپرد کر دینے کے ہیں اور یہی آپؐ کی لائی ہوئی تعلیم کا حقیقی خلاصہ ہے۔ آپؐ کے مذہب کا پہلا اور سب سے بڑا اصول توحید باری تعالیٰ ہے۔ یعنی یہ کہ اس دُنیا کا خالق و مالک ایک خُدا ہے جو اپنی ذات و صفات میں واحد لاشریک ہے اور وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور زمین و آسمان کی ہر چیز اسی کی پیدا کردہ اور اسی کے سہارے سے قائم ہے، اس لیے اسکے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں اور وہ تمام معبود جو خُدا کے سوا لوگوں نے بنا رکھے ہیں وُہ سب فرضی اور باطل ہیں۔ یہ وہ سب سے پہلا اور سب سے بڑا اصول ہے جو آپؐ نے اہلِ مکہ کے سامنے پیش کیا۔ دُوسرا اصول آپؐ نے یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت پیدا کیا ہے اور وُہ یہ کہ لوگ اُسے پہچان کر اُس کے رنگ میں رنگین ہوں اور اپنے لیے اَبدی ترقی کا سامان پیدا کریں۔ اور اس غرض کے لیے اُس نے انسانی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک دُنیا کی زندگی جو کہ دارالعمل ہے اور ایک آخرت کی زندگی جو کہ دارالجزاء ہے اور ان ہر دو زندگیوں کے درمیان موت کو حدِ فاصل مقرر کیا گیا ہے۔ تیسرا اصول آپؐ نے یہ پیش کیا کہ اللہ تعالےٰ دُنیا کی ہدایت کے لیے اپنی طرف سے رسُول اور نبی مبعوث کرتا

---

[1] سورۃ مدثر: ۲ تا ۵ و بخاری ابواب التفسیر و باب بدء الوحی۔ [2] زرقانی و طبری۔

رہتا ہے جو خُدا سے علم پا کر دُنیا کی ہدایت کا انتظام کرتے ہیں۔ ایسے رسُول اور نبی ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانہ میں گذرے ہیں اور انہیں میں سے آپ بھی خُدا کے ایک رسُول ہیں۔ یہ وُہ تین اصل الاصول ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مشن کی بنیاد تھے۔ مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا بعض مزید اصول اور ان اصول کی مزید فروع اور مزید تفصیلات نازل ہوتی گئیں حتیٰ کہ آپ کی لائی ہوئی تعلیم موجودہ قرآن کریم کی صورت میں اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور آپ سب اوّلین و آخرین کے سردار اور خاتم النبیین اور آخری اور کامل شریعت لانے والے قرار دیئے گئے۔

سب سے پہلا مُسلمان

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے مشن کی تبلیغ شروع کی تو سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہؓ تھیں جنھوں نے ایک لحظہ کے لیے بھی تردد نہیں کیا۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد مَردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ بعض حضرت ابوبکرؓ عبداللہ بن ابی قحافہ کا نام لیتے ہیں۔ بعض حضرت علیؓ کا جن کی عمر اس وقت صرف دس سال کی تھی۔ اور بعض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ کا۔ مگر ہمارے نزدیک یہ جھگڑا فضول ہے۔ حضرت علیؓ اور زیدؓ بن حارثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے آدمی تھے اور آپ کے بچوں کی طرح آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا تھا اور ان کا ایمان لانا۔ بلکہ ان کی طرف سے تو شاید کسی قولی اقرار کی بھی ضرورت نہ تھی۔ پس ان کا نام بیچ میں لانے کی ضرورت نہیں اور جو باقی رہے ان سب میں سے حضرت ابوبکرؓ مسلّمہ طور پر مقدّم اور سابق بالایمان تھے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درباری شاعر حسانؓ بن ثابت انصاری حضرت ابوبکرؓ کے متعلق کہتے ہیں ؎

إِذَا تَذَكَّرْتَ شَجْوًا مِنْ أَخِيْ ثِقَةٍ ٭ فَاذْكُرْ أَخَاكَ أَبَا بَكْرٍ بِمَا فَعَلَا
خَيْرَ الْبَرِيَّةِ أَتْقَاهَا وَأَعْدَلَهَا ٭ بَعْدَ النَّبِيِّ وَأَوْفَاهَا بِمَا حَمَلَا
اَلثَّانِيَ التَّالِيَ الْمَحْمُوْدَ مَشْهَدُهُ ٭ وَأَوَّلَ النَّاسِ مِنْهُمْ صَدَّقَ الرُّسُلَا

یعنی "جب تمہارے دل میں کبھی کوئی درد آمیز یاد تمہارے کسی اچھے بھائی کے متعلق پیدا ہو تو اس وقت اپنے بھائی ابوبکرؓ کو بھی یاد کر لیا کرو۔ اس کی ان خوبیوں کی وجہ سے جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب لوگوں میں سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ منصف مزاج تھا اور وہ سب سے زیادہ پُورا کرنیوالا تھا اپنی اُن ذمہ داریوں کو جو اُس نے اُٹھائیں۔ ہاں ابوبکرؓ وہی تو ہے جو غارِ ثور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دُوسرا شخص تھا جس نے اپنے آپ کو آپ کی اتباع میں بالکل محو کر رکھا تھا اور وُہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا اُسے خوبصورت بنا دیتا تھا اور وُہ ان سب لوگوں میں سے پہلا تھا جو رسُول پر ایمان لائے۔"[1]

---

[1] : طبری

حضرت ابوبکرؓ اپنی شرافت اور قابلیت کی وجہ سے قریش میں بہت مکرم و معزز تھے۔ اور اسلام میں تو ان کو وُہ رتبہ حاصل ہُوا جو کسی اور صحابی کو حاصل نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک لمحہ کے لیے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ میں شک نہیں کیا بلکہ سُنتے ہی قبول کیا۔ اور پھر اُنھوں نے اپنی ساری توجہ اور اپنی جان اور مال کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی خدمت میں وقف کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں ابوبکرؓ کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور آپؐ کی وفات کے بعد وُہ آپؐ کے پہلے خلیفہ ہوئے۔ اپنی خلافت کے زمانہ میں بھی اُنہوں نے بے نظیر قابلیت کا ثبوت دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق یورپ کا مشہور مستشرق سپرنگر لکھتا ہے کہ:

"ابوبکرؓ کا آغازِ اسلام میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانا اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خواہ دھوکا کھانے والے ہوں مگر دھوکا دینے والے ہرگز نہیں تھے۔ بلکہ صدقِ دل سے اپنے آپ کو خدا کا رسُول یقین کرتے تھے"

اور سر ولیم میور کو بھی سپرنگر کی اس رائے سے کلی اتفاق ہے[1]۔

سابقین

حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، اور زیدؓ بن حارثہ کے بعد اسلام لانے والوں میں پانچ اشخاص تھے جو حضرت ابوبکرؓ کی تبلیغ سے ایمان لائے۔ اور یہ سب کے سب اسلام میں ایسے جلیل القدر اور عالی مرتبہ اصحاب نکلے کہ چوٹی کے صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

اوّل حضرت عثمانؓ بن عفان جو خاندان بنو امیہ میں سے تھے۔ اسلام لانے کے وقت اُن کی عمر قریباً تیس سال کی تھی۔ حضرت عمرؓ کے بعد وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیسرے خلیفہ ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نہایت باحیا۔ باوفا۔ نرم دل۔ فیاض اور دولتمند آدمی تھے۔ چنانچہ کئی موقعوں پر انہوں نے اسلام کی بہت بہت مالی خدمات کیں۔ حضرت عثمانؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے انہیں پے در پے اپنی دو لڑکیاں شادی میں دیں جس کی وجہ سے انہیں ذوالنورین کہتے ہیں۔

دوسرے عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے جو خاندان بنو زہرہ سے تھے جس خاندان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ تھیں۔ نہایت سمجھدار اور بہت سُلجھی ہوئی طبیعت کے آدمی تھے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا سوال انہی کے ہاتھ سے طے ہوا تھا۔ اسلام لانے کے وقت اِن کی عمر قریباً تیس سال کی تھی۔ عہدِ عثمانی میں فوت ہوئے۔

---

[1] لائف آف محمد مصنفہ میور صفحہ ۵۶۔

تیسرے سعد بن ابی وقاصؓ تھے جو اس وقت بالکل نوجوان تھے یعنی اس وقت اُن کی عمر انیس سال کی تھی۔ یہ بھی بنو زہرہ میں سے تھے اور نہایت دلیر اور بہادر تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عراق انہی کے ہاتھ پر فتح ہوا۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں فوت ہوئے۔

چوتھے زبیر بن العوامؓ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ یعنی صفیہ بنت عبد المطلب کے صاحبزادے تھے اور بعد میں حضرت ابوبکرؓ کے داماد ہوئے۔ یہ بنو اسد میں سے تھے اور اسلام لانے کے وقت ان کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیرؓ کو غزوۂ خندق کے موقعہ پر ایک خاص خدمت سرانجام دینے کی وجہ سے حواری کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ زبیرؓ حضرت علیؓ کے عہدِ حکومت میں جنگِ جمل کے بعد شہید ہوئے۔

پانچویں طلحہ بن عبید اللہ تھے جو حضرت ابوبکرؓ کے خاندان یعنی قبیلہ بنو تیم میں سے تھے اور اس وقت بالکل نوجوان تھے۔ طلحہ بھی اسلام کے خاص فدایان میں سے تھے۔ حضرت علیؓ کے عہد میں جنگِ جمل میں شہید ہوئے۔

یہ پانچوں اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے ہیں یعنی اُن دس اصحاب میں داخل ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے خاص طور پر جنت کی بشارت دی تھی اور جو آپ کے نہایت مقرب صحابی اور مشیر شمار ہوتے تھے[1]

اِن لوگوں کے بعد اور لوگ جو شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، وُہ بعض تو قریش میں سے تھے اور بعض دُوسرے قبائل میں سے تھے۔ اِن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابو عبیدہ بن عبداللہ بن الجراحؓ جن کے ہاتھ پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شام فتح ہوا۔ یہ نہایت نیک اور صوفی مزاج آدمی تھے جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امین الملّۃ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ابو عبیدہ قریش کے قبیلہ بنو فہر میں سے تھے جنھیں بعض اوقات فہر بن مالک کی طرف منسوب کر کے فہری بھی کہہ لیتے تھے۔ حضرت عائشہ کی نظر میں ابو عبیدہ کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ وہ کہا کرتی تھیں کہ اگر حضرت عمرؓ کی وفات پر ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو وہی خلیفہ ہوتے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی ابو عبیدہؓ کی بہت قدر کرتے تھے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جن لوگوں کو حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کا اہل قرار دیا تھا، اُن میں سے ابو عبیدہؓ بھی تھے۔ ابو عبیدہؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وبائے طاعون سے شہید ہوئے۔

پھر عبیدہؓ بن الحارث تھے جو بنو مطلب میں سے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی

---

[1] اصابہ و اسد الغابہ و ابن ہشام و طبری و زرقانی

رشتہ دار تھے۔ پھر ابو سلمہؓ بن عبدالاسد تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے اور بنو مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی وفات پر اُن کی بیوہ امّ سلمہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوئی۔ ابو حذیفہؓ بن عتبہ تھے جو بنو امیہ میں سے تھے۔ ان کا باپ عتبہ بن ربیعہ سرداران قریش میں سے تھا۔ ابو حذیفہؓ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے جو حضرت ابو بکرؓ کے زمانۂ خلافت میں مسیلمہ کذّاب کے ساتھ ہوئی تھی۔ سعیدؓ بن زیدؓ تھے جو بنو عدی میں سے تھے اور حضرت عمرؓ کے بہنوئی تھے۔ یہ زید بن عمرو بن نفیل کے صاحبزادے تھے جنھوں نے زمانۂ جاہلیت میں ہی شرک ترک کر رکھا تھا۔ سعیدؓ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں فوت ہوئے۔ عثمان بن مظعونؓ تھے جو بنو جمح میں سے تھے۔ نہایت صوفی مزاج آدمی تھے۔ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں ہی شراب ترک کر رکھی تھی اور اسلام میں بھی تارکِ دنیا ہونا چاہتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے کہ اسلام میں رہبانیت جائز نہیں ہے۔ اس کی اجازت نہیں دی۔ ارقمؓ بن ابی ارقمؓ جن کے مکان کو جو کوہِ صفا کے دامن میں تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اپنا تبلیغی مرکز بنایا۔ ارقمؓ بنو مخزوم میں سے تھے۔ پھر عبداللہؓ بن جحش اور عبیداللہؓ بن جحش تھے۔ یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ مگر قبیلہ قریش سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ زینبؓ بنت جحش جو بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں انہی کی بہن تھیں۔ عبیداللہ بن جحش ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے زمانہ جاہلیت میں ہی بُت پرستی ترک کر رکھی تھی۔ اسلام آیا تو وہ مسلمان ہو گیا لیکن جب وہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گیا تو کسی وجہ سے وہاں اسلام سے منحرف ہو کر عیسائی ہو گیا۔ اس کی بیوہ اُمّ حبیبہؓ جو قریش کے مشہور رئیس ابو سفیان کی لڑکی تھی بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئی[1]

اِن لوگوں کے علاوہ عبداللہ بن مسعودؓ تھے جو غیر قریشی تھے اور قبیلہ ھذیل سے تعلق رکھتے تھے۔ عبداللہ ایک بہت غریب آدمی تھے اور عقبہ بن ابی معیط رئیس قریش کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آگئے اور آپ کی صحبت سے بالآخر نہایت عالم و فاضل بن گئے۔ فقہ حنفی کی بنیاد زیادہ تر انہی کے اقوال و اجتہادات پر مبنی ہے۔ پھر بلالؓ بن رباح تھے جو امیہ بن خلف کے حبشی غلام تھے ہجرت کے بعد مدینہ میں اذان دینے کا کام انہی کے سپرد تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے اذان کہنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں شام فتح ہوا تو ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے اصرار پر انہوں نے پھر اذان کہی جس پر سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آگیا؛ چنانچہ وہ خود اور حضرت عمرؓ اور دُوسرے

---

[1] اسد الغابہ ؛

اصحاب جو اس وقت موجود تھے اتنے روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ حضرت عمرؓ کو بلالؓ سے اتنی محبت تھی کہ جب وُہ فوت ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "آج مسلمانوں کا سردار گذر گیا" یہ ایک غریب حبشی غلام کے متعلق بادشاہِ وقت کا قول تھا۔ پھر عامر بن فہیرہ تھے جن کو حضرت ابوبکرؓ نے غلامی سے آزاد کر کے خود اپنے پاس نوکر رکھ لیا تھا۔ پھر خبابؓ بن الارت تھے جو ایک آزاد شدہ غلام تھے اور اُن دنوں مکّہ میں لوہار کا کام کیا کرتے تھے۔ پھر ابوذرؓ تھے جو قبیلہ غفار سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ سُنا تو تحقیقات کے لیے اپنے بھائی کو مکّہ بھیجا۔ چنانچہ وہ مکّہ آیا اور واپس جا کر ابوذرؓ کو حالات سے اطلاع دی، مگر اس سے ابوذرؓ کی تسلی نہیں ہوئی اس لیے اس کے بعد وہ خود مکّہ میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے کا قصہ بخاری میں مفصل درج ہے اور بہت دلچسپ ہے[1]۔ ابوذرؓ نہایت زاہد اور صوفی مزاج آدمی تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ کسی صورت میں بھی مال جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ اِس بنا پر بعض اوقات بعض دُوسرے صحابہ سے ان کا جھگڑا ہو جاتا تھا[2]۔

یہ وُہ چند لوگ ہیں جو ابتدائی تین چار سال میں اسلام لائے۔ ان میں سے شادی شدہ لوگوں کے بیوی بچّے بھی عموماً ان کے ساتھ تھے؛ چنانچہ اس زمانہ میں مسلمان ہونے والی عورتوں میں مؤرخین نے حضرت خدیجہؓ کے بعد اسماء بنت ابی بکرؓ اور فاطمہؓ بنت خطاب زوجہ سعید بن زید کا نام خاص طور پر لیا ہے۔ ان کے علاوہ عورتوں میں عباسؓ بن عبدالمطلب کی بیوی اُمّ فضل بھی ابتدائی مسلمانوں میں تھیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت تک عباسؓ خود اسلام نہیں لائے تھے۔ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تین چار سالہ تبلیغی جدوجہد کا نتیجہ بھی چند گنتی کی جانیں تھیں۔ مگر ان سابقین الاوّلین میں سے سوائے حضرت ابوبکرؓ کے ایک بھی ایسا نہ تھا جو قریش میں کوئی خاص اثر یا وجاہت رکھتا ہو۔ بعض غلام تھے اور اکثر لوگ غریب اور کمزور تھے۔ بعض البتہ قریش کے اعلیٰ گھرانوں سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان میں سے بھی زیادہ تر نوجوان تھے۔ بلکہ بعض کو تو گویا بچّے ہی کہنا چاہیئے اس لیے وہ ابھی اس حالت کو نہ پہنچے تھے کہ اپنے قبیلے میں کوئی اثر پیدا کر سکیں اور جو معمّر تھے وہ غربت یا کسی اور وجہ سے کوئی اثر نہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے قریش میں یہ عام خیال تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو صرف چھوٹے اور کمزور لوگوں نے مانا ہے؛ چنانچہ جب کئی سال بعد ہرقل شہنشاہ روم نے رئیس مکّہ ابوسفیان سے دریافت کیا کہ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بڑے لوگ مانتے ہیں یا کہ کمزور اور چھوٹے لوگ؟ تو ابوسفیان نے یہی جواب دیا کہ "کمزور اور چھوٹے لوگ مانتے ہیں۔" جس پر ہرقل نے کہا اور خوب کہا کہ "اللہ کے رسول کو شروع شروع میں چھوٹے لوگ ہی مانا کرتے ہیں[3]"

---

[1] بخاری کتاب بدء الخلق باب اسلام ابی ذر ؛ [2] اصابہ اسد الغابہ ؛ [3] بخاری باب بدء الوحی ؛

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیعت لینے کا طریق

اس موقعہ پر یہ ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ جب کوئی شخص مسلمان ہونے کے لئے آتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ آپؐ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مقررہ الفاظ میں اسلام کا اقرار کرواتے تھے اور یہ عہد لیتے تھے کہ آئندہ وہ ہر معروف امر میں آپؐ کی فرمانبرداری کرے گا۔ اسلام کے اقرار میں اصولی باتوں کا صراحت کے ساتھ ذکر کروا کے اقرار لیا جاتا تھا۔ مثلاً یہ کہ خدا کو ایک واحد لاشریک یقین کروں گا اور کسی قسم کا شرک نہیں کروں گا اور ہر قسم کے اعمالِ شنیعہ مثلاً چوری، زنا، قتل، جھوٹ وغیرہ سے پرہیز کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے آپ اقرار تو یہی لیتے تھے جو مردوں سے لیا جاتا تھا، مگر آپؐ عورتوں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے تھے بلکہ صرف زبانی اقرار لے لیا جاتا تھا۔ بعد میں جب جہاد بالسیف کے متعلق احکام نازل ہوتے تو آپؐ نے بیعت میں جہاد کے متعلق بھی الفاظ زیادہ فرما دیئے، لیکن عورتوں کی بیعت آخر تک اسی ابتدائی صورت میں قائم رہی[1]۔ بیعت کے علاوہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ آپؐ غیر محرم عورتوں کے ساتھ مصافحہ نہیں کرتے تھے[2] اور پردہ کا حکم نازل ہونے کے بعد تو شرعاً غیر محرم مرد و عورت کا ایک دوسرے پر اپنی زینت کا اظہار خواہ وہ نظر کے ذریعہ ہو یا لمس وغیرہ کے ذریعہ ممنوع قرار دے دیا گیا[3]۔

ابتدائی اِخفا اور قریش کا رویّہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں قریباً تین برس تک اسلام کی تبلیغ کو عموماً خفیہ رکھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا کوئی خاص مرکز بھی نہ تھا جہاں وہ جمع ہو سکتے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مسلمانوں کی تبلیغ سے جو متلاشیانِ حق آتے تھے اُن سے آپؐ عموماً اپنے مکان کے اندر ہی ملتے تھے یا شہر سے باہر کسی جگہ ملاقات فرماتے تھے اس اخفاء کا یہاں تک اثر تھا کہ بعض اوقات خود مسلمانوں کو ایک دوسرے کے اسلام کا پتہ نہ لگتا تھا جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان اپنے اسلام کو عام طور پر چھپاتے تھے اور سردارانِ قریش کے کانوں تک تو بہت ہی کم خبر پہنچتی تھی لیکن اگر کبھی خبر پہنچ بھی جاتی تو بھی ان کی طرف سے ان ایام میں عموماً مسلمانوں سے کوئی تعارض نہ ہوتا تھا بلکہ اُن کی مخالفت عملاً ہنسی مذاق تک ہی محدود رہتی تھی کیونکہ وہ اس تمام کارروائی کو ایک بچوں کا کھیل سمجھتے تھے۔ یا اگر کبھی کوئی شخص زیادہ سختی سے مخالفت کرتا بھی تھا تو یہ اس کا ذاتی فعل ہوتا تھا۔ اور اسلام کے خلاف قریش

---

[1] ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ اولیٰ و عقبہ ثانیہ و قرآن شریف سورۃ ممتحنہ رکوع ۲ و بخاری باب وفود الانصار الی النبی صلعم۔ نیز بخاری کتاب الاحکام باب بیعۃ النساء۔

[2] بخاری کتاب الاحکام باب بیعۃ النساء۔ [3] قرآن کریم سورہ نور ۳۱:۱

کی طرف سے اس وقت کوئی متحدہ مخالفانہ کوشش نہ تھی۔

ابتدائی زمانہ کے ارکانِ اسلام

اصول اسلام کا ذکر اُوپر گذر چکا ہے یعنی یہ کہ اس ابتدائی زمانہ میں جبکہ شریعت اسلامی کے نزول کی ابتداء تھی ارکان اسلام میں سے صرف ایمان باللہ اور توحید پر اصل زور تھا۔ اس کے بعد ایمان بالرسل، بعث بعد الموت اور جزا سزا کا عقیدہ تھا۔ اور گو درحقیقت یہ وہ بنیادی اصول ہیں کہ اگر غور سے دیکھو تو سب کچھ ان کے اندر آجاتا ہے لیکن جس طرح بعد میں یہ اور دوسری اصولی باتیں تدوینی رنگ میں ارکانِ ایمان قرار دی گئیں یہ حال اوائل میں نہ تھا۔ اسی طرح ارکانِ اعمال کا حال تھا۔ بلکہ اعمال میں تو موجودہ ارکان یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ میں سے کوئی رکن بھی اس وقت تک باقاعدہ طور پر قائم نہ ہوا تھا۔ البتہ احادیث سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ابتداء میں جبرائیل نے آپؐ کو نماز اور وضو کا طریق سکھا دیا تھا مگر باقاعدہ پانچ وقت کی نماز بہت بعد میں شروع ہوئی اور روزہ وغیرہ تو اس سے بھی بہت عرصہ بعد میں شروع ہوئے۔ ابتداء میں صرف نماز تھی اور وُہ بھی ایک نفلی رنگ رکھتی تھی۔ یعنی ان ابتدائی ایام میں مُسلمان اپنے طور پر گھروں میں یا مکہ کے پاس کی گھاٹیوں میں دو دو چار چار مل کر جب موقعہ ملا ایک عام عبادت کے رنگ میں نماز ادا کر لیا کرتے تھے؛ چنانچہ اس ابتدائی زمانہ کے متعلق مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت علی مکہ کی کسی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک اس طرف سے ابوطالب کا گذر ہوا۔ ابوطالب کو ابھی تک اسلام کی کوئی خبر نہ تھی اس لیے وہ کھڑا ہو کر نہایت حیرت سے یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ جب آپؐ نماز ختم کر چکے تو اس نے پُوچھا "بھتیجے یہ کیا دین ہے جو تم نے اختیار کیا ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "چچا! یہ دین الٰہی اور دینِ ابراہیم ہے" اور آپؐ نے ابوطالب کو مختصر طور پر اسلام کی دعوت دی، لیکن ابوطالب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "مَیں اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑ سکتا۔ مگر ساتھ ہی اپنے بیٹے حضرت علیؓ کی طرف مخاطب ہو کر بولا "ہاں بیٹا تم بیشک محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا ساتھ دو کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تم کو سوائے نیکی کے اور کسی طرف نہیں بلاتے گا"[1] غالباً اسی زمانہ کے قریب کا ایک اور واقعہ ہے کہ سعد بن ابی وقاص اور چند اور مسلمان مل کر کسی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک چند مشرکین وہاں آنکلے اور انہوں نے مسلمانوں کو ایک نئے رنگ کی عبادت کرتے دیکھ کر ڈانٹا جس پر باہم کچھ تکرار بھی ہو گئی[2]۔

کھلی تبلیغ کا آغاز

یہ ابتدائی زمانہ اِسی طرح خاموش اور خفیہ تبلیغ میں گذر رہا تھا۔ اور بعثت نبویؐ پر قریباً تین سال گذر چکے تھے اور اب چوتھا سال شروع تھا کہ الٰہی حکم نازل ہوا کہ "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ"

---

[1] ابن ہشام باب ابتداءُ مَا فَرَضَ اللّٰہُ۔ [2] طبری

"یعنی اے رسُول! جو حکم تجھے دیا گیا ہے وہ کھول کھول کر لوگوں کو سُنا دے"۔[1]

اور اس کے قریب ہی یہ آیت اُتری کہ: فَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ۔ "یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہوشیار و بیدار کر"[2]

جب یہ احکام اُترے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے پکار کر اور ہر قبیلہ کا نام لے لے کر قریش کو بلایا[3] جب سب لوگ جمع ہو گئے۔ تو آپؐ نے فرمایا: "اے قریش! اگر میں تم کو یہ خبر دُوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بڑا لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنے کو تیار ہے تو کیا تم میری بات کو مانو گے؟" بظاہر یہ ایک بالکل ناقابلِ قبول بات تھی مگر سب نے کہا: "ہاں ہم ضرور مانیں گے کیونکہ ہم نے تمہیں ہمیشہ صادق القول پایا ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "تو پھر سُنو! مَیں تم کو خبر دیتا ہوں کہ اللہ کے عذاب کا لشکر تمہارے قریب پہنچ چکا ہے۔ خُدا پر ایمان لاؤ تا اس عذاب سے بچ جاؤ۔" جب قریش نے یہ الفاظ سُنے تو کھل کھلا کر ہنس پڑے اور آپؐ کے چچا ابولہب نے آپؐ سے مخاطب ہو کر کہا: "تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا" محمدؐ تو ہلاک ہو کیا اس غرض سے تُو نے ہم کو جمع کیا تھا؟ پھر سب لوگ ہنسی مذاق کرتے ہوئے منتشر ہو گئے۔[3]

اقربا کی دعوت

انہی دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ ایک دعوت کا انتظام کرو اور اس میں بنو عبدالمطلب کو بلاؤ۔ تاکہ اس ذریعہ سے اُن تک پیغامِ حق پہنچایا جاوے؛ چنانچہ حضرت علیؓ نے دعوت کا انتظام کیا۔ اور آپؐ نے اپنے سب قریبی رشتہ داروں کو جو اس وقت کم و بیش چالیس[4] نفوس تھے اس دعوت میں بُلایا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو آپؐ نے کچھ تقریر شروع کرنی چاہی مگر بدبخت ابولہب نے کچھ ایسی بات کہدی جس سے سب لوگ منتشر ہو گئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ "یہ موقعہ تو جاتا رہا۔ اب پھر دعوت کا انتظام کرو" چنانچہ آپؐ کے رشتہ دار پھر جمع ہوئے۔ اور آپؐ نے انہیں یوں مخاطب کیا کہ "اے بنو عبدالمطلب! دیکھو مَیں تمہاری طرف وہ بات لیکر آیا ہوں کہ اس سے بڑھ کر اچھی بات کوئی شخص اپنے قبیلہ کی طرف نہیں لایا۔ مَیں تمہیں خُدا کی طرف بُلاتا ہُوں۔ اگر تم میری بات مانو تو تم دین و دُنیا کی بہترین نعمتوں کے وارث بنوگے۔ اب بتاؤ اس کام میں میرا کون مددگار ہوگا؟" سب خاموش تھے اور ہر طرف مجلس میں ایک سنّاٹا تھا کہ یکلخت ایک طرف سے ایک تیرہ سال کا دُبلا پتلا بچہ جس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اُٹھا اور یُوں گویا ہوا "گو مَیں سب میں کمزور ہوں اور سب میں چھوٹا ہوں مگر مَیں آپؐ کا ساتھ دوں گا۔" یہ حضرت علیؓ کی آواز تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے یہ الفاظ سُنے تو اپنے رشتہ داروں

---

[1] قرآن شریف سورۃ حجر: ۹۵ ؂ [2] قرآن شریف سورۃ شعراء: ۲۱۵ ؂ [3] بخاری قصہ اسلام ابی ذر
[4] طبری و خمیس ؂

کی طرف دیکھ کر فرمایا۔" اگر تم جانو تو اس بچے کی بات سُنو اور اسے مانو۔" حاضرین نے یہ نظارہ دیکھا تو بجائے عبرت حاصل کرنے کے سب کھل کھلا کر ہنس پڑے اور ابولہب اپنے بڑے بھائی ابوطالب سے کہنے لگا۔ "لو اب محمدؐ تمھیں یہ حکم دیتا ہے کہ تم اپنے بیٹے کی پیروی اختیار کرو۔" اور پھر یہ لوگ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمزوری پر ہنسی اُڑاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔[1]

دارِ ارقم میں پہلا تبلیغی مرکز

غالباً انہی ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مکہ میں ایک تبلیغی مرکز قائم کیا جاوے۔ جہاں مسلمان نماز وغیرہ کے لیے بے روک ٹوک جمع ہو سکیں اور امن و اطمینان اور خاموشی کے ساتھ باقاعدہ اسلام کی تبلیغ کی جا سکے۔ اس غرض کے لیے ایک ایسے مکان کی ضرورت تھی جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو۔ چنانچہ آپؐ نے ایک نومسلم ارقم بن ابی ارقم کا مکان پسند فرمایا۔ جو کوہِ صفا کے دامن میں واقع تھا۔ اس کے بعد تمام مسلمان یہیں جمع ہوتے یہیں نماز پڑھتے۔ یہیں متلاشیانِ حق آتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلام کی تبلیغ فرماتے۔ اسی وجہ سے یہ مکان تاریخ میں خاص شہرت رکھتا ہے اور "دارالاسلام" کے نام سے مشہور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریباً تین سال تک دارِ ارقم میں کام کیا۔ یعنی بعثت کے چوتھے سال آپؐ نے اسے اپنا مرکز بنایا اور چھٹے سال کے آخر تک آپؐ نے اُس میں اپنا کام کیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ دارِ ارقم میں اسلام لانے والوں میں آخری شخص حضرت عمرؓ تھے جن کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بہت تقویت پہنچی اور وہ دارِ ارقم سے نکل کر برملا تبلیغ کرنے لگ گئے۔[2]

دارِ ارقم میں جو اشخاص ایمان لائے وہ بھی سابقین میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں۔ اوّل مصعبؓ بن عمیر جو بنو عبدالدار میں سے تھے اور بہت شکیل اور حسین تھے اور اپنے خاندان میں نہایت عزیز و محبوب سمجھے جاتے تھے یہ وہی نوجوان بزرگ ہیں جو ہجرت سے قبل یثرب میں پہلے اسلامی مبلغ بنا کر بھیجے گئے اور جن کے ذریعہ مدینہ میں اسلام پھیلا۔ پھر زیدؓ بن الخطاب تھے جو حضرت عمرؓ کے بڑے بھائی تھے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے۔ حضرت عمرؓ کو ان کی وفات کا بہت صدمہ ہوا؛ چنانچہ جب اُن کے عہدِ خلافت میں کسی شخص نے اُن کے سامنے اپنے بھائی کا مرثیہ پڑھا، تو اُنھوں نے فرمایا کہ "اگر مَیں ایسے شعر کہہ سکتا تو مَیں بھی اپنے بھائی کا ایسا مرثیہ کہتا۔" اُس شخص نے جواب دیا۔ "اے امیرالمومنین! جس قسم کی مبارک موت آپ کے بھائی کو نصیب ہوئی ہے وہ اگر میرے بھائی کو نصیب ہوتی تو مَیں تو کبھی بھی اُس کا نوحہ نہ کرتا اور مرثیہ نہ کہتا۔" حضرت عمرؓ کی طبیعت

---

[1] طبری ۔ [2] زرقانی و خمیس

بڑی نکتہ شناس تھی۔ فرمایا۔ خدا کی قسم جس طرح آج تم نے اِس قول سے مجھے تسلی دی ہے۔ ایسی کبھی کسی نے نہیں دی۔ اور اس کے بعد پھر کبھی اپنے بھائی کی وفات پر اس طرح غم کا اظہار نہیں کیا[۱]

پھر اس زمانہ میں ایمان لانے والوں میں سے ایک عبداللہ ابن امِ مکتومؓ تھے جو نابینا تھے اور حضرت خدیجہؓ کے عزیزوں میں سے تھے اُن کے متعلق ایک دلچسپ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ولید بن مغیرہ کو جو قریش کا ایک بہت معزز رئیس تھا نہایت شوق اور سرگرمی سے تبلیغ فرما رہے تھے ابن امِ مکتومؓ جلدی جلدی آئے اور کسی دینی مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ دریافت کرنا چاہا۔ لیکن اپنے شوق میں اُنھوں نے یہ خیال نہ کیا کہ یہاں کن لوگوں کا مجمع ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس کام میں مصروف ہیں اور آدابِ مجلسِ رسُول کے ماتحت ان کو ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو موقعہ کے لحاظ سے اُن کا یہ فعل پسند نہ آیا اور آپؐ کے چہرہ پر ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوتے مگر آپؐ کے اخلاق کریمانہ کا یہ تقاضا تھا کہ آپؐ نے اُن کو زبان سے کچھ نہیں فرمایا بلکہ صرف آپؐ نے یہ کیا کہ اُن کی طرف سے بے التفاتی کر کے ولید سے اپنی بات جاری رکھی۔ عبداللہ ابن امِ مکتوم کو اپنی غلطی کی طرف تو خیال نہیں گیا مگر آپؐ کی اس بے التفاتی پر ملال ہوا اور اُنہوں نے یہ خیال کیا کہ چونکہ ولید ایک بڑا آدمی ہے اس لیے آپؐ نے شاید اس کے مقابلہ میں مجھ غریب کی پروا نہیں کی۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد تھا کیونکہ اسوقت غریب امیر کا کوئی سوال نہ تھا بلکہ آپؐ ایک ایسے شخص کو تبلیغ فرمانے میں مصروف تھے جس کو ان باتوں کے سُننے کا بہت کم موقعہ ملتا تھا اور ابنِ امِ مکتوم کے لیے یہ موقع ہر وقت میسّر تھا اس لیے آپؐ نے اِس موقعہ کو ہاتھ سے دینا پسند نہ فرمایا اور ابنِ امِ مکتوم کے قطع کلام کو بُرا مانا جو حقیقت میں تھا بھی آدابِ مجلس کے خلاف مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا یہ عالم تھا کہ جب آپؐ کو ابنِ اُمِّ مکتوم کے دلی ملال پر اطلاع ہوئی اور ایک قرآنی وحی بھی اِس بارے میں نازل ہوئی تو آپؐ نے اُن کی بڑی دلداری کی اور عرب کے طریق کے مطابق اپنی چادر مبارک بچھا کر اس پر ان کو بٹھایا[۲]

پھر اس زمانہ میں مسلمان ہونے والوں میں ایک جعفر بن ابی طالب تھے جو حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز تھے۔ جعفرؓ کے متعلق مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ خَلق اور خُلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ملتے تھے۔ پھر عمارؓ بن یاسر تھے جو قبیلہ مذحج سے تھے اور اپنے باپ یاسر اور والدہ سمیّہ کے ساتھ مکّہ میں رہتے تھے۔ پھر صہیبؓ بن سنان تھے جو عام طور پر صہیبؓ رومی کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر دراصل وہ رُومی نہ تھے بلکہ کسی زمانہ میں جبکہ ان کا باپ ایرانی

---

[۱] اسد الغابہ ؛ [۲] قرآن شریف سورۃ عبس ع۱ و تفسیر ابن جریر سورۃ مذکور و اسد الغابہ ؛

حکومت کی طرف سے کسی جگہ کا عامل تھا رُومیوں کے ہاتھ قید ہوکر غلام بنالیے گئے تھے اور پھر کچھ مدت تک اُن میں بطور غلام مقیم رہے بالآخر عبداللہ بن جدعان قرشی نے جو مکہ کا ایک رئیس تھا انہیں خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ صہیبؓ جب مسلمان ہوئے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نیک فال کے طور پر فرمایا کہ یہ ہمارا پہلا رُومی پھل ہے۔ صہیبؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اتنے دلدادہ تھے کہ جب یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تو قریش نے ان کو روکا کہ تو ہمارے اندر ایک غریب غلام کی حیثیت میں آیا تھا اور اب تو ہم میں رہ کر امیر ہو گیا ہے اس لیے ہم تجھے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے کہا تم میری ساری دولت لے لو اور مجھے جانے دو۔ اس شرط پر قریش نے انہیں جانے دیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر پہنچی تو آپؐ نے خوشی کے ساتھ فرمایا کہ: "صہیبؓ نے بہت نفع والی تجارت کی ہے۔" جب حضرت عمرؓ اپنے عہدِ خلافت میں مہلک طور پر زخمی ہوئے تو انہوں نے اپنی جگہ صہیبؓ کو ہی جو اس وقت پاس موجود تھے امام الصلوٰۃ مقرر فرمایا تھا چنانچہ حضرت عمرؓ کا جنازہ بھی صہیبؓ نے پڑھا تھا۔ ابو موسیٰؓ اشعری بھی غالباً اُسی زمانہ میں یا اس کے قریب مسلمان ہوئے تھے۔ ابو موسیٰؓ یمن کے رہنے والے تھے اور نہایت خوش الحان تھے۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق ایک دفعہ فرمایا کہ "ابو موسیٰ کو تو لحنِ داؤدی سے حصہ ملا ہے۔" یہ وہی ابو موسیٰ ہیں جو حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے درمیان ثالث مقرر ہوئے تھے۔

قریش کی مخالفت کا آغاز اور اس کے اسباب

جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے دارارقم میں داخل ہونے کے زمانہ سے کچھ پہلے ہی کھلم کھلی تبلیغ شروع ہو گئی تھی۔ اور مکہ کے گلی کوچوں میں اسلام کا چرچا ہونے لگا تھا۔ قریش اب تک تو ایک حد تک خاموش تھے لیکن اب ان کو بھی فکر شروع ہوا کہ کہیں یہ "مرض" زیادہ نہ پھیل جاوے اور اسلام کا پودا مکہ کی زمین میں جڑ نہ پکڑ جاوے۔ اس لیے اب انہوں نے بھی اس کی طرف توجہ شروع کی اور اسلام کی اشاعت کو بزور روکنا چاہا۔ اس مخالفت کے کیا اسباب تھے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر نیا الٰہی سلسلہ جو دُنیا میں قائم ہوتا ہے دُنیا کی طرف سے ضرور اس کی مخالفت ہوتی ہے کیونکہ وہ لازماً اپنے اندر ایسی باتیں رکھتا ہے جس سے اس وقت کی دُنیا محض ناآشنا ہوتی ہے بلکہ یہ وُہ باتیں ہوتی ہیں جن کو دُنیا اپنی موجودہ عادات اور موجودہ عقاید و خیالات کے واسطے ایک یقینی موت سمجھتی ہے۔ درحقیقت انبیاء کی بعثت ہی ایسے وقت میں ہوتی ہے کہ جب دُنیا کے لوگ اس راستہ کو چھوڑ چکے ہوتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا منشاء ہے کہ وہ چلیں۔ اور وہ اپنے موجودہ غلط راستہ کو ہی صحیح راستہ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ پس جب بھی کبھی کوئی نیا نبی آتا اور دُنیا کو سیدھے راستے کی طرف بلاتا ہے تو دُنیا اس کی باتوں کو غلط خیال کرتی اور اس کے مقابلہ کے لیے

تیار ہو جاتی ہے، چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ[1]

"یعنی وائے حسرت لوگوں پر کہ کوئی بھی رسول اُن کی طرف ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ اُنھوں نے ہنسی اور ٹھٹھا نہ کیا ہو۔"

اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ بڑے سمجھے جاتے ہیں وہی عموماً مخالفت میں بھی بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا[2]

"یعنی سنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ ہر جگہ رسُول کے مقابلہ پر بڑے لوگ ہی خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کرنیوالے اور فتنہ و فساد کے بانی بن جاتے ہیں۔"

چنانچہ دیکھ لو حضرت ابراہیمؑ مبعوث ہوئے تو اُن کی قوم کے بڑے بڑے لوگوں نے اُن کو پکڑ کر آگ میں جھونک دیا۔ حضرت موسیٰؑ آئے تو ان کو بھی اکابر قوم کی طرف سے جنگ وجدل کے مصائب دیکھنے پڑے۔ حضرت مسیحؑ کی باری آئی تو اُن کی قوم کے علماء اور فریسیوں نے مل ملا کر اُن کو دار پر کھچوا دیا۔ ہندوستان میں کرشن مبعوث ہوئے تو اُن کی قوم ان کو ہلاک کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تو کیا سرورِ انبیاءؐ اس سنّتِ رسل سے باہر رہتا؟ نہیں بلکہ جتنا عظیم الشان مشن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اُتنی ہی شدید آپؐ کی مخالفت ہونی چاہیئے تھی کیونکہ آپؐ ایسے زمانہ میں مبعوث ہوئے تھے کہ جب تاریکی کا خاص زور تھا اور ضروری تھا کہ نُور کے آنے پر تاریکی کی فوجیں اپنی انتہائی طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سارے گذشتہ انبیاء کی نسبت آپؐ کی مخالفت سب سے زیادہ ہوئی۔ اس مخالفت کے موٹے موٹے ظاہری اسباب یہ تھے:

(۱) قریش ایک پرلے درجہ کی بُت پرست قوم تھی اور بُتوں کی عزّت و محبت ان کے دلوں میں اسقدر جمی ہوئی تھی کہ اُن کے خلاف ایک لفظ بھی سُننا اُنہیں گوارا نہ تھا۔ خانہ کعبہ جو محض اللہ تعالےٰ کی عبادت کے واسطے بنایا گیا تھا۔ اس میں بھی ان ظالموں نے سینکڑوں بُت جمع کر رکھے تھے اور اپنی تمام ضروریات کے لیے اپنی بتوں کا مُنہ تکتے تھے۔ اب اسلام آیا تو اس کا بنیادی اصول ہی توحید باری تعالیٰ تھا اور صاف حکم تھا کہ کسی انسان یا درخت یا پتھر یا ستارے وغیرہ کے سامنے سر مت جھکاؤ۔ بلکہ:

---

[1] سورۃ یٰسین: ۳۱ ☆ [2] سورۃ انعام: ۱۲۴ ☆

وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَہُنَّ ۔ ؎۱

" صرف اسی ذات کے سامنے جُھکو جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے"۔
پھر یہی نہیں بلکہ قریش کے بُتوں کو اُن کے خیال میں ہتک آمیز لفظوں میں یاد کیا جاتا تھا اور ان کو جہنّم کا ایندھن قرار دیا جاتا تھا۔ جیسے مثلاً فرمایا :۔

اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ ۔ ؎۲

" یعنی اے لوگو! تم اور تمہارے وُہ بُت جن کو تم پُوجتے ہو دوزخ کا ایندھن ہیں "
ان باتوں نے قریش کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی اور وہ ایک جان ہو کر اسلام کو مٹانے کے واسطے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

(۲) بُت پرستی کے علاوہ عرب میں عادات اور اخلاق کا جو حال تھا وہ اس کتاب کے شروع میں بیان ہو چکا ہے۔ زنا۔ شراب۔ قمار بازی۔ غارت گری۔ قتل۔ حرام خوری کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا، مگر اسلام ان سب باتوں سے روکتا تھا۔ گویا اسلام لانے سے ان کو ایک نئی زندگی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ اور قریش اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ یہی حال رُسوم پرستی کا تھا جو گویا عربوں کے دین و مذہب کا جزو بن چکی تھیں، مگر اسلام سب گندی اور خلافِ اخلاق اور خلافِ مذہب رسوم کو پاؤں کے نیچے مَسلتا تھا۔

(۳) اپنے آباؤ اجداد کی عزت اور ہر بات میں خواہ وُہ دُرست ہو یا غلط ان کی پیروی اختیار کرنا عربوں کے دین و مذہب کا جُزو تھا۔ اسی وجہ سے اُن کو اصرار تھا کہ :

بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ؎۳

" یعنی ہم تو بہر حال اُسی بات کی اِتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔
مگر اسلام خداداد عقل کو سچ اور جھوٹ کے درمیان حَکَمْ قرار دیتا تھا اور اُن کے مُشرک آباء کے متعلق صاف کہتا تھا :

اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ ؎۴

" کیا وُہ اپنے آباؤ اجداد ہی کی اِتباع کریں گے خواہ ان کے آباء گمراہ اور بیوقوف ہی کیوں نہ ہوں"۔

(۴) قریش ایک نہایت متکبر قوم تھی۔ یہ لوگ کسی کو اپنے برابر نہ سمجھتے تھے اور غلاموں کو تو خصوصیت سے ذلیل اور زیر رکھنا چاہتے تھے، مگر اسلام حقوق کے معاملہ میں ان سب امتیازات کو مٹا کر ایک

؎۱ حٰم سجدہ : ۳۸ ٭ ؎۲ سورۃ انبیاء : ۹۹ ٭
؎۳ سورۃ بقرہ : ۱۷۱ ٭ ؎۴ سورۃ بقرہ : ۱۷۱ ٭

عالمگیر اخوت قائم کرنا اور آقا اور غلام کو خدا تعالیٰ کے حضور میں ایک صف میں کھڑا کرتا تھا اور یہ بات رؤساء قریش کے واسطے موت کے پیالہ سے کم نہ تھی۔

(۵) قریش میں بڑے بڑے صاحبِ اثر اور مالدار لوگ موجود تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے کے ان دونوں باتوں سے خالی تھے۔ یعنی نہ تو آپ اپنی خلوت پسند طبیعت کی وجہ سے لیڈرانِ قریش میں سے تھے اور نہ مال و دولت کے لحاظ سے کوئی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ایسی حالت میں سردارانِ مکہ کے لیے آپ کی اتباع اختیار کرنا ایک ایسی بڑی قربانی تھی جس کے لیے یہ لوگ ہرگز تیار نہیں تھے اور اسی وجہ سے وہ کہتے تھے کہ :

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ[1]

"کیوں نہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر نازل ہوا"

(۶) ان اسباب کے علاوہ ایک باعث یہ بھی تھا کہ قریش کے مختلف قبائل کے درمیان سخت رقابت اور دشمنی رہتی تھی اس لیے باقی قبائل کو ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ اُن پر کسی قسم کا امتیاز لے جاوے اور قبائل بنو امیہ اور بنو مخزوم کو تو خصوصیت سے بنو ہاشم کے ساتھ سخت عداوت تھی۔ اسی لیے سب قبائل سے بڑھ کر ان دو قبائل نے اسلام کی مخالفت میں حصہ لیا۔

ائمۃ الکفر قریش میں سے جن لوگوں نے اسلام کی زیادہ مخالفت کی اور اس تحریک میں وہ دوسروں کے لیڈر سمجھے جاتے تھے وہ سب ایک قسم کے نہ تھے بعض میں ذاتی شرافت تھی اور وہ اپنے رنگ میں بالعموم شرافت ہی کا معاملہ کرنا چاہتے تھے مگر کچھ تو اپنی بڑائی کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول نہ کر سکتے تھے اور کچھ انہیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی تھی کہ اس طرح بعض "خام خیالوں" کے ہاتھ سے اُن کے دینِ آبائی کی بربادی ہو رہی ہے اُن میں زیادہ ممتاز یہ لوگ نظر آتے ہیں۔ اوّل مطعم بن عدی جو قبیلہ بنو نوفل سے تھا اور رؤساء قریش میں سے تھا۔ مطعم پکا مشرک تھا مگر معاملات میں حتی الوسع شرافت کا طریق اختیار کرتا تھا؛ چنانچہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کے معاہدہ بائیکاٹ کو توڑنے اور سفرِ طائف سے واپسی پر آپ کو اپنی پناہ میں مکہ میں داخل کرنے میں مطعم نے خاص شرافت اور خاص جرأت سے کام لیا تھا۔ دوسرے ابوالبختری تھا جو قبیلہ بنو اسد سے تھا۔ ابوالبختری بھی مخالفت میں حتی الوسع شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتا تھا۔ اسی ذیل میں ایک شخص زہیر بن ابوامیہ تھا جو حضرت ام سلمہؓ کا بھائی تھا۔ اور باوجود مخالفت کے عموماً شرافت کا پہلو اختیار کرتا تھا۔

---

[1] سورۃ زخرف : ۳۲

دُوسری قسم کے وُہ لوگ تھے جن کی مخالفت کچھ شرارت کا پہلو بھی لیے ہوئے تھی۔ اِن میں یہ لوگ ممتاز تھے۔ اوّل عتبہ بن ربیعہ جو بنو عبدشمس میں سے تھا اور بہت مالدار اور صاحب اثر تھا۔ جنگِ بدر کے موقعہ پر جب عتبہ اپنے سُرخ اُونٹ پر سوار ہو کر اسلامی لشکر کے سامنے آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دیکھ کر فرمایا کہ اگر اس گروہ میں کسی میں کچھ شرافت ہے، تو اس سُرخ اُونٹ کے سوار میں ہے۔ عتبہ کا بھائی شیبہ بھی اسی کے زیرِ اثر تھا۔ یہ دونوں جنگِ بدر میں حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ دُوسرے ولید بن مغیرہ تھا جو حضرت خالدؓ بن ولید کا والد اور قریش کا رئیسِ اعظم تھا حتّٰی کہ قریش اسے اپنا باپ سمجھتے تھے۔ ولید ہجرتِ نبوی کے تین ماہ بعد اتفاقی طور پر تیر چُبھ جانے سے ہلاک ہوا۔ تیسرے عاص بن وائل سہمی تھا۔ جو حضرت عمروؓ بن عاص کا باپ تھا۔ یہ بھی نہایت دولت مند اور بڑا صاحبِ اثر تھا۔ عاص ہجرت کے دُوسرے ماہ پاؤں سُوج جانے سے نہایت تکلیف اُٹھا کر مکہ میں مرگیا۔

تیسری قسم کے گروہ کی حالت بالکل مختلف تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں بالکل اندھے ہو رہے تھے اور ہر جائز و ناجائز طریق سے کوشش کرتے تھے کہ اسلام اور بانیٔ اسلام کو صفحۂ دُنیا سے مِٹا دیں۔ اور مُسلمانوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالیں۔ اور قریش میں انہی لوگوں کا زیادہ زور تھا اور انہی لوگوں کی کثرت تھی۔ اُن میں خاص طور پر ممتاز یہ لوگ نظر آتے ہیں۔ اوّل عمرو بن ہشام جو بنو مخزوم میں سے تھا۔ یہ وہ شخص ہے جسے گویا رأس المعاندین سمجھنا چاہیئے۔ قریش میں یہ نہایت ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اور وُہ اسے "ابوالحکم یعنی دانائی کا باپ" کہتے تھے۔ مگر مسلمانوں نے اس کا نام ابوجہل رکھا۔ یہ جنگِ بدر میں دو انصار لڑکوں کے ہاتھ سے واصل جہنم ہوا۔ دُوسرے ابولہب بن عبدالمطلب جو بنو ہاشم میں سے تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا۔ ابولہب مخالفت اور ایذاء رسانی میں ابوجہل کا ہم پلہ تھا اور اسے یہ خصُوصیت بھی حاصل ہے کہ معاندینِ اسلام میں سے صرف اسی کا نام قرآن شریف میں صراحت کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔ ابولہب جنگِ بدر سے تھوڑا عرصہ بعد مکہ میں بیمار پڑ کر ہلاک ہوا۔ تیسرے عقبہ بن ابی معیط تھا جو بنو امیہ میں سے تھا اور پرلے درجہ کا شریر اور بدباطن شخص تھا۔ یہ جنگِ بدر میں شریک ہوا اور مارا گیا۔ پھر امیہ بن خلف تھا جو بنو جمح میں سے تھا۔ شرارت اور عداوت میں یہ ابوجہل کا مثل تھا۔ جنگ بدر میں قتل ہوا۔ امیہ کا بھائی اُبیّ بن خلف بھی اسی قماش کا آدمی تھا۔ یہ جنگِ اُحد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے زخمی ہوا اور اسی زخم سے اپنی کیفرِ کردار کو پہنچا۔ پھر النضر بن الحارث تھا جو بنو عبدالدار میں سے تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت دُکھ دیا کرتا تھا۔ یہ جنگِ بدر میں قید ہوا اور اپنے جرموں کی پاداش میں مارا گیا۔ پھر اسود بن عبدیغوث۔ حارث بن قیس۔ اسود بن مطلب۔ ابوقیس بن فاکہہ۔ منبہ بن الحجاج۔ نبیہ بن الحجاج۔ مالک بن طلاطلہ۔ حکم بن ابی العاص۔ رُکانہ بن یزید وغیرہ بھی شرارت اور عداوت میں

کم و بیش بہت حصّہ لیتے تھے[1]

اِن کے علاوہ بعض اور لوگ بھی تھے جو عداوت میں بہت بڑھے ہوئے تھے، لیکن چونکہ وہ بعد میں مُسلمان ہوگئے اس لیے ان کا اس جگہ اس فہرست میں ذکر کرنا شاید دُرست نہ ہو البتہ اپنے اپنے موقعہ پر اُن کا ذکر خود آجائے گا۔

اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف کفّارِ مکہ کی عداوت

اسلام کے خلاف جب قریش کی مخالفت شروع ہوئی تو پھر وُہ دن بدن بڑھتی گئی اور خطرناک صورت اختیار کرتی گئی؛ چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے کہ قریش نے فیصلہ کر لیا تھا کہ:

> "یہ نیا مذہب صفحۂ دُنیا سے ملیا میٹ کر دیا جاوے اور اس کے متبعین اس سے بزور روک دیتے جاویں۔ اور قریش کی طرف سے جب ایک دفعہ مخالفت شروع ہوئی تو پھر دن بدن اُن کی ایذاء رسانی بڑھتی اور آتشِ غضب تیز ہوتی گئی۔"[2]

درحقیقت جو فتنہ مخالفینِ اسلام نے اسلام کے خلاف برپا کیا اور اس کے مٹانے کے واسطے جو جو تدابیر کیں وُہ ایک لمبی اور دردناک کہانی ہے جس کا سلسلہ ہجرت کے آٹھویں سال تک پہنچتا ہے۔

ابوطالب کے پاس قریش کا پہلا وفد

سب سے پہلی کوشش قریش کی یہ تھی کہ جس طرح بھی ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب کی ہمدردی اور حفاظت سے محروم کر دیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جبتک ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں اس وقت تک بین القبائل تعلّقات کو خراب کئے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے۔ ابوطالب قبیلہ بنو ہاشم کے رئیس تھے اور باوجود مُشرک ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مربّی اور محافظ تھے اس لیے ان کے ہوتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہاتھ اُٹھانا بین القبائل سیاست کی رُو سے بنو ہاشم کے ساتھ جنگ چھیڑنے کے مترادف تھا جس کے لیے دُوسرے قبائلِ قریش ابھی تک تیار نہ تھے۔ لہٰذا پہلی تجویز اُنھوں نے یہ کی کہ ابوطالب کے پاس دوستانہ رنگ میں ایک وفد بھیجا کہ وہ اپنے بھتیجے کو اشاعتِ اسلام سے روک دیں؛ چنانچہ ولید بن مغیرہ۔ عاص بن وائل۔ عتبہ بن ربیعہ۔ ابوجہل بن ہشام۔ ابوسفیان وغیرہ جو سب رؤساء قریش میں سے تھے ابوطالب کے پاس آئے اور نرمی کے طریق پر کہا کہ "آپ ہماری قوم میں معزز ہیں۔ اس لیے ہم آپ سے درخواست

---

[1] تاریخ کامل وزرقانی ۔ [2] میور صفحہ ۶۱ ۔

کرتے ہیں کہ آپ اپنے بھتیجے کو اس نئے دین کی اشاعت سے روک دیں اور یا پھر اس کی حمایت سے دستبردار ہو جاویں۔ اور ہمیں اور اُس کو چھوڑ دیں کہ ہم آپس میں فیصلہ کر لیں۔" ابوطالب نے اُن کے ساتھ بہت نرمی کی باتیں کیں اور اُن کے غصّہ کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر انہیں ٹھنڈا کر کے واپس کر دیا۔[1]

دُوسرا وفد

لیکن چونکہ اُن کی ناراضگی کا سبب موجود تھا بلکہ دن بدن ترقی کرتا جاتا تھا اور قرآن شریف میں بڑی سختی سے شرک کے ردّ میں آیات نازل ہو رہی تھیں۔ اس لیے کوئی لمبا عرصہ نہ گذرا تھا کہ یہ لوگ پھر ابوطالب کے پاس جمع ہوئے اور ان سے کہا کہ "اب معاملہ حد کو پہنچ گیا ہے اور ہم کو رجس اور پلید اور شر البریّہ اور سُفہاء اور شیطان کی ذرّیت کہا جاتا ہے اور ہمارے معبودوں کو جہنّم کا ایندھن قرار دیا جاتا ہے اور ہمارے بزرگوں کو لا یعقل کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس لیے اب ہم صبر نہیں کر سکتے اور اگر تم اُس کی حمایت سے دستبردار نہیں ہو سکتے، تو پھر ہم بھی مجبور ہیں۔ ہم پھر تم سب کے ساتھ مقابلہ کریں گے حتّٰی کہ دونوں فریقوں میں سے ایک ہلاک ہو جاوے۔" ابوطالب کے لیے اب نہایت نازک موقعہ تھا اور وہ سخت ڈر گئے۔ اور اُسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلایا۔ جب آپؐ آئے تو اُن سے کہا کہ "اے میرے بھتیجے! اب تیری باتوں کی وجہ سے قوم سخت مشتعل ہو گئی ہے اور قریب ہے کہ تجھے ہلاک کر دیں۔ اور ساتھ ہی مجھے بھی۔ تُو نے ان کے عقلمندوں کو سفیہ قرار دیا۔ اُن کے بزرگوں کو شر البریّہ کہا۔ ان کے قابلِ تعظیم معبودوں کا نام ہیزمِ جہنّم اور وقود النّار رکھا اور خود اُنہیں رجس اور پلید ٹھہرایا۔ مَیں تجھے خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ اس دُشنام دہی سے اپنی زبان کو تھام لو اور اس کام سے باز آ جاؤ؛ ورنہ میں تمام قوم کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھ لیا کہ اب ابوطالب کا پائے ثبات بھی لغزش میں ہے اور دنیاوی اسباب میں سے سب سے بڑا سہارا مخالفت کے بوجھ کے نیچے دب کر ٹوٹا چاہتا ہے۔ مگر آپؐ کے ماتھے پر بل تک نہ تھا۔ نہایت اطمینان سے فرمایا "چچا یہ دشنام دہی نہیں ہے بلکہ نفس الامر کا عین محل پر بیان ہے اور یہی تو وُہ کام ہے جس کے واسطے میں بھیجا گیا ہوں کہ لوگوں کی خرابیاں اُن پر ظاہر کر کے اُنہیں سیدھے رستے کی طرف بلاؤں اور اگر اِس راہ میں مجھے مرنا درپیش ہے تو مَیں بخوشی اپنے لیے اس موت کو قبول کرتا ہُوں۔ میری زندگی اِس راہ میں وقف ہے اور مَیں موت کے ڈر سے اظہارِ حق سے رُک نہیں سکتا۔ اور اے چچا! اگر آپ کو اپنی کمزوری اور تکلیف کا خیال ہے تو آپ بیشک مجھے اپنی پناہ میں رکھنے سے دستبردار ہو جاویں۔ مگر مَیں احکامِ الٰہی کے پہنچانے سے کبھی نہیں رُکوں گا۔ اور خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سُورج اور دُوسرے ہاتھ میں چاند بھی لا کر دے دیں تب بھی مَیں اپنے فرض سے باز نہیں رہوں گا اور مَیں اپنے

---

[1] ابن ہشام

کام میں لگا رہوں گا حتیٰ کہ خُدا اسے پُورا کرے یا مَیں اس کوشش میں ہلاک ہو جاؤں؟ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم یہ تقریر فرما رہے تھے اور آپؐ کے چہرہ پر سچائی اور نورانیت سے بھری ہوئی رقّت نمایاں تھی۔ اور جب آپؐ تقریر ختم کر چکے تو آپؐ یکلخت چل پڑے اور وہاں سے رُخصت ہونا چاہا مگر ابوطالب نے پیچھے سے آواز دی۔ جب آپؐ لوٹے تو آپؐ نے دیکھا کہ ابوطالب کے آنسو جاری تھے۔ اُسوقت ابوطالب نے بڑی رقّت کی آواز میں آپؐ سے مخاطب ہوکر کہا ”بھتیجے جا اور اپنے کام میں لگا رہ جب تک مَیں زندہ ہُوں اور جہاں تک میری طاقت ہے مَیں تیرا ساتھ دُوں گا“[1]

تیسرا وفد

جب اس دفعہ بھی قریش ناکام رہے تو اُنھوں نے ایک اور چال چلی اور وہ یہ کہ قریش کے ایک اعلیٰ خاندان سے ایک ہونہار نوجوان عمارہ بن ولید کو ساتھ لے کر ابوطالب کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ ”ہم عمارہ بن ولید کو اپنے ساتھ لائے ہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ یہ قریش کے بہترین نوجوانوں میں سے ہے۔ پس تم ایسا کرو کہ محمدؐ کے عوض میں تم اِس لڑکے کو لے لو اور اس سے جس طرح چاہو فائدہ اُٹھاؤ۔ اور چاہو تو اسے اپنا بیٹا بنالو۔ ہم اس کے حقوق سے کلیۃً دستبردار ہوتے ہیں اور اس کے عوض تم محمدؐ کو ہمارے سپرد کردو جس نے ہمارے آبائی دین میں رخنہ پیدا کر کے ہماری قوم میں ایک فتنہ کھڑا کر رکھا ہے۔ اس طرح جان کے بدلے جان کا قانون پورا ہو جائے گا اور تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی“۔ ابوطالب نے کہا ”یہ عجیب انصاف ہے کہ مَیں تمہارے بیٹے کو لے کر اپنا بیٹا بناؤں اور اسے کھلاؤں اور پلاؤں اور اپنا بیٹا تمہیں دے دُوں کہ تم اسے قتل کر دو۔ واللہ یہ کبھی نہیں ہوگا“ قریش کی طرف سے مطعم بن عدی نے کہا کہ ”پھر اے ابوطالب! تمھاری قوم نے تو تم پر ہر رنگ میں حجت پوری کر دی ہے۔ اور اب تک جھگڑے سے اپنے آپ کو بچایا ہے مگر تم ان کی کوئی بات بھی مانتے نظر نہیں آتے“ ابوطالب نے کہا ”واللہ میرے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا اور مطعم مَیں دیکھتا ہوں کہ تم بھی اپنی قوم کی پیٹھ ٹھونکنے میں میرے ساتھ بے وفائی کرنے پر آمادہ ہو۔ پس اگر تمہارے تیور بدلے ہوئے ہیں تو مَیں کیا کہہ سکتا ہُوں۔ تم نے جو کرنا ہو وہ کرو“[2]

مُسلمانوں کے متعلق قریش کا فیصلہ

رؤسا قریش ابوطالب کی طرف سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ تجویز کی کہ جس جس قبیلہ میں سے کوئی شخص مُسلمان ہوچکا تھا وُہ قبیلہ اپنے اپنے آدمی پر دباؤ ڈال کر اسے اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ سب نے مِل کر باہم مشورہ سے یہ فیصلہ کیا کہ تو مسلموں پر ان کے اپنے اپنے قبیلہ کی طرف سے زور ڈالا جائے تاکہ کسی قسم کی بین القبائل پیچیدگی نہ پیدا ہو اور

---

[1] ازالہ اوہام جلد اصفحہ ۱۰ و ابن ہشام و زرقانی ۞ [2] ابن ہشام و طبری ۞

اُنھوں نے یہ خیال کیا کہ جب خود مُسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیں گے تو آپؐ اکیلے کچھ نہیں کر سکیں گے اور یہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اس فیصلہ میں یہ بھی قرار پایا کہ صرف زبانی دباؤ تک نہ رہا جائے بلکہ ہر رنگ میں تنگ کر کے اور تکلیف میں ڈال کر نو مسلموں کو واپس لانے کی کوشش کی جائے۔ جب ابوطالب کو اس مشورہ سے اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے بھی ایک جوابی تدبیر کے طور پر بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ایک جگہ جمع کیا اور حالات بتا کر تحریک کی کہ اس عداوت کے طوفان میں ہمیں محمدؐ کی حفاظت کرنی چاہیئے چنانچہ ابولہب کے سِوا جو اسلام کی عداوت میں اندھا ہو رہا تھا باقی سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور قومی غیرت میں آکر دُوسروں کے مقابلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت کے لیے تیار ہو گئے[1]۔ ان حالات نے مکّہ کی فضا میں ایک آتشی مادہ پیدا کر دیا تھا۔ مگر چونکہ ابھی تک مسلمانوں کی ایذا رسانی کا فیصلہ ہر قبیلہ کی حدود کے اندر محدود تھا، اس لیے کوئی بین القبائل پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں مُسلمانوں کے لیے انفرادی طور پر سخت مصائب و آلام کا دروازہ کھُل گیا اور اس وقت سے لیکر ہجرت یثرب تک کی داستان ایک خُون کے آنسو رُلانے والی داستان ہے۔

مُسلمانوں کی تکالیف کا نمونہ

ان ایّام میں جو جو تکالیف مُسلمانوں کو پہنچیں اُن کو وہی جانتے تھے جن کو یہ مصائب جھیلنے پڑے۔ مگر ہاں تاریخ نے جہاں تک ان واقعات کو محفوظ رکھا ہے اور وُہ یقیناً اصل واقعات سے بہت کم ہیں۔ ان کا نمونہ درج ذیل ہے:

حضرت عثمانؓ بنو اُمیّہ میں سے تھے اور ایک نسبتاً پختہ عمر کے اور مرفہ الحال آدمی تھے، لیکن قریش کے مذکورہ بالا فیصلہ کے بعد اُن کے چچا حکم بن ابی العاص نے ان کو رسیّوں سے باندھ کر پیٹا اور ان بیچاروں نے سامنے سے اُف تک نہیں کی[2]۔ زبیرؓ بن العوام قبیلہ اسد سے تھے اور ایک جوانمرد آدمی تھے مگر ان کا ظالم چچا اُن کو چٹائی میں لپیٹ کر اُن کے ناک میں آگ کا دھواں دیا کرتا تھا کہ اسلام سے باز آجاویں مگر وُہ بڑی خوشی کے ساتھ اس تکلیف کو برداشت کرتے اور کہتے کہ مَیں صداقت کو پہچان کر پھر انکار نہیں کر سکتا[3]۔ سعیدؓ بن زید جو حضرت عمرؓ کے بہنوئی تھے بنو عدی سے تھے اور اپنے حلقہ میں معزز تھے، لیکن جب عمر بن الخطاب کو ان کے اسلام کا علم ہوا تو وُہ انہیں گرا کر ان کی چھاتی پر سوار ہو گئے اور اسی کش مکش میں اپنی بہن کو بھی زخمی کر دیا[4]۔ عبداللہ بن مسعود جو قبیلہ ھذیل میں سے تھے۔ انہیں قریش نے عین صحن کعبہ میں مار مار کر ہلکان کر دیا[5]۔ ابوذر غفاری کو قریش نے اتنا پیٹا کہ مارتے

---

[1] ابن ہشام و طبری ؛ [2] طبقات ابن سعد حالات عثمان بن عفان ؛ [3] زرقانی جلد ا باب اوّل من اسلم ؛
[4] ابنِ ہشام ذکر اسلام عمر ؛ [5] اسدالغابہ ؛

مارتے زمین پر بچھا دیا اور قریب تھا کہ جان سے مار ڈالتے، مگر عباس بن عبدالمطلب نے یہ کہہ کر انکو قریش سے چھڑایا کہ "جانتے ہو کہ یہ شخص بنو غفار میں سے ہے جو تمہارے شامی تجارت کے راستہ پر آباد ہیں۔ اگر اُن کو علم ہوا، تو تمہارا راستہ روک دیں گے"[1]۔ یہ سختیاں اُن لوگوں پر تھیں جو طاقتور قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے، مگر جو حال غلاموں اور دُوسرے کمزور لوگوں کا تھا وہ پڑھ کر تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ذیل کی چند مثالیں قریش کے مظالم کا صرف ایک معمولی نمونہ ہیں۔

بلالؓ بن رباح اُمیہ بن خلف کے ایک حبشی غلام تھے۔ اُمیہ ان کو دوپہر کے وقت جبکہ اُوپر سے آگ برستی تھی اور مکہ کا پتھریلا میدان بھٹی کی طرح تپتا تھا، باہر لے جاتا اور ننگا کر کے زمین پر لٹا دیتا اور بڑے بڑے گرم پتھر اُن کے سینے پر رکھ کر کہتا لات اور عُزّیٰ کی پرستش کرو اور محمدؐ سے علیحدہ ہو جاؤ ورنہ اسی طرح عذاب دے کر مار دُوں گا۔ بلالؓ زیادہ عربی نہ جانتے تھے۔ بس صرف اتنا کہتے احد احد یعنی اللہ ایک ہی ہے۔ اور یہ جواب سُنکر اُمیہ اور تیز ہو جاتا اور ان کے گلے میں رسہ ڈال کر انہیں شریر لڑکوں کے حوالے کر دیتا اور وُہ ان کو مکہ کی پتھریلی گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے جس سے اُنکا بدن خُون سے تر بتر ہو جاتا۔ مگر اُن کی زبان پر سوائے اَحد اَحد کے اور کوئی لفظ نہ آتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُن پر یہ جور و ستم دیکھے تو ایک بڑی قیمت پر خرید کر انہیں آزاد کر دیا۔

ابو فکیہہؓ صفوان بن اُمیہ کے غلام تھے۔ ان کو بھی یہ لوگ اسی طرح گرم زمین پر لٹا دیتے اور سینے پر اتنے بھاری پتھر رکھتے کہ اُن کی زبان باہر نکل آتی۔

عامرؓ بن فہیرہ بھی ایک غلام تھے انہیں بھی اسلام کی وجہ سے سخت تکالیف دی جاتی تھیں۔ ان کو حضرت ابوبکرؓ نے خرید کر اپنے پاس بکریاں چرانے پر نوکر رکھ لیا۔

لبینہؓ بنو عدی کی لونڈی تھی۔ اسلام لانے سے پہلے عمرؓ اس کو اتنا مارتے کہ مارتے مارتے تھک جاتے، لیکن جب ذرا دم لے لیتے تو پھر اُسی طرح مارنا شروع کر دیتے وُہ سامنے سے صرف اتنا کہتی کہ عمرؓ اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو خُدا اس ظلم کا بے انتقام نہیں چھوڑے گا۔

زنیرہؓ بنو مخزوم کی لونڈی تھی۔ ابوجہل نے اُسے اس بے دردی سے پیٹا کہ اس کی آنکھیں جاتی رہیں۔ ابوجہل اس کی طرف اشارہ کر کے طنزاً کہا کرتا تھا کہ "اگر اسلام سچا ہوتا تو کیا بھلا اسے مل جاتا اور ہم محروم رہتے۔"

صہیبؓ بن سنان رُومی ہرچند کہ اب غلام نہ تھے اور تھے بھی نسبتاً خوشحال، لیکن قریش ان کو اتنا پیٹتے کہ اُن کے حواس مختل ہو جاتے۔ یہ وہی صہیبؓ ہیں جن کو حضرت عمرؓ نے زخمی ہونے پر امام الصلوٰۃ مقرر کیا تھا اور انہوں نے ہی حضرت عمرؓ کا جنازہ پڑھایا تھا[2]۔

---

[1] بخاری باب قصۃ اسلام ابی ذر ؛ [2] اسد الغابہ و تاریخ کامل "

خبابؓ بن الارت بھی اب غلام نہ تھے بلکہ آزاد تھے اور لوہار کا کام کرتے تھے، مگر ایک دفعہ قریش نے اُن کو پکڑ کر آہنی کی بھٹی کے دہکتے ہوئے کوئلوں پر اُلٹا لِٹا دیا اور ایک شخص اُن کی چھاتی پر چڑھ گیا، تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں، چنانچہ وہ کوئلے اُسی طرح جل جل کر اُن کے نیچے ٹھنڈے ہوگئے۔ خبابؓ نے مدّتوں کے بعد حضرت عمرؓ سے یہ واقعہ بیان کیا اور اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی جو زخموں کے داغوں سے بالکل سفید تھی۔ خبابؓ کے متعلق یہ روایت بھی آتی ہے کہ ایک دفعہ مکّہ کے ایک رئیس عاص بن وائل نے اُن سے کچھ تلواریں بنوائیں اور جب خبابؓ نے قیمت کا مطالبہ کیا تو وہ کہنے لگا تم لوگ یہ دعویٰ کرتے ہو کہ جنّت میں انسان کو ہر قسم کی نعمت سونا اور چاندی وغیرہ سب حسب خواہش ملے گی۔ سو تم اپنی تلواروں کی قیمت مجھ سے جنّت میں آکر لے لینا۔ کیونکہ واللہ اگر تمھیں جنّت میں جانے کی توقع ہے تو مجھے تو بدرجہ اولیٰ ہونی چاہیئے اور یہ کہکر قیمت دینے سے انکار کر دیا۔[1]

عمارؓ اور ان کے والد یاسرؓ اور ان کی والدہ سمیّہ کو بنی مخزوم جن کی غلامی میں سمیّہ کسی وقت رہ چکی تھیں۔ اتنی تکالیف دیتے تھے کہ ان کا حال پڑھ کر بدن پر لرزہ پڑنے لگتا ہے۔ ایک دفعہ جب ان فدائیانِ اسلام کی جماعت کسی جسمانی عذاب میں مبتلا تھی اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس طرف آنکلے۔ آپؐ نے اُن کی طرف دیکھا۔ اور دردمندانہ لہجہ میں فرمایا : صَبْرًا اٰلَ يَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةَ۔ "اے آلِ یاسر صبر کا دامن نہ چھوڑنا کہ خدا نے تمہاری انہی تکلیفوں کے بدلے میں تمہارے لیے جنّت تیار کر رکھی ہے" آخر یاسرؓ تو اسی عذاب کی حالت میں جاں بحق ہو گئے۔ اور بوڑھی سمیّہ کی ران میں ظالم ابوجہل نے اس بے دردی سے نیزہ مارا کہ وہ اس کے جسم کو کاٹتا ہوا ان کی شرمگاہ تک جا نکلا۔ اور اس بے گناہ خاتون نے اسی جگہ تڑپتے ہوئے جان دیدی۔ اب صرف عمارؓ باقی رہ گئے۔ ان کو بھی ان لوگوں نے انتہائی عذاب اور دُکھ میں مبتلا کیا اور ان سے کہا کہ "جب تک محمدؐ کا کفر نہ کرو گے اسی طرح عذاب دیتے رہیں گے"۔ چنانچہ آخر عمارؓ نے سخت تنگ آکر کوئی نازیبا الفاظ مُنہ سے کہہ دیئے جس پر کفار نے انہیں چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے بعد عمارؓ فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور زار زار رونے لگے۔ آپؐ نے پوچھا "کیوں عمار کیا بات ہے؟" اُنھوں نے کہا "یا رسول اللہ میں ہلاک ہوگیا۔ مجھے ظالموں نے اتنا دُکھ دیا کہ میں نے آپؐ کے متعلق کچھ ناگفتنی الفاظ مُنہ سے کہہ دیئے"۔ آپؐ نے فرمایا : "تم اپنے دل کا حال کیسا پاتے ہو؟" اُس نے عرض کیا "یا رسُول اللہ میرا دل تو اُسی طرح مومن ہے اور اللہ اور اس کے رسُول کی محبت میں اُسی طرح سرشار"۔ آپؐ نے فرمایا۔ تو پھر خیر ہے خدا تمہاری اس لغزش کو معاف کرے۔

---

[1] بخاری و مسلم بحوالہ تلخیص الصحاح جلد ۱ صفحہ ۲۰۶

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تکالیف

مُسلمانوں کی ان تکالیف کے مقابلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی حالت بھی مخالفت کے اِس طوفان بے تمیزی میں چنداں تسلی بخش نہ تھی۔ بے شک بنو ہاشم اور بنو مطلب کے اُس فیصلہ کے بعد جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے آپؐ کو اپنے اعزہ و اقارب کی عمومی حمایت حاصل تھی۔ اور قریش کی بین القبائل سیاست میں یہ حمایت خاصہ وزن رکھتی تھی، لیکن اوّل تو آپؐ کے چچا ابولہب کی بیوفائی اور غداری نے اس فیصلہ کی طاقت کو ایک حد تک کمزور کر دیا تھا۔ دُوسرے خود قریش بھی یہ دھمکی دے چکے تھے کہ اگر بنو ہاشم اور بنو مطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت و پناہ بننے سے باز نہیں آئیں گے تو پھر ہم ان سب کا مقابلہ کریں گے اور گو ابھی تک اُنھوں نے اس دھمکی کو پورے طور پر عملی جامہ نہیں پہنایا تھا، لیکن وہ اُس کی تیاری میں مصروف تھے اور طعن و تشنیع اور نوک جھونک سے گذر کر کبھی کبھی اپنا بچاؤ رکھ کر عملی چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتے تھے؛ چنانچہ سب سے پہلے تو انہوں نے ایک مجلس کر کے اُس سوال پر غور کیا کہ اب جو حج کا موسم آئے گا تو اس موقعہ پر لازماً باہر سے آنے والے حاجیوں میں اسلام کے متعلق چرچا ہوگا اور لوگ آ آ کر ہم سے پُوچھیں گے کہ یہ نیا نبی کون ہے اور کیا کہتا ہے اس لیے ہمیں باہم مشورہ سے کوئی جواب سوچ رکھنا چاہیئے تاکہ ہمارا آپس کا اختلاف کوئی بُرا اثر پیدا نہ کرے؛ چنانچہ سب روساءِ قریش ولید بن مغیرہ کے مکان پر جمع ہوئے اور ولید نے ان کے سامنے ایک افتتاحی تقریر کر کے ساری بات سمجھائی اور بتایا کہ اب حج کا وقت آ رہا ہے اور محمدؐ کے اس دعویٰ کی خبر باہر پہنچ چکی ہے اور لازماً حج پر آنے والے لوگ ہمیں اس کے متعلق پُوچھیں گے۔ پس ہمیں چاہیئے کہ باہم مشورہ سے کوئی ایک پختہ جواب سوچ رکھیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دُوسرے کے خلاف باتیں کہہ کر خود اپنے اثر کو مٹا لیں۔ اُس پر ایک شخص بولا کہ ہمارا جواب صاف ہے کہ یہ شخص ایک کاہن ہے اور کاہنوں کی سی باتیں کر کے اس نے چند لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ ولید نے کہا کہ ہم اسے کاہن کس طرح کہہ سکتے ہیں جبکہ اس میں کاہنوں کی کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی۔ نہ کاہنوں کا سا ترنم ہے اور نہ کاہنوں کا سا مخصوص اندازِ بیان۔ دُوسرے نے کہا کہ پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمدؐ مجنون ہے اور اپنے جنون کے جوش میں باتیں کرتا رہتا ہے۔ ولید نے کہا۔ ہماری یہ بات کون مانے گا۔ اور جنون کی وہ کونسی علامتیں ہیں جو ہم محمدؐ میں دکھا سکیں گے۔ نہ اُس میں وہ وحشت ہے اور نہ وہ اضطراب اور نہ ہی وہ وسوسہ جو ایک مجنون میں لازماً پائے جاتے ہیں۔ پھر ہمارے جنون کے ادّعا کو کون سُنے گا۔ تیسرا بولا کہ پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے اور اپنے جادو وا اثر اشعار سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ ولید نے کہا۔ ہم اسے شاعر کہہ کر اس کے کلام میں شعر کے خصائص از قسم رجز اور ہزج اور قریض اور مقبوض اور مبسوط[1] کہاں سے دکھائیں گے۔ اس پر ایک چوتھا شخص بولا کہ اسے ایک ساحر کے طور پر پیش کرنا چاہیئے۔

---

[1] یہ شعراءِ عرب کی اصطلاحیں تھیں۔

ولید نے کہا پھر ہم اس میں ساحروں کی سی پھونکیں مارنا اور گرہیں ڈالنا اور گرہیں کھولنا کس طرح دکھائیں گے۔ لوگوں نے کہا تو پھر اے عبدشمس تم ہی بتاؤ کہ پھر ہمیں کیا کہنا چاہیے۔ ولید نے کہا۔ اس معاملہ میں میں خود حیران ہوں کہ کیا کیا جائے۔ جو بات بھی سوچتا ہوں وہ محمدؐ پر چسپاں ہوتی نظر نہیں آتی اور ایسی بات کہنا جس سے لوگوں کو تسلی نہ ہو خود اپنے آپ کو ہنسی کا نشانہ بنانا ہے۔ اس طرح اس مجلس میں کچھ عرصہ باتیں ہوتی رہیں۔ آخر یہ مشورہ قرار پایا کہ اور کوئی بات تو خیال میں آتی نہیں اور جو باتیں پیش کی گئی ہیں ان میں ساحر والی زیادہ وزن دار ہے۔ پس یہ فیصلہ ہوا کہ حج کے موقعہ پر باہر سے آنیوالے لوگوں کے سامنے محمدؐ کے متعلق سب لوگ یہی کہیں کہ یہ ایک ساحر ہے جو اپنی مخفی سحرکاری سے باپ کو بیٹے، سے بھائی کو بھائی سے، خاوند کو بیوی سے جُدا کرتا چلا جارہا ہے؛ چنانچہ جب حج کا موقعہ آیا تو قریش کے بچے بچہ کی زبان پر یہی فقرہ تھا کہ محمدؐ تو ایک ساحر ہے جو جس گھر میں داخل ہوتا ہے انشقاق و اختلاف کا بیج بو کر نکلتا ہے۔ اور ان کے اس پروپیگنڈا نے تمام قبائل عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف ایک خطرناک ہیجان پیدا کر دیا[1]

قریش نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ مکّہ کے اوباشوں اور خودسر لوگوں کو اکسایا کہ وہ جس طرح بھی ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرتے رہیں؛ چنانچہ اس انگیخت میں آکر شہر کے آوارہ مزاج لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپؐ کے سامنے بھی اور پیچھے بھی طرح طرح کی بکواس کرتے رہتے تھے جس کی غرض سوائے دل دُکھانے اور اشتعال پیدا کر کے فساد برپا کرنے کے اور کچھ نہ تھی۔ جو لوگ آپؐ کے پڑوس میں رہتے تھے ان کا یہ معمول تھا کہ آپؐ کے گھر میں پتھر پھینکتے۔ دروازے پر کانٹے بچھاتے۔ گھر کے اندر گندی اور بدبودار چیزیں لاکر ڈال دیتے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کی وجہ سے عملاً کوئی تکلیف پہنچتی تو وہ خوش ہو کر ہنستے اور قہقہے لگاتے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے ایک نہایت گندی اور متعفن چیز آپؐ کے گھر میں پھینک دی۔ آپؐ خود اُسے اُٹھا کر باہر لائے اور فرمایا ”اے بنوعبد مناف! یہ تم اچھا ہمسائیگی کا حق ادا کرتے ہو“ مگر جن کانوں تک یہ آواز پہنچتی وہ شرافت کی اپیل کے لیے بالکل بہرے تھے۔ انہی دنوں میں قریش نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بجائے محمدؐ کے مُذمَّم یعنی بدنام اور مذمّت شدہ کہہ کر پکارا جاوے؛ چنانچہ کچھ عرصہ تک مکّہ میں اس نام کا چرچا رہا اور قریش کو اتنی بھی شرم نہ آئی کہ یہ وہی شخص ہے جسے ہم اس کے دعویٰ سے پہلے امین کہہ کر پکارتے رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس فعل سے اطلاع ہوئی تو آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ میرا نام تو محمدؐ ہے اور جو محمدؐ ہو وہ مذمّم کیسے ہو سکتا ہے۔ دیکھو خُدا مجھے ان کی

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ۔ [2] تاریخ طبری

گالیوں سے کس طرح محفوظ رکھتا ہے[1]

مگر اس زمانہ میں بھی قریش کی ایذا رسانی صرف زبانی باتوں تک محدود نہ تھی بلکہ وہ بعض اوقات جوش میں آکر یا موقعہ نکال کر آپؐ کو عملی نقصان پہنچانے اور جسمانی تکلیف میں مبتلا کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ غالباً یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جب آپؐ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے عقبہ بن ابی معیط غصہ میں اُٹھا اور آپؐ کے گلے میں کپڑا ڈال کر اس زور سے ساتھ بھینچا کہ آپؐ کا دم رُکنے لگ گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کو علم ہوا تو وہ دوڑے آئے اور آپؐ کو اس بدبخت کے شر سے بچایا اور قریش سے مخاطب ہو کر کہا:

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ

"کیا تم ایک شخص کو صرف اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب خدا ہے۔"[2]

ایک اور موقعہ پر آپؐ نے صحنِ کعبہ میں توحید کا اعلان کیا تو قریش جوش میں آکر آپؐ کے اردگرد اکٹھے ہو گئے اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ آپؐ کے ربیب یعنی حضرت خدیجہؓ کے فرزند حارث بن ابی ہالہ کو اطلاع ہوئی تو وہ بھاگے آئے اور خطرہ کی صورت پا کر آپؐ کو قریش کی شرارت سے بچانا چاہا۔ مگر اس وقت بعض نوجوانانِ قریش کے اشتعال کی یہ کیفیت تھی کہ کسی بدباطن نے تلوار چلا کر حارث کو وہیں ڈھیر کر دیا۔[3] اور اس وقت کے شور و شغب میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تلوار چلانے والا کون تھا۔

ان مصائب پر مسلمانوں کو صبر کی تلقین

الغرض یہ وقت اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے سخت نازک وقت تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی کسی ذاتی تکلیف کی تو پرواہ نہیں تھی مگر مسلمانوں اور خصوصاً کمزور مسلمانوں کے مصائب کی وجہ سے آپؐ ضرور فکرمند تھے، مگر دوسری طرف آپؐ اس بات کو بھی خوب جانتے اور سمجھتے تھے کہ قومیں مصائب میں سے گذر کر ہی بنا کرتی ہیں۔ اس لیے آپؐ ایک جہت سے ان مصائب کو مسلمانوں کی تربیت کا بھی ذریعہ سمجھتے تھے اور اپنے صحابہ کو صبر و تحمل کی تعلیم دیتے اور گذشتہ انبیاء کے متبعین کی تکالیف کا ذکر کرکے ان کو بتاتے تھے کہ قدیم سے یہی سنت چلی آئی ہے کہ اللہ کے رسولوں اور اُن کے متبعین کو دُکھ دیئے جاتے ہیں، لیکن آخر کار مومنوں کی فتح ہوتی ہے۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے پاس ٹیک لگائے بیٹھے تھے خباب بن الارت اور بعض دوسرے صحابہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مسلمانوں کو قریش کے ہاتھ سے اتنی تکالیف پہنچ رہی ہیں

---

[1] بخاری باب ماجاء فی اسماء الرسول۔

[2] بخاری باب مالقی النبی صلعم۔ [3] اصابہ ذکر حارث۔

آپ ان کے لیے بددُعا کیوں نہیں کرتے؟" آپ یہ الفاظ سُنتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا:

"دیکھو تم سے پہلے وُہ لوگ گذرے ہیں جن کا گوشت لوہے کے کانٹوں سے نوچ نوچ کر ہڈیوں تک صاف کر دیا گیا مگر وہ اپنے دین سے متزلزل نہیں ہوتے۔ اور وُہ لوگ گذرے ہیں جن کے سروں پر آرے چلا کر ان کو دو ٹکڑے کر دیا گیا مگر ان کے قدموں میں لغزش نہیں آئی۔ دیکھو خدا اِس کام کو ضرور پُورا کرے گا۔ حتیٰ کہ ایک شتر سوار صنعا (شام) سے لے کر حضر موت تک کا سفر کرے گا۔ اور اس کو سوائے خدا کے اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ مگر تم تو جلدی کرتے ہو[1]"

ایک اور موقعہ پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مع چند دُوسرے اصحاب کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا" یا رسُول اللہ ہم مُشرک تھے تو ہم معزز تھے۔ اور کوئی ہماری طرف آنکھ تک نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ لیکن جب سے مسلمان ہوئے ہیں کمزور اور ناتواں ہو گئے ہیں اور ہم کو ذلیل ہو کر کفار کے مظالم سہنے پڑتے ہیں۔ پس یا رسُول اللہؐ! آپ ہم کو اجازت دیں کہ ہم ان کفار کا مقابلہ کریں" آپ نے فرمایا:

اِنِّی اُمِرْتُ بِالْعَفْوِ۔ فَلَا تُقَاتِلُوْا[2]

یعنی "مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو کا حکم ہے پس مَیں تم کو لڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا"

صحابہؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول کے سامنے سرِ تسلیم خم تھا۔ اُنھوں نے صبر اور برداشت کا وُہ نمونہ دکھایا کہ تاریخ اِس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔

---

[1] بخاری باب علامات نبوت و باب مالقی النبی صلعم و اصحابہ من المشرکین۔
[2] نسائی بحوالہ تلخیص الصحاح جلد ۱ صفحہ ۱۵۲۔

ایّامِ کش مکش

ہجرتِ حبشہ جب مُسلمانوں کی تکلیف انتہا کو پہنچ گئی اور قریش اپنی ایذا رسانی میں ترقی کرتے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُسلمانوں سے فرمایا کہ وُہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں اور فرمایا کہ "حبشہ کا بادشاہ عادل اور انصاف پسند ہے۔ اُس کی حکومت میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔" حبشہ کا مُلک جو انگریزی میں ایتھوپیا یا ابی سینیا کہلاتا ہے، برّاعظم افریقہ کے شمال مشرق میں واقع ہے اور جائے وقوع کے لحاظ سے جنوبی عرب کے بالکل مقابل پر ہے اور درمیان میں بحیرہ احمر کے سوا کوئی اور مُلک حائل نہیں۔ اس زمانہ میں حبشہ میں ایک مضبوط عیسائی حکومت قائم تھی اور وہاں کا بادشاہ نجاشی کہلاتا تھا۔ بلکہ اب تک بھی وہاں کا حکمران اسی نام سے پُکارا جاتا ہے۔ حبشہ کے ساتھ عرب کے تجارتی تعلقات تھے[۱] اور ان ایّام میں جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں حبشہ کا دارالسلطنت اکسوم (AXSUN) تھا جو موجودہ شہر عدوا (ADOWA) کے قریب واقع ہے اور اب تک ایک مقدس شہر کی صورت میں آباد چلا آتا ہے۔ اکسوم ان دنوں میں ایک بڑی طاقت ور حکومت کا مرکز تھا[۲] اور اس وقت کے نجاشی کا ذاتی نام اصحمہ تھا[۳]۔ جو ایک عادل بیدار مغز اور مضبوط بادشاہ تھا۔ بہر حال جب مُسلمانوں کی تکلیف انتہا کو پہنچ گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ جن جن سے ممکن ہو حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر ماہ رجب ۵ نبوی میں[۴] گیارہ مرد اور چار عورتوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ اُن میں سے زیادہ معروف کے نام یہ ہیں: حضرت عثمان بن عفان اور ان کی زوجہ رقیہ بنت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ زبیر ابن العوام۔ ابو حذیفہ بن عتبہ۔ عثمان بن مظعون۔ مصعب بن عمیر۔ ابو سلمہ بن عبدالاسد اور ان کی زوجہ اُمّ سلمہ[۵]

---

[۱] ابن ہشام و طبری ۔ [۲] طبری ۔ [۳] چیمبرس انسائیکلو پیڈیا ۔ [۴] بخاری بحوالہ زرقانی ۔
[۵] ابن سعد ۔ [۶] ابن ہشام ۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ ان ابتدائی مہاجرین میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو قریش کے طاقتور قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور کمزور لوگ کم نظر آتے ہیں جس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اول یہ کہ طاقتور قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی قریش کے مظالم سے محفوظ نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ کمزور لوگ مثلاً غلام وغیرہ اس وقت ایسی کمزوری اور بے بسی کی حالت میں تھے کہ ہجرت کی بھی طاقت نہ رکھتے تھے۔

جب یہ مہاجرین جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے شُعَیبَہ پہنچے جو اُس زمانہ میں عرب کا ایک بندرگاہ تھا تو اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ ان کو ایک تجارتی جہاز مل گیا جو حبشہ کی طرف روانہ ہونے کو بالکل تیار تھا؛ چنانچہ یہ سب امن سے اس میں سوار ہو گئے اور جہاز روانہ ہو گیا۔ قریش مکہ کو اُن کی ہجرت کا علم ہوا تو سخت برہم ہوئے کہ یہ شکار مفت میں ہاتھ سے نکل گیا۔ چنانچہ اُنھوں نے ان مہاجرین کا پیچھا کیا مگر جب ان کے آدمی ساحل پر پہنچے تو جہاز روانہ ہو چکا تھا، اس لیے خائب و خاسر واپس لوٹ آئے۔[1] حبشہ میں پہنچ کر مسلمانوں کو نہایت اَمن کی زندگی نصیب ہوئی اور خُدا خدا کر کے قریش کے مظالم سے چھٹکارا ملا۔

قریش کے اسلام کی جھوٹی افواہ اور بعض مہاجرین حبشہ کی واپسی

لیکن جیسا کہ بعض مؤرخین نے بیان کیا ہے ابھی ان مہاجرین کو حبشہ میں گئے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ایک اُڑتی ہوئی افواہ ان تک پہنچی کہ تمام قریش مسلمان ہو گئے ہیں اور مکہ میں اب بالکل اَمن و امان ہے۔ اس خبر کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر مہاجرین بلا سوچے سمجھے واپس آ گئے۔ جب یہ لوگ مکہ کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔ اب ان کے لیے بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ بالآخر بعض تو راستہ میں سے ہی واپس لوٹ گئے اور بعض چھُپ چھُپ کر یا کسی ذی اثر اور طاقتور شخص کی حمایت میں ہو کر مکہ میں آ گئے۔[2] یہ شوال ۵ نبوی کا واقعہ ہے۔[3] یعنی آغازِ ہجرت اور مہاجرین کی واپسی کے درمیان صرف ڈھائی تین ماہ کا فاصلہ تھا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں حبشہ کی ہجرت رجب کے مہینہ میں ہوئی تھی اور مہاجرین کی مزعومہ واپسی کی تاریخ شوال بیان کی گئی ہے۔

گو حقیقتہً یہ افواہ بالکل جھُوٹی اور بے بنیاد تھی جو مہاجرینِ حبشہ کو واپس لانے اور ان کو تکلیف میں ڈالنے کی غرض سے قریش نے مشہور کر دی ہوگی۔ بلکہ زیادہ غور سے دیکھا جاوے تو اس افواہ اور مہاجرین کی واپسی کا قصہ ہی بے بنیاد نظر آتا ہے لیکن اگر اسے صحیح سمجھا جاوے تو ممکن ہے کہ اس کی تہ میں وُہ واقعہ ہو جو بعض احادیث میں بیان ہوا ہے اور وُہ جیسا کہ بخاری میں آتا ہے۔ یہ ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحنِ کعبہ میں سورۃ نجم کی آیات تلاوت فرمائیں اس وقت وہاں کئی ایک رؤساءِ کفار بھی موجود

---

[1] ابن سعد و زرقانی ◊ [2] زرقانی ◊ [3] ابن سعد ◊

تھے۔ اور بعض مُسلمان بھی تھے۔ جب آپؐ نے سُورۃ ختم کی تو آپؐ نے سجدہ کیا اور آپؐ کے ساتھ ہی تمام مُسلمان اور کافر بھی سجدہ میں گر گئے[1]۔ کفار کے سجدہ کی وجہ حدیث میں بیان نہیں ہوئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت پُراثر آواز میں آیاتِ الہٰی کی تلاوت فرمائی اور وُہ آیات بھی ایسی تھیں جن میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی واحدانیت اور اس کی قدرت و جبروت کا نہایت فصیح و بلیغ رنگ میں نقشہ کھینچا گیا تھا اور اس کے احسانات یاد دلائے گئے تھے اور پھر ایک نہایت پُر رعب و پُر جلال کلام میں قریش کو ڈرایا گیا تھا کہ اگر وُہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو ان کا وہی حال ہوگا جو اُن سے پہلے اُن قوموں کا ہوا جنھوں نے خُدا کے رسُولوں کی تکذیب کی اور پھر آخر میں ان آیات میں حکم دیا گیا تھا کہ آؤ اور اللہ کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ[2] اور ان آیات کی تلاوت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان یکلخت سجدہ میں گر گئے تو اس کلام اور اس نظارہ کا ایسا ساحرانہ اثر قریش پر ہوا کہ وہ بھی بے اختیار ہوکر مُسلمانوں کے ساتھ سجدہ میں گر گئے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر ایسے حالات کے ماتحت جو اُوپر بیان ہوئے ہیں بسا اوقات انسان کا قلب مرعوب ہو جاتا ہے۔ اور وُہ بے اختیار ہوکر ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو دراصل اس کے اصول و مذہب کے خلاف ہوتی ہے؛ چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض اوقات ایک سخت اور ناگہانی آفت کے وقت ایک دہریہ بھی "اللہ اللہ" یا "رام رام" پکار اُٹھتا ہے اور قریش تو دہریہ نہ تھے بلکہ بہرحال خدا کی ہستی کے قائل تھے۔ پس جب اس پُر رعب و پُر جلال کلام کی تلاوت کے بعد مُسلمانوں کی جماعت یکلخت سجدہ میں گر گئی تو اس کا ایسا ساحرانہ اثر ہوا کہ ان کے ساتھ قریش بھی بے اختیار ہوکر سجدہ میں گر گئے۔ لیکن ایسا اثر عمُوماً وقتی ہوتا ہے اور انسان پھر جلد ہی اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے؛ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا اور سجدہ سے اُٹھ کر قریش پھر وہی بُت پرست کے بُت پرست تھے۔

بہرحال یہ ایک واقعہ ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ پس اگر مہاجرینِ حبشہ کی واپسی کی خبر دُرست ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد قریش نے جو مہاجرینِ حبشہ کے واپس لانے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے اپنے اس فعل کو آڑ بنا کر خود ہی یہ افواہ مشہور کر دی ہوگی کہ قریشِ مکہ مُسلمان ہوگئے ہیں اور یہ کہ اب مکہ میں مُسلمانوں کے لیے بالکل اَمن ہے اور جب یہ افواہ مہاجرین حبشہ تک پہنچی تو وُہ طبعاً اُسے سُن کر بہت خوش ہوتے اور سُنتے ہی خوشی کے جوش میں واپس آ گئے۔ لیکن جب وہ مکہ کے پاس پہنچے تو حقیقت امر سے آگاہی ہوئی جس پر بعض تو چھپ چھپ کر اور بعض کسی طاقتور اور صاحبِ اثر رئیس قریش کی حفاظت میں ہوکر مکہ میں آ گئے اور بعض واپس چلے گئے۔ پس اگر قریش کے مُسلمان ہو جانے

---

[1] بخاری تفسیر سورۃ نجم ؛ [2] دیکھئے سورۃ نجم : ۶۳

کی افواہ میں کوئی حقیقت تھی تو وہ صرف اسی قدر تھی جو سورۃ نجم کی تلاوت پر سجدہ کرنے والے واقعہ میں بیان ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

بہرحال اگر مہاجرین حبشہ واپس آئے بھی تھے تو اُن میں سے اکثر پھر واپس چلے گئے۔ اور چونکہ قریش دن بدن اپنی ایذا رسانی میں ترقی کرتے جاتے تھے اور ان کے مظالم روز بروز بڑھ رہے تھے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر دُوسرے مسلمانوں نے بھی خفیہ خفیہ ہجرت کی تیاری شروع کر دی اور موقعہ پاکر آہستہ آہستہ نکلتے گئے۔ یہ ہجرت کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ بالآخر ان مہاجرین حبشہ کی تعداد ایک سو ایک تک پہنچ گئی جن میں اٹھارہ عورتیں بھی تھیں[1] اور مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت ہی تھوڑے مسلمان رہ گئے۔ اس ہجرت کو بعض مؤرخین ہجرت حبشہ ثانیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ایک جھوٹا واقعہ

ہجرت حبشہ کے تعلق میں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ کفار قریش کے سجدہ کرنے اور مہاجرین حبشہ کے واپس چلے آنے کے متعلق بعض مؤرخین ایک عجیب قصہ نقل کرتے ہیں جو یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا از حد شوق رہتا تھا کہ اللہ کی طرف سے کوئی ایسی بات نازل ہو جو قریش کو اسلام کی طرف کھینچنے والی اور ان کی منافرت کو دُور کرنے والی ہو۔ لہٰذا جب آپؐ سورۃ نجم کی آیات تلاوت فرماتے ہوئے ان آیات پر پہنچے کہ:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ [2]

"یعنی کیا تم نے مشرکین کے بُتوں لات اور عزیٰ اور منات کی طرف دیکھا ہے؟"

تو شیطان نے آپؐ کے اس شوق سے فائدہ اُٹھایا اور آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ جاری کر دیئے کہ:

تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى ۝

"یعنی لات اور عزیٰ اور منات بڑے جلیل القدر بُت ہیں اور ان کی شفاعت کی اُمید رکھنی چاہیے۔"

جب قریش نے یہ الفاظ سُنے تو وہ خاموش ہو گئے کہ ان کے بُتوں کی عظمت اور قوت کو مان لیا گیا ہے۔ لہٰذا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ نے سُورۃ نجم ختم کرنے پر سجدہ کیا تو قریش نے بھی آپؐ کے ساتھ سجدہ کیا اور اس طرح گویا صلح صفائی ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد جلد ہی جبرائیل آپؐ کے پاس آئے اور آپؐ کو اس غلطی سے آگاہ کیا۔ اور شیطان کی القاء کردہ آیت کی جگہ وہ الٰہی کلام آپؐ پر وحی کیا جو اب قرآن شریف میں موجود ہے اور اس طرح قریش پھر ناراض ہو گئے۔ لیکن چونکہ قریش کے ساتھ صلح صفائی ہو جانے کی خبر شائع ہو چکی تھی اس لیے پیشتر اس کے کہ اس کی تردید ہوتی وہ حبشہ بھی پہنچ گئی اور

---

[1] زرقانی
[2] سورۃ النجم: ۲۰، ۲۱

اس طرح بعض مہاجرین واپس آگئے۔

یہ وُہ قصّہ ہے جو اس موقعہ پر بعض مؤرخین لکھتے ہیں۔لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ قصّہ سراسر جھوٹ ہے اور ہر معقول رنگ میں اس کا جھوٹا ہونا ثابت ہے؛ چنانچہ کبار محدثین اور ائمہ حدیث مثلاً علامہ عینی۔ قاضی عیاض اور علامہ نووی نے کھول کھول کر اور دلائل دے دے کر اس کو غلط اور موضوع ثابت کیا ہے۔ چنانچہ علامہ عینی اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لَا صِحَّۃَ لَـہٗ نَقْلاً وَّلَا عَقْلاً [1]

یعنی "نقل اور عقل دونوں سے یہ قصّہ غلط ثابت ہوتا ہے۔"

اور قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ:

لَمْ یُخْرِجْہُ اَھْلُ الصِّحَّۃِ وَلَا رَوَاہُ ثِقَۃٌ بِسَنَدٍ سَلِیْمٍ مَعَ ضُعْفِ نَقَلَتِہٖ وَاضْطِرَابِ رِوَایَاتِہٖ وَانْقِطَاعِ اَسَانِیْدِہٖ وَاَکْثَرُ الطُّرُقِ فِیْھَا ضَعِیْفَۃٌ وَاھِیَۃٌ لَمْ یُسْنِدْھَا اَحَدٌ مِنْھُمْ وَلَا رَفَعَھَا اِلٰی صَاحِبٍ [2]

یعنی "محتاط اور ثقہ لوگوں نے اس کی روایت نہیں کی،کیونکہ اس قصّہ میں روایت کا اضطراب اور سند کی کمزوری بہت پائی جاتی ہے۔اور اس کے طریقے بہت کمزور اور بودے ہیں۔اور کسی راوی نے اس کی سند کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یا آپؐ کے کسی صحابی تک نہیں پہنچایا۔"

اور علامہ نووی لکھتے ہیں:

لَا یَصِحُّ فِیْہِ شَیْءٌ لَا مِنْ جِھَۃِ النَّقْلِ وَلَا مِنْ جِھَۃِ الْعَقْلِ [3]

یعنی "اس قصّہ میں کوئی بات بھی دُرست نہیں نہ نقل کے طریق پر اور نہ عقل کے طریق پر۔"

دُوسری طرف اکثر ائمۃ الحدیث نے اس قصّہ کا ذکر تک نہیں کیا۔مثلاً صحاح ستّہ میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں؛ حالانکہ صحاح ستہ میں سورۃ نجم کی تلاوت اور قریش کے سجدہ کا ذکر موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان محدثین کے سامنے یہ روایت آئی۔لیکن اُنھوں نے اسے غلط اور ناقابلِ اعتبار سمجھ کر ردّ کر دیا۔ اسی طرح کبار مفسرین مثلاً امام رازی نے اس قصّہ کو لغو اور جھوٹا قرار دیا ہے[4] اور صوفیاء میں سے ابن عربی جیسے باریک بین انسان نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ: "لَا اَصْلَ لَھَا" یعنی اس قصّہ میں کچھ بھی حقیقت نہیں ہے[5]۔ ویسے بھی اگر صرف سورۃ نجم کی آیات پڑھی جو شروع سے لیکر آخر تک شرک کے خلاف بھری

---

[1] عینی شرح بخاری ٭ [2] شفا قاضی عیاض بحوالہ زرقانی ٭ [3] نووی شرح مسلم ٭
[4] تفسیر کبیر باب سورۃ نجم ۶۳۱ ٭ [5] زرقانی ٭

پڑی ہیں۔ نظر ڈالی جاوے تو اُسی سے اس کا بطلان ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ہرگز خیال نہیں کیا جاسکتا کہ اس قسم کے مواحدانہ کلام میں جس میں توحیدِ باری تعالیٰ پر اس قدر زور دیا گیا ہے ایک صریح طور پر مشرکانہ فقرہ داخل کیا جاسکتا تھا۔ اور ایک ہی وقت میں ایک ہی زبان پر یہ دو انتہائی طور پر متضاد باتیں جاری ہو سکتی تھیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی کے لحاظ سے بھی عقلِ انسانی اس قصہ کو دُور سے دھکے دیتی ہے۔ بھلا جس شخص نے اپنی بعثت سے پہلے بھی ساری عمر بُت پرستی نہ کی ہو حالانکہ اس کی ساری قوم بُت پرست ہو۔ تو کیا عقل اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ اس وقت جبکہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کا صریح حکم آگیا ہو کہ بُت پرستی کے خلاف آواز اُٹھا اور صرف خدائے واحد کی پرستش کا لوگوں کو حکم دے اور اس کے مذہب کا بنیادی پتھر ہی توحیدِ باری تعالیٰ ہو جس کی وجہ سے وہ دن رات لوگوں کے ساتھ جھگڑتا ہو تو کیا اس وقت وہ قریش کو خوش کرنے کے لیے بُت پرستی کی طرف جُھک جائے گا؟ آخر عقل بھی کوئی چیز ہے؟ ذرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالو۔ کیا کبھی آپؐ نے کفار کو خوش کرنے کی غرض سے اپنے مذہب کے کسی اصول کو چھوڑا؟ کیا کبھی آپؐ نے کفار کو اپنے ساتھ ملانے کی غرض سے مداہنت اختیار کی؟ قرآن تو صریح کہتا ہے:۔

وَدُّوْا لَوْتُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ[1]

یعنی "کفار کو ہمیشہ یہ حسرت ہی رہی کہ تو مداہنت کرکے انکی ہاں میں ہاں ملادے تو وہ بھی مداہنت اختیار کریں۔ اور اس طرح ظاہری صورت میں ملاپ کی ہو جاوے"

کیا ایسے شخص کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس نے کبھی قریش کی خاطر توحید کو چھوڑ کر شرک اختیار کیا ہوگا؟

البتہ ایک توجیہہ اس قصہ کی ممکن ہے اور جیسا کہ علامہ قسطلانی اور زرقانی نے لکھا ہے اور بہت سے محققین نے اس کی تائید کی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ توجیہہ درست ہو اور وہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بخاری کی روایت کے مطابق صحنِ کعبہ میں سورۃ نجم کی آیات تلاوت فرمائی ہوں تو ممکن ہے کہ شیاطینِ قریش میں سے کسی نے آپؐ کی آواز میں آواز ملا کر تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى کا فقرہ ملا دیا ہو جس کی وجہ سے اس وقت بعض لوگوں میں اشتباہ واقع ہوگیا ہو کہ شاید یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہے ہیں۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت کے وقت قریش کی یہ عام عادت تھی کہ وہ اس کے اثر کو مٹانے کے لیے شور کیا کرتے تھے جیسا کہ قرآن شریف میں بھی ان کے یہ الفاظ آتے ہیں کہ:

---

[1] سورۃ القلم: ۱۰

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ [۱]

یعنی "قریش کہا کرتے تھے کہ" جب تمہارے سامنے قرآن پڑھا جاوے تو اُس میں شور کر کے گڑبڑ پیدا کر دیا کرو۔ شاید اسی طرح تم غالب آسکو"

اِس توجیہہ کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں قریش کی یہ عادت تھی کہ وہ کعبہ کا طواف کرتے ہوتے یہی فقرہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى والا پڑھا کرتے تھے [۲] پس تعجب نہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم کی آیات تلاوت فرمائی ہوں تو اُن میں سے کسی نے حسب عادت یہاں بھی اس فقرہ کو داخل کر دیا ہو۔ اور اس طرح بعض لوگوں کو عارضی طور پر یہ اشتباہ واقع ہو گیا ہو کہ شاید یہ الفاظ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے نکلے ہیں۔ اس توجیہہ کی تائید ابن عربی۔ قاضی عیاض۔ ابن جریر۔ امام رازی اور حافظ ابن حجر نے بھی کی ہے [۳] لیکن ایک اور بات ہے جو اس افواہ اور مہاجرین کی واپسی کے قصہ کو سِرے سے ہی مشتبہ کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ کہ تاریخ میں ہجرت حبشہ کے آغاز کی تاریخ رجب ۵ نبوی اور سجدہ کی تاریخ رمضان ۵ نبوی بیان ہوئی ہے اور پھر تاریخ میں ہی یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس افواہ کے نتیجہ میں مہاجرین حبشہ کی واپسی شوال ۵ نبوی میں ہوئی تھی [۴] گویا آغاز ہجرت اور واپسی مہاجرین کے زمانوں میں صرف دو سے لے کر تین ماہ کا فاصلہ تھا۔ اور اگر سجدہ کی تاریخ سے زمانہ کا شمار کریں تو یہ عرصہ صرف ایک ہی ماہ کا بنتا ہے۔ اب اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ مکہ اور حبشہ کے درمیان اس قلیل عرصہ میں تین سفر مکمل ہو سکے ہوں۔ یعنی سب سے پہلے مُسلمان مکہ سے حبشہ پہنچے۔ اس کے بعد کوئی شخص قریش کے اسلام کی خبر لے کر مکہ سے حبشہ گیا اور پھر مسلمان حبشہ سے روانہ ہو کر مکہ میں واپس آتے۔ ان تین سفروں کی تکمیل قطع نظر اس عرصہ کے جو زائد امور میں صرف ہو جاتا ہے اس قلیل عرصہ میں قطعاً ناممکن تھی۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ بات ناممکن تھی کہ سجدہ کے زمانہ سے لیکر مہاجرین حبشہ کی مذعومہ واپسی تک دو سفر مکمل ہو سکے ہوں کیونکہ اس زمانہ میں مکہ سے حبشہ جانے کے لیے پہلے جنوب میں آنا پڑتا تھا اور پھر وہاں سے کشتی لے کر جو ہر وقت موجود نہیں ملتی تھی بحر احمر کو عبور کر کے افریقہ کے ساحل تک جانا ہوتا تھا۔ اور پھر ساحل سے لیکر حبشہ کے دارالسلطنت اکسوم تک جو ساحل سے کافی فاصلہ پر ہے پہنچنا پڑتا تھا۔ اور اس زمانہ کے آہستہ سفروں کے لحاظ سے اِس قسم کا ایک سفر بھی ڈیڑھ دو ماہ سے کم عرصہ میں ہرگز مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اِس جہت سے گویا یہ قصہ سرے سے ہی غلط اور بے بنیاد قرار پاتا ہے۔ لیکن اگر بالفرض اِس میں کوئی حقیقت تھی بھی تو وہ یقیناً اس سے زیادہ نہیں تھی جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ واللہ اعلم ؏

---

[۱] سورۃ حٰم سجدہ : ۲۷ ؏ [۲] معجم البلدان جلد ۶ زیر بحث عزّیٰ ؏ [۳] زرقانی جلد ۱ باب دخول الشعب ؏

[۴] ابن سعد حالات واپسی مہاجرین حبشہ ؏

نجاشی کے دربار میں قریش کا ناکام وفد

بہر حال قریش نے جب مسلمانوں کو اس طرح اپنے ہاتھوں سے صحیح سلامت نکلے جاتے دیکھا اور حبشہ میں ان کو امن وامان کی زندگی بسر کرتے پایا تو ان کے غضب کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ اور بالآخر انھوں نے اپنے دو ممتاز ممبر یعنی ایک عمروؓ ابن العاص اور دوسرے عبداللہ بن ربیعہ کو حبشہ کی طرف روانہ کرنے کی تجویز کی اور اس وفد کے ساتھ نہ صرف نجاشی کے واسطے گراں قیمت تحفے تیار کئے بلکہ اس کے تمام درباریوں کے واسطے بھی تحائف تیار کئے گئے جو زیادہ تر چمڑے کے سامان کے تھے جس کیلئے ان دنوں میں عرب خاص شہرت رکھتا تھا۔ اور اس طرح بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ یہ وفد روانہ ہوا۔ اس وفد کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کو حبشہ سے واپس لاکر پھر ان کو اپنے مظالم کا تختہ مشق بنائیں؛ چنانچہ حبشہ میں پہنچ کر عمروؓ بن العاص اور ان کے ساتھی نے پہلے نجاشی کے درباریوں کے ساتھ ملاقات کی اور اُن کے سامنے تحائف پیش کئے اور پھر ان کے ذریعہ سے نجاشی کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ اور تحفے تحائف پیش کرنے کے بعد نجاشی سے ان الفاظ میں درخواست کی کہ "اے بادشاہ سلامت ہمارے چند بیوقوف لوگوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا ہے اور ایک نیا دین نکالا ہے جو آپ کے دین کے بھی مخالف ہے اور ان لوگوں نے ملک میں فساد ڈال دیا ہے اور اب ان میں سے بعض لوگ وہاں سے بھاگ کر یہاں آگئے ہیں پس ہماری یہ درخواست ہے کہ آپ ان کو ہمارے ساتھ واپس بھجوا دیں" درباریوں نے ان کی تائید کی لیکن نجاشی نے جو ایک بیدار مغز حکمران تھا یکطرفہ فیصلہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "یہ لوگ میری پناہ میں آئے ہیں پس جبتک میں خود ان کا اپنا بیان نہ سُن لوں میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔ چنانچہ مسلمان مہاجرین دربار میں بلائے گئے اور اُن سے مخاطب ہو کر نجاشی نے پُوچھا کہ "یہ کیا معاملہ ہے اور یہ کیا دین ہے جو تم نے نکالا ہے؟" حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے مسلمانوں کی طرف سے جواب دیا کہ "اے بادشاہ! ہم جاہل لوگ تھے۔ بُت پرستی کرتے تھے۔ مُردار کھاتے تھے۔ بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ قطع رحمی کرتے تھے۔ ہمسایوں سے بدمعاملگی کرتے تھے اور ہم میں سے مضبوط کمزور کا حق دبا لیتا تھا۔ اس حالت میں اللہ نے ہم میں اپنا ایک رسول بھیجا جس کی نجابت اور صدق اور امانت کو ہم سب جانتے تھے۔ اُس نے ہم کو توحید سکھائی اور بُت پرستی سے روکا اور راست گفتاری اور امانت اور صلہ رحمی کا حکم دیا۔ اور ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تعلیم دی اور بدکاری اور جھوٹ اور یتیموں کا مال کھانے سے منع کیا اور خونریزی سے روکا۔ اور ہم کو عبادتِ الٰہی کا حکم دیا۔ ہم اس پر ایمان لائے اور اس کی اتباع کی۔ لیکن اس وجہ سے ہماری قوم ہم سے ناراض ہوگئی اور اُس نے ہم کو دکھوں اور مصیبتوں میں ڈالا اور ہم کو طرح طرح کے عذاب دیئے اور ہم کو اس دین سے جبراً روکنا چاہا۔ حتّٰی کہ ہم تنگ آکر اپنے وطن سے نکل آئے اور آپ کے ملک میں آکر پناہ لی۔ پس اے بادشاہ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ کے

ماتحت ہم پر ظلم نہ ہوگا۔" نجاشی اس تقریر سے بہت متاثر ہوا اور حضرت جعفر سے کہنے لگا کہ "جو کلام تم پر اُترا ہے وُہ مجھے سُناؤ۔" اس پر حضرت جعفر نے بڑی خوش الحانی کے ساتھ سورۃ مریم کی ابتدائی آیات پڑھ کر سُنائیں۔ یہ آیات سُن کر نجاشی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور اس نے رقت کے لہجہ میں کہا، "خُدا کی قسم یہ کلام اور ہمارے مسیح کا کلام ایک ہی منبع نُور کی کرنیں معلوم ہوتی ہیں۔" یہ کہہ کر نجاشی نے قریش کے وفد سے کہا "تم واپس چلے جاؤ۔ مَیں ان لوگوں کو تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔" اور نجاشی نے ان کے تحفے بھی واپس کر دیئے۔

لیکن قریش کے خونی سفیر اس طرح آسانی کے ساتھ خاموش نہیں کئے جا سکتے تھے۔ دوسرے دن عمرو بن العاص نے دربار میں پھر رسائی حاصل کی اور نجاشی سے عرض کیا کہ "حضور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ مسیح کے متعلق کیا کہتے ہیں؟" نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بُلا بھیجا۔ مسلمان فکرمند ہوئے کہ چونکہ ہم مسیح کے ابن اللہ ہونے کے مُنکر ہیں اس لئے کہیں عمرو بن العاص کی یہ چال چل نہ جاوے۔ مگر یہ لوگ تلوار کے سایہ کے نیچے بھی حق بات کہنے سے رکنے والے نہ تھے؛ چنانچہ جب نجاشی نے پوچھا کہ "تم مسیح کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟" تو جعفر نے صاف عرض کیا کہ "اے بادشاہ! ہمارے اعتقاد کی رُو سے مسیح اللہ کا ایک بندہ ہے خدا نہیں ہے مگر وہ اس کا ایک بہت مقرب رُسول ہے اور اس کے اُس کلام سے عالم ہستی میں آیا ہے جو اُس نے مریم پر ڈالا۔" نجاشی نے فرش پر سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا "واللہ جو تم نے بیان کیا ہے مَیں اس سے مسیح کو اس تنکے کے برابر بھی بڑا نہیں سمجھتا۔" نجاشی کے اس کلام پر دربار کے پادری سخت برہم ہوئے مگر نجاشی نے ان کی کچھ پروانہ کی اور قریش کا وفد بے نیلِ مرام واپس آگیا۔

اس کے بعد مہاجرین حبشہ ایک عرصہ تک بڑے امن کے ساتھ حبشہ میں رہے لیکن اُن میں سے اکثر تو ہجرتِ یثرب سے قریب مکہ میں واپس آگئے اور بعض حبشہ میں ہی مقیم رہے حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے اور جنگِ بدر اور اُحد اور احزاب تمام ہو چکیں تب یہ لوگ عرب میں واپس آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگِ خیبر سے واپس آرہے تھے۔

ابتداء میں جبکہ ابھی اکثر مہاجرین حبشہ میں ہی تھے نجاشی کو اپنے ایک حریف سے جنگ پیش آگئی اس پر صحابہ نے باہم مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ضرورت پیش آئے تو ہمیں بھی نجاشی کی امداد کرنی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے زبیر ابن العوام کو دریائے نیل کے پار میدانِ جنگ میں بھیجا کہ حالات سے اطلاع دیں۔ اور پیچھے صحابہ خُدا سے دُعائیں کرتے رہے کہ نجاشی کی فتح ہو۔ چنانچہ چند دن کے بعد حضرت زبیر نے واپس آکر اطلاع دی کہ نجاشی نے خدا کے فضل سے فتح پائی ہے۔[1]

---

[1] ان جملہ حالات کے لیے دیکھو ابن ہشام و زرقانی و طبری و ابن سعد و بخاری۔

حضرت ابوبکرؓ کا ہجرت کے ارادے سے نکلنا

حدیث میں حضرت عائشہؓ سے روایت آتی ہے کہ جب مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تو ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ بھی ہجرت کے ارادہ سے مکہ سے نکلے مگر جب جنوب کی طرف جاتے ہوئے برک الغماد میں پہنچے تو وہاں اتفاقاً قبیلہ قارہ کے رئیس ابن الدغنہ سے ملاقات ہوگئی۔ ابن الدغنہ نے اس سفر کا سبب پوچھا تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، اس لیے میں نے اب ارادہ کیا ہے کہ اللہ کی زمین میں کہیں نکل جاؤں اور آزاد ہو کر اپنے رب کی عبادت کروں۔" ابن الدغنہ نے کہا "تمہارے جیسے شخص کو تو نہ خود مکہ سے نکلنا چاہیئے اور نہ لوگوں کو چاہیئے کہ اسے نکالیں..... آؤ میں تمہیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ واپس لوٹ چلو۔ اور مکہ میں ہی اپنے رب کی عبادت کرو۔" چنانچہ ابوبکرؓ ان کے کہنے پر واپس چلے آئے۔ مکہ پہنچ کر ابن الدغنہ نے رؤسا قریش کو ملامت کی اور کہا کہ کیا تم ایسی ایسی نیک صفات والے شخص کو نکالتے ہو؟ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنے گھر کے صحن میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی جس میں وہ نماز اور قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ اور چونکہ وہ نہایت رقیق القلب تھے۔ اس لیے جب وہ قرآن شریف پڑھتے تو بسا اوقات ساتھ ساتھ روتے بھی جاتے۔ قریش کی عورتیں اور بچے جو نسبتاً سادہ طبع اور تعصبات مذہبی سے آزاد تھے یہ نظارہ دیکھتے تو ان کے قلوب پر اس کا ایک خاص اثر ہوتا اور چونکہ ویسے بھی حضرت ابوبکرؓ قریش میں بہت معزز تھے اس لیے ان کی یہ والہانہ عبادت لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرتی تھی۔ اس پر قریش نے ابن الدغنہ کے پاس شکایت کی کہ ابوبکرؓ اونچی آواز سے قرآن پڑھتا ہے اور اس سے ہماری عورتیں اور بچے اور کمزور لوگ فتنہ میں پڑتے ہیں۔ لہٰذا تم اسے روک دو۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ کو روکنا چاہا۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ "میں یہ کام ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاں اگر تمھیں کوئی ڈر ہے تو میں تمہاری پناہ سے نکلتا ہوں مجھے اپنے مولیٰ کی پناہ بس ہے"[1] اس کے بعد قریش نے حضرت ابوبکرؓ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں مگر وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔

اسلام حمزہؓ

ہجرت حبشہ کے متعلق سلسلہ واقعات کو ایک جگہ بیان کرنے کی وجہ سے ہم نے بعض درمیانی واقعات کا ذکر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب بیان کرتے ہیں۔ ابتک مسلمانوں کی ظاہری حالت نہایت کمزور تھی۔ کیونکہ مسلمان ہونے والوں میں سے سوائے حضرت ابوبکرؓ کے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو قریش میں کوئی اثر رکھتا ہو یا کم از کم جس سے قریش کچھ دبتے ہوں مگر اب خدا کے فضل سے دو ایسے شخص اسلام میں داخل ہوتے جو اپنی وجاہت اور رعب

---

[1] بخاری ابواب الہجرت۔

کی وجہ سے اسلام کی ظاہری شان کو ایک حد تک مضبوط کرنے والے ثابت ہوئے۔ ہماری مراد حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت عمرؓ بن الخطاب سے ہے جو دونوں ایک دُوسرے کے آگے پیچھے ۶ سنہ نبوی میں مسلمان ہوئے۔

حمزہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا تھے اور اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت تھی، لیکن ابھی تک مشرک تھے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ ہر روز صبح سویرے تیر کمان لے کر باہر نکل جاتے تھے اور سارا دن شکار کھیلتے رہتے تھے۔ شام کو واپس آکر پہلے خانہ کعبہ کا طواف کرتے اور پھر قریش کی ان مجلسوں میں دورہ لگاتے جو وہ صحنِ کعبہ میں دُو دُو چار چار کی ٹولیوں میں جما کر بیٹھا کرتے تھے اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد گھر جاتے تھے۔ ایک دن حمزہ اسی طرح شکار سے واپس آئے تو ایک خادمہ نے اُن سے کہا "کیا آپ نے سُنا کہ ابھی ابھی ابوالحکم (یعنی ابوجہل) آپ کے بھتیجے کو سخت بُرا بھلا کہتا گیا ہے اور بہت گندی گندی گالیاں دی ہیں مگر محمدؐ نے سامنے سے کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ سُن کر حمزہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور خاندانی غیرت جوش زن ہوئی۔ فوراً کعبہ کی طرف گئے اور پہلے طواف کیا۔ طواف کرنے کے بعد اس مجلس کی طرف بڑھے جس میں ابوجہل بیٹھا تھا اور جاتے ہی بڑے زور کے ساتھ ابوجہل کے سر پر اپنی کمان ماری اور کہا "میں سُنتا ہوں کہ تُو نے محمدؐ کو گالیاں دی ہیں۔ سُن میں بھی محمدؐ کے دین پر ہُوں اور میں بھی وہی کہتا ہوں جو وُہ کہتا ہے۔ پس اگر تجھ میں کچھ ہمت ہے تو میرے سامنے بول"۔ ابوجہل کے ساتھی ابوجہل کی حمایت میں اُٹھے اور قریب تھا کہ لڑائی ہو جاتی مگر ابوجہل حمزہ کی دلیری اور جرأت کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور اُس نے اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر روک دیا کہ حمزہ حق بجانب ہے واقعی مجھ سے زیادتی ہوگئی تھی اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا۔[1]

حمزہ جوش میں یہ الفاظ "کہہ بیٹھے تھے کہ "میں بھی محمدؐ کے دین پر ہوں" لیکن جب گھر آئے اور غصہ کم ہوا تو کچھ گھبرائے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے آخر دل نے یہی فیصلہ کیا کہ اب شرک چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئے[2] یہ بعثت نبوی کے چھٹے سال کا واقعہ ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دارارقم میں ہی مقیم تھے[3] حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے کی خوشی میں یا دیسے ہی اپنے اخلاص کے جوش میں مگر بہر حال اُسی دن جس دن حمزہ مسلمان ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے صحنِ کعبہ میں برملا توحید کا اعلان کیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض دُوسرے مسلمان بھی وہاں موجود تھے۔ قریش نے حضرت ابوبکرؓ کی اس جسارت کو دیکھا تو جوش میں آکر اُن پر ٹوٹ پڑے اور اس بے دردی سے مارا کہ لکھا ہے کہ جب اُن کے قبیلہ کے لوگ انہیں اُٹھا

---

[1] طبری و ابن ہشام ؛ [2] الروض الانف سہیلی ؛ [3] زرقانی ؛

کراُن کے گھر سے گئے تو وہ بالکل بے ہوش تھے اور ضربات کی وجہ سے انکا ناک مُنہ ایک ہو رہا تھا۔ جب انہیں ہوش آیا تو ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے اور جبتک آپؐ کی خیریت کی خبر نہیں سُنی حضرت ابوبکرؓ کو چین نہیں آیا۔[۱]

اسلام عمرؓ

ابھی حضرت حمزہؓ کو اسلام لائے صرف چند دن ہی گذرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک اَور خوشی کا موقعہ دکھایا یعنی حضرت عمرؓ جو ابھی تک اشد مخالفین میں سے تھے مُسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے کا قصّہ نہایت دلچسپ ہے۔ حضرت عمرؓ کی طبیعت میں سختی کا مادہ تو زیادہ تھا ہی مگر اسلام کی عداوت نے اُسے اور بھی زیادہ کر دیا تھا، چنانچہ اسلام سے قبل عمرؓ غریب اور کمزور مُسلمانوں کو ان کے اسلام کی وجہ سے بہت سخت تکلیف دیا کرتے تھے لیکن جب وُہ انہیں تکلیف دیتے دیتے تھک گئے اور اُن کے واپس آنے کی کوئی صورت نہ دیکھی تو خیال آیا کہ کیوں نہ اِس "فتنہ" کے بانی کا ہی کام تمام کر دیا جاوے۔ یہ خیال آنا تھا کہ تلوار لے کر گھر سے نکلے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش شروع کی۔ راستہ میں ایک شخص نے انہیں ننگی تلوار ہاتھ میں لیے جاتے دیکھا تو پُوچھا "عُمر! کہاں جاتے ہو؟" عمر نے جواب دیا "محمدؐ کا کام تمام کرنے جاتا ہُوں" اُس نے کہا "کیا تم محمدؐ کو قتل کر کے بنو عبد مناف سے محفوظ رہ سکو گے؟ ذرا پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی مُسلمان ہو چکے ہیں" حضرت عمرؓ جھٹ پلٹے اور اپنی بہن فاطمہ کے گھر کا راستہ لیا۔ جب گھر کے قریب پہنچے تو اندر سے قرآن شریف کی تلاوت کی آواز آئی۔ جو خباب بن الارت خوش الحانی کے ساتھ پڑھ کر سُنا رہے تھے۔ عمر نے یہ آواز سُنی تو غصّہ اور بھی بڑھ گیا۔ جلدی سے گھر میں داخل ہوئے لیکن ان کی آہٹ سنتے ہی خباب تو جھٹ کہیں چُھپ گئے اور فاطمہ نے قرآن شریف کے اوراق بھی اِدھر اُدھر چُھپا دیئے۔[۲] حضرت عمرؓ اندر آئے تو للکار کر کہا "میں نے سُنا ہے تم اپنے دین سے پھر گئے ہو" یہ کہکر اپنے بہنوئی سعید بن زید سے لپٹ گئے۔ فاطمہ اپنے خاوند کو بچانے کے لیے آگے بڑھیں تو وہ بھی زخمی ہوئیں مگر فاطمہ نے دلیری کے ساتھ کہا "ہاں عمر! ہم مُسلمان ہو چکے ہیں اور تم سے جو ہو سکتا ہے کر لو ہم اسلام کو نہیں چھوڑ سکتے۔" حضرت عمرؓ نہایت سخت آدمی تھے لیکن اس سختی کے پَردہ کے نیچے محبت اور نرمی کی بھی ایک جھلک تھی جو بعض اوقات اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ بہن کا یہ دلیرانہ کلام سُنا تو آنکھ اُوپر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا وُہ خُون میں تربہ تر تھی۔ اس نظّارہ کا عمرؓ کے قلب پر ایک خاص اثر ہوا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بہن سے کہنے لگے "مجھے وُہ کلام تو دکھاؤ جو تم پڑھ رہے تھے؟" فاطمہ نے کہا "مَیں نہیں دکھاؤں گی کیونکہ تم ان اوراق کو ضائع کر دو گے" عمرؓ نے جواب دیا "نہیں نہیں تم مجھے دکھا دو۔ میں ضرور واپس کر دوں گا۔"

---

[۱] خمیس جلد ۱ صفحہ ۲۳۲ ☆ [۲] یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اس سے پتہ لگتا ہے کہ ابتدائے زمانہ سے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کو ساتھ ساتھ لکھواتے جاتے تھے اور یہ نسخے متعدد صحابہ کے پاس محفوظ رہتے تھے۔ منہ

فاطمہ نے کہا" مگر تم نجس ہو اور قرآن کو پاکیزگی کی حالت میں ہاتھ لگانا چاہیئے پس تم پہلے غسل کرو اور پھر دیکھنا" غالباً ان کا منشا یہ بھی ہو گا کہ غسل کرنے سے عمر کا غصہ بالکل فرو ہو جائے گا اور وہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔ جب عمر غسل سے فارغ ہوتے تو فاطمہ نے قرآن کے اوراق نکال کران کے سامنے رکھ دیئے۔ اُنھوں نے اُٹھا کر دیکھا تو سورۃ طٰہٰ کی ابتدائی آیات تھیں حضرت عمرؓ نے ایک مرعوب دل کے ساتھ انہیں پڑھنا شروع کیا اور ایک ایک لفظ اس سعید فطرت کے اندر گھر کئے جاتا تھا۔ پڑھتے پڑھتے حضرت عمرؓ اس آیت پر پہنچے کہ:

إِنَّنِيٓ أَنَا ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعۡبُدۡنِي وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكۡرِيٓ ۝
إِنَّ ٱلسَّاعَةَ ءَاتِيَةٌ أَكَادُ أُخۡفِيهَا لِتُجۡزَىٰ كُلُّ نَفۡسِۭ بِمَا تَسۡعَىٰ ۝[1]

یعنی میں ہی اس دُنیا کا واحد خالق و مالک ہُوں میرے سوا اور کوئی قابل پرستش نہیں۔ پس تمہیں چاہیئے کہ صرف میری ہی عبادت کرو اور میری ہی یاد کے لیے اپنی دعاؤں کو وقف کر دو۔ دیکھو موعود گھڑی جلد آنے والی ہے مگر ہم اس کے وقت کو مخفی رکھے ہوتے ہیں تاکہ ہر شخص اپنے کئے کا سچا سچا بدلہ پا سکے۔"

جب حضرت عمرؓ نے یہ آیت پڑھی تو گویا ان کی آنکھ کھل گئی اور سوئی ہوئی فطرت چونک کر بیدار ہوگئی بے اختیار ہو کر بولے" یہ کیسا عجیب اور پاک کلام ہے"!

خباب نے یہ الفاظ سُنے تو فوراً باہر نکل آئے اور خدا کا شکر ادا کیا اور کہا" یہ رسُول اللہ کی دُعا کا نتیجہ ہے کیونکہ خدا کی قسم ابھی کل ہی میں نے آپؐ کو یہ دُعا کرتے سنا تھا کہ یا اللہ تو عُمر ابن الخطاب یا عمرو بن ہشام (یعنی ابوجہل) میں سے کوئی ایک ضرور اسلام کو عطا کر دے" حضرت عمرؓ کو اب ایک ایک پل گراں تھی۔ خباب سے کہا" مجھے ابھی محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا راستہ بتاؤ" مگر کچھ ایسے آپے سے باہر ہو رہے تھے کہ تلوار اُسی طرح ننگی کھینچ رکھی تھی۔ اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم دار ارقم میں مقیم تھے؛ چنانچہ خبابؓ نے انہیں وہاں کا پتہ بتا دیا۔ عمر گئے اور دروازہ پر پہنچ کر زور سے دستک دی۔ صحابہ نے دروازے کی دراڑ میں سے عمر کو ننگی تلوار تھامے ہوتے دیکھ کر دروازہ کھولنے میں تامل کیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا" دروازہ کھول دو" اور حضرت حمزہؓ نے بھی کہا۔ دروازہ کھول دو۔ اگر نیک ارادہ سے آیا ہے تو بہتر؛ ورنہ اگر نیت بد ہے تو واللہ اسی کی تلوار سے اُس کا سر اُڑا دوں گا" دروازہ کھولا گیا۔ عمر ننگی تلوار ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوئے۔ اُن کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم آگے بڑھے اور عمر کا دامن پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور کہا" عمر کس ارادہ سے آئے ہو؟ واللہ میں دیکھتا ہوں

---

[1] سورۃ طٰہٰ: ۱۵-۱۶

کہ تم خدا کے عذاب کے لیے نہیں بنائے گئے۔" عمرؓ نے عرض کیا" یارسُول اللہ! مَیں مسلمان ہونے آیا ہوں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سُنے تو خوشی کے جوش میں اللہ اکبر کہا اور ساتھ ہی صحابہ نے اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکّہ کی پہاڑیاں گونج اُٹھیں[1]

حضرت عمرؓ کی عمر اس وقت ۳۳ سال کی تھی اور آپ اپنے قبیلہ بنو عدی کے رئیس تھے۔ قریش میں سفارت کا عہدہ بھی انہی کے سپرد تھا اور ویسے بھی نہایت بارُعب اور جرّی اور دلیر تھے۔ ان کے اسلام لانے سے مُسلمانوں کو بہت تقویت پہنچی اور اُنھوں نے دارارقم سے نکل کر برملا مسجدِ حرام میں نماز ادا کی۔ حضرت عمرؓ آخری صحابی تھے جو دارارقم میں ایمان لائے اور یہ بعثتِ نبوی کے چھٹے سال کے آخری ماہ کا واقعہ ہے۔ اس وقت مکّہ میں مُسلمان مردوں کی تعداد چالیس تھی[2]

جب حضرت عمرؓ کے اسلام کی خبر قریش میں پھیلی تو وہ سخت جوش میں آگئے۔ اور اسی جوش کی حالت میں اُنھوں نے حضرت عمرؓ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت عمرؓ باہر نکلے تو ان کے اردگرد لوگوں کا ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا اور قریب تھا کہ بعض جوشیلے لوگ اُن پر حملہ آور ہو جائیں لیکن حضرت عمرؓ بھی نہایت دلیری کے ساتھ ان کے سامنے ڈٹے رہے۔ آخر اُسی حالت میں مکّہ کا رئیس اعظم عاص بن وائل اُوپر سے آگیا اور اس ہجوم کو دیکھ کر اس نے اپنے سردارانہ انداز میں آگے بڑھ کر پوچھا" یہ کیا معاملہ ہے؟" لوگوں نے کہا" عمرؓ صابی ہو گیا ہے" اُس نے موقعہ شناسی سے کام لیتے ہوئے کہا" تو خیر پھر بھی اس ہنگامہ کی ضرورت نہیں۔ مَیں عمرؓ کو پناہ دیتا ہوں" اس آواز کے سامنے عربی دستور کے مطابق لوگوں کو خاموش ہونا پڑا اور وُہ آہستہ آہستہ منتشر ہوگئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ چند دن تک امن میں رہے کیونکہ عاص بن وائل کی پناہ کی وجہ سے کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس حالت کو حضرت عمرؓ کی غیرت نے زیادہ دیر تک برداشت نہ کیا؛ چنانچہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اُنھوں نے عاص بن وائل سے جاکر کہہ دیا کہ مَیں تمہاری پناہ سے نکلتا ہوں۔ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد مَیں مکّہ کی گلیوں میں پٹتا پٹتا ہی رہتا تھا[3] مگر حضرت عمرؓ نے کبھی کسی کے سامنے آنکھ نیچی نہیں کی۔

حضرت عمرؓ کے مُسلمان ہونے کے قریب ہی ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ بھی مسلمان ہوئے۔ عبداللہ اسوقت بالکل بچّہ تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اُنھوں نے بہت بڑا رتبہ حاصل کیا اور اسلام کے چوٹی کے علماء میں سے سمجھے جانے لگے۔

---

[1] ابن ہشام والروض الانف وزرقانی۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کے متعلق بعض اور روایات بھی ہیں۔ مگر ہم نے اس جگہ صرف اہل سیرۃ کی معروف روایت کو لے لیا ہے۔

[2] زرقانی ۞ [3] زرقانی ۞

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کی قریش کے ایک وفد سے ملاقات

جب قریش نے دیکھا کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے ذی مقدرت لوگ بھی اسلام میں داخل ہوتے جاتے ہیں تو انہیں بہت فکر دامنگیر ہوا اور اُنھوں نے باہم مشورہ کرکے پہلے تو عتبہ بن ربیعہ کو آپؐ کے پاس بھیجا تاکہ وہ کسی طرح آپؐ کو راضی کر کے اشاعت اسلام سے باز رکھنے کی کوشش کرے لیکن جب عتبہ کو اس مشن میں ناکامی ہوئی بلکہ قریش نے دیکھا کہ اُلٹا عتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے متاثر اور مرعوب ہوکر واپس آیا ہے[1]۔ تو انھوں نے ایک دن کعبہ کے پاس جمع ہوکر باہم مشورہ کیا اور یہ تجویز کی کہ چند رؤسا اکٹھے ہوکر آپؐ کے ساتھ بات کریں، چنانچہ اس تجویز کے مطابق ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل اور ابوجہل اور امیّہ بن خلف اور عتبہ اور شیبہ اور ابوسفیان اور اسود بن مطلب اور نضر بن حارث اور ابو البختری وغیرہ صحن کعبہ میں مجلس جماکر بیٹھ گئے اور ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف پیغام دیکر روانہ کیا گیا۔ کہ تمہاری قوم کے رؤسا تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں تم ذرا صحنِ کعبہ میں آکر اُن کی بات سُن جاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم تو ایسے موقعوں کی تلاش میں خود رہتے تھے، فوراً تشریف لے گئے۔ اور رسمی علیک سلیک کے بعد قریش نے یوں گفتگو شروع کی کہ۔۔۔

"اے محمدؐ! دیکھو تمہاری وجہ سے قوم میں کتنا اختلاف وانشقاق پیدا ہو رہا ہے۔ تم نے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب میں رخنہ ڈال کر اپنی قوم کے بزرگوں کو بُرا بھلا کہا۔ ان کے قابلِ تکریم معبودوں کو گالیاں دیں اور ان کے ذی عزت بزرگوں کو لایعقل قرار دیا۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم کی ہتک اور ذلّت کیا ہوسکتی ہے جو تم نے کی ہے اور کر رہے ہو۔ مگر ہم تمہارے معاملہ میں حیران ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ اگر تو تمہاری یہ ساری جدوجہد اس غرض سے ہے کہ تم اس ذریعہ سے مال جمع کرکے مالدار بن جاؤ تو ہم تمہیں اتنا مال جمع کئے دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولتمند کہلا سکو۔ اگر جاہ وعزت کی طلب ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار اور رئیس بنا لینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر حکومت کی حرص ہے تو ہمیں اس میں بھی تامل نہیں کہ تمہیں اپنا بادشاہ قرار دے لیں۔ اور اگر تمہارا یہ شور وشغب کسی بیماری یا آسیب کا نتیجہ ہے تو ہم اپنے پاس سے خرچ کرکے تمہارے علاج کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرکے خوش ہو سکتے ہو تو تمہیں عرب کی بہترین لڑکی تلاش کرکے پیش کیے دیتے ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے نہایت خاموشی کے ساتھ رؤسائے قریش کی اس تقریر کو سُنا اور جب وہ اپنی بات ختم کرچکے تو آپؐ نے فرمایا "اے معشرِ قریش! مجھے ان چیزوں میں سے کسی کی تمنّا نہیں ہے اور نہ مجھے کوئی آسیب یا بیماری لاحق ہے۔ مَیں تو خُدا کی طرف سے ایک رسُول ہوں اور خدا کا

---

[1] ابن ہشام وطبری۔

یہ پیغام لے کر تمہاری طرف آیا ہُوں۔ اور میرا دل تمہاری ہمدردی سے معمور ہے۔ اگر تم میری بات سُنو اور مانو تو دین و دُنیا میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اور اگر تم اسے رَدّ کر دو تو مَیں اس صورت میں صبر و تحمل کے ساتھ اپنے ربّ کے فیصلہ کا انتظار کروں گا۔" قریش نے کہا" تو اے محمد اگو یا تم ہماری اس تجویز کو منظور نہیں کرتے۔ اچھا اگر تم نے اپنی رسالت ہی منوانی ہے تو آؤ اسی کے متعلق فیصلہ کر لو۔ تم دیکھتے ہو کہ ہمارا یہ ملک کس قدر بے آب و گیاہ ہے اور خشک پتھروں اور چٹانوں یا ریت کے بے پناہ تودوں کے سوا یہاں کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تم واقعی خدا کے رسُول ہو تو اپنے خدا سے کہہ کر اس ملک میں بھی شام و عراق کی طرح نہریں جاری کروا دو اور ان پہاڑوں کو اڑا کر زرخیز میدان بنوا دو۔ پھر ہم ضرور تمہاری رسالت کے قائل ہو جائیں گے۔" آپؐ نے فرمایا "مَیں تو خدا کی طرف سے ایک پیغامبر ہوں اور میرا کام صرف یہ ہے کہ تمہیں حق و باطل کا راستہ دکھا دوں اور تمہارے نفع نقصان کی بات تمہیں سمجھا دوں۔ ہاں مَیں یہ ضرور کہتا ہوں کہ تم اگر خدا کی آواز پر لبیک کہو گے تو خدا اپنے وقت پر ضرور تمہیں دین و دُنیا کے انعامات کا وارث بنائے گا۔" قریش نے کہا اچھا یہ بھی نہیں تو کم از کم تمہارے ساتھ خدا کا کوئی فرشتہ ہی اُترتا نظر آتا اور محلات میں تمہارا بسیرا ہوتا اور تمہارے ہاتھ میں سونے چاندی کے ڈھیر ہوتے مگر ان میں سے کوئی چیز بھی تو تمہیں میسّر نہیں ہے بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہماری طرح بازاروں میں پھرتے اور ہماری طرح اپنی روزی کے متلاشی ہوتے ہو۔ پھر وہ کونسی علامت ہے جس سے ہم تمہیں خدا کا بھیجا ہوا سمجھ لیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" مَیں تو ان باتوں کا اس رنگ میں مدّعی نہیں ہوں جو تم ڈھونڈتے ہو۔ ہاں یہ مَیں نے کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ اگر تم مجھے مانو گے تو خدائی سُنت کے مطابق دین و دُنیا کی حسنات سے ضرور حصّہ پاؤ گے۔" قریش نے بگڑ کر کہا کہ "اگر یہ بھی نہیں تو پھر وہ عذاب ہی لاؤ جس کا تم وعدہ دیتے ہو۔ آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی ہم پر آگرے۔ یا فرشتوں کی کوئی فوج ہی خدائی جھنڈے کے نیچے ہمارے سامنے آدھمکے۔ خدا کی قسم ہمیں تو اب بس یہی نظر آرہا ہے کہ یا ہم زندہ رہیں گے یا تُو رہے گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے غصّہ کو دباتے ہوتے خاموش ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مغموم دل کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر واپس تشریف لے آئے۔ جب آپ واپس چلے آئے تو ابوجہل نہایت غضبناک ہو کر بولا کہ "اے معشرِ قریش! تم نے دیکھ لیا کہ محمدؐ نے تمہاری ساری باتوں کو ٹھکرا دیا ہے اور وہ اپنی اس فتنہ انگیزی سے کبھی باز نہیں آئے گا۔ اب واللہ مَیں بھی اس وقت تک چین نہیں لوں گا کہ جب تک محمدؐ کا سر کچل کر نہ رکھ دُوں۔ اور پھر بنو عبد مناف میرے ساتھ جو کرنا چاہیں کر گذریں۔" بنو عبد مناف کے جو لوگ وہاں موجود تھے اور وہ بھی تھے جو بنو ہاشم اور بنو مطلب کے ماسوا تھے۔ ان سب نے بیک آواز کہا "ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم محمدؐ کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے ہو بیشک کرو۔" دُوسرے دن ابوجہل ایک بڑا سا پتھر لے کر صحنِ کعبہ کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب آپؐ تشریف لائے تو اس کے دل پر کچھ ایسا رُعب طاری

ہوا کہ وہیں بُت بن کر کھڑا رہا اور آگے بڑھ کر وار کرنے کی ہمت نہیں پڑی[1]

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا خداداد رُعب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ابوجہل کے مرعوب ہونے کے متعلق ایک اور روایت بھی آتی ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ خدائی سنت اسی طرح پر ہے کہ جو لوگ خدا کے مرسلین کے سامنے زیادہ بیباک ہوتے ہیں عموماً انہیں پر خدا تعالیٰ اپنے رسولوں کا رعب زیادہ مسلط کرتا ہے؛ چنانچہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ اراشہ نامی شخص مکہ میں کچھ اونٹ بیچنے آیا اور ابوجہل نے اُس سے یہ اُونٹ خرید لیے مگر اُونٹوں پر قبضہ کر لینے کے بعد قیمت ادا کرنے میں حیل و حجت کرنے لگا۔ اس پر اراشہ جو مکہ میں ایک اجنبی اور بے یار و مددگار تھا بہت پریشان ہوا اور چند دن تک ابوجہل کی منت و سماجت کرنے کے بعد وہ آخر ایک دن جبکہ بعض رؤسا قریش کعبۃ اللہ کے پاس مجلس جمائے بیٹھے تھے، ان لوگوں کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اے معززین قریش آپ میں سے ایک شخص ابوالحکم نے میرے اُونٹوں کی قیمت دبا رکھی ہے آپ مہربانی کر کے مجھے یہ قیمت دلوا دیں۔ قریش کو شرارت جو سوجھی تو کہنے لگے ایک شخص یہاں محمدؐ بن عبداللہ نامی رہتا ہے تم اس کے پاس جاؤ۔ وہ تمہیں قیمت دلا دے گا۔ اور اس سے غرض ان کی یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بہرحال انکار ہی کریں گے اور اس طرح باہر کے لوگوں میں آپؐ کی سُبکی اور ہنسی ہوگی۔ جب اراشہ وہاں سے لوٹا تو قریش نے اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی کر دیا کہ دیکھو کیا تماشہ بنتا ہے؛ چنانچہ اراشہ اپنی سادگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مَیں ایک مسافر آدمی ہوں اور آپ کے شہر کے ایک رئیس ابوالحکم نے میری رقم دبا رکھی ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ مجھے یہ رقم دلوا سکتے ہیں پس آپ مہربانی کر کے مجھے میری رقم دلوا دیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو مَیں تمہارے ساتھ چلتا ہوں؛ چنانچہ آپؐ اُسے لے کر ابوجہل کے مکان پر آئے اور دروازہ پر دستک دی۔ ابوجہل باہر آیا تو آپؐ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اور خاموشی کے ساتھ آپؐ کا مُنہ دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا "یہ شخص کہتا ہے کہ اس کے پیسے آپ کی طرف نکلتے ہیں۔ یہ ایک مسافر ہے آپ اس کا حق کیوں نہیں دیتے؟" اس وقت ابوجہل کا رنگ فق ہو رہا تھا کہنے لگا "محمدؐ ٹھہرو! مَیں ابھی اس کی رقم لاتا ہوں۔" چنانچہ وہ اندر گیا اور اراشہ کی رقم لا کر اسی وقت اس کے حوالے کر دی۔ اراشہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اور واپس آ کر قریش کی اسی مجلس میں پھر گیا۔ اور وہاں جا کر ان کا بھی شکریہ ادا کیا کہ آپ لوگوں نے مجھے ایک بہت ہی اچھے آدمی کا پتہ بتایا۔ خُدا اُسے جزاء خیر دے اُس نے اُسی وقت میری رقم دلا دی۔ رؤسا قریش کے مُنہ میں زبان بند تھی اور وہ ایک دوسرے کی طرف حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔ جب اراشہ چلا گیا تو انھوں نے اس آدمی سے دریافت کیا جو اراشہ کے پیچھے پیچھے ابوجہل

---

[1] ابن ہشام طبری و زرقانی

کے مکان تک گیا تھا کہ کیا قصہ ہوا ہے۔ اُس نے کہا۔ واللہ! مَیں نے تو ایک عجیب نظارہ دیکھا ہے اور وہ یہ کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جا کر ابوالحکم کے دروازہ پر دستک دی اور ابوالحکم نے باہر آکر محمد کو دیکھا تو اسوقت اس کی حالت ایسی تھی کہ گویا ایک قالب بے رُوح ہے اور جونہی کہ اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا کہ اس کی رقم ادا کر دو، اُسی وقت اُس نے اندر سے پائی پائی لا کر سامنے رکھ دی۔" تھوڑی دیر کے بعد ابوجہل بھی اس مجلس میں آپہنچا۔ اسے دیکھتے ہی سب لوگ اس کے پیچھے ہو لیے کہ اے ابوالحکم تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ محمدؐ سے اس قدر ڈر گئے۔ اُس نے کہا۔ خُدا کی قسم! جب مَیں نے محمدؐ کو اپنے دروازے پر دیکھا، تو مجھے یُوں نظر آیا کہ اُس کے ساتھ لگا ہوا ایک مست اور غضبناک اُونٹ کھڑا ہے اور مَیں سمجھتا تھا کہ اگر ذرا بھی چون وچرا کروں گا تو وہ مجھے چبا جائے گا۔[1]

ایک عیسائی غلام سے تعلیم حاصل کرنے کا الزام

جو الزامات قریشِ مکہ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لگائے جاتے تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپؐ بعض عیسائیوں سے باتیں سیکھتے ہیں اور پھر انہیں اپنا رنگ دے کر اپنی تعلیم کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر ایک جبرؔ نامی عیسائی کا نام لیا جاتا تھا جو مکہ کے ایک مشرک رئیس ابن حضرمی کا غلام تھا۔ یہ شخص چونکہ عیسائی تھا اور عیسائیت کی تعلیم بُت پرستی کی نسبت اسلام کے زیادہ قریب تھی اور مکہ کے مناظر میں جبر کو شرک اور بُت پرستی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، اس لیے وہ کبھی کبھی اپنے مذہبی شوق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا رہتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے شوق کو دیکھ کر کبھی کبھی اس کے پاس تشریف لے جاتے تھے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے تھے۔ قریش نے یہ نظارہ دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے کی غرض سے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ "محمد تو جبر سے تعلیم حاصل کرتا ہے۔"[2] اسلام اور مسیحیت کی تعلیم کے اختلاف اور جبر کی علمی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ ایک نہایت فضول اور لغو اعتراض تھا، مگر قریش کو تو صرف اعتراض کی ضرورت تھی۔ معقول یا غیر معقول ہونے سے سروکار نہ تھا۔ اس لیے وُہ بڑے شوق سے اس اعتراض کو دوہراتے رہے۔ قرآن شریف نے اس اعتراض کا خوب جواب دیا ہے کہ جس شخص کی طرف تم محمد رسُول اللہ کی تعلیم کو منسوب کرتے ہو اس کی زبان تو ظاہری اور معنوی ہر دو رنگ میں گنگ ہے، پھر وُہ قرآن جیسی کتاب میں محمد رسُول اللہ کا استاد کس طرح ہو سکتا ہے؟[3] یعنی یہ شخص غیر عربی ہونے کی وجہ سے اس فصیح اور بلیغ عربی کلام کا معلم کس طرح سمجھا جا سکتا ہے جو قرآن شریف میں استعمال ہوا ہے اور دُوسری طرف معنوی رنگ میں اس شخص کی جہالت معارفِ قرآنی کا سرچشمہ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ٭ [2] ابن ہشام ٭

[3] سورۃ نحل: ۱۰۴ ٭

کس طرح قرار دی جا سکتی ہے۔

قرآنی آیات محولہ بالا میں جو عجمی یعنی غیر عربی کا لفظ استعمال ہوا ہے اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ابھی اناجیل کا عربی ترجمہ نہیں ہوا تھا[1] اس لیے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جبر اناجیل کے کوئی حصے سناتا ہوگا تو وہ لازماً عبرانی یا یونانی میں ہوں گے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کس طرح سمجھتے اور کس طرح عربی کے قالب میں ڈھالتے ہوں گے۔

بعض روایتوں میں جبر کے سوا بعض اور لوگوں کے نام بھی اس تعلق میں بیان ہوئے ہیں جن کے متعلق قریش اعتراض کیا کرتے تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتے ہیں۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ غلاموں کے طبقہ میں سے تھے[2] بہرحال قریش مکہ نے کچھ دن اس اعتراض کو شہرت دیکر بھی اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر جو آگ نہ بجھنے والی تھی وہ کیسے بجھتی؟

ابتر ہونے کا الزام

انہی ایام میں بعض قریش نے یہ کہہ کر بھی اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو لاوارث اور بے نسل ہے۔ چند دن تک اس کا سلسلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس پر یہ وحی نازل ہوئی کہ:

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝[3]

یعنی "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تیری نسل اور تیری برکات و فیوض کے سلسلہ کو بہت لمبا بنایا ہے۔ پس تو خدا کے لیے اپنے نفس کی طاقتوں اور اپنی نسل و اموال کو بیشک بے دریغ خرچ کر۔ کیونکہ یہ خزانہ ختم ہونے والا نہیں ہے؛ البتہ تیرے بدخواہ دشمنوں کے سارے سلسلے مٹا دیئے جائیں گے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جس شاندار اور آپؐ کے معاندین کے لیے جس ہیبت ناک طریق پر آپؐ کا یہ الہام پورا ہوا ہے وہ تاریخ کا ایک کھلا ورق ہے جسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ انہی اعتراض کرنے والوں کی اولاد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو کر اس بات پر مہر لگا دی کہ نہ صرف قریش بلکہ تمام قبائل عرب میں سے اگر کسی شخص کی نسل حقیقتاً قائم رہی ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ ہیں۔

قریش کی طرف سے مصالحت کی تجویز

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ان ایام میں قریش سخت پیچ و تاب کھا رہے تھے اور ہر شخص اس سوچ میں

---

[1] دیکھو ٹیکسٹ اینڈ کینن آف نیو ٹسٹیمنٹ مصنفہ اے سوٹر ایم۔ اے اور شائع کردہ میسرز ڈکورتھ لنڈن صفحہ ۲۰۷

[2] تفسیر البحر المحیط زیر آیت ۱۰۴ سورۃ نحل۔ نیز لائف آف محمدؐ صلعم مصنفہ سر ولیم میور صفحہ ۶۵

[3] ابن ہشام اور قرآن شریف سورۃ کوثر

پڑا ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ اس ادھیڑ بُن میں ایک دن روسائے قریش میں سے ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل اور اُمیہ بن خلف وغیرہ آپس میں بات کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہنے لگے "اے محمدؐ! یہ اختلاف تو بہت بڑھتا جاتا ہے اور ہمارا قومی شیرازہ بکھر رہا ہے۔ کیا کوئی باہم مصالحت کی تدبیر نہیں ہو سکتی؟" آپؐ نے دریافت فرمایا "وہ کیسے؟" انھوں نے جواب دیا کہ ہم اور تم اپنی عبادت کو مشترک کر لیتے ہیں۔ یعنی تم اپنے خُدا کے ساتھ ہمارے بُتوں کو بھی پُوج لیا کرو اور ہم اپنے بتوں کی عبادت میں تمہارے خُدا کو بھی شریک کر لیا کریں گے۔ اس طرح مصالحت سے ایک یہ فائدہ بھی ہو گا کہ ہم میں سے جو فریق حق اور راستی پر ہے اس کا فائدہ دُوسرے کو بھی پہنچتا رہے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا۔ ذرا غور تو کرو یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ مَیں اپنے خُدا کو مانتے ہوئے تمہارے بُتوں کو کس طرح پُوج سکتا ہوں۔ اور تم بُت پرستی پر قائم رہتے ہوئے میرے خُدا کی پرستش کس طرح کر سکتے ہو؟ یہ دونوں باتیں تو ایک دُوسرے کے اس قدر مخالف اور متضاد واقع ہوئی ہیں کہ کسی طرح ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں[1]! چنانچہ انہی ایام میں قرآن شریف کی یہ آیات نازل ہوئیں کہ:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۗ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

"یعنی اے کفّار کے گروہ! جن بُتوں کو تم پُوجتے ہو۔ مَیں انہیں قابل پرستش نہیں سمجھتا۔ اور نہ تم اپنے بتوں کو پُوجتے ہوئے میرے خدا کی پرستش کر سکتے ہو۔ پس یہ ناممکن ہے کہ مَیں کبھی تمہارے بُتوں کی پرستش کروں جس طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ تم اپنے بُتوں پر ایمان لاتے ہوئے میرے واحد لاشریک خُدا کے سامنے جھکو۔ میرا دین اور ہے اور تمہارا دین اور ہے اور یہ دونوں کبھی بھی ایک جگہ مل نہیں سکتے[2]"

اس جواب سے قریش نے سمجھ لیا کہ ان کے اس ہوائی قلعہ کے کوئی پاؤں نہیں ہیں۔

مُسلمانوں کے خلاف قریش کا معاہدہ اور مسلمانوں کا بائیکاٹ

قریش کو ان کی اُوپر تلے کی ناکامی نے سخت مشتعل کر دیا تھا۔ سب سے اوّل ابوطالب کے معاملہ میں اُنہیں ذلّت کا مُنہ دیکھنا پڑا اور وہ بنو ہاشم کو مُسلمانوں سے جُدا نہ کر سکے۔ اس کے بعد اُنھوں نے مُسلمانوں کو ہر طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا کر کے دیکھ لیا کہ یہ چٹان اپنی

---

[1] طبری ۔

[2] سورۃ کافرون و سیرۃ ابن ہشام ۔

جگہ سے ہلنے والی نہیں ہے۔ بعدہٗ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام نے ان کی آنکھیں اس حقیقت کے دیکھنے کے لیے کھول دیں کہ شروع شروع میں مخالف رہنے کے بعد بھی ان کے بڑے سے بڑے لوگ اسلام کی رَو میں بہہ جانے سے محفوظ نہیں ہیں۔ زاں بعد حبشہ کا وفد نجاشی کے دربار سے خائب و خاسر ہو کر لوٹا اور قریش کو اس معاملہ میں سخت ذلت نصیب ہوئی۔ اور اب اُنھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سلسلہ جنبانی کر کے ایسی مُنہ کی کھائی کہ بایدوشاید۔ ان پے درپے ناکامیوں اور ذلتوں نے قریش کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی؛ چنانچہ اُنھوں نے ایک عملی اقدام کے طور پر باہم مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام افراد بنو ہاشم اور بنو مطلب کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات قطع کر دیئے جاویں اور اگر وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت سے دستبردار نہ ہوں تو ان کو ایک جگہ محصور کر کے تباہ کر دیا جاوے؛ چنانچہ محرم سَنہ نبوی میں ایک باقاعدہ معاہدہ لکھا گیا کہ کوئی شخص خاندان بنو ہاشم اور بنو مطلب سے رشتہ نہیں کرے گا اور نہ ان کے پاس کوئی چیز فروخت کریگا۔ نہ اُن سے کچھ خریدے گا اور نہ اُن کے پاس کوئی کھانے پینے کی چیز جانے دے گا اور نہ اُن سے کسی قسم کا تعلق رکھے گا۔ جب تک کہ وُہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے الگ ہو کر آپ کو ان کے حوالے نہ کر دیں[1]۔ یہ معاہدہ جس میں قریش کے ساتھ قبائل بنو کنانہ بھی شامل تھے[2] باقاعدہ لکھا گیا اور تمام بڑے بڑے رؤسا کے اُس پر دستخط ہوئے اور پھر وہ ایک اہم قومی عہدنامہ کے طور پر کعبہ کی دیوار کے ساتھ آویزاں کر دیا گیا؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام بنو ہاشم اور بنو مطلب کیا مسلم اور کیا کافر (سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کے جس نے اپنی عداوت کے جوش میں قریش کا ساتھ دیا) شعب ابی طالب میں جو ایک پہاڑی درّہ کی صورت میں تھا، محصور ہو گئے اور اس طرح گویا قریش کے دُو بڑے قبیلے مکہ کی تمدنی زندگی سے عملاً بالکل منقطع ہو گئے اور شعب ابی طالب میں جو گویا بنو ہاشم کا خاندانی دّرہ تھا قیدیوں کی طرح نظر بند کر دیئے گئے[3]۔ چند گنتی کے دُوسرے مسلمان جو اس وقت مکہ میں موجود تھے وہ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔

جو جو مصائب اور سختیاں ان ایّام میں ان محصورین کو اُٹھانی پڑیں اُن کا حال پڑھ کر بدن پر لرزہ پڑ جاتا ہے۔ صحابہ کا بیان ہے کہ بعض اوقات اُنھوں نے جانوروں کی طرح جنگلی درختوں کے پتّے کھا کھا کر گزارہ کیا[4]۔ سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کے وقت ان کا پاؤں کسی ایسی چیز پر جا پڑا جو تر اور نرم معلوم ہوتی تھی (غالباً کوئی کھجور کا ٹکڑا ہوگا)۔ اس وقت ان کی بھوک کا یہ عالم تھا کہ اُنھوں نے فوراً اُسے اٹھا کر نگل لیا اور وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے آج تک پتہ نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔ ایک دوسرے

---

[1] ابن سعد ؛ [2] ابن ہشام و ابن سعد و طبری [3] بخاری کتاب وجوب الحج ؛ [4] طبری ابن سعد و ابن ہشام ؛
[5] کتب احادیث بحوالہ الروض الانف ؛

موقعہ پر بھوک کی وجہ سے ان کا یہ حال تھا کہ انہیں ایک سوکھا ہوا چمڑہ زمین پر پڑا ہوا مِل گیا تو اُسی کو انہوں نے پانی میں نرم اور صاف کیا اور پھر بھون کر کھایا اور تین دن اسی غیبی ضیافت میں بسر کیے[1] بچوں کی یہ حالت تھی کہ محلہ سے باہر ان کے رونے اور چلّانے کی آواز جاتی تھی جسے سُن سُن کر قریش خوش ہوتے تھے[2] لیکن مخالفین اسلام سب ایک سے نہ تھے۔ بعض یہ دردناک نظارے دیکھتے تھے تو ان کے دل میں رحم پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ حکیم بن حزام کبھی کبھی اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لیے خفیہ خفیہ کھانا لے جاتے تھے۔ مگر ایک دفعہ ابوجہل کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا تو اس کمبخت نے راستہ میں بڑی سختی کے ساتھ روکا اور باہم ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی[3] یہ مصیبت برابر اڑھائی تین سال تک جاری رہی اور اس عرصہ میں مسلمان سوائے حج وغیرہ کے موسم کے جبکہ اشہر حرم کی وجہ سے امن ہوتا تھا باہر نہیں نکل سکتے تھے[4]

اس ظلم سے مسلمانوں کی رہائی

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ قریش میں بعض نرم دل اور شریف مزاج لوگ بھی تھے۔ یہ لوگ ان مظالم کو دیکھتے تو دل میں کڑھتے مگر قوم کے متفقہ فیصلہ کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتے تھے، اس لیے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے آخر خُدا کی طرف سے ایسا سامان پیدا ہو گیا کہ انہیں اس معاملہ میں جرأت کے ساتھ قدم اٹھانے کی ہمت پڑ گئی۔ اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے کہ جب اس بائیکاٹ پر قریباً تین سال کا عرصہ گذر گیا، تو ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب سے فرمایا کہ مجھے خُدا نے بتایا ہے کہ ہمارے خلاف جو معاہدہ لکھا گیا تھا اس میں سوائے خدا کے نام کے ساری تحریر مٹ چکی ہے اور کاغذ کھایا جا چکا ہے۔ ابوطالب فوراً اٹھ کر خانہ کعبہ میں پہنچے جہاں بہت سے رؤسائے قریش مجلس لگائے بیٹھے تھے اور انکو مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تمہارا یہ ظالمانہ معاہدہ کب تک چلے گا۔ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے کہ خدا نے اس معاہدہ کی ساری تحریر سوائے اپنے نام کے محو کر دی ہے[5] تم ذرا یہ معاہدہ نکالو تاکہ دیکھیں کہ میرے بھتیجے کی یہ بات کہاں تک درست ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے کہا کہ ہاں ہاں! ضرور دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ معاہدہ منگا کر دیکھا گیا تو واقعی وہ سب کِرم خوردہ ہو چکا تھا۔ اور سوائے شروع میں خُدا کے نام کے کوئی لفظ پڑھا نہیں جاتا تھا۔ اس پر بعض قریش تو اور بھی زیادہ چمک اُٹھے۔ لیکن وہ جن کے دل میں پہلے سے انصاف اور رحم اور قرابت داری کے جذبات پیدا ہو رہے تھے ان کو اس معاہدہ کے خلاف آواز اٹھانے کا ایک عمدہ موقعہ ہاتھ آ گیا[6] چنانچہ رؤسائے قریش میں سے ہشام بن عمرو۔ زہیر بن ابی امیہ۔ مطعم بن عدی۔ ابوالبختری

---

[1] الروض الانف حالات نقض صحیفہ ۔ [2] ابن سعد ذکر حصر قریش ۔ [3] ابن ہشام ۔ [4] ابن سعد
[5] قریش کی عادت تھی کہ اپنی تحریرات کے شروع میں باسمك اللّٰھم کے لفظ لکھا کرتے تھے اور معاہدہ میں صرف یہی حصہ باقی رہ گیا تھا ۔ [6] ابن ہشام و ابن سعد ۔

اور زمعہ بن اسود نے باہم مل کر یہ تجویز کی کہ اس ظالمانہ اور قطع رحمی کرنے والے معاہدہ کو اب ختم کر دینا چاہیئے۔ یہ تجویز کر کے یہ لوگ دوسرے رؤسائے قریش کی مجلس میں گئے اور ان میں سے ایک نے قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اے قریش کیا یہ مناسب ہے کہ تم تو مزے کے ساتھ زندگی بسر کرو اور تمہارے بھائی اس طرح مصیبت میں دن کاٹیں۔ یہ معاہدہ ظالمانہ ہے اسے اب منسوخ کر دینا چاہیئے۔" اس کے دوسرے ساتھیوں نے اس کی تائید کی۔ لیکن ابوجہل بولا "ہرگز نہیں یہ معاہدہ قائم رہے گا اسے کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا۔" کسی نے جواب دیا "نہیں اب یہ قائم نہیں رہ سکتا۔ جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے۔" اسی حیل و حجت میں مطعم بن عدی نے ہاتھ بڑھا کر یہ بوسیدہ دستاویز چاک کر دی۔ اور ابوجہل اور اس کے ساتھی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

صحیفہ چاک کرنے کے بعد یہ لوگ ہتھیار لگا کر شعب ابی طالب کے دروازہ پر گئے اور تلواروں کے سایہ کے نیچے محصورین کو باہر نکال لائے۔ یہ واقعہ بعثت نبوی کے دسویں سال کا ہے[1] گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اڑھائی تین سال تک محصور رہے کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ آپؐ بعثت کے ساتویں سال ماہ محرم میں محصور ہوئے تھے۔

شق القمر کا معجزہ

غالباً ابھی آپؐ شعب ابی طالب میں ہی تھے کہ شق القمر کا مشہور معجزہ ظاہر ہوا یعنی بعض کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ طلب کیا۔ اور آپؐ نے انہیں چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے کا معجزہ دکھایا۔ اس واقعہ کا قرآن شریف میں اس طرح ذکر آتا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ[2]

"موعود گھڑی قریب آگئی ہے اور چاند پھٹ گیا۔ اگر یہ لوگ کوئی نشان دیکھیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک جادو ہے اور ایسا جادو ہوتا ہی چلا آیا ہے۔ انھوں نے ہمارے رسول کی تکذیب کی اور اپنی حرص و آز کے پیچھے پڑے رہے، حالانکہ ہر بات کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ بہر حال ہم نے انہیں ایک ایسی خبر پہنچا دی ہے جس میں ان کے لیے ایک تنبیہہ اور بیداری کا سامان موجود ہے۔"

[1] ابن سعد ۔ [2] سورہ قمر: ۱ تا ۶

اور حدیث میں اس معجزہ کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے :-

إِنَّ أَهْلَ مَكَّةَ سَأَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُرِيَهُمْ آيَةً فَأَرَاهُمُ الْقَمَرَ شِقَّتَيْنِ حَتّٰى رَأَوْا حِرَاءَ بَيْنَهُمَا[1]

"یعنی کفارِ مکہ نے آپؐ سے کوئی معجزہ طلب کیا جس پر آپؐ نے انہیں چاند کو دو ٹکڑوں میں دکھایا۔ حتیٰ کہ انہیں چاند کا ایک ٹکڑا حراء پہاڑی کے ایک طرف نظر آتا تھا اور دوسرا دوسری طرف۔"

اور ایک دوسری روایت میں جو عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے یہ الفاظ ہیں :-

اِنْشَقَّ الْقَمَرُ وَنَحْنُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ بِمِنًى فَقَالَ اشْهَدُوْا ...... فِرْقَةٌ فَوْقَ الْجَبَلِ وَفِرْقَةٌ دُوْنَهُ[2]

"یعنی ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منٰی میں تھے کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو اور گواہ رہو۔ ایک ٹکڑا پہاڑی کے اُوپر کی جانب تھا اور دوسرا نیچے کی طرف۔"

اس کے علاوہ حدیث اور کتبِ سیرۃ میں شق القمر کے متعلق اور بھی بہت سی روایات ہیں جن میں بعض مزید تفصیلات بھی دی گئی ہیں مگر زیادہ معتبر روایات وہی ہیں جو اُوپر درج کر دی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ ہمیں اس جگہ اس مسئلے کے متعلق مناظرانہ رنگ میں کوئی بحث کرنا مقصود نہیں اس لیے اس موقعہ پر صرف مندرجہ بالا روایات کا اندراج کافی ہے؛ البتہ ایک مختصر تشریحی نوٹ اس بات کے متعلق درج کرنا ضروری ہے کہ اس معجزہ کی حقیقت کیا تھی۔ آیا واقعی چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا یا یہ کہ صرف دیکھنے والوں کی نظروں پر ایسا تصرف ہوا کہ چاند انہیں دو ٹکڑوں میں نظر آیا۔ نیز یہ کہ اس معجزہ کی غرض و غایت کیا تھی؟

سو اس کے متعلق جاننا چاہیئے کہ گو خدا کی قدرت کے آگے کوئی بات بھی اَنہونی نہیں اور جو شخص یہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ سارا عالم خُدا کے دستِ قدرت سے عالمِ وجود میں آیا ہے وہ اس بات کے ماننے میں ایک لحظہ کے لیے بھی تامل نہیں کر سکتا کہ اگر خدا چاہے تو اپنے ایک اشارہ سے اس کے سارے تار و پود کو ملیا میٹ کر کے رکھ دے مگر جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے ثابت شدہ بات یہی ہے کہ چاند حقیقتاً دو ٹکڑے نہیں ہوا بلکہ خدائی تصرف کے ماتحت صرف دیکھنے والوں کو دو ٹکڑوں میں نظر آیا تھا اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کیونکہ جبکہ ایک مشتاق انسان اپنی قوتِ ارادی یعنی ہپنوٹزم کے زور سے دوسروں کو ایک مرئی چیز اپنی غیر اصلی صورت میں دکھا سکتا ہے تو خدا کی قدرت اور اس کے رسُول کی رُوحانی طاقت کے آگے تو یہ بات

---

[1] و [2] بخاری و مسلم۔

کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی کہ اس وقت دیکھنے والوں کی آنکھوں پر ایسا تصرف ہوا ہو کہ انہیں چاند دو ٹکڑوں میں پھٹتا نظر آیا ہو۔ بہر حال ہمارے نزدیک اصل حقیقت یہی ہے کہ چاند حقیقۃً دو ٹکڑے نہیں ہوا تھا بلکہ صرف دیکھنے والوں کو دو ٹکڑوں میں نظر آیا تھا۔ اور اگر غور کیا جاوے تو حدیث کے الفاظ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ ایک تصرفِ الٰہی تھا جو دیکھنے والوں کی نظروں پر کیا گیا اور اکثر محققین نے اسی تشریح کو صحیح قرار دیا ہے۔

لیکن اگر بالفرض اس معجزہ کو اس کی ظاہری صورت میں بھی قبول کیا جائے تو پھر بھی ہرگز جائے اعتراض نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتیں لامحدود ہیں جن کی معمولی وسعت تک بھی انسان کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ ابھی ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے کہ جنوبی امریکہ کے ملک لاپلاٹا میں ایک ستارہ دو ٹکڑے ہوتا دیکھا گیا۔ اس ستارے کا نام نووا پکٹورس (NOVA PICTORIS) تھا جنوبی امریکہ کی سب سے بڑی رصدگاہ واقعہ جونس برگ نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔ اور سائنسدان کہتے ہیں کہ اس بات کا امکان ہے کہ اس سے پہلے بھی کوئی آسمانی ستارہ دو ٹکڑے ہو گیا ہو[1]۔ پس کوئی تعجب نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خدائی تصرف کے ماتحت چاند میں سے کوئی ٹکڑا الگ ہو گیا ہو یا چاند دو ٹکڑے ہو کر پھر مل گیا ہو اور کوئی سائنسدان اس پر اعتراض نہیں کر سکتا لیکن حقیقت وہی ہے جو اُوپر بیان کی گئی ہے۔ واللہ اعلم

اب رہا دُوسرا سوال کہ اس معجزہ کی غرض و غایت کیا تھی۔ اور دراصل اس بحث میں یہی اصل اور اہم سوال ہے کیونکہ اسی سے اس معجزہ کی حقیقت اور شان ظاہر ہو سکتی ہے۔ سو اس کے متعلق جاننا چاہیئے کہ دراصل علمِ تعبیرِ رؤیا میں چاند سے حکومت و بادشاہ مُراد ہوتے ہیں خواہ وُہ عادل و انصاف پسند ہوں یا کہ ظالم و جابر[2] اور اس تاویل کی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں؛ چنانچہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جب خیبر کے یہودی رئیس حُیَیّ بن اخطب کی لڑکی صفیہ نے یہ خواب دیکھا کہ چاند اس کی گود میں آگرا ہے تو اس کے باپ نے اس کی یہی تعبیر کی تھی کہ صفیہ کسی دن عربوں کے بادشاہ کے عقد میں آئے گی؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ فتحِ خیبر کے بعد صفیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئی[3] اسی طرح جب حضرت عائشہ نے خواب دیکھا کہ ان کے حجرے میں تین چاند آگرے ہیں تو واقعات نے اس خواب کی یہی تعبیر ثابت کی کہ اس سے اُن کے حجرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا دفن ہونا مراد ہے[4]۔ اس صورت میں گویا کفارِ مکہ کو چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے کا معجزہ دکھانے میں یہ اشارہ تھا کہ اب تمہاری حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے اور اس کی جگہ اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ گویا جب کفارِ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ طلب کیا تو خدا تعالیٰ نے ان کی نظروں میں چاند کو دو ٹکڑے کر کے زبانِ حال سے

---

[1] دیکھو ہندوستان ٹائمز دہلی مؤرخہ ۲۹ را پریل ۱۹۲۸ء ؛ [2] دیکھو تعطیر الانام جلد ۲ زیر لفظ قمر ؛
[3] اسد الغابہ و زرقانی حالات صفیہ ؛ [4] مؤطا امام مالک کتاب الجنائز۔

بتا دیا کہ تم معجزہ مانگتے ہو اور یہاں تمہاری موت کی گھنٹی بج رہی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف نے اس معجزہ کے بیان کیساتھ جو اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ (یعنی تمہاری قیامت قریب آگئی ہے) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ گویا جب کفار نے معجزہ مانگا تو انہیں جواب میں شق القمر کا معجزہ دکھا کر یہ بتایا گیا کہ اب تمہاری حکومت کا خاتمہ ہو کر محمد رسول اللہ کی حکومت کا دَور دَورہ شروع ہونے والا ہے جو آپ کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہو گا۔ اور چونکہ کفار اپنی روایات کی بنا پر اس اشارے کو سمجھتے تھے وہ بے اختیار ہو کر بول اُٹھے کہ سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ یعنی اے محمدؐ! اگر تمہاری موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ایسا ہو گیا تو پھر یہ ایک بڑا پکا جادو ہو گا۔ الغرض شق القمر کے معجزہ میں اصل غرض وغایت یہی تھی کہ کفارِ مکہ کو بتایا جائے کہ اب تمہاری حکومت کا خاتمہ ہے۔ اسی تشریح کے ساتھ شق ایک عظیم الشان معجزہ قرار پاتا ہے؛ ورنہ محض ظاہر میں بے نتیجہ طور پر چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا گو علمِ ہیئت کی رُو سے ایک عجوبہ ہو مگر رُوحانی رنگ میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ اسی لیے گذشتہ علماء میں سے بھی امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی جیسے محققین نے یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ صرف ایک خدائی تصرف تھا جس کے ماتحت کفار کو چاند دو ٹکڑوں میں ہو کر نظر آیا؛ ورنہ حقیقتاً میں چاند دو ٹکڑے نہیں ہوا تھا[1] اور جب حقیقتاً چاند دو ٹکڑے نہیں ہوا بلکہ صرف دیکھنے والوں کو ایسا دکھائی دیا تو لامحالہ اس میں کوئی خاص حکمت ہو گی اور وہ حکمت وہی تھی جو ہم نے اُوپر بیان کی ہے۔ واللہ اعلم[2] شق القمر کا معجزہ ہجرت سے قریباً پانچ سال قبل ۹ سنہ نبوی میں ہوا تھا[3]

حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات

جب آپؐ شعب ابی طالب سے نکلے تو آپؐ کو پے دَر پے دو نہایت شدید صدمے پہنچے۔ یعنی حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ یہ دونوں عمر رسیدہ تھے اور وفات ہر انسان کے لیے مقدر ہے۔ لیکن ان دونوں کا شعب ابی طالب میں محصور ہونے کے زمانہ کے اس قدر قریب فوت ہونا اس بات کا قوی شبہ پیدا کرتا ہے کہ محصور ہونے کی غیر معمولی سختی کا ان کی وفات میں بہت کچھ دخل تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل سختی کے اثر کے نیچے اُن کی صحتیں بالکل شکستہ ہو گئی تھیں لیکن جب تک تو وہ محصور رہے ان کی طبیعتوں کو مقابلہ کے خیال نے سنبھالے رکھا مگر جونہی کہ وہ باہر آئے۔ محاصرہ کی لمبی سختی نے اپنا اثر ظاہر کر دیا اور دونوں ایک دُوسرے کے آگے پیچھے موت کا شکار ہو گئے۔ ان پئے دَر پئے صدموں کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال یعنی ۱۰ سنہ نبوی کا نام عام الحزن

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد سوم ۔ [2] مفصل بحث کیلئے دیکھئے سرمہ چشم آریہ مصنفہ مقدس بانی سلسلہ احمدیہ۔
[3] خمیس

یعنی غموں کا سال رکھا[1]۔ ابوطالب گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور باپ کے تھے اور آپؐ سے بہت محبت کرتے تھے اور آپؐ کو بھی ان سے بہت محبت تھی۔ جب ابوطالب مرض الموت میں تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باقاعدہ ان کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے؛ چنانچہ ایک دفعہ جب ان کی وفات قریب تھی، آپؐ اُن کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت وہاں ابوجہل وغیرہ مشرکین بھی بیٹھے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کی وفات قریب دیکھ کر فرمایا "چچا! آپ صرف کلمۂ شہادت پڑھ دیں۔ مَیں قیامت کے دن خُدا کے حضور آپ کے متعلق عرض کروں گا۔" یہ سُن کر ابوجہل وغیرہ گھبرائے اور ابوطالب سے کہنے لگے کہ کیا آپ اپنے والد عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے؟ اور مختلف صورتوں میں ابوطالب کو سمجھاتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوطالب کی زبان سے جو آخری الفاظ سُنے گئے وہ یہ تھے کہ "مَیں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سُنے تو دردمند ہو کر فرمایا "اچھا مَیں بھی اپنے ربّ سے آپ کے واسطے مغفرت چاہتا رہوں گا سوائے اس کے کہ مَیں اس سے روک دیا جاؤں۔" مگر ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ آپؐ اس سے روک دیئے گئے۔ اور شرک اور کفر پر مرنے والوں کے لیے یہ حکم نازل ہوا کہ اُن کے لیے مغفرت کی دُعا کرنا جائز نہیں بلکہ ان کا معاملہ خدا پر چھوڑنا چاہئیے[2]۔

ایک روایت یہ بھی آتی ہے جو بعید نہیں کہ دُرست ہو کہ ابوطالب نے مرتے ہوئے رؤساءِ قریش سے یہ الفاظ کہے کہ "اے قریش کے گروہ! تم خدا کی خلق میں ایک برگزیدہ قوم ہو اور خُدا نے تمہیں بڑی عزت دی ہے۔ مَیں تمہیں محمدؐ کے متعلق نصیحت کرتا ہُوں کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کیونکہ وُہ تم میں ایک اعلیٰ اخلاق کا انسان ہے اور عربوں میں اپنے صدق اور سداد کی وجہ سے امتیاز رکھتا ہے اور سچ پوچھو تو وہ ہماری طرف وہ پیغام لایا ہے جس سے خواہ زبان انکار کرتی ہے، مگر دل اُسے مانتا ہے۔ مَیں نے عمر بھر محمدؐ کا ساتھ دیا ہے اور ہر تکلیف کے موقعہ پر اس کی حفاظت کے لیے آگے بڑھا ہوں اور اگر مجھے اور مہلت ملی تو آئندہ بھی ایسا ہی کروں گا۔ اور اے قریش! میری تمہیں بھی یہ نصیحت ہے کہ اسے دُکھ دینے کے درپے نہ ہو بلکہ اس کی نصرت اور اعانت کرو کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے[3]۔" اس کے بعد ابوطالب کی جلد ہی وفات ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی وفات پر سخت صدمہ ہوا۔ اور چونکہ ابوطالب ہمیشہ قریش کے مقابل میں آپؐ کے حامی اور محافظ رہے تھے، اس لیے ان کی وفات سے آپؐ کی پوزیشن اور بھی زیادہ نازک ہو گئی۔ وفات کے وقت جو سنہ ۱۰ نبوی میں واقع ہوئی ابوطالب کی عمر اسّی سال سے اُوپر تھی[4]۔ ابوطالب گو زندگی بھر شرک پر قائم رہے اور اسی حالت میں ان کی وفات ہوئی مگر

---

[1] زرقانی۔ [2] بخاری باب قصہ ابی طالب
[3] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۲۹۵، ۲۹۶۔ [4] ابن سعد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ انہیں اپنے باپ کی طرح سمجھا اور ان کی محبت و وفاداری اور خدمت و اطاعت اور عزت و احترام کا وہ اعلیٰ نمونہ دکھایا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ دُوسری طرف ابوطالب نے بھی آپؐ کے ساتھ ہمیشہ نہایت درجہ مربیانہ اور وفادارانہ سلوک رکھا اور اپنے آپ کو ہر قسم کی تکلیف میں ڈالنا گوارا کیا مگر آپؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان کا یہ سلوک جہاں اُن کی اپنی شرافت و وفاداری کا ثبوت ہے وہاں اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ خواہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مشرکانہ خیالات کے ماتحت غلطی خوردہ خیال کرتے ہوں، مگر جھُوٹا اور دھوکا دینے والا ہرگز نہیں سمجھتے تھے۔ اور آپؐ کے اعلیٰ اخلاق اور راست گفتاری اور اخلاص کے دل سے قائل تھے؛ چنانچہ اس موقعہ پر میور صاحب لکھتے ہیں:۔

"ابوطالب نے باوجود اپنے بھتیجے کے مشن پر ایمان نہ لانے کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر جس رنگ میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کی اور جس طرح اپنی ذات اور اپنے خاندان کو اپنے بھتیجے کی خاطر قربانی کے لیے پیش کیا، اس سے ابوطالب کی ذاتی شرافت و نجابت پر ایک نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ دُوسری طرف ابوطالب کی یہ قُربانیاں اس بات کا بھی قطعی ثبوت ہیں کہ وُہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے دعویٰ میں مخلص خیال کرتا تھا۔ یقیناً ابوطالب ایک خود غرض اور دھوکے باز انسان کے واسطے اس قدر قربانی کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا اور اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کو دیکھنے اور پڑتال کرنے کے لیے بھی غیر معمولی مواقع حاصل تھے۔"[1]

ابوطالب کی وفات سے چند دن بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی انتقال کیا۔[2] خدیجہؓ نے بڑی بڑی دُکھ اور تکلیف کی گھڑیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا اور اُن کو آپؐ سے اور آپؐ کو ان سے بہت محبت تھی، اس لیے طبعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ وفات کے بعد جب کبھی ان کا ذکر آتا تو آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں اور آپؐ اکثر اُن کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ خدیجہؓ اپنے زمانہ کی بہترین عورتوں میں سے تھی۔ اور حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ آپؐ حضرت خدیجہؓ کا اس کثرت سے ذکرِ خیر کیا کرتے تھے کہ مجھے اُن پر غیرت آنے لگتی تھی اور میں کہتی تھی کہ آپؐ تو اس طرح خدیجہؓ کا ذکر فرماتے ہیں کہ گویا دُنیا میں بس وہی ایک عورت پیدا ہوئی ہے۔ آپؐ فرماتے تھے۔ "عائشہؓ! اس میں بڑی بڑی خوبیاں تھیں اور خدا نے مجھے اولاد بھی اسی سے دی۔" غرض آپؐ ہمیشہ

---

[1] لائف آف محمد صفحہ ۱۰۳۔ [2] طبری و ابن سعد۔

نہایت محبت کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کا ذکر فرماتے تھے۔ اگر گھر میں کبھی کوئی جانور وغیرہ ذبح ہوتا تو آپؐ حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو ضرور حصہ بھیجتے۔ ایک دفعہ آپؐ حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے کہ حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہ بنت خویلد آپؐ سے ملنے کے لیے آئیں اور دروازہ پر آکر اجازت چاہی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ بیتاب ہو کر اُٹھے کہ خدیجہؓ کی سی آواز ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہن ہالہ آئی ہے[۱]۔ جنگِ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابو العاص جو ابھی تک اسلام نہ لائے تھے، قید ہو کر آئے تو ان کی زوجہ یعنی آپؐ کی صاحبزادی زینبؓ نے جو ابھی تک مکہ ہی میں تھیں۔ ان کے فدیہ کے طور پر اپنے گلے کا ہار اُتار کر بھیجا۔ یہ وُہ ہار تھا جو حضرت خدیجہؓ نے زینبؓ کو جہیز میں دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہار کو دیکھا تو مرحومہ خدیجہؓ یاد آگئی اور آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ صحابہ سے فرمایا "اگر چاہو تو خدیجہؓ کی یہ یادگار اس کی بیٹی کو واپس کر دو۔" انہیں اشارہ کی دیر تھی فوراً ہار واپس کر دیا[۲]۔ وفات کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ مکہ کے مقام حجون میں دفن کی گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی قبر میں اُترے مگر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ کیونکہ ابھی تک جنازہ کی نماز مقرر نہ ہوئی تھی[۳]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکالیف میں اضافہ

حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے بعد قریشِ مکہ آپؐ کی ذات کے متعلق بہت دلیر ہو گئے اور اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت تکالیف پہنچانی شروع کیں[۴]۔ ایک دفعہ آپؐ ایک راستہ پر چلے جاتے تھے کہ ایک شریر نے برسرِعام آپؐ کے سر پر خاک ڈال دی۔ ایسی حالت میں آپؐ گھر تشریف لائے۔ آپؐ کی ایک صاحبزادی نے یہ دیکھا تو جلدی سے پانی لے کر آئیں اور آپؐ کا سر دھویا۔ اور زار زار رونے لگیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی اور فرمایا "بیٹی رو نہیں۔ اللہ تیرے باپ کی خود حفاظت کرے گا اور یہ سب تکلیفیں دُور ہو جائیں گی[۵]۔" پھر ایک دفعہ آپؐ صحنِ کعبہ میں خدا تعالےٰ کے سامنے سربسجود تھے اور چند رؤساءِ قریش بھی وہاں مجلس لگائے بیٹھے تھے کہ ابوجہل نے کہا "اس وقت کوئی شخص ہمت کرے تو کسی اُونٹنی کا بچہ دان لا کر محمدؐ کے اُوپر ڈال دے۔" چنانچہ عقبہ بن ابی معیط اُٹھا اور ایک ذبح شدہ اُونٹنی کا بچہ دان لا کر جو خون اور گندی آلائش سے بھرا ہوا تھا آپؐ کی پشت پر ڈال دیا اور پھر سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ فاطمۃ الزہراؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ دوڑی آئیں اور اپنے باپؐ کے کندھوں سے یہ بوجھ اُتارا۔ تب جا کر آپؐ نے سجدہ سے سر اٹھایا۔ روایت آتی ہے کہ ایک موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رؤساءِ قریش کے نام لے لے کر جو اس طرح اسلام کو ذلیل کرنے اور مٹانے کے درپے تھے

---

[۱] بخاری باب تزویج النبی صلعم خدیجہؓ ✦ [۲] ابنِ ہشام و طبری ✦ [۳] زرقانی ✦
[۴] ابنِ ہشام و ابن سعد ✦ [۵] طبری ✦

بَددُعا کی اور خدا سے فیصلہ چاہا۔ راوی کہتا ہے کہ پھر میں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ بدر کے دن مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہو کر وادیٔ بدر کی ہوا کو متعفّن کر رہے تھے[۱]

حضرت عائشہؓ اور سودہؓ کی شادی

نکاح کرنا اسلام میں ضروری قرار دیا گیا ہے اور سوائے معذوری کی صورت کے تجرّد سے روکا گیا ہے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں :-

اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ لَّمْ یَعْمَلْ بِسُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ[۲]

"یعنی شادی کرنا میری سُنّت میں داخل ہے اور جو میری سُنّت پر عمل نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں ہے"

اور خصوصاً ایک نبی اور شارع نبی کے واسطے تو شادی کرنا از بس ضروری ہے نہ صرف اس لیے کہ تا اس ذریعہ سے وہ حُسنِ معاشرت کا نمونہ اپنی اُمّت کے واسطے قائم کر سکے بلکہ اس لیے بھی کہ تبلیغ احکام کے کام میں اس کی بیوی اس کی مددگار ہو۔ کیونکہ عورتوں کے متعلق جو مسائل ہوتے ہیں اُن کی تبلیغ و تعلیم جس خُوبی کے ساتھ ایک عورت کر سکتی ہے مرد نہیں کر سکتا بلکہ درحقیقت انبیاء کے واسطے تو مناسب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو وہ حتی الوسع ایک سے زیادہ بیویاں کریں تا ان کے لیے تبلیغ و تعلیم کا کام اور بھی زیادہ آسان ہو جائے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر گذشتہ انبیاء علیہم السلام تعددِ ازدواج کے مسئلہ پر کاربند تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں سے بھی کثرت ایسے ہی نبیوں کی تھی جن کی ایک سے زائد بیویاں تھیں[۳] اور تعجب ہے کہ عیسائی لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور مسلمانوں پر اس مسئلہ کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں مگر اپنے ان بزرگوں کی طرف نہیں دیکھتے جن کو وہ خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسُول یقین کرتے ہیں۔ اسی طرح دوسری قوموں کے بھی اکثر نبی تعددِ ازدواج پر عامل تھے[۴] غرضیکہ شادی کرنا بلکہ حتی الوسع ایک سے زیادہ شادیاں کرنا انبیاء علیہم السّلام کی سُنّت ہے۔ لہٰذا حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے دل میں جلد ہی دُوسری شادی کا خیال آنا آپ کے منصب نبوّت کے لحاظ سے ایک طبعی امر تھا، مگر ایسے حالات میں ایک نبی کے واسطے بیوی کا انتخاب بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا کیونکہ کئی باتوں کو دیکھنا اور کئی امور کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ تعالیٰ کے حضور دُعائیں کیں کہ وہ اس معاملہ میں آپ کا ہادی اور رہنما ہو۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے آپ کی دُعا کو سُنا اور آپؐ کو ایک رؤیا کے ذریعہ اپنے انتخاب سے اطلاع دی؛ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ انہی ایّام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک خواب دیکھا کہ جبرائیل علیہ السّلام آپؐ کی

---

[۱] بخاری حالات غزوہ بدر ۔ [۲] ابن ماجہ ۔ [۳] مثلاً دیکھو حالات حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہم السلام ۔ [۴] مثلاً دیکھو حالات حضرت کرشن اور رامچندر جی وغیرہ ۔

خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور آپؐ کے سامنے ایک سبز رنگ کا ریشمی رومال پیش کر کے عرض کیا کہ یہ آپؐ کی بیوی ہے دُنیا اور آخرت میں۔" آپؐ نے رومال لیکر دیکھا تو اس پر حضرت عائشہؓ بنت ابوبکرؓ کی تصویر تھی۔[1]

اس کے کچھ عرصہ بعد خولہ بنت حکیم زوجہ عثمانؓ بن مظعون آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپؐ سے عرض کیا کہ" یارسُول اللہ آپؐ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" آپؐ نے فرمایا۔"کس سے کروں؟" اس نے عرض کیا کہ" آپؐ چاہیں تو کنواری لڑکی بھی موجود ہے اور بیوہ عورت بھی۔" آپؐ نے فرمایا۔" کون؟" خولہ نے عرض کیا۔" کنواری تو آپؐ کے عزیز دوست ابوبکرؓ صدیق کی لڑکی عائشہ ہے اور بیوہ سودہ بنت زمعہ ہے جو آپؐ کے خادم سکران بن عمرو مرحوم کی بیوہ ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" اچھا تو پھر تم ان دونوں کے متعلق بات کرو۔" چنانچہ خولہ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور اُن کی اہلیہ اُمّ رومان سے ذکر کیا۔ وہ پہلے بہت حیران ہوئے۔ اور کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے بھائی ہیں۔[2] مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہلا بھیجا کہ دین کی اخوّت سے رشتہ پر اثر نہیں پڑتا تو پھر انہیں کیا عذر ہو سکتا تھا بلکہ ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی تھی کہ اُن کی بیٹی رسُولِ خدا کی بیوی بنے اس کے بعد خولہؓ حضرت سودہؓ بنت زمعہ کے پاس گئیں۔ وہ اور ان کے عزیز بھی راضی تھے۔ لہٰذا شوال ۱۰ نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان ہر دو کے ساتھ چار چار سو درہم مہر پر نکاح پڑھا گیا اور حضرت سودہؓ کا تو نکاح کے ساتھ ہی رُخصتانہ بھی ہوگیا لیکن چونکہ عائشہؓ کی عمر اس وقت صرف سات سال کی تھی اس لیے ان کا رخصتانہ ہجرت کے بعد تک ملتوی رہا۔[3]

اس موقعہ پر یاد رکھنا چاہیئے کہ جو جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات سے خالی ہوئی تھی وہ دراصل حضرت عائشہؓ سے ہی پُر ہوئی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل تجویز حضرت عائشہؓ ہی کے متعلق تھی اور وہی آپؐ کو خواب میں بھی دکھائی گئی تھیں۔ لیکن حضرت سودہؓ کا نکاح ایک خاص مصلحت اور خاص ضرورت کے ماتحت تھا اور وہ یہ کہ چونکہ یہ زمانہ مسلمانوں کے واسطے ایک سخت تکلیف اور مصیبت کا زمانہ تھا اور ظالم قریش کی طرف سے سب مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں پر جور و جفا کے تبر چل رہے تھے اور خصوصاً بے یار و مددگار غرباء کے لیے تو یہ انتہائی مصائب کے دن تھے اس لیے ایسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ صدمہ خوردہ اور غم رسیدہ بیوہ بغیر کسی انتظام کے چھوڑ دی جاوے اور اسلام کی وجہ سے مصیبت کے دن کاٹے اس لیے اور نیز اس لیے بھی کہ آپؐ

---

[1] : بخاری و اسد الغابہ۔

[2] اس وقت تک صحابہ آنحضرت صلعم کے ساتھ اپنا اخوت کا رشتہ سمجھتے تھے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رشتہ اخوت کا نہیں بلکہ ابنیت اور ابوت کا ہے لیکن یہ کہ اس روحانی رشتہ کا اثر جسمانی رشتوں پر نہیں ہے۔ [3] زرقانی و اسد الغابہ۔

نے مُسلمانوں کو آپس میں محبت رکھنے اور ایک دُوسرے کی ہمدردی اور مدد کرنے کا عملی سبق بھی دینا تھا جب آپؐ کے سامنے سودہؓ کا ذکر آگیا تو آپؐ نے بلا تامل یہی فیصلہ کیا کہ آپؐ انہیں خود اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیں اور یہ آپؐ کی طرف سے ایک قربانی تھی جو حالات پیش آمدہ کے ماتحت کی گئی۔ کیونکہ اوّل تو سودہؓ ایک بیوہ تھیں۔ دُوسرے وہ اچھی عمر رسیدہ تھیں۔ حتیٰ کہ شادی سے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ مباشرت کے بالکل ناقابل ہوگئیں۔ تیسرے اُن میں آپؐ کی زوجیت کے واسطے کوئی امتیازی قابلیت بھی نہ تھی اور نہ کوئی خاص وجہِ کشش تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کا آپؐ کے حرم میں آنا یہ معنے رکھتا تھا کہ آپؐ اپنی اُس بیوی پر ایک سوت لا رہے ہیں جو خدائی انتخاب کے ماتحت آپؐ کی زوجہ بنی تھی اور اس وجہ سے آپؐ کو بہت محبُوب تھی۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اپنی محبوب بیوی پر کوئی شخص یونہی بلا خاص وجہ کے سوت نہیں لایا کرتا۔ پس حضرت عائشہؓ کے ہوتے ہوئے آپؐ کا حضرت سودہؓ جیسی عمر رسیدہ خاتون کے ساتھ نکاح کرنا صاف بتا رہا ہے کہ نعوذ باللہ یہ کوئی عیش و عشرت کا سامان نہ تھا جو آپؐ اپنے گھر لا رہے تھے بلکہ یہ ایک قربانی تھی جو آپؐ کو حالات پیش آمدہ کے ماتحت کرنی پڑی تھی۔

پس آپؐ کی اصل اور مستقل تجویز حضرت عائشہؓ ہی کے لیے تھی جن کے متعلق خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہوا تھا اور وہی دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے مناسب بھی تھیں۔ کیونکہ :۔

اوّل :۔ وہ بالکل نوعمر لڑکی تھیں اور اس لیے پوری طرح اس قابل تھیں کہ اسلامی تعلیمات کو جلد، بآسانی اور بخوبی سیکھ کر ایک دینی معلّمہ بن سکیں جو ایک شارع نبی کی بیوی کے واسطے ضروری ہے۔

دوسرے :۔ وُہ نہایت درجہ ذہین اور ذکی تھیں جس کی وجہ سے دینی مسائل کے سیکھنے اور تفقہ فی الدین کے لیے نہایت مناسب تھیں۔

تیسرے :۔ بوجہ کم عمر ہونے کے ان کے متعلق بظاہر توقع تھی جو پوری بھی ہوئی کہ وہ ابھی بہت لمبی عمر پائیں گی اور اس طرح انہیں مُسلمان عورتوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ کا زیادہ موقع مِل سکے گا۔

چوتھے :۔ اسلام ہی میں اُن کی پیدائش ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے اسلامی تعلیم گویا اُن کی گھٹی میں پڑی تھی اور بچپن سے ہی اُنھوں نے اسلامی عادات و اطوار اچھی طرح سیکھ لیے تھے اور تعلیمِ اسلامی کا ایک بہت عمدہ نمونہ تھیں۔

پانچویں :۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اوّل المؤمنین اور افضل المسلمین کی صاحبزادی تھیں جس کی وجہ سے ان کی تربیت نہایت اعلیٰ اور کامل اور شعارِ اسلامی کے عین مطابق ہوئی تھی اور اس لیے وہ عورتوں میں نمونہ بننے کے خاص طور پر قابل تھیں۔

اِن وجوہات سے حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ بننے کے واسطے سب سے بڑھ کر مناسب تھیں اور انہی وجوہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے واسطے ان کو پسند فرمایا۔ چنانچہ یہ باتیں

اپنا پھل لائیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے وجود سے اُمتِ محمدیہ کو بڑے بڑے فائدے پہنچے ہیں۔ احادیث کا وہ حصہ جو عورتوں کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے زیادہ تر حضرت عائشہؓ ہی کے اقوال و روایات پر مبنی ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ عام دینی مسائل میں بھی ان کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ:۔

كَانَ الْاَكَابِرُ مِنْ صَحَابَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجِعُوْنَ إِلٰى قَوْلِهَا وَيَسْتَفْتُوْنَهَا[1]

"یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے بڑے صحابہ بھی حضرت عائشہؓ کے قول کی طرف رجوع کرتے اور ان سے فتویٰ پوچھتے تھے۔"

غرض اصل اور مستقل تجویز آپ کی حضرت عائشہؓ سے تھی اور وہی اس منصبِ عالی کے لائق تھیں۔ باقی رہی حضرت سودہؓ بنت زمعہ کی شادی، سو جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں وُہ ایک قربانی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ کیونکہ یہ شادی ایک خاص مربیانہ اصول کے ماتحت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دلی محبت اور قلبی توجہ اور حقیقی مہربانی کا ایک بیّن ثبوت ہے جو آپؐ ان مصائب کے زمانہ میں اپنے خدام اور ان کے پسماندگان کے حال پر فرماتے تھے اور یہ بات حضرت سودہؓ کی ہی شادی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ جیسا کہ آگے چل کر اپنے اپنے موقعہ پر ظاہر ہو جائے گا۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ کے نکاح کے سوا جو کہ خود بالذات مقصود تھا باقی جتنے بھی نکاح آپؐ نے کیے وہ سب خاص حالات۔ خاص ضروریات اور خاص مصالح کے ماتحت کئے گئے؛ چنانچہ آپؐ کا خواب بھی یہی ظاہر کرتا ہے جس میں آپؐ کو صرف حضرت عائشہؓ کی تصویر دکھائی گئی تھی اور یہ الفاظ کہے گئے تھے کہ "اب تیری یہ بیوی ہے دُنیا اور آخرت میں۔" اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے خاص محبت تھی چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے آپؐ سے دریافت کیا۔" اَيُّ النَّاسِ اَحَبُّ اِلَيْكَ"۔ یعنی "یا رسُول اللہ! لوگوں میں سے آپؐ کو کس سے زیادہ محبت ہے؟" آپؐ نے فرمایا "عائشہؓ سے"۔ اس نے پُوچھا "یا رسُول اللہ! مَردوں میں سے کس سے زیادہ ہے؟" فرمایا: "اَبُوْهَا: عائشہؓ کے باپ سے۔"[2]

حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ کا نکاح شوال ۱۰ نبوی میں ہوا تھا۔ اور عام روایات کے مطابق حضرت سودہؓ کے نکاح کی رسم حضرت عائشہؓ کے نکاح سے چند روز پہلے وقوع میں آئی تھی۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچاس سال سے اُوپر تھی۔

تعدّد ازدواج پر ایک مختصر نوٹ

حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ کی شادی کے ذکر میں ہمارے غیر مُسلم ناظرین کے دل میں تعددِ ازدواج کا مسئلہ ضرور

---

[1] زاد المعاد ٭ [2] ترمذی جلد ۲ باب فَضْلُ عَائِشَةَ ٭

کھٹکا ہوگا اس مسئلہ کے متعلق مفصّل بحث تو انشاء اللہ کتاب کے حصّہ دوم میں آئے گی۔ مگر اس جگہ بھی ایک مختصر سا نوٹ لکھنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ سو جاننا چاہیئے کہ اسلام کے کئی ایسے مسائل ہیں جن کے متعلق مخالفین نے یکطرفہ خیالات کے ماتحت اعتراض کر دیئے ہیں اور کبھی ٹھنڈے دل سے اُن پر غور نہیں کیا اور نہ تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں ان کی حقیقت کو پرکھا ہے۔ انہی میں سے ایک تعدد ازدواج کا مسئلہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ سو اس بارہ میں پہلے تو یہ جاننا چاہیئے کہ فطرت بے شک ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اس کی ہدایت کے واسطے ودیعت کیا ہے لیکن یہ نُور بعض اوقات مخالف عناصر کے نیچے دب کر کمزور یا مُردہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور ایسے حالات میں اس کا فتویٰ قابلِ قبول نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو پھر تعصبات سے پاک نہ کیا جاوے، چنانچہ دیکھو مسئلہ طلاق کے متعلق عیسائی فطرت صدیوں سے مخالف عناصر کے نیچے دب کر کمزور ہو گئی تھی اس لیے اس کا آج تک یہی فتویٰ چلا آیا ہے کہ عورت کی طرف سے زنا سرزد ہونے کے سوا اسے طلاق دینا ہرگز جائز نہیں ہے، چنانچہ اسی کے مطابق مسیحیوں نے اپنے قوانین بھی وضع کر لئے لیکن اب مشاہدہ اور تجربہ کے دھکے کھا کر ان کی سوئی ہوئی فطرت کچھ بیدار ہوئی ہے اور وہ اس طرف آ رہے ہیں کہ زنا ہی نہیں بلکہ دُنیا میں اور بھی ایسے حالات ہو سکتے ہیں جن کے ماتحت میاں بیوی کا حسنِ معاشرت کے ساتھ اکٹھا رہنا محال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب عیسائی ممالک میں اسلامی تعلیم کے مطابق طلاق کے متعلق قانون پاس ہو رہے ہیں۔

بات یہ ہے کہ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کان کو بھلی معلوم ہوتی ہیں اور دل اُن کی طرف پسندیدگی کا میلان محسوس کرتا ہے مگر دراصل یہ ایک دھوکا ہوتا ہے۔ کیونکہ عملی زندگی میں آکر ان کی حقیقت کا راز کھل جاتا ہے انہی میں سے مسئلہ طلاق ہے جس کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے اور انہی میں سے تعدّدِ ازدواج کا مسئلہ ہے جس کے متعلق یہ مختصر نوٹ سپردِ قلم کیا جا رہا ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک بڑی اچھی تعلیم ہے کہ انسان ہر حالت میں ایک بیوی رکھے اور کسی حالت میں بھی اسے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا اختیار نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر ہم غور سے کام لیں اور بنی نوع انسان کی مختلف ضروریات پر نظر ڈالیں تو ماننا پڑتا ہے کہ بعض اوقات انسان پر ضرور ایسے حالات آتے ہیں کہ جب نہ صرف خود اس کی بلکہ سوسائٹی کی فلاح و بہبودی اس بات کی مُقتضی ہوتی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ مثلاً (۱) کوئی ایسا شخص ہے جس کی ایک بیوی موجود ہے مگر بیوی کے کسی نقص کی وجہ سے اُس سے اولاد نہیں ہوتی یا (۲) ہوتی تو ہے مگر ماں کے کسی نقص کی وجہ سے مر مر جاتی ہے یا (۳) کوئی ایسا شخص ہے جس کی بیوی ایسے مرض میں مبتلا ہو گئی ہے کہ جس کی وجہ سے وُہ خاوند کی خاص ہمدردی اور توجہ کی تو ضرور حقدار ہے مگر وہ صحیح اہلی مباشرت کے قابل نہیں رہی یا (۴) کوئی شخص بوجہ اپنے مخصوص حالات کے ایک بیوی کے ساتھ اپنے تقویٰ اور اخلاق کو قائم نہیں رکھ سکتا یا (۵) کسی شخص کی دُوسری شادی کے ساتھ کوئی اہم ملکی یا قومی مفاد وابستہ ہیں یا (۶) کسی زمانہ میں

کسی ملک اور قوم کی حالت اس بات کی مُقتضی ہے کہ نسل کی ترقی یا قومی اخلاق کی حفاظت کے واسطے لوگ عام طور پر ایک سے زیادہ شادیاں کریں یا (۷) دُوسری شادی کے واسطے کوئی اور ایسی وجوہ ہیں جن کو عقل جائز قرار دیتی ہے تو ایسے حالات میں ہر ایک صحیح الدماغ شخص کا ضمیر بشرطیکہ وُہ تعصبات کے نیچے دب کر مُردہ نہ ہو گیا ہو تعددِ ازدواج کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دے گا۔ اور اس قسم کے حالات میں مرد اور عورت دونوں سے توقع رکھی جائے گی کہ وہ زیادہ اہم اغراض کے حصول کے لیے اپنے جذبات کی قربانی کرنے کے واسطے تیار ہو جائیں۔

اسلام ایک عملی مذہب ہے اور بنی نوع انسان کی تمام جائز ضروریات کو پورا کرنے والا ہے اور شکر کا مقام ہے کہ صدیوں کی ٹھوکروں کے بعد اب عیسائی دنیا بھی آہستہ آہستہ اسلامی تعلیم کی طرف آ رہی ہے اور وہ دن دُور نہیں کہ دُنیا جان لے گی کہ جو پاک اور کامل تعلیم تعصباتِ مذہبی و سیاسی کے سبب صدیوں سے اعتراضات کا تختۂ مشق بنی رہی ہے وہی اس قابل ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام جائز ضروریات کو پورا کر کے دُنیا میں حقیقی امن کی بنیاد قائم کر سکے۔

افسوس معترضین نے بغیر سوچے سمجھے اسلامی مسئلۂ تعددِ ازدواج کے متعلق یہ خیال کر لیا ہے کہ نعوذ باللہ یہ ایک عیش و عشرت کا راستہ ہے جو اسلام اپنے متبعین کے واسطے کھولتا ہے؛ حالانکہ اگر ان قیود کو جن کے ساتھ اسلام نے تعددِ ازدواج کی اجازت دی ہے نظرِ غور سے دیکھا جاوے تو صاف پتہ لگ جاتا ہے کہ ایک سچے مُسلمان کے واسطے دوسری شادی ہرگز عیش و عشرت کا سامان نہیں ہو سکتی۔ بلکہ سچ پُوچھو تو یہ ایک قربانی ہے جو اسے خاص حالات اور خاص ضروریات کے ماتحت کرنی پڑتی ہے اور اگر کوئی مسلمان ان قیود کو توڑ کر عیش و عشرت کی غرض سے ایک سے زیادہ شادیاں کرتا ہے تو یہ اس کا ایک ذاتی فعل ہو گا جو کسی صورت میں بھی اسلامی شعار نہیں کہلا سکتا۔ وہ ایک ایسا ہی کام کرتا ہے جیسا کہ بعض دُوسرے مذاہب کے آزاد طبع لوگ جن کا مذہب کسی صورت میں بھی تعددِ ازدواج کی اجازت نہیں دیتا۔ گھر میں ایک بیوی کے ہوتے ہوتے اِدھر اُدھر مُنہ کالا کرتے پھرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ اسلام میں تعددِ ازدواج کا حکم نہیں دیا گیا۔ یعنی یہ لازمی نہیں قرار دیا گیا کہ ہر مُسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرے۔ بلکہ صرف یہ ایک استثنار ہے جو خاص حالات کے پیش آ جانے کی صورت میں جائز رکھی گئی ہے اور عملاً بیشتر مُسلمان ایک ہی شادی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

توسیع اشاعت

قبائل کا دورہ

حج کے ایام میں ہر دُور دراز کے علاقہ سے مکہ میں لوگ جمع ہوتے تھے اور اشہرِ حرم میں عکاظ۔ مجنہ اور ذوالمجاز میں بڑی بڑی تعداد میں لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتداء سے ہی یہ طریق تھا کہ ان موقعوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور مختلف قبائلِ عرب کی فرودگاہوں پر جا جا کر اُنہیں اسلام کی دعوت دیا کرتے تھے[1] مگر طبعاً ابتک آپؐ کی زیادہ توجہ قریشِ مکہ کی طرف تھی، لیکن جن ایام میں قریشِ مکہ نے مسلمانوں کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر کے ان کے ساتھ تعلقات قطع کر دیئے اور ان کے ساتھ میل ملاپ بند ہوگیا تو ان دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر قبائلِ عرب کی طرف زیادہ توجہ شروع کی، چنانچہ محصور ہونے کے زمانہ میں آپؐ اشہرِ حرم میں جبکہ سب طرف اُمن ہوتا تھا حج میں آنے والے قبائل کا خاص طور پر دورہ کیا کرتے تھے اور عکاظ وغیرہ کے اجتماعات میں بھی باقاعدہ جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے تھے۔ لیکن قریشِ مکہ نے اس تبلیغ میں بھی روک تھام شروع کر دی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قبائل کا مسلمان ہو جانا ان کے لیے قریباً قریباً ویسا ہی خطرناک ہے جیسا کہ خود مکہ والوں کا اسلام لے آنا، چنانچہ یہ قریش ہی کی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ باوجود اس کے کہ آپؐ نے کئی دفعہ قبائل کا دورہ کیا اور ہر کیمپ میں جا جا کر اسلام کی دعوت دی لیکن کہیں بھی کامیابی کی اُمید نہ بندھی[2]

طائف کا سفر

جب محاصرہ اُٹھ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حرکات وسکنات میں ایک گونہ آزادی نصیب ہوئی تو آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ طائف میں جا کر وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ طائف ایک مشہور مقام ہے جو مکہ سے جنوب مشرق کی طرف چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اس زمانہ میں قبیلہ بنو ثقیف سے آباد تھا۔ کعبہ کی خصوصیت کو الگ رکھ کر طائف گویا مکہ کا ہم پلہ تھا اور اس میں بڑے بڑے صاحبِ اثر اور دولتمند لوگ آباد تھے۔ اور طائف کی اس اہمیت کا خود مکہ والوں کو بھی اقرار تھا چنانچہ یہ مکہ والوں کا ہی قول ہے کہ:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ[3]

"یعنی اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے تو مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا"

---

[1] ابن سعد ذکر دُعاء رسُول اللہ صلعم قبائل العرب فی المواسم [2] ابن سعد و طبری [3] سورۃ زخرف: ۳۲

غرض شوال سنہ نبوی میں[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف اکیلے تشریف لے گئے[2] یا بعض روایتوں کی رُو سے زید بن حارثہؓ بھی ساتھ تھے[3] وہاں پہنچ کر آپؐ نے دس دن قیام کیا اور شہر کے بہت سے رؤسا سے یکے بعد دیگرے ملاقات کی۔ مگر اس شہر کی قسمت میں بھی مکہ کی طرح اس وقت اسلام لانا مقدر نہ تھا۔ چنانچہ سب نے انکار کیا بلکہ ہنسی اڑائی۔ آخر آپؐ نے طائف کے رئیس اعظم عبد یالیل[4] کے پاس جاکر اسلام کی دعوت دی مگر اس نے بھی صاف انکار کیا بلکہ تمسخر کے رنگ میں کہا کہ "اگر آپؐ سچے ہیں تو مجھے آپؐ کے ساتھ گفتگو کی مجال نہیں اور اگر جھوٹے ہیں تو گفتگو لاحاصل ہے۔" اور پھر اس خیال سے کہ کہیں آپؐ کی باتوں کا شہر کے نوجوانوں پر اثر نہ ہو جائے، آپؐ سے کہنے لگا۔ بہتر ہوگا کہ آپؐ یہاں سے چلے جائیں کیونکہ یہاں کوئی شخص آپؐ کی بات سُننے کے لیے تیار نہیں ہے اس کے بعد اس بدبخت نے شہر کے آوارہ آدمی آپؐ کے پیچھے لگا دیئے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے نکلے تو یہ لوگ شور کرتے ہوئے آپؐ کے پیچھے ہو لئے اور آپؐ پر پتھر برسانے شروع کئے جس سے آپؐ کا سارا بدن خون سے تر بتر ہو گیا۔ برابر تین میل تک یہ لوگ آپؐ کے ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور پتھر برساتے چلے آئے۔

طائف سے تین میل کے فاصلہ پر مکہ کے رئیس عتبہ بن ربیعہ کا ایک باغ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں آکر پناہ لی اور ظالم لوگ تھک کر واپس لوٹ گئے۔ یہاں ایک سایہ میں کھڑے ہو کر آپؐ نے اللہ کے حضور یوں دُعا کی :

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

اَللّٰھُمَّ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ ۔۔ الخ

یعنی "اے میرے رب مَیں اپنے ضعفِ قوت اور قلتِ تدبیر اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کی شکایت تیرے ہی پاس کرتا ہوں۔ اے میرے خدا تُو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور کمزوروں اور بیکسوں کا تُو ہی نگہبان و محافظ ہے اور تُو ہی میرا پروردگار ہے ..... مَیں تیرے ہی مُنہ کی روشنی میں پناہ کا خواستگار ہوتا ہوں کیونکہ تُو ہی ہے جو ظلمتوں کو دُور کرتا اور انسان کو دُنیا و آخرت کے حسنات کا وارث بناتا ہے۔"

عتبہ و شیبہ اس وقت اپنے اس باغ میں موجود تھے۔ جب اُنھوں نے آپؐ کو اس حالت

---

[1] ابن سعد ؛ [2] ابن ہشام و طبری ؛ [3] ابن سعد ؛

[4] حدیث میں ابن عبد یالیل کا نام آتا ہے۔ دیکھو بخاری کتاب بدءالخلق ذکر الملائکہ ؛

میں دیکھا تو دُور و نزدیک کی رشتہ داری یا قومی احساس یا نہ معلوم کس خیال سے اپنے عیسائی غلام عداس نامی کے ہاتھ ایک کشتی میں کچھ انگور لگا کر آپ کے پاس بھجوائے۔ آپ نے لے لیے اور عداس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور کس مذہب کے پابند؟ اس نے کہا "میں نینوا کا ہُوں اور مذہبًا عیسائی ہوں۔" آپ نے فرمایا "کیا وُہی نینوا جو خُدا کے صالح بندے یونس بن متّٰی کا مسکن تھا۔" عداس نے کہا "ہاں۔ مگر آپ کو یونس کا حال کیسے معلوم ہوا؟" آپ نے فرمایا "وُہ میرا بھائی تھا۔ کیونکہ وُہ بھی اللہ کا نبی تھا اور مَیں بھی اللہ کا نبی ہوں۔" پھر آپ نے اُسے اسلام کی تبلیغ فرمائی جس کا اس پر بہت اثر ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر جوشِ اخلاص میں آپ کے ہاتھ چُوم لیے۔ اس نظارہ کو دُور سے کھڑے کھڑے عتبہ اور شیبہ نے بھی دیکھ لیا، چنانچہ جب عداس ان کے پاس واپس گیا۔ تو انھوں نے کہا عداس! یہ تجھے کیا ہوا تھا کہ اس شخص کے ہاتھ چومنے لگا۔ یہ شخص تو تیرے دین کو خراب کر دے حالانکہ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔[1]

تھوڑی دیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باغ میں آرام فرمایا اور پھر وہاں سے روانہ ہوتے اور نخلہ میں پہنچے جو مکہ سے ایک منزل کے فاصلے پر واقع ہے اور وہاں کچھ دن قیام کیا۔ اس کے سے روانہ ہو کر کوہِ حرا پر آئے۔ اور چونکہ سفرِ طائف کی بظاہر ناکامی کی وجہ سے مکہ والوں کے زیادہ دلیر ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے یہاں سے آپ نے کسی شخص کی زبانی مطعم بن عدی کو کہلا بھیجا کہ مَیں مکہ میں داخل ہونا چاہتا ہُوں، کیا تم مجھے اس کام میں مدد دے سکتے ہو؟ مطعم پکا کافر تھا مگر طبیعت میں شرافت تھی اور ایسے حالات میں انکار کرنا شرفاء عرب کی فطرت کے خلاف تھا، اس لیے اُس نے اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں کو ساتھ لیا اور سب مسلح ہو کر کعبہ کے پاس کھڑے ہو گئے اور آپ کو کہلا بھیجا کہ آجائیں۔ آپ آئے اور کعبہ کا طواف کیا اور وہاں سے مطعم اور اسکی اولاد کے ساتھ تلواروں کے سایہ میں اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ راستہ میں ابوجہل نے مطعم کو اس حالت میں دیکھا تو حیران ہو کر کہنے لگا۔ "اَمُجِیْرٌ اَمْ تَابِعٌ" یعنی کیا تم نے محمدؐ کو صرف پناہ دی ہے یا اس کے تابع ہو گئے ہو؟ مطعم نے کہا "مَیں صرف پناہ دینے والا ہُوں تابع نہیں ہوں۔" اس پر ابوجہل نے کہا "اچھا پھر کوئی حرج نہیں۔" مطعم کفر کی حالت میں ہی فوت ہوا مگر مسلمان ناقدرشناس نہیں تھے۔ حضرت حسان بن ثابت انصاری نے جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درباری شاعر تھے مطعم کے اس شریفانہ برتاؤ پر اسکی مدح میں زوردار اشعار کہے جو ان کے دیوان میں ابتک محفوظ ہیں[2]۔ طائف کا سفر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک خاص واقعہ ہے۔ اس سفر کے حالات سے آپ کی ارفع شان اور بلند ہمتی اور بے نظیر صبر و استقلال

---

[1] ابن ہشام و طبری ؛ [2] بخاری کتاب بدء الخلق ۔

کا پتہ چلتا ہے؛ چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے :-

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سفر طائف میں عظمت اور شجاعت کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ایک تنہا شخص جسے اُس کی قوم نے حقارت کی نظر سے دیکھا اور رد کر دیا وہ خدا کی راہ میں دلیری کے ساتھ اپنے شہر سے نکلتا ہے اور جس طرح یونس بن متّٰی نینوا کو گیا، اسی طرح وہ ایک بُت پرست شہر میں جا کر اُن کو توحید کی طرف بلاتا اور توبہ کا وعظ کرتا ہے۔ اس واقعہ سے یقیناً اس بات پر بہت روشنی پڑتی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے صدقِ دعویٰ پر کس درجہ ایمان تھا۔"

حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا آپؐ کو کبھی جنگ اُحد والے دن سے بھی زیادہ تکلیف پہنچی ہے؟ آپؐ نے فرمایا "عائشہ تیری قوم کی طرف سے مجھے بڑی بڑی سخت گھڑیاں دیکھنی پڑی ہیں۔" اور پھر آپؐ نے سفر طائف کے حالات سُنائے اور فرمایا کہ اس سفر سے واپسی پر میرے پاس پہاڑوں کا فرشتہ آیا اور کہنے لگا کہ مجھے خدا نے آپؐ کے پاس بھیجا ہے تا اگر ارشاد ہو تو میں یہ پہلو کے دونوں پہاڑ اِن لوگوں پر پیوست کر کے ان کا خاتمہ کر دُوں۔" آپؐ نے فرمایا "نہیں نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اِنہی لوگوں میں سے وہ لوگ پیدا کر دے گا جو خدائے واحد کی پرستش کریں گے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنّات کا وفد

طائف کے سفر کے متعلق یہ بھی روایت آتی ہے کہ جب آپؐ اس سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے تو نخلہ میں رات کے وقت جبکہ آپؐ قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف تھے جنّات کا ایک گروہ جو سات نفوس پر مشتمل تھا اور شام کے ایک شہر نصیبینؔ* سے آیا تھا آپؐ کے پاس سے گذرا اور اُس نے آپؐ کی تلاوت کو سُنا اور اس سے متاثر ہوا۔ اور جب یہ جنّ اپنی قوم کی طرف واپس گئے تو اُنھوں نے اپنی قوم سے آپؐ کی بعثت اور قرآن شریف کا ذکر کیا۔ قرآن شریف میں اس واقعہ کا دو جگہ ذکر آتا ہے[1]۔ اور دونوں جگہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن جنّوں کے آنے کا خود براہِ راست علم نہیں ہوا بلکہ ان کے چلے جانے کے بعد خدائی وحی کے ذریعہ اس بات کی اطلاع دی گئی کہ ایک جنّوں کا گروہ آپؐ کی تلاوت کو سُن گیا ہے۔ حدیث میں بھی

---

* زیادہ صحیح طور پر یہ شہر شام اور عراق کے درمیان واقع ہے۔ منہ

[1] سورۃ احقاف : ۳۰ و سورۃ جنّ : ۱

متفرق جگہ اس واقعہ کا ذکر آتا ہے اور گو تاریخی بیان سے حدیث کا بیان بعض تفصیلات میں مختلف ہے مگر مآل ایک ہی ہے کہ جنات کے ایک وفد نے ایک سفر کی حالت میں آپ کی تلاوتِ قرآن کریم کو سُنا اور پھر اس سے متاثر ہو کر اپنی قوم کی طرف واپس لَوٹ گیا[1] یہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ ایک سے زیادہ دفعہ ہوا ہو جس کی وجہ سے روایات میں باہمی اختلاف ہو گیا ہے۔ لیکن اس جگہ ہمیں اس واقعہ کی ظاہری تفصیلات سے زیادہ سروکار نہیں ہے بلکہ مختصر طور پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس جگہ جنات سے کیا مراد ہے اور ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلنا اور پھر کلام مجید کی تلاوت سُن کر واپس لوٹ جانا کس غرض وغایت کے ماتحت تھا۔

سو جاننا چاہیئے کہ جنوں کی ہستی کا عقیدہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کم وبیش دُنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے اور مذہبی اور غیر مذہبی ہر دو قسم کے لٹریچر میں اس کا وجود ملتا ہے مگر اس کی تفصیلات میں بہت اختلاف ہے۔ بعض قوموں کے لٹریچر میں جنات کے اندر ایک قسم کی خدائی طاقت تسلیم کی گئی ہے اور انہیں قابلِ پرستش مانا جاتا ہے۔ بعض میں ان کو بلا استثناء ایک ناپاک مخلوق قرار دیا گیا ہے اور گویا شیطان اور ابلیس کی طرح خیال کیا جاتا ہے مگر اسلام ان ہر دو قسم کے خیالات کو ردّ کرتا ہے اور یہ تعلیم دیتا ہے کہ جن اللہ تعالیٰ کی ایک مخفی مخلوق ہے جس میں انسانوں کی طرح اچھے اور بُرے دونوں قسم کے افراد پائے جاتے ہیں لیکن اس مخلوق کا دائرہ انسانوں سے بالکل جُدا ہے اور ایک علیحدہ عالم سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں اللہ تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت تمثیلی رنگ میں جنوں کے وجود کا خاص خاص انسانوں کو نظارہ کرا دیا جاتا ہے۔ مگر ظاہر حالات میں یہ ہر دو مخلوق ایک دُوسرے سے بالکل جُدا ہیں اور ان کا آپس میں کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ قرآن شریف میں جنوں کا ذکر چھبیس (۲۶) مختلف مقامات پر آتا ہے[2] ان سب مقامات میں جن کے لفظ سے ایک ہی معنے مُراد نہیں ہیں، کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کریں گے یہ لفظ عربی زبان میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن ان ۲۶ مقامات کے مجموعی مطالعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وُہ یہی ہے کہ جن خدا تعالیٰ کی ایک مخفی مخلوق ہے جو انسانوں کی طرح (گو اپنی تفصیلات میں یقیناً اس سے بہت مختلف) ترقی اور تنزل دونوں کا مادہ رکھتی ہے اور اپنے اعمال

---

[1] مثلاً دیکھو صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الجہر فی الصبح ؂

[2] سورۃ سبا: ۱۳، ۱۵، ۴۲ ؂ سورۃ ذاریات: ۵۷ ؂ سورۃ انعام: ۱۰۰، ۱۱۲، ۱۲۸، ۱۳۰ سورۃ رحمٰن: ۳۴ ؂ سورۃ اعراف: ۳۹، ۱۸۰ ؂ سورۃ کہف: ۵۱ ؂ سورۃ نمل: ۱۸، ۴۰ سورۃ فُصّلت یعنی حٰمٓ سجدہ: ۲۶، ۲۹ ؂ سورۃ احقاف: ۱۹، ۳۹ ؂ سورۃ جن: ۱، ۶ سورۃ بنی اسرائیل: ۸۹ ؂ سورۃ ہود: ۱۲۰ ؂ سورۃ سجدہ: ۱۴ ؂ سورۃ الناس: ۷ ؂

میں اچھے اور بُرے رستے کے اختیار کرنے کے لیے اپنی حدودِ مقررہ کے اندر اندر صاحبِ اختیار ہے مگر جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے جنّ کا لفظ قرآن کریم میں ہر جگہ اس مخفی مخلوق کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ بعض جگہ یہ لفظ غیر اصطلاحی معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

دراصل جنّ ایک عربی لفظ ہے جس کے روٹ میں چھُپنے یا چھُپانے یا نظروں سے پوشیدہ ہونے یا پردہ میں رہنے یا آڑ میں آجانے یا سایہ یا اندھیرا کرنے کے معنے ہیں۔ چنانچہ عربی میں جنّت باغ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے درخت زمین پر سایہ کر کے اُسے چھپا لیتے ہیں۔ جنین اس بچّہ کو کہتے ہیں جو ابھی رحمِ مادر میں ہے کیونکہ وہ رحم کے پردوں میں مخفی ہوتا ہے۔ مجنّہ ڈھال کو کہتے ہیں، کیونکہ اس کے پیچھے ایک جنگجو سپاہی لڑائی کے وقت میں آڑ لیتا ہے۔ جنون دیوانگی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ جَنان دل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سینہ میں مخفی ہوتا ہے۔ اسی طرح جنان رات یا لباس کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اندھیرا کرنے یا ڈھانکنے کا ذریعہ ہیں۔ جَنَن قبر یا کفن کو کہتے ہیں کیونکہ یہ دونوں مُردے کو اپنے اندر چھپا لیتے ہیں۔ جَانّ سانپ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ عموماً زمین کے مخفی سوراخوں میں زندگی گذارتا ہے۔ مِجنّہ اوڑھنی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سر اور چھاتی کو ڈھانکتی ہے وغیرہ ذالک[1]۔ اس اصل کے ماتحت بعض اوقات عربی محاورہ میں جنّ کا لفظ ایسے اُمراء و رؤساء کے لیے بھی استعمال ہو جاتا ہے جو بوجہ امارت اور علوِّ منزلت اور استکبار کے عام لوگوں کی سوسائٹی میں میل جول نہیں رکھتے اور علیحدگی میں زندگی گذارتے ہیں، چنانچہ بسا اوقات قرآن شریف میں جنّ کا لفظ اِنس یعنی عامۃ الناس کے مقابلہ میں امراء کے طبقہ کے لیے استعمال ہوا ہے اور ان معنوں میں یہ لفظ عموماً بُرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ایسی قوموں پر بھی جنّ کا لفظ بول دیتے ہیں جو کسی ایسی علیحدہ اور منقطع جگہ میں آباد ہوں کہ دُوسرے لوگوں کے ساتھ ان کا زیادہ میل ملاپ ممکن نہ ہو اور انہی دو معنوں کے پیشِ نظر بعض محققین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنّوں کے وفد کے حاضر ہونے سے یہ مُراد لیا ہے کہ یہ لوگ یا تو خاص امراء کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں گے جنھوں نے برملا طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پرہیز کیا اور علیحدگی میں آپؐ کا کلام سُنکر واپس چلے گئے اور یا وہ کسی دُور افتادہ قوم کے افراد ہوں گے جو اپنے ماحول کی وجہ سے دُوسرے لوگوں سے بالکل جُدا اور علیحدہ رہتی ہوگی۔ ہمیں ان معنوں کے قبول کرنے میں کوئی تامّل نہیں ہے اور اگر نخلہ میں جنّوں کے وفد کے حاضر ہونے سے مراد اُمراء کے کسی وفد کا حاضر ہونا یا کسی دُور افتادہ منقطع قوم کے افراد کا پیش ہونا مراد ہے تو پھر اس میں خدا تعالیٰ کا یہ اشارہ ہوگا کہ اے رسُول! مکّہ اور طائف میں بظاہر اپنی ناکامیوں کو دیکھ کر پریشان اور دلگیر نہ ہو کیونکہ اب وقت آتا ہے کہ عوام الناس تو کیا بڑے

---

[1] اقرب الموارد۔

بڑے امیر وکبیر لوگ تیرے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے اور دُنیا کی دُور افتادہ قومیں تیری غلامی کا جُوا اپنی گردنوں پر رکھیں گی۔

لیکن اگر جنّ سے وہ مخفی مخلوق مراد ہے جس کی تفصیلات کا ہم کو علم نہیں، لیکن اس کا وجود نصوص قرآنی کے ساتھ ثابت ہے تو اس میں بھی کسی عقلمند انسان کو شُبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کی خلق کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ کسی مخلوق کی نظر اس کی انتہا کو نہیں پا سکتی۔ جہاں انسان کے سوا اس مَرئی دُنیا میں ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں قسم کی دُوسری مخلوق موجود ہے جن میں سے بعض قسم کی مخلوق مَرئی ہونے کے باوجود ہماری کوتاہ نظر سے پوشیدہ رہتی ہے اور اس مخلوق کے وجود پر علم طب اور سائنس کے دُوسرے شعبے یقینی قطعی شاہد ہیں تو پھر اس بات کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق جنّ کی قسم کی بھی موجود ہوگی جو باوجود انسانی نظر سے پوشیدہ ہونے کے اسی طرح زندہ اور قائم ہوگی جس طرح انسان اپنے دائرہ کے اندر زندہ اور قائم ہے۔ بیشک اسلام ہمیں اس رنگ میں جنّات کی تعلیم نہیں دیتا کہ ہم ہوہو مہ بھوتوں وغیرہ کی صورت میں کسی ایسی مخلوق کے قائل ہوں جس کے افراد انسانی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہوئے انسان کے لیے ایک تماشہ بنتے پھریں اور انسان کے سامنے مختلف صورتیں بدل بدل کر اُس کی تفریح یا تخویف کا سامان بہم پہنچائیں۔ یہ خیالات جاہلانہ توہم پر مبنی ہیں۔ جن کا کوئی ثبوت اسلامی تاریخ یا حدیث یا قرآن کریم میں نہیں ملتا مگر یہ کہ جسطرح دُنیا میں اللہ تعالیٰ کی بیشمار دُوسری مخلوق ہے جس میں بڑی چھوٹی کثیف لطیف۔ مَرئی وغیر مَرئی ہر قسم کی چیزیں شامل ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق جنّ بھی ہے جو جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے۔ انسان کی نظروں سے مخفی ہے اور ایک جداگانہ عالم سے تعلق رکھتی ہے اور عام حالات میں انسان کے ساتھ اس کا کوئی سروکار نہیں۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس پر کوئی عقلمند اعتراض نہیں کر سکتا۔

باقی رہا یہ سوال کہ ان معنوں کی رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنّات کے وفد آنے سے کیا مراد ہے سو اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نظارہ ایک کشفی نظارہ سمجھا جائے گا اور اس سے مراد یہ ہوگی کہ اس انتہائی درجہ پریشانی اور بے بسی کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نظارہ دکھا کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اے رسُول گو دیسے ہر وقت ہی ہماری نصرت تیرے ساتھ ہے لیکن جس طرح گرمی کی شدت خاص طور پر بادل کو کھینچتی ہے اسی طرح اب وقت آگیا ہے کہ ہماری مخفی طاقتیں تیری رسالت کی تائید میں خصوصیت کے ساتھ مصروفِ کار ہو جائیں؛ چنانچہ اس کے بعد جلد ہی حالات نے پلٹا کھایا اور ہجرت یثرب کا پردہ اُٹھتے ہی خدا کی مخفی تجلّیات اسلام کے جھنڈے کو اٹھا کر کہیں کا کہیں لے گئیں۔ اور روایات میں جو سات کا لفظ آتا ہے سو اس سے مخفی طاقتوں کا کامل ظہور مراد ہے کیونکہ عربی میں سات کا عدد کمال کے اظہار کے لیے آتا ہے اور شام کے شہر نصیبین

میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فتوحات کی رو عرب کے بعد شام کے ملک سے شروع ہوگی۔ واللہ اعلم۔

قبیلہ دوس میں اسلام

ابتدائی ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی کوششوں کے علاوہ اشاعتِ اسلام کا بڑا ذریعہ یہی تھا کہ کسی قبیلہ کا کوئی شخص اسلام لے آیا تو پھر اس کے ذریعہ سے اس قبیلہ میں آہستہ آہستہ اسلام پھیلنے لگا۔ یا مسلمان مکہ سے نکل کر کہیں گئے تو اپنے ساتھ اِس نُور کی شعاعوں کو بھی لیتے گئے۔ مثلاً قبیلہ بنو غفار میں ابوذرؓ غفاری کے واسطے سے اور حبشہ میں مہاجرینِ حبشہ کے ذریعہ سے اور یمن کے قبیلہ اشعر میں ابو موسیٰ اشعری کے مسلمان ہونے سے اسلام داخل ہو چکا تھا۔ اب خُدا کے فضل سے ایک اور قبیلہ میں بھی اس کا اثر پہنچ گیا اور وہ یوں ہوا کہ طفیل بن عمرو قبیلہ دوس کا ایک معزز رئیس تھا اور شاعر بھی تھا۔ وہ کسی تقریب پر مکہ آنکلا۔ قریش نے اُسے دیکھا تو فکر پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور مسلمان ہو جاوے۔ اس لیے وہ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ "تم ہمارے شہر میں ایسی حالت میں آئے ہو کہ یہاں ایک شخص نے ہم میں سخت فتنہ اور تفرقہ ڈال رکھا ہے۔ اس کی باتیں باپ کو بیٹے سے، بھائی کو بھائی سے اور خاوند کو بیوی سے جُدا کر دیتی ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ تم اس کی ساحرانہ باتیں سُنو اور متاثر ہو جاؤ۔ لہٰذا ہم تمھیں بروقت ہوشیار کرتے ہیں کہ دیکھنا کہیں اس کی باتوں میں نہ آجانا۔" طفیل کہتے ہیں کہ مجھے قریش نے اِس معاملہ میں اس طرح بار بار تاکید کی کہ میں ان کی بات کو سچا سمجھ کر بہت خائف ہو گیا حتیٰ کہ میں نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے کان میں اچانک اس ساحر کی کوئی آواز پڑ جاوے اور میں کسی فتنہ میں مبتلا ہو جاؤں۔ میں ایک دن اسی حالت میں صبح کے وقت مسجد حرام میں گیا تو وہاں میں نے ایک کونہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ مجھے یہ نظارہ بھلا معلوم ہوا اور میں آہستہ آہستہ آپؐ کے قریب چلا گیا۔ خدا کی قدرت! باوجودیکہ میرے کان بند تھے پھر بھی کچھ کچھ آواز مجھے سُنائی دینے لگی اور میں نے دل میں کہا۔ "میری ماں مجھے کھوئے۔[1] میں ایک سمجھدار شخص ہوں اور نیکی بدی کی تمیز رکھتا ہوں۔ پس کیا حرج ہے کہ میں اس شخص کی بات سُن لوں۔ اگر وہ اچھی ہوئی تو مان لوں گا اور اگر بُری ہوئی تو انکار کر دوں گا۔" یہ خیال دل میں آنا تھا کہ میں نے کانوں سے روئی نکال پھینکی اور قرآن کی تلاوت سُنتا رہا۔ اور جب رسول اللہ نماز ختم کر چکے اور گھر کی طرف لوٹے تو میں ساتھ ہو لیا اور آپؐ سے عرض کیا کہ مجھے آپؐ اپنی باتیں سُنائیں۔ آنحضرت

---

[1] یعنی میں مروں۔ یہ ایک عربی کا محاورہ ہے جو کسی غلطی وغیرہ کے ارتکاب پر استعمال کیا جاتا ہے اور مُراد یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک ایسا کام ہے کہ اس سے مرنا بہتر ہے۔ منہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کلام الٰہی سنایا اور توحید کی تبلیغ فرمائی جس کا یہ اثر ہوا کہ میں وہیں مسلمان ہوگیا۔ پھر میں نے آپ سے عرض کیا۔ یارسول اللہ! میں اپنے قبیلے میں ممتاز حیثیت رکھتا ہوں اور لوگ میری بات مانتے ہیں۔ پس آپ دعا کریں کہ میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کو اسلام کی ہدایت دے۔ آپ نے اجازت دی اور دعا فرمائی۔ جب طفیل اپنے قبیلہ میں پہنچے تو انھوں نے سب سے پہلے اپنے والد اور بیوی کو تبلیغ کی اور وہ مسلمان ہوگئے۔ پھر قبیلہ والوں کی طرف رُخ کیا اور ان کو اسلام کی طرف بلایا، مگر انھوں نے انکار کیا اور نہ مانا بلکہ نفرت و مخالفت میں بڑھتے گئے۔ یہ حالت دیکھ کر طفیل پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یارسول اللہ! میری قوم نے تکذیب کی ہے اور مخالفت میں بڑھ گئی ہے۔ پس اب آپ اُن کے واسطے بددعا کریں۔ آپ نے ہاتھ اُٹھاتے مگر بجائے بددعا کرنے کے یہ الفاظ فرمائے کہ: اَللّٰھُمَّ اِھْدِ دَوْسًا "یعنی اے میرے اللہ تو قبیلہ دوس کو ہدایت دے" اور پھر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اپنی قوم کی طرف واپس چلے جاؤ اور نرمی اور محبت سے تبلیغ میں لگے رہو۔ طفیل کہتے ہیں کہ میں پھر اپنے قبیلہ کی طرف واپس آیا اور ان میں تبلیغ کرتا رہا۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کی اور جنگِ بدر اور اُحد اور احزاب ہوچکیں تب جاکر میری قوم نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد میں اُن میں سے ستر خاندانوں کے ساتھ مدینہ میں ہجرت کر آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگِ خیبر میں مصروف تھے[1] حضرت ابوہریرہؓ جو احادیث کے ایک مشہور راوی ہیں قبیلہ دوس سے تھے اور انہی لوگوں میں مدینہ آئے تھے۔

طفیلؓ بن عمرو دوسی کے متعلق یہ بھی روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو قریش مکہ نے بہت زیادہ تنگ کرنا شروع کیا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ میرے پاس چل کر قیام فرمادیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب ہجرت کا حکم دے گا، تبھی میرا نکلنا ہوگا اور پھر جہاں کا ارشاد ہوگا وہیں جانا ہوگا۔"

معراج اور اسراء

معراج اور اسراء کے مسئلہ کو اسلامی لٹریچر میں جو پوزیشن حاصل ہے اور جو لمبی لمبی بحثیں اس بارے میں کی گئی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ بحثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تھوڑا عرصہ بعد سے لیکر آج تک کے لٹریچر میں پائی جاتی ہیں، مگر ہمیں ایک مؤرخ ہونے کی حیثیت میں ان بحثوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ معراج اور اسراء کے متعلق تاریخی لحاظ سے جو بات ثابت ہے اسے مختصر طور پر اپنے ناظرین کے

---

[1] ابن ہشام و اسد الغابہ۔

سامنے رکھ دیں مگر پیشتر اس کے کہ اصل واقعات بیان کیے جائیں بعض ان اصولی غلطیوں کا ذکر ضروری ہے جو اس بحث میں عام طور پر واقع ہوئی ہیں جن میں بدقسمتی سے خود مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی مبتلا ہو گیا ہے۔

پہلی غلطی یہ ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے ایک حصہ نے اور ان کی پیروی میں بیشتر غیر مسلم مؤرخین نے یہ سمجھ لیا ہے کہ معراج اور اسراء ایک ہی واقعہ کے دو مختلف نام ہیں یا کم از کم یہ کہ وہ ایک ہی واقعہ کے دو مختلف حصوں کے نام ہیں حالانکہ قرآن شریف اور صحیح احادیث اور مستند تاریخی روایات کے مطالعہ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دراصل معراج اور اسراء دو مختلف چیزیں ہیں جو خواہ ایک دوسرے کے قریب قریب واقع ہوئی ہوں اور خواہ ان کا آپس میں روحانی رنگ میں کوئی جوڑ اور رابطہ بھی ہو مگر حقیقتہً وہ ایک دوسرے سے جدا اور مختلف ہیں یعنی معراج تو اس روحانی سفر کا نام ہے جس میں آپ کو مکہ سے اٹھا کر آسمان تک پہنچایا گیا جہاں بالآخر آپ خداوندِ عالمیان کے دربار میں پیش ہوئے۔ اور اسراء ایک دوسرا سفر ہے جو آپ کو بعض مصالح کے ماتحت مکہ سے لیکر بیت المقدس تک کرایا گیا۔ قرآن شریف نے ان ہر دو سفروں کو علیحدہ علیحدہ سورتوں میں علیحدہ علیحدہ کیفیات اور تفاصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؛ چنانچہ سورۃ نجم[1] میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس روحانی پرواز کا ذکر آتا ہے۔ وہ معراج ہے۔ جیسا کہ بخاری میں بھی سورۃ نجم کی آیات کو معراج کے واقعہ پر چسپاں کر کے اشارہ کیا گیا ہے[2] اور سورۃ بنی اسرائیل میں[3] جس سفر کا ذکر ہے وہ اسراء ہے۔ اور ان دونوں کی تفصیلات اور کیفیات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں اسراء کا واقعہ بیان کرتے ہوتے قرآن شریف نے آسمان کا ذکر تک نہیں کیا اور سورۃ نجم کے بیان میں بیت المقدس کا کوئی ذکر نہیں آتا۔

اسی طرح احادیث کے بغور مطالعہ سے بھی معراج اور اسراء کا جدا جدا ہونا ثابت ہوتا ہے چنانچہ بخاری میں جو قرآن شریف کے بعد اسلامی لٹریچر میں صحیح ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ اسراء اور معراج کے علیحدہ علیحدہ باب باندھ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ دو مختلف چیزیں ہیں[4] اور دونوں سفروں کی جدا جدا ابتداء بیان کرنے میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ ہر دو سفر ایک دوسرے سے جدا تھے۔ یعنی جہاں اسراء کے متعلق یہ الفاظ آتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے لے کر بیت المقدس تک کی سیر کرائی گئی وہاں معراج کے متعلق یہ الفاظ آتے ہیں کہ آپ کو مکہ سے آسمان کی طرف اٹھایا گیا۔ گویا ہر دو سفروں کی ابتداء علیحدہ علیحدہ طور پر مکہ سے ہی ہوئی جس سے ان کا ایک دوسرے سے

---

[1] النجم: ۸تا۱۱ ۞ [2] بخاری کتاب التوحید باب قَوْلِهٖ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۞ [3] بنی اسرائیل: ۲

[4] دیکھو بخاری ابواب الاسراء والمعراج

جُدا اور متغائر ہونا ظاہر و عیاں ہے[1]۔ علاوہ ازیں باوجود اس کے کہ معراج کی حدیث بخاری میں چھ مختلف جگہوں میں بیان ہوئی ہے[2] اور اسی طرح اِسراء کی حدیث بھی متعدد جگہ آئی ہے اور بعض جگہ راویوں کی بے احتیاطی سے جزوی طور پر اسراء اور معراج کے بیان میں کسی قدر خلط بھی ہو گیا ہے لیکن کہیں بھی معراج کے بیان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس کی طرف جانا مذکور نہیں ہوا بلکہ ساری کی ساری روایات میں مکہ سے سیدھا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا بیان کیا گیا ہے۔ جس سے معراج کا اسراء سے جُدا ہونا یقینی طور پر ثابت ہے۔ اسی طرح سیرت ابن ہشام میں جو سیرۃ کی کتابوں میں سب سے زیادہ متداول کتاب ہے۔ معراج اور اسراء کو بالکل علیحدہ علیحدہ طور پر بیان کیا گیا ہے اور یہ تصریح ہے کہ مکہ سے لے کر بیت المقدس تک کے سفر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں واپس تشریف لے آتے تھے اور معراج کا واقعہ علیحدہ طور پر ہوا تھا[3]۔ اسی طرح مشہور مؤرخ ابن سعد نے بھی معراج اور اسراء کو علیحدہ علیحدہ تاریخوں میں علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[4]۔ ان شہادتوں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ خواہ معراج اور اسراء کا روحانی طور پر آپس میں کوئی تعلق اور رابطہ ہو مگر واقعہ کے لحاظ سے وہ ایک دُوسرے سے بالکل مختلف اور متغائر چیزیں تھیں جو جُدا جُدا طور پر علیحدہ علیحدہ کوائف کے ساتھ وقوع پذیر ہوئیں؛ چنانچہ متقدین میں سے بھی ایک معتد بہ حصہ نے معراج اور اسراء کو علیحدہ علیحدہ قرار دیا ہے[5]۔

دُوسری غلطی اس بحث میں یہ ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سفروں کو ظاہری سفر قرار دے دیا گیا ہے جو گویا اس مادی جسم کے ساتھ وقوع پذیر ہوئے؛ حالانکہ مذکورہ بالا تینوں شہادتیں اس خیال کو بھی سختی سے ردّ کرتی ہیں؛ چنانچہ قرآن شریف میں معراج کے متعلق جو بیان آتا ہے۔ اس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی[6] یعنی اس موقعہ پر جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل نے دیکھا وہ بالکل ٹھیک اور سچ تھا اور آپؐ کے قلبِ صافی نے اس نظارہ کے دیکھنے اور سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ یہ ایک قلبی نظارہ تھا نہ کہ ایک جسمانی اور مادی سفر۔ اسی طرح حدیث میں بھی یہ واضح اشارہ پایا جاتا ہے کہ معراج ایک روحانی امر تھا چنانچہ

---

[1] دیکھو بخاری ابواب الاسراء والمعراج ٭ [2] دیکھو بخاری کتاب الصلوٰۃ باب کَیْفَ فُرِضَتِ الصَّلوٰۃُ و کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ و باب ادریس علیہ السلام و باب کَانَ النَّبِیُّ تَنَامُ عَیْنُہٗ وَلَا یَنَامُ قَلْبُہٗ و باب المعراج و کتاب التوحید باب قولہ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ٭ [3] سیرۃ ابن ہشام ذکر الاسراء ٭
[4] طبقات ابن سعد جلد ۱ ٭ [5] دیکھو زرقانی بحث اسراء و معراج جلد ۱ و جلد ۶ و خمیس ذکر اسراء و معراج و سیرت حلبیہ ذکر معراج ٭ [6] سورۃ نجم: ۸ تا ۱۰ ٭

حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر اُٹھائے جانے کا نظارہ دکھایا گیا۔ اس وقت آپؐ سو رہے تھے مگر یہ کہ آپؐ کا یہ سونا عام لوگوں کی طرح کا سونا نہ تھا بلکہ اس خاص شانِ نبوت سے تعلق رکھتا تھا جس میں آپؐ کی آنکھ تو سوتی تھی مگر دل بیدار رہتا تھا[1]۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ مذکور ہے کہ معراج کا نظارہ آپؐ کو نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں دکھایا گیا[2]۔ اور ایک تیسری روایت میں یہ مذکور ہے کہ معراج کے نظارہ کے بعد آپؐ بیدار ہو گئے[3]۔ اور ایک چوتھی روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر کوئی شخص تم میں سے یہ کہے کہ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جسمانی آنکھوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کو دیکھا تو وہ جھوٹا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ مانو۔ اور فرماتی ہیں کہ میرے تو اس خیال سے ہی بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں کہ آپؐ نے ان جسمانی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو دیکھا تھا[4]۔ پھر کتب سیرۃ میں بھی ایسی روایات کی کمی نہیں ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج ایک روحانی امر تھا نہ کہ ظاہری اور جسمانی سفر۔ چنانچہ مشہور اسلامی مؤرخ ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ مَا فُقِدَ جَسَدُہٗ یعنی معراج کی رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک غائب نہیں ہوا بلکہ تمام وقت اسی مادی دُنیا میں موجود رہا[5]۔ اس سے بڑھ کر معراج کے روحانی ہونے کے متعلق کیا شہادت ہوگی؟

اسی طرح اسراء کے متعلق قرآن شریف اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ وہ ایک رُوحانی امر تھا جو خاص مصالح کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا؛ چنانچہ قرآن شریف نے اس کے متعلق تین باتیں بیان کی ہیں۔ اوّل یہ کہ سفر رات کے وقت ہوا جیسا کہ اَسْرٰی کے لفظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ دوم یہ کہ وہ ایک ہی رات کے دوران میں مکمل ہو کر ختم ہو گیا جیسا کہ لَیْلًا کے لفظ سے پایا جاتا ہے۔ اور سوم یہ کہ اس سفر کی غرض و غایت یہ تھی کہ ہم اپنے رسُول کو اپنے بعض نشانات دکھائیں[6]۔ اب جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ تینوں باتیں اسراء کو ایک رُوحانی سیر ثابت کرتی ہیں نہ کہ ایک ظاہری اور جسمانی سفر۔ کیونکہ اوّل تو عام حالات میں ظاہری سفر کا وقت دن ہے اور رات کے وقت سفر کرنا ایک استثنائی صورت رکھتا ہے۔ اور اس کے مقابل پر روحانی سیر یعنی رؤیا وغیرہ کے لئے اصل وقت رات ہے اور دن کے وقت اس کا واقع ہونا ایک گونہ استثنائی رنگ رکھتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رات کا لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ یہ ایک روحانی سفر تھا جو بصورت رویاء وقوع پذیر ہوا۔ ورنہ رات کے ذکر میں کوئی خاص حکمت نظر نہیں آتی۔ دُوسرے اس سفر کے متعلق ان الفاظ کا استعمال کیا جانا کہ وہ ایک رات کے دوران میں مکمل ہو کر ختم ہو گیا سوائے

۱؎ بخاری ابواب صفۃ النبی باب تَنَامُ عَیْنُہٗ وَلَا یَنَامُ قَلْبُہٗ ۔ ۲؎ بخاری ابواب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ ۔
۳؎ بخاری کتاب التوحید باب قَوْلِہٖ وَكَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ۔ ۴؎ بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر سورۃ نجم ۔
۵؎ ابن ہشام ذکر الاسراء ۔ ۶؎ سورۃ بنی اسرائیل : ۲ ۔

اس کے اور کسی غرض و غایت کے لیے نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے رُوحانی ہونے کی طرف اشارہ کیا جائے۔ کیونکہ عام حالات میں مادی اسباب کے ماتحت مکہ سے لے کر بیت المقدس تک کا سفر ایک رات کے اندر اندر پُورا ہونا بالکل ممکن نہ تھا۔ تیسرے اس سفر کی غرض و غایت کے متعلق جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے اپنے بندے کو یہ سفر اس لیے کرایا ہے کہ اُسے اپنے بعض نشانات دکھائیں، یہ بھی اسے ایک رُوحانی امر ثابت کرتا ہے کیونکہ مکہ سے لے کر بیت المقدس کا ظاہری اور جسمانی سفر خواہ وہ ایک رات کے قلیل عرصہ میں ہی تکمیل کو پہنچ جائے ایک عجوبہ نمائی کے سوا اپنے اندر کوئی خاص شان کا پہلو نہیں رکھتا جسے مقامِ نبوّت کے مناسب حال سمجھا جا سکے؛ البتہ اگر اس سفر کو کشفی رنگ میں ایک رُوحانی امر سمجھا جائے جس سے تصویری زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مُسلمانوں کی آئندہ ترقیات اور فتوحات مُراد ہوں تو تب بیشک وہ ایک مقتدرانہ پیشگوئی کی صورت میں ایک بہت بڑا نشان قرار پاتا ہے جس کے مقابل پر ظاہری سفر کو کچھ بھی حیثیت حاصل نہیں۔ علاوہ ازیں قرآن شریف نے اسی سورۃ بنی اسرائیل میں جس کے ابتداء میں اسراء کا ذکر آتا ہے، اسراء کے متعلق رؤیا کا لفظ استعمال کیا ہے[1]۔ جس سے اس بات میں کوئی شُبہ نہیں رہتا کہ یہ سفر ایک رؤیا کے رنگ میں تھا نہ کہ ایک ظاہری اور جسمانی سفر۔ مگر اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عربی میں رؤیا کے معنے صرف خواب کے نہیں ہوتے بلکہ عربی محاورہ کے مطابق رؤیا کا لفظ ہر اس رُوحانی نظارہ پر بولا جاتا ہے جو کسی انسان کو بطریق خواب یا کشف وغیرہ دکھایا جائے اور ہر قسم کے رُوحانی مناظر اس کے اندر شامل ہیں۔ پس جہاں اسراء یا معراج کے متعلق رؤیا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہاں اس سے اُردو محاورہ کے مطابق خواب مُراد نہیں ہوتی بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا رُوحانی کشف مُراد ہوتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی اَرفع اور اَعلیٰ شان کے مطابق خاص مصالحِ الٰہی کے ماتحت دکھایا گیا۔ بہرحال قرآن شریف نے واضح ارشادات کے ذریعہ اس بات کو کھول کر بتا دیا ہے کہ اسراء کوئی مادی امر نہیں تھا بلکہ وہ رُوحانی سفر تھا جس کی غرض و غایت خدا کے بعض مقتدرانہ نشانات دکھانا ہی تھی۔

اسی طرح حدیث میں بھی اسراء کے متعلق صاف اشارہ آتا ہے کہ وہ ایک رُوحانی امر تھا نہ کہ جسمانی اور ظاہری سفر۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مکہ کی مسجد حرام سے لیکر بیت المقدس کی مسجد اقصٰی تک سیر کرائی تو اس پر کفارِ مکہ نے جن میں سے بعض بیت المقدس کو دیکھ چکے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بیت المقدس نہیں گئے یہ اعتراض کیا کہ اگر آپ کا یہ دعویٰ دُرست ہے تو آپ بیت المقدس کا کوئی نظارہ بیان کریں۔

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل : ۶۱

اس پر آنحضرت کی طبیعت میں بے چینی پیدا ہوئی۔ کیونکہ گو آپؐ رؤیا میں بیت المقدس کو دیکھ چکے تھے مگر آپ جانتے تھے کہ یہ ایک رؤیا کا معاملہ ہے جس میں ممکن ہے کہ آپؐ کے ذہن کا نقشہ ظاہر کے ساتھ بالکل مطابقت نہ رکھتا ہو اور آپؐ کو رؤیا کے مخصوص مناظر کے سوا بیت المقدس کے عام مناظر کا علم بھی نہیں تھا اس لیے طبعاً آپؐ کو کفار کے اس اعتراض پر لوگوں کی ٹھوکر کے خیال سے فکر پیدا ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے فوراً کشفی رنگ میں بیت المقدس کا ظاہری نقشہ آپؐ کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا اور آپؐ نے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرماتے ہوئے کفار کو بتایا کہ بیت المقدس کی یہ یہ نشانیاں ہیں[1]۔ اس پر کفار شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔ اب اگر اسراء اس ظاہری جسم کے ساتھ ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کے مناظر کو واقعی اپنی ان جسمانی آنکھوں کے ساتھ ملاحظہ فرما چکے تھے۔ تو کفار کے اعتراض پر آپؐ کو فکرمند ہونے اور اللہ تعالیٰ کو بیت المقدس کا دوبارہ نظارہ کروانے کی کیا ضرورت تھی؟ کفار کے اعتراض پر آپؐ کا فکرمند ہونا اور خدا تعالیٰ کا دوبارہ نظارہ دکھانا صاف ظاہر کرتا ہے کہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قبل بیت المقدس کو حقیقی طور پر نہیں دیکھا تھا اور صرف اعتراض ہونے پر اس کا حقیقی نظارہ دکھایا گیا اور پہلا نظارہ جو اسراء کے موقعہ پر ہوا تھا، اس میں بیت المقدس کا نقشہ صرف عالمِ رؤیا کا ایک اجمالی نقشہ تھا جس کی بنا پر آپؐ اس بستی کی تفصیلات نہیں بتا سکتے تھے۔

الغرض قرآن شریف اور احادیث اور تاریخ تینوں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ معراج اور اسراء خالصۃً رُوحانی امور تھے جو بعض خاص مصالح کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے گئے اور جن لوگوں نے اس کے خلاف ادّعا کیا ہے ان کے ہاتھ میں سوائے کمزور اور بودے استدلالات کے اور کچھ نہیں۔ ہاں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ہماری مراد معراج اور اسراء کے رُوحانی ہونے سے ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ نظارے معمولی خواب کے نظارے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند کی حالت میں دکھائے گئے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے اس نے اسراء اور معراج کی حقیقت کو ہرگز نہیں سمجھا اور یقیناً وہ ان لوگوں سے بڑھ کر غلطی خوردہ ہے جو ان مناظر کو جسمانی اور ظاہری حالت کے ساتھ وابستہ قرار دیتے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ جس طرح ہر شخص کے روحانی مقام کے لحاظ سے اس کے رُوحانی قویٰ تیز اور لطیف ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کے مقابل پر اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کے لیے اُن کے مقامِ قرب کے لحاظ سے روحانی بلندیوں کے دروازے کھولتا ہے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ روحانی مناظر آپؐ کے اَرفع و اَعلیٰ مقام کے لحاظ سے

---

[1] دیکھو بخاری تفسیر سورۃ بنی اسرائیل آیت اسراء و مسلم باب فی ذکر المسیح ابن مریم و تفسیر ابن کثیر آیت اسراء۔

دوسروں کے لطیف ترین کشوف سے بھی آگے نکلے ہوتے تھے جن میں آپؐ کو ایک سراسر نورانی جسم کے ساتھ ان بلند ترین رُوحانی چوٹیوں کی سیر کرائی گئی جہاں آج تک کسی بشر کا قدم نہیں پہنچا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے مقابل پر محض ایک خواب کو کچھ بھی حیثیت حاصل نہیں اور نہ ہی اس کے سامنے محض ایک ظاہری اور جسمانی پرواز کو جو ایک عجوبہ نمائی سے بڑھ کر نہیں کوئی حقیقت حاصل ہے۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کسی بشر کو اس جسمِ عنصری کے ساتھ آسمان پر لے جانے کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ قرآن شریف اور صحیح احادیث اور مستند تاریخی روایات سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اسراء یا معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جسمِ عنصری کے ساتھ اٹھائے گئے ہوں بلکہ اس کے برعکس جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت لطیف اور پاکیزہ قسم کی رُوحانی پرواز تھی جو بطریق رؤیا آپؐ کو کرائی گئی اور تصویری اور تعبیری زبان میں اس پرواز کے اندر بہت سے حقائق اور اشارات مخفی تھے جو ایک عظیم الشان نشان کے طور پر اپنے وقت پر پورے ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ دُوسری طرف اس جگہ اس بات کے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ گو خدائی قدرت کے لحاظ سے سبھی کچھ ممکن ہے مگر خدا تعالیٰ نے بعض امور کو خود اپنی سنت کے خلاف قرار دیدیا ہے۔ اور انہی میں کسی بشر کا اس جسمِ عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھایا جانا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں صراحت کے ساتھ یہ ذکر آتا ہے کہ جب ایک موقعہ پر کفارِ مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معجزہ طلب کیا کہ آپؐ ہمیں آسمان پر چڑھ کر دکھلا دیں تو آپؐ نے انہیں خدائی منشاء کے ماتحت یہ جواب دیا کہ سُبْحَانَ اللہ ! مَیں تو صرف ایک انسان رسول ہُوں اور ایک انسان رسُول کا اس طرح آسمان پر جانا خدائی سُنت کے خلاف ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ واقعہ قرآن شریف نے اسی سورۃ میں بیان فرمایا ہے جس میں اسراء کا ذکر آتا ہے[1] اسی طرح بعض دوسری آیات میں بھی یہ صاف مذکور ہے کہ ایک انسان اس دنیوی زندگی میں عالمِ مادی کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتا[2]

اسراء اور معراج کے بارے میں دو اصولی غلطیوں کے ازالہ کے بعد ہم اصل واقعہ کو لیتے ہیں یعنی یہ کہ ان کشوف کی تفصیلات کیا تھیں۔ وہ کس جہت سے آیاتِ الٰہی کے حامل تھے اور وہ کب وقوع پذیر ہوئے۔ پہلے ہم معراج کو لیتے ہیں۔ سو جاننا چاہئیے کہ معراج ایک عربی لفظ ہے جو عَرَجَ سے نکلا ہے جس کے معنے اُوپر چڑھنے کے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے عربی میں معراج سیڑھی کو بھی کہتے ہیں جو گویا اُوپر چڑھنے کا آلہ اور واسطہ ہے۔ معراج کی تفصیل قرآن شریف میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ:-

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۔ ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۔ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۔

---

[1] دیکھو سورۃ بنی اسرائیل: ۹۴ ﴿ [2] مرسلات: ۲۷ و انعام: ۳۶ ﴿

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۔ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۔ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۔ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۔ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۔ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى [1]

"یعنی خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خود تعلیم دی ہے۔ وہی خدا جو بڑی طاقتوں کا مالک اور صاحبِ قوت وسطوت ہے سو (اس تعلیم کے نتیجہ میں) یہ رسُول ایستادہ ہوکر بلند ہوا حتّٰی کہ وہ بلند ہوتا ہوتا افقِ اعلیٰ تک جا پہنچا۔ پھر وُہ خدا سے قریب ہوا اور خدا بھی اس کی طرف جُھکا حتّٰی کہ وہ دونوں یُوں ہو گئے جیسے دو کمانوں کے ملنے سے اُن کا چلّہ ایک ہو جاتا ہے (یعنی کمانیں تو الگ الگ رہتی ہیں مگر تیر چلانے کی جگہ ایک ہو جاتی ہے اور مقصد و مرمیٰ کے لحاظ سے کوئی دوئی نہیں رہتی) اس حالت میں خدا نے اپنے اس رسُول کو وُہ وحی کی جو اُسے کرنا تھی۔ اور رسُول کے قلبِ صافی نے اس نظارہ کے دیکھنے میں کوئی غلطی نہیں کی بلکہ جو کچھ دیکھا ٹھیک ٹھیک دیکھا۔ کیا اے لوگو تم ہمارے رسُول کے اِن رُوحانی مناظر کو شک کی نظر سے دیکھتے ہو؟ حالانکہ اس نے تو اس وقت (اس سے بھی بڑھ کر) ایک اور نظارہ بھی دیکھا تھا۔ وہی جو اُس نے اس انتہائی بیری کے قریب دیکھا۔ وہ بیری جو اَبدی رہائش والی جنّت کے پاس ہے جبکہ اس بیری پر ایک خاص تجلّی کا ظہور ہو رہا تھا۔ یقیناً اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ غلط راستہ پر نہیں پڑی اور نہ ہی وہ حدِّ مقررہ سے آگے نکلی۔ اور آپؐ نے اس نظارہ میں خدائے ذوالجلال کے بڑے بڑے نشان ملاحظہ کئے۔"

اس قرآنی بیان کی تشریح و تفصیل میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں اُن میں بدقسمتی سے کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے اور جیسا کہ قاعدہ ہے جوں جوں کوئی روایت اعتبار کے اعلیٰ مقام سے نیچے گرتی گئی ہے توں توں اس میں کمزور حصّہ کا دخل زیادہ ہوتا گیا ہے۔ اس لیے ہم اس جگہ صرف مضبوط اور معتبر روایتوں تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے۔ اور اُن میں سے بھی صرف اس حصّہ پر

---

[1] سورۃ نجم: ۶ تا ۱۹

اکتفا کریں گے جو ہماری تحقیق میں اختلاف و اختلاط سے پاک ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ معراج کے متعلق صحیح روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ :

ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ حرام کے اس حصّہ میں جو حطیم کہلاتا ہے لیٹے ہوئے تھے اور یقظہ اور نوم کی درمیانی حالت تھی۔ یعنی آپ کی آنکھ تو سوتی تھی مگر دل بیدار تھا کہ آپ نے دیکھا کہ جبرائیل علیہ السلام نمودار ہوئے ہیں۔ حضرت جبرائیلؑ نے آپ کے قریب آکر آپ کو اُٹھایا اور چاہِ زمزم کے پاس لاکر آپ کا سینہ چاک کیا اور آپ کے دل کو زمزم کے مصفا پانی سے اچھی طرح دھویا۔ اس کے بعد ایک سونے کی طشتری لائی گئی جو ایمان و حکمت سے لبریز تھی اور حضرت جبرائیلؑ نے آپ کے دل میں حکمت و ایمان کا خزانہ بھر کر آپ کے سینہ کو پھر اُسی طرح بند کر دیا۔ اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام آپ کو اپنے ساتھ لے کر آسمان کی طرف اُٹھ گئے اور پہلے آسمان کے دروازہ پر پہنچ کر دستک دی۔ دربان نے پُوچھا کون ہے؟ جبرائیل نے جواب دیا میں جبرائیل ہُوں۔ اور میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ دربان نے پوچھا۔ کیا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو بُلایا گیا ہے؟ جبرائیلؑ نے کہا۔ ہاں۔ اس پر دربان نے دروازہ کھول کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش آمدید کہا۔ اندر داخل ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بزرگ انسان کو دیکھا جس نے آپ کو مخاطب ہو کر کہا "مرحبا اے صالح نبی اور اے صالح فرزند" اور آپ نے بھی اُسے سلام کیا۔ اس شخص کے دائیں اور بائیں ایک بہت بڑی تعداد میں رُوحوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ جب وہ اپنے دائیں طرف دیکھتا تھا تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھتا تھا اور جب بائیں طرف دیکھتا تھا تو غم سے اس کا مُنہ اُتر جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیلؑ سے پُوچھا کہ یہ صاحب کون ہیں؟ جبرائیل نے کہا۔ یہ آدمؑ ہیں اور ان کے دائیں طرف ان کی نسل میں سے اہلِ جنّت کا سایہ پڑ رہا ہے، جسے دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہیں اور بائیں طرف اہلِ نار کا سایہ ہے جسے دیکھ کر وہ غم محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بعد جبرائیل آپ کو لے کر آگے چلے اور دُوسرے آسمان کے دروازہ پر بھی آپ کو وہی واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے اندر داخل ہو کر آپ نے دو شخصوں کو دیکھا۔ جنھوں نے ان الفاظ میں آپ کا خیر مقدم کیا کہ "مرحبا اے صالح نبی اور صالح بھائی" اور آپ نے بھی انہیں سلام کہا۔ اور جبرائیلؑ نے آپ کو بتایا کہ یہ حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰؑ ہیں۔ جو خالہ زاد بھائی تھے۔ اسی طرح جبرائیل علیہ السلام آپ کو اپنے ساتھ لے کر تیسرے اور چوتھے اور پانچویں آسمان میں سے گذرے جن میں آپ نے علی الترتیب حضرت یوسفؑ اور حضرت ادریسؑ اور حضرت ہارونؑ کو پایا۔ چھٹے آسمان پر آپ کی ملاقات حضرت موسیٰؑ سے ہوئی۔ اور حضرت موسیٰؑ نے بھی آپ کو اسی طرح مرحبا کہا۔ اور آپ نے سلام کیا۔ جب آپ ان سے آگے گذرنے لگے تو حضرت موسیٰؑ رو پڑے۔ جس پر آواز آئی۔ اے موسیٰؑ! کیوں روتے ہو؟ حضرت موسیٰؑ نے کہا۔ اے میرے اللہ! یہ نوجوان میرے پیچھے آیا۔ مگر اس کی اُمت میری امت کی نسبت جنّت میں زیادہ داخل ہوگی۔ اے میرے اللہ!

مَیں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی شخص میرے پیچھے آکر مجھ سے آگے نکل جائے گا۔[1] اس کے بعد آپؐ ساتویں آسمان میں داخل ہوئے جہاں آپؐ کی حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی۔ جو بیتِ معمور کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ یہ بیتِ معمور آسمانی عبادت گاہ کا مرکز تھا (جس کے گویا ظل کے طور پر دُنیا میں کعبۃ اللہ تعمیر ہوا تھا) حضرت ابراہیمؑ نے بھی آپؐ کو دیکھ کر اُسی طرح مرحبا کہا جس طرح حضرت آدمؑ نے کہا تھا۔ (کیونکہ وُہ بھی حضرت آدمؑ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِّ امجد تھے) اور آپؐ نے بھی اسی طرح اُن کو سلام کہا۔

اس کے بعد آپؐ اور آگے بڑھے اور وہاں پہنچے جہاں اس وقت تک کسی بشر کا قدم نہیں پہنچا تھا۔ یہاں آپؐ نے اپنے اُوپر سے بہت سی قلموں کے چلنے کی آواز سُنی (جو گویا قضا و قدر کی قلمیں تھیں) اس کے بعد آپؐ کو اپنے سامنے ایک بیری کا سا درخت نظر آیا جو گویا زمینی تعلقات کے لیے آسمان کا آخری نقطہ تھا اور اس کے ساتھ سے جنّتِ ماوٰی شروع ہوتی تھی۔ اس بیری کے درخت کے پھل اور پتے بڑے بڑے اور عجیب و غریب قسم کے تھے۔ جب آپؐ نے اس درخت کو دیکھا تو اس پر ایک فوق البیان اور گوناگوں تجلّی کا ظہور ہوا جس کے متعلق آپؐ فرماتے ہیں کہ الفاظ میں یہ طاقت نہیں کہ انہیں بیان کر سکیں۔ اس بیری کے نیچے چار دریا بہہ رہے تھے جن کے متعلق جبرائیلؑ نے آپؐ کو بتایا کہ ان میں سے دُو دریا تو دُنیا کے ظاہری دریا نیل و فرات ہیں اور دُو باطنی دریا ہیں جو جنّت کی طرف کو بہتے ہیں اِس موقعہ پر آپؐ کو حضرت جبرائیل اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر آئے اور آپؐ نے دیکھا کہ وہ چھ سو پَروں سے آراستہ ہیں۔ اس کے بعد آپؐ کو جنّت کی سیر کرائی گئی۔ اور بالآخر آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ خدائے ذوالجلال کے دربار میں پیش ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے بلا واسطہ کلام فرمایا اور بعض بشارات دیں اور آخر کار خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ آپؐ کی اُمّت کے لیے رات دن میں پچاس نمازیں فرض کی گئی ہیں۔ آپؐ یہ حکم لے کر واپس آئے تو راستہ میں حضرت موسیٰ نے آپؐ کو روک کر پوچھا کہ آپؐ کو کیا احکام ملے ہیں؟ آپؐ نے پچاس نمازوں کا حکم بیان کیا۔ حضرت موسیٰ یہ حکم سن کر چونک پڑے اور کہا کہ مَیں بنی اسرائیل کے ساتھ واسطہ پڑنے کی وجہ سے صاحبِ تجربہ ہوں۔ آپؐ کی امت کو اتنی نمازوں کی ہرگز برداشت نہ ہوگی پس آپ واپس جائیں اور خدا سے اس حکم میں تخفیف کی درخواست کریں۔ آپؐ گئے اور اللہ تعالیٰ نے پچاس میں دسؔ کی کمی کر کے چالیسؔ نمازوں کا حکم دیا۔ مگر واپسی پر حضرت موسیٰ نے پھر روکا اور کہا کہ یہ بھی بہت زیادہ ہیں آپؐ واپس جا کر مزید رعایت مانگیں۔ اس پر آپؐ پھر گئے اور

---

[1] یہ فقرہ حضرت موسیٰؑ کی طرف سے نعوذ باللہ حسد کے طور پر نہیں تھا بلکہ ایک طبعی رشک کا اظہار تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اَرفع شان کو ظاہر کرنے کے لیے غالباً خدائی تصرّف کے ماتحت کہا گیا۔ منہ

دس کی مزید رعایت منظور ہوئی۔ غرض اس طرح حضرت موسیٰؑ کے مشورہ پر آپؐ بار بار خدا کے دربار میں گئے اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازوں کا حکم دیا۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے آپؐ کو پھر روکا اور مزید رعایت کے لیے واپس جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ مَیں بنی اسرائیل کو دیکھ چکا ہوں اور وُہ اس سے بھی کم عبادت کو نباہ نہیں سکے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اب مجھے واپس جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس پر غیب سے آواز آئی "اے محمدؐ! یہ پانچ نمازیں بھی ہیں اور پچاس بھی کیونکہ ہم نے ایک نماز کے بدلے میں دس کا اجر مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح ہمارے بندوں سے تخفیف بھی ہو گئی اور ہمارا اصل حکم بھی قائم رہا۔ اس کے بعد جب آپؐ مختلف آسمانوں میں سے ہوتے ہوئے نیچے اُترے تو آپؐ کی آنکھ کھل گئی۔ (یعنی یہ کشف کی حالت جاتی رہی) اور آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ اسی طرح مسجدِ حرام میں لیٹے ہوئے ہیں[1]۔

بعض روایتوں میں معراج ہی کے ذکر میں ایک گھوڑے کی قسم کی سواری براق نامی کا لایا جانا اور آپؐ کا اس پر سوار ہو کر یہ سفر طے کرنا اور آپؐ کے سامنے دو یا تین دُودھ اور شراب وغیرہ کے پیالوں کا پیش کیا جانا وغیرہ بیان ہوا ہے۔ مگر تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظارے دراصل اسراء کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور جیسا کہ بعض متقدمین کی بھی رائے ہے[2] راویوں کی غلطی سے معراج کے ذکر میں مخلوط ہو گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

دُوسرا واقعہ اسراء کا ہے۔ اسراء بھی ایک عربی لفظ ہے جس کے معنے کسی کو رات کے وقت ایک جگہ سے دُوسری جگہ لے جانے یا سفر کرانے کے ہیں۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ رُوحانی سیر رات کے وقت کرائی گئی تھی، اس لیے اس کا نام اسراء رکھا گیا۔ اسراء کے متعلق جو ذکر قرآن شریف میں آتا ہے وُہ یہ ہے کہ:۔

> سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ ..... وَاِذْ قُلْنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ[3]۔

> "یعنی پاک ہے وُہ خُدا جو اپنے بندے کو ایک رات کے دوران میں مسجدِ حرام سے لے کر مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اپنے اس بندے کو اپنے بعض نشانات دکھا دیں۔ بے شک خدا بہت سُننے

---

[1] دیکھو بخاری کتاب الصلوٰۃ و کتاب بدء الخلق و کتاب التفسیر و کتاب التوحید۔ مسلم ابواب الاسراء۔

[2] زرقانی جلد ۶ بحث اسراء و معراج۔ [3] سورۃ بنی اسرائیل: ۲، ۶۱۔

والا اور دیکھنے والا ہے .... یہ وہی موقعہ تھا جب اے رسُول ہم نے
تجھے یہ کہا کہ تیرے رب نے اب لوگوں کو گھیر لیا ہے اور جو رؤیا ہم نے
تجھے دکھائی وُہ لوگوں کے لیے ایک آزمائش تھی۔"

اور حدیث میں جو تفصیلات اسراء کے واقعہ کی بیان ہوئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے دیکھا کہ ایک خدائی فرشتہ آپؐ کے پاس آیا اور ایک گدھے سے بڑا مگر خچر سے چھوٹا جانور بُراق نامی جو نہایت خوبصورت سفید رنگ لمبے جسم کا تھا آپؐ کے سامنے پیش کر کے اس پر آپؐ کو سوار کیا اور پھر آپؐ کو ساتھ لے کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس جانور کا قدم اس تیزی کے ساتھ اٹھتا تھا کہ ہر قدم نظر کی انتہائی حد تک لے جاتا تھا اور آپؐ بہت جلد بیت المقدس میں پہنچ گئے۔ جہاں آپؐ نے اس جانور کو اس حلقہ میں باندھ دیا جہاں گذشتہ انبیاء اسے باندھا کرتے تھے اور پھر آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے جہاں گذشتہ انبیاء کی ایک جماعت جن میں حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام خاص طور پر مذکور ہوتے ہیں، پہلے سے موجود تھی۔ آپؐ نے ان انبیاء کے ساتھ مل کر نماز پڑھی جس میں آپؐ امام ہوئے اور باقی انبیاء مقتدی بنے۔ اس کے بعد جبرائیل نے (کیونکہ یہ فرشتہ جبرائیل تھا) آپؐ کے سامنے دو پیالے پیش کئے۔ ان میں سے ایک میں دُودھ تھا اور دُوسرے میں شراب تھی۔ آپؐ نے دُودھ کا پیالہ لے لیا اور شراب رد کر دی۔ جس پر جبرائیل نے کہا آپؐ نے فطرت کی بات پہچان لی۔ اگر آپؐ شراب کا پیالہ لیتے تو آپؐ کی اُمت بھٹکتی پھرتی۔[1]"

اور بعض دُوسری روایتوں میں اس کی مزید تفصیل یُوں بیان ہوئی ہے کہ:

"جب حضرت جبرائیلؑ آپؐ کے سامنے بُراق لائے اور آپؐ اس پر سوار ہونے لگے تو وہ کچھ چمکا جس پر جبرائیلؑ نے بُراق سے کہا۔ بُراق ٹھہرو ٹھہرو۔ واللہ آج تک تم پر کوئی اس شان کا شخص سوار نہیں ہوا۔ اس پر بُراق شرم سے پسینہ پسینہ ہو کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد آپؐ اس پر سوار ہو کر حضرت جبرائیل کے ساتھ بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں آپؐ کو ایک بڑھیا ملی جسے دیکھ کر آپؐ نے جبرائیل سے پُوچھا کہ یہ کون ہے؟ جبرائیل نے کہا آگے چلئے آگے چلئے۔ جب آپؐ آگے روانہ ہوئے تو تھوڑی دیر کے بعد آپؐ کو راستہ کے ایک طرف سے کسی نے آواز دے کر بلایا کہ محمدؐ ادھر آؤ۔ مگر جبرائیل نے آپؐ سے پھر کہا۔ چلئے آگے چلئے۔ جب آپؐ آگے آئے تو کچھ دیر کے بعد آپؐ کو راستہ میں چند آدمیوں کی ایک جماعت ملی۔ جنھوں نے ان الفاظ میں آپؐ کو سلام کہا کہ "اے اوّل تجھ پر خدا کا سلام ہو۔ اے آخر تجھ پر خدا کا سلام ہو۔ اے حاشر (یعنی جمع کرنے والے) تجھ پر خدا کا سلام ہو۔" جبرائیل

---

[1] بخاری باب تفسیر سورۃ بنی اسرائیل و مسلم باب الاسراء و باب ذکر المسیح ابن مریم۔

نے کہا آپ بھی ان کے سلام کا جواب دیں؛ چنانچہ آپ نے بھی انہیں سلام کہا اور پھر آگے روانہ ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر یہی جماعت آپ کو راستہ میں ملی اور پھر انہی الفاظ میں سلام کہا اور کچھ وقفہ کے بعد پھر تیسری دفعہ یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد آپ بیت المقدس میں پہنچ گئے۔ یہاں جبرائیل نے آپ کے سامنے تین پیالے پیش کیے۔ ایک میں پانی تھا۔ دوسرے میں شراب تھی اور تیسرے میں دُودھ تھا۔ آپ نے دودھ کا پیالہ لے لیا اور باقی دونوں رد کردیئے۔ جبرائیل نے کہا۔ آپ نے فطرت کی بات اختیار کی۔ اگر آپ پانی لیتے تو آپ کی اُمت غرق ہو جاتی اور اگر آپ شراب کا پیالہ لیتے تو آپ کی اُمت بھٹکتی پھرتی۔ پھر آپ کے سامنے حضرت آدمؑ اور ان کے بعد کے انبیاء لائے گئے۔ اور آپ نے ان کا امام بنکر انہیں نماز پڑھائی۔ اس کے بعد جبرائیل نے آپ سے کہا کہ وہ جو آپ نے راستہ میں بڑھیا دیکھی تھی وُہ دُنیا تھی اور دُنیا کی عمر میں اب صرف اسی قدر وقت باقی رہ گیا ہے جو اس بڑھیا کی عمر میں باقی رہتا ہے اور وُہ جو آپ کو کوئی شخص راستہ کے ایک طرف بُلاتا تھا وہ شیطان تھا جو آپ کو راستہ سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ جو آپ کو آخر میں ایک جماعت ملی تھی اور انھوں نے آپ کو سلام کہا تھا وُہ خدا کے رسُول حضرت ابراہیم اور مُوسیٰ اور عیسیٰ علیہم السّلام تھے۔ اس کے بعد آپ مکہ کی طرف واپس لوٹ آئے[1]

یہ وہ واقعات ہیں جو معراج اور اسراء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے اور جو شخص ان واقعات کو غور سے مطالعہ کریگا وہ ان کی غرض وغایت کے متعلق کبھی بھی شک وشُبہ میں نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً جبکہ اس بات کو مدِنظر رکھا جائے کہ یہ واقعات ظاہر کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے بلکہ وہ نہایت اعلیٰ قسم کے کشوف تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائی تصرف کے ماتحت دکھائے گئے۔ یہ بات تو ادنیٰ مطالعہ سے بھی ظاہر ہے کہ معراج اور اسراء دونوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع شان اور آپ کی اُمت کے مرتبہ کی بلندی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ علاوہ اور اشارات کے دونوں کشوف میں آپ کا گذشتہ انبیاء سے ملنا اور اُن سے آگے نکل جانا یا نماز میں ان کا امام بننا اسی حقیقت کا حامل ہے۔ ان کشوف میں بعض انبیاء کا خاص طور پر آپ کی ملاقات کے لیے منتخب کیا جانا بھی اپنے اندر ایک معنی رکھتا ہے۔ دراصل یہ انبیاء وہی ہیں جن کی اُمتوں سے یا تو آپ کی اُمت کو خاص طور پر واسطہ پڑنے والا تھا۔ اور یا یہ انبیاء بعض خاص صفات کے حامل تھے اور ان کشوف میں اس حقیقت کا اظہار مقصود تھا کہ آپ کا وجود ان انبیاء کی مخصوص صفات میں بھی ان سے بالا وارفع ہے۔ اُمتوں کے تعلق کے لحاظ سے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مُوسیٰؑ اور ایک جہت سے حضرت ابراہیم اور حضرت آدم علیہم السلام خاص امتیاز

---

[1] ترمذی باب التفسیر و ابن کثیر تفسیر آیت اسراء بحوالہ ابن جریر از روایت انسؓ بن مالک۔ ابن ہشام ذکر اسراء ملخصاً

رکھتے ہیں اور اسی لیے اسراء اور معراج دونوں میں ان انبیاء کو خاص طور پر نمایاں کرکے دکھایا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ تو مسیحی اقوام کے مرکزی نقطہ تھے جو اُس زمانہ میں بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل کر چکی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ نہ صرف یہودیت کے بانی مبانی تھے جن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عنقریب واسطہ پڑنے والا تھا بلکہ وہ ایک ایسی شریعت کے لانے والے تھے جو اپنی تدوین اور تعیین اور الہامی نوعیت کی وجہ سے اسلامی شریعت کے ساتھ بہت قریب کی مشابہت رکھتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ وسیع شامی اقوام کے جدِّ امجد ہونے کے علاوہ مسیحیت اور یہودیت اور حنیفیت اور اسلام کے لیے ایک مشترک واجب الاحترام ہستی تھے۔ اور بالآخر حضرت آدمؑ کا وجود تھا جو گویا تمام بنی نوع آدم کا اجتماعی نقطہ تھا۔ اس جہت سے معراج اور اسراء میں ان انبیاء کا مخصوص طور پر چُنا جانا صاف طور پر اس بات کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود میں وُہ عظیم الشان ہستی مبعوث ہوئی ہے جو سیّدِ وُلدِ آدم اور فخرِ اولین و آخرین ہے، اور خُدا کی طرف سے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ آپؐ کی اُمّت کا قدم ان سب اُمّتوں پر بالا و ارفع ہے۔ حضرت موسیٰؑ چونکہ ایک خاص سلسلہ کے بانی ہونے کی وجہ سے ان رموز سے زیادہ آشنا تھے۔ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پروازِ رُوحانی کی حقیقت کو فوراً سمجھ لیا اور اِس طبعی رشک کی وجہ سے جو فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے (نہ کہ کسی حسد کی بنا پر) اِس انکشاف نے انہیں وقتی طور پر غم میں ڈال دیا کہ ایک پیچھے آنے والا نوجوان اُن سے آگے نکلا جا رہا ہے۔ اسراء میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا راستہ پر کھڑے ہو کر آپؐ کو اوّل اور آخر اور حاشر کہہ کر پکارنا اور سلام کرنا بھی اپنے اندر یہی لطیف اشارہ رکھتا ہے کہ "اے نبیوں کے سرتاج ہم پہچان گئے ہیں کہ گو آپؐ سب انبیاء کے آخر میں مبعوث ہوئے ہیں مگر رُتبہ کے لحاظ سے آپؐ ہی سب سے اوّل ہیں اور آپؐ ہی نسلِ آدم کا وہ مرکزی نقطہ ہیں جس کے قدموں میں مختلف اقوامِ عالم کا جمع ہونا مقدر کیا گیا ہے[1] پس لیجئے ہماری طرف سے سلام اور دُعا کی پیشکش حاضر ہے اسے قبول کیجئے۔"

مندرجہ بالا غرض و غایت کے اظہار کے علاوہ جو معراج اور اسراء ہر دو میں مقصود ہے ان رُوحانی سفروں کی علیحدہ علیحدہ غرض اور علیحدہ علیحدہ تشریح بھی ہے۔ اور جہاں تک ہم نے غور کیا ہے وہ یہ ہے کہ معراج تو زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رُوحانی کمالات کے اظہار کے لیے ہے اور اسراء آپؐ کی ظاہری اور دنیوی ترقی کو ظاہر کرنے کے واسطے ہے۔ اسی لیے جہاں معراج کے واسطے آسمان

---

[1] حاشر کے معنی جمع کرنیوالے کے ہیں۔ یعنی مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر قوم اور ہر ملک کی طرف الگ الگ رسول مبعوث ہوتے تھے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تمام اقوامِ عالم اور تمام عالم کے لیے مبعوث کیے گئے۔ منہ

کو چُنا گیا۔ اسراء کا آخری نقطہ زمین رکھی گئی ہے۔ اس طرح جہاں معراج میں آپؐ کا بغیر کسی سواری اور بغیر کسی ظاہری اور مادی واسطہ کے اُوپر اُٹھایا جانا بیان ہوا ہے وہاں اسراء میں بُراق کی سواری کا واسطہ رکھا گیا ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ آپؐ کی اور آپؐ کے اتباع کی دنیوی اور ظاہری ترقی میں مادی اسباب کا بھی دخل ہو گا گو جیسا کہ بُراق کی غیر معمولی رفتار میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ مادی اسباب محض ایک پردہ کے طور پر ہوں گے اور اصل سبب وہ غیبی تائید ہو گی جو ہر قدم پر آپؐ کے ساتھ رہے گی۔

معراج میں آپؐ کا سب نبیوں سے آگے نکل جانا اس بات کی طرف اشارہ رکھتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ آپؐ اپنے مقام اور مرتبہ کے لحاظ سے سب سے بالا اور اَرفع ہیں اور نہ صرف یہ کہ آپؐ کی لائی ہوئی شریعت اپنے رُوحانی کمالات میں سب شریعتوں سے فائق و برتر ہے بلکہ آپؐ کے فیضانِ رُوحانی میں وہ خصوصیت رکھی گئی ہے جو پہلے کسی بشر کو حاصل نہیں ہوئی یعنی آپؐ کی سچی اور کامل پیروی انسان کو بلند ترین رُوحانی مدارج تک پہنچا سکتی ہے۔ اور کوئی رُوحانی مرتبہ ایسا نہیں ہے جہاں تک آپؐ کی پیروی کی برکت سے انسان نہ پہنچ سکتا ہو۔ آپؐ سے پہلے جتنے بھی نبی آئے وہ بیشک اپنے متبعین کے لیے سراسر رحمت و برکت بن کر آئے اور بیشک اُنھوں نے اپنے پیچھے چلنے والوں کے لیے خدائی انعامات کے دروازے کھولے لیکن آپؐ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس کی پیروی انسان کو انتہائی کمالات تک پہنچانے کے لیے کافی ہو اور اسی لیے پہلی اُمتوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریق تھا کہ جب کوئی شخص کسی نبی کی کامل پیروی کے نتیجہ میں ترقی کر کے اس انتہائی رُوحانی حد تک پہنچ جاتا تھا جہاں تک یہ پیروی اُسے لے جا سکتی تھی تو اس کے بعد اگر یہ شخص اپنی استعداد اور شوق اور کوشش کے لحاظ سے مزید رُوحانی ترقی کے قابل ہوتا تھا تو خدا تعالیٰ اُسے براہِ راست موہبت اور انعام کے رنگ میں اُوپر اُٹھا لیتا تھا۔ جس میں اس کے نبیِ متبوع کی پیروی کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ اعلیٰ اور ارفع مقام ہے کہ ایک انسان آپؐ کی اتباع میں ہی جملہ قسم کے رُوحانی مقامات تک پہنچ سکتا ہے۔ اور یہی وُہ خصوصیت ہے کہ جس کی طرف آپؐ کی اس رُوحانی پرواز میں اشارہ کیا گیا ہے جو معراج کے سفر میں آپؐ کو کرائی گئی۔ اور اسی حقیقت کی طرف قرآن شریف کی اس آیت میں اشارہ ہے کہ:

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ[1]

"یعنی "محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک رسُول ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین بھی ہیں"۔ جن کی مُہرِ تصدیق سے انسان کو ہر قسم کے اعلیٰ ترین رُوحانی انعامات مِل سکتے ہیں اور کوئی رُوحانی مرتبہ آپؐ کے اتباع کی رسائی سے باہر نہیں ہے۔

---

[1] سورۃ احزاب: ۴۱

معراج میں جن نبیوں کے ساتھ آپ کی ملاقات ہوئی وُہ یہ ہیں :

حضرت آدمؑ ۔ حضرت عیسیٰؑ ۔ حضرت یحییٰؑ ۔ حضرت یوسفؑ ۔ حضرت ادریسؑ ۔ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام ۔

ان آٹھ نبیوں میں سے دو تو صرف ایک ضمنی تعلق کی وجہ سے اس نظارہ میں آئے ہیں ۔ یہ دو نبی حضرت یحییٰؑ اور حضرت ہارونؑ ہیں ۔ جن میں سے مقدم الذکر نبی حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی ہونے کے علاوہ اُنکے لیے بطور ارہاص کے بھی تھے اور مؤخر الذکر نبی حضرت موسیٰؑ کے نائب تھے اور بھائی بھی تھے پس اس جسمانی اور رُوحانی تعلق کی وجہ سے یہ دو نبی اس نظارہ میں شامل کیئے گئے ۔ لیکن ایک لطیف بات یہ ہے کہ جہاں حضرت یحییٰ کو بوجہ جُدا اور علیٰحدہ حیثیت رکھنے کے حضرت عیسیٰ کے ساتھ رکھا گیا وہاں حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ کی ماتحتی کی وجہ سے ان سے نیچے کے مگر متصل آسمان میں دکھایا گیا ۔ باقی جو چھ انبیاء ہیں اُن میں سے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت آدمؑ کی خصوصیت اوپر بیان ہو چکی ہیں کہ وہ اپنی اپنی نسل اور اپنی اپنی اُمت کے نمائندوں کی حیثیت میں دکھائے گئے ہیں اور بقیہ دو انبیاء یعنی حضرت یوسفؑ اور حضرت ادریسؑ کی خصوصیت خود حدیث میں اس طرح مذکور ہے کہ حضرت یُوسف اپنے خداداد حُسنِ ذاتی کی وجہ سے اور حضرت ادریسؑ اپنے مخصوص علوِّ مکانی کی وجہ سے ممتاز تھے[1] ۔ اور انہیں اس نظارہ میں لاکر یہ اظہار مقصود تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم ان امتیازی خصائص رکھنے والے نبیوں سے بھی ان کے امتیازی خصائص میں بالا اور ارفع ہے ۔ واللہ اعلم ۔

معراج کا ایک نظارہ اس خاص تجلّی سے تعلق رکھتا ہے جو سدرۃ المنتہیٰ پر ہوئی جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کے بیان کی الفاظ میں طاقت نہیں ہے سو اس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قربِ الٰہی کی طرف اشارہ تھا جس میں محبّ و محبُوب میں جلوہ ہائے خاص کی نیرنگیوں کا ظہور ہوا جس کے بیان کی کوشش تو درکنار اس کے علم کی کوشش بھی بے سُود ہے ، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اس نظارہ میں آپ نے خُدا کی ان خاص اور ممتاز تجلیات کا مشاہدہ کیا جن کے دیکھنے کی طاقت صرف اس مقام پر پہنچ کر ہی حاصل ہو سکتی ہے جو آپ کو حاصل ہوا ۔ سدرہ کے نیچے چار دریاؤں کو بہتے دیکھنا جن میں دو ظاہری دریا تھے اور دو باطنی اس غرض کے اظہار کے لیے تھا کہ خدا کی یہ تجلیات ہر دو صورتوں میں اثر انداز ہوں گی ۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی ۔ رُوحانی طور پر بھی اور دنیوی رنگ میں بھی ۔ اور چار کے عدد میں یہ اشارہ تھا کہ آپ کی اُمت پر ظاہری اور رُوحانی ترقی کے دو دو دَور آئیں گے ۔ ایک دَور ان ہر دو قسم کی تجلیات کا خود آپ کے وجود باجود سے شروع ہوگا ۔ اور ایک بعد کے زمانہ میں آئے گا ۔

---

[1] مسلم ابواب الاسراء عَنْ ثَابِتٍ بُنَانِی عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ ۔

جبکہ مُسلمان اپنے درمیانی زمانہ میں گرِکر پھر دوبارہ اُٹھیں گے اور اس طرح ہر دَور میں دو دو تجلیات کا ظہور ہو کر چار نہریں مکمل ہو جائیں گی۔

بالآخر پنجگانہ نماز کے فرض کئے جانے کا نظارہ ہے اس کا ایک حصّہ تو ظاہر سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تعبیر سے خارج ہے، لیکن پچاس سے پانچ تک کی کمی کا منظور ہونا ایک نہایت لطیف رُوحانی نظارہ ہے جس میں اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اصل تعداد جو فرض کی جانیوالی تھی وہ پانچ ہی تھی مگر ساتھ ہی یہ مقدر تھا کہ ان پانچ نمازوں کا ثواب پچاس کے برابر ملے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ منشا تھا کہ اُمتِ محمدیہ کو انکی نیکیوں کا بدلہ بڑھ چڑھ کر عطا کیا جائے۔ اس لیے یہ نمازیں ابتداء میں پچاس کی صُورت میں فرض کی گئیں۔ اور پھر ایک لطیف رنگ میں جس میں ضمنی طور پر اللہ تعالیٰ کی شفقت اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رأفت کا اظہار بھی مقصود ہے۔ یہ تعداد گھٹا کر پانچ کر دی گئی۔ اور باتوں باتوں میں مُسلمانوں کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ تمہارے متعلق یہ اندیشہ کیا گیا ہے کہ تم ان پانچ نمازوں کی ادائیگی میں بھی سُستی نہ دکھاؤ۔ اس لیے دیکھنا تم اس میں سُست نہ ہونا۔ ان حقائق کے علاوہ معراج میں اور بھی بہت سے اشارات تھے مگر ایک تاریخی مضمون میں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں نکال جا سکتی۔

اسراء کا واقعہ جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے اس تعلق کی طرف اشارہ کرنے والا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کی اُمّت کو عنقریب دُوسری اُمتوں کے ساتھ پڑنے والا تھا۔ نیز اس میں اُن آزمائشوں پر متنبہ کرنا مقصود تھا جو آپ کے متبعین کو ان کی ترقی کے زمانہ میں پیش آنے والی تھیں۔ اس واقعہ میں سب سے پہلا اشارہ یہ تھا کہ اب جو اسلام پر ایک تنگی کا زمانہ ہے اسے ہم عنقریب دُور کر دیں گے اور مصائب کی موجودہ تاریکی دن کی روشنی میں بدل جائے گی۔ چنانچہ آیت اسراء میں "رات" کا لفظ استعمال کیا جانا اسی حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کیونکہ تصویری زبان میں تنگی اور مصیبت کا زمانہ رات کے وقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر اس سفر کی ابتداء اور انتہا کے لیے مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصٰی کے الفاظ کا بیان کیا جانا اس غرض سے ہے کہ اے مُسلمانو! اب تک تمھارا واسطہ صرف قدیم عربی مذہب و تمدن کے ساتھ رہا ہے جس کا مرکز مسجدِ حرام ہے۔ لیکن اب وقت آتا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ بھی تمہارا واسطہ پڑے گا اور تمہاری توجہ کا مرکز مسجدِ حرام سے وسیع ہو کر یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی مرکز بیت المقدس تک جا پہنچے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا کہ ہجرت کے بعد اسلام کا محاذ غیر معمولی طور پر وسیع ہو کر یہودیت اور مسیحیت کے مقابل پر آ گیا اور اسراء میں جو پیشگوئی کی گئی تھی وُہ لفظ بلفظ پوری ہوئی۔

اس کے بعد بُراق کی سواری کا منظر ہے جس کے متعلق اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس سے یہ مُراد تھی کہ جو مقابلہ دُوسری قوموں کے ساتھ مُسلمانوں کو پیش آنیوالا ہے اس میں بیشک مُسلمانوں کی کامیابی بظاہر مادی اسباب کے ماتحت نظر آئے گی مگر ان اسباب میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک غیر معمولی طاقت

ودیعت کی جائے گی جس میں ان نتائج کو جو خُدا پیدا کریگا ان کے ظاہری اسباب سے کوئی نسبت نہیں ہوگی۔ اور مُسلمانوں کی سواری گویا بجلی کی طرح اُڑتی ہوئی آگے نکل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تیسرے اس رُوحانی نظارہ میں یہ اشارہ تھا کہ مُسلمانوں کے لیے جس نئے ماحول کا دروازہ کھولا جارہا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس میں اسلام کے لیے ہر قسم کی برکات رکھی ہیں۔ جیسا کہ فرمایا۔ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ[1] یعنی ہم نے اس نئے میدان کے ماحول کو تمہارے لیے بابرکت بنایا ہے" اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا کہ عرب اور اہلِ عرب کی حدُود سے باہر نکل کر اسلام نے ایسا محسوس کیا کہ گویا یہ ماحول پہلے سے انہی کے لیے تیار کیا جاچکا تھا اور اس محاذ میں اسلام کی غیر معمولی فتوحات پہلے سے مقدر تھیں۔ دورانِ سفر میں جو نظارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے گئے ان کی تشریح تو خود کشف کے اندر موجود ہے کہ ان فتوحات کے زمانہ میں مُسلمانوں کو دُنیا کے اموال اَمتِعَہ اپنی طرف کھینچیں گے مگر گو یہ دُنیا کی نعمتوں کا پانی پینے کی حد تک بے شک استعمال کیا جائے لیکن چونکہ اس کی کثرت غرق کر دینے کا سامان بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے اس لیے مُسلمانوں کو اس کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ابلیس کا نظارہ عقیدہ کی گمراہیوں اور ضلالتوں کا مجسمہ ہے۔ اور مُسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ ان کی فاتحانہ یلغار میں انہیں شیطانی طاقتیں جادۂ صواب سے منحرف نہ کردیں۔ پھر نبیوں کی ملاقات ہے جو اپنے اندر برکت اور سلام کے پیغام کے علاوہ یہ معنی بھی رکھتی ہے کہ آئندہ فتوحات میں دُنیا کی قومیں اسلامی برکات سے مُتمتّع ہو کر اس کی برتری کا سکہ مانیں گی۔ چنانچہ یہ ایک تاریخ کا کھُلا ہوا وَرق ہے کہ یورپ و امریکہ کی موجودہ بیداری اسلام ہی کے ساتھ واسطہ پڑنے کے نتیجہ میں ہے۔ ورنہ اسلام سے قبل یہ سب قومیں جہالت کی نیند سو رہی تھیں اور یورپ کے غیر متعصب محققین نے اسلام کے اس فیض و برکت کو کھُلے الفاظ میں تسلیم کیا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مغرب نے علومِ جدیدہ کا پہلا سبق اسلام ہی سے سیکھا ہے[2] بالآخر بیت المقدس میں پہنچ کر آپؐ کی اقتدا میں گذشتہ نبیوں کے نماز پڑھنے کا نظارہ ہے۔ مگر یہ نظارہ ایسا ہے جو خود اپنی آپ تفسیر ہے جس کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اسراء میں بعض اور حقائق بھی ہیں مگر ہم اختصار کے خیال سے صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

الغرض معراج اور اسراء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نہایت اعلیٰ درجہ کے کشوف تھے جن میں آپؐ کی اور آپؐ کی اُمت کی آئندہ فتوحات اور ترقیوں کے نظارے دکھائے گئے۔ اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ کشوف خُدا کی طرف سے تھے کیونکہ ان میں آپؐ کو جو کچھ دکھایا گیا اسی طرح وقوع پذیر ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اور آئندہ ہوگا۔ اب دیکھو کہ اس عظیم الشان پہلو کے مقابلہ پر محض ظاہری

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل: ۱ [2] "فال آف دی رومن ایمپائر" مصنفہ گبن اور انسائیکلو پیڈیا برٹینکا۔

اور جسمانی سفر کو کیا حقیقت حاصل ہے۔ اگر ان سفروں کو ظاہری جسمانی سفر قرار دیا جاتے تو اس سے زیادہ اس کے معنے نہیں بنتے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کے ماتحت آپؐ کو ایک خارقِ عادت رنگ میں جسمانی طور پر مکہ سے اُٹھا کر بیت المقدس تک پہنچا دیا اور زمین سے اُٹھا کر آسمانوں کی سیر کرا دی۔ یہ بیشک ایک بہت پُرلطف اور مقتدرانہ نظارہ سمجھا جا سکتا ہے مگر اسے اس عظیم الشان حقیقت سے جو ان رُوحانی مناظر میں مخفی ہے جس کا دامن ہجرتِ یثرب سے لے کر گویا قیامت تک پھیلا ہوا ہے کچھ دُور کی بھی نسبت نہیں مگر افسوس ہے کہ خود مُسلمان کہلانے والوں کا ایک طبقہ بھی اسے ایک عجوبہ نمائی سے زیادہ حیثیت نہیں دینا چاہتا، حالانکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان روحانی مناظر میں اس کے بڑے بڑے نشانات مخفی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس قسم کے کشوف کم و بیش سبھی انبیاء کو ہوتے آئے ہیں اور سارے نبیوں کو ہی اُن کی اُمتوں کے آئندہ حالات کا فی الجملہ نظارہ کرایا جاتا رہا ہے اور اسی طرح بعض صُوفیا نے لکھا ہے کہ معراج بھی ہر نبی کو ہوا ہے اور حضرت موسیٰؑ کے کشفِ رُوحانی کا ذکر تو خود قرآن شریف[1] میں بھی آتا ہے مگر "فکرِ ہرکس بقدرِ ہمتِ اوست"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نظارہ دکھایا گیا اور جو معراج آپؐ کو نصیب ہوا وہ اپنی بلندی اور اپنی وسعت اور اپنے گوناگوں کوائف میں ایک ایسی ارفع شان رکھتا ہے جو کسی دُوسرے کو حاصل نہیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

معراج اور اسراء کے وقوع کی تاریخ کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے مگر روایات کا کثیر حصہ اس طرف گیا ہے کہ یہ نظارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرتِ یثرب سے کچھ عرصہ پہلے دکھلائے گئے تھے اور کم از کم اسراء کے کشف کی جو تشریح ثابت ہوتی ہے وہ اسی خیال کی مؤید ہے کہ اسراء کا کشف ہجرت کے قریب ہی ہوا تھا اور امام بخاری نے بھی جن کا پایہ روایت میں بہت بلند مانا گیا ہے۔ اسراء اور معراج کو ہجرت کے واقعات سے معًا پہلے لکھا ہے۔[2] پس اکثر مؤرخین کا یہ خیال دُرست معلوم ہوتا ہے کہ اسراء اور معراج ہجرت سے کم و بیش ایک سال پہلے وقوع پذیر ہوئے اس طرح ان کا زمانہ ۱۲ سنہ نبوی یا ابتداء ۱۳ سنہ قرار پاتا ہے۔ اور اسراء کے متعلق تو یقیناً یہی صحیح ہے گو معراج کا واقعہ غالباً اس سے پہلے کا ہے۔ اِن کی آپس کی ترتیب کے متعلق بھی مؤرخین میں اختلاف ہے جو لوگ ان دونوں سفروں کو ایک ہی سفر یا ایک ہی سفر کے دو حصے قرار دیتے ہیں۔ اُنھوں نے بالعموم اسراء کو پہلے اور معراج کو بعد میں رکھا ہے کیونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ پہلے آپ مکہ سے بیت المقدس تک گئے اور پھر وہاں سے آسمانوں کی طرف اُٹھائے گئے۔ لیکن ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ خیال دُرست نہیں ہے۔ بلکہ اسراء اور معراج جُدا جُدا چیزیں

---

[1] دیکھئے سورۃ کہف: ۶۱ تا ۸۳ [2] بخاری بدءالخلق

ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کو جُداگانہ چیزیں ماننے والوں کے درمیان بھی ان کی ترتیب کے متعلق اختلاف ہے۔ ابنِ اسحاق نے اسراء کو پہلے رکھا ہے اور معراج کو بعد میں[1]۔ اور اس خیال کی تائید بخاری سے بھی ہوتی ہے جس میں اسراء اور معراج کے الگ الگ باب باندھ کر اسراء کو معراج سے پہلے بیان کیا گیا ہے[2]۔ مگر ابنِ سعد نے صراحت کے ساتھ اس کے خلاف رائے ظاہر کی ہے اور معین تاریخیں بیان کر کے معراج کو اسراء سے پہلے رکھا ہے، چنانچہ ابنِ سعد نے معراج کی تاریخ رمضان ۱۲ سنہ نبوی بیان کی ہے اور اسراء کی ربیع الاوّل ۱۳ سنہ[3] اور طبری کا بھی اسی طرف میلان نظر آتا ہے کہ معراج کا واقعہ اسراء سے پہلے کا ہے کیونکہ طبری نے معراج کو ابتداء دعویٰ میں رکھا ہے[4]۔ ہم ان تاریخوں کی تحقیق میں تو نہیں گئے مگر واقعات کے تفصیلی مطالعہ سے ہم اس طرف ضرور مائل ہیں کہ معراج کا واقعہ اسراء سے پہلے ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔

پنجگانہ نماز کا فرض ہونا معراج سے پہلے اسلام میں نماز کا آغاز تو ہو چکا تھا چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ اصحاب مکہ کی گھاٹیوں میں اکیلے اکیلے یا ایک ایک یا دو دو مل کر نماز پڑھا کرتے تھے مگر باقاعدہ صورت میں پانچ وقت کی نماز کا آغاز معراج میں ہوا اور اس وقت سے اسلامی عبادات کا پہلا اور سب سے بڑا رکن اپنی موجودہ صورت میں قائم ہو گیا۔ یعنی اوّل پَو پھٹنے کے بعد مگر سُورج نکلنے سے پہلے فجر کی نماز۔ دُوسرے سُورج ڈھلنے کے بعد مگر اس کے زیادہ نیچے ہونے سے پہلے ظہر کی نماز۔ تیسرے سورج کے نیچے ہو جانے کے بعد مگر روشنی دھیمی پڑنے سے پہلے عصر کی نماز۔ چوتھے سُورج کے ڈوبنے کے بعد مگر شفق غائب ہونے سے پہلے مغرب کی نماز۔ پانچویں شفق غائب ہونے کے بعد مگر نصف شب سے پہلے عشاء کی نماز۔ ان پانچوں فرض نمازوں کے اوقات کے متعلق گو قرآن شریف نے صرف ایک اجمالی اشارہ کیا ہے[5]۔ مگر حدیث میں صراحت کے ساتھ ان کی تعیین بیان ہوئی ہے۔ جہاں یہ مذکور ہے کہ معراج کے بعد حضرت جبرائیلؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر پانچوں نمازوں کے اوقات بالتفصیل سمجھائے[6]۔

اسلامی نماز کی ظاہری شکل و صورت جو خدائی حکم کے ماتحت قائم کی گئی ہے یہ ہے کہ نماز کی ابتدا قیام کی حالت سے ہوتی ہے۔ جبکہ نماز پڑھنے والا اپنے سینہ پر ہاتھ باندھ کر خُدا کے سامنے مؤدبانہ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد رکوع کی حالت ہے جو گویا خُدا کی تعظیم اور بندے کے تذلّل کا دُوسرا درجہ ہے جبکہ نماز پڑھنے والا قیام کی حالت کو چھوڑ کر اپنے خالق و مالک کے سامنے دوہرا ہو کر جُھک جاتا ہے۔

---

[1] ابن ہشام ذکر اسراء [2] بخاری ابواب الاسراء والمعراج [3] طبقات ابن سعد جلد ۱ [4] طبری ذکر معراج
[5] سورۃ بنی اسرائیل: ۲ [6] بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ

تیسری حالت سجدہ کی ہے جو ایک درمیانی قیام کے بعد آتی ہے جبکہ نماز پڑھنے والا انتہائی عاجزی اور تذلّل کی صورت میں خُدا کے سامنے زمین پر گر کر اپنی جبینِ نیاز اُس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ اور چونکہ یہ حالت انتہائی تذلّل اور تعبّد کی حالت ہے، اس لیے اسے ایک درمیانی وقفہ کے ساتھ دو دفعہ دوہرا جاتا ہے اور اس طرح نماز کی ایک رکعت پُوری ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد اسی صورت میں دُوسری اور تیسری اور چوتھی رکعت پڑھی جاتی ہے اور آخر میں نماز پڑھنے والا قعدہ میں دو زانو بیٹھ کر جو گویا ایک مقرب اور تسکین یافتہ درباری کی کیفیت ہے، اپنی نماز کو تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ نماز کی ہر حالت یعنی قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعدہ کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ کلمات جو ہر حالت کے مناسب حال دُعا اور تحمید اور تسبیح وغیرہ پر مشتمل ہیں مقرر کر دیئے گئے ہیں، مگر ساتھ ہی اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ علاوہ مقررہ کلمات کے نماز پڑھنے والا اپنی زبان میں بھی جس طرح مناسب خیال کرے نماز کے اندر دُعا اور تحمید اور تسبیح وغیرہ سے کام لے سکتا ہے[1] نماز میں اتحاد فی الصورت کی غرض سے یہ پابندی بھی لگائی گئی ہے کہ خواہ کوئی مُسلمان کسی جگہ ہو وُہ کعبہ کی طرف مُنہ کر کے نماز ادا کرے[2] اور سوائے کسی ناگزیر مجبوری کے یہ بھی لازمی ہے کہ ایک محلّہ یا گاؤں یا قصبہ کے سب مُسلمان مقررہ اوقات میں مسجد میں جمع ہو کر یا اگر مسجد نہ ہو تو کسی دُوسری جگہ میں اکٹھے ہو کر ایک امام کی اقتداء میں نماز ادا کیا کریں تاکہ ان کی اجتماعی زندگی کا شیرازہ بجائے منتشر ہونے کے دن بدن مضبوط ہوتا چلا جاوے۔ نماز میں نشاط کی کیفیت پیدا کرنے اور خدا کے دربار میں صفائی کی حالت میں پیش ہونے کی غرض سے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ نماز سے پہلے ہر مُسلمان کو چاہیئے کہ اپنے جسم کی ہر سہ اطراف کو یعنی مُنہ ہاتھ اور پاؤں کو پانی سے دھو لیا کرے[3] اس عمل کو اِسلامی اصطلاح میں وضو کہتے ہیں جو گویا نماز کی اغراض کے لیے غسل کا قائم مقام ہے۔

الغرض معراج کے ساتھ اِسلامی عبادات کے سب سے بڑے رُکن کا قیام عمل میں آیا اور پانچ وقت کی باقاعدہ نماز کا آغاز ہو گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نماز مومن کی معراج ہے۔ جس میں وہ خُدا کے حضور میں حاضر ہو کر اس سے باتیں کرتا ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ اگر نماز کو اس کے جُملہ شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے اور دِل کی توجہ بھی اس کے ساتھ ہو تو وہ ذاتِ باری تعالیٰ کے قُرب کے حصول کے لیے ایک بہترین کیفیت کی حامل ہے۔ انسانی جسم اور رُوح میں فطری طور پر ایک ایسا رابطہ اور اتحاد رکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا چھوٹے سے چھوٹا تغیر بھی دُوسرے پر ایک گہرا اثر پیدا کرتا ہے۔ مثلاً جسم کو اگر کوئی تکلیف پہنچے تو فوراً رُوح بھی بے قرار ہونے لگتی ہے۔ اور اگر رُوح کو کوئی صدمہ پہنچے تو اس کا فوری اثر جسم پر پڑتا ہے اور جسم میں بھی ساری کیفیات پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں جو خود جسم کو تکلیف پہنچنے کی

---

[1] کشتی نوح مصنفہ مقدس بانی سلسلہ احمدیہ ٭ [2] قرآن شریف سورۃ بقرۃ: ۱۴۵ ٭ [3] قرآن شریف سورۃ مائدہ: ۷ ٭

صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ رُوح خوش ہو تو جسم پر بھی خوشی کے آثار تبسم وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اگر رُوح مغموم ہو تو انسان کا چہرہ فوراً غم کا نقشہ پیش کرنے لگ جاتا ہے۔ الغرض جسم اور رُوح کے درمیان ایک فطری رابطہ اور اتحاد ہے جس کی وجہ سے وُہ دونوں ایک دُوسرے سے گہرا اثر قبول کرتے ہیں اس لیے اسلامی شریعت میں کمال حکمت سے عبادت کا جسمانی نقشہ ایسا تجویز کیا گیا ہے جو انسانی رُوح میں تعبد اور تذلل کی کیفیات پیدا کرنے کے لیے اپنے اندر ایک طبعی خاصیت رکھتا ہے؛ چنانچہ نماز میں قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعدہ کی حالتیں اسی غرض و غایت کے ماتحت رکھی گئی ہیں کہ تا انسانی رُوح کے اندر ان جسمانی کیفیات کے مناسب حال رُوحانی کیفیات پیدا کی جائیں اور ہر حالت کے لیے جو دُعا یا تحمید یا تسبیح کے الفاظ مقرر کیے گئے ہیں وُہ بھی اس رُوحانی کیفیت کے مناسب حال تجویز کئے گئے ہیں جو ہر جسمانی کیفیت کے مقابلہ میں رُوح کے اندر پیدا کرنی مقصود ہے۔ مثلاً نماز میں سجدہ کی حالت میں انسان اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے انتہائی تعبد اور تذلل کی حالت ہے اس لیے جو الفاظ سجدہ کی حالت میں پڑھنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں یعنی سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی (میرا رب جو سب سے بالا و بلند ہے وہ سب عیبوں سے پاک اور سب کمزوریوں سے منزّہ ہے) وہ بھی خدا تعالیٰ کی بڑائی اور بزرگی کے سب سے زیادہ حامل ہیں تاکہ انسانی رُوح یہ محسوس کرے کہ میں جس ہستی کے سامنے سجدہ کر رہی ہوں وہ ایک ایسی برتر و بالا ہستی ہے کہ اس کے سامنے میرا یہی منصب ہے کہ انتہائی تعبد و تذلل کے ساتھ اس کے آگے گری رہوں۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی انسانی رُوح قرب الٰہی کی طرف بلند ہونا شروع ہو جاتی ہے اور ناممکن ہے کہ سجدہ کی حالت میں ایک انسان اپنی توجہ کو قائم رکھتے ہوتے اپنے دل میں کوئی رُوحانی تغیر محسوس نہ کرے البتہ جو لوگ نماز کو محض ایک رسم کے طور پر ادا کرتے ہیں اور دل کی توجہ ان کے ساتھ نہیں ہوتی ان کی رُوح بے شک نماز کے اعمال میں سے گذر کر بھی خالی کی خالی نکل آتی ہے کیونکہ ان کے عمل میں کوئی جان نہیں ہوتی اور بے جان عمل کوئی تغیر پیدا نہیں کر سکتا۔

الغرض اس میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے کہ نماز حقیقی معنوں میں مومن کی معراج ہے۔ اور مسلمان اس مبارک عبادت پر جتنا بھی فخر کریں وہ تھوڑا ہے۔ یقیناً نماز کے مقابلہ پر کسی مذہب کی کوئی عبادت نہیں ٹھہر سکتی کیونکہ جس طرح نماز میں جسم اور رُوح کی ان باریک در باریک کیفیات کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو تعبد کے لیے ضروری ہیں وہ کسی اور جگہ نظر نہیں آتا۔ پھر نماز میں ان مختلف کیفیات کو جس ترتیب کے ساتھ رکھا گیا ہے وہ بھی فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ سب سے پہلے درجہ پر قیام ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس میں سینہ پر ہاتھ باندھے ہوئے ایک مومن خُدا کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ اس کے بعد رکوع ہے جو قیام اور سجدہ کے بین بین تعبد و تذلل کا ایک درمیانی مرتبہ ہے۔ اس کے بعد سجدہ ہے جس میں گویا انسانی رُوح اپنے خالق و مالک کی اعلیٰ اور کامل صفات کا مطالعہ کر کے اس کے سامنے بیتاب ہو کر زمین پر گر جاتی ہے۔

سب سے آخر میں قعدہ ہے جو سجدہ کے بعد ایک سکون کی کیفیت ہے جس میں انسان تعبد و تذلل کے مراحل میں سے گذر کر گویا خدا کے تسلی یافتہ بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نماز پڑھنے والا دونوں طرف مُنہ پھیر کر سلام کہتا ہے اور نماز سے فارغ ہو جاتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اب اسے دنیا میں واپس جا کر دوسرے لوگوں تک بھی اس سلامتی کے پیغام کو پہنچانا چاہیئے جو اُس نے اپنے خُدا سے حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ نماز کی کوئی حالت بھی خاموشی کی حالت نہیں بلکہ ہر حالت کے ساتھ اس حالت کے مناسب حال دُعا اور تحمید اور تسبیح وغیرہ کے کلمات مقرر کر دیئے گئے ہیں تاکہ یہ مبارک کلمات جسم کی ظاہری حالت اور دل کی باطنی توجہ کے ساتھ مل کر ایک پُورا اور حقیقی نقشہ تعبد اور تذلل اور سوال کا پیدا کر دیں۔ بھلا اس کامل و مکمل عبادت کے مقابلہ پر دُوسرے مذاہب کا گانا یا بجانا یا کسی غیر فطری حالت میں محض کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر کوئی الفاظ مُنہ سے کہہ دینا کیا حقیقت رکھتا ہے ؟

اور پھر اسلام نے نماز کی عبادت کو ایک اجتماعی صورت دینے کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی قرار دی کہ ایک حلقہ کے سب مسلمان باہم مل کر ایک امام کے پیچھے باترتیب صفوں میں قبلہ رُخ کھڑے ہو کر نماز ادا کیا کریں۔ اور ضمنی طور پر اس روزانہ پنجوقتہ اجتماع میں بہت سے دوسرے اجتماعی مفاد کا دروازہ بھی کھول دیا گیا ہے۔ غرض وضو سے لیکر اپنے اختتام تک نماز ایک نہایت ہی بابرکت عبادت ہے جس سے بڑھ کر قربِ الٰہی کے حصول اور دل کی طہارت کے لیے کوئی دُوسری عبادت تصور میں نہیں آسکتی۔ اور دن رات کے مختلف وقتوں میں پانچ نمازوں کا مقرر کیا جانا بھی اپنے اندر روحانی حفاظت اور روحانی تقویت کا ایک ایسا غیر معمولی سامان رکھتا ہے جو یقیناً کسی اور مذہب میں پایا نہیں جاتا۔

کیا اسلامی عبادتوں میں ظاہری شکل و صورت پر زیادہ زور دیا گیا ہے

بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اسلام نے اپنی عبادتوں میں ظاہری فارم یعنی شکل وصورت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور اس کے بغیر انہیں ناقص سمجھا ہے اور اصل چیز جو دل کی کیفیت سے تعلق رکھتی ہے اور جو گویا عبادت کی رُوح سمجھی جانی چاہیئے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہدیتے ہیں کہ چونکہ عبادت میں اصل چیز اس کی رُوح ہے اس لیے اس کے واسطے کسی ظاہری شکل وصورت کے مقرر کرنے کی ضرورت ہی نہیں صرف دل کی توجہ کافی ہونی چاہیئے اور یہ کہ اسلام نے عبادت کی ایک فارم مقرر کر کے اور پھر اس پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر اس کی اصل رُوح کو مٹا دیا ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جو آجکل اسلامی عبادتوں کے متعلق کیا جاتا ہے لیکن غور کیا جائے تو یہ اعتراض بالکل فضول اور بودا ہے۔ یعنی نہ تو یہ خیال دُرست ہے کہ عبادت چونکہ دل کی توجہ کا نام ہے اس لیے عبادتوں میں کسی فارم یعنی ظاہری شکل وصورت کے مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ یہ دُرست ہے کہ اسلام نے عبادت کی ظاہری شکل وصورت پر

ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور اس کی اصل حقیقت کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ دونوں خیال اسلامی تعلیم کی رُو سے قطعاً غلط اور بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔

پہلے ہم اس اعتراض کو لیتے ہیں کہ کیا عبادت میں کسی ظاہری شکل وصورت کے مقرر کئے جانے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ سو جاننا چاہیئے کہ یہ خیال کہ چونکہ عبادت کا حقیقی تعلق انسان کی قلبی کیفیت سے ہے اس لیے اس کے واسطے کسی ظاہری فارم یعنی شکل وصورت کی ضرورت نہیں ایک بالکل جہالت اور نادانی کا خیال ہے۔ کیونکہ اوّل تو جب جسم بھی خدا کا پیدا کردہ ہے تو اس کا بھی فرض ہے کہ وُہ بھی خدا کی عبادت میں حصہ لے اور اسے اپنے خالق و مالک کی عبودیت سے خارج یا آزاد قرار دے دینا کسی طرح بھی جائز نہیں سمجھا جا سکتا۔ انسان کا جسم اور اس کے سارے اعضاء اور ان اعضاء کی ساری طاقتیں خدا کی پیدا کردہ ہیں پس اگر رُوح پر خُدا کی مخلوق ہونے کی وجہ سے عبادت کا فرض عائد ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جسم اس فرض کی ادائیگی سے باہر رہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔[1]

یعنی "سچا مُسلمان وُہ ہے کہ جو ان سب چیزوں اور سب طاقتوں کو جو خدا نے اُسے عطا کی ہیں خواہ وُہ جسمانی ہیں یا رُوحانی۔ مادی ہیں یا غیر مادی ہمارے رستے میں خرچ کرتا ہے اور ہر ایک چیز میں سے جو ہم نے اُسے دی ہے ہمارا حق نکالتا ہے"

پس اسلام ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا کہ عبادت کا حق صرف رُوح کے ذمہ ہے اور جسم اس سے آزاد ہے۔ بلکہ اسلامی تعلیم کی رُو سے رُوح اور جسم دونوں اس بوجھ کے نیچے ہیں اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔

دوسرے یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر رُوح یعنی سپرٹ کے لیے کسی نہ کسی جسم یعنی ظاہری فارم کا ہونا ضروری ہے کیونکہ کوئی رُوح بغیر جسم کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور جو شخص کسی روح کو جسم کے بغیر زندہ رکھنے کی سعی کرتا ہے وہ یقیناً بہت جلد رُوح کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ مثلاً بزرگوں اور افسروں کا ادب و احترام ایک سراسر رُوحانی کیفیت ہے مگر کیا کوئی شخص اس جذبہ کی رُوح کو بغیر کسی ظاہری اور جسمانی پابندی کے زندہ رکھ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یقیناً اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں اپنے بزرگوں اور افسروں کے سامنے بھی اسی طرح آزادی اور بے پروائی کے ساتھ رہتے ہوئے جس طرح مَیں اپنے ہم عمر دوستوں یا اپنے عزیزوں وغیرہ کے ساتھ رہتا ہوں ان کے ادب و احترام کے جذبہ کو اپنے دل میں قائم رکھ سکتا ہوں تو اس کا یہ دعویٰ غلط اور باطل ہوگا اور ایسا شخص بہت جلد ادب و احترام کی رُوح کو ضائع کر کے خالی ہاتھ

---

[1] سورۃ بقرہ: ۴

رہ جائے گا۔ دراصل فطرتِ انسانی کے ماتحت رُوح اور جسم کے درمیان ایک ایسا گہرا رابطہ اور وثیق تعلق ہے کہ کبھی بھی ایک کو دُوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا اور یہ دونوں چیزیں ہر وقت ایک غیر معلوم مگر یقینا نہ قانون کے ماتحت ایک دُوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک انسان تکلّف کے ساتھ رونے کی شکل بنائے تو وُہ محسوس کریگا کہ اس ظاہری تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے دل کے اندر بھی غم و الم کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہوگئی ہے۔ اِسی طرح اگر ایک شخص کا دل مغموم ہے مگر کسی وجہ سے اس کے ظاہری جسم میں ہنسی کی صورت پیدا کر دی جاوے تو اس کے ساتھ ہی اس کے دل کا غم خوشی میں مبدل ہونا شروع ہو جائے گا پس عبادات میں جسم یعنی ظاہری فارم اور شکل و صورت کا تجویز کیا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جسم اور رُوح ایک دُوسرے کے ساتھ غیر مُنفک صورت میں پیوست ہیں اور جسم کو شامل کرنے کے بغیر عبادت کی رُوح ہرگز زندہ نہیں رہ سکتی اور لحظہ بہ لحظہ کمزور ہو کر بہت جلد مر جاتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کے ہر نظام میں ہر رُوح کے لیے کوئی نہ کوئی جسم مقرر کیا جاتا ہے اور تعجب ہے کہ جو لوگ اسلامی عبادات پر زیادہ معترض ہیں وہی اس مزعومہ "ظاہر پرستی" میں دُوسروں سے آگے نکلے ہوئے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ و امریکہ کے سارے نظام اور سارے تہذیب و تمدن کی بنیاد ظاہری فارم اور ضابطہ پر مبنی ہے اور یقیناً جتنا زور مغربی ممالک میں ہر چیز کی فارم پر دیا جاتا ہے اتنا کسی اور جگہ نظر نہیں آتا۔ مثلاً ایک ماتحت کے لیے افسر کا ادب لازمی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے ادب محض ایک قلبی کیفیّت کا نام ہے لیکن کوئی مغربی حکومت اس بات پر تسلّی نہیں پاتی کہ اس کے افراد صرف اپنے دل میں اپنے افسروں کا ادب محسوس کر لیا کریں اور بس۔ بلکہ اس کے لیے یورپ و امریکہ کی ہر حکومت میں بے شمار ضوابط مقرر ہیں اور افسروں کے احترام کی غرض سے ماتحتوں کو سینکڑوں ظاہری پابندیوں میں جکڑ دیا گیا ہے کیونکہ دنیاوی معاملات میں ان لوگوں کے دل دُوسروں کی نسبت اس بات کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی جذبہ کی رُوح کو بغیر ظاہری فارم کے زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ دینی معاملات میں اس فطری قانون کو نظر انداز کیا جاوے۔ الغرض جسم کو عبادت میں شامل کرنا نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ جسم بھی خدا کی مخلوق ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی پرستش میں حصّہ لے بلکہ اس لیے بھی کہ ظاہری اور جسمانی پابندی کے بغیر اندرونی رُوح کا بقا ممکن نہیں۔

دُوسرا اعتراض یہ ہے کہ اسلام نے اپنی عبادات میں ظاہری شکل و صورت پر زیادہ زور دیا ہے اور عبادت کی رُوح کی طرف جو اصل چیز ہے پوری توجہ نہیں دی۔ سو یہ اعتراض بھی بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے گو اسلام نے جسم کو عبادت میں شامل کر کے ہر عبادت کے لیے ایک ظاہری صورت تجویز کی ہے لیکن چونکہ بہرحال رُوح جسم پر مقدّم ہے اس لیے اسلام نے اصل زور عبادت کی رُوح پر دیا ہے۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس قدر زور عبادت کی رُوح پر اسلام میں پایا جاتا ہے

وہ کسی اور مذہب میں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ نماز جو اسلام میں ساری عبادتوں سے افضل قرار دی گئی ہے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ[1]

یعنی "تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنی نماز کی اصل حقیقت سے غافل ہیں۔ وہ ایک ایسا کام کرتے ہیں جو لوگوں کو تو نظر آتا ہے مگر اس کے اندر کوئی رُوح نہیں ہے۔ اُنھوں نے صرف برتن کو روک رکھا ہے اور اصل رُوح جس کے لیے یہ برتن مقرر ہے اُن کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔"

اِس قرآنی آیت میں جس وضاحت اور زور کے ساتھ اور جس مؤثر انداز میں اسلامی عبادات کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں اور ہمارا دعویٰ ہے کہ کوئی دوسرا مذہب اس سے بہتر تعلیم نہیں پیش کر سکتا۔ ان مختصر اور سادہ الفاظ میں اس غایت درجہ اہم اور نہایت وسیع مسئلہ کا ایسا نچوڑ آ جاتا ہے کہ جس کے بعد حقیقتاً کسی اور تشریح کی ضرورت نہیں رہتی اور یہ آیت ہم نے صرف مثال کے طور پر دی ہے ورنہ اسلامی شریعت اس قسم کی تعلیم سے بھری پڑی ہے کہ عبادات میں گو فطرتِ انسانی کے ازلی قانون کے ماتحت جسم کا ہونا بھی ضروری ہے مگر اصل چیز رُوح ہے جس کے بغیر کسی جسم کو زندہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ مثلاً قربانی کے مسئلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ[2]

یعنی "ہم نے قربانی کے جانوروں کو تمہارے لیے خُدا کی شناخت کا ایک ذریعہ بنایا ہے اور ان میں تمہارے لیے بہت خیر و برکت رکھی گئی ہے۔ پس جب تم انہیں ذبح کرنے کے لیے باندھو تو اُن پر خُدا کا نام پڑھ لیا کرو۔ اور پھر جب وہ اپنے پہلو پر گر کر جاں بحق ہو جائیں تو تم ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور حاجت مندوں اور فقیروں کو بھی کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو اس غرض سے تمہارے قابو میں

---

[1] قرآن شریف سورۃ ماعون: ۵ تا ۸ [2] قرآن شریف سورہ حج: ۳۷، ۳۸

دے رکھا ہے تاکہ تم خُدا کے شکر گذار بندے بنو۔ مگر یاد رکھو کہ ان جانوروں کا گوشت اور خُون خُدا کو نہیں پہنچتا بلکہ جو چیز خدا کو پہنچتی ہے وہ اس تقویٰ کی رُوح ہے جس سے تم یہ کام کرتے ہو اور ہم نے اسی تقویٰ کی رُوح کو تمہارے قابو میں رکھنے کے لیے یہ طریق مقرر کیا ہے تاکہ تم اس رنگ میں جو خدا نے مقرر کر رکھا ہے اس کی بڑائی بیان کر سکو۔ اور اے رسُول بشارت دے ان لوگوں کو جو اس رنگ میں خدا کی عبادت بجالاتے ہیں۔"

اسی طرح حدیث میں بھی کثرت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وارد ہوئے ہیں جن میں آپؐ نے اسلامی عبادات کے متعلق یہ تشریح فرمائی ہے کہ ان میں اصل اور حقیقی مقصود عبادت کی رُوح ہے۔ چنانچہ روزہ کے متعلق آپؐ فرماتے ہیں :۔

مَنْ لَمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ یَدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ[1]

"یعنی جو شخص روزہ رکھ کر جھُوٹ اور ریاکاری کو ترک نہیں کرتا اور اسی پر عامل رہتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ خُدا کو اس کے بھوکا اور پیاسا رہنے کی کوئی حاجت نہیں یعنی اس صورت میں اس کا روزہ کوئی روزہ نہیں۔ بلکہ وہ بلاوجہ بھوکا اور پیاسا رہتا ہے جس کا اسے کوئی بھی ثواب نہیں۔"

پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اسلام نے اپنی مختلف عبادات میں ایسی تعلیم دی ہے کہ جس میں اس اصول کو کہ عبادت میں اصل چیز اُس کی رُوح ہے عملاً ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ وہ قبلہ رُخ ہو کر ادا ہونی چاہیئے لیکن ایسے حالات میں جبکہ کسی مجبوری سے قبلہ رُخ ہونا مشکل ہو جائے۔ مثلاً انسان جب کسی سواری پر سوار ہو اور سواری کا رُخ اس کے قابو میں نہ ہو یا کسی وقت بادل وغیرہ کی وجہ سے قبلہ کا رُخ معلوم نہ ہو سکے تو اس قسم کی صورتوں میں اسلام کا یہ حکم ہے کہ پھر جدھر سواری کا رُخ ہو یا جس طرف انسان قیاس کرے کہ ادھر قبلہ ہے اُدھر ہی مُنہ کر کے نماز ادا کر لی جاوے۔ یا مثلاً نماز کے لیے قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعدہ کی حالتیں لازمی قرار دی گئی ہیں لیکن بایں ہمہ اگر بیماری کی وجہ سے کوئی شخص کھڑا نہ ہو سکے یا کوئی اور معذوری ہو تو اس کے لیے اجازت ہے کہ بیٹھ کر ہی نماز ادا کر لے اور اگر بیٹھ بھی نہ سکے تو لیٹے لیٹے ہی نماز پڑھ لے۔ یہی اصول دوسری عبادتوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ گویا جہاں کہیں بھی عبادت کی رُوح اور اس کا جسم وقتی حالات کی مجبوری کی وجہ سے آپس میں ٹکرانے لگتے ہیں اور دونوں

---

[1] بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب تنزیہ الصوم ؂

کو ایک وقت میں اختیار نہیں کیا جاسکتا تو وہاں اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ جسم کو چھوڑ دو اور رُوح کو اختیار کر لو۔ جو اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ اسلام میں اصل مقصود عبادت کی رُوح کو قرار دیا گیا ہے اور جسم کو محض جسم کی ظاہری شرکت اور رُوح کے بقا کے لیے رکھا گیا ہے۔ وھو المراد۔ پس یہ الزام کہ اسلام نے اپنی عبادات میں جسم کو شامل کر کے رُوح کو مٹا دیا ہے یا یہ کہ جسم پر زیادہ زور دے کر رُوح کو کمزور کر دیا ہے بالکل غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اس معاملہ میں اسلامی تعلیم ایک ایسا اعلیٰ اور وسطی اور دلکش نمونہ پیش کرتی ہے جو نہ صرف ہر اعتراض سے بالا ہے بلکہ دُنیا کا کوئی دوسرا مذہب اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتا اور پھر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اسلام نے اپنی عبادات کے لیے جسم بھی ایسے تجویز کئے ہیں کہ ان سے بڑھ کر عبادت کی رُوح کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے کوئی صورت خیال میں نہیں آسکتی۔

سلطنت ہائے رُوم و فارس کی باہمی جنگ اور اسکے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی

اسلام سے قبل اور اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تمام متمدن دُنیا میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ وسیع سلطنتیں دو تھیں سلطنتِ فارس اور سلطنت روم اور یہ دونوں سلطنتیں عرب کے قریب واقع تھیں سلطنت فارس عرب کے شمال مشرق میں تھی اور سلطنتِ رُوم شمال مغرب میں۔ چونکہ ان سلطنتوں کی سرحد ملتی تھی اس لیے بعض اوقات ان کا آپس میں جنگ وجدل بھی ہو جاتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی جس کا اب ہم ذکر کر رہے ہیں۔ یہ سلطنتیں برسرپیکار تھیں اور سلطنت فارس نے سلطنت روم کو زیر کیا ہوا تھا۔ اور اس کے کئی قیمتی علاقے چھین لیے تھے اور اُسے برابر دباتی چلی جاتی تھی۔[1] قریش چونکہ بُت پرست تھے اور فارس کا بھی قریباً قریباً یہی مذہب تھا۔ اس لیے قریشِ مکہ فارس کی ان فتوحات پر بہت خوش تھے۔ مگر مسلمانوں کو سلطنتِ روم سے ہمدردی تھی کیونکہ رومی سلطنت عیسائی تھی اور عیسائی بوجہ اہلِ کتاب ہونے اور حضرت مسیح ناصری سے نسبت رکھنے کے بُت پرست اور مجوس اقوام کی نسبت مسلمانوں کے بہت قریب تھے۔ ایسے حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے علم پاکر پیشگوئی فرمائی کہ گو اس وقت رُوم فارس سے مغلوب ہو رہا ہے مگر چند سال کے عرصہ میں وہ فارس پر غالب آجائے گا۔ اور اس دن مومن خوش ہوں گے۔[2] یہ پیشگوئی سُن کر مسلمانوں نے جن میں حضرت ابوبکرؓ کا نام خاص طور پر مذکور ہوا ہے مکہ میں عام اعلان کرنا شروع کیا کہ ہمارے خُدا نے یہ بتایا ہے کہ عنقریب رُوم فارس پر غالب آجائے گا۔ قریش نے جواب دیا کہ اگر یہ پیشگوئی سچی ہے تو آؤ شرط لگا لو۔ چونکہ اس وقت تک اسلام میں شرط لگانا ممنوع نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے منظور کر لیا اور رؤسائے قریش اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان چند اُونٹوں کی ہار جیت پر شرط قرار پاگئی اور چھ سال کی میعاد مقرر ہوئی مگر جب آنحضرت

---

[1] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا حالات ہرقل ۔ [2] قرآن شریف سورۃ روم ۲تا۵ ۔

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپؐ نے فرمایا۔ چھ سال کی میعاد مقرر کرنا غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو میعاد کے متعلق بِضْعِ سِنِيْنَ کے الفاظ فرمائے ہیں جو عربی محاورہ کی رُو سے تین سے لے کر نو تک کے لیے بولے جاتے ہیں۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ آپؐ مکّہ میں ہی مقیم تھے اور ہجرت نہیں ہوئی تھی اس کے بعد مقررہ میعاد کے اندر اندر ہی جنگ نے اچانک پلٹا کھایا اور رُوم نے فارس کو زیر کر کے تھوڑے عرصہ میں ہی اپنا تمام علاقہ واپس چھین لیا۔ یہ ہجرت کے بعد کی بات ہے[1] اس واقعہ کا سَر ولیم میور نے اپنی کتاب میں یوں ذکر کیا ہے کہ:۔

"جب فارس کی فتوحات کا سیلاب ابھی تک برابر بڑھا چلا جاتا تھا۔ محمد (صلعم) نے اپنی تیسویں سورۃ میں یہ پیشگوئی کی کہ عنقریب رُوم فارس پر غالب آئے گا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں واقعات نے اس پیشگوئی کو سچا ثابت کیا۔"[2]

قبائلِ عرب کو تبلیغِ اسلام

قبائل کے دَورہ کے متعلق مختصراً اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ انبیاء تو کبھی بھی مایوس نہیں ہوتے مگر ظاہری حالات کے لحاظ سے مکّہ کی حالت اسوقت سخت مایوس کُن تھی۔ قریش عداوت اور ایذا رسانی میں دن بدن ترقی کرتے جاتے تھے اور موجودہ صورت میں اُن کے مُسلمان ہونے کی بظاہر بہت ہی کم اُمید تھی۔ دُوسری طرف آپؐ کے طائف کے سفر نے اس شہر کے متعلق بھی فی الحال کوئی اُمید پیدا نہیں کی تھی۔ انہیں حالات کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دن بدن اپنی توجہ کو دیگر قبائلِ عرب کی طرف زیادہ پھیرتے جاتے تھے اور چونکہ قبائل کی تبلیغ کا بہترین ذریعہ یہ تھا کہ حج کے موقعہ پر مکّہ اور منیٰ میں اور شہر حرم کے ایام میں عکاظ، مجنّہ اور ذوالمجاز کے میلوں کے موقعہ پر ان کے پاس جا کر تبلیغ کی جاوے اس لیے آپؐ نے ان موقعوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا شروع کیا اور کثرت کے ساتھ قبائل کا دَورہ شروع کر دیا۔ بعض اوقات حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ یا زیدؓ بن حارثہ بھی آپؐ کے ساتھ ہوتے تھے۔ مگر جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے قریش نے اس میں بھی روک ٹوک شروع کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ابولہب نے تو گویا اپنا یہ معمول کر لیا تھا کہ جہاں آپؐ تشریف لے جاتے وہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور جب آپؐ اپنی تقریر شروع فرماتے تو وہ شور کرنے لگتا اور لوگوں سے کہتا کہ اس کی بات نہ مانو کیونکہ یہ اپنے دین سے پھر گیا ہے اور تمہارا دین بھی بگاڑنا چاہتا ہے[3] لوگ جب دیکھتے کہ آپؐ کے اپنے رشتہ دار ہی آپؐ کو جھٹلا رہے ہیں تو وہ بھی تکذیب کرتے[4]

---

[1] ترمذی تفسیر سورۃ روم وخمیس جلد ا و چیمبرس انسائیکلو پیڈیا حالات ہرقل و تذکرہ بائی زین ٹائین ایمپائر۔

[2] لائف آف محمد صفحہ ۱۱۹۔ [3] ابن ہشام باب عَرْضُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَفْسَہٗ عَلَی الْقَبَائِلِ۔ [4] ابن سعد۔

اور بعض وقت ہنسی اور مذاق بھی اڑاتے۔ ابولہب کے علاوہ ابوجہل نے بھی کئی دفعہ آپؐ کے پیچھے جا کر لوگوں کو آپؐ سے بدظن کرنے کی کوشش کی؛ چنانچہ ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جب مَیں ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا، مَیں نے آپؐ کو ذوالمجاز میں دیکھا کہ آپؐ لوگوں کے مجمعوں میں گھس کر توحید کا وعظ فرماتے پھرتے تھے۔ اُس وقت ابوجہل آپؐ کے پیچھے پیچھے تھا اور آپؐ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا تھا "اے لوگو! اس کے فریب میں نہ آنا۔ یہ چاہتا ہے کہ تم کو لات و عزیٰ کی پرستش سے پھیر دے[1]۔"

ایک دفعہ آپؐ بنو عامر بن صعصعہ کے ڈیرے میں تشریف لے گئے۔ خوش قسمتی سے اس وقت کوئی قریش آپؐ کے ساتھ نہ تھا۔ آپؐ نے انہیں توحید کا وعظ فرمایا اور اسلام کی تائید میں اُن سے مدد چاہی۔ جب آپؐ تقریر ختم کر چکے تو اُن میں سے بحیرہ بن فراس نامی ایک شخص بولا "واللہ اگر یہ شخص میرے ہاتھ آ جاوے تو مَیں سارے عرب کو زیر کر لوں" اور پھر آپؐ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اچھا یہ بتاؤ کہ اگر ہم نے تمہارا ساتھ دیا اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آ گئے۔ تو تمہارے بعد حکومت میں ہمارا حصہ ہو گا یا نہیں؟" آپؐ نے فرمایا۔ "حکومت کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔" اُس نے کہا "خوب! تمام عرب کے سامنے سینہ سپر ہم ہوں اور حکومت غیر کے ہاتھ میں جاوے! جاؤ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں[2]۔" غرض آپؐ نے مختلف قبائل کا دورہ فرمایا اور بنو عامر بن صعصعہ، بنو محارب، فزارہ، غسان، مرّہ، حنیفہ، سُلیم، عبس، کندہ، کلب، حارث، عذرہ، حضارمہ وغیرہ سب کو باری باری اسلام کی دعوت دی، مگر سب نے انکار کیا[3] اور سب سے زیادہ سختی کے ساتھ انکار کرنے والے بنو حنیفہ تھے جو یمامہ کے رہنے والے تھے[4]۔ مسیلمہ کذّاب جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر عہد میں نبوت کا دعویٰ کیا اسی قبیلہ کا رئیس تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبائل کا دورہ بھی ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ ہر دو جہان کا بادشاہ جس کا نام لینے پر بعد کے مسلمان شہنشاہ جن کے نام سے دُنیا کانپتی تھی اپنے تختوں سے نیچے اُتر آتے تھے، قبائلِ عرب کے بدوی رئیسوں کے خیموں میں جاتا ہے اور ایک ایک رئیس کے خیمہ پر دستک دیکر خالقِ کونین کا پیغام پیش کرتا ہے اور پیچھے پڑ پڑ کر استدعا کرتا ہے کہ یہ تمہارے بھلے کی چیز ہے، اسے لے لو مگر ہر دروازہ اس کے لیے بند کیا جاتا ہے اور ہر خیمہ سے اس کو یہ آواز آتی ہے کہ جاؤ یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔ اور خدا کا یہ بندہ اپنے مقدس مال کی گٹھڑی اٹھا کر اگلے خیمے کا راستہ لیتا ہے۔

بہر حال اب اسلامی منظر چاروں طرف تاریک و تار تھا۔ مکہ میں قریش اسلام کے جانی دشمن تھے اور ہر وقت اُسے نیست و نابود کر دینے کی فکر میں رہتے تھے۔ طائف والوں نے اسلام کا نام لینے پر

---

[1] مسند امام حنبل جلد ۴ ÷ [2] ابن ہشام ÷ [3] ابنِ سعد ذکر دُعاءِ رسول اللہ صلعم قبائل العرب ÷
[4] ابن ہشام ÷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسا دیتے تھے۔ دیگر قبائلِ عرب آپ کو صاف صاف جواب دے چکے تھے۔ گویا ظاہری اسباب کے لحاظ سے اب اسلام کے لیے "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کی حالت تھی، مگر اسلام خُدا کا بھیجا ہوا دین تھا اور اُسی نے اسے قائم کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اور اس زمانہ میں بھی اس کی تائید و نصرت کے وعدے ہو رہے تھے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانہ کی وحیٔ الٰہی میں خصوصیت کے ساتھ بڑے پُرشوکت اور پُر رُعب الفاظ میں اسلام کی آئندہ ترقی اور فتوحات کے نقشے کھینچے جا رہے تھے۔ اور مخالفین اسلام کی آئندہ ناکامیاں اور ان کی ہلاکت کی پیشگوئیاں دُنیا کو سُنائی جا رہی تھیں۔ قریش ان باتوں کو سُنتے اور بے اختیار ہنس دیتے۔ مگر خداوندِ عالمیان اپنی قدرت کے زور سے یہ سب نظارے دکھانے والا تھا اور پردۂ غیب سے عنقریب کچھ ظاہر ہونے والا تھا؛ چنانچہ ناگاہ یثرب کی جانب کا کنارہ ٹوٹ کر گرا اور اسلامی چشمہ کا پانی جو چاروں طرف راستہ بند ہونے کی وجہ سے اب تک اپنے کناروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر رہ جاتا تھا بڑے زور کے ساتھ اس راستہ سے بہ نکلا۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کی کیفیت بیان کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یثرب اور اہلِ یثرب کا مختصر سا حال تحریر کر دیں تاکہ ان واقعات کا سمجھنا آسان ہو جاوے۔

وطن سے بے وطن

یثرب اور اہلِ یثرب

مکہ کے شمال کی طرف قریباً اڑھائی سو میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے جس کا نام مدینہ ہے۔ اب تو اس کے نام سے ساری دنیا واقف ہے کیونکہ ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری دس سال یہیں گذارے اور یہیں آپ فوت ہوئے اور یہیں آپ کا مزار مبارک ہے اور یہی ابتداء میں خلافتِ اسلامی کا مرکز رہا ہے۔ مگر اسلام سے پہلے یہ شہر ایک گمنامی کی حالت میں تھا اور اس کا نام یثرب تھا۔ ہجرت کے بعد رسُولِ خدا کا مسکن ہو جانے کی وجہ سے اس کا نام مدینۃ الرسول مشہور ہوگیا اور پھر آہستہ آہستہ صرف مدینہ رہ گیا۔ اسلام سے پہلے یثرب کی آبادی مذہباً دُو حصوں میں منقسم تھی۔ یعنی یہود اور بُت پرست۔ یہود پھر آگے تین قبائل میں تقسیم شدہ تھے یعنی بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ اور بُت پرستوں کی بھی دو شاخیں تھیں جن کا نام اوس اور خزرج تھا۔ یہی اوس اور خزرج بعد میں اسلام لاکر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دیکر انصار کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اسلام سے پہلے اوس و خزرج عموماً آپس میں برسرِپیکار رہتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں ان کے درمیان ایک خطرناک لڑائی کی تیاری ہو رہی تھی جو جنگِ بُعاث کے نام سے مشہور ہے۔ اس لڑائی میں اوس و خزرج کے بڑے بڑے نامور سردار کٹ کر ہلاک ہوگئے۔

چونکہ یہودی لوگ علمی اور مذہبی لحاظ سے ان بُت پرستوں پر فوقیت رکھتے تھے اور دولت و اقتدار میں بھی عموماً بڑھے ہوئے تھے، اس لیے یہود کا اُن پر خاص اثر تھا۔ حتّٰی کہ اگر کسی مُشرک کے اولادِ نرینہ نہ ہوتی تھی تو وہ منّت مانتا تھا کہ اگر میرے اولادِ نرینہ ہوئی تو مَیں اپنے پہلے لڑکے کو یہودی بناؤں گا۔[1] یہود کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اوس و خزرج بھی کتبِ سماوی اور سلسلہ رسالت سے کچھ کچھ آشنا ہو گئے تھے۔ اور چونکہ یہود میں الٰہی نوشتوں کی رُو سے ان دنوں ایک نبی کا انتظار تھا، اس لیے یہ بات اوس اور خزرج کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ یہود اُن سے کہا کرتے تھے کہ اب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ وہ جب آئے گا تو ہم اس کا ساتھ دے کر بُت پرستوں اور کافروں کو نیست و نابُود کر دیں گے اور وہ ایک بڑی سلطنت قائم کریگا اور ہم اُسے مان کر دُنیا میں طاقتور ہو جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔[2]

---

[1] تفسیر ابن جریر زیر آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ بقرہ: ۲۵۷ [2] ابن ہشام

یثرب میں اسلام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسب دستور مکہ میں اشہرِ حرم کے اندر قبائل کا دورہ کر رہے تھے کہ آپؐ کو معلوم ہوا کہ یثرب کا ایک مشہور شخص سوید بن صامت مکہ میں آیا ہوا ہے۔ سوید مدینہ کا ایک مشہور شخص تھا اور اپنی بہادری اور نجابت اور دُوسری خوبیوں کی وجہ سے کامل کہلاتا تھا اور شاعر بھی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا پتہ لیتے ہوئے اس کے ڈیرے پر پہنچے اور اُسے اسلام کی دعوت دی۔ اُس نے کہا۔ میرے پاس بھی ایک خاص کلام ہے۔ جس کا نام مجلۂ لقمان ہے۔ آپؐ نے کہا۔ مجھے بھی اس کا کوئی حصہ سناؤ۔ جس پر سوید نے اس صحیفہ کا ایک حصہ آپؐ کو سُنایا۔ آپؐ نے اس کی تعریف فرمائی کہ اس میں اچھی باتیں ہیں، مگر فرمایا کہ میرے پاس جو کلام ہے وُہ بہت بالا اور ارفع ہے چنانچہ پھر آپؐ نے اُسے قرآن شریف کا ایک حصہ سُنایا۔ جب آپؐ ختم کر چکے تو اُس نے کہا۔ ہاں واقعی یہ بہت اچھا کلام ہے۔ اور گو وُہ مسلمان نہیں ہوا مگر اُس نے فی الجملہ آپؐ کی تصدیق کی اور آپؐ کو جھٹلایا نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مدینہ میں واپس جا کر اُسے زیادہ مہلت نہیں ملی اور وہ جلد ہی کسی ہنگامہ میں قتل ہو گیا۔ یہ جنگِ بُعاث سے پہلے کی بات ہے[1]۔ اس کے بعد اسی زمانہ کے قریب یعنی جنگِ بُعاث سے قبل آپؐ پھر ایک دفعہ حج کے موقعہ پر قبائل کا دورہ کر رہے تھے کہ اچانک آپؐ کی نظر چند آدمیوں پر پڑی۔ یہ قبیلہ اوس سے تھے اور اپنے بُت پرست رقیبوں یعنی خزرج کے خلاف قریش سے مدد طلب کرنے آئے تھے۔ یہ بھی جنگِ بعاث سے پہلے کا واقعہ ہے۔ گویا یہ طلبِ مدد اسی جنگ کی تیاری کا ایک حصہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ آپؐ کی تقریر سُن کر ایک نوجوان شخص جس کا نام ایاس تھا بے اختیار بول اُٹھا۔ "خُدا کی قسم جس طرف یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو بُلاتا ہے وہ اس سے بہتر ہے جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔" مگر اس گروہ کے سردار نے ایک کنکروں کی مُٹھی اٹھا کر اس کے مُنہ پر ماری اور کہا۔ چُپ رہو۔ ہم اس کام کے لیے یہاں نہیں آئے۔ اور اس طرح اس وقت یہ معاملہ یونہی دب کر رہ گیا۔ مگر لکھا ہے کہ ایاس جب واپس وطن جا کر فوت ہونے لگا، تو اس کی زبان پر کلمۂ توحید جاری تھا[2]۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب جنگِ بُعاث ہو چکی تو ۱۱ سنہ نبوی کے ماہِ رجب میں[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں یثرب والوں سے پھر ملاقات ہوگئی۔ آپؐ نے حسب ونسب پوچھا تو معلوم ہوا کہ قبیلہ خزرج کے لوگ ہیں اور یثرب سے آئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت محبت کے لہجہ میں کہا۔ "کیا آپ لوگ میری کچھ باتیں سُن سکتے ہیں؟" اُنہوں نے کہا "ہاں! آپ کیا کہتے ہیں۔" آپؐ بیٹھ گئے اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن شریف کی چند آیات سُنا کر اپنے مشن سے آگاہ کیا۔ ان لوگوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا اور کہا "یہ موقعہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہود ہم سے سبقت لے جاویں۔ یہ کہہ کر سب

---

[1] طبری ؛ [2] ابن ہشام ؛ [3] زرقانی

مسلمان ہو گئے۔ یہ چھ اشخاص تھے۔ جن کے نام یہ ہیں :

(۱) ابوامامہ اسعد بن زرارہ جو بنو نجار سے تھے اور تصدیق کرنے میں سب سے اوّل تھے۔
(۲) عوف بن حارث یہ بھی بنو نجار سے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے ننھیال کا قبیلہ تھا۔
(۳) رافع بن مالک جو بنو زریق سے تھے۔ اب تک جو قرآن شریف نازل ہو چکا تھا۔ وہ اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عطا فرمایا[1]
(۴) قطبہ بن عامر جو بنی سلمہ سے تھے۔
(۵) عقبہ بن عامر جو بنی حرام سے تھے اور
(۶) جابر بن عبداللہ بن رُمان جو بنی عبیدہ سے تھے۔

اس کے بعد یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ہوئے اور جاتے ہوئے عرض کیا کہ ہمیں خانہ جنگیوں نے بہت کمزور کر رکھا ہے اور ہم میں آپس میں بہت نا اتفاقیاں ہیں ہم یثرب میں جا کر اپنے بھائیوں میں اسلام کی تبلیغ کریں گے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ہم کو پھر جمع کر دے۔ پھر ہم ہر طرح آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں گے؛ چنانچہ یہ لوگ گئے اور ان کی وجہ سے یثرب میں اسلام کا چرچا ہونے لگا[2]

بیعتِ عقبہ اولیٰ ۱۲ سنہ نبوی

یہ سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں یثرب والوں کی طرف سے ظاہری اسباب کے لحاظ سے ایک بیم و رجا کی حالت میں گذارا۔ آپ اکثر یہ خیال کیا کرتے تھے کہ دیکھیں ان چھ مصدقین کا کیا انجام ہوتا ہے اور آیا یثرب میں کامیابی کی کوئی امید بندھتی ہے یا نہیں مسلمانوں کے لیے بھی یہ زمانہ ظاہری حالات کے لحاظ سے ایک بیم و رجا کا زمانہ تھا۔ وُہ دیکھتے تھے کہ سردارانِ مکہ اور رؤساء طائف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو سختی کے ساتھ رَد کر چکے ہیں دیگر قبائل عرب بھی ایک ایک کر کے اپنے انکار پر مُہر لگا چکے تھے۔ مدینہ میں اُمید کی ایک کرن پیدا ہوئی تھی، مگر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کرن مصائب و آلام کے طوفان اور شدائد کی آندھیوں میں قائم رہ سکے گی۔ دوسری طرف مکہ والوں کے مظالم دن بدن زیادہ ہو رہے تھے۔ اور انھوں نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اسلام کو مٹانے کا بس یہی وقت ہے مگر اس نازک وقت میں بھی جس سے زیادہ نازک وقت اسلام پر کبھی نہیں آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخلص صحابی ایک مضبوط چٹان کی

---

[1] اس سے قبل حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں اس قسم کا ذکر گذر چکا ہے اسی ضمن میں یہ دوسرا واقعہ ہے جو اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن شریف ساتھ ساتھ ضبط تحریر میں آتا جاتا تھا۔ منہ ‏[2] ابن ہشام و طبری و زرقانی

طرح اپنی جگہ پر قائم تھے۔ اور آپ کا یہ عزم و استقلال بعض اوقات آپ کے مخالفین کو بھی حیرت میں ڈال دیتا تھا کہ یہ شخص کس قلبی طاقت کا مالک ہے کہ کوئی چیز اسے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی۔ بلکہ اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں خاص طور پر ایک رُعب اور جلال کی کیفیت پائی جاتی تھی اور مصائب کے ان تُند طوفانوں میں آپ کا سر اور بھی بلند ہوتا جاتا تھا۔ یہ نظارہ اگر ایک طرف قریش مکہ کو حیران کرتا تھا تو دُوسری طرف ان کے دلوں پر کبھی کبھی لرزہ بھی ڈال دیتا تھا۔ ان ایام کے متعلق سر ولیم میور لکھتا ہے :

> "ان ایام میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے سامنے اس طرح سینہ سپر تھا کہ انہیں بعض اوقات حرکت کی تاب نہیں ہوتی تھی۔ اپنی بالآخر فتح کے یقین سے معمور مگر بظاہر بے بس اور بے یار و مددگار۔ وہ اور اس کا چھوٹا سا گروہ اس زمانہ میں گویا ایک شیر کے مُنہ میں تھے مگر اس خُدا کی نُصرت کے وعدوں پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے جس نے اسے رسُول بنا کر بھیجا تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ایسے عزم کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑا تھا جسے کوئی چیز اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی تھی۔ یہ نظارہ ایک ایسا شاندار منظر پیش کرتا ہے جس کی مثال سوائے اسرائیل کی اس حالت کے اور کہیں نظر نہیں آتی کہ جب اس نے مصائب و آلام میں گھِر کر خُدا کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے کہ اے میرے آقا! اب تو میں۔ ہاں صرف میں ہی اکیلا رہ گیا ہوں۔ نہیں بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ نظارہ اسرائیلی نبیوں سے بھی ایک رنگ میں بڑھ کر تھا .... محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ الفاظ اسی موقعہ پر کہے گئے تھے کہ اے میری قوم کے صنادید تم نے جو کچھ کرنا ہے کرو میں بھی کسی اُمید پر کھڑا ہُوں۔"

الغرض اسلام کے لیے یہ ایک بہت نازک وقت تھا کہ مکہ والوں کی طرف سے تو ایک گونہ نا اُمیدی ہو چکی تھی، مگر مدینہ میں اُمید کی کرن پیدا ہو رہی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑی توجہ کے ساتھ اس طرف نظر لگائے ہوتے تھے کہ آیا مدینہ بھی مکہ اور طائف کی طرح آپ کو رد کرتا ہے یا کہ اس کی قسمت دُوسرے رنگ میں لکھی ہے؛ چنانچہ جب حج کا موقعہ آیا تو آپ بڑے شوق کے ساتھ اپنے گھر سے نکلے اور منیٰ کی جانب عقبہ کے پاس پہنچ کر ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ناگاہ آپ کی نظر اہلِ یثرب کی ایک چھوٹی سی جماعت پر پڑی جنھوں نے آپ کو دیکھ کر فوراً پہچان لیا۔ اور نہایت محبت اور اخلاص سے آگے بڑھ کر آپ کو ملے۔ اب کے یہ بارہ اشخاص تھے۔ جن میں سے پانچ تو وہی گزشتہ سال کے مصدقین تھے اور سات نئے تھے۔ اور اوس اور خزرج دونوں قبیلوں میں سے تھے۔

ان کے نام یہ ہیں :-

(۱)	ابو امامہ اسعد بن زرارہ	یہ پانچ اصحاب سابقہ مصدقین میں سے تھے۔
(۲)	عوف بن حارث	
(۳)	رافع بن مالک	
(۴)	قطبہ بن عامر	
(۵)	عقبہ بن عامر	

(۶)	معاذ بن حارث	از قبیلہ بنی نجار	(خزرج)
(۷)	ذکوان بن عبد قیس	از قبیلہ بنو زریق	(خزرج)
(۸)	ابو عبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہ	از بنی بلی	(حلیف خزرج)
(۹)	عبادہ بن صامت	از بنی عوف	(خزرج)
(۱۰)	عباس بن عبادہ بن نضلہ	از بنی سالم	(خزرج)
(۱۱)	ابوالہیثم بن تیہان	از بنی عبدالاشہل	(اوس)
(۱۲)	عویم بن ساعدہ	از بنی عمرو بن عوف	(اوس)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے الگ ہو کر ایک گھاٹی میں ان سے ملے۔ اُنھوں نے یثرب کے حالات سے اطلاع دی اور اب کی دفعہ سب نے باقاعدہ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت مدینہ میں اسلام کے قیام کا بنیادی پتھر تھی۔ چونکہ ابتک جہاد بالسیف فرض نہیں ہوا تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے صرف اِن الفاظ میں بیعت لی جن میں آپؐ جہاد فرض ہونے کے بعد عورتوں سے بیعت لیا کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم خُدا کو ایک جانیں گے۔ شرک نہیں کریں گے۔ چوری نہیں کریں گے۔ زنا کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ قتل سے باز رہیں گے۔ کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور ہر نیک کام میں آپؐ کی اطاعت کریں گے۔ بیعت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

"اگر تم صدق و ثبات کے ساتھ اِس عہد پر قائم رہے تو تمہیں جنت نصیب ہوگی اور اگر کمزوری دکھائی تو پھر تمہارا معاملہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ ہے وہ جس طرح چاہے گا کرے گا۔"

یہ بیعت تاریخ میں بیعتِ عقبہ اولیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ وُہ جگہ جہاں بیعت لی گئی تھی عقبہ کہلاتی ہے جو مکہ اور منیٰ کے درمیان واقع ہے۔ عقبہ کے لفظی معنی بلند پہاڑی رستے کے ہیں۔

مکہ سے رُخصت ہوتے ہوئے ان بارہ نومسلمین نے درخواست کی کہ کوئی اسلامی معلّم ہمارے ساتھ بھیجا جاوے جو ہمیں اسلام کی تعلیم دے اور ہمارے مُشرک بھائیوں کو اسلام کی تبلیغ کرے۔ آپؐ نے مصعب بن عُمیرؓ کو جو قبیلہ عبدالدار کے ایک نہایت مخلص نوجوان تھے ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اسلامی

مبلغ ان دنوں میں قاری یا مقرئ کہلاتے تھے کیونکہ ان کا کام زیادہ تر قرآن شریف سُنانا تھا کیونکہ یہی تبلیغ اسلام کا بہترین ذریعہ تھا۔ چنانچہ مصعبؓ بھی یثرب میں مقرئ کے نام سے مشہور ہو گئے[1]

یثرب میں اسلام کا چرچا

مصعبؓ بن عمیر نے مدینہ پہنچ کر اسعد بن زرارہ کے مکان پر قیام کیا جو مدینہ میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔ اور ویسے بھی ایک نہایت مخلص اور باا ثر بزرگ تھے اور اسی مکان کو اپنا تبلیغی مرکز بنایا اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور چونکہ مدینہ میں مسلمانوں کو اجتماعی زندگی نصیب تھی اور تھی بھی نسبتاً امن کی زندگی، اس لیے اسعد بن زرارہ کی تجویز پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعبؓ بن عمیر کو جمعہ کی نماز کی ہدایت فرمائی اس طرح مسلمانوں کی اشتراکی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں مدینہ میں گھر گھر اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اور اوس و خزرج بڑی سُرعت کے ساتھ مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔ بعض صورتوں میں تو ایک قبیلے کا قبیلہ ایک دن میں ہی سب کا سب مسلمان ہو گیا؛ چنانچہ بنو عبدالاشہل کا قبیلہ بھی اسی طرح ایک ہی وقت میں اکٹھا مسلمان ہوا تھا۔ یہ قبیلہ انصار کے مشہور قبیلہ اوس کا ایک ممتاز حصّہ تھا اور اس کے رئیس کا نام سعد بن معاذ تھا۔ جو صرف قبیلہ بنو عبدالاشہل کے ہی رئیس اعظم نہ تھے بلکہ تمام قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ جب مدینہ میں اسلام کا چرچا ہوا تو سعد بن معاذ کو یہ بُرا معلوم ہوا اور انھوں نے اسے روکنا چاہا۔ مگر اسعد بن زرارہ سے ان کی بہت قریب کی رشتہ داری تھی۔ یعنی وہ ایک دوسرے کے خالہ زاد بھائی تھے اور اسعد مسلمان ہو چکے تھے، اس لیے سعد بن معاذ خود براہِ راست دخل دیتے ہوئے رُکتے تھے کہ کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو جائے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ایک دوسرے رشتہ دار اُسید بن الحُضیر سے کہا کہ اسعد بن زرارہ کی وجہ سے مجھے تو کچھ حجاب ہے مگر تم جا کر مصعبؓ کو روک دو کہ ہمارے لوگوں میں یہ بے دینی نہ پھیلائیں۔ اور اسعد سے بھی کہہ دو کہ یہ طریق اچھا نہیں ہے۔ اُسید قبیلہ عبدالاشہل کے ممتاز رؤسا میں سے تھے۔ حتّٰی کہ ان کا والد جنگِ بعاث میں تمام اوس کا سردار رہ چکا تھا۔ اور سعد بن معاذ کے بعد اُسید بن الحضیر کا بھی اپنے قبیلہ پر بہت اثر تھا۔ چنانچہ سعد کے کہنے پر وہ مصعب بن عمیر اور اسعد بن زرارہ کے پاس گئے اور مصعب سے مخاطب ہو کر غصّہ کے لہجہ میں کہا "تم کیوں ہمارے آدمیوں کو بے دین کرتے پھرتے ہو اُس سے باز آجاؤ؛ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ پیشتر اس کے کہ مصعب کچھ جواب دیتے اسعد نے آہستگی سے مصعب سے کہا کہ یہ اپنے قبیلہ کے ایک با اثر رئیس ہیں ان سے بہت نرمی اور محبت سے بات کرنا؛ چنانچہ مصعب نے بڑے ادب اور محبت کے رنگ میں اُسید سے کہا کہ "آپ ناراض نہ ہوں بلکہ مہربانی فرما کر تھوڑی دیر تشریف رکھیں اور ٹھنڈے دل سے ہماری بات سُن لیں اور اُس کے

---

[1] ابن ہشام و طبری۔

بعد کوئی رائے قائم کریں۔" اُسید اس بات کو معقول سمجھ کر بیٹھ گئے اور مصعب نے انہیں قرآن شریف سُنایا اور بڑی محبت کے پیرایہ میں اسلامی تعلیم سے آگاہ کیا۔ اُسید پر اتنا اثر ہوا کہ وہیں مسلمان ہو گئے۔ اور پھر کہنے لگے کہ میرے پیچھے ایک ایسا شخص ہے کہ جو اگر ایمان لے آیا تو ہمارا سارا قبیلہ مسلمان ہو جائے گا۔ تم ٹھہرو میں اسے ابھی یہاں بھیجتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُسید اُٹھ کر چلے گئے اور کسی بہانہ سے سعد بن معاذ کو مصعب بن عمیر اور اسعد بن زرارہ کی طرف بھجوا دیا۔ سعد بن معاذ آئے اور بڑے غضبناک ہو کر اسعد بن زرارہ سے کہنے لگے کہ "دیکھو اسعد تم اپنی قرابت داری کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہو اور یہ ٹھیک نہیں ہے۔" اس پر مصعبؓ نے اسی طرح نرمی اور محبت کے ساتھ ان کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ آپ ذرا تھوڑی دیر تشریف رکھکر میری بات سُن لیں اور پھر اگر اس میں کوئی چیز قابلِ اعتراض ہو تو بے شک ردّ کر دیں۔ سعد نے کہا۔ ہاں یہ مطالبہ تو معقول ہے اور اپنا نیزہ ٹیک کر بیٹھ گئے اور مصعبؓ نے اسی طرح پہلے قرآن شریف کی تلاوت کی اور پھر اپنے دلکش رنگ میں اسلامی اصول کی تشریح کی۔ ابھی زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ یہ بُت بھی رام تھا۔ چنانچہ سعد نے مسنون طریق پر غسل کر کے کلمۂ شہادت پڑھ دیا۔ اور پھر اس کے بعد سعد بن معاذ اور اُسید بن الحضیر دونوں مل کر اپنے قبیلہ والوں کی طرف گئے۔ اور سعدؓ نے اُن سے مخصوص عربی انداز میں پوچھا کہ "اے بنی عبد الاشہل تم مجھے کیسا جانتے ہو؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا "آپ ہمارے سردار اور سردار ابن سردار ہیں۔ اور آپ کی بات پر ہمیں کامل اعتماد ہے۔" سعد نے کہا "تو پھر میرے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں جب تک تم اللہ اور اس کے رسُول پر ایمان نہ لاؤ۔" اس کے بعد سعد نے انہیں اسلام کے اصول سمجھائے اور ابھی اس دن پر شام نہیں آئی تھی کہ تمام قبیلہ مسلمان ہو گیا اور سعدؓ اور اُسیدؓ نے خود اپنے ہاتھ سے اپنی قوم کے بُت نکال کر توڑے[1]۔

سعد بن معاذ اور اُسید بن الحضیرؓ جو اس دن مسلمان ہوئے دونوں چوٹی کے صحابہ میں شمار ہوتے ہیں اور انصار میں تو لاریب ان کا بہت ہی بلند پایہ تھا۔ بالخصوص سعد بن معاذؓ کو تو انصارِ مدینہ میں وہ پوزیشن حاصل ہوئی جو مہاجرین مکہ میں حضرت ابوبکرؓ کو حاصل تھی۔ یہ نوجوان نہایت درجہ مخلص نہایت درجہ وفادار اور اسلام اور بانیٔ اسلام کا ایک نہایت جاں نثار عاشق نکلا۔ اور چونکہ وہ اپنے قبیلہ کا رئیس اعظم بھی تھا اور نہایت ذہین تھا۔ اسلام میں اُسے وہ پوزیشن حاصل ہوئی جو صرف خاص بلکہ اخص صحابہ کو حاصل تھی اور لاریب اس کی جوانی کی موت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "سعدؓ کی موت پر تو رحمٰن کا عرش بھی حرکت میں آ گیا ہے۔" ایک گہری صداقت پر مبنی تھا[2]۔

غرض اس طرح سُرعت کے ساتھ اوس خزرج میں اسلام پھیلتا گیا۔ یہود خوف بھری آنکھوں کے

---

[1] ابن ہشام :: [2] بخاری ::

ساتھ یہ نظارے دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں یہ کہتے تھے کہ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔

یہ تو مدینہ کے خوشکن واقعات ہیں۔ جو بیعت عقبہ اُولیٰ کے بعد پیش آئے مگر اِدھر مکہ میں یہ سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مُسلمانوں کے واسطے نہایت تنگی اور سختی کا گذرا۔ قریش دن بدن اپنے مظالم میں ترقی کرتے جاتے تھے خصوصاً جب ان کو مدینہ کے حالات سے اطلاع ہوئی تو ان کی دشمنی کی آگ بہت ہی بھڑک اُٹھی اور اُنھوں نے آگے سے بھی بڑھ کر مظالم شروع کر دیئے اور بے چارے مُسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔

بیعت عقبہ ثانیہ ۱۳ سنہ نبوی

اگلے سال یعنی ۱۳ سنہ نبوی کے ماہ ذی الحجہ میں حج کے موقعہ پر اوس اور خزرج کے کئی سو آدمی مکہ میں آئے۔ اُن میں ستر شخص ایسے شامل تھے جو یا تو مُسلمان ہو چکے تھے اور یا اب مُسلمان ہونا چاہتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے مکہ آئے تھے۔ مصعبؓ بن عمیر بھی ان کے ساتھ تھے۔ مصعبؓ کی ماں زندہ تھی اور گو مُشرکہ تھی، مگر ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ جب اسے ان کے آنے کی خبر ملی تو اس نے ان کو کہلا بھیجا کہ پہلے مجھ سے آکر مل جاؤ پھر کہیں دُوسری جگہ جانا۔ مصعبؓ نے جواب دیا کہ "مَیں ابھی تک رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ملا آپؐ سے مل کر پھر تمہارے پاس آؤں گا۔" چنانچہ وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ آپؐ سے مل کر اور ضروری حالات عرض کر کے پھر اپنی ماں کے پاس گئے۔ وُہ بہت جلی بُھنی بیٹھی تھی۔ ان کو دیکھ کر بہت روئی اور بڑا شکوہ کیا۔ مصعبؓ نے کہا "ماں! مَیں تم سے ایک بڑی اچھی بات کہتا ہوں جو تمہارے واسطے بہت ہی مفید ہے اور سارے جھگڑوں کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔" اس نے کہا وُہ کیا ہے؟ مصعبؓ نے آہستہ سے جواب دیا۔ بس یہی کہ بُت پرستی ترک کر کے مُسلمان ہو جاؤ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آؤ۔" وہ پکی مُشرکہ تھی، سُنتے ہی شور مچا دیا کہ "مجھے ستاروں کی قسم ہے مَیں تمہارے دین میں کبھی داخل نہ ہوں گی۔" اور اپنے رشتہ داروں کو اشارہ کیا کہ مصعبؓ کو پکڑ کر قید کر لیں۔ مگر وہ بھاگ کر نکل گئے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مصعبؓ سے انصار کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور ان میں سے بعض لوگ آپؐ سے انفرادی طور پر ملاقات بھی کر چکے تھے۔ مگر چونکہ اس موقعہ پر ایک اجتماعی اور خلوت کی ملاقات کی ضرورت تھی، اس لیے مراسم حج کے بعد ماہ ذی الحجہ کی وسطی تاریخ مقرر کی گئی کہ اس دن نصف شب کے قریب یہ سب لوگ گذشتہ سال والی گھاٹی میں آپؐ کو آکر ملیں تا کہ اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ علیحدگی میں بات چیت ہو سکے اور آپؐ نے انصار کو تاکید فرمائی کہ اکٹھے نہ آئیں بلکہ ایک ایک دو دو کر کے وقت مقررہ پر گھاٹی میں پہنچ جائیں۔ اور سوتے کو نہ جگائیں اور نہ غیر حاضر کا انتظار کریں۔[2] چنانچہ جب مقررہ تاریخ آئی

---

[1] اسد الغابہ ٭ [2] ابن سعد ٭

تورات کے وقت جبکہ ایک تہائی رات جا چکی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے گھر سے نکلے اور راستہ میں اپنے چچا عباس کو ساتھ لیا جو ابھی تک مشرک تھے، مگر آپ سے محبت رکھتے تھے اور خاندان ہاشم کے رئیس تھے اور پھر دونوں مل کر اس گھاٹی میں پہنچے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ انصار بھی ایک ایک دو دو کر کے آ پہنچے۔ یہ ستر اشخاص تھے اور اوس و خزرج دونوں قبیلوں سے تعلق رکھنے والے تھے۔ سب سے پہلے عباس نے گفتگو شروع کی کہ "اے خزرج کے گروہ[1]! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان میں معزز و محبوب ہے اور وہ خاندان آج تک اس کی حفاظت کا ضامن رہا ہے اور ہر خطرہ کے وقت میں اس کے لیے سینہ سپر ہوا ہے مگر اب محمد کا ارادہ اپنا وطن چھوڑ کر تمہارے پاس چلے جانے کا ہے۔ سو اگر تم اسے اپنے پاس لے جانے کی خواہش رکھتے ہو تو تمہیں اس کی ہر طرح حفاظت کرنی ہوگی اور ہر دشمن کے سامنے سینہ سپر ہونا پڑے گا۔ اگر تم اس کے لیے تیار ہو تو بہتر ورنہ ابھی سے صاف صاف جواب دے دو کیونکہ صاف صاف بات اچھی ہوتی ہے۔" البراء بن معرور جو انصار کے قبیلہ کے ایک معمر اور بااثر بزرگ تھے نے کہا۔ عباس! ہم نے تمہاری بات سن لی ہے، مگر ہم چاہتے ہیں کہ رسول اللہ خود بھی اپنی زبان مبارک سے کچھ فرمادیں۔ اور جو ذمہ داری ہم پر ڈالنا چاہتے ہیں وہ بیان فرمادیں۔" اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی چند آیات تلاوت فرمائیں اور پھر ایک مختصر سی تقریر میں اسلام کی تعلیم بیان فرمائی۔ اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ میں اپنے لیے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ جس طرح تم اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی حفاظت کرتے ہو۔ اسی طرح اگر ضرورت پیش آئے تو میرے ساتھ بھی معاملہ کرو۔ جب آپ تقریر ختم کر چکے تو البراء بن معرور نے عرب کے دستور کے مطابق آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "یا رسول اللہ! ہمیں اس خدا کی قسم ہے جس نے آپ کو حق و صداقت کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کہ ہم اپنی جانوں کی طرح آپ کی حفاظت کریں گے ہم لوگ تلواروں کے سایہ میں پلے ہیں اور ..... مگر ابھی وہ بات ختم کرنے نہ پائے تھے کہ ابوالہیثم بن تیہان نے جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ان کی بات کاٹ کر کہا "یا رسول اللہ! یثرب کے یہود کے ساتھ ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں۔ آپ کا ساتھ دینے سے وہ منقطع ہو جائیں گے ایسا نہ ہو کہ جب اللہ آپ کو غلبہ دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنے وطن میں واپس تشریف لے آویں اور ہم نہ ادھر کے رہیں نہ اُدھر کے۔" آپ نے ہنس کر فرمایا "نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ تمہارا خون میرا خون ہوگا۔ تمہارے دوست میرے دوست اور تمہارے دشمن میرے دشمن۔" اس پر عباس بن عبادہ انصاری نے اپنے ساتھیوں پر نظر ڈال کر کہا۔ لوگو کیا تم سمجھتے ہو کہ اس عہد و پیمان کے کیا معنے ہیں؟ اس کا یہ مطلب ہے کہ اب تمہیں ہر اسود و احمر کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیئے اور ہر قربانی کے لیے آمادہ رہنا چاہیئے۔"

---

[1] عرب کے لوگ اوس اور خزرج دونوں کو عام طور پر صرف خزرج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

لوگوں نے کہا " ہاں ہم جانتے ہیں۔ مگر یارسُول اللہ! اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا ؟ آپؐ نے فرمایا: "تمھیں خُدا کی جنّت ملے گی، جو اس کے سارے انعاموں میں سے بڑا انعام ہے" سب نے کہا۔ "ہمیں یہ سودا منظور۔ یارسُول اللہ! اپنا ہاتھ آگے کریں " آپؐ نے اپنا دستِ مبارک آگے بڑھا دیا اور یہ ستّر جاں نثاروں کی جماعت ایک دفاعی معاہدہ میں آپؐ کے ہاتھ پر بِک گئی[1] اس بیعت کا نام بیعت عقبہ ثانیہ ہے۔

جب بیعت ہو چکی تو آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم میں سے بارہ[12] نقیب چنے تھے، جو موسیٰؑ کی طرف سے اُن کے نگران اور محافظ تھے۔ مَیں بھی تم میں سے بارہ نقیب مقرر کرنا چاہتا ہوں جو تمہارے نگران اور محافظ ہوں گے۔ اور وہ میرے لیے عیسیٰ کے حواریوں کی طرح ہوں گے اور میرے سامنے اپنی قوم کے متعلق جوابدِہ ہوں گے۔ پس تم مناسب لوگوں کے نام تجویز کرکے میرے سامنے پیش کرو۔ چنانچہ بارہ[12] آدمی تجویز کیے گئے جنھیں آپؐ نے منظور فرمایا[2] اور انہیں ایک ایک قبیلہ کا نگران مقرر کرکے اُن کے فرائض سمجھا دیے۔ اور بعض قبائل کے لیے آپؐ نے دو دو نقیب مقرر فرمائے۔ بہرحال ان بارہ[12] نقیبوں کے نام یہ ہیں :-

(۱) اسعد بن زرارہ	ان کا ذکر اُوپر گذر چکا ہے۔ قبیلہ خزرج کے خاندان بنو نجار میں سے تھے۔ جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری تھی۔ یثرب میں نماز جمعہ کی ابتداء انہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اوّل درجہ کے مخلصوں میں سے تھے۔ ہجرت کے بعد جنگِ بدر سے پہلے فوت ہو گئے۔
(۲) اُسید بن الحضیر	ان کا ذکر بھی گذر چکا ہے۔ قبیلہ اوس کے خاندان بنو عبدالاشہل سے تھے۔ اکابر صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا والد جنگِ بُعاث میں قبیلہ اوس کا قائدِ اعظم تھا۔ اُسید نہایت مخلص اور نہایت سمجھدار تھے۔ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ انصار میں سے تین اشخاص اپنی فضیلت میں جواب نہیں رکھتے تھے یعنی اُسید بن الحضیر، سعد بن معاذ اور عباد بن بشر۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اُسید بڑے پائے کے صحابی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ

[1] طبری و ابن ہشام ۔ [2] ابنِ ہشام و ابن سعد و طبری و زرقانی ۔

	اُسید کی بڑی عزت کرتے تھے۔ عہدِ فاروقی میں وفات پائی۔
(۳) ابوالہیثم مالک بن تیہان	ان کا ذکر بھی اُوپر گذر چکا ہے۔ حلفاء بنی عبدالاشہل سے تھے۔ جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے ہو کر لڑے اور شہادت پائی۔
(۴) سعد بن عبادہ	قبیلہ خزرج کے خاندان بنو ساعدہ سے تھے۔ اور تمام قبیلہ خزرج کے رئیس تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہدِ مبارک میں ممتاز ترین انصار میں شمار ہوتے تھے۔ حتّی کہ آنحضرتؐ کی وفات پر بعض انصار نے انہی کو خلافت کے لیے پیش کیا تھا جس کی وجہ سے وُہ خلافتِ ابوبکرؓ کے سوال پر متزلزل ہو گئے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فوت ہوئے۔
(۵) البراء بن معرور	قبیلہ خزرج کے خاندان بنو سلمہ سے تھے اور بڑے معمّر اور بزرگ آدمی تھے۔ ہجرت سے پہلے ہی وفات پا گئے۔
(۶) عبداللہ بن رواحہ	قبیلہ خزرج کے خاندان بنو حارث سے تھے اور مدینہ کے مشہور شاعر اور اوّل درجہ کے مخلصین میں سے تھے جنگِ موتہ میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں ہوئی تھی حضرت جعفر بن ابی طالب کی شہادت کے بعد یہ امیر العسکر ہوتے اور لڑتے لڑتے شہادت پائی۔
(۷) عبادہ بن صامت	قبیلہ خزرج کے خاندان بنو عوف میں سے تھے اور علماء صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں حضرت عثمانؓ کی خلافت میں فوت ہوتے۔

(۸)	سعد بن الربیع	قبیلہ خزرج کے خاندان بنو ثعلبہ میں سے تھے۔ بڑے مخلص اور ممتاز صحابی تھے حضرت ابو بکرؓ انہیں بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔
(۹)	رافع بن مالک	ان کا ذکر اُوپر گذر چکا ہے۔ قبیلہ خزرج کے خاندان بنی زریق میں سے تھے۔ جب یہ اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وُہ قرآنی سُورتیں عطا فرمائیں جو اس وقت تک نازل ہو چکی تھیں۔ جنگِ احد میں شہید ہوئے۔
(۱۰)	عبداللہ بن عمرو	قبیلہ خزرج کے خاندان بنو سلمہ سے تھے جنگِ اُحد میں شہید ہوئے اُن کی وفات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاجزادہ جابر بن عبداللہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے والد سے اللہ تعالیٰ نے بالمشافہ کلام کیا اور ان سے خوش ہو کر کہا کہ "اے میرے بندے! تم نے جو مانگنا ہو مانگو"۔ تمہارے والد نے عرض کیا۔ اَے میرے خالق و مالک۔ میری بس یہی خواہش ہے کہ پھر زندہ کیا جاؤں تا پھر اسلام کے راستہ میں جان دُوں۔ ارشاد ہوا "ہم ایسا ضرور کر دیتے، مگر ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ کوئی بشر اس دُنیا سے گذر کر پھر اس دُنیا میں واپس نہیں آئے گا۔ عبداللہ بن عمرو کے متعلق یہ روایت بھی آتی ہے کہ ایک دفعہ جنگِ اُحد کے چھیالیس (۴۶) سال بعد کسی سیلاب کی وجہ سے خطرہ پیدا ہوا تو اُن کی قبر کھود کر ان کو دُوسری جگہ منتقل کرنے کی تجویز کی گئی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ان کی نعش اسی طرح صحیح وسلامت تھی جس حالت میں کہ انہیں دفن کیا گیا تھا۔

(۱۱) سعد بن خیثمہ	قبیلہ اوس کے خاندان بنو حارثہ میں سے تھے جنگِ بدر میں شہید ہوئے۔ جب یہ جنگِ بدر کے لیے مدینہ سے نکلنے لگے تو ان کے والد نے کہا کہ ہم میں سے ایک کو گھر پر ٹھہرنا چاہیئے اور چونکہ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ جانا چاہتا ہوں تم گھر پر ٹھہرو۔ مگر اُنھوں نے اصرار کیا۔ اور آخر یہ تجویز ہوئی کہ اس غرض کے لیے قرعہ ڈالا جائے؛ چنانچہ قرعہ میں ان کا نام نکلا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ نکل آئے اور اُسی جنگ میں شہید ہوئے۔
(۱۲) منذر بن عمرو	قبیلہ خزرج کے خاندان بنو ساعدہ سے تھے اور ایک صُوفی مزاج آدمی تھے۔ "بئر معونہ" میں شہید ہوئے[1]

جب نقیبوں کا تقرر ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے چچا عباس بن عبدالمطلب نے انصار سے تاکید کی کہ انہیں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے کام لینا چاہیئے کیونکہ قریش کے جاسُوس سب طرف نظر لگائے بیٹھے ہیں ایسا نہ ہو کہ اس قول و اقرار کی خبر نکل جائے اور مشکلات پیدا ہو جائیں۔ ابھی غالباً وُہ یہ تاکید کر ہی رہے تھے کہ گھاٹی کے اُوپر سے رات کی تاریکی میں کسی شیطان کی آواز آئی کہ "اے قریش! تمھیں بھی کچھ خبر ہے کہ یہاں (نعوذ باللہ) مُذمّم اور اس کے ساتھ کے مرتدین تمہارے خلاف کیا عہد و پیمان کر رہے ہیں"۔ اس آواز نے سب کو چونکا دیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم بالکل مطمئن رہے۔ اور فرمایا کہ اب آپ لوگ جس طرح آئے تھے اُسی طرح ایک ایک دو دو ہو کر اپنی قیام گاہوں میں واپس چلے جائیں۔ عباس بن نضلہ انصاری نے کہا "یارسُول اللہ! ہمیں کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اگر حکم ہو تو ہم آج صبح ہی ان قریش پر حملہ کر کے اُنہیں ان کے مظالم کا مزہ چکھا دیں"۔ آپؐ نے فرمایا "نہیں نہیں مجھے ابھی تک اس کی اجازت نہیں ہے۔ بس تم صرف یہ کرو کہ خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے خیموں میں واپس چلے جاؤ"۔ جس پر تمام لوگ ایک ایک دو دو کر کے دبے پاؤں گھاٹی سے نکل گئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم بھی اپنے چچا عباس کے ساتھ مکہ میں واپس تشریف لے آئے۔ قریش کے کانوں میں چونکہ بھنک پڑ چکی تھی کہ اس طرح رات کو کوئی

---

[1] اسد الغابہ

خفیہ اجتماع ہوا ہے۔ وہ صبح ہوتے ہی اہلِ یثرب کے ڈیرہ میں گئے اور ان سے کہا کہ "آپ کے ساتھ ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں اور ہم ہرگز نہیں چاہتے کہ ان تعلقات کو خراب کریں، مگر ہم نے سُنا ہے کہ گذشتہ رات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ آپ کا کوئی خفیہ سمجھوتہ ہوا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ اوس اور خزرج میں سے جو لوگ بُت پرست تھے ان کو چونکہ اس واقعہ کی کوئی اطلاع نہ تھی، وہ سخت حیران ہوئے اور صاف انکار کیا کہ قطعاً کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول بھی جو بعد میں منافقین مدینہ کا سردار بنا۔ اس گروہ میں تھا۔ اُس نے کہا۔ "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ اہلِ یثرب کوئی اہم معاملہ طے کریں اور مجھے اس کی اطلاع نہ ہو؟" غرض اس طرح قریش کا شک رفع ہوا اور وہ واپس چلے آئے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد انصار واپس یثرب کی طرف کوچ کر گئے، لیکن ان کے کوچ کر جانے کے بعد قریش کو کسی طرح اس خبر کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی اہل یثرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی عہد و پیمان کیا ہے۔ جس پر اُن میں سے بعض آدمیوں نے اہل یثرب کا پیچھا کیا۔ قافلہ تو نکل گیا تھا، مگر سعد بن عبادہ کسی وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے اُن کو یہ لوگ پکڑ لائے اور مکہ کے پتھریلے میدان میں لا کر خوب زد و کوب کیا اور سر کے بالوں سے پکڑ کر ادھر اُدھر گھسیٹا۔ آخر جبیر بن مطعم اور حارث بن حرب کو جو سعد کے واقف تھے اطلاع ہوئی تو اُنہوں نے ان کو ظالم قریش کے ہاتھ سے چھڑا دیا[1]۔

ہجرتِ یثرب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دفعہ رؤیا میں یہ بتایا گیا تھا کہ آپ کو ایک دن مکہ سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ جانا ہو گا اور ساتھ ہی آپ کو ہجرت کی جگہ دکھائی گئی جو ایک باغوں اور چشموں والی جگہ تھی۔ چونکہ ابھی تک اس کی تشریح آپ پر نہیں کھلی تھی اور تشریح سے قبل ایک نبی بھی بعض اوقات اپنے اجتہاد میں غلطی کر سکتا ہے، اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ:

ذَهَبَ وَهْلِي إِلَى أَنَّهَا الْيَمَامَةُ أَوْ هَجَرُ فَإِذَا هِيَ مَدِيْنَةُ يَثْرِبَ[2]

یعنی "میرا خیال اس طرف گیا کہ یہ جگہ یمامہ یا ہجر ہے (جو نجد میں ڈو شاداب جگہیں ہیں) مگر وہ یثرب نکل آیا۔"

چنانچہ جب یثرب میں اسلام کا چرچا ہونے لگا تو تب آپ پر یہ منکشف ہوا کہ ہجرت کی جگہ یثرب ہے نہ کہ یمامہ یا ہجر۔ اس کے بعد جب انصار کے ساتھ سب قول و قرار ہو چکا اور وہ ایک دفاعی عہد و پیمان کی بیعت کر کے واپس چلے گئے تو آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اب جو لوگ جا سکیں وہ سب یثرب کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں باوجود قریش کی طرف سے کئی قسم کی روکوں کے اکثر

---

[1] ابن سعد طبری و ابن ہشام۔

[2] بخاری باب الہجرت۔

مسلمان ہجرت کر گئے اور مکّہ کے بہت سے مکانات خالی ہو گئے اور بالآخر صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ اور ان کے اہل و عیال اور ایسے کمزور لوگ جو ہجرت کی طاقت نہ رکھتے تھے یا جنہیں قریش ہجرت کے لیے نکلنے نہ دیتے تھے باقی رہ گئے۔ یہ سب مہاجرین مدینہ میں انصار کے مکانات میں متفرق طور پر بطور مہمان کے ٹھہرے اور اسی حالت میں رہے یہاں تک کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچ گئے اور مہاجرین کے واسطے آہستہ آہستہ الگ مکانات کا انتظام ہو گیا۔ مدینہ والوں نے جن کو مہاجرین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کرنے اور پناہ دینے کی وجہ سے انصار کہتے ہیں نہایت گرمجوشی کے ساتھ مہاجرین کا استقبال کیا اور اپنے حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر اُن کے ساتھ سلوک کیا چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو آپ نے سب مہاجرین کو انصار کی تعریف میں رطب اللسان پایا[1]

خدا تعالیٰ کا نبی مہاجر کے لباس میں

اب ہم اس عظیم الشان واقعہ کے قریب پہنچ گئے ہیں جس سے اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے وطنِ مالوف کو چھوڑ کر یثرب کی طرف ہجرت کر جانا۔ اسلامی سنہ جو سن ہجری کہلاتا ہے اسی انقلابی تاریخ سے شمار کیا جاتا ہے۔

جب تمام مُسلمان مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تو قریش کو اپنی سابقہ کارروائیوں کی وجہ سے اندیشہ ہوا کہ اس طرح تمام مسلمانوں کا وطن سے بے وطن ہو جانا ضرور کوئی رنگ لائے گا۔ علاوہ ازیں ان کو یہ بھی غصہ تھا کہ ان کا شکار اُن کے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے، اس لیے انہوں نے اپنی جگہ سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر کریں جس سے یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے مِٹ جائے۔ اور اُن کے مظالم کی پاداشس کا کوئی سوال باقی نہ رہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم ابھی مکّہ میں ہی تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کے متعلق اجازت کے منتظر تھے۔ مکّہ والوں نے دیکھا کہ یہ موقعہ بہت اچھا ہے مُسلمان سب جا چکے ہیں اور مُحمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) اب گویا اکیلا تنِ تنہا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق کوئی ایسی تدبیر ہو کہ بس اس کا خاتمہ ہی ہو جائے، چنانچہ وہ اسی خیال سے اپنے قومی مشورہ گاہ یعنی دارالندوہ میں جمع ہوئے اور باہم مشورہ کرنے لگے کہ کیا کیا جاوے۔ اس مشورہ میں قریباً ایک سَو قریش شامل تھے اور ایک ابلیس صفت معمر نجدی شیخ بھی شریک تھا۔ پیش آمدہ صورتِ حال پر گفت و شنید ہونے کے بعد مشورہ کے آخری مراحل میں یُوں گفتگو ہوئی :

ایک شخص :۔ مُحمّد کو آہنی زنجیروں سے جکڑ کر ایک کمرہ میں بند کر دو کہ وہیں پڑا پڑا ہلاک ہو جائے۔

---

[1] ابن ہشام، زرقانی و خمیس؛

شیخ نجدی :- یہ رائے درست نہیں۔ کیونکہ جب محمدؐ کے رشتہ داروں اور متبعین کو علم ہوگا تو وہ ضرور حملہ کرکے آئیں گے اور اس کو چھڑالیں گے۔ اور پھر فساد آگے سے بھی بڑھ جائے گا۔

دوسرا شخص :- محمدؐ کو مکہ سے جلاوطن کردو۔ جب وہ ہماری آنکھوں سے دور ہوگیا اور ہمارے شہر سے نکل گیا تو ہمیں کیا کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ ہمارے شہر کو اس فتنہ سے نجات مل جائے گی۔

شیخ نجدی :- کیا تم نے محمدؐ کی شیریں زبانی اور طلاقتِ لسانی اور سحر بیانی نہیں دیکھی۔ اگر وہ یہاں سے یونہی سلامت نکل گیا تو یقین جانو کہ اس کے بہکانے میں آکر کوئی نہ کوئی قبیلہ عرب تمہارے خلاف اُمڈ آئے گا اور پھر تم اس کے خلاف کچھ نہ کرسکو گے۔

غرض اسی طرح تھوڑی دیر تک باہم گفتگو ہوتی رہی۔ کسی نے کچھ رائے دی اور کسی نے کچھ۔ آخر ابوجہل بن ہشام بولا :-

ابوجہل :- میری رائے تو یہ ہے کہ قریش کے ہر اک قبیلہ سے ایک ایک جوان چُنا جاوے اور ان کے ہاتھ میں تلواریں دے دی جاویں۔ پھر یہ لوگ ایک آدمی کی طرح اکٹھے ہوکر محمدؐ پر حملہ کریں اور اُسے قتل کردیں۔ ایسا کرنے سے اس کا خون سب قبائلِ قریش پر پھیل جائیگا۔ اور بنو عبد مناف کو اتنی جرأت ہرگز نہیں ہوگی کہ ساری قوم کے ساتھ لڑیں۔ پس لامحالہ ان کو اس خون کے بدلے میں دیت قبول کرنی ہوگی۔ سو وہ ہم دے دیں گے۔

شیخ نجدی :- رائے ہے تو بس اس شخص کی۔ باقی سب فضول باتیں ہیں۔ پس اگر کچھ کرنا ہے تو جو یہ کہتا ہے وہ کرو۔

غرض اس رائے پر سب کا اتفاق ہوگیا[1]

قرآن شریف میں ان کے اس مشورہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے :

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ
وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ[2]

"اور یاد کر جبکہ کفار تیرے متعلق منصوبے کرتے تھے تاکہ تجھے قید کردیں یا قتل کردیں۔ یا وطن سے نکال دیں[3] اور وہ اپنی طرف سے خوب پختہ منصوبے گانٹھ رہے تھے مگر اللہ نے بھی اپنی جگہ تدبیر کرلی تھی۔ اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے"

اِدھر یہ لوگ مشورہ کرکے نکلے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خون سے اپنے پلید ہاتھ رنگیں اور اُدھر

---

[1] ابن ہشام وطبری وابن سعد ۔ [2] سورۃ انفال : ۳۱ ۔ [3] اس صورت کو آخر میں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ بالآخر عملاً یہی وقوع میں آئی ۔

اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ سے اپنے نبی کو ان کے اس بُرا ارادے سے اطلاع دیدی اور اجازت عطا فرمائی کہ یثرب کی طرف ہجرت کر جائیں اور آنیوالی رات مکہ میں نہ گذاریں۔[1]

یہ اطلاع پاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے۔ گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کا وقت تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ صبح یا شام آپؐ ہمارے مکان پر حضرت ابوبکرؓ سے ملنے تشریف لایا کرتے تھے[2]۔ اُس دن جو بے وقت آئے اور آئے بھی اس طرح کہ آپؐ نے اپنا سَر ایک کپڑے سے ڈھانکا ہوا تھا۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ آج کوئی خاص بات ہے۔ آپؐ اجازت لے کر گھر کے اندر داخل ہوئے اور فرمایا۔ "اگر یہاں کوئی غیر شخص ہو تو اُسے ذرا باہر بھیج دیں"۔ ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ! آپؐ ہی کے گھر کے لوگ ہیں"۔ فرمایا۔ "مجھے ہجرت کی اجازت مل گئی ہے"۔ حضرت ابوبکرؓ جو دن رات اس خبر کے انتظار میں تھے۔ فوراً بولے اَلصُّحْبَۃُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔ یعنی "یارسول اللہ! مجھے بھی ساتھ رکھیئے گا؟" ارشاد ہوا "ہاں"۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں۔ مَیں نے اس وقت تک کسی شخص کو خوشی میں روتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اب دیکھا کہ جونہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں"۔ حضرت ابوبکرؓ کے آنسو جاری ہوگئے[3]۔ پھر انھوں نے آپؐ سے عرض کیا۔ یارسول اللہ! مَیں نے ہجرت کی تیاری میں دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر پال رکھی ہیں، ان میں سے ایک آپؐ قبول فرماویں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں، مگر قیمتاً لوں گا"۔ ابوبکرؓ نے ناچار قبول کیا اور ہجرت کی تیاری شروع ہوئی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم نے جلدی جلدی ضروری سامان تیار کیا اور کھانا تیار کر کے ایک چمڑہ کے برتن میں بند کیا اور پھر میری بہن اسماء نے اپنے نطاق یعنی کمر پر باندھنے والے پٹکے کے دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا کھانے کے برتن پر باندھ دیا اور ایک پانی کے برتن پر۔ اس سبب سے[4] اُن کو ذَاتُ النِّطَاقَیْنِ یعنی دو نطاقوں والی کہتے ہیں۔[5] اس کے بعد آپؐ حضرت ابوبکرؓ سے اسی رات مکہ سے نکل جانے اور غارِ ثور میں پناہ لینے کی قرارداد کر کے اپنے گھر واپس تشریف لے آئے۔

آغازِ سفرِ ہجرت اور قریش کا تعاقب

رات کا تاریک وقت تھا اور ظالم قریش جو مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اپنے خونی ارادے کے ساتھ آپؐ کے مکان کے اردگرد جمع ہو کر آپؐ کے مکان کا محاصرہ کر چکے تھے۔ اور انتظار تھا کہ صبح ہو یا آپؐ اپنے گھر سے نکلیں تو آپؐ پر ایک دم حملہ کر کے قتل کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بعض کفار کی امانتیں پڑی تھیں۔ کیونکہ باوجود شدید مخالفت کے اکثر لوگ اپنی امانتیں آپؐ کے صدق و امانت

---

[1] ابن ہشام و طبری ۔ [2] طبری واقعات ہجرت ۔ [3] بخاری باب الہجرت ۔ [4] طبری و ابن ہشام ۔
[5] بخاری باب الہجرت و کتاب الاطعمہ ۔

کی وجہ سے آپؐ کے پاس رکھوا دیا کرتے تھے[1] لہٰذا آپؐ نے حضرت علیؓ کو ان امانتوں کا حساب کتاب سمجھا دیا اور تاکید کی کہ بغیر امانتیں واپس کئے مکہ سے نہ نکلنا۔ اس کے بعد آپؐ نے ان سے فرمایا کہ تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔ اور تسلی دی کہ انہیں خُدا کے فضل سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ وہ لیٹ گئے۔ اور آپؐ نے اپنی چادر جو سُرخ رنگ کی تھی اُن کے اُوپر اُڑھا دی۔ اس کے بعد آپؐ اللہ کا نام لے کر اپنے گھر سے نکلے۔ اُس وقت محاصرین آپؐ کے دروازے کے سامنے موجود تھے مگر چونکہ انہیں یہ خیال نہیں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر اوّل شب میں ہی گھر سے نکل آئیں گے۔ وہ اُس وقت اس قدر غفلت میں تھے کہ آپؐ اُن کے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے اُن کے درمیان سے نکل گئے اور اُن کو خبر تک نہ ہوئی۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموشی کے ساتھ مگر جلد جلد مکہ کی گلیوں میں سے گذر رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں آبادی سے باہر نکل گئے اور غارِ ثور کی راہ لی۔ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ پہلے سے تمام بات طے ہو چکی تھی وہ بھی راستہ میں مل گئے۔ غارِ ثور جو اسی واقعہ کی وجہ سے اسلام میں ایک مقدس یادگار سمجھی جاتی ہے۔ مکہ سے جانب جنوب یعنی مدینہ سے مختلف جانب تین میل کے فاصلہ پر ایک بنجر اور ویران پہاڑی کے اُوپر خاصی بلندی پر واقع ہے اور اس کا راستہ بھی بہت دشوار گذار ہے وہاں پہنچ کر پہلے حضرت ابوبکرؓ نے اندر گھس کر جگہ صاف کی اور پھر آپؐ بھی اندر تشریف لے گئے۔

دوسری طرف وہ قریش جو آپؐ کے گھر کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ وُہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آپؐ کے گھر کے اندر جھانک کر دیکھتے تھے، تو حضرت علیؓ کو آپؐ کی جگہ پر لیٹا دیکھ کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ لیکن صبح ہوئی تو انہیں علم ہوا کہ ان کا شکار اُن کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس پر وہ اِدھر اُدھر بھاگے۔ مکہ کی گلیوں میں صحابہ کے مکانات پر تلاش کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ اِسی غصہ میں انہوں نے حضرت علیؓ کو پکڑا اور کچھ مارا پیٹا۔ حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر جا کر شور کیا۔ اور ان کی صاحبزادی کو ڈانٹا ڈپٹا مگر ان باتوں سے کیا بنتا تھا۔

آخر اُنھوں نے عام اعلان کیا کہ جو کوئی محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زندہ یا مُردہ پکڑ کر لائے گا، اس کو ایک سو اُونٹ انعام دیئے جاویں گے، چنانچہ کئی لوگ انعام کی طمع میں مکہ کے چاروں طرف اِدھر اُدھر نکل گئے۔ خود رؤسا قریش بھی سُراغ لیتے لیتے آپؐ کے پیچھے نکلے اور عین غارِ ثور کے مُنہ پر جا پہنچے۔ یہاں پہنچ کر اُن کے سُراغ رسان نے کہا کہ "بس سُراغ اس سے آگے نہیں چلتا۔ اس لیے یا تو محمدؐ یہیں کہیں پاس ہی چھپا ہوا ہے۔ یا پھر آسمان پر اُڑ گیا ہے۔" کسی نے کہا "کوئی شخص ذرا اس غار کے اندر جا کر بھی دیکھ آئے"۔ مگر ایک اور شخص بولا کہ "واہ یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ بھلا کوئی شخص اس غار میں جا کر چھپ سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت

---

[1] ابن ہشام وطبری ۔

تاریک وتار اور خطرناک جگہ ہے اور ہم ہمیشہ سے اسے اسی طرح دیکھتے آتے ہیں۔" یہ بھی روایت آتی ہے کہ غار کے مُنہ پر جو درخت تھا۔ اُس پر آپؐ کے اندر تشریف لے جانے کے بعد مکڑی نے جالا تن دیا تھا اور عین مُنہ کے سامنے کی شاخ پر ایک کبوتری نے گھونسلا بنا کر انڈے دے دیئے تھے۔ یہ روایت تو کمزور ہے لیکن اگر ایسا ہوا ہو تو ہرگز تعجب کی بات نہیں۔ مکڑی بعض اوقات چند منٹ میں ایک وسیع جگہ پر جالا تن دیتی ہے۔ اور کبوتری کو بھی گھونسلا تیار کرنے اور انڈے دینے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ اس لیے اگر خدا تعالیٰ نے اپنے رسُول کی حفاظت کے لیے ایسا تصرّف فرمایا ہو تو ہرگز بعید نہیں ہے بلکہ اس وقت کے لحاظ سے ایسا ہونا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ بہرحال قریش میں سے کوئی شخص آگے نہیں بڑھا اور یہیں سے سب لوگ واپس چلے گئے۔[1]

روایت آتی ہے کہ قریش اس قدر قریب پہنچ گئے تھے کہ اُن کے پاؤں غار کے اندر سے نظر آتے تھے اور ان کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ اس موقعہ پر حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر مگر آہستہ سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ " یارسول اللہ! قریش اتنے قریب ہیں کہ اُن کے پاؤں نظر آرہے ہیں۔ اور اگر وہ ذرا آگے ہو کر جھانکیں تو ہم کو دیکھ سکتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا :-

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔

یعنی " ہرگز کوئی فکر نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

پھر فرمایا :-

وَمَا ظَنُّکَ یَا اَبَا بَکْرٍ بِاثْنَیْنِ اَللّٰہُ ثَالِثُھُمَا۔

یعنی " اے ابوبکرؓ! تم ان دو شخصوں کے متعلق کیا گمان کرتے ہو جن کے ساتھ تیسرا خُدا ہے۔"[2]

ایک اور روایت میں آتا ہے کہ جب قریش غار کے مُنہ کے پاس پہنچے، تو حضرت ابوبکرؓ سخت گھبرا گئے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کی گھبراہٹ کو دیکھا تو تسلّی دی کہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے رقّت بھری آواز میں کہا :

اِنْ قُتِلْتُ فَاَنَا رَجُلٌ وَاحِدٌ وَاِنْ قُتِلْتَ اَنْتَ ھَلَکَتِ الْاُمَّۃُ[3]

یعنی " یارسُول اللہ! اگر میں مارا جاؤں تو میں تو بس ایک اکیلی جان ہُوں لیکن اگر خدانخواستہ آپؐ پر کوئی آنچ آئے تو پھر تو گویا ساری اُمّت کی اُمّت مِٹ گئی۔"

اس پر آپؐ نے خدا سے الہام پاکر یہ الفاظ فرمائے کہ :

---

[1] زرقانی و تاریخ خمیس ٭ [2] بخاری باب مناقب المہاجرین ٭

[3] زرقانی ٭

"لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" (سورۃ توبہ: ۴۰)

یعنی "اے ابوبکرؓ! ہرگز کوئی فکر نہ کرو کیونکہ خُدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم دونوں اُس کی حفاظت میں ہیں" یعنی تم تو میری وجہ سے فکر مند ہو اور تمہیں اپنے جوشِ اخلاص میں اپنی جان کا کوئی غم نہیں مگر خدا تعالےٰ اس وقت نہ صرف میرا محافظ ہے بلکہ تمہارا بھی۔ اور وہ ہم دونوں کو دشمن کے شر سے محفوظ رکھے گا۔[1]

سفرِ ہجرت اور تعاقب سراقہ بن مالک

حضرت ابوبکرؓ نے گھر سے نکلتے ہوئے اپنے بیٹے عبداللہ کو جو ایک بہت زیرک اور ہوشیار نوجوان تھے ہدایت کی تھی کہ قریش کی حرکات کا خیال رکھیں اور روزانہ غارِ ثور میں اطلاع دے جایا کریں۔ چنانچہ وُہ ایسا کرتے تھے کہ رات کو اندھیرا ہوتے ہی غارِ ثور میں پہنچ جایا کرتے تھے اور رات وہیں گذار کر صبح سویرے ہی واپس آجایا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے خادم عامر بن فہیرہ کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ دن بھر بکریاں چرائیں اور رات کو اُن کے پاس دُودھ پہنچا جایا کریں۔ اس طرح آپؐ تین رات تک غارِ ثور میں ٹھہرے اور اس عرصہ تک یہی انتظام جاری رہا۔ پھر جب قریش کے تعاقب کی کوشش میں کمی آگئی تو تیسرے دن صبح کے وقت آپؐ غار سے نکلے۔[2] یہ پیر کا دن تھا اور چار ربیع الاول یا بعض مؤرخین کی تحقیق کے مطابق یکم ربیع الاول ۱۴ سنہ نبوی مطابق ۱۲ ستمبر ۶۲۲؁ء کی تاریخ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے پہلے سے ایک شخص عبداللہ بن اریقط کو جو قبیلہ بنی الدیل سے تھا اور باوجود عاص بن وائل رئیس مکہ کے ساتھ تعلق رکھنے کے قابلِ اعتماد تھا۔ معقول اُجرت دینی کر کے بطور رہنما کے ساتھ چلنے کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ یہ شخص اپنے فن کا خُوب ماہر تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے اسے پہلے سے اپنی اُونٹنیاں سپرد کر رکھی تھیں اور سمجھا رکھا تھا کہ تین رات کے بعد تیسرے دن کی صبح کو اُونٹنیاں لے کر غارِ ثور میں پہنچ جائے۔[3] چنانچہ وُہ حسبِ قرارداد پہنچ گیا۔ یہ بخاری کی مشہور روایت ہے، مگر مؤرخین لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام جو قرآن شریف میں بھی مذکور ہے ایک خاص شان کا کلام ہے اور اس میں آپؐ کی اس ارفع شان کا پتہ چلتا ہے جو حضرت موسیٰ پر آپؐ کو حاصل تھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰ نے تو فرعون کے تعاقب کے وقت اپنی قوم کے گھبرا جانے پر صرف یہ لفظ کہے کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ یعنی "میرے ساتھ میرا خدا ہے وہ میرے لیے بچاؤ کا راستہ نکال دے گا"۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کے الفاظ استعمال فرمائے۔ یعنی "میرے اور میرے ساتھی دونوں کے ساتھ خدا ہے"۔ آپؐ کے اس جملہ پر مقابلۃً نظر ڈالنے سے آپؐ کے برتر اخلاق اور آپؐ کے صحابہ کے اعلیٰ مقام اور آپؐ سے خدا تعالیٰ کے بہتر سلوک پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ منہ

[2] بخاری باب الہجرت ✧ [3] زرقانی و محمود پاشا مصری ✧

[4] بخاری باب الہجرت ✧

رات کو روانہ ہوتے تھے اور خود بخاری کی ہی ایک دوسری روایت میں اس کی تصدیق پائی جاتی ہے[1] اور قرین قیاس بھی یہی ہے کہ آپؐ رات کو روانہ ہوتے ہوں۔ بہرحال غارِ ثور سے نکل کر آپ ایک اُونٹنی پر جس کا نام بعض روایات میں اُلقصوا بیان ہوا ہے، سوار ہوگئے اور دُوسری پر حضرت ابوبکرؓ اور اُن کا خادم عامر بن فہیرہ سوار ہوتے[2] روانہ ہوتے ہوئے آپؐ نے مکّہ کی طرف آخری نظر ڈالی اور حسرت کے الفاظ میں فرمایا "اے مکّہ کی بستی! تو مجھے سب جگہوں سے زیادہ عزیز ہے مگر تیرے لوگ مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے"[3]

اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے کہا "ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکالا ہے۔ اب یہ ضرور ہلاک ہوں گے"[4]

چونکہ ابھی تک تعاقب کا ڈر تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی اصل راستہ چھوڑ کر ساحل سمندر کے قریب قریب یثرب کی طرف روانہ ہوئے اور برابر ایک رات اور دُوسرے دن کا کچھ حصّہ چلتے رہے۔ دُوسرے دن دوپہر کے قریب جب سُورج کی گرمی تیز ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے عرض کرنے پر آپؐ ایک بڑے پتھر کے سایہ میں آرام فرمانے کے لیے اُترے۔ حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر آپؐ کے واسطے جگہ تیار کی اور آپؐ ذرا لیٹ کر سو گئے۔ اور حضرت ابوبکرؓ اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر دیکھنے لگے کہ کوئی تعاقب کرنے والا تو نہیں آرہا۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ کو ایک چرواہا نظر آیا جس کے ساتھ چند بکریاں تھیں۔ جنھیں وہ اُسی پتھر کی طرف سایہ کی غرض سے لا رہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے دُودھ کی اجازت لے کر اس کے ہاتھ اور بکری کے تھن خوب اچھی طرح صاف کروائے اور پھر اسے دُودھ دُوہنے کو کہا۔ چنانچہ اس نے ایک برتن میں دُودھ دوہا۔ اور پھر حضرت ابوبکرؓ اُسے پانی میں ٹھنڈا کر کے آپؐ کے پاس لائے۔ اس وقت تک آپؐ نیند سے جاگ چکے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کے سامنے دودھ کا برتن پیش کیا اور آپؐ نے اُسے نوش فرمایا۔ اور حضرت ابوبکرؓ روایت کرتے ہیں کہ اس سے میری طبیعت خوش ہوگئی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ سے عرض کیا "یا رسُول اللہ کوچ کا وقت ہوگیا ہے" آپؐ نے فرمایا۔ "ہاں چلو!"

چنانچہ آپؐ آگے روانہ ہوگئے۔ لیکن ابھی آپؐ تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ ایک شخص گھوڑا دوڑائے ان کے پیچھے آرہا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر کہا "یا رسُول اللہ! کوئی شخص ہمارے تعاقب میں آرہا ہے" آپؐ نے فرمایا "کوئی فکر نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے"[5]

---

[1] بخاری باب الہجرۃ عن براء بن عازب ۔ [2] خمیس و زرقانی ۔

[3] مسند احمد و ترمذی بحوالہ زرقانی ۔ [4] ترمذی و نسائی بحوالہ زرقانی کتاب المغازی ۔

[5] بخاری باب المہاجرین ۔

یہ تعاقب کرنے والا سراقہ بن مالک تھا جو اپنے تعاقب کا قصہ خود اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل گئے تو کفارِ قریش نے یہ اعلان کیا کہ جو کوئی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ابوبکرؓ کو زندہ یا مُردہ پکڑ کر لائے گا اسے اس اس قدر انعام دیا جائے گا اور اس اعلان کی انہوں نے اپنے پیغام رسانوں کے ذریعہ سے ہمیں بھی اطلاع دی۔ اس کے بعد ایک دن میں اپنی قوم بنو مدلج[1] کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ قریش کے ان آدمیوں میں سے ایک شخص ہمارے پاس آیا اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا کہ میں نے ابھی ابھی ساحلِ سمندر کی سمت میں دُور سے کچھ شکلیں دیکھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھی ہوں گے۔ سراقہ کہتا ہے کہ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ ضرور وہی ہوں گے مگر میں نے اُسے ٹالنے کے لیے (اور یہ فخر خود حاصل کرنے کی غرض سے) کہا کہ یہ تو فلاں فلاں لوگ ہیں جو ابھی ہمارے سامنے سے گذرے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میں اس مجلس سے اُٹھا اور اپنے گھر آکر اپنی خادمہ سے کہا کہ میرا گھوڑا تیار کر کے گھر کے پچھواڑے میں کھڑا کر دے اور پھر میں نے ایک نیزہ لیا اور گھر کی پشت کی طرف سے ہو کر چپکے سے نکل گیا اور گھوڑے کو تیز کر کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور میں زمین پر گر گیا، لیکن میں جلدی سے اُٹھا اور اپنا ترکش نکال کر میں نے ملک کے دستور کے مطابق تیروں سے فال لی۔ فال میرے منشاء کے خلاف نکلی، مگر (اسلام کی عداوت کا جوش اور انعام کا لالچ تھا) میں نے فال کی پرواہ نہ کی۔ اور پھر سوار ہو کر تعاقب میں ہولیا اور اس دفعہ اس قدر قریب پہنچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی (جو اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کرتے جا رہے تھے) قرأت کی آواز مجھے سنائی دیتی تھی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک دفعہ بھی مُنہ موڑ کر پیچھے کی طرف نہیں دیکھا۔ مگر ابوبکرؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر کی وجہ سے) بار بار دیکھتے تھے۔ میں جب ذرا آگے بڑھا تو میرے گھوڑے نے پھر ٹھوکر کھائی اور اس دفعہ اس کے پاؤں ریت کے اندر دھنس گئے اور میں پھر زمین پر آرہا۔ میں نے اُٹھ کر گھوڑے کو جو دیکھا تو اس کے پاؤں زمین میں اس قدر دھنس چکے تھے کہ وہ انہیں زمین سے نکال نہیں سکتا تھا۔ آخر بڑی مشکل سے وہ اُٹھا اور اس کی اس کوشش سے میرے اردگرد سب غبار ہی غبار ہو گیا۔ اس وقت میں نے پھر فال لی اور پھر وہی فال نکلی۔ جس پر میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو صلح کی آواز دی۔ اس آواز پر وہ ٹھہر گئے اور میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اُن کے پاس پہنچا۔ اس سرگذشت کی وجہ سے جو میرے ساتھ گذری تھی میں نے یہ سمجھا کہ اس شخص کا ستارہ اقبال پر ہے اور یہ کہ بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غالب

---

[1] شاخ بنو کنانہ ۔

رہیں گے ؛ چنانچہ مَیں نے صُلح کے رنگ میں ان سے کہا کہ آپؐ کی قوم نے آپؐ کو قتل کرنے یا پکڑ لانے کے لیے اس اس قدر انعام مقرر کر رکھا ہے اور لوگ آپؐ کے متعلق یہ یہ ارادہ رکھتے ہیں اور مَیں بھی اسی ارادے سے آیا تھا مگر اب مَیں واپس جاتا ہوں۔ اس کے بعد مَیں نے انہیں کچھ زادِ راہ پیش کیا مگر انھوں نے نہیں لیا اور نہ ہی مجھ سے کوئی اور سوال کیا۔ صرف اس قدر کہا کہ ہمارے متعلق کسی سے ذکر نہ کرنا۔ اس کے بعد مَیں نے (یہ یقین کرتے ہوئے کہ کسی دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک میں غلبہ حاصل ہو کر رہے گا) آپؐ سے عرض کیا کہ مجھے ایک اَمن کی تحریر لکھ دیں۔ جس پر آپؐ نے عامر بن فہیرہ کو ارشاد فرمایا اور اُس نے مجھے ایک چمڑے کے ٹکڑے پر امن کی تحریر لکھ دی[1] اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی آگے روانہ ہو گئے[2]

جب سراقہ واپس لوٹنے لگا۔ تو آپؐ نے اُسے فرمایا "سراقہ اُس وقت تیرا کیا حال ہوگا جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن ہوں گے؟" سراقہ نے حیران ہو کر پُوچھا کہ "کسریٰ بن ہرمز شہنشاہِ ایران"؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں" سراقہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کہاں عرب کے صحرا کا ایک بدوی اور کہاں کسریٰ شہنشاہِ ایران کے کنگن! مگر قدرتِ حق کا تماشا دیکھو کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران فتح ہوا اور کسریٰ کا خزانہ غنیمت میں مُسلمانوں کے ہاتھ آیا تو کسریٰ کے کنگن بھی غنیمت کے مال کے ساتھ مدینہ میں آئے۔ حضرت عمرؓ نے سراقہ کو بُلایا جو فتح مکہ کے بعد مُسلمان ہو چکا تھا۔ اور اپنے سامنے اس کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن جو بیش قیمت جواہرات سے لدے ہوئے تھے پہنائے[3]

سراقہ کے تعاقب سے رہائی ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے۔ راستہ میں زبیر بن العوامؓ سے ملاقات ہو گئی جو شام سے تجارت کر کے مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ مکہ کو واپس جا رہے تھے۔ زبیرؓ نے ایک جوڑا سفید کپڑوں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ایک حضرت ابوبکرؓ کی نذر کیا[4] اور کہا۔ مَیں بھی مکہ سے ہو کر بہت جلد آپؐ سے مدینہ میں آملوں گا۔ اور بھی کئی لوگ راستہ میں ملتے تھے اور چونکہ حضرت ابوبکرؓ بوجہ تجارت پیشہ ہونے کے اس راستہ سے بارہا آتے جاتے رہتے تھے اس لیے اکثر لوگ ان کو پہچانتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانتے تھے لہٰذا وہ ابوبکرؓ سے پُوچھتے تھے کہ یہ تمہارے آگے آگے کون ہے۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے۔ هٰذَا يَهْدِيْنِيَ السَّبِيْلَ "یہ میرا ہادی ہے" وہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ کوئی دلیل یعنی گائیڈ ہے جو راستہ دکھانے کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے ساتھ لے لیا ہے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ کا مطلب کچھ اور ہوتا تھا[5]

---

[1] یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایسے نازک اور بے سروسامانی کے وقت میں بھی لکھنے کا سامان ساتھ ہوتا تھا۔ [2] بخاری باب الہجرت۔

[3] یہ نظارہ غالباً آنحضرت صلعم کو اسی وقت کشفی حالت میں دکھایا گیا ہوگا۔ [4] اسد الغابہ ذکر سراقہ۔ [5] بخاری باب الہجرت۔

اختتام سفر اور تکمیلِ ہجرت

آٹھ روز کے سفر کے بعد راستہ میں مختلف جگہ ٹھہرتے ہوئے بارہ ربیع الاوّل سنہ ۱۴ نبوی مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کو آپؐ مدینہ کے پاس پہنچے[1]۔ اہلِ یثرب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے روانگی کے متعلق خبر پہنچ چکی تھی، اس لیے وہ ہر روز مدینہ سے باہر آپؐ کے استقبال کے لیے آتے اور دیر دیر تک انتظار کرتے رہتے تھے، مگر جب دھوپ تیز ہونے لگتی تھی تو مایوس ہو کر واپس لَوٹ جاتے تھے۔ اُس دن بھی وہ آپؐ کے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے، مگر چونکہ دن بہت چڑھ آیا تھا اس لیے آج بھی مایوس ہو کر واپس چلے گئے تھے کہ اچانک جبکہ وُہ ابھی اپنے گھروں میں پہنچے ہی تھے ایک یہودی نے جو اپنی گڑھی میں ایک بلند مقام پر کسی اپنی غرض سے کھڑا تھا۔ دُور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو سفید لباس میں چمکتے ہوئے دیکھا اور زور سے پکار کر کہا "اے اہلِ عرب! جس کا تم راہ دیکھتے ہو وُہ یہ آتا ہے۔" مخلص جماعت کے کان میں یہ آواز پہنچی اور مسلمان خوشی کے جوش میں دیوانے ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور جلدی جلدی ہتھیار سنبھال کر دوڑتے بھاگتے ہوئے شہر سے باہر نکل آئے[2]۔

---

[1] زرقانی و محمود پاشا مصری .... بعض محققین کی تحقیق کے مطابق آٹھ ربیع الاوّل تاریخ تھی۔

[2] عربوں میں ہتھیار لگا کر کسی کے استقبال کے لیے نکلنا اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ استقبال کرنے والا اپنے مہمان کے لیے جان تک قربان کر دینے کے لیے تیار ہے۔

مکّی زندگی پر ایک سرسری نظر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے پہلے دور یعنی قبل از بعثت زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے جو قلّتِ واقعات کی شکایت ہم نے بیان کی تھی وہ آپ کی زندگی کے دُوسرے دَور میں بھی پوری طرح دُور نہیں ہوئی۔ یہ دُرست ہے کہ ماموریت کے دعویٰ کے بعد ایسے لوگ موجود تھے جن کے واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک نمونہ کا حکم رکھتی تھی۔ اور جو آپ کی تمام حرکات وسکنات کو غور کی نظر سے مطالعہ کرتے تھے اور ہر وقت آپ کی صُحبت میں رہنے کے خواہشمند تھے مگر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں قریش کے مظالم نے مکہ میں مسلمانوں کو کبھی بھی اکٹھا نہیں ہونے دیا اور کبھی بھی ان کو اتنی فرصت اور موقعہ نہیں دیا کہ وہ اپنے آقا کی صُحبت میں رہ کر اس کی زندگی کے تمام حالات کو آنے والی نسلوں کے لیے بالتفصیل محفوظ کر دیں۔ بااین ہمہ بعثت سے قبل اور بعد کی زندگی کے حالات میں ایک بہت نمایاں فرق نظر آتا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ مدنی زندگی کے حالات میں یہ فرق بہت ہی نمایاں ہو جائے گا۔ کیونکہ مدینہ میں صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے اور آپ کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے کا ہر وقت موقعہ ملتا تھا اور انھوں نے بھی جس تفصیل اور بسط کے ساتھ اس زمانہ کے متعلق آپ کے سوانح کو ہم تک پہنچایا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ دُنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں انبیاء گذرے ہوں گے مگر جس تفصیل اور بسط کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تاریخ وحدیث میں محفوظ ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسرے نبی کے متعلق میسّر نہیں۔ خدا ہزار ہزار رحمتیں نازل فرمائے صحابہؓ اور تابعین اور تبع تابعین کی مقدس جماعت پر جس کے طفیل آج بھی جبکہ ساڑھے تیرہ سو سال کا عرصہ آپ کی وفات پر گذر چکا ہے آپ کی جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور ہم اپنی زندگی کے ہر قدم پر آپ کے پاک نمونہ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

قیامِ مکہ اور سنین نبوی وہجری

بعثت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں قریباً تیرہ سال ٹھہرے۔ بعض روایات میں دس سال بیان کئے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک لحاظ سے دُرست ہے کیونکہ ابتداءِ وحی کے بعد آپ نے تین سال تک اپنے مشن کو مخفی رکھا تھا۔ پس اگر ان

تین سالوں کو نکال دیں تو باقی دس سال ہی رہ جاتے ہیں۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ ہجرت کے وقت آپؐ کی عمر ترپن[۵۳] سال کی تھی۔

ظہورِ اسلام سے پہلے قریش میں سنہ تاریخ عموماً عام الفیل کے حساب سے شمار ہوتا تھا؛ چنانچہ مورخین بھی بعثتِ نبوی سے پہلے کے واقعات کی تاریخ بتانے کے لیے عموماً عام الفیل کا حوالہ دیتے ہیں۔ لیکن بعثت سے بعد کے واقعات کا سنہ بعثتِ نبوی سے شمار کیا جاتا ہے مگر یہ سنہ بھی صرف تیرہ سال یعنی ہجرت تک چلتا ہے۔ اِس کے بعد سے مستقل طور پر سنہ ہجری شروع ہوتا ہے۔ جس کی تجویز اور تعیین ابتداءً حضرت عمرؓ کے عہد میں ہوئی تھی[۱]

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بعثتِ نبوی عام الفیل کے چالیسویں سال ماہِ رمضان میں ہوئی تھی اور چونکہ رمضان عربی مہینوں میں نواں مہینہ ہے اس لیے بعثتِ نبوی کا پہلا سال صرف چند ایام اور تین ماہ یعنی بقیہ رمضان اور شوال۔ ذیقعدہ اور ذی الحجہ کا شمار ہوتا ہے اور چونکہ ہجرتِ نبوی ۱۴ سنہ نبوی ابتداء ماہ ربیع الاوّل میں ہوئی تھی[۲] اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بعد از بعثت مکی قیام دراصل صرف بارہ سال پانچ ماہ اور چند ایام کا بنتا ہے۔ ہاں اگر رویائے صالحہ کا زمانہ یعنی ابتدائی چند ماہ بھی زمانۂ نبوت میں شمار کر لیے جاویں تو یہ کل عرصہ قریباً تیرہ سال کا ہو جاتا ہے۔

نزولِ وحی کی کیفیت کلامِ الٰہی کے نزول کی کیفیت اور اس کے نزول کے وقت مُنزّل علیہ کے قلب کی حالت کو حقیقی طور پر سمجھنا تو صرف اسی شخص کا کام ہے جو اس کوچہ سے آشنا ہو۔ تاہم جو اجمالی نقشہ قرآن شریف اور حدیث میں بیان ہوا ہے۔ وہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۚ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔[۳]

یعنی "نہیں کلام کرتا اللہ کسی بندے سے مگر وحی کے طریق پر یا کسی پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیجتا ہے جو القاء کرتا ہے بندہ پر اللہ کے اذن سے بیشک اللہ تعالیٰ بہت بلند اور حکمت والا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کلامِ الٰہی کے تین طریق بتائے ہیں:

اوّل۔ وحی یعنی براہِ راست لفظی کلام۔ جس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

---

[۱] طبری ؛ [۲] طبری ؛ [۳] سورۃ شوریٰ: ۵۲

(الف) یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی الفاظ براہِ راست انسان کے کانوں میں پہنچیں۔
وحی کی یہ صورت عموماً سب سے زیادہ بارُعب اور شاندار ہوتی ہے۔

(ب) یہ کہ اس کی زبان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی الفاظ جاری کیے جائیں ان دونوں
طریقوں کو اسلامی اصطلاح میں وَحی کہتے ہیں۔

دوسرے۔ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ یعنی کسی تحریر کے سامنے آجانے یا کشف یا خواب یا قلبی
القاء وغیرہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی امر بندہ پر ظاہر ہو۔

تیسرے۔ یُرْسِلَ رَسُوْلًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی فرشتہ وغیرہ بندہ کے پاس آوے
اور خدا کی طرف سے اس کے ساتھ کلام کرے۔

اسی کے مطابق حدیث میں حضرت عائشہؓ کی روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسُول اللہ آپؐ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ:

اَحْیَانًا یَّأْتِیْنِیْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرْسِ وَھُوَ اَشَدُّہٗ عَلَیَّ فَیَفْصِمُ عَنِّیْ وَقَدْ وَعَیْتُ عَنْہُ مَا قَالَ وَ اَحْیَانًا یَتَمَثَّلُ لِیَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَیُکَلِّمُنِیْ فَاَعِیْ مَا یَقُوْلُ[۱]

یعنی "کبھی تو میرے پاس وحی آتی ہے گھنٹی کی چھنکار کی طرح (تا کہ ٹیلیفون کی طرح پہلے الارم بجا کر ہوشیار اور متوجہ کیا جائے) اور یہ طرز وحی کی (بوجہ خدائی کلام کی براہِ راست حامل ہونے کے) مجھ پر سخت ترین ہوتی ہے۔ پھر بعد اس کے کہ مَیں اس کا کلام خوب محفوظ کر چکا ہوتا ہوں یہ آواز مجھ سے جُدا ہو جاتی ہے۔ اور کبھی کوئی فرشتہ میرے پاس انسان کی صُورت اختیار کر کے آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے۔ سو مَیں اس کی بات کو بھی محفوظ کر لیتا ہوں۔"

اس حدیث میں مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ والی صورت نہیں بیان کی گئی جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صورت جو رؤیا وغیرہ سے تعلق رکھتی ہے ایک نسبتاً عام صورت ہے اور اکثر لوگ علیٰ قدرِ مراتب اس کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں بمقابلہ باقی دو صورتوں کے جن کا حلقہ صرف رسولوں اور خاص خاص لوگوں تک محدود ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ الٰہی کی بڑی اقسام تین ہیں مگر یہ کہ یہ تینوں قسمیں پھر

---

[۱] بخاری کتاب بدء الوحی

آگے بہت سی ماتحت اقسام میں منقسم ہیں جن کا موٹا نقشہ حسب ذیل صُورت میں سمجھا جا سکتا ہے :-

اوّل : کلام بصُورت وحی یعنی براہِ راست لفظی کلام جس کی دو صُورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) کلامِ الٰہی کا براہِ راست انسانی کانوں تک پہنچنا جو کئی طریق پر ہو سکتا ہے۔

(ب) خدائی تصرّف کے ماتحت خود انسان کی زبان پر کوئی کلام جاری ہونا۔ یہ ہردو صورتیں یقظہ اور نوم ہردو حالتوں میں ممکن ہیں۔

دوم۔ کلام بواسطہ ارسالِ رُسل یعنی خدا کی طرف سے کوئی فرشتہ وغیرہ انسان کے سامنے نمودار ہوکر اس کے ساتھ خدائی منشاء کے ماتحت کلام کرے۔ یہ بھی کئی صُورتوں میں ہو سکتا ہے۔ اور یقظہ اور نوم ہردو حالتوں میں ممکن ہے۔

سوم : کلام پسِ پردہ۔ یعنی نہ تو خدا کا براہِ راست کلام ہو اور نہ ہی کسی فرشتہ کا براہ راست واسطہ اختیار کیا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کسی پردے کے پیچھے رہ کر کسی رنگ میں اپنے منشاء کا اظہار فرما دے۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں : مثلاً

(الف) کشف یعنی عین بیداری یا نیم بیداری میں خدائی تصرّف کے ماتحت کوئی نقشہ دکھایا جانا۔ خواہ وہ نقشہ اصل حالت کا مظہر ہو یا قابلِ تعبیر ہو۔ یہ حالت یقظہ کی صُورت میں ہوتی ہے۔ اور حواسِ ظاہری کے تعطّل اور عدمِ تعطّل ہردو حالتوں میں ممکن ہے یعنی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری حواس بھی کام کر رہے ہوتے ہیں اور اسی حالت میں باطنی حواس میں ایک بیداری پیدا ہو کر کوئی نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایک آنِ واحد کے لیے ظاہری حواس معطّل ہو کر حواسِ باطنی کو جگہ دے دیتے ہیں۔

(ب) رؤیا یا خواب جس کی کیفیت سے اکثر لوگ واقف ہیں جو نیند کی حالت میں دکھائی جاتی ہے اور بالعموم تعبیر طلب ہوتی ہے۔

(ج) کسی تحریر کا آنکھوں کے سامنے پھر جانا جو یقظہ اور نوم ہردو حالتوں میں ممکن ہے۔

مندرجہ بالا صورتوں کے علاوہ ایک وحی خفی بھی ہوتی ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات انسان کے دل میں ڈالا جانا۔ مگر اس کا پہچاننا خاص مشق چاہتا ہے۔

یہ صرف ایک موٹا اور سرسری نقشہ ہے ورنہ درحقیقت کلامِ الٰہی کی صُورتیں بہت ہیں اور بسا اوقات ایک سے زیادہ قسمیں ایک ہی وقت میں جمع بھی ہو جاتی ہیں[1]۔

نزولِ وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی جو حالت ہوتی تھی اس کے متعلق حضرت عائشہؓ فرماتی

---

[1] اس بارے میں متقدمین کے خیالات معلوم کرنے ہوں تو زرقانی جلد ۱ باب مراتب الوحی دیکھئے۔

ہیں کہ :۔

لَقَدْ رَاَيْتُهٗ يُنْزَلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَنْفَصِمُ عَنْهُ وَاِنَّ جَبِيْنَهٗ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا[1]

"یعنی مَیں نے دیکھا ہے کہ بعض اوقات سخت سردی کا دن ہوتا تھا لیکن جب آپؐ پر وحی اُترتی تھی تو پسینہ آپؐ کی پیشانی سے پھُوٹ پھُوٹ کر بہتا تھا۔"

پھر زید بن ثابتؓ جو آپؐ کے کاتبِ وحی تھے روایت کرتے ہیں کہ :

اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفَخِذُهٗ عَلٰى فَخِذِيْ فَثَقُلَتْ عَلَيَّ حَتّٰى خِفْتُ اَنْ تَرُضَّ فَخِذِيْ ثُمَّ سُرِّيَ عَنْهُ[2]

"یعنی ایک دفعہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ران میری ران پر تھی کہ آپؐ پر وحی کی حالت طاری ہوئی اس وقت آپؐ کی ران مجھے اس قدر بوجھل محسوس ہوتی تھی کہ میں ڈر گیا کہ کہیں میری ران بوجھ سے ٹوٹ نہ جاوے۔ پھر اس کے بعد آپؐ کی یہ حالت جاتی رہی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت چونکہ رُوحانی حسّیں بیدار ہو کر بہت تیز ہو جاتی ہیں۔ اس لیے عموماً انسان کی جسمانی طاقت معطّل ہو جاتی ہے اور جسم مُردہ کی طرح بے سہارا ہو کر گر جاتا ہے۔

اِس جگہ اس شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے جو بعض ناواقف اور سادہ مزاج لوگوں کے دل میں پیدا ہوا کرتا ہے کہ خُدا بولتا کس طرح ہے؟ یعنی کیا خدا کی کوئی زبان ہے جس سے وہ کلام کرتا ہے؟ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ہستی کے حالات اور صفات کے مطابق اُس کی طاقتوں کا اظہار ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی چونکہ نہایت لطیف اور غیر مادی اور غیر محدود اور وراءالوراء ہستی ہے اس لیے انسان کے حالات پر جو مادی بھی ہے اور مخلوق بھی اور محدود بھی اُس کا قیاس ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پس یہ ایک انتہائی درجہ جہالت کا خیال ہوگا۔ اگر یہ سمجھا جاوے کہ چونکہ انسان کو کلام کرنے کے لیے ایک گوشت کے لوتھڑے کی ضرورت ہے اس لیے خدا کی بھی کوئی ایسی زبان ہونی چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خدا اپنی دوسری لاتعداد طاقتوں کو کام میں لاتا ہے۔ اسی طرح وہ بولتا بھی ہے مگر بغیر ظاہری زبان کے۔ اور سُنتا بھی ہے مگر بغیر ظاہری کانوں کے۔ اور دیکھتا بھی ہے مگر بغیر ظاہری آنکھوں کے۔ بے شک اس کی ہستی کو محسوس کرنا انسانی عقل سے بالا نہیں مگر اس کی ہستی کی کُنہہ کو سمجھنا یقیناً عقلِ انسانی سے بالا و برتر ہے۔ ایک گراموفون کو ہی دیکھو۔ کیا انسان کی طرح اس کی بھی کوئی زبان ہے جس سے وہ بولتا ہے؟ پس جب مخلوق اور ادنیٰ چیزوں میں

---

[1] بخاری۔

[2] بخاری کتاب التفسیر۔

اس قدر اختلاف موجود ہے تو خدا جیسی خالق و مالک۔ اول و آخر۔ ازلی و ابدی لطیف و غیر محدود قادرِ مطلق ہستی کو انسان پر قیاس کرنا کس قدر جہالت کا فعل ہوگا۔

جمعِ قرآن جمعِ قرآن کے متعلق اصل بحث تو کتاب کے حصّہ دوم میں آئے گی مگر اس جگہ ایک مختصر نوٹ میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن شریف جو ہم مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہے اور جسے ہم اللہ کا کلام سمجھتے ہیں جو اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تاراً یکلخت نازل نہیں ہوا، بلکہ آہستہ آہستہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر نازل ہوا تھا اور اس تدریجی نزول میں کئی حکمتیں ہیں۔ جن کے بیان کی اس جگہ ضرورت نہیں۔ جو سُورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں وہ مکّی سُورتیں کہلاتی ہیں اور بعد کی مدنی۔ قرآن شریف کا جو جو حصّہ نازل ہوتا جاتا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو سُنا دیتے تھے۔ اور بعض کو یاد کروا دیتے تھے اور اس کے مختلف نسخے لکھوا بھی دیتے تھے۔ جس کے لیے آپؐ نے اپنے خواندہ صحابیوں میں سے متعدد کاتبِ وحی مقرر کیے ہوئے تھے اچنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب زمانہ جاہلیت میں حضرت عمرؓ غصّہ کی حالت میں اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوئے تو اس وقت ان کے پاس لکھا ہوا قرآن شریف موجود تھا جس پر سے خباب بن الارت تلاوت کر کے حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو سُنا رہے تھے۔

قرآنی سورتیں قرآن شریف میں اسی ترتیب سے نہیں رکھی گئیں جس ترتیب سے ان کا نزول ہوا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود الٰہی حکم کے ماتحت اُن کی ایک خاص ترتیب مقرر فرما دی۔ چنانچہ ہر سُورۃ کے ختم ہونے پر آپؐ ہدایت فرماتے تھے کہ اسے فلاں موقعہ پر رکھو۔ اسی طرح ہر آیت کے نزول پر بھی خود فرماتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں جگہ ڈالو[1] جو ترتیب قرآنی آیات اور سورتوں کی آپؐ نے خدائی تفہیم کے ماتحت مقرر فرمائی وہی اب تک موجود ہے اور غور و تدبر کرنے والوں پر اس ترتیب کی خوبی مخفی نہیں رہ سکتی۔

مکّی سُورتیں چونکہ مکّہ میں نزولِ شریعت کی ابتدا تھی اس لیے زیادہ تر عقائد کی اصولی باتوں پر ہی اکتفا کی گئی ہے۔ ویسے بھی چونکہ مکّہ میں صرف مشرکین اور بُت پرست بستے تھے اس لیے مکّی آیات میں زیادہ تر شرک اور بُت پرستی ہی کی تردید کی گئی ہے اور ہستی باری تعالےٰ اور توحید کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد سلسلۂ رسالت کی حقانیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ثبوت اور اس پر کفار کے اعتراضوں کے جوابات اور گذشتہ انبیاء کے حالات مذکور ہیں۔ پھر ملائکہ کے وجود۔ قیامت۔ جزا سزا۔ جنت و دوزخ۔ تقدیر وغیرہ کے مسائل پر دلچسپ بحثیں ہیں۔

---

[1] ابوداؤد ترمذی و مسند احمد بحوالہ مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن و فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹-۲۰ ؎

اس کے علاوہ جاہلانہ رُسوم اور بدعات سے روکا گیا ہے اور نیک عادات و اخلاقِ حسنہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور پھر اس سے اعلیٰ مقام یعنی عرفانِ الٰہی کی راہوں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے طریقوں کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔

عبادات میں مکی سورتیں سوائے نماز کے حکم کے باقی سب احکام سے خالی ہیں، چنانچہ حج، روزہ، زکوٰۃ کا کہیں ذکر نہیں آتا، کیونکہ یہ سب مدینہ میں فرض ہوئے تھے۔ جہاد بالسیف کا ذکر بھی مکی آیات میں نہیں ملتا، کیونکہ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عفو کا حکم تھا اور کفار پر اتمامِ حجت کیا جارہا تھا۔ پھر جب اتمامِ حجت ہوچکا اور کفار اپنے مظالم سے باز نہ آئے بلکہ دن بدن ترقی کرتے گئے۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو اپنے وطن سے بے وطن ہونا پڑا۔ اور پھر ہجرت کے بعد بھی قریش نے مسلمانوں کا پیچھا نہ چھوڑا تب جاکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہاد بالسیف کی اجازت نازل ہوئی۔

اسی طرح چونکہ مکہ میں اسلامی سوسائٹی کی بالکل ابتدائی حالت تھی بلکہ حق تو یہ ہے کہ مکہ میں کوئی اسلامی سوسائٹی تھی ہی نہیں کیونکہ قریش کے بیدردانہ مظالم نے سب کو منتشر کر رکھا تھا اس لیے مکی سورتوں میں تمدنی احکام بھی نظر نہیں آتے۔ اسی طرح سیاسی احکام بھی مکی سورتوں میں مفقود ہیں۔ گویا فقہی مسائل سے مکی سورتیں قریباً قریباً خالی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکی سورتیں عام طور پر بہت چھوٹی ہیں۔ اور ان کی زبان بھی زیادہ زوردار، جوش والی اور موزوں ہے بمقابلہ مدنی سورتوں کے جن میں احکام کی کثرت اور فقہی مسائل کی پیچیدگیوں کی وجہ سے طرزِ بیان میں مناسب تبدیلی آگئی ہے اور یہ تبدیلی نہایت موزوں اور برمحل ہے کیونکہ بلاغت اسی میں ہے کہ طرزِ کلام واقعات کے مناسبِ حال ہو۔

ارتقاءِ نبوی

مسئلہ ارتقاء یعنی درجہ بدرجہ ترقی کرنا ایک مسلّم مسئلہ ہے اور گو اس کی وہ صورت جو اہلِ مغرب پیش کرتے ہیں درست نہ ہو مگر جہاں تک اصول کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ دن بدن اس کی حقانیت پر زیادہ سے زیادہ روشنی پڑتی جارہی ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے خود اس مسئلہ کو قرآن شریف میں متعدد موقعوں پر بیان کیا ہے اور اس کی طرف توجہ دلائی ہے اور انسانی پیدائش کے بیان میں تو خلقِ آدم کے ارتقائی مراحل بھی صراحت کے ساتھ بیان کئے ہیں[۱]۔ دراصل اللہ تعالیٰ کے تمام کاموں میں تدریجی ترقی کا اصول نمایاں طور پر کام کرتا نظر آتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہی اصول انبیاء علیہم السلام کے حالاتِ زندگی میں پایا جاتا ہے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انبیاء کا وجود کسی فوری انقلاب کا نتیجہ ہوتا ہے وہ بالکل غلط سمجھا ہے اور اس نے نبوت کی حقیقت پر بالکل غور نہیں کیا۔ کیونکہ جس طرح صحیفۂ قدرت پر ہر اک چیز تدریجاً بنتی ہے اسی طرح انبیاء بھی اپنی نبوت

---

[۱] سورۃ مومنون: ۱۲ تا ۱۵

ہیں تدریجاً نشو ونما پاتے ہیں اور قطعاً کسی فوری انقلاب کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ آہستہ آہستہ کئی درمیانی حالتوں میں سے گذرنے کے بعد اُس آخری مقام کو حاصل کرتے ہیں جس پر ان کے مراتب سلوک ختم ہوتے ہیں۔ تمام انبیاء جس طرح جسمانی لحاظ سے مراحلِ خلق میں سے گذرتے ہوئے پیدا ہوئے پھر انھوں نے اپنے بچپن کے دن گذارے۔ پھر وُہ نوجوان ہوئے اور پھر اپنی پختگی کو پہنچے۔ اسی طرح رُوحانی لحاظ سے بھی وہ پہلے پیدا ہوتے ہیں اور پھر درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ اپنی پختگی کو پہنچتے ہیں۔ اور پھر مقام نبوت میں بھی وہ ایک جگہ نہیں ٹھہرتے بلکہ دن بدن شاہراہ ترقی پر آگے قدم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تدریجی نشوونما قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے اور فوری انقلاب کے بداثرات سے محفوظ رکھتا ہے نیز اور بھی کئی طرح سے مفید بلکہ ضروری ہوتا ہے مگر اس جگہ اس مسئلہ کی تفصیلات کی گنجائش نہیں اس جگہ ہیں مختصر طور پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی میں یہ تدریجی نشوونما کس طریق پر کام کرتا نظر آتا ہے۔ سو اختصار کی غرض سے ہم آپؐ کی ابتدائی زندگی سے قطع نظر کر کے صرف دعویٰ اور اس کے مقدمات سے آپؐ کی زندگی کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

سب سے اول ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاشِ حق میں ترکِ دنیا کا طریق اختیار کیا اور خلوت میں رہنا شروع کیا۔ اس پر ایک عرصہ گذرا تو آپؐ پر رؤیائے صادقہ کا دروازہ کھولا گیا اور آپ کو سچے خواب آنے شروع ہوئے جو اپنے وقت پر پورے ہو ہو کر آپؐ کی پختگی کا موجب ہوتے رہے اور یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ جب آپؐ اس کوچے سے ایک حد تک آشنا ہو گئے اور طبیعت نبوت کے مناسب حال پختگی کو پہنچ گئی تو غارِ حرا میں آپؐ کے پاس الٰہی فرشتہ آیا اور اُس نے اللہ کی طرف سے آپ کے ساتھ کلام کیا اور رؤیا صادقہ سے اُوپر کا مقام آپؐ پر کھولا گیا، لیکن باوجود اس کے کہ آپؐ اس کوچہ سے آشنا ہو چکے تھے آپؐ کی طبیعت اس تبدیلی کو پہلی دفعہ پوری طرح برداشت نہیں کرسکی اور آپؐ سخت خوفزدہ ہو چکے اور یہ خوف واضطراب آپؐ کو ایک عرصہ تک تکلیف دیتا رہا۔ حتیٰ کہ اس ربّانی رسول کے بار بار آپؐ کے پاس آنے اور آپؐ کو تسلی دینے کے بعد آپؐ کو پُورا سکون حاصل ہوا۔

اس اطمینان کے بعد آپؐ نے اپنا کام شروع فرمایا۔ مگر اس میں بھی تدریجی ترقی کا پہلو موجود تھا۔ پہلے پہل آپؐ نے عام تبلیغ شروع نہیں کی۔ بلکہ صرف اپنے دوستوں اور عزیزوں تک تبلیغ کا کام محدود رکھا اور ڈھائی تین سال تک صرف خفیہ طور پر فرض تبلیغ ادا فرماتے رہے اس کے بعد آپؐ نے الٰہی حکم کے تحت کھلی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر اس زمانہ میں بھی آپؐ کے کام کا دائرہ عموماً مکہ والوں تک محدود رہا۔ بے شک باہر سے آنے والوں کے لیے بھی پیغامِ حق کا دروازہ کھلا تھا اور مسیح ناصری کی طرح متلاشیانِ حق سے یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ "میں بچوں کا کھانا کتوں کے آگے کیونکر ڈال دُوں"۔ مگر اوائل میں آپؐ کا

اصل رُوئے سخن قریش مکہ کی طرف تھا اور وہی اصل زیرِ تبلیغ تھے اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ لیکن جب مکہ والوں نے نہ صرف انکار پر اصرار کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے متبعین کو سخت سے سخت مظالم کا تختہ مشق بنایا بلکہ اس بات کا بھی عہد کر لیا کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھا جائے اور عملاً اپنے اوپر تبلیغِ اسلام کا دروازہ بند کر لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی توجہ مکہ والوں سے ہٹا کر دیگر قبائلِ عرب کی طرف پھیرلی۔ طائف کا سفر اسی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں قریشِ مکہ میں سے ایمان لانے والوں کی تعداد بہت ہی کم نظر آتی ہے اور ان کی جگہ دیگر قبائلِ عرب میں اسلام زیادہ پھیلتا نظر آتا ہے۔ یثرب کے قبائل اوس اور خزرج اس کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ ہجرت کے بعد یہود اور نصاریٰ کے ساتھ معاملہ پڑا اور دینۂ تبلیغ کی آخری سیڑھی اس وقت ختم ہوئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطینِ عجم کے نام تبلیغی مراسلات بھیجے اور اَسوَد و اَحمر کو پیغام شروع ہوا۔

اپنے مقام کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تدریجاً انکشاف ہوا چنانچہ شروع شروع میں تو آپؐ کی وحی میں آپؐ کے متعلق نبی اور رسول کا لفظ بھی استعمال نہیں ہوا۔ صرف ایک عمومی رنگ میں تبلیغِ حق کا حکم تھا اور جب نبوت اور رسالت کے مقام کا اظہار ہوا تو اس کے بعد بھی آپؐ ایک عرصہ تک اپنے آپ کو صرف یکے از انبیاء خیال فرماتے رہے اور بس۔ اپنی فضیلت اور ختمِ نبوت کے متعلق قطعاً کوئی دعویٰ نہ تھا۔ بلکہ ہجرت کے بعد تک یہ حال تھا کہ اگر کوئی صحابی اپنے جوشِ عقیدت میں آپؐ کو دیگر انبیاء پر افضل قرار دیتا تھا تو آپؐ اُسے سختی کے ساتھ روک دیتے تھے۔ چنانچہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ مدینہ میں ایک دفعہ ایک صحابی نے ایک یہودی کے سامنے حضرت موسیٰؑ پر آپؐ کی فضیلت بیان کی تو آپؐ اس صحابی پر بہت ناراض ہوئے اور حضرت موسیٰؑ کی ایک فضیلت بیان کر کے اس یہودی کی دلداری فرمائی[1] لیکن پھر ایک وقت آیا کہ آپؐ نے خود فرمایا کہ:

لَوْ کَانَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی حَیَّیْنِ لَمَا وَسِعَھُمَا اِلَّا اتِّبَاعِیْ[2]

"یعنی اگر اس وقت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو اُنکو بھی بجز میری پیروی کے چارہ نہ تھا"

پھر اوائل میں جب کسی صحابی نے آپؐ کو خیر البریہ یعنی افضل الخلق کہہ کر پکارا تو آپؐ نے اُسے روکا اور فرمایا۔ "ذَاکَ اِبْرَاھِیْمُ" یعنی افضل الخلق تو ابراہیمؑ تھے[3] نیز فرمایا "مجھے یونس بن متّیٰ پر فضیلت مت دو"[4] لیکن پھر خود فرمایا کہ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ وَلَا فَخْرَ[5] یعنی میں تمام بنی آدم کا سردار ہوں۔ مگر اس وجہ سے میں اپنے اندر کوئی تکبر نہیں پاتا" یہ گویا ارتقاءِ علمی تھا کیونکہ آپؐ افضل الرسل اور سید ولد آدم

---

[1] بخاری کتاب بدء الخلق باب وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ٭ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۲۴۶ زیر آیت وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ ٭ [3] مسند احمد جلد ۱ ٭ [4] بخاری کتاب بدء الخلق ٭ [5] ترمذی و ابن ماجہ ٭

تو اوائل سے ہی تھے مگر اس کا انکشاف آپ پر آہستہ آہستہ ہوا اور یہ بھی درست ہے کہ آپ کے مدارج میں بھی آہستہ آہستہ ترقی ہوتی گئی تھی۔

مکی زندگی میں اشاعتِ اسلام

بعثت کے بعد جو قریباً تیرہ سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں گذارے اُن میں اسلام سرزمینِ عرب میں گو جڑ پکڑ چکا تھا اور قریشِ مکہ سے باہر بھی اس کا اثر پہنچ چکا تھا؛ چنانچہ ابوذر غفاری، عبداللہ بن مسعود ھذیلی، ضماد بن ثعلبہ ازدی، ابوموسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی، سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی وغیرہ کئی غیر قبائل کی مثالیں موجود ہیں جو اس زمانہ میں اسلام لائے، مگر اس میں شک نہیں کہ ابھی تک اسلام ایک نہایت کمزور حالت میں تھا اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے ان مخالف عناصر کے مقابلہ میں جن کا اسے سامنا تھا اس کی زندگی خطرہ سے باہر نہیں تھی۔

قریش مکہ میں سے ہجرتِ نبوی تک اسلام لانے والوں کی تعداد صحیح طور پر معلوم نہیں ہے اور نہ کسی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن قرائن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قریش اور ان کے متعلقین میں سے ہجرت تک مسلمان ہونے والوں کی تعداد تین سو نفوس سے کسی صورت میں زیادہ نہیں ہوگی۔ اس تعداد میں عورتیں اور بچے سب شامل ہیں۔ گویا قریشِ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ کوششوں کا نتیجہ یہی تین سو جانیں تھیں۔ اور یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ ان میں سے کثیر تعداد ان لوگوں کی تھی جو اپنی کم سنی یا مفلسی یا کسی اور وجہ سے قریش میں کوئی اثر یا رسوخ نہیں رکھتے تھے۔

قریش کے علاوہ دیگر قبائل عرب میں سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد اہل یثرب کو الگ رکھتے ہوئے بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ ہاں یثرب میں البتہ جلد جلد اسلام پھیلا اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ہجرتِ نبوی سے پہلے مدینہ والوں میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد بشمولیت زن و فرزند کئی سو تک ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ اس طرح گویا ہجرت تک کل مسلمانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ قریباً ایک ہزار بنتی ہے۔ جن میں اگر عورتوں اور بچوں کو الگ رکھیں تو بالغ مرد شاید تین چار سو ہوں گے۔ لیکن یہ بھی ہجرت کے بعد سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ میں موجود نہیں تھے بلکہ کچھ متفرق طور پر اپنے اپنے قبائل میں تھے، کچھ حبشہ میں تھے اور کچھ ہجرت کی طاقت نہ رکھنے والے ابھی تک مکہ میں ہی قریش کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ اس قلیل نفری کے ساتھ اسلام مذاہبِ عالم کی جولانگاہ میں بازی لے جانے کے دعوے بھرتا ہوا قدم زن ہو رہا تھا۔

قریش کی ایذاء رسانیوں کا اثر مسلمانوں پر

قریش کے مظالم کی مختصر کیفیت اُوپر بیان ہو چکی ہے۔ ان مصائب پر مسلمانوں نے صبر اور برداشت کا جو اعلیٰ نمونہ دکھایا وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ صحیح روایات سے ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی شخص نے ان

مصائب سے ڈر کر ارتداد کی راہ اختیار کی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے متّبعین میں بلاشبہ ہم کو بعض مرتدین نظر آتے ہیں اور دراصل ارتداد کا سلسلہ ایک حد تک ہر نبی کے زمانہ میں پایا جاتا ہے لیکن آپؐ کی مکّی زندگی میں محض مصائب کے ڈر کی وجہ سے کسی مسلمان کے حقیقی ارتداد کا ذکر کم از کم مجھے کسی صحیح روایت میں نہیں ملا۔ اس کی یہ وجہ تھی کہ چونکہ قریش کے یہ مظالم برملا ہوتے تھے اور ہر شخص مسلمانوں کے مصائب و آلام سے آگاہ تھا اس لئے اس زمانہ میں جو بھی ایمان لاتا تھا وہ اس بات کے فیصلہ کے بعد اسلام لاتا تھا کہ مجھے حق کی راہ میں جتنی بھی تکالیف سہنی پڑیں وہ مَیں برداشت کروں گا۔ اس لیے مسلمان ہونے کے بعد یہ مصائب کسی شخص کو اسلام سے پھیر نہیں سکتے تھے مگر وقتی طور پر ان مصائب کا ایک ضرر رساں اثر ضرور تھا اور وہ یہ کہ بہت سے ایسے لوگ تھے جو ان مصائب کی وجہ سے اسلام لانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کے دلوں میں اسلام کا اثر پہنچتا تھا اور وُہ چاہتے تھے کہ شرک و بُت پرستی کی تاریکیوں سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آجائیں مگر ان مصائب کے طوفان کے سامنے ایمان کی چنگاری ان کے قلوب میں چمک چمک کر بُجھ بُجھ جاتی تھی۔ پھر بہتیرے ایسے بھی تھے جن کو ان مصائب کے منظر نے اسلام کی طرف توجہ کرنے سے ہی روک رکھا تھا۔ علاوہ ازیں قریش کے مظالم کا ایک یہ بھی اثر تھا کہ مسلمان پوری طرح اپنے عقائد کی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ اور چونکہ جتنی تبلیغ زیادہ ہو اسی نسبت سے پیغامِ حق زیادہ لوگوں تک پہنچتا ہے اور پھر اسی نسبت سے ماننے والے بھی زیادہ نکل آتے ہیں۔ اس لیے بھی مکّہ میں مُسلمانوں کی تعداد جلد جلد ترقی نہیں کر سکی۔ مُسلمان ان رُکاوٹوں کو محسوس کرتے تھے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "یا رسُول اللہ! جب ہم مشرک تھے تو ہم معزّز تھے۔ اور کوئی شخص ہماری طرف آنکھ تک نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ لیکن مسلمان ہو کر ہم کمزور و ناتواں ہوگئے ہیں اور ہمیں ذلیل ہو کر رہنا پڑتا ہے پس آپؐ ہمیں ظالموں کے مقابلہ کی اجازت دیں۔" آپؐ نے فرمایا:۔

اِنِّیْ اُمِرْتُ بِالْعَفْوِ فَلَا تُقَاتِلُوْا[1]

"مجھے ابھی تک عفو کا حکم ہے۔ اس لیے مَیں تمہیں لڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

اپنے آقا کے اس حکم پر مسلمانوں نے ہاں انہی شیر دل مسلمانوں نے جنھوں نے اس کے چند سال بعد قیصرو کسریٰ کے تخت اُلٹ کر رکھ دیئے جس صبر و رضا کے ساتھ ان مظالم کو برداشت کیا اس کی کسی قدر تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مکّہ میں مسلمانوں کا کفّار کے مقابلہ پر تلوار نہ اٹھانا اور خاموشی اور صبر کے ساتھ ان مظالم کو برداشت کرنا اس وجہ سے نہیں تھا جیسا کہ بعض مخالفین نے سمجھا ہے کہ وہ کمزور تھے اور مقابلہ کی طاقت نہ رکھتے تھے بلکہ اس لیے تھا کہ ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو عفو کا حکم تھا۔

---

[1] نسائی

اور صحابہ کو مقابلہ کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن جب اتمام حجت ہو چکا اور کفار اپنے مظالم سے باز نہ آتے بلکہ دن بدن زیادہ شوخ اور زیادہ متمرد ہوتے گئے اور انھوں نے اسلام کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کی ٹھان لی اور ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کا پیچھا نہ چھوڑا تو باوجود اس کے کہ اس وقت بھی آپؐ کے پاس عرب کے مقابلہ کے لیے قطعاً کوئی جمعیت نہ تھی آپؐ نے وہی مٹھی بھر جماعت لے کر ان کا مقابلہ کیا۔ اور چونکہ اللہ کی نصرت آپؐ کے شاملِ حال تھی آپؐ اس مقابلہ میں کامیاب ہوئے۔

ہجرت نبوئی اور اس کی علّت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے اصحاب کی ہجرت کوئی خوشی کا سفر نہ تھا جو سیر و سیاحت کی غرض سے کیا گیا ہو بلکہ یہ سفر قریش کے ان بیدردانہ مظالم کا نتیجہ تھا جن کا مسلمان سالہا سال سے تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ حتّٰی کہ آخر تنگ آکر مسلمانوں اور ان کے محبوب آقا کو وطن سے بے وطن ہونا پڑا۔ جو جو مظالم ان ابتدائی تیرہ سالوں میں مسلمانوں نے قریش مکہ اور ان کے ہم خیالوں کے ہاتھوں برداشت کئے ان کا صحیح صحیح اندازہ کرنا محال ہے۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ عرب جیسے جاہل اور آزاد ملک میں قریش جیسی وحشی اور متکبر قوم اپنی عداوت کے جوش و خروش میں جو جو مظالم کمزور و بےبس مسلمانوں پر کر سکتی تھی وہ سب اس نے کئے۔ مسلمانوں کی تذلیل کے لیے ان پر ہنسی اور مذاق اڑایا گیا۔ انکے خلاف دلآزار طعن و تشنیع اور گندی گالی گلوچ سے کام لیا گیا۔ ان کو خُدا کی عبادت سے روکا گیا اور توحید کے اعلان سے جبراً منع کیا گیا۔ ان کو اُن کے پیارے اور محبوب آقا سے الگ کر دینے کی کوشش کی گئی۔ اُن کو نہایت بے دردانہ طور پر مارا اور پیٹا گیا۔ ان میں سے بعض کو نہایت وحشیانہ طور پر قتل کیا گیا۔ ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ ان کا بائیکاٹ کر کے اُن کو بھوک اور پیاس سے ہلاک کرنے کی ٹھانی گئی۔ ان کے مال و متاع چھین لیے گئے۔ حتّٰی کہ ان کو اپنے وطن سے نکل کر بھاگنا پڑا اور جو ٹھہرے وہ سینے پر پتھر رکھ کر ٹھہرے۔ پھر ان کے آقا اور سردار کو جو انہیں اُن کی جانوں سے زیادہ عزیز تھا سخت سے سخت دُکھ دیئے گئے اور برملا بدنی تکالیف پہنچائی گئیں اور اس پر پتھر برسائے گئے حتّٰی کہ ان کا بدن خون سے تربتر ہو گیا اور آخر اس کے قتل کا منصوبہ کیا گیا۔ اور منصوبہ بھی ایسا کہ جس میں سب قبائل قریش شریک تھے۔ اور ہر قبیلہ اس کے مقدس خون سے اپنے ناپاک ہاتھ رنگنے کے واسطے تیار ہو گیا اور اسلام کے پودہ کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کی ٹھان لی گئی۔ تو کیا ان مظالم کے نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابہؓ کی ہجرت کوئی معمولی سفر تھا کہ یونہی رائیگاں جاتا اور خدائے غیور کی غیرت جوش میں نہ آتی؟ نہیں بلکہ ہجرت میں خدا کی طرف سے یہ صاف اشارہ تھا کہ اب قریش کے مظالم کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ ظالم اپنی کیفرِ کردار کو پہنچے۔

خاتمہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ثُمَّ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کہ سیرۃ خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ خاکسار راقم الحروف خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر بجا لاتا ہے کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اس کے پُورا کرنے کی توفیق دی۔ اب اسے اللہ! تُو اپنے فضل سے ایسا کر کہ تیرے بندے اِسے پڑھیں اور اس سے فائدہ اٹھاویں اور تیرے برگزیدہ رسُولؐ کے پاک نمونہ پر چل کر تیری رضا حاصل کریں۔ اور اے میرے مولا! تُو مجھے بھی توفیق عطا کر کہ مَیں تیری رضا کے ماتحت اس کتاب کے باقی حِصّوں کی تکمیل کر سکوں اور اپنے فضل کو میرے شاملِ حال رکھ ٭

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ اٰمِیْن

راقم آثم

مرزا بشیر احمد

سیرتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

حصّہ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ۔۔ و علی عبدہ المسیح الموعود

عرض حال

جلد دوم

سیرۃ خاتم النبیینؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل دیباچہ تو تکمیل تصنیف کے وقت ہی لکھا جاسکے گا مگر اس جگہ چند الفاظ حصہ دوم کے متعلق مخصوص طور پر عرض کرنے ضروری ہیں ابتداءً ۱۹۱۹ء میں جب میں نے بطور خود رسالہ ریویو آف ریلیجنز قادیان کے لئے سیرۃ کی تصنیف کا کام شروع کیا تو اس وقت اس کی غرض وغایت بہت محدود تھی۔ چنانچہ سیرۃ کا حصہ اول جو ۱۹۲۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا وہ اسی محدود غرض وغایت کے ماتحت تھا جو صرف یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سادہ اور مختصر سوانح عمری میسر آجاوے۔ کوئی علمی تحقیق یا محققانہ تبصرے اس وقت میرے مدنظر نہ تھے۔ چنانچہ اسی غرض سے حصہ اول میں حوالے تک درج نہیں کئے گئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی امام جماعت احمدیہ قادیان کو اس کام کی تکمیل کی طرف توجہ پیدا ہوئی اور آپ نے ۱۹۲۹ء کے اوائل میں مجھے سیرت کے حصہ دوم کی تیاری کے متعلق ارشاد فرمایا تو ساتھ ہی یہ ہدایت فرمائی کہ ہر قسم کے طبقہ کو مدنظر رکھ کر اس حصہ میں حصہ اوّل کی نسبت زیادہ مستقل تحقیق و تدقیق سے کام لیا جاوے لیکن یہ کوشش کی جاوے کہ کتاب کا حجم حتی الوسع زیادہ نہ ہونے پائے۔

جس حد تک میں اس ہدایت کی تعمیل کر سکا ہوں وہ اب سیرۃ خاتم النبیینؐ صلی اللہ علیہ وسلم حصہ دوم کی صورت میں ناظرین کے سامنے ہے۔ اگر اس کے بعض حصوں میں میں نے حد مناسب سے زیادہ طوالت سے کام لیا ہے تو وہ غالباً میرے اس طبعی نقص کی وجہ سے ہے کہ میں تحریر میں اختصار پر زیادہ قابو نہیں رکھ سکتا اور میں ڈرتا ہوں کہ شاید اس جہت سے میں حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ بنصرہ کی ہدایت پر پوری طرح عمل نہیں کر سکا۔

تحقیق و تدقیق کی جہت سے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میدان اس قدر وسیع ہے کہ اگر اسے ایک نہ ختم ہونے والا میدان کہہ سکیں تو بے جانہ ہوگا۔ میرے اپنے احساس کا یہ حال ہے کہ جب بھی میں نے سیرت کے مسودے کی نظر ثانی کی ہے مجھے اس میں قریباً ہمیشہ ہی تحقیق کے لئے ایک نیا دروازہ نظر آیا ہے اور بعض حصے تو یقیناً ایسے ہیں کہ ان میں مزید تحقیق کی ضرورت عیاں ہے مگر فی الحال جو کچھ بھی ہے وہ ہدیہ ناظرین ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اسے قبولیت کا شرف عطا کرے اور اس کے ذریعہ سے اس مقصد کو پورا فرمائے جو اس کی تصنیف کی اصل غرض وغایت ہے۔ اللھم آمین۔

حصہ دوم کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ حصہ اوّل کی نسبت اس حصہ میں چار زائد خصوصیات ہیں: اوّل زیادہ تحقیق و تدقیق۔ دوم زیادہ تفصیل و تشریح۔ سوم بہت سے علمی اور ضمنی مسائل کی بحث۔ چہارم حوالہ جات کا اندراج۔ ان

خصوصیات کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اگر اور جب حصہ اول کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو اسے ان مزید خصوصیات کی روشنی میں نظرثانی کرنے کے بعد شائع کیا جاوے ورنہ یہ دونوں حصے بالکل غیر مربوط نظر آئیں گے۔

جن کتب سے میں نے حصہ دوم کی تیاری میں استفادہ کیا ہے ان کا اندازہ صرف ان اسماء سے نہیں لگ سکتا جو حوالہ کی صورت میں حاشیہ میں درج ہوئے ہیں۔ بالعموم متأخرین کی کتب کے حوالے درج نہیں کئے گئے کیونکہ جب بھی مجھے ان کتب میں کوئی نئی یا مفید بات ملی ہے تو میں نے بجائے ان کتب کا حوالہ دینے کے ان کے ماخذ کی طرف رجوع کر کے اصل کتاب کا حوالہ درج کر دیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اس وجہ سے متاخرین کی کتب کی طرف سے میرے جذبہ تشکر میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔

ممکن ہے کہ بعض طبائع میں یہ سوال پیدا ہو کہ مولانا شبلی کی سیرت کے ہوتے ہوئے اس تصنیف کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا اصل جواب تو ہر دو کتب کے مطالعہ سے ہی مل سکتا ہے' لیکن میں اس قدر عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے سیرۃ النبیؐ کی خوبیوں کا اعتراف ہے اور میں نے بعض جگہ اس سے اور دارالمصنفین کی دوسری تصنیفات سے فائدہ بھی اٹھایا ہے مگر تحقیق کے خزانے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اور پھر ہر شخص کا نقطۂ نظر اور اسلوب بیان بھی جدا ہوتا ہے اس لئے میری یہ ناچیز کوشش کسی کے ناگوار خاطر نہیں ہونی چاہئے بلکہ اگر کل کو کوئی اور شخص اپنی کوئی جدید تحقیق یا کوئی جدید نقطۂ نظر اور جدید اسلوب بیان دنیا کے سامنے پیش کرے تو یقیناً" اسلامی لٹریچر کی یہ ایک مزید خوش قسمتی ہوگی۔ ولکل امرء مانوی وانما الاعمال بالنیات۔

میرے لئے اس جگہ ان بزرگان و احباب کرام کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں کسی نہ کسی رنگ میں امداد فرمائی ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے کمال مہربانی سے اپنا نہایت قیمتی وقت خرچ کر کے حصہ دوم کے مسودے کا بیشتر حصہ ملاحظہ فرمایا اور وقتاً" فوقتاً" اپنے بیش قیمت ارشادات سے مستفیض ہونے کا موقعہ عطا کیا۔ حضرت مولوی شیر علی صاحب بی۔ اے ناظر تالیف و تصنیف جماعت احمدیہ قادیان نے قریباً" ساری کاپیاں ملاحظہ کیں اور مجھے ان کی تصحیح میں امداد دینے کے علاوہ بعض جگہ مفید مشورے بھی دیئے۔ مولوی عبدالرحیم صاحب درد ایم۔ اے سابق مبلغ اسلام لنڈن نے مسودے کے بعض خاص خاص حصے دیکھے اور مجھے اپنی قیمتی رائے سے مستفید کیا۔ مولوی ارجمند خان صاحب مولوی فاضل پروفیسر جامعہ احمدیہ قادیان نے کاپیوں کی درستی میں بہت قابل قدر امداد دی۔ فجزاھم اللہ خیراً۔ اسی طرح مینیجر بکڈپو تالیف و اشاعت قادیان اور مینیجر اللہ بخش سٹیم پریس قادیان اور کاتب کتاب ہذا بھی اپنی ہمدردانہ توجہ کی وجہ سے قابل شکر ہیں۔

خاکسار

مرزا بشیر احمد

کارکن نظارت تالیف و تصنیف جماعت احمدیہ قادیان

۳۱/ ۳/ ۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

مدینہ کا ابتدائی قیام اور حکومتِ اسلامی کی تاسیس

مدینہ کے حالات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ہجرت کا بیان کتاب کے حصّہ اوّل میں گذر چکا ہے اب ہجرت کے بعد سے آپ کی مدنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن بیشتر اس کے کہ ہم آپ کی مدنی زندگی کا بیان شروع کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود مدینہ اور اُس کی آبادی کا مختصر حال بیان کر دیا جاوے، کیونکہ اس کے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے بعض حالات کا پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے قبل مدینہ کا شہر یثرب کے نام سے مشہور تھا لیکن آپ کی ہجرت کے بعد لوگ اسے مدینۃ الرسولؐ (یعنی خدا کے رسُول کا شہر) کہہ کر پکارنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ اس کا نام صرف مدینہ مشہور ہو گیا۔ مدینہ عرب کے علاقہ حجاز کا قدیم شہر ہے جو مکہ سے شمال کی طرف دو ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر بحر احمر کے مشرقی ساحل سے قریباً پچاس میل مشرق کی طرف ہٹ کر واقع ہے۔ گویا مدینہ اس قدیم مگر صحرائی تجارتی راستے کے قرب میں آباد ہے جو مکہ سے شام کی طرف جاتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مکہ اور شام کے درمیان آنے جانے والے تاجر بعض اوقات راستے سے کچھ ہٹ کر مدینہ میں بھی قیام کرتے جاتے تھے اور اس لیے مکہ اور مدینہ کے بہت سے لوگ آپس میں روشناس تھے اور بعض تو ایک دُوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی رکھتے تھے۔

جگہ کے لحاظ سے مدینہ کو ایک وادی کہنا چاہیئے جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی اور انہی پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی اُحد تھی جہاں بعد میں مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے درمیان ایک نہایت خطرناک جنگ وقوع میں آئی۔ عرب کے دُوسرے مقامات کے مقابلہ میں مدینہ میں بارش عموماً خاصی ہو جاتی ہے اور زمین بھی ویسی ریتلی اور ناقص نہیں جو عموماً عرب کے دُوسرے حصوں میں پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ

کے باشندے قدیم زمانہ سے عموماً زراعت پیشہ رہے ہیں۔ مدینہ میں گرمی شدت کی پڑتی ہے اور سرما میں سردی بھی بہت تیز ہوتی ہے اور جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں مدینہ میں ملیریا وغیرہ کی وبا بھی بہت پڑتی تھی اور لوگ بخار سے سخت تکلیف اُٹھاتے تھے۔ چنانچہ جب شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب مدینہ میں ہجرت کر کے آئے تو بوجہ آب و ہوا کی تبدیلی کے انہوں نے بہت تکلیف اُٹھائی اور بہت سے مُسلمان بخار میں مبتلا ہوگئے اور ان کی صحتوں کو بہت نقصان پہنچا چنانچہ احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وُہ دُعا مروی ہے جو آپؐ نے مُسلمانوں کی اس تکلیف کو دیکھ کر خدا کے حضور کی اور جس کے نتیجہ میں خدا نے مُسلمانوں کو اس تکلیف سے نجات دی اور مدینہ کی فضا ایک بڑی حد تک وبائی جراثیم سے پاک ہوگئی [1]

اس زمانہ میں مدینہ کی آبادی اکٹھی نہیں تھی بلکہ کسی قدر پھیلی ہوئی تھی اور ہر قوم الگ الگ حصّوں میں آباد تھی اور خود حفاظتی کے لیے سب نے اپنے اپنے واسطے چھوٹے چھوٹے قلعے سے بنا رکھے تھے۔ پُرانی روایات سے پتہ لگتا ہے کہ یثرب میں سب سے پہلے آباد ہونے والے لوگ عمالیق قوم کے آدمی تھے جنھوں نے وہاں کھجوروں کے باغات لگائے اور چھوٹے چھوٹے قلعے تیار کئے۔ ان کے بعد یہودی لوگ آباد ہوئے۔ ان یہود کے متعلق روایات میں اختلاف ہے کہ وُہ نسلاً عرب تھے یا کہ باہر سے آئے تھے۔ مگر عام مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ وُہ زیادہ تر بنی اسرائیل تھے جو اپنے وطن سے نکل کر عرب میں آکر آباد ہوگئے تھے اور پھر بعد میں آہستہ آہستہ عرب کے بعض اصلی باشندے بھی ان کا مذہب اختیار کر کے ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ بہر حال عمالیق کے بعد مدینہ میں یہود آکر آباد ہوئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ عمالیق کو نیست و نابود یا جلا وطن کر کے ان کی جگہ خود لے لی۔ یہ یہود تین بڑے قبائل میں منقسم تھے یعنی بنو قینقاع۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ تینوں قبائل شروع میں عموماً بہت اتفاق و اتحاد کے ساتھ رہتے تھے۔ ان یہود نے بھی اس زمانہ کے دستور کے مطابق اپنی رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے قلعے تیار کئے۔ جو ایک دُوسرے سے ملحق نہ تھے بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مدینہ کے آس پاس پھیلے ہوتے تھے۔ یہود کا پیشہ عموماً تجارت تھا، مگر ان میں سے بعض زراعت کا شغل بھی رکھتے تھے۔ بنو قینقاع زیادہ تر صنّاعی کا کام کرتے تھے۔ یہود چونکہ اپنے اردگرد کے لوگوں کی نسبت زیادہ مہذب و متمدن تھے اور تعلیم میں بھی آگے تھے۔ اس لیے انہوں نے مدینہ کے گرد و نواح میں اپنا اثر پیدا کرنا شروع کیا اور جلد ہی بہت اقتدار حاصل کر لیا۔ وہ اسی اقتدار کی حالت میں تھے کہ یمن کی طرف سے بنو قحطان کے دو قبیلے جو اوس اور خزرج کے نام سے پکارے جاتے تھے مدینہ میں آکر آباد ہوئے۔ یہ قبائل ایک شخص حارثہ بن ثعلبہ کے دو بیٹوں اوس اور خزرج کی اولاد تھے اور آپس میں بہت اتفاق و محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ شروع شروع میں تو وُہ یہود سے بالکل الگ تھلگ رہے لیکن آخر یہود کے زور و اقتدار کی وجہ سے اُن کے حلیف بن گئے۔

---

[1] بخاری ابواب الہجرت۔ ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۱۵۔ و خمیس جلد ۱ صفحہ ۳۹۵۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ اوس وخزرج نے بھی پھیلنا اور زور پکڑنا شروع کیا اور کچھ کچھ یہود کی ہمسری کا دم بھرنے لگے۔ لیکن چونکہ یہودی لوگ زیادہ ہوشیار اور زیادہ متمدن اور زیادہ بااثر ہونے کے علاوہ تعلیم اور امورِ مذہبی میں بھی زیادہ دخل رکھتے تھے اور اوس وخزرج محض بُت پرست اور عموماً جاہل تھے اس لیے اوس وخزرج پر یہود کا ایک گہرا اثر تھا حتیٰ کہ جب کبھی کسی اوسی یا خزرجی شخص کے کوئی نرینہ اولاد نہ ہوتی تو وہ یہ منت مانتا تھا کہ اگر میرے گھر لڑکا پیدا ہوا تو میں اُسے یہودی بناؤں گا؛ چنانچہ اسی طرح کئی لوگ یہودی بن گئے اور ان کا زور دن بدن بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ یہودیوں نے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اوس وخزرج پر طرح طرح کے مظالم شروع کر دیئے جس کے نتیجہ میں یہود اور اوس وخزرج کے تعلقات بہت خراب ہو گئے اور بالآخر موخرالذکر قبائل نے تنگ آکر ریاست غسان کے فرمانروا کی امداد سے یہود کے تمام سرآوردہ لوگوں کو ہوشیاری سے قتل کروا دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کا زور ٹوٹ گیا اور اوس وخزرج شہر میں طاقت پکڑ گئے۔ لیکن یہود کے کمزور ہو جانے کا آہستہ آہستہ یہ اثر بھی ظاہر ہونے لگا کہ اوس وخزرج جو اس وقت تک یہود کے مقابلہ کی وجہ سے آپس میں اتحاد واتفاق کے ساتھ رہتے تھے اب آپس میں لڑنے اور جھگڑنے لگ گئے اور بالآخر یہ خانہ جنگیاں ایسی وسیع اور خطرناک صورت پکڑ گئیں کہ دونوں قومیں آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھ سے کٹ کٹ کر بہت کمزور ہو گئیں اور یہود کو جو غالباً اس خانہ جنگی کی آگ کو بھڑکانے والے تھے پھر طاقت پکڑ جانے کا موقعہ مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اوس وخزرج نے پھر یہودی قبائل کی امداد کا سہارا ڈھونڈا اور ایک دوسرے کے خلاف ان کی مدد چاہی؛ چنانچہ بنو قینقاع قبیلہ خزرج کے حلیف بن گئے اور بنو نضیر اور بنو قریظہ قبیلہ اوس کے اور اس طرح سارا شہر ایک خطرناک خانہ جنگی کی آگ سے شعلہ بار ہو گیا۔

اہلِ یثرب اسی خانہ جنگی کی حالت میں تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے حکم پا کر مکہ میں نبوت کا دعویٰ کیا؛ چنانچہ اوس وخزرج کے درمیان آخری جنگ جو تاریخ عرب میں جنگِ بعاث کے نام سے مشہور ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت میں ہی ہوئی تھی جب کہ آپؐ مکہ میں مقیم تھے۔ اس لڑائی میں اس قدر خونریزی ہوئی اور فریقین کے اتنے آدمی مارے گئے کہ اوس اور خزرج ناچار آپس میں صلح کرنے پر مجبور ہو گئے؛ چنانچہ دونوں قبیلوں نے آپس میں مشورہ کر کے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ چند شرائط کے ماتحت عبداللہ بن ابی بن سلول کو جو قبیلہ خزرج کا ایک نامور اور ہوشیار رئیس تھا اپنا متحدہ سردار تسلیم کر لیا جاوے اور عبداللہ کی باقاعدہ تاجپوشی کی تیاری ہونے لگی۔ مگر عبداللہ کا سر ہنوز قبائل اوس وخزرج کی سرداری کے تاج سے مزین نہ ہونے پایا تھا کہ اسلام کی آواز مدینہ تک پہنچ گئی اور حالات نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن ابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کو ایک ایسے رقیب کی آمد سمجھا جس نے اس سے اوس اور خزرج کی سرداری کا مجوزہ تاج چھین لیا؛ چنانچہ اس کے دل میں حسد وعداوت کی آگ سُلگنے لگ گئی اور چونکہ وہ اتنی جرأت نہیں رکھتا تھا کہ اپنے قبیلہ والوں کے خلاف ہو کر کھلم کھلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کھڑا ہو سکے اس لیے اُس نے برملا طور پر مخالفت کرنے کی بجائے خفیہ عداوت اور ریشہ دوانی کا طریق شروع کر دیا اور جنگِ بدر کے بعد اس نے بظاہر اسلام

بھی قبول کر لیا، مگر اس کے دل کا یہ مرض کم نہ ہوا اور آخر اسی حالت میں اُس نے جان دی[1]

نزولِ قبا، ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء

مدینہ اور اُس کی آبادی کے یہ مختصر حالات بیان کرنے کے بعد ہم اپنے اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب انصار کے کانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی آواز پہنچی تو مدینہ کا میدان تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھا اور لوگ جلدی جلدی اپنے ہتھیاروں کو دُرست کر کے نہایت شوق کے ساتھ اس سمت میں لپکے جدھر سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے۔ یہ وقت بھی ایک عجیب وقت تھا۔ سرورِ عالم یعنی خدا کا وہ مقدس فرستادہ جس کے وجود میں نبوت و رسالت کے پیغام نے اپنے کمال کو پہنچنا تھا اپنے عزیز و اقارب کے مظالم سے تنگ آکر اپنے وطن سے نکلتا ہے اور ایک ایسی بستی کی طرف آتا ہے جو دنیوی رشتہ کے لحاظ سے گویا ایک غیروں کی بستی ہے مگر خدا انہی غیروں کے دلوں میں وہ محبت ڈال دیتا ہے کہ جس کے سامنے خون کے رشتے کی محبت بالکل ہیچ نظر آتی ہے اور آج سے مدینہ کے اوس و خزرج کی قسمت اسلام کے نوشتۂ تقدیر کے ساتھ اس طرح مخلوط طور پر بُن دی جاتی ہے کہ ناممکن ہے کہ دُنیا کا کوئی مؤرخ ایک کے ذکر سے دُوسرے کے ذکر کو جُدا کر سکے۔ بیشک اسلام نے عرب کے ان بادیہ نشینوں کو جن کے بیشتر اوقات شراب اور زنا اور جوئے اور آپس کی لڑائی میں گذرتے تھے ایک تاریک ترین قعرِ مذلت سے اُٹھایا اور ایک روشن ترین اوجِ سعادت پر پہنچا دیا اور اسلام پر کسی کا احسان نہیں ہے بلکہ ہر ایک مسلمان کی گردن اسلام کے احسان کے نیچے ہے، لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان ابتدائی فدایانِ اسلام نے جس جاں نثارانہ قربانی اور جس والہانہ عشق و محبت سے اسلام کے نازک اور کم سن پودے کو اپنے خون کے پانی سے سینچا اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ مگر مجھے اپنے مضمون کی طرف لوٹنا چاہیے۔ انصار کی نظریں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑیں تو ان کے چہرے خوشی سے تمتما اُٹھے اور انہوں نے ایسا محسوس کیا کہ گویا دنیا و آخرت کے سارے انعامات انہیں آپؐ کے وجود میں حاصل ہو گئے ہیں؛ چنانچہ بخاری میں براء بن عازب کی روایت ہے کہ جو خوشی انصار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لاتے کے وقت پہنچی ویسی خوشی کی حالت میں مَیں نے انہیں کبھی کسی اور موقعہ پر نہیں دیکھا۔ ترمذی اور ابنِ ماجہ نے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ہم نے یوں محسوس کیا کہ ہمارے لیے مدینہ روشن ہو گیا اور جب آپؐ فوت ہوئے تو اس دن سے زیادہ تاریک ہمیں مدینہ کا شہر کبھی نظر نہیں آیا[2]

استقبال کرنے والوں کی ملاقات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی خیال کے ماتحت جس کا ذکر تاریخ میں نہیں آیا سیدھے شہر کے اندر داخل نہیں ہوئے بلکہ دائیں طرف ہٹ کر مدینہ کی بالائی آبادی میں جو اصل شہر

---

[1] مدینہ اور اس کی آبادی کے حالات کتاب معجم البلدان اور الروض الانف اور دیگر کتب تاریخ و جغرافیہ سے ماخوذ ہیں۔
[2] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۳۵۹۔

سے دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر تھی اور جس کا نام قباء تھا تشریف لے گئے اس جگہ انصار کے بعض خاندان آباد تھے جن میں زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا اور اس زمانہ میں اس خاندان کے رئیس کلثوم بن الہدم تھے۔ قباء کے انصار نے آپؐ کا نہایت پُرتپاک استقبال کیا اور آپؐ کلثوم بن الہدم کے مکان پر فروکش ہو گئے۔ وہ مہاجرین جو آپؐ سے پہلے مدینہ پہنچ گئے ہوئے تھے وہ بھی اس وقت تک زیادہ تر قباء میں کلثوم بن الہدم اور دُوسرے معززین انصار کے پاس مقیم تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے سب سے پہلے قباء میں قیام کرنا پسند فرمایا۔ ایک آن کی آن میں سارے مدینہ میں آپؐ کی آمد کی خبر پھیل گئی اور تمام مسلمان جوشِ مسرت میں بیتاب ہو کر جوق در جوق آپؐ کی فرودگاہ پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اس وقت ایک عجیب لطیفہ ہوا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کی سادگی کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ جن اہالیانِ مدینہ نے آپؐ کو اس سے پہلے نہیں دیکھا ہوا تھا ان میں سے بعض اپنے خیال میں حضرت ابوبکرؓ کو ہی رسول اللہ سمجھتے رہے مگر جب مجلس میں دُھوپ آ گئی اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنی چادر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کیا اُس وقت اُن کی یہ غلط فہمی دُور ہوئی[1] اس غلط فہمی کی وجہ یہ تھی کہ باوجود عمر میں چھوٹا ہونے کے حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت زیادہ بوڑھے نظر آتے تھے اور بمقابلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے اور چونکہ مجلس میں نشست کی کوئی خاص ترتیب بھی نہیں تھی اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی ممتاز جگہ معین تھی اس لیے ناواقف لوگوں کو دھوکا لگ گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزولِ قباء یعنی تکمیلِ سفرِ ہجرت کی تاریخ کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ عام مورخین کا خیال ہے کہ وہ پیر کا دن اور ربیع الاوّل ۱۴ سنہ نبوی کی بارہ تاریخ تھی۔ مگر بعض محققین نے آٹھ تاریخ لکھی ہے۔ عیسوی سنہ کے شمار سے یہ تاریخ بعض حساب دانوں کے خیال کے مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی[2]۔ اسلامی سن کا شمار اسی واقعہ ہجرت سے شروع ہوتا ہے مگر سال کی ابتداء ربیع الاوّل سے نہیں ہوتی جو کہ ہجرت کا مہینہ ہے بلکہ محرم سے ہوتی ہے جو کہ قمری مہینوں کا پہلا ماہ سمجھا جاتا ہے اور اس طرح پہلا سال ہجرت کا دراصل بارہ ماہ کا نہیں تھا بلکہ نو ماہ اور کچھ دن کا تھا۔ اس بارہ میں مورخین میں اختلاف ہے کہ اسلام میں ہجرت کے سن کا حساب ابتداءً کس کے عہد میں شروع ہوا۔ حاکم نے اکلیل میں روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہجرت کے بعد اس کا حکم دیا تھا[3] لیکن دُوسری روایات کی بنا پر جمہور مورخین کا یہ خیال ہے اور یہی دُرست معلوم ہوتا ہے کہ یہ حساب حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں شروع ہوا تھا[4] واللہ اعلم۔

مورخین لکھتے ہیں کہ پہلا کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قباء میں کیا وہ ایک مسجد کی تعمیر تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اس مسجد کی بنیاد رکھی اور صحابہ نے مل کر مزدوروں اور معماروں کا کام کیا۔ اور

---

[1] بخاری باب الہجرت۔

[2] توفیقات الہامیہ محمد مختار پاشا مصری۔ [3] زرقانی۔ [4] طبری۔

چند دن کی محنت سے یہ مسجد تیار ہوگئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسجد سے آخر وقت تک بہت محبت رہی[1] چنانچہ مدینہ میں چلے جانے کے بعد آپؐ ہر ہفتہ قباء تشریف لے جاتے اور اس مسجد میں نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ قرآن شریف میں جس مسجد کے متعلق اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ کے الفاظ بیان ہوئے ہیں وہ یہی مسجد قباء ہے۔ اور اس میں شک نہیں ہے کہ گو اس سے پہلے بھی بعض مسجدیں مسلمانوں نے بنائی تھیں، لیکن یقیناً قباء کی مسجد اسلام میں وہ پہلی مسجد تھی جس کی بناء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے تکمیل ہجرت کے بعد پہلے دن رکھی گئی اور جسے مسلمانوں نے گویا ایک قومی عبادت گاہ کے طور پر تعمیر کیا۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرتے ہوئے اپنی جگہ حضرت علیؓ کو چھوڑ آئے تھے اور ان کو تاکید فرما آئے تھے کہ امانتیں وغیرہ واپس کر کے بہت جلد مدینہ پہنچ جائیں، چنانچہ ابھی آپؐ کو قباء میں تشریف لائے صرف تین دن ہی ہوئے تھے کہ حضرت علیؓ بھی مع الخیر قباء میں پہنچ گئے لیکن ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت مکہ میں ہی تھے۔

ورودِ مدینہ اور جمعہ کی پہلی نماز

غالباً ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قباء میں ہی مقیم تھے کہ مسلمانانِ مدینہ میں اس بات کے متعلق گفتگو شروع ہوئی کہ مدینہ میں آپؐ کس کے ہاں قیام فرما ہوں گے۔ ہر ایک خاندان یہ چاہتا تھا کہ اُسے آپؐ کی میزبانی کا فخر حاصل ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ اختلاف پہنچا تو آپؐ نے فرمایا کہ مَیں عبدالمطلب کے ننھیال بنو نجار کے ہاں ٹھہروں گا۔[2] یہ ایک نہایت حکیمانہ فیصلہ تھا جس سے آپؐ نے انصار کے مختلف قبائل میں ناواجب جذبات رقابت کے پیدا ہونے کا سدباب فرما دیا اور آپؐ کے اس ارشاد پر سب کی تسلی ہوگئی۔ کیونکہ گو ایمان و اخلاص میں سب ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر تھے لیکن بنو نجار کو یہ ایک مزید اور مسلّم خصوصیت حاصل تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کی والدہ سلمٰی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

قباء میں زائد از دس دن[3] کے قیام کے بعد جمعہ کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے اندرونی حصہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انصار و مہاجرین کی ایک بڑی جماعت آپؐ کے ساتھ تھی۔ آپؐ ایک اُونٹنی پر سوار تھے اور حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے پیچھے تھے۔ یہ قافلہ آہستہ آہستہ شہر کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ راستہ میں ہی نماز جمعہ کا وقت آگیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو سالم بن عوف کے محلہ میں ٹھہر کر صحابہ کے سامنے خطبہ دیا اور جمعہ[4] کی نماز ادا کی۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ گو اس سے پہلے جمعہ کا آغاز ہو چکا تھا[5] مگر یہ پہلا جمعہ تھا جو آپؐ نے خود ادا کیا۔[6] اور اس کے بعد سے جمعہ کی نماز کا طریق باقاعدہ جاری ہوگیا۔ دراصل جمعہ نمازوں کی عید ہے جیسا کہ روزوں کی عید عیدالفطر اور حج کی عید عیدالاضحٰی ہے اور اسی لیے شریعتِ اسلامی میں جمعہ کی نماز کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اس نماز میں امام

---

[1] توبہ: ۱۰۸۔ [2] مسلم باب الہجرت [3] بخاری باب الہجرت عن عائشہؓ۔

[4] ابوداؤد باب الجمعہ فی القریٰ [5] ابن ہشام ذکر ہجرت۔

ایک خُطبہ دیتا ہے جس میں حاضرالوقت مسائل پر تقریر ہوتی ہے اور حاضرین کو ایمان و اعمال کے متعلق مناسب نصائح کی جاتی ہیں اور اس کے بعد دُو رکعت نماز فرض ادا کی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی حکم ہے کہ حتی الوسع ہر مُسلمان کو چاہیئے کہ جمعہ کے دن غسل کرے اور کپڑے بدلے اور خوشبُو لگائے اور خُطبہ شروع ہونے سے قبل مسجد میں پہنچ جاوے۔ جس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پہلا جمعہ ادا کیا اس جگہ اب ایک مسجد ہے جسے اس جمعہ کی یادگار میں مسجد الجمعہ کہتے ہیں۔[1]

جمعہ سے فارغ ہوکر آپؐ کا قافلہ پھر آہستہ آہستہ آگے روانہ ہوا۔ راستہ میں آپؐ مسلمانوں کے گھروں کے پاس سے گذرتے تھے تو وہ جوشِ محبت میں بڑھ بڑھ کر عرض کرتے تھے "یا رسُول اللہ! یہ ہمارا گھر یہ ہمارا مال وجان حاضر ہے اور ہمارے پاس حفاظت کا سامان بھی ہے آپؐ ہمارے پاس تشریف فرما ہوں۔" آپؐ ان کے لیے دُعائے خیر فرماتے اور آہستہ آہستہ شہر کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ مُسلمان عورتوں اور لڑکیوں نے خوشی کے جوش میں اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ چڑھ کر گانا شروع کیا۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَىٰ لِلّٰهِ دَاعٍ[2]

یعنی آج ہم پر کوہِ وداع کی گھاٹیوں سے چودھویں کے چاند نے طلوع کیا ہے۔ اس لیے اب ہم پر ہمیشہ کے لیے خدا کا شکر واجب ہوگیا ہے۔" مُسلمانوں کے بچے مدینہ کی گلی کوچوں میں گاتے پھرتے تھے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم آگئے۔ خدا کے رسُولؐ آگئے۔" اور مدینہ کے حبشی غلام آپؐ کی تشریف آوری کی خوشی میں تلوار کے کرتب دکھاتے پھرتے تھے۔ جب آپؐ شہر کے اندر داخل ہوتے تو ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ آپؐ اس کے پاس قیام فرمائیں اور ہر شخص بڑھ بڑھ کر اپنی خدمت پیش کرتا تھا۔ آپؐ سب کے ساتھ محبت کا کلام فرماتے اور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ آپؐ کی ناقہ بنو نجار کے محلہ میں پہنچی اس جگہ بنو نجار کے لوگ ہتھیاروں سے سجے ہوئے صف بند ہوکر آپؐ کے استقبال کے لیے کھڑے تھے اور قبیلہ کی لڑکیاں دُفیں بجا بجا کر یہ شعر گا رہی تھیں۔

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي نَجَّارِ يَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارِ

یعنی ہم قبیلہ بنو نجار کی لڑکیاں ہیں اور ہم کیا ہی خوش قسمت ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے محلہ میں ٹھہرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔" بنو نجار میں پہنچ کر پھر یہ سوال درپیش تھا کہ آپؐ کس شخص کے ہاں مہمان ٹھہریں۔ قبیلہ کا ہر شخص خواہشمند تھا کہ اسی کو یہ فخر حاصل ہو، بلکہ بعض لوگ تو جوشِ محبت میں آپؐ کی اونٹنی کی باگوں پر ہاتھ ڈال دیتے تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا "میری اُونٹنی کو چھوڑ دو کہ یہ اس وقت مامور ہے۔" یعنی جہاں

---

[1] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۳۵۹ مطبوعہ مصر بمطبع الازہریۃ المصریۃ ۱۳۲۵ھ۔

[2] وداع ایک پہاڑی یا بعض روایتوں کی رُو سے وہ مختلف الجہت پہاڑیوں کا نام ہے جہاں مدینہ والے اپنے مسافروں کو رخصت کیا کرتے تھے اور باہر سے آنیوالوں کا استقبال بھی یہیں کیا جاتا تھا۔

خدا کا منشاء ہوگا وہاں یہ خود بیٹھ جائے گی۔ اور یہ کہتے ہوئے آپ نے بھی اس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ اُونٹنی آگے بڑھی اور تھوڑی دُور خراماں خراماں چلتی ہوئی جب اس جگہ میں پہنچی جہاں بعد میں مسجدِ نبویؐ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرات تعمیر ہوئے اور جو اس وقت مدینہ کے دو بچوں کی افتادہ زمین تھی تو بیٹھ گئی، لیکن فوراً ہی پھر اُٹھی اور آگے کی طرف چلنے لگی۔ مگر چند قدم چل کر پھر لوٹ آئی اور اُسی جگہ جہاں پہلے بیٹھی تھی دوبارہ بیٹھ گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھٰذَا اِنْ شَآءَ اللّٰہُ الْمَنْزِلُ یعنی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے منشاء میں یہی ہماری قیام گاہ ہے[1] اور پھر خدا سے دُعا مانگتے ہوئے اُونٹنی سے نیچے اُتر آئے اور دریافت فرمایا کہ اپنے آدمیوں میں سے یہاں سے قریب ترین گھر کس کا ہے ابو ایوب انصاری فوراً لپک کر آگے ہو گئے اور عرض کیا "یا رسُول اللہ! میرا گھر ہے اور یہ میرا دروازہ ہے۔ تشریف لے چلیئے" آپ نے فرمایا "اچھا جاؤ اور ہمارے لیے کوئی ٹھہرنے کی جگہ تیار کرو"[2]

قیام دارِ ابی ایُّوبؓ

ابو ایوب انصاری فوراً اپنے مکان کو ٹھیک ٹھاک کر کے آگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ اندر تشریف لے گئے۔ یہ مکان دو منزلہ تھا۔ ابو ایوب چاہتے تھے کہ آپ اوپر کی منزل میں قیام فرمائیں، لیکن آپ نے اس خیال سے کہ ملاقات کے لیے آنے جانے والے لوگوں کو آسانی رہے نچلی منزل کو پسند فرمایا اور وہاں فروکش ہو گئے۔ رات ہوئی تو ابو ایوب اور ان کی بیوی کو ساری رات اس خیال سے نیند نہیں آئی کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے ہیں اور ہم آپ کے اوپر ہیں اور مزید اتفاق یہ ہوگیا کہ رات کو چھت پر ایک پانی کا برتن ٹوٹ گیا اور ابو ایوب نے اس ڈر سے کہ پانی کا کوئی قطرہ نیچے نہ ٹپک جاوے۔ جلدی سے اپنا لحاف پانی پر گرا کر اُسے خشک کر دیا۔ صبح ہوئی تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور بکمال اصرار آپ کی خدمت میں اوپر کی منزل میں تشریف لے چلنے کی درخواست کی آپ نے پہلے تو تامل کیا، لیکن بالآخر ابو ایوب کے اصرار کو دیکھ کر رضامند ہو گئے۔ اس مکان میں آپ نے سات ماہ تک یا ابنِ اسحاق کی روایت کی رُو سے ماہِ صفر سنہ ۲ ہجری تک قیام فرمایا۔ گویا جب تک مسجدِ نبوی اور اس کے ساتھ والے حجرے تیار نہیں ہو گئے آپ اسی جگہ مقیم رہے۔ ابو ایوب آپ کی خدمت میں کھانا بھجواتے تھے اور پھر جو کھانا بچ کر آتا تھا وہ خود کھاتے تھے اور محبت و اخلاص کی وجہ سے اُسی جگہ اُنگلیاں ڈالتے تھے جہاں سے آپ نے کھایا ہوتا تھا۔[3] دوسرے اصحاب بھی عموماً آپ کی خدمت میں کھانا بھیجا کرتے تھے، چنانچہ ان لوگوں میں سعد بن عبادہ رئیس قبیلہ خزرج کا نام تاریخ میں خاص طور پر مذکور ہوا ہے۔ انس بن مالک مدینہ کے ایک دس سالہ یتیم بچے تھے۔ ان کی والدہ جن کا نام اُمِّ سلیم تھا اور جو بہت مخلص تھیں ان کو اپنے ساتھ لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسُول اللہ!

---

[1] بخاری کتاب الہجرت۔ بخاری میں اونٹنی کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان نہیں ہوا مگر یہ ذکر موجود ہے کہ مسجد والی جگہ میں اونٹنی خود بخود آکر بیٹھ گئی تھی جس پر آپ نے یہ الفاظ فرمائے کہ یہی ہماری منزل ہے۔ باقی تفصیل کتبِ سیر میں ہے۔

[2] مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۷ و ابن ہشام۔ [3] مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۷ و ابن ہشام۔

میں انس کو آپؐ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں آپؐ اس کے لیے دُعا فرماویں اور اپنی خدمت کے لیے اسے قبول فرماویں۔ آپؐ نے ان کے لیے دُعائے خیر کی اور اپنی خدمت میں انہیں منظور فرمایا اور اس کے بعد سے انس بن مالک ہمیشہ آپؐ کی خدمت میں رہنے لگ گئے اور آپؐ کی وفات تک اس خدمت سے جُدا نہیں ہوئے۔ یہ وہی انس ہیں جن سے بہت سی احادیث کتب حدیث میں مروی ہوئی ہیں اور جو خاص صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انس نے بڑی لمبی عمر پائی اور سنہ ۹۱ یا سنہ ۹۳ ہجری میں بصرہ میں فوت ہوئے جبکہ ان کے سوا غالباً ایک یا دو صحابی اور زندہ تھے۔ اپنی آخری عمر میں انس اکثر کہا کرتے تھے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے میرے مال اور میری اولاد میں اتنی برکت ہوئی ہے جو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی اور اب مجھے صرف جنّت کی دُعا کے پُورا ہونے کا انتظار ہے۔

مدینہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو کچھ روپیہ دیکر مکہ روانہ فرمایا جو چند دن میں آپؐ کے اور اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر مع الخیر مدینہ میں پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ عبداللہ بن ابی بکر حضرت ابوبکرؓ کے اہل وعیال کو بھی ساتھ لے کر مدینہ پہنچ گئے۔

تعمیر مسجدِ نبویؐ

مدینہ کے قیام کا سب سے پہلا کام مسجدِ نبویؐ کی تعمیر تھا۔ جس جگہ آپؐ کی اُونٹنی آکر بیٹھی تھی وہ مدینہ کے دو مُسلمان بچوں سہل اور سہیل کی ملکیت تھی جو حضرت اسعد بن زرارہ کی نگرانی میں رہتے تھے۔ یہ ایک افتادہ جگہ تھی جس کے ایک حصّہ میں کہیں کہیں کھجُوروں کے درخت تھے اور دُوسرے حصّہ میں کچھ کھنڈرات وغیرہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مسجد اور اپنے حجرات کی تعمیر کے لیے پسند فرمایا اور دس دینار یعنی قریب نوّے روپے میں یہ زمین خریدی گئی اور جگہ کو ہموار کر کے اور درختوں کو کاٹ کر مسجدِ نبویؐ کی تعمیر شروع ہوگئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دُعا مانگتے ہوئے سنگِ بنیاد رکھا اور جیسا کہ قبا کی مسجد میں ہوا تھا صحابہ نے معماروں اور مزدوروں کا کام کیا جس میں کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی شرکت فرماتے تھے۔ بعض اوقات اینٹیں اُٹھاتے ہوئے صحابہ حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

هٰذَا الْحِمَالُ لَاحِمَالَ خَيْبَرَ   هٰذَا اَبَرُّ رَبَّنَا وَاَطْهَرُ

یعنی "یہ بوجھ خیبر کے تجارتی مال کا بوجھ نہیں ہے جو جانوروں پر لد کر آیا کرتا ہے بلکہ اے ہمارے مولیٰ! یہ بوجھ تقویٰ اور طہارت کا بوجھ ہے جو ہم تیری رضا کے لیے اُٹھاتے ہیں۔"

اور کبھی کبھی صحابہ کام کرتے ہوئے عبداللہ بن رواحہ کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّ الْاَجْرَ اَجْرُ الْاٰخِرَةْ   فَارْحَمِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةْ

یعنی "اے ہمارے اللہ! اصل اجر تو صرف آخرت کا اجر ہے۔ پس تُو اپنے فضل سے انصار و مہاجرین پر اپنی رحمت نازل فرما۔"

جب صحابہؓ یہ اشعار پڑھتے تھے تو بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی آواز کے ساتھ آواز ملا

دیتے تھے اور اس طرح ایک لمبے عرصہ کی محنت کے بعد یہ مسجد مکمل ہوئی[1] مسجد کی عمارت پتھروں کی سلوں اور اینٹوں کی تھی جو لکڑی کے کھمبوں کے درمیان چُن دی گئی تھیں اور چھت پر کھجور کے تنے اور شاخیں ڈالی گئی تھیں۔ مسجد کے اندر چھت کے سہارے کے لیے کھجور کے ستون تھے اور جب تک منبر کی تجویز نہیں ہوئی انہی ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے وقت ٹیک لگا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ مسجد کا فرش کچا تھا اور چونکہ زیادہ بارش کے وقت چھت ٹپکنے لگ جاتی تھی اس لیے ایسے اوقات میں فرش پر کیچڑ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اس تکلیف کو دیکھ کر بعد میں کنکریوں کا فرش بنوا دیا گیا۔ شروع شروع میں مسجد کا رُخ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا تھا، لیکن تحویلِ قبلہ کے وقت یہ رُخ بدل دیا گیا۔ مسجد کی بلندی اُس وقت دس فٹ اور طول ایک سو پانچ فٹ اور عرض نوّے فٹ کے قریب تھا، لیکن بعد میں اُس میں توسیع کر دی گئی۔

مسجد کے ایک گوشے میں ایک چھت دار چبوترہ بنایا گیا تھا جسے صُفّہ کہتے تھے۔ یہ ان غریب مہاجرین کے لیے تھا جو بے گھر بار تھے۔ یہ لوگ یہیں رہتے تھے اور اصحاب الصُّفّہ کہلاتے تھے۔ ان کا کام گویا دن رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنا، عبادت کرنا اور قرآن شریف کی تلاوت کرنا تھا۔ ان لوگوں کا کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی خبرگیری فرماتے تھے اور جب کبھی آپؐ کے پاس کوئی ھدیہ وغیرہ آتا تھا یا گھر میں کچھ ہوتا تھا تو اُن کا حصّہ ضرور نکالتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات خود فاقہ کرتے اور جو کچھ گھر میں ہوتا تھا وہ اصحاب الصُّفّہ کو بھجوا دیتے تھے۔ انصار بھی ان کی مہمانی میں حتّی المقدور مصروف رہتے تھے اور اُن کے لیے کھجوروں کے خوشے لا لا کر مسجد میں لٹکا دیا کرتے تھے[2] لیکن بایں ہمہ اُن کی حالت تنگ رہتی تھی اور بسا اوقات فاقہ تک نوبت پہنچ جاتی تھی اور یہ حالت کئی سال تک جاری رہی حتّٰی کہ کچھ تو مدینہ کی آبادی کی وسعت کے نتیجہ میں ان لوگوں کے لیے کام نکل آیا۔ اور کچھ قومی بیت المال سے امداد کی صورت پیدا ہو گئی۔

مسجد کے ساتھ ملحق طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رہائشی مکان تیار کیا گیا تھا۔ مکان کیا تھا ایک دس پندرہ فٹ کا چھوٹا سا حجرہ تھا اور اس حجرہ اور مسجد کے درمیان ایک دروازہ رکھا گیا تھا جس میں سے گذر کر آپؐ نماز وغیرہ کے لیے مسجد میں تشریف لاتے تھے۔ جب آپؐ نے اور شادیاں کیں تو اسی حجرہ کے ساتھ ساتھ دوسرے حجرات تیار ہوتے گئے۔ مسجد کے آس پاس بعض اور صحابہ کے مکانات بھی تیار ہو گئے۔

یہ تھی مسجد نبویؐ جو مدینہ میں تیار ہوئی اور اس زمانہ میں چونکہ اور کوئی پبلک عمارت ایسی نہ تھی جہاں قومی کام سرانجام دیئے جاتے اس لیے ایوانِ حکومت کا کام بھی یہی مسجد دیتی تھی۔ یہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس لگتی تھی۔ یہیں تمام قسم کے مشورے ہوتے تھے۔ یہیں مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا۔ یہیں سے احکامات صادر ہوتے تھے۔ یہی قومی مہمان خانہ تھا اور ضرورت ہوتی تھی تو اسی سے جنگی قیدیوں کی حبس گاہ کا کام بھی لے لیا جاتا تھا۔

سر ولیم میور اس مسجد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] بخاری ابواب الہجرت و زرقانی ۔ [2] ترمذی بحوالہ تلخیص جلد ۱

"گو یہ مسجد سامانِ تعمیر کے لحاظ سے نہایت سادہ اور معمولی تھی، لیکن محمد (صلعم) کی یہ مسجد اسلامی تاریخ میں ایک خاص شان رکھتی ہے۔ رسُولِ خدا اور ان کے اصحاب اسی مسجد میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ گذارتے تھے یہیں اسلامی نماز کا باقاعدہ باجماعت صورت میں آغاز ہوا۔ یہیں تمام مسلمان جمعہ کے دن خدا کی تازہ وحی کو سننے کے لیے مؤدبانہ اور مرعوب حالت میں جمع ہوتے تھے۔ یہیں محمدؐ (صلعم) اپنی فتوحات کی تجاویز پختہ کیا کرتے تھے۔ یہی وہ ایوان تھا جہاں مفتوح اور تائب قبائل کے وفود ان کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ یہی وہ دربار تھا جہاں سے وہ شاہی احکام جاری کئے جاتے تھے جو عرب کے دُور دراز کونوں تک باغیوں کو خوف سے لرزا دیتے تھے اور بالآخر اسی مسجد کے پاس اپنی بیوی عائشہؓ کے حجرے میں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی جان دی اور اسی جگہ اپنے دو خلیفوں کے پہلو بہ پہلو وُہ مدفون ہیں[1]"

یہ مسجد اور اس کے ساتھ کے حجرے کم و بیش سات ماہ کے عرصہ میں تیار ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نئے مکان میں اپنی بیوی حضرت سودہؓ کے ساتھ تشریف لے گئے بعض دُوسرے مہاجرین نے بھی انصار سے زمین حاصل کرکے مسجد کے آس پاس مکانات تیار کرلیے اور جنھیں مسجد کے قریب زمین نہیں مل سکی۔ اُنھوں نے دُور دُور مکان بنالئے اور بعض کو انصار کی طرف سے بنے بنائے مکان مل گئے تھے۔

ابتدائے اذان

ابھی تک نماز کے لیے اعلان یا اذان وغیرہ کا انتظام نہیں تھا۔ صحابہ عموماً وقت کا اندازہ کرکے خود نماز کے لیے جمع ہو جاتے تھے، لیکن یہ صورت کوئی قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ اب مسجد نبویؐ کے تیار ہو جانے پر یہ سوال زیادہ محسوس طور پر پیدا ہوا کہ کس طرح مسلمانوں کو وقت پر جمع کیا جاوے۔ کسی صحابی نے نصاریٰ کی طرح ناقوس کی رائے دی۔ کسی نے یہود کی مثال میں بُوق کی تجویز پیش کی۔ کسی نے کچھ کہا مگر حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ کسی آدمی کو مقرر کر دیا جائے کہ وہ نماز کے وقت یہ اعلان کر دیا کرے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ اس فرض کو ادا کیا کریں[2] چنانچہ اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تھا بلالؓ بلند آواز سے اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ کہہ کر پکارا کرتے تھے اور لوگ جمع ہو جاتے تھے بلکہ اگر نماز کے علاوہ بھی کسی غرض کے لیے مسلمانوں کو مسجد میں جمع کرنا مقصود ہوتا تھا تو یہی ندا دی جاتی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ایک صحابی عبداللہ بن زید انصاری کو خواب میں موجودہ اذان کے الفاظ سکھائے گئے اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے اس خواب کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ میں نے خواب میں ایک شخص کو اذان کے طریق پر یہ الفاظ پکارتے سُنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ خواب خدا کی طرف سے

---

[1] لائف آف محمدؐ مصنفہ سر ولیم میور ۔ [2] بخاری کتاب الاذان

ہے اور عبداللہ کو حکم دیا کہ بلالؓ کو یہ الفاظ سکھا دیں۔ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جب بلالؓ نے ان الفاظ میں پہلی دفعہ اذان دی تو حضرت عمرؓ اُسے سُنکر جلدی جلدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسُول اللہ! آج جن الفاظ میں بلالؓ نے اذان دی ہے بعینہٖ یہی الفاظ میں نے بھی خواب میں دیکھے ہیں[1]۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کے الفاظ سُنے تو فرمایا کہ اسی کے مطابق وحی بھی ہو چکی ہے[2]۔ الغرض اس طرح موجودہ اذان کا طریق جاری ہوگیا اور جو طریق اس طرح جاری ہوا وہ ایسا مبارک اور دلکش ہے کہ کوئی دوسرا طریق اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ گویا ہر روز پانچ وقت اسلامی دُنیا کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں ہر مسجد سے خدا کی توحید اور محمدؐ رسُول اللہ کی رسالت کی آواز بلند ہوتی ہے اور اسلامی تعلیمات کا خلاصہ نہایت خوبصورت اور جامع الفاظ میں لوگوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

رکعاتِ نماز میں ایزادی

یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ نماز جو اسلامی عبادات میں سب سے افضل عبادت سمجھی گئی ہے مکّہ میں ہی فرض ہو چکی ہیں، لیکن اب تک سوائے نماز مغرب کے جس میں تین رکعات تھیں باقی تمام فرض نمازوں میں صرف دو دو رکعات تھیں، لیکن ہجرت کے کچھ عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے حکم پاکر سفر کے لیے تو وہی دو دو رکعات نماز رہنے دی لیکن حضر کے لیے سوائے نمازِ فجر اور مغرب کے جو اپنی پہلی صورت میں قائم رہیں باقی نمازوں میں چار چار رکعات فرض کردیں اور اس طرح سفر و حضر کا امتیاز قائم ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم میں یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ اس کے تمام احکام میں میانہ روی کو اختیار کیا گیا ہے اور ان عملی مشکلات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے جو انسان کو اس کی زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں، چنانچہ نماز کے مسائل میں ہی بہت سے احکام ایسے پائے جاتے ہیں جو حالات کے اختلاف سے بدل جاتے ہیں مثلاً سفر و حضر کی نماز کے امتیاز کے علاوہ جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ نماز کی ظاہری شکل وصورت کا ملحوظ رکھنا عام حالات میں ضروری ہے لیکن جو شخص بیماری وغیرہ کی وجہ سے نماز کو اس کی مقررہ صورت میں ادا نہ کرسکتا ہو اس کے لیے اجازت ہے کہ ظاہری صورت کو ترک کرکے بیٹھے بیٹھے یا اگر یہ بھی مشکل ہو تو لیٹے لیٹے ہی نماز ادا کرے۔ اسی طرح نماز میں کعبہ کی طرف مُنہ کرنا واجبات میں سے ہے لیکن جب کوئی شخص سفر میں ہو اور سواری پر بیٹھے ہوئے اُسے جہت کا پتہ نہ لگ سکے یا وہ جہت کو قائم نہ رکھ سکے تو اسلام اُسے اختیار دیتا ہے کہ جدھر اس کی سواری کا رُخ ہو اُدھر مُنہ کرکے نماز ادا کرے۔ اسی طرح نماز کے لیے مقررہ طریق پر وضو کرنا ضروری ہے لیکن ایسا شخص جسے پانی نہ ملے یا جسے وضو کرنے سے بیماری کا اندیشہ ہو وہ وضو ترک کرسکتا ہے۔ وغیر ذالک۔

اسی طرح دوسرے امور میں بھی جہاں کہیں کوئی معقول عملی دقت پیدا ہو جاتی ہے اسلام اپنے احکام کی صورت

---

[1] ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ تفصیلاً اور مؤطا امام مالک اجمالاً۔

[2] زرقانی بروایت ابوداؤد و عبدالرزاق جلد ا صفحہ ۲۷۸۔

کو مناسب طور پر بدل کر اس کی جگہ کوئی دُوسری صُورت پیش کر دیتا ہے جس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ اول تو اسلام کا پیغام ایک عالمگیر وسعت رکھتا ہے جس میں حالات کے اختلاف کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور دُوسرے یہ کہ شریعت اسلامی میں اصل مقصود عبادات کی رُوح ہے اور عبادات کا جسم صرف اس رُوح کے بقا اور حفاظت کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور اسی لیے جہاں کہیں بھی حالات کے بدل جانے سے جسم کا اختیار کرنا مشکل ہو جاتا ہے وہاں جسم کو ترک کر کے رُوح کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔

اس جگہ یہ ذکر بھی بے موقعہ نہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی جملہ عبادات میں سب سے زیادہ زور نماز پر دیا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ نماز مومن کا معراج ہے۔ نیز فرماتے تھے کہ نماز ایسی عبادت ہے جس میں بندہ اپنے خدا سے ہمکلام ہوتا اور گویا اس کی مجلس میں پہنچ جاتا ہے اور آپ کو نماز سے اس قدر محبت تھی کہ نماز پنجگانہ تو خیر فرض ہی ہے دوسری نوافل نمازیں بھی آپ نہایت کثرت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور نماز تہجد یعنی نصف شب کی نماز سے تو آپ کو اتنا شغف تھا کہ آپ نہایت التزام کے ساتھ بلا ناغہ اس نماز کے لیے اُٹھا کرتے تھے اور روایات آتی ہے کہ آپ اس قدر دیر تک نماز تہجد میں کھڑے رہتے تھے کہ بعض اوقات آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے تھے اور آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ یعنی نماز تو میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے اور آپ اپنے صحابہ کو نماز کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ اگر لوگوں کو یہ علم ہو کہ نماز با جماعت میں کیا خوبی ہے تو خواہ انہیں اپنے گھٹنے گھسیٹتے ہوئے مسجد میں آنا پڑے وہ ضرور آئیں۔ اپنی آخری بیماری میں جبکہ آپ کو غشی پر غشی آتی تھی اور سخت بے چینی کی حالت تھی آپ نے ایک دفعہ صبح کے وقت اپنے دروازے کا پردہ اُٹھا کر دیکھا تو مسجد میں صحابہ نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر آپ کا چہرہ اس قدر خوشی سے تمتما اُٹھا جیسے کوئی مرجھایا ہوا پھول یکلخت شگفتہ ہو جاوے اور بعض روایات میں ہے کہ آخری فقرہ جو آپ کی زبان سے سُنا گیا وہ اَلصَّلٰوةُ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ تھا۔ یعنی میری اُمت کے لوگو! نماز اور غلاموں کے متعلق میری تعلیم کو فراموش نہ کرنا۔[1]

یہودیوں میں پہلا مُسلمان

اب تک مسلمان ہونے والے لوگوں میں غالباً بعض مسیحی تو شامل ہو چکے تھے، مگر یہودی کوئی نہیں تھا، لیکن اب ہجرت کے بعد یہ سلسلہ بھی شروع ہوا اور گو یہودیوں میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہت ہی تھوڑے لوگ ایمان لائے لیکن یہ قوم بھی بالکل محروم نہیں رہی۔ سب سے پہلا یہودی جو مشرف باسلام ہوا اُس کا نام حصین بن سلام تھا۔ یہ شخص مدینہ کا رہنے والا تھا اور یہودیوں میں اپنے علم و فضل کی وجہ سے بہت اثر رکھتا تھا۔ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ہی تھے کہ یہ شخص آپ کے دعوی کو سُن کر کچھ کچھ اسلام کی طرف مائل ہو چکا تھا، مگر ابھی تک اس نے اپنی اس حالت کا کسی سے اظہار نہیں کیا تھا۔ جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو یہ شخص خفیہ طور پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چونکہ طبیعت میں سعادت تھی

---

[1] یہ جملہ حوالہ جات معتبر کتب حدیث سے ماخوذ ہیں۔

پہلی ملاقات میں ہی مسلمان ہوگیا۔ مسلمان ہونے کے بعد اُسے یہ شوق ہوا کہ اس کی قوم کے لوگ بھی اس نور سے محروم نہ رہیں۔ جس سے خدا نے اس کے سینے کو منور کیا تھا؛ چنانچہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ یہودیوں کے سرآوردہ لوگوں کو اپنے پاس بلائیں اور انہیں اسلام کی تبلیغ کریں اور ان سے میرے متعلق رائے دریافت فرمائیں کہ میں ان میں کیسا آدمی سمجھا جاتا ہوں تاکہ اگر وہ میرے متعلق اچھی رائے کا اظہار کریں تو شاید میرے اسلام لانے کی خبر ہی ان کی ہدایت کا موجب ہو جاوے؛ چنانچہ حصین بن سلام ایک طرف ہو کر چھپ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی عمائد کو اپنے پاس بلا کر اسلام کی تبلیغ کی مگر انھوں نے نہ مانا۔ اس کے بعد آپ نے حصین بن سلام کے متعلق رائے دریافت کی۔ جس پر انھوں نے حصین کے علم وفضل کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ وہ ہمارا سردار اور ابنِ سردار ہے وغیرہ ذالک۔ آپ نے کہا دیکھو اگر وہ مسلمان ہو جائے تو پھر تم بھی مسلمان ہونے کے لیے تیار ہو گے؟ انہوں نے کہا نعوذ باللہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ حصین مسلمان ہو جاوے۔ آپ نے حصین کو آواز دی۔ اور وہ اپنے چھپنے کی جگہ سے باہر آگئے اور یہودی عمائد سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اے میری قوم کے لوگو! خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کے عذاب کو اپنے اوپر مت لو تم جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تمہاری کتاب میں موجود ہے اور وہ وہی نبی ہیں جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا تھا۔ پس خدا سے ڈرو اور انکار کی طرف قدم نہ بڑھاؤ۔ یہ سنکر پہلے تو یہودی لوگ سخت مبہوت ہو گئے اور پھر کہنے لگے کہ ہم حصین کی بات نہیں مانتے یہ جھوٹا اور کذاب ہے اور پھر حصین بن سلام کو گالیاں دیتے ہوئے وہ آپ کی مجلس سے اُٹھ گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان ہوتے پر حصین کا نام بدل کر عبداللہ کر دیا اور اسی نام سے وہ تاریخ وحدیث میں معروف ہیں۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا تھا تو عام طور پر اس کا وہی نام رہنے دیتے تھے جو پہلے ہوتا تھا ہاں اگر کسی شخص کا نام مشرکانہ ہوتا تھا تو آپ اسے بدل دیتے تھے حصین بن سلام کا نام مشرکانہ تو نہیں تھا، لیکن غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ یہ شخص یہودیوں سے پہلا نو مسلم ہے اس کے نام کو خالص اسلامی رنگ میں بدلنا مناسب خیال فرمایا۔

اہل فارس میں پہلا مسلمان

اسی زمانہ کے قریب قریب سلمان فارسیؓ مسلمان ہوئے۔ سلمان ملک فارس کے رہنے والے تھے اور ابتداءً زرتشتی مذہب کے پیرو تھے لیکن فطری سعادت نے اس مذہب کی اس وقت کی حالت پر تسلی نہ پائی اور وہ کسی بہتر مذہب کی تلاش میں وطن سے نکلے اور بالآخر شام میں آکر عیسائی ہو گئے۔ اسی زمانہ میں کسی لوٹ مار میں وہ غلام بنا لیے گئے۔ مگر یہی غلامی ان کے اسلام کا باعث بن گئی۔ کیونکہ کئی آقاؤں کے تبادلہ کے بعد بالآخر مدینہ کے ایک شخص نے انہیں خرید کر اپنے پاس رکھ لیا؛ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو سلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے پھر انہوں نے آہستہ آہستہ روپے کا انتظام کر کے اپنے آقا سے آزادی حاصل کر لی اور سب سے پہلی مرتبہ وہ غزوۂ خندق میں شریک جہاد ہوئے اور انہی کے مشورے سے خندق کھودی گئی۔ سلمان نہایت پارسا اور متقی آدمی تھے اور بالکل درویشانہ زندگی گذارتے تھے۔ ان سے ایک دفعہ کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کے باپ کا کیا نام ہے تو انہوں نے نہایت سادگی سے جواب دیا

کرئیں ابن اسلام ہوں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ان کے متعلق فرمایا کہ سَلْمَانُ مِنَّا اَھْلَ الْبَیْتِ[1] کہ سلمان ہم اہلبیت میں سے ہیں۔ اور ایک دفعہ جب کہ یہ قرآنی آیت نازل ہوئی کہ آئندہ ایک زمانہ میں ایک جماعت صحابہ کی مانند اور انہیں کی تعلیم کی حامل پیدا ہوگی تو صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے۔ اس پر آپؐ نے سلمان فارسی پر اپنا ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ لَوْکَانَ الْاِیْمَانُ عِنْدَ الثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رِجَالٌ اَوْ رَجُلٌ مِنْ ھٰٓؤُلَآءِ[2] یعنی اگر ایمان ثریا تک بھی اُٹھ جائے گا تو ان فارسی الاصل لوگوں میں سے ایک شخص اسے دُنیا میں پھر قائم کر دیگا۔

قبیلہ اوس و خزرج کے غیر مُسلم رؤساء

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مدینہ میں ابھی تک اوس و خزرج کے بہت سے لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ بدستور اپنے مذہب پر قائم تھے۔ اُن میں سے دو شخص خاص طور پر ممتاز اور معزز سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن اُبَی بن سلول رئیس خزرج کا ذکر اوپر گذر چکا ہے کہ وہ کس طرح شروع میں تو اسلام سے الگ الگ رہا مگر بعد میں بظاہر مسلمان ہو گیا، لیکن در پردہ اسلام کا دشمن رہا اور منافقینِ مدینہ کا سردار بن گیا۔ دُوسرا شخص ابو عامر تھا جو قبیلہ اوس کا رئیس تھا۔ یہ شخص اپنی زندگی کے ابتدائی حصّہ میں ایک سیاح رہ چکا تھا اور بہت سے ممالک میں سفر کرنے کے بعد اب گویا تارک الدنیا ہو کر راہب کہلاتا تھا۔ ابو عامر کچھ کچھ نصرانیت کی طرف مائل تھا اور ایک آزاد مذہبی معلم ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر اس نے آپؐ کی مخالفت شروع کی اور بالآخر اپنے بغض و حسد میں جلتا ہوا مدینہ کو چھوڑ کر مکہ کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ وہ چند لوگ بھی جو اس کے زیر اثر تھے مدینہ چھوڑ گئے۔ جنگ اُحد میں ابو عامر مکہ والوں کی طرف سے ہو کر میدانِ جنگ میں آیا اور قدرتِ حق کا عجیب نظارہ ہے کہ اسی جنگ میں اس کا لڑکا حنظلہ جو ایک نہایت مخلص مسلمان تھا مسلمانوں کی طرف سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ ابو عامر فتح مکہ تک مکہ میں ہی مقیم رہا اور فتح مکہ کے بعد طائف چلا گیا اور جب طائف بھی صحابہؓ کے ہاتھ پر فتح ہو گیا تو وہ مسلمانوں کے خلاف رُومی سلطنت کے ساتھ سازش کرنے کی نیت سے شام کی طرف نکل گیا، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ابو عامر جب مدینہ میں تھا تو طعن و تحقیر کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طرید و وحید (یعنی وطن سے نکالا ہوا اکیلا چھوڑا ہوا شخص) کہہ کر پکارا کرتا تھا، لیکن آخر خود اس کا یہ انجام ہوا کہ بالآخر وہیں شام میں وہ بے وطنی اور بے کسی و بے بسی کی حالت میں بھٹکتا ہوا مر گیا[3]۔

مواخاتِ انصار و مہاجرین

اس وقت مدینہ کے مُسلمان دو حصّوں میں منقسم تھے۔ ایک تو وہ تھے جو مدینہ کے باشندے نہ تھے بلکہ مکہ یا کسی اور جگہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بوجہ اپنی ہجرت کے مہاجرین کہلاتے تھے۔ دُوسرے وہ لوگ تھے جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور چونکہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دُوسرے مہاجرین کو پناہ دی تھی اور ان کی اعانت کا بیڑا اٹھایا تھا اس لیے

---

[1] طبقات ابن سعد ۔ [2] بخاری تفسیر سورۃ جمعہ صفحہ ۲۷، مطبع مجتبائی دہلی ۔

[3] زرقانی۔ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۴۴۔ میور صفحہ ۱۷۴۔ مارگولیس صفحہ ۲۲۴ ۔

وُہ انصار کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔ مہاجرین عام طور پر مدینہ میں بالکل بے سروسامان تھے کیونکہ غریب تو غریب تھے ہی متمول مہاجرین بھی عموماً اپنا سب مال و متاع وطن میں چھوڑ کر نکل آئے تھے۔ انصار نے ان کے ساتھ حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر سلوک کیا اور کوئی دقیقہ ان کی مہمان نوازی کا اُٹھا نہیں رکھا۔ لیکن اس رشتہ اخوت کو اور بھی مضبوط کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز فرمائی کہ انس بن مالک کے مکان پر انصار و مہاجرین کو جمع فرمایا اور باہم مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دُو دُو کا جوڑا بنا کر انصار و مہاجرین کے کم و بیش نوّے اشخاص کے درمیان باقاعدہ رشتہ اخوت قائم کر دیا۔ اس سلسلہ مواخاۃ پر طرفین کی طرف سے جس محبت اور اخلاص اور وفاداری کے ساتھ عملدرآمد ہوا وہ آجکل کی حقیقی اخوت کو بھی شرماتا ہے۔ انصار و مہاجرین بھائی بھائی کیا بنے گویا ایک جان دُو قالب ہو گئے۔ پہلی تجویز انصار نے اس رشتہ اخوت کے بعد یہ کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ درخواست پیش کی کہ آپ ہمارے باغات کو ہم میں اور ہمارے بھائیوں میں تقسیم فرما دیں۔ لیکن چونکہ مہاجرین عموماً تجارت پیشہ تھے اور کھیتی باڑی کے کام سے قطعاً ناواقف تھے بلکہ مکّہ والے تو اس کام کو پسند بھی نہیں کرتے تھے، اس لیے پھر انصار نے خود ہی یہ تجویز پیش کی کہ باغات کا انتظام اور محنت ہم کریں گے مگر ماحصل میں سے مہاجرین کو حصّہ مل جایا کرے[1] چنانچہ اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا حتیٰ کہ آہستہ آہستہ مہاجرین کی تجارتیں جن میں وُہ مدینہ میں آکر مشغول ہو گئے تھے چل نکلیں اور ان کی اپنی جائیدادیں بھی بن گئیں اور انصار کی طرف سے امداد کی ضرورت نہ رہی[2] لکھا ہے کہ جب مہاجرین نے انصار کی طرف سے اس غیر معمولی لطف و شفقت کو دیکھا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انصار کے اس سلوک کی بہت تعریف کی اور کہا کہ یا رسُول اللہ انصار کی اس نیکی کو دیکھ کر ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں خدا سے سارا اجر وہی نہ لے جائیں۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا جبتک تم ان کی نیکی کے شکرگذار اور خدا کے حضور اُن کے لیے دست بدعا ہوگے تم اجر سے محروم نہیں ہو سکتے[3] حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سعد ابن الربیع انصاری کے بھائی بنے تھے سعد نے اپنا سارا مال و متاع نصف نصف کر عبدالرحمٰن بن عوف کے سامنے رکھ دیا اور جوشِ محبت میں یہاں تک کہہ دیا کہ میری دو بیویاں ہیں۔ میں ان میں سے ایک کو طلاق دیئے دیتا ہوں اور پھر اس کی عدت گذرنے پر تم اس کے ساتھ شادی کر لینا۔ یہ سعد کی طرف سے جوشِ محبت کا ایک بے اختیاری اظہار تھا۔ ورنہ وہ اور عبدالرحمٰن دونوں جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن عوف نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کے لیے دُعا کرتے ہوئے کہا کہ خدا یہ سب کچھ تمہیں مبارک کرے مجھے بازار کا رستہ بتا دو، چنانچہ عبدالرحمٰن بن عوف نے تجارت شروع کی اور چونکہ وہ نہایت ہوشیار اور سمجھدار آدمی تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی تجارت چمک اٹھی اور بالآخر وہ ایک نہایت امیر کبیر آدمی بن گئے۔ ابھی اُن کی تجارت ابتدائی حالت میں ہی تھی اور انہیں مدینہ میں آئے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ انہوں نے مدینہ کی ایک انصاری لڑکی سے شادی کر لی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے

---

[1] بخاری باب الھجرت و نیز دیکھو مسلم کتاب الجہاد باب ردّ المہاجرین الی الانصار۔

[2] مسلم باب مذکور۔ [3] ابوداؤد۔

کپڑوں پر زعفران کا رنگ دیکھا جو عرب دستور کے مطابق شادی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ تو مسکراتے ہوئے دریافت فرمایا۔ "ابن عوف یہ کیا ماجرا ہے؟" عبدالرحمٰن نے عرض کیا "یارسُول اللہ! مَیں نے ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے۔" آپؐ نے پُوچھا "مہر کیا دیا ہے؟" عبدالرحمٰن نے جواب دیا "یارسُول اللہ! کھجور کی ایک گٹھلی کے برابر سونا دیا ہے۔" آپؐ نے فرمایا: اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ "تو اب پھر ولیمہ کی دعوت کرنی ہوگی۔ خواہ صرف ایک بکری کے گوشت کی کیوں نہ ہو" یعنی اب تمہاری حیثیت ایسی نہیں ہے کہ ایک دو دوستوں کو کھانا کھلا کر سمجھو کہ بس ولیمہ ہوگیا بلکہ کم از کم ایک بکری کے اندازہ کا گوشت تو دعوت میں پکنا چاہیئے۔[1] اس سلسلہ مواخات کا اثر وراثت تک پر تھا، چنانچہ یہ فیصلہ تھا کہ اگر کوئی انصاری فوت ہو تو اس کا ترکہ حصہ رسدی اس کے بھائی مہاجر کو بھی ملے۔ یہ سمجھوتہ جنگِ بدر تک قائم رہا جس کے بعد یہ وراثت خدا کی وحی کے ماتحت منسوخ ہوگیا اور صرف حقیقی رشتہ دار وارث قرار دیئے گئے۔[2] اس سلسلہ مواخات میں حضرت ابوبکرؓ خارجہ بن زید کے بھائی بنے۔ حضرت عمرؓ عتبان بن مالک کے۔ حضرت عثمانؓ اوس بن ثابت کے۔ ابوعبیدہ بن الجراح سعد بن معاذ کے۔ سعید بن زید اُبی بن کعب کے۔ سلمان فارسی ابو درداء کے۔ مصعب بن عمیر ابوایوب انصاری کے۔ عمار بن یاسر حذیفہ بن یمان کے۔ وغیر ذالک۔

مواخات کا یہ سلسلہ کئی لحاظ سے مفید اور بابرکت ہوا۔

اوّل:۔ جو پریشانی اور بے اطمینانی مہاجرین کے دلوں میں اس بے وطنی و بے سروسامانی کی حالت میں پیدا ہوسکتی تھی وہ اس سے بڑی حد تک محفوظ ہوگئے۔

دوم:۔ رشتہ داروں اور عزیزوں سے علیحدگی کے نتیجہ میں جس تکلیف کے پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ وہ ان نئے روحانی رشتہ داروں کے مل جانے سے جو جسمانی رشتہ داروں کی نسبت بھی زیادہ محبت کرنے والے اور زیادہ وفادار تھے پیدا نہ ہوئی۔

سوم:۔ انصار و مہاجرین کے درمیان جو محبت و اتحاد مذہبی اور سیاسی اور تمدنی لحاظ سے ان ایام میں ضروری تھا وہ مضبوط ہوگیا۔

چہارم: بعض غریب اور بے کار مہاجرین کے لیے ایک سہارا اور ذریعہ معاش پیدا ہوگیا۔

مدینہ کی سوسائٹی کی تقسیم اور یہود کے ساتھ معاہدہ

یہ بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل مدینہ کی آبادی دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک تو بُت پرست تھے جو قبائل اوس و خزرج میں منقسم تھے۔ اور دوسرے یہود تھے جن کے تین قبائل کا ذکر اُوپر گذر چکا ہے۔ اسلام کی آمد نے ایک تیسری جماعت مسلمانوں کی پیدا کر دی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو اس وقت مدینہ کی آبادی میں ایک اور فرقہ کا اضافہ ہوگیا جو منافقین کے نام سے یاد کیا جاتا

---

[1] بخاری باب فضائل اصحاب النبیؐ
[2] زرقانی ذکر مواخاۃ

ہے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ایک آسمانی بارش کے طور پر تھا جس کے نتیجہ میں زمین سے ہر قسم کی اچھی بُری روئیدگی نمودار ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مدینہ کی مسلمان آبادی بھی دو شاخوں میں منقسم ہو گئی اور مہاجرین و انصار کی اصطلاح کا آغاز ہو گیا۔ اب گویا مدینہ میں مندرجہ ذیل فرقوں کا وجود پایا جاتا ہے۔

اوّل :۔ مُسلمان جو دو شاخوں میں منقسم تھے (الف) مہاجرین جو عموماً مکّہ کے رہنے والے تھے اور جو کفار کے مظالم سے تنگ آ کر اپنے وطن سے نکل آئے تھے۔

(ب) انصار جو مدینہ کے باشندے تھے اور جنہوں نے اسلام اور بانی اسلام کی مدد اور حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ یہ لوگ قریباً سب کے سب اوس و خزرج کے قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔

دوم :۔ منافقین یعنی اوس و خزرج کے وہ لوگ جو بظاہر مُسلمان ہو گئے تھے مگر دل میں کافر تھے اور اسلام اور بانی اسلام کے خلاف خفیہ کارروائیاں کرتے رہتے تھے نیز ایسے لوگ بھی اسی گروہ میں شامل سمجھے جاتے تھے جو ویسے تو ایمان لے آئے تھے مگر ان کی عملی حالت عموماً غیر مومنانہ تھی اور غیروں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی اسی طرح قائم تھے۔

سوم :۔ بُت پرست یعنی اوس و خزرج کے وہ لوگ جو ابھی تک شرک پر قائم تھے۔

چہارم :۔ یہود جو قبائل بنو قینقاع۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ میں منقسم تھے۔

ان چار فرقوں میں سے پہلے فرقہ کی دونوں شاخیں پورے طور پر ایک نقطہ پر جمع تھیں کیونکہ ہر امر میں ان کی آنکھیں ایک ہی وجود کی طرف اُٹھتی تھیں اور گو عادات و اطوار میں اُن کا رنگ ڈھنگ مختلف تھا اور عرب کے قدیم دستور اور رسم و رواج کے مطابق اُن کا ایک نقطہ پر جمع ہونا آسان کام نہ تھا لیکن اسلام کی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقناطیسی شخصیت نے دُوسرے سب جذبات کو دبا دیا تھا۔ دُوسرا گروہ جو منافقین کا تھا وہ ایک نہایت خطرناک گروہ تھا۔ یہ لوگ ظاہر میں مُسلمان تھے مگر دل میں اسلام کے سخت دشمن تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض اور حسد کی آگ سے جلے جاتے تھے۔ اُن کی خفیہ ریشہ دوانیوں اور مخفی شرارتوں نے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کئی موقعوں پر نہایت خطرناک حالات پیدا کر دیئے مگر چونکہ یہ لوگ بظاہر مُسلمان کہلاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں اپنے آپ کو شمار کرتے تھے، اس لیے انہیں بہر حال مُسلمانوں کے ساتھ مل کر رہنا پڑتا تھا۔ اور وہ اس بات پر مجبور تھے کہ کم از کم ظاہری طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کو اپنے اوپر تسلیم کریں۔ تیسرا گروہ ، بُت پرستوں کا تھا۔ یہ لوگ ہجرت کے وقت تک تو کافی تعداد میں تھے مگر اس کے بعد ان کی تعداد جلد جلد کم ہوتی گئی اور تھوڑے عرصہ میں ہی مدینہ کا شہر شرک کے عنصر سے بالکل پاک ہو گیا۔ یہ لوگ گو مذہباً مسلمان نہ تھے لیکن عرب کے تمدن کے ماتحت وہ اس بات کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ اپنے کثیر التعداد مُسلمان بھائیوں کے ساتھ مل کر رہیں۔ پس سیاسی طور پر یہ گروہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے تھا اور آپ کی حکومت کو

تسلیم کرتا تھا۔ مگر چونکہ گروہ جو یہود پر مشتمل تھا وہ ہر طرح آزاد اور خود مختار تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُور اندیش طبیعت سے یہ بعید تھا کہ آپ ایسے حالات میں جبکہ شہر کا امن اور مُسلمانوں کے جان و مال معرض خطرہ میں تھے اور پھر قریش کی عداوت کی وجہ سے اسلام کی موت اور زندگی کا سوال سامنے تھا ان یہود کو مدینہ میں بغیر کسی معاہدہ کے چھوڑ دیتے؛ چنانچہ ابھی ہجرت پر بہت تھوڑا عرصہ ہی گذرا تھا کہ آپ نے ایک طرف مہاجرین اور اوس و خزرج اور دُوسری طرف یہود کے عمائد کو جمع کر کے اُن کے سامنے اس ضرورت کو بیان کیا کہ مدینہ کی مختلف اقوام کے درمیان ایک باہمی معاہدہ ہو جانا چاہیئے جس کے ماتحت آئندہ شہر کے اُمن اور اس کے مختلف الاقوام باشندوں کی حفاظت اور بہبودی کا انتظام ہو سکے اور کوئی صورت جھگڑے اور امن شکنی کی پیدا نہ ہو؛ چنانچہ پہلے تو آپ نے مُسلمانوں اوس اور خزرج کے اندرونی نظم و نسق کے متعلق چند قواعد فیصلہ فرمائے اور پھر اتفاق رائے سے یہود کے ساتھ ایک معاہدہ طے فرمایا جو باضابطہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ یہ معاہدہ جس کی طرف احادیث اور قرآن شریف میں بھی اشارہ آتا ہے پوری تفصیل کے ساتھ تاریخ میں درج ہے اور اس جگہ ہم اس کی موٹی موٹی شرطیں اپنے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

۱۔ مُسلمان اور یہودی آپس میں ہمدردی اور اخلاص کے ساتھ رہیں گے اور ایک دُوسرے کے خلاف زیادتی یا ظلم سے کام نہیں لیں گے۔

۲۔ ہر قوم کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

۳۔ تمام باشندگان کی جانیں اور اموال محفوظ ہوں گے اور ان کا احترام کیا جائے گا۔ سوائے اس کے کہ کوئی شخص ظلم یا جرم کا مرتکب ہو۔

۴۔ ہر قسم کے اختلاف اور تنازعات رسُول اللہ کے سامنے فیصلہ کے لیے پیش ہوں گے اور ہر فیصلہ خدائی حکم (یعنی ہر قوم کی اپنی شریعت) کے مطابق کیا جائے گا۔

۵۔ کوئی فریق بغیر اجازت رسُول اللہ جنگ کے لیے نہیں نکلے گا۔

۶۔ اگر یہودیوں یا مُسلمانوں کے خلاف کوئی قوم جنگ کرے گی تو وہ ایک دُوسرے کی امداد میں کھڑے ہوں گے۔

۷۔ اسی طرح اگر مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

۸۔ قریش مکہ اور ان کے معاونین کو یہود کی طرف سے کسی قسم کی امداد یا پناہ نہیں دی جائے گی۔

۹۔ ہر قوم اپنے اپنے اخراجات خود برداشت کرے گی۔

۱۰۔ اس معاہدہ کی رُو سے کوئی ظالم یا آثم یا مفسد اس بات سے محفوظ نہیں ہوگا کہ اسے سزا دی جاوے یا اس سے انتقام لیا جاوے۔[1]

اس معاہدہ کی رُو سے مسلمانوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات منضبط ہو گئے اور مدینہ میں ایک قسم کی منظم حکومت

---

[1] سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۷۸، ۱۷۹۔

کی بنیاد قائم ہوگئی جس کے ماتحت ہر قوم باوجود اپنے مذہب اور اپنے اندرونی معاملات میں آزاد ہونے کے ایک اجتماعی قانون اور مرکزی حکومت کے ماتحت آگئی اور اس مرکزی حکومت کے صدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرار پائے۔

مشرکینِ مدینہ کے نام قریشِ مکہ کا تہدیدی خط

ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں تشریف لائے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ قریش مکہ کی طرف سے عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس قبیلہ خزرج اور اس کے مشرک رفقاء کے نام ایک تہدیدی خط آیا کہ تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پناہ سے دستبردار ہو جاؤ؛ ورنہ تمہاری خیر نہیں ہے؛ چنانچہ اس خط کے الفاظ یہ تھے:

اِنَّكُمْ اٰوَيْتُمْ صَاحِبَنَا وَ اِنَّا نُقْسِمُ بِاللّٰهِ لَتُقَاتِلُنَّهٗ اَوْ تُخْرِجُنَّهٗ اَوْ لَنَسِيْرَنَّ اِلَيْكُمْ بِاَجْمَعِنَا حَتّٰى نَقْتُلَ مُقَاتِلَتَكُمْ وَ نَسْتَبِيْحَ نِسَاءَكُمْ[1]

یعنی "تم لوگوں نے ہمارے آدمی محمد (صلعم) کو پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم اسکا ساتھ چھوڑ کر اس کے خلاف جنگ کرو یا کم از کم اسے اپنے شہر سے نکال دو؛ ورنہ ہم اپنا سارا لاؤ لشکر لے کر تم پر حملہ آور ہو جائیں گے اور تمہارے سارے مردوں کو تہ تیغ کر دیں گے اور تمہاری عورتوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنے لیے جائز کر لیں گے۔"

جب یہ خط مدینہ میں پہنچا تو عبداللہ اور اس کے ساتھی جو پہلے سے ہی دل میں اسلام کے سخت دشمن ہو رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ فوراً ان لوگوں سے ملے اور ان کو سمجھایا کہ میرے ساتھ جنگ کرنے میں تمہارا اپنا ہی نقصان ہے۔ کیونکہ تمہارے ہی بھائی بند تمہارے مقابلہ میں ہوں گے۔ یعنی اوس اور خزرج کے مسلمانوں نے بہر حال میرا ساتھ دینا ہے پس میرے ساتھ جنگ کرنے کے صرف یہ معنے ہوں گے کہ تم لوگ اپنے ہی بیٹوں اور بھائیوں اور باپوں کے خلاف تلوار اٹھاؤ۔ اب تم خود سوچ لو۔" عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو جن کے دلوں میں ابھی تک جنگ بعاث کی تباہی کی یاد تازہ تھی یہ بات سمجھ آگئی اور وہ اس ارادے سے باز آگئے۔[2] جب قریش کو اس تدبیر میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے کچھ عرصہ کے بعد اور اسی قسم کا ایک خط مدینہ کے یہود کے نام ارسال کیا۔ مگر اس کا ذکر آگے چل کر اپنے وقت پر آئے گا۔ دراصل کفار مکہ کی غرض یہ تھی کہ جس طرح بھی ہو اسلام کے نام و نشان کو صفحۂ دنیا سے مٹا دیا جاوے۔ مسلمان اُن کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ گئے تو وہاں انہوں نے ان کا پیچھا کیا۔ اور اس بات کی کوشش میں اپنی انتہائی طاقت صرف کر دی کہ نیک دل نجاشی ان مظلوم غریب الوطنوں کو مکہ والوں کے حوالے کر دے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں آگئے تو قریش نے آپکا تعاقب کر کے آپؐ کو گرفتار کر لینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور اب جب انہیں یہ علم ہوا کہ آپؐ اور آپؐ کے اصحاب مدینہ پہنچ گئے ہیں اور وہاں اسلام سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے تو انہوں نے یہ تہدیدی خط بھیج کر مدینہ والوں کو آپ

---

[1] ابوداؤد کتاب الخراج باب فی خبر النضیر ۔ [2] ابوداؤد باب فی النضیر ۔

کے ساتھ جنگ کر کے اسلام کو ملیا میٹ کر دینے یا آپ کی پناہ سے دستبردار ہو کر آپ کو مدینہ سے نکال دینے کی تحریک کی۔ قریش کے اس خط سے عرب کی اس رسم پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ اپنے جنگوں میں دشمنوں کے سارے مردوں کو قتل کر کے ان کی عورتوں پر قبضہ کر لیا کرتے تھے اور پھر ان کو اپنے لیے جائز سمجھتے تھے اور نیز یہ کہ مسلمانوں کے متعلق ان کے ارادے اس سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔ کیونکہ جب یہ سزا انہوں نے مسلمانوں کے پناہ دینے والوں کے لیے تجویز کی تھی تو خود مسلمانوں کے لیے تو یقیناً وہ اس سے بھی زیادہ سخت ارادے رکھتے ہوں گے۔

ابوجہل کی دھمکی

قریش مکہ کا یہ خط ان کے کسی عارضی جوش کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ وہ مستقل طور پر اس بات کا تہیہ کر چکے تھے کہ مسلمانوں کو چین نہیں لینے دیں گے اور اسلام کو دنیا سے مٹا کر چھوڑیں گے۔ چنانچہ ذیل کا تاریخی واقعہ قریش مکہ کے خونی ارادوں کا پتہ دے رہا ہے۔

بخاری میں روایت آتی ہے کہ ہجرت کے کچھ عرصہ بعد سعد بن معاذ جو قبیلہ اوس کے رئیس اعظم تھے اور مسلمان ہو چکے تھے عمرہ کے خیال سے مکہ گئے اور اپنے زمانۂ جاہلیت کے دوست امیہ بن خلف رئیس مکہ کے پاس مقیم ہوئے۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ مکہ والے ان کے ساتھ ضرور چھیڑ چھاڑ کریں گے، اس لیے انہوں نے فتنہ سے بچنے کے لیے امیہ سے کہا کہ "میں کعبۃ اللہ کا طواف کرنا چاہتا ہوں، تم میرے ساتھ ہو کر ایسے وقت میں مجھے طواف کرا دو جبکہ میں علیحدگی میں امن کے ساتھ اس کام سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس چلا جاؤں۔" چنانچہ امیہ بن خلف دوپہر کے وقت جبکہ لوگ عموماً اپنے اپنے گھروں میں ہوتے ہیں سعد کو لیکر کعبہ کے پاس پہنچا، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ عین اسی وقت ابوجہل بھی وہاں آنکلا اور جونہی اس کی نظر سعد پر پڑی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا مگر اپنے غصہ کو دبا کر وہ امیہ سے یوں مخاطب ہوا کہ "اے ابوصفوان یہ تمہارے ساتھ کون شخص ہے؟" امیہ نے کہا: "یہ سعد بن معاذ رئیس اوس ہے۔" اس پر ابوجہل نہایت غضبناک ہو کر سعد سے مخاطب ہوا کہ "کیا تم لوگ یہ خیال کرتے ہو کہ اس مرتد (محمد صلعم) کو پناہ دینے کے بعد تم لوگ امن کے ساتھ کعبہ کا طواف کر سکو گے اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم اس کی حفاظت اور امداد کی طاقت رکھتے ہو؟ خدا کی قسم اگر اس وقت تیرے ساتھ ابوصفوان نہ ہوتا تو تو اپنے گھر والوں کے پاس بچ کر نہ جا سکتا؟" سعد بن معاذ فتنہ سے بچتے تھے مگر ان کی رگوں میں بھی ریاست کا خون تھا اور دل میں ایمانی غیرت جوش زن تھی۔ کڑک کر بولے "واللہ اگر تم نے ہم کو کعبہ سے روکا تو یاد رکھو کہ پھر تمہیں بھی تمہارے شامی راستے پر امن نہیں مل سکے گا۔" امیہ نے کہا: "سعد! دیکھو ابوالحکم سید اہل وادی کے مقابلہ میں یوں آواز بلند نہ کرو۔" سعد نے جواب دیا: "جانے دو امیہ! تم اس بات میں نہ آؤ۔ واللہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی نہیں بھولتی کہ تم کبھی دن مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہو گے۔" یہ خبر سنکر امیہ بن خلف سخت گھبرا گیا اور گھر میں آکر اس نے اپنی بیوی کو سعد کی اس بات سے اطلاع دی اور کہا کہ خدا کی قسم میں تو اب مسلمانوں کے خلاف مکہ سے نہیں نکلوں گا[1] مگر تقدیر کے نوشتے پورے ہونے تھے۔ بدر کے موقعہ پر امیہ کو مجبوراً مکہ سے نکلنا پڑا

---

[1] بخاری کتاب المغازی

اور وہیں وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ یہ امیہ وہی تھا جو حضرت بلالؓ پر اسلام کی وجہ سے نہایت سخت مظالم کیا کرتا تھا۔

ولید بن مغیرہ کی موت اور قریش کے خونی ارادے

پھر اسی زمانہ کی بات ہے کہ خالد بن ولید کا والد ولید بن مغیرہ جو مکہ کا ایک نہایت با اثر اور معزز رئیس تھا بیمار ہو گیا اور جب اُس نے دیکھا کہ اب اُس کی موت قریب ہے تو وہ بے اختیار سا ہو کر رونے لگ گیا اس وقت مکہ کے بعض بڑے بڑے رئیس اس کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر اس کے رونے کا سبب پُوچھا تو ولید نے کہا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں موت کے ڈر سے روتا ہوں۔ واللہ ایسا ہرگز نہیں۔ مجھے تو یہ غم ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین پھیل جائے اور مکہ بھی اُس کے قبضہ میں چلا جائے“ ابو سفیان بن حرب نے جواب دیا کہ ”اس بات کا غم نہ کرو۔ جب تک ہم زندہ ہیں ایسا نہیں ہوگا، ہم اس بات کے ضامن ہوتے ہیں“[1]

مدینہ میں خوف کی راتیں

یہ تمام باتیں قریش مکہ کے ان خونی ارادوں کا پتہ دے رہی ہیں جو وہ ہجرت کے بعد اسلام کے متعلق رکھتے تھے اور مسلمان ان ارادوں سے ناواقف نہ تھے بلکہ خوب سمجھتے تھے کہ مکہ والوں کے یہ بدلے ہوئے تیور عنقریب کوئی رنگ لائیں گے اور گو ان کو خدا کے وعدوں پر پُورا بھروسہ تھا، لیکن فطرتاً وہ سخت خوفزدہ اور پریشان بھی تھے کہ دیکھئے ہمیں کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ خوف ایسا غالب تھا کہ صحابہ کو مدینہ میں رات کے وقت نیند نہیں آتی تھی کہ نہ معلوم کس وقت ان پر کوئی حملہ ہو جاوے اور یہ خطرات طبعاً دوسرے مسلمانوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زیادہ تھے اور چونکہ ویسے بھی آپؐ کو سب کی نسبت مُسلمانوں کی حفاظت کا زیادہ فکر تھا۔ اس لیے آپؐ سب سے زیادہ محتاط رہتے تھے، چنانچہ نسائی[2] میں ایک روایت آتی ہے کہ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ يَسْهَرُ مِنَ اللَّيْلِ ”یعنی جب شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپؐ عموماً راتوں کو جاگتے رہتے تھے“ اور اسی مضمون کی ایک روایت بخاری[3] اور مسلم[4] میں ہے کہ اَرِقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ ثُمَّ قَالَ لَيْتَ رَجُلًا صَالِحًا مِنْ اَصْحَابِيْ يَحْرُسُنِي اللَّيْلَةَ اِذَا سَمِعْنَا صَوْتَ السِّلَاحِ فَقَالَ رَسُوْلُ ﷺ مَنْ هٰذَا قَالَ سَعْدُ بْنُ اَبِيْ وَقَّاصٍ يَا رَسُوْلَ اللهِ جِئْتُ اَحْرُسُكَ فَنَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ یعنی ”ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت دیر تک جاگتے رہے اور پھر فرمایا کہ اگر اس وقت ہمارے دوستوں میں سے کوئی مناسب آدمی پہرہ دیتا تو میں ذرا سو لیتا۔ اتنے میں ہم نے ہتھیاروں کی جھنکار سُنی۔ آپؐ نے پُوچھا کون ہے؟ آواز آئی۔ یا رسُول اللہ! مَیں سعد بن ابی وقاص ہُوں۔ مَیں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ پہرہ دوں۔ اس اطمینان کے

---

[1] تاریخ الخمیس جلد ۱ صفحہ ۲۹۸ ؎ [2] دیکھو فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۶۰ ؎
[3] کتاب التمنی ؎ [4] باب فضل سعد بن ابی وقاص ؎

بعد آپ تھوڑی دیر کے لیے سو گئے [1] اور مُسلم کے اسی باب کی دُوسری روایت میں ہے کہ یہ واقعہ ابتدائے ہجرت کا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فکر اپنی ذات کے متعلق نہ تھا بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا فکر تھا اور ان خوف کے ایام میں آپ یہ ضروری خیال فرماتے تھے کہ مدینہ میں رات کے وقت پہرہ کا انتظام رہے چنانچہ اس غرض سے بسا اوقات آپ خود رات کو جاگا کرتے اور دُوسرے مُسلمانوں کو بھی ہوشیار و چوکس رہنے کی تاکید فرماتے تھے اور آپ کا یہ فکر ڈرنا یا بزدلی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ احتیاط اور بیدار مغزی کی بنا پر تھا؛ ورنہ آپ کی ذاتی شجاعت اور مردانگی تو دوست و دشمن میں مسلّم ہے، چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک رات مدینہ میں کچھ شور ہوا اور لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے اور جس طرف سے شور کی آواز آئی تھی اُدھر کا رُخ کیا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ سامنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلوار حمائل کئے ابوطلحہؓ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار واپس تشریف لا رہے تھے۔ جب آپ قریب آئے تو آپ نے صحابہؓ سے فرمایا "میں دیکھ آیا ہوں کوئی فکر کی بات نہیں، کوئی فکر کی بات نہیں [1]" جس پر لوگ واپس لوٹ آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رات بھی آپ جاگ رہے تھے اور جونہی آپ نے شور کی آواز سُنی آپ جھٹ ابوطلحہ والے گھوڑے پر سوار ہو کر اس طرف نکل گئے اور لوگوں کے روانہ ہوتے ہوتے پتہ لیکر واپس بھی آگئے۔

قبائل عرب کی متحدہ مخالفت اور مسلمانوں کی نازک حالت

قریش مکہ کے جن خونی ارادوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ صرف انہی تک محدود نہ تھے بلکہ ہجرت کے بعد سے انہوں نے قبائل عرب میں مُسلمانوں کے خلاف ایک باقاعدہ پراپیگنڈہ جاری کر رکھا تھا اور چونکہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے ان کا سارے عرب پر ایک گہرا اثر تھا، اس لیے ان کی اس انگیخت سے تمام عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مُسلمانوں کا سخت دشمن ہو رہا تھا۔ قریش کے قافلوں نے تو گویا اپنا یہ فرض قرار دے رکھا تھا کہ جہاں بھی جاتے تھے راستہ میں قبائل عرب کو مُسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ چنانچہ قرآن شریف میں قریش کے ان اشتعال انگیز دوروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے [2]۔ بیچارے مسلمان جو اس وقت تک صرف قریش کے خیال سے ہی سہمے جاتے تھے اب بالکل ہی سراسیمہ ہونے لگے، چنانچہ حاکم اور طبرانی کی مندرجہ ذیل روایت انکی اس وقت کی مضطربانہ حالت کا پتہ دیتی ہے:۔

لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَصْحَابُهُ الْمَدِيْنَةَ وَاٰوَتْهُمُ الْاَنْصَارُ رَمَتْهُمُ الْعَرَبُ عَنْ قَوْسٍ وَاحِدَةٍ وَكَانُوْا لَا يَبِيْتُوْنَ اِلَّا بِالسِّلَاحِ وَلَا يُصْبِحُوْنَ اِلَّا فِيْهِ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَلَا تَرَوْنَ اَنَّا نَعِيْشُ حَتّٰى نَبِيْتَ اٰمِنِيْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ

---

[1] مسلم کتاب الفضائل باب فی شجاعۃ النبی صلعم۔

[2] سورۃ مومن اور سورۃ آل عمران: ۱۹۷۔

لَا نَخَافُ اِلَّا اللّٰہَ[1]

"یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ ہجرت کر کے مدینہ میں آئے اور انصار نے انہیں پناہ دی تو تمام عرب ایک جان ہو کر ان کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ رات کو بھی ہتھیار لگا کر سوتے تھے اور دن کو بھی ہتھیار لگائے رہتے تھے کہ کہیں کوئی اچانک حملہ نہ ہو جاوے اور وہ ایک دُوسرے سے کہا کرتے تھے کہ دیکھئے ہم اس وقت تک زندہ بھی رہتے ہیں یا نہیں جب ہم رات کو اَمن کی نیند سو سکیں گے اور سوائے خدا کے ہمیں اور کسی کا ڈر نہ ہو گا"

قرآن شریف نے جو مخالفینِ اسلام کے نزدیک بھی اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ مستند ریکارڈ ہے مسلمانوں کی اس حالت کا مندرجہ ذیل الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے:۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ[2]

"یعنی اے مسلمانو! وہ وقت یاد رکھو جبکہ تم ملک میں بہت تھوڑے اور کمزور تھے اور تمہیں ہر وقت یہ خوف لگا رہتا تھا کہ لوگ تمہیں اُچک کر لے جائیں یعنی اچانک حملہ کر کے تمہیں تباہ نہ کر دیں مگر خدا نے تمہیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے تمہاری مدد فرمائی اور تمہارے لیے پاکیزہ نعمتوں کے دروازے کھولے۔ پس تمہیں اَب شکر گزار بندے بن کر رہنا چاہیئے"

سچ ہے اگر اللہ کی نصرت شامل حال نہ ہوتی تو اس زمانہ میں مسلمانوں کی حالت واقعی ایسی نازک ہو رہی تھی کہ ظاہری اسباب کے ماتحت ان کی زندگی کے دن بہت محدود نظر آتے تھے۔ بیشک مکہ میں بھی ان کے لیے مصائب تھے اور سخت مصائب تھے اور انہیں دن رات قریش کے بے دردانہ مظالم کا تختۂ مشق بن کر رہنا پڑتا تھا، لیکن مدینہ میں ان کی حالت شروع شروع میں کئی لحاظ سے زیادہ نازک اور زیادہ خطرناک ہو گئی تھی، کیونکہ مکہ میں صرف قریش کی طرف سے اندیشہ تھا اور قریش کے متعلق مسلمانوں کو ایک حد تک یہ اطمینان تھا کہ خواہ ان کی مخالفت کیسی بھی سخت صورت اختیار کرے جبتک مسلمان مکہ میں ہیں قبائل کے باہمی تعلقات کا خیال قریش کو اس بات سے باز رکھے گا کہ وہ ایک جتھے کی صورت میں مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر بلا تمیز سب کو تہ تیغ کر دیں۔ مختلف قبائل کی باہمی رقابتیں رشتہ داری کے احساسات وغیرہ کئی اس قسم کی باتیں تھیں جو عموماً قریش کو

---

[1] حاکم بحوالہ لُبَابُ النُّقُوْلِ فِیْ اَسْبَابِ النُّزُوْلِ زیر آیت وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ

[2] سورۃ الانفال: ۲۷

مُسلمانوں کے خلاف ہاں کم از کم معزز خاندانوں سے تعلق رکھنے والے مُسلمانوں کے خلاف انتہائی کارروائی کرنے سے باز رکھتی تھیں، چنانچہ یاد ہوگا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا فیصلہ کس قدر طویل بحث و تأمل کے بعد اور پھر کتنی احتیاطوں کے ساتھ اختیار کیا تھا، لیکن اب ہجرت کے بعد نہ صرف یہ کہ قریشِ مکّہ کی مخالفت بہت زیادہ چمک گئی تھی اور اس خیال سے کہ مُسلمان اُن کے ہاتھ سے بچ کر نکل گئے ہیں اور غیروں کے ہاں پناہ گزین ہوئے ہیں ان کے بُغض و عداوت کی آگ کو خطرناک طور پر بھڑکا دیا تھا۔ بلکہ عرب کے دُوسرے قبائل بھی ایک جان ہوکر مُسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور خود مدینہ کے شہر میں ایسے منافقین موجود تھے جو مخالفین کے ہاتھ میں مُسلمانوں کے خلاف ایک نہایت کارگر ہتھیار کا کام دے سکتے تھے اور یہود کا وجود مزید براں خطرے کے احتمالات پیدا کر رہا تھا اور ان خطرات کے مقابلہ میں انصار کی جمعیت کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ ان حالات میں گو مُسلمان خدا کے وعدوں پر بھروسہ تھا، لیکن اس ظاہری حالت کو دیکھ کر اُن میں سے بہتوں کے دل اندر ہی اندر بیٹھے جاتے تھے اور خوف اور بے چینی کا ایسا غلبہ تھا کہ ان بے چاروں کو رات کے وقت نیند نہیں آتی تھی۔ ناظرین کو چاہیئے کہ ان باتوں کو اچھی طرح یاد رکھیں کیونکہ آگے چل کر انہیں باتوں نے اس جنگِ عظیم کی بنیاد بنانا ہے جو مُسلمانوں اور کفارِ عرب کے درمیان وقوع میں آئی اور جس نے عرب کی وسیع سرزمین میں خُون کی ندیاں بہا دیں۔

ہجرت کے بعد مہاجرین کا پہلا بچّہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت

ہجرت کے بعد مہاجرین کے ہاں جو پہلا بچّہ مدینہ میں پیدا ہوا وہ عبداللہ بن زبیر تھے اور اسی لیے اُن کی پیدائش پر مہاجرین کو بہت خوشی ہوئی۔ عبداللہ بن زبیر تاریخِ اسلامی میں ایک بہت مشہور و معروف آدمی ہیں۔ ان کے والد زبیر بن العوام کا حال کتاب کے حصّہ اوّل میں گذر چکا ہے۔ زبیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور کبار صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی لڑکی اسماء کو جو حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن تھیں۔ زبیر کے عقد میں دیا تھا اور انہی اسماء کے بطن سے ہجرت کے پہلے سال میں عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے۔ جس وقت عبداللہ کو اٹھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا تو آپؐ نے ایک کھجور کو اپنے مُنہ میں نرم کرکے اس کا لعاب عبداللہ کے مُنہ میں ڈالا اور ان کے لیے دُعائے خیر فرمائی اور یہی اس کی پہلی خوراک تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو عبداللہ بالکل بچّہ تھے لیکن بعد میں بڑے ہوکر انہوں نے اپنے علم و فضل سے بڑا رتبہ حاصل کیا۔ شاہانِ بنواُمیہ کے قابلِ اعتراض مُسلک کو دیکھ کر انہوں نے اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی تھی لیکن بالآخر عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں شہید ہوئے۔ حضرت عائشہؓ انہیں اپنے بچّے کے طور پر سمجھتی تھیں اور اسی لیے انکی کُنیت عبداللہ کے نام پر اُمِّ عبداللہ مشہور ہوگئی تھی۔

انصار کے دو رئیسوں کی وفات

ہجرت کے پہلے سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دو مخلص اصحاب کی وفات کا صدمہ اُٹھانا پڑا یعنی کلثوم بن الہدم

جن کے مکان پر آپ قبا میں قیام فرما ہوتے تھے اور جو ایک معمر آدمی تھے فوت ہو گئے اور اسی زمانہ میں اسعد بن زرارۃ کا بھی انتقال ہوا۔ اسعد ان ابتدائی چھ اشخاص میں سے تھے جنھوں نے مکہ میں بیعت عقبہ اولیٰ سے بھی ایک سال قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی تھی اور جن کے مکان پر اسلام کے سب سے پہلے مبلغ مصعب بن عمیر نے مدینہ میں قیام کیا تھا اور جو ہجرت سے قبل مدینہ میں نماز باجماعت اور جمعہ کا التزام کیا کرتے تھے۔ نیز اسعد ان بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے جو بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار میں مقرر فرمائے تھے۔ چنانچہ اُن کی وفات پر بنو نجار نے جن کے وہ نقیب تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اسعد بن زرارہ کا کوئی قائم مقام مقرر فرمایا جاوے لیکن چونکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نے فرمایا اب مَیں خود تمہارا نقیب ہوں گا اور نقیب کی ضرورت نہیں[1]

دو معاندینِ اسلام کی ہلاکت

اسی سال اسلام کے دو نہایت ذی اثر مخالفین کی موت بھی وقوع میں آئی۔ چنانچہ ولید بن مغیرہ کی موت کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ اسی کے قریب مکہ میں عاص بن وائل کی موت واقع ہوئی[2] یہ دونوں شخص اسلام کے سخت مخالف تھے اور مکہ میں نہایت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے مگر یہ ایک عجیب منظر ہے کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرتا کہ ان مرنے والوں کی اولاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو کر فدایانِ اسلام کی صفِ اوّل میں کھڑی نظر آتی ہے؛ چنانچہ خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کے کارنامے تاریخِ اسلام میں کسی معرفی کے محتاج نہیں۔

---

[1] طبری [2] طبری

جہادِ بالسّیف کا آغاز
اور
جہاد کے متعلق اُصولی بحث

جہاد بالسیف کا آغاز اب ہم ہجرت کے دُوسرے سال اور اسلامی تاریخ کے اس حِصّہ میں داخل ہوتے ہیں جس میں کفّار کے ساتھ مُسلمانوں کی جنگ کا آغاز ہوا۔ جہاد بالسیف کا مسئلہ جس کے ماتحت مُسلمانوں کی تلوار نیام سے باہر آئی باوجود درحقیقت ایک بہت صاف اور سادہ مسئلہ ہونے کے ان متضاد خیالات کی وجہ سے جو بدقسمتی سے خود بعض مسلمانوں کی طرف سے اس کے متعلق ظاہر کئے گئے ہیں اور نیز بعض غیر مُسلم مؤرخین کی تحریرات کی وجہ سے جو انہوں نے مؤرخ کی حیثیت سے ہٹ کر ایک متعصب مذہبی مناظر کی حیثیت میں لکھی ہیں ایک نہایت پیچدار مسئلہ بن گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے ابتداءً تلوار کے سایہ کے نیچے پرورش پائی جو ہر اس شخص کے سر پر اُٹھتی تھی جو اسلام لانے سے انکار کرتا تھا اور مُسلمانوں کا یہ مذہبی فرض مقرر کیا گیا تھا کہ وُہ تلوار کے زور سے لوگوں کو مُسلمان بنائیں۔ یہ خیال حقیقت سے کس قدر دُور اور صحیح تاریخی واقعات کے کس قدر خلاف ہے؟ اس کا جواب ذیل کے اوراق میں ملے گا۔ حقیقتِ حال یہ ہے اور اس حقیقت کے شواہد ابھی ظاہر ہو جائیں گے کہ اس ابتدائی زمانہ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابہؓ نے ابتداءً جو کچھ کیا وہ دفاع اور خود حفاظتی میں کیا اور وہ بھی اس وقت کیا جبکہ قریش مکّہ اور ان کی انگیخت پر دُوسرے قبائل عرب کی معاندانہ کارروائیاں اس حد کو پہنچ چکی تھیں کہ ان سے مقابلہ میں مُسلمانوں کا خاموش رہنا اور اپنی حفاظت کے لیے ہاتھ نہ اُٹھانا خودکشی کے ہم معنی تھا۔ جسے کوئی عقلمند نظرِ استحسان سے نہیں دیکھ سکتا اور پھر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس دفاعی جنگ کے دوران جو جو کارروائیاں فرمائیں وہ حالات پیش آمدہ کے ماتحت نہ صرف بالکل جائز اور دُرست تھیں بلکہ جنگی ضابطہ اخلاق کا جو معیار آپؐ نے قائم فرمایا وہ آج بھی دُنیا کے واسطے ایک بہترین نمونہ ہے جس سے زیادہ سختی اور سزا کی طرف مائل ہونا عدل اور رحم کے منافی ہے اور جس سے زیادہ نرمی اور رعایت کا طریق اختیار کرنا دُنیا کے اَمن کے لیے

بہم قائل۔ درحقیقت اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ فطرت کا مذہب ہے اس لیے نہ تو وہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر صورت میں ہر گناہ اور ہر جرم کی سزا ہونی چاہیئے اور نہ وہ یہ سکھاتا ہے کہ کسی حالت میں بھی بدی کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہ ہر دو تعلیمات افراط و تفریط کی راہیں ہیں اور ان پر عمل کرنے سے کبھی بھی امن قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اقوام و افراد کے اخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے اور صحیح اور سچی تعلیم یہی ہے کہ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ[1] یعنی " بدی اور جرم کی سزا اس کے مناسب حال ہونی چاہیئے لیکن اگر عفو کرنے سے اصلاح ہوتی ہو تو عفو کرنا چاہیئے اور اس رنگ میں عفو کرنے والا شخص خدا کے نزدیک اجر کا مستحق ہوگا " یہ قرآنی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جنگی ضابطۂ اخلاق کا خلاصہ ہے اور آپ کی تمام جنگی کارروائیاں اسی آیت کی تفسیر ہیں۔

کیا اسلام میں مذہب کے معاملہ میں جبر کرنا جائز ہے؟

ابتدائی اسلامی لڑائیوں پر نظر ڈالنے سے پیشتر ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اسلام مذہبی معاملات میں جبر کرنے کے متعلق کیا تعلیم دیتا ہے۔ یعنی کیا اسلامی تعلیم کی رُو سے یہ جائز ہے کہ لوگوں کو جبراً اسلام میں داخل کیا جاوے اور تلوار کے ذریعہ اسلام پھیلایا جاوے۔ اگر اسلام جبر کی اجازت دیتا ہے تو پھر بیشک معاملہ مشتبہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اس صورت میں اس بات کا امکان ہوگا کہ شاید ابتدائی اسلامی جنگیں بھی لوگوں کو بزور مسلمان بنانے کی غرض سے کی گئی ہوں لیکن اگر یہ ثابت ہو کہ اسلامی تعلیم کی رُو سے مذہب میں جبر ممنوع ہے تو پھر یہ ایک قوی ثبوت اس بات کا ہوگا کہ یہ ابتدائی اسلامی لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی غرض سے نہ تھیں بلکہ ان کی وجوہات کوئی اور تھیں۔ کیونکہ یہ ہرگز ممکن نہیں اور کوئی عقلمند اسے قبول نہیں کر سکتا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ایسے برملا طور پر اس تعلیم کے خلاف قدم مارا ہو جو وہ خدا کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے اور جس پر ان کی قومی ہستی کا دارومدار تھا۔

اب ہم قرآن شریف پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں صریح طور پر جبری اشاعت کے خلاف احکام پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ[2]

" اے رسُول! تو کہہ دے لوگوں سے کہ یہ اسلام حق ہے تمہارے ربّ کی طرف سے پھر اس کے بعد جو چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے "

پھر فرماتا ہے:

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَھْتَدِیْ لِنَفْسِہٖ

---

[1] قرآن شریف سورۃ شوریٰ : ۴۱

[2] کہف : ۳۰

وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ[1]

"یعنی اے رسول! تو لوگوں سے کہدے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آتا ہے۔ پس اب جو شخص ہدایت کو قبول کریگا تو اُس کا فائدہ خود اسی کے نفس کو ہوگا اور جو غلط راستہ پر چلے گا اُس کا وبال بھی خود اُسی کی جان پر ہے اور مَیں کوئی تمہاری ہدایت کا ذمہ دار نہیں ہوں۔"

پھر فرماتا ہے:-

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ[2]

یعنی "دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہونا چاہیئے۔ ہدایت اور گمراہی کا معاملہ پوری طرح کھل چکا ہے۔ پس اب جو شخص گمراہی کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آئے گا۔ وہ گویا ایک نہایت مضبوط کڑے کو پکڑ لے گا۔ جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا اور اللہ سُننے والا جاننے والا ہے۔"

اس قرآنی آیت کی عملی تشریح میں ایک حدیث آتی ہے کہ فَلَمَّا أُجْلِيَتْ بَنُو نَضِيرٍ كَانَ فِيهِمْ مِنْ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ فَقَالُوا لَا نَدَعُ أَبْنَاءَنَا فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ[3] یعنے جب بنو نضیر مدینہ سے جلا وطن کئے گئے تو ان میں وہ لوگ بھی تھے جو انصار کی اولاد تھے[4] انصار نے انہیں روک لینا چاہا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآنی آیت کے ماتحت کہ دین کے معاملہ میں جبر نہ ہونا چاہیئے انصار کو منع فرمایا کہ ایسا نہ کریں۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت کے متعلق وثیق رومی کی ایک روایت آتی ہے کہ كُنْتُ مَمْلُوكًا لِعُمَرَ فَكَانَ يَقُولُ أَسْلِمْ ...... قَالَ فَأَبَيْتُ فَقَالَ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ فَلَمَّا حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ إِعْتَقَنِي فَقَالَ إِذْهَبْ حَيْثُ شِئْتَ[5] یعنی وثیق رومی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں مَیں ان کا غلام ہوتا تھا۔ آپؓ مجھ سے فرماتے رہتے تھے کہ مُسلمان ہو جاؤ مگر مَیں انکار کرتا تھا اور حضرت عمرؓ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے کہ اچھا۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ یعنی "دین کے معاملہ میں جبر جائز نہیں ہے۔" پھر جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے مجھے خود بخود آزاد کر دیا اور فرمایا اب جہاں چاہتے ہو چلے جاؤ۔

---

[1] سورۃ یونس: ۱۰۹ ؛ [2] سورۃ بقرۃ: ۲۵۷ ؛ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد ؛

[4] زمانہ جاہلیت میں جب کسی اوسی یا خزرجی مُشرک کے اولادِ نرینہ نہ ہوتی تھی تو وہ مَنت مانتا تھا کہ اگر میرے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوا تو مَیں اسے یہودی بنادونگا۔ اس طرح اوس و خزرج کے کئی بچے یہودی بن گئے تھے۔

[5] عوارف بروایت ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ؛

پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ

"یعنی اے رسُول! کہدے اہلِ کتاب اور مشرکین سے کہ کیا تم اسلام کو قبول کرتے ہو؟ یعنی ان کو اسلام کا پیغام پہنچا دے۔ پھر اگر وہ اسلام کو قبول کر لیں تو جانو کہ وہ ہدایت پا گئے، لیکن اگر وہ تیری دعوت کو رَدّ کر دیں تو تیرا کام تو صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خود دیکھ رہا ہے"

قرآن شریف کی یہ آیات جنکو میں نے اُن کے نازل ہونے کی تاریخ کے مطابق ترتیب کے ساتھ درج کیا ہے اس بات کا ایک قطعی ثبوت ہیں کہ اسلامی تعلیم کی رُو سے دین کے معاملہ میں جبر کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اسلام نے دین کے معاملہ کو ہر شخص کے ضمیر پر چھوڑ دیا ہے کہ جس مذہب کو کوئی شخص اپنے لئے پسند کرے اختیار کرے ان آیات میں سے سورہ کہف کی آیت مکی زمانہ کی ہے۔ سُورۃ یونس کی آیت بعض محققین کے نزدیک مکی زمانہ کے آخری ایام کی ہے اور بعض کے نزدیک مدنی ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت مدینہ کے ابتدائی سالوں کی ہے جبکہ اسلامی جنگوں کا آغاز ہوا تھا اور سُورۃ آل عمران کی آیت مدینہ کے آخری زمانہ کی ہے جبکہ مکہ اور طائف وغیرہ فتح ہو چکے تھے اور عرب کی جنگوں کا قریباً خاتمہ تھا۔ گویا یہ مختلف آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف زمانوں میں نازل ہوئی تھیں اور آخری آیت آپؐ کی وفات کے قریب نازل ہوئی تھی اور یہ ساری آیات قطعی اور یقینی طور پر جبری اشاعت کو ممنوع قرار دیتی ہیں اور رسول کا صرف یہ کام بتاتی ہیں کہ وہ اپنی تعلیم کو کھول کھول کر لوگوں کو سُنا دے۔ آگے ماننا نہ ماننا لوگوں کا اپنا کام ہے۔ اب کیا یہ ممکن ہے کہ اس صریح اور واضح تعلیم کے ہوتے ہوئے جو ببانگ بلند دن رات لوگوں کو سُنائی جاتی تھی اور جس کی طرف کفار کو بُلایا جاتا تھا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کے لیے تلوار ہاتھ میں لیکر نکلتے۔ اور پھر کیا اس صورت میں کفار یہ اعتراض نہ کرتے کہ تم نے اپنے خدا کا کلام تو جبر کے خلاف سُناتے ہو اور خود جبر کرتے ہو، مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ کفار کی طرف سے کبھی یہ اعتراض نہیں ہوا، حالانکہ ان کی عادت تھی کہ خوب ہی کھول کھول کر آپؐ کے خلاف اعتراض کیا کرتے تھے اور ان کے اعتراضات قرآن کریم اور کتب حدیث و تاریخ میں کثرت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

آغازِ جہاد کے وقت مسلمانوں کی حالت جبر کے خیال کی تکذیب ہے

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت مسلمانوں کی طرف سے جہاد کا آغاز ہوا اُس وقت ان کی جو حالت تھی وُہ بھی جبر کے خیال کو جُھٹلاتی ہے۔ بھلا گنتی کے چند لوگ جنکے خلاف

سورۃ آل عمران ۲۱ : ۱

گویا سارا ملک ہتھیار بند تھا اور دشمن کا یہ حال تھا کہ خوف کے مارے ان کو رات کو نیند نہیں آتی تھی وہ جبر کے خیال سے جنگ شروع کرسکتے ہیں؟ ایسی حالت میں تو صرف وہی شخص لڑائی کے لیے نکل سکتا ہے جو یا تو یہ سمجھتا ہو کہ اب موت سے بچنے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو یہی ہے کہ خود حفاظتی کے لیے تلوار نکالی جاوے اور یا وہ یہ خیال کرتا ہو کہ اب مرنا تو ہے ہی کیوں نہ مردوں کی طرح میدانِ جنگ میں جان دی جاوے۔ ان دو غرضوں کے سوا کسی اور غرض کے لیے کوئی شخص جو مجنون نہیں ہے اس حالت میں لڑائی کے لیے نہیں نکل سکتا جو اس وقت مسلمانوں کی تھی۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی ابتدائی لڑائیاں دفاع اور خود حفاظتی کے لیے تھیں نہ کہ جبر اور تشدد کی غرض سے۔

کبھی کوئی شخص جبراً مسلمان نہیں بنایا گیا

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کی یہ لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی غرض سے تھیں تو تاریخ سے ہمیں ایسے لوگوں کی مثالیں نظر آنی چاہئیں جو بزور مسلمان بنائے گئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ہزاروں مسلمانوں اور کافروں کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں کوئی ایک مثال تو ایسے شخص کی ملنی چاہیئے جسے تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی جبری تبلیغ کی نظر نہیں آتی۔ ہاں دُوسری طرف ایسی مثالیں تاریخ سے ثابت ہیں کہ عین لڑائی کے دوران میں کسی مشرک نے اسلام کا اظہار کیا، لیکن مسلمانوں نے اس خیال سے کہ یہ شخص ڈر کر اسلام کا اعلان کر رہا ہے اور اس کے اسلام کے اظہار کے ساتھ دل کی تصدیق شامل نہیں ہے اس کے اسلام کو اسلام نہیں سمجھا اور اسے تلوار کی گھاٹ اُتار دیا! چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک لڑائی میں اسامہ بن زید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے صاحبزادے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز تھے ایک کافر کے سامنے ہوئے جب اس کافر نے دیکھا کہ اسامہ نے اُس پر غلبہ پالیا ہے تو کہنے لگا کہ میں مسلمان ہوتا ہوں لیکن اسامہ نے اس کی پروا نہ کی اور اپنا نیزہ چلا دیا۔ جب لڑائی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس واقعہ کا ذکر ہوا تو آپؐ اسامہ پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ جب وہ شخص اسلام کا اظہار کرتا تھا تو تم نے اسے کیوں مارا؟ اسامہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ ڈر کے مارے ایسا کہتا تھا اور دل میں مسلمان نہیں تھا۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟" یعنی بالکل ممکن ہے کہ اسی وقت اس پر اسلام کی صداقت کھل گئی ہو اور وہ دل سے مسلمان ہو گیا ہو۔ مثلاً ایسا ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کا یہ معیار رکھا ہو کہ اگر میں لڑائی میں غالب آگیا تو معلوم ہوگا کہ ہمارے بُت جن کے لیے میں لڑ رہا ہوں سچے ہیں لیکن اگر میں مغلوب ہو گیا تو ثابت ہوگا کہ خدا ایک ہے۔ بہرحال اس کا میدانِ جنگ میں مسلمان ہونا اس بات کا یقینی ثبوت نہیں تھا کہ وہ ڈر کر مسلمان ہوتا ہے پس جب اس بات کا امکان تھا کہ وہ دل سے مسلمان ہوتا ہے تو اسامہ کو اپنا ہاتھ روک لینا چاہیئے تھا اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن پر ناراض ہوئے اور اسامہ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ مجھ پر اس قدر ناراض ہوئے کہ میں نے یہ تمنا کی کہ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا اور اب اس کے بعد مسلمان ہوتا تاکہ آپؐ کی یہ ناراضگی میرے حصّہ میں نہ آتی۔ (مسلم کتاب الایمان)

پھر تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ اگر کسی وجہ سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی شخص کے متعلق یہ علم ہوگیا ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوا بلکہ محض ڈر یا طمع کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے تو آپؐ نے اس کا اسلام قبول نہیں فرمایا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ایک روایت آتی ہے کہ کسی لڑائی میں صحابہ نے ایک ایسے کافر کو قید کیا جو بنو ثقیف کے حلیفوں میں سے تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قیدی کے پاس سے گذرے تو اس نے قید سے رہائی پانے کے خیال سے کہا کہ "اے محمدؐ! مجھے کیوں قید میں رکھا جاتا ہے میں تو مسلمان ہوتا ہوں" آپؐ نے فرمایا "اگر تم اس حالت سے پہلے اسلام لاتے تو خدا کے حضور یہ اسلام مقبول ہوتا اور تم نجات پا جاتے مگر اب نہیں" اس کے بعد آپؐ نے اس کے بدلے میں دو مسلمان قیدی بنو ثقیف سے چھڑوالئے اور اُسے کفار کو واپس کر دیا۔[1] الغرض تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ صحابہ نے کسی شخص کو تلوار سے ڈرا کر مسلمان بنایا ہو بلکہ جو مثال بھی ملتی ہے اس کے خلاف ملتی ہے اور یہ اس بات کا ایک عملی ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی یہ لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی غرض سے نہ تھیں۔

اس جگہ اگر کسی کو یہ شُبہ پیدا ہو کہ لڑائی میں کسی کافر کی طرف سے اسلام کے اظہار پر اُسے چھوڑ دینا یہ بھی تو ایک رنگ کا جبر ہے تو یہ ایک جہالت کا اعتراض ہوگا کیونکہ مخاصمت کے دُور ہو جانے پر لڑائی سے ہاتھ کھینچ لینا حسنِ اخلاق اور احسان ہے نہ کہ جبر و ظلم۔ کفارِ عرب کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ کرنا صرف اس بنا پر تھا کہ انھوں نے آپؐ کے خلاف تلوار اُٹھائی تھی اور اسلام کی پُر امن تبلیغ کو بزور روکنا چاہتے تھے اور اس کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملک میں امن اور مذہبی آزادی قائم کرنا چاہتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص مسلمان ہو جاتا ہے تو قطع نظر اس کے کہ اسے گھر میں بیٹھے ہوئے اسلام پر شرح صدر پیدا ہوتا ہے یا میدانِ جنگ میں جب بھی وہ اسلام کا اظہار کریگا تو اس کے اس اظہار کے کم از کم یہ معنے ضرور ہوں گے کہ اب اس کی طرف سے وہ خطرہ دُور ہو گیا ہے جن کی بناء پر یہ جنگ ہو رہی تھی تو اس صورت میں لازماً اس کے خلاف کارروائی بند کر دی جاوے گی۔ درحقیقت جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائے گا جنگ کی ابتدا تو کفار کی طرف سے تھی۔ پس جب کوئی شخص مسلمان ہوتا تھا تو طبعاً اس کے یہ معنے ہوتے تھے کہ اب وہ جنگ کو ترک کر کے صلح کی طرف مائل ہوتا ہے پس اس کے خلاف لڑائی روک دی جاتی تھی۔ یہی مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ[2] یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان کفار سے جنگ کروں جو اسلام کے خلاف میدانِ جنگ میں نکلے ہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ مسلمان ہو جائیں" مگر غلطی سے بعض لوگوں نے اس حدیث کے یہ معنے سمجھ لیے ہیں کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دُنیا کے تمام کافروں کے خلاف اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ مسلمان ہو جائیں؛ حالانکہ یہ معنے قرآنی تعلیم اور تاریخی واقعات کے صریح خلاف ہیں اور یہ ایک سراسر خلافِ دیانت فعل ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول کے وہ معنے چھوڑ کر جو قرآن و تاریخ کے مطابق

---

[1] مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب حکم الاسراء ۔ [2] مسلم کتاب الایمان ۔

ہیں اور لغتِ عرب کی رُو سے بھی ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا وہ معنے کئے جاویں جو واضح قرآنی تعلیم اور صریح تاریخی واقعات کے بالکل خلاف ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا یہی مطلب ہے کہ جن کفار نے مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھائی ہے اور مُلک میں نقضِ اَمن کا موجب ہو رہے ہیں مجھے اُن کے خلاف لڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن اگر وُہ مسلمان ہو جائیں اور اُن کی طرف سے یہ خطرہ جاتا رہے تو مجھے لڑائی بند کر دینے کا حکم ہے۔ گویا مراد یہ ہے کہ مجھے ان کفار کے خلاف اس وقت تک لڑنے کا حکم ہے کہ یا تو جنگ کا طبعی نتیجہ ظاہر ہو جاوے یعنی یہ لوگ جو اسلام کے خلاف اُٹھے ہوئے ہیں مفتوح ہو جائیں اور جنگ کا خاتمہ ہو جاوے اور یا وہ اسلام کی صداقت کے قائل ہو کر مسلمان ہو جائیں اور ان کی طرف سے اَمن شکنی کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ صرف اسلام کے اظہار پر ہی لڑائی بند نہیں ہوتی تھی بلکہ اگر کوئی قبیلہ مسلمانوں کے خلاف جنگ ترک کر دیتا تھا اور مسلمانوں کی سیاسی حکومت کو قبول کر لیتا تھا تو خواہ وُہ کفر و شرک پر ہی قائم رہتا تھا اس کے خلاف بھی جنگ کی کارروائی روک دی جاتی تھی، چنانچہ اس کی بہت سی مثالیں تاریخ میں مذکور ہیں جو اپنے موقعہ پر بیان ہوں گی۔ الغرض اسلام کے اظہار پر لڑائی بند کر دینے کے حکم کا قطعاً کوئی تعلق جبر سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک حسن سیاست کا فعل ہے جو ہر عقل مند کے نزدیک قابلِ تعریف سمجھا جانا چاہیئے۔ یہ تشریح جو اس حدیث کی گئی ہے یہ محض عقلی تشریح نہیں بلکہ خود قرآن کریم کمال صراحت کے ساتھ اس تعلیم کو پیش کرتا ہے کہ اگر کفار اپنے مظالم سے باز آجائیں اور مُلک میں فساد اور اَمن شکنی کا موجب نہ بنیں تو اس صورت میں مسلمانوں کو ان کے خلاف فوراً کارروائی روک دینی چاہیئے، چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ [1]

یعنی "اے مسلمانو! تم جنگ کرو ان کفار سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اس وقت تک کہ مُلک میں فتنہ نہ رہے اور ہر شخص اپنے خدا کے لیے (نہ کسی ڈر اور تشدد کی وجہ سے) جو دین بھی چاہے رکھ سکے اور اگر یہ کفار اپنے ظلموں سے باز آجائیں تو تم بھی رُک جاؤ کیونکہ تمہیں ظالموں کے سوا کسی کے خلاف جنگی کارروائی کرنے کا حق نہیں ہے۔"

اس آیت کی تفسیر حدیث میں اس طرح آتی ہے کہ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ۔ قَالَ ابْنُ عُمَرَ قَدْ فَعَلْنَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ كَانَ الْاِسْلَامُ قَلِيْلًا فَكَانَ الرَّجُلُ يُفْتَنُ فِيْ دِيْنِهٖ اِمَّا يَقْتُلُوْهُ وَاِمَّا يُوْثِقُوْهُ حَتّٰى كَثُرَ الْاِسْلَامُ فَلَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ [2] یعنی یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لڑو ان کفار سے جو تم سے لڑتے ہیں اس وقت تک کہ مُلک میں فتنہ نہ رہے اس کے متعلق ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اس الٰہی حکم کی تعمیل یوُں کی کہ جبکہ رسول اللہ کے زمانہ میں مسلمان بہت تھوڑے تھے اور جو شخص اسلام

---

[1] بقرہ: ۱۹۴ [2] بخاری کتاب التفسیر سورۃ انفال: ۴۰

لاتا تھا اسے کفار کی طرف سے دین کے راستے میں دُکھ دیا جاتا تھا اور بعض کو قتل کر دیا جاتا تھا اور بعض کو قید کر دیا جاتا تھا۔ پس ہم نے جنگ کیا اس وقت تک کہ مسلمانوں کی تعداد اور طاقت زیادہ ہو گئی اور نو مسلموں کے لیے فتنہ ندر ہا۔ اس واضح اور بیّن آیت اور اس واضح اور بیّن حدیث کے ہوتے ہوئے ذو معنیین حدیث سے جبری اشاعت کی تعلیم ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہرگز دیانتداری کا فعل نہیں سمجھا جا سکتا۔

صحابہ کی زندگیاں جبر کے خیال کی مکذّب ہیں

پھر سچے ایمان کی بعض علامات ہیں جن سے وُہ پہچانا جاتا ہے اور جو کبھی بھی اس شخص میں پیدا نہیں ہو سکتیں جو تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو۔ مثلاً سچے ایمان میں محبت ہوتی ہے۔ اخلاص ہوتا ہے قربانی ہوتی ہے غیرت ہوتی ہے اور ناممکن ہے کہ یہ باتیں اس شخص میں پائی جائیں جس کا ایمان محض دکھاوے کا ایمان ہے اور جو صرف خوف کی وجہ سے کسی عقیدہ کا اظہار کرتا ہے مگر اس کا دل اس ایمان سے خالی ہوتا ہے۔ پس ہمیں صحابہؓ کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور پھر دیکھنا چاہیئے کہ کیا ان کا حال ان لوگوں کا سا نظر آتا ہے جن کا مذہب تلوار کے زور سے تبدیل کیا گیا ہو؟ کیا ان کے ایمان میں محبت کی بُو نہیں؟ کیا ان کے دل اخلاص سے خالی نظر آتے ہیں؟ کیا اُن میں قربانی کی رُوح نہیں پائی جاتی؟ کیا ان میں غیرت کی کمی محسوس ہوتی ہے؟ اگر یہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ اور یہ سب علامات صحابہ میں موجود ہیں اور نہ صرف موجود ہیں بلکہ بدرجہ کمال پائی جاتی ہیں اور ان کی زندگیوں کا ہر کارنامہ ان کے ایمان ان کے اخلاص اور اسلام کے لیے اُن کی محبت اور قربانی اور غیرت پر شاہد ہے تو یہ کس قدر ظلم ہو گا کہ ان کے ایمان کی سچائی پر شُبہ کیا جاوے۔ دُور نہ جاؤ عکرمہ بن ابوجہل کی ہی مثال لے لو۔ باپ ابوجہل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خُون کا پیاسا تھا اور اسی کوشش میں ہلاک ہوا۔ خود عکرمہ کا یہ حال تھا کہ ہر لڑائی میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑا اور اسلام کو مٹانے کے لیے اس نے اپنی تمام کوشش صرف کر دی اور بالآخر جب مکہ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ماتحتی کو اپنے لیے موجب ذلت سمجھ کر مکہ سے بھاگ گیا اور مورخین لکھتے ہیں کہ وُہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے قتل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا، لیکن بالآخر جب وُہ مسلمان ہوا تو اس کے ایمان و اخلاص کا یہ حال تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں اس نے باغیوں کے قلع قمع کرنے میں بے نظیر جان نثاریاں دکھلائیں اور جب ایک جنگ میں سخت گھمسان کا رن پڑا اور لوگ اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے تھے جیسے درانتی کے سامنے گھاس گرتا ہے اس وقت عکرمہ چند ساتھیوں کو لے کر عین قلب لشکر میں جا کر دا۔ بعض لوگوں نے منع کیا کہ اس وقت لڑائی کی حالت سخت خطرناک ہو رہی ہے اس طرح دشمن کی فوج میں گھُسنا ٹھیک نہیں ہے لیکن عکرمہ نہ مانا اور یہی کہتا ہوا آگے بڑھتا گیا کہ "مَیں لات وعزّیٰ کی خاطر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑا ہوں۔ آج خدا کے رستے میں لڑتے ہوئے پیچھے نہیں رہوں گا" لڑائی کے خاتمہ پر دیکھا گیا تو اس کی لاش نیزوں تلوار کے زخموں سے چھلنی تھی۔ مالی قربانی کا یہ حال تھا کہ جب غنائم میں سے عکرمہ کو کوئی حصّہ ملتا تو وہ اسے صدقہ وخیرات اور خدمت دین میں بے دریغ خرچ کر دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ ایک زمانہ تھا کہ مَیں خدا کے دین کے خلاف

خرچ کیا کرتا تھا اب جب تک خدا کی راہ میں خرچ نہ کروں مجھے چین نہیں آتا[1] کیا یہ وہ لوگ ہیں جو تلوار کے ڈر سے مسلمان ہوتے تھے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح کی خواہش جبر کے خیال کو جھٹلاتی ہے

ایک اور ثبوت اس بات کا کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی غرض سے نہ تھیں یہ ہے کہ آپ ہمیشہ صلح کے خواہشمند رہتے تھے۔ اور آپ کی یہ انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح یہ لڑائیاں بند ہو جاویں اور ملک میں امن وامان کی صورت پیدا ہو! چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش نے سخت سے سخت شرطیں پیش کیں۔ حتٰی کہ اکثر مسلمانوں نے ان شرطوں کے قبول کرنے کو اپنے لیے موجب ذلت سمجھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بات کی پروا نہ کی اور جس طرح قریش نے کہا اسی طرح ان کی شرطیں مان کر صلح کر لی۔ اب غور کا مقام ہے کہ اگر ان لڑائیوں میں آپ کی غرض یہ تھی کہ کفار کو تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جاوے تو صورت حال یہ ہونی چاہیئے تھی کہ قریش صلح پر زور دیتے اور ایسی نرم شرطیں پیش کرتے جنھیں مسلمان بخوشی مان لینے کو تیار ہو جاتے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلہ میں سختی کا پہلو اختیار کرتے اور صلح کی تجویز کو آنوں بانوں سے ٹال کر جنگ چھیڑے رکھتے تا کہ کفار کے جبراً مسلمان بنانے کا موقعہ میسر رہتا۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے جو اس بات کا ایک یقینی ثبوت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش یہ تھی کہ جس طرح بھی ہو یہ جنگ رک جاوے اور ملک میں امن وامان کی صورت پیدا ہو۔ پھر اسی موقعہ پر جو قرآنی آیت نازل ہوئی وہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان لڑائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض جبری تبلیغ نہ تھی بلکہ قیام امن تھی! چنانچہ بخاری[2] میں روایت آتی ہے کہ یہ آیت قرآنی کہ اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا[3] یعنی ہم نے تجھے یہ ایک بڑی کھلی کھلی فتح عطا کی ہے۔ صلح حدیبیہ ہی کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے صلح اور قیام امن کا نام مسلمانوں کے لیے ایک کھلی کھلی فتح رکھا ہے اور حق بھی یہ ہے کہ صلح حدیبیہ ایک نہایت عظیم الشان فتح تھی جس کے مقابل میں ایک طرح سے بدر وخندق بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ کیونکہ گو بدر وخندق میں کفار کو ہزیمت ہوئی اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں پسپا ہو کر لوٹے لیکن ان جنگوں میں مسلمانوں کو ان کے جہاد کا مقصد حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ کفار ابھی تک اسی طرح برسرپیکار تھے اور جنگ جاری تھی۔ لیکن حدیبیہ میں گو کوئی کشت وخون نہیں ہوا اور بظاہر مسلمانوں کو دب کر صلح کرنی پڑی۔ لیکن ان کے جہاد کا مقصد حاصل ہو گیا یعنی جنگ رک گئی اور ملک میں امن قائم ہو گیا۔ پس حقیقی فتح صلح حدیبیہ ہی تھی اور اسی لیے خدا نے اس کا نام فتح مبین رکھا اور یہ ایک نہایت زبردست ثبوت اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کی لڑائیاں

---

[1] اصابہ و اسد الغابہ و استیعاب۔

[2] بخاری کتاب التفسیر۔ [3] سورۃ فتح: ۲۔

دفاع یا قیامِ اُمن کے لیے تھیں نہ کہ اسلام کو بزور پھیلانے کی غرض سے۔

صلح کے زمانہ میں مسلمانوں کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی

ایک اور جہت سے بھی اس سوال پر غور ہو سکتا ہے اور وُہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جاوے کہ آیا صُلح کے زمانہ میں اسلام کو زیادہ ترقی حاصل ہوئی یا کہ جنگ کے زمانہ میں۔ اگر یہ ثابت ہو جاوے کہ صلح کے زمانہ میں اسلام نے جنگ کے زمانہ کی نسبت غیر معمولی سُرعت کے ساتھ ترقی کی تھی تو یہ اس بات کا ایک عملی ثبوت ہوگا کہ یہ لڑائیاں اسلام کی جبری اشاعت کی غرض سے نہ تھیں۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال سے عملی جنگ کا آغاز ہو گیا تھا اور صُلح حدیبیہ ہجرت کے چھٹے سال میں وقوع میں آئی۔ گویا صلح حدیبیہ سے پہلے مُسلمانوں پر قریباً پانچ سال جنگ کی حالت میں گذرے تھے۔ ان پانچ سالوں میں مُسلمانوں کی تعداد کا اندازہ ان سپاہیوں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے جو اسلامی فوج میں شامل ہو کر شریکِ جنگ ہوتے تھے۔ اعلانِ جنگ ماہ صفر ۲ سنہ ہجری میں ہوا اور قریش کے ساتھ مُسلمانوں کی پہلی لڑائی رمضان ۲ سنہ ہجری میں بدر کے موقعہ پر ہوئی۔ جہاں مُسلمان کچھ اوپر تین سو تھے۔ دُوسری لڑائی شوال ۳ سنہ ہجری میں اُحد کے موقعہ پر ہوئی جہاں مسلمانوں کی تعداد سات سو تھی۔ تیسری لڑائی شوال ۵ سنہ ہجری میں ہوئی جو غزوہ احزاب یا غزوہ خندق کے نام سے مشہور ہے اس میں مُسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ لڑائی چونکہ مدینہ میں ہوئی تھی اس لیے اس میں مسلمان زیادہ کثرت کے ساتھ شامل ہو سکے تھے ورنہ اگر دُور کا سفر ہوتا تو غالباً اس زمانہ میں اس کثرت کیساتھ مسلمان شامل نہ ہو سکتے کیونکہ کمزور اور ضعیف اور غریب لوگ کثرت سے رہ جاتے۔ بہرحال اس جنگ میں تین ہزار مُسلمان شریک ہوئے۔ اس کے بعد ذوقعدہ ۶ سنہ ہجری میں غزوہ صُلح حدیبیہ وقوع میں آیا اور اس میں ڈیڑھ ہزار مسلمان شامل ہوئے۔ گویا اس چار پانچ سالہ جنگی زمانہ کے آخری غزوہ میں مُسلمانوں کی تعداد تین سو سے لے کر ڈیڑھ ہزار تک پہنچی تھی اور اگر غزوہ خندق کی تعداد پر بنیاد رکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ تعداد تین ہزار تک پہنچی تھی۔ اس کے بعد صُلح کا زمانہ شروع ہوا اور قریباً پونے دو سال تک صُلح رہی لیکن اس صلح کے زمانہ میں جس غیر معمولی سرعت سے اسلام کی ترقی ہوئی وُہ اس تعداد سے معلوم کی جا سکتی ہے جو غزوہ فتح مکہ کے موقعہ پر جو رمضان ۸ سنہ ہجری میں ہوا مُسلمانوں کی تھی۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس غزوہ میں اسلامی لشکر کی تعداد دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ گویا چار پانچ سالہ جنگ کے زمانہ میں قابلِ جہاد مُسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار یا زیادہ سے زیادہ تین ہزار تک پہنچی تھی اور پونے دو سالہ اُمن کے زمانہ میں یہ تعداد دس ہزار کو پہنچ گئی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لڑائیاں اسلام کی جبری اشاعت کی غرض سے نہ تھیں بلکہ دراصل یہ جنگ اسلام کی ترقی میں ایک روک تھی کیونکہ جونہی یہ جنگ ختم ہوئی اسلام سُرعت کے ساتھ پھیلنا شروع ہو گیا۔ دراصل جنگ کی حالت میں بھی لوگ اسلام کی طرف توجہ نہیں کر سکتے تھے اور کئی کمزور طبیعت لوگ کفار کی مخالفت سے بھی ڈرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی جنگ کی مصروفیت کی وجہ سے اصل تبلیغ کا موقعہ بہت کم ملتا تھا، لیکن جب جنگ رُک گئی تو ایک طرف لوگوں کو اسلام کے متعلق غور کرنے کا موقعہ مل گیا اور کمزور طبائع کا خوف جاتا رہا اور

دُوسری طرف تبلیغ کی سرگرمی زیادہ ہوگئی اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وُہ ہمارے سامنے ہے۔

فتح مکّہ کے موقعہ پر سینکڑوں کفّار اسلام سے مُنکر رہے

ایک اور دلیل اس بات کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لڑائیاں اسلام کی جبری اشاعت کے لیے نہیں تھیں یہ ہے کہ غزوہ مکّہ کے موقعہ پر جب مکّہ مُسلمانوں کے ہاتھ فتح ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ایک فاتح کی حیثیت میں مکّہ میں داخل ہوئے اس وقت گو بعض لوگ قریش مکہ میں سے اپنی مرضی سے مُسلمان ہوگئے تھے لیکن بہت سے قریش کُفر پر قائم رہے اور اُن سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ جوں جوں ان لوگوں کو اسلام کے متعلق شرح صدر ہوتا گیا وہ اپنی مرضی سے مسلمان ہوتے گئے ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں تھی؛ چنانچہ صفوان بن اُمیّہ جو کہ مکّہ کے رئیس اُمیّہ بن خلف کا لڑکا تھا اور اسلام کا سخت دشمن تھا وہ بھی فتح مکّہ کے موقعہ پر مسلمان نہیں ہوا اور کفر کی حالت میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر غزوہ حنین میں شریک ہوا جس میں اور بھی بہت سے مشرک شریک ہوئے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حُسنِ اخلاق سے اس پر اسلام کی حقانیت کھلتی گئی اور بالآخر وہ خود بشرح صدر مسلمان ہوگیا[۱]۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ لوگوں کو جبراً مسلمان بناتے تھے تو فتح مکّہ کے بعد جبکہ قریش کی طاقت بالکل ٹوٹ چکی تھی اور اسلامی لشکر مکّہ پر قابض تھا اس وقت مکّہ والوں کو کیوں نہ جبراً اسلام میں داخل کیا گیا۔ فتح مکّہ سے بہتر مسلمانوں کے لیے اسلام کی جبری اشاعت کا کونسا موقعہ ہوسکتا تھا۔ جبکہ تلوار کے ذرا سے اشارے سے ایک بہت بڑی جماعت اسلام میں داخل کی جاسکتی تھی، لیکن چونکہ اسلام مذہبی آزادی کا پیغام لیکر آیا تھا اور حکم تھا کہ دین کے معاملہ میں قطعاً کوئی جبر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے کمال دیانتداری کے ساتھ ہر ایک شخص کو اس کے ضمیر پر آزاد چھوڑ دیا کہ جس مذہب پر کوئی چاہے رہے۔ لیکن اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں تھا کہ مشرکین عرب اس کے متعلق ٹھنڈے طور پر غور کرنے کا موقعہ پاتے اور پھر اپنے مذہب کے مقابلہ میں اس کی خوبیوں کے قائل نہ ہوتے؛ چنانچہ لوہے کی تلوار نے نہیں بلکہ براہین و آیات کی تلوار نے اپنا کام کیا اور ایک نہایت قلیل عرصہ میں مکّہ کی سرزمین شرک کے عنصر سے پاک تھی۔

وجوہاتِ جنگ

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کن حالات میں اور کن لوگوں کے خلاف جہاد بالسیف کی اجازت دی گئی اور اس کی کیا وجوہات تھیں اس سوال کے جواب میں ہمیں اپنے پاس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاریخ کے واقعات واضح ہیں۔ ذرا ایک ادنیٰ عقل کا آدمی بھی ان کے مطالعہ سے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہ ہو۔ سب سے پہلی

---

[۱] اصابہ و اسد الغابہ و استیعاب۔

بات تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں جو جو مظالم قریش نے مسلمانوں پر کئے اور جو جو تدابیر اسلام کو مٹانے کی اُنہوں نے اختیار کیں وہ ہر زمانہ میں ہر قسم کے حالات کے ماتحت کسی دو قوموں میں جنگ چھڑ جانے کا کافی باعث ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ سخت تحقیر آمیز استہزاء اور نہایت دلآزار طعن و تشنیع کے علاوہ کفارِ مکہ نے مسلمانوں کو خدائے واحد کی عبادت اور توحید کے اعلان سے جبراً روکا، اُن کو نہایت بے دردانہ طور پر مارا اور پیٹا، ان کے اموال کو ناجائز طور پر غصب کیا۔ ان کا بائیکاٹ کر کے ان کو ہلاک و برباد کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے بعض کو ظالمانہ طور پر قتل کیا۔ ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی۔ حتّٰی کہ ان مظالم سے تنگ آکر بہت سے مسلمان مکہ کو چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ لیکن قریش نے اس پر بھی صبر نہ کیا اور نجاشی کے دربار میں اپنا ایک وفد بھیج کر یہ کوشش کی کہ کسی طرح یہ مہاجرین پھر مکہ میں واپس آجائیں اور قریش اُنہیں اسلام سے منحرف کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور یا ان کا خاتمہ کر دیا جاوے۔ پھر مسلمانوں کے آقا اور سردار کو جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے سخت تکالیف پہنچائی گئیں اور ہر قسم کے دُکھوں میں مبتلا کیا گیا اور قریش کے بھائی بندوں نے طائف میں خدا کا نام لینے پر آپ پر پتھر برسا دیئے حتّٰی کہ آپ کا بدن خون سے تر بتر ہو گیا اور بالآخر مکہ کی قومی پارلیمنٹ میں سارے قبائلِ قریش کے نمائندوں کے اتفاق سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ محمد رسول اللہ کو قتل کر دیا جاوے تا کہ اسلام کا نام و نشان مٹ جاوے اور توحید کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو اور پھر اس خونی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نوجوانانِ مکہ جو مختلف قبائلِ قریش سے تعلق رکھتے تھے رات کے وقت ایک جتھہ بنا کر آپ کے مکان پر حملہ آور ہوئے لیکن خُدا نے آپ کی حفاظت فرمائی اور آپ ان کی آنکھوں پر خاک ڈالتے ہوئے اپنے مکان سے نکل آئے اور غارِ ثور میں پناہ لی۔ کیا یہ مظالم اور یہ خونی قراردادیں قریش کی طرف سے اعلانِ جنگ کا حکم نہیں رکھتیں؟ کیا ان مناظر کے ہوتے ہوئے کوئی عقلمند یہ خیال کر سکتا ہے کہ قریش مکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار نہ تھے؟ پھر کیا قریش کے یہ مظالم مسلمانوں کی طرف سے دفاعی جنگ کی کافی بنیاد نہیں ہو سکتے تھے؟ کیا دُنیا میں کوئی باغیرت قوم جو خودکشی کا ارادہ نہ کر چکی ہو ان حالات کے ہوتے ہوئے اس قسم کے اُلٹی میٹم کے قبول کرنے سے پیچھے رہ سکتی ہے جو قریش نے مسلمانوں کو دیا؟ یقیناً یقیناً اگر مسلمانوں کی جگہ کوئی اور قوم ہوتی تو وہ اس سے بہت پہلے قریش کے خلاف میدانِ جنگ میں اُتر آتی۔ مگر مسلمانوں کو اُن کے آقا کی طرف سے صبر اور عفو کا حکم تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب مکہ میں قریش کے مظالم بہت بڑھ گئے تو عبدالرحمٰن بن عوف اور دُوسرے صحابہؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر قریش کے مقابلہ کی اجازت چاہی، مگر آپ نے فرمایا اِنِّی اُمِرْتُ بِالْعَفْوِ فَلَا تُقَاتِلُوْا[1] یعنی "مجھے ابھی تک عفو کا حکم ہے اس لیے میں تمہیں لڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" چنانچہ صحابہؓ نے دین کی راہ میں ہر قسم کی تکلیف اور ذلت برداشت کی مگر صبر کے دامن کو نہ چھوڑا حتّٰی کہ قریش کے مظالم

---

[1] نسائی کتاب الجہاد

کا پیالہ لبریز ہو کر چھلکنے لگ گیا اور خداوند عالم کی نظر میں اتمام حجت کی میعاد پوری ہو گئی۔ تب خدا نے اپنے بندے کو حکم دیا کہ تُو اس بستی سے نکل جا کہ اب معاملہ عفو کی حد سے گذر چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ ظالم اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہجرت قریش کے الٹی میٹم کے قبول کیے جانے کی علامت تھی اور اس میں خدا کی طرف سے اعلانِ جنگ کا ایک مخفی اشارہ تھا جسے مسلمان اور کفار دونوں سمجھتے تھے چنانچہ دارالندوہ کے مشورہ کے وقت جب کسی شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیا جاوے تو رؤسائے قریش نے اس تجویز کو اسی بنا پر رد کر دیا تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے نکل گیا تو پھر ضرور مسلمان ہمارے الٹی میٹم کو قبول کر کے ہمارے خلاف میدان میں نکل آئیں گے اور مدینہ کے انصار کے سامنے بھی جب بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا سوال آیا تو انہوں نے فوراً کہا کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ ہمیں تمام عرب کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے نکلے اور آپؐ نے مکہ کے در و دیوار پر حسرت بھری نگاہیں ڈال کر فرمایا کہ اے مکہ تُو مجھے ساری بستیوں سے زیادہ عزیز تھا مگر تیرے باشندے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے تو اس پر حضرت ابوبکرؓ نے بھی یہی کہا کہ انھوں نے خدا کے رسُول کو اس کے وطن سے نکالا ہے اب یہ لوگ ضرور ہلاک ہوں گے[1] خلاصہ کلام یہ کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مقیم رہے آپؐ نے ہر قسم کے مظالم برداشت کئے، لیکن قریش کے خلاف تلوار نہیں اُٹھائی۔ کیونکہ اوّل تو پیشتر اس کے کہ قریش کے خلاف کوئی کارروائی کی جاتی سنّت اللہ کے مطابق ان پر اتمام حجت ضروری تھا اور اس کے لیے مہلت درکار تھی۔ دُوسرے خدا کا یہ بھی منشاء تھا کہ مسلمان اس آخری حد تک عفو اور صبر کا نمونہ دکھلائیں کہ جس کے بعد خاموش رہنا خودکشی کے ہم معنے ہو جاوے جو کسی عقلمند کے نزدیک مستحسن فعل نہیں سمجھا جاسکتا۔ تیسرے مکہ میں قریش کی ایک قسم کی جمہوری حکومت قائم تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے شہریوں میں سے ایک شہری تھے۔ پس حسن سیاست کا تقاضا تھا کہ جب تک آپؐ مکہ میں رہیں آپؐ اس حکومت کا احترام فرمائیں اور خود کوئی امن شکن بات نہ ہونے دیں اور جب معاملہ عفو کی حد سے گذر جاوے تو آپؐ وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ چوتھے یہ بھی ضروری تھا کہ جب تک خدا کی نظر میں آپؐ کی قوم اپنی کارروائیوں کی وجہ سے عذاب کی مستحق نہ ہو جاوے اور ان کو ہلاک کرنے کا وقت نہ آجاوے آپؐ ان میں مقیم رہیں اور جب وہ وقت آجاوے تو آپؐ وہاں سے ہجرت فرما جائیں۔ کیونکہ سنّت اللہ کے مطابق نبی جبتک اپنی قوم میں موجود ہو اُن پر ہلاک کر دینے والا عذاب نہیں آتا[2] اور جب ہلاکت کا عذاب آنے والا ہو تو نبی کو وہاں سے چلے جانے کا حکم ہوتا ہے۔ ان وجوہات سے آپؐ کی ہجرت اپنے اندر خاص اشارات رکھتی تھی مگر افسوس کہ ظالم قوم نے نہ پہچانا اور ظلم و تعدی میں بڑھتی گئی ورنہ اگر اب بھی قریش باز آجاتے اور دین کے معاملہ میں جبر سے کام لینا چھوڑ دیتے اور مسلمانوں کو امن کی زندگی

---

[1] نسائی کتاب الجہاد ٭ [2] سورۃ انفال : ۳۴ ٭

بسر کرنے دیتے تو خدا ارحم الراحمین ہے اور اس کا رسُول بھی رحمۃ للعالمین تھا یقیناً اب بھی انہیں معاف کر دیا جاتا اور عرب کو وہ کشت وخون کے نظارے نہ دیکھنے پڑتے جو اس نے دیکھے، مگر تقدیر کے نوشتے پورے ہونے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت نے قریش کی عداوت کی آگ پر تیل کا کام دیا اور وہ آگے سے بھی زیادہ جوش وخروش کے ساتھ اسلام کو مٹانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ان غریب اور کمزور مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھانے کے علاوہ جو ابھی تک مکہ میں ہی تھے سب سے پہلا کام جو قریش نے کیا وہ یہ تھا کہ جونہی کہ ان کو یہ علم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے بچ کر نکل گئے ہیں وہ آپ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے اور وادی بکہ کی چپہ چپہ زمین آپ کی تلاش میں چھان ماری اور خاص غارِ ثور کے مُنہ تک بھی جا پہنچے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمائی اور قریش کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا کہ وہ عین منزلِ مقصود تک پہنچ کر خائب وخاسر واپس لوٹ گئے۔ جب وہ اس تلاش میں مایوس ہوئے تو انہوں نے عام اعلان کیا کہ جو شخص بھی محمد (صلعم) کو زندہ یا مُردہ پکڑ کر لائے گا اُسے ایک سَو اونٹ جو آجکل کی قیمت کے حساب سے قریباً بیس ہزار روپیہ بنتا ہے انعام دیا جائیگا اور اس انعام کے لالچ میں مختلف قبائل کے بیسیوں نوجوان آپ کی تلاش میں چاروں طرف نکل کھڑے ہوئے؛ چنانچہ سراقہ بن مالک کا تعاقب جس کا ذکر کتاب کے حصہ اوّل میں گذر چکا ہے اسی انعامی اعلان کا نتیجہ تھا مگر اس تدبیر میں بھی قریش کو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ غور کیا جاوے تو دو قوموں میں جنگ چھڑ جانے کے لیے صرف یہی ایک وجہ کافی ہے کہ کسی قوم کے آقا وسردار کے متعلق دُوسری قوم اس طرح کا انعام مقرر کرے۔ بہرحال جب یہ تجویز بھی کارگر نہ ہوئی اور قریش کو علم ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امن وعافیت کے ساتھ مدینہ پہنچ گئے ہیں تو جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے رؤسائے قریش نے مدینہ کے رئیس اعظم عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول اور اس کے ساتھیوں کے نام ایک خطرناک تہدیدی خط ارسال کیا جس میں لکھا کہ:

إِنَّكُمْ آوَيْتُمْ صَاحِبَنَا وَإِنَّا نُقْسِمُ بِاللهِ لَتُقَاتِلُنَّهُ أَوْ تُخْرِجُنَّهُ أَوْ لَنَسِيرَنَّ إِلَيْكُمْ بِأَجْمَعِنَا حَتَّى نَقْتُلَ مُقَاتِلَتَكُمْ وَنَسْتَبِيحَ نِسَاءَكُمْ۔[1]

"یعنی تم لوگوں نے ہمارے آدمی (محمد صلعم) کو پناہ دی ہے اور ہمیں خدا کی قسم ہے کہ یا تو تم اس کا ساتھ چھوڑ کر اس کے خلاف جنگ کرو یا کم سے کم اُسے اپنے شہر سے نکال دو ورنہ ہم ضرور بالضرور اپنا سارا لاؤلشکر لے کر تم پر حملہ آور ہو جائیں گے اور تمہارے مردوں کو قتل کر ڈالیں گے اور تمہاری عورتوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنے لئے جائز کر لیں گے۔"

اس خط سے جو تشویش بے چارے مہاجرین کو دامنگیر ہو سکتی تھی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن انصار میں بھی اس نے ایک خطرناک سنسنی پیدا کر دی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ خود عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس

---

[1] ابوداؤد کتاب الخراج

تشریف لے گئے اور اسے یہ سمجھا کر ٹھنڈا کیا کہ تمہارے اپنے عزیز و اقارب میرے ساتھ ہیں کیا تم اپنے جگر گوشوں سے جنگ کرو گے؟ انہی ایام کے قریب سعد بن معاذ رئیس اوس عمرہ کی غرض سے مکہ آئے تو انہیں دیکھ کر ابوجہل کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس نے بگڑ کر کہا کہ "تم نے (نعوذ باللہ) اس مرتد (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو پناہ دی ہے کیا تمہارا خیال ہے کہ تم اس کی حفاظت کر سکو گے"[1] اس زمانہ میں قریش کو اسلام کے استیصال کا اتنا خیال تھا کہ ولید بن مغیرہ رئیس مکہ جب مرنے لگا تو بے اختیار ہو کر رونے لگ گیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا تکلیف ہے۔ اس نے جواب دیا میں ڈرتا ہوں کہ میرے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین نہ پھیل جاوے۔ رؤسا قریش نے کہا "تم فکرمند نہ ہو" ہم اس بات کے ضامن ہیں کہ اس کے دین کو نہیں پھیلنے دیں گے[2] یہ سب ہجرت کے بعد کی باتیں ہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے مظالم سے تنگ آکر مکہ کو چھوڑ چکے تھے اور خیال کیا جا سکتا تھا کہ اب قریش مسلمانوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں گے۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ جب قریش نے دیکھا کہ اوس و خزرج مسلمانوں کی پناہ سے دستبردار نہیں ہوتے اور اندیشہ ہے کہ اسلام مدینہ میں جڑ نہ پکڑ جاوے تو انہوں نے دوسرے قبائل عرب کا دورہ کر کر کے ان کو مسلمانوں کے خلاف اکسانا شروع کر دیا اور چونکہ بوجہ خانہ کعبہ کے متولی ہونے کے قریش کا سارے قبائل عرب پر ایک خاص اثر تھا اس لیے قریش کی انگیخت سے کئی قبائل مسلمانوں کے جانی دشمن بن گئے اور مدینہ کا یہ حال ہو گیا کہ گویا اس کے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے۔ چنانچہ یہ روایت اوپر گذر چکی ہے کہ:

لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُہٗ الْمَدِیْنَۃَ وَاٰوَتْھُمُ الْاَنْصَارُ رَمَتْھُمُ الْعَرَبُ عَنْ قَوْسٍ وَاحِدَۃٍ۔ فَکَانُوْا لَا یَبِیْتُوْنَ اِلَّا بِالسِّلَاحِ وَلَا یُصْبِحُوْنَ اِلَّا فِیْہِ وَقَالُوْا اَتَرَوْنَ اَنَّا نَعِیْشُ حَتّٰی نَبِیْتَ اٰمِنِیْنَ لَا نَخَافُ اِلَّا اللّٰہَ[3] یعنی ابی بن کعب جو کبار صحابہ میں سے تھے بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مدینہ میں تشریف لائے اور انصار نے انہیں پناہ دی تو تمام عرب ایک جان ہو کر ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا؛ چنانچہ ان دنوں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ خوف کی وجہ سے وہ راتوں کو بھی ہتھیار لگا لگا کر سوتے تھے اور دن کو بھی ہتھیار لگائے پھرتے تھے کہ کہیں کوئی اچانک حملہ نہ ہو جاوے اور وہ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ دیکھئے ہم اس وقت تک بچتے بھی ہیں یا نہیں کہ ہمیں امن کی راتیں گذارنے کا موقعہ ملے گا اور خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ رہے گا۔"

خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَوَّلَ مَاقَدِمَ الْمَدِیْنَۃَ یَسْھَرُ مِنَ اللَّیْلِ[4] "جب شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لاتے، تو دشمن کے حملہ کے خوف سے آپ عموماً راتوں کو جاگا کرتے تھے۔"

---

[1] بخاری ۔ [2] تاریخ الخمیس ۔ [3] حاکم وطبرانی بحوالہ لباب النقول ۔ [4] نسائی

اسی زمانے کے متعلق قرآن شریف فرماتا ہے :-

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ [1]

"مسلمانو! وہ زمانہ یاد کرو جب تم تھوڑے تھے اور ملک میں بہت کمزور سمجھے جاتے تھے اور تمہیں یہ خوف لگا رہتا تھا کہ لوگ تمہیں اُچک کر تباہ کر دیں۔ پھر خدا نے تمہیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے تمہاری تائید فرمائی اور تمہارے لیے پاکیزہ رزق کے دروازے کھولے۔ پس تمہیں شکر گذار ہو کر رہنا چاہیئے۔"

یہ بیرونی خطرات کا حال تھا اور خود مدینہ کے اندر یہ حالت تھی کہ ابھی تک ایک معتدبہ حصہ اوس وخزرج کا شرک پر قائم تھا اور گو وہ بظاہر اپنے بھائی بندوں کے ساتھ تھے لیکن ان حالات میں ایک مشرک کا کیا اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ پھر دُوسرے نمبر پر منافقین تھے جو بظاہر اسلام لے آئے تھے مگر دَرپردہ وہ اسلام کے دشمن تھے اور مدینہ کے اندر ان کا وجود خطرناک احتمالات پیدا کرتا تھا۔ تیسرے درجہ پر یہود تھے جن کے ساتھ گو ایک معاہدہ ہو چکا تھا۔ مگر ان یہود کے نزدیک معاہدہ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ غرض اس طرح خود مدینہ کے اندر ایسا مواد موجود تھا جو مسلمانوں کے خلاف ایک مخفی ذخیرۂ بارود سے کم نہ تھا۔ اور قبائلِ عرب کی ذرا سی چنگاری اس بارود کو آگ لگانے اور مسلمانانِ مدینہ کو بھک سے اُڑا دینے کے لیے کافی تھی اس نازک وقت میں جس سے زیادہ نازک وقت اسلام پر کبھی نہیں آیا ــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی وحی نازل ہوئی کہ اب تمہیں بھی ان کفار کے مقابلہ میں تلوار استعمال کرنی چاہیئے جو تمہارے خلاف تلوار لے کر سراسر ظلم وتعدی سے میدان میں نکلے ہوئے ہیں اور جہاد بالسیف کا اعلان ہو گیا۔

اس وقت لڑائی کے قابل مسلمانوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں تھی اور ان چند سو نفوس میں بھی کثرت ان لوگوں کی تھی جو سخت درجہ کمزوری اور غربت کی حالت میں تھے اور بعض کو تو آئے دن فاقے کی نوبت رہتی تھی اور ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو اپنے لیے لڑائی کا معمولی سامان تک مہیا کر سکتے تھے۔ دُوسری طرف فریقِ مقابل کا یہ حال تھا کہ مذہبی لحاظ سے تو بلا استثنا سارا ملک دشمن تھا۔ عملاً بھی قریش کے علاوہ جن کی تعداد ہزارہا نفوس پر مشتمل تھی اور جو دولت وثروت اور سامانِ حرب میں مسلمانوں سے کئی درجہ زیادہ مضبوط تھے بہت سے دُوسرے قبائلِ عرب قریش کے پشت پناہ بن گئے تھے اور ان خطرات کی وجہ سے مسلمانوں کو راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ ایسی نازک حالت میں خدا کا یہ حکم نازل ہوا کہ اے مسلمانو! اب تم بھی ان کفار کے مقابلہ میں تلوار لے کر اُٹھ کھڑے ہو۔ اس جہاد کی غرض وغایت کے متعلق کسی قسم کے شُبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ ایسی حالت میں صرف وہی شخص میدان میں نکل سکتا ہے جو دو باتوں میں سے ایک کا ارادہ کر چکا ہو یا یہ کہ اب میں نے مرنا تو ہے ہی

---

[1] سورۃ انفال : ۲۷

کیوں نہ مردوں کی طرح میدان میں جان دوں اور یا یہ کہ اب مرنے سے بچنے کا اگر کوئی امکانی ذریعہ ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ تلوار لے کر میدان میں نکل جاؤں۔ اور پھر ہر چہ بادا باد، مسلمانوں کی ابتدائی لڑائیاں اسی آخرالذکر عزم کے ماتحت تھیں مگر باوجود اس خدائی حکم اور مسلمانوں کے اس اضطراری عزم کے اس وقت بہت سے کمزور دل مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ لڑائی کے خیال سے اُن کے دل بیٹھے جاتے تھے، چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے:۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ [1]

یعنی جب مسلمانوں پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ کفار سے اتنا ڈرتا تھا کہ خدا کے ڈر سے بھی ان کا ڈر بڑھا ہوا تھا اور یہ لوگ کہتے تھے کہ اے رب ہمارے تُو نے ابھی سے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا اور کیوں ہمیں تھوڑی دیر اور مہلت نہ دی۔"

پھر فرماتا ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ [2]

"یعنی اے مسلمانو! ہم جانتے ہیں کہ جہاد بالسیف تم پر ایسے وقت میں فرض کیا گیا ہے کہ وہ تمہارے لیے ایک مشکل اور تکلیف دہ کام ہے مگر یاد رکھو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اپنے لیے موجب تکلیف سمجھو مگر دراصل وہ اچھی ہو۔ یا تم ایک چیز کو اپنے لیے اچھا سمجھو مگر دراصل وہ بُری ہو اور بیشک اللہ اس بات کو جانتا ہے مگر تم نہیں جانتے۔"

جہاد کے متعلق پہلی قرآنی آیت مؤرخین لکھتے ہیں کہ جہاد بالسیف کے متعلق سب سے پہلی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ۱۲ ؍ صفر ۲ھ [3] مطابق ۱۵ اگست ۶۲۳ء [4] کو نازل ہوئی جبکہ آپؐ کو مدینہ میں تشریف لائے قریباً ایک سال کا عرصہ گذرا تھا اور وہ یہ آیت ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۔ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ [5]

"اجازت دی جاتی ہے لڑنے کی مسلمانوں کو جن کے خلاف کفار نے تلوار اُٹھائی ہے۔ کیونکہ وہ

---

[1] نساء: ۷۸ ۔ [2] بقرة: ۲۱۷ ۔ [3] زرقانی ۔
[4] توفیقات الہامیہ ۔ [5] حج: ۴۰-۴۱ ۔

(مسلمان) مظلوم ہیں اور ضرور اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے۔ وہ ظلم کے ساتھ اپنے گھروں سے نکالے گئے صرف اس بنا پر کہ انھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نہ روکے (دفاعی جنگ کی اجازت دیکر) ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف تو یقیناً راہبوں کے صومعے اور عیسائیوں کے گرجے اور یہود کے معابد اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ خدا کا نام لیا جاتا ہے ایک دوسرے کے ہاتھ سے تباہ و برباد کر دی جاویں اور اللہ تعالیٰ ضرور اُس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ قوی اور غالب خدا ہے۔"

اس آیت کے الفاظ جس وضاحت اور صفائی کے ساتھ ابتدائی اسلامی جنگوں کی غرض و غایت اور اس وقت کے مُسلمانوں کی حالت کو ظاہر کر رہے ہیں وہ کسی تفسیر کی محتاج نہیں ہے اور اگر غور سے دیکھا جاوے تو اس آیت سے چار باتیں ثابت ہوتی ہیں :- اوّل - یہ کہ اس جنگ میں ابتداء کفار کی طرف سے تھی جیسا کہ "یُقَاتَلُوْنَ" کے لفظ سے ظاہر ہے۔ دُوسرے یہ کہ کفار مسلمانوں پر سخت ظلم کیا کرتے تھے اور ان کے یہی مظالم جنگ کا باعث تھے جیسا کہ "بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ کفار کی غرض یہ تھی کہ دین اسلام کو تلوار کے زور سے نیست و نابود کر دیں جیسا کہ "لَهُدِّمَتْ" کے لفظ میں اشارہ ہے۔ چوتھے یہ کہ مُسلمانوں کے اعلانِ جنگ کی غرض خود حفاظتی اور دفاع تھی۔ جیسا کہ "لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ" کے الفاظ سے پایا جاتا ہے۔ الغرض یہ آیتِ کریمہ جو جہاد بالسیف کے متعلق سب سے پہلی آیت ہے کمال صفائی کے ساتھ یہ بتا رہی ہے کہ ان جنگوں میں ابتداء کفار کی طرف سے تھی جو اسلام کو بزور مٹانا چاہتے تھے اور مسلمان مظلوم تھے اور انہوں نے محض خود حفاظتی اور دفاع میں تلوار اٹھائی تھی۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ مخالفینِ اسلام کی طرف سے جہاد بالسیف کے متعلق جتنے بھی اعتراض ہوتے ہیں اُن کے جواب کے لیے یہی ایک آیت کافی ہے اگر کوئی سمجھے۔

قرآن سب سے زیادہ صحیح تاریخی شہادت ہے

اس جگہ ممکن ہے کسی کے دل میں یہ شُبہ گذرے کہ قرآن تو خود مسلمانوں کی اپنی مذہبی کتاب ہے اس کی شہادت کو کس طرح یہ رُتبہ دیا جا سکتا ہے کہ اس پر ایک اہم تاریخی واقعہ کی بنیاد رکھی جاوے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا شُبہ صرف اس شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے جو فنِ تاریخ اور اسلامی لٹریچر سے قطعاً ناواقف ہو۔ قرآن کریم کا تو وہ مرتبہ ہے کہ جس کے مقابل میں اسلامی تاریخ کا کوئی دُوسرا ریکارڈ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ بھلا حدیث و تاریخ کی روایت کو باوجود محدثین اور مؤرخین کی اتنی چھان بین کے قرآن کے مقابلہ میں کیا وزن حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ صرف خوش عقیدگی کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک بیّن صداقت ہے، جس کو دوست و دشمن نے تسلیم کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہاں کسی مذہبی مسئلہ کا سوال نہیں ہے کہ کوئی غیر مسلم یہ کہہ کر قرآن کے خیال کو رد کر دے کہ مَیں قرآنی تعلیم کو خدا کی طرف سے نہیں مانتا۔ بلکہ یہاں تاریخی شہادت کا سوال ہے اور یہ مسلّم ہے کہ تاریخی شہادت سب سے زیادہ صحیح اور سب سے زیادہ مستند وہی ہوتی ہے جو اس وقت کی ہو جبکہ کوئی

واقعہ ہوا ہے اور ان لوگوں کی ہو جن کے سامنے وُہ واقعہ ہوا ہے اور وہ اُسی وقت ضبطِ تحریر میں آ جاوے اور پھر اس کے بعد بھی ہر قسم کی تحریف سے پاک رہے اور اس جہت سے جو مرتبہ قرآن کریم کو حاصل ہے وہ ہرگز کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی نہ صرف ضبطِ تحریر میں آ گیا تھا بلکہ بہت سے حفاظ نے اس کو اپنے ذہنوں میں لفظ بلفظ محفوظ بھی کر لیا تھا اور اس کے بعد وہ آجتک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہا ہے اور اب بھی بعینہٖ اسی شکل و صورت میں ہے جیسا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانہ میں تھا۔ چونکہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے، مَیں اس بحث میں زیادہ وقت صرف نہیں کرنا چاہتا؛ ورنہ مَیں بتاتا کہ قرآن کی صحت کا مرتبہ کیسا عالیشان ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی اور سند کو لانا صداقت کی ہتک کرنا ہے۔ صرف بطور مثال کے دو شہادتیں پیش کرتا ہوں اور وہ بھی ان لوگوں کی جو مخالفینِ اسلام میں سے ہیں۔ وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ ۔

سر ولیم میور جو ایک بہت مشہور انگریز مؤرخ گذرے ہیں اور جن کی کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح میں غالباً سب مغربی کتب سے زیادہ متداول ہے وُہ اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم)" میں لکھتے ہیں:-

"اس بات کی مضبوط ترین شہادت موجود ہے کہ مسلمانوں کا قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقت سے لے کر آجتک غیر محرّف و مبدّل رہا ہے۔"

پھر لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے قرآن کا ہماری اناجیل کے ساتھ مقابلہ کرنا جو بدقسمتی سے بہت کچھ محرّف و مبدّل ہو چکی ہیں دو ایسی چیزوں کا مقابلہ کرنا ہے جن کو ایک دُوسرے سے کوئی بھی مناسبت نہیں۔"

پھر لکھتے ہیں:

اس بات کی پوری پوری اندرونی اور بیرونی ضمانت موجود ہے کہ قرآن اب بھی اسی صورت و شکل میں ہے جیسا کہ وہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقت میں تھا۔[1]

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سر ولیم میور اسلام کے دوستوں میں سے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنی کتاب میں جابجا اسلام اور بانیٔ اسلام پر سخت حملے کیے ہیں مگر قرآن کی وہ ارفع شان ہے جسے کسی کا تعصب گرد آلود نہیں کر سکتا۔ پھر نولڈیکی جو جرمنی کا ایک نہایت مشہور عیسائی مستشرق گذرا ہے اور جو اس فن میں گویا اُستاد مانا گیا ہے۔ قرآن کے متعلق لکھتا ہے کہ:-

"آج کا قرآن بعینہٖ وہی ہے جو صحابہؓ کے وقت میں تھا۔"

پھر لکھتا ہے کہ:-

---

[1] دیکھو دیباچہ لائف آف محمدؐ (صلعم) مصنفہ سر ولیم میور۔

"یورپین علماء کی یہ کوشش کہ قرآن میں کوئی تحریف ثابت ہو سکے قطعاً ناکام رہی ہے[1]"

یہ تو قرآن کی عام صحت کے متعلق اہلِ مغرب کی شہادت ہے پھر خاص تاریخی نقطہ نگاہ سے سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

"اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق تاریخی تحقیقات کرنے کے لیے قرآن ایک بنیادی پتھر ہے جس سے ہر واقعہ کی صحت جانچی جا سکتی ہے۔"

پھر لکھتے ہیں:-

نبیٔ اسلام کے سوانح کے لیے قرآن ایک یقینی کلید ہے[2]۔"

پھر پروفیسر نکلسن جو انگلستان کا ایک مسیحی مستشرق ہے اور جس کی تصنیف "عرب کی ادبی تاریخ" بہت شائع اور متعارف ہے، اپنی اس کتاب میں لکھتا ہے:

"اسلام کی ابتدائی تاریخ کا علم حاصل کرنے کے لیے قرآن ایک منظر اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا کتاب ہے اور یقیناً بدھ مذہب اور مسیحیت یا کسی قدیم مذہب کو اس قسم کا مستند تاریخی ریکارڈ حاصل نہیں ہے جیسا کہ قرآن میں اسلام کو حاصل ہے[3]۔"

الغرض قرآن کریم ابتدائی اسلامی تاریخ کا بالکل سچا اور سب سے زیادہ مستند ریکارڈ ہے اور اس کو وہ مرتبہ حاصل ہے جو حدیث یا سیرت یا تاریخ کو حاصل نہیں ہے۔ پس جب قرآن کریم اپنی اس آیت میں جو سب سے پہلے جہاد بالسیف کی اجازت میں نازل ہوئی نہایت واضح اور غیر مشکوک الفاظ میں یہ شہادت دے رہا ہے کہ ابتداء کفار کی طرف سے تھی اور مسلمانوں نے محض دفاع میں تلوار اٹھائی تھی تو ریک اور بودے استدلالات کر کے مسلمانوں کی طرف سے ابتداء ہونے کا ثبوت تلاش کرنا ہرگز دیانتداری کا فعل نہیں سمجھا جا سکتا۔

جہاد کے متعلق بعض دوسری قرآنی آیات

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی بعض دوسری آیات بھی درج کر دی جاویں جو وقتاً فوقتاً جہاد بالسیف کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں کیونکہ اُن سے ابتدائی اسلامی جنگوں کے حالات پر ایک ایسی روشنی پڑتی ہے جو کسی دوسری جگہ میسر نہیں آ سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا ؛ [2] دیکھو لائف آف محمد مصنفہ میور ؛

[3] دیکھو عرب کی ادبی تاریخ مصنفہ نکلسن صفحہ ۱۴۳ ؛

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝[1]

اے مسلمانو! لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں مگر دیکھنا زیادتی نہ کرنا کیونکہ زیادتی کرنیوالوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ اور لڑو ان کفار سے جو تم سے لڑتے ہیں جہاں بھی ان کا اور تمہارا سامنا ہو۔ اور نکالو ان کو اس جگہ سے جہاں سے وہ تمہیں نکالیں۔ یعنی جہاں بھی وہ تمہارے اثر کو بزور مٹانا چاہیں تم ان کا مقابلہ کرو۔ اور بیشک وہ فتنہ جس کے یہ لوگ مرتکب ہو رہے ہیں وہ قتل سے بھی سخت تر ہے مگر ہاں لڑائی مت کرو حرم کے علاقہ میں لیکن اگر یہ کفار خود تم سے حرم میں لڑائی کی ابتدا کریں تو پھر بیشک تم بھی ان کا مقابلہ کرو۔ کیونکہ ناشکر گذاروں کی یہی سزا ہے اور اگر کفار اس سے باز آ جائیں تو جانو کہ اللہ بھی غفور و رحیم ہے اور اے مسلمانو! تم لڑو ان کفار سے اس وقت تک کہ ملک میں فتنہ نہ رہے اور دین خدا ہی کے لیے ہو جاوے۔ یعنی دین کے معاملہ میں سوائے خدا کے اور کسی کا خوف نہ رہے اور ہر شخص آزادی سے اپنی ضمیر کے مطابق جو دین پسند کرے وہ رکھ سکے اور اگر یہ کفار جنگ سے باز آ جائیں تو تم بھی فوراً رک جاؤ۔ کیونکہ کسی کو جنگ کشی کا حق نہیں ہے مگر صرف ظالموں کے خلاف۔"

یہ آیت بھی اپنے معانی میں نہایت واضح ہے اور اس سے صاف طور پر پتہ لگتا ہے کہ مسلمانوں کو جہاد کا حکم صرف ان لوگوں کے خلاف دیا گیا تھا جو اُن سے دین کے معاملہ میں جنگ کرتے تھے اور ان کو تلوار کے زور سے ان کے دین سے پھیرنا چاہتے تھے اور نیز یہ کہ مسلمانوں کو یہ بھی حکم تھا کہ اگر یہ کفار جنگ سے باز آ جائیں تو تمہیں بھی چاہیئے کہ فوراً رک جاؤ اور اس آیت میں جنگ کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ملک میں فتنہ نہ رہے اور مذہبی آزادی قائم ہو جاوے۔

پھر فرماتا ہے:۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ[2]

"اور اگر یہ کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو اے نبی تمہیں چاہیئے کہ تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ اور اللہ پر توکل کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

پھر فرماتا ہے:۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ[3]

---

[1] سورہ بقرہ: ۱۹۱ تا ۱۹۴ – [2] سورۃ انفال: ۶۲ [3] سورۃ توبہ: ۶

"اور اگر کوئی مشرک تمہاری پناہ میں داخل ہوکر تمہارے پاس تحقیقِ دین کے لیے آنا چاہے تو اُسے آنے دو اور پھر اپنی حفاظت میں اُسے اُس کی امن کی جگہ میں واپس پہنچا دو۔"[1]

پھر فرماتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

"اور وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے ہیں مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی یعنی وہ تمہارے مصائب میں تمہارا ہاتھ نہیں بٹاتے وہ تمہاری سیاسی دوستی کے حقدار نہیں ہیں؛ البتہ اگر وہ کسی دینی معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو تمہارا فرض ہے کہ تم ان کو مدد دو، لیکن ان کفار کے خلاف تمہیں مدد دو، لیکن ان کفار کے خلاف تمہیں دینے کی اجازت نہیں ہے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو اور اے مومنو! ہوشیار ہو کہ خدا تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے"

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۖ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا[2]

"اور پورا کرو اپنے عہد کو کیونکہ یقیناً تمہیں اپنے عہد کے متعلق خدا کے سامنے جواب دِہ ہونا پڑے گا"

پھر فرماتا ہے:۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

"نہیں منع کرتا اللہ تم کو ان لوگوں سے جنھوں نے تمہارے ساتھ دین کے معاملہ میں لڑائی نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا یہ کہ تم ان سے مہربانی کا سلوک کرو اور ان سے عدل اور احسان سے پیش آؤ۔ بیشک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے۔ سوائے اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے تم کو کہ دوست بناؤ ان لوگوں کو جنھوں نے تمہارے خلاف دین کے معاملہ میں لڑائی کی اور تمہارے گھروں سے تمہیں نکالا یا تمہارے نکالے جانے میں اعانت کی۔ اور جو کوئی دوستی لگائے گا ایسے دشمنوں کے ساتھ تو ایسے لوگ ظالموں میں سے سمجھے جائیں گے"[3]

پھر فرمایا:۔

---

[1] انفال: ۷۲، [2] بنی اسرائیل: ۳۵، [3] ممتحنہ: ۹، ۱۰

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ؁[1]

"اے مومنو! چاہیئے کہ تم دُنیا میں خدا کے لیے عدل و انصاف کو قائم کرو اور چاہیئے کہ ہرگز نہ آمادہ کرے تم کو کسی قوم کی دشمنی اس بات پر کہ تم اس کے ساتھ انصاف سے پیش نہ آؤ۔ بلکہ تمہیں چاہیئے کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا معاملہ کرو کیونکہ عدل و انصاف کرنا تقویٰ کا تقاضا ہے۔ پس تم متقی بنو اور یاد رکھو کہ اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔"

جہاد بالسیف کے متعلق بعض اصولی روایات

یہ قرآن شریف کا بیان گذرا ہے اور گو قرآن کے بیان کے بعد کسی اور بیان کی حاجت نہیں رہتی، لیکن اس خیال سے کہ کسی شخص کو یہ شُبہ نہ گذرے کہ شاید عام تاریخی روایات قرآن کے مخالف ہوں اس جگہ بعض روایات بھی درج کر دینی مناسب ہیں جن سے اسلام کی ابتدائی لڑائیوں پر ایک اُصولی روشنی پڑتی ہے سو روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ:-

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْئَلُوا اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ فَاِذَا لَقِیْتُمُوْھُمْ فَاصْبِرُوْا[2]۔ "اے مسلمانو! تمہیں چاہیئے کہ دشمن کے مقابلہ کی خواہش نہ کیا کرو اور خدا سے امن و عافیت کے خواہاں رہو اور اگر تمہاری خواہش کے بغیر حالات کی مجبوری سے کسی دشمن کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہو جائے تو پھر ثابت قدمی دکھاؤ۔" اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ کفار کی طرف سے اعلانِ جنگ ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کا چیلنج قبول کر لیا تھا اور جنگ کا آغاز ہو چکا تھا پھر بھی مُسلمانوں کو یہی حکم تھا کہ وہ اس جنگ کے جزوی مقابلوں میں بھی لڑائی کی خواہش نہ کیا کریں۔ ہاں البتہ اگر دشمن سے مقابلہ ہو جاوے تو پھر جم کر لڑیں۔

پھر روایت آتی ہے کہ:-

سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الرَّجُلِ یُقَاتِلُ شُجَاعَۃً وَیُقَاتِلُ حَمِیَّۃً وَیُقَاتِلُ رِیَاءً اَیُّ ذٰلِکَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ[3]

"یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص ہے کہ وہ اپنی بہادری کے اظہار کے لیے جنگ کرتا ہے اور ایک شخص ہے کہ وہ خاندانی یا قومی غیرت کی وجہ سے لڑتا ہے اور ایک شخص ہے کہ وہ لوگوں کو دکھانے کے لیے لڑائی کرتا ہے۔ ان میں سے کونسا شخص فی سبیل اللہ لڑنے والا سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کوئی بھی نہیں بلکہ خدا کے رستے میں وہ شخص لڑنے والا سمجھا جائیگا جو اس لیے لڑتا ہے کہ جو کوشش کفار کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے دین کو مغلوب کرنے کی جاری ہے اس کا قلع قمع ہو اور خدا کا دین کفار کی ان کوششوں کے مقابل پر غالب آجاوے۔"

---

[1] مائدہ: ۹ ٭ [2] بخاری و مسلم و ابوداؤد ٭ [3] بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی۔

پھر روایت آتی ہے کہ :۔

عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِذَا لَقِيْتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَادْعُهُمْ إِلٰى ثَلٰثِ خِلَالٍ فَإِنْ أَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ أُدْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ فَإِنْ أَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ۔ ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلٰى دَارِ الْمُهَاجِرِيْنَ وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوْا ذَالِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِيْنَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْهِمْ فَإِنْ أَبَوْا أَنْ يَّتَحَوَّلُوْا مِنْهَا فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُوْنُوْنَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِيْنَ يَجْرِيْ عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللّٰهِ تَعَالٰى الَّذِيْ يَجْرِيْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَكُوْنُ لَهُمْ فِي الْغَنِيْمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلَّا أَنْ يُّجَاهِدُوْا مَعَ الْمُسْلِمِيْنَ وَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَسَلْهُمُ الْجِزْيَةَ فَإِنْ هُمْ أَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ فَإِنْ أَبَوْا فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَقَاتِلْهُمْ[1]

یعنی بریدۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی فوجی دستہ روانہ کرتے تھے تو اس کے امیر کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ جب تم اپنے دشمنوں کے سامنے ہو یعنی اس قوم سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہو جاوے جن سے تمہاری لڑائی چھڑی ہوئی ہے تو لڑائی شروع کرنے سے پہلے انہیں تین باتوں کی دعوت دیا کرو۔ اگر ان تینوں میں سے وہ کوئی ایک بھی مان لیں تو پھر اُن سے مت لڑو۔ سب سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ مان لیں تو ان کے اسلام کو قبول کرو اور ان سے اپنا ہاتھ کھینچ لو پھر اس کے بعد تم ان کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی تحریک کرو۔ اور ان سے کہو کہ اگر وہ ہجرت کریں گے تو ان کو مہاجرین کے حقوق دیئے جائیں گے اور مہاجرین والی ذمہ داری بھی اُن پر ہوگی اگر وہ ہجرت پر رضامند نہ ہوں تو پھر ان سے کہہ دو کہ وہ اسلام میں تو داخل ہو جائیں گے لیکن مہاجرین کے حقوق ان کو نہیں ملیں گے کیونکہ وہ صرف جہاد فی سبیل اللہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ تمہاری دعوتِ اسلام کو ہی رد کر دیں تو پھر ان سے کہو کہ ٹیکس دینا قبول کر کے اسلامی حکومت کے ماتحت آجاؤ۔ اگر وہ یہ صورت مان لیں تو پھر بھی ان سے لڑائی مت کرو، لیکن اگر وہ انکار کریں تو پھر خدا کا نام لیکر ان سے لڑو۔

پھر روایت آتی ہے کہ :

عَنِ الْحَارِثِ بْنِ مُسْلِمِ بْنِ الْحَارِثِ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَرِيَّةٍ فَلَمَّا بَلَغْنَا الْمَغَارَ اِسْتَحْثَثْتُ فَرَسِيْ فَسَبَقْتُ أَصْحَابِيْ فَتَلَقَّانِيْ أَهْلُ الْحَيِّ بِالرَّنِيْنِ فَقُلْتُ لَهُمْ قُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَقَالُوْهَا فَلَامَنِيْ أَصْحَابِيْ فَقَالُوْا حَرَمْتَنَا الْغَنِيْمَةَ فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرُوْهُ بِالَّذِيْ صَنَعْتُ فَدَعَانِيْ فَحَسَّنَ لِيْ مَا صَنَعْتُ ثُمَّ قَالَ لِيْ أَمَا إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ كَتَبَ لَكَ بِكُلِّ إِنْسَانٍ مِنْهُمْ كَذَا وَكَذَا مِنَ الْأَجْرِ وَقَالَ أَمَا إِنِّيْ سَأَكْتُبُ لَكَ بِالْوَصَاةِ بَعْدِيْ فَفَعَلَ وَخَتَمَ

---

[1] مسلم و ابوداؤد و ترمذی ۔

عَلَیْہِ وَدَفَعَہٗ اِلَیَّ [1]

"یعنی حارث بن مسلم بن حارث اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سریہ میں بھیجا۔ جب ہم منزلِ مقصود پر پہنچے تو مَیں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے آگے کر لیا۔ جب قبیلہ کے لوگ مجھے ملے تو وہ اچانک حملہ کی وجہ سے ڈر کر عاجزی کرنے لگ گئے۔ جس پر مَیں نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور وُہ مسلمان ہو گئے۔ اس پر میرے بعض کمزور ساتھیوں نے مجھے ملامت کی کہ تم نے ہمیں غنیمت سے محروم کر دیا ہے۔ پھر جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے تو لوگوں نے اس واقعہ کی آپؐ کو اطلاع دی۔ آپؐ نے مجھے بُلایا اور میرے فعل کی تعریف کی۔ اور فرمایا کہ تم نے بہت ہی اچھا کام کیا ہے اور پھر کہا کہ خدا نے تمہارے لیے اس قبیلہ کے ہر آدمی کے بدلے میں اتنا اَجر مقرر کیا ہے اور جوشِ مسرت میں فرمایا کہ آؤ مَیں تمہیں ایک پروانہ خوشنودی لکھ دیتا ہوں تاکہ ہمیشہ کے لیے میری یہ خوشنودی تمہارے پاس رہے۔ چنانچہ آپؐ نے مجھے ایک پروانہ لکھ دیا اور اس پر اپنی مُہر ثبت فرمائی۔"

پھر روایت آتی ہے کہ:-

عَنْ عَاصِمِ بْنِ کُلَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفَرٍ فَاَصَابَ النَّاسَ حَاجَۃٌ شَدِیْدَۃٌ وَجَھْدٌ فَاَصَابُوْا غَنَمًا فَانْتَھَبُوْھَا فَاِنَّ قُدُوْرَنَا لَتَغْلِیْ اِذْ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَمْشِیْ بِالْکَفَاءِ الْقُدُوْرِ بِقَوْسِہٖ ثُمَّ جَعَلَ یُرَمِّلُ اللَّحْمَ بِالتُّرَابِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ النُّھْبَۃَ لَیْسَتْ بِاَحَلَّ مِنَ الْمَیْتَۃِ [2]

یعنی "عاصم بن کلیب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی بیان کرتے تھے کہ ہم ایک غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تو ایک موقعہ پر لوگوں کو خطرناک بھوک لگی اور وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے اور (ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا) جس پر انھوں نے ایک بکریوں کے گلّہ میں سے چند بکریاں پکڑ لیں اور انہیں ذبح کر کے پکانا شروع کر دیا۔ ہماری ہنڈیاں اس گوشت سے اُبل رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اوپر سے تشریف لے آئے اور آپؐ نے آتے ہی اپنی کمان سے ہماری ہنڈیوں کو اُلٹ دیا اور غصہ میں گوشت کے ٹکڑوں کو مٹی میں مسلنے لگ گئے اور فرمایا کہ لوٹ کا مال مُردار سے بہتر نہیں ہے۔"

یہ ان لوگوں کا قصہ ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نعوذباللہ ان کو لوٹ مار کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر آج کسی یورپین فوج کو اس طرح کی حالت پیش آئے کہ اُن کے پاس زادِ راہ ختم ہو گیا ہو اور فوجی لوگ بھوک سے تڑپ رہے ہوں تو کسی چرتے ہوئے گلّہ کی بکریوں پر قبضہ کر لینا تو معمولی بات ہے وہ نہ معلوم کیا کچھ جائز قرار دے لیں۔

---

[1] ابوداؤد بحوالہ تلخیص الصحاح کتاب الجہاد۔

[2] ابوداؤد و ترمذی۔

پھر روایت آتی ہے کہ :-

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ رَجُلٌ یُّرِیْدُ الْجِھَادَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَھُوَ یَبْتَغِیْ عَرَضًا مِنَ الدُّنْیَا فَقَالَ لَا اَجْرَلَہٗ فَاَعَادَلَہٗ ثَلَاثًا کُلُّ ذٰالِکَ یَقُوْلُ لَا اَجْرَلَہٗ [1]

"یعنی" ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ایک شخص ہے کہ اس کی اصل نیت تو جہاد فی سبیل اللہ کی ہے لیکن ساتھ ہی اُسے یہ بھی خیال آجاتا ہے کہ جنگ میں کچھ مال و متاع بھی مل رہے گا تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ایسے شخص کے لیے ہرگز کوئی ثواب نہیں ہے۔ اس شخص نے حیران ہو کر تین دفعہ اپنا سوال دوہرایا مگر ہر دفعہ آپؐ نے یہی جواب دیا کہ اُس کے لیے ہرگز کوئی ثواب نہیں"

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد کرنیوالے کی نیت خالصۃً دینی ہونی چاہیئے اور اگر حفاظتِ دین کے علاوہ کوئی ذرا سا خیال بھی اس کے دل میں پیدا ہو تو وہ ثواب سے محروم ہو جاتا ہے اور غنیمت اور دنیوی مال و متاع کی اُمید رکھنا مجاہد کے لیے قطعی حرام ہے۔

پھر روایت آتی ہے کہ :-

مَامِنْ غَازِیَۃٍ تَغْزُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیُصِیْبُوْنَ غَنِیْمَۃً اِلَّا تَعَجَّلُوْا ثُلُثَیْ اَجْرِھِمْ مِنَ الْاٰخِرَۃِ وَیَبْقٰی لَھُمُ الثُّلُثُ وَاِنْ لَمْ یُصِیْبُوْا غَنِیْمَۃً تَمَّ لَھُمْ اَجْرُھُمْ [2]

یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو مجاہدین خدا کی راہ میں لڑنے کے لیے نکلتے ہیں اور ان کو لڑائی میں غنیمت کا مال ہاتھ آجاتا ہے تو ان کا دو تہائی ثواب آخرت کا کم ہو جائے گا اور صرف ایک تہائی ثواب ملے گا۔ لیکن اگر انہیں کوئی غنیمت ہاتھ نہ آئے تو انکو پورا پورا ثواب ملے گا"

یہ حدیث گذشتہ حدیث کی نسبت زیادہ واضح ہے کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی لڑائی میں خالصۃً جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے شامل ہوتا ہے اور اس میں کوئی ملونی دُنیا کی نہیں ہوتی اور پھر اسے بغیر خیال اور اُمید کے غنیمت کا مال بھی مل جاتا ہے تو پھر بھی چونکہ اسے دُنیا کے اموال سے حصہ مل گیا ہے اس لیے اس کا آخرت کا اجر کم ہو جائے گا۔ لیکن جو شخص خالص جہاد کی نیت سے نکلتا ہے اور اُسے غنیمت کا مال مطلقاً نہیں ملتا وہ پورے پورے ثواب کا حقدار ہو گا۔ گویا جہاں گذشتہ حدیث صحابہ کے دل میں دُنیا کے اموال سے محض عدم رغبت پیدا کرتی تھی وہاں یہ حدیث دُوری اور ایک قسم کی نفرت پیدا کرتی ہے اور اس تعلیم کے ہوتے ہوئے ایک سچا مسلمان نہ صرف یہ کہ غنیمت وغیرہ کا خیال تک دل میں نہیں لائے گا بلکہ غنیمت کے مواقع سے بھی حتی الوسع پرہیز کرے گا اور اس کی یہی خواہش اور کوشش ہو گی کہ جس طرح بھی ہو غنیمت اُسے نہ ملے تاکہ جہاد کے ثواب میں کمی نہ آئے؛ چنانچہ کمزور لوگوں کو الگ رکھ کر جس کا

---

[1] ابو داؤد ونسائی ۔ [2] مسلم و ابو داؤد و نسائی ۔ الفاظ مطابق ابو داؤد کتاب الجہاد ۔

وجود کم و بیش ہر قوم میں پایا جاتا ہے مگر جو یقیناً صحابہ کی جماعت میں دنیا کی ہر قوم سے کمتر تعداد میں تھے صحابہ اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے؛ چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح مسلم بن حارث نے ایک دشمن قبیلہ پر حملہ کر کے غنیمت حاصل کرنے کی بجائے اسلام کی تحریک کر کے مسلمان بنالیا اور خود غنیمت سے محروم ہوگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے فعل کی بہت تعریف فرمائی اور اسے اپنی طرف سے ایک پروانہ خوشنودی عطا فرمایا۔

پھر ابوداؤد ہی کی روایت ہے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ میں مدینہ سے نکلنے لگے تو ایک بوڑھے انصاری نے[1] ایک غریب صحابی واثلہ بن اسقع کو اپنی طرف سے سواری وغیرہ کا انتظام کر دیا۔ جہاد کے بعد واثلہ بن اسقع کعب بن عجرۃ کے پاس آئے اور کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ اونٹنیاں غنیمت میں دی ہیں تم اپنا حصہ لے لو۔ کعب نے کہا۔ بھتیجے! خدا تمہیں یہ مال مبارک کرے۔ میری نیت غنیمت کی نہ تھی بلکہ ثواب کی تھی اور حصہ لینے سے انکار کر دیا۔[1]

پھر نسائی میں ایک روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک اعرابی ایمان لایا اور ایک غزوہ میں ساتھ ہو لیا۔ جب کچھ مال غنیمت ملا تو آپ نے اس کا حصہ بھی نکالا۔ اسے معلوم ہوا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! آپ نے میرا حصہ نکالا ہے۔ خدا کی قسم میں تو اس خیال سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔ میری تو یہ نیت تھی کہ مجھے خدا کی راہ میں (حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس جگہ تیر لگے اور میں جنت میں جاؤں۔ آپ نے فرمایا۔ اگر یہ شخص سچی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو خدا اُسے پورا کرے گا۔ تھوڑی دیر بعد لڑائی ہوئی تو وہ شخص وہیں حلق میں تیر کھا کر شہید ہوا۔ جب صحابہؓ اُسے آپ کے سامنے اٹھا کر لائے تو آپ نے پوچھا کیا یہ وہی ہے صحابہ نے عرض کیا۔ ہاں رسول اللہ! آپ نے فرمایا۔ خدا نے اس کی آرزو کو پورا کر دیا۔ پھر آپ نے اس کے کفن کے لیے اپنا جُبّہ عطا کیا اور اس کے لیے خاص طور پر دُعا فرمائی۔[2]

افسوس۔ صد افسوس! ان شہادتوں کے ہوتے ہوئے بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر یہ الزام لگاتے ہوئے خدا کا خوف نہیں کرتے کہ ان لڑائیوں میں اُن کی غرض لوٹ مار اور دُنیا کمانا تھی۔[3]

عرب میں جنگ کا طریق

کفار اور مسلمانوں کی لڑائیوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ عرب میں جنگوں کا طریق دو رنگ رکھتا تھا۔ جسے انگریزی میں فیوڈ (FEUD) کہتے ہیں۔ یعنی جب کسی وجہ سے عرب کے دو قبائل میں جنگ چھڑتی تھی تو پھر

---

[1] ابوداؤد میں اسکا نام مذکور نہیں مگر اسد الغابہ سے پتا لگتا ہے کہ اس کا نام کعب بن عجرۃ تھا۔ کتاب الجہاد۔

[2] کتاب الجنائز۔ [3] اوپر والی جملہ روایتوں میں جن میں ابواب وغیرہ کا حوالہ نہیں دیا گیا وہ عموماً ابواب الجہاد والسیر المغازی سے لی گئی ہیں اور ان کے الفاظ تلخیص الصواح کی روایت کے مطابق درج کئے گئے ہیں۔

جبتک اُن میں باقاعدہ صلح نہ ہو جاتی تھی وہ ہمیشہ جنگ کی حالت میں سمجھے جاتے تھے اور موقعہ پاکر وقفہ وقفہ سے آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات یہ جنگیں بڑے بڑے لمبے عرصہ تک جاری رہتی تھیں؛ چنانچہ جنگ بسوس جس کا ذکر کتاب کے حصہ اوّل میں گذر چکا ہے اسی طرح وقفہ وقفہ سے چالیس سال تک جاری رہی تھی اور تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض جنگیں سو سو سال تک بھی جاری رہیں مگر مسلسل لڑتے رہنے کا عرب میں دستور نہیں تھا جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اوّل تو چونکہ قبیلہ کا ہر شخص سپاہی ہوتا تھا اور کوئی باقاعدہ الگ فوج نہیں ہوتی تھی اس لیے قبائل عرب اپنی جنگوں کو مسلسل طور پر جاری نہیں رکھ سکتے تھے اور اپنے دوسرے کاروبار کی وجہ سے اس بات پر مجبور تھے کہ وقفہ دے کر لڑائی کریں۔ دُوسرے چونکہ جنگ میں ہر شخص اپنا اپنا خرچ خود برداشت کرتا تھا اور اس غرض کے لیے عموماً کوئی قومی خزانہ نہیں ہوتا تھا اس لیے یہ انفرادی مالی بوجھ بھی عربوں کو مجبور کرتا تھا کہ دَم لے لے کر میدان میں آئیں۔ اس غیر مسلسل جنگ کو جاری رکھنے کے لیے بعض اوقات یہ طریق بھی اختیار کیا جاتا تھا کہ جب ایک لڑائی ہوتی تھی تو اُسی میں آئندہ کے لیے وعدہ ہو جاتا تھا کہ اب فلاں وقت فلاں جگہ پھر ملیں گے اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جاتا تھا؛ چنانچہ اُحد کے موقعہ پر ابوسفیان نے اسی قسم کا وعدہ مسلمانوں سے کیا تھا جس کے نتیجہ میں غزوہ بدرالموعد وقوع میں آیا۔ الغرض عربوں میں مسلسل لڑتے رہنے کا طریق نہیں تھا بلکہ وہ وقفہ ڈال ڈال کر لڑتے تھے اور درمیانی وقفوں کو لڑائی کی تیاری اور اپنے دوسرے کاروبار میں صرف کرتے تھے اور ان کی یہ ساری لڑائیاں ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہوتی تھیں۔ یہ ایک بڑا عجیب نکتہ ہے جسے نظر انداز کر دینے کی وجہ سے بعض مؤرخین نے ٹھوکر کھائی ہے۔ کیونکہ انہوں نے قریش اور مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں میں سے ہر لڑائی کے لیے الگ الگ وجوہات تلاش کرنی چاہی ہیں؛ حالانکہ حق یہ ہے کہ جب قریش اور مسلمانوں کے درمیان ایک دفعہ جنگ شروع ہو گیا تو پھر اس وقت تک کہ ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ سے ان کے درمیان صلح نہیں ہو گئی۔ یعنی صلح حدیبیہ تک جو ہجرت کے چھٹے سال ہوئی یہ دونوں قومیں حالتِ جنگ میں تھیں اور اس عرصہ میں اُن کے درمیان جتنی بھی لڑائیاں ہوئیں وُہ اسی جنگ کے مختلف کارنامے تھے اور ان کے لیے الگ الگ وجوہات تلاش کرنا سخت غلطی ہے۔ ہاں بعض اوقات بیشک ایسا ہوا ہے کہ کسی درمیانی لڑائی کے لیے کوئی الگ تحریکی باعث بھی پیدا ہو گیا ہے لیکن اصل سبب وہی مستقل پہلا جھگڑا رہا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض اوقات عرب کے جنگوں میں یہ بھی ہوتا تھا (اور دراصل یہ بات تو آجکل کے جنگوں میں بھی پائی جاتی ہے) کہ جنگ کرنیوالے قبائل کے ساتھ دوسرے قبائل بھی اپنے اپنے قومی مصالح کے ماتحت جنگ میں شامل ہو جاتے تھے مثلاً اگر الف اور ب میں جنگ شروع ہوئی تو علاوہ اس کے الف کے حلیف الف کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے اور ب کے حلیف ب کے ساتھ۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ دورانِ جنگ میں کوئی قبیلہ کسی وجہ سے الف کے ساتھ مل جاتا تھا اور کوئی دُوسرا قبیلہ ب کے ساتھ ہو جاتا تھا اور اس طرح جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا تھا۔ قریباً قریباً یہی صورت اسلامی جنگوں میں پیش آئی۔ یعنی ابتداءً مسلمانوں کو قریش مکہ کی طرف سے جنگ کا الٹی میٹم ملا جسے بالآخر انہوں نے مجبور ہو کر قبول کیا، لیکن بعد میں آہستہ آہستہ بہت سے

دُوسرے قبائل بھی اس جنگ کی لپیٹ میں آتے گئے۔ مثلاً قریشِ مکہ نے کسی دُوسرے قبیلہ کو مسلمانوں کے خلاف اپنے ساتھ گانٹھ لیا تو مسلمانوں کی اس کے ساتھ بھی جنگ چھڑ گئی یا قریش کے نمونہ کو دیکھ کر کسی دُوسرے قبیلہ نے خودبخود مسلمانوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کر دی تو اس سے بھی جنگ کا آغاز ہوگیا یا قریش کی سازباز سے کسی حلیف قوم نے مسلمانوں سے دغابازی کی تو اس طرح اس کے ساتھ بھی مسلمانوں کی لڑائی ہوگئی۔ وغیر ذالک۔ الغرض جب جنگ کی آگ ایک دفعہ مشتعل ہوگئی تو اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ایک تھوڑے عرصہ میں ہی عرب کی سرزمین کے بیشتر حصہ سے اس آگ کے شعلے بلند ہونے لگ گئے۔

اسلامی جنگوں کے اقسام

ابتدائی اسلامی جنگوں کے متعلق پوری بصیرت حاصل کرنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جیسا کہ مندرجہ بالا قرآنی آیات اور دیگر تاریخی روایات میں اشارے کیے گئے ہیں یہ اسلامی جنگیں سب ایک قسم کی نہ تھیں بلکہ مختلف قسم کے اسباب کے ماتحت دقوع میں آئی تھیں مثلاً بعض لڑائیاں دفاع اور خودحفاظتی کی غرض سے تھیں یعنی ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کو کفار کے مظالم اور تباہی سے بچایا جاوے۔ بعض قیامِ امن کے لیے تھیں یعنی ان کا مقصد مُلک میں فتنہ کو دُور کرنا اور امن کو قائم کرنا تھا۔ بعض مذہبی آزادی کے قائم کرنے کی غرض سے تھیں۔ بعض تعزیری رنگ رکھتی تھیں۔ یعنی ان کی غرض وغایت کسی قوم یا قبیلہ یا گروہ کو اُن کے کسی خطرناک جُرم یا ظلم وستم یا دغابازی کی سزا دینا تھی۔ بعض سیاسی تھیں۔ یعنی ان کا مقصد کسی معاہد قبیلہ کی اعانت یا اس قسم کا کوئی اور سیاسی تقاضا تھا اور بعض ایسی بھی تھیں جن میں ان اغراض ومقاصد میں سے ایک سے زیادہ اغراض مدِنظر تھیں مثلاً وہ دفاعی بھی تھیں اور تعزیری بھی یا سیاسی بھی تھیں اور قیامِ امن کی غرض بھی رکھتی تھیں۔ وغیر ذالک۔ یہ ایک بڑا ضروری علم ہے جس کے نہ جاننے کی وجہ سے بعض مؤرخین نے ساری لڑائیوں کو ایک ہی غرض کے ماتحت لانے کی کوشش کی ہے اور پھر ٹھوکر کھائی ہے۔ اس جگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اُوپر کی بحث میں ہم نے عام طور پر صرف دفاع اور خودحفاظتی کی غرض کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کی ابتداء زیادہ تر اسی غرض کے ماتحت ہوئی تھی جیسا کہ ابتدائی قرآنی آیت سے ظاہر ہے اور باقی اغراض بعد میں آہستہ آہستہ حالات کے ماتحت پیدا ہوتی گئیں۔

اسلامی آدابِ جہاد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی کا بیان شروع کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مختصر طور پر وہ آداب بھی بیان کر دیئے جائیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً جہاد میں ملحوظ رکھتے تھے اور جن کی صحابہ کو تاکید کی جاتی تھی۔ یہ آداب عموماً صحاحِ ستّہ کی کتب الجہاد والسیر والمغازی سے ماخوذ ہیں۔ اور اس لیے میں نے صرف ان باتوں کا حوالہ درج کیا ہے جو یا تو بہت اہم ہیں اور یا نسبتاً کم معروف ہیں اور باقی کے حوالے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ سو جاننا چاہیئے کہ:

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفروں کو حتی الوسع جمعرات کے دن شروع کرنا پسند فرماتے تھے اور گھر سے عموماً صبح کے وقت نکلتے تھے۔

۲۔ روانگی سے قبل دُعا کرنا آپؐ کی سُنّت تھی۔

۳۔ دشمن کی حرکات و سکنات کا علم حاصل کرنے کے لیے آپؐ خبر رسانی کا پختہ انتظام رکھتے تھے اور عام طور پر خبر رسانوں کو یہ ہدایت ہوتی تھی کہ جب کوئی خبر لائیں تو عام مجلس میں اس کا ذکر نہ کریں اور اگر کوئی تشویشناک خبر ہوتی تھی تو آپؐ پھر خود بھی اس کا عام اظہار نہیں فرماتے تھے، البتہ خاص خاص صحابہ کو اس کی اطلاع دے دیتے تھے[1]

۴۔ جب آپؐ کسی جنگی غرض سے نکلتے تھے تو آپؐ کا یہ عام طریق تھا کہ اپنی منزلِ مقصود کا علم نہیں دیتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی کرتے تھے کہ اگر مثلاً جنوب کی طرف جانا ہوتا تھا تو چند میل شمال کی طرف جا کر پھر چکر کاٹ کر جنوب کی طرف گھوم جاتے تھے[2]

۵۔ آپؐ کی عادت تھی کہ شہر سے تھوڑی دُور نکل کر فوج کا جائزہ لیا کرتے تھے اور سب انتظام ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد آگے روانہ ہوتے تھے۔

۶۔ جب کوئی اہم مہم پیش آتی تھی تو آپؐ اس کے لیے صحابہؓ میں تحریک فرماتے تھے پھر جو لوگ اس کے لیے تیار ہوتے تھے وہ اپنا اپنا سامانِ جنگ اور سواری وغیرہ کا انتظام خود کرتے تھے، البتہ کسی ذی ثروت صحابی کو مقدرت ہوتی تھی تو وہ دوسروں کی امداد بھی کر دیتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً اس قسم کی امداد کی تحریک فرمایا کرتے تھے اور بعض اوقات جب گنجائش ہوتی تھی تو خود بھی امداد فرماتے تھے۔

۷۔ چھوٹے بچے یعنی پندرہ سال سے کم عمر کے بچے عموماً جنگ میں ساتھ نہیں لیے جاتے تھے اور جو بچے اس شوق میں ساتھ ہو لیتے تھے انہیں جائزہ کے وقت جو عموماً شہر سے باہر نکل کر لیا جاتا تھا واپس کر دیا جاتا تھا۔

۸۔ جنگ میں عموماً چند ایک عورتیں بھی ساتھ جاتی تھیں جو کھانے پینے کا انتظام کرنے کے علاوہ تیمارداری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام بھی کرتی تھیں اور لڑائی کے وقت فوجیوں کو پانی بھی لا کر دیتی تھیں بعض خاص خاص موقعوں پر مسلمان عورتوں نے کفار کے خلاف تلوار بھی چلائی ہے۔

۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ سفر میں اپنی ازواج میں سے کسی ایک کو یا ایک سے زیادہ کو جیسا کہ موقعہ ہو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور اس کے لیے آپؐ قرعہ ڈالا کرتے تھے اور جس کا نام قرعہ میں نکلتا تھا اُسے ساتھ لے جاتے تھے۔

۱۰۔ جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عام طریق تھا کہ جب کبھی آپ کو کسی دشمن قبیلہ کے متعلق یہ اطلاع ملتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے تو آپؐ پیش دستی کر کے اس کے حملہ کو روکنے کی کوشش فرماتے تھے اور ایسا نہیں کرتے تھے کہ دشمن کو پوری طرح تیاری کر لینے کا موقع دیں اور اس کے حملہ کا انتظار کرتے

---

[1] زرقانی حالات غزوہ اُحد و خندق ۔

[2] بخاری حالات غزوہ تبوک و زرقانی حالات غزوہ بنولحیان ۔

رہیں اور جب وہ عملاً حملہ کر دے تو پھر اس کا مقابلہ کریں۔ نیز آپؐ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اسلامی لشکر دشمن تک اچانک پہنچ جائے اور اُسے اطلاع نہ ہو ان تدابیر سے آپؐ نے مسلمانوں کو بہت سے مصائب سے بچا لیا۔

۱۱- جب آپؐ کوئی فوجی دستہ روانہ فرماتے تھے تو انہیں چلتے ہوئے یہ نصیحت فرماتے تھے کہ جب تم دشمن کے سامنے ہو تو اُسے تین باتوں کی طرف دعوت دو۔ اور اگر ان باتوں میں سے وہ کوئی ایک بات بھی مان لے تو اُسے قبول کر لو اور لڑائی سے رُک جاؤ۔ سب سے پہلے اُسے اسلام کی دعوت دو اگر وہ لوگ مسلمان ہونا پسند کریں تو پھر انہیں ہجرت کرنے کی تحریک کرو۔ اگر وہ ہجرت کرنا قبول نہ کریں، تو اُن سے کہو کہ اچھا تم مسلمان رہو اور اپنے گھروں میں ٹھہرو، لیکن اگر وہ مسلمان ہونا ہی پسند نہ کریں تو پھر اُن سے کہو کہ اپنے مذہب پر رہو، لیکن مسلمانوں کی عداوت اور ان سے جنگ کرنا چھوڑ دو اور اسلامی حکومت کے ماتحت آجاؤ۔ اگر وہ لوگ یہ بھی نہ مانیں تو پھر اس کے بعد تمہیں اُن سے لڑنے کی اجازت ہے[۱]۔

۱۲- نیز جب آپؐ کوئی فوجی دستہ روانہ فرماتے تھے تو اُسے نصیحت فرماتے تھے کہ اُغْزُوْا بِسْمِ اللّٰهِ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تُمَثِّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا وَلَا امْرَأَةً[۲] وَلَا تَقْتُلُوْا اَصْحَابَ الصَّوَامِعِ[۳] وَلَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا وَلَا طِفْلًا وَلَا صَغِيْرًا وَلَا امْرَأَةً وَاَصْلِحُوْا وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ[۴] ــ یعنی اے مسلمانو! نکلو اللہ کا نام لے کر اور جہاد کرو حفاظتِ دین کی نیت سے۔ مگر خبردار مالِ غنیمت میں بد دیانتی نہ کرنا اور نہ کسی قوم سے دھوکا کرنا۔ اور نہ دشمنوں کے مقتولوں کا مثلہ کرنا اور نہ بچوں اور عورتوں اور مذہبی عبادت گاہوں کے لوگوں کو قتل کرنا اور نہ بہت بوڑھوں کو قتل کرنا اور مُلک میں اصلاح کرنا۔ اور لوگوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا کیونکہ تحقیق خدا تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" اور حضرت ابوبکرؓ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ جب کسی فوج کو روانہ فرماتے تھے تو اس کے امیر کو یہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ اَلَّذِيْنَ زَعَمُوْا اَنَّهُمْ حَبَسُوْا اَنْفُسَهُمْ لِلّٰهِ فَذَرْهُمْ وَمَا زَعَمُوْا اَنَّهُمْ حَبَسُوْا اَنْفُسَهُمْ لَهٗ ...... وَلَا تَقْطَعَنَّ شَجَرًا مُثْمِرًا وَلَا تُخَرِّبَنَّ عَامِرًا[۵] یعنی وہ لوگ جنھوں نے اپنے خیال میں اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر رکھا ہے ان کو کچھ نہ کہنا اور اسی طرح جس چیز کو وہ مقدس سمجھتے ہوں اُسے بھی کچھ نہ کہنا اور پھلدار درخت کو نہ کاٹنا اور نہ کسی آبادی کو ویران کرنا"

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عرب میں یہ دستور تھا کہ بعض اوقات لڑائی میں دشمن کے بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کر دیتے تھے اور بعض اوقات نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے مقتولوں کے ہاتھ پاؤں اور ناک کان وغیرہ کاٹ ڈالتے تھے جسے مُثلہ کرنا کہتے تھے اور دشمن کے اموال و امتعہ اور ان کی آبادی کو تباہ و برباد کر دیتے تھے اور عہد و پیمان کی تو کوئی قیمت ہی نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں سے روک دیا۔ مذہبی لوگوں اور مذہبی چیزوں کی حفاظت کے طریق میں بھی اسلام نے ایک نمایاں امتیاز پیدا کیا۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آپؐ جب

---

[۱] مسلم و ابوداؤد [۲] مسلم [۳] طحاوی [۴] ابوداؤد [۵] موطا امام مالک

کسی جماعت کو روانہ فرماتے تھے تو اسے نصیحت فرماتے تھے کہ بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا وَیَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا [1] یعنی لوگوں کو خوشخبریاں دو یعنی ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرو اور ایسا طریق اختیار نہ کرو جس سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہو اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کرو اور انہیں مشکلوں میں مت ڈالو۔[1]

۱۳- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ لازمی طریق تھا کہ جب کسی پارٹی یا دستہ یا فوج کو روانہ فرماتے تھے تو ان میں سے کسی شخص کو ان کا امیر مقرر فرما دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر تین آدمی بھی ہوں تو انہیں چاہیئے کہ اپنے میں سے کسی کو اپنا امیر بنا لیا کریں اور آپؐ امیر کی اطاعت کی سخت تاکید فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ فرمایا کہ اگر تم پر ایک بیوقوف حبشی غلام بھی امیر مقرر کر دیا جاوے تو اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ مگر ساتھ ہی یہ حکم تھا کہ اگر امیر کوئی ایسا حکم دے جو خدا اور اس کے رسُول کے حکم کے صریح خلاف ہو تو اس معاملہ میں اس کی اطاعت نہ کرو مگر اس حال میں بھی اس کا ادب ضرور ملحوظ رکھو۔

۱۴- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ جب کسی غزوہ میں کسی چڑھائی پر چڑھتے تھے تو تکبیر کہتے جاتے تھے یعنی اللہ کی بڑائی بیان کرتے تھے اور جب کسی بلندی سے نیچے اُترتے تھے تو تسبیح کہتے تھے یعنی اللہ کی پاکیزگی بیان کرتے تھے۔

۱۵- سفر میں صحابہ کو حکم ہوتا تھا کہ اس طرح پر پڑاؤ نہ ڈالا کریں کہ لوگوں کے لیے موجب تکلیف ہو۔ نیز حکم تھا کہ کوچ کے وقت اس طرح نہ چلا کرو کہ راستہ رُک جاوے اور اس میں یہاں تک سختی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ اعلان فرمایا کہ جو شخص پڑاؤ اور رستے میں دُوسروں کا خیال نہیں رکھے گا وہ جہاد کے ثواب سے محروم رہے گا۔[2]

۱۶- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دشمن کے سامنے ہوتے تھے تو پہلے ہمیشہ دُعا فرمایا کرتے تھے۔

۱۷- لڑائی کے لیے آپؐ صبح کا وقت پسند فرمایا کرتے تھے اور جب دھوپ تیز ہو جاتی تھی تو رُک جاتے تھے اور پھر دوپہر گذار کر لڑائی کا حکم دیتے تھے۔[3]

۱۸- لڑائی سے قبل آپؐ خود صحابہؓ کی صف آرائی فرمایا کرتے تھے اور صفوں میں بے ترتیبی کو بہت ناپسند فرماتے تھے۔

۱۹- اسلامی لشکر کے ساتھ عموماً دو قسم کے جھنڈے ہوتے تھے ایک سفید ہوتا تھا جو کسی لکڑی وغیرہ پر لپٹا ہوتا تھا اسے لواء کہتے تھے۔ دوسرا عموماً سیاہ ہوتا تھا جس کی ایک طرف کسی لکڑی وغیرہ سے بندھی ہوتی تھی اور وہ ہوا میں لہراتا تھا اسے رایہ کہتے تھے۔ یہ دونوں قسم کے جھنڈے لڑائی کے وقت خاص خاص آدمیوں کے سپرد کر دیئے جاتے تھے۔

۲۰- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ہر لڑائی میں اپنی فوج کا کوئی لفظی شعار[4] مقرر فرما دیا کرتے تھے جس سے اپنا بیگانہ

---

[1] مسلم ۔ [2] ابوداؤد ۔

[3] ابوداؤد و ترمذی ۔ [4] WATCHWORD ۔

پہچانا جاتا تھا۔

۲۱۔ فوج میں شور و شغب کو ناپسند کیا جاتا تھا اور نہایت خاموشی کے ساتھ کام کرنے کا حکم تھا۔[1]

۲۲۔ لڑائی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی فوج کے مختلف دستوں پر مختلف صحابیوں کو امیر مقرر کرکے ان کی جگہیں متعین فرما دیتے تھے اور فرائض سمجھا دیتے تھے۔ ان کمانڈروں کے تقرر میں عموماً اس اصول کو مدِنظر رکھا جاتا تھا کہ کسی دستہ پر اس شخص کو امیر بنایا جاوے جو اُن میں صاحب اثر ہو۔

۲۳۔ بعض خاص خاص موقعوں پر آپؐ کا یہ بھی طریق تھا کہ صحابہ سے خاص بیعت لیتے تھے۔ چنانچہ صُلح حدیبیہ کے موقعہ پر بیعت لینے کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے۔

۲۴۔ میدانِ جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حُکم ہوتا تھا کہ جبتک میں حکم نہ دوں لڑائی شروع نہ کی جاوے۔

۲۵۔ لڑائی کے دوران میں بھی آپؐ خاص خاص احکام جاری فرماتے رہتے تھے اور خود یا کسی بلند آواز صحابی کے واسطے سے پکار پکار کر ضروری ہدایات کا اعلان فرماتے تھے۔

۲۶۔ مُسلمانوں کو بھاگنے یا ہتھیار ڈالنے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ حکم تھا کہ یا غالب آؤ یا شہید ہو جاؤ۔ ہاں جنگی اغراض کے لیے وقتی طور پر پیچھے ہٹ آنے کی اجازت تھی۔[2] لیکن اگر کبھی کسی بشری کمزوری کے ماتحت بعض لوگ بھاگ جاتے تھے تو آپؐ ان سے زیادہ ناراض نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں آئندہ کے لیے ہمّت دلاتے تھے اور فرماتے تھے کہ شاید تم لوگ جنگی تدبیر کے طور پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے پیچھے ہٹ آتے ہو گے۔

۲۷۔ صحابہ کو حکم تھا کہ لڑائی میں کسی کے منہ پر ضرب نہ لگائیں۔[3]

۲۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ضرب لگانے میں سب لوگوں سے زیادہ نرم مسلمان کو ہونا چاہیئے۔[4]

۲۹۔ تاکیدی حکم تھا کہ جب تک عملاً لڑائی نہ ہولے۔ قیدی نہ پکڑے جائیں۔ یہ نہیں کہ دشمن کو دیکھا اور کمزور پا کر قیدی پکڑنے شروع کر دیئے۔[5]

۳۰۔ حکم تھا کہ جو قیدی پکڑے جائیں انہیں بعد میں حسب حالات یا تو بطور احسان کے یونہی چھوڑ دیا جاوے۔ یا ضروری ہو تو قید میں رکھا جاوے، مگر یہ قید صرف اس وقت رہ سکتی ہے کہ جبتک جنگ جاری رہے یا جنگ کی وجہ سے جو بوجھ پڑے ہوں وُہ دُور نہ ہو جائیں، اس کے بعد نہیں۔[6]

۳۱۔ قیدیوں کے ساتھ نہایت درجہ نرمی اور شفقت کے سلوک کا حکم تھا؛ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے صحابہ کو خود اپنے آرام کی نسبت بھی قیدیوں کے آرام کا خیال زیادہ رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی حکم تھا کہ جو قیدی آپس میں قریبی رشتہ دار ہوں انکو ایک دُوسرے سے ہرگز جُدا نہ کیا جاوے۔[7]

---

[1] ابوداؤد ۞ [2] سورۃ انفال: ۱۶،۱۷ ۞ [3] بخاری و مسلم ۞ [4] ابوداؤد ۞ [5] قرآن کریم سورۃ انفال: ۶۸
[6] قرآن کریم سورۃ محمد: ۵ [7] ترمذی ابواب السیر و ابواب البیوع ۞

۴۲۔ قیدیوں کا فدیہ صرف نقدی کی صورت میں لینے پر اصرار نہ کیا جاتا تھا؛ چنانچہ بدر کے بعض خواندہ قیدیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز کیا تھا کہ اگر وہ مسلمانوں کو نوشت و خواند سکھا دیں تو انہیں چھوڑ دیا جاویگا۔ بعض اوقات کفار قیدیوں کو مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں بھی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نقد فدیہ کی صورت میں بھی مکاتبت کے طریق کی اجازت تھی۔

۴۳۔ مسلمانوں کو لوٹ مار اور غارت گری سے نہایت سختی سے روکا جاتا تھا؛ چنانچہ اس کے متعلق کسی قدر مفصل بحث اوپر گذر چکی ہے۔

۴۴۔ حکم تھا کہ اگر لڑائی کے وقت بھی کوئی دشمن اسلام کا اظہار کرے تو خواہ اس نے مسلمانوں کا کتنا ہی نقصان کیا ہو فوراً اس سے ہاتھ کھینچ لو۔ کیونکہ اب اس سے خطرہ کا احتمال نہیں رہا؛ چنانچہ اس ضمن میں اسامہ بن زید کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے۔

۴۵۔ عہد و پیمان کے پورا کرنے کی نہایت سختی سے تاکید کی جاتی تھی[1] اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عہد کا اس قدر پاس تھا کہ جب حذیفہ بن یمان مکہ سے ہجرت کر کے بدر کے موقعہ پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ سے عرض کیا کہ میں جب مکہ سے نکلا تھا تو قریش نے یہ شبہ کر کے کہ شاید میں آپ کی مدد کے لیے جا رہا ہوں مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ میں آپ کی طرف سے نہ لڑوں گا۔ تو آپ نے فرمایا۔ تو پھر تم جاؤ اور اپنا عہد پورا کرو ہمیں خدا کی امداد بس ہے۔[2] (یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال احتیاط تھی؛ حالانکہ فتویٰ کے طور پر ایسا عہد جو جبر کے طور پر حاصل کیا جاوے واجب الایفاء نہیں) اور حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں تو یہاں تک اعلان کیا تھا کہ جو مسلمان دشمن کے ساتھ دھوکا یا بدعہدی کریگا میں اس کی گردن اُڑا دوں گا۔[3]

۴۶۔ میدان جنگ میں جو مسلمان شہید ہوتے تھے انہیں غسل نہیں دیا جاتا تھا اور نہ ہی خاص طور پر کفنایا جاتا تھا۔

۴۷۔ مجبوری کے وقت ایک ہی قبر میں کئی کئی شہداء کو اکٹھا دفن کر دیا جاتا تھا اور ایسے موقعوں پر ان لوگوں کو قبر میں پہلے اُتارا جاتا تھا جو قرآن شریف زیادہ جانتے تھے۔ نیز شہداء کے متعلق حکم تھا کہ انہیں میدان جنگ میں ہی دفنا دیا جاوے۔

۴۸۔ شہداء کا جنازہ بعض اوقات تو لڑائی کے فوراً بعد پڑھ دیا جاتا تھا اور بعض اوقات جب امن کی صورت نہ ہو تو بعد میں کسی اور موقعہ پر پڑھا دیا جاتا تھا۔

۴۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ حتی الوسع دشمن کے مقتولوں کو بھی اپنے انتظام میں دفن کروا دیتے تھے۔[4]

---

[1] قرآن سورۃ انفال: ۲۰، و بنی اسرائیل و نیز بخاری و مسلم ؛ [2] مسلم

[3] موطا ؛ [4] دار قطنی بحوالہ الروض الانف حالات غزوہ بدر ؛

۴۰۔ اسلامی جنگوں میں لڑنے والے تنخواہ دار نہیں ہوتے تھے۔

۴۱۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کا یہ اصول تھا کہ سب سے پہلے امیرِ لشکر غنیمت کے مال میں سے کوئی ایک چیز اپنے لیے چُن لیتا تھا جسے صفیہ کہتے تھے۔ پھر سارے اموال کا پانچواں حصّہ خدا اور اس کے رسول کے لیے الگ کر دیا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد بقیہ مال فوج میں بحصّہ برابر تقسیم کر دیا جاتا تھا اس طرح پر کہ سوار کو پیدل کی نسبت دو حصّے زیادہ دیا جاتا تھا اور نیز مقتول کافر کا ذاتی سامان جو اس کے جسم پر ہو وہ بھی مسلمان قاتل کا حق سمجھا جاتا تھا۔

۴۲۔ جو خُمس خدا اور اس کے رسول کے لیے الگ کیا جاتا تھا اُس میں کچھ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل و عیال اور اقرباء میں تقسیم فرما دیتے تھے اور بیشتر حصّہ اس کا مسلمانوں کی اجتماعی دینی اور قومی اغراض میں صرف ہوتا تھا اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ سے فرمایا کہ مالِ غنیمت میں سے مجھے خُمس کے علاوہ ایک اونٹ کے بال کے برابر بھی لینا حرام ہے وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ عَلَيْكُمْ[1] اور پھر یہ خُمس بھی تمہارے ہی کام آتا ہے۔

۴۳۔ لڑائی کے میدان میں عام طور پر نماز کی ادائیگی کا یہ طریق تھا کہ امام تو ایک ہی رہتا تھا لیکن فوج کے آدمی مختلف حصّوں میں باری باری آکر امام کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے اور بقیہ فوج دشمن کے سامنے رہتی تھی اسے صلوٰۃ خوف کہتے تھے اور مختلف حالات کے ماتحت اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

۴۴۔ شروع شروع میں بعض صحابہ سفروں میں روزے رکھتے تھے اور بعض افطار کرتے تھے لیکن آخری ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ سفر میں روزہ نہ رکھا جاوے اور فرمایا تھا کہ سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے۔ جن صحابہ نے آپؐ کے اس حکم کو محض ایک سفارش سمجھ کر روزہ رکھ لیا ان کے متعلق آپ نے فرمایا: أُولٰئِكَ الْعُصَاةُ[2] یعنی یہ لوگ نافرمانی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

۴۵۔ جاسوس کے قتل کا عرب میں دستور تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے برقرار رکھا۔

۴۶۔ دشمن کے قاصد کو روک لینے یا کسی قسم کا نقصان پہنچانے یا قتل کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سختی سے منع فرماتے تھے؛ چنانچہ ایک دفعہ بعض لوگ کفار کے قاصد ہو کر آئے اور انھوں نے آپؐ کے سامنے گستاخانہ طریق سے باتیں کیں۔ آپؐ نے فرمایا تم قاصد ہو اس لیے میں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک اور موقعہ پر ایک قاصد آیا اور آپؐ سے مل کر مسلمان ہو گیا اور پھر اُس نے آپؐ سے عرض کیا کہ میں اب واپس جانا نہیں چاہتا۔ آپؐ نے فرمایا: میں بدعہدی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ تم قاصد ہو تمہیں بہرحال واپس جانا چاہیے۔ ہاں اگر پھر آنا چاہو تو آ جانا۔ چنانچہ وہ گیا اور کچھ عرصہ کے بعد موقعہ پا کر پھر واپس آ گیا[3]

۴۷۔ جب مکہ اور مدینہ کی سرزمین شرک کے عنصر سے پاک ہو گئی اس وقت یہ اعلان کیا گیا کہ اگر اب بھی کوئی بیرونی مشرک مذہبی تحقیق کے لیے حجاز میں آنا چاہے تو بخوشی آ سکتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ

---

[1] موطا امام مالک ✤ [2] ترمذی ابواب الصوم ✤ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد ✤

اس کی حفاظت اور پُرامن واپسی کے ہم ذمہ وار ہوں گے[۱]

۴۸۔ کفار میں سے جو لوگ مُسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر لیتے تھے اُن کی حفاظت اور حقوق کا آپ کو خاص خیال رہتا تھا۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مَنْ قَتَلَ مُعَاهِداً لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ[۲] یعنی جو مسلمان کسی معاہد کافر کو قتل کریگا، اُسے جنّت کی ہوا تک نہیں پہنچے گی۔

نیز آپ نے یہ حکم جاری فرمایا تھا کہ جو مُسلمان کسی معاہد کافر کو یونہی غلطی سے بلا ارادے کے قتل کر دے اس کا فرض ہوگا کہ اس کے رشتہ داروں کو اس کی پوری پوری دیت ادا کرنے کے علاوہ ایک غلام آزاد کرے[۳]

۴۹۔ معاہد کافر کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِداً أَوِ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ الطَّاقَةِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئاً بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسِهِ فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ[۴] یعنی جو مسلمان کسی معاہد کافر پر کسی قسم کا ظلم کرے گا یا اُسے نقصان پہنچائیگا یا اس پر کوئی ایسی ذمہ داری یا ایسا کام ڈالے گا جو اس کی طاقت سے باہر ہے یا اس سے کوئی چیز بغیر اس کی خوشی اور مرضی کے لے گا تو اے مسلمانو! سُن رکھو میں قیامت کے دن اس معاہد کافر کی طرف سے ہو کر اس مسلمان کے خلاف انصاف چاہوں گا۔

۵۰۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی قوم کے خلاف جنگ کرنے کو نکلتے تھے تو فتح حاصل ہونے کے بعد عموماً تین دن سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہرتے تھے اور یہ غالباً اس لیے کرتے تھے کہ وہاں کے لوگوں کے لیے اسلامی لشکر کا قیام موجب تکلیف اور پریشانی نہ ہو[۵]

۵۱۔ سب سے آخر میں مگر غالباً سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاد میں دین کی حفاظت اور فتنہ کے سدِ باب کے سوا کسی اور نیت کو سخت ناجائز سمجھا جاتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام اعلان تھا کہ جو شخص غنیمت کے لالچ میں یا لڑائی کے اظہار کے لیے یا کسی اور دنیاوی غرض سے نکلتا ہے وہ جہاد کے ثواب سے قطعی محروم ہے۔ اس ضمن میں کسی قدر مفصل بحث اوپر گذر چکی ہے۔

اس جگہ یہ ذکر بھی بے موقعہ نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں عرب میں لڑنے کا طریق یہ ہوتا تھا کہ جب فوجیں ایک دوسرے کے سامنے ہو جاتی تھیں تو خاص خاص لوگ انفرادی مقابلوں کے لیے نکل کر مبارز طلبی کرتے تھے اور ان انفرادی مقابلوں کے بعد عام حملہ کیا جاتا تھا۔ جنگ میں پیدل اور گھوڑے پر سوار ہو کر دونوں طرح لڑنے کا دستور تھا مگر گھوڑے پر سوار ہو کر لڑنا بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اُونٹ عموماً صرف سفر کاٹنے یا اسباب اٹھانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ آلاتِ حرب حملہ کے لیے تلوار نیزہ اور تیر کمان تک محدود تھے اور دفاع کے لیے ڈھال اور زرہ اور خود استعمال کیے جاتے تھے۔ عرب کے بعض قبائل میں دشمن پر پتھر کی بارش برسانے کے لیے ایک قسم کی مشین بھی استعمال ہوتی تھی جسے

---

[۱] سورۃ توبہ ٭ [۲] بخاری کتاب الجہاد ٭ [۳] سورۃ نساء : ۹۲

[۴] ابوداؤد ٭ [۵] بخاری کتاب الجہاد ٭

منجنیق کہتے تھے۔ اس مشین کا خیال غالباً ایران سے عرب میں آیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا استعمال محاصرہ طائف کے موقعہ پر فرمایا تھا۔

آغازِ جہاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاطی تدابیر

یہ بتایا جا چکا ہے کہ جہاد بالسیف کی اجازت میں پہلی قرآنی آیت بارہ صفر ۲ھ کو نازل ہوئی تھی۔ یعنی دفاعی جنگ کے اعلان کا جو خدائی اشارہ ہجرت میں کیا گیا تھا اس کا باضابطہ اعلان صفر ۲ھ میں کیا گیا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیام مدینہ کی ابتدائی کارروائیوں سے فارغ ہو چکے تھے اور اس طرح جہاد کا آغاز ہو گیا۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ کفار کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً چار تدابیر اختیار کیں جو آپ کی اعلیٰ سیاسی قابلیت اور جنگی دوربینی کی ایک بیّن دلیل ہیں۔

یہ تدابیر مندرجہ ذیل تھیں :-

اوّل آپ نے خود سفر کرکے آس پاس کے قبائل کے ساتھ باہمی امن وامان کے معاہدے کرنے شروع کیے تاکہ مدینہ کے اردگرد کا علاقہ خطرہ سے محفوظ ہو جائے اس امر میں آپ نے خصوصیت کے ساتھ ان قبائل کو مدِنظر رکھا جو قریش کے شامی رستے کے قرب وجوار میں آباد تھے کیونکہ جیسا کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے یہی وہ قبائل تھے جن سے قریش مکہ مسلمانوں کے خلاف زیادہ مدد لے سکتے تھے اور جن کی دشمنی مسلمانوں کے واسطے سخت خطرات پیدا کر سکتی تھی۔

دوم آپ نے چھوٹی چھوٹی خبر رساں پارٹیاں مدینہ کے مختلف جہات میں روانہ کرنی شروع فرمائیں۔ تاکہ آپ کو قریش اور ان کے حلفاء کی حرکات وسکنات کا علم ہوتا رہے اور قریش کو بھی یہ خیال رہے کہ مسلمان بے خبر نہیں ہیں اور اس طرح مدینہ اچانک حملوں کے خطرات سے محفوظ ہو جائے۔

سوم ان پارٹیوں کے بھجوانے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ تا اس ذریعہ سے مکہ اور اس کے گردونواح کے کمزور اور غریب مسلمانوں کو مدینہ کے مسلمانوں میں آملنے کا موقعہ مل جاوے۔ ابھی تک مکہ کے علاقہ میں کئی لوگ ایسے موجود تھے جو دل سے مسلمان تھے مگر قریش کے مظالم کی وجہ سے اپنے اسلام کا برملا طور پر اظہار نہیں کر سکتے تھے اور نہ اپنی غربت اور کمزوری کی وجہ سے ان میں ہجرت کی طاقت تھی کیونکہ قریش ایسے لوگوں کو ہجرت سے جبراً روکتے تھے؛ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا[1] یعنی "اے مومنو! کیا وجہ ہے کہ تم لڑائی نہ کرو اللہ کے دین کی حفاظت کیلئے اور ان مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر جو کمزوری کی حالت میں پڑے ہیں اور

---

[1] سورۃ النساء : ۷۶ ؎

دُعائیں کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! نکال ہم کو اس شہر سے جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہم ناتوانوں کے لیے اپنی طرف سے کوئی دوست و مددگار عطا فرما۔ پس ان پارٹیوں کے بھجوانے میں ایک یہ مصلحت بھی تھی کہ تا ایسے لوگوں کو ظالم قوم سے چھٹکارا پانے کا موقعہ مل جاوے۔ یعنی ایسے لوگ قریش کے قافلوں کے ساتھ ملے ہوئے مدینہ کے قریب پہنچ جائیں اور پھر مسلمانوں کے دستے کی طرف بھاگ کر مسلمانوں میں آملیں، چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلا دستہ ہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبیدہ بن الحارث کی سرداری میں روانہ فرمایا تھا اور جس کا عکرمہ بن ابوجہل کے ایک گروہ سے سامنا ہو گیا تھا اس میں مکہ کے دو کمزور مسلمان جو قریش کے ساتھ ملے ملائے آگئے تھے، قریش کو چھوڑ کر مسلمانوں میں آملے تھے، چنانچہ روایت آتی ہے کہ:

فَرَّمِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اِلَى الْمُسْلِمِيْنَ اَلْمِقْدَادُ بْنُ عَمْرٍو حَلِيْفُ بَنِيْ زُهْرَةَ وَعُتْبَةُ بْنُ غَزْوَانَ حَلِيْفُ بَنِيْ نَوْفَلَ وَكَانَا مُسْلِمَيْنِ وَلٰكِنَّهُمَا خَرَجَا لِيَتَوَصَّلَا بِالْكُفَّارِ اِلَى الْمُسْلِمِيْنَ[1] یعنی "اس مہم میں جب مسلمانوں کی پارٹی لشکرِ قریش کے سامنے آئی تو دو شخص مقداد بن عمرو اور عتبہ بن غزوان جو بنو زہرہ اور بنو نوفل کے حلیف تھے مشرکین میں سے بھاگ کر مسلمانوں میں آملے اور یہ دونوں شخص مسلمان تھے اور صرف کفار کی آڑ لے کر مسلمانوں میں آملنے کے لیے نکلے تھے۔"

پس ان پارٹیوں کے بھجوانے میں ایک غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی تھی کہ تا ایسے لوگوں کو ظالم قریش سے چھٹکارا پانے اور مسلمانوں میں آملنے کا موقعہ ملتا رہے۔

چہارم: چوتھی تدبیر آپ نے یہ اختیار فرمائی کہ آپ نے قریش کے ان تجارتی قافلوں کی روک تھام شروع فرما دی جو مکہ سے شام کی طرف آتے جاتے ہوئے مدینہ کے پاس سے گذرتے تھے۔ کیونکہ (الف) یہ قافلے جہاں جہاں سے گذرتے تھے مسلمانوں کے خلاف عداوت کی آگ لگاتے جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ مدینہ کے گردونواح میں اسلام کی عداوت کا تخم بویا جانا مسلمانوں کے لیے نہایت خطرناک تھا (ب) یہ قافلے ہمیشہ مسلح ہوتے تھے اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کے قافلوں کا مدینہ سے اس قدر قریب ہو کر گذرنا ہرگز خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ (ج) قریش کا گذارہ زیادہ تر تجارت پر تھا اور ان حالات قریش کو زیر کرنے اور ان کو اُن کی ظالمانہ کارروائیوں سے روکنے اور صلح پر مجبور کرنے کا یہ سب سے زیادہ یقینی اور سریع الاثر ذریعہ تھا کہ ان کی تجارت کا راستہ بند کر دیا جاوے۔ چنانچہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جن باتوں نے بالآخر قریش کو صلح کی طرف مائل ہونے پر مجبور کیا اُن میں ان کے تجارتی قافلوں کی روک تھام کا بہت بڑا دخل تھا پس یہ ایک نہایت دانشمندانہ تدبیر تھی جو اپنے وقت پر کامیابی کا پھل لائی۔ (د) قریش کے ان قافلوں کا نفع بسا اوقات اسلام کو مٹانے کی کوشش میں صرف ہوتا تھا۔ بلکہ بعض قافلے تو خصوصیت کے ساتھ اسی غرض سے بھیجے جاتے تھے کہ ان کا سارا نفع مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ اس صورت میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان قافلوں کی روک تھام خود اپنی ذات میں بھی ایک بالکل جائز مقصود تھی۔

---

[1] طبری و ابن ہشام حالات سریہ عبیدۃ الحارث۔

بعض متعصب عیسائی مورخین نے جن کو اسلام کی خوبیاں بھی بدی کی شکل میں نظر آتی ہیں یہ اعتراض کیا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ قریش کے قافلوں کو لُوٹنے کی غرض سے نکلتے تھے۔ ہم ان عدل و انصاف کے مجسموں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا تمہاری قومیں جنھیں تم تہذیب وشرافت کے معراج کو پہنچا ہوا سمجھتے ہو جنگ کے زمانہ میں دشمن قوموں کے تجارتی رستے نہیں روکتیں؟ اور کیا انہیں جب یہ خبر پہنچتی ہے کہ فلاں دشمن قوم کا کوئی تجارتی جہاز فلاں جگہ سے گذر رہا ہے تو وہ فوراً اس کے پیچھے ایک بحری دستہ روانہ کرکے اس کو تباہ و برباد کر دینے یا اسے مغلوب کرکے اس کے اموال پر قبضہ کر لینے کی تدابیر نہیں اختیار کرتیں؟ تو پھر کیا اس وجہ سے تمہارے فرمانرواؤں کا نام ڈاکو اور لٹیرے اور غارت گر رکھا جا سکتا ہے؟ یقیناً اگر مسلمانوں نے قریش کے قافلوں کی روک تھام کی تو اس غرض سے نہیں کی کہ ان کے قافلوں کے اموال پر قبضہ کریں بلکہ اس لیے کی کہ تدابیر جنگ کا تقاضا تھا کہ قریش کی تجارت کا رستہ بند کر دیا جاوے کیونکہ اس سے بہتر ان کو ہوش میں لانے اور صلح کی طرف مائل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ باقی اگر قریش کا کوئی قافلہ مغلوب ہو گیا اور اس غلبہ کے نتیجہ میں اس کا مال و متاع مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو وہ جنگ کی فتوحات کا حصہ تھا جس کا ہر قوم اور [illegible]ں فاتح کو حقدار سمجھا گیا ہے کیا معترضین کا یہ مطلب ہے کہ مسلمان کفار کے قافلوں کو تو بیشک روکتے اور ان کے آدمیوں کو مارتے لیکن قافلوں کے اموال کو اپنے تصرف میں نہ لاتے بلکہ اپنے خرچ پر اپنی فوج کی حفاظت میں نہایت احتیاط کے ساتھ مکہ بھجوا دیا کرتے تا کہ ان اموال کی مدد سے قریش دو چار اور جرار لشکر تیار کرکے مسلمانوں کے خلاف مدینہ پر چڑھا لاتے؟ اگر ان کا یہی خیال ہے تو انہیں یہ خیال مبارک ہو۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اسلام کا دامن اس قسم کی بے وقوفی اور بے غیرتی اور خودکشی کی تعلیم سے پاک ہے اور یہ کہنا کہ ان قافلوں کی روک تھام میں مسلمانوں کو لُوٹ مار کی تعلیم دی جاتی تھی کس قدر ظلم کس قدر انصاف سے بعید ہے۔ کیا اس قوم کو لُوٹ مار کی تعلیم دی جاتی تھی جن میں سے بعض نے ایک جہاد کے سفر میں بھوک سے سخت تنگ آکر اور گویا موت کے منہ میں پہنچ کر کسی کے ایک گلہ میں سے دو چار بکریاں پکڑ کر ذبح کر لیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر غصہ میں ہنڈیوں کو اُلٹ دیا اور گوشت کو مٹی میں مسلتے ہوئے فرمایا کہ "یہ لُوٹ کا مال تمہارے لیے کس نے حلال کیا ہے؟ یہ تو ایک مُردار سے بڑھ کر نہیں"؟ پھر کیا اس قوم کو لُوٹ مار کی تعلیم دی جاتی تھی جن میں سے نومسلم لوگ جہاد پر جاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آ آکر پوچھتے تھے کہ یا رسول اللہ! اگر لڑائی میں ایک شخص کی اصل نیت تو حفاظت دین ہو لیکن اسے کچھ یہ بھی خیال ہو کہ شاید غنیمت کا مال بھی مل جائے گا، تو کیا ایسے شخص کو جہاد کا ثواب ہوگا؟ اور آپؐ فرماتے تھے "ہرگز نہیں ہرگز نہیں ایسے شخص کے لیے کوئی ثواب نہیں ہے"؟ کیا ان واقعات کے ہوتے ہوئے قافلوں کی روک تھام کو لُوٹ مار کی تعلیم سمجھا جا سکتا ہے؟ پھر یہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو سمجھاتے رہتے تھے کہ جہاد میں دُنیا کے خیالات کی ملونی نہیں ہونی چاہیے بلکہ صحابہ پر آپؐ کی اس تعلیم کا اثر بھی تھا اور یہ اثر اس قدر غالب تھا کہ وہ نہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ اُن کے دلوں میں دُنیا طلبی کے خیالات جاگزیں نہ ہوں بلکہ بعض اوقات وہ ایسے جائز موقعوں سے بھی بچتے تھے جن میں کمزور طبیعتوں کے لیے اس قسم کے خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ ہوسکتا

تھا، چنانچہ غزوہ بدر کے متعلق روایت آئی ہے کہ کئی صحابہ اس غزوہ میں اس لیے شریک نہیں ہوتے تھے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ مہم صرف قافلہ کی روک تھام کے لیے اختیار کی جا رہی ہے ورنہ اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ قریش کے لشکر کے ساتھ جنگ ہوگا تو وہ ضرور شامل ہوتے[1] اور یہ اس بات کا ایک عملی ثبوت ہے کہ صحابہ کو قافلوں کی روک تھام میں ان کے اموال واَمتعہ کی وجہ سے کوئی شغف نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو صورتِ حال یہ ہونی چاہیئے تھی کہ کسی قافلہ کی روک تھام کے موقعہ پر صحابہ زیادہ کثرت کے ساتھ شامل ہونے کے لیے آگے بڑھتے، مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے صحابہ ایک جیسے تھے۔ بیشک ان میں بعض کمزور بھی تھے اور طبعاً یہ کمزوری ابتدا میں نسبتاً زیادہ تھی مگر جو تبدیلی صحابہ کی جماعت نے آپؐ کی تربیت کے ماتحت دکھائی وہ فی الجملہ نہایت محیر العقول اور حقیقتاً بے نظیر تھی۔

---

[1] ابن ہشام و طبری و ابن سعد

ابتدائی لڑائیاں ٥ روزہ کی ابتداء ٥ تحویل قبلہ

اور

جنگِ بدر کے متعلق ابتدائی بحث

غزوات وسرایا کا آغاز اور غزوہ ودان صفر ۲ھ ہجری

اب مغازی کا عملی آغاز ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تھا کہ کبھی تو خود صحابہ کو ساتھ لیکر نکلتے تھے اور کبھی کسی صحابی کی امارت میں کوئی دستہ روانہ فرماتے تھے۔ مؤرخین نے ہر دو قسم کی مہموں کو الگ الگ نام دیئے ہیں، چنانچہ جس مہم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفس نفیس شامل ہوتے ہوں اس کا نام مؤرخین غزوہ رکھتے ہیں اور جس میں آپ خود شامل نہ ہوئے ہوں اس کا نام سریہ یا بعث رکھا جاتا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ غزوہ اور سریہ دونوں میں مخصوص طور پر جہاد بالسیف کی غرض سے نکلنا ضروری نہیں بلکہ ہر وہ سفر جس میں آپ جنگ کی حالت میں شریک ہوئے ہوں غزوہ کہلاتا ہے خواہ وہ خصوصیت کے ساتھ لڑنے کی غرض سے نہ کیا گیا ہو اور اسی طرح ہر وہ سفر جو آپ کے حکم سے کسی جماعت نے کیا ہو مؤرخین کی اصطلاح میں سریہ یا بعث کہلاتا ہے خواہ اس کی غرض وغایت لڑائی نہ ہو، لیکن بعض لوگ ناواقفیت سے ہر غزوہ اور سریہ کو لڑائی کی مہم سمجھنے لگ جاتے ہیں جو درست نہیں۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جہاد بالسیف کی اجازت ہجرت کے دوسرے سال ماہ صفر میں نازل ہوئی چونکہ قریش کے خونی ارادوں اور ان کی خطرناک کارروائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے فوری کارروائی کی ضرورت تھی اس لیے آپ اسی ماہ میں مہاجرین کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہوئے مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ روانگی سے قبل آپ نے اپنے پیچھے مدینہ میں سعد بن عبادہ رئیس خزرج کو امیر مقرر فرمایا اور مدینہ سے جنوب مغرب کی طرف مکہ کے راستہ پر روانہ ہو گئے اور بالآخر مقام ودان تک پہنچے۔ اس علاقہ میں قبیلہ بنو ضمرۃ کے لوگ آباد تھے۔ یہ قبیلہ بنو کنانہ کی ایک شاخ تھا اور اس طرح گویا یہ لوگ قریش کے چچا زاد بھائی تھے۔ یہاں پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو ضمرۃ کے رئیس کے ساتھ بات چیت کی اور باہم رضامندی سے آپس میں ایک معاہدہ ہو گیا۔

جس کی شرطیں یہ تھیں کہ بنوضمرۃ مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں گے اور مسلمانوں کے خلاف کسی دشمن کی مدد نہیں کرینگے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مسلمانوں کی مدد کے لیے بلائیں گے، تو وہ فوراً آجائیں گے۔ دوسری طرف آپؐ نے مسلمانوں کی طرف سے یہ عہد کیا کہ مسلمان قبیلہ بنوضمرۃ کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں گے اور بوقتِ ضرورت ان کی مدد کریں گے۔ یہ معاہدہ باقاعدہ لکھا گیا اور فریقین کے اس پر دستخط ہوتے اور پندرہ دن کی غیر حاضری کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے[1] غزوہ ودان کا دوسرا نام غزوہ ابواء بھی ہے کیونکہ ودان کے قریب ہی ابواء کی بستی بھی ہے اور یہ وہی مقام ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس غزوہ میں بنوضمرۃ کے ساتھ قریش مکہ کا بھی خیال تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ دراصل آپؐ کی یہ مہم قریش کی خطرناک کارروائیوں کے سدِ باب کے لیے تھی۔ اور اس میں اُس زہریلے اور خطرناک اثر کا ازالہ مقصود تھا جو قریش کے قافلے وغیرہ مسلمانوں کے خلاف قبائلِ عرب میں پیدا کر رہے تھے اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت ان ایام میں بہت نازک ہو رہی تھی۔

سریہ عبیدۃ بن الحارث ربیع الاوّل ۲ سنہ ہجری

غزوہ ودان سے واپس آنے پر ماہ ربیع الاوّل کے شروع میں آپؐ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار عبیدۃ بن الحارث مطلبی کی امارت میں ساٹھ شتر سوار مہاجرین کا ایک دستہ روانہ فرمایا۔ اس مہم کی غرض بھی قریش مکہ کے حملوں کی پیش بندی تھی؛ چنانچہ جب عبیدۃ بن الحارث اور اُن کے ساتھی کچھ مسافت طے کر کے ثنیۃ المرۃ کے پاس پہنچے تو ناگاہ کیا دیکھتے ہیں کہ قریش کے دو سو مسلح نوجوان عکرمہ بن ابوجہل کی کمان میں ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں۔ فریقین ایک دوسرے کے سامنے ہوئے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں کچھ تیراندازی بھی ہوئی[2] لیکن پھر مشرکین کا گروہ یہ خوف کھا کر کہ مسلمانوں کے پیچھے کچھ کمک مخفی ہو گی ان کے مقابلہ سے پیچھے ہٹ گیا اور مسلمانوں نے اُن کا پیچھا نہیں کیا[3]۔ البتہ مشرکین کے لشکر میں سے دو شخص مقداد بن عمرو اور عتبہ بن غزوان عکرمہ بن ابوجہل کی کمان سے خود بخود بھاگ کر مسلمانوں کے ساتھ آملے اور لکھا ہے کہ وہ اسی غرض سے قریش کے ساتھ نکلے تھے کہ موقعہ پاکر مسلمانوں میں آملیں[4]۔ کیونکہ وہ دل سے مسلمان تھے مگر بوجہ اپنی کمزوری کے قریش سے ڈرتے ہوئے ہجرت نہیں کر سکتے تھے اور ممکن ہے کہ اسی واقعہ نے قریش کو بددل کر دیا ہو اور انہوں نے اِسے بدفال سمجھ کر پیچھے ہٹ جانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ تاریخ میں یہ مذکور نہیں ہے کہ قریش کا یہ لشکر جو یقیناً کوئی تجارتی قافلہ نہیں تھا اور جس کے متعلق ابن اسحاق نے جمع عظیم (یعنی ایک بڑا لشکر) کے الفاظ استعمال کیے ہیں کسی خاص ارادہ سے اس طرف آیا تھا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اُن کی نیت بخیر نہیں تھی اور یہ خدا کا فضل تھا کہ مسلمانوں کو چوکس پاکر اور اپنے آدمیوں میں سے بعض کو

---

[1] ابنِ ہشام وزرقانی ۔ [2] ابنِ ہشام وطبری ۔
[3] تاریخ الخمیس ۔ [4] طبری و ابن ہشام ۔

مسلمانوں کی طرف جاتا دیکھ کران کو ہمت نہیں ہوئی اور وہ واپس لوٹ گئے۔ اور صحابہ کو اس مہم کا یہ عملی فائدہ ہو گیا کہ دو مسلمان رُوحیں قریش کے ظلم سے نجات پا گئیں۔

سریہ حمزہ بن عبدالمطلب ربیع الاوّل ۲ھ

اسی ماہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس شتر سوار مہاجرین کے ایک دستہ کو اپنے حقیقی چچا حمزہ بن عبدالمطلب کی سرداری میں مدینہ سے مشرقی جانب سیف البحر علاقہ عیص کی طرف روانہ فرمایا۔ حمزہ اور ان کے ساتھی جلدی جلدی وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مکہ کا رئیس اعظم ابوجہل تین سو سواروں کا ایک لشکر لیے ان کے استقبال کو موجود ہے۔ مسلمانوں کی تعداد سے یہ تعداد دس گنے زیادہ تھی مگر مسلمان خدا اور اس کے رسُول کے حکم کی تعمیل میں گھر سے نکلے تھے اور موت کا ڈر انہیں پیچھے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں صف آرائی کرنے لگ گئیں اور لڑائی شروع ہونے والی ہی تھی کہ اس علاقہ کے رئیس مجدی بن عمرو الجہنی نے جو دونوں فریق کے ساتھ تعلقات رکھتا تھا درمیان میں پڑ کر بیچ بچاؤ کرایا اور لڑائی ہوتے ہوتے رُک گئی [۱] ابن سعد نے جو عموماً اپنے استاد واقدی کی اتباع کرتا ہے لکھا ہے کہ یہ قریش کا ایک قافلہ تھا جس سے مُسلمانوں کا سامنا ہوا تھا، لیکن ابن اسحاق نے بروایت ابن ہشام قافلہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ قریش کے تین سو سواروں سے سامنا ہوا تھا جو ابوجہل کے زیر کمان تھے اور کفار کی تعداد اور دُوسرے قرائن سے ابن اسحاق کی روایت صحیح ثابت ہوتی ہے اور یہ یقینی ہے کہ کفار کا یہ دستہ مُسلمانوں کے خلاف نکلا تھا؛ چنانچہ کرز بن جابر فہری کا حملہ بھی جس کا ذکر آگے آتا ہے اس خیال کا مؤید ہے۔

غزوہ بواط ربیع الآخر ۲ھ

اسی مہینہ کے آخری ایام یا ربیع الآخر کے شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر قریش کی طرف سے کوئی خبر موصول ہوئی جس پر آپ مہاجرین کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر خود مدینہ سے نکلے اور اپنے پیچھے سائب بن عثمان بن مظعون کو مدینہ کا امیر مقرر فرمایا لیکن قریش کا پتہ نہیں چل سکا اور آپ بواط تک پہنچ کر واپس تشریف لے آئے [۲]

غزوہ عشیرہ اور سریہ سعد بن ابی وقاص جمادی الاولیٰ ۲ھ

اس کے بعد جمادی الاولیٰ میں پھر قریش مکہ کی طرف سے کوئی خبر پاکر آپ مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور اپنے پیچھے اپنے رضاعی بھائی ابوسلمہ بن عبدالاسد کو امیر مقرر فرمایا۔ اس غزوہ میں آپ کئی چکر کاٹتے ہوئے بالآخر ساحل سمندر کے قریب ینبع کے پاس مقام عشیرہ تک پہنچے اور گو قریش کا مقابلہ نہیں ہوا مگر اس میں آپ نے قبیلہ بنو مدلج کے ساتھ انہیں شرائط پر جو بنوضمرۃ کے ساتھ قرار پائی تھیں ایک معاہدہ طے فرمایا اور پھر واپس تشریف لے آئے۔ اسی سفر کے دوران میں آپ نے سعد بن ابی وقاص

---

[۱] ابن ہشام وطبری ٭ [۲] طبری و ابن ہشام ٭

کو آٹھ مہاجرین کے ایک دستہ پر امیر مقرر کر کے قریش کی خبر رسانی کے لیے خرار کی طرف روانہ فرمایا۔[1]

کرز بن جابر کا حملہ اور غزوہ سفوان جمادی الآخر ۲ ھ

مگر باوجود صحابہؓ کی اس قدر بیدار مغزی اور مسلمان پارٹیوں کے مدینہ کے گرد و نواح میں اس طرح ہوشیاری کے ساتھ چکر لگاتے رہنے کے قریش کی شرارت نے اپنے لیے راستہ پیدا کر ہی لیا؛ چنانچہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں تشریف لائے دس دن بھی نہیں گذرے تھے کہ مکہ کے ایک رئیس کرز بن جابر فہری نے قریش کے ایک دستہ کے ساتھ کمال ہوشیاری سے مدینہ کی چراگاہ پر جو شہر سے صرف تین میل پر تھی اچانک حملہ کیا اور مسلمانوں کے اونٹ وغیرہ لوٹ کر چلتا ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ہوئی تو آپؐ فوراً زید بن حارثہ کو اپنے پیچھے امیر مقرر کر کے اور مہاجرین کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر اس کے تعاقب میں نکلے اور سفوان تک جو بدر کے پاس ایک جگہ ہے اس کا پیچھا کیا مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ اس غزوہ کو غزوہ بدر الاولیٰ بھی کہتے ہیں۔[2]

کرز بن جابر کا یہ حملہ ایک معمولی بدویانہ غارت گری نہیں تھی بلکہ یقیناً وہ قریش کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف خاص ارادے سے آیا تھا بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس کی نیت خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو نقصان پہنچانے کی ہو، مگر مسلمانوں کو ہوشیار پا کر ان کے اونٹوں پر ہاتھ صاف کرتا ہوا نکل گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ مدینہ پر چھاپے مار مار کر مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا جاوے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ گو اس سے پہلے مسلمانوں کو جہاد بالسیف کی اجازت ہو چکی تھی اور انھوں نے خود حفاظتی کے خیال سے اس کے متعلق ابتدائی کارروائی بھی شروع کر دی تھی، لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کفار کو عملاً کسی قسم کا مالی یا جانی نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن کرز بن جابر کے حملہ سے مسلمانوں کو عملاً نقصان پہنچا۔ گویا مسلمانوں کی طرف سے قریش کا چیلنج قبول کیے جانے کے بعد بھی عملی جنگ میں کفار ہی کی پہل رہی۔

سریہ عبداللہ بن جحش بطرف نخلہ

کرز بن جابر کے اچانک حملہ نے طبعاً مسلمانوں کو بہت متوحش کر دیا تھا اور چونکہ رؤسا قریش کی یہ دھمکی پہلے سے موجود تھی کہ ہم مدینہ پر حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیں گے، مسلمان سخت فکر مند ہوتے اور انہی خطرات کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ فرمایا کہ قریش کی حرکات و سکنات کا زیادہ قریب سے ہو کر علم حاصل کیا جاوے تاکہ ان کے متعلق ہر قسم کی ضروری اطلاع بروقت میسر ہو جاوے اور مدینہ ہر قسم کے اچانک حملوں سے محفوظ رہے؛ چنانچہ اس غرض سے آپؐ نے آٹھ مہاجرین کی ایک پارٹی تیار کی[3] اور مصلحتاً اس پارٹی میں ایسے آدمیوں کو رکھا جو قریش کے مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے[4] تاکہ قریش کے مخفی ارادوں کے متعلق خبر حاصل کرنے میں آسانی ہو اور اس پارٹی پر آپؐ نے اپنے پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن جحش کو امیر مقرر فرمایا۔ اور اس خیال سے کہ اس پارٹی کی غرض و غایت عامۃ المسلمین سے

---

[1] ابن ہشام [2] ابن ہشام [3] ابن ہشام و طبری [4] واقدی

بھی مخفی رہے آپؐ نے اس سریہ کو روانہ کرتے ہوئے اس سریہ کے امیر کو بھی یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کہاں اور کس غرض سے بھیجا جا رہا ہے بلکہ چلتے ہوئے ان کے ہاتھ میں ایک سربمہر خط دیدیا اور فرمایا کہ اس خط میں تمہارے لیے ہدایات درج ہیں۔ جب تم مدینہ سے دو دن کا سفر طے کر لو تو پھر اس خط کو کھول کر اس کی ہدایات کے مطابق عملدرآمد کرنا۔ چنانچہ عبداللہ اور ان کے ساتھی اپنے آقا کے حکم کے ماتحت روانہ ہو گئے اور جب دو دن کا سفر طے کر چکے تو عبداللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو کھول کر دیکھا تو اس میں یہ الفاظ درج تھے۔ اِمْضِ حَتّٰی تَنْزِلَ نَخْلَةَ بَیْنَ مَكَّةَ وَالطَّائِفِ فَتَرَصَّدْ بِهَا قُرَيْشًا وَتَعْلَمْ لَنَا مِنْ اَخْبَارِهِمْ[1] یعنی "تم مکہ اور طائف کے درمیان وادی نخلہ میں جاؤ اور وہاں جا کر قریش کے حالات کا علم لو اور پھر ہمیں اطلاع لا کر دو۔" اور چونکہ مکہ سے اس قدر قریب ہو کر خبر رسانی کرنے کا کام بڑا نازک تھا۔ آپؐ نے خط کے نیچے یہ ہدایت بھی لکھی تھی کہ اس مشن کے معلوم ہونے کے بعد اگر تمہارا کوئی ساتھی اس پارٹی میں شامل رہنے سے متامل ہو اور واپس چلا آنا چاہے، تو اُسے واپس آنے کی اجازت دے دو۔ عبداللہ نے آپؐ کی یہ ہدایت اپنے ساتھیوں کو سُنا دی اور سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم بخوشی اس خدمت کے لیے حاضر ہیں۔[2] اس کے بعد یہ جماعت نخلہ کی طرف روانہ ہوئی۔ راستہ میں سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کا اُونٹ کھو یا گیا اور وہ اس کی تلاش کرتے کرتے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے اور باوجود بہت تلاش کے انہیں نہ مل سکے اور اب یہ پارٹی صرف چھ کس کی رہ گئی۔ مسٹر مارگولیس اس موقعہ پر لکھتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاص اور عتبہ نے جان بوجھ کر اپنا اُونٹ چھوڑ دیا تھا اور اس بہانہ سے پیچھے رہ گئے۔ ان جاں نثارانِ اسلام پر جن کی زندگی کا ایک ایک واقعہ ان کی شجاعت اور فدائیت پر شاہد ہے اور جن میں سے ایک غزوہ بئر معونہ میں کفار کے ہاتھوں شہید ہوا اور دُوسرا کئی خطرناک معرکوں میں نمایاں حصہ لیکر بالآخر عراق کا فاتح بنا اس قسم کا شبہ کرنا اور شبہ بھی محض اپنے من گھڑت خیالات کی بنا پر کرنا مسٹر مارگولیس ہی کا حصہ ہے اور پھر لُطف یہ ہے کہ مارگولیس صاحب اپنی کتاب میں دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو کر لکھی ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مسلمانوں کی یہ چھوٹی سی جماعت نخلہ پہنچی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی اور ان میں سے بعض نے اخفاء راز کے خیال سے اپنے سر کے بال منڈوا دیئے تاکہ راہگیر وغیرہ ان کو عمرہ کے خیال سے آئے ہوئے لوگ سمجھ کر کسی قسم کا شبہ نہ کریں لیکن ابھی ان کو وہاں پہنچے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اچانک وہاں قریش کا ایک چھوٹا سا قافلہ بھی آن پہنچا جو طائف سے مکہ کی طرف جا رہا تھا اور ہر دو جماعتیں ایک دُوسرے کے سامنے ہو گئیں۔ مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خفیہ خفیہ خبر رسانی کرنے کیلئے بھیجا تھا، لیکن دوسری طرف قریش سے جنگ شروع ہو چکی تھی اور اب دونوں حریف ایک دوسرے کے سامنے تھے اور پھر طبعاً یہ اندیشہ بھی تھا کہ اب جو قریش کے ان قافلہ والوں نے مسلمانوں کو دیکھ لیا ہے تو اس خبر رسانی کا راز بھی مخفی نہ رہ سکے گا۔ ایک دقت یہ بھی

---

[1] طبری وسیرۃ ابن ہشام ۔ [2] ابن ہشام وطبری ۔

تھی کہ بعض مسلمانوں کو خیال تھا کہ شاید یہ دن رجب یعنی شہرِ حرام کا آخری ہے جس میں عرب کے قدیم دستور کے مطابق لڑائی نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ اور بعض سمجھتے تھے کہ رجب گذر چکا ہے اور شعبان شروع ہے[1] اور بعض روایات میں ہے کہ یہ سریہ جمادی الآخر میں بھیجا گیا ہے اور شک یہ تھا کہ یہ دن جمادی کا ہے یا رجب کا[2] لیکن دوسری طرف نخلہ کی وادی عین حرم کے علاقہ کی حد پر واقع تھی اور یہ ظاہر تھا کہ اگر آج ہی کوئی فیصلہ نہ ہوا تو کل کو یہ قافلہ حرم کے علاقہ میں داخل ہو جائے گا جس کی حرمت یقینی ہوگی۔ غرض ان سب باتوں کو سوچ کر مسلمانوں نے آخر یہی فیصلہ کیا کہ قافلہ پر حملہ کر کے یا تو قافلہ والوں کو قید کر لیا جاوے اور یا مار دیا جاوے۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کا نام لے کر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں کفار کا ایک آدمی جس کا نام عمرو بن الحضرمی تھا مارا گیا اور دو آدمی قید ہو گئے، لیکن بدقسمتی سے چوتھا آدمی بھاگ کر نکل گیا اور مسلمان اسے پکڑ نہ سکے اور اس طرح ان کی تجویز کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے قافلہ کے سامان پر قبضہ کر لیا اور چونکہ قریش کا ایک آدمی بچ کر نکل گیا تھا اور یقین تھا کہ اس لڑائی کی خبر جلدی مکہ پہنچ جائے گی عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھی سامانِ غنیمت لے کر جلد جلد مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

مسٹر مارگولیس اس موقعہ پر لکھتے ہیں کہ دراصل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ دستہ دیدہ دانستہ اس نیت سے شہرِ حرام میں بھیجا تھا کہ چونکہ اس مہینہ میں قریش طبعاً غافل ہوں گے۔ مسلمانوں کو ان کے قافلہ کو لوٹنے کا آسان اور یقینی موقعہ مل جائے گا، لیکن ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسی مختصر پارٹی کو اتنے دُور دراز علاقہ میں کسی قافلہ کی غارت گری کے لیے نہیں بھیجا جا سکتا خصوصاً جبکہ دشمن کا ہیڈ کوارٹر اتنا قریب ہو اور پھر یہ بات تاریخ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ پارٹی محض خبر رسانی کی غرض سے بھیجی گئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ علم ہوا کہ صحابہ نے قافلہ پر حملہ کیا تھا تو آپؐ سخت ناراض ہوئے۔ چنانچہ روایت ہے کہ جب یہ جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپؐ کو سارے ماجرا کی اطلاع ہوئی تو آپؐ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا مَا اَمَرْتُکُمْ بِقِتَالٍ فِی الشَّھْرِ الْحَرَامِ[3] "میں نے تمہیں شہرِ حرام میں لڑنے کی اجازت نہیں دی ہوئی۔" وَاَبٰی اَنْ یَّاْخُذَ مِنْ ذٰلِکَ شَیْئًا[4] اور آپؐ نے مالِ غنیمت لینے سے انکار کر دیا۔" اس پر عبداللہ اور ان کے ساتھی سخت نادم اور پشیمان ہوئے۔ وَظَنُّوْا اَنَّھُمْ قَدْ ھَلَکُوْا[5] اور انھوں نے خیال کیا کہ بس اب ہم خدا اور اس کے رسول کی ناراضگی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔" صحابہ نے بھی ان کو سخت ملامت کی کہ اور کہا صَنَعْتُمْ مَالَمْ تُؤْمَرُوْا وَقَاتَلْتُمْ فِی الشَّھْرِ الْحَرَامِ وَلَمْ تُؤْمَرُوْا بِالْقِتَالِ[6] یعنی "تم نے وہ کام کیا جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا اور تم نے شہرِ حرام میں لڑائی کی؛ حالانکہ اس مہم میں تو تم کو مطلقاً لڑائی کا حکم نہیں تھا۔" دوسری طرف قریش نے بھی شور

---

[1] طبری و ابن ہشام ٭ [2] زرقانی ٭ [3] طبری و سیرۃ ابن ہشام ٭ [4] طبری و ابن ہشام ٭
[5] طبری و سیرۃ ابن ہشام ٭ [6] طبری ٭

مچایا کہ مُسلمانوں نے شہرِ حرام کی حُرمت کو توڑ دیا ہے اور چونکہ جو شخص مارا گیا تھا یعنی عمرو بن الحضرمی وہ ایک رئیس آدمی تھا اور پھر وہ عتبہ بن ربیعہ رئیس مکّہ کا حلیف بھی تھا اس لیے بھی اس واقعہ نے قریش کی آتشِ غضب کو بہت بھڑکا دیا اور انھوں نے آگے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی چنانچہ جنگِ بدر جس کا ذکر آگے آتا ہے زیادہ تر قریش کی اسی تیاری اور جوشِ عداوت کا نتیجہ تھا۔ الغرض اس واقعہ پر مسلمانوں اور کفار ہر دو میں بہت چہ میگوئی ہوئی اور بالآخر ذیل کی قرآنی وحی نازل ہو کر مسلمانوں کی تشفی کا موجب ہوئی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا[1] یعنی "لوگ تجھ سے پُوچھتے ہیں کہ شہرِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ تو ان کو جواب دے کہ بیشک شہرِ حرام میں لڑنا بہت بُری بات ہے، لیکن شہرِ حرام میں خدا کے دین سے لوگوں کو جبراً روکنا بلکہ شہرِ حرام اور مسجدِ حرام دونوں کا کفر کرنا یعنی ان کی حُرمت کو توڑنا اور پھر حرم کے علاقہ سے اس کے رہنے والوں کو بزور نکالنا جیسا کہ اے مشرکو تم لوگ کر رہے ہو یہ سب باتیں خدا کے نزدیک شہرِ حرام میں لڑنے کی نسبت بھی زیادہ بُری ہیں اور یقیناً شہرِ حرام میں ملک کے اندر فتنہ پیدا کرنا اس قتل سے بدتر ہے جو فتنہ کو روکنے کے لیے کیا جاوے۔ اور اے مسلمانو! کفار کا تو یہ حال ہے کہ وہ تمہاری عداوت میں لتنے اندھے ہو رہے ہیں کہ کسی وقت اور کسی جگہ بھی وہ تمہارے ساتھ لڑنے سے باز نہیں آئیں گے اور وہ اپنی یہ لڑائی جاری رکھیں گے حتّٰی کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں بشرطیکہ وہ اس کی طاقت پائیں۔" چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اسلام کے خلاف رؤسائے قریش اپنے خونی پراپیگنڈا کو اشہرِ حرم میں بھی برابر جاری رکھتے تھے بلکہ اشہرِ حرم کے اجتماعوں اور سفروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ان مہینوں میں اپنی مفسدانہ کارروائیوں میں اور بھی زیادہ تیز ہو جاتے تھے اور پھر کمال بے حیائی سے اپنے دل کو جھوٹی تسلّی دینے کے لیے وہ عزّت کے مہینوں کو اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر منتقل بھی کر دیا کرتے تھے جسے وہ نسئی کے نام سے پکارتے تھے اور پھر آگے چل کر تو انہوں نے غضب ہی کر دیا کہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں باوجود پختہ عہد و پیمان کے کفار مکّہ اور ان کے ساتھیوں نے حرم کے علاقہ میں مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ کے خلاف تلوار چلائی اور پھر جب مسلمان اس قبیلہ کی حمایت میں نکلے تو ان کے خلاف بھی عین حرم میں تلوار استعمال کی۔ پس اس جواب سے مسلمانوں کی تو تسلّی ہونی ہی تھی قریش بھی کچھ ٹھنڈے پڑ گئے اور اس دوران میں ان کے آدمی بھی اپنے دو قیدیوں کو چھڑانے کے لیے مدینہ پہنچ گئے، لیکن چونکہ ابھی تک سعد بن ابی وقاص اور عتبہ واپس نہیں آئے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے متعلق سخت خدشہ تھا کہ اگر وہ قریش کے ہاتھ پڑ گئے تو قریش انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، اس لیے آپ نے ان کی واپسی تک قیدیوں کو چھوڑنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میرے آدمی

---

[1] سورۃ بقرہ: ۲۱۸

بخیریت مدینہ پہنچ جائیں گے تو پھر میں تمہارے آدمیوں کو چھوڑ دوں گا، چنانچہ جب وہ دونوں واپس پہنچ گئے، تو آپ نے فدیہ لے کر دونوں قیدیوں کو چھوڑ دیا، لیکن ان قیدیوں میں سے ایک شخص پر مدینہ کے قیام کے دوران میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ فاضلہ اور اسلامی تعلیم کی صداقت کا اس قدر گہرا اثر ہو چکا تھا کہ اس نے آزاد ہو کر بھی واپس جانے سے انکار کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر آپ کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو گیا اور بالآخر بئرِ معونہ میں شہید ہوا۔ اس کا نام حکم بن کیسان تھا۔[1]

تحویلِ قبلہ

باوجود جنگ و جدال کی بے انتہا مصروفیت کے تکمیل و تاسیسِ مذہب کا کام نہیں رُک سکتا تھا کیونکہ بعثتِ نبوی کی یہی علّتِ اولیٰ تھی۔ پنجگانہ نماز مکہ میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ مدینہ میں باجماعت نماز کے التزام نے اذان کی ضرورت محسوس کرائی اور اس کا انتظام کیا گیا۔ مگر مسلمانوں کا قبلہ ابھی تک بیت المقدس تھا اور مکہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور مدینہ کے ابتدائی زمانہ میں بھی یہی طریق جاری رہا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ مکہ کے کعبہ کو قرار دیا جاوے، کیونکہ وہ خدا کی عبادت کا پہلا گھر تھا جو دُنیا میں تعمیر ہوا اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور عربوں کے جدِ اعظم اسماعیل ذبیح اللہ کی یادگار بھی اسی گھر سے وابستہ تھی اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد و مسکن اور اسلام کا مبداء و منبع ہونے کی حیثیت میں بھی کعبہ ہی مسلمانوں کا قبلہ بننے کا حقدار تھا، لیکن چونکہ ابھی تک کعبہ کی طرف مُنہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے آپ بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور یہ سلسلہ ہجرت کے سولہ سترہ ماہ بعد تک جاری رہا، لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ مسلمانوں کو ان کے اصل قبلہ پر قائم کر دیا جاوے؛ چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال شعبان کے مہینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ حکمِ الٰہی کے نزول کی محرک ہوئی اور یکلخت مسلمانوں کا رُخ بیت المقدس کی طرف سے کعبہ کی طرف پھر گیا۔ قرآن شریف میں جو آیات اس بارہ میں نازل ہوئیں۔ وُہ یہ ہیں:۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ...... وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ...... قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ...... وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا ۖ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا

---

[1] طبری۔ [2] البقرہ ۱۴۳ تا ۱۴۵۔

يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞[1]

"ضرور بیوقوف لوگ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کو اُن کے اس قبلہ سے کس بات نے پھیر دیا جس پر کہ وُہ تھے۔ تُو کہہ دے کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لیے ہے وہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف راستہ دکھا دیتا ہے اور اے رسُول! ہم نے تیرے پہلے قبلہ کو تو صرف اس امتحان کے طور پر رکھا تھا کہ یہ ظاہر ہو جاوے کہ کون خُدا کے رسُول کی سچی اتباع اختیار کرتا ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے اور بیشک پہلا قبلہ طبائع پر ایک بوجھ رہا ہے سوائے ان لوگوں کے جو اللہ کی طرف سے ہدایت پر قائم ہیں اور اے رسُول! ہم دیکھتے ہیں کہ تیری توجہ قبلہ کے معاملہ میں آسمان کی طرف لگی ہوئی ہے کہ کب کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم اُترتا ہے۔ لہٰذا اب ہم پھیر دیتے ہیں تجھے اس قبلہ کی طرف جو تجھے پسند ہے۔ پس اے رسُول اپنے رُخ کو مسجدِ حرام کی طرف پھیر لے اور اے مسلمانو! جہاں کہیں بھی تم ہو اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف رکھا کرو اور جانو کہ ہر قوم کے لیے توجہ کی ایک خاص سمت ہوتی ہے اور گو ہم نے تمہاری ظاہری سمت کعبہ کو مقرر کیا ہے لیکن یاد رکھو تمہاری باطنی سمت نیکیوں کی طرف بڑھنا ہونی چاہیئے اور اس ظاہر و باطن کی یکجہتی سے یہ فائدہ ہوگا کہ تم خواہ دُنیا کے کسی حصّہ میں پھیلے ہوئے ہوگے تم میں اتّحاد رہے گا۔ بے شک اللہ جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے۔"

ان آیات قرآنی میں جہاں تحویلِ قبلہ کا حکم ہے وہاں قبلہ کی حکمت اور ضرورت بھی بیان کی گئی ہے کہ اس سے قوم میں ظاہری یکجہتی اور اتحاد فی الصورت قائم رہتے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شروع شروع میں اللہ تعالیٰ نے ایک عرصہ تک مسلمانوں کو بیت المقدس کے قبلہ پر اس مصلحت سے قائم رکھا تھا کہ وہ مشرکین عرب کے لئے جن کی ساری توجہ کا مرکز کعبہ تھا بطور ایک امتحان کے رہے اور وہ اپنے اندر ایمان کی خاطر قربانی کرنے کی رُوح پیدا کریں، لیکن جب آزمائش کا مناسب زمانہ گذر گیا تو اصل قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیدیا گیا۔ اس موقعہ پر سر ولیم میور نے اعتراض کیا ہے کہ شروع شروع میں مسلمان بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے اس لیے نماز پڑھتے تھے کہ تا اس طرح مدینہ کے یہودیوں کو اپنی طرف مائل کریں لیکن جب دیکھا کہ وہ اس داؤ میں نہیں آتے تو رُخ بدل کر کعبہ کی طرف کر لیا گیا تاکہ مشرکینِ عرب کو خوش کرنے کی کوشش کی جاوے۔ تعصّب بیشک انسان کو اندھا کر دیتا ہے لیکن اگر سر ولیم جیسا قابل شخص جو ہندوستان کے ایک بہت بڑے صوبے کا کامیاب حاکم رہ چکا ہے۔ اسلام کے متعلق ایسی بے بنیاد باتیں کرے تو جائے تعجب ضرور ہے، مگر حقیقت ایسی واضح ہے کہ کسی کے چھپائے چھپ نہیں سکتی۔ جو طریق عمل ہجرت سے کئی سال پہلے مکہ میں جاری ہوا ہوا اور مدینہ جانے پر چند ماہ کے بعد منسوخ کر دیا ہو اس کے

---

[1] بقرہ : ۱۴۹

متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ یہود مدینہ کو خوش کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا اور اس کی منسوخی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مشرکین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وقوع میں آئی تھی کسی عقلمند کو دھوکے میں نہیں ڈال سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلا قبلہ مشرکین کیلئے بطور ایک امتحان کے تھا اور اس امتحان کا وقت ہجرت سے پہلے ہی مناسب تھا لیکن چونکہ مدینہ میں بھی مشرکین بستے تھے اس لیے مدینہ کے ابتدائی ایام میں بھی وہ امتحان جاری رہا۔ مگر جب مشرکین مدینہ قریباً مفقود ہو گئے تو اس امتحان کی ضرورت نہ رہی اور تحویل قبلہ کا حکم نازل ہو گیا اور اس حکم میں دو مصلحتیں تھیں۔ ایک یہ کہ مسلمان اپنے اصل قبلہ پر قائم ہو گئے اور دوسرے یہ کہ نیا قبلہ یہود کے لیے ایک امتحان بن گیا جیسا کہ پہلا قبلہ مشرکین کے لیے امتحان تھا۔ پس حقیقت وہ نہیں جو میور صاحب کے خانہ تعصب نے خلق کی ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے اور قرآن جس کی شہادت کی تاریخی حیثیت کو میور صاحب نے سب شہادتوں سے بڑھ کر قرار دیا ہے اس کا شاہد ہے۔

صیامِ رمضان

نماز سے اُتر کر اسلامی عبادات کا دوسرا بڑا رکن روزہ ہے۔ دراصل اسلام نے مختلف قسم کی عبادات مختلف قسم کے تزکیہ نفس کو مدِ نظر رکھ کر شروع کی ہیں یعنی اگر نماز ایک رنگ میں انسان کی آلائشوں اور کمزوریوں کو دُور کرتی ہے اور اسے خدا کا مقرب بننے کے قابل بناتی ہے تو روزے کسی دوسرے رنگ میں یہ کام سر انجام دیتے ہیں اور زکوٰۃ ایک تیسرے میدان کے لیے مقرر ہے اور حج کا ان تینوں کے علاوہ ایک چوتھا مقصد ہے اور اس طرح مختلف عبادتیں مختلف مقاصد کو پورا کرتی ہیں اور مختلف جہات سے انسان کی اصلاح اور ترقی کے کام میں ممد ہوتی ہیں اور اگر غور کیا جاوے تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس ترتیب سے اسلامی عبادات کے مختلف ارکان شروع ہوتے ہیں وہی اُن کی اہمیت کی ترتیب بھی ہے۔ یعنی سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع طور پر انسانی اخلاق اور رُوحانیت پر اثر ڈالنے والی عبادت وہ ہے جو سب سے پہلے قائم کی گئی اور اس کے بعد اس سے کم درجہ کی قائم کی گئی اور اس کے بعد اس سے کم کی وعلیٰ ہذا القیاس۔ اور جو لوگ عبادات کو محض ایک رسم کے طور پر ادا نہیں کرتے اور ان کے اثر کو اپنے نفوس میں مطالعہ کرنے کے عادی ہیں وہ یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ عبادات میں اوّل نمبر نماز کا ہے اور پھر اس سے اُتر کر روزہ کا۔ اور پھر دُوسری عبادات کا۔ بہر حال اس وقت تک صرف نماز مشروع ہوئی تھی اور اب ہجرت کے دُوسرے سال رمضان کی آمد پر روزوں کا بھی آغاز ہوا۔[1] یعنی یہ حکم نازل ہوا کہ رمضان کے مہینہ میں تمام بالغ مسلمان مرد و عورت باستثناء بیماروں اور ناتوانوں کے اور باستثناء مسافروں کے صبح صادق سے لیکر غروب آفتاب تک ہر قسم کے کھانے پینے سے پرہیز کریں اور ان اوقات میں خاوند بیوی کے مخصوص تعلقات سے بھی پرہیز کیا جاوے اور روزوں کے ایام کو خصوصیت کے ساتھ ذکر الٰہی اور قرآن خوانی اور صدقہ و خیرات میں گذارا جاوے اور روزوں کی راتوں میں مخصوص طور پر نماز تہجد

---

[1] طبری

کا التزام کیا جاوے وغیر ذالک[1]؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے کہ آپؐ کا رمضان گویا ایک مجسّم عبادت کا رنگ رکھتا تھا اور گو یوں تو آپؐ کی ساری زندگی ہی عبادت تھی، مگر روزوں میں آپؐ خصوصیت سے بیشتر حصہ وقت کا نوافل اور ذکرِ الٰہی میں گذارتے تھے اور راتوں کو کثرت کے ساتھ جاگتے تھے اور رمضان میں آپؐ اتنا صدقہ وخیرات کرتے تھے کہ صحابہؓ نے اس کو ایک تیز ہوا کے ساتھ تشبیہہ دی ہے جو کسی روک کو خیال میں نہ لائے[2] نیز روزہ کی رُوح کو زندہ رکھنے کے لیے آپؐ ہمیشہ صحابہ کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ یہ نہ سمجھو کہ بس کھانا پینا چھوڑنے کی رسم ادا کر کے تم خدا کے نزدیک روزہ دار شمار ہو جاؤ گے بلکہ تمہیں روزہ کی اصل رُوح کو ملحوظ رکھنا چاہیئے تا کہ اس سے تمہارے اندر طہارتِ نفس اور ضبطِ خواہشات اور مادۂ قربانی اور غرباء کی امداد کا احساس پیدا ہو اور فرماتے تھے کہ وُہ شخص بہت بدقسمت ہے جس کو کوئی رمضان میسّر آئے اور پھر اس کے گذشتہ گناہ معاف نہ ہوں ۔ آپؐ نوافل کے طور پر بھی روزہ کی تحریک فرمایا کرتے تھے مگر آپؐ کی یہ سنّت تھی کہ آپؐ ہر بات میں میانہ روی کا حکم دیتے تھے؛ چنانچہ آپؐ اس بات سے منع فرماتے تھے کہ کوئی شخص مسلسل روزے ہی رکھتا چلا جاوے اور فرماتے تھے کہ انسان پر خدا نے اس کے نفس کا بھی حق رکھا ہے اور اس کی بیوی کا بھی حق رکھا ہے اور اس کے بچوں کا بھی حق رکھا ہے اور اس کے دوستوں کا بھی حق رکھا ہے اور ہمسایوں کا بھی حق رکھا ہے اور اسی طرح دوسرے حقوق ہیں اور ان میں سے ہر حق کو خدا کی شریعت اور منشاء کے ماتحت ادا کرنا عبادت میں داخل ہے۔ پس ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ کوئی شخص ایک خاص عبادت پر زور دے کر دُوسرے حقوق کو نظر انداز کر دے۔ غرض اس طرح اس سال رمضان کے روزے فرض ہو گئے اور اسلامی عبادات میں دُوسرے رُکن کا اضافہ ہوا، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح پنجگانہ نماز فرض ہونے سے قبل بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رنگ میں نفلی نماز پڑھا کرتے تھے اور صحابہ کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔ اسی طرح رمضان کے روزے فرض کیے جانے سے پہلے آپؐ نفلی روزے بھی رکھتے تھے، مگر وہ اس طرح باقاعدہ اور معیّن اور موقّت صورت میں مشروع نہیں ہوئے تھے؛ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے قبل آپؐ یوم عاشورہ یعنی محرم کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھا کرتے تھے اور صحابہ کو بھی اس کی تحریک فرماتے تھے۔

عید الفطر

رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد رمضان کا آخر آیا تو آپؐ نے خدا سے حکم پا کر صدقۃ الفطر کا حکم جاری فرمایا کہ ہر مسلمان جسے اس کی طاقت ہو اپنی طرف سے اور اپنے اہل وعیال اور توابع کی طرف سے فی کس ایک صاع[3] کے حساب سے کھجور یا انگور یا جَو یا گندم وغیرہ بطور صدقہ عید سے پہلے ادا کرے اور یہ صدقہ غرباء اور مساکین اور یتامیٰ اور بیوگان وغیرہ میں تقسیم کر دیا جاوے تا کہ ذی استطاعت

---

[1] قرآن شریف سورۃ بقرہ و بخاری ابواب الصیام ؛ [2] بخاری

[3] ایک عربی پیمانہ ہے جو وزن کے لحاظ سے کچھ اوپر تین سیر گندم کے برابر ہوتا ہے۔

لوگوں کی طرف سے عبادت صوم کی کمزوریوں کا کفارہ ہو جاوے اور غرباء کے لیے عید کے موقعہ پر ایک امداد کی صورت نکل آئے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہر عید رمضان سے پہلے صدقۃ الفطر باقاعدہ طور پر ہر چھوٹے بڑے مرد عورت مسلمان سے وصول کیا جاتا تھا اور یتامیٰ اور غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

عیدالفطر بھی اسی سال شروع ہوئی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ رمضان کا مہینہ ختم ہو جانے پر شوال کی پہلی تاریخ کو مسلمان عید منایا کریں۔ یہ عید اس بات کی خوشی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان کی عبادت ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ مگر کیا شانِ دلربائی ہے کہ آپ نے اس خوشی کے اظہار کے لیے بھی ایک عبادت ہی مقرر فرمائی؛ چنانچہ حکم دیا کہ عید کے دن تمام مسلمان کسی کھلی جگہ جمع ہو کر پہلے دو رکعت نماز ادا کیا کریں اور پھر اس نماز کے بعد بیشک جائز طور پر ظاہری خوشی بھی منائیں کیونکہ رُوح کی خوشی کے وقت جسم کا بھی حق ہے کہ وہ خوشی میں حصہ لے۔ دراصل اسلام نے ان تمام بڑی بڑی عبادتوں کے اختتام پر جو اجتماعی طور پر ادا کی جاتی ہیں۔ عیدیں رکھی ہیں؛ چنانچہ نمازوں کی عید جمعہ ہے جو گویا ہر ہفتہ کی نمازوں کے بعد آتا ہے اور جسے اسلام میں ساری عیدوں سے افضل قرار دیا گیا ہے پھر روزوں کی عید عیدالفطر ہے جو رمضان کے بعد آتی ہے۔ اور حج کی عید عیدالاضحیٰ ہے جو حج کے دوسرے دن منائی جاتی ہے اور یہ ساری عیدیں پھر خود اپنے اندر ایک عبادت ہیں الغرض اسلام کی عیدیں اپنے اندر ایک عجیب شان رکھتی ہیں اور ان سے اسلام کی حقیقت پر بڑی روشنی پڑتی اور یہ اندازہ کرنیکا موقعہ ملتا ہے کہ کس طرح اسلام مسلمانوں کے ہر کام کا ذکر الٰہی کے ساتھ پیوند کرنا چاہتا ہے۔ مجھے تاریخ سے ہٹنا پڑتا ہے؛ ورنہ میں بتاتا کہ کس طرح اسلام نے ایک مسلمان کی ہر حرکت و سکون اور ہر قول و فعل کو خُدا کی یاد کا خمیر دیا ہے۔ حتیٰ کہ روزمرّہ کے معمولی اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، نہانے دھونے کپڑے بدلنے، جوتا پہننے، گھر سے باہر جانے، گھر کے اندر آنے، سفر پر جانے، سفر سے واپس آنے، کوئی چیز بیچنے، کوئی چیز خریدنے، بلندی پر چڑھنے، بلندی سے اُترنے، مسجد میں داخل ہونے، مسجد سے باہر آنے۔ دوست سے ملنے، دشمن کے سامنے ہونے، نیا چاند دیکھنے، بیوی کے پاس جانے۔ غرض ہر کام کے شروع کرنے اور ختم کرنے حتیٰ کہ چھینک اور اباسی تک لینے کو[1] کسی نہ کسی طرح خدا کے ذکر کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اس حالت میں اگر مشرکین عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو دراصل اس تعلیم کے لانے والے لیکن کفار کے خیال میں اس تعلیم کے بنانیوالے تھے یہ کہتے ہوں کہ مُحمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خُدا کا جنون ہو گیا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ واقعی ایک دُنیادار کو یہ باتیں جنون کے سوا اور کچھ نظر نہیں آسکتیں، مگر جس نے اپنی ہستی کی حقیقت کو سمجھا ہے وہ جانتا ہے کہ زندگی اِسی کا نام ہے۔

---

[1] یہ اُمور کتب حدیث کے ذریعہ سے اسلامی شریعت میں شائع و متعارف ہیں کسی خاص حوالہ کی ضرورت نہیں۔

جنگِ بدر کے متعلق ایک ابتدائی بحث

اِسی سال رمضان کے مہینہ میں بدر کی جنگ وقوع میں آئی۔ یہ جنگ چونکہ کئی لحاظ سے تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کے متعلق کسی قدر زیادہ تفصیلی نظر ڈالی جاوے۔ بدر وہ پہلی باقاعدہ لڑائی ہے جو کفار اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی اور اس کے اثرات بھی ہر دو فریق کے لیے نہایت وسیع اور گہرے ثابت ہوئے یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے اس کا نام "یوم الفرقان" یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کا دن رکھا ہے اور اس کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ یہ وہی عذاب ہے جس کی خبر رسُولِ خدا کے ذریعہ قریش مکہ کو ہجرت سے پہلے دی گئی تھی۔ جنگِ بدر کے تحریکی سبب کے متعلق زمانہ حال میں بعض محققین نے اختلاف کیا ہے اور اسی اختلاف کے متعلق ہم اس ابتدائی نوٹ میں کچھ بحث کرنا چاہتے ہیں۔ عام مؤرخین کا یہ خیال ہے اور متقدمین میں سے تو اس بارہ میں کسی ایک مؤرخ نے بھی اختلاف نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے ایک تجارتی قافلہ کی اطلاع ملی تھی جو ابوسفیان کی سرداری میں شام کی طرف سے مکہ کو واپس آرہا تھا اور آپ اسی قافلہ کی روک تھام کے لیے مدینہ سے نکلے تھے لیکن جب آپ بدر کے قریب پہنچے تو اس وقت آپ کو یہ اطلاع ملی کہ قریش کا ایک بڑا لشکر مکہ سے آیا ہے اور پھر قافلہ تو بچ کر نکل گیا اور قریش کے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کی مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ دُوسری طرف زمانہ حال میں جماعتِ احمدیہ قادیان کے ایک معزز فرد مولوی شیر علی صاحب بی۔ اے نے رسالہ ریویو آف ریلیجنز قادیان بابت سال ۱۹۱۰ء میں اور ہندوستان کے مشہور مؤرخ مولانا شبلی نعمانی نے سیرۃ النبیؐ میں بعض قرآنی آیات اور دیگر شہادات سے استدلال کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں کو مدینہ میں ہی قریش کے لشکر کی اطلاع مل گئی تھی۔ اور وہ مدینہ سے ہی لشکر کے مقابلہ کے خیال سے نکلے تھے اور قافلہ کے ارادے سے نکلنے کا خیال غلط ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی اپنی رائے کا خلاصہ یہ لکھتے ہیں کہ:

"مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیتِ عظیم لے کر مدینہ آ رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔"[1]

جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی خلق اور مسلمانوں کے قومی اخلاق پر روشنی پڑنے کا سوال ہے یہ اختلاف چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ صحابہ قافلہ کی روک تھام کے لیے نکلے تھے یا لشکر قریش کے مقابلہ کی غرض سے یا یہ کہ انہیں دونوں کی اطلاع اور دونوں کا خیال تھا ان میں سے کوئی بھی مقصد ہو وہ مقصد جیسا کہ ہم جہاد کی اصولی بحث میں ثابت کر چکے ہیں بالکل دُرست اور جائز تھا اور کوئی معقول اور غیر متعصب شخص اس پر اعتراض نہیں کر سکتا لیکن تاریخی اور علمی نکتہ نگاہ سے یہ اختلاف ایک دلچسپ بحث کا رنگ اختیار کر گیا ہے اور کوئی علم دوست مؤرخ اس کی طرف سے بے توجہی نہیں برت سکتا اور پھر صحتِ واقعات کی تحقیق کی ذمہ داری مزید برآں ہے لیکن مشکل

---

[1] سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۳۱۸

یہ ہے کہ اس کی پوری پوری بحث اور مکمل چھان بین کے لیے ایک طویل مقالہ کی ضرورت ہے جس کی گنجائش ایک خالص تاریخ کی کتاب میں نہیں نکالی جا سکتی اور حق یہ ہے کہ مَیں نے اس بحث میں ایک مفصّل مضمون لکھا بھی تھا لیکن پھر اسے اس خیال سے خارج کر دیا کہ اس قسم کا مضمون حقیقتہً علم کلام میں داخل ہے اور عام تاریخ کا حصّہ نہیں بننا چاہیے۔ سو اب میں نہایت مختصر طور پر اس معاملہ میں اپنی تحقیق کا ذکر کر کے اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہوں۔ مَیں نے ہر دو قسم کے خیالات کے متعلق کافی غور کیا ہے لیکن جہاں میں مولوی شبیر علی صاحب اور مولانا شبلی کی تحقیق کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں وہاں میں افسوس کے ساتھ بعض باتوں میں ان بزرگوں سے اختلاف بھی رکھتا ہوں اور میری رائے میں اصل حقیقت ان ہر دو قسم کے خیالات کے بین بین ہے۔ یعنی میری تحقیق یہ ہے کہ ایک طرف تو جدید تحقیق کا یہ حصّہ ٹھیک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں ہی لشکرِ قریش کی آمد کی اطلاع ہو گئی تھی اور دُوسری طرف عام مؤرخین کا یہ خیال بھی ہرگز غلط نہیں ہے کہ صحابہ (یعنی اکثر صحابہ جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائیگا) صرف قافلہ ہی کی روک تھام کے خیال سے نکلے تھے اور لشکرِ قریش کا علم انہیں بدر کے قریب پہنچ کر ہوا تھا اور جہاں تک مَیں نے غور کیا ہے قرآن شریف اور تاریخ و حدیث دونوں میرے اس خیال کے مؤید ہیں۔ دراصل ہمارے ان جدید محققین نے قرآن شریف کے سارے بیان کو اپنے مدِّنظر نہیں رکھا اور صرف اس کے ایک حصّہ کو لیکر (جو بظاہر تاریخی بیان کے مخالف نظر آتا ہے حالانکہ دراصل وہ بھی تاریخی روایات کے مخالف نہیں ہے بلکہ تاریخ سے ایک زائد بات بتاتا ہے) اس بحث میں ساری تاریخی روایات کو عملاً ردّی کی طرح پھینک دیا ہے؛ حالانکہ خود قرآن شریف کے دُوسرے حصّے ان تاریخی روایات کی تصدیق کرتے ہیں اور سوائے ایک زائد بات کے جس کی طرف قرآن شریف اشارہ کرتا ہے باقی ساری باتوں میں قرآنی بیان اور تاریخی بیان ایک دُوسرے کے مطابق ہیں اور ہرگز کوئی اختلاف نہیں۔ تفصیلات سے قطع نظر کرتے ہوئے تاریخی بیان کا ماحصل جو مضبوط روایات سے ثابت ہے اور جس کی تائید میں صحیح احادیث بھی پائی جاتی ہیں یہ ہے کہ بدر کے موقعہ پر مُسلمان صرف قافلہ کی روک تھام کے خیال سے مدینہ سے نکلے تھے اور لشکرِ قریش کا علم انہیں بدر کے پاس پہنچ کر ہوا تھا اور اس طرح گویا لشکرِ قریش اور مسلمانوں کا مقابلہ اچانک ہو گیا تھا۔ اب اس تاریخی بیان کے مقابلہ میں ہم قرآن شریف پر نظر ڈالتے ہیں کہ وہ اِس بارے میں کیا کہتا ہے سو سورۃ انفال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۙ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ[1] ...... اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا

---

[1] انفال: ۶ تا ۸

وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ...... وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

یعنی "اے رسُول! جس طرح نکالا تجھے تیرے رب نے تیرے گھر (مدینہ) سے حق کے ساتھ اس حال میں کہ مومنوں میں سے بعض لوگ تیرے اس نکلنے کو ایک سخت مشکل اور نازک کام سمجھتے تھے اسی طرح نکلے تیرے دشمن تجھ سے لڑتے ہوئے حق کے رستہ میں بعد اس کے کہ وہ حق ان کے لیے ظاہر ہو چکا تھا۔ (یعنی اُن پر خدائی سنّت کے مطابق اتمامِ حجت ہو چکا تھا) اور حق کو قبول کرنا ان کے لیے ایسا تھا کہ گویا وہ موت کی طرف دھکیلے جا رہے ہوں اور موت بھی وہ جو سامنے نظر آ رہی ہو۔ اور یاد کرو اے مسلمانو! جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ وعدہ دیتا تھا کہ کفار کے دو گروہوں (یعنی لشکر اور قافلہ) میں سے کسی ایک گروہ پر ضرور تمہیں غلبہ حاصل ہوگا اور تمہارا حال یہ تھا کہ تم خواہش کر رہے تھے کہ ان گروہوں میں سے کم تکلیف اور کم مشقت والے گروہ (یعنی قافلہ) سے تمہارا سامنا ہو، لیکن اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ (لشکر سے تمہارا مقابلہ کرا کے) اپنی پیشگوئی کے مطابق حق کو قائم کر دے اور ان کفارِ مکہ کی جڑ کاٹ ڈالے (یعنی ائمۃ الکفر ہلاک کر دیئے جائیں ...... جبکہ تم بدر کی وادی کے ورلے کنارے پر پہنچے تھے اور قریش کا لشکر پرلے کنارے پر تھا (یعنی تم ایک دُوسرے کے آمنے سامنے ہو گئے تھے) اور قافلہ تمہارے نیچے (مکہ کی طرف کو) نکل چکا تھا (یعنی قافلہ تو بچکر نکل گیا اور تم اچانک لشکر کے سامنے آ گئے اور یہ سب کچھ خدائی تصرّف کے ماتحت ہوا ورنہ) اگر لڑائی کے وقت کی تعیین تم پر چھوڑ دی) جاتی تو (اس وقت ظاہری اسباب کے لحاظ سے تمہاری حالت ایسی کمزور تھی کہ) تم ضرور اس میں اختلاف کرتے (یعنی گو تم میں سے بعض یہ کہتے کہ ہم ہر حالت میں لڑنے کو تیار ہیں، لیکن بعض ضرور اس بات پر زور دیتے کہ لڑائی کے وقت کو پیچھے ڈال دیا جاوے تاکہ وہ کفار کے مقابلہ کے لیے اچھی طرح مضبوط ہو جائیں تو پھر لڑائی کے لیے ان کے سامنے آئیں) لیکن اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ (تمہیں لشکرِ قریش کے مقابلہ پر لا کر) وہ کام کر گذرے جس کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا تھا (یعنی وہ پیشگوئی پوری کرے جو خدائی نشان کے طور پر ائمۃ الکفر کی ہلاکت کے متعلق کی گئی تھی)...... پھر وہ وقت بھی یاد کرو جب میدانِ جنگ میں اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھوں میں کفار کو تھوڑا کر کے دکھاتا تھا

لے الانفال : ۴۳ تا ۴۵ ۔

(تاکہ تم بزدل نہ ہو) اور تمہیں کفار کی نظروں میں تھوڑا کر کے دکھاتا تھا (تاکہ وہ بھی مقابلہ سے پیچھے نہ ہٹ جائیں) یہ بھی خدا نے اس لیے کیا کہ وہ اس بات کو کر گذرے جس کا پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا اور بیشک اللہ ہی کی طرف ہر کام کا مآل ہے (یعنی تمام کاموں کا انتہائی تصرف اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ جس طرح چاہے واقعات کو چلا سکتا ہے۔")

ان قرآنی آیات سے جو مسلّمہ طور پر جنگِ بدر کے متعلق تسلیم کی گئی ہیں اور جن کے ترجمہ کی تشریح کیلئے (میں نے) بعض الفاظ زائد کر دیئے ہیں مندرجہ ذیل یقینی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

اوّل۔ جس وقت آپؐ مدینہ سے نکلے اس وقت مومنوں میں سے بعض لوگ آپؐ کے نکلنے کو ایک مشکل اور نازک کام سمجھتے تھے۔

دوم۔ مومنوں کی (مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب کی یا اکثر کی۔ مگر غالباً اکثر کی) یہ خواہش تھی کہ قافلہ کے ساتھ مقابلہ ہو۔

سوم۔ یہ خواہش اس لیے نہیں تھی کہ انہیں قافلہ کے اموال و اَمتعہ کا خیال تھا بلکہ اس لیے تھی کہ قافلہ والوں کی تعداد تھوڑی تھی اور ان کا سامانِ حرب بھی کم تھا اس لیے اس کے مقابلہ میں کم تکلیف اور کم مشکل پیش آنے کا احتمال تھا۔

چہارم۔ مگر اللہ تعالیٰ کا شروع سے ہی یہ ارادہ تھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ لشکر قریش کے ساتھ ہو۔ تاکہ وہ ائمۃ الکفر جو اپنے مظالم اور سرکشیوں اور خونی کارروائیوں کی وجہ سے ہلاک کئے جانے کے سزاوار ہو چکے تھے ایک خدائی نشان کے طور پر کمزور لوگوں کے ہاتھ سے ہلاک کر دیئے جائیں اور وہ پیشگوئی پوری ہو جو ان کی ہلاکت کے متعلق پہلے سے کی جا چکی ہیں۔

پنجم۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا تصرّف کیا کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کا میلان قافلہ کے مقابلہ کیطرف تھا قافلہ تو بچکر نکل گیا اور لشکرِ قریش سے ان کا اچانک سامنا ہو گیا۔

ششم۔ یہ تصرّف اس لیے کیا گیا کہ مسلمانوں کی حالت اس وقت ظاہری اسباب کے ماتحت اتنی کمزور تھی کہ اگر خود اُن پر اس لڑائی کے وقت کی تعیین چھوڑ دی جاتی تو اُن میں سے ایک فریق ضرور اس مقابلہ کے وقت کو پیچھے ڈالنے کی کوشش کرتا حالانکہ اللہ کا منشا یہ تھا کہ ابھی مقابلہ ہو اور فیصلہ ہو جائے۔

ہفتم۔ یہ خدائی تصرف لشکرِ قریش اور مسلمانوں کے ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو جانے کے وقت تک بھی جاری رہا؛ چنانچہ خدائی تصرّف کے ماتحت دونوں فوجیں ایسے طور پر ایک دوسرے کے سامنے آئیں کہ دونوں ایک دُوسرے کو ان کی اصل تعداد سے کم نظر آتے تھے اور یہ اس لیے کیا گیا کہ تا مسلمانوں میں بزدلی نہ پیدا ہو اور قریش بھی جرأت کے ساتھ آگے بڑھیں اور مقابلہ ہو جاوے۔

یہ وہ سات باتیں ہیں جو امر زیرِ بحث کے متعلق قرآن شریف سے یقینی طور پر پتہ لگتی ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ

سوائے نمبر اوّل کے یہ ساری باتیں تاریخی بیان کے عین مطابق ہیں اور ان میں وہی حالات بیان کئے گئے ہیں جو صحیح تاریخی روایات اور احادیث میں مذکور ہوئے ہیں پس کوئی وجہ نہیں کہ ہم تاریخی بیان کو ردّ کریں کیونکہ نہ صرف یہ کہ وہ قرآنی بیان کے مخالف نہیں ہے بلکہ اس کے ردّ کرنے سے قرآنی بیان کا ردّ لازم آتا ہے۔ غور کا مقام ہے کہ تاریخی روایات سوائے اس کے اور کیا کہتی ہیں کہ مسلمانوں کا لشکر قافلہ کے خیال سے نکلا تھا، مگر اچانک اس کا مقابلہ لشکرِ قریش سے ہوگیا۔ مگر کیا قرآن شریف بھی یہی نہیں کہتا کہ مسلمانوں کو قافلہ کی خواہش تھی، مگر خدا تعالیٰ نے اس کا مقابلہ اچانک لشکرِ قریش سے کرا دیا؟ اور قرآن شریف اس کی وجہ بھی بتاتا ہے کہ خدا نے یہ کام اپنے خاص تصرف کے ماتحت اس لیے کیا کہ تا بطور ایک خدائی نشان کے ائمۃ الکفر مسلمانوں کے ہاتھ سے ہلاک کروا دیئے جائیں اور وہ پیشگوئی پوری ہو جو ان کی ہلاکت کے متعلق پہلے سے کی جا چکی تھی اندریں حالات اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ مسلمان مدینہ سے ہی لشکرِ قریش کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے اس بات کے ہم معنی ہے کہ نہ صرف یہ کہ تاریخ و احادیث کی کثیر التعداد مضبوط اور صحیح روایات کو بالکل ردّی کی طرح پھینک دیا جاوے، بلکہ اس قرآنی بیان کو بھی غلط قرار دیا جاوے جسے خدا تعالیٰ نے بدر کے قصہ میں بطور مرکزی نقطہ کے رکھا ہے۔

پس حق یہی ہے کہ مسلمان قافلہ ہی کی روک تھام کے خیال سے نکلے لیکن جب بدر کے پاس پہنچے تو اچانک یعنی علیٰ غیر میعاد لشکرِ قریش کا سامنا ہوگیا اور جیسا کہ ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں قافلہ کی روک تھام کے لیے نکلنا ہرگز قابلِ اعتراض نہیں تھا۔ کیونکہ اوّل تو یہ مخصوص قافلہ جس کے لیے مسلمان نکلے تھے ایک غیر معمولی قافلہ تھا جس میں قریش کے ہر مرد و عورت کا تجارتی حصہ تھا[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق رؤسا قریش کی یہ نیت تھی کہ اس کا منافع مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے میں استعمال کیا جائے گا؛ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ یہی منافع جنگِ اُحد کی تیاری میں صرف کیا گیا[2] پس اس قافلہ کی روک تھام تدابیرِ جنگ کا ضروری حصہ تھی۔ دوسرے عام طور پر بھی قریش کے قافلوں کی روک تھام اس لیے ضروری تھی کہ چونکہ یہ قافلے مسلح ہوتے تھے اور مدینہ سے بہت قریب ہو کر گذرتے تھے ان سے مسلمانوں کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا جس کا سدّ باب ضروری تھا۔ تیسرے یہ قافلے جہاں جہاں سے بھی گذرتے تھے مسلمانوں کے خلاف قبائلِ عرب میں سخت اشتعال انگیزی کرتے پھرتے تھے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت نازک ہو رہی تھی۔ پس ان کا راستہ بند کرنا دفاع اور خود حفاظتی کے پروگرام کا حصہ تھا۔ چوتھے قریش کا گذارہ زیادہ تر تجارت پر تھا اس لیے ان قافلوں کی روک تھام ظالم قریش کو ہوش میں لانے اور ان کو ان کی جنگی کارروائیوں سے باز رکھنے اور صلح اور قیامِ امن کے لیے مجبور کرنے کا ایک بہت عمدہ ذریعہ تھی اور پھر ان قافلوں کی روک تھام کی غرض لوٹ مار نہیں تھی بلکہ جیسا کہ قرآن شریف صراحتاً بیان کرتا ہے خود اس خاص مہم میں مسلمانوں کو قافلہ کی خواہش اس کے اموال کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس وجہ سے تھی کہ

---

[1] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۷ ، [2] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۲۵ ۔

اس کے مقابلہ میں کم تکلیف اور کم مشقت کا اندیشہ تھا۔

اب رہی وہ بات جو قرآن شریف میں تاریخی بیان سے زائد پائی جاتی ہے سو وہ بھی تاریخ کے مخالف نہیں کہلا سکتی کیونکہ تاریخی بیان میں کوئی ایسی بات نہیں جو اس کے خلاف ہو البتہ یہ ایک زائد علم ہے جو ہمیں قرآن شریف سے حاصل ہوتا ہے اور بعض تاریخی روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے مگر بہرحال یہی ایک بات ہے جو تاریخی نکتہ نگاہ سے قابلِ تشریح سمجھی جا سکتی ہے اور یہ بات قرآنی بیان کے مطابق یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکلے تو اس وقت بعض مسلمان آپ کی اس مہم کو ایک مشکل اور نازک کام سمجھتے تھے اس پر طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے صحابہ کے دل میں یہ احساس تھا اگر محض قافلہ کی روک تھام کا خیال ہوتا تو تین سو جاں نثاروں سے زائد کی جمعیت کے ہوتے ہوئے یہ احساس ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پس معلوم ہوا کہ قافلہ کی خبر کے ساتھ ساتھ کوئی اور خیال بھی تھا جو بعض مسلمانوں کو فکر مند کر رہا تھا۔ یہ خیال کیا تھا؟ اس سوال کا جواب تاریخ سے واضح طور پر نہیں ملتا اور نہ ہی قرآن شریف نے اسے صراحتاً بیان کیا ہے۔ پس اس کے متعلق لازماً قیاس کرنا ہو گا اور خوش قسمتی سے یہ قیاس مشکل نہیں ہے کیونکہ تاریخ و قرآن شریف ہر دو میں قافلہ کے ساتھ ساتھ لشکرِ قریش کا ذکر بھی چلتا ہے اور اس سارے قصہ میں اگر کوئی بات ایسی نظر آتی ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں فکر پیدا کر سکتی تھی تو وہ لشکرِ قریش کی اطلاع ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ مدینہ میں ہی لشکرِ قریش کی خبر بھی پہنچ گئی ہوگی۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ فکر دامنگیر ہوا ہو گا کہ اگر لشکر سے مقابلہ ہو گیا تو سخت مشکل کا سامنا ہو گا۔ یہ وہ استدلال ہے جو اس آیت سے کیا گیا ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ استدلال ایک عمدہ استدلال ہے جو اس آیت کی روشنی میں یہ واقعی ماننا پڑتا ہے کہ قریش کی آمد آمد کی اطلاع مدینہ میں ہی پہنچ گئی ہوگی لیکن جو وسعت اس استدلال میں پیدا کر لی گئی ہے وہ ہرگز درست نہیں۔ یعنی اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مدینہ میں ہی سارے یا اکثر مسلمانوں کو یہ اطلاع پہنچ گئی تھی اور وہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر اسی علم کے ماتحت مدینہ سے نکلے تھے۔ یہ یقیناً غلط ہے کیونکہ علاوہ اس کے قرآن شریف کا بقیہ بیان اور کثیر التعداد تاریخی روایات اسے قطعی طور پر غلط ثابت کرتی ہیں۔ خود آیت زیرِ بحث بھی اس وسعت کو قبول نہیں کرتی کیونکہ آیت میں یہ صاف طور پر موجود ہے کہ یہ احساس صرف بعض صحابہ کو تھا جیسا کہ فریقاً کے لفظ سے پایا جاتا ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکلنے کے متعلق صرف بعض صحابہ فکر مند تھے۔ سب یا اکثر صحابہ فکر مند نہ تھے۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن شریف کی رو سے مدینہ میں لشکرِ قریش کی خبر صرف بعض صحابہ کو پہنچی تھی اور اکثر اس سے بے خبر تھے اور یہ وہ صورت ہے جو قرآن شریف کے بقیہ بیان اور تاریخی روایات کے مخالف نہیں ہے کیونکہ یہ بالکل قرینِ قیاس ہے کہ جب لشکرِ قریش کی خبر مدینہ میں پہنچی ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے اس کی اطلاع صرف بعض خاص خاص صحابہ کو دی ہو اور اکثر مسلمان اس سے بے خبر رہے ہوں اور وہ اسی بے خبری کی حالت میں صرف قافلہ کے خیال سے مدینہ سے نکلے ہوں اور پھر بدر کے پاس پہنچ کر قریش سے اچانک اُن کا سامنا ہو گیا ہو۔ اور

بھی صورت درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ قرآن شریف کا بقیہ بیان اس کی تائید میں ہے اور تاریخ و حدیث میں بھی اس کے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ سے نکلنے سے قبل خاص طور پر صحابہ سے مشورہ کرنا اور اس مشورہ کو ایسے رنگ میں چلانا کہ انصار بھی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائیں تاکہ آپ کے ساتھ زیادہ جمعیت ہو[1] حالانکہ انصار اس سے پہلے کسی مہم میں شامل نہیں ہوئے تھے[2] اور پھر جب بدر کے پاس پہنچ کر قریش کے ایک حبشی غلام کے ذریعہ لشکرِ قریش کی اطلاع ہوئی تو صحابہ کا اس کے متعلق شک کرنا اور اُسے جھوٹا سمجھنا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فوراً اُسے بلا تامل مان لینا اور فرمانا کہ یہ غلام سچ کہتا ہے[3]۔ وغیر ذالک۔ یہ سب اس بات کی شہادتیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے ہی لشکرِ قریش کی آمد کی اطلاع تھی مگر صحابہ اس سے بے خبر تھے۔ سوائے ان خاص خاص صحابہ کے جنھیں قرآنی بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس خبر کی اطلاع ہوگئی ہوگی۔

اب صرف یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ کیا یہ ممکن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکرِ قریش کی خبر مدینہ میں ہی مل جاتی اور پھر یہ کہ اگر آپ کو یہ خبر مل گئی تھی تو آپ نے کیوں صرف بعض صحابہ کو اطلاع دی اور اکثر مسلمان اس سے بے خبر رہے؟ سو اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہاں ایسا ممکن تھا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے نبی اور رسول تھے اور آپ پر خدا کا کلام نازل ہوتا تھا اور تاریخ سے ثابت ہے کہ بسا اوقات آپ کو آئندہ ہونے والے واقعات یا غیب کی خبروں سے خدائی وحی کے ذریعہ اطلاع دی جاتی تھی پس اگر اس موقعہ پر بھی آپ کو خدائی الہام کے ذریعہ یہ اطلاع مل گئی ہو کہ قریش کا ایک لشکر آ رہا ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں اور آپ کی زندگی کے واقعات کے لحاظ سے یہ ایک نہایت معمولی واقعہ سمجھا جائے گا۔ اور چونکہ ایسا الہام جو کسی پیشگوئی کا حامل ہو بعض اوقات تاویل طلب ہوتا ہے اور اس کی پوری تفہیم بعض اوقات خود ملہم کو بھی واقعہ سے قبل نہیں ہوتی۔ اس لیے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احتیاطاً اس الٰہی خبر کی اطلاع صرف خاص خاص صحابہ کو دی ہو اور اکثر مسلمانوں کو اس کی اطلاع نہ دی گئی ہو تاکہ ان میں اس خبر سے کسی قسم کی بد دلی نہ پھیلے جیسا کہ قرآن شریف سے بھی پتہ لگتا ہے کہ اسی جنگ میں دوسرے موقعہ پر بد دلی کے سدِ باب کے لیے خدا نے یہ تصرف فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی نظروں میں کفار کا لشکر ان کی اصلی تعداد سے کم نظر آتا تھا۔ دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی یہ بات بالکل ممکن تھی کہ آپ کو مدینہ میں ہی لشکرِ قریش کی اطلاع موصول ہو جاتی۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ جب ابوسفیان کا قاصد مکہ میں پہنچا تو قریش نے تین دن تیاری میں صرف کئے[4] اور پھر بدر تک پہنچنے میں آٹھ یا نو دن مزید لگ گئے[5] یعنی کل گیارہ یا بارہ دن ہوئے۔ باوجود اس کے جب اسلامی لشکر بدر میں پہنچا تو لشکرِ قریش پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں سولہ رمضان کو پہنچے تھے اس لیے یہ ماننا

---

[1] صحیح مسلم حالات غزوہ [2] ابنِ سعد [3] صحیح مسلم
[4] سیرۃ حلبیہ [5] زرقانی

پڑے گا کہ قریش کا لشکر غالباً پندرہ تاریخ کو وہاں پہنچ گیا ہوگا اب ان پندرہ دنوں میں سے گیارہ یا بارہ دن تیاری اور سفر کے نکال دیں تو یہ یقینی نتیجہ نکلتا ہے کہ قریش نے تین یا چار رمضان کو مکہ سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا۔ دوسری طرف اسلامی لشکر کے مدینہ سے نکلنے کی تاریخ عقلاً بھی اور روایۃً بھی بارہ رمضان ثابت ہوتی ہے[1] گویا قریش کی تیاری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خروج از مدینہ کے درمیان پورے آٹھ یا نو دن کا وقفہ تھا۔ اس عرصہ میں لشکرِ قریش کی اطلاع بڑی آسانی کے ساتھ مدینہ میں پہنچ سکتی تھی بلکہ یہ عرصہ ایک شخص کے مکہ سے مدینہ جانے اور مدینہ سے پھر مکہ واپس آجانے کے لیے بھی کافی تھا۔ کیونکہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ایک تیزرو سوار جو ہر قسم کے بوجھوں سے آزاد ہو تیسرے چوتھے دن مکہ سے مدینہ پہنچ جاتا تھا[2]

اور اگر یہ سوال ہو کہ مکہ سے اطلاع دینے والا کون تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ علاوہ اس کے کہ ابھی تک مکہ میں بعض کمزور اور غریب مسلمان موجود تھے جو اس قسم کے خطرات کی حالت میں خبر رسانی کا انتظام کر سکتے تھے۔ ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا عباس بن عبدالمطلب بھی مکہ میں ہی تھے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ ہر قسم کی ضروری خبریں مکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھجوایا کرتے تھے[3] چنانچہ غزوہ اُحد کے متعلق تو خاص طور پر یہ ذکر آتا ہے کہ عباس نے اس موقعہ پر لشکرِ قریش کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخفی طور پر بھجوائی تھی اور قاصد سے یہ شرط کی تھی کہ وہ تین دن کے اندر اندر یہ خبر مدینہ پہنچا دیگا؛ چنانچہ یہ قاصد واقعی تین دن میں مدینہ پہنچ گیا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکرِ قریش کی بروقت اطلاع ہوگئی اور آپؐ نے شروع شروع میں یہ خبر صرف خاص خاص صحابہ پر ظاہر فرمائی اور بعد میں اعلان کیا[4] ان حالات میں کیا یہ قرین قیاس نہیں بلکہ میں کہوں گا کہ یہ اغلب نہیں ہے کہ بدر کے موقعہ پر بھی عباس کی کوئی مخفی تحریر آپؐ کو پہنچ گئی ہو اور آپؐ نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں بددلی نہ پیدا ہو اس کا ذکر صرف خاص خاص صحابہ سے فرمایا ہو اور عامۃ المسلمین سے اس خبر کو مخفی رکھا ہو؟ بلکہ ان حالات کی وجہ سے جو اوپر بیان ہو چکے ہیں بدر کے موقعہ پر اس قسم کا پردہ رکھنا زیادہ ضروری تھا اور پھر یہ رازداری بدر میں اُحد کی نسبت آسان بھی زیادہ تھی کیونکہ اس موقعہ پر قافلہ کی آمد کی خبر بھی ساتھ موجود تھی جس کی وجہ سے لشکرِ قریش کی خبر آسانی کے ساتھ اور آخر وقت تک پردہ میں رکھی جاسکتی تھی اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں اُحد کے موقعہ پر عباس کی چٹھی کی خبر ظاہر ہوگئی۔ کیونکہ گو شروع میں راز رکھا جاسکتا تھا لیکن بالآخر اس کے اظہار کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بدر کے موقعہ پر یہ خبر آخر وقت تک بالکل پردہ میں رہی اور ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ خدائی منشاء کے ماتحت جس کا قرآن شریف میں بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وقت تک یہ پردہ

---

[1] ابن سعد ۔ [2] زرقانی حالاتِ غزوہ اُحد ۔ [3] اسدالغابہ حالات عباس و مواہب اللدنیہ حالات غزوہ بدر ۔
[4] زرقانی و ابن سعد و واقدی ۔

رکھنا ضروری خیال کیا ہو

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن شریف اور تاریخ و حدیث کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو عام مورخین کا یہ خیال دُرست ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سارے کے سارے مسلمان محض قافلہ کے خیال سے مدینہ سے نکلے تھے اور لشکرِ قریش کی اطلاع سے وہ سب قطعی طور پر بے خبر تھے اور نہ ہمارے جدید محققین کی یہ رائے درست ہے کہ مدینہ میں ہی سارے مسلمانوں کو لشکرِ قریش کی آمد آمد کی اطلاع ہوگئی تھی اور وہ اس اطلاع کے بعد مدینہ سے نکلے تھے بلکہ حق یہ ہے کہ پیشتر اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکلتے لشکر اور قافلہ دونوں کی اطلاع آپؐ کو پہنچ چکی تھی مگر لشکر کی آمد مصلحتًا بصیغہ راز رکھی گئی اور سوائے بعض خاص خاص صحابہ کے جو غالبًا صرف اکابر مہاجرین میں سے تھے باقی سارے مسلمان اس سے بالکل بے خبر رہے اور اسی بے خبری کی حالت میں وہ مدینہ سے نکلے حتیٰ کہ بدر کے پاس پہنچ کر لشکرِ قریش سے ان کا اچانک سامنا ہوگیا۔ واللہ اعلم۔

یہ سوال کہ کفار کی طرف سے جنگ بدر کا سبب کیا تھا یعنی لشکرِ قریش مکہ سے کس غرض و غایت کے ماتحت نکلا تھا اس کے متعلق قرآن شریف مندرجہ ذیل صداقت پیش کرتا ہے:۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ[1] "یعنی اے مسلمانو! تم ان کفار کی طرح مت بنو جو اپنے گھروں سے تکبّر اور نمائش کا اظہار کرتے ہوئے نکلے تھے اور ان کی غرض یہ تھی کہ اللہ کے دین کے رستے میں جبری طور پر روکیں پیدا کریں۔ مگر اللہ نے ان کی کارروائیوں کا محاصرہ کر کے انہیں خائب و خاسر کر دیا۔"

اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ خواہ تحریکی سبب کوئی ہوا ہو اس مہم میں قریش مکہ کی اصل غرض و غایت ان کے ان خونی ارادوں پر مبنی تھی جو وہ شروع سے اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق رکھتے تھے اور قافلہ کی حفاظت یا عمرو بن حضرمی کے قتل کے انتقام کا خیال محض ایک آلہ تھا جس سے وہ عوام کو اشتعال دلانے اور ان کے جوشوں کو قائم رکھنے کا کام لیتے تھے اور تاریخ سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے؛ چنانچہ قافلہ کے خطرے کی اطلاع آنے پر بجائے اس کے کہ قریش جلدی سے نکل کھڑے ہوتے ان کا پورے ساز و سامان اور پوری تیاری کے ساتھ تین دن کے بعد نکلنا اور رستہ میں قافلہ کے بچ کر نکل جانے کی اطلاع آجانے پر بھی بڑی رعونت کے ساتھ آگے بڑھنے پر اصرار کرنا اور پھر عین میدانِ جنگ میں پہنچ کر جب کہ بعض لوگوں کی طرف سے جنگ کے روک دیئے جانے کی تحریک ہوئی ابوجہل وغیرہ کا نہایت سختی کے ساتھ لڑنے پر اصرار کرنا اور سارے لوگوں کا اسی کی تائید میں ہونا یہ سب اس بات کی یقینی شہادتیں ہیں کہ در اصل قافلہ کی حفاظت اور عمرو بن حضرمی کے قتل کے انتقام کا خیال ایک محض بہانہ تھا اور اصل غرض اسلام کو مٹانا اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا تھی۔

---

[1] انفال: ۴۸

اس اصولی بحث کے بعد ہم جنگِ بدر کے حالات کا بیان شروع کرتے ہیں مگر ہم ناظرین سے استدعا کریں گے کہ ہماری اس اصولی بحث کو بدر کے حالات کے مطالعہ کے بعد ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرمائیں۔ کیونکہ جنگِ بدر کے حالات معلوم ہونے پر یہ بحث زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھ آسکتی ہے۔

جنگِ بدر

○

اسلامی سلطنت کا استحکام

اور

رؤساء قریش کی تباہی

جنگِ بدر۔ رمضان ۲ھ مطابق مارچ ۶۲۳ء

اب ہم جنگِ بدر کے حالات کا ذکر شروع کرتے ہیں۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ہجرتِ نبوی کے بعد قریشِ مکہ نے مدینہ پر حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دینے کی تیاری شروع کر دی تھی اور اس دوران میں سریہ وادیٔ نخلہ میں جو عمرو بن حضرمی کے قتل کا واقعہ ہوا تھا اس سے رؤسائے قریش نے ناجائز فائدہ اُٹھا کر عامۃ الکفار کے دلوں میں مسلمانوں کی عداوت کی آگ کو اور بھی زیادہ خطرناک طور پر شعلہ زن کر دیا تھا اور اُس شخص کی طرح جسے اپنے وہ مظالم تو بھول جاتے ہیں جو وہ خود دوسروں پر کرتا رہا ہے لیکن اگر کسی دوسرے کی طرف سے اُسے ذرا سی بھی تکلیف پہنچ جاوے تو وہ اُسے ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ خواہ وہ جوابی رنگ ہی رکھتی ہو۔ قریشِ مکہ مسلمانوں پر حملہ کر کے ان کو تباہ و برباد کر دینے کی تیاری میں پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ منہمک ہو گئے تھے۔ اسی اثناء میں مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قریشِ مکہ کا ایک تجارتی قافلہ جس کے ساتھ تیس چالیس یا بعض روایات کی رُو سے ستّر آدمی تھے ابوسفیان کی سرداری میں شام کی طرف سے مکہ کو واپس آرہا ہے[1]۔ اس قافلہ میں غیر معمولی طور پر قریش کے ہر مرد و عورت کا حصہ تھا بلکہ لکھا ہے کہ جو چیز اور جو رقم بھی وہ تجارت میں لگا سکتے تھے وہ اس موقعہ پر انہوں نے لگا دی تھی[2] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس تجارت کے منافع کے متعلق قریش کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگی مصارف میں خرچ ہو گا۔ چونکہ قافلوں کی روک تھام، ظالم قریش کو ہوش میں لانے اور انہیں ان کی خطرناک کارروائیوں سے روکنے کا ایک بہترین ذریعہ تھی اور دُوسرے ان قافلوں کا مدینہ سے اس قدر قریب ہو کر گذرنا ویسے بھی مسلمانوں کے لیے کئی طرح سے خطرے کے احتمالات رکھتا تھا

---

[1] ابن ہشام و زرقانی ۔ [2] ابن سعد حالات غزوہ بدر ۔

اور پھر اس قافلہ کے خاص حالات ایسے تھے کہ اس کا بچ کر نکل جانا بظاہر حالات مسلمانوں کی تباہی کا پیش خیمہ سمجھا جا سکتا تھا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر پاکر اپنے دو مہاجر صحابی طلحہ بن عبیداللہ اور سعید بن زید کو خبر رسانی کے لیے روانہ فرمایا اور دوسرے صحابہ کو بھی اطلاع دے دی کہ وہ اس قافلہ کی روک تھام کے لیے نکلنے کو تیار رہیں مگر اتفاق ایسا ہوا کہ کسی طرح ابوسفیان کو بھی آپ کے اس ارادے کی اطلاع ہوگئی یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ویسے ہی بطور خود اندیشہ محسوس کیا ہو۔ بہرحال اس نے ایک سوار ضمضم نامی مکہ کی طرف بھگا دیا اور اُسے تاکید کی کہ بڑی تیزی کے ساتھ سفر کرتا ہوا مکہ میں پہنچے اور وہاں سے قریش کا لشکر قافلہ کی حفاظت اور مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے نکال لائے اور خود ابوسفیان نے یہ احتیاط اختیار کی کہ اصل راستے کو چھوڑ کر سمندر کے کنارے کی طرف ہٹ گیا اور چھپ چھپ کر مگر تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ جب ابوسفیان کا یہ قاصد مکہ پہنچا تو اُس نے عرب کے دستور کے مطابق ایک نہایت وحشت زدہ حالت بنا کر زور زور سے چلانا شروع کیا کہ اے اہل مکہ تمہارے قافلہ پر محمد اور اس کے اصحاب حملہ کرنے کے لیے نکلے ہیں چلو اور اُسے بچالو[1] یہ خبر سنکر مکہ کے لوگ گھبرا کر کعبۃ اللہ کے گرد جمع ہو گئے اور رؤسا قریش نے پھر اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہایت درجہ اشتعال انگیز تقریریں کیں جس سے لوگوں کے سینے اسلام کی عداوت کے جوش سے بھر گئے اور انھوں نے مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر تباہ و برباد کر دینے کا پختہ عزم کر لیا۔ اُس وقت قریش کے جوش کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ ایک بڑا جرار لشکر تیار کر کے مسلمانوں کے خلاف نکلیں اور اس مہم میں ہر وہ شخص جو لڑنے کے قابل ہے شامل ہو اور جو شخص کسی مجبوری کی وجہ سے خود شامل نہ ہو سکتا ہو وہ اپنی جگہ کسی دوسرے شخص کو بھیجنے کا انتظام کرے۔ اور رؤسا قریش اس تحریک میں خود سب سے آگے آگے تھے۔ صرف دو شخص تھے جنہوں نے شمولیت سے تامل کیا اور وہ ابولہب اور امیہ بن خلف تھے مگر ان کے تامل کی وجہ بھی مسلمانوں کی ہمدردی نہیں تھی بلکہ ابولہب تو اپنی بہن عاتکہ بنت عبدالمطلب کے خواب سے ڈرتا تھا جو اُس نے ضمضم کے آنے سے صرف تین دن پہلے قریش کی تباہی کے متعلق دیکھا تھا اور امیہ بن خلف اس پیشگوئی کی وجہ سے خائف تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل ہونے کے متعلق فرمائی تھی اور جس کا علم اُسے سعد بن معاذ کے ذریعہ مکہ میں ہو چکا تھا۔ لیکن چونکہ ان دو نامی رؤسا کے پیچھے رہنے سے عامۃ الکفار پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا اس لیے دوسرے رؤسا قریش نے جوش اور غیرت دلا دلا کر آخر ان دونوں کو رضامند کر لیا۔ یعنی اُمیّہ تو خود تیار ہو گیا اور ابولہب نے ایک دوسرے شخص کو کافی روپیہ دینا کر کے اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور اس طرح تین دن کی تیاری کے بعد[2] ایک ہزار سے زائد جانباز سپاہیوں کا لشکر مکہ سے نکلنے کو تیار ہو گیا۔

ابھی یہ لشکر مکہ میں ہی تھا کہ بعض رؤسا قریش کو یہ خیال آیا کہ چونکہ بنو کنانہ کی شاخ بنو بکر کے ساتھ اہل مکہ

---

[1] یہ بالکل جھوٹ تھا کیونکہ ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ہی تھے۔ [2] زرقانی و سیرۃ حلبیہ۔

کے تعلقات خراب ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر وہ ان کے پیچھے مکہ پر حملہ کر دیں اور اس خیال کی وجہ سے بعض قریش کچھ متزلزل ہونے لگے۔ مگر بنو کنانہ کے ایک رئیس سراقہ بن مالک بن جعشم نے جو اس وقت مکہ میں تھا ان کو اطمینان دلایا اور کہا کہ میں اس بات کا ضامن ہوتا ہوں کہ مکہ پر کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ بلکہ سراقہ کو مسلمانوں کی مخالفت کا ایسا جوش تھا کہ قریش کی اعانت میں وہ خود بھی بدر تک گیا، لیکن وہاں مسلمانوں کو دیکھ کر اس پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ جنگ سے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر بھاگ آیا۔ اسی واقعہ کی طرف قرآن شریف کی اس آیت میں اشارہ سمجھا گیا ہے کہ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ......... وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ[1]۔ "جبکہ شیطان قریشِ مکہ کو مسلمانوں کے خلاف حق بجانب قرار دیتا تھا اور انہیں اُبھارتا تھا" الخ

مکہ سے نکلنے سے پہلے قریش نے کعبہ میں جا کر دُعا کی کہ "اے خدا ہم دونوں فریقوں میں سے جو گروہ حق پر قائم ہے اور تیری نظروں میں زیادہ شریف اور زیادہ افضل ہے تُو اُسی کی نصرت فرما اور دُوسرے کو ذلیل و رسوا کر[2]۔" اس کے بعد کفار کا لشکر بڑے جاہ و حشم کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوا۔ تمام رؤسا قریش ساتھ تھے اور گانے بجانے والی عورتیں بھی جو اپنے اشعار کے ساتھ دفیں بجاتی ہوئی غیرت اور جوش دلاتی تھیں ہمراہ تھیں۔ راستہ میں رؤسا قریش نے اس مہم کو ایک خاص قومی کارنامہ خیال کرتے ہوئے اپنے خرچ سے لشکر کی خوراک کا انتظام کیا؛ چنانچہ اُن کی طرف سے ہر روز باری باری نو نو دس دس اُونٹ سپاہیوں کی ضیافت کے لیے ذبح کیے جاتے تھے[3]۔ جب یہ لشکر جحفہ میں پہنچا جو مکہ اور بدر کے درمیان مگر بدر کے قریب تر ایک مقام ہے تو ابوسفیان کے ایک قاصد کے ذریعے انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ ان کا قافلہ خطرہ کی جگہ سے بچ کر نکل گیا ہے اور اس لیے اب لشکر کو آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ اس خبر پر بعض لوگ واپس جانے کو تیار ہو گئے، لیکن ابوجہل اور اس کی پارٹی کے اثر کے ماتحت اکثر اہلِ لشکر نے جن کی نیتیں کچھ اور تھیں بلکہ ایک روایت کی رُو سے سب نے[4] بڑی سختی سے انکار کیا اور کہا کہ "خدا کی قسم ہم بدر تک ضرور جائیں گے اور وہاں جا کر تین دن تک جشن منائیں گے تاکہ ہمیشہ کے لیے ملک میں ہمارا رُعب بیٹھ جاوے اور لوگ ہم سے ڈرنے لگ جائیں[5]۔" چنانچہ سوائے چند آدمیوں کے جو واپس لوٹ گئے[6] باقی سارا لشکر بڑھ کر دفرکے

---

[1] انفال: ۴۹ [2] خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۱۷ [3] زرقانی حالات غزوہ بدر [4] طبری صفحہ ۱۲۸۸ و ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۔

[5] یاد رکھنا چاہیئے کہ بدر ایک وادی کا نام ہے جس میں چند چشمے ہیں اور جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ اس کی مسافت عام حالات میں مدینہ سے چار پانچ یوم اور مکہ سے آٹھ نو یوم کی بھی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہاں ہر سال ایک میلہ لگا کرتا تھا جس میں عرب کے مختلف قبائل جمع ہو کر تجارت کرتے اور جشن مناتے تھے۔ پس کفارِ مکہ نے اس میلہ کی آڑ رکھ کر یہ اصرار کیا کہ ہم بدر تک ضرور جائیں گے تاکہ ہمارا رُعب بیٹھ جاوے۔

[6] روایات میں واپس لوٹ جانیوالوں میں قبیلہ بنو عدی اور زہرہ کا نام مذکور ہوا ہے۔

ساتھ آگے بڑھا اور مکہ سے نکلنے کی تاریخ سے نویں دن (ایک دن درمیان میں راستہ کھوئے جانے کی وجہ سے ضائع ہو گیا تھا[1]) یعنی ضمضم کی اطلاع پہنچنے کے گیارہ یا بارہ دن کے بعد بدر کی وادی کے ورلے کنارے پر پہنچا اور وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ اس وقت لشکرِ قریش کی تعداد ایک ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور یہ لوگ رائج الوقت سامانِ حرب سے خوب آراستہ تھے؛ چنانچہ فوج میں سواری کے سات سو اُونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے اور سب سوار اور اکثر پیادہ زرہ پوش تھے اور دیگر سامانِ جنگ بھی مثلاً نیزہ اور تلوار اور تیر کمان وغیرہ کافی تعداد میں موجود تھا۔

اب ہم تھوڑی دیر کے لیے لشکرِ قریش سے جُدا ہو کر مدینہ کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کے قافلہ کی خبر پا کر اپنے دو صحابی اطلاعِ حالات کے لیے روانہ فرما دیئے تھے لیکن ابھی وہ واپس نہیں لوٹے تھے کہ آپؐ کو کسی ذریعہ سے مخفی طور پر یہ اطلاع بھی پہنچ گئی کہ قریش کا ایک جرار لشکر مکہ سے آرہا ہے۔ اس وقت جو کمزور حالت مسلمانوں کی تھی اُسے ملحوظ رکھتے ہوئے نیز جنگی تدابیر کے عام اصول کے مطابق آپؐ نے اس خبر کو مشتہر نہیں ہونے دیا تاکہ عامۃ المسلمین میں اس کی وجہ سے کسی قسم کی بددلی نہ پیدا ہو لیکن ایک بیدار مغز جرنیل کی طرح آپؐ نے بغیر اس خبر کے اظہار کے ایسے رنگ میں صحابہ میں تحریک فرمائی کہ بہت سے صحابہ باوجود یہ خیال رکھنے کے کہ یہ مہم قافلہ کی روک تھام کی غرض سے اختیار کی جارہی ہے آپؐ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے حتّٰی کہ انصار بھی جو بیعتِ عقبہ ثانیہ کے معاہدے کے موافق صرف مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں آپؐ کی حفاظت کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے اور جو اس وقت تک کسی غزوہ یا سریہ میں شامل نہیں ہوئے تھے[2] شریکِ جہاد ہونے کے لیے آمادہ ہو گئے؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ آپؐ نے مدینہ میں ایک مجلس قائم کی اور صحابہ سے مشورہ دریافت فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے جان نثارانہ تقریریں کیں مگر آپؐ نے ان کی طرف کچھ التفات نہ کیا جس پر رؤسار انصار سمجھ گئے کہ آپؐ کا روئے سخن اُن کی طرف ہے؛ چنانچہ اُن میں سے سعد بن عبادۃؓ رئیس خزرج نے جان نثارانہ تقریر کی اور عرض کیا یا رسُول اللہ! انصار ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں اور جہاں بھی آپ ارشاد فرمائیں جانے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے صحابہ میں عام تحریک فرمائی اور انصار و مہاجرین کی ایک جمعیت آپؐ کے ساتھ نکلنے کو تیار ہو گئی[3] لیکن پھر بھی چونکہ عام خیال قافلہ کے مقابلہ کا تھا بہت سے صحابہ یہ خیال کرکے کہ محض قافلہ کی روک تھام کا معاملہ ہے جس کے لیے زیادہ لوگوں کا شامل ہونا ضروری نہیں ہے شامل نہیں ہوئے[4] دُوسری طرف وہ بعض خاص صحابہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لشکرِ قریش کی آمد کا علم ہو گیا تھا مگر جن کو اخفاءِ راز کا حکم تھا وہ اپنی جگہ فکر مند تھے کہ دیکھئے اس موقعہ پر جبکہ لشکرِ قریش سے بھی مٹھ بھیڑ ہو جانے کا احتمال ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی اہم ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں یا

---

[1] زرقانی ✧ [2] ابن سعد و طبری ✧ [3] مسلم و ابوداؤد ✧ [4] طبری و ابن ہشام ✧

نہیں، چنانچہ انہی لوگوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قرآن شریف فرماتا ہے اِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکَارِھُوْنَ۔[1]
یعنی مدینہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکلنے کو مومنوں کا ایک فریق (اپنی ظاہری طاقت کا خیال کرتے ہوئے) پسند نہیں کرتا تھا اور اسے ایک مشکل اور نازک کام سمجھتا تھا،" مگر چونکہ اُن کے آقا کا یہی منشاء تھا وہ دلی جوش کے ساتھ لبیک لبیک کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اس وقت تک گو وہ دو صحابی جن کو آپؐ نے خبر رسانی کے واسطے بھیجا تھا واپس نہیں لوٹے تھے مگر چونکہ لشکر قریش کی اطلاع آچکی تھی آپؐ نے مزید توقف کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ اور بارہ رمضان کو بروز اتوار مدینہ سے انصار و مہاجرین کی ایک جمعیت کے ساتھ اللہ کا نام لیتے ہوئے روانہ ہوگئے[2] اکابر صحابہ میں سے جو لوگ اس غزوہ میں شامل نہیں ہوسکے اُن میں سے حضرت عثمان بن عفان کا نام خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ان ایام میں چونکہ ان کی زوجہ رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت بیمار تھیں۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خود حکم دیا تھا کہ وہ ان کی تیمار داری کے لیے مدینہ میں ہی ٹھہریں۔ اسی طرح قبیلہ خزرج کے رئیس اعظم سعد بن عبادۃ بھی عین وقت پر بیمار ہوجانے کی وجہ سے شامل نہیں ہوسکے۔[3] قبیلہ اوس کے رئیس اسید بن الحضیر بھی کسی مجبوری کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے۔ طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید چونکہ ابھی تک خبر رسانی کی مہم سے واپس نہیں آئے تھے اس لیے وہ بھی لڑائی کی عملی شرکت سے محروم رہ گئے باقی اکثر اکابر صحابہ آپؐ کے ہمرکاب تھے۔

مدینہ سے تھوڑی دُور نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈیرہ ڈالنے کا حکم دیا اور فوج کا جائزہ لیا۔ کم عمر بچے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کے شوق میں ساتھ چلے آئے تھے، واپس کئے گئے۔ سعد بن ابی وقاص کے چھوٹے بھائی عمیر بھی کم سن تھے۔ انہوں نے جب بچوں کی واپسی کا حکم سُنا تو لشکر میں اِدھر اُدھر چھپ گئے لیکن آخر ان کی باری آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی واپسی کا حکم دیا۔ یہ حکم سُن کر عمیر رونے لگ گئے اور آپؐ نے اُن کے غیر معمولی شوق کو دیکھ کر انہیں اجازت دے دی[4]۔ اب لشکر اسلامی کی تعداد کچھ اُوپر تین سو دس تھی۔ جن میں مہاجرین کچھ اُوپر ساٹھ تھے اور باقی سب انصار تھے[5]۔ مگر بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ساری فوج میں صرف ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے اور انہی پر مسلمان باری باری سوار ہوتے تھے حتّٰی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کوئی الگ سواری نہیں تھی یعنی آپؐ کو بھی دُوسروں کے ساتھ باری باری سے چڑھنا اور اُترنا پڑتا تھا۔ آپؐ کے ساتھیوں نے بڑے اصرار سے عرض کیا کہ ہم پیدل چلتے ہیں حضور سوار رہیں، مگر آپؐ نے نہ مانا اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ مَیں تم سے چلنے میں کمزور نہیں ہوں اور ثواب کی خواہش بھی مجھے کسی سے کم نہیں پھر مَیں کیوں نہ باری میں حصہ لوں[6]۔ لشکر میں زرہ پوش صرف چھ سات تھے اور باقی سامانِ حرب بھی بہت تھوڑا اور ناقص تھا۔ الغرض جائزہ وغیرہ کے کام

---

[1] سورۃ انفال: ۶ ۔ [2] ابن سعد و زرقانی ۔ [3] زرقانی ۔ [4] اصابہ ذکر عمیر بن ابی وقاص ۔
[5] بخاری غزوہ بدر ۔ [6] ابن سعد ۔

سے فارغ ہوکر آپؐ آگے روانہ ہوئے۔ ابھی تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ ایک شخص نے جو مشرک تھا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ مَیں آپؐ کے ساتھ چل کر جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ صحابہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ شخص اپنی بہادری اور شجاعت میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ مگر آپؐ نے یہ فرماکر اُسے رّد کر دیا کہ مَیں اس موقعہ پر ایک مشرک سے مدد نہیں لینا چاہتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شخص پھر آیا۔ لیکن اِدھر سے پھر وہی جواب تھا۔ تیسری دفعہ وہ پھر حاضر ہوا اور اپنی خدمات پیش کیں اور ساتھ ہی عرض کیا کہ مَیں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں اب بڑی خوشی سے ہمارے ساتھ چلو۔[1]

مدینہ سے نکلتے ہوتے آپؐ نے اپنے پیچھے عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ کا اَمیر مقرر کیا تھا۔ مگر جب آپؐ روحاء کے قریب پہنچے جو مدینہ سے ۳۶ میل کے فاصلہ پر ہے تو غالباً اس خیال سے کہ عبداللہ ایک نابینا آدمی ہیں اور لشکر قریش کی آمد آمد کی خبر کا تقاضا ہے کہ آپؐ کے پیچھے مدینہ کا انتظام مضبوط رہے آپؐ نے ابولبابہ بن منذر کو مدینہ کا امیر مقرر کرکے واپس بھجوا دیا اور عبداللہ بن ام مکتوم کے متعلق حکم دیا کہ وہ صرف امام الصلوٰۃ رہیں مگر انتظامی کام ابولبابہ سرانجام دیں۔ مدینہ کی بالائی آبادی یعنی قباء کے لیے آپؐ نے عاصم بن عدی کو الگ امیر مقرر فرمایا۔ اسی مقام سے آپؐ نے بسبس اور عدی نامی دو صحابیوں کو دشمن کی حرکات و سکنات کا علم حاصل کرنے کے لیے بدر کی طرف روانہ فرمایا اور حکم دیا کہ وہ بہت جلد خبر لے کر واپس آئیں۔[2] روحاء سے آگے روانہ ہوکر جب مسلمان وادئ صفراء کے ایک پہلو سے گذرتے ہوئے ذفران میں پہنچے جو بدر سے صرف ایک منزل ورے ہے تو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قافلہ کی حفاظت کے لیے قریش کا ایک بڑا جرّار لشکر مکہ سے آرہا ہے۔ اب چونکہ اخفاء راز کا موقعہ گذر چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو جمع کرکے انہیں اس خبر سے اطلاع دی اور پھر اُن سے مشورہ پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ظاہری اسباب کا خیال کرتے ہوئے تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ سے سامنا ہو کیونکہ لشکر کے مقابلہ کے لیے ہم ابھی پوری طرح تیار نہیں ہیں مگر آپؐ نے اس رائے کو پسند نہ فرمایا۔[3] دوسری طرف اکابر صحابہ نے یہ مشورہ سُنا تو اُٹھ اُٹھ کر جاں نثارانہ تقریریں کیں اور عرض کیا ہمارے جان و مال سب خدا کے ہیں۔ ہم ہر میدان میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ چنانچہ مقداد بن اُسود نے جن کا دوسرا نام مقداد بن عمرو بھی تھا کہا۔ "یا رسُول اللہ! ہم موسٰی کے اصحاب کی طرح نہیں ہیں کہ آپ کو یہ جواب دیں کہ جا تُو اور تیرا خدا جاکر لڑو ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ آپؐ جہاں بھی چاہتے ہیں چلیں ہم آپؐ کے ساتھ ہیں اور ہم آپؐ کے دائیں اور بائیں اور آگے اور پیچھے ہوکر لڑیں گے۔" آپؐ نے یہ تقریر سُنی تو آپؐ کا چہرہ مبارک خوشی سے تمتمانے لگ گیا۔[4] مگر اس موقعہ پر بھی آپؐ انصار کے جواب کے منتظر تھے اور چاہتے تھے کہ وہ بھی کچھ بولیں۔ کیونکہ آپؐ کو یہ خیال تھا کہ شاید انصار یہ سمجھتے ہوں کہ بیعت عقبہ کے

---

[1] مسلم آخر ابواب الجہاد والسیر۔ [2] ابن ہشام۔ [3] تاریخ الخمیس۔ [4] بخاری کتاب المغازی۔

ماتحت ہمارا فرض صرف اس قدر ہے کہ اگر عین مدینہ پر کوئی حملہ ہو تو اس کا دفاع کریں، چنانچہ باوجود اس قسم کی جاں نثارانہ تقریروں کے آپ یہی فرماتے گئے کہ اچھا پھر مجھے مشورہ دو کہ کیا کیا جاوے۔ سعد بن معاذ رئیس اوس نے آپ کا منشاء سمجھا اور انصار کی طرف سے عرض کیا "یارسول اللہ! شاید آپ ہماری رائے پُوچھتے ہیں۔ خدا کی قسم جب ہم آپ کو سچا سمجھ کر آپ پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم نے اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے تو پھر اب آپ جہاں چاہیں چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں اور اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ اگر آپ ہمیں سمندر میں کُود جانے کو کہیں تو ہم کُود جائیں گے اور ہم میں سے ایک فرد بھی پیچھے نہیں رہے گا اور آپ انشاء اللہ ہم کو لڑائی میں صابر پائیں گے اور ہم سے وہ بات دیکھیں گے جو آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرے گی۔" آپ نے یہ تقریر سُنی تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ سِيْرُوْا وَابْشِرُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ وَعَدَنِي إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ وَاللّٰهِ لَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى مَصَارِعِ الْقَوْمِ۔ یعنی "پھر اللہ کا نام لیکر آگے بڑھو اور خوش ہو کیونکہ اللہ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ کفار کے ان دو گروہوں (یعنی لشکر اور قافلہ) میں سے کسی ایک گروہ پر وہ ہم کو ضرور غلبہ دیگا۔ اور خدا کی قسم میں گویا اس وقت وہ جگہیں دیکھ رہا ہوں جہاں دشمن کے آدمی قتل ہو ہو کر گریں گے۔"[1] آپ کے یہ الفاظ سُنکر صحابہ خوش ہوئے مگر ساتھ ہی انھوں نے حیران ہو کر عرض کیا هَلَّا ذَكَرْتَ لَنَا الْقِتَالَ فَنَسْتَعِدَّ لَهُ۔ یعنی "یارسول اللہ! اگر آپ کو پہلے سے لشکرِ قریش کی اطلاع تھی تو آپ نے ہم سے مدینہ میں ہی جنگ کے احتمال کا ذکر کیوں نہ فرمادیا کہ ہم کچھ تیاری تو کر کے نکلتے۔" مگر باوجود اس خبر اور اس مشورہ کے اور باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس خدائی بشارت کے کہ ان دو گروہوں میں سے کسی ایک پر مسلمانوں کو ضرور فتح حاصل ہوگی ابھی تک مسلمانوں کو معیّن طور پر یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ ان کا مقابلہ کس گروہ سے ہوگا اور وہ ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک گروہ کے ساتھ مٹھ بھیڑ ہو جانے کا امکان سمجھتے تھے اور وہ طبعاً کمزور گروہ یعنی قافلہ کے مقابلہ کے زیادہ خواہشمند تھے۔

اس مشورہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیزی کے ساتھ بدر کی طرف بڑھنے شروع ہوئے اور جب آپ بدر کے قریب پہنچے تو کسی خیال کے ماتحت جس کا ذکر روایات میں نہیں ہے آپ حضرت ابوبکر صدیق کو اپنے پیچھے سوار کر کے اسلامی لشکر سے کچھ آگے نکل گئے اس وقت آپ کو ایک بوڑھا بدوی ملا جس سے آپ کو باتوں باتوں میں یہ معلوم ہوا کہ اس وقت قریش کا لشکر بدر کے بالکل پاس پہنچا ہوا ہے۔ آپ یہ خبر سُنکر واپس تشریف لے آئے اور حضرت علی اور زبیر بن العوام اور سعد بن وقاص وغیرہ کو دریافت حالات کے لیے آگے روانہ فرمایا۔ جب یہ لوگ بدر کی وادی میں گئے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مکہ کے چند لوگ ایک چشمہ سے پانی بھر رہے ہیں۔ ان صحابیوں نے اس جماعت پر حملہ کر کے اُن میں سے ایک حبشی غلام کو پکڑ لیا اور اُسے

---

[1] ابن ہشام و ابن سعد ؛ [2] ابن کثیر و سیرۃ حلبیہ ؛

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آئے[1] اس وقت آپؐ نماز میں مصروف تھے۔ صحابہ نے یہ دیکھ کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو نماز میں مصروف ہیں، خود اُس غلام سے پوچھنا شروع کیا کہ ابوسفیان کا قافلہ کہاں ہے[2]۔ یہ حبشی غلام چونکہ لشکر کے ہمراہ آیا تھا اور قافلہ سے بے خبر تھا اُس نے جواب میں کہا کہ ابوسفیان کا تو مجھے علم نہیں ہے؛ البتہ ابوالحکم یعنی ابوجہل اور عتبہ اور شیبہ اور امیّہ وغیرہ اس وادی کے دُوسرے کنارے ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں صحابہ نے جن کا میلان قافلہ کی طرف زیادہ تھا سمجھا کہ وُہ جھوٹ بولتا ہے اور دیدہ دانستہ قافلہ کی خبر کو چھپانا چاہتا ہے جس پر بعض لوگوں نے اُسے کچھ زدوکوب کیا، لیکن جب وُہ اُسے مارتے تھے تو وہ ڈر کے مارے کہہ دیتا تھا کہ اچھا میں بتاتا ہوں اور جب اُسے چھوڑ دیتے تھے تو پھر وہی پہلا جواب دیتا تھا کہ مجھے ابوسفیان کا تو کوئی علم نہیں ہے؛ البتہ ابوجہل وغیرہ یہ پاس ہی موجود ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں یہ باتیں سُنیں تو آپؐ نے جلدی سے نماز سے فارغ ہو کر صحابہ کو مارنے سے روکا اور فرمایا "جب وہ سچّی بات بتاتا ہے تو تم اسے مارتے ہو اور جھوٹ کہنے لگتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔" پھر آپؐ نے خود نرمی کے ساتھ اس سے دریافت فرمایا کہ لشکر اس وقت کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ اس سامنے والے ٹیلے کے پیچھے ہے آپؐ نے پُوچھا کہ لشکر میں کتنے آدمی ہیں۔ اُس نے جواب دیا کہ بہت ہیں مگر پوری پوری تعداد مجھے معلوم نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اُن کے لیے ہر روز کتنے اُونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ دس ہوتے ہیں۔ آپؐ نے صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ایک ہزار آدمی معلوم ہوتے ہیں[3] اور حقیقۃً وہ اتنے ہی تھے[4] پھر آپؐ نے اس غلام سے پوچھا کہ رؤسا قریش میں سے کون کون لوگ ہیں۔ اُس نے کہا۔ عتبہ، شیبہ، ابوجہل، ابوالبختری، عقبہ بن ابی معیط، حکیم بن حزام، نضر بن حارث، امیّہ بن خلف، سہیل بن عمرو، نوفل بن خویلد، طعیمہ بن عدی، زمعہ بن اسود وغیرہ وغیرہ سب ساتھ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا، هٰذِهِ مَكَّةُ قَدْ أَلْقَتْ إِلَيْكُمْ أَفْلَاذَ كَبِدِهَا۔ یعنی "لو مکّہ نے تمہارے سامنے اپنے جگر گوشے نکال کر ڈال دیئے ہیں[5]۔" یہ نہایت دانشمندانہ اور حکیمانہ الفاظ تھے جو آپؐ کی زبان مبارک سے بے ساختہ طور پر نکلے۔ کیونکہ بجائے اس کے کہ قریش کے اتنے نامور رؤساء کا ذکر آنے سے کمزور طبیعت مسلمان بے دل ہوتے ان الفاظ نے ان کی قوتِ متخیلہ کو اس طرف مائل کر دیا کہ گویا ان سردارانِ قریش کو تو خدا نے مسلمانوں کا شکار بننے کے لیے بھیجا ہے۔

جس جگہ اسلامی لشکر نے ڈیرہ ڈالا تھا وہ کوئی ایسی اچھی جگہ نہ تھی۔ اس پر حباب بن منذر نے آپؐ سے دریافت کیا کہ آیا خدائی الہام کے ماتحت آپؐ نے یہ جگہ پسند کی ہے یا محض فوجی تدبیر کے طور پر اسے اختیار کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس بارہ میں کوئی خدائی حکم نہیں ہے، تم کوئی مشورہ دینا چاہتے ہو تو

---

[1] ابن ہشام [2] ابھی تک قافلہ کا خیال دل سے نہیں نکلا تھا اور اسی کی خواہش غالب تھی۔
[3] طبری صفحہ ۱۲۸۹ [4] مسلم و ابوداؤد [5] ابن ہشام و طبری۔

بتاؤ؟ حباب نے عرض کیا۔ تو پھر میرے خیال میں یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر قریش سے قریب ترین چشمہ پر قبضہ کر لیا جاوے۔ میں اس چشمہ کو جانتا ہوں۔ اس کا پانی اچھا ہے اور عموماً ہوتا بھی کافی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور چونکہ ابھی تک قریش ٹیلہ کے پرے ڈیرہ ڈالے پڑے تھے اور یہ چشمہ خالی تھا، مسلمان آگے بڑھ کر اس چشمہ پر قابض ہو گئے لیکن جیسا کہ قرآن شریف میں اشارہ پایا جاتا ہے اس وقت اس چشمہ میں بھی پانی زیادہ نہیں تھا اور مسلمانوں کو پانی کی قلت محسوس ہوتی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ وادی کے جس طرف مسلمان تھے وہ ایسی اچھی نہ تھی کیونکہ اس طرف ریت بہت تھی جس کی وجہ سے پاؤں اچھی طرح جمتے نہیں تھے۔

جگہ کے انتخاب کے بعد سعد بن معاذ رئیس اوس کی تجویز سے صحابہ نے میدان کے ایک حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ایک سائبان سا تیار کر دیا اور سعد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری سائبان کے پاس باندھ کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! آپ اس سائبان میں تشریف رکھیں اور ہم اللہ کا نام لے کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر خدا نے ہمیں فتح دی تو یہی ہماری آرزو ہے، لیکن اگر خدانخواستہ معاملہ دگرگوں ہوا تو آپ اپنی سواری پر سوار ہو کر جس طرح بھی ہو مدینہ پہنچ جائیں۔ وہاں ہمارے ایسے بھائی بند موجود ہیں جو محبت و اخلاص میں ہم سے کم نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اُن کو یہ خیال نہیں تھا کہ اس مہم میں جنگ پیش آ جائیگی اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں آئے ورنہ ہرگز پیچھے نہ رہتے لیکن جب انہیں حالات کا علم ہوگا، تو وہ آپ کی حفاظت میں جان تک لڑا دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔"[1] یہ سعد کا جوشِ اخلاص تھا جو ہر حالت میں قابلِ تعریف ہے، ورنہ بھلا خدا کا رسول اور میدان سے بھاگے؛ چنانچہ حنین کے میدان میں بارہ ہزار فوج نے پیٹھ دکھائی، مگر یہ مرکزِ توحید اپنی جگہ سے متزلزل نہیں ہوا۔ بہر حال سائبان تیار کیا گیا اور سعد اور بعض دوسرے انصار اس کے گرد پہرہ دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر نے اسی سائبان میں رات بسر کی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات بھر خدا کے حضور گریہ وزاری سے دُعائیں کیں اور لکھا ہے کہ سارے لشکر میں صرف آپ ہی تھے جو رات بھر جاگے۔ باقی سب لوگ باری باری اپنی نیند سو لئے۔ اور چونکہ نیند کا آنا بھی ایک اطمینان کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا قرآن شریف میں ذکر کیا ہے۔ پھر خدا کا مزید فضل یہ ہوا کہ کچھ بارش بھی ہو گئی جس سے مسلمانوں کو یہ موقعہ مل گیا کہ حوض بنا بنا کر پانی جمع کر لیں۔ اور یہ بھی فائدہ ہو گیا کہ ریت جم گئی اور پاؤں زمین میں دھنسنے سے رُک گئے۔ دوسری طرف قریش والی جگہ میں کیچڑ کی سی صورت ہو گئی اور اس طرف کا پانی بھی کچھ گدلا ہو کر میلا ہو گیا۔ اس واقعہ کا بھی قرآن شریف نے ذکر کیا ہے۔[2]

اب رمضان ۲ھ کی سترہ تاریخ اور جمعہ کا دن تھا۔[3] اور عیسوی حساب سے ۱۴ مارچ ۶۲۳ء تھی۔[4] صبح

---

[1] طبری و ابن ہشام ☆ [2] ہر دو واقعات کے لیے دیکھو سورۃ انفال : ۲۰ ☆

[3] ابنِ ہشام و ابنِ سعد ☆ [4] توفیقات ☆

اُٹھ کر سب سے پہلے نماز ادا کی گئی اور پرستارانِ احدیت کھلے میدان میں خدائے واحد کے حضور سربسجود ہوئے۔
اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد پر ایک خطبہ فرمایا اور پھر جب ذرا روشنی ہوئی تو آپؐ نے ایک تیر کے اشارہ سے مسلمانوں کی صفوں کو درست کرنا شروع کیا۔ ایک صحابی سوادؓ نامی صف سے کچھ آگے نکلا کھڑا تھا آپؐ نے اُسے تیر کے اشارہ سے پیچھے ہٹنے کو کہا مگر اتفاق سے آپؐ کے تیر کی لکڑی اُس کے سینہ پر جا لگی۔ اُس نے جرأت کے انداز سے عرض کیا "یارسول اللہ! آپؐ کو خدا نے حق و انصاف کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے مگر آپؐ نے مجھے ناحق تیر مارا ہے واللہ میں تو اس کا بدلہ لوں گا" صحابہ انگشت بدنداں تھے کہ سوادؓ کو کیا ہو گیا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت شفقت سے فرمایا کہ اچھا سوادؓ تم بھی مجھے تیر مار لو" اور آپؐ نے اپنے سینہ سے کپڑا اُٹھا دیا۔ سوادؓ نے فرطِ محبت سے آگے بڑھ کر آپؐ کا سینہ چوم لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "سوادؓ یہ تمہیں کیا سوجھی؟" اُس نے رقت بھری آواز میں عرض کیا "یارسول اللہ! دشمن سامنے ہے کچھ خبر نہیں کہ یہاں سے بچ کر جانا ملتا ہے یا نہیں۔ میں نے چاہا کہ شہادت سے پہلے آپؐ کے جسم مبارک سے اپنا جسم چھو جاؤں"[1]
غالباً اسی وقت کے قریب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حذیفہ بن یمان اور ابوجبل حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ ہم ابھی ابھی مکہ سے آرہے ہیں۔ جب ہم وہاں سے نکلے تھے تو قریش نے ہم کو روک دیا تھا اور پھر یہ عہد لیکر چھوڑا تھا کہ ہم آپؐ کے ساتھ ہو کر ان کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔ گو یہ عہد قابلِ ایفاء نہیں تھا کیونکہ جبراً لیا گیا تھا مگر آپؐ نے فرمایا "تو پھر تم جاؤ اور اپنے عہد کو پورا کرو۔ ہم اللہ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور اُسی کی نصرت پر ہمارا بھروسہ ہے"[2]
ابھی آپؐ صفوں کی درستی میں ہی مصروف تھے کہ قریش کے لشکر میں حرکت پیدا ہوئی اور لشکرِ کفار میدانِ قتال کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ یہ وہ موقعہ تھا جبکہ کفار کو مسلمان اصلی تعداد سے کم نظر آتے تھے[3] اس لیے وہ جرأت کے ساتھ بڑھتے آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دور سے دیکھا تو فرمایا "اے میرے مولا! یہ لوگ تکبر و غرور سے بھرے ہوئے تیرے دین کے مٹانے کے لیے آئے ہیں تو اپنے وعدہ کے مطابق اپنے دین کی نصرت فرما[4] اسی اثناء میں قریش کے چند آدمی مسلمانوں کے چشمہ کی طرف بڑھے۔ صحابہ نے روکنا چاہا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور حکم دیا کہ ان کو پانی پی لینے دیا جاوے، چنانچہ انہوں نے امن کے ساتھ پانی پیا اور اپنے لشکر کو واپس لوٹ گئے۔[5] دشمن کے ساتھ اس عدل و احسان کا معاملہ کرنا عرب کے ضابطۂ اخلاق میں مفقود تھا اور یہ اسلام کی ایک خصوصیت ہے کہ اس نے خود حفاظتی قواعد کی رعایت رکھتے ہوئے دشمن سے بھی نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔
اب فوجیں بالکل ایک دوسرے کے سامنے تھیں مگر قدرتِ الٰہی کا عجیب تماشہ ہے کہ اس وقت لشکروں کے کھڑے ہونے کی ترتیب ایسی تھی کہ اسلامی لشکر قریش کو اصلی تعداد سے زیادہ بلکہ دوگنا نظر آتا تھا[6] جس کی

---

[1] ابن ہشام ٭ [2] مسلم کتاب الجہاد باب الوفاء بالعہد ٭ [3] انفال: ۴۵ ٭
[4] ابن ہشام و طبری ٭ [5] طبری و ابن ہشام ٭ [6] سورۃ آل عمران: ۱۴ ٭

وجہ سے کفار مرعوب ہوئے جاتے تھے اور دُوسری طرف قریش کا لشکر مسلمانوں کو اُن کی اصلی تعداد سے کم نظر آتا تھا[1] جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے دل بڑھے ہوئے تھے۔ قریش کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح اسلامی لشکر کی تعداد کا صحیح اندازہ پتہ لگ جاوے تاکہ وہ چھوٹے ہوئے دلوں کو سہارا دے سکیں۔ اس کے لیے رؤسار قریش نے عمیر بن وہب کو بھیجا کہ اسلامی لشکر کے چاروں طرف گھوڑا دوڑا کر دیکھے کہ اس کی تعداد کتنی ہے اور آیا ان کے پیچھے کوئی کمک تو مخفی نہیں؟ چنانچہ عمیر نے گھوڑے پر سوار ہو کر مسلمانوں کا ایک چکر کاٹا، مگر اسے مسلمانوں کی شکل و صورت سے ایسا جلال اور عزم اور موت سے ایسی بے پروائی نظر آئی کہ وہ سخت مرعوب ہو کر لوٹا اور قریش سے مخاطب ہو کر کہنے لگا مَا رَأَيْتُ شَيْئًا وَلٰكِنِّي قَدْ رَأَيْتُ يَا مَعْشَرَ الْقُرَيْشِ الْبَلَايَا تَحْمِلُ الْمَنَايَا نَوَاضِحُ يَثْرِبَ تَحْمِلُ الْمَوْتَ النَّاقِعَ[2] یعنی مجھے کوئی مخفی کمک وغیرہ تو نظر نہیں آئی، لیکن اے معشر قریش! میں نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے لشکر میں گویا اونٹنیوں کے کجاوں نے اپنے اوپر آدمیوں کو نہیں بلکہ موتوں کو اُٹھایا ہوا ہے اور یثرب کی سانڈنیوں پر گویا بلاکتیں سوار ہیں؟ قریش نے جب یہ بات سنی تو اُن میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ سراقہ جوان کا ضامن بنکر آیا تھا کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ اُلٹے پاؤں بھاگ گیا۔ اور جب لوگوں نے اُسے روکا تو کہنے لگا۔ اِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ[3] "مجھے جو کچھ نظر آرہا ہے وہ تم نہیں دیکھتے"۔ حکیم بن حزام نے عمیر کی رائے سنی تو گھبرایا ہوا عتبہ بن ربیعہ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "اے عُتبہ! تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آخر عمرو حضرمی کا بدلہ ہی چاہتے ہو[4] وہ تمہارا حلیف تھا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اس کی طرف سے خون بہا ادا کر دو اور قریش کو لیکر واپس لوٹ جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے تمہاری نیک نامی رہے گی"۔ عتبہ کو جو خود گھبرایا ہوا تھا اور کیا چاہیئے تھا جھٹ بولا "ہاں ہاں میں راضی ہوں اور پھر حکیم! دیکھو تو یہ مسلمان اور ہم آخر آپس میں رشتہ دار ہی تو ہیں۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ بھائی بھائی پر تلوار اٹھائے اور باپ بیٹے پر۔ تم ایسا کرو کہ ابھی ابوالحکم (یعنی ابوجہل) کے پاس جاؤ اور اس کے سامنے یہ تجویز پیش کرو"۔[5] اور ادھر عتبہ نے خود اونٹ پر سوار ہو کر اپنی طرف سے لوگوں کو سمجھانا شروع کر دیا کہ "رشتہ داروں میں لڑائی ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں واپس لوٹ جانا چاہیئے اور محمد کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ دُوسرے قبائل عرب کے ساتھ نپٹتا رہے۔ جو نتیجہ ہوگا دیکھا جائے گا۔ اور پھر تم دیکھو کہ ان مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ خواہ تم مجھے بزدل کہو، حالانکہ مَیں بزدل نہیں ہوں اِنِّي أَرَىٰ قَوْمًا مُسْتَمِيتِينَ[5] ۔ یعنی "مجھے تو یہ لوگ موت کے خریدار نظر آتے ہیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُور سے عتبہ کو دیکھا تو فرمایا "اگر لشکرِ کفار میں سے کسی میں شرافت ہے تو اس سُرخ اُونٹ کے سوار میں ضرور ہے۔ اگر یہ لوگ اس کی بات مان لیں تو ان کے لیے اچھا ہو"۔ لیکن جب حکیم بن حزام ابوجہل کے پاس آیا اور اُس سے یہ تجویز

---

[1] سورۃ انفال: ۴۵ [2] طبری و ابن سعد و ابن ہشام [3] سورہ انفال: ۴۹

[4] یہ ایک پردہ رکھنے کی بات تھی ورنہ دل میں رؤسار قریش خوب جانتے تھے کہ عمرو کے قتل کا تو صرف ایک بہانہ ہے ورنہ اصلی جلن اسلام کے نام کی ہے۔ [5] ابن ہشام و طبری

بیان کی تو وہ فرعونِ امت بھلا ایسی باتوں میں کب آنے والا تھا چھٹتے ہی بولا" اچھا اچھا اب عتبہ کو اپنے سامنے اپنے رشتہ دار نظر آنے لگے ہیں" اور پھر اس نے عمرو حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا" تم نے سُنا تمہارا حلیف عتبہ کیا کہتا ہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ تمہارے بھائی کا بدلہ گویا ہاتھ میں آیا ہوا ہے" عامر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور اُس نے عرب کے قدیم دستور کے مطابق اپنے کپڑے پھاڑ کر اور ننگا ہو کر چلانا شروع کیا" واعمراہ واعمراہ" ہائے افسوس! میرا بھائی بغیر انتقام کے رہا جاتا ہے۔ ہائے افسوس! میرا بھائی بغیر انتقام کے رہا جاتا ہے!! اس صحرائی آواز نے لشکرِ قریش کے سینوں میں عداوت کے شعلے بلند کر دیئے اور جنگ کی بھٹی اپنے پُورے زور سے دہکنے لگ گئی۔

ابوجہل کے طعنے نے عتبہ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس غصہ میں بھرا ہوا وہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے لڑکے ولید کو ساتھ لیکر لشکرِ کفار سے آگے بڑھا اور عرب کے قدیم دستور کے مطابق انفرادی لڑائی کے لیے مبارز طلبی کی۔ چند انصار ان کے مقابلہ کیلئے آگے بڑھنے لگے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روک دیا اور فرمایا" حمزہ تم اُٹھو۔ علی تم اُٹھو۔ عبیدہ تم اُٹھو" یہ تینوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت قریبی رشتہ دار تھے اور آپؐ چاہتے تھے کہ خطرہ کی جگہ پر سب سے پہلے آپؐ کے عزیز و اقارب آگے بڑھیں۔ دوسری طرف عتبہ وغیرہ نے بھی انصار کو دیکھ کر آواز دی کہ " ان لوگوں کو ہم کیا جانتے ہیں۔ ہماری ٹکر کے ہمارے سامنے آئیں" چنانچہ حمزہ اور علیؓ اور عبیدہ آگے بڑھے۔ عرب کے دستور کے مطابق پہلے روشناسی ہوئی۔ پھر عبیدۃ بن مطلب ولید کے مقابل ہو گئے اور حمزہ عتبہ کے اور علی شیبہ کے[۱] حمزہ اور علی نے تو ایک دو واروں میں ہی اپنے حریفوں کو خاک میں ملا دیا، لیکن عبیدۃ اور ولید میں دو چار اچھی ضربیں ہوئیں۔ اور بالآخر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ سے کاری زخم کھا کر گرے۔ جس پر حمزہ اور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر ولید کا تو خاتمہ کر دیا اور عبیدۃ کو اُٹھا کر اپنے کیمپ میں لے آئے۔ مگر عبیدہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے اور بدر سے واپسی پر راستہ میں انتقال کیا۔

اِن انفرادی مقابلوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر اپنے سائبان میں تشریف لے گئے اور جاتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ جب تک میں حکم نہ دوں عام دھاوا نہ کیا جائے اور فرمایا کہ" اگر کفار فوری حملہ کر کے آئیں تو پہلے تیروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرو، لیکن دیکھو تیر ذرا احتیاط سے چلانا۔ ایسا نہ ہو کہ یونہی بے فائدہ طور پر اپنے ترکش خالی کر دو اور تلوار صرف اس وقت نکالو کہ جب دونوں لشکر آپس میں مل جائیں" غالباً اسی موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مخاطب ہو کر یہ بھی فرمایا کہ لشکرِ کفار میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے دل کی خوشی سے اس مہم میں شامل نہیں ہوئے بلکہ رؤسائے قریش کے دباؤ کی وجہ سے شامل ہو گئے ہیں؛ ورنہ وہ دل میں ہمارے مخالف نہیں۔ اسی طرح بعض ایسے لوگ بھی اس لشکر میں شامل ہیں جنھوں نے مکہ میں ہماری مصیبت کے وقت میں ہم سے شریفانہ سلوک کیا تھا اور ہمارا فرض ہے کہ اُن کے احسان کا بدلہ اتاریں۔ پس اگر کسی ایسے شخص پر کوئی مسلمان

---

[۱] ابن ہشام ۔ [۲] ابوداؤد ۔

غلبہ پائے تو اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائے۔ اور آپؐ نے خصوصیت کے ساتھ قسم اوّل میں عباس بن عبدالمطلب اور قسم ثانی میں ابوالبختری کا نام لیا اور ان کے قتل سے منع فرمایا۔ مگر حالات نے کچھ ایسی ناگریز صورت اختیار کی کہ ابوالبختری قتل سے بچ نہ سکا گو اسے مرنے سے قبل اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل سے منع فرمایا ہے۔[۱] اس کے بعد آپؐ سائبان میں جاکر پھر دُعا میں مشغول ہوگئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے اور سائبان کے ارد گرد انصار کی ایک جماعت سعد بن معاذؓ کی زیر کمان پہرہ پر متعین تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میدان میں سے ایک شور بلند ہوا اور معلوم ہوا کہ قریش کے لشکر نے عام حملہ کردیا ہے۔ اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت رقت کی حالت میں خدا کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے دعائیں کر رہے تھے اور نہایت اضطراب کی حالت میں فرماتے تھے کہ:
اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَنْشُدُکَ عَھْدَکَ وَوَعْدَکَ اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃَ مِنْ اَھْلِ الْاِسْلَامِ لَاتُعْبَدْ فِی الْاَرْضِ "اے میرے خدا اپنے وعدوں کو پُورا کر۔ اے میرے مالک! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت آج اس میدان میں ہلاک ہوگئی تو دُنیا میں تجھے پُوجنے والا کوئی نہیں رہے گا۔"[۲] اور اس وقت آپؐ اس قدر کرب کی حالت میں تھے کہ کبھی آپؐ سجدہ میں گر جاتے تھے اور کبھی کھڑے ہوکر خُدا کو پکارتے تھے اور آپؐ کی چادر آپؐ کے کندھوں سے گر گر پڑتی تھی اور حضرت ابوبکرؓ اُسے اُٹھا اُٹھا کر آپؐ پر ڈال دیتے تھے۔[۳] حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ مجھے لڑتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آتا تھا تو میں آپؐ کے سائبان کی طرف بھاگا جاتا تھا، لیکن جب بھی میں گیا میں نے آپؐ کو سجدہ میں گڑگڑاتے ہوئے پایا۔ اور میں نے سُنا کہ آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ[۴] یعنی "اے میرے زندہ خدا! اے میرے زندگی بخش آقا!" حضرت ابوبکرؓ آپؐ کی اس حالت کو دیکھ کر بے چین ہوئے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی بے ساختہ عرض کرتے تھے "یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ آپؐ گھبرائیں نہیں۔ اللہ اپنے وعدے ضرور پورے کرے گا۔"[۵] مگر اس سچے مقولہ کے مطابق کہ ہر کہ عارف تراست ترساں تر" آپؐ برابر دُعا اور گریہ وزاری میں مصروف رہے۔

دُوسری طرف جب دونوں فوجیں ایک دُوسرے سے بھڑ گئیں تو ابوجہل رئیس قریش نے بھی یُوں دُعا کی کہ "اے خدا! وہ فریق جس نے رشتوں کو توڑ رکھا ہے اور دین میں ایک بدعت پیدا کی ہے تو آج اسے اس میدان میں تباہ و برباد کر۔"[۶] ایک دُوسری روایت[۷] میں آتا ہے کہ اس موقعہ پر یا اس سے قبل ابوجہل نے یہ دُعا کی تھی کہ "اے ہمارے رب اگر محمدؐ کا لایا ہوا دین سچا ہے تو آسمان سے ہم پر پتھروں کی بارش برسا یا کسی اور دردناک عذاب سے ہمیں تباہ و برباد کر۔"[۸]

---

[۱] طبری ٭ [۲] بخاری ومسلم ٭ [۳] مسلم وترمذی ٭ [۴] نسائی وابن سعد ٭ [۵] مسلم ٭
[۶] ابن ہشام ٭ [۷] بخاری تفسیر سورۃ انفال ٭ [۸] ابوجہل کی یہ دعائیں بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس مہم میں روسار قریش کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا تھا اور عمرو حضرمی کے قتل کا انتقام وغیرہ ایک محض بہانہ اور عامۃ الکفار کو جوش دلانے کا آلہ تھا۔

اب میدان کارزار میں کشت وخون کا میدان گرم تھا۔ مسلمانوں کے سامنے ان سے سہ چند جماعت تھی جو ہر قسم کے سامانِ حرب سے آراستہ ہو کر اس عزم کے ساتھ میدان میں نکلی تھی کہ اسلام کا نام ونشان مٹا دیا جاوے۔ اور مسلمان بیچارے تعداد میں تھوڑے۔ سامان میں تھوڑے۔ غربت اور بے وطنی کے صدمات کے مارے ہوئے ظاہری اسباب کے لحاظ سے اہل مکہ کے سامنے چند منٹوں کا شکار تھے۔ مگر توحید اور رسالت کی محبت نے انہیں متوالا بنا رکھا تھا اور اس چیز نے جس سے زیادہ طاقتور دُنیا میں کوئی چیز نہیں یعنی زندہ ایمان نے ان کے اندر ایک فوق العادت طاقت بھر دی تھی۔ وہ اس وقت میدانِ جنگ میں خدمتِ دین کا وہ نمونہ دکھا رہے تھے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ہر اک شخص دوسرے سے بڑھ کر قدم مارتا تھا اور خدا کی راہ میں جان دینے کے لیے بے قرار نظر آتا تھا۔ حمزہ اور علی اور زبیر نے دشمن کی صفوں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیں۔ انصار کے جوشِ اخلاص کا یہ عالم تھا کہ عبدالرحمٰن بن عوف روایت کرتے ہیں کہ جب عام جنگ شروع ہوئی تو مَیں نے اپنے دائیں بائیں نظر ڈالی۔ مگر کیا دیکھتا ہوں کہ انصار کے دو نوجوان لڑکے میرے پہلو بہ پہلو کھڑے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرا دل کچھ بیٹھ سا گیا کیونکہ ایسے جنگوں میں دائیں بائیں کے ساتھیوں پر لڑائی کا بہت انحصار ہوتا تھا۔ اور وہی شخص اچھی طرح لڑ سکتا ہے جس کے پہلو محفوظ ہوں۔ مگر عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ مَیں اس خیال میں ہی تھا کہ ان لڑکوں میں سے ایک نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا کہ گویا وہ دُوسرے سے اپنی یہ بات مخفی رکھنا چاہتا ہے کہ چچا وہ ابوجہل کہاں ہے جو مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دُکھ دیا کرتا تھا۔ مَیں نے خدا سے عہد کیا ہوا ہے کہ مَیں اُسے قتل کروں گا یا قتل کرنے کی کوشش میں مارا جاؤں گا۔ مَیں نے ابھی اس کا جواب نہ دیا تھا کہ دوسری طرف سے دُوسرے نے بھی اسی طرح آہستہ سے یہی سوال کیا۔ مَیں ان کی یہ جرأت دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ کیونکہ ابوجہل گویا سردارِ لشکر تھا اور اُس کے چاروں طرف آزمودہ کار سپاہی جمع تھے۔ مَیں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ وہ ابوجہل ہے۔ عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میرا اشارہ کرنا تھا کہ وہ دونوں بچے باز کی طرح جھپٹے اور دشمن کی صفیں کاٹتے ہوئے ایک آن کی آن میں وہاں پہنچ گئے اور اس تیزی سے وار کیا کہ ابوجہل اور اس کے ساتھی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور ابوجہل خاک پر تھا[۱]۔ عکرمہ بن ابوجہل بھی اپنے باپ کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے باپ کو تو بچا نہ سکا مگر اُس نے پیچھے سے معاذ پر ایسا وار کیا کہ اُن کا بایاں بازو کٹ کر لٹکنے لگ گیا۔ معاذ نے عکرمہ کا پیچھا کیا مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ چونکہ کٹا ہوا بازو لڑنے میں مزاحم ہوتا تھا۔ معاذ نے اُسے زور کے ساتھ کھینچ کر اپنے جسم سے الگ کر دیا اور پھر لڑنے لگ گئے[۲]۔ غرض کیا مہاجر اور کیا انصار سب مسلمان پورے زور وشور اور اخلاص کے ساتھ لڑے۔ مگر دشمن کی کثرت اور اس کے سامان کی زیادتی کچھ پیش نہ جانے دیتی تھی اور نتیجہ ایک عرصہ تک مشتبہ رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر دُعا وابتہال میں مصروف تھے اور آپ کا اضطراب لحظہ بلحظہ بڑھتا جاتا تھا۔ مگر آخر ایک کافی لمبے عرصہ کے بعد آپ

---

[۱] بخاری کتاب المغازی ؛

[۲] طبری ؛

سجدہ سے اُٹھے اور خدائی بشارت سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ کہتے ہوئے سائبان سے باہر نکل آئے[1]
باہر آکر آپؐ نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو کشت وخون کا میدان گرم پایا۔ اُس وقت آپؐ نے ریت اور کنکر کی ایک مُٹھی اٹھائی اور اُسے کفار کی طرف پھینکا[2] اور جوش کے ساتھ فرمایا۔ شَاھَتِ الْوُجُوْہُ "دشمنوں کے مُنہ بگڑ جائیں"[3] اور ساتھ ہی آپؐ نے مسلمانوں سے پکار کر فرمایا۔ یکدم حملہ کرو[4] مسلمانوں کے کانوں میں اپنے محبوب آقا کی آواز پہنچی اور انھوں نے تکبیر کا نعرہ لگا کر یکدم حملہ کر دیا۔ دوسری طرف ادھر آپؐ کا مُٹھی بھر کر ریت پھینکنا تھا کہ ایسی آندھی کا جھونکا آیا کہ کفار کی آنکھیں اور مُنہ اور ناک ریت اور کنکر سے بھرنے شروع ہو گئے[5] آپؐ نے فرمایا۔ یہ خدائی فرشتوں کی فوج ہے جو ہماری نصرت کو آئی ہے اور روایتوں میں مذکور ہے کہ اس وقت بعض لوگوں کو یہ فرشتے نظر بھی آئے۔ بہرحال عُتبہ، شیبہ اور ابوجہل جیسے رؤسا قریش تو خاک میں مِل ہی چکے تھے۔ مسلمانوں کے اس فوری دھاوے اور آندھی کے اچانک جھونکے کے نتیجہ میں قریش کے پاؤں اُکھڑنے شروع ہو گئے اور جلد ہی کفار کے لشکر میں بھاگڑ پڑ گئی اور تھوڑی دیر میں میدان صاف تھا۔ مسلمانوں نے ستر قیدی پکڑے اور جب لڑائی کے بعد مقتولین کی دیکھ بھال کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہی تعداد قریش کے مقتولین کی تھی اور جب مقتولین کی شناخت ہوئی تو قرآنی آیت وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکَافِرِیْنَ[6] کی ہیبت ناک تفسیر آنکھوں کے سامنے تھی یعنی تمام بڑے بڑے رؤسا قریش خاک میں ملے پڑے تھے اور جو ایک دو رئیس بچے تھے وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں قیدی تھے؛ البتہ شروع شروع میں ابوجہل کی لاش نظر نہ آتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی جا کر اچھی طرح دیکھے کہ ابوجہل کا کیا حال ہے۔ عبداللہ بن مسعود گئے اور دیکھ بھال کے بعد اُسے ایک جگہ جان توڑتے ہوئے پایا۔ جبکہ وہ قریباً ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ عبداللہ نے اُس سے پوچھا کیا تو ہی ابوجہل ہے؟ اُس نے کہا۔ ھَلْ فَوْقَ رَجُلٍ قَتَلْتُمُوْہُ۔ "کیا تم نے مجھ سے بھی کوئی بڑا شخص قتل کیا ہے؟" یعنی مَیں سب سے بڑا آدمی ہوں جو تم نے مارا ہے۔ پھر کہنے لگا لَوْ غَیْرَ اَکَّارٍ قَتَلَنِیْ[7] "کاش میں کسی کسان کے ہاتھ قتل نہ ہوتا[8]۔" پھر اس نے پُوچھا کہ میدان کس کے ہاتھ میں رہا ہے؟ عبداللہ نے جواب دیا۔ "خدا اور اس کے رسُول کے ہاتھ۔" اس کے بعد ابوجہل بالکل بے حس وحرکت ہو گیا اور جان دیدی[9] اور عبداللہ بن مسعود نے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے قتل کی اطلاع دی۔ امیہ بن خلف جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یعنی "لشکرِ کفار ضرور پسپا ہوگا اور پیٹھ دکھلائے گا۔" یہ قرآن کریم سورۃ قمر کی آیت: ۴۶ ہے جو کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے بطور پیشگوئی کے نازل ہوئی تھی اور اب خدا نے اسے آپ کی زبان پر دوبارہ جاری کر کے بتایا کہ کفار مکہ کے لیے اب وہی موعود ساعت آگئی ہے۔ [2] قرآن کریم سورۃ انفال: ۱۸ [3] طبری و زرقانی ۔ [4] طبری ۔
[5] زرقانی ۔ [6] یعنی خدا نے یہ لڑائی اس لیے کرائی تھی کہ کفار کی جڑ کاٹ دی جاوے ۔ [7] بخاری ۔
[8] یہ اس نے اس لیے کہا کہ اہلِ مکہ چونکہ زراعت کو بُرا سمجھتے تھے اس لیے بعض اوقات مدینہ کے لوگوں کو تحقیر کے لہجہ میں کسان کہا کرتے تھے ۔ [9] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۲۸ بحوالہ ابن عقبہ ۔

کی پیشگوئی کی وجہ سے مکہ سے نہیں نکلتا تھا، مگر جس کا دل عداوتِ اسلام اور بغضِ رسولؐ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا انجام یوں ہوا کہ جس وقت لشکرِ قریش پسپا ہوا۔ اُس نے اپنے جاہلیت کے دوست عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس پناہ ڈھونڈی جن کا اس کے ساتھ یہ معاہدہ تھا کہ وہ ایک دُوسرے کی حفاظت کریں گے، لیکن جونہی کہ بلالؓ کی نظر اُمیہ پر پڑی اُس نے شور مچا دیا کہ دیکھو یہ راُسُ الکفر بچکر نکلا جا رہا ہے جس پر چند انصاریوں نے اُس کا پیچھا کیا اور اُس کے ساتھ لڑکر اُسے مار کر گرا دیا بلکہ اُسے بچاتے بچاتے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بھی کسی قدر زخمی ہو گئے[1]

جب دُوسرے کاموں سے فراغت حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رؤسارِ قریش کو ایک جگہ جمع کر کے دفن کر دیا جاوے۔ چنانچہ ایک گڑھے میں چوبیس رؤسار کی لاشوں کو اکٹھا کر کے دفنا دیا گیا۔ اور دوسرے لوگوں کو اپنی اپنی جگہ پر دفن کر دیا گیا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عام طریق تھا کہ حتی الوسع کسی لاش کو کھلا نہیں رہنے دیتے تھے خواہ وہ دشمن ہی کی کیوں نہ ہو[2] واپسی سے قبل آپؐ اس گڑھے کے پاس تشریف لے گئے جس میں رؤسائے قریش دفن کئے گئے تھے اور پھر اُن میں سے ایک ایک کا نام لے کر پکارا اور فرمایا۔ هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَكُمُ اللّٰهُ حَقًّا فَاِنِّیْ وَجَدْتُّ مَا وَعَدَنِیَ اللّٰهُ حَقًّا۔ یعنی "کیا تم نے اس وعدہ کو حق پایا جو خدا نے میرے ذریعہ تم سے کیا تھا۔ تحقیق مَیں نے اس وعدہ کو حق پا لیا ہے جو خدا نے مجھ سے کیا تھا"[3] نیز فرمایا یَا اَھْلَ الْقَلِیْبِ بِئْسَ عَشِیْرَۃُ النَّبِیِّ کُنْتُمْ لِنَبِیِّکُمْ کَذَّبْتُمُوْنِیْ وَصَدَّقَنِیَ النَّاسُ وَاَخْرَجْتُمُوْنِیْ وَاٰوَانِیَ النَّاسُ وَقَاتَلْتُمُوْنِیْ وَنَصَرَنِیَ النَّاسُ[4] یعنی "اے گڑھے میں پڑے ہوئے لوگو! تم اپنے نبی کے بہت بُرے رشتہ دار بنے۔ تم نے مجھے جُھٹلایا اور دُوسرے لوگوں نے میری تصدیق کی۔ تم نے مجھے میرے وطن سے نکالا اور دُوسروں نے مجھے پناہ دی۔ تم نے میرے خلاف جنگ کی۔ اور دُوسروں نے میری مدد کی۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ یا رسُول اللہ! وہ اب مُردہ ہیں وہ کیا سُنیں گے۔ آپؐ نے فرمایا "میری یہ بات وُہ تم سے بھی بہتر سُن رہے ہیں۔" یعنی وہ اس عالم میں پہنچ چکے ہیں جہاں ساری حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے اور کوئی پردہ نہیں رہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات جو اوپر درج کئے گئے ہیں اپنے اندر ایک عجیب درد و اَلَم کی آمیزش رکھتے ہیں اور ان سے اس قلبی کیفیت کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس وقت آپؐ پر طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت قریش کی مخالفت کی گذشتہ تاریخ آپؐ کی آنکھوں کے سامنے تھی اور آپؐ عالمِ تخیل میں اس کا ایک ایک ورق اُٹھاتے جاتے تھے اور آپؐ کا دل ان اوراق کے مطالعہ سے بے چین تھا۔ آپؐ کے یہ الفاظ اس بات کا بھی یقینی ثبوت ہیں کہ اس سلسلہ جنگ کے آغاز کی ذمہ داری کلیۃً کفارِ مکہ پر تھی۔ جیسا کہ آپؐ کے الفاظ قَاتَلْتُمُوْنِیْ وَنَصَرَنِیَ النَّاسُ ۔ سے ظاہر ہے۔ یعنی "اے میری قوم کے لوگو! تم نے مجھ سے جنگ کی اور دُوسروں نے میری مدد کی۔ اور

---

[1] بخاری کتاب الوکالۃ ؛ [2] دار قطنی بحوالہ روض الانف ؛

[3] بخاری کتاب المغازی ؛ [4] طبری صفحہ ۱۳۳۲ ؛

کم ازکم ان الفاظ سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ یہی یقین رکھتے تھے کہ ان جنگوں میں ابتداء کفار کی طرف سے ہوئی ہے اور آپ نے مجبور ہو کر محض خود حفاظتی میں تلوار اٹھائی ہے۔

اپنے مقتولین کی دیکھ بھال ہوئی تو معلوم ہوا کہ کل چودہ آدمی شہید ہوئے ہیں۔ جن میں سے چھ مہاجرین میں سے تھے اور باقی انصار تھے۔ انہیں میں وہ مخلص بچہ عمیر وقاص بھی تھا جس نے روکر ساتھ آنے کی اجازت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ زخمی تو بہت سے صحابہ ہوئے تھے، لیکن یہ نقصان ایسا نہیں تھا کہ اس عظیم الشان دینی فتح کی خوشی کو مکدر کر سکتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ مسلمان شکر و امتنان کے جذبات سے معمور تھے۔ تین دن تک آپ نے بدر کی وادی میں قیام فرمایا۔ اور یہ وقت اپنے شہداء کی تکفین و تدفین اور اپنے زخمیوں کی مرہم پٹی میں گذرا۔ اور انہی دنوں میں غنیمت کے اموال کو جمع کر کے مرتب کیا گیا اور کفار کے قیدیوں کو جن کی تعداد ستر تھی محفوظ کر کے مختلف مسلمانوں کی سپردگی میں دے دیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تاکید کی کہ قیدیوں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کریں اور ان کے آرام کا خیال رکھیں۔ صحابہؓ نے جن کو اپنے آقا کی ہر خواہش کے پورا کرنے کا عشق تھا آپ کی اس نصیحت پر اس خوبی کے ساتھ عمل کیا کہ دُنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی؛ چنانچہ خود ان قیدیوں میں سے ایک قیدی ابوعزیز بن عمیر کی زبانی روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے انصار مجھے تو پکی ہوئی روٹی دیتے تھے، لیکن خود کھجور وغیرہ کھا کر گذارہ کر لیتے تھے اور کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ اُن کے پاس اگر روٹی کا چھوٹا ٹکڑا بھی ہوتا تھا تو وہ مجھے دے دیتے تھے اور خود نہیں کھاتے تھے اور اگر میں کبھی شرم کی وجہ سے واپس کر دیتا تھا تو وہ اصرار کے ساتھ پھر مجھی کو دے دیتے تھے[1] جن قیدیوں کے پاس لباس کافی نہیں تھا انہیں کپڑے مہیا کر دیئے گئے تھے؛ چنانچہ عباس کو عبداللہ بن اُبیّ نے اپنی قمیص دی تھی[2]۔

سر ولیم میور نے قیدیوں کے ساتھ اس مشفقانہ سلوک کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت کے ماتحت انصار و مہاجرین نے کفار کے قیدیوں کے ساتھ بڑی محبت اور مہربانی کا سلوک کیا؛ چنانچہ بعض قیدیوں کی اپنی شہادت تاریخ میں ان الفاظ میں مذکور ہے کہ "خدا بھلا کرے مدینہ والوں کا وہ ہم کو سوار کرتے تھے اور آپ پیدل چلتے تھے۔ ہم کو گندم کی پکی ہوئی روٹی دیتے تھے اور آپ صرف کھجوریں کھا کر پڑ رہتے تھے۔ اس لیے (میور صاحب لکھتے ہیں) ہم کو یہ معلوم کر کے تعجب نہ کرنا چاہئیے کہ بعض قیدی اس نیک سلوک کے اثر کے نیچے مسلمان ہو گئے اور ایسے لوگوں کو فوراً آزاد کر دیا گیا .... جو قیدی اسلام نہیں لائے اُن پر بھی اس نیک سلوک کا بہت اچھا اثر تھا۔"

یہ بھی روایت آتی ہے کہ جب یہ قیدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے گئے تو آپ نے فرمایا

---

[1] طبری و ابن ہشام حالات غزوہ بدر۔ [2] بخاری۔

کہ اگر آج مطعم بن عدی[1] زندہ ہوتا اور مجھ سے ان لوگوں کی سفارش کرتا تو میں ان کو یونہی چھوڑ دیتا۔[2] مطعم پکا مشرک تھا اور اسی حالت میں وہ مرا لیکن طبیعت میں شرافت کا مادہ رکھتا تھا؛ چنانچہ قریش کا ظالمانہ صحیفہ جس کی وجہ سے مسلمان شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیئے گئے تھے اُسے مطعم نے ہی چاک کیا تھا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس آئے تھے تو اس وقت بھی مطعم نے ہی آپؐ کو اپنی پناہ میں لیکر مکہ میں داخل کیا تھا۔ یہ اسی احسان کی یاد تھی جس سے متاثر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ جب کبھی کوئی شخص آپؐ کے ساتھ ذرا سا بھی نیک سلوک کرتا تھا تو آپؐ اس کے احسان کو کبھی نہیں بھولتے تھے اور آپؐ کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ آپؐ کو اس کے احسان کا عملی شکریہ ادا کرنے کا موقعہ ملتا رہے اور یہ نہیں تھا کہ دُنیا داروں کی طرح جب آپؐ ایک دفعہ کسی کے احسان کے جواب میں نیک سلوک کر لیتے تھے تو پھر یہ کہنے لگ جاتے تھے کہ بس اب احسان کا بدلہ اُتر گیا ہے۔ بلکہ جب کبھی کوئی شخص آپؐ کے ساتھ نیک سلوک کرتا تھا تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے آپؐ کو اپنا خاص محسن بنا لیتا تھا اور آپؐ کبھی بھی اس کے احسان کو اُترا ہوا نہیں سمجھتے تھے اور دراصل اعلیٰ اخلاق کا یہی تقاضا ہے۔ کیونکہ جس احسان کے نیچے انسان ایک دفعہ آجائے پھر اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ کسی جوابی احسان سے اس کا بدلہ اُتر سکتا ہے۔ ایک تجارتی لین دین تو کہلا سکتا ہے مگر ایک اخلاقی ذمہ داری سے عہدہ برآئی ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا۔

جو لوگ قید ہوئے تھے ان میں سے بعض رؤساء قریش میں سے تھے؛ چنانچہ النضر بن الحارث اور سُہیل بن عمرو مکہ کے بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ بعض قیدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت قریبی رشتہ دار تھے مثلاً عباس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ عقیل آپؐ کے چچازاد بھائی اور حضرت علی کے حقیقی بھائی تھے۔ ابوالعاص بن ربیع تھے جو آپؐ کی صاحبزادی زینب کے خاوند یعنی آپؐ کے داماد تھے۔ بعض مؤرخین نے قید ہونے والے رؤساء میں عقبہ بن ابی معیط کا نام بھی بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ماتحت حالتِ قید میں قتل کر دیا گیا تھا۔[3] مگر یہ درست نہیں ہے۔ حدیث[4] اور تاریخ میں نہایت صراحت کے ساتھ یہ روایت آتی ہے کہ عقبہ بن ابی معیط میدانِ جنگ میں قتل ہوا تھا اور ان رؤساء مکہ میں سے تھا جن کی لاشیں ایک گڑھے میں دفن کی گئی تھیں؛ البتہ نضر بن حارث کا حالتِ قید میں قتل کیا جانا اکثر روایات سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کے قتل کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ان بے گناہ مسلمانوں کے قتل کے براہِ راست ذمہ دار تھے جو مکہ میں کفار کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ اور اغلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حارث بن ابی ہالہ جو ابتداءِ اسلام میں نہایت ظالمانہ طور پر آنحضرت

---

[1] مُطعم مکہ کا ایک رئیس تھا جو کفر کی حالت میں مرگیا تھا۔ [2] بخاری کتاب المغازی۔

[3] بخاری کتاب الوضوء وکتاب سترۃ المصلی وکتاب الجہاد۔ [4] ابن سعد جلد ۴ صفحہ ۱۵۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے قتل کئے گئے تھے۔ان کے قتل کرنیوالوں میں نضر بن حارث بھی شامل تھا لیکن یہ یقینی ہے کہ نضر کے سوا کوئی قیدی قتل نہیں کیا گیا اور نہ ہی اسلام میں صرف دشمن ہونے اور جنگ میں خلاف حصہ لینے کی وجہ سے قیدیوں کے قتل کرنے کا دستور تھا؛ چنانچہ اس کے متعلق بعد میں ایک معین حکم بھی قرآن شریف میں نازل ہوا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ گو بہت سی روایات میں نضر بن حارث کے قتل کئے جانے کا ذکر آتا ہے لیکن بعض ایسی روایتیں بھی پائی جاتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ بدر کے بعد مدت تک زندہ رہا اور بالآخر غزوہ حنین کے موقعہ پر مسلمان ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہوگیا تھا۔ مگر مقدم الذکر روایات کے مقابلہ میں یہ روایتیں عموماً کمزور سمجھی گئی ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہرحال اگر قیدیوں میں سے کوئی شخص قتل کیا گیا تو وہ صرف نضر بن حارث تھا جو قصاص میں قتل کیا گیا تھا اور اس کے متعلق بھی یہ روایت آتی ہے کہ جب اس کے قتل کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی بہن کے وہ دردناک اشعار سُنے جن میں آپؐ سے رحم کی اپیل کی گئی تھی تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر یہ اشعار مجھے پہلے پہنچ جاتے تو مَیں نضر کو معاف کر دیتا۔ بہرحال نضر کے سوا کوئی قیدی قتل نہیں کیا گیا۔ بلکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکیدی حکم دیا تھا کہ قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاوے۔

بدر سے روانہ ہوتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو مدینہ کی طرف روانہ فرمایا تاکہ وہ آگے آگے جاکر اہلِ مدینہ کو فتح کی خوشخبری پہنچادیں؛ چنانچہ انہوں نے آپؐ سے پہلے پہنچ کر مدینہ والوں کو فتح کی خبر پہنچائی جس سے مدینہ کے صحابہ کو اگر ایک طرف اسلام کی عظیم الشان فتح ہونے کے لحاظ سے کمال درجہ خوشی ہوئی تو اس لحاظ سے کسی قدر افسوس بھی ہوا کہ اس عظیم الشان جہاد کے ثواب سے وہ خود محروم رہے۔ اس خوشخبری نے اس غم کو بھی غلط کر دیا جو زید بن حارثہ کی آمد سے تھوڑی دیر قبل مسلمانانِ مدینہ کو عموماً اور حضرت عثمانؓ کو خصوصاً رقیہ بنت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہنچا تھا جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے بیمار چھوڑ کر غزوہ بدر کے لئے تشریف لے گئے تھے اور جن کی وجہ سے حضرت عثمانؓ بھی شریک غزوہ نہیں ہوسکے۔

مدینہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے متعلق مشورہ کیا کہ ان کے متعلق کیا کرنا چاہیئے۔ عرب میں بالعموم قیدیوں کو قتل کر دینے یا مستقل طور پر غلام بنا لینے کا دستور تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر یہ بات سخت ناگوار گذرتی تھی۔ اور پھر ابھی تک اس بارہ میں کوئی الٰہی احکام بھی نازل نہیں ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میری رائے میں تو ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہیئے۔ کیونکہ آخر یہ لوگ اپنے ہی بھائی بند ہیں اور کیا تعجب کہ کل کو انہی میں سے فدایانِ اسلام پیدا ہو جائیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا

۱؎ اصابہ ذکر حارث ۔ ۲؎ سورۃ محمد:۵ نیز دیکھو کتاب الخراج صفحہ ۱۲۱ ۔

۳؎ زرقانی حالات غزوہ بدر اور اسد الغابہ ذکر نضر بن حارث ۔ ۴؎ ابن ہشام ۔

کہ دین کے معاملہ میں رشتہ داری کا کوئی پاس نہیں ہونا چاہیئے اور یہ لوگ اپنے افعال سے قتل کے مستحق ہو چکے ہیں۔ پس میری رائے میں ان سب کو قتل کر دینا چاہیئے بلکہ حکم دیا جاوے کہ مسلمان خود اپنے ہاتھ سے اپنے اپنے رشتہ داروں کو قتل کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فطری رحم سے متاثر ہو کر حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو پسند فرمایا اور قتل کے خلاف فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ جو مشرکین اپنا فدیہ وغیرہ ادا کر دیں انہیں چھوڑ دیا جاوے[1]۔ چنانچہ بعد میں اسی کے مطابق الٰہی حکم نازل ہوا[2]۔ چنانچہ ہر شخص کے مناسب حال ایک ہزار درہم سے لے کر چار ہزار درہم تک[3] اس کا فدیہ مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح سارے قیدی رہا ہوتے گئے عباس جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا تھے اور ان کو آپ سے اور آپ کو اُن سے بہت محبت تھی اُن کے متعلق انصار نے عرض کیا کہ یہ ہمارا بھانجہ[4] ہے۔ ہم انہیں بغیر فدیہ کے چھوڑ دیتے ہیں، لیکن گو قیدی کو بطور احسان کے چھوڑ دینا اسلام میں جائز بلکہ پسندیدہ تھا مگر اس موقعہ پر عباس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں مانا۔ اور فرمایا کہ عباس فدیہ ادا کریں تو تب چھوڑے جائیں[5]۔ عباس کے متعلق یہ بھی روایت آتی ہے کہ جب وہ مسجدِ نبوی میں بندھے ہوئے پڑے تھے تو رات کے وقت ان کے کراہنے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند نہیں آتی تھی انصار کو معلوم ہوا تو انہوں نے عباس کے بندھن ڈھیلے کر دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا اگر بندھن ڈھیلے کرتے ہو تو سب کے کرو۔ عباس کی کوئی خصوصیت نہیں؛ چنانچہ سارے قیدیوں کے بندھن ڈھیلے کر دیئے گئے۔ آنحضرت کے داماد ابوالعاص بھی اسیرانِ بدر میں سے تھے ان کے فدیہ میں اُن کی زوجہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینب نے جو ابھی تک مکہ میں تھیں کچھ چیزیں بھیجیں۔ اُن میں اُن کا ایک ہار بھی تھا۔ یہ ہار وہ تھا جو حضرت خدیجہ نے جہیز میں اپنی لڑکی زینب کو دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہار کو دیکھا تو مرحومہ خدیجہؓ کی یاد دل میں تازہ ہو گئی اور آپؐ چشم پُر آب ہو گئے اور صحابہ سے فرمایا اگر تم پسند کرو تو زینب کا مال اُسے واپس کر دو۔ صحابہ کو اشارہ کی دیر تھی زینب کا مال فوراً واپس کر دیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نقد فدیہ کے قائم مقام ابوالعاص کے ساتھ یہ شرط مقرر کی کہ وہ مکہ میں جا کر زینب کو مدینہ بھجوا دیں اور اس طرح ایک مومن رُوح دارِ کفر سے نجات پا گئی۔ کچھ عرصہ بعد ابوالعاص بھی مسلمان ہو کر مدینہ میں ہجرت کر آئے اور اس طرح خاوند بیوی پھر اکٹھے ہو گئے۔ حضرت زینب کی ہجرت کے متعلق یہ روایت آتی ہے کہ جب وہ مدینہ آنے کے لیے مکہ سے نکلیں تو مکہ کے چند قریش نے اُن کو بزور واپس لے جانا چاہا۔ جب انہوں نے انکار کیا تو ایک بدبخت ھبار بن اسود نامی نے نہایت

---

[1] مسلم کتاب الجہاد۔ ترمذی تفسیر سورۃ انفال و زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۴۰، ۴۴۱۔

[2] سورۃ محمد و کتاب الخراج صفحہ ۱۲۱ ؍؍

[3] ابن سعد ؍؍ [4] یاد ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پڑدادی مدینہ کی تھیں۔

[5] بخاری ؍؍

وحشیانہ طریق پر ان پر نیزے سے حملہ کیا جس کے ڈر اور صدمہ کے نتیجہ میں انہیں اسقاط ہو گیا[1] - بلکہ اس موقعہ پر ان کو کچھ ایسا صدمہ پہنچ گیا کہ اس کے بعد ان کی صحت کبھی بھی پورے طور پر بحال نہیں ہوئی اور بالآخر انہوں نے اسی کمزوری اور ضعف کی حالت میں بے وقت انتقال کیا[2]۔

قیدیوں میں جو غریب لوگ تھے اور فدیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت یونہی بطور احسان رہا کر دیئے گئے[3] مگر جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کی رہائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کے ساتھ مشروط فرمائی کہ وہ دس دس بچوں کو نوشت و خواند سکھادیں تو رہا کئے جاویں؛ چنانچہ زید بن ثابت نے جو بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب خاص کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اسی طرح لکھنا پڑھنا سیکھا تھا[4]۔

قیدیوں میں سہیل بن عمرو بھی تھا جو رؤسائے قریش میں سے تھا اور نہایت فصیح و بلیغ خطیب تھا اور عموماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لیکچر دیتا رہتا تھا۔ جب وہ بدر میں قید ہوا تو حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! سہیل بن عمرو کے اگلے دانت نکلوا دیئے جاویں تاکہ وہ آپ کے خلاف زہر نہ پھیلا سکے۔ مگر آپؐ نے اس تجویز کو بہت ناپسند کیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ عمرؓ تمہیں کیا معلوم ہے کہ خدا آئندہ اسے ایسے مقام پر کھڑا کرے جو قابلِ تعریف ہو؛ چنانچہ فتح مکہ کے موقعہ پر سہیل مسلمان ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اُس نے متزلزل لوگوں کو بچانے کے لیے اسلام کی تائید میں نہایت پُراثر خطبے دیئے جس سے بہت سے ڈگمگاتے ہوئے لوگ بچ گئے اور اسی سہیل کے متعلق روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں وہ اور ابوسفیان اور بعض دُوسرے رؤسائے مکہ جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوتے تھے حضرت عمرؓ کو ملنے کے لیے گئے۔ اتفاق سے اسی وقت بلالؓ اور عمارؓ اور صہیبؓ وغیرہ بھی حضرت عمرؓ سے ملنے کے لیے آگئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو غلام رہ چکے تھے اور بہت غریب تھے مگر ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ابتداء میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع دی گئی تو انھوں نے بلال وغیرہ کو پہلے ملاقات کے لیے بلایا۔ ابوسفیان نے جس کے اندر غالباً ابھی تک کسی قدر جاہلیت کی رگ باقی تھی۔ یہ نظارہ دیکھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی؛ چنانچہ کہنے لگا "یہ ذلت بھی ہمیں دیکھنی تھی کہ ہم انتظار کریں اور ان غلاموں کو شرفِ ملاقات بخشا جاوے۔" سہیل نے فوراً سامنے سے جواب دیا کہ "پھر یہ کس کا قصور ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سب کو خدا کی طرف بلایا۔ لیکن انہوں نے فوراً مان لیا اور ہم نے دیر کی پھر ان کو ہم پر فضیلت حاصل ہو یا نہ ہو؟"[5] قیدیوں میں ایک شخص ولید بن ولید تھا۔

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰ حالات عباس بن عبدالمطلب ﴿ [2] ابوداؤد ﴿ [3] ابن ہشام
[4] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۱۵ ﴿ [5] اصابہ و اسدالغابہ حالات سہیل بن عمرو ﴿

جو مکہ کے رئیسِ اعظم ولید بن مغیرہ کا لڑکا اور خالد بن ولید کا بھائی تھا۔ صحابہ نے اس سے چار ہزار درہم فدیہ مانگا جو اس کے بھائیوں نے ادا کر دیا اور ولید رہا ہو کر مکہ پہنچ گیا۔ مکہ میں پہنچ کر ولید نے اسلام کا اظہار کر دیا۔ اس کے بھائی اس پر سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ تُو نے مسلمان ہی ہونا تھا تو فدیہ کیوں ادا کیا۔ ولید نے جواب دیا کہ میں نے اس لیے فدیہ ادا کرنے کے بعد اسلام کا اظہار کیا ہے کہ تا لوگ یہ خیال نہ کریں کہ میں فدیہ سے بچنے کے لیے مسلمان ہوا ہوں۔ اس کے بعد مکہ والوں نے ولید کو اپنے پاس قید کر لیا اور سخت تکالیف پہنچائیں مگر وہ ثابت قدم رہا اور آخر کچھ عرصہ کے بعد موقعہ پا کر مدینہ بھاگ آیا[1]

مکہ میں جب لشکرِ قریش کی شکست اور رؤسائے قریش کی ہلاکت کی خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا اس حالت کو دیکھ کر ابوسفیان اور بعض دوسرے ذی اثر قریش نے اعلان کروایا کہ کوئی شخص اس وقت تک مقتولینِ بدر پر نوحہ نہ کرے جبتک کہ ہم لوگ مسلمانوں سے بدر کا بدلہ نہ لے لیں اور اس طرح عامۃ الناس کے جوشِ نوحہ کو انتقام کی تیاری میں لگا دیا گیا۔ مگر بدر کا صدمہ ایسا نہ تھا کہ عرب کی فطرت اسے آسانی سے دبا سکتی۔ چند دن کے صبر و خاموشی کے بعد پھر گھر گھر سے صدائے ماتم بلند ہونی شروع ہوئی اور بدر کے مقتول مکہ کی گلی کوچوں میں برملا طور پر پیٹے جانے لگے۔ عرب کی سی آتشی فطرت اور پھر بدر کی سی تباہی اس کے نتیجہ میں جو ماتم بھی ہو سکتا تھا وہ ہوا اور برابر ایک ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ شروع شروع میں جبکہ قریش اظہارِ ماتم سے رُکے ہوئے تھے اور پھر اپنے جوشِ ماتم کو دبا نہ سکنے کی وجہ سے پھوٹ پڑے اس وقت کی ایک مثال روایات میں خاص طور پر مذکور ہوئی ہے اور ناظرین کی بصیرت کے لیے ہم اُسے یہاں درج کرتے ہیں۔ اسود بن عبد یغوث مکہ کا ایک رئیس تھا اس کے دو لڑکے اور ایک پوتا جنگِ بدر میں مارے گئے تھے مگر رؤسائے قریش کے فیصلہ کی وجہ سے وُہ خاموش تھا اور فرطِ غم سے اندر ہی اندر گھُلا جاتا تھا۔ ایک رات اس نے اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے باہر گلی میں سے رونے چلانے کی آواز سُنی۔ اُس آواز نے اُسے بے چین کر دیا اور اُس نے اپنے نوکر کو بُلا کر کہا۔ دیکھو تو یہ آواز کیسی ہے۔ شاید رؤسائے قریش نے ماتم کرنے کی اجازت دیدی ہے۔ اگر یہ دُرست ہے تو میرے سینے میں ایک آگ لگ رہی ہے میں بھی جی کھول کر رو لوں کہ دل کا کچھ بخار تو نکل جاوے۔ نوکر گیا اور خبر لایا کہ ایک عورت کا اُونٹ کھویا گیا ہے اور وہ اس پر نوحہ کر رہی ہے۔ شاعری عرب کی فطرت میں تھی اسود کے مُنہ سے بے اختیار یہ شعر نکلے اور دبے ہوئے جذبات پھوٹ کر باہر آ گئے ؎

اَتَبْکِیْ اَنْ یُّضِلَّ لَهَا بَعِیْرٌ	وَیَمْنَعُهَا مِنَ النَّوْمِ السُّهُوْدُ
فَلَا تَبْکِیْ عَلٰی بَکْرٍ وَلٰکِنْ	عَلٰی بَدْرٍ تَقَاصَرَتِ الْجُدُوْدُ
وَبَکِّیْ اِنْ بَکَیْتِ عَلٰی عَقِیْلٍ	وَبَکِّیْ حَارِثًا اَسَدَ الْاُسُوْدِ

---

[1] اسد الغابہ و اصابہ حالات ولید بن ولید ۔

یعنی "کیا وہ عورت اس بات پر رو رہی ہے کہ اس کا ایک اُونٹ کھو یا گیا ہے اور اس نقصان کا غم اُسے رات کو سونے نہیں دیتا۔ اے عورت! تُو اس اُونٹ پر کیا روتی ہے۔ رو بدر پر جہاں کہ ہماری قسمت نے یاوری نہ کی۔ ہاں! اگر تُو نے رونا ہے تو رو میرے عقیل پر اور رو میرے حارث پر جو شیروں کا شیر تھا۔"[1]

غرض اس طرح ماتم کے رُکے رہنے کا اعلان دھرے کا دھرا رہ گیا اور ایک ایک کر کے سارے قریش ماتم کی رَو میں بہ گئے۔ صرف ایک گھر تھا جو خاموش تھا اور وہ ابوسفیان کا گھر تھا۔ ابوسفیان کی بیوی ہند قریش کے رئیس اعظم عتبہ بن ربیعہ کی لڑکی تھی اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بدر کے میدان میں عتبہ اور اس کا لڑکا ولید اور اس کا بھائی شیبہ سب خاک میں مل چکے تھے، مگر مردانہ صفت ہند نے ایک لفظ بھی نوحہ کا اپنے مُنہ سے نکلنے نہیں دیا۔ لوگ آ آ کر اس سے پُوچھتے تھے کہ اے ہند! تو کیوں خاموش ہے۔ ہند جواب دیتی تھی کہ "اگر آنسو میرے غم کی آگ کو بجھا سکتے تو مَیں بھی روتی لیکن مَیں جانتی ہوں کہ آنسو میری آگ کو نہیں بجھا سکتے اب یہ آگ اسی وقت بجھے گی کہ تم لوگ پھر محمدؐ کے خلاف میدان میں نکلو اور بدر کا بدلہ لو۔"[2]

جنگِ بدر کا اثر کفار اور مسلمانوں ہر دو کے لیے نہایت گہرا اور دیرپا ہوا اور اسی لیے تاریخ اسلام میں اس جنگ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے حتّٰی کہ قرآن شریف میں اس جنگ کا نام یوم الفرقان رکھا گیا ہے۔ یعنی وہ دن جبکہ اسلام اور کُفر میں ایک کُھلا کُھلا فیصلہ ہو گیا۔ بیشک جنگِ بدر کے بعد بھی قریش اور مسلمانوں کی باہم لڑائیاں ہوئیں اور خوب سخت سخت لڑائیاں ہوئیں اور مسلمانوں پر بعض نازک نازک موقعے بھی آئے، لیکن جنگِ بدر میں کفار مکہ کی ریڑھ کی ہڈی ٹُوٹ چکی تھی جسے بعد کا کوئی جرّاحی عمل مستقل طور پر دُرست نہیں کر سکا۔ تعداد مقتولین کے لحاظ سے بیشک یہ کوئی بڑی شکست نہیں تھی۔ قریش جیسی قوم میں سے ستّر بہتّر سپاہیوں کا مارا جانا ہرگز قومی تباہی نہیں کہلا سکتا۔ جنگِ اُحد میں یہی تعداد مسلمان مقتولین کی تھی، لیکن یہ نقصان مسلمانوں کے فاتحانہ رستہ میں ایک عارضی روک بھی ثابت نہیں ہوا۔ پھر وہ کیا بات تھی کہ جنگِ بدر یوم الفرقان کہلائی؟ اس سوال کے جواب میں بہترین الفاظ وہ ہیں جو قرآن شریف نے بیان فرمائے اور وہ یہ ہیں۔ یَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ۔ واقعی اس دن کفار کی جڑ کٹ گئی۔ یعنی جنگِ بدر کی ضرب کفار کی جڑ پر لگی اور وہ دو ٹکڑے ہو گئی۔ اگر یہی ضرب بجائے جڑ کے شاخوں پر لگتی تو خواہ اس سے کتنا گُنا زیادہ نقصان کرتی وہ نقصان اس نقصان کے مقابلہ میں ہیچ ہوتا، لیکن جڑ کی ضرب نے ہرے بھرے درخت کو دیکھتے دیکھتے ایندھن کا ڈھیر کر دیا۔ اور صرف وہی شاخیں بچیں، جو خشک ہونے سے پہلے دُوسرے درخت سے پیوند ہو گئیں۔ پس بدر کے میدان میں قریش کے نقصان کا پیمانہ یہ نہیں تھا کہ کتنے آدمی مرے بلکہ یہ تھا کہ کون کون مرے اور جب ہم اس نقطۂ نگاہ سے قریش کے مقتولین پر نظر ڈالتے ہیں تو اس بات میں ذرا بھی شک و شُبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ بدر میں فی الواقعہ قریش کی

---

[1] ابن ہشام ٭ [2] مغازی الرسول واقدی ٭

جڑ کٹ گئی۔ عتبہ اور شیبہ اور اُمیّہ بن خلف اور ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث وغیرہ قریش کی قومی زندگی کی رُوحِ رواں تھے اور یہ رُوح بدر کی وادی میں قریش سے ہمیشہ کے لیے پرواز کر گئی اور وہ ایک قالب بے جان کی طرح رہ گئے۔ یہ وہ تباہی تھی جس کی وجہ سے جنگِ بدر یومِ فرقان کے نام سے موسوم ہوئی اور خود قریش بھی اس نقصان کے اندازہ کو خوب سمجھتے تھے، چنانچہ قریش کا ایک معزز شاعر بدر کے مقتولین کا نوحہ کرتا ہوا کہتا ہے اور کیا خوب کہتا ہے ؎

اَلَا قَدْ سَادَ بَعْدَهُمْ اُنَاسٌ   وَلَوْلَا یَوْمُ بَدْرٍ لَمْ یَسُوْدُوْا

"ان رؤساء قریش کے بعد کہ جو بدر کے دن مارے گئے ایسے لوگ قومی ریاست کے مسند پر بیٹھے ہیں کہ اگر بدر کا دن نہ ہوتا تو یہ لوگ ہرگز رئیس نہ بن سکتے۔"[1] اللہ اللہ کیا تباہی تھی جو اس قوم پر آئی! بدر کی شکست کیا تھی کہ گویا قوم رانڈ ہوگئی۔ بے شک رؤساء زادے اب بھی قریش میں کافی موجود تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو ریاست کی صفِ دوم میں شمار کیے جا سکتے تھے، مگر وہ چوٹی کے سردار جو اسلام کے خلاف معاندانہ کارروائیوں کی رُوحِ رواں تھے اور جن کے پیچھے اُن کی قوم باوجود عرب کی فطری آزادی کے اس معاملہ میں گویا بھیڑوں کی طرح چلتی تھی۔ سب کے سب خاک میں مل گئے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں کوئی خاص تقدیر کام کر رہی تھی کیونکہ ابولہب جو بدر کی جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا مگر جو مخالفینِ اسلام کی صفِ اول میں تھا وہ بھی ہلاکت سے نہیں بچا کیونکہ بدر کے چند دن بعد ہی وہ مکہ میں ایک مکروہ بیماری میں مبتلا ہوا اور نہایت ذلت کی موت مر کر اپنے اُن ساتھیوں سے جا ملا جو بدر میں مارے گئے تھے۔[2] اب لے دے کے صرف ایک ابوسفیان رہ گیا تھا جسے شاید اس کی قسمت نے فتح مکہ کے موقعہ پر مسلمان ہونے کے لیے بچا لیا تھا۔ اور بدر کے بعد اُسی کے سر پر قریش کی سرداری کا تاج رکھا گیا تھا۔ بدر کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے سر ولیم میور لکھتے ہیں:-

"بدر کے حالات میں ایسی باتوں کا بہت کچھ عنصر نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے محمدؐ صاحب اس فتح کو جائز طور پر خدائی تقدیر کا کرشمہ شمار کر سکتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ یہ فتح بہت نمایاں اور فیصلہ کن تھی بلکہ اس جنگ میں غیر معمولی طور پر محمدؐ (صلعم) کے اکثر بااثر دشمن خاک میں مل گئے تھے۔ ان رؤساء مکہ کے علاوہ جو جنگ میں قتل کیے گئے یا قید کر لیے گئے تھے ابولہب جو جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا وہ بھی قریش کی بھگوڑی فوج کے مکہ پہنچنے کے چند دن بعد ہی مکہ میں مر گیا۔ گویا کہ وہ خدائی حکم جس کی مار رؤساء مکہ پر پڑی ایک اٹل تقدیر تھی۔"[3]

دوسری طرف جنگِ بدر کے نتیجے میں مسلمانوں کی پوزیشن نمایاں طور پر مضبوط ہوگئی تھی کیونکہ اول تو اس عظیم الشان اور غیر متوقع فتح کی وجہ سے قبائلِ عرب پر مسلمانوں کا ایک قسم کا رُعب بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے خود مسلمانوں

---

[1] ابن ہشام۔ [2] ابن ہشام و طبری۔ [3] لائف آف محمد صفحہ ۲۲۸۔ صفحہ ۲۲۹۔

کی ہمتیں بھی لازماً بلند ہوگئی تھیں اور ایک جائز رنگ خود اعتمادی کا پیدا ہوگیا تھا۔ اس فتح کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ منافقین مدینہ مرعوب ہوکر دب گئے اور چونکہ یہ فتح بالکل غیر متوقع حالات میں حاصل ہوئی تھی اور فریقین کے لیے اپنے نتائج اور اثرات کے لحاظ سے ایک عظیم الشان قومی یادگار تھی اس لیے مسلمانوں میں جنگِ بدر ایک خاص نظر سے دیکھی جانے لگی؛ چنانچہ جن صحابہ نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا وہ دُوسروں سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ ایک بدری صحابی سے کوئی سخت غلطی سرزد ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے اُسے ایک قومی غدار سمجھ کر (حالانکہ دراصل وہ ایک مخلص صحابی تھا مگر اس سے یہ غلطی ہوگئی تھی) اُسے سزا دینی چاہی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ اور فرمایا کہ "عمر! تم جانتے نہیں ہو کہ یہ شخص بدری ہے اور بدریوں کی اس قسم کی غلطیاں اللہ کے نزدیک معاف ہیں"[1] حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی جب صحابہ کے وظیفے مقرر ہوئے تو بدری صحابیوں کا وظیفہ ممتاز طور پر خاص مقرر کیا گیا خود بدری صحابہؓ بھی جنگِ بدر کی شرکت پر خاص فخر کرتے تھے؛ چنانچہ میور صاحب لکھتے ہیں:

"بدری صحابی اسلامی سوسائٹی کے اعلیٰ ترین رکن سمجھے جاتے تھے۔ سعد بن ابی وقاص جب اسّی سال کی عمر میں فوت ہونے لگے تو انھوں نے کہا کہ مجھے وہ چوغہ لاکر دو جو مَیں نے بدر کے دن پہنا تھا اور جسے مَیں نے آج کے دن کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ یہ وہی سعدؓ تھے جو بدر کے زمانہ میں بالکل نوجوان تھے اور جن کے ہاتھ پر بعد میں ایران فتح ہوا اور جو کوفہ کے بانی اور عراق کے گورنر بنے مگر اُن کی نظر میں یہ تمام عزتیں اور فخر جنگِ بدر میں شرکت کے عزت و فخر کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھیں اور جنگِ بدر والے دن کے لباس کو وہ اپنے واسطے سب خلعتوں سے بڑھ کر خلعت سمجھتے تھے اور ان کی آخری خواہش یہی تھی کہ اسی لباس میں لپیٹ کر اُن کو قبر میں اُتارا جاوے"[2]

خدا نے بھی قرآن شریف میں جنگِ بدر کے تذکرہ کو خاص اہمیت دی ہے اور سورۃ انفال گویا ساری کی ساری اسی کے بیان میں ہے اور بدر کے متعلق جو پیشگوئی مکہ میں ہوئی تھی وہ بھی نمایاں طور پر قرآن شریف میں بیان ہوئی ہے؛ چنانچہ سورۃ قمر میں اس کا ان الفاظ میں ذکر ہے: اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝ سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَۃُ مَوْعِدُھُمْ وَالسَّاعَۃُ اَدْھٰی وَاَمَرُّ ...... یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ[3] یعنی "کیا یہ کفار کہتے ہیں کہ ہم انتقام لینے کے لیے جمع ہوتے ہیں؟ یہ لشکر ضرور پسپا ہوگا اور پیٹھ دکھائے گا بلکہ یہ گھڑی ان کے عذاب کی گھڑی ہوگی۔ اور یہ وقت ان پر سخت کڑا اور کڑوا وقت ہوگا اس وقت یہ لوگ آگ یعنی جنگ میں اپنے مُنہ کے بل گھسیٹے جائیں گے اور اُن سے کہا جائے گا کہ لو اب اس آگ کا عذاب چکھو" کیا یہ پیشگوئی لفظ بلفظ پوری نہیں ہوئی؟ پھر صحفِ گذشتہ میں بھی بدر کا تذکرہ

---

[1] بخاری حالاتِ بدر۔
[2] لائف آف محمدؐ مصنفہ ولیم میور صفحہ ۲۲۶، ۲۲۷۔
[3] سورۃ القمر: ۴۵ تا ۴۹۔

مخصوص طور پر موجود ہے؛ چنانچہ کتاب یسعیاہ[1] میں "عرب کے متعلق الہامی کلام" کے عنوان کے نیچے یہ پیشگوئی درج ہے:

"عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے۔ اے ددانیوں کے قافلو! پانی لیکر پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کر بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں[2]۔ کیونکہ خداوند نے مجھ سے یوں فرمایا۔ ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ٹھیک ایک برس[3]۔ قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیراندازوں کی جو باقی رہی قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔"

الغرض یہ جنگ تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم اور عظیم الشان واقعہ ہے اور اسکے اثرات کفار اور مسلمانوں ہر دو کے واسطے نہایت گہرے اور دیرپا ثابت ہوئے اور جہاں کفار مکہ کی جڑ کٹ گئی وہاں ظاہری اسباب کے لحاظ سے مسلمانوں کی جڑ زمین میں قائم ہوگئی لیکن اگر ایک لحاظ سے جنگ بدر کے یہ خوش کن ثمرات مسلمانوں کیلئے پیدا ہوئے تو دوسرے لحاظ سے وقتی طور پر مسلمانوں کے خطرات بھی بدر کے بعد زیادہ ہوگئے۔ کیونکہ لازماً بدر کی تباہی کی وجہ سے کفار مکہ کے سینے جذبہ انتقام سے بھر گئے اور چونکہ اب قریش کے قومی کاموں کا حل وعقد زیادہ تر نوجوانوں کے ہاتھ میں تھا جو طبعاً زیادہ جوشیلے اور عواقب کی طرف سے بے پروا ہوتے ہیں اس لیے بدر کے بعد مدینہ پر کفار کے حملہ کا خطرہ زیادہ مہیب صورت اختیار کر گیا۔ دوسری طرف دوسرے قبائل عرب جہاں جنگ بدر سے مرعوب ہوتے وہاں مسلمانوں کی طرف سے اُن کا فکر آگے سے بھی زیادہ بڑھ گیا اور انھوں نے یہ خیال کرنا شروع کیا کہ اگر اسلام کو مٹانے اور مُسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی کوئی صورت جلدی نہ ہوئی تو یہ قوم ملک میں اس قدر مضبوط ہو جائے گی کہ پھر اس کا مٹانا ناممکن ہوگا، اس لیے جنگ بدر کے نتیجہ میں ان کی معاندانہ کوششیں زیادہ عملی اور خطرناک صورت اختیار کر گئیں اور یہودانِ مدینہ بھی چونک کر ہوشیار ہوگئے۔ ایک اور خطرناک نتیجہ بدر کا یہ نکلا کہ کفار مکہ جو ابتک صرف ظاہری زور اور گھمنڈ پر لڑ رہے تھے اب ایک کھلے میدان میں مسلمانوں سے زک اُٹھا کر مخفی اور دَر پردہ سازشوں کی طرف بھی مائل ہونے لگ گئے؛ چنانچہ ذیل کا تاریخی واقعہ جو جنگ بدر کے صرف چند دن بعد وقوع میں آیا اس خطرہ کی ایک بیّن مثال ہے لکھا ہے کہ بدر کے چند دن بعد عُمیر بن وہب اور صفوان بن امیہ بن خلف جو ذی اثر قریش میں سے تھے صحنِ کعبہ میں بیٹھے ہوئے مقتولین بدر کا ماتم کر رہے تھے کہ اچانک صفوان نے عُمیر سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اب تو جینے کا کوئی مزا نہیں رہا۔"

---

[1] یسعیاہ باب ۲۱ آیات ۱۳ تا ۱۷۔ [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا کیا خوب نقشہ ہے۔

[3] مزدور کا دن اصل دن سے کچھ چھوٹا ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم اس معیار کو مزدور کے دن کے حساب سے ایک سال کہہ رہے ہیں ورنہ اصل میعاد اس سے کچھ زیادہ ہوگی؛ چنانچہ بدر کی جنگ ہجرت کے ایک سال اور چند ماہ بعد واقع ہوئی۔

عمیر نے اشارہ تاڑا اور جواب دیا کہ "مَیں تو اپنی جان خطرہ میں ڈالنے کو تیار ہوں لیکن بچوں اور قرض کا خیال مجھے مانع ہو جاتا ہے، ورنہ معمولی بات ہے مدینہ جا کر چپکے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کر آؤں اور میرے لیے وہاں جانے کا یہ بہانہ بھی موجود ہے کہ میرا لڑکا اُن کے پاس قید ہے۔" صفوان نے کہا "تمہارے قرض اور بچوں کا مَیں ذمہ دار ہوتا ہوں تم ضرور جاؤ اور جس طرح بھی ہو یہ کام کر گذرو۔" غرض تجویز پختہ ہو گئی اور صفوان سے رخصت ہو کر عمیر اپنے گھر آیا اور ایک تلوار زہر میں بجھا کر مکہ سے نکل کھڑا ہوا جب وہ مدینہ پہنچا تو حضرت عمرؓ نے جو ان باتوں میں بہت ہوشیار تھے اُسے دیکھ کر خوفزدہ ہوئے اور فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ عمیر آیا ہے اور مجھے اس کے متعلق اطمینان نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اُسے میرے پاس لے آؤ۔ حضرت عمرؓ اُسے لینے کے لیے گئے۔ مگر جاتے ہوئے بعض صحابہ سے کہہ گئے کہ مَیں عمیر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملانے کے لیے لاتا ہوں، مگر مجھے اس کی حالت مشتبہ معلوم ہوتی ہے تم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ اور چوکس رہو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ عمیر کو ساتھ لیے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے اُسے نرمی کے ساتھ اپنے پاس بٹھا کر پوچھا "کیوں عمیر کیسے آنا ہوا؟" عمیر نے کہا "میرا لڑکا آپ کے ہاتھ میں قید ہے۔ اُسے چھڑانے آیا ہوں۔" آپؐ نے فرمایا "تو پھر یہ تلوار کیوں حمائل کر رکھی ہے؟" اُس نے کہا "آپؐ تلوار کا کیا کہتے ہیں۔ بدر میں تلواروں نے کیا کام دیا۔" آپؐ نے فرمایا نہیں ٹھیک ٹھیک بات بتاؤ کہ کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا بات وہی ہے جو مَیں کہہ چکا ہوں کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "اچھا تو گویا تم نے صفوان کے ساتھ مل کر صحن کعبہ میں کوئی سازش نہیں کی؟" عمیر سناٹے میں آگیا۔ مگر سنبھل کر بولا "نہیں مَیں نے کوئی سازش نہیں کی۔" آپؐ نے فرمایا "کیا تم نے میرے قتل کا منصوبہ نہیں کیا؟ مگر یاد رکھو خدا تمہیں مجھ تک پہنچنے کی توفیق نہیں دے گا۔" عمیر ایک گہرے فکر میں پڑ گیا اور پھر بولا "آپؐ سچ کہتے ہیں۔ ہم نے واقعی یہ سازش کی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے خدا آپؐ کے ساتھ ہے جس نے آپؐ کو ہمارے ارادوں سے اطلاع دیدی ورنہ جس وقت میری اور صفوان کی بات ہوئی تھی اسوقت وہاں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا اور شاید خدا نے یہ تجویز میرے ایمان لانے ہی کے لیے کروائی ہے۔ اور میں سچے دل سے آپؐ پر ایمان لاتا ہوں۔" آپؐ عمیر کے اسلام سے خوش ہوئے اور صحابہ سے فرمایا "اب یہ تمہارا بھائی ہے اسے اسلام کی تعلیم سے آگاہ کرو اور اس کے قیدی کو چھوڑ دو۔" الغرض عمیر بن وہب مسلمان ہو گئے اور بہت جلد انھوں نے ایمان و اخلاص میں نمایاں ترقی کر لی اور بالآخر نور صداقت کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باصرار عرض کیا کہ مجھے مکہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ مَیں وہاں کے لوگوں کو جا کر تبلیغ کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی اور عمیر نے مکہ پہنچ کر اپنے جوش تبلیغ سے کئی لوگوں کو خفیہ خفیہ مسلمان بنا لیا صفوان جو دن رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی خبر سُننے کا منتظر تھا اور قریش سے کہا کرتا تھا کہ اب تم ایک خوشخبری سننے کے لیے تیار رہو۔ اُس نے جب یہ نظارہ

دیکھا تو بے خود سا رہ گیا۔[1]

اگر اس جگہ کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کس طرح علم ہوگیا کہ عمیر اس نیت سے آیا ہے تو اس کا سیدھا اور سادہ جواب یہ ہے کہ جس خدا نے آپؐ کو دُنیا کی اصلاح کے لیے نبی بنا کر بھیجا تھا اور جس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے اُسی نے آپ کو اطلاع دیدی۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ آپ کوئی معمولی انسان نہ تھے بلکہ آپؐ کو خدا کی طرف سے نبی اور رسول بلکہ خاتم النبیینؐ ہونے کا دعویٰ تھا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آپؐ کی سیرت وسوانح کا منہاج نبوت کی روشنی میں مطالعہ کیا جاوے۔ پس جس طرح ضرورتِ زمانہ کے ماتحت دُوسرے انبیاء ومرسلین کو اللہ غیب کی باتوں پر آگاہ کرتا رہا ہے اور اُن کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً خوارق ومعجزات ظاہر ہوتے رہے ہیں اسی طرح ضروری تھا کہ آپؐ کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ اپنے علم وقدرت کی مخفی طاقتوں کا اظہار کرے اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر ہم دنیا کی دوسری باتوں کو معتبر لوگوں کی شہادت کی وجہ سے مانتے ہیں تو آیات ومعجزات کو معتبر شہادت کے ہوتے ہوئے نہ مانیں۔ البتہ جس طرح دوسری باتوں میں تحقیق کے بعد ایک بات کو مانا جاتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ آیات ومعجزات کے متعلق پوری پوری تحقیق سے کام لیا جاوے اور صرف اسی بات کو مانا جاوے جو معتبر شہادت سے پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہو تاکہ غلط اور موضوع قصے صحیح تاریخ کا حصہ نہ قرار پا جائیں مگر یہ ایک نازک اور اہم مسئلہ ہے جس کے متعلق مفصل بحث انشاء اللہ کسی اور موقعہ پر آئے گی۔"

بدر کا اثر مشرکینِ مدینہ پر ابھی تک مدینہ میں قبائل اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ شرک پر قائم تھے۔ بدر کی فتح نے ان لوگوں میں ایک حرکت پیدا کر دی اور ان میں سے بہت سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عظیم الشان اور خارق عادت فتح کو دیکھ کر اسلام کی حقانیت کے قائل ہو گئے۔ اور اس کے بعد مدینہ سے بُت پرست عنصر بڑی سرعت کے ساتھ کم ہونا شروع ہو گیا مگر بعض ایسے بھی تھے جن کے دلوں میں اسلام کی اس فتح نے بغض وحسد کی چنگاری روشن کر دی اور انہوں نے برملا مخالفت کو خلاف مصلحت سمجھتے ہوئے بظاہر تو اسلام قبول کر لیا لیکن اندر ہی اندر اس کے استیصال کے درپے ہو ہو کر منافقین کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ ان مؤخر الذکر لوگوں میں زیادہ ممتاز عبداللہ بن اُبی ابن سلول تھا جو قبیلہ خزرج کا ایک نہایت نامور رئیس تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں تشریف لانے کے نتیجہ میں اپنی سرداری کے چھینے جانے کا صدمہ اٹھا چکا تھا۔ یہ شخص بدر کے بعد بظاہر مسلمان ہو گیا، لیکن اس کا دل اسلام کے خلاف بغض وعداوت سے لبریز تھا اور اہلِ نفاق کا سردار بن کر اس نے مخفی مخفی اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ریشہ دوانی کا سلسلہ شروع کر دیا، چنانچہ بعد کے واقعات سے پتہ لگے گا کہ

---

[1] ابن ہشام وطبری

کس طرح یہ شخص بعض اوقات اسلام کے لیے نہایت نازک حالت پیدا کر دینے کا باعث بنا۔

رومی سلطنت کی فتح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی

کتاب کے حصہ اوّل میں بیان کیا گیا تھا کہ ان ایام میں روم اور فارس کی مملکتیں برسرِ پیکار تھیں اور مکہ والوں کی ہمدردی طبعاً اہلِ فارس کے ساتھ تھی جو انہی کی طرح مشرک تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تشریف رکھتے تھے کہ آپ نے خدا سے الہام پا کر یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ اس جنگ میں گو ابتداءً روم کو نیچا دیکھنا پڑے گا، لیکن بالآخر اُسے فارس پر فتح حاصل ہوگی اور تین سال سے لیکر نو سال کے عرصہ تک روم غالب آجائے گا۔ یہ پیشگوئی اُس وقت کی گئی تھی جبکہ فارس کی افواج روم کو دباتی چلی جاتی تھیں اور بہت سے رومی علاقے فارس نے چھین لیے تھے اور بظاہر حالات روم کے لیے کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ اس حالت کو دیکھ کر کفارِ مکہ بہت خوش تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشگوئی فرمائی تو وہ کہتے تھے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ اب روم کو غلبہ حاصل ہو؛ چنانچہ ان کی تحریک پر حضرت ابوبکرؓ نے اُن سے ایک شرط بھی باندھ لی[1] مگر حضرت ابوبکر سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے کفارِ مکہ کے کہنے میں آکر قرآن شریف کی بیان کردہ میعاد کو جو تین سال سے لیکر نو سال کے عرصہ پر مشتمل تھی صرف چھ سال میں محصور کر دیا اور اس طرح قریش کو ایک جھوٹی خوشی کا موقعہ مل گیا۔ مگر بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح فرما دی کہ خدائی میعاد کو تنگ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے پوری میعاد نو سال ہے اور اس وقت تک پیشگوئی کے پورا ہونے کا انتظار کرنا چاہیئے؛ چنانچہ ابھی نو سال نہیں گذرے تھے کہ جنگ نے یکلخت پلٹا کھایا اور روم نے فارس کو شکست پر شکست دیکر اپنا سارا علاقہ واپس چھین لیا اور جنگ کا اختتام روم کی فتح پر ہوا۔ یہ ایام وہی تھے جبکہ صحابہ نے قریشِ مکہ کو بدر کے میدان میں شکست دی تھی۔ گویا اس موقعہ پر مسلمانوں کے لیے دو خوشیاں جمع ہوگئیں اور قریشِ مکہ کے لیے دو ماتم۔[2] بعض روایات میں یہ مروی ہوا ہے کہ یہ فتح روم کو صلح حدیبیہ کے زمانہ میں حاصل ہوئی تھی مگر یہ دونوں روائتیں متضاد نہیں ہیں کیونکہ دراصل روم کی فتح کا زمانہ جنگِ بدر سے لیکر صلح حدیبیہ کے زمانہ تک پھیلا ہوا تھا۔

---

[1] اس وقت تک اسلام میں شرط باندھنا ممنوع نہیں تھا۔ [2] قرآن شریف سورۃ روم اور ترمذی جلد ۲ تفسیر سورۃ روم۔ لائف آف محمد مصنفہ سر ولیم میور صفحہ ۱۱۸-۱۱۹ و انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا حالات ہرقل۔

غلاموں کیساتھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کا سلوک

——— اور ———

مسئلہ غلامی کے متعلق آپؐ کی تعلیم

مسئلہ غلامی اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم

چونکہ جنگ کو غلامی کے مسئلہ کے ساتھ ایک بنیادی تعلق ہے اور بدر وہ پہلی باقاعدہ جنگ ہے جو کفار اور مسلمانوں کے درمیان وقوع میں آئی۔ اس لیے جنگ بدر کے تذکرہ میں طبعًا یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ غلامی کے متعلق کیا تعلیم دی اور کیا طریق اختیار کیا؟ لہٰذا پیشتر اس کے کہ ہم آگے چلیں مسئلہ غلامی کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ مگر چونکہ یہ مسئلہ نہایت وسیع اور نہایت نازک ہے اور اس پر پورے تبصرہ کے لیے بہت سے مباحث میں داخل ہونا پڑتا ہے جس کی اس جگہ گنجائش نہیں اور نہ ایک مورخ ہونے کی حیثیت میں ہم اس قسم کی علمی بحثوں میں زیادہ پڑ سکتے ہیں، اس لیے ہم اس جگہ صرف اصولی نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ پر ایک اجمالی نظر ڈالیں گے اور اس میں بھی اپنے آپ کو صرف اس حد تک محدود رکھیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور طریق عمل کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔

سو سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیئے کہ جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں تصریح کی گئی ہے دنیا میں غلامی کی ابتداء دراصل جنگ سے ہوتی ہے۔ شروع شروع میں غلام بنائے جانے کا طریق اس طرح پر جاری ہوا کہ جب دو قبیلوں یا دو قوموں یا دو ملکوں کے درمیان کسی وجہ سے جنگ چھڑتی تھی تو مفتوح فوج کے جنگجو لوگ بلکہ بسا اوقات مفتوح قوم کے بیشتر یا سارے کے سارے مرد قتل کر دیئے جاتے تھے اور عورتوں اور بچوں کو (سوائے اس کے کہ انہیں بھی واجب القتل سمجھا جاوے) قید کرکے غلام بنا لیا جاتا تھا اور پھر ان غلاموں سے مختلف قسم کے کام اور محنتیں لی جاتی تھیں۔ اِس کے بعد جب ایک طرف دنیا میں تمدن اور کاروبار نے ترقی کی اور مزدور پیشہ لوگوں اور خدمتگاروں کی مانگ زیادہ ہونی شروع ہوئی اور دوسری طرف عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لینے

کے عملی تجربہ نے یہ ثابت کیا کہ خدمت اور مزدوری حاصل کرنے کا یہ ایک عمدہ اور آسان ذریعہ ہے کہ مفتوح قوم کے لوگوں کو غلام بنا کر رکھا جاوے اس لیے آہستہ آہستہ یہ طریق جاری ہو گیا کہ باستثناء ان لوگوں کے جو کسی وجہ سے واجب القتل سمجھے جاتے تھے مفتوح قوم کے مردوں کو بھی بجائے قتل کرنے کے غلام بنا لیا جاتا تھا اور پھر ان سے ملکی اور قومی اور انفرادی کاموں میں جبری محنت لی جاتی تھی۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ طریق ایسا وسیع ہو گیا کہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ بعض ممالک میں غلاموں کی تعداد اصل باشندوں سے بھی زیادہ ہو گئی اور غلامی کا طریق دنیا کے تمدن اور معاشرت کا ایک ضروری حصہ بن گیا۔ یہ غلام مالک کی کامل ملکیت سمجھے جاتے تھے اور اسے اختیار حاصل ہوتا تھا کہ انہیں جس طرح چاہے رکھے۔ جو کام چاہے اُن سے لے جو سزا چاہے انہیں دے اور جب اور جس طرح چاہے انہیں کسی اور شخص کے پاس فروخت کر دے۔

اور بالآخر اس سلسلہ نے ایسی وسعت اختیار کر لی کہ ان غلاموں کی اولاد بھی مالک کی ملک متصور ہونے لگی۔ اور اس طرح ایک مستقل اور غیر متناہی سلسلہ غلامی کا جاری ہو گیا اور جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہ ایک بڑا فائدہ مند سلسلہ ہے کہ گویا مفت میں ایسے نوکروں اور مزدوروں کی خدمت حاصل ہو جاتی ہے جن کو کوئی تنخواہ وغیرہ نہیں دینی پڑتی اور جو ہر حالت میں ہر قسم کی خدمت پر مجبور ہوتے تھے بلکہ علاوہ خدمت کے اُن سے اور بھی بعض فائدے اُٹھائے جا سکتے ہیں تو جنگی قیدیوں کے طریق کے علاوہ لوگوں نے اور بھی کئی قسم کے ظالمانہ طریق غلام بنانے کے ایجاد کر لیے۔ مثلاً بلاوجہ کسی کمزور قبیلہ یا قافلہ پر حملہ کر کے اُن کے مرد و زن کو پکڑ کر غلام بنا لیا جاتا تھا اور پھر ان بدنصیب لوگوں کی نسل میں یہ غلامی کا داغ ہمیشہ کے لیے چلتا چلا جاتا تھا۔ الغرض آہستہ آہستہ غلامی کا جائز و ناجائز طریق دنیا میں رائج اور مستحکم ہو گیا اور جس وقت اسلام کی ابتداء ہوئی اس وقت تمام ممالک میں یہ طریق کم و بیش جاری تھا اور مملکت ہائے روم اور یونان اور ایران وغیرہ میں لاکھوں غلام دُکھ اور مصیبت کی زندگی کاٹ رہے تھے اور کوئی اُن کا پرسانِ حال نہیں تھا اور بحیثیت مجموعی اُن کی حالت جانوروں سے بڑھ کر نہیں تھی۔ اس زمانہ میں عرب کے ملک میں بھی ہزارہا غلام پائے جاتے تھے اور امراء کی امارت میں غلاموں کی تعداد بھی گویا ایک ضروری حصہ سمجھی جاتی تھی اور عرب کے لوگ خصوصیت کے ساتھ غلاموں کو سخت حقیر و ذلیل خیال کرتے تھے اور جیسا بھی ظالمانہ سلوک چاہتے تھے اُن سے کرتے تھے؛ چنانچہ کتاب کے حصہ اوّل میں گذر چکا ہے کہ مسلمان ہونے والے غلاموں پر رؤساءِ مکہ نے کیسے کیسے سخت مظالم کئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خدا سے الہام پا کر رسالت کا دعویٰ کیا تو آپ کی ابتدائی تعلیمات میں یہ بات بھی داخل تھی کہ غلاموں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک ہونا چاہیئے۔ اور غلاموں کے آزاد کئے جانے کے متعلق بھی آپ نے اسی ابتدائی زمانہ میں تحریک شروع کر دی تھی بلکہ اس بارہ میں تو خصوصیت کے ساتھ ایک قرآنی وحی بھی نازل ہوئی کہ غلام کا آزاد کرنا ایک بہت بڑی نیکی ہے[1] اسلامی تعلیم کی خوبی اور کشش

---

[1] سورۃ البلد: ۱۱-۱۴)

کے ساتھ اس مخصوص تعلیم نے مل کر عرب کے غلاموں پر ایک نہایت گہرا اثر پیدا کیا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو اپنے لیے ایک نجات دہندہ کی آواز سمجھنے لگ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود ان نہایت درجہ بے دردانہ مظالم کے جو رؤساء مکہ مسلمان ہونے والوں پر کرتے تھے۔ غلاموں میں اسلام بڑی سرعت کیساتھ پھیلنا شروع ہو گیا؛ چنانچہ جیسا کہ کتاب کے حصہ اوّل میں بیان کیا جا چکا ہے ابتدائی مسلمانوں میں غلاموں کی نسبت غیر معمولی طور پر زیادہ تھی اور تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ لوگ ابتدائی زمانہ میں بھی اسلامی سوسائٹی میں ہرگز ذلیل نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اس کے بعد جوں جوں اسلامی احکام نازل ہوتے گئے غلاموں کی پوزیشن زیادہ مضبوط اور اُن کی حالت زیادہ بہتر ہوتی گئی اور بالآخر اس انتظامی فرق کے سوا کہ ایک افسر ہوتا تھا اور دُوسرا اس کے ماتحت کوئی اور امتیاز باقی نہ رہا۔ دُوسری طرف غلاموں کی آزادی کی تحریک بھی دن بدن زیادہ مضبوط ہوتی گئی اور مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پُرزور تعلیم اور آپؐ کے عملی نمونہ کے ماتحت ایک دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس تحریک میں حصہ لیا؛ چنانچہ قرآن شریف اور کتب حدیث و تاریخ اس کی تفاصیل سے بھری پڑی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف اس حد تک محدود رہا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے اور آپؐ نے غلامی کے ناجائز اور ظالمانہ طریقوں کو منسوخ کرنے کے لیے کوئی تدابیر اختیار نہیں کیں؟ اگر یہی ہے تو گو پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے ایک عظیم الشان محسن قرار پاتے ہیں کہ آپؐ نے غلاموں کی حالت کو بہتر بناتے اور اُن کی آزادی کی تحریک جاری کرنے اور اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے میں ایک نہایت نمایاں خدمت سرانجام دی مگر یقیناً اس سے آپؐ کا وہ حقیقی کام پردہ میں رہتا ہے جو آپؐ کی اس تحریک کی اصل روحِ رواں تھا۔ کیونکہ جہاں تک ہماری تحقیق ہے اور یہ تحقیق خوش عقیدگی کا ثمرہ نہیں بلکہ تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف غلاموں کی حالت کو بہتر ہی نہیں بنایا بلکہ آپؐ نے آئندہ کے لیے غلامی کے ناجائز اور ظالمانہ طریقوں کو منسوخ بھی کر دیا۔ گویا مسئلہ غلامی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم میں اصلاح کا کام دو حلقوں میں تقسیم شدہ تھا۔

[اوّل حاضر الوقت غلاموں کی حالت کی اصلاح اور اُن کی آزادی کا انتظام۔ دوم آئندہ کے لیے اصولی احکامات۔ اور ہم اس جگہ ان دونوں قسم کے کاموں کے متعلق آپؐ کی تعلیم اور آپؐ کے طریق عمل کا نمونہ مختصر طور پر ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

موجود الوقت غلاموں کی اصلاح کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم

طبعی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلے ہم اس بحث کو لیتے ہیں جو حاضر الوقت غلاموں سے تعلق رکھتی ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ ...... وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا[۱]

"اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی اور احسان کا سلوک کرو اور اپنے دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ .... اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ۔ اور جانو کہ اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا ان لوگوں کو جو تکبر اور بڑائی کا طریق اختیار کرتے ہیں۔"

اس آیت میں غلاموں کے ساتھ نیکی اور احسان کا حکم دیا گیا ہے۔

پھر فرماتا ہے:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ أَعْجَبَكُمْ[۲]

اور اے مسلمانو! نہ شادی کرو تم مشرک عورتوں کے ساتھ حتّٰی کہ وہ ایمان لے آئیں اور جانو کہ ایک مسلمان لونڈی بہتر ہے ایک آزاد مشرک عورت سے خواہ تمہیں مشرک عورت اچھی ہی نظر آئے۔ اور اے مسلمانو! نہ نکاح کرو مسلمان عورتوں کا تم مشرک مردوں کے ساتھ حتّٰی کہ وہ ایمان لے آئیں اور جانو کہ ایک مسلمان غلام بہتر ہے ایک آزاد مشرک آدمی سے خواہ تمہیں مشرک آدمی اچھا ہی نظر آئے۔"

اس آیت میں علاوہ اس کے کہ غلاموں کی پوزیشن کو نمایاں طور پر مضبوط کیا گیا ہے۔ آزاد مسلمان مردوں اور عورتوں اور مسلمان لونڈیوں اور غلاموں کی باہمی شادیوں کے لیے دروازہ کھولا گیا ہے تا اس مساویانہ اور رشتہ دارانہ اختلاط کے نتیجہ میں غلاموں کی حالت جلد تر اصلاح پذیر ہو سکے؛ چنانچہ منجملہ اور مصالح کے اس اصل کے ماتحت قرآن شریف میں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ چار بیویوں کی انتہائی اور استثنائی حد کے پورا ہو چکنے کے بعد بھی اگر کسی مسلمان کے لیے کسی غلام عورت کے ساتھ رشتہ کرنے کا سوال پیدا ہو تو یہ چار کی حد بندی اس کے راستہ میں روک نہیں ہوگی اور وہ ہر حالت میں غلام عورت کے ساتھ رشتہ کر سکے گا[۳] تاکہ غلاموں کی حالت کی اصلاح کا رستہ کسی صورت میں بھی مسدود نہ ہونے پائے۔ پھر فرماتا ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ ...... إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ[۴]

"اور اے رسول! جو شادیاں تم اب تک کر چکے ہو (یہ تمہاری تبلیغی تربیتی اور سیاسی ضروریات کے لیے کافی ہیں اس لیے) اب اس کے بعد تمہیں کوئی اور شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

---

[۱] نساء: ۳۷ ◆ [۲] بقرہ: ۲۲۲ ◆ [۳] نساء: ۴ ◆ [۴] احزاب: ۵۳ ◆

البتہ اگر کسی غلام عورت کے ساتھ رشتہ کا سوال پیدا ہو تو تمہیں اس کی اجازت ہے۔
یہ حکم بھی اسی غرض و غایت کا حامل ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے اور اس میں مزید غرض یہ شامل ہے کہ تا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل سے مسلمانوں کے لیے ایک بہترین نمونہ قائم ہو جاوے۔
پھر فرماتا ہے :-

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ...... اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ [1]

"یعنی اے مسلمان عورتو ! تم اپنی زینت سوائے اپنے خاوندوں اور فلاں فلاں قریبی رشتہ داروں کے کسی پر ظاہر نہ کیا کرو۔ یعنی پردے کی ان حدود کو مدنظر رکھو جو تمہارے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ البتہ تمہیں اپنے غلاموں سے پردہ نہیں کرنا چاہیے۔"

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلاموں کے متعلق اسلامی تعلیم کا اصل منشاء یہ تھا کہ مسلمان انہیں بالکل اپنے قریبی عزیزوں کی طرح سمجھیں۔ حتّٰی کہ مسلمان عورتیں اپنے غلاموں سے پردہ بھی نہ کریں تاکہ غیریت کا احساس بالکل جاتا رہے اور رشتہ داروں کا سا اختلاط پیدا ہو جائے۔
پھر حدیث میں آتا ہے :-

عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم اِنَّ اِخْوَانَكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ كَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَاَعِيْنُوْهُمْ [2]

یعنی "ابوذر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ" تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ پس جب کسی شخص کے ماتحت کوئی غلام ہو تو اُسے چاہیئے کہ اُسے وہی کھانا دے جو وہ خود کھاتا ہے اور وہی لباس دے جو وہ خود پہنتا ہے اور تم اپنے غلاموں کو ایسا کام نہ دیا کرو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور اگر کبھی ایسا کام دو تو پھر اس کام میں خود ان کی مدد کیا کرو۔" اور مدد کرنے کے الفاظ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ وہ کام ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر وہ آقا کو خود کرنا پڑے تو وہ اسے اپنے لیے موجب عار سمجھے بلکہ ایسا ہونا چاہیئے کہ جسے آقا خود بھی کر سکتا ہو اور کرنے کو تیار ہو۔ یہ حدیث اپنے مطالب میں نہایت واضح ہے اور اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ غلاموں کے ساتھ کامل درجہ کے حسن سلوک اور انتہائی شفقت کا حکم دیا گیا ہے جس کی نظیر یقیناً کسی اور مذہب اور کسی اور قوم میں نہیں ملتی بلکہ یہ کہ درحقیقت اس تعلیم کا اصلی منشاء تھا کہ مسلمان اپنے غلاموں کو بالکل اپنے بھائیوں کی طرح سمجھیں اور ہر امر میں جس طرح خود رہتے ہیں اسی طرح انہیں رکھیں تاکہ ان کے تمدن و معاشرت میں اسی طرح کی

---

[1] سورۃ نور : ۳۲ ٭ [2] بخاری کتاب العتق ٭

بلندی پیدا ہو جائے جیسی کہ دوسرے آزاد لوگوں میں ہے اور ان کے دلوں سے پستی کے احساسات بالکل مٹ جائیں ورنہ محض حسنِ سلوک کی غرض سے اس قدر انتہائی تعلیم نہیں دی جا سکتی تھی کہ غلاموں کو بعینہٖ اسی طرح رکھو جس طرح کہ خود رہتے ہو۔ کیونکہ حفظِ مراتب تو ہوا ہی کرتا ہے اور اسلام اسے تسلیم کرتا ہے۔

پھر حدیث میں آتا ہے:۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الْوَلِيْدِ بْنِ عُبَادَةَ الصَّامِتِ قَالَ لَقِيْنَا اَبَا الْيُسْرِ صَاحِبَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَمَعَهٗ غُلَامٌ وَعَلَيْهِ بُرْدَةٌ وَمَعَافِرِيٌّ وَعَلٰى غُلَامِهٖ بُرْدَةٌ وَمَعَافِرِيٌّ قَالَ قُلْتُ لَهٗ يَا عَمِّ لَوْ اَنَّكَ اَخَذْتَ بُرْدَةَ غُلَامِكَ وَاَعْطَيْتَهٗ مَعَافِرِيَّكَ وَاَخَذْتَ مَعَافِرِيَّهٗ وَاَعْطَيْتَهٗ بُرْدَتَكَ فَكَانَتْ عَلَيْكَ حُلَّةٌ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ قَالَ فَمَسَحَ رَأْسِيْ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْهِ ثُمَّ قَالَ يَا ابْنَ اَخِيْ بَصُرَتْ عَيْنَايَ هَاتَانِ وَسَمِعَتْهُ اُذُنَايَ هَاتَانِ وَوَعَاهُ قَلْبِيْ هٰذَا وَاَشَارَ اِلٰى مَنَاطِ قَلْبِهٖ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ يَقُوْلُ اَطْعِمُوْهُمْ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ وَاَكْسُوْهُمْ مِمَّا تَلْبَسُوْنَ فَكَانَ اِنْ اَعْطَيْتُهٗ مِنْ مَتَاعِ الدُّنْيَا اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ يَاْخُذَ مِنْ حَسَنَاتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ[1]

یعنی "عبادہ بن ولید روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابوالیسر کو ملے۔ اس وقت اُن کے ساتھ ان کا ایک غلام بھی تھا اور ہم نے دیکھا کہ ایک دھاری دار چادر اور ایک یمنی چادر اُن کے بدن پر تھی اور اسی طرح ایک دھاری دار چادر اور ایک یمنی چادر ان کے غلام کے بدن پر تھی میں نے انہیں کہا۔ چچا تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ اپنے غلام کی دھاری دار چادر خود لے لیتے اور اپنی یمنی چادر اُسے دے دیتے یا اُس کی یمنی چادر خود لے لیتے اور اپنی دھاری دار چادر اُسے دے دیتے تا کہ تم دونوں کے بدن پر ایک ایک طرح کا جوڑا تو ہو جاتا۔ ابوالیسر نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے دُعا کی اور کہا بھتیجے! میری اِن آنکھوں نے دیکھا ہے اور میرے اِن کانوں نے سُنا ہے اور میرے اس دل نے اسے اپنے اندر جگہ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ "اپنے غلاموں کو وہی کھانا کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ پس مَیں اس بات کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں کہ مَیں دُنیا کے اموال میں سے اپنے غلام کو برابر کا حصہ دے دوں بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن میرے ثواب میں کوئی کمی آوے۔"

یہ حدیث اپنے الفاظ کے زوردار ہونے میں گذشتہ حدیث سے بھی زیادہ واضح ہے اور اس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت پر صحابہ عمل بھی کرتے تھے۔ بلکہ اس کی تعمیل میں انہیں اس درجہ انہماک تھا کہ وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے اور ان کے غلاموں کے لباس میں درجہ کا اختلاف تو الگ رہا ظاہری صورت کا بھی خفیف سا اختلاف پیدا ہو۔

---

[1] مسلم کتاب الزھد مُلخّصًا۔

پھر روایت آتی ہے:

عَنْ اَبِی النَّوَارِ بَیَّاعِ الْکَرَابِیْسِ قَالَ اَتَانِیْ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ وَمَعَهُ غُلَامٌ لَهُ فَاشْتَرٰی مِنِّیْ قَمِیْصَیْ کَرَابِیْسَ فَقَالَ لِغُلَامِهٖ اِخْتَرْ اَیَّهُمَا شِئْتَ فَاَخَذَ اَحَدَهُمَا وَاَخَذَ عَلِیٌّ الْاٰخَرَ فَلَبِسَهٗ [1]

یعنی "ابو نوار جو روئی کے کپڑوں کی تجارت کرتے تھے روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ ان کی دوکان پر آئے۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کا ایک غلام بھی تھا۔ علیؓ نے دو ٹھنڈی قمیصیں خریدیں اور پھر اپنے غلام سے کہنے لگے کہ ان میں سے جو قمیص تم چاہو لے لو۔ چنانچہ غلام نے ایک قمیص چن لی اور جو دوسری قمیص رہ گئی وہ حضرت علیؓ نے خود پہن لی۔"

اس روایت سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت خاص خاص صحابہؓ بعض اوقات یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ اپنی چیزوں میں سے انتخاب کا حق پہلے غلام کو دیتے تھے اور پھر جو چیز باقی رہ جاتی تھی وہ خود استعمال کرتے تھے۔ یہ انتہائی درجہ کا ایثار ہے جو کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لیے کر سکتا ہے اور یقیناً غلاموں کے متعلق اس درجہ کا ایثار محض حسن سلوک کی غرض سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں وہی دُور کی غرض بھی مدنظر تھی کہ یہ غلام جلد تر اپنے اخلاق اور معاشرت میں آزاد لوگوں کے مرتبہ کو پہنچ کر آزاد کر دیئے جانے کے قابل ہو جائیں۔

پھر حدیث میں آتا ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ یُحَدِّثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ لَا یَقُلْ اَحَدُکُمْ عَبْدِیْ اَمَتِیْ وَلْیَقُلْ فَتَایَ وَفَتَاتِیْ ...... وَلْیَقُلْ سَیِّدِیْ وَمَوْلَایَ [2]

یعنی "ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "اے مسلمانو! تم یوں نہ کہا کرو کہ "میرا غلام میری لونڈی" بلکہ یوں کہا کرو کہ "میرا آدمی میری عورت" اور غلام بھی اپنے آقا کو ربّ یعنی مالک نہ کہا کرے بلکہ سیّد اور بزرگ کہہ کر پکارا کرے۔"

اس حدیث میں آقا اور غلام کی ذہنیتوں کو درست کیا گیا ہے یعنی جہاں ایک طرف آقا کے دل و دماغ سے بڑائی اور تکبر کے خیالات کو مٹایا گیا ہے۔ وہاں دوسری طرف غلام کے دل میں خودداری اور عزتِ نفس کے جذبات پیدا کئے گئے ہیں اور عملی اور معاشرتی اصلاح کے ساتھ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ ذہنی اصلاح مل کر سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے اور اس کے بعد حالات اور خیالات کی کامل تبدیلی میں کوئی امر مانع نہیں رہتا۔ اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث اور آثار ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اسلام

---

[1] اسد الغابہ حالات حضرت علیؓ جلد ۴ صفحہ ۲۴ [2] بخاری کتاب العتق

میں موجود الوقت غلاموں کی اصلاح اور ان کی بہبودی اور آرام و آسائش کے متعلق انتہائی درجہ کا زور دیا گیا ہے بلکہ یہ کہ اس تعلیم میں اسلام کا اصل منشاء یہ تھا کہ غلاموں اور ان کے مالکوں کے تمدن و معاشرت اور عزت و آبرو کو ایک مساویانہ درجہ پر لاکر غلاموں کو جلد تر اس قابل بنا دیا جاوے کہ وہ آزاد ہو کر ملک کے مفید اور کارآمد شہری بن سکیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غلاموں کے یہ حقوق جنکا کسی قدر نمونہ اوپر درج کیا گیا ہے محض سفارشی رنگ نہیں رکھتے تھے بلکہ شرعی اور سیاسی احکام تھے اور حکومتِ اسلامی کی طرف سے نہایت سختی کے ساتھ غلاموں کے حقوق کی نگرانی کی جاتی تھی۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ اِلْبَدْرِیِّ قَالَ کُنْتُ اَضْرِبُ غُلَامًا بِالسَّوْطِ فَسَمِعْتُ صَوْتًا مِنْ خَلْفِیْ اِعْلَمْ اَبَا مَسْعُوْدٍ فَلَمْ اَفْهَمِ الصَّوْتَ مِنَ الْغَضَبِ قَالَ فَلَمَّا دَنٰی مِنِّیْ اِذَا هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاِذَا هُوَ یَقُوْلُ اِعْلَمْ اَبَا مَسْعُوْدٍ اِعْلَمْ اَبَا مَسْعُوْدٍ قَالَ فَاَلْقَیْتُ السَّوْطَ مِنْ یَدِیْ فَقَالَ اِعْلَمْ اَبَا مَسْعُوْدٍ اِنَّ اللّٰهَ اَقْدَرُ عَلَیْكَ مِنْكَ عَلٰی هٰذَا الْغُلَامِ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هُوَ حُرٌّ لِوَجْهِ اللّٰهِ فَقَالَ اَمَا لَوْ لَمْ تَفْعَلْ لَلَفَحَتْكَ النَّارُ اَوْ لَمَسَّتْكَ النَّارُ[1]

یعنی ابو مسعود بدری روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے کسی بات پر اپنے غلام کو مارا اُس وقت میں نے اپنے پیچھے سے آواز سُنی کہ کوئی شخص کہہ رہا تھا "دیکھو ابو مسعود یہ کیا کرتے ہو۔ مگر غصہ کی وجہ سے میں نے اس آواز کو نہ پہچانا اور غلام کو مارتا ہی گیا۔ اتنے میں وہ آواز میرے قریب آگئی اور میں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی آواز دیتے ہوئے میری طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں کہ "دیکھو ابو مسعود یہ کیا کرتے ہو۔ آپ کو دیکھ کر میری چھڑی میرے ہاتھ سے گر گئی اور آپ نے غصہ کی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "ابو مسعود تمہارے سر پر ایک خدا ہے جو تمہارے متعلق اس سے بہت زیادہ طاقت رکھتا ہے جو تم اس غلام پر رکھتے ہو"۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسُول اللہ! میں خدا کی خاطر اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا "اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہارے مُنہ کو جھلستی"۔

پھر حدیث میں آتا ہے:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَتَی النَّبِیَّ ﷺ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَیِّدِیْ زَوَّجَنِیْ اَمَتَهٗ وَهُوَ یُرِیْدُ اَنْ یُّفَرِّقَ بَیْنِیْ وَبَیْنَهَا قَالَ فَصَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمِنْبَرَ فَقَالَ اَیُّهَا النَّاسُ

---

[1] مسلم کتاب الایمان باب ۳۵

مَا بَالُ اَحَدِكُمْ يُزَوِّجُ عَبْدَهٗ اَمَتَهٗ ثُمَّ يُرِيْدُ اَنْ يُّفَرِّقَ بَيْنَهُمَا اِنَّمَا الطَّلَاقُ لِمَنْ اَخَذَ بِالسَّاقِ[1]

یعنی ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! میرے آقا نے اپنی لونڈی کے ساتھ میری شادی کر دی تھی مگر اب وہ چاہتا ہے کہ ہمارے نکاح کو فسخ کر کے ہمیں ایک دُوسرے سے جدا کر دے۔ آپؐ یہ بات سُنکر غصہ کی حالت میں منبر پر چڑھ گئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "اے مسلمانو! یہ کیا بات ہے کہ تم لوگ اپنے غلاموں اور لونڈیوں کی شادی کرتے ہو اور پھر خود بخود اپنی مرضی سے ان میں علیحدگی کرانا چاہتے ہو؟ سُن لو کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ طلاق دینے کا حق صرف خاوند کو ہے اور تم اپنے غلاموں کو طلاق پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

پھر حدیث میں آتا ہے:

كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَذْهَبُ اِلَى الْعَوَالِيْ كُلَّ يَوْمِ سَبْتٍ فَاِذَا وَجَدَ عَبْدًا فِيْ عَمَلٍ لَا يُطِيْقُهٗ وَضَعَ عَنْهُ مِنْهُ[2]

یعنی امام مالک روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ قاعدہ تھا کہ ہر ہفتہ مدینہ کے مضافات میں جایا کرتے تھے اور جب انہیں کوئی ایسا غلام نظر آتا تھا جسے اس کی طاقت اور مناسبت کے لحاظ سے زیادہ کام دیا گیا ہو تو حکماً اس کے کام میں تخفیف کر دیتے تھے۔"

موجود الوقت غلاموں کی آزادی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم

اب ہم اس سوال کے دُوسرے حصّہ کو لیتے ہیں جو حاضر الوقت غلاموں کی آزادی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور جو اسلام اور بانیٔ اسلام کا اصل نصب العین تھا۔ سو جاننا چاہیئے کہ اس کے متعلق اسلام میں دو طریق اختیار کئے گئے اوّل سفارشی طریق اور دوسرے جبری طریق۔ اور ان دونوں طریقوں کے متحدہ اثر کے ماتحت آزادی کی تحریک کو تقویت پہنچائی گئی۔ پہلے ہم سفارشی طریق کو لیتے ہیں۔ سب سے پہلے جبکہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کی ابتداء ہی تھی اور آپؐ مکہ میں مقیم تھے آپؐ پر یہ خدا کی وحی نازل ہوئی:

وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ فَكُّ رَقَبَةٍ[3]

یعنی "اے رسول! کیا تم جانتے ہو کہ دین کے راستے میں ایک بڑی گھاٹی والی چڑھائی کونسی ہے جس پر چڑھ کر انسان قربِ الٰہی کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے؟ اگر تم نہیں جانتے تو ہم بتاتے ہیں کہ وہ

---

[1] ابن ماجہ کتاب الطلاق [2] موطا امام مالک باب الامر بالرفق للملوک [3] سورۃ بلد: ۱۳، ۱۴

غلام کا آزاد کرنا ہے۔"

پھر فرمایا :-

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ...... وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ [۱]

یعنی اللہ کے نزدیک بہت بڑی نیکی یہ ہے کہ انسان خدا پر ایمان لائے اور اُس کی محبت میں مال خرچ کرے رشتہ داروں پر اور یتیموں پر اور مسکینوں پر اور مسافروں پر اور غلاموں کے آزاد کرنے پر۔

اور حدیث میں آتا ہے :

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ اَعْتَقَ رَقَبَةً مُسْلِمَةً اَعْتَقَ اللّٰهُ بِکُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْوًا مِنَ النَّارِ [۲]

یعنی " ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی مسلمان غلام آزاد کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے دوزخ سے کلی نجات عطا کر دے گا۔"

پھر حدیث میں آتا ہے :

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ عَلِّمْنِیْ عَمَلًا یُدْخِلُنِی الْجَنَّةَ قَالَ لَئِنْ کُنْتَ اَقْصَرْتَ الْخُطْبَةَ لَقَدْ اَعْرَضْتَ الْمَسْئَلَةَ اِعْتِقِ النَّسَمَةَ وَفُکَّ الرَّقَبَةَ [۳]

یعنی " براء بن عازب روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ یا رسول اللہ ! مجھے آپ کوئی ایسا عمل بتائیں کہ جس میں اس سے سیدھا جنّت میں چلا جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم نے لفظ تو مختصر کہے ہیں، مگر بات بہت بڑی پوچھی ہے۔ تم ایسا کرو کہ غلام کو آزاد کرو اور اگر خود اکیلے آزاد نہ کر سکو تو دُوسروں کے ساتھ مل کر آزاد کرو۔"

پھر حدیث میں آتا ہے :-

عَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَیُّمَا رَجُلٍ کَانَتْ عِنْدَهٗ وَلِیْدَةٌ فَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَهَا وَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَادِیْبَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا وَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ [۴]

---

[۱] سورۃ بقرہ : ۱۷۸ ٭ [۲] بخاری کتاب الایمان والنذور ٭ [۳] بیہقی شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العتق ٭ [۴] بخاری کتاب النکاح ٭

"یعنی" ابوبُردہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کے پاس ایک لونڈی ہو اور وہ بہت اچھی طرح اسے تعلیم دے اور بہت اچھی طرح اس کی تربیت کرے اور پھر اُسے آزاد کرکے اس کے ساتھ خود شادی کرے تو ایسا شخص خدا کے حضور دُوہرے ثواب کا مستحق ہوگا۔"

ان پُرزور سفارشات کے علاوہ اسلامی تعلیم میں بعض غلطیوں اور گناہوں کے کفارہ میں غلام کے آزاد کرنے کا قاعدہ مقرر کیا گیا ہے۔ جسے گویا سفارشی اور جبری طریق کے بین بین سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ط ...... فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ [1]

یعنی "کوئی شخص کسی مومن کو یونہی غلطی سے قتل کر دے تو اُس کی سزا یہ ہے کہ وہ ایک مُسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خُون بہا بھی ادا کرے سوائے اس کے کہ اُس کے ورثاء اُسے یہ خون بہا خود بخود معاف کر دیں اور اگر ایسے شخص کو کوئی غلام آزاد کرنے کے لیے نہ ملے تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔"

پھر فرماتا ہے:۔

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ...... فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ [2]

"اگر مقتول ایسی قوم میں سے ہے جو مسلمانوں کی دُشمن اور ان سے برسرپیکار ہے، لیکن مقتول خود مومن ہو تو پھر قاتل کی صرف یہ سزا ہے کہ وُہ ایک مُسلمان غلام آزاد کرے اور اگر وہ کوئی غلام نہ پاوے تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔"

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ج فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ [3]

اور اگر مقتول کسی ایسی قوم میں سے ہو جن کے اور تمہارے درمیان عہدوپیمان ہے تو خواہ مقتول کافر ہی ہو۔ اس کے قاتل کی سزا یہ ہے کہ وہ مقتول کے وارثوں کو خُون بہا ادا کرے اور ایک مُسلمان غلام آزاد کرے اور اگر کوئی غلام نہ پائے تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔"

---

[1]، [2]، [3] نساء : ۹۳

پھر فرماتا ہے :

فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ[1]

یعنی اگر کوئی شخص خدا کی قسم کھا کر پھر اُسے توڑ دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اپنی حیثیت کے مطابق کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو لباس عطا کرے یا ایک غلام آزاد کرے اور اگر کوئی غلام نہ پائے تو تین دن کے روزے رکھے۔"

پھر فرماتا ہے :

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا .... فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ .... فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا[2]

یعنی جو لوگ اپنی بیویوں سے علیحدہ رہنے کا عہد کر لیتے ہیں لیکن پھر کسی وجہ سے انہی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں تو اُن کا کفارہ یہ ہے کہ وہ ایک غلام آزاد کریں اور اگر کوئی غلام نہ پائے تو ایسا شخص دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے اور اگر روزوں کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔"

یہ وہ مختلف صورتیں ہیں جو اسلام نے کفارہ میں غلاموں کے آزاد کیے جانے کی بیان کی ہیں اور اسلام نے حسبِ عادت ان کے حالات کے اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو دو تین تین مقابلہ کی صورتیں تجویز کر کے ان میں مسلمانوں کو اختیار دے دیا ہے کہ جو صورت آسانی کے ساتھ اور بہتر طور پر اختیار کی جا سکے اسے اختیار کر لیا جاوے اور کمال حکمت کے ساتھ ان آیات میں خدا تعالیٰ نے جہاں جہاں بھی غلام کے آزاد کرنے کا ذکر کیا ہے وہاں لازماً ساتھ ہی یہ الفاظ بھی زیادہ کر دیئے ہیں کہ اگر کوئی غلام نہ پاتے تو پھر یہ صورت اختیار کی جاوے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا اصل منشاء یہ تھا کہ بالآخر غلامی کا سلسلہ بالکل مفقود ہو جانا چاہیئے۔ اس کے مقابلہ میں جب سورۃ مجادلہ کی آیت میں دو ماہ کے روزوں کے مقابلہ کی صورت تجویز کی گئی ہے تو وہاں یہ الفاظ رکھے گئے ہیں کہ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو پھر یوں کیا جاوے۔ پس غلام کے آزاد کئے جانے کی صورت کے مقابلہ میں لازماً ان الفاظ کا آنا کہ "اگر کوئی غلام نہ پاوے"۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں چھوڑتا کہ اسلام کی انتہائی غرض موجود الوقت غلاموں کی کلی آزادی تھی۔

---

[1] مائدہ : ۹۰ [2] مجادلہ : ۴-۵

پھر حدیث میں آتا ہے :

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَتْ اَمَرَ النَّبِیُّ ﷺ بِالْعِتَاقِ فِیْ کُسُوْفِ الشَّمْسِ[1]۔

"یعنی" اسماء بنت ابی بکر روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو حکم دیتے تھے کہ سُورج گرہن کے موقعہ پر غلام آزاد کیا کریں"

اب ہم جبری آزادی کے طریق کو لیتے ہیں۔ سو اس کے متعلق اسلام نے مختلف صورتیں تجویز کی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے :۔

عَنْ سُوَیْدِ بْنِ مُقَرِّنٍ قَالَ لَقَدْ رَأَیْتُنِیْ وَاِنِّیْ سَابِعُ اِخْوَۃٍ لِیْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَمَا لَنَا خَادِمٌ غَیْرُ وَاحِدٍ فَعَمَدَ اَحَدُنَا فَلَطَمَہٗ فَاَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَنْ نُعْتِقَہٗ[2]

یعنی" سوید صحابی روایت کرتے ہیں کہ ہم سات بھائی تھے اور ہمارے پاس صرف ایک غلام تھا۔ ہم میں سے ایک کسی بات پر غصہ آیا تو اس نے اس غلام کو ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپؐ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اس غلام کو آزاد کر دیں"

یہی حدیث ابن عمرؓ سے بھی مروی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو مارے اور پھر اسے آزاد کر دے تو اُسے اس کے اس فعل کا کوئی ثواب نہیں ہوگا۔ کیونکہ غلام کا آزاد کیا جانا اسلام میں مالک کے مارنے کے فعل کی سزا قرار پا چکا ہے[3]" گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کو جبری طور پر آزاد کرنے کا ایک طریق یہ اختیار کیا کہ مالک کے لیے غلام کو مارنے کی سزا یہ مقرر کر دی کہ وہ اُسے فوراً آزاد کر دے۔

پھر حدیث میں آتا ہے :۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ مَلَکَ ذَا رَحِمٍ مُحَرَّمٍ فَھُوَ حُرٌّ[4]

یعنی" ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر کسی شخص کے قبضہ میں کوئی ایسا غلام آجاوے جو اس کا قریبی رشتہ دار ہے تو وہ غلام خود بخود آزاد سمجھا جائیگا"

پھر حدیث میں آتا ہے :۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ اَعْتَقَ شِرْکًا لَّہٗ فِیْ مَمْلُوْکٍ فَعَلَیْہِ عِتْقُہٗ

---

[1] بخاری کتاب العتق ؛ [2] مسلم کتاب الایمان ؛
[3] مسلم کتاب الایمان ؛ [4] ابن ماجہ کتاب العتق ؛

كُلَّهُ إِنْ كَانَ لَهُ مَالٌ يَبْلُغُ ثَمَنَهُ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَإِلَّا قُوِّمَ عَلَيْهِ فَاسْتَسْعَى بِهِ غَيْرَ مَشْقُوقٍ عَلَيْهِ[1]

یعنی "ابن عمر اور ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی غلام کی ملکیت میں دُوسروں کے ساتھ حِصّہ دار ہو اور وُہ اپنے حِصّہ میں غلام کو آزاد کر دے تو اس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے دُوسرے حِصّہ داروں کو بھی روپیہ دے کر غلام کو کلیتہً آزاد کرائے اور اگر اس کے پاس اتنا روپیہ نہ ہو تو پھر بھی غلام کو عملاً آزاد کر دیا جائیگا تاکہ وہ خود اپنی کوشش سے بقیہ رقم پیدا کرے اور دُوسرے مالکوں کو ادا کر کے کُلّی طور پر آزاد ہو جاوے اور اس معاملہ میں غلام کو ہر قسم کی سہولت دی جائیگی "

پھر حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ مشرکینِ مکّہ کے بعض غلام بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گئے جس پر مشرکوں نے آپؐ سے درخواست کی کہ وہ غلام انہیں واپس دے دیئے جائیں اور بعض مسلمانوں نے بھی اُن کی سفارش کی، مگر اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے ؛ چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

غَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَأَبَى أَنْ يَرُدَّهُمْ وَقَالَ هُمْ عُتَقَاءُ اللّٰهِ[2]

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس موقعہ پر سخت ناراض ہوئے اور غلاموں کے واپس کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ تو خدا کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ کیا میں انہیں پھر غلامی اور شرک کی طرف لوٹا دوں "

پھر حدیث میں آتا ہے :

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّمَا رَجُلٍ وَلَدَتْ أَمَتُهُ مِنْهُ فَهِيَ مُعْتَقَةٌ عَنْ دُبُرٍ مِنْهُ[3] وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ أُمُّ الْوَلَدِ حُرَّةٌ وَإِنْ كَانَ سَقْطًا[4]

یعنی "ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص اپنی لونڈی کے ساتھ رشتہ کرے اور اُسے آزاد نہ بھی کرے تو پھر بھی اگر اس لونڈی کے بطن سے اس کے ہاں کوئی اولاد ہو جاوے تو اس کے بعد وہ لونڈی خود بخود آزاد سمجھی جائے گی اور ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ اُمّ وَلَد بیوی بہر حال آزاد سمجھی جائے گی خواہ بچہ کی پیدائش اسقاط کی صورت میں ہی ہو "

---

[1] بخاری کتاب العتق ، [2] ابوداؤد کتاب الجہاد ، [3] ابن ماجہ کتاب العتق ، [4] کشف الغمہ باب امہات الاولاد

غلاموں کی آزادی کے لیے ایک مستقل انتظام

یہ مختلف طریقے جبری آزادی کے تھے جو اسلام نے قائم کیے مگر ظاہر ہے کہ باوجود ان جبری آزادیوں کے پھر بھی بہت سے غلام ایسے رہ جاتے تھے جو ان صورتوں میں سے کسی صورت سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تھے اور دُوسری طرف عام سفارشی رنگ میں ان کا آزادی حاصل کرنا یقینی نہیں تھا اس لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسا مستقل اور پختہ انتظام کیا جاتا جس سے یہ موجود الوقت غلام خود بخود آزادی حاصل کرتے جاتے۔ سواس کے متعلق اسلام نے وُہ پُراز حکمت انتظام تجویز کیا جو مُکاتبت کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور جس میں مالک اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر غلام اپنے حالات کے لحاظ سے (جس کا فیصلہ حکومت یا عدالت کے ہاتھ میں ہوتا ہے نہ کہ مالک کے ہاتھ میں) آزادی کی اہلیت کو پہنچ چکا ہو تو وہ اس سے مناسب رقم پیدا کر لے کی شرط کر کے اُسے آزاد کر دے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ [1]

یعنی "اے مسلمانو! تمہارے غلاموں میں سے جو غلام تم سے مکاتبت کا عہد کرنا چاہیں تمہارا فرض ہے کہ اُن سے مکاتبت کا عہد کر کے انہیں آزاد کر دو بشرطیکہ وہ آزادی کے اہل بن چکے ہوں۔ اور ایسی صورت میں تمہارا یہ بھی فرض ہے کہ اس مال میں سے انہیں بھی حِصّہ دو جو دراصل تو خدا کا ہے مگر خدا نے اس مُکاتبت کے نتیجہ میں تمہیں عطا کیا ہے۔"

یہ آیت غلاموں کی جبری آزادی کے انتظام کا بنیادی پتھر ہے اور اس کے الفاظ بہت مختصر ہیں مگر اس کے معانی نہایت وسیع اور نہایت وقیع ہیں۔ اس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو غلام ان کے ساتھ مکاتبت کا عہد کر کے آزاد ہونا چاہیں ان کا فرض ہے کہ انہیں آزاد کر دیں بشرطیکہ وہ آزادی کے قابل بن چکے ہوں اور مکاتبت کے عہد سے یہ مراد ہے کہ غلام اور آقا کے درمیان یہ فیصلہ ہو جاوے کہ اگر غلام اپنے آقا کو اس قدر رقم ادا کر دیگا تو وہ آزاد سمجھا جائے گا اور اس کا طریق یہ تھا کہ اس قسم کے فیصلہ کے بعد غلام عملاً آزاد ہو جاتا تھا اور اس نیم آزادی کی حالت میں وہ کوئی کام یا پیشہ از قسم تجارت یا صنعت و حرفت یا زراعت یا ملازمت وغیرہ اختیار کر کے مکاتبت کی رقم پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا اور جب یہ رقم پوری ہو جاتی تھی تو وہ کلی طور پر آزاد سمجھا جاتا تھا اور مکاتبت کی رقم گو مالک کے تصرف میں سمجھی جاتی تھی مگر مالک کا یہ فرض تھا کہ اُس میں سے مناسب حِصّہ غلام کو بھی دے۔ یہ انتظام ایسا مبارک اور پُرحکمت تھا کہ اس کے نتیجہ میں غلاموں میں سے اہل لوگ نہ صرف خود بخود بطور حق کے آزاد ہوتے چلے جاتے

---

[1] سورۃ نور: ۳۴

تھے بلکہ بوجہ اس کے کہ انہیں مکاتبت کی رقم پوری کرنے کے لیے کسی آزادانہ کام میں پڑنا پڑتا تھا اور ایک سول معاہدہ کی ذمہ داری برداشت کرنی پڑتی تھی اُن میں آزاد زندگی گذارنے اور ملک کے مفید شہری بننے کی قابلیت بھی پیدا ہو جاتی تھی۔

مکاتبت کا یہ انتظام مالک کی مرضی پر منحصر نہیں تھا بلکہ جبری تھا۔ یعنی غلام کی طرف سے مکاتبت کا مطالبہ ہونے پر مالک کو انکار کا حق نہیں ہوتا اور یہ کام عدالت یا حکومت کا تھا کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ آیا غلام آزادی کے قابل ہو چکا ہے یا نہیں؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ:۔

اِنَّ سِیْرِیْنَ سَأَلَ اَنَساً الْمُکَاتَبَةَ وَکَانَ کَثِیْرَ الْمَالِ فَاَبٰی فَانْطَلَقَ اِلٰی عُمَرَ فَقَالَ کَاتِبْهُ فَاَبٰی فَضَرَبَهُ بِالدُّرَّةِ وَیَتْلُوْ عُمَرُ فَکَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْراً فَکَاتَبَهُ[1]

یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی انسؓ کا ایک غلام تھا جس کا نام سیرین تھا اس نے انس کے ساتھ مکاتبت کرنی چاہی مگر انس نے یہ خیال کر کے کہ میرے پاس بہت روپیہ ہے مجھے مکاتبت کے روپے کی ضرورت نہیں ہے۔ مکاتبت سے انکار کر دیا۔ اس پر سیرین نے حضرت عمرؓ کے پاس حضرت انسؓ کی شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے سیرین کی شکایت سُن کر انسؓ کو حکم دیا کہ وہ مکاتبت کریں لیکن انس نے پھر بھی نہ مانا۔ جس پر حضرت عمرؓ نے انسؓ کو دُرّہ سے مارا اور یہ قرآنی آیت سُنائی کہ "اے مسلمانو! اگر تمہارے غلام تمہارے ساتھ مکاتبت کرنا چاہیں تو تمہارا فرض ہے کہ ان کے ساتھ مکاتبت کرو۔ اس پر انس نے سیرین سے مکاتبت کا عہد کر لیا"

مکاتبت کی فرضیت کا دارومدار اس بات پر تھا کہ آیا کوئی غلام آزادی حاصل کرنے کا اہل بن چکا ہے یا نہیں؛ چنانچہ یحییٰ بن کثیر سے روایت آتی ہے کہ:۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَکَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْراً قَالَ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ حِرْفَةً وَلَا تُرْسِلُوْهُمْ کَلًّا عَلَی النَّاسِ[2]

یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو قرآن شریف میں آتا ہے کہ "اگر تم غلاموں میں بھلائی پاؤ تو تمہارا فرض ہے کہ تم مکاتبت سے انکار نہ کرو۔ اس میں بھلائی سے مراد پیشہ وغیرہ کی اہلیت ہے یعنی مقصود یہ ہے کہ ایسے غلاموں کے ساتھ مکاتبت ضروری ہو جاتی ہے جو کوئی پیشہ یا کام وغیرہ جانتے ہوں یا جلد سیکھ سکتے ہوں تاکہ وہ آزادی حاصل کرنے کے بعد سوسائٹی پر کسی قسم کے بوجھ کا باعث نہ بنیں"

اور یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کہ کوئی غلام اس بات کی اہلیت کو پہنچا ہے یا نہیں حکومت

---

[1] بخاری کتاب المکاتب ؞ [2] ابوداؤد بحوالہ تفسیر ابن کثیر زیر تفسیر آیت مکاتبت ؞

کے ہاتھ میں تھا نہ کہ مالک کی مرضی پر۔ یہ حدیث اس بات کو بھی واضح کرتی ہے کہ دراصل اسلامی تعلیم کا اصل منشا یہی تھا کہ موجود الوقت غلاموں کی حالت کو بہتر بنا کر انہیں آزادی کے قابل بنایا جاوے اور جُوں جُوں یہ غلام آزادی کے قابل ہوتے جائیں تُوں تُوں انہیں آزادی ملتی جاوے۔

یہ مکاتبت کا طریق چونکہ غلاموں کی آزادی کے انتظام کا بنیادی پتھر تھا اس لیے اسلام میں اسے نہایت پسندیدہ سمجھا گیا ہے؛ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَوْنُهُمُ الْمُكَاتِبُ الَّذِیْ يُرِيْدُ الْاَدَاءَ وَالنَّاكِحُ الَّذِیْ يُرِيْدُ الْعِفَافَ وَالْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[1]

یعنی "ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت کو اپنے اوپر ایک حق کے طور پر قرار دے لیا ہے۔ اوّل مکاتب غلام جو اپنی مکاتبت کی رقم کی ادائیگی کی فکر میں ہے۔ دوسرے وہ شادی کرنیوالا شخص جو اپنی عفت کے بچانے کی نیت رکھتا ہے اور تیسرے مجاہد فی سبیل اللہ۔"

غلاموں کی آزادی کی تحریک صرف افراد تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اسلامی سلطنت کا بھی یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ قومی بیت المال میں سے ایک معتدبہ حصہ غلاموں کے آزاد کرانے میں صرف کرے؛ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ[2]

یعنی "زکوٰۃ کے اموال فقراء اور مساکین پر خرچ ہونے چاہئیں اور محکمہ زکوٰۃ کے عاملین پر اور کمزور نومسلموں پر اور غلاموں کے آزاد کرنے میں۔ اور مقروضوں کے قرض کی ادائیگی میں اور اشاعت دین کے لیے اور مسافروں کو آرام پہنچانے کے لیے۔ یہ ایک فرض ہے جو اللہ تعالےٰ نے مقرر کیا۔"

اس آیت کی رُو سے اسلامی سلطنت کا فرض مقرر کیا گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے محاصل میں سے غلاموں کی آزادی پر روپیہ خرچ کرے۔

آزاد شدہ غلاموں کے متعلق تعلیم

غلاموں کی آزادی کے اس انتظام میں اس بات کو بھی مدنظر رکھا گیا تھا کہ آزاد ہونے کے بعد بھی آزاد شدہ غلام بالکل بے سہارا اور بے یار و مددگار نہ رہیں؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا انتظام فرمایا تھا کہ

---

[1] ترمذی و نسائی و ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ کتاب النکاح ، [2] سورۃ توبہ : ۶۰

مالک اور آزاد شدہ غلام کے درمیان ایک قسم کا رشتۂ اخوت مستقل طور پر قائم رہے؛ چنانچہ آپ کے حکم کے ماتحت مالک اور آزاد شدہ غلام ایک دُوسرے کے "مولیٰ" یعنی دوست اور مددگار کہلاتے تھے تاکہ آقا اور غلام دونوں کے دلوں میں یہ احساس رہے کہ ہم ایک دُوسرے کے دوست ہیں اور بوقتِ ضرورت ہم نے ایک دُوسرے کے کام آنا ہے اسی مصلحت کے ماتحت آزاد شدہ غلام اور مالک کو ایک دُوسرے کے متعلق حقِ موروثیت بھی عطا کیا گیا تھا۔ یعنی اگر غلام بے وارث مرتا تھا تو اس کا ترکہ اس کے سابقہ آقا کو جاتا تھا اور اگر مالک بے وارث رہ جاتا تھا تو اس کا ورثہ اس کے آزاد کردہ غلام کو ملتا تھا؛ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنَّ الْوَلَاءَ لِمَنْ اَعْتَقَ[1] وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلًا مَاتَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلَمْ يَدَعْ وَارِثًا اِلَّا عَبْدًا هُوَ اَعْتَقَهٗ فَاَعْطَاهُ النَّبِيُّ ﷺ مِيْرَاثَهٗ[2]

یعنی "عائشہ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی آزاد شدہ غلام لاوارث مر جاوے تو اس کا ترکہ اس کے سابق مالک کو ملے گا اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص ایسی حالت میں مر گیا کہ اس کا کوئی وارث نہیں تھا؛ البتہ اس کا ایک آزاد شدہ غلام تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ترکہ اس کے آزاد شدہ غلام کو عطا فرما دیا۔"

چونکہ اس حقِ موروثیت کی بنیاد مالی اور اقتصادی خیالات پر مبنی نہیں تھی بلکہ اصل منشاء مالک اور آزاد شدہ غلام کے تعلق کو قائم رکھنا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم جاری فرمایا کہ یہ حقِ موروثیت کسی صورت میں بھی بیع یا ہبہ وغیرہ نہیں ہو سکتا؛ چنانچہ ابن عمرؓ سے روایت آتی ہے کہ:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَهِبَتِهٖ[3]

یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد شدہ غلام اور آقا کے حقِ موروث کی خرید و فروخت اور اس کے ہبہ وغیرہ سے منع فرمایا ہے۔"

پھر آزاد شدہ غلاموں کی عزت و احترام کے قیام کے لیے حدیث میں آتا ہے۔

عَنْ عَائِذِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ اَبَا سُفْيَانَ اَتٰى عَلٰى سَلْمَانَ وَصُهَيْبٍ وَبِلَالٍ فِيْ نَفَرٍ فَقَالُوْا وَاللّٰهِ مَا اَخَذَتْ سُيُوْفُ اللّٰهِ مِنْ عُنُقِ عَدُوِّ اللّٰهِ مَاْخَذَهَا قَالَ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَتَقُوْلُوْنَ هٰذَا لِشَيْخِ قُرَيْشٍ وَسَيِّدِهِمْ فَاَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَاَخْبَرَهٗ فَقَالَ يَا اَبَابَكْرٍ

---

[1] بخاری کتاب العتق ۔ [2] ترمذی ابواب الفرائض و ابوداؤد و ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ ۔
[3] بخاری کتاب العتق ۔

لَعَلَّكَ اَغْضَبْتَهُمْ لَئِنْ كُنْتَ اَغْضَبْتَهُمْ لَقَدْ اَغْضَبْتَ رَبَّكَ فَاَتَاهُمْ اَبُوْبَكْرٍ فَقَالَ يَا اِخْوَتَاهُ اَغْضَبْتُكُمْ قَالُوْا لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ يَا اُخَيَّ [1]

یعنی" ایک دفعہ سلمان اور صہیب اور بلال وغیرہ جو آزاد شدہ غلام تھے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے ان کے سامنے سے ابوسفیان گذرا تو انہوں نے آپس میں کہا کہ" یہ خدا کا دشمن خدائی تلوار سے بچ گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کی یہ بات سُنی تو انہیں فہمائش کی اور کہا کہ کیا تم قریش کے سردار کے متعلق ایسی بات کہتے ہو؟ اس کے بعد ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے سارا ماجرا عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ ابوبکر! تم نے بلال وغیرہ کو کہیں ناراض تو نہیں کر دیا؟ اگر تم نے انہیں ناراض کیا ہے تو ان کی ناراضگی میں خدا کی ناراضگی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ فوراً بلال وغیرہ کے پاس واپس آئے اور کہا۔ بھائیو! تم میری بات پر ناراض تو نہیں ہوئے۔ اُنھوں نے کہا۔ نہیں بھائی ہم ناراض نہیں ہوئے فکر نہ کرو۔"

مُسلمانوں نے غلاموں کی آزادی کی تعلیم پر کس طرح عمل کیا

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ ان سفارشات اور ان کفّارہ جات اور جبری آزادیوں اور اس انتظامِ مکاتبت کے نتیجے میں غلاموں کی آزادی عملاً بھی وقوع میں آئی یا نہیں؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس زمانہ میں غلام نہایت کثرت کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض ممالک میں بعض اوقات غلاموں کی تعداد اصل آبادی سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی [2] پس اس غیر متناہی ذخیرہ کو ختم کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور نہ ہی یہ سارے غلام محدود اسلامی سلطنت اور محدود تر مسلمان مالکوں کے ماتحت تھے۔ پس لازماً یہ آزادی کی تحریک آہستہ آہستہ ہی چل سکتی تھی، لیکن تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاں تک صحابہ اور اُن کے متبعین کی کوشش کا تعلق تھا انہوں نے غلاموں کے آزاد کرنے اور آزاد کرانے میں اپنی پوری توجہ اور پوری سعی سے کام لیا اور وہ نمونہ دکھایا جو یقیناً تاریخ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان نہ صرف اپنے ہاتھ میں آتے ہوئے غلاموں کو کثرت سے آزاد کرتے رہتے تھے بلکہ خاص اس نیت اور اس ارادے سے غلام خریدتے بھی تھے کہ انہیں خرید کر آزاد کر دیں اور اس طرح بے شمار غلام مسلمانوں کی مساعی جمیلہ سے داغِ غلامی سے نجات پا گئے؛ چنانچہ مندرجہ ذیل فہرست جو یقیناً مکمل نہیں ہے اور جس میں نمونہ کے طور پر صرف چند صحابیوں کا نام لیا گیا ہے ہمارے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ سُبُلُ السّلام میں روایت آتی ہے کہ:۔

---

[1] مسلم باب فضائل سلمان و صہیب و بلال ۔

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا بحث غلامی ۔ [3] سُبُلُ السّلام شرح بلوغ المرام کتاب العتق ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے	تریسٹھ [۶۳]	غلام آزاد کئے
حضرت عائشہؓ نے	سڑسٹھ [۶۷]	〃 〃 〃
حضرت عباسؓ نے	ستر [۷۰]	〃 〃 〃
حکیم بن حزام نے	یکصد [۱۰۰]	〃 〃 〃
عبداللہ بن عمر نے	ایکہزار [۱۰۰۰]	〃 〃 〃
عبدالرحمٰن بن عوف نے	تین ہزار	〃 〃 〃
حضرت عثمان بن عفان نے	۲۰۰۰۰ بیس ہزار	〃 〃 〃 صرف ایک دن میں جو اُن کی شہادت کا دن تھا ورنہ انکی مجموعی تعداد بہت زیادہ تھی۔
ذوالکلاع الحمیری نے	۸۰۰۰ آٹھ ہزار	〃 〃 〃 صرف ایک دن میں
میزان	۳۲۳۲۰ [۱]	

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس روایت میں بطور نمونہ صرف چند صحابہ کا نام لیا گیا ہے اور اگر اسی نسبت سے دوسرے کثیر التعداد صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے متعلق قیاس کیا جاوے تو یہ تعداد یقیناً کروڑوں سے اوپر پہنچتی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس روایت میں جو تعداد مذکورہ بالا صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی بیان کی گئی ہے وہ بھی درست نہیں بلکہ اصل تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ کے متعلق ایک روایت سے ثابت ہے کہ انھوں نے صرف ایک موقعہ پر چالیس غلام آزاد کئے تھے[۲] اور دوسری روایت سے پتہ لگتا ہے کہ ان کا یہ طریق تھا کہ وہ نہایت کثرت کے ساتھ غلام آزاد کیا کرتی تھیں پس ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انہوں نے ساری عمر میں صرف سڑسٹھ [۶۷] غلام آزاد کئے تھے یقیناً درست نہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو تعداد بتائی گئی ہے وہ گو آپؐ کی ذاتی حیثیت میں درست ہو کیونکہ آپؐ کی ذاتی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور آپؐ ان احکامات کے جاری ہونے کے بعد زندہ بھی بہت تھوڑا عرصہ رہے تھے لیکن یقیناً اس تعداد میں وہ غلام شامل نہیں ہیں جو آپؐ نے اسلامی حکومت کے ہیڈ ہونے کی حیثیت میں آزاد کئے اور جن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ آپؐ کے متعلق بہت سی روایات سے ثابت ہے کہ کبھی کوئی ایک غلام بھی آپؐ کے قبضہ میں

---

[۱] سبل السلام شرح بلوغ المرام کتاب العتق ۔

[۲] بخاری کتاب الادب باب الہجرت ۔

نہیں آیا کہ اُسے آپ نے آزاد نہ کر دیا ہو؛ چنانچہ مندرجہ ذیل روایت میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْحَارِثِ اَخِیْ جُوَیْرِیَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِیْنَ قَالَ مَا تَرَکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عِنْدَ مَوْتِہٖ دِرْھَمًا وَلَا دِیْنَارًا وَلَا عَبْدًا وَلَا اَمَةً [1]

یعنی "عمرو بن الحارث سے روایت ہے جو ام المؤمنین جویریہؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سالے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موت کے وقت کوئی درہم کوئی دینار، کوئی غلام اور کوئی لونڈی اپنے پیچھے نہیں چھوڑی۔"

الغرض اسلام کی یہ تعلیم جو اس نے غلاموں کے متعلق دی صرف کاغذوں کی زینت نہیں تھی بلکہ یہ تعلیم اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی طریقِ معاشرت کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی اور افراد و حکومت دونوں پورے شوق کے ساتھ اس پر عمل پیرا تھے۔

آزاد شدہ غلاموں کیلئے تمام ترقی کے دروازے کھلے تھے

یہ بتایا جا چکا ہے کہ غلاموں کو آزادی اس اطمینان کے بعد دی جاتی تھی کہ وہ اخلاق و عادات اور روزی کمانے کی اہلیت کے لحاظ سے آزادی کے قابل ہو جائیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو غلام آزاد کئے جاتے تھے وہ واقعی مفید شہری بن جاتے تھے اور اسلامی سوسائٹی میں ویسے ہی معزز و مکرّم سمجھے جاتے تھے جیسے کہ دُوسرے لوگ۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ لوگوں کے پرانے خیالات کی اصلاح کی غرض سے آپ غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں میں سے قابل لوگوں کی تعظیم و تکریم کا خیال دوسرے لوگوں کی نسبت بھی زیادہ رکھتے تھے چنانچہ آپ نے بہت سے موقعوں پر اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ اور ان کے لڑکے اسامہ بن زید کو جنگی مہموں میں امیر مقرر فرمایا اور بڑے بڑے صاحب عزت اور جلیل القدر صحابیوں کو اُن کے ماتحت رکھا اور جب ناسمجھ لوگوں نے اپنے پُرانے خیالات کی بناء پر آپ کے اس فعل پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا:۔

اِنْ تَطْعَنُوْا فِیْ اِمَارَتِہٖ فَقَدْ کُنْتُمْ تَطْعَنُوْنَ فِیْ اِمَارَةِ اَبِیْہِ مِنْ قَبْلُ وَاَیْمُ اللّٰہِ اِنْ کَانَ لَخَلِیْقًا لِلْاِمَارَةِ وَاِنْ کَانَ لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ وَاِنَّ ھٰذَا لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ بَعْدَہٗ [2]

یعنی "تم لوگوں نے اسامہ کے امیر بنائے جانے پر اعتراض کیا ہے اور اس سے پہلے تم اس کے باپ زید کی امارت پر بھی طعن کر چکے ہو، مگر خدا کی قسم جس طرح زید امارت کا

---

[1] بخاری بروایت مشکوٰۃ باب وفات النبی ﷺ ؁ [2] بخاری کتاب فضائل اصحاب ؁

حقدار اور اہل تھا اور میرے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا اسی طرح اسامہ بھی امارت کا اہل ہے اور میرے محبوب ترین لوگوں میں سے ہے۔"

پھر اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ آپؐ نے اپنی حقیقی پھوپھی کی لڑکی زینب بنت جحش کو زید بن حارثہ سے بیاہ دیا اور عجیب کرشمہ یہ ہے کہ سارے قرآن میں اگر کسی صحابی کا نام مذکور ہوا ہے تو وہ یہی زید بن حارثہ ہیں۔[1] پھر علم وفضل میں بھی بعض آزاد شدہ غلاموں نے بہت بڑا رتبہ حاصل کیا؛ چنانچہ سالم بن معقل مولی ابی حذیفہ خاص الخاص علماء صحابہ میں سے سمجھے جاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی تعلیم کے لیے جن چار صحابیوں کو مقرر فرمایا تھا اُن میں سے ایک سالم بھی تھے۔[2] اور تقویٰ وطہارت کی وجہ سے تعظیم وتکریم کا یہ حال تھا کہ حضرت عمرؓ بلالؓ کے متعلق اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ ہمارا سردار ہے۔[3] پھر صحابہ کے بعد بھی بعض آزاد شدہ غلاموں نے اسلامی سوسائٹی میں بہت بڑا مرتبہ حاصل کیا؛ چنانچہ عطاء بن ابی رباح۔ مجاہد بن جُبیر۔ نافع مولیٰ ابن عمر اور موسیٰ بن عقبہ بزرگ ترین تابعین میں سے سمجھے جاتے تھے۔ جن کے سامنے بڑے بڑے جلیل القدر لوگ زانوئے تلمذی طے کرتے تھے۔[4]

تمام غلاموں کو یکلخت کیوں آزاد کر دیا گیا

پیشتر اس کے کہ ہم اس بحث کو ختم کریں اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ جب اسلام غلاموں کی آزادی اور رستگاری کا پیغام لیکر آیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ تمام حاضر الوقت غلاموں کو یکلخت حکماً آزاد کروا دیا؟ سو اس کا مختصر اور سادہ جواب تو صرف اس قدر ہے کہ آپؐ نے اس لیے ایسا نہیں کیا کہ آپؐ غلاموں کے حقیقی دوست تھے اور آپؐ کا کام اصلاح کرنا تھا نہ کہ نمائش۔ پس آپؐ نے کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھایا جو بظاہر تو دوستی کا رنگ رکھتا ہو، لیکن حقیقتہً وہ غلاموں کے لیے نقصان دہ اور ملک کی ترقی اور تمدن کے لیے ضرر رساں ہو۔ ہر اک عقلمند شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت کے حالات کے ماتحت لاکھوں غلاموں کا یک لخت آزاد ہو جانا غلاموں کو ایک ایسی بے سہارا اور غیر محفوظ حالت میں چھوڑ دیتا جو ان کے لیے کئی لحاظ سے خطرناک ہو سکتی تھی اور اس زمانہ کے حالات کے ماتحت اس فوری اور عالمگیر آزادی کا نتیجہ یقیناً یہ ہوتا کہ ان آزاد شدہ غلاموں میں سے اگر ایک حصہ غربت کی حالت میں فاقوں سے مرتا تو دوسرا حصہ بیکاری اور ارتکاب جرائم کی طرف مائل ہو کر اپنی اخلاقی تباہی اور ملک وقوم کی بے چینی اور بدامنی کا باعث بن جاتا۔ انقلابی تجاویز خواہ بعض اوقات جذباتی رنگ میں کیسی ہی دلخوش کن نظر آئیں مگر حقیقتہً وہ اکثر صورتوں میں نفع مند ثابت نہیں ہوتیں بلکہ بعض صورتوں میں تو ان سے افراد کے عادات وخصائل اور قوم کی اجتماعی زندگی اور تمدن پر خطرناک اثر پڑتا ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سورۃ احزاب: ۳۸ [2] ؛ [3] بخاری کتاب فضائل [4] تہذیب التہذیب

جوایک حقیقی مصلح تھے اور غلاموں کے لیے وہ کام کرنا چاہتے تھے جو اُن کے لیے فی الواقع مفید اور بابرکت ہو۔ ایسے رستہ پر قدم زن نہیں ہوئے جو عرب کی سوسائٹی میں ایک تباہ کن زلزلہ پیدا کرنے والا ثابت ہوتا۔ اور غلاموں کو اس سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا۔ خوب سوچ لو کہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت لاکھوں غلاموں کو بغیر کسی دُور اندیشانہ انتظام کے یک لخت آزاد کر دینے کے یقیناً یہ معنے تھے کہ ان غلاموں کی دُنیا بھی تباہ ہوتی اور دین بھی۔ یعنی دنیا کے لحاظ سے ان میں سے اکثر نہ صرف بالکل بے سہارا اور بے ذریعہ معاش رہ جاتے۔ بلکہ ان کے لیے کسب سیکھنے کے موقعے بھی میسر نہ رہتے اور دینی لحاظ سے اُن کی یہ فوری اور عالمگیر آزادی ان کے اخلاق و عادات پر ایک نہایت ضرر رساں اثر پیدا کرتی خصوصاً جبکہ ایک بہت لمبے عرصے کی ظالمانہ غلامی کے نتیجہ میں اُن کے اندر دنائت اور سنگدلی اور اسی قسم کے دوسرے مذموم اخلاق پیدا ہو چکے تھے جو فوری آزادی کے نتیجہ میں نہ معلوم کس رستے پر پڑ کر کیا کیا رنگ لاتے اور اس عالمگیر آزادی کے نتیجے میں جو دوسرے مضر اثرات سوسائٹی پر پڑ سکتے تھے وہ مزید براں تھے۔ پس اسلام نے کمال دانشمندی سے یہ تجویز اختیار فرمائی کہ ایک طرف تو آئندہ کے لیے غلامی کے ظالمانہ طریقوں کو بند کر کے اس حلقہ کی مزید وسعت کو روک دیا جیسا کہ آگے چل کر اس کی بحث آئیگی اور دوسری طرف وقتی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے موجود الوقت غلاموں کی اخلاقی اور معاشرتی اور اقتصادی اصلاح و بہبودی کے لیے عملی تدابیر اختیار فرمائیں اور ساتھ ہی یہ انتظام فرمایا کہ جوں جوں یہ غلام آزاد زندگی کو مفید طور پر بسر کرنے کے قابل ہوتے جائیں توں توں وہ لازماً آزاد بھی ہوتے جائیں اور یہی وہ حقیقی اصلاح کا طریق تھا جو اس زمانے کے حالات کے ماتحت بہترین نتائج کی اُمید کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا تھا بلکہ اس انتظام کا تفصیلی مطالعہ اس بات میں ذرا بھی شک نہیں رہنے دیتا کہ یہ ایک عدیم المثال نظام تھا جس کی نظیر نہ تو اس سے پہلے کسی زمانہ میں نظر آتی ہے اور نہ اس کے بعد آج تک ایسا نمونہ کسی قوم نے دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

اگر اس جگہ کسی کو یہ شُبہ پیدا ہو کہ گذشتہ صدی کے دوران بہت سے یورپین اور امریکن مصلح ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں کو غلاموں کی آزادی کی تحریک میں گویا وقف کر دیا تھا اور ان کی کوششوں کے نتیجے میں دنیا کے بیشتر ممالک میں غلامی کا سلسلہ یکلخت منسوخ ہو گیا تھا۔ مثلاً ابراہام لنکن نے جو اپنے وقت میں امریکہ کی جمہوری سلطنت کا صدر تھا۔ امریکہ کے لاکھوں حبشی غلاموں کو یکلخت آزادی دلا دی اور اس فوری اور عالمگیر آزادی کا کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلا بلکہ ابراہام لنکن کی یہ خدمت انتہائی تحسین کی نظر سے دیکھی جاتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو آج سے چودہ سو سال قبل کے زمانہ اور آج کے زمانہ کے حالات میں زمین و آسمان کا اختلاف ہے اور چونکہ اسلام کی یہ تعلیم جو اس زمانہ کے غلاموں کی تدریجی آزادی کے متعلق دی گئی تھی اُس زمانہ کے حالات کے ماتحت تھی اور مستقل تعلیم اسلام کی اس بارے میں اور تھی جس کا ذکر آگے آتا ہے اس لیے عقلاً یہ مقابلہ کسی صورت میں دُرست نہیں سمجھا جا سکتا۔ پس اگر موجودہ زمانہ کے

حالات میں فوری اور عالمگیر آزادی مضر ثابت نہیں ہوئی تو اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ آج سے پہلے زمانوں اور آج کی نسبت دوسری قسم کے حالات میں بھی یہ طریق ضرر رساں ثابت نہ ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غلاموں کی اخلاقی اور معاشرتی حالت نہایت درجہ پست تھی اور دُوسری طرف دُنیا کا تہذیب و تمدن بھی اس تہذیب و تمدن سے بالکل جُدا تھا جو آجکل دُنیا میں پایا جاتا ہے۔ پس اس زمانہ کے حالات کے ماتحت یہی مناسب تھا کہ بجائے فوری اور عالمگیر آزادی کے تدریجی آزادی کے طریق کو اختیار کیا جاتا ورنہ نتیجہ بجائے مفید ہونے کے یقیناً مضر ہوتا تھا۔ یہ ایک اُصولی جواب ہے جو اس اعتراض کا دیا جا سکتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ جو تجاویز اسلام نے اختیار کیں وہ بہرحال زیادہ مفید اور نفع مند تھیں اور ہر غیر متعصب شخص جو ٹھنڈے طور پر اس مسئلہ کے متعلق غور کریگا وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا جو ہم نے بیان کیا ہے۔ حضرت مسیح ناصری کا ایک نہایت سچا مقولہ ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پس ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ان دونوں قسم کے طریقوں میں سے کس طریق کے نتائج زیادہ مفید اور زیادہ نفع مند ثابت ہوتے ہیں آیا اس طریق کے جو اسلام نے آج سے چودہ سو سال قبل اختیار کیا تھا یا اس طریق کے جو موجودہ زمانہ میں بعض یورپین اور امریکن مصلحین نے اختیار کیا ہے؟ اس جگہ ہم کسی تفصیلی بحث میں داخل نہیں ہو سکتے، صرف موٹے طور پر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان ہر دو طریقوں کے نتائج کی نسبتی خوبی کا دو طرح پر امتحان کیا جا سکتا ہے۔ اوّل اس پہلو سے کہ ان طریقوں میں سے کس طریقہ کے نتیجہ میں زیادہ حقیقی آزادی قائم ہوئی۔ دُوسرے اس پہلو سے کہ ان میں سے کس طریقہ کے نتیجہ میں آزاد شدہ غلاموں نے زیادہ ترقی کی۔ اور ہم دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے وہ طریقہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو برس قبل اختیار کیا تھا اس طریقہ سے بدرجہا بہتر تھا، جو بعض مغربی مصلحین نے اس زمانہ میں اختیار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف نام کے طور پر کسی غلام کو آزاد کر دینا مگر غلامی کی اصل رُوح کو نہ مارنا ہرگز حقیقی آزادی کا فعل نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن غور سے دیکھا جائے تو جو اصلاح مغربی مصلحین نے کی ہے وہ کسی صورت میں بھی اس نام نہاد اصلاح سے بڑھ کر نہیں۔ بیشک انھوں نے لاکھوں غلاموں کو آزاد کیا اور یکلخت حکماً آزاد کیا مگر وہ غلامی کی رُوح کو نہیں مار سکے بلکہ اس آزادی کے بعد بھی آزاد کرنے والوں اور آئندہ آزاد ہونے والوں کے دل و دماغ میں غلام بنانے اور غلام بننے کی رُوح اسی طرح زندہ رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی طور پر غلامی بھی نہ مٹی اور آقاؤں اور غلاموں کے تعلقات بھی سخت کشیدہ ہو گئے۔ امریکہ کی ہی مثال لے لو۔ بیشک ریاستہائے متحدہ میں بظاہر لاکھوں حبشی غلاموں نے یکلخت آزادی حاصل کر لی مگر قطع نظر اس کے کہ اس عالمگیر آزادی کی وجہ سے ملک ایک خطرناک خانہ جنگی کی آگ سے شعلہ بار ہو گیا تھا۔ کیا اس وقت امریکہ کا حبشی غلام واقعی آزاد ہو گیا تھا؟ بلکہ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اس وقت تک بھی ملک کا کوئی قانون امریکہ کے حبشی غلام کو حقیقی آزادی دلا سکا ہے؟ کیا امریکہ کا گورا آدمی اپنے آزاد کردہ حبشی غلام کو آج تک

دُنیا کے بدترین غلاموں سے عملاً بدتر نہیں سمجھتا؟ پھر کیا یہ آزاد شدہ حبشی اپنے آپ کو حقیقی طور پر امریکہ میں آزاد سمجھتا ہے؟ یقیناً امریکہ میں آزاد کرنے والے گورے لوگوں اور آزاد ہونے والے کالے حبشیوں کے تعلقات بین الاقوام تعلقات کی بدترین مثال ہیں۔ جو اس وقت دُنیا میں پائی جاتی ہے اور یہ حالت اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان غلاموں کے آزاد کرنے میں وہ طریق اختیار کیا گیا ہے جس سے غلام لوگ نام کو تو بیشک آزاد ہو گئے مگر ان کو حقیقی آزادی نہیں مل سکی اور آزاد کرنے والوں اور آزاد ہونے والوں کی ذہنیتوں میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی طریق پر جو لوگ آزاد کئے گئے وہ گو تدریجی طور پر آزاد ہوتے مگر آزاد ہونے کے بعد وہ حقیقۃً آزاد تھے۔ یعنی ان کے جسم بھی آزاد تھے، اُن کی رُوحیں بھی آزاد تھیں، ان کے خیالات بھی آزاد تھے اُن کی ذہنیتیں بھی آزاد تھیں اور ان آزاد شدہ غلاموں اور ان کے آزاد کرنے والے لوگوں کے درمیان وہ محبت و اخلاص کے تعلقات قائم ہو گئے تھے کہ آج کی حقیقی اخوت بھی ان کے سامنے شرماتی ہے۔ میں جب اس زمانہ کے امریکن حبشی ٹام اور آج سے چودہ سو سال قبل کے عربی حبشی بلالؓ کے حالات پر نگاہ کرتا ہوں تو ایک عجیب منظر نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ دونوں شخص حبشی ہیں اور دونوں آزاد شدہ غلام ہیں۔ عربی غلام (یعنی بلالؓ) جب بادشاہ وقت (یعنی عمر بن الخطاب) سے ملنے کے لیے جاتا ہے تو باوجود اس کے کہ اُس وقت بڑے بڑے رؤساء عرب بادشاہ کی ملاقات کے انتظار میں دروازے پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ بادشاہِ وقت بلالؓ کی خبر پاکر ان رؤساء عرب کو جو وہ بھی مسلمان ہی تھے نہیں بلاتا اور بلالؓ کو فوراً بُلا لیتا ہے اور جب بلالؓ ملاقات سے فارغ ہو کر چلا جاتا ہے تو پھر اس کے بعد ان رؤساء عرب کی باری آتی ہے اور جب اس بادشاہ کی مجلس میں بلال کا ذکر آتا ہے تو بادشاہ کہتا ہے "بلالؓ ہمارا سردار ہے"۔ لیکن اس کے مقابلہ میں امریکہ کے آزاد شدہ حبشی ٹام کی کیا حیثیت ہے؟ دُنیا جانتی ہے کہ وہ اپنے آزاد کرنے والوں کے پاؤں کی ٹھوکریں کھاتا اور مجلسوں میں ذلت کی جگہوں میں بٹھایا جاتا اور ہر قسم کے مظالم سہتا اور دم نہیں مار سکتا۔ یہ اختلاف کیوں ہے؟ یقیناً اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام نے جو طریق غلاموں کی آزادی کا اختیار کیا، وہ حقیقی اصلاح کا طریق تھا۔ پس اس کے نتیجہ میں حقیقی آزادی پیدا ہوئی، لیکن مغربی مصلحین کی اصلاح ناقص اور اُن کا طریق غلط تھا۔ پس اس کے نتیجہ میں بیشک ٹام کو تو آزادی مل گئی، مگر غلامی کی رُوح پر موت نہیں آئی اور ذہنیتیں وہی کی وہی رہیں۔

دوسرا طریق اس سوال پر غور کرنے کا یہ ہے کہ یہ دیکھا جاوے کہ ان طریقوں میں سے کس طریق کے نتیجہ میں آزاد شدہ غلاموں نے زیادہ ترقی کی۔ سو مذکورہ بالا بحث کے بعد اس سوال کا جواب بھی مشکل نہیں رہتا۔ کیونکہ طبعاً وہی رستہ غلاموں کی زیادہ ترقی کا ہونا چاہیئے، جس میں انہیں زیادہ حقیقی آزادی حاصل ہو۔

---

[1] اصابہ و اسد الغابہ احوال بلال و ابو سفیان و سہیل بن عمرو

اور وہ وہی تھا جو اسلام نے اختیار کیا۔ مگر عملاً بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس جہت سے بھی اسلامی طریق زیادہ کامیاب اور زیادہ مفید نظر آتا ہے کیونکہ اسلامی طریق پر آزاد ہونے والے لوگوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی نظر آتی ہے جو ہر قسم کے میدان میں ترقی کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچے ہیں اور جنھوں نے مختلف شعبوں میں مسلمانوں میں لیڈر ہونے کا مرتبہ حاصل کیا۔ مثلاً جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے صحابہ میں زید بن حارثہ ایک آزاد شدہ غلام تھے مگر انھوں نے اتنی قابلیت پیدا کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قابلیت کی وجہ سے بہت سی اسلامی مہموں میں انہیں امیر العسکر مقرر فرمایا اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابی حتیٰ کہ خالد بن ولید جیسے کامیاب جرنیل بھی ان کی ماتحتی میں رکھے۔ پھر سالم بن معقل تھے جو ابو حذیفہ بن عتبہ کے معمولی آزاد کردہ غلام تھے، مگر وہ اپنے علم و فضل میں اتنی ترقی کر گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار صحابیوں کو قرآن شریف کی تعلیم کے لیے مسلمانوں میں مقرر فرمایا تھا اور اس معاملہ میں گویا انہیں اپنا نائب بننے کے قابل سمجھا تھا، ان میں ایک سالم بھی تھے۔ اسی طرح صحابہ کے بعد نافع مولیٰ ابن عمر اور عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور مکحول بن عبداللہ اور عطاء بن ابی رباح اور عبداللہ بن مبارک اور محمد بن سیرین حدیث اور فقہ کے امام مانے جاتے تھے جن کی شاگردی کو بڑے بڑے جلیل القدر لوگ فخر خیال کرتے تھے۔ پھر حسن بصری تصوف میں اور مجاہد بن جُبیر علم قرأت میں یکتائے زمانہ تھے اور موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق علم تاریخ میں استاذ الکل تھے جن کے علم کا لوہا دنیا مانتی تھی۔ مگر یہ سب لوگ معمولی غلام سے اس مرتبہ کو پہنچے تھے[1]۔ پھر ہندوستان کا خاندانِ غلاماں بھی جس کے بعض ممبروں نے سیاست اور ملک داری میں کمال پیدا کیا کسی معرفی کا محتاج نہیں۔ یہ درخشندہ مثالیں جو صرف بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں (ورنہ اسلام کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے) اسلامی طریقِ آزادی کا ثمرہ ہیں۔ مگر اس کے مقابلہ میں مغربی مصلحین کی اصلاح کا ثمرہ کیا ہے؟ کیا سارے یورپ و امریکہ اور سارے افریقہ و آسٹریلیا میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نظر آتی ہے کہ کبھی کسی آزاد شدہ غلام نے کسی میدان میں ایسی لیڈری اور امامت کا مرتبہ حاصل کیا ہو کہ آزاد کرنے والی قوم بھی اسے اپنا مقتدار تسلیم کرنے لگ جاوے؟ ہمیں اقوام کی تاریخ کے عبور کا دعویٰ نہیں ہے لیکن جہانتک ہمارا علم ہے ہمیں مسیحی اقوام کے آزاد کردہ غلاموں میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ ان غلاموں میں سے کبھی کسی نے کوئی خاص نمایاں امتیاز پیدا کیا ہو بلکہ یہی نظر آتا ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی یہ لوگ معمولی درجہ کے انسان رہے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی طریق آزادی یقیناً بہت زیادہ نفع مند اور بہت زیادہ بابرکت تھا۔ اندریں حالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ کے کسی مصلح کا نام لینا صداقت کی ہتک کرنا ہے۔ بیشک ہم ان لوگوں کے کام کو بھی قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی کوششوں کے مداح ہیں

---

[1] تہذیب التہذیب و اکمال وغیرہ

مگر ہر شخص کی کوشش کا ایک مرتبہ ہوتا ہے اور حق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحات کا وہ مرتبہ ہے کہ اُس کے مقابلہ میں کسی شخص کی کوشش کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ آج سے چودہ سو سال قبل جبکہ دُنیا غلامی کو اپنا پیدائشی حق سمجھے ہوئے تھی اور غلاموں کی حالت جانوروں سے بدتر ہو رہی تھی اس وقت آپ کا غلاموں کی حمایت میں آواز اُٹھانا اور آئندہ کے لیے غلامی کے ظالمانہ طریقوں کو قطعی طور پر منسوخ کر کے موجود الوقت غلاموں کی حالت کی اصلاح کے لیے نہایت دانشمندانہ عملی تدابیر اختیار کرنا اور پھر ان غلاموں کی آزادی کے متعلق پُرزور سفارشات کرنے کے علاوہ ایک ایسا پُرحکمت انتظام جاری کر دینا کہ جس کے نتیجہ میں یہ غلام اپنی حالت کو بھی بہتر بناتے جائیں اور ساتھ ساتھ لازماً آزاد بھی ہوتے جائیں اور حکومت کا یہ فرض مقرر کرنا کہ وہ غلاموں کی حالت کی اصلاح اور ان کی تدریجی مگر لازمی آزادی کے عمل کی سختی کے ساتھ نگرانی کرے اور پھر اس انتظام کو اس خوبی کے ساتھ چلانا کہ جو غلام آزاد ہوئے اور ان کی تعداد کروڑوں تھی وہ نہ صرف حقیقی معنوں میں آزاد ہوئے بلکہ وہ ملک وقوم کے نہایت مفید شہری بھی بن گئے اور اُن میں سے وہ لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے مسلمانوں میں امارت وامامت کا مرتبہ حاصل کیا جن کے سامنے ان کے آزاد کرنے والوں کی گردنیں بھی جھک گئیں۔ یہ وہ کام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور یہ وہ کام ہے جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی پس عامی لوگوں کی طرح یہ اعتراض اُٹھانا کہ ابراہام لنکن یا دوسرے مغربی لوگوں کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام غلاموں کو یکلخت کیوں نہیں آزاد کر دیا جذبات انسانی کا ایک محض سطحی اُبال ہے جس کے اندر کوئی بھی گہرائی نہیں۔

اسلامی ممالک میں غلامی کیوں قائم رہی؟

اس موقعہ پر یہ سوال بھی پیدا کیا گیا ہے کہ اگر اسلام کی تعلیم کا اصل منشاء یہ تھا کہ غلام آہستہ آہستہ آزاد ہو جائیں تو پھر اسلامی ممالک میں موجودہ زمانہ تک غلامی کا سلسلہ کیوں جاری رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جبتک ایک طرف تو اسلامی حکومت ترقی کرتی گئی اور اس کے اثر کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور دوسری طرف مسلمان اسلامی تعلیمات کی اصل رُوح کو سمجھتے رہے اور اس پر کاربند رہے اُس وقت تک غلاموں کی آزادی کی تحریک نہایت سُرعت کے ساتھ جاری رہی اور مسلمانوں کی کوشش سے کروڑوں غلام داغ غلامی سے نجات پاگئے، لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اس زمانہ میں دُنیا میں غلاموں کی تعداد بیشمار اور بے حساب تھی اور دُنیا کا کوئی متمدن ملک ایسا نہیں تھا جہاں نہایت کثرت کے ساتھ غلام نہ پائے جاتے ہوں۔ پس پیشتر اس کے کہ یہ نہ ختم ہونے والا خزانہ ختم ہوتا۔ ایک طرف تو اسلامی فتوحات کی رو آہستہ آہستہ کمزور ہو کر بالآخر بالکل رُک گئی۔ اور دوسری طرف زمانہ نبوی کے بُعد کے نتیجہ میں وہ نُورِ نبوت کی روشنی جس سے یہ سارا باغ وبہار تھا مسلمانوں کے دلوں میں مدھم پڑنی شروع ہو گئی۔ اور اسلامی تعلیمات کی حقیقت کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا وہ ولولہ انگیز شوق جسے صحابہ نے کر اُٹھے تھے اور

جو صحابہ نے اپنے پیچھے آنے والوں کو ورثہ میں دیا تھا وہ مسلمانوں کے دلوں سے آہستہ آہستہ مٹنا شروع ہوگیا۔ بلکہ اس فیج اعوج کے زمانہ میں وہ لوگ پیدا ہوگئے جنھوں نے اپنی جہالت یا دنیاداری کے نتیجہ میں دین کو بگاڑ کر اسے کچھ کا کچھ رنگ دیدیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری قوموں کی طرح جو ابھی تک غلامی کی نہایت مکروہ صورت پر کاربند تھیں مسلمان بھی اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایات کو چھوڑ کر غلامی کی اس ظالمانہ صورت کی طرف لوٹ گئے جس کے استیصال کے لیے اسلام کھڑا ہوا تھا اور گو اس کج خیالی اور کمزوری کے زمانہ میں بھی اسلامی ممالک میں غلاموں کی حالت دوسرے ممالک کی نسبت بحیثیتِ مجموعی اچھی رہی ہے۔ اور مسلمان لوگ ظاہری طور پر غلام رکھتے ہوئے بھی کبھی غلامی کی اصل رُوح کے حامی نہیں بنے اور اس کے مقابلہ میں ابی سینیا کے عیسائی ملک میں تو اس وقت تک غلامی کی وہ بھیانک صورت قائم ہے جسے دیکھ کر انسانیت شرماتی ہے اور یورپ و امریکہ کے مہذب اور متمدن عیسائی ممالک میں بھی ابھی تک غلامی کی رُوح پر موت نہیں آئی لیکن کسی ہمسایہ قوم کی خراب تر حالت ہماری خرابی کے داغ کو دھو نہیں سکتی اور اس بات کی فوری اور اشد ضرورت ہے کہ اسلامی حکومتیں اور اسلامی سوسائیٹیاں پوری توجہ اور پوری کوشش کے ساتھ غلامی کے ظالمانہ طریق کو مٹانے میں لگ جائیں اور دنیا کو پھر اس مبارک نقطہ پر لے آئیں جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اسے قائم کرنا چاہتے تھے اور جس کا مقصد دُنیا سے غلامی اور اس کی رُوح کو مٹانا اور حقیقی آزادی اور حقیقی مساوات کا قائم کرنا تھا۔

غلاموں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت

میں اس بحث کو ان نہایت درجہ پیارے الفاظ کے ساتھ ختم کرتا ہوں جو اس مادی دنیا میں مقدس بانیٔ اسلام کے آخری الفاظ تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب اور انس بن مالک روایت کرتے ہیں:۔

كَانَ اٰخِرُ كَلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَهُوَ يُغَرْغِرُ بِنَفْسِهٖ اَلصَّلٰوةُ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ[1]

یعنی آخری الفاظ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنے گئے اس حال میں کہ آپ پر موت کا غرغرہ طاری تھا یہ تھے کہ اَلصَّلٰوةُ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یعنی اے مسلمانو! میری آخری وصیت تم کو یہ ہے کہ نماز اور غلاموں کے متعلق میری تعلیم کو نہ بھولنا۔"

اُس وقت جبکہ آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔ آپ کی وہ رفیقِ حیات بیویاں جنھوں نے ہر تنگی و تُرشی میں آپ کا ساتھ دیا تھا آپ کے پاس تھیں۔ آپ کی لختِ جگر صاحبزادی اور اس کے بچے اور آپ کے

---

[1] ابن ماجہ ابواب الوصیۃ نیز نسائی عن انسؓ و مسند احمد عن ام سلمہؓ بحوالہ جامع الصغیر جلد ۲ صفحہ ۴۲

دُوسرے عزیز واقارب بھی سامنے تھے۔ وفادار مہاجرین کی مخلصانہ رفاقت میں آپؐ کی عمر گذری تھی وہ بھی موجود تھے۔ جان نثار انصار جنہوں نے اپنے خون کے پانی سے اسلام کے پودے کو سینچا تھا وہ بھی قریب تھے اور یہ وقت بھی وہ تھا جس کے بعد آپؐ کو کسی اور کو نصیحت کے کرنے کا موقعہ نہیں ملنا تھا اور آپؐ اس بات کو بھی جانتے اور محسوس کرتے تھے کہ ایسے وقت کی نصیحت آپؐ کی ساری نصیحتوں سے زیادہ وزن رکھے گی مگر آپؐ کی نظر ان لوگوں میں سے کسی پر نہیں پڑی اور اگر دُنیا میں سے آپؐ نے کسی کو یاد کیا اور اس کی یاد نے موت کے غرغرہ میں بھی آپؐ کو بے چین کر دیا تو وہ یہی مظلوم غلام تھے۔ اللہ! اللہ!! غلاموں کا یہ کیسا سچا دوست۔ کیسا دردمند مخلص تھا جو خدا نے دُنیا کو عطا کیا مگر افسوس کہ دُنیا نے اس کی قدر نہیں کی۔

آئندہ غلامی کو روکنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم

اب ہم اس بحث کے دوسرے سوال کو لیتے ہیں اور جو اس امر سے تعلق رکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ غلامی کے متعلق اصولی طور پر کیا تعلیم دی ہے یعنی موجود الوقت غلاموں کے سوال سے قطع نظر کرتے ہوئے آپؐ نے آئندہ کے لیے غلامی کے مسئلہ اور غلام بنائے جانے کے سوال کے متعلق کیا اصولی احکام صادر فرمائے ہیں لیکن چونکہ گذشتہ بحث نے ہمارے اندازہ سے بہت زیادہ جگہ لے لی ہے اس لیے اگلی بحث کو ہم نہایت مختصر طور پر بیان کریں گے۔ سو اس کے متعلق سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ یہ بحث دراصل دو حصوں پر منقسم ہے۔ اوّل حقیقی غلامی کا سوال یعنی کسی آزاد انسان کو اس کی جائز آزادی کے حق سے کلیتہً اور مستقل طور پر محروم کر دینا۔ یہ صورت غلام بنانے کے ان طریقوں سے تعلق رکھتی ہے جو مذہبی جنگوں میں قیدی پکڑے جانے کے علاوہ ہیں۔ یعنی غلام بنانے کے بہت سے ظالمانہ طریق جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دُنیا کے تمام ممالک میں کم و بیش رائج تھے اور اسلام کے بعد بھی مختلف غیر اسلامی ممالک میں رائج رہے۔ دُوسرے مذہبی جنگوں میں قیدی پکڑے جانے کا سوال جسے اسلامی تعلیم کی روشنی میں گویا ایک قسم کی غیر حقیقی غلامی کہہ سکتے ہیں[1]

پہلے ہم مقدم الذکر بحث کو لیتے ہیں۔ سو اس کے متعلق جاننا چاہیئے کہ جیسا کہ گذشتہ بحث میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اسلام نے حقیقی غلامی کو یعنی غلامی کے ان ظالمانہ طریقوں کو جو مذہبی جنگوں میں قیدی پکڑے جانے کے علاوہ ہیں یکدم اور قطعی طور پر منسوخ کر دیا تھا مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس بارے میں کوئی معیّن اور منصوص اسلامی احکام پیش کریں ہم اس کے متعلق دو منفی قسم کے دلائل ہدیہ ناظرین کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] ہم نے جو اس جگہ حقیقی اور غیر حقیقی غلامی کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ کوئی اسلامی اصطلاح نہیں ہے بلکہ ہم نے خود اپنی طرف سے اسلامی تعلیم کی روشنی میں بحث کی سہولت کے لیے یہ اصطلاح قائم کی ہے۔ وَ لِكُلٍّ اَنْ يَّصْطَلِحَ ؕ

پہلی دلیل یہ ہے کہ قطع نظر اس کے کہ اُصولی طور پر اسلام بڑی سختی کے ساتھ ظلم و تعدی کے طریق سے منع فرماتا ہے اور انسانی آزادی اور انسانی مساوات کا نہایت زبردست حامی ہے اور یہ تمام باتیں حقیقی غلاموں کے طریق سے بُعد المشرقین رکھتی ہیں وہ واضح اور پُرزور تعلیم جو اسلام نے حاضر الوقت غلاموں کے ساتھ مُحسنانہ اور مساویانہ سلوک کئے جانے اور ان کی آزادی کے متعلق دی ہے اور جس کا ایک خاکہ اوپر درج کیا جا چکا ہے وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اسلام غلامی کے ظالمانہ طریق کی تائید میں نہیں ہو سکتا۔ انسانی عقل ہرگز اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ اس تعلیم کے ساتھ ساتھ کہ غلاموں کو اپنا بھائی سمجھو اور انہیں اپنے گھر کے آدمیوں کی طرح رکھو اور ان کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کرو اور پھر جُوں جُوں ان کی حالت بہتر ہوتی جاوے اور وہ دُنیا میں آزاد زندگی گذارنے کے قابل بنتے جائیں انہیں آزاد کرتے جاؤ۔ اسلام میں یہ تعلیم بھی دی جا سکتی تھی کہ کسی آزاد انسان کو اس کی جائز آزادی کے حق سے کلیتہً محروم کر کے حقیقی طور پر غلام بنانا جائز ہے۔ ان دونوں قسم کی تعلیم میں بُعد المشرقین ہے اور وہ کبھی بھی کسی ایک ہی شخص کی تعلیم کا حصّہ نہیں بن سکتیں۔ پس غور کیا جاوے تو دراصل وہ تعلیم ہی جس کا خاکہ اوپر والے مضمون میں درج کیا گیا ہے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام میں حقیقی غلامی کی تعلیم نہیں دی گئی۔

دُوسری دلیل جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں حقیقی غلامی کو جائز نہیں سمجھا گیا یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر کے کسی حصّہ میں یہ حکم موجود نہیں کہ کسی آزاد شخص کو اس کی آزادی کے جائز حق سے محروم کر کے حقیقی طور پر غلام بنا لینا جائز ہے یا یہ کہ اگر کسی آزاد شخص کو غلام بنانا ہو تو اس کا یہ طریق ہے۔ حالانکہ غلامی کے دوسرے مسائل مثلاً غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے اور انہیں آزاد کرنے کے متعلق اسلامی شریعت میں نہایت تفصیلی احکام موجود ہیں پس غلاموں کے بارے میں دُوسرے ہر قسم کے مسائل کا پایا جانا، لیکن غلام بنانے کے سوال کے متعلق قطعاً کسی جوازی حکم کا پایا نہ جانا اس بات میں ہرگز کسی شک کی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ دراصل اسلام میں حقیقی غلامی کو جائز ہی نہیں سمجھا گیا۔ مَیں نے بہت تلاش کی ہے مگر مجھے کسی قرآنی آیت یا کسی روایت میں خدا یا اس کے رسول کا یہ حکم نظر نہیں آیا کہ کسی آزاد انسان کو حقیقی طور پر غلام بنانا جائز ہے یا یہ کہ کسی آزاد شخص کو غلام بنانا ہو تو اس کا یہ طریق ہے۔ حالانکہ اگر اسلام میں کسی آزاد انسان کو حقیقی طور پر غلام بنانا جائز ہوتا تو غلامی کے جملہ مسائل میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر اور سب سے زیادہ نازک مسئلہ جو توضیح و تفصیل کا حقدار تھا اور جس میں ایک نہایت واضح اور منصوص حکم دیئے جانے کی ضرورت تھی وہ یہی غلام بنانے کا مسئلہ تھا مگر تفصیل و توضیح تو الگ رہی قرآن و حدیث میں اس کا ذکر تک نہیں ہے جو اس بات کی ایک یقینی دلیل ہے کہ اسلام میں کسی آزاد شخص کو حقیقی طور پر غلام بنانا جائز نہیں ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ ہمارے دعویٰ کی بنیاد صرف منفی قسم کے دلائل پر نہیں ہے بلکہ خدا کے فضل سے اسلامی شریعت میں نہایت واضح اور منصوص طور پر یہ حکم موجود ہے کہ کسی آزاد انسان کو اس کی جائز

آزادی سے محروم کر کے غلام بنانا ایک سخت ممنوع اور حرام فعل ہے جس کے متعلق قیامت کے دن خدا کے حضور سخت مواخذہ ہوگا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی ثَلَاثَةٌ اَنَا خَصْمُهُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ رَجُلٌ اَعْطٰی بِیْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اِسْتَاْجَرَ اَجِیْرًا فَاسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ یُعْطِ اَجْرَهٗ [1]

یعنی "ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جنگ کروں گا۔ اوّل وہ شخص جو میرا واسطہ دیکر کسی سے کوئی عہد باندھتا ہے اور پھر غداری کرتا ہے دوسرے وہ جو کسی آزاد شخص کو غلام بناتا ہے اور اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کھا جاتا ہے اور تیسرے وہ جو کسی شخص کو کام پر لگاتا ہے اور پھر اس سے کام تو پورا لے لیتا ہے مگر اس کی مزدوری اُسے نہیں دیتا۔"

اور دوسری روایت میں یوں آتا ہے:-

عَنِ ابْنِ عُمَرَ ...... لَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ صَلٰوةٌ وَرَجُلٌ اِعْتَبَدَ مُحَرَّرًا۔ الخ [2]

یعنی "ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا ہے کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن کی نماز میرے حضور ہرگز مقبول نہیں ہوگی اور میں ان سے قیامت کے دن لڑوں گا۔ ایک وہ شخص جو میرا واسطہ دے کر کسی سے کوئی عہد باندھتا ہے اور پھر بد عہدی کرتا ہے۔ دُوسرے وہ جو اُسے غلام بناتا ہے جسے خدا نے آزاد رکھا ہے اور تیسرے وہ جو مزدور سے کام لیتا ہے اور پھر اس کی مزدوری نہیں دیتا۔"

ان حدیثوں میں جس وضاحت اور تعیین کے ساتھ اور جس زوردار طریق پر حقیقی غلامی کو منسوخ کیا گیا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے اور پھر یہ حدیثیں بھی حدیث کی اس قسم میں داخل ہیں جو محدثین کی اصطلاح میں حدیثِ قدسی کہلاتی ہے یعنی جو ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہے مگر اس میں حکم اور الفاظ خدا کے ہوتے ہیں۔ اب اس واضح اور صریح تعلیم کے ہوتے ہوتے کسی کا یہ کہنا کہ اسلام میں حقیقی غلامی کو جائز رکھا گیا ہے یعنی اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کسی آزاد انسان کو اس کی جائز آزادی کے حق سے محروم کر کے حقیقی طور پر غلام بنالیا جاوے ایک انتہائی درجہ کا ظلم ہے جس کے ارتکاب کی کوئی دیانت دار شخص جرأت نہیں کر سکتا۔

---

[1] بخاری کتاب البیع ❊ [2] ابوداؤد بروایت فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۳۴۶ ❊

جنگی قیدیوں کا مسئلہ

اب ہم جنگی قیدیوں کے سوال کو لیتے ہیں اور درحقیقت اگر اسلام میں غلام بنانے کے جواز کی کوئی صورت سمجھی جا سکتی ہے تو وہ صرف اسی سوال کے ماتحت آتی ہے، لیکن جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائے گا غلامی کی یہ قسم دراصل حقیقی غلامی نہیں ہے بلکہ ایک محض جزوی مشابہت کی وجہ سے اسے یہ نام دیدیا گیا ہے اور پھر اس غیر حقیقی غلامی کو بھی اسلام نے ایسی شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا ہے کہ وہ ایک عالمگیر چیز نہیں رہتی بلکہ بعض خاص قسم کے حالات میں محدود ہو جاتی ہے اس بحث میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ جیسا کہ تاریخ عالم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے غلامی کی ابتداء دُنیا میں جنگی قیدیوں سے ہی ہوئی تھی اور بعد میں آہستہ آہستہ دُوسرے ظالمانہ طریق ایجاد ہوتے گئے جس کی وجہ سے بالآخر غلامی جو دراصل ابتدائی زمانہ کے حالات کا ایک لازمی نتیجہ تھی ایک بھیانک صورت اختیار کر گئی اور بجائے ظلم کو روکنے کا باعث بننے کے جو اس کی اصل غرض تھی وہ خود ظلم و ستم کا ایک خطرناک آلہ بن گئی ابتداءً یہ طریق تھا گو بعد میں اس کے ساتھ اور اور ظالمانہ طریق شامل ہو گئے (جنھیں نہ صرف اسلام نے مٹا دیا بلکہ اس ابتدائی طریق کو بھی مزید پاک و صاف کر کے اُسے ایک نہایت پاکیزہ صورت دیدی) کہ جب ایک قوم دُوسری قوم پر حملہ آور ہو کر اُسے صفحۂ دنیا سے مٹا دینے یا اس کی آزادی کو چھین کر اُسے بلاوجہ اپنے ماتحت کر لینے کے دَرپے ہوتی تھی تو موخر الذکر قوم غلبہ حاصل کرنے پر حملہ آور قوم کے آدمیوں کو قید کر کے اپنے پاس روک لیتی تھی کیونکہ اگر ظالم لوگوں کو اس طرح روک لینے کا طریق اختیار نہ کیا جاتا تو بین الاقوام جنگوں کا کبھی بھی خاتمہ نہ ہو سکتا اور ظالم لوگ اپنی دراز دستیوں اور امن شکن کارروائیوں سے باز نہ آتے اور ظلم و ستم کا میدان وسیع ہوتا چلا جاتا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ اس قسم کی غلامی کا طریق ابتدائی زمانہ میں تمام اقوامِ عالم میں کم و بیش پایا جاتا تھا۔ حتّٰی کہ بنو اسرائیل میں بھی جو نبیوں کی اولاد تھے اور کثیر التعداد نبیوں کے تربیت یافتہ تھے یہ طریق کثرت کے ساتھ رائج تھا بلکہ اسرائیلی شریعت نے خود اس کا حکم دیا تھا[1] اور اگر غور کیا جاوے تو اس ابتدائی زمانہ میں مذہبی جماعتوں کے لیے اس کی ضرورت دوسری قوموں کی نسبت بھی زیادہ تھی۔ کیونکہ جیسا کہ قاعدہ ہے مذہبی سلسلوں کی سخت مخالفت ہوتی تھی اور دوسری قومیں انہیں تلوار کے زور سے مٹانے کے لیے کھڑی ہو جاتی تھیں پس انہیں بھی دفاع اور خود حفاظتی میں غلامی وغیرہ کے طریق اختیار کرنے پڑتے تھے۔ اسی طرح مسیحی قوم میں بھی جو دراصل بنو اسرائیل ہی کی ایک شاخ تھے غلامی کا سلسلہ جاری رہا[2] بلکہ ابتک بھی حبشہ کے عیسائی ملک میں جو اس وقت تک ابتدائی مسیحی روایات پر بڑی سختی

---

[1] استثناء باب ۲۰ آیت ۱۲، ۱۴ [2] پولوس ۶/۵ و پطرس ۲/۱۸ موجودہ ایڈیشنوں میں اس جگہ غلام کی جگہ نوکر کا لفظ ہے مگر جیسا کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے اصل مفہوم غلام ہی کا ہے۔

کے ساتھ قائم ہے غلامی کا رواج پایا جاتا ہے بلکہ شاید اس ملک کی غلامی دوسرے ممالک کی غلامی سے بھی سخت تر ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی قدیم آریہ قوم میں بھی غلامی کا رواج تھا۔ چنانچہ یہ شودر وغیرہ جو آج تک ہندوستان میں پائے جاتے ہیں یہ اسی سلسلۂ غلامی کا ایک ناگوار بقیہ ہیں۔ الغرض ابتدائی زمانوں میں غلامی کا رواج کم وبیش سب ممالک اور سب اقوام میں پایا جاتا تھا اور یہ ان زمانوں کے حالات کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور اس کی غرض ظلم وستم کا سدِ باب تھی اور پھر یہ کہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت بلکہ حقیقی ضرورت صرف مذہبی جماعتوں کو تھی جو سب سے زیادہ مظالم کا تختۂ مشق بنتی تھیں اور لوگ اُن کے مذہب کو تباہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اس رنگ کی غلامی جسے اسلام نے اور بھی پاک وصاف کر دیا حتیٰ کہ وہ حقیقتہً ایک محض قید کی صورت اختیار کر گئی کوئی ناانصافی نہیں تھی۔ کیونکہ جو قوم دُوسروں کے مذہب کو تلوار کے زور سے مٹانا چاہتی ہے اور ظالم وسفاک ہے اور امن شکنی کا طریق اختیار کر کے ملک میں فتنہ وفساد اور قتل وغارت کا بیج بوتی ہے، وہ ہرگز آزادی کی حقدار نہیں سمجھی جاسکتی۔ جیسے کہ ایک چور یا ٹھگ یا ڈاکو جیل خانہ سے باہر رہنے کا حقدار نہیں سمجھا جاتا اور یہ مظالم سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو پیش آتے۔ ہمارے ناظرین بھولے نہیں ہوں گے کہ کفار نے مسلمانوں کو اسلام کی وجہ سے نہایت دردناک عذاب دیئے[1] ان کے دین ومذہب کو بزور مٹانے کے لیے مسلمانوں کے خلاف تلوار نکالی[2] اور ان کے محبوب آقا کے مقدس خون سے اپنے ناپاک ہاتھوں کو رنگنا چاہا[3]۔ اور کمزور مگر بے گناہ اور آزاد مسلمانوں کو غلاموں کی طرح اپنے پاس قید رکھا[4] اور بے گناہ مسلمانوں کو ذلیل ترین دھوکے کے ساتھ قید کر کے اپنا غلام بنایا اور پھر ان میں سے بعض کو نہایت ظالمانہ طریق پر تہ تیغ کیا[5] اور ان کی عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنانے کے لیے سازشیں کیں اور لڑائیاں لڑیں[6] اور ان کے معزز شہیدوں کا مُثلہ کیا اور ان کے ناک کان کاٹ کر اپنے گلوں میں ہار پہنے[7] اور ان کی معزز مستورات پر وحشیانہ حملے کر کے اُن کے حمل گرائے[8] اور ان کی عصمت شعار بیبیوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر انہیں ہلاک کیا[9]۔ ان حالات میں اگر ان ظالموں کو ان کی آزادی سے محروم کر کے مستقل طور پر غلام بنا لیا جاتا تو یہ ہرگز ناانصافی نہیں تھی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سراسر احسان تھا کہ آپ نے

---

[1] زرقانی جلد ا صفحہ ۲۶۶ تا ۲۷۰ [2] سورۃ بقرہ: ۲۲۲ [3] سورہ انفال: ۳۱ [4] سورۃ انفال: ۷۱
[5] بخاری وکتب تاریخ حالات واقعہ رجیع وبئر معونہ
[6] ابوداؤد باب فی خبر النضیر وزرقانی حالات غزوہ ذی قرد
[7] کتب احادیث وتاریخ حالات غزوہ احد [8] ابن ہشام حالات قیدیان بدر و ذکر ابوالعاص بن الربیع۔
[9] اسد الغابہ حالات سُمیّہ ونیز زرقانی جلد ا صفحہ ۲۶۶

ایسے لوگوں میں سے بھی اکثر کو معاف فرما دیا۔ اور ان میں سے جو لوگ جنگ میں پکڑے جا کر قیدی بنے ان کی آزادی میں بھی سوائے وقتی حد بندی کے کوئی روک نہیں ڈالی اور اس وقتی حد بندی کے زمانہ میں بھی آپؐ نے قیدیوں کے آرام و آسائش کے متعلق ایسے تاکیدی احکام صادر فرمائے کہ ان سے متأثر ہو کر صحابہ نے اپنی قمیصیں اتار اتار کر قیدیوں کو ہاں اپنے خون کے پیاسے قیدیوں کو دیدیں[1]۔ خود خشک کھجوروں پر گذارہ کیا۔ اور انہیں پکا ہوا کھانا دیا[2]۔ آپ پیدل چلے اور انہیں سوار کیا[3]۔ کیا دنیا کی کسی قوم میں کسی زمانہ میں اس کی مثال ملتی ہے؟

جنگی قیدیوں کے متعلق اسلامی تعلیم کا خلاصہ تین قرآنی آیتوں میں آجاتا ہے جن میں سے دو تو خاص جنگی قیدیوں کے متعلق ہیں اور ایک اصولی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ"[4]

یعنی نبی کی شان سے یہ بہت بعید ہے کہ اس کے لیے جنگی قیدی پکڑے جائیں حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ کسی میدان میں اچھی طرح عملی جنگ نہ ہو لے۔ اے مسلمانو! تم قریب کے فوائد پر نگاہ رکھتے ہو (کہ قیدی پکڑنے میں جلدی کی جاوے تاکہ تم ان کے فدیہ کی رقم سے دشمن کے مقابلہ کی تیاری کر سکو) مگر اللہ تعالیٰ انجام کار کو دیکھتا ہے (اور چونکہ انجام کے لحاظ سے یہ طریق پسندیدہ نہیں اور اخلاقی طور پر اس کا اثر خراب ہے اس لیے وہ تمہیں اس طریق سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے) اور اگر تمہیں دشمن کی تعداد و طاقت کا خوف ہو تو جانو کہ اللہ تعالیٰ سب طاقتوں پر غالب ہے اور وہ حکیم یعنی تمہاری حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کمزوری اور دشمن کی طاقت کے خیال سے یا فدیہ کے ذریعہ اپنی مالی حالت کو مضبوط بنانے کی غرض سے دشمن کے قیدی پکڑنے کے معاملہ میں جلدی اور بے احتیاطی سے کام نہیں لینا چاہیئے کہ جہاں بھی دشمن کو کمزور پایا قیدی پکڑنے شروع کر دیئے یا میدانِ جنگ میں عملی مقابلہ ہونے سے پہلے ہی قیدی پکڑ لیے۔ بلکہ مسلمانوں کو صرف اس صورت میں قیدی پکڑنے کی اجازت ہے کہ میدانِ جنگ میں عملاً دشمن کا مقابلہ ہو اور لڑائی کے بعد قیدی پکڑے جائیں۔ اس اسلامی تعلیم میں جو بین الاقوامی ضابطۂ جنگ کی اعلیٰ ترین بنیاد پر قائم ہے۔ جنگی قیدیوں کی تعداد اور وسعت کو امکانی طور پر تنگ سے تنگ دائرہ میں محدود کر دیا گیا ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کا منشا یہ تھا

---

[1] بخاری کتاب الجہاد باب الکسوۃ للاسارٰی [2] ابن ہشام حالات قیدیان بدر
[3] میور حالات قیدیان غزوہ بدر [4] سورۃ انفال: ۶۸

کہ سوائے ان صورتوں کے جو لابدی اور اٹل ہوں حتی الوسع جنگی قیدی نہیں پکڑنے چاہئیں۔

پھر فرماتا ہے :-

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا[۱]

یعنی "اے مسلمانو! جب کفار کے ساتھ تمہاری جنگ ہو تو خوب جم کر لڑو اور ظالموں کو قتل کرو اور جب اچھی طرح جنگ ہو لے تو اس کے بعد دشمن کے آدمیوں میں سے قیدی پکڑو۔ پھر اگر اصلاح کی امید ہو اور حالات مناسب ہوں تو ان قیدیوں کو بعد میں یونہی احسان کے طور پر چھوڑ دو یا مناسب فدیہ لیکر انہیں رہا کر دو اور یا اگر ضروری ہو تو انہیں قید میں ہی رکھو حتیٰ کہ جنگ ختم ہو جاوے اور اس کے بوجھ تمہارے سروں سے اُتر جاویں۔"

یہ آیت جنگی قیدیوں کے متعلق اسلامی شریعت میں بطور بنیادی پتھر کے ہے جس میں وہ مختلف صورتیں بتا دی گئی ہیں جو قیدیوں کے معاملہ میں مختلف حالات کے ماتحت اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اور وہ تین ہیں :-

اوّل:- بطور احسان چھوڑ دینا۔ دوّم: فدیہ لیکر چھوڑ دینا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل سے پتہ لگتا ہے کہ فدیہ کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں (ا) نقد فدیہ خواہ وہ یکمشت اور فوری ادائیگی کی صورت میں ہو یا مکاتبت کے اصول پر جس کی مفصل بحث اوپر گذر چکی ہے (ب) مسلمان قیدیوں کے ساتھ تبادلہ (ج) کوئی مناسب خدمت لے لینا مثلاً اگر قیدیوں کو کوئی فن آتا ہو تو اُن کے ساتھ یہ شرط کر لینا کہ اگر وہ بعض مسلمانوں کو یہ فن سکھا دیں تو رہا کر دیئے جائیں گے۔

سوّم: قید کی حالت کو ہی جنگ کے اختتام تک لمبا کر دینا اور جنگ کے اختتام سے اس کا کامل اختتام مراد ہے جبکہ نہ صرف جنگی کارروائیوں کا سلسلہ عملاً ختم ہو جاوے بلکہ وہ بوجھ بھی جو اس کی وجہ سے ملک اور قوم پر پڑے ہوں اور جن کی ذمہ داری دشمن قوم پر بھی جاوے دُور ہو جائیں۔ جیسا کہ قرآنی الفاظ وضع اوزار میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور یہ آخری صورت اس لئے تجویز کی گئی ہے کہ اگر حالات ایسے ہوں کہ نہ تو کفار کے قیدیوں کو احسان کے طور پر چھوڑنا قرینِ مصلحت ہو اور نہ ہی وہ یا ان کے رشتہ دار اپنی خِسّت یا عناد کی وجہ سے فدیہ ادا کرنے پر آمادہ ہوں تو پھر انہیں جنگ کے حقیقی اختتام تک قید رکھا جا سکے تا کہ اُن کے رہا ہونے سے مسلمانوں کی مشکلات اور خطرات میں اضافہ نہ ہو۔ اور یہی وہ صورت ہے جسے اسلام میں غلامی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جس کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ مگر غور کیا جاوے تو دراصل

---

[۱] سورۃ محمد : ۵

یہ غلامی نہیں بلکہ محض ایک قید ہے اور پھر اس قید یا غیر حقیقی غلامی کو بھی اسلام نے ایک اصولی قاعدہ کے ساتھ مشروط و محدود کر دیا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ [1]

یعنی "اے مسلمانو! اگر تم کفار کے مقابلہ میں انتقام اور سزا کے طریق پر کوئی سختی کرنا مناسب خیال کرو تو ضروری ہے کہ تمہاری سختی اس سختی سے تجاوز نہ کرے جو کفار تمہارے خلاف کرتے ہوں۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ تم کوئی ایسی سختی نہ کرو جس میں کفار نے سبقت اور پہل نہ کی ہو اور اگر تمہارے لیے صبر کرنا ممکن ہو تو پھر صبر ہی سے کام لو کیونکہ صبر کرنا بہتر ہے۔"

اس اصولی آیت کے ماتحت جنگی قیدیوں کے متعلق وہ صورت جو قید کی حالت کے لمبا کئے جانے سے تعلق رکھتی ہے مختلف رنگ اختیار کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر کفار مسلمان قیدیوں سے خدمت لیتے ہوں تو مسلمان بھی کفار کے قیدیوں سے مناسب خدمت لے سکتے ہیں۔ مگر یہ خدمت بہرحال ان شرائط کے ماتحت ہوگی جو غلاموں وغیرہ سے خدمت لینے کے متعلق اسلام نے مقرر فرمائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کو ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ دیا جاوے اور ایسا کام نہ دیا جاوے جسے آقا خود کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اسی طرح اگر کفار مسلمان قیدیوں کو بجائے قومی اور ملکی قید خانوں میں رکھنے کے اپنے افراد میں تقسیم کر دیتے ہوں تو مسلمان بھی کفار کے قیدیوں کو مسلمان افراد کی سپردگی میں دے سکتے ہیں۔ وغیر ذالک۔ مگر بہرحال یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی تفصیلات میں جو صورت بھی اختیار کی جاوے وہ کسی منصوص اسلامی حکم کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً یہ کہ یہ ضروری ہے کہ قید کا سلسلہ جنگ کے اختتام پر لازماً ختم کر دیا جاوے [2] یا یہ کہ قیدی محض دشمن کی فوج کا سپاہی ہونے کی وجہ سے قتل نہ کیا جاوے [3] یا یہ کہ قیدیوں سے خدمت ان کی طاقت اور حیثیت کے مطابق لی جاوے [4] یا یہ کہ قیدیوں کے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھا جاوے [5] وغیر ذالک۔

یہ وہ تعلیم ہے جو جنگی قیدیوں کے متعلق اسلام دیتا ہے۔ اب ناظرین خود انصاف کے ساتھ غور کریں کہ خواہ نام کے لحاظ سے اسے غلامی کہہ دیا جائے مگر کیا اس تعلیم میں کوئی حقیقت غلامی کی پائی جاتی ہے؟ کیا آج کل کی حکومتیں جنگی قیدی نہیں پکڑتیں؟ کیا آج کل کی حکومتیں جنگی قیدیوں سے خدمت

---

[1] سورۃ نحل : ۱۲۷ [2] سورۃ محمد : ۵ [3] سورۃ محمد : ۵ و کتاب الخراج صفحہ ۱۲۱
[4] بخاری۔ کتاب العتق [5] سورۃ : ۹ : ۱۰ و بخاری کتاب الجہاد و طبری وغیرہ

نہیں لیتیں؟ پھر کیا آجکل کی حکومتیں جنگی قیدیوں کی قید کے عرصہ کو جنگ کے لمبا ہو جانے کی صورت میں لمبا نہیں کر دیتیں؟ جب یہ سب کچھ ہر قوم میں ہوتا ہے اور اب بھی ہوتا ہے اور ہر زمانہ میں بین الاقوامی قانون اسے جائز قرار دیتا ہے تو پھر از روئے انصاف اس بناء پر اسلام اور بانی اسلام پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ اسلام کا ایک احسان ہے کہ اُس نے اس جنگی ضابطہ میں نرمی اور شفقت کے عنصر کو نمایاں کر کے دُنیا کے امن اور اتحاد بین الاقوام کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔ باقی رہا انفرادی قبضہ کا سوال۔ سو یہ درست ہے کہ ابتداء میں کفار کے قیدی عام طور پر مسلمان سپاہیوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے اور دراصل یہی ایک بات ہے جو اس قانون کو غلامی کا رنگ دینے والی سمجھی جا سکتی ہے مگر غور کیا جاوے تو یہ بات ان حالات میں جن کے ماتحت اسے اختیار کیا جاتا رہا ہے ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے اور نہ اُسے حقیقی غلامی سے یعنی غلامی کی اس اصطلاح سے جو غیر اسلامی دنیا میں رائج ہے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ اول تو یہ طریق اسلام میں بالذات اختیار نہیں کیا گیا اور نہ مخصوص تعلیم میں جو اسلام جنگی قیدیوں کے متعلق دیتا ہے اس کا کوئی ذکر پایا جاتا ہے[۱] بلکہ درحقیقت یہ ایک جوابی تدبیر تھی جو کفار کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے اختیار کی گئی تھی۔ یعنی چونکہ کفار مسلمان قیدیوں کو غلام بنا کر اپنے افراد میں تقسیم کر دیتے تھے اس لیے انہیں ہوش میں لانے کی غرض سے اسلام میں بھی کفار کے قیدیوں کو مسلمانوں کی انفرادی حراست میں دے دینے کا طریق اختیار کیا گیا۔ مگر پھر بھی اسلام نے ان قیدیوں کو اس رنگ میں غلام بنانے کی اجازت نہیں دی جیسا کہ کفار بناتے تھے نیز یہ شرط کر دی کہ جنگ کے اختتام پر وہ لازماً آزاد کر دیئے جائیں۔ دوسری وجہ انفرادی حراست کے طریق اختیار کئے جانے کی یہ تھی کہ اس زمانہ میں شاہی قید خانوں کا دستور نہیں تھا بلکہ دشمن کے قیدی فاتح قوم کے افراد میں تقسیم کر دیئے جاتے جو انہیں اپنی زیرِ نگرانی رکھتے تھے اور یہی طریق ابتداء میں اسلام میں رائج رہا۔ پس درحقیقت یہ غلامی نہیں تھی۔ بلکہ قیدیوں کے رکھنے کا ایک سسٹم تھا جو بعد میں آہستہ آہستہ بدل گیا اور اس کی جگہ شاہی قید خانوں کا طریق قائم ہو گیا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق تھا یہ طریق قیدیوں کے لیے ہرگز تکلیف دہ نہیں تھا بلکہ یقیناً اس میں ان کو آجکل کے شاہی قیدیوں کی نسبت بھی زیادہ آرام ملتا تھا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پُر زور تعلیم اور حکومت کی چوکس نگرانی کی وجہ سے کفار کے قیدی مسلمانوں کے جس خاندان میں رہتے تھے اس کے نوکر اور خادم بن کر نہیں رہتے تھے بلکہ خاندان کے ممبر سمجھے جاتے تھے اور اُن کی خاطر و تواضع مہمانوں کی طرح ہوتی تھی؛ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بدر کے قیدیوں کو جو عموماً اسلام

---

[۱] دیکھو آیات سورۃ انفال و سورۃ محمد محولہ بالا۔

کے بدترین دشمن تھے مسلمانوں نے اس آرام و آسائش کے ساتھ رکھا کہ وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور اُن میں سے کئی محض اس حُسنِ سلوک سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے[1] الغرض اس نام نہاد غلامی میں بھی جس کی اسلام اجازت دیتا ہے اسلام نے احسان و مروت کا وہ اعلیٰ نمونہ قائم کیا جو آجکل کی آزادی کی برکات کو بھی شرماتا ہے، لیکن بہرحال چونکہ یہ طریق ایک محض جوابی رنگ رکھتا تھا اس لیے وُہ ان خاص حالات کے ساتھ مخصوص سمجھا جائیگا جن کے جواب میں وہ اختیار کیا گیا۔ اور اسی لیے اب اس زمانہ میں یہی فتویٰ ہے کہ چونکہ آج کل شاہی قیدیوں کا دستور قائم ہو گیا ہے اور مسلمان قیدیوں کو کفار غلام نہیں بناتے اس لیے شریعتِ اسلامی کے اصول حکم کے ماتحت اب مسلمانوں کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کفار کے قیدیوں کو مسلمان افراد میں تقسیم کر کے ایک رنگ غلامی کا پیدا کریں؛ چنانچہ مقدس بانی سلسلہ احمدیہ جن کا دعویٰ خدا کی طرف سے اس زمانہ کے لیے مامور و مصلح ہونے کا تھا تحریر فرماتے ہیں :

"یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے زمانہ میں اسلام کے مقابل پر جو کافر کہلاتے ہیں انہوں نے یہ تعدی اور زیادتی کا طریق چھوڑ دیا ہے اس لیے اب مسلمانوں کے لیے بھی روا نہیں کہ ان کے قیدیوں کو لونڈی غلام بنائیں کیونکہ خدا قرآن شریف میں فرماتا ہے جو تم جنگجو فرقہ کے مقابل پر صرف اس قدر زیادتی کرو جس میں پہلے انہوں نے سبقت کی ہو۔ پس جبکہ اب وہ زمانہ نہیں ہے اور اب کافر لوگ جنگ کی حالت میں مسلمانوں کے ساتھ ایسی سختی اور زیادتی نہیں کرتے کہ ان کو اور ان کے مَردوں اور عورتوں کو لونڈیاں اور غلام بنادیں بلکہ وہ شاہی قیدی سمجھے جاتے ہیں اس لیے اب اس زمانہ میں مسلمانوں کو بھی ایسا کرنا ناجائز اور حرام ہے۔"[2]

خلاصہ کلام یہ کہ جنگی قیدیوں کے متعلق اسلامی تعلیم کے اصل الاصول صرف دو ہیں۔ یعنی اول یہ کہ حتی الوسع قیدی پکڑنے میں جلدی نہ کی جاوے اور صرف انتہائی حالات میں عملی جنگ ہونے کے بعد قیدی پکڑے جائیں۔ دوم یہ کہ قیدی پکڑنے کے بعد حالات کے ماتحت یا تو انہیں بلا فدیہ احسان کے طور پر چھوڑ دیا جاوے اور یہ سب سے زیادہ پسندیدہ صورت ہے اور یا مناسب فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جاوے اور یا اگر ضروری ہو تو اختتامِ جنگ تک ان کی قید کے سلسلہ کو لمبا کر دیا جاوے اس سے زیادہ جنگی قیدیوں کے متعلق کوئی منصوص تعلیم اسلامی شریعت میں پائی نہیں جاتی؛ البتہ ایک عام قاعدہ کے طور پر اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ اگر سیاسی اغراض کے ماتحت کفار کے متعلق کوئی سخت جوابی تدبیر اختیار کی جانی ضروری ہو تو وہ اس شرط کے ماتحت اختیار کی جاسکتی ہے کہ اول اس میں کوئی ایسی سختی نہ کی جاوے جس میں کفار نے خود پہل نہ کی ہو اور دوسرے وہ اسلام کی کسی دوسری منصوص تعلیم کے خلاف نہ ہو۔ کفار

---

[1] میور حالات قیدیانِ بدر۔ [2] چشمہ معرفت صفحہ ۲۴۴ و ۲۴۵ حاشیہ

کے قیدیوں کا مسلمان افراد میں تقسیم کر دیا جانا اسی عام قاعدہ کے ماتحت تھا، لیکن چونکہ آجکل کفار مسلمانوں کے قیدیوں کو غلام نہیں بناتے اور شاہی قیدیوں کے طور پر رکھتے ہیں۔ اس لیے اس زمانہ میں مسلمانوں کے لیے بھی ناجائز ہے کہ وہ کفار کے قیدیوں کو مسلمان افراد میں تقسیم کر کے کوئی رنگ غلامی کا پیدا کریں۔

کیا قیدیوں کو قتل کیا جا سکتا ہے؟

یہ سوال کہ آیا قیدیوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا مجمل جواب اوپر گذر چکا ہے کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، لیکن چونکہ اس معاملہ میں بعض مسلمان علماء نے بھی اختلاف کیا ہے اور مسیحی مؤرخین نے بھی اسے اعتراض کا نشانہ بنایا ہے اس لیے اس کے متعلق کسی قدر تشریح کے ساتھ لکھنا ضروری ہے سو سب سے پہلے تو جاننا چاہیئے کہ سورۃ محمدؐ کی آیت سے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے نہایت واضح طور پر پتہ لگتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اور قرآنی فیصلہ کے بعد کسی کو حق نہیں ہے کہ کوئی اور طریق تجویز کرے، لیکن ناظرین کی مزید تسلی کے لیے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآنی آیت کے جو معنے ہم نے کئے ہیں اس زمانہ کی اختراع نہیں ہے بلکہ یہی معنے صحابہ بھی کرتے تھے اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ چنانچہ حدیث میں روایت آتی ہے کہ:-

عَنِ الْحَسَنِ اَنَّ الْحَجَّاجَ اُتِیَ بِاَسِیْرٍ فَقَالَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قُمْ فَاقْتُلْهُ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ مَا بِهٰذَا اُمِرْنَا یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً[1]

یعنی "حسن روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حجاج کے سامنے ایک قیدی پیش ہوا اسوقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی پاس تھے۔ حجاج نے ابن عمرؓ سے کہا "آپ اُٹھیں اور اس قیدی کی گردن اُڑا دیں" ابن عمرؓ نے جواب دیا۔ ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا۔ اللہ تعالےٰ تو فرماتا ہے کہ جب جنگ میں قیدی پکڑے جائیں تو ان کو یا تو احسان کے طور پر چھوڑ دینا چاہیئے یا فدیہ لے کر رہا کر دینا چاہیئے۔ قتل کرنے کا کوئی حکم نہیں ہے۔"

اسی طرح حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح سے روایت آتی ہے کہ:

لَا تُقْتَلُ الْاُسَارٰی یُتَخَیَّرُ بَیْنَ الْمَنِّ وَالْفِدَاءِ[2]

یعنی "قیدی قتل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے یہی حکم ہے کہ یا تو اسے احسان کے طور پر چھوڑ دیا جاوے اور یا فدیہ لے کر رہا کر دیا جاوے۔"

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۱۲۱ ÷

[2] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۰۶ ÷

قرآن شریف کی محولہ بالا واضح آیت کے ساتھ یہ واضح تشریح ملکر اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتی کہ قیدیوں کے قتل کے جواز کا مسئلہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے اور اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی جنگی قیدی کو قتل کیا جاوے اور اگر اس جگہ یہ سوال ہو کہ پھر اس معاملہ میں بعض مسلمان علماء کو غلطی کیوں لگی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ تاریخ میں بظاہر ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض جنگی قیدیوں کو قتل کیا ہے لیکن ان مثالوں سے نتیجہ نکالنے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جنگی قیدیوں کے قتل کا حکم دیا تھا وہ جنگی قیدی ہونے کی حیثیت میں قتل نہیں کیے گئے بلکہ ان کے قتل کی وجہ یہ تھی کہ وہ بعض دوسرے جرائم کی وجہ سے واجب القتل تھے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی قیدی کسی ایسے جرم کا مرتکب ہوا جس کی سزا قتل ہے تو اس کا قیدی ہونا اسے اس سزا سے نہیں بچا سکتا۔ اگر ایک آزاد شخص کسی جرم کی سزا میں قتل کیا جا سکتا ہے تو ایک قیدی کیوں نہیں کیا جا سکتا پس جیسا کہ اپنے اپنے موقعہ پر ثابت کیا جائے گا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جو قیدی بھی قتل کیا گیا وہ اس جرم کی بناء پر قتل نہیں کیا گیا کہ وہ ایک دشمن فوج کا سپاہی یا ایک جنگجو قوم کا فرد ہے بلکہ وہ اس وجہ سے قتل کیا گیا کہ وہ کسی ایسے جرم کا مرتکب ہو چکا تھا جس کی سزا قتل تھی لیکن بعض علماء نے صرف اس ظاہری حالت کو دیکھ کر کہ بعض قیدی قتل کر دیئے گئے تھے یہ نتیجہ نکال لیا کہ قیدی کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے حالانکہ یہ بات اسلامی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل ہر دو کے لحاظ سے قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔

یہ اس تعلیم کا ڈھانچہ ہے جو اسلام نے جنگی قیدیوں کے متعلق دی ہے اور ہر عقلمند شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک نہایت منصفانہ قانون ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا نے دُنیا کو عطا کیا ہے اور موجودہ زمانہ کی ترقی یافتہ اور مہذب کہلانے والی اقوام بھی اس سے بہتر قانون دنیا کو نہیں دے سکیں کہ جس میں اگر ایک طرف جنگ کے ناواجب طور پر طول پکڑ جانے اور بین الاقوامی مظالم کا سدباب کیا گیا ہے تو دوسری طرف احسان و مروت کے پہلو کو بھی بہترین صورت میں قائم رکھا گیا ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس قانون میں دشمن کے ساتھ نرمی اور احسان کا پہلو اپنی حفاظت کے پہلو سے بھی غالب ہے اور یقیناً آج تک کوئی قوم ایسی نہیں گذری جس نے اپنے خونی دشمنوں کے ساتھ جو اسے ملیا میٹ کر دینے کے درپے ہوا ایسے منصفانہ اور محسنانہ سلوک کا حکم دیا ہو۔

لونڈیوں کا مخصوص مسئلہ

اب ہم ایک لفظ لونڈیوں یعنی غلام عورتوں کے متعلق کہہ کر غلامی کی بحث کو ختم کرتے ہیں۔ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی عام اجازت دیکر نعوذ باللہ اپنے متبعین کے لیے تعیش کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کے متعلق ہم سب سے پہلے اصولی طور پر یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلام میں مرد وعورت کے مخصوص تعلق کی غرض وغایت کیا رکھی گئی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے

صحابہ کے اعمال کو جج کرنے اور ان کے پیچھے جو نیتیں مخفی تھیں اُن کا پتہ لگانے کے لیے سب سے زیادہ صحیح ذریعہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جاوے کہ جس مذہب کے احکام کی تعمیل میں آپ اور آپ کے صحابہ یہ اعمال بجالاتے اور ان کی اجازت دیتے تھے وہ اس قسم کے اعمال کا حکم کس غرض وغایت کے ماتحت دیتا ہے۔ سو ہم قرآن شریف میں دیکھتے ہیں کہ نکاح کی اغراض میں سے جو غرض مرد وعورت کے مخصوص تعلق کے ضمن میں بیان کی گئی ہے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ [1]

یعنی "اے مسلمانو! فلاں فلاں قریبی رشتہ دار عورتوں کو چھوڑ کر باقی سب عورتیں تمہارے لیے حلال اور جائز کی جاتی ہیں یہ کہ تم اپنے اموال میں سے اُن کے مہر مقرر کر کے ان کے ساتھ نکاح کرو۔ مگر تمہارے نکاح کی غرض یہ ہونی چاہیئے کہ تم اس کے ذریعہ اپنے آپ کو بدیوں اور بیماریوں سے محفوظ کرلو اور یہ غرض ہرگز نہیں ہونی چاہیئے کہ تم شہوت رانی کا طریق اختیار کرو۔"

اس تعلیم کا صحابہ کرام کی طبیعت پر اس قدر گہرا اثر تھا کہ اس انسان کی طرح جو ایک بات سے متاثر ہو کر اس کے انتہائی نقطہ کی طرف جھک جاتا ہے صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عورتوں سے بالکل ہی مجتنب ہو جانے کی اجازت چاہتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو فطرتِ صحیحہ کے مالک تھے اور اسلامی تعلیم کی اصل غرض وغایت کو سمجھتے ہوئے اپنے متبعین کو افراط وتفریط کی راہوں سے بچا کر اعتدال کے مقام پر قائم رکھنا چاہتے تھے انہیں اس طریق سے باز رکھتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ یَقُوْلُ رَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ التَّبَتُّلَ وَلَوْ اَذِنَ لَهٗ لَاخْتَصَیْنَا [2]

یعنی "سعد بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ عثمان بن مظعون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں سے بالکل ہی علیحدہ ہو جانے کی اجازت چاہی مگر آپ نے اس کی اجازت نہیں دی اور اگر آپ اجازت دے دیتے تو ہم لوگ تیار تھے کہ اپنے آپ کو گویا بالکل خصی ہی کر لیتے۔"

ان حالات میں تعیش وغیرہ کا سوال تو بالکل خارج از بحث ہے اور اس قسم کی بدظنی وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو اسلامی تعلیم اور اسلامی تاریخ سے قطعی طور پر ناواقف ہو اور یا وہ خود اس گند میں اس حد تک مبتلا ہو کہ اسے دوسروں کے اعمال میں بھی اس گندی نیت کے سوا کوئی اور نیت نظر نہ آتی ہو۔

---

[1] سورۃ نساء: ۲۵

[2] بخاری کتاب النکاح

مگر بہر حال یہ سوال قابلِ جواب ہے کہ لونڈیوں کے متعلق اسلامی تعلیم کیا ہے؟ سو اس کے متعلق سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیئے کہ غلامی کے عام احکام میں غلام اور لونڈی کے معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی جو حقوق غلاموں کے ہیں وہی لونڈیوں کے بھی ہیں؛ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ لونڈیوں کو اچھی تعلیم و تربیت دینے اور انہیں آزاد کر کے اپنے عقد میں لے لینے کے بارے میں اسلام نے زیادہ تاکیدی سفارش کی ہے[1] اور جب تک لونڈیاں غلامی کی حالت میں رہیں اس وقت تک اُن کیلئے بھی یہ پسند کیا گیا ہے کہ آزاد لوگ ان کے ساتھ رشتے کریں تاکہ اس رشتہ دارانہ اختلاط کے نتیجے میں غلاموں کے تمدن و معاشرت میں جلد تر اصلاح پیدا ہو سکے اور اسی غرض و غایت کے ماتحت لونڈیوں کا معاملہ تعدد ازدواج کی انتہائی حد بندی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے[2]۔ تاکہ غلاموں اور لونڈیوں کے تمدن و معاشرت میں اصلاح کے موقعے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھلے رہیں اور وہ جلد تر آزاد کئے جانے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے متعلق بعض قرآنی آیات اُوپر والے مضمون میں درج کی جا چکی ہیں اس جگہ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

یہ سوال کہ آیا لونڈیوں کے ساتھ باقاعدہ رسمی نکاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ اوّل جبکہ کسی لونڈی اور غلام کے آپس کے رشتہ کا سوال ہو۔ دوم جبکہ کسی لونڈی اور ایسے آزاد مرد کے رشتہ کا سوال ہو جو اس کا مالک و آقا نہیں ہے۔ سوم جبکہ کسی غلام اور آزاد عورت کے رشتہ کا سوال ہو۔ چہارم جبکہ کسی لونڈی اور اس کے اپنے آقا و مالک کے رشتہ کا سوال ہو۔ ان چاروں امکانی صورتوں میں سے پہلی تین صورتوں میں مسلمہ طور پر رسمی نکاح ضروری سمجھا گیا ہے اور اس کے بغیر رشتہ قائم نہیں ہو سکتا، لیکن چوتھی صورت میں اکثر علماء آقا اور لونڈی کے رشتے کے معاملہ میں رسمی نکاح کی ضرورت نہیں سمجھتے اور اُن کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ آقا کو لونڈی پر حقِ ملکیت حاصل ہوتا ہے اس لیے قانونی رنگ میں یہی حقِ نکاح کا قائم مقام سمجھا جانا چاہیئے اور کسی الگ رسمی نکاح کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ اخلاقی اور تمدنی اور نسلی حفاظت جو رسمی نکاح میں ملحوظ ہے وہ اس رشتہ میں بھی جو حقِ ملکیت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح حاصل ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

قیدی عورتوں کا سوال

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ اسلام نے ان عورتوں کے متعلق بھی جو کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیں اور بطور قیدی کے پکڑی جائیں اس قسم کا ایک استثنائی انتظام جاری کیا ہے جس کے ماتحت ان قیدی عورتوں کے ساتھ جن کے مرد انہیں فدیہ دیکر چھڑانے کے لیے جلد نہ پہنچ جائیں یا جو قید ہونے پر خود مکاتبت کے طریق پر آزاد کئے جانے کا مطالبہ نہ کریں مسلمانوں کا رشتہ نکاح قائم ہو سکتا ہے۔

---

[1] بخاری کتاب النکاح [2] سورۃ نساء : ۴

اور اس انتظام کی غرض دغایت اسلام نے یہ رکھی کہ تا قیدی عورتوں اور اُن کی وجہ سے اُن کے قید کرنے والوں کے اخلاق خراب ہونے سے محفوظ رہیں اور سوسائٹی میں بدی اور بدکاری پھیلنے نہ پائے۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ عموماً جب کبھی بھی کسی قوم کو کوئی بڑی جنگ پیش آئی ہے تو اس کے بعد اس قوم میں عموماً زنا اور بدکاری کا مرض پھیل گیا ہے۔ کیونکہ اول تو جنگ میں عموماً عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ دُوسرے جنگ کے مصائب کی وجہ سے مَردوں کے اعصاب پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ جس کی وجہ سے اُن میں عموماً ضبطِ نفس کا مادہ کمزور ہو جاتا ہے۔ پس چونکہ اسلام انفرادی اور قومی اخلاق کی حفاظت کے سوال کو باقی تمام تمدنی اور معاشرتی اُمور پر ترجیح دیتا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ اس قسم کے حالات کے لیے کوئی خاص احتیاطی احکام جاری کیے جاتے، چنانچہ ایسا کیا گیا کہ ایک طرف تو تعددِ ازدواج کی استثنائی اجازت دیدی گئی اور دوسری طرف ان عورتوں کے متعلق جو ایسے جنگوں میں قید ہو کر آئیں جن میں کوئی قوم مسلمانوں کے مذہب کو برباد کرنے کے لیے اُن پر حملہ آور ہوئی ہو یہ حکم دیا گیا کہ اگر اُن کے مرد اُن کے ساتھ قید نہ ہوں اور نہ ہی وہ انہیں چھڑانے کے لیے جلد پہنچیں اور نہ ہی یہ قیدی عورتیں خود مکاتبت کے طریق پر آزاد کئے جانے کا مطالبہ کریں تو ان کے ساتھ مسلمانوں کو استثنائی طور پر رشتہ قائم کرنے کی اجازت ہے تاکہ نہ تو ان قیدی عورتوں کے اخلاق خراب ہوں اور نہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کی سوسائٹی میں بدکاری رُونما ہونے پائے اور اس انتظام میں نسلی اختلاط و اشتباہ سے بچانے کے لیے یہ شرط لگادی گئی کہ قیدی عورتوں کے ساتھ اس اطمینان کے بعد رشتہ ہونا چاہیئے کہ وہ حاملہ نہیں ہیں[1]۔ یہ سسٹم شاید جدید تہذیب و تمدن کے دل دادگان کو اچنبھا نظر آئیگا، لیکن اگر ان حالات کو مدِّنظر رکھا جاوے جن کے لیے یہ انتظام مقصود ہے تو کم از کم وہ لوگ جو انفرادی اور قومی اخلاق کی حفاظت کے خیال پر دوسرے خیالات کو قربان کرنا جانتے ہیں وُہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان حالات کے ماتحت جن میں یہ انتظام جاری کیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت دانشمندانہ انتظام تھا جو بنی نوع انسان کی حقیقی بہتری کے لیے استثنائی حالات میں ضروری سمجھا گیا۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب مکاتبت کا دروازہ ہر قیدی عورت کے لیے کُھلا ہے تو جو عورت اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتی اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے سابقہ رشتوں کو قطع کر کے اسلامی سوسائٹی کا جزو بننا چاہتی ہے۔ پس اس حالت میں اس کے ساتھ کسی مسلمان کا رشتہ قائم ہونا قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو جنگوں میں پکڑا ہی کیوں جاتا تھا کہ اس قسم کے خطرات پیدا ہوتے اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں عرب میں یہ عام دستور تھا کہ عورتیں بھی کثرت کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتی تھیں اور بعض اوقات جنگ میں عملی حصہ بھی لیتی تھیں اور میدانِ جنگ میں سپاہیوں کو جوش دلانے کا

---

[1] ترمذی ابواب السیر صفحہ ۲۹۶

کام تو زیادہ تر عورتوں کے ہی سپرد ہوتا تھا پس کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان حالات میں انہیں قید نہ کیا جاتا۔ اگر فوجداری مقدمات میں عورت قید کی جا سکتی ہے اور ہر ایک مُلک و قوم میں قید کی جاتی ہے تو کیوں جنگجو عورت میدانِ جنگ میں قید نہ کی جاتی؟ علاوہ ازیں چونکہ اس زمانہ میں کفار لوگ مسلمانوں کی عورتوں کو قید کرتے تھے بلکہ لونڈی تک بنا کر رکھتے تھے اور ان ابتدائی جنگوں میں تو ان بد باطنوں کی طرف سے یہ عام الٹی میٹم تھا کہ وہ مسلمان عورتوں کو قید کر کے اپنی لونڈیاں بنائیں گے اور لونڈیوں کی طرح اُن سے تعلقات قائم کریں گے[1] اس لیے خدائے اسلام نے جو اگر ایک طرف حلیم ہے تو دُوسری طرف سب سے زیادہ غیرت مند بھی ہے۔ مسلمانوں کو بھی اجازت دیدی کہ اگر ضرورت ہو تو وہ بھی کفار کے ساتھ اگر ولیسا نہیں تو اسی قسم کا سلوک کر کے انہیں ہوش میں لائیں، تاکہ وہ اپنے مظالم میں زیادہ شوخ اور دلیر نہ ہوتے جائیں جنگی ضروریات سے واقف لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ بسا اوقات جنگوں میں انتقامی طریق اختیار کیے جانے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جنگی قانون سول قانون سے ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔ پس یہ ایک ناگزیر حالات کی مجبوری تھی جس کے بغیر چارہ نہیں تھا اور جب یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ عورتیں قید میں آتی تھیں اور نیز یہ کہ کفار لوگ مسلمان عورتوں کے ساتھ ہر قسم کا سلوک روا رکھتے تھے تو اس کے لازمی اور خطرناک نتائج کے سدِباب کے لیے کوئی خاص قانون جاری کرنا بھی ضروری تھا البتہ چونکہ موجودہ زمانہ میں کفار لوگ مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرتے اور اگر عورتیں قید بھی ہوں تو انہیں شاہی قیدی کے طور پر رکھا جاتا ہے اس لیے اُصولی قرآنی حکم کے مطابق جو اوپر درج کیا گیا ہے اس زمانہ میں مسلمانوں کے لیے بھی یہ ناجائز ہو گا کہ وہ کفار کی عورتوں کو بلا کسی حقیقی مجبوری کے قید کریں یا قید کرنے کے بعد انہیں مسلمانوں کی انفرادی حراست میں دے کر کوئی رنگ غلامی کا پیدا کریں[2]

اس جگہ اگر کسی کو شبہ پیدا ہو کہ ایسا کیوں ہے کہ بعض حالات میں شریعتِ اسلامی کا فتویٰ اور ہوتا ہے اور بعض میں اور۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی نقص کی بات نہیں بلکہ اگر غور کیا جاوے تو یہی بات اسلامی شریعت کے کامل اور عالمگیر ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت میں حالات کے اختلاف کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے اور جہاں بعض احکام جو اصل الاصول کے طور پر ہیں ٹھوس اور غیر مبتدل صورت میں رکھے گئے ہیں جن میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں وہاں بہت سے احکام ایسے بھی ہیں جن میں یا تو حالات کے اختلاف سے حکم کی صورت بدل جاتی ہے اور یا ان میں مختلف حالات کے ماتحت نئی مگر جائز تشریحات کی گنجائش ہوتی ہے۔ چنانچہ

---

[1] ابوداؤد کتاب جہاد باب فی خبر النضیر ؛

[2] چشمہ معرفت صفحہ ۲۴۵ ؛

قرآن شریف خود فرماتا ہے :

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ[1]

یعنی خدا نے یہ قرآن شریف اس صورت میں اُتارا ہے کہ اس کی بعض آیات تو محکم ہیں یعنی اصل الاصول کے طور پر ہیں جو سب حالات میں ایک سی چسپاں ہوتی ہیں اور بعض متشابہات ہیں یعنی ان میں ایسی لچک رکھی گئی ہے کہ وہ مختلف حالات میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ غلامی کے متعلق اسلامی تعلیم دو حصّوں میں منقسم ہے۔ اوّل وہ تعلیم جو ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہے جو کسی وجہ سے ظالمانہ غلامی کے چکر میں آ پھنسے تھے اور ان کے اخلاق و عادات میں عموماً نہایت درجہ پستی اور دنائت پیدا ہو چکی تھی اور وہ جوہر جو انسان کو دنیا میں آزاد زندگی گذارنے کے قابل بناتا ہے اُن میں مفقود ہو چکا تھا ایسے لوگوں کے متعلق اسلام نے یہ تجویز کی کہ پہلے اُن کے اخلاق اور تمدن کو دُرست کیا جاوے اور پھر جُوں جُوں ان کی اصلاح ہوتی جاوے وہ ساتھ ساتھ آزاد کیے جاتے رہیں اور ایسا انتظام کیا کہ آزاد ہونے کے بعد ایسے لوگوں کی آزادی حقیقی آزادی ہو نہ کہ محض رسمی اور نمائش کی آزادی۔ اور اس انتظام کی نگرانی کا کام اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل کر دیا گیا تاکہ لوگ اس معاملہ میں کسی قسم کی سُستی یا غفلت سے کام نہ لیں۔ دوّم وہ تعلیم جو غلام بنانے کے سوال کے متعلق اسلام نے اصولی طور پر دی اور جس کی رُو سے غلامی کے تمام ظالمانہ طریق قطعی طور پر منسوخ کر دیئے گئے۔ باقی رہا جنگی قیدیوں کا سوال سو اس میں بیشک بعض حالتوں میں انتقامی طریق پر غلامی کی اجازت دی گئی ہے مگر اس کی تفصیلات پر غور کیا جاوے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس رنگ کی غلامی نہیں ہے جو غیر اسلامی دُنیا میں عام طور پر معروف ہے بلکہ حقیقتہً ایک نوع قید کی ہے اور یہ جوابی اور غیر حقیقی غلامی بھی جس کی اجازت دی گئی ہے موجودہ زمانہ میں ناجائز اور حرام ہے کیونکہ اب شاہی قید خانوں کا سسٹم رائج ہو گیا ہے اور کفّار مسلمانوں کے قیدیوں کو غلام نہیں بناتے بلکہ شاہی قیدیوں کے طور پر رکھتے ہیں۔ اس لیے اب مسلمانوں کے لیے بھی ناجائز ہے کہ کفّار کے قیدیوں کو مسلمانوں کی انفرادی حراست میں تقسیم کر کے کوئی رنگ غلامی کا پیدا کریں۔ باقی رہا غلاموں اور جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کرنے کا معاملہ سو اس میں اسلام نے وہ منصفانہ اور محسنانہ تعلیم دی ہے کہ جس کی نظیر کوئی قوم کسی زمانہ میں پیش نہیں کر سکتی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

---

[1] سورۃ آل عمران : ۸

حضرت عائشہؓ کا رُخصتانہ اور اُنکی عمر کی بحث

تعدد ازدواج کا مسئلہ۔ دُو فرضی واقعات

حضرت عائشہؓ کا رخصتانہ، ماہ شوال سنہ ۲ھ

کتاب کے حصہ اوّل میں یہ ذکر گذر چکا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہؓ صدیقہ کے ساتھ شادی فرمائی تھی یہ سنہ نبوی کا دسواں سال اور شوال کا مہینہ تھا[1] اور اُسوقت حضرت عائشہؓ کی عمر سات سال کی تھی[2] مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا نشو و نما اسوقت بھی غیر معمولی طور پر اچھا تھا؛ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ خولہ بنت حکیم کو جو اُن کے نکاح کی محرک بنی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے لیے اُن کی طرف خیال جاتا لیکن بہرحال ابھی تک وہ بالغ نہیں ہوئی تھیں، اس لیے اُسوقت نکاح تو ہوگیا مگر رخصتانہ نہیں ہوا اور وہ بدستور اپنے والدین کے پاس مقیم رہیں، لیکن اب ہجرت کے دُوسرے سال جبکہ اُن کی شادی پر پانچ سال گذر چکے تھے اور ان کی عمر بارہ سال کی تھی وہ بالغ ہو چکی تھیں، چنانچہ خود حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر رخصتانہ کی تحریک کی[3] جس پر آپ نے مہر کی ادائیگی کا انتظام کیا (اس زمانہ میں مہر کے نقد ادا کرنے کا دستور تھا۔) اور ماہ شوال سنہ ۲ھ میں حضرت عائشہ اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو کر حرم نبویؐ میں داخل ہوگئیں۔

یہ سوال کہ رُخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر کتنی تھی اس زمانہ میں ایک اختلافی سوال بن گیا ہے۔ عام کتب تاریخ اور کتب حدیث میں حضرت عائشہ کی عمر نو یا دس سال کی بیان ہوتی ہے حتیٰ کہ صحیح بخاری میں خود حضرت عائشہؓ سے بھی یہ روایت مروی ہے کہ رخصتانہ کے وقت میری عمر صرف نو سال تھی اور اسی بناء پر جمہور مؤرخین نے نو سال کی عمر بیان کی ہے مگر اس کے مقابلہ میں بعض جدید محققین نے مختلف قسم کے

---

[1] استیعاب صفحہ ۶۵، سطر ۱۸ [2] ابن ہشام جلد ۳ ذکر ازواج النبیؐ

[3] طبرانی بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۳۱ [4] عینی جلد ۱ صفحہ ۴۵

استدلالات سے چودہ سال بلکہ سولہ سال تک عمر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہرچند کہ ہم ان نو محققین کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے مگر حالات کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ نو سال کی عمر کا خیال بھی درست نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے رخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر پورے بارہ سال یا قریباً بارہ سال کی ثابت ہوتی ہے۔ دراصل اس معاملہ میں متقدمین کو تو ساری غلطی اس وجہ سے لگی ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہ کے نو سال والے اندازے کو جو صحیح احادیث میں بیان ہوا ہے بالکل یقینی اور قطعی سمجھ کر کسی اور بات کی طرف توجہ نہیں کی؛ حالانکہ ہر عقلمند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ روایت کا صحیح ہونا اور بات ہے اور اندازے کا صحیح ہونا بالکل اور بات۔ یعنی باوجود اس کے کہ یہ روائتیں جن میں حضرت عائشہ کا یہ اندازہ بیان ہوا ہے کہ رخصتانہ کے وقت میری عمر نو سال کی تھی۔ اصل روایت کے لحاظ سے بالکل صحیح ہوں حضرت عائشہ کا یہ اندازہ خود اپنی ذات میں غلط ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ بسا اوقات لوگوں کے اندازے اپنی عمر کے متعلق غلط ہو جایا کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جن لوگوں نے نو سال والے خیال کو غلط سمجھ کر آزادانہ تحقیق کرنی چاہی ہے انھوں نے یہ غلطی کی ہے کہ تحقیق کے سیدھے اور صاف راستہ کو ترک کر کے ایک ایسا پیچدار طریق اختیار کیا ہے کہ جو دل کی تسلی کا موجب نہیں ہو سکتا۔ ہر فہمیدہ شخص ہمارے ساتھ اتفاق کرے گا کہ سب سے زیادہ پختہ اور سب سے زیادہ آسان ذریعہ حضرت عائشہ کی عمر کا پتہ لگانے کا یہ ہے کہ ہمیں ایک طرف تو انکی پیدائش کی تاریخ اور دوسری طرف ان کے رخصتانہ کی تاریخ کا پتہ چل جاوے۔ کیونکہ ان دونوں تاریخوں کے معین ہو جانے کے بعد رخصتانہ کے وقت کی عمر کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔ پہلے ہم پیدائش کے سوال کو لیتے ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت نقل کی ہے کہ كَانَتْ عَائِشَةُ وُلِدَتِ السَّنَةَ الرَّابِعَةَ مِنَ النُّبُوَّةِ فِي أَوَّلِهَا[1] یعنی "حضرت عائشہ ۴ سنہ نبوی کے ابتدا میں پیدا ہوئیں تھیں"۔ حضرت عائشہ کی تاریخ پیدائش کے متعلق اس روایت کے سوا کوئی اور معین روایت ابتدائی مؤرخین کی کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گذری اور نہ ہی حدیث کی کسی کتاب میں اس کے متعلق کوئی روایت آتی ہے۔ پس پیدائش کی تاریخ تو آسانی کے ساتھ معین ہو گئی۔ اور وہ ابتدا ۴ سنہ نبوی ہے۔

اب ہم دوسرے سوال کو لیتے ہیں جو رخصتانہ کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں بیشک روایات میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں یہ تاریخ شوال ۱ سنہ ہجری بیان ہوتی ہے اور بعض میں شوال ۲ سنہ ہجری لیکن غور کیا جاوے تو موخر الذکر روایات زیادہ صحیح قرار پاتی ہیں۔ شوال ۱ سنہ ہجری والی روایت کا اصل منبع ابن سعد ہے۔ جس نے ایک سلسلہ رواۃ کے ذریعہ اس روایت کو حضرت عائشہ تک پہنچایا

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۵۴

ہے۔[1] اور اکثر مؤرخین نے ابن سعد والی روایت پر ہی بنا رکھ کر رخصتانہ کی تاریخ شوال سنہ ۱ ہجری قرار دی ہے، لیکن گو ابن سعد خود اپنی ذات میں ثقہ ہے مگر اس روایت میں اس کے راویوں میں ایک راوی واقدی ہے جس کے غیر ثقہ اور ناقابلِ اعتماد بلکہ جھوٹا ہونے کے متعلق محققین نے قریباً قریباً اجماع کیا ہے۔[2] پس محض اس واقدی والی روایت پر جبکہ وہ دوسری روایات کے خلاف ہو ایک تاریخی واقعہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی اس کے مقابلہ پر علامہ نووی علامہ عینی اور قسطلانی اور بعض دوسرے محققین نے شوال سنہ ۲ ہجری والی روایت کو صحیح اور قابلِ ترجیح قرار دیا ہے[3] اور علامہ نووی نے تو بڑی صراحت اور اصرار کے ساتھ لکھا ہے کہ اس روایت کے مقابلہ میں شوال سنہ ۱ ہجری والی روایت کمزور اور قابلِ رد ہے[4]۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ صرف اس بناء پر کہ عام مؤرخین نے شوال سنہ ۱ ہجری والی روایت کی تقلید کی ہے ہم ایک زیادہ مضبوط خیال کو رد کر دیں اور در اصل عام مؤرخین نے بھی واقدی کی روایت کو محض اس خیال سے نوازا ہے کہ وہ نو سال والی عمر کے اندازے کے ساتھ جو صحیح احادیث میں بیان ہوا ہے زیادہ مطابقت کھاتی ہے، چنانچہ زرقانی جیسا محقق صاف لکھتا ہے کہ شوال سنہ ۲ ہجری والی روایت اس لیے قابلِ قبول نہیں ہے کہ اسطرح نو سال سے زیادہ ہو جاتی ہے[5] حالانکہ جب خود عمر کا سوال اور عمر کی روایتیں ہی زیرِ بحث ہوں تو کسی خاص روایت کو صحیح فرض کر لینا درست نہیں ہے اور پھر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں نو سال والے اندازے کو غلط ماننے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ نو سال والی روایتیں بھی غلط ہیں۔ اور پھر تعجب یہ ہے کہ خود علامہ زرقانی نے دوسری جگہ[6] شوال سنہ ۲ ھ والے قول کو مقدم کیا ہے۔ اندریں حالات شوال سنہ ۱ ہجری والی روایت شوال سنہ ۲ ہجری والی روایت کے مقابلہ میں قابلِ قبول نہیں سمجھی جاسکتی اور حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عائشہ کا رخصتانہ شوال سنہ ۲ ہجری میں ہوا تھا۔ واللہ اعلم

اب جب پیدائش اور رخصتانہ کی تاریخوں کی تعیین ہو گئی تو عمر کا پتہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف ایک موٹا حسابی سوال رہ جاتا ہے جسے ایک بچہ بھی نکال سکتا ہے۔ حضرت عائشہ سنہ ۴ نبوی کے شروع میں پیدا ہوئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سنہ ۱۴ نبوی کے ربیع الاول میں ہوئی[7] اس طرح ہجرت تک حضرت عائشہ کی عمر کچھ ماہ اوپر دس سال بنتی ہے اور ہجرت کے بعد جو ربیع الاول سنہ ۱

---

[1] طبقات جلد ۸ صفحہ ۳۹، ۴۰ ⁎ [2] تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸ ⁎

[3] نووی بحوالہ زرقانی جلد ۱ صفحہ ۳۷۴ و جلد ۳ صفحہ ۲۳۰ و عینی شرح بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۵ و مواہب اللدنیہ ذکر حضرت عائشہ و تاریخ یافعی ودفا و اسد الغابہ بحوالہ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۰۳ ⁎

[4،5] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۳۰ [6] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱ و جلد ۳ صفحہ ۲۰۳ ⁎

[7] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲۵۵ و تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۳۶۳، ۳۶۴

میں ہوئی شوال ۲ سنہ ہجری تک جبکہ حضرت عائشہؓ کا رخصتانہ ہوا دو سال سے کچھ کم کا عرصہ ہوتا ہے اور ان دونوں عرصوں کو ملانے سے وہی بارہ سال حاصل ہوتے ہیں جو ہم نے ابتداء میں بیان کئے ہیں اور اگر ابن سعد کی روایت کے مطابق رخصتانہ کو ہجرت کے پہلے سال میں سمجھا جاوے تو پھر بھی یہ عرصہ گیارہ سال کا بنتا ہے نہ کہ نو یا دس سال کا۔ اور یہ ایک حسابی نتیجہ ہے جس کے مقابلہ میں کوئی تخمینی اندازہ قبول نہیں کیا جا سکتا۔

اب رہا یہ سوال کہ متعدد احادیث میں حضرت عائشہؓ نے خود اپنی عمر نو سال کی کیوں بیان کی ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ان روایتوں کو غلط نہیں کہتے یعنی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ کا یہی خیال تھا کہ رخصتانہ کے وقت اُن کی عمر نو سال کی تھی، لیکن یقیناً اُن کا یہ خیال محض تخمینی تھا اور دُرست نہیں تھا اور یہ کوئی قابلِ تعجب بات نہیں کیونکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عمروں کے اندازوں میں لوگوں سے غلطی ہو جایا کرتی ہے۔ پس اگر پیدائش اور رخصتانہ کی تاریخوں کے حسابی مقابلہ سے حضرت عائشہ کی عمر نو سال نہیں بنتی تو محض حضرت عائشہ کے اس اندازے کی وجہ سے کہ رخصتانہ کے وقت میری عمر نو سال کی تھی نو سال والی روایت کو قبول نہیں کیا جا سکتا؛ البتہ اگر کسی صحیح حدیث میں حضرت عائشہ کی پیدائش کی تاریخ اوائل ۴ سنہ نبوی کے علاوہ کوئی اور بیان کی گئی ہو یا رخصتانہ کی تاریخ شوال ۲ سنہ ہجری کے علاوہ کوئی اور ثابت ہو تو بیشک یہ روائتیں قابلِ قبول ہوں گی اور انہی پر عمر کے حساب کو مبنی قرار دیا جائے گا۔ لیکن ایک محض اندازے اور خیال کے مقابلہ میں خواہ وہ صحیح احادیث میں ہی بیان کیا گیا ہو ایک حسابی نتیجہ کو ردّ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ تو ایک اُصولی بحث ہے جو ہم نے اس جگہ پیش کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اندازے والی روایتوں کی چھان بین کی جاتے تو ان سے بھی بالآخر وہی نتیجہ نکلتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے یعنی یہ کہ رُخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر بارہ سال کی تھی نہ کہ نو سال کی۔ اس کے سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ دراصل حضرت عائشہ نے صرف رخصتانہ کی عمر کا اندازہ ہی نہیں بتایا بلکہ ساتھ ہی نکاح کی عمر کا اندازہ بھی بتایا ہے اور حدیث و تاریخ کی کتابوں میں یہ دونوں اندازے ساتھ ساتھ بیان ہوئے ہیں؛ چنانچہ حضرت عائشہ کا یہ قول کثرت کے ساتھ مروی ہوا ہے کہ جب میرا نکاح ہوا تو میری عمر چھ یا سات سال کی تھی اور جب میرا رخصتانہ ہوا تو میری عمر نو سال کی تھی اور بعض روایتوں میں رخصتانہ کی عمر دس سال بھی بیان ہوئی ہے۔

اب اصولی قاعدہ کے مطابق ہمیں ان دونوں اندازوں میں سے پہلے اندازے کو جو نکاح کے وقت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اقرب بالصحت سمجھنا چاہیئے کیونکہ اوّل تو یہ اندازہ زیادہ چھوٹی عمر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جبکہ غلطی کا امکان نسبتاً کم ہوتا ہے۔ دُوسرے چونکہ وہ سب سے پہلا اندازہ ہے۔ وہی اصل اندازہ سمجھا جائے گا اور بعد کی عمر کے ساتھ تعلق رکھنے والے اندازے اس اندازے کی فرع سمجھے جائیں گے نہ کہ مستقل اندازے۔ پس اندازوں کی بحث میں اصل بنیاد لازماً پہلے اندازے پر رکھی جائے گی جو نکاح

کے وقت کی عمر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور جس میں چھ یا سات سال کی عمر بیان کی گئی ہے۔ اب جب ہم اس اندازے سے حساب شماری کر کے رخصتانہ کی عمر کا پتہ لگاتے ہیں تو اس طرح بھی وہی بارہ سال کی عمر ثابت ہوتی ہے نہ کہ نو یا دس سال کی۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم یہ حساب پیش کریں چھ اور سات کے باہمی اختلاف کا حل ضروری ہے۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شادی کے وقت کی عمر بعض روایتوں میں چھ سال بیان ہوئی ہے اور بعض میں سات سال۔ اور یہ دونوں قسم کی روایتیں کتب حدیث اور کتب تاریخ ہر دو میں پائی جاتی ہیں۔ سات سال والی روایت خصوصیت کے ساتھ صحیح مسلم و نسائی[1] اور ابن ہشام[2] اور ابن سعدؒ[3] اور طبریؒ[4] میں بیان ہوئی ہے اور اس کے مقابلہ میں چھ سال والی روایت بھی ان سب کتب میں باستثناء سیرت ابن ہشام مروی ہوئی ہے اور علاوہ اس کے بخاری میں بھی چھ سال والی روایت پائی جاتی ہے۔ اب ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں کی روایتوں میں سے کونسی روایتیں قابل ترجیح ہیں۔ ہر شخص جو علم روایت سے تھوڑا بہت بھی مس رکھتا ہے اس بات کو تسلیم کریگا کہ جہاں تک محض روایت کی صحت کا تعلق ہے کہ دونوں قسم کی روایتیں ہر طرح صحیح اور قابلِ اعتماد ہیں اور ہم ان میں سے کسی کو غلط کہہ کر رد نہیں کر سکتے۔ پس ماننا پڑے گا کہ خود حضرت عائشہؓ نے ہی مختلف موقعوں پر یہ دو مختلف اندازے بیان کیے ہیں۔ یعنی کبھی تو انہوں نے اپنی عمر چھ سال کی بیان کی ہے اور کبھی سات سال کی اور کبھی ان دونوں کو ملا کر یہ کہہ دیا ہے کہ شادی کے وقت میری عمر چھ یا سات سال کی تھی پس روایت کے لحاظ سے تو کوئی فرق نہیں ہے لیکن درایتہً غور کیا جاوے تو سات سال والے اندازے کو ترجیح دینی پڑتی ہے اور وہ اس طرح پر کہ یہ ایک عام دستور ہے کہ جب تک عمر کا کوئی سال پورا نہیں ہو جاتا۔ اُس وقت تک صرف نیچے کے سال کا نام لیا جاتا ہے اور اوپر کی کسر کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اوپر کے سال کا نام صرف اسی وقت لیا جاتا ہے کہ جبکہ یا تو اوپر کا سال پورا ہو چکا ہو اور یا پورا ہونے کے اس قدر قریب ہو کہ عملاً اُسے پورا سمجھا جا سکے۔ پس حضرت عائشہ کی عمر کے متعلق بعض روایات میں چھ سال کا ذکر آنا اور بعض میں سات سال کا یقینی طور پر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر چھ سے گذر کر سات کے اس قدر قریب پہنچ چکی تھی کہ اس پر سات سال کا اطلاق عام محاورہ کی رُو سے جائز ہو گیا تھا اور صرف تھوڑی سی برائے نام کمی کی وجہ سے چھ سال کا لفظ استعمال کر لیا جاتا تھا ورنہ عملاً ان کی عمر سات سال کی ہی تھی، چنانچہ اسی خیال کے ماتحت بعض مؤرخین نے چھؔ سال کے ذکر کو بالکل ترک کر دیا ہے اور صرف سات سال کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ابن ہشامؒ نے چھ سال کا ذکر تک نہیں کیا اور صرف ساتؔ سال کا ذکر کیا ہے اور اس کے مقابلہ میں میری نظر سے کوئی ایسی مستند تاریخ کی کتاب نہیں گذری جس میں

---

[1] بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۳۰ ، [2] جلد ۳ صفحہ ۹۴ ، [3] جلد ۸ صفحہ ۴۱ سطر ۲۶
[4] جلد ۳ صفحہ ۱۲۶۳ سطر ۶ ، [5] جلد ۳ صفحہ ۹۴

صرف چھ سال کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہو۔ پھر صاحب سیرت حلبیہ نے بھی جہاں ازواج النبیؐ کا ذکر کیا ہے، وہاں حضرت عائشہ کی عمر صرف سات سال بیان کی ہے اور چھ سال کا ذکر نہیں کیا[1]۔ اور حضرت عائشہ کے نکاح کے بیان میں ذکر تو دونوں کا ہے مگر صراحتاً لکھا ہے کہ سات سال والی روایت اقرب بالصحت ہے[2]۔ اندریں حالات گو روایتہ دونوں قسم کی روایتیں صحیح ہیں مگر درایت کے طریق پر اس بات میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں سمجھی جا سکتی کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سات سال کے اس قدر قریب پہنچی ہوئی تھی کہ گویا عملاً وہ سات سال ہی تھی۔

اب جب یہ ثابت ہو گیا کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سات سال کی تھی تو اگلا حساب کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت عائشہ کی شادی شوال ۱۰ سنہ نبوی میں ہوئی تھی[3] اور یہی تاریخ جمہور مؤرخین میں مسلّم ہے گویا شوال ۱۰ سنہ نبوی میں حضرت عائشہ کی عمر سات سال یا اس کے قریب تھی۔ اس کے بعد ربیع الاوّل ۱۴ سنہ نبوی میں ہجرت ہوئی[4] اس طرح شادی اور ہجرت کے درمیان کا عرصہ تین سال اور کچھ ماہ بنتا ہے اور ہجرت کے وقت حضرت عائشہ کی عمر دس سال اور کچھ ماہ کی قرار پاتی ہے اس کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہجرت اور رخصتانہ کے درمیان کا عرصہ کس قدر ہے یہ مسلّم ہے کہ ہجرت ربیع الاوّل میں ہوئی، اس لیے ہجرت کا پہلا سال ساڑھے نو ماہ کا ہوا اور پھر چونکہ رخصتانہ شوال ۲ سنہ ہجری میں ہوا اس لیے ساڑھے نو ماہ ہی دُوسرے سال کے ہوتے اور یہ دونوں عرصے مل کر ہجرت اور رُخصتانہ کے درمیان کا عرصہ انیس ۱۹ ماہ یعنی ایک سال اور سات ماہ کا ہوا۔ اب اگر اس عرصہ کے ساتھ ملائیں جو ہجرت سے قبل کا ہے تو اس کی میزان وہی بارہ سال ہوتی ہے جو ہم نے دوسری جہت سے قرار دی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ خواہ حضرت عائشہ کے اندازے سے حساب شماری کریں یا یہ کہ اُن کی تاریخ پیدائش سے شمار کریں نتیجہ دونوں صورتوں کا یہی ہے کہ رخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر بارہ سال کی تھی نہ کہ نو سال کی۔ اور یقیناً حضرت عائشہ کا یہ خیال کہ اُسوقت میری عمر نو سال کی تھی غلط اندازے یا غلط حساب شماری پر مبنی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انھوں نے مہینوں کی کسر چھوڑ کر اپنے نکاح کی عمر کا اندازہ چھ سال لگایا تو اس کے بعد انھوں نے حسابی طور پر درمیانی عرصہ کو شمار نہیں کیا بلکہ یونہی موٹے طور پر اندازہ کر لیا کہ رُخصتانہ کے وقت اُن کی عمر نو سال کی ہوگی اور پھر یہی خیال ان کے دل میں قائم ہو گیا۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ اُس وقت تک ابھی جنتری وغیرہ کا حساب مروّج نہیں ہوا تھا اور ہجری کی تاریخ بھی ابھی ضبط و تدوین میں نہیں آئی تھی۔ اور پھر شادی اور رخصتانہ کے درمیان کی میعاد بھی دو مختلف سنین (یعنی

---

[1] سیرت حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۳۵۲ ☆ [2] سیرت حلبیہ جلد ۱ صفحہ ۳۷۹
[3] ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۳۹ ☆ [4] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲۵۵

سن نبوئی اور سن ہجری) کے حسابات سے تعلق رکھتی تھی اس لیے حضرت عائشہ سے حساب شماری میں سہواً غلطی ہوگئی ہو اور پھر یہ غلط خیال ان کے دل میں ایسا راسخ ہوگیا ہو کہ بعد میں کبھی اس حسابی غلطی کی طرف ان کا ذہن منتقل ہی نہ ہوا ہو لیکن بہرحال کچھ بھی ہو اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سات سال یا اس کے قریب تھی تو پھر رخصتانہ کے وقت نو سال کی عمر کا اندازہ کسی صورت میں بھی درست نہیں سمجھا جا سکتا اور یہ ایک حسابی سوال ہے جس کے مقابلہ میں کوئی اور دلیل نہیں ٹھہر سکتی۔ خلاصہ کلام یہ کہ خواہ کسی جہت سے بھی دیکھا جاوے رخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر بارہ سال یا اس کے قریب قریب ہوتی ہے اور اگر رخصتانہ کی تاریخ شوال سلہ ہجری قرار دی جاوے تو پھر بھی ان کی عمر گیارہ سال کی بنتی ہے پس نو سال کا اندازہ بہرحال غلط اور نادرست ہے۔

لیکن اگر بالفرض نو سال کی عمر کو ہی صحیح تسلیم کر لیا جاوے تو پھر بھی کوئی جائے اعتراض نہیں ہے، کیونکہ عرب جیسے ملک میں نو یا دس سال کی لڑکی کا بالغ ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ خود ہمارے ہندوستان میں بھی بعض لڑکیاں جن میں نشوونما کا مادہ غیر معمولی طور پر زیادہ ہوتا ہے۔ دس سال کی عمر میں بالغ ہو جاتی ہیں۔ دراصل بلوغ کا انحصار زیادہ تر آب و ہوا اور خوراک اور گردوپیش کے حالات پر ہوتا ہے۔ ٹھنڈے ممالک میں اور خصوصاً ایسے ممالک میں جہاں کی خوراک میں گرم مسالہ جات کا دخل کم ہوتا ہے، لڑکیاں عموماً بہت دیر میں بالغ ہوتی ہیں، چنانچہ انگلستان وغیرہ میں سن بلوغ اوسطاً اٹھارہ سال کا ہوتا ہے اور لڑکیوں کی شادی عموماً بیس سال بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ عمر میں ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں اگر کوئی لڑکی بیس سال کی عمر تک بغیر شادی کے بیٹھی رہے تو عموماً لوگوں میں انگشت نمائی شروع ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی نقص ہو گا تبھی اسے کوئی رشتہ نہیں ملا۔ کیونکہ یہاں بلوغ کی اوسط عمر تیرہ چودہ سال ہے۔ عرب کا ملک چونکہ ہندوستان کی نسبت بھی زیادہ گرم اور خشک ہے اس لیے وہاں کے سن بلوغ کی اوسط ہندوستان سے بھی گری ہوئی ہے اور کئی لڑکیاں ایسی ملتی ہیں جو نو دس سال کی عمر میں ہی سن بلوغ کو پہنچ جاتی ہیں۔ اندریں حالات حضرت عائشہ کا نو یا دس سال کی عمر میں بالغ ہو کر رخصتانہ کے قابل ہو جانا ہرگز قابل تعجب نہیں سمجھا جا سکتا۔ خصوصاً جبکہ اس امر کو مد نظر رکھا جاوے کہ حضرت عائشہ میں نشوونما کا مادہ غیر معمولی طور پر زیادہ تھا۔ جیسا کہ سر ولیم میور نے بھی اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے [۱]۔

بہرحال اب حضرت عائشہ پوری طرح بالغ تھیں اور ہجرت کے بعد شوال سنہ ۲ ہجری میں ان کا رخصتانہ ہوا۔ اس وقت حضرت عائشہ کی والدہ مدینہ کے مضافات میں ایک جگہ السُّنح نامی میں مقیم تھیں، چنانچہ انصار کی عورتوں نے وہاں جمع ہو کر حضرت عائشہ کو رخصتانہ کے لیے آراستہ کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ

---

[۱] دیکھو لائف آف محمدؐ صفحہ ۱۱۰، ۱۷۱

علیہ وسلّم خود وہاں تشریف لے گئے اور اس کے بعد حضرت عائشہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر حرم نبوی میں داخل ہو گئیں[1]۔ مہر پانچسو درہم یا بعض روایات کی رُو سے چار سو درہم[2] یعنی کم و بیش ایک صد روپیہ تھا، جو رخصتانہ کے وقت نقد ادا کر دیا گیا[3]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تمام بیویوں میں سے صرف حضرت عائشہ ہی وہ بیوی تھیں جو باکرہ ہونے کی حالت میں آپؐ کے نکاح میں آئیں[4]۔ باقی سب بیوہ یا مطلقہ تھیں اور اس خصوصیت کو حضرت عائشہ بعض اوقات اپنے امتیازات میں شمار کیا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ کے رُخصتانہ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی عمر قریباً پچپن سال کی تھی اور آپ حضرت عائشہ کی خوردسالی کا خیال کرتے ہوئے ان کے ساتھ بہت دلداری کا سلوک فرماتے اور ان کے جذبات کا خاص خیال رکھتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ جب چند حبشی شمشیرزن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابہ کو نیزہ کے کرتب دکھانے لگے تو آپؐ نے انہیں مسجدِ نبوی کے صحن میں کرتب دکھانے کے لیے ارشاد فرمایا۔ اور خود حضرت عائشہ کو سہارا دیکر مکان کی دیوار کے ساتھ اپنی اوٹ میں لیکر کھڑے ہو گئے۔ تاکہ وہ بھی ان لوگوں کے کرتب دیکھ لیں۔ اور جب تک وہ اس فوجی تماشہ سے خود سیر نہیں ہو گئیں آپؐ وہاں سے نہیں ہٹے[5]۔ ایک دوسرے موقعہ پر آپؐ نے حضرت عائشہ کے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ کیا۔ پہلی دفعہ تو حضرت عائشہ آگے نکل گئیں، لیکن جب ایک عرصہ بعد آپؐ دُوسری دفعہ اُن کے ساتھ دوڑے تو اس وقت وہ پیچھے رہ گئیں، جس پر آپؐ نے مُسکراتے ہوئے فرمایا۔ ھٰذِہٖ بِتِلْکَ[6]۔ یعنی "لو عائشہ اب وہ بدلہ اُتر گیا ہے۔" بعض اوقات حضرت عائشہ کی بعض سہیلیاں اُن کے گھر میں معصومانہ اشعار وغیرہ پڑھنے کا شغل کرتیں، تو آپؐ بالکل تعرض نہ فرماتے بلکہ جب ایک دفعہ حضرت ابوبکر نے یہ نظارہ دیکھ کر لڑکیوں کو کچھ تنبیہہ کرنی چاہی تو آپؐ نے منع فرمایا اور کہا ابوبکر جانے دو۔ یہ عید کا دن ہے لڑکیاں اپنا شغل کرتی ہیں لیکن جب آپؐ دوسری طرف متوجہ ہوئے تو حضرت عائشہ نے خود ان لڑکیوں کو اشارہ کر کے انہیں رخصت کر دیا[7]۔ مگر باوجود اس صغرسنی کے حضرت عائشہ کا ذہن اور حافظہ غضب کا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم و تربیت کے ماتحت انھوں نے نہایت سرعت کے ساتھ حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔ اور دراصل اس چھوٹی عمر میں ان کو اپنے گھر میں لے آنے سے آپ کی غرض ہی یہ تھی کہ تا آپ بچپن سے ہی اپنے منشاء کے مطابق اُن کی تربیت کر سکیں اور تا انہیں آپ کی صحبت میں رہنے کا لمبے سے لمبا عرصہ مل سکے اور وہ اس نازک اور عظیم الشان کام کے اہل بنائی جا سکیں جو ایک شارعِ نبی کی بیوی پر عاید ہوتا ہے، چنانچہ آپؐ اس منشاء میں کامیاب ہوئے

---

[1] بخاری کتاب بدءالخلق تزویج النبی [2] مسلم [3] ابن سعد [4] ابن سعد
[5] بخاری کتاب النکاح [6] بخاری باب حسن المعاشرت [7] ابوداؤد باب السبق
[8] بخاری کتاب العیدین ؎

اور حضرت عائشہ نے مسلمان خواتین کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا وہ کام سرانجام دیا جس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ احادیثِ نبویؐ کا ایک بہت بڑا اور بہت ضروری حصہ حضرت عائشہ ہی کی روایات پر مبنی ہے حتیٰ کہ ان کی روایتوں کی کل تعداد دو ہزار دو سو دس تک پہنچتی ہے[1]۔ ان کے علم و فضل اور تفقہ فی الدین کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ اُن کا لوہا مانتے اور ان سے فیض حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کو کوئی علمی مشکل ایسی پیش نہیں آئی کہ اس کا حل حضرت عائشہ کے پاس نہ مل گیا ہو[2] اور عروہ بن زبیر کا قول ہے کہ مَیں نے کوئی شخص علمِ قرآن اور علمِ میراث اور علمِ حلال و حرام اور علمِ فقہ اور علمِ شعر اور علمِ طب اور علمِ حدیثِ عرب اور علمِ انساب میں عائشہؓ سے زیادہ عالم نہیں دیکھا[3]۔ زہد و قناعت میں اُن کا یہ مرتبہ تھا کہ ایک دفعہ ان کے پاس کہیں سے ایک لاکھ درہم آئے انہوں نے شام ہونے سے پہلے پہلے سب خیرات کر دیئے، حالانکہ گھر میں شام کے کھانے تک کے لیے کچھ نہیں تھا[4]۔ انہی اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے جن کی جھلک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی نظر آنے لگ گئی تھی۔ آپؐ انہیں خاص طور پر عزیز رکھتے تھے اور بعض اوقات فرماتے تھے کہ سب لوگوں میں عائشہ مجھے محبوب ترین ہے[5]۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مردوں میں تو بہت لوگ کامل گذرے ہیں، لیکن عورتوں میں کاملات بہت کم ہوئی ہیں۔ پھر آپؐ نے آسیہ اہلیہ فرعون اور مریم بنت عمران کا نام لیا اور پھر فرمایا کہ عائشہ کو عورتوں پر وہ درجہ حاصل ہے جو عرب کے بہترین کھانے ثرید کو دوسرے کھانوں پر ہوتا ہے[6]۔ ایک دفعہ بعض دوسری ازواج مطہرات نے کسی اہلی امر میں حضرت عائشہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات کہی مگر آپؐ خاموش رہے، لیکن جب اصرار کے ساتھ کہا گیا تو آپؐ نے فرمایا "مَیں تمہاری ان شکایتوں کا کیا کروں مَیں تو یہ جانتا ہوں کہ کبھی کسی بیوی کے لحاف میں مجھ پر میرے خدا کی وحی نازل نہیں ہوئی، مگر عائشہ کے لحاف میں وہ ہمیشہ نازل ہوتی ہے[7]۔" اللہ اللہ! کیا ہی مقدس وہ بیوی تھی جسے یہ خصوصیت حاصل ہوئی اور کیا ہی مقدس وہ خاوند تھا جس کی اہلی محبت کا معیار بھی تقدس و طہارت کے سوا کچھ نہیں تھا!!

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ حضرت عائشہ کا نکاح خاص خدائی تجویز کے ماتحت وقوع میں آیا تھا؛ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ان کے نکاح سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا

---

[1] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۳۴ ٭ [2] ترمذی باب مناقب عائشہ ٭ [3] حاکم و طبرانی بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۳۴ ٭ [4] ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۴۶ ٭ [5] بخاری باب مناقب ابی بکرؓ ٭

[6] بخاری باب فضل عائشہ ٭

[7] بخاری باب فضل عائشہ ٭

تھا کہ ایک فرشتہ آپ کے سامنے ایک ریشمی کپڑا پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ آپ کی بیوی ہے آپ اسے کھولتے ہیں تو اس میں حضرت عائشہ کی تصویر پاتے ہیں مگر آپ نے اس خواب کا کسی سے ذکر نہیں فرمایا اور سمجھ لیا کہ اگر اس خواب نے اپنی ظاہری صورت میں پورا ہونا ہے تو خدا خود اس کا سامان کر دے گا؛ چنانچہ بالآخر خولہ بنت حکیم کی تحریک سے یہ رشتہ قائم ہو گیا[1] احادیث میں یہ ذکر بھی آتا ہے کہ آخری ایام میں حضرت سودہ بنت زمعہ نے اپنی باری حضرت عائشہ کو دیدی تھی اور اس طرح حضرت عائشہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مستفیض ہونے کا دوہرا موقعہ میسر آگیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ اس زمانہ میں شریعت کا نزول ہو رہا تھا اور ہر امر میں جدید دستور العمل کی بنیاد پڑ رہی تھی، اس لیے جب حضرت سودہ بوڑھی ہو گئیں اور پورے طور پر حقوقِ زوجیت کی ادائیگی کے قابل نہ رہیں تو انہیں اپنی جگہ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں انہیں علیحدہ کر دیں اس لیے انھوں نے خود ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کرکے کہ یارسول اللہ مجھے اب باری کی ضرورت نہیں ہے اپنی باری حضرت عائشہ کو دیدی[2] ان کا یہ خیال تو سراسر غلط اور محض وہم پر مبنی تھا، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال تھا اور وہ اپنی عمر اور حالات کے لحاظ سے اس قابل تھیں کہ ان پر خاص توجہ صرف کی جاوے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باری کے متعلق سودہ کی تجویز منظور فرمالی۔ مگر اس کے بعد بھی آپ حضرت سودہؓ کے پاس باقاعدہ تشریف لے جایا کرتے تھے اور دُوسری بیویوں کی طرح ان کی دلداری اور آرام کا خیال رکھتے تھے۔

حضرت عائشہؓ کے خواندہ ہونے کے متعلق اختلاف ہے مگر بخاری کی ایک روایت سے پتہ لگتا ہے کہ اُن کے پاس ایک نسخہ قرآن شریف کا لکھا ہوا موجود تھا[3] جس پر سے انہوں نے ایک عراقی مسلمان کو بعض آیات خود املا کرائی تھیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کم از کم خواندہ ضرور تھیں اور اغلب ہے کہ انھوں نے اپنے رُخصتانہ کے بعد ہی لکھنا سیکھا تھا، لیکن جیسا کہ بعض مؤرخین نے تصریح کی ہے وہ غالباً لکھنا نہیں جانتی تھیں[4]۔ حضرت عائشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کم و بیش اڑتالیس سال زندہ رہیں اور ۵۸ سنہ ہجری کے ماہِ رمضان میں اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملیں۔ اُس وقت اُن کی عمر قریباً اڑسٹھ سال کی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعدّد ازدواج اور اسکی حکمتیں

حضرت عائشہ کے رُخصتانہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم

---

[1] بخاری کتاب النکاح ۔

[2] ترمذی و ابوداؤد بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۲۹ ۔ [3] باب تالیف القرآن ۔ [4] بلاذری باب امر الخط ۔

میں تعدد ازدواج کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے اس موقعہ پر اس مسئلہ کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ درج کرنا نامناسب نہ ہوگا لیکن پیشتر اس کے کہ تعدد ازدواج کے متعلق کچھ بیان کیا جاوے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اغراض بیان کر دی جائیں جو اسلامی شریعت میں نکاح کی مقرر کی گئی ہیں۔ کیونکہ منجملہ اور اغراض کے ان اغراض کے توسیعی مصالح پر ہی تعدد ازدواج کا ایک حد تک دارومدار ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ قرآن شریف سے نکاح کی اغراض چار معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل انسان کا بعض جسمانی اور اخلاقی اور روحانی بیماریوں اور ان کے بدنتائج سے محفوظ ہو جانا۔ اسی صورت کو عربی میں احصان کہتے ہیں جس کے لفظی معنے کسی قلعہ کے اندر محفوظ ہو جانے کے ہیں۔ دوم بقائے نسل۔ سوم حصولِ رفیق حیات اور سکینتِ قلب۔ چہارم محبت اور رحمت کے تعلقات کی توسیع؛ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے:۔

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ[1]

"اور اے مسلمانو! جائز کی جاتی ہیں تمہارے لیے تمام عورتیں سوائے ان عورتوں کے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ کہ تم اُن کے مہر مقرر کر کے اُن کے ساتھ نکاح کرو۔ مگر تمہارے نکاح کی غرض یہ ہونی چاہیئے کہ تم بیماریوں اور بدیوں سے محفوظ ہو جاؤ اور یہ غرض نہیں ہونی چاہیئے کہ تم شہوت کے طریق پر عیش و عشرت میں پڑو۔"

اس آیت میں احصان والی غرض بیان کی گئی ہے یعنی (الف) یہ کہ نکاح کے ذریعہ انسان بعض ان خاص قسم کی جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہونے سے بچ جاوے جو تجرّد کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں اور (ب) یہ کہ وہ بعض رُوحانی اور اخلاقی بیماریوں سے محفوظ ہو جاوے، لیکن ناپاک خیالات اور ناپاک تعلقات میں مبتلا نہ ہو۔ اسی غرض و غایت کو ایک دُوسری آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ[2]

"اے مسلمان مردو! یاد رکھو کہ تمہاری عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم اپنی عورتوں کا لباس ہو۔"

یعنی تم ایک دُوسرے کو بدیوں اور بیماریوں سے محفوظ کرنے کا ذریعہ ہو جیسا کہ لباس انسان کے لیے سردی اور گرمی کی تکلیف سے بچنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس آیت میں چونکہ عورتوں کو بھی شامل کرنا تھا اس لیے طریق بیان زیادہ لطیف کر دیا گیا ہے۔ نیز اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مرد و عورت ایک دُوسرے کے لیے پردہ پوشی کا بھی ذریعہ ہیں جیسا کہ لباس بھی پردہ پوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

پھر فرماتا ہے:

نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ[3]

---

[1] سورۃ نساء: ۲۵ [2] بقرہ: ۱۸۸ [3] بقرہ: ۲۲۴

یعنی "اے مسلمانو! تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں جن سے تمہاری آئندہ نسل کی فصل نے پیدا ہونا ہے۔ پس اب تمہیں اختیار ہے کہ جس طرح چاہو اپنی کھیتیوں کے ساتھ معاملہ کرو اور جس قسم کی فصل اپنے لیے پیدا کرنا چاہو پیدا کر لو۔"

اس آیت میں بقائے نسل کی غرض بیان کی گئی ہے یعنی یہ کہ انسانی نسل کا سلسلہ قائم رہے اور ساتھ ہی خداتعالیٰ نے نہایت لطیف پیرایہ میں یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ جب بیویوں کے ذریعہ آئندہ نسل کا وجود قائم ہونا ہے تو پھر انسان کو چاہیئے کہ اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات رکھنے میں ایسا طریق اختیار کرے کہ جس کے نتیجہ میں آئندہ نسل خراب نہ ہو بلکہ بہتر سے بہتر نسل پیدا ہو۔

پھر فرماتا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً [1]

یعنی "اللہ تعالیٰ نے تمہاری جنس میں سے ہی تمہارے لیے بیویاں بنائی ہیں تاکہ تم اُن کے تعلق میں سکینتِ قلب حاصل کرو اور پھر اس تعلق کو خدا نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت کا ذریعہ بنایا ہے۔"

اس آیت میں نکاح کی تیسری اور چوتھی اغراض بیان کی گئی ہیں۔ یعنی یہ کہ خاوند کو بیوی میں اور بیوی کو خاوند میں رفیقِ حیات میسر آجاوے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے تعلق میں تسکینِ قلب پائیں اور دوسرے یہ کہ نکاح کے ذریعہ سے خاوند اور بیوی کے متعلقین کے درمیان رشتۂ وداد و اتحاد قائم ہو جاوے اور نسلی رشتہ داری کے تعلق کے علاوہ رحمی تعلق کے ذریعہ بھی مختلف خاندانوں اور مختلف قوموں کے درمیان محبت اور رحمت کی زنجیر سے منسلک ہو جانے کے موقعے میسر رہیں۔

الغرض اسلامی شریعت میں نکاح کی چار اغراض بیان کی گئی ہیں۔ اوّل احصان یعنی بعض جسمانی اور رُوحانی بیماریوں اور ان کے نتائج سے محفوظ ہو جانا۔ دوّم بقاء نسل۔ سوّم رفاقتِ حیات اور تسکینِ قلب۔ چہارم مختلف خاندانوں یا مختلف قوموں کا آپس میں محبت اور رحمت کے رشتہ کے ذریعہ سے مِل جانا۔ اور اگر غور کیا جاوے تو یہ ساری اغراض نہ صرف بالکل جائز اور مناسب ہیں بلکہ نہایت درجہ پاکیزہ اور فطرتِ انسانی اور ضروریاتِ بنی نوع انسان کے عین مطابق ہیں اور ان سے خاوند بیوی کے تعلق کو ایک بہترین بنیاد پر قائم کر دیا گیا ہے اور اس تعلق سے بہترین ثمرہ پیدا کرنے کی صورت نکالی گئی ہے اور ان اغراض کے مقابلہ میں جس غرض کو قرآن شریف نے نام لے کر ناجائز قرار دیا اور اس سے مسلمانوں کو روکا

---

[1] سورۃ روم: ۲۲

ہے وہ تعیّش اور شہوت رانی کی غرض ہے۔

اب ہم وہ اغراض بیان کرتے ہیں جو تعدد ازدواج کی اجازت میں اسلام نے مدنظر رکھی ہیں سو اسلامی شریعت کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ اغراض دو قسم کی ہیں۔ اوّل وہی عام اغراض جو نکاح میں اسلام کے مدِنظر ہیں اور جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ دوم وہ خاص اغراض جو مخصوص طور پر تعدد ازدواج کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مقدم الذکر اغراض کو تعدد ازدواج کے معاملہ میں اس لیے بحال رکھا گیا ہے کہ بعض اوقات ایک بیوی سے نکاح کی غرض پورے طور پر حاصل نہیں ہوتی اور اس لیے اسی غرض کے ماتحت دوسری بیوی کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً نکاح کی ایک غرض احصان ہے یعنی یہ کہ اس ذریعہ سے انسان بعض بیماریوں اور بدیوں اور بدکاریوں سے بچ جاوے لیکن ہو سکتا ہے کہ انسان کے حالات ایسے ہوں کہ وہ ایک ہی عورت کے تعلق سے جس پر حیض اور حمل اور وضع حمل اور رضاعت اور پھر مختلف قسم کی بیماریوں وغیرہ کی حالتیں آتی رہتی ہیں اپنے تقویٰ اور طہارت کو قائم نہ رکھ سکتا ہو۔ اور اگر وہ غیر معمولی کوشش کے ساتھ اپنے آپ کو عملی بدی سے بچائے بھی رکھے تو کم از کم اس کے خیالات میں ناپاکی کا عنصر غالب رہتا ہو اور یا اس طرح رُکے رہنے سے اُسے کسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کا صحیح علاج سوائے تعدد ازدواج کے اور کوئی نہیں۔ یعنی وہی غرض جو ایک نکاح کی محرّک تھی اس صورت میں اس کے لیے دوسرے نکاح کی محرک ہو جائے گی۔ اسی طرح نکاح کی ایک غرض بقائے نسل ہے لیکن اگر کسی شخص کے ہاں ایک بیوی سے کوئی اولاد نہ ہو یا نرینہ اولاد نہ ہو تو یہی غرض دوسرے نکاح کی جائز بنیاد بن جائے گی۔ اسی طرح نکاح کی ایک غرض رفاقتِ حیات اور تسکینِ قلب ہے لیکن اگر کسی کی بیوی دائم المریض ہو اور اس کا مرض اس حالت کو پہنچا ہوا ہو کہ وہ بالکل صاحبِ فراش رہتی ہو یا وہ مجنون ہو جاوے تو اس صورت میں ایسے شخص کو رفاقتِ حیات اور تسکینِ قلب کی غرض کو پورا کرنے کے لیے دوسری بیوی کی ضرورت ہو گی۔ اسی طرح نکاح کی ایک غرض مختلف خاندانوں کا آپس میں ملنا اور ایک دُوسرے کے لیے محبت و رحمت کے موقعے پیدا کرنا ہے لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نے ابتداءً کسی ایسے خاندان میں شادی کی ہو جہاں اس کے لیے اس رشتہ محبت کا قائم ہونا ضروری تھا، مگر اس کے بعد اس کے لئے اس سے بھی زیادہ ضروری اور اہم موقعے پیش آجائیں جہاں اس کا تعلق قائم ہونا خاندانی یا قومی یا ملکی یا سیاسی یا دینی مصالح کے ماتحت نہایت ضروری اور پسندیدہ ہو تو اس صورت میں اس کے لیے تعدد ازدواج پر عمل کرنا ضروری ہو جائے گا۔ الغرض وہ ساری اغراض جو اسلام نے نکاح کے متعلق بیان کی ہیں وہی خاص حالات میں تعدد ازدواج کی بنیاد بھی بن جاتی ہیں اور مندرجہ بالا صورتیں مثال کے طور پر بیان کی گئی ہیں، ورنہ اور بعض صورتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں کہ جب نکاح کی غرض ایک بیوی سے پورے طور پر یا احسن صورت میں حاصل نہیں ہوتی اور دوسری بیوی کی جائز طور پر ضرورت پیش آجاتی ہے، لیکن ان اغراض کے علاوہ اسلام

نے تعدّدِ ازدواج کی بعض خاص وجوہات بھی بیان کی ہیں اور وہ تین ہیں۔ اوّل حفاظتِ یتامیٰ۔ دوم انتظامِ بیوگان، سوم تکثیرِ نسل۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً [1]

اور" اے مسلمانو! (ان جنگوں میں جو تمہیں درپیش ہیں لازماً یتامیٰ کی کثرت ہوگی اور تمہیں ان یتامیٰ کی حفاظت کے لیے تعدّدِ ازدواج کی ضرورت پیش آئیگی پس) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ (ایک بیوی تک محدود رہتے ہوتے) تم یتامیٰ کی حفاظت اور اُن کے حقوق کی خاطر خواہ ادائیگی سے قاصر رہو گے تو پھر اپنی پسند کے مطابق زیادہ عورتوں سے شادیاں کرو۔ دو دو کے ساتھ تین تین کے ساتھ اور چار چار کے ساتھ (مگر اس سے زیادہ نہیں کیونکہ خدا کی نظر میں یہ حد تمہاری استثنائی ضروریات کے لیے کافی ہے، لیکن اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ اپنی مالی یا جسمانی یا انتظامی کمزوری کی وجہ سے یا طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے) تم ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کر کے ان کے ساتھ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر تمہیں لازماً ایک ہی بیوی سے شادی کرنی چاہیئے۔"

اس آیت کریمہ میں تعدّدِ ازدواج کے حکم کو یتامیٰ کے ذکر کے ساتھ ملا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دراصل یتامیٰ کی کثرت بھی تعدّدِ ازدواج کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ ہے اور چونکہ یتامیٰ کی کثرت ایک طرف تو بیوگان کی کثرت کو چاہتی ہے اور دوسری طرف وہ آئندہ کے لیے نسل کی قلت کا اندیشہ پیدا کرتی ہے اور ویسے بھی یہ تینوں حالتیں جنگ کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس لیے گویا اس آیت میں ہی خدا تعالیٰ نے نہایت لطیف پیرایہ میں تعدّدِ ازدواج کی ساری زائد اغراض کو جمع کر دیا ہے۔ یعنی حفاظتِ یتامیٰ انتظامِ بیوگان اور علاجِ قلتِ نسل۔ اور پھر مزید تشریح و توضیح کے لیے ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر بھی کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ [2]

یعنی "اے مسلمانو! (اب جب ہم نے تمہارے لیے تعدّدِ ازدواج کا استثنائی علاج تجویز کر دیا ہے تو) اب تمہیں ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ حتی الوسع کوئی غیر شادی شدہ عورت خواہ وہ کنواری ہو یا بیوہ ہو بغیر شادی کے نہ رہے۔"

اس آیت میں غیر شادی شدہ عورتوں خصوصاً بیوگان کی شادی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

---

[1] سورۃ نساء: ۴ ۔ [2] سورۃ نور: ۳۳

پھر حدیث میں آتا ہے :

عَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّیْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ ؎

"یعنی معقل بن یسار روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب سے فرماتے تھے کہ تمہیں چاہیئے کہ محبت کرنے والی زیادہ بچے دینے والی عورتوں کے ساتھ شادیاں کیا کرو، تاکہ تمہاری تعداد ترقی کرے اور میں قیامت کے دن اپنی اُمت کی زیادتی پر فخر کرسکوں "

اس حدیث میں تکثیرِ نسل والی غرض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اِس طرح یہ کل سات اغراض ہوتی ہیں جو اسلام نے تعددِ ازدواج کے متعلق بیان کی ہیں یعنی جسمانی اور رُوحانی بیماریوں سے حفاظت۔ بقائے نسل۔ رفاقتِ حیات اور تسکینِ قلب۔ محبت و رحمت کے تعلقات کی توسیع۔ انتظامِ یتامیٰ۔ انتظامِ بیوگان اور ترقیٔ نسل۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اغراض کو حاصل کس طرح کیا جاوے۔ یعنی کس اصل کے ماتحت بیوی کا انتخاب کیا جاوے کہ یہ اغراض احسن صورت میں حاصل ہوسکیں۔ سو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِاَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ ؎

"یعنی نکاح میں عورت کا انتخاب چار قسم کے خیالات کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ عورت کی مالی حالت کی بناء پر بیوی کا انتخاب کرتے ہیں۔ بعض کو حسب و نسب کا خیال ہوتا ہے بعض خوبصورتی اور حُسن دیکھتے ہیں اور بعض لوگ عورت کی اخلاقی اور دینی حالت کو مدنظر رکھتے ہیں، لیکن اے مُسلمانو! تمہیں چاہیئے کہ تم ہمیشہ دینی پہلو کو ترجیح دیا کرو۔ یہی تمہاری کامیابی کا طریق اور یہی دین و دُنیا کی خرابی سے بچنے کا طریق ہے "

اس حدیث میں نکاح کی اغراض کے حصول کے لیے بیوی کے انتخاب کا اصول بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دینی پہلو کو ترجیح دی جاوے اور دین سے صرف عورت کی ذاتی دینی یا اخلاقی حالت مراد نہیں ہے اور نہ دین کا لفظ عربی زبان میں محض مذہب اور عقیدہ کے معنوں میں آتا ہے بلکہ جیسا کہ عربی کی مشہور لغت اقرب الموارد میں تشریح کی گئی ہے دین کا لفظ عربی زبان میں مندرجہ ذیل معانی کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اوّل اخلاق و عادات، دوم رُوحانی پاکیزگی اور طہارت۔ سوم مذہب۔ چہارم قوم و ملت۔ پنجم سیاست و

؎ ابوداؤد و نسائی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب النکاح ۔ ؎ بخاری کتاب النکاح ۔

حکومت۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ عورت کے انتخاب میں دینی پہلو کو ترجیح دی جاوے اس میں جہاں یہ مراد ہے کہ بیوی ایسی ہونی چاہیئے جو ذاتی طور پر اخلاق وعادات اور تقویٰ وطہارت اور مذہب وعقیدہ میں اچھی ہو تاکہ خاوند اور بیوی کے تعلقات بھی اچھے رہیں اور آئندہ اولاد پر بھی اچھا اثر پڑے، وہاں یہ بھی مراد ہے کہ بیوی کے انتخاب میں وہ عام دینی پہلو بھی جو مصالحِ مذہب اور مصالحِ قوم وملت اور مصالحِ سیاست وحکومت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اپنے اپنے موقعہ پر مدِنظر رہنے چاہئیں اور اگر اس جگہ کسی کو یہ شبہ گذرے کہ گو لغوی طور پر یہ سب معانی درست ہوں مگر یہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ایک ہی لفظ میں ایک ہی وقت میں اتنے معانی مراد ہوں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مُقنّن نبی تھے۔ آپؐ کا کلام قانونی کلام کا رنگ رکھتا تھا جو ہمیشہ جامع المعانی اور وسیع المفہوم ہوتا ہے اور اس کے ایک ایک لفظ میں کئی کئی پہلو مدِنظر ہوتے ہیں اور اسی روشنی میں ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے معنے کرنے چاہئیں اور بہرحال جب لغوی طور پر یہ معانی دُرست ہیں تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام نے نکاح کی اغراض چار اور تعددِ ازدواج کی اغراض سات بیان کی ہیں اور ان اغراض کے بہترین حصول کے لیے بیوی کے انتخاب کے متعلق یہ ہدایت دی ہے کہ اس میں عورت کی ذاتی خوبی کے علاوہ مصالحِ مذہب اور مصالحِ قوم وملت اور مصالحِ سیاست وحکومت کو ترجیح دینی چاہیئے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ نکاح کے معاملہ میں اور خوبیوں کو نہ دیکھا جاوے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں کو عورت کی دوسری خوبیوں کے مدِنظر رکھنے کی بھی اجازت دی ہے بلکہ بعض اوقات خود اس کی تحریک فرمائی ہے کہ دوسری باتوں کو بھی دیکھ لیا کرو؛ چنانچہ باوجود پردہ کے احکام کے آپؐ یہ تحریک فرماتے تھے کہ نکاح سے پہلے مرد کو چاہیئے کہ عورت کو خود دیکھ لے[1] تاکہ بعد میں شکل وصورت کی ناپسندیدگی کی وجہ سے اس کی طبیعت میں کسی قسم کا تکدر نہ پیدا ہو۔ اسی طرح مناسب حد تک مالی حالت کے مدِنظر رکھنے کی بھی تحریک کی گئی ہے[2]۔ اسی طرح ایک حد تک عمر اور طبیعت کی مناسبت کو بھی ملحوظ رکھنے کی سفارش کی گئی ہے[3] اور یہی اُصول دوسرے حالات میں چسپاں ہوتا ہے مگر جس بات کی اسلام ہدایت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ان باتوں کو دینی پہلو کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ اگر دینی پہلو کی خوبیاں موجود نہ ہوں تو محض یہ خوبیاں حقیقی اور دائمی خوشی کی بنیاد نہیں بن سکتیں بلکہ بعض صورتوں میں مُضر اور نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہیں۔

---

[1] ترمذی ابواب النکاح ۔ [2] مسلم کتاب الرضاع باب المطلقة ثلاثا لا نفقة لها۔ [3] مسلم کتاب الرضاع باب استحباب نکاح البکر و بخاری کتاب النکاح باب الثیبات۔

اب ایک طرف تعددِ ازدواج کی اغراض اور دوسری طرف اس اصول کو جو بیویوں کے انتخاب کے لیے اسلام نے تجویز کیا ہے، مدِّنظر رکھا جاوے تو ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی بابرکت انتظام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے دُنیا میں قائم کیا ہے اور اس میں بنی نوع انسان کے بڑے سے بڑے حصہ کی بڑی سے بڑی بھلائی مدِّنظر ہے۔ دراصل جن لوگوں نے تعددِ ازدواج کے خلاف رائے ظاہر کی ہے، انہوں نے اپنی نظر کو بہت ہی محدود رکھا ہے اور خاوند و بیوی کے جذباتی تعلقات کے سوا کسی اور بات کی طرف ان کی نظر نہیں اٹھی۔ اور نہ ان لوگوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے نکاح کی اغراض اور بنی نوع انسان کی ضروریات کے متعلق غور کیا ہے، ورنہ یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ کوئی فہمیدہ شخص اس کی خوبیوں سے انکار کی گنجائش پاتا۔ پھر یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ تعددِ ازدواج کا انتظام اسلام میں قاعدہ کے طور پر نہیں ہے بلکہ یہ ایک استثناء ہے جو نکاح کی جائز اغراض کے حصول اور نسلِ انسانی کی جائز ضروریات کے پورا کرنے کے لیے خاص خاص قسم کے حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے جاری کی گئی ہے۔ پس اس کے متعلق رائے لگاتے ہوئے اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ کیا دُنیا میں انسان کو ایسے حالات پیش نہیں آسکتے کہ جن کے ماتحت تعددِ ازدواج ایک ضروری علاج قرار پاتا ہے اور انسان کی ذات یا اس کے خاندان یا اس کی قوم یا اس کے ملک کے مفاد اس بات کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں کہ وہ دُوسری بیوی سے شادی کرے۔ مجھے شہنشاہ نپولین کی زندگی کا وہ واقعہ نہیں بھولتا کہ جب اُس نے اپنے ملکی مفاد کے ماتحت حصولِ اولاد کی غرض سے دوسری بیوی کی ضرورت محسوس کی، مگر یہ ضرورت کس طرح پوری کی گئی؟ اس کے تصور سے میرے بدن پر ایک لرزہ آجاتا ہے۔ شہنشاہ کی ملکہ جوزفین کی طلاق کا واقعہ تاریخ کے تاریک ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی تہہ میں یہی جھوٹا جذباتی خیال ہے کہ انسان کو کسی صورت میں بھی ایک سے زیادہ بیوی نہیں کرنی چاہیئے۔ افسوس! اس جھوٹے جذباتی خیال نے کئی کمزور لوگوں کے تقویٰ پر ڈاکہ ڈالا۔ کئی خاندانوں کو بےنسل کرکے دنیا سے مٹا دیا۔ کئی گھروں کی خوشیوں کو تباہ کیا۔ کئی گھرانوں اور کئی قوموں اور کئی ملکوں کے اتحاد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کئی یتیموں کو آوارہ کیا۔ کئی بیوگان کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑا۔ کئی قوموں کی نسل کو تنزّل کے رستے پر ڈال کر ان کی تباہی کا بیج بویا۔ اور یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوا کہ عورت ہر صورت میں اپنے خاوند کی توجہ کی اکیلی مالک بنی رہے! مگر یہ ایک عجیب قربانی ہے کہ بڑی چیز کو چھوٹی چیز پر قربان کیا جاتا ہے، حالانکہ حق یہ تھا کہ اخلاقی فوائد پر مادی فوائد قربان کئے جاتے دینی منافع پر دنیاوی منافع قربان کئے جاتے۔ خاندانی مصالح پر ذاتی مصالح قربان کئے جاتے۔ قومی مفاد پر انفرادی مفاد قربان کیے جاتے اور درحقیقت تعددِ ازدواج کا تو انتظام ہی ایک مجسّم قربانی کا انتظام ہے اور اس میں خاوند اور بیوی دونوں کی ذاتی اور جسمانی قربانی کے ذریعہ اخلاقی اور دینی اور خاندانی اور قومی اور ملکی مصالح کے لیے راستہ کھولا گیا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام میں تعددِ ازدواج کا انتظام ایک استثنائی انتظام ہے جو انسانوں کی خاص ضروریات کو مدِّنظر رکھ کر جاری

کیا گیا ہے اور یہ ایک قربانی ہے جو مرد اور عورت دونوں کو اپنے اخلاق اور دین اور خاندان اور قوم اور ملک کے لیے خاص حالات میں کرنی پڑتی ہے اور اسلام ہر شخص سے امید رکھتا ہے کہ وہ اس قسم کے حالات کے پیدا ہونے پر جو تعدد ازدواج کے لیے ضروری ہیں اپنی خواہش اور اپنے جسمانی آرام کو زیادہ بڑے مفاد کے لیے قربان کر دینے میں تامل نہیں کریگا اور موقعہ پیش آنے پر یہ ثابت کر دے گا کہ اس کی زندگی صرف اس کی ذات یا اس کے گھر تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ دُنیا کی وسیع انسانیت کا ایک فرد ہے جس کی خاطر اسے اپنے شخصی مفاد کے قربان کرنے میں دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تعدد ازدواج کی جائز ضرورت کے پیدا ہونے پر بھی اسلام نے تعددِ ازدواج کو لازمی نہیں قرار دیا۔ بلکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اسے اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا ہے کہ اگر انسان عدل کرنے کے قابل ہو تو تب تعدّدِ ازدواج پر عمل کرے؛ ورنہ بہرحال صرف ایک بیوی پر ہی اکتفا کرے اور عدل سے اسجگہ صرف بیویوں کے درمیان عدل کرنا مراد نہیں بلکہ ان کے ہر قسم کے حقوق کا ادا کرنا مراد ہے جو تعددِ ازدواج کی صورت میں انسان پر عائد ہوتے ہیں پس تعدد ازدواج کی دو شرطیں ہوئیں۔ اوّل سے ان جائز اغراض میں سے کسی غرض کا پیدا ہو جانا جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کی ہیں۔ دوم انسان کا عدل کر سکنے کے قابل ہونا اور ان دونوں شرطوں کے پورا ہونے کے بغیر تعددِ ازدواج پر عمل کرنے والا شخص اپنے وقت اپنی توجہ اپنے مال اپنے ظاہری سلوک غرضیکہ دل کی محبت کے سوا جس پر انسان کو اختیار نہیں ہوتا باقی سب چیزوں میں اپنی بیویوں کے ساتھ بلا کم وکاست ایک سا معاملہ کرتے[1]۔ اور غور کیا جاوے تو یہ پابندی خود ایک عظیم الشان قربانی ہے جو خاوند کو کرنی پڑتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اُسے اپنی بیویوں میں سے ان کے ذاتی حالات اور ذاتی قابلیت کے فرق کی وجہ سے کسی سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور کسی سے کم مگر پھر بھی وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی ہر چیز کو ترازو کی طرح تول کر اپنی بیویوں میں برابر برابر تقسیم کرے۔ اور یہ قربانی صرف خاوند ہی کی قربانی نہیں بلکہ اس قربانی میں اس کی بیویاں بھی برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ ان حالات میں ہر عقلمند شخص سمجھ سکتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اسلام نے تعددِ ازدواج کے معاملہ میں تعیش کے خیال تک سے منع فرمایا ہے بلکہ اس نے اس کے لیے عملی طور پر شرطیں بھی ایسی لگا دی ہیں کہ کوئی شخص ان شرطوں پر کاربند ہوتا ہوا عیش وعشرت میں پڑ ہی نہیں سکتا۔

اس موقعہ پر یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں میں بلکہ دنیا کی کسی قوم میں بھی تعددِ ازدواج کی کوئی حد بندی نہیں تھی اور ہر شخص جتنی بیویاں بھی چاہتا تھا رکھ سکتا تھا۔ مگر اسلام نے علاوہ دُوسری شرائط عائد کرنے کے تعداد کے لحاظ سے بھی اسے زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دیا؛ چنانچہ

---

[1] مشکوٰۃ کتاب القسم ؛

تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ جن نومسلموں کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں انہیں یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ باقیوں کو طلاق دیدیں۔ مثلاً غیلان بن سلمہ ثقفی جب مسلمان ہوئے تو اُن کی دس بیویاں تھیں۔ جن میں سے چھ کو حکماً طلاق دلوادی گئی[1]

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں میں کون سی اغراض مدِنظر تھیں کیونکہ ہمارا اصل مضمون یہی ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ عام اغراض تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں میں وہی تھیں جو اسلام نے عام طور پر نکاح اور تعددِ ازدواج کی بیان کی ہیں اور جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اور ان اغراض میں سے خصوصیت کے ساتھ آپ کے مدِنظر بقائے نسل محبت اور رحمت کے تعلقات کی توسیع اور انتظام یتامیٰ و بیوگان کی غرضیں تھیں۔ اور محبت اور رحمت کے تعلقات کی توسیع کی غرض کے ماتحت آپ کے پیش نظر ایسی عورتیں تھیں جو مصالح مذہب، مصالح قوم وملت اور مصالح سیاست وحکومت کے لحاظ سے زیادہ مناسب تھیں، لیکن ان عام اغراض کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص حالات کے ماتحت آپ کی شادیوں کی بعض خاص وجوہات بھی تھیں اور یہ اغراض دو تھیں۔ اوّل آپ کے ذاتی نمونہ سے بعض جاہلانہ رسوم اور غلط عقائد کی عملی تردید۔ دوم بعض مناسب عورتوں کو آپ کی تربیت میں رکھ کر اُن کے ذریعہ اسلامی شریعت کے اس حصہ کا استحکام جو مستورات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور مسلمان عورتوں کی تعلیم و تربیت ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا[2]

یعنی "اے رسول! جب تیرے مُنہ بنائے بیٹے زید بن حارثہ نے اپنی بیوی زینب کو طلاق دیدی تو ہم نے اُس کی شادی کی تجویز خود تیرے ساتھ کر دی تاکہ اس ذریعہ سے یہ جاہلانہ رسم مِٹ جائے کہ مُنہ بُلایا بیٹا اصل بیٹے کی طرح ہو جاتا ہے اور اس کی مطلقہ بیوی یا بیوہ بیٹا بنانے والے شخص کے لیے جائز نہیں ہوتی۔ اور آئندہ کے لیے مومنوں کے دلوں میں اس امر کے متعلق کوئی دبدہ یا خلش باقی نہ رہے۔"

اس آیت میں پہلی غرض بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونہ کے ذریعہ سے بعض اُن جاہلانہ رسوم کا استیصال کیا جاوے جو عربوں کی طبیعت میں اس قدر راسخ ہو چکی تھیں کہ ان کا حقیقی استیصال بغیر اس کے ناممکن تھا کہ آپ اس معاملہ میں خود ایک عملی نمونہ قائم کریں۔ چنانچہ متبنّٰی

---

[1] ترمذی ابواب النکاح ۔

[2] سورۃ احزاب : ۳۸ ؛

بنانے کی رسم عرب میں بہت راسخ اور رائج تھی اور اس معاملہ میں الٰہی حکم نازل ہونے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو متبنّی بنایا ہوا تھا، اس لیے جب یہ حکم نازل ہوا کہ کسی شخص کو محض مُنہ بولا بیٹا بنا لینے سے وہ اصل بیٹا نہیں ہو جاتا اور اس کے بعد یہ واقعہ پیش آگیا کہ زید بن حارثہ نے اپنی بیوی زینب بنت جحش کو طلاق دیدی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدائی حکم کے ماتحت زینب کے ساتھ خود شادی فرمائی اور اس طرح اس جاہلانہ رسم کا استیصال کیا جو آپؐ کے عملی نمونہ کے بغیر پوری طرح مٹنی محال تھی۔ علاوہ ازیں آپؐ نے زینب کے ساتھ شادی کر کے اس بات میں بھی عملی نمونہ قائم فرما دیا کہ کسی طلاق شدہ عورت کے ساتھ شادی کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

پھر فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۝ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۝ ...... يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ ...... وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۝ وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا۝[1]

یعنی "اے نبی! تم اپنی بیویوں سے کہدو کہ اگر تمہیں یہ خواہش ہے کہ دُنیا کی زندگی کا ساز و سامان تمہیں مل جاوے تو آؤ میں تمہیں دُنیا کا مال و متاع دیئے دیتا ہوں، مگر اس صورت میں تم میری بیویاں نہیں رہ سکتیں بلکہ پھر میں احسان و مروّت کے ساتھ تمہیں رُخصت کر دُوں گا۔ لیکن اگر تم خدا اور اس کے رسُول کی خواہش رکھتی ہو اور آخرت کا اجر چاہتی ہو تو سُن لو کہ تم میں سے ان نیکو کاروں کے لیے جو خدا کے منشاء کو پورا کریں خدا نے بہت بڑا اجر تیار کیا ہے۔ ...... اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم تقویٰ اختیار کرو اور نماز کو اس کی اصلی صورت میں قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اور خدا اور اس کے رسُول کی پوری پوری اطاعت کرو (کیونکہ خدا نے تمہیں ایک خاص کام کے لیے چُنا ہے۔) اے نبی کے اہلِ بیت! اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی کمزوریوں اور نقصوں کو دُور کر کے تمہیں خوب اچھی طرح پاک و صاف کر دے تاکہ تم ان آیاتِ الٰہی اور ان حکمت کی باتوں کو لوگوں تک پہنچاؤ جو نبی کے ذریعہ سے تمہارے گھروں میں سُنائی جاتی ہیں اور خدا تعالےٰ تمہارے ذریعہ سے

---

[1] سورۃ احزاب: ۲۹، ۳۰، ۳۳، ۳۴، ۳۵

یہ کام اس لیے لینا چاہتا ہے کہ وہ اگر بوجہ لطیف ہونے کے خود لوگوں کی نظروں سے اوجھل اور مخفی ہے تو بوجہ خبیر ہونے کے وہ لوگوں کی ضروریات سے آگاہ بھی ہے پس ضروری ہے کہ وہ ہدایت خلق کا کام انسانوں کے واسطے سے سرانجام دے۔"

اس آیت کریمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج کی مخصوص غرض میں سے دوسری اور بڑی غرض بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ آپؐ کے ساتھ مناسب مستورات کو بطور بیویوں کے رکھ کر انہیں مسلمان عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تیار کیا جاوے۔ یہ وہ خاص الخاص غرض ہے جس کے ماتحت آپؐ کی شادیاں وقوع میں آئیں اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی غرض ہے جو آپؐ کی ذات کے ساتھ مخصوص تھی اور اسی لیے عام مسلمانوں کے لیے جو حد بندی تعددِ ازدواج کی مقرر کی گئی ہے اس سے آپ مستثنیٰ تھے۔ دراصل چونکہ آپ ایک شرعی نبی تھے اور آپؐ کے ذریعہ سے دُنیا میں ایک نئے شرعی قانون اور نئے تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑنی تھی اس لیے صرف اس قدر کافی نہیں تھا کہ آپؐ کے ذریعہ نئے احکام کی اشاعت ہو جاتی بلکہ اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ آپ خود اپنی نگرانی میں اس نئی شریعت کو تفصیلاً جاری فرماتے اور لوگوں کی زندگیوں کو اس جدید داغ بیل پر عملاً چلا دیتے جو اسلام نے قائم کی تھی۔ یہ کام ایک نہایت مشکل اور نازک کام تھا اور گو مردوں کے معاملہ میں بھی آپ کے رستے میں بہت سی مشکلات تھیں لیکن مستورات کے متعلق تو یہ ایک نہایت ہی مشکل کام تھا۔ کیونکہ اوّل تو بوجہ ان کے عموماً اپنے گھروں میں رہنے اور اپنے خانگی مشاغل کی مصروفیت کے انہیں آپؐ کی صحبت سے مستفیض ہونے کے زیادہ موقعے نہیں تھے۔ دوسرے اس طبعی حیاء کی وجہ سے جو عورتوں میں ہوتی ہے وہ ان مخصوص مسائل کو جو عورتوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں زیادہ آزادی کے ساتھ آپؐ سے دریافت نہیں کر سکتی تھیں اور اس کے مقابلہ میں عورتوں میں تعلیم کی نسبتاً کمی اور جاہلانہ رسُوم کی پابندی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے مقررہ طریق میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے لیے جلد تیار نہیں ہوتیں ان حالات میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق خاص انتظام کی ضرورت تھی اور اس کی بہترین صورت یہی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مناسب عورتوں کے ساتھ شادی کر کے انہیں اپنی تربیت میں اس کام کے قابل بنا دیں اور پھر آپ کی یہ ازواج مسلمان عورتوں کی تعلیم و تربیت کا کام سرانجام دیں، چنانچہ یہ تجویز کارگر ہوئی اور مسلمان عورتوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اور نہایت قلیل عرصہ میں اپنی زندگیوں کو جدید شریعت کے مطابق بنا لیا۔ حتیٰ کہ دنیا کی کسی قوم میں یہ مثال نظر نہیں آتی کہ طبقۂ نسواں نے ایسے قلیل عرصہ میں اور اس درجۂ تکمیل کے ساتھ ایک بالکل نئے قانون اور نئے تہذیب و تمدن کو اختیار کر لیا ہو۔

اس بات کا ایک عملی ثبوت کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیاں نفسانی اغراض کے ماتحت نہیں تھیں بلکہ دینی اغراض کے ماتحت تھیں اس بات سے بھی ملتا ہے کہ آپؐ نے بعض ایسی عورتوں کے ساتھ شادی فرمائی جو اتنی عمر کو پہنچ چکی تھیں کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ مثلاً حضرت اُم سلمہؓ جن سے

آپ نے ۴ سنہ ہجری میں شادی فرمائی۔ ان کی عمر شادی کے وقت پیدائش اولاد وغیرہ کی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس بناء پر عذر بھی کیا، مگر چونکہ آپ کی غرض و غایت دینی تھی اور اس غرض کے لیے وہ بہت مناسب تھیں، اس لیے آپ نے ان کو باصرار رضامند کر کے اُن کے ساتھ شادی فرمائی[1]

الغرض وہ اغراض جن کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیاں وقوع میں آئیں نہایت مبارک اور پاکیزہ تھیں اور ان میں غالب طور پر فرائض نبوت کی ادائیگی مدنظر تھی اور شادیوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا جاوے تو پتہ لگتا ہے کہ آپ جو کام بھی کرتے تھے خواہ وہ بظاہر دنیا کا ہو یا دین کا اس میں بلاواسطہ یا بالواسطہ آپ کی مقدم اور غالب غرض فرائض نبوت کی ادائیگی ہوتی تھی اور دُنیا کی نعمتوں سے آپ کو کبھی بھی شغف نہیں ہوا۔ اور مندرجہ ذیل حدیث یقیناً آپ کی زندگی کا بہترین نقشہ ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ نَامَ عَلٰی حَصِیْرٍ فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِیْ جَسَدِہٖ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَبْسُطَ لَکَ وَ نَعْمَلَ فَقَالَ مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا وَمَا اَنَا وَالدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَ تَرَکَھَا[2]

یعنی "ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک موٹی اور کھردری چٹائی پر لیٹ کر سو گئے جب آپ اُٹھے تو اس چٹائی کا نشان آپ کے جسم پر نظر آتا تھا۔ اس پر میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ پسند فرمائیں تو ہم آپ کے لیے آرام و آسائش کا سامان مہیا کر دیں۔ آپ نے فرمایا۔ ابن مسعود! مجھے دُنیا کی نعمتوں سے کیا کام ہے میری اور دُنیا کی مثال تو یہ ہے کہ ایک سوار راستہ پر چلا جاتا ہو اور وہ تھوڑی دیر کے لیے کسی درخت کے سایہ کے نیچے دم لینے کے لیے ٹھہر جاوے اور پھر اُٹھ کر اپنا راستہ لے لے۔"

اس حدیث سے یہ مراد نہیں ہے کہ دُنیا کی نعمتوں سے متمتع ہونا منع ہے۔ کیونکہ اسلام کسی جائز نعمت سے جائز طور پر متمتع ہونے سے منع نہیں کرتا بلکہ خود قرآن شریف میں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً[3]

یعنی "اے ہمارے رب! ہمیں دنیا کی نعمتوں سے بھی حصہ دے اور آخرت کی نعمتوں سے بھی حصہ دے۔"

پس حدیث مندرجہ بالا سے صرف مراد یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کا اصل مقصد دُنیا کی نعمتوں کا حصول

---

[1] نسائی بحوالہ زرقانی جلد ۳ حالات ام سلمہؓ و ابن سعد جلد ۸ حالات ام سلمہؓ

[2] مسند احمد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الرقاق صفحہ ۴۴۲

[3] بقرۃ: ۲۰۱

نہیں سمجھنا چاہیئے اور نیز اس حدیث سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی طور پر دنیا کی نعمتوں سے قطعاً کوئی شغف نہیں تھا اور جہاں تک نعماءِ دُنیا کا تعلق ہے آپؐ کی زندگی ایک محض مسافرانہ زندگی تھی۔

تعدد ازدواج کے متعلق اس نوٹ میں یہ ذکر بھی بے موقعہ نہ ہوگا کہ تعدد ازدواج کی اجازت دینے میں اسلام اکیلا نہیں ہے بلکہ دُنیا کے اکثر مذاہب میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً موسوی شریعت میں اس کی اجازت ہے[1] اور بنو اسرائیل کے بہت سے انبیاء اس پر عملاً کاربند رہے ہیں۔[2] ہندوؤں کے مذہب میں تعدد ازدواج کی اجازت ہے[3] اور کئی ہندو بزرگ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے رہے ہیں۔ مثلاً کرشن جی تعدد ازدواج پر عملاً کاربند تھے[4] اور ہندو راجے مہاراجے تو اب تک تعدد ازدواج پر کاربند ہیں۔ اسی طرح حضرت مسیح ناصری کا بھی کوئی قول تعدد ازدواج کے خلاف مروی نہیں ہے اور چونکہ شریعت موسوی میں اس کی اجازت تھی اور عملاً بھی حضرت مسیح ناصری کے زمانہ میں تعدد ازدواج کا رواج تھا، اس لیے اُن کی خاموشی سے یہی نتیجہ نکالا جائیگا کہ وہ اسے جائز سمجھتے تھے۔ پس اسلام نے اس میں کوئی جدت نہیں کی؛ البتہ اسلام نے یہ کیا کہ تعددِ ازدواج کی حد بندی کر دی اور اسے ایسے شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا کہ افراد اور اقوام کے استثنائی حالات کے لیے ایک مفید اور بابرکت نظام قائم ہو گیا۔

اس نوٹ کے خاتمہ پر یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ گو مخالفین کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں پر بہت سخت سخت اعتراض کئے گئے ہیں اور ہر شخص نے اپنی فطرت اور اپنے خیالات کے مطابق آپؐ کے تعددِ ازدواج کے مسئلہ کو دیکھا ہے مگر پھر بھی صداقت کبھی مخالفین کے قلم وزبان پر بھی غالب آگئی ہے اور انہیں اگر کلی طور پر نہیں تو کم از کم جزواً حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا ہے؛ چنانچہ مسٹر مارگولیس بھی جن کی آنکھ عموماً ہر سیدھی بات کو اُلٹا دیکھنے کی عادی ہے اس معاملہ میں حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "محمد" میں لکھتے ہیں:۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بہت سی شادیاں جو خدیجہؓ کے بعد وقوع میں آئیں بیشتر یورپین مصنفین کی نظر میں نفسانی خواہشات پر مبنی قرار دی گئی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر اس جذبہ پر مبنی نہیں تھیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بہت سی شادیاں قومی اور سیاسی اغراض کے ماتحت تھیں کیونکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چاہتے تھے کہ اپنے خاص خاص صحابیوں کو شادیوں کے ذریعہ سے اپنی

---

[1] استثناء باب ۲۱ آیت ۱۵ و سلاطین ۱ باب ۱۱ آیت ۳

[2] مثلاً دیکھو حالات حضرت ابراہیم و حضرت یعقوب و حضرت داؤد اور حضرت سلیمان وغیرہم علیہم السلام۔

[3] منو $\frac{9}{122}$، $\frac{9}{149}$، $\frac{9}{183}$

[4] سری کرشن مصنفہ لالہ لاجپت رائے صفحہ ۹۷، ۹۸

ذات کے ساتھ محبت کے تعلقات میں زیادہ پیوست کریں۔ ابوبکر و عمر کی لڑکیوں کی شادیاں یقیناً اسی خیال کے ماتحت کی گئی تھیں۔ اسی طرح سربرآوردہ دشمنوں اور مفتوح رئیسوں کی لڑکیوں کے ساتھ بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شادیاں سیاسی اغراض کے ماتحت وقوع میں آئی تھیں ...... باقی شادیاں اس نیت سے تھیں کہ تا آپ کو اولاد نرینہ حاصل ہو جاوے جس کی آپ کو بہت آرزو رہتی تھی۔"[1]

یہ اس شخص کی رائے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگاروں میں عناد اور تعصب کے لحاظ سے غالباً صفِ اوّل میں ہے اور گو مارگولیس صاحب کی یہ رائے غلطی سے بالکل پاک نہیں ہے مگر اس سے یہ ثبوت ضرور ملتا ہے کہ صداقت کس طرح ایک عنید دل کو بھی مغلوب کر سکتی ہے۔ والفضل ما شهدت به الاعداء۔

دو فرضی واقعات

جنگِ بدر کے حالات کے بعد واقدی اور بعض دوسرے مؤرخین نے دو ایسے واقعات درج کئے ہیں جن کا کتب حدیث اور صحیح تاریخی روایات میں نشان نہیں ملتا۔ اور درایتاً بھی غور کیا جاوے تو وہ درست ثابت نہیں ہوتے مگر چونکہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک ظاہری صورت اعتراض کی پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے بعض عیسائی مؤرخین نے حسب عادت نہایت ناگوار صورت میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ فرضی واقعات یوں بیان کئے گئے ہیں کہ مدینہ میں ایک عورت عصماء نامی رہتی تھی جو اسلام کی سخت دشمن تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہت زہر اُگلتی رہتی تھی اور اپنے اشتعال انگیز اشعار میں لوگوں کو آپ کے خلاف بہت اکساتی تھی اور آپ کے قتل پر اُبھارتی تھی۔ آخر ایک نابینا صحابی عمیر بن عدی نے اشتعال میں آکر رات کے وقت اس کے گھر میں جبکہ وہ سوئی ہوئی تھی اُسے قتل کر دیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس صحابی کو ملامت نہیں فرمائی۔ بلکہ ایک گونہ اس کے فعل کی تعریف کی[2] دوسرا واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک بڈھا یہودی ابوعفک نامی مدینہ میں رہتا تھا۔ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اشتعال انگیز شعر کہتا تھا اور کفار کو آپ کے خلاف جنگ کرنے اور آپ کو قتل کر دینے کے لیے اُبھارتا تھا۔ آخر ایک دن اُسے بھی ایک صحابی سالم بن عُمیر نے غصہ میں آکر رات کے وقت اُس کے صحن میں قتل کر دیا[3] اور واقدی اور ابن ہشام نے بعض وہ اشتعال انگیز اشعار بھی نقل کئے ہیں جو عصماء اور ابوعفک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کہے تھے[4] ان دو واقعات کو سرولیم میور وغیرہ نے نہایت ناگوار صورت میں اپنی کتابوں کی زینت بنایا ہے

---

[1] مارگولیس صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷ ۔

[2] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۸ و ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹۱ ۔

[3] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹ و ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۹۰ ۔

[4] ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۹۰، ۹۱ و مغازی الصادقہ لواقدی صفحہ ۱۲۳، ۱۲۵ ۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ جرح اور تنقید کے سامنے یہ واقعات درست ثابت ہی نہیں ہوتے۔ پہلی دلیل جو ان کی صحت کے متعلق شبہ پیدا کرتی ہے یہ ہے کہ کتب احادیث میں ان واقعات کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ یعنی کسی حدیث میں قاتل یا مقتول کا نام لیکر اس قسم کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا گیا[1] بلکہ حدیث تو الگ رہی بعض مؤرخین نے بھی ان کا ذکر نہیں کیا؛ حالانکہ اگر اس قسم کے واقعات واقعی ہوئے ہوتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ کتب حدیث اور بعض کتب تاریخ ان کے ذکر سے خالی ہوتیں۔ اس جگہ یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ چونکہ ان واقعات سے بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے خلاف ایک گونہ اعتراض وارد ہوتا تھا اس لئے محدثین اور بعض مؤرخین نے ان کا ذکر ترک کر دیا ہوگا، کیونکہ اول تو یہ واقعات ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جن میں وہ وقوع پذیر ہوئے قابل اعتراض نہیں ہیں۔ دوسرے جو شخص حدیث و تاریخ کا معمولی مطالعہ بھی رکھتا ہے اس سے یہ بات مخفی نہیں ہو سکتی کہ مسلمان محدثین اور مؤرخین نے کبھی کسی روایت کے ذکر کو محض اس بناء پر ترک نہیں کیا کہ اس سے اسلام اور بانیٔ اسلام پر بظاہر اعتراض وارد ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مسلّمہ طریق تھا کہ جس بات کو بھی وہ از روئے روایت صحیح پاتے تھے اُسے نقل کرنے میں وہ اس کے مضمون کی وجہ سے قطعاً کوئی تأمل نہیں کرتے تھے بلکہ اُن میں سے بعض محدثین اور اکثر مؤرخین کا تو یہ طریق تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے متعلق جو بات بھی انہیں پہنچتی تھی خواہ وہ روایت و درایت دونوں لحاظ سے کمزور اور ناقابل اعتماد ہو وہ اُسے دیانتداری کے ساتھ اپنے ذخیرہ میں جگہ دے دیتے تھے اور اس بات کا فیصلہ مجتہد علماء پر یا بعد میں آنے والے محققین پر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ اصول روایت و درایت کے مطابق صحیح و سقیم کا خود فیصلہ کر لیں اور ایسا کرنے میں اُن کی نیت یہ ہوتی تھی کہ کوئی بات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی طرف منسوب ہوتی ہے خواہ وہ درست نظر آئے یا غلط وہ جمع ہونے سے نہ رہ جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی ابتدائی کتابوں میں ہر قسم کے رطب و یابس کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ سب قابل قبول ہیں بلکہ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان میں سے کمزور کو مضبوط سے جُدا کر دیں۔ بہرحال اس بات میں ذرہ بھر بھی گنجائش نہیں کہ کسی مسلمان محدث یا مؤرخ نے کبھی کسی روایت کو محض اس بناء پر رد نہیں کیا کہ وہ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ کی شان

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود باب الحکم فی من سب میں بیشک ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جو عصماء کے قتل کے واقعہ سے کچھ ملتا جلتا ہے، لیکن اول تو اس میں قاتل و مقتول کے نام بیان نہیں کئے گئے دوسرے اس کی بعض تفصیلات بھی اس واقعہ کی تفصیل سے نہیں ملتیں۔ علاوہ ازیں اسی باب کی اگلی حدیث میں واقعہ کو ایک بالکل ہی مختلف صورت میں بیان کیا گیا ہے جس سے روایت کا اضطراب ظاہر ہوتا ہے۔

کے خلاف ہے یا یہ کہ اس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ چنانچہ کعب بن اشرف اور ابو رافع یہودی کے قتل کے واقعات جو عصماء اور ابو عفک کے مزعومہ واقعات سے بالکل ملتے جلتے ہیں اور جن کا بیان آگے چل کر اپنے اپنے موقعہ پر آئیگا حدیث و تاریخ کی تمام کتابوں میں پوری پوری صراحت اور تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور کسی مسلمان راوی یا محدث یا مؤرخ نے ان کے بیان کو ترک نہیں کیا۔ اندریں حالات عصماء اور ابو عفک یہودی کے قتل کا ذکر کسی حدیث میں نہ پایا جانا، بلکہ ابتدائی مؤرخین میں سے بعض مؤرخین کا بھی اس کے متعلق خاموش ہونا اس بات کو قریباً قریباً یقینی طور پر ظاہر کرتا ہے کہ یہ قصے بناوٹی ہیں اور کسی طرح بعض روایتوں میں راہ پاکر تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ پھر اگر ان قصوں کی تفصیلات کا مطالعہ کیا جاوے تو ان کا بناوٹی ہونا اور بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ مثلاً عصماء کے قصہ میں ابن سعد وغیرہ کی روایت میں قاتل کا نام عمیر بن عدی بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں ابن دُرید کی روایت میں قاتل کا نام عمیر بن عدی نہیں بلکہ غشیر ہے[1] سہیلی ان دونوں ناموں کو غلط قرار دیکر یہ کہتا ہے کہ دراصل عصماء کو اس کے خاوند نے قتل کیا تھا[2] جس کا نام روایتوں میں یزید بن یزید بیان ہوا ہے[3] اور پھر بعض روایتوں میں یہ آتا ہے کہ مذکورہ بالا لوگوں میں سے کوئی بھی عصماء کا قاتل نہیں تھا بلکہ اس کا قاتل ایک نامعلوم الاسم شخص تھا جو اسی کی قوم میں سے تھا[4] مقتولہ کا نام ابن سعد وغیرہ نے عصماء بنت مروان بیان کیا ہے، لیکن علامہ عبدالبر کا یہ قول ہے کہ وہ عصماء بنت مروان نہیں تھی بلکہ دراصل عمیر نے اپنی بہن بنت عدی کو قتل کیا تھا[5] قتل کا وقت ابن سعد نے رات کا درمیانی حصہ لکھا ہے لیکن زرقانی کی روایت سے دن یا زیادہ سے زیادہ رات کا ابتدائی حصہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مقتولہ اس وقت کھجوریں بیچ رہی تھی[6]

دوسرا واقعہ ابو عفک کے قتل کا ہے اس میں ابن سعد اور واقدی وغیرہ نے قاتل کا نام سالم بن عمیر لکھا ہے لیکن بعض روایتوں میں اس کا نام سالم بن عمرو بیان ہوا ہے[7] اور ابن عقبہ نے سالم بن عبداللہ بیان کیا ہے[8] اسی طرح ابو عفک مقتول کے متعلق ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ یہودی تھا، لیکن واقدی اسے یہودی نہیں لکھتا[9] پھر ابن سعد اور واقدی دونوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ سالم نے خود جوش میں آکر ابو عفک کو قتل کر دیا تھا، لیکن ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت

---

[1] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۵۳ ؛ [2] الروض الانف جلد ۲ صفحہ ۳۶۴

[3] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹۱ ؛ [4] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۵۴

[5] استیعاب جلد ۲ صفحہ ۴۴۰ ؛ [6] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۵۴

[7] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۵۵ [8] اصابہ و استیعاب ذکر سالم بن عمیر ؛ [9] مغازی الصادقہ صفحہ ۱۲۵

سے قتل کیا گیا تھا۔[1] زمانۂ قتل کے متعلق بھی ابن سعد اور واقدی اسے عصماء کے قتل کے بعد رکھتے ہیں لیکن ابن اسحاق اور ابوالربیع اسے عصماء کے قتل سے پہلے بیان کرتے ہیں۔[2] یہ جملہ اختلافات اس بات کے متعلق قوی شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ قصے جعلی اور بناوٹی ہیں یا اگر ان میں کوئی حقیقت ہے تو وہ ایسی مستور ہے کہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہے اور کس نوعیت کی ہے۔

ایک اور دلیل ان واقعات کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ ان دونوں قصوں کا زمانہ وہ بیان کیا گیا ہے جس کے متعلق جملہ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک ابھی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی جھگڑا یا تنازعہ رونما نہیں ہوا تھا؛ چنانچہ تاریخ میں غزوہ بنی قینقاع کے متعلق یہ بات مسلّم طور پر بیان ہوئی ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان یہ پہلی لڑائی تھی جو وقوع میں آئی اور یہ کہ بنو قینقاع وہ پہلے یہودی تھے جنھوں نے اسلام کی عداوت میں عملی کارروائی کی۔[3] پس یہ کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے کہ اس غزوہ سے پہلے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان اس قسم کا کشت و خون ہو چکا تھا اور پھر اگر غزوہ بنو قینقاع سے قبل ایسے واقعات ہو چکے تھے تو یہ ناممکن تھا کہ اس غزوہ کے بواعث وغیرہ کے بیان میں ان واقعات کا ذکر نہ آتا۔ کم از کم اتنا تو ضروری تھا کہ یہودی لوگ جو ان واقعات کی بناء پر مسلمانوں کے خلاف ایک ظاہری رنگ اعتراض کا پیدا کر سکتے تھے کہ انھوں نے ان کے ساتھ عملی چھیڑ چھاڑ کرنے میں پہل کی ہے ان واقعات کے متعلق واویلا کرتے۔ اگر کسی تاریخ میں حتیٰ کہ خود ان مؤرخین کی کتب میں بھی جنھوں نے یہ قصے روایت کئے ہیں قطعاً یہ ذکر نہیں آتا کہ مدینہ کے یہود نے کبھی کوئی ایسا اعتراض کیا ہو اور اگر کسی شخص کو یہ خیال پیدا ہو کہ شاید انھوں نے اعتراض اٹھایا ہو مگر مسلمان مؤرخین نے اس کا ذکر نہ کیا ہو تو یہ ایک غلط اور بے بنیاد خیال ہو گا۔ کیونکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کبھی کسی مسلمان محدث یا مؤرخ نے مخالفین کے کسی اعتراض پر پردہ نہیں ڈالا؛ چنانچہ مثلاً جب سریہ نخلہ والے قصہ میں مشرکین مکہ نے مسلمانوں کے خلاف اشہرِ حرم کی بے حرمتی کا الزام لگایا تو مسلمان مؤرخین نے کمال دیانت داری سے ان کے اس اعتراض کو اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔ پس اگر اس موقعہ پر بھی یہود کی طرف سے کوئی اعتراض ہوا ہوتا، تو تاریخ اس کے ذکر سے خالی نہ ہوتی۔ الغرض جس جہت سے بھی دیکھا جاوے یہ قصے صحیح ثابت نہیں ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کسی مخفی دشمنِ اسلام نے کسی مسلمان کی طرف منسوب کر کے یہ قصے بیان کر دیئے تھے اور پھر وہ مسلمانوں کی روایتوں میں دخل پا گئے۔ اور یا کسی کمزور مسلمان نے اپنے قبیلہ کی طرف یہ جھوٹا فخر منسوب کرنے کے لیے کہ اس سے تعلق رکھنے والے آدمیوں نے بعض موذی کافروں کو قتل کیا تھا۔ یہ باتیں

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹۰۔ [2] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹۰ و زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۵۳
[3] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹ نیز ابن ہشام و طبری۔

تاریخ میں داخل کردیں۔ واللہ اعلم۔

یہ تو وہ اصل حقیقت ہے جو ان واقعات کی معلوم ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اگر یہ واقعات دُرست بھی ہوں تو پھر بھی ان حالات کو دیکھتے ہوئے جن کے ماتحت وہ وقوع پذیر ہوئے وہ قابلِ اعتراض نہیں سمجھے جا سکتے۔ ان ایام میں جو نازک حالت مسلمانوں کی تھی اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان کا حال بعینہٖ اس شخص کی طرح ہو رہا تھا جو ایک ایسی جگہ میں گھر جاوے جس کے چاروں طرف دُور دُور تک خطرناک آگ شعلہ زن ہو اور اس کے لیے کوئی راستہ باہر نکلنے کا نہ ہو اور پھر اس کے پاس بھی وہ لوگ کھڑے ہوں جو اس کے جانی دشمن ہیں۔ مسلمانوں کی ایسی نازک حالت میں اگر کوئی شریر اور فتنہ پرداز شخص ان کے آقا اور سردار کے خلاف اشتعال انگیز شعر کہہ کہہ کر لوگوں کو اس کے خلاف اکساتا اور اس کے قتل پر دشمنوں کو اُبھارتا تھا، تو اس زمانہ کے حالات کے ماتحت اس کا علاج سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایسے شخص کو قتل کر دیا جاتا اور پھر یہ قتل بھی مسلمانوں کی طرف سے انتہائی اشتعال کی حالت میں ہوا۔ جس حالت میں کہ معمولی قتل بھی قصاص کے قابل نہیں سمجھا جاتا؛ چنانچہ مسٹر مارگولیس جیسا شخص بھی جو عموماً ہر امر میں مخالفانہ پہلو لیتا ہے ان واقعات کی وجہ سے مسلمانوں کو قابلِ ملامت نہیں قرار دیتا؛ چنانچہ مسٹر مارگولیس لکھتے ہیں:۔

"چونکہ عصماء نے اپنے اشعار میں اگر وہ اس کی طرف صحیح طور پر منسوب کئے گئے ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل پر اُن کے دشمنوں کو عمداً ابھارا تھا۔ اس لیے اس کا قتل خواہ اُسے دُنیا کے کسی معیار کے مطابق ہی جانچا جاوے ایک بے بنیاد اور ظالمانہ فعل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اشتعال انگیزی کا وہ طریق جو ہجو کے اشعار کی صورت میں اختیار کیا گیا وہ عرب جیسے ملک میں دُوسرے ممالک کی نسبت بہت زیادہ خطرناک نتائج پیدا کر سکتا تھا .... اور یہ بات کہ صرف مجرموں کو ہی قتل کیا گیا عرب کے رائج الوقت دستور پر ایک بہت بڑی اصلاح تھی۔ کیونکہ عربوں میں اشتعال انگیز اشعار کی وجہ سے صرف افراد تک معاملہ محدود نہیں رہتا تھا۔ بلکہ سالم کے سالم قبائل میں خطرناک جنگ کی آگ مشتعل ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی جگہ اسلام میں یہ صحیح اصول قائم کیا گیا کہ جرم کی سزا صرف مجرم کو ہونی چاہیئے نہ کہ اس کے عزیز و اقارب کو بھی۔"[1]

مسٹر مارگولیس کو اگر ان قتلوں کے متعلق کوئی اعتراض ہے، تو اس طریق کی وجہ سے ہے جو اختیار کیا گیا یعنی یہ کہ کیوں نہ ان کے جرم کا باقاعدہ اعلان کر کے انہیں باضابطہ طور پر قتل کی سزا دی گئی۔ سو اس کا پہلا جواب

---

[1] محمد (ﷺ) مصنفہ مارگولیس صفحہ ۲۷۸، ۲۷۹۔

تو یہ ہے کہ اگر ان واقعات کو دُرست بھی سمجھا جاوے تو وہ بعض مسلمانوں کے محض انفرادی فعل تھے جو ان سے سخت اشتعال کی حالت میں سرزد ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حکم نہیں دیا تھا جیسا کہ ابن سعد کے بیان سے یقینی طور پر پایا جاتا ہے۔[1] دُوسرے اگر بالفرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہی سمجھا جاوے تو پھر بھی یقیناً اس زمانہ کے حالات ایسے تھے کہ اگر عصماء اور ابوعفک کے قتل کے متعلق باقاعدہ طور پر ضابطہ کا طریق اختیار کیا جاتا اور مقتولین کے متعلقین کو پیش از وقت اطلاع ہو جاتی کہ ہمارے آدمی قتل کئے جائیں گے، تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے تھے اور اس بات کا سخت اندیشہ تھا کہ یہ واقعات مسلمانوں اور یہودیوں اور نیز مسلمانوں اور مشرکین مدینہ کے درمیان ایک وسیع جنگ کی آگ مشتعل کر دیتے۔ تعجب ہے کہ مسٹر مارگولیس نے جہاں محض قتل کے فعل کو عرب کے مخصوص حالات کے ماتحت جائز قرار دیا ہے، وہاں طریقہ قتل کے متعلق ان کی نظر اس زمانہ کے مخصوص حالات تک کیوں نہیں پہنچی۔ اگر وہ اس پہلو میں بھی اس وقت کے حالات کو مدّ نظر رکھتے تو غالباً انہیں یقین ہو جاتا کہ جو طریق اختیار کیا گیا وہی اس وقت کے حالات اور امن عامہ کے مفاد کے لیے مناسب اور ضروری تھا، لیکن اس کے متعلق زیادہ تفصیلی بحث ہم انشاء اللہ کعب بن اشرف کے قتل کے بیان میں ہدیہ ناظرین کریں گے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اوّل تو عصماء اور ابوعفک یہودی کے قتل کے واقعات روایتاً اور درایتاً دُرست ثابت ہی نہیں ہوتے اور اگر بالفرض انہیں دُرست سمجھا بھی جاوے تو وہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت قابل اعتراض نہیں سمجھے جا سکتے اور پھر یہ کہ جو بھی صورت ہو یہ واقعات قتل بہرحال بعض مسلمانوں کے انفرادی افعال تھے جو سخت اشتعال کی حالت میں اُن سے سرزد ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق حکم نہیں دیا تھا۔

---

[1] ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۸، ۱۹۔

قبائلِ نجد اور یہود کے ساتھ جنگ کا آغاز
حضرت فاطمہؓ اور حفصہؓ کی شادی
بعض متفرق واقعات

غزوہ قرقرۃ الکدر شوال ۲ ہجری

یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہجرت کے بعد قریشِ مکہ نے مختلف قبائل عرب کا دورہ کرکے بہت سے قبائل کو مسلمانوں کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ ان قبائل میں طاقت اور جتھے کے لحاظ سے زیادہ اہم عرب کے وسطی علاقہ نجد کے رہنے والے دو قبیلے تھے۔ جن کا نام بنو سلیم اور بنو غطفان تھا اور قریش مکہ نے ان دو قبائل کو خصوصیت کے ساتھ اپنے ساتھ گانٹھ کر مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر دیا تھا؛ چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:-

"قریشِ مکہ نے اب اپنی توجہ اس نجدی علاقہ کی طرف پھیری اور اس علاقہ کے قبائل کے ساتھ آگے سے بھی زیادہ گہرے تعلقات قائم کر لیے اور اس وقت کے بعد قبائل سلیم و غطفان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سخت دشمن ہو گئے اور ان کی اس دشمنی نے مسلمانوں کے خلاف عملی صورت اختیار کر لی؛ چنانچہ قریش کی اشتعال انگیزی اور ابوسفیان کے عملی نمونہ کے نتیجہ میں انہوں نے مدینہ پر حملہ آور ہونے کی تجویز پختہ کر لی۔"[1]

چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے واپس تشریف لائے تو ابھی آپ کو مدینہ میں پہنچے ہوئے صرف چند دن ہی ہوئے تھے[2] کہ آپ کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قبائل سلیم و غطفان کا ایک بڑا لشکر مدینہ پر حملہ آور ہونے کی نیت سے قرقرۃ الکدر میں جمع ہو رہا ہے۔[3] جنگِ بدر کے اس قدر قریب اس اطلاع کا آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب قریش کا لشکر مسلمانوں کے خلاف حملہ آور ہونے کی نیت سے

---

[1] لائف آف محمد صفحہ ۲۲۶، ۲۲۷ [2] ابن ہشام حالات غزوہ بنی سلیم بالکدر [3] ابن سعد۔

مکہ سے نکلا تھا تو رؤسا قریش نے اُسی وقت قبائل سلیم وغطفان کو یہ پیغام بھیج دیا ہو گا کہ تم دوسری طرف سے مدینہ پر حملہ آور ہو جاؤ۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ جب ابوسفیان اپنے قافلہ کے ساتھ بچ کر نکل گیا، تو اس نے کسی قاصد وغیرہ کے ذریعہ ان قبائل کو مسلمانوں کے خلاف نکلنے کی تحریک کی ہو۔ بہرحال ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگِ بدر سے فارغ ہو کر مدینہ میں پہنچے ہی تھے کہ یہ دہشتناک اطلاع موصول ہوئی کہ قبائل سلیم و غطفان مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ خبر سُنکر آپ فوراً صحابہ کی ایک جمعیت کو ساتھ لیکر پیش بندی کے طور نجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن جب آپ کئی دن کا تکلیف دہ سفر طے کرکے موضع الکدر کے قرقرہ یعنی چٹیل میدان میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بنوسلیم اور بنوغطفان کے لوگ لشکرِ اسلام کی آمد آمد کی خبر پاکر پاس کی پہاڑیوں میں جا چھپے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تلاش میں مسلمانوں کا ایک دستہ روانہ فرمایا اور خود بطنِ وادی کی طرف بڑھے، مگر ان کا کچھ سُراغ نہیں ملا[1]۔ البتہ اُن کے اُونٹوں کا ایک بڑا گلہ ایک وادی میں چرتا ہوا مل گیا، جس پر قوانینِ جنگ کے ماتحت صحابہ نے قبضہ کر لیا اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کو واپس لوٹ آئے۔ ان اُونٹوں کا چرواہا ایک یسار نامی غلام تھا، جو اونٹوں کے ساتھ قید کر لیا گیا تھا۔ اس شخص پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا ایسا اثر ہوا کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا اور گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ عادت اسے بطور احسان کے آزاد کر دیا[2] مگر وہ مرتے دم تک آپ کی خدمت سے جُدا نہیں ہوا[3]۔

غزوہ سویق ذوالحجہ ۲ ہجری

بدر کے نتیجہ میں جو ماتم مکہ میں بپا ہوا تھا اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ قریباً سارے رؤسا قریش قتل ہو چکے تھے اور اب مکہ کی ریاست ابوسفیان بن حرب کے حصہ میں آئی تھی؛ چنانچہ بدر کے بعد ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک مقتولین بدر کا انتقام نہ لے گا کبھی اپنی بیوی کے پاس نہ جائے گا[4] اور نہ کبھی اپنے بالوں کو تیل لگائے گا[5]۔ چنانچہ بدر کے دو تین ماہ بعد ذوالحجہ کے مہینہ میں ابوسفیان دو۲ سو مسلح قریش کی جمعیت کو اپنے ساتھ لیکر مکہ سے نکلا اور نجدی راستہ کی طرف سے ہوتا ہوا مدینہ کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے اپنے لشکر کو تو مدینہ سے کچھ فاصلہ پر چھوڑا اور خود رات کی تاریکی کے پردہ میں چھپتا ہوا یہودی قبیلہ بنونضیر کے رئیس حیّی بن اخطب کے مکان پر پہنچا اور اس سے امداد چاہی، مگر چونکہ اس کے دل میں اپنے عہد وپیمان کی کچھ یاد باقی تھی اس نے انکار کیا۔ پھر ابوسفیان اسی طرح چھپتا ہوا بنونضیر کے دوسرے رئیس سلام بن مشکم کے مکان پر گیا اور اس سے مسلمانوں کے خلاف اعانت کا طلبگار ہوا۔ اس بدبخت نے کمال جرأت کے ساتھ سارے عہد وپیمان کو بالائے طاق رکھ کر ابوسفیان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور

---

[1] زرقانی [2] ابن سعد [3] اسد الغابہ جلد ۵ صفحہ ۱۲۴ [4] ابن ہشام [5] ابن سعد

اُسے اپنے پاس رات کو مہمان رکھا اور اس سے مسلمانوں کے حالات کے متعلق مخبری کی[1] صبح ہونے سے قبل ابوسفیان وہاں سے نکلا اور اپنے لشکر میں پہنچ کر اس نے قریش کے ایک دستے کو مدینہ کے قریب عریض کی وادی میں چھاپہ مارنے کے لیے روانہ کر دیا[2] یہ وہ وادی تھی جہاں ان ایام میں مسلمانوں کے جانور چرا کرتے تھے اور جو مدینہ سے صرف تین میل پر تھی اور غالباً اس کا حال ابوسفیان کو سلام بن مشکم سے معلوم ہوا ہوگا۔ جب قریش کا یہ دستہ وادیٔ عریض میں پہنچا تو خوش قسمتی سے اس وقت مسلمانوں کے جانور وہاں موجود نہ تھے؛ البتہ ایک مسلمان انصاری اور اس کا ایک ساتھی اُس وقت وہاں موجود تھے۔ قریش نے ان دونوں کو پکڑ کر ظالمانہ طور پر قتل کر دیا[3]۔ اور پھر کھجوروں کے درختوں کو آگ لگا کر[4] اور وہاں کے مکانوں اور جھونپڑیوں کو جلا کر ابوسفیان کی قیام گاہ کی طرف واپس لوٹ گئے۔ ابوسفیان نے اس کامیابی کو اپنی قسم کے پورا ہونے کے لیے کافی سمجھ کر لشکر کو واپسی کا حکم دیا۔ دُوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوسفیان کے حملہ کی اطلاع ہوئی تو آپؐ صحابہ کی ایک جماعت ساتھ لے کر اُس کے تعاقب میں نکلے؛ مگر چونکہ ابوسفیان اپنی قسم کے ایفاء کو مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایسی سراسیمگی کے ساتھ بھاگا کہ مسلمان اس کے لشکر کو پہنچ نہیں سکے اور بالآخر چند دن کی غیر حاضری کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس لوٹ آئے۔ اس غزوہ کو غزوہ سویق کہتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ جب ابوسفیان مکہ کو واپس لوٹا تو تعاقب کے خیال کی وجہ سے کچھ تو گھبراہٹ میں اور کچھ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے وہ اپنا سامانِ رسد جو زیادہ تر سویق یعنی ستو کے تھیلوں پر مشتمل تھا راستہ میں پھینکتا گیا تھا۔

عیدالاضحٰے ذوالحجہ ۲ ہجری عیدالفطر کے ذکر میں اسلامی عیدوں کا فلسفہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی سال ماہ ذی الحجہ میں دُوسری اسلامی عید یعنی عیدالاضحٰی مشروع ہوئی جو ماہ ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام اسلامی دُنیا میں منائی جاتی ہے[5] اس عید میں علاوہ نماز کے جو ہر سچے مسلمان کی حقیقی عید ہے۔ ہر ذی استطاعت مسلمان کے لیے واجب ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے کوئی چوپایہ جانور قربان کر کے اُس کا گوشت اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں اور ہمسایوں اور دُوسرے لوگوں میں تقسیم کرے اور خود بھی کھائے؛ چنانچہ عیدالاضحٰی کے دن اور اس کے بعد دو دن تک تمام اسلامی دُنیا میں لاکھوں کروڑوں جانور فی سبیل اللہ قربان کئے جاتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کے اندر عملی طور پر اس عظیم الشان قربانی کی یاد زندہ رکھی جاتی ہے جو حضرت ابراہیمؑ

---

[1] ابنِ ہشام و ابن سعد [2] ابنِ ہشام [3] ابنِ ہشام و ابن سعد [4] ابن ہشام
[5] ابن سعد [6] طبری صفحہ ۱۳۶۲

اور حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ نے پیش کی اور جس کی ایک بہترین مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تھی اور ہر ایک مسلمان کو ہوشیار کیا جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے آقا و مالک کی راہ میں اپنی جان اور مال اور اپنی ہر ایک چیز قربان کر دینے کے واسطے تیار رہے۔ یہ عید بھی عید الفطر کی طرح ایک عظیم الشان اسلامی عبادت کی تکمیل پر منائی جاتی ہے اور وہ عبادت حج ہے۔ جس کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ اپنے موقعہ پر آئے گا۔

حضرت فاطمہؓ کا نکاح ذوالحجہ سنہ ۲ ہجری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے بیان میں حضرت فاطمہؓ کا ذکر گزر چکا ہے جمہور مؤرخین کے قول کے مطابق حضرت فاطمہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اولاد میں سب سے چھوٹی تھیں جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی[1] اور آپ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ حضرت فاطمہؓ کو عزیز رکھتے تھے[2]۔ اور اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے وہی اس امتیازی محبت کی سب سے زیادہ اہل تھیں۔ اب ان کی عمر کم و بیش پندرہ سال کی تھی اور شادی کے پیغامات آنے شروع ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے درخواست کی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر کر دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ مگر ان کی درخواست بھی منظور نہ ہوئی[3]۔ اس کے بعد ان دونوں بزرگوں نے یہ سمجھ کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ حضرت علیؓ کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ سے تحریک کی کہ تم فاطمہؓ کے متعلق درخواست کر دو۔ حضرت علیؓ نے جو غالباً پہلے سے خواہشمند تھے مگر بوجہ حیا خاموش تھے فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کر دی[4]۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائی وحی کے ذریعہ یہ اشارہ ہو چکا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی شادی حضرت علیؓ سے ہونی چاہیئے؛ چنانچہ حضرت علیؓ نے درخواست پیش کی تو آپ نے فرمایا کہ مجھے تو اس کے متعلق پہلے سے خدائی اشارہ ہو چکا ہے[5]۔ پھر آپ نے حضرت فاطمہؓ سے پوچھا وہ بوجہ حیا کے خاموش رہیں[6]۔ یہ ایک طرح سے اظہار رضا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت کو جمع کر کے حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کا نکاح پڑھ دیا[7]۔ یہ سنہ ۲ ہجری کی ابتداء یا وسط کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد جب جنگِ بدر ہو چکی[8] تو غالباً ماہ ذوالحجہ سنہ ۲ ہجری میں رخصتانہ کی تجویز ہوئی[9]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلا کر دریافت فرمایا کہ تمہارے پاس مہر کی ادائیگی کے لیے کچھ ہے یا نہیں؟ حضرت علیؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میرے

---

[1] اصابہ [2] ترمذی باب فضل فاطمہ [3] نسائی کتاب النکاح باب تزویج المرأۃ مثلہا
[4] ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۱۱، ۱۲ [5] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۴، ۵ [6] ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۱۲۔
[7] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۴، ۵، ۶ [8] اصابہ [9] طبری صفحہ ۱۲۷۶

پاس تو کچھ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا وہ زرہ کیا ہوئی[1] جو مَیں نے اس دن (یعنی بدر کے مغانم میں سے) تمہیں دی تھی؟ حضرت علیؓ نے عرض کیا وہ تو ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ بس وہی لے آؤ[2]۔ چنانچہ یہ زرہ چار سو اسّی درہم میں فروخت کر دی گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی رقم میں سے شادی کے اخراجات مہیا کئے[3]۔ جو جہیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو دیا وہ ایک بیل دار چادر۔ ایک چمڑے کا گدیلا جس کے اندر کھجور کے خشک پتّے بھرے ہوئے تھے اور ایک مشکیزہ تھا[4]۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کے جہیز میں ایک چکی بھی دی تھی[5]۔ جب یہ سامان ہو چکا تو مکان کی فکر ہوئی۔ حضرت علیؓ اب تک غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد کے کسی حجرہ وغیرہ میں رہتے تھے مگر شادی کے بعد یہ ضروری تھا کہ کوئی الگ مکان ہو جس میں خاوند بیوی رہ سکیں؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ اب تم کوئی مکان تلاش کرو جس میں تم دونوں رہ سکو۔ حضرت علیؓ نے عارضی طور پر ایک مکان کا انتظام کیا اور اس میں حضرت فاطمہؓ کا رخصتانہ ہو گیا[6]۔ اسی دن رخصتانہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور تھوڑا سا پانی منگا کر اس پر دعا کی اور پھر وہ پانی حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ ہر دو پر یہ الفاظ فرماتے ہوئے چھڑکا: اَللّٰھُمَّ بَارِکْ فِیْھِمَا وَبَارِکْ عَلَیْھِمَا وَبَارِکْ لَھُمَا نَسْلَھُمَا[7]۔ یعنی "اے میرے اللہ! تو ان دونوں کے باہمی تعلقات میں برکت دے اور ان کے ان تعلقات میں برکت دے جو دوسرے لوگوں کے ساتھ قائم ہوں اور ان کی نسل میں برکت دے۔" اور پھر آپؐ اس نئے جوڑے کو اکیلا چھوڑ کر واپس تشریف لے آئے۔ اس کے بعد جو ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے تو حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حارثہ بن نعمان انصاری کے پاس چند ایک مکانات ہیں آپؐ ان سے فرما دیں کہ وہ اپنا کوئی مکان خالی کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ وہ ہماری خاطر اتنے مکانات پہلے ہی خالی کر چکے ہیں، اب مجھے تو انہیں کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ حارثہ کو کسی طرح اس کا علم ہوا تو وہ بھاگے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا جو کچھ ہے وہ حضور کا ہے اور واللہ جو چیز آپؐ مجھ سے قبول فرما لیتے ہیں وہ مجھے زیادہ خوشی پہنچاتی ہے بہ نسبت اس چیز کے جو میرے پاس رہتی ہے اور پھر اس مخلص صحابی نے باصرار اپنا ایک مکان خالی کروا کے پیش کر دیا اور حضرت علیؓ اور فاطمہؓ وہاں اٹھ گئے[8]۔

اس جگہ یہ ذکر بھی بے موقعہ نہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اولاد میں صرف حضرت فاطمہؓ

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب الرجل یدخل [2] اصابہ [3] زرقانی [4] نسائی بحوالہ تلخیص الصحاح کتاب النکاح [5] اصابہ [6] ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۱۴ [7] اصابہ [8] ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۱۴۔

، ہی آپؐ کی وفات کے بعد زندہ رہیں باقی سب بچے آپؐ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اولاد میں صرف انہی کی نسل کا سلسلہ قائم رہا[1] چنانچہ مسلمانوں میں سادات کی قوم انہی کی نسل سے ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد وفات پائی[2]

غزوہ بنوقینقاع اواخر ۲ ہجری

یہ بتایا جا چکا ہے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے تھے اس وقت مدینہ میں یہود کے تین قبائل آباد تھے۔ ان کے نام بنوقینقاع بنونضیر اور بنوقریظہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آتے ہی ان قبائل کے ساتھ امن و امان کے معاہدے کر لیے اور آپس میں صلح اور امن کے ساتھ رہنے کی بنیاد ڈالی۔ معاہدہ کی رُو سے فریقین اس بات کے ذمہ دار تھے کہ مدینہ میں امن و امان قائم رکھیں اور اگر کوئی بیرونی دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں[3] شروع شروع میں تو یہود اس معاہدہ کے پابند رہے اور کم از کم ظاہری طور پر انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی جھگڑا پیدا نہیں کیا۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان مدینہ میں زیادہ اقتدار حاصل کرتے جاتے ہیں تو اُن کے تیور بدلنے شروع ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کا تہیہ کر لیا اور اس غرض کے لیے اُنھوں نے ہر قسم کی جائز و ناجائز تدابیر اختیار کرنا شروع کیں۔ حتّٰی کہ انھوں نے اس بات کی کوشش سے بھی دریغ نہیں کیا کہ مسلمانوں کے اندر پھُوٹ پیدا کر کے خانہ جنگی شروع کرا دیں؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک موقعہ پر قبیلہ اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ اکٹھے بیٹھے ہوئے باہم محبت و اتفاق سے باتیں کر رہے تھے کہ بعض فتنہ پرداز یہود نے اس مجلس میں پہنچ کر جنگِ بُعاث کا تذکرہ شروع کر دیا۔ یہ وہ خطرناک جنگ تھی جو ان دو قبائل کے درمیان ہجرت سے چند سال قبل ہوئی تھی اور جس میں اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ اس جنگ کا ذکر آتے ہی بعض جوشیلے لوگوں کے دلوں میں پُرانی یاد تازہ ہو گئی اور گذشتہ عداوت کے منظر آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باہم نوک جھونک اور طعن و تشنیع سے گذر کر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اسی مجلس میں مسلمانوں کے اندر تلوار کھچ گئی۔ مگر خیر گذری کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بر وقت اس کی اطلاع مل گئی اور آپؐ مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ فوراً موقعہ پر تشریف لے آئے اور فریقین کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا اور پھر ملامت بھی فرمائی کہ تم میرے ہوتے ہوئے جاہلیت کا طریق اختیار کرتے ہو اور خدا کی اس نعمت کی قدر نہیں کرتے کہ اس نے اسلام کے ذریعہ تمہیں بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ انصار پر آپؐ کی اس نصیحت کا ایسا اثر ہوا کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ اپنی

---

[1] اصابہ [2] بخاری [3] ابن ہشام حالات معاہدہ یہود و طبری صفحہ ۱۳۹۵

اس حرکت سے تائب ہو کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے[1]

جب جنگ بدر ہو چکی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو باوجود ان کی قلت اور بے سروسامانی کے قریش کے ایک بڑے جرار لشکر پر نمایاں فتح دی اور مکہ کے بڑے بڑے عمائد خاک میں مل گئے تو مدینہ کے یہودیوں کی آتش حسد بھڑک اٹھی اور انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کھلم کھلا نوک جھونک شروع کر دی اور مجلسوں میں برملا طور پر کہنا شروع کیا کہ قریش کے لشکر کو شکست دینا کونسی بڑی بات تھی ہمارے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقابلہ ہو تو ہم بتادیں کہ کس طرح لڑا کرتے ہیں[2] حتیٰ کہ ایک مجلس میں انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر اسی قسم کے الفاظ کہے؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جنگ بدر کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو آپ نے ایک دن یہودیوں کو جمع کر کے ان کو نصیحت فرمائی اور اپنا دعویٰ پیش کر کے اسلام کی طرف دعوت دی۔ آپ کی اس پُرامن اور ہمدردانہ تقریر کا رؤسائے یہود نے ان الفاظ میں جواب دیا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم شاید چند قریش کو قتل کر کے مغرور ہو گئے ہو وہ لوگ لڑائی کے فن سے ناواقف تھے۔ اگر ہمارے ساتھ تمہارا مقابلہ ہو تو تمہیں پتہ لگ جاوے کہ لڑنے والے ایسے ہوتے ہیں"[3] یہود نے صرف عام دھمکی پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے بھی منصوبے شروع کر دیئے تھے، کیونکہ روایت آتی ہے کہ جب ان دنوں میں طلحہ بن براء جو ایک مخلص صحابی تھے فوت ہونے لگے تو انہوں نے وصیت کی کہ اگر میں رات کو مروں تو نماز جنازہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہ دی جاوے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ پر یہود کی طرف سے کوئی حادثہ گذر جاوے[4] الغرض جنگ بدر کے بعد یہود نے کھلم کھلا شرارت شروع کر دی اور چونکہ مدینہ کے یہود میں بنو قینقاع سب میں زیادہ طاقتور اور بہادر تھے اس لیے سب سے پہلے انہی کی طرف سے عہد شکنی شروع ہوئی؛ چنانچہ مورخین لکھتے ہیں کہ اِنَّ بَنِیْ قَیْنُقَاعَ کَانُوْا اَوَّلَ یَہُوْدٍ نَقَضُوْا مَا بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ[5] فَلَمَّا کَانَتْ وَقْعَۃُ بَدْرٍ اَظْھَرُوْا الْبَغْیَ وَالْحَسَدَ وَنَبَذُوْا الْعَھْدَ[6] یعنی مدینہ کے یہودیوں میں سے سب سے پہلے بنو قینقاع نے اس معاہدہ کو توڑا جو ان کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہوا تھا اور بدر کے بعد انھوں نے بہت سرکشی شروع کر دی اور برملا طور پر بغض و حسد کا اظہار کیا اور عہد و پیمان کو توڑ دیا۔

مگر باوجود اس قسم کی باتوں کے مسلمانوں نے اپنے آقا کی ہدایت کے ماتحت ہر طرح صبر سے کام لیا اور اپنی طرف سے کوئی پیش دستی نہیں ہونے دی، بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ اس معاہدہ کے بعد جو یہود کے ساتھ ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر یہود کی دلداری کا خیال رکھتے تھے؛ چنانچہ ایک

---

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۲ صفحہ ۱۲ [2] طبری صفحہ ۱۳۵۹ سطر ۱۴، ۱۵ [3] ابوداؤد کتاب الخراج باب کیف کان اخراج الیہود و طبری صفحہ ۱۳۶۰ و ابن ہشام [4] اصابہ جلد ۳ صفحہ ۵۸۰ [5] ابن ہشام و طبری [6] ابن سعد

دفعہ ایک مُسلمان اور ایک یہودی میں کچھ اختلاف ہوگیا۔ یہودی نے حضرت موسیٰؑ کی تمام انبیاء پر فضیلت بیان کی۔ صحابی کو اس پر غصہ آیا اور اُس نے اُس یہودی کے ساتھ کچھ سختی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الرسل بیان کیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپؐ ناراض ہوئے اور اس صحابی کو ملامت فرمائی اور کہا کہ "تمہارا یہ کام نہیں کہ تم خدا کے رسُولوں کی ایک دُوسرے پر فضیلت بیان کرتے پھرو" اور پھر آپؐ نے موسیٰؑ کی ایک جزوی فضیلت بیان کر کے اس یہودی کی دلداری فرمائی[1] مگر باوجود اس دلدارانہ سلوک کے یہودی اپنی شرارت میں ترقی کرتے گئے اور بالآخر خود یہود کی طرف سے ہی جنگ کا باعث پیدا ہوا اور ان کی قلبی عداوت ان کے سینوں میں سما نہ سکی اور یہ اس طرح پر ہوا کہ ایک مُسلمان خاتون بازار میں ایک یہودی کی دُکان پر کچھ سودا خریدنے کے لیے گئی۔ بعض شریر یہودیوں نے جو اُس وقت اُس دکان پر بیٹھے ہوتے تھے اسے نہایت اوباشانہ طریق پر چھیڑا اور خود دوکاندار نے یہ شرارت کی کہ اس عورت کی تہ بند کے نچلے کونے کو اس کی بے خبری کی حالت میں کسی کانٹے وغیرہ سے اس کی پیٹھ کے کپڑے سے ٹانک دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ عورت اُن کے اوباشانہ طریق کو دیکھ کر وہاں سے اُٹھ کر لوٹنے لگی تو وہ ننگی ہوگئی اس پر اس یہودی دوکاندار اور اس کے ساتھیوں نے زور سے ایک قہقہہ لگایا اور ہنسنے لگ گئے۔ مُسلمان خاتون نے شرم کے مارے ایک چیخ ماری اور مدد چاہی۔ اتفاق سے ایک مُسلمان اس وقت قریب موجود تھا۔ وُہ لپک کر موقعہ پر پہنچا اور باہم لڑائی میں یہودی دوکاندار مارا گیا۔ جس پر چاروں طرف سے اس مسلمان پر تلواریں برس پڑیں اور وُہ غیور مُسلمان وہیں ڈھیر ہوگیا۔ مسلمانوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو غیرت قومی سے ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور دُوسری طرف یہود جو اس واقعہ کو لڑائی کا بہانہ بنانا چاہتے تھے ہجوم کر کے اکٹھے ہوگئے اور ایک بلوہ کی صورت پیدا ہوگئی[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے رُؤسائے بنو قینقاع کو جمع کر کے کہا کہ یہ طریق اچھا نہیں، تم ان شرارتوں سے باز آجاؤ اور خدا سے ڈرو۔ اُنھوں نے بجائے اس کے کہ اظہارِ افسوس و ندامت کرتے اور معافی کے طالب بنتے سامنے سے نہایت متمردانہ جواب دیئے اور پھر وہی دھمکی دہرائی کہ بدر کی فتح پر غرور نہ کرو، جب ہم سے مقابلہ ہوگا تو پتہ لگ جائے گا کہ لڑنے والے ایسے ہوتے ہیں[3] ناچار آپؐ صحابہ کی ایک جمعیت کو ساتھ لیکر بنو قینقاع کے قلعوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب یہ آخری موقعہ تھا کہ وہ اپنے افعال پر پشیمان ہوتے مگر وہ سامنے سے جنگ پر آمادہ تھے[4] الغرض جنگ کا اعلان ہوگیا اور اسلام اور یہودیت کی طاقتیں ایک دُوسرے کے مقابل پر نکل آئیں۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق جنگ کا ایک طریق یہ بھی ہوتا تھا کہ اپنے

---

[1] مُسلم جلد ۲ باب من فضائل موسیٰ ص۳۰۸ ✽ [2] ابن ہشام ✽
[3] خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۷۰ ✽ [4] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۵۷ سطر ۲۷ ✽

قلعوں میں محفوظ ہوکر بیٹھ جاتے تھے اور فریق مخالف قلعوں کا محاصرہ کرلیتا تھا اور موقعہ موقعہ پر گاہے گاہے ایک دُوسرے کے خلاف حملے ہوتے رہتے تھے۔ حتّٰی کہ یا تو محاصرہ کرنے والی فوج قلعہ پر قبضہ کرنے سے مایوس ہوکر محاصرہ اُٹھالیتی تھی اور یہ محصورین کی فتح سمجھی جاتی تھی اور یا محصورین مقابلہ کی تاب نہ لا کر قلعہ کا دروازہ کھول کر اپنے آپ کو فاتحین کے سپرد کر دیتے تھے اس موقعہ پر بھی بنو قینقاع نے یہی طریق اختیار کیا اور اپنے قلعوں میں بند ہوکر بیٹھ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا محاصرہ کیا اور پندرہ دن تک برابر محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر جب بنو قینقاع کا سارا زور اور غرور ٹوٹ گیا تو انھوں نے اس شرط پر اپنے قلعوں کے دروازے کھول دیئے کہ ان کے اموال مُسلمانوں کے ہوجائیں گے، مگر اُن کی جانوں اور اُن کے اہل وعیال پر مسلمانوں کا کوئی حق نہیں ہوگا[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو منظور فرما لیا کیونکہ گو مُوسوی شریعت کی رُو سے یہ سب لوگ واجب القتل تھے[2] اور معاہدہ کی رُو سے ان لوگوں پر مُوسوی شریعت کا فیصلہ ہی جاری ہونا چاہیئے تھا مگر اس قوم کا یہ پہلا جُرم تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحیم وکریم طبیعت انتہائی سزا کی طرف جو ایک آخری علاج ہوتا ہے ابتدائی قدم پر مائل نہیں ہوسکتی تھی، لیکن دوسری طرف ایسے بدعہد اور معاند قبیلہ کا مدینہ میں رہنا بھی ایک مارِ آستین کے پالنے سے کم نہ تھا۔ خصوصاً جب کہ اوس اور خزرج کا ایک منافق گروہ پہلے سے مدینہ میں موجود تھا اور بیرونی جانب سے بھی تمام عرب کی مخالفت نے مسلمانوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ایسے حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فیصلہ ہوسکتا تھا کہ بنو قینقاع مدینہ سے چلے جائیں۔ یہ سزا ان کے جُرم کے مقابل میں اور نیز اس زمانہ کے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک بہت نرم سزا تھی اور دراصل اس میں صرف خود حفاظتی کا پہلو ہی مدِنظر تھا؛ ورنہ عرب کی خانہ بدوش اقوام کے نزدیک نقل مکان کوئی بڑی بات نہ تھی۔ خصوصاً جبکہ کسی قبیلہ کی جائیدادیں، زمینوں اور باغات کی صُورت میں نہ ہوں۔ جیسا کہ بنو قینقاع کی نہیں تھیں[3] اور پھر سارے کے سارے قبیلہ کو بڑے اَمن وامان کے ساتھ ایک جگہ چھوڑ کر کسی دُوسری جگہ جاکر آباد ہونے کا موقعہ مِل جاوے؛ چنانچہ بنو قینقاع بڑے اطمینان کے ساتھ مدینہ چھوڑ کر شام کی طرف چلے گئے۔ ان کی روانگی کے متعلق ضروری اہتمام اور نگرانی وغیرہ کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابی عبادۃ بن صامت کے سپرد فرمایا تھا جو اُن کے حلفاء میں سے تھے؛ چنانچہ عبادۃ بن صامت چند منزل تک بنو قینقاع کے ساتھ گئے اور پھر انہیں حفاظت کے ساتھ آگے روانہ کرکے واپس لوٹ آئے[4] مالِ غنیمت جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا وہ صرف آلاتِ حرب اور آلاتِ پیشہ زرگری پر مشتمل تھا[5]

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹ ۔ [2] استثناء باب ۲۰ آیت ۱۲ تا ۱۴ [3] طبری صفحہ ۱۳۶۱ سطر ۱۴ ۔
[4، 5] طبری صفحہ ۱۳۶۱ ۔

بنو قینقاع کے متعلق بعض روایتوں میں ذکر آتا ہے کہ جب ان لوگوں نے اپنے قلعوں کے دروازے کھول کر اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا تو اُن کی بدعہدی اور بغاوت اور شرارتوں کی وجہ سے آپؐ کا ارادہ ان کے جنگجو مردوں کو قتل کروا دینے کا تھا، مگر عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس منافقین کی سفارش پر آپؐ نے یہ ارادہ ترک کر دیا، لیکن محققین نے ان روایات کو صحیح تسلیم نہیں کیا[1] کیونکہ جب دُوسری روایات میں یہ صریحاً مذکور ہے کہ بنو قینقاع نے اس شرط پر دروازے کھولے تھے کہ اُن کی اور ان کے اہل وعیال کی جان بخشی کی جائے گی۔ تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شرط کو قبول کر لینے کے بعد دُوسرا طریق اختیار فرماتے؛ البتہ بنو قینقاع کی طرف سے جان بخشی کی شرط کا پیش ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خود ہی سمجھتے تھے کہ اُن کی اصل سزا قتل ہی ہے اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رحم کے طالب تھے اور یہ وعدہ لینے کے بعد اپنے قلعے کا دروازہ کھولنا چاہتے تھے کہ ان کو قتل کی سزا نہیں دی جاوے گی، لیکن گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رحیم النفسی سے اُنہیں معاف کر دیا تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نظر میں یہ لوگ اپنی بداعمالی اور جرائم کی وجہ سے اب دُنیا کے پردے پر زندہ چھوڑے جانے کے قابل نہیں تھے؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جس جگہ یہ لوگ جلاوطن ہو کر گئے تھے وہاں انہیں ابھی ایک سال کا عرصہ بھی نہ گذرا تھا کہ اُن میں کوئی ایسی بیماری وغیرہ پڑی کہ سارے کا سارا قبیلہ اس کا شکار ہو کر پیوندِ خاک ہو گیا[2]۔

غزوہ بنو قینقاع کی تاریخ کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے۔ واقدی اور ابن سعد نے شوال ۲ھ ہجری بیان کی ہے اور متاخرین نے زیادہ تر اسی کی اتباع کی ہے، لیکن ابن اسحاق اور ابن ہشام نے اسے غزوہ سویق کے بعد رکھا ہے جو مسلمہ طور پر ماہ ذی الحجہ ۲ھ ہجری کے شروع میں ہوا تھا اور حدیث کی ایک روایت میں یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ غزوہ بنو قینقاع حضرت فاطمہؓ کے رخصتانہ کے بعد ہوا تھا۔ کیونکہ اس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے ولیمہ کی دعوت کا خرچ مہیا کرنے کے لیے یہ تجویز کی تھی کہ بنو قینقاع کے ایک یہودی زرگر کو ساتھ لیکر جنگل میں جائیں اور وہاں سے اذخر گھاس لاکر مدینہ کے زرگروں کے پاس فروخت کریں[3] جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے رخصتانہ کے وقت جو عام مؤرخین کے نزدیک ذوالحجہ ۲ھ ہجری میں ہوا تھا ابھی تک بنو قینقاع مدینہ میں ہی تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر میں نے غزوہ بنو قینقاع کو غزوہ سویق اور حضرت فاطمہؓ کے رُخصتانہ کے بعد اواخر ۲ھ ہجری میں رکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۵۷، ۴۵۸ ۔ [2] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۵۸ ۔
[3] بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ بدر ۔

اس موقعہ پر یہ ذکر بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ غزوہ بنو قینقاع کا سبب بیان کرتے ہوئے مسٹر مارگولیس نے اپنی طرف سے ایک عجیب وغریب بات بنا کر لکھی ہے جس کا قطعاً کسی روایت میں اشارہ تک نہیں آتا۔ بخاری میں ایک روایت آتی ہے کہ حضرت حمزہؓ نے شراب کے نشہ میں (اُس وقت تک ابھی شراب حرام نہیں ہوئی تھی) حضرت علیؓ کے دو اونٹ مار دیئے تھے۔ جو انہیں جنگِ بدر کی غنیمت میں حاصل ہوئے تھے۔[1] اس منفرد واقعہ کو بغیر کسی قسم کی تاریخی سند کے غزوہ بنو قینقاع کے ساتھ جوڑ کر مسٹر مارگولیس رقمطراز ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو قینقاع پر اس غرض سے چڑھائی کی تھی تا اس کی غنیمت سے حضرت علیؓ کے اس نقصان کی تلافی کریں۔ تاریخ نویسی میں یہ جرأت غالباً اپنی مثال آپ ہی ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ مسٹر مارگولیس اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مَیں نے یہ بات اپنی طرف سے قیاس کر کے زائد کی ہے[2]

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

جنت البقیع اور اسکا پہلا مدفون

اسی سال کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے لیے مدینہ میں ایک مقبرہ تجویز فرمایا جسے جنت البقیع کہتے تھے اس کے بعد صحابہ عموماً اسی مقبرہ میں دفن ہوتے تھے۔ سب سے پہلے صحابی جو اس مقبرہ میں دفن ہوئے وہ عثمان بن مظعون تھے[3] عثمان بہت ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے اور نہایت نیک اور عابد اور صوفی منش آدمی تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد ایک دفعہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور مجھے اجازت مرحمت فرمائیں تو مَیں چاہتا ہوں کہ بالکل تارک الدنیا ہو کر اور بیوی بچوں سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی زندگی خالصتہً عبادتِ الٰہی کے لیے وقف کر دوں، مگر آپؐ نے اس کی اجازت نہیں دی[4] بلکہ جو لوگ ترک دنیا تو اختیار نہیں کرتے تھے لیکن روزہ اور نماز کی اس قدر کثرت کرتے تھے کہ اس سے اُن کی متعلقین کے حقوق پر اثر پڑتا تھا، اُن کے متعلق بھی آپؐ نے فرمایا کہ تمہیں چاہیئے کہ خدا کا حق خدا کو دو۔ بیوی بچوں کا حق بیوی بچوں کو دو۔ مہمان کا حق مہمان کو دو۔ اور اپنے نفس کا حق نفس کو دو۔ کیونکہ یہ سب حقوق خدا کے مقرر کردہ ہیں اور ان کی ادائیگی عبادت میں داخل ہے[5] الغرض آپؐ نے عثمان بن مظعون کو ترکِ دُنیا کی اجازت نہیں دی اور اسلام میں تبتل اور رہبانیت کو ناجائز قرار دیکر اپنی امت کے لیے افراط وتفریط کے درمیان ایک میانہ روی کا رستہ قائم کر دیا۔ عثمان بن مظعون کی وفات کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت صدمہ ہوا اور روایت آتی ہے کہ وفات کے بعد آپؐ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس وقت آپؐ کی آنکھیں پُرنم تھیں[6] ان کے دفنائے جانے کے بعد آپؐ نے ان کی قبر کے سرہانے ایک پتھر بطور علامت کے نصب

---

[1] بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ بدر ۔ [2] محمد مصنفہ مارگولیس صفحہ ۲۸۱ ۔ [3] اصابہ
[4] بخاری کتاب النکاح [5] بخاری کتاب الصوم ۔ [6] اصابہ ۔

کروا دیا اور پھر آپ کبھی کبھی جنت البقیع میں جا کر ان کے لیے دُعا فرمایا کرتے تھے[1] عثمان پہلے مہاجر تھے جو مدینہ میں فوت ہوئے۔

غزوہ ذی امر محرم یا صفر ۳ ھ

غزوہ قرقرۃ الکدر کے بیان میں یہ ذکر گذر چکا ہے کہ کس طرح قریش کی انگیخت پر نجد کے قبائل سلیم و غطفان نے مسلمانوں کے خلاف جارحانہ طریق اختیار کر کے اسلام اور بانیٔ اسلام کو تباہ و برباد کر دینے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ ابھی اس واقعہ پر کوئی زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ بنو غطفان کے بعض قبائل یعنی بنو ثعلبہ اور بنو محارب کے لوگ اپنے ایک نامور جنگجو دعثور بن حارث کی تحریک پر پھر مدینہ پر اچانک حملہ کر دینے کی نیّت سے نجد کے ایک مقام ذی امر میں جمع ہونے شروع ہوئے[2] لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دشمنوں کی حرکات و سکنات کا باقاعدہ علم رکھتے تھے آپ کو ان کے اس خونی ارادے کی بروقت اطلاع ہو گئی اور آپ ایک بیدار مغز جرنیل کی طرح پیش بندی کے طور پر ساڑھے چار سو صحابیوں کی جمعیت کو اپنے ساتھ لیکر[3] محرم ۳ ھ کے آخر یا صفر کے شروع میں[4] مدینہ سے نکلے اور تیزی کے ساتھ کوچ کرتے ہوئے ذی امر کے قریب پہنچ گئے۔ دشمن کو آپ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اس نے جھٹ پٹ آس پاس کی پہاڑیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ اور مسلمان ذی امر میں پہنچے تو میدان خالی تھا، البتہ بنو ثعلبہ کا ایک بدوی جس کا نام جبار تھا صحابہ کے قابو میں آ گیا۔ جسے قید کر کے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے حالات دریافت کئے تو معلوم ہوا کہ بنو ثعلبہ اور بنو محارب کے سارے لوگ پہاڑیوں میں محفوظ ہو گئے ہیں اور وہ کھلے میدان میں مسلمانوں کے سامنے نہیں آئیں گے[5]۔ ناچار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واپسی کا حکم دینا پڑا، مگر اس غزوہ کا اتنا فائدہ ضرور ہو گیا کہ اس وقت جو خطرہ بنو غطفان کی طرف سے پیدا ہوا تھا۔ وہ وقتی طور پر ٹل گیا۔ جبار جو مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوا تھا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے بخوشی مسلمان ہو گیا اور آپ نے اس کی تربیت کا کام بلالؓ کے سپرد فرمایا[6] اور تین دن کے قیام کے بعد آپ مدینہ کی طرف واپس تشریف لے آئے۔

بعض تاریخی روایات کی رُو سے اسی غزوہ میں وہ مشہور واقعہ پیش آیا جس میں ایک بدوی سردار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا اور غافل پا کر آپ پر تلوار کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ مگر پھر خود مرعوب ہو کر اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی[7] لیکن حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ بشرطیکہ وہ دو دفعہ نہیں ہوا غزوہ ذات الرقاع میں پیش آیا تھا جو بروایت صحیح ۵ ھ میں ہوا تھا[8]۔

تزویج اُمّ کلثوم ربیع الاول ۳ ھ

رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوجہ حضرت عثمانؓ بن عفان

---

[1] اسد الغابہ[2] ابن سعد [3][4] ابن ہشام و ابن سعد [5] ... [8] بخاری کتاب المغازی باب غزوہ ذات الرقاع

کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دُوسری لڑکی اُمّ کلثوم کی شادی جو حضرت فاطمہ سے بڑی مگر رقیہؓ سے چھوٹی تھیں حضرت عثمانؓ سے کر دی۔ اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو ذوالنورین[1] دو نُوروں والا کہتے ہیں۔ اُمّ کلثوم کی یہ دُوسری شادی تھی کیونکہ وہ اور اُن کی بہن رقیہؓ شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کے دو لڑکوں سے بیاہی گئی تھیں، مگر قبل اس کے کہ انکا رُخصتانہ ہوتا مذہبی مخالفت کی بناء پر یہ رشتہ منقطع ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے حضرت عثمانؓ سے رقیہ کی شادی کی اور رقیہ کی وفات کے بعد اُمّ کلثوم کی شادی کر دی۔ مگر افسوس ہے کہ اِن دونوں صاحبزادیوں کی نسل کا سلسلہ نہیں چلا۔ کیونکہ اُمّ کلثوم کے تو کوئی بچہ ہوا ہی نہیں اور رقیہ کا صاحبزادہ عبداللہ چھ سال کا ہو کر وفات پا گیا۔ اُمّ کلثوم کا نکاح ربیع الاول ۳ھ میں ہوا تھا۔[2]

غزوہ بحران ربیع الاول ۳ھ

بنو سلیم اور بنو غطفان کے دو حملوں کی تیاری کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فوری اور بروقت تدبیر نے خدا کے فضل سے اس وقت مسلمانوں کو ان خونخوار قبائل کے شر سے محفوظ رکھا تھا۔ مگر جس کے دل میں عداوت کی آگ سلگ رہی ہو وہ نچلا کس طرح بیٹھ سکتا تھا۔ ابھی غزوہ ذی امر پر زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا یعنی اواخر ربیع الاول ۳ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ وحشتناک اطلاع موصول ہوئی کہ بنو سلیم پھر موضع بحران میں مدینہ پر اچانک حملہ کرنے کی غرض سے بہت بڑی تعداد میں جمع ہو رہے ہیں[3] اور یہ کہ ان کے ساتھ قریش کا بھی ایک جتھہ ہے۔[4] ناچار آپ پھر صحابہ کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر مدینہ سے نکلے، لیکن حسب عادت عرب کے یہ وحشی درندے جو اپنے شکار پر اچانک اور غفلت کی حالت میں حملہ کرنے کا موقعہ چاہتے تھے آپؐ کی آمد کی خبر پاکر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ عرصہ وہاں قیام کر کے واپس تشریف لے آئے۔

بنو سلیم اور بنو غطفان کا اس طرح بار بار مدینہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے جمع ہونا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ صحرائے عرب کے یہ وحشی اور جنگجو قبائل اسلام کے سخت جانی دشمن تھے اور دن رات اس فکر میں رہتے تھے کہ کوئی موقعہ ملے تو مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیں۔ ذرا مسلمانوں کی اُس وقت کی نازک حالت کا اندازہ لگاؤ کہ اُن پر اُس زمانہ میں کیسے دن گذر رہے تھے۔ ایک طرف مکہ کے قریش تھے جن کو اسلام کی عداوت اور جنگ بدر کی انتقامی رُوح نے اندھا کر رکھا تھا اور انہوں نے خانہ کعبہ کے پردوں کے ساتھ لپٹ لپٹ کر قسمیں کھائی ہوئی تھیں کہ جب تک مسلمانوں کو ملیا میٹ

---

[1] اصابہ و اسد الغابہ [2] ابن ہشام [3] ابن سعد؛
[4] ابن ہشام

نہ کریں گے چین نہیں لیں گے۔ دُوسری طرف صحرائے عرب کے یہ خونخوار درندے تھے جن کو قریش کی انگیخت اور اسلام کی دشمنی نے مسلمانوں کے خُون کی پیاس سے بے چین کر رکھا تھا؛ چنانچہ دیکھو کر بدر کے بعد چند ماہ کے اندر اندر آپ کو کتنی دفعہ بذاتِ خود ان وحشی قبائل عرب کے خونی ارادوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے سفر کرنا پڑا۔ جیساکہ سرولیم میور نے تصریح کی ہے یہ دن بھی بہت سخت گرمیوں کے دن تھے اور گرمی بھی عرب کے صحرا کی گرمی تھی۔ اگر خدا کی خاص نصرت شاملِ حال نہ ہوتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیدار مغزی مسلمانوں کو ہر وقت ہوشیار اور چوکس نہ رکھتی اور آپ دشمن کی جمعیت کو چھاپہ مارنے سے قبل ہی منتشر کر دینے کی تدابیر اختیار نہ کرتے تو ان دنوں میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں کوئی شک نہیں تھا اور یہ صرف بیرونی خطرات تھے۔ باقی اندرونی خطرات بھی کسی طرح کم نہ تھے۔ خود مدینہ کے اندر مسلمانوں سے ملے جُلے رہنے والے منافقین موجود تھے جن کو مارِ آستین کہنا یقیناً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ان کے علاوہ غدار اور خفیہ سازشوں کے عادی یہودی لوگ تھے جن کی عداوت کی گہرائی اور وسعت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اللہ اللہ ان ابتدائی مُسلمانوں کے لیے یہ کیسی مصیبت کے دن تھے!! خود ان کی زبان سے سُنیئے۔ اُبَیّ بن کعب ایک مشہور صحابی روایت کرتے ہیں:

كَانُوْا لَا يُبِيْتُوْنَ اِلَّا فِي السِّلَاحِ وَلَا يُصْبِحُوْنَ اِلَّا فِيْهِ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَلَا تَرَوْنَ اَنَّا نَعِيْشُ حَتّٰى نَبِيْتَ اٰمِنِيْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَا نَخَافُ اِلَّا اللّٰهَ[1]

یعنی اس زمانہ میں صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ ڈر کے مارے راتوں کو ہتھیار لگا لگا کر سوتے تھے اور دن کو بھی ہر وقت مسلح رہتے تھے کہ کہیں ان پر کوئی اچانک حملہ نہ ہو جاوے اور وہ ایک دُوسرے سے کہا کرتے تھے کہ دیکھئے ہم اس وقت تک زندہ بھی رہتے ہیں یا نہیں کہ جب ہم اَمن و اطمینان کی زندگی گذاریں گے اور خدا کے سوا ہمیں کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔"

ان الفاظ میں کس مصیبت اور کس بے کسی کا اظہار ہے اور امن اور اطمینان کی زندگی کی کتنی تڑپ مخفی ہے۔ اس کا اندازہ ہر انصاف پسند شخص خود کر سکتا ہے۔

سریہ زید بن حارثہ بطرف قردہ جمادی الآخرۃ ۳ ہجری

بنوسلیم اور بنوغطفان کے حملوں سے کچھ فرصت ملی تو مسلمانوں کو ایک اور خطرہ کے سدِ باب کے لیے وطن سے نکلنا پڑا۔ اب تک قریش اپنی شمالی تجارت کیلئے عموماً حجاز کے ساحلی راستے سے شام کی طرف جاتے تھے لیکن اب انھوں نے یہ راستہ ترک کر دیا

---

[1] حاکم و طبرانی بحوالہ لباب النقول زیر آیت وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم

کیونکہ جیساکہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے اس علاقہ کے قبائل مسلمانوں کے حلیف بن چکے تھے اور قریش کے لیے شرارت کا موقعہ کم تھا بلکہ ایسے حالات میں وہ اس ساحلی راستے کو خود اپنے لیے موجب خطرہ سمجھتے تھے۔ بہرحال اب اُنھوں نے اس راستے کو ترک کر کے نجدی راستہ اختیار کر لیا جو عراق کو جاتا تھا۔ اور جس کے آس پاس قریش کے حلیف اور مسلمانوں کے جانی دشمن قبائل سلیم وغطفان آباد تھے[۱] چنانچہ جمادی الآخرۃ کے مہینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قریش مکہ کا ایک تجارتی قافلہ نجدی راستہ سے گذرنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قریش کے قافلوں کا ساحلی راستے سے گذرنا مسلمانوں کے لیے موجب خطرہ تھا تو نجدی راستے سے اُن کا گذرنا ویسا ہی بلکہ اس سے بڑھ کر اندیشہ ناک تھا۔ کیونکہ برخلاف ساحلی راستے کے اس راستے پر قریش کے حلیف آباد تھے جو قریش ہی کی طرح مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے اور جن کے ساتھ مل کر قریش بڑی آسانی کے ساتھ مدینہ پر خفیہ چھاپہ مار سکتے یا کوئی اور شرارت کر سکتے تھے اور پھر قریش کو کمزور کرنے اور انہیں صلح جوئی کی طرف مائل کرنے کی غرض کے ماتحت بھی ضروری تھا کہ اس راستہ پر بھی ان کے قافلوں کی روک تھام کی جاوے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خبر کے ملتے ہی اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کی سرداری میں اپنے اصحاب کا ایک دستہ روانہ فرمادیا۔

قریش کے اس تجارتی قافلے میں ابوسفیان بن حرب[۲] اور صفوان بن امیہ[۳] جیسے رؤسا بھی موجود تھے۔ زید نے نہایت چستی اور ہوشیاری سے اپنے فرض کو ادا کیا اور نجد کے مقام قردہ میں ان دشمنانِ اسلام کو جادبایا۔ اس اچانک حملہ سے گھبرا کر قریش کے لوگ قافلہ کے اموال وامتعہ کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور زید بن حارثہ اور ان کے ساتھی ایک کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ مدینہ میں بانیل مرام واپس آگئے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قریش کے اس قافلہ کا رہبر ایک فرات نامی شخص تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوا اور مسلمان ہونے پر رہا کر دیا گیا[۴] لیکن دوسری روایتوں سے پتہ لگتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف مشرکین کا جاسوس تھا مگر بعد میں مسلمان ہو کر مدینہ میں ہجرت کر کے آگیا[۵]

قتل کعب بن اشرف جمادی الآخرۃ ۳ھ

بدر کی جنگ نے جس طرح مدینہ کے یہودیوں کی دلی عداوت کو ظاہر کر دیا تھا اس کا ذکر غزوہ بنو قینقاع کے بیان میں گذر چکا ہے، مگر افسوس ہے کہ بنو قینقاع کی جلاوطنی بھی دوسرے یہودیوں کو اصلاح کی طرف مائل نہ کر سکی اور وہ اپنی شرارتوں اور فتنہ پردازیوں میں ترقی کرتے گئے۔

[۱-۴] ابن ہشام ج ۳[۵] ابن سعد [۵] اصابہ واستیعاب

چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ کعب گو مذہباً یہودی تھا لیکن دراصل یہودی النسل نہ تھا، بلکہ عرب تھا۔ اس کا باپ اشرف بنو نبہان کا ایک ہوشیار اور چلتا پرزہ آدمی تھا جس نے مدینہ میں آکر بنو نضیر کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور ان کا حلیف بن گیا اور بالآخر اس نے اتنا اقتدار اور رسوخ پیدا کر لیا کہ قبیلہ بنو نضیر کے رئیس اعظم ابو رافع بن ابی الحقیق نے اپنی لڑکی اُسے رشتہ میں دیدی[1] اسی لڑکی کے بطن سے کعب پیدا ہوا جس نے بڑے ہو کر اپنے باپ سے بھی بڑھ کر رتبہ حاصل کیا۔ حتیٰ کہ بالآخر اُسے یہ حیثیت حاصل ہو گئی کہ تمام عرب کے یہودی اسے گویا اپنا سردار سمجھنے لگ گئے۔ کعب ایک وجیہہ اور شکیل شخص ہونے کے علاوہ ایک قادر الکلام شاعر اور ایک نہایت دولتمند آدمی تھا اور ہمیشہ اپنی قوم کے علماء اور دوسرے ذی اثر لوگوں کو اپنی مالی فیاضی سے اپنے ہاتھ کے نیچے رکھتا تھا[2] مگر اخلاقی نقطۂ نگاہ سے وہ ایک نہایت گندے اخلاق کا آدمی تھا اور خفیہ چالوں اور ریشہ دوانیوں کے فن میں اسے کمال حاصل تھا۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ہجرت کر کے تشریف لائے تو کعب بن اشرف نے دوسرے یہودیوں کے ساتھ ملکر اس معاہدہ میں شرکت کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان باہمی دوستی اور امن و امان اور مشترکہ دفاع کے متعلق تحریر کیا گیا تھا[3] مگر اندر ہی اندر کعب کے دل میں بغض و عداوت کی آگ سلگنے لگ گئی اور اس نے خفیہ چالوں اور مخفی سازباز سے اسلام اور بانی اسلام کی مخالفت شروع کر دی؛ چنانچہ لکھا ہے کہ کعب ہر سال یہودی علماء و مشائخ کو بہت سی خیرات دیا کرتا تھا، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد یہ لوگ اپنے سالانہ وظائف لینے کے لیے اس کے پاس گئے تو اس نے باتوں باتوں میں اُن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شروع کر دیا اور اُن سے آپ کے متعلق مذہبی کتب کی بناء پر رائے دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ بظاہر تو یہ وہی نبی معلوم ہوتا ہے جس کا ہمیں وعدہ دیا گیا تھا۔ کعب اس جواب پر بہت بگڑا اور انکو سخت سُست کہہ کر وہاں سے رخصت کر دیا۔ اور جو خیرات انہیں دیا کرتا وہ نہ دی۔ یہودی علماء کی جب روزی بند ہوئی تو کچھ عرصہ کے بعد پھر کعب کے پاس گئے اور کہا کہ ہمیں علامات کے سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی۔ ہم نے دوبارہ غور کیا ہے۔ دراصل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ نبی نہیں ہے جس کا وعدہ دیا گیا تھا۔ اس جواب سے کعب کا مطلب حل ہو گیا اور اس نے خوش ہو کر ان کو سالانہ خیرات دیدی[4] خیر یہ تو ایک مذہبی مخالفت تھی جو گو ناگوار صورت میں اختیار کی گئی، لیکن چنداں قابلِ اعتراض نہیں ہوسکتی تھی اور نہ اس بناء پر

---

[1] ابن ہشام ۔ [2] زرقانی ۔
[3] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۹ ۔ [4] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۸ ۔

کعب کو زیرِ الزام سمجھا جا سکتا تھا، مگر اس کے بعد کعب کی مخالفت زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتی ہے اور بالآخر جنگِ بدر کے بعد تو اس نے ایسا رویہ اختیار کیا جو سخت مفسدانہ اور فتنہ انگیز تھا اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے لیے نہایت خطرناک حالات پیدا ہو گئے۔ دراصل بدر سے پہلے کعب یہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کا یہ جوشِ ایمان ایک عارضی چیز ہے اور آہستہ آہستہ یہ سب لوگ خود بخود منتشر ہو کر اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ جائیں گے، لیکن جب بدر کے موقعہ پر مسلمانوں کو ایک غیر معمولی فتح نصیب ہوئی اور رؤسائے قریش اکثر مارے گئے تو اس نے سمجھ لیا کہ اب یہ نیا دین یُونہی مٹتا نظر نہیں آتا؛ چنانچہ بدر کے بعد اس نے اپنی پوری کوشش اسلام کے مٹانے اور تباہ و برباد کر دینے میں صرف کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے دلی بغض و حسد کا سب سے پہلا اظہار اس موقعہ پر ہوا جبکہ بدر کی فتح کی خبر مدینہ میں پہنچی۔ اس خبر کو سُن کر کعب نے علی رؤس الاشہاد یہ کہا کہ یہ خبر بالکل جھوٹی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قریش کے ایسے بڑے لشکر پر فتح حاصل ہو اور مکہ کے اتنے نامور رئیس خاک میں مل جائیں اور اگر یہ خبر سچ ہے تو پھر اس زندگی سے مرنا بہتر ہے[1] جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی اور کعب کو یہ یقین ہو گیا کہ واقعی بدر کی فتح نے اسلام کو وہ استحکام دیدیا ہے جس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا تو وہ غیض و غضب سے بھر گیا۔ اور فوراً سفر کی تیاری کر کے اس نے مکہ کی راہ لی اور وہاں جا کر اپنی چرب زبانی اور شعر گوئی کے زور سے قریش کے دلوں کی سلگتی ہوئی آگ کو شعلہ بار کر دیا۔ اور ان کے دل میں مسلمانوں کے خون کی نہ بجھنے والی پیاس پیدا کر دی اور اُن کے سینے جذباتِ انتقام و عداوت سے بھر دیئے[2] اور جب کعب کی اشتعال انگیزی سے اُن کے احساسات میں ایک انتہائی درجہ کی بجلی پیدا ہو گئی تو اس نے ان کو خانہ کعبہ کے صحن میں لے جا کر اور کعبہ کے پردے ان کے ہاتھوں میں دے دے کر اُن سے قسمیں لیں کہ جبتک اسلام اور بانیٔ اسلام کو صفحۂ دُنیا سے ملیا میٹ نہ کر دیں گے، اُس وقت تک چین نہ لیں گے[3] مکہ میں یہ آتش فشاں فضا پیدا کر کے اس بدبخت نے دوسرے قبائلِ عرب کا رُخ کیا اور قوم بقوم پھر کر مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا[4] اور پھر مدینہ میں واپس آکر مسلمان خواتین پر تشبیب کہی۔ یعنی اپنے جوش دلانے والے اشعار میں نہایت گندے اور فحش طریق پر مسلمان خواتین کا ذکر کیا[5] حتیٰ کہ خاندانِ نبوت کی مستورات کو بھی اپنے ان اوباشانہ اشعار کا نشانہ بنانے سے دریغ نہیں کیا[6] اور ملک میں ان اشعار کا چرچا کروایا۔ اور بالآخر اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش

---

[1] ابن ہشام و ابن سعد ۔ [2] ابوداؤد کتاب الخراج نیز ابن ہشام و ابن سعد ۔
[3] فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۵۹ ۔ [4] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۹ ۔
[5] ابن ہشام ۔ [6] طبری و الروض الانف ۔

کی۔ اور آپ کو کسی دعوت وغیرہ کے بہانے سے اپنے مکان پر بلا کر چند نوجوان یہودیوں سے آپ کو قتل کروانے کا منصوبہ باندھا۔ مگر خدا کے فضل سے وقت پر اطلاع ہو گئی اور اُس کی یہ سازش کامیاب نہیں ہوئی۔[1]

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور کعب کے خلاف عہد شکنی۔ بغاوت۔ تحریکِ جنگ۔ فتنہ پردازی۔ فحش گوئی اور سازشِ قتل کے الزامات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اُس بین الاقوام معاہدہ کی رُو سے جو آپؐ کے مدینہ میں تشریف لانے کے بعد اہالیانِ مدینہ میں ہوا تھا۔ مدینہ کی جمہوری سلطنت کے صدر اور حاکمِ اعلیٰ تھے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ کعب بن اشرف اپنی کارروائیوں کی وجہ سے واجب القتل ہے اور اپنے بعض صحابیوں کو ارشاد فرمایا کہ اُسے قتل کر دیا جاوے[2] لیکن چونکہ اس وقت کعب کی فتنہ انگیزیوں کی وجہ سے مدینہ کی فضاء ایسی ہو رہی تھی کہ اگر اس کے خلاف باضابطہ طور پر اعلان کر کے اسے قتل کیا جاتا تو مدینہ میں ایک خطرناک خانہ جنگی شروع ہو جانے کا احتمال تھا۔ جس میں نہ معلوم کتنا کشت و خون ہوتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ممکن اور جائز قربانی کر کے بین الاقوام کشت و خون کو روکنا چاہتے تھے۔ آپؐ نے یہ ہدایت فرمائی کہ کعب کو برملا طور پر قتل نہ کیا جاوے بلکہ چند لوگ خاموشی کے ساتھ کوئی مناسب موقعہ نکال کر اُسے قتل کر دیں اور یہ ڈیوٹی آپؐ نے قبیلہ اوس کے ایک مخلص صحابی محمد بن مسلمہ کے سپرد فرمائی اور انہیں تاکید فرمائی کہ جو طریق بھی اختیار کریں قبیلہ اوس کے رئیس سعد بن معاذ کے مشورہ سے کریں۔ محمد بن مسلمہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ خاموشی کے ساتھ قتل کرنے کے لیے تو کوئی بات کہنی ہوگی۔ یعنی کوئی عذر وغیرہ بنانا پڑے گا۔ جس کی مدد سے کعب کو اس کے گھر سے نکال کر کسی محفوظ جگہ میں قتل کیا جا سکے۔ آپؐ نے ان عظیم الشان اثرات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو اس موقعہ پر ایک خاموش سزا کے طریق کو چھوڑنے سے پیدا ہو سکتے تھے فرمایا "اچھا" چنانچہ محمد بن مسلمہ نے سعد بن معاذ کے مشورہ سے ابو نائلہ اور دو تین اور صحابیوں کو اپنے ساتھ لیا اور کعب کے مکان پر پہنچے اور کعب کو اس کے اندرون خانہ سے بُلا کر کہا کہ "ہمارے صاحب (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے صدقہ مانگتے ہیں اور ہم تنگ حال ہیں۔ کیا تم مہربانی کر کے ہمیں کچھ قرض دے سکتے ہو؟" یہ بات سُن کر کعب خوشی سے کُود پڑا اور کہنے لگا۔ واللہ ابھی کیا ہے، وہ دن دُور نہیں جب

---

[1] خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۶۰ و زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۰ [2] ابوداؤد کتاب الخراج نیز بخاری باب قتل کعب بن اشرف و [3] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۰

[4] یہ بات گو اس موقعہ کے لیے اختیار کی گئی ہو مگر اپنی جگہ درست تھی کیونکہ واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابیوں سے قومی ضروریات کے لیے چندے اور زکوٰۃ کا مطالبہ فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی درست ہے کہ صحابہ عموماً نادار اور غریب تھے۔

تم اس شخص سے بیزار ہو کر اُسے چھوڑ دو گے۔ محمد نے جواب دیا" خیر ہم تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اختیار کر چکے ہیں اور اب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس سلسلہ کا انجام کیا ہوتا ہے۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ قرض دو گے یا نہیں ؟ کعب نے کہا" ہاں ! مگر کوئی چیز رہن رکھو" محمد نے پوچھا کیا چیز ؟ اس بدبخت نے جواب دیا" اپنی عورتیں رہن رکھ دو" محمد نے غصہ کو دبا کر کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے جیسے آدمی کے پاس ہم اپنی عورتیں رہن رکھ دیں۔ اُس نے کہا اچھا تو پھر بیٹے سہی۔ محمد نے جواب دیا کہ یہ بھی ناممکن ہے۔ ہم سارے عرب کا طعن اپنے سر پر نہیں لے سکتے ؛ البتہ اگر تم مہربانی کرو تو ہم اپنے ہتھیار رہن رکھ دیتے ہیں۔ کعب راضی ہو گیا اور محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھی رات کو آنے کا وعدہ دیکر واپس چلے آئے۔ جب رات ہوئی تو یہ پارٹی ہتھیار وغیرہ ساتھ لیکر (کیونکہ اب وہ برملا طور پر ہتھیار اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے) کعب کے مکان پر پہنچے اور اُسے اس کے گھر سے نکال کر باتیں کرتے کرتے ایک طرف کو لے آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چلتے چلتے محمد بن مسلمہ یا اُن کے کسی ساتھی نے کسی بہانے سے کعب کے سر پر ہاتھ ڈالا اور نہایت پھرتی کے ساتھ اس کے بالوں کو مضبوطی سے قابو کر کے اپنے ساتھیوں کو آواز دی "مارو" صحابہ نے جو پہلے سے تیار اور ہتھیار بند تھے فوراً تلواریں چلا دیں۔ اور بالآخر کعب قتل ہو کر گرا۔ اور محمد بن مسلمہ اور اُن کے ساتھی وہاں سے رخصت ہو کر جلدی جلدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور آپ کو اس کے قتل کی اطلاع دی[1]۔

جب کعب کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو شہر میں ایک سنسنی پھیل گئی اور یہودی لوگ سخت جوش میں آ گئے اور دُوسرے دن صبح کے وقت یہودیوں کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ ہمارا سردار کعب بن اشرف اس اس طرح قتل کر دیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی باتیں سُنکر فرمایا کہ کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ کعب کس کس جرم کا مرتکب ہوا ہے ؟ اور پھر آپ نے اجمالاً اُن کو کعب کی عہد شکنی اور تحریک جنگ اور فتنہ انگیزی اور فحش گوئی اور سازشِ قتل وغیرہ کی کارروائیاں یاد دلائیں[2] جس پر یہ لوگ ڈر کر خاموش ہو گئے[3] اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ تمہیں چاہیئے کہ کم از کم آئندہ کے لیے ہی امن اور تعاون کے ساتھ رہو اور عداوت اور فتنہ فساد کا بیج نہ بوؤ ؛ چنانچہ یہود کی رضامندی کے ساتھ آئندہ کے لیے ایک نیا معاہدہ لکھا گیا اور یہود نے مسلمانوں کے ساتھ اَمن و اَمان کے ساتھ رہنے اور فتنہ و فساد کے طریقوں سے بچنے کا از سرِ نو وعدہ کیا[4] اور یہ عہدنامہ حضرت علی کی سپردگی میں دیدیا گیا[5] اور تاریخ میں کسی جگہ مذکور نہیں کہ

---

[1] بخاری باب قتل کعب بن اشرف [2] ابوداؤد کتاب الخراج نیز ابن سعد [3] فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۶۲ و زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۴ [4] ابوداؤد کتاب الخراج باب کیف کان اخراج الیہود و نیز ابن سعد [5] ابن سعد

اس کے بعد یہودیوں نے کبھی کعب بن اشرف کے قتل کا ذکر کر کے مسلمانوں پر الزام قائم کیا ہو۔ کیونکہ ان کے دل محسوس کرتے تھے کہ کعب اپنی مستحق سزا کو پہنچا ہے۔

کعب بن اشرف کے قتل پر بعض مغربی مؤرخین نے بڑی خامہ فرسائی کی ہے اور اس واقعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن پر ایک بدنما دھبے کے طور پر ظاہر کر کے اعتراضات جمائے ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اوّل آیا یہ قتل فی ذاتہٖ ایک جائز فعل تھا یا نہیں؟ دُوسرے آیا جو طریق اس قتل کے واسطے اختیار کیا گیا وہ جائز تھا یا نہیں؟ امر اوّل کے متعلق تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کعب بن اشرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باقاعدہ امن وامان کا معاہدہ کر چکا تھا اور مسلمانوں کے خلاف کارروائی کرنا تو درکنار رہا اُس نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ وُہ ہر بیرونی دشمن کے خلاف مسلمانوں کی امداد کرے گا اور مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے گا۔ اُس نے اِس معاہدہ کی رُو سے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ جو رنگ مدینہ میں جمہوری سلطنت کا قائم کیا گیا ہے اُس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدر ہوں گے اور ہر قسم کے تنازعات وغیرہ میں آپؐ کا فیصلہ سب کے لیے واجب القبول ہوگا؛ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اسی معاہدہ کے ماتحت یہودی لوگ اپنے مقدمات وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور آپؐ ان میں احکام جاری فرماتے تھے؛ چنانچہ آپؐ نے ایک زنا کے مقدمہ میں ایک یہودی مرد اور یہودی عورت کو تورات کے حکم کے مطابق رجم کی سزا دی تھی[1] اب اگر ان حالات کے ہوتے ہوئے کعب نے تمام عہدوپیمان کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں سے بلکہ حق یہ ہے کہ حکومتِ وقت سے غداری کی اور مدینہ میں فتنہ وفساد کا بیج بُویا اور ملک میں جنگ کی آگ مشتعل کرنے کی کوشش کی اور مُسلمانوں کے خلاف قبائلِ عرب کو خطرناک طور پر اُبھارا اور مسلمانوں کی عورتوں پر اپنے جوش دلانے والے اشعار میں تشبیب کہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے منصوبے کیے۔ اور یہ سب کچھ ایسی حالت میں کیا کہ مسلمان پہلے سے ہی چاروں طرف سے مصائب میں گھرے ہوئے تھے اور عرب کے خونخوار درندے اُن کے خُون کی پیاس میں مجنون ہو رہے تھے اور صحابہ کی ایسی حالت تھی کہ نہ دن آرام میں گذرتا تھا اور نہ رات۔ اور دشمن کے حملہ کے خطرہ میں اُن کی نیند تک حرام ہو رہی تھی۔ تو کیا اِن حالات میں کعبؔ کا جُرم بلکہ بہت سے جرموں کا مجموعہ ایسا نہ تھا کہ اس کے خلاف کوئی تعزیری قدم اُٹھایا جاتا؟ اور پھر کیا قتل سے کم کوئی اور سزا تھی جو یہود کی اس فتنہ پردازی کے سلسلہ کو روک سکتی؟ مَیں نہیں سمجھتا کہ کوئی غیر متعصب شخص کعب کے قتل کو ایک غیر منصفانہ فعل سمجھ سکتا ہے۔ کیا آجکل مہذب کہلانے والے ممالک میں بغاوت اور عہد شکنی اور اشتعالِ جنگ اور سازشِ قتل کے جرموں میں مجرم کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی؟

---

[1] بخاری کتاب المحاربین

دُوسرا سوال قتل کے طریق سے تعلق رکھتا ہے۔ سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ عرب میں اس وقت کوئی باقاعدہ سلطنت نہ تھی، بلکہ ہر شخص اور ہر قبیلہ آزاد اور خود مختار تھا۔ ایسی صورت میں وہ کونسی عدالت تھی جہاں کعب کے خلاف مقدمہ دائر کر کے باقاعدہ قتل کا حکم حاصل کیا جاتا؟ کیا یہود کے پاس اس کی شکایت کی جاتی جن کا وہ سردار تھا اور جو خود مسلمانوں کے خلاف غدّاری کر چکے تھے اور آئے دن فتنے کھڑے کرتے رہتے تھے؟ کیا مکہ کے قریش کے سامنے مقدمہ پیش کیا جاتا جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے؟ کیا قبائل سلیم و غطفان سے دادرسی چاہی جاتی جو گذشتہ چند ماہ میں تین چار دفعہ مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تیاری کر چکے تھے؟ اسوقت کی عرب کی حالت پر غور کرو اور پھر سوچو کہ مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے وہ کونسا راستہ کھلا تھا کہ جب ایک شخص کی اشتعال انگیزی اور تحریک جنگ اور فتنہ پردازی اور سازش قتل کی وجہ سے اس کی زندگی کو اپنے لیے اور مُلک کے امن کے لیے خطرناک پاتے تو خود حفاظتی کے خیال سے موقعہ پا کر اُسے خود قتل کر دیتے کیونکہ یہ بہت بہتر ہے کہ ایک شریر اور مُفسد آدمی قتل ہو جاوے۔ بجائے اس کے کہ بہت سے پُرامن شہریوں کی جان خطرے میں پڑے اور ملک کا امن برباد ہو۔ پھر جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اس معاہدہ کی رُو سے جو ہجرت کے بعد مسلمانوں اور یہود کے درمیان ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک معمولی شہری کی حیثیت حاصل نہ تھی، بلکہ آپ اس جمہوری سلطنت کے صدر قرار پائے تھے جو مدینہ میں قائم ہوئی تھی۔ اور آپ کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ جملہ تنازعات اور اُمور سیاسی میں جو فیصلہ مناسب خیال کریں صادر فرمائیں[۱]۔ پس اگر آپ نے مُلک کے امن کے مفاد میں کعب کی فتنہ پردازی کی وجہ سے اُسے واجب القتل قرار دیا تو آج تیرہ سو سال گذرنے پر جبکہ اس زمانہ کے بہت سے تفصیلی حالات بھی ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ کے فیصلہ پر عدالت اپیل بن کر بیٹھے۔ خصوصاً جبکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ خود یہود نے کعب کی اس سزا کو اس کے جرموں کی روشنی میں واجبی سمجھ کر خاموشی اختیار کی اور اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جاوے کہ ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ قتل کا حکم دینے سے پہلے یہود کو بُلا کر ان کو کعب کے یہ جُرم سُنائے جاتے اور حُجت پوری کرنے کے بعد اس کے قتل کا باقاعدہ اور برملا طور پر حکم دیا جاتا، تو اس کا جواب اُوپر گذر چکا ہے کہ اُسوقت حالات ایسے نازک ہو رہے تھے کہ ایسا طریق اختیار کرنے سے بین الاقوام پیچیدگیوں کے بڑھنے کا سخت خطرہ تھا اور کوئی تعجب نہ تھا کہ مدینہ میں ایک خطرناک سلسلہ کشت و خون اور خانہ جنگی کا شروع ہو جاتا۔ پس ان کاموں کی طرح جو جلد اور خاموشی کے ساتھ ہی کر گذرنے سے فائدہ مند ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امنِ عامہ کے خیال سے یہی مناسب

---

[۱] ابنِ ہشام

سمجھا کہ خاموشی کے ساتھ کعب کی سزا کا حکم جاری کر دیا جاوے مگر اس میں قطعاً کسی قسم کے دھوکے کا دخل نہ تھا اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشاء تھا کہ یہ سزا ہمیشہ کے لیے بصیغہ راز رہے کیونکہ جونہی کہ یہود کا وفد دُوسرے دن صبح آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا آپؐ نے فوراً بلا توقف انہیں ساری سرگذشت سُنا دی اور اس فعل کی پوری پوری ذمہ داری اپنے اوپر لیکر یہ ثابت کر دیا کہ اس میں کوئی دھوکے وغیرہ کا سوال نہیں ہے اور یہودیوں کو یہ بات واضح طور پر بتادی کہ فلاں فلاں خطرناک جرموں کی بناء پر کعب کے متعلق یہ سزا تجویز کی گئی تھی جو میرے حکم سے جاری کی گئی ہے اُس وفد نے آپؐ کے اس بیان کی معقولیت کو تسلیم کیا اور کعب کے جرموں کو اُس کی سزا کا کافی اور جائز باعث یقین کرتے ہوئے خاموش ہو گئے۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو جھُوٹ اور فریب کی اجازت دی۔ سو یہ بالکل غلط ہے اور صحیح روایات اُس کی مکذب ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً جھوٹ اور غلط بیانی کی اجازت نہیں دی بلکہ صحیح بخاری کی روایت کے بموجب جو اصح الروایات ہے جب محمد بن مسلمہ نے آپؐ سے یہ دریافت کیا کہ کعب کو خاموشی کے ساتھ قتل کرنے کے لیے تو کوئی بات کہنی پڑے گی تو آپ نے ان عظیم الشان فوائد کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو خاموش سزا کے محرک تھے جواب میں صرف اسقدر فرمایا کہ "ہاں" اور اس سے زیادہ اس موقعہ پر آپؐ کی طرف سے یا محمد بن مسلمہ کی طرف سے قطعاً کوئی تشریح یا توضیح نہیں ہوئی[1] اور ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ مطلب تھا کہ محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھی جو کعب کے مکان پر جاکر اُسے باہر نکال کر لائیں گے تو اس موقعہ پر انہیں لازماً کوئی ایسی بات کہنی ہوگی جس کے نتیجہ میں کعب رضامندی اور خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل کر اُن کے ساتھ آجاوے اور اس میں ہرگز کوئی قباحت نہیں ہے آخر جنگ کے دوران میں جاسوس وغیرہ جو اپنے فرائض ادا کرتے ہیں تو ان کو بھی اسی قسم کی باتیں کہنی ہی پڑتی ہے جس پر کبھی کسی عقلمند کو اعتراض نہیں ہوا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تو بہرحال پاک ہے۔ باقی رہا محمد بن مسلمہ وغیرہ کا معاملہ جنھوں نے وہاں جاکر عملاً اس قسم کی باتیں کیں۔ سو اُن کی گفتگو میں بھی درحقیقت کوئی بات خلافِ اخلاق نہیں ہے۔ انھوں نے حقیقتہً کوئی غلط بیانی نہیں کی؛ البتہ اپنے مشن کی غرض و غایت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کچھ ذو معنیین الفاظ ضرور کہے مگر ان کے بغیر چارہ نہیں تھا اور حالاتِ جنگ میں ایک اچھی اور نیک غرض کے ماتحت سادہ اور صاف گوئی کے طریق سے اس قدر خفی انحراف ہرگز کسی عقلمند دیانت دار شخص کے نزدیک قابلِ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھیوں کی یہ گفتگو اس نیک اثر کی ایک بہت عمدہ اور دلچسپ دلیل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے آپؐ کے صحابہ پر پیدا کیا تھا۔ عرب کے لوگوں کی اسلام سے قبل کیا حالت

---

[1] بخاری باب قتل کعب بن اشرف

تھی؟ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ وہ ہر قسم کے گندوں میں مبتلا تھے اور دھوکا فریب جھوٹ تو گویا ان کی فطرت کا حصہ بن چکا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قلیل صحبت نے اُن کے قلوب پر اس قدر گہرا اثر پیدا کیا کہ جھوٹ بولنا تو درکنار رہا وہ ایک نہایت اچھی اور نیک غرض کے ماتحت بھی سادہ اور صاف گوئی کے طریق سے ذرا بھر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہتے تھے؛ چنانچہ اس خطرناک موقعہ پر بھی جو کعب بن اشرف کی شرانگیزی نے پیدا کر دیا تھا۔ ان کو صاف گوئی کے راستے سے ایک نہایت خفی انحراف کرنے کے لیے بھی اپنے آقا کی اجازت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُن کے اس نمونے کے مقابلہ میں اگر یہ دیکھا جاوے کہ آج کل دُنیا میں ہر قوم و ملت میں اس جھوٹے اصول کے ماتحت کہ ایک نیک غرض کے لیے ہر کام کرنا جائز ہے کیا کچھ ظلم ڈھایا جاتا اور کیسے مظالم اور اکاذیب روا رکھے جاتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک اور معجزہ نما اثر کی دل سے تعریف نکلتی ہے جو آپ کی تربیت نے عرب کے جاہل اور وحشی لوگوں میں ایسے قلیل عرصہ میں پیدا کیا۔

کیا جنگ میں جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا جائز ہے

بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ یعنی "جنگ تو ایک دھوکا ہے۔" اور اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جنگ میں دھوکے کی اجازت تھی؛ حالانکہ اوّل تو اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جنگ میں دھوکہ کرنا جائز ہے بلکہ اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ "جنگ خود ایک دھوکا ہے۔" یعنی جنگ کے نتیجہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہوگا۔ یعنی جنگ کے نتیجہ پر اتنی مختلف باتیں اثر ڈالتی ہیں کہ خواہ کیسے ہی حالات ہوں نہیں کہہ سکتے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور ان معنوں کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ حدیث[1] میں یہ روایت دو طرح سے مروی ہوئی ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ یعنی "جنگ ایک دھوکا ہے۔" اور دوسری روایت میں یہ ہے کہ سَمّٰی الْحَرْبُ خُدْعَۃٌ "یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کا نام دھوکا رکھا تھا" اور دونوں کے ملانے سے یہ یقینی نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کا منشاء یہ نہیں تھا کہ جنگ میں دھوکا کرنا جائز ہے بلکہ یہ تھا کہ جنگ خود ایک دھوکا دینے والی چیز ہے، لیکن اگر ضرور اس کے یہی معنی کئے جائیں کہ جنگ میں دھوکا جائز ہے تو پھر بھی یقیناً اس جگہ دھوکے سے جنگی تدبیر اور حیلہ مراد ہے جھوٹ اور فریب ہرگز مُراد نہیں ہے کیونکہ اس جگہ خُدْعَۃٌ کے معنے داؤ پیچ اور تدبیر جنگ کے ہیں جھوٹ اور فریب کے نہیں ہیں۔ پس مطلب یہ ہے کہ جنگ میں اپنے دشمن کو کسی حیلہ اور تدبیر سے غافل کر کے قابو میں لے آنا یا

---

[1] بخاری کتاب الجہاد باب اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ۔

مغلوب کر لینا منع نہیں ہے اور اس قسم کے داؤ پیچ کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مہم میں نکلتے تھے تو عموماً اپنا منزل مقصود ظاہر نہیں فرماتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی کرتے تھے کہ جانا تو جنوب کی طرف ہوتا تھا مگر شروع شروع میں شمال کی طرف رُخ کر کے روانہ ہو جاتے تھے اور پھر چکر کاٹ کر جنوب کی طرف گھوم جاتے تھے یا جب کبھی کوئی شخص پوچھتا تھا کہ کدھر سے آئے ہو تو بجائے مدینہ کا نام لینے کے قریب یا دُور کے پڑاؤ کا نام لے دیتے تھے یا اسی قسم کی کوئی دوسری جائز جنگی تدبیر اختیار فرماتے تھے یا جیسا کہ قرآن شریف میں اشارہ کیا گیا ہے صحابہ بعض اوقات ایسا کرتے تھے کہ دشمن کو غافل کرنے کے لیے میدانِ جنگ سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیتے تھے اور جب دشمن غافل ہو جاتا تھا اور اس کی صفوں میں اَبتری پیدا ہو جاتی تھی تو پھر اچانک حملہ کر دیتے تھے اور یہ ساری صورتیں اس خُدعَۃٌ کی ہیں جسے حالاتِ جنگ میں جائز قرار دیا گیا ہے اور اب بھی جائز سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ کہ جھوٹ اور غداری وغیرہ سے کام لیا جاوے۔ اس سے اسلام نہایت سختی کے ساتھ منع کرتا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً فرمایا کرتے تھے کہ ”اسلام میں خدا کے ساتھ شرک کرنے اور والدین کے حقوق تلف کرنے کے بعد تیسرے نمبر پر جھوٹ بولنے کا گناہ سب سے بڑا ہے“[1] نیز فرماتے تھے کہ ایمان اور بُزدلی ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ ایمان اور بخل ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ مگر ایمان اور جھوٹ کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے[2] اور دھوکے اور غداری کے متعلق فرماتے تھے کہ ”جو شخص غداری کرتا ہے وہ قیامت کے دن خدا کے سخت عتاب کے نیچے ہوگا“[3] الغرض جنگ میں جس قسم کے خدعۃ کی اجازت دی گئی ہے وہ حقیقی دھوکا یا جھوٹ نہیں ہے بلکہ اس سے وہ جنگی تدابیر مراد ہیں جو جنگ میں دشمن کو غافل کرنے یا اُسے مغلوب کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں اور جو بعض صورتوں میں ظاہری طور پر جھوٹ اور دھوکے کے مشابہ تو سمجھی جا سکتی ہیں مگر وہ حقیقۃً جھوٹ نہیں ہوتیں، چنانچہ مندرجہ ذیل حدیث ہمارے اس خیال کی مصدق ہے:

عَنْ اُمِّ کُلْثُوْمَ بِنْتِ عُقْبَۃَ بْنِ اَبِیْ مُعَیْطٍ قَالَتْ لَمْ اَسْمَعِ النَّبِیَّ ﷺ یُرَخِّصُ فِیْ شَیْءٍ مِمَّا یَقُوْلُ النَّاسُ کِذْبٌ اِلَّا فِیْ ثَلَاثٍ اَلْحَرْبِ وَ الْاِصْلَاحِ بَیْنَ النَّاسِ وَحَدِیْثِ الرَّجُلِ اِمْرَاَتَہٗ وَحَدِیْثِ الْمَرْأَۃِ زَوْجَھَا[4]

یعنی ”اُمّ کلثوم بنت عقبہ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف تین موقعوں کے لیے ایسی باتوں کی اجازت دیتے سُنا جو حقیقۃً تو جھوٹ نہیں

---

[1] مسلم کتاب الایمان ؛ [2] موطا امام مالک باب ما جاء فی الصدق و الکذب آخر الکتاب
[3] مسلم کتاب الجہاد باب تحریم الغدر ؛ [4] مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب ما ینھی من التہاجر

ہوتیں مگر عام لوگ انہیں غلطی سے جھوٹ سمجھ سکتے ہیں۔ اوّل جنگ۔ دوّم لڑے ہوئے لوگوں کے درمیان صُلح کرانے کا موقعہ اور سوّم جبکہ مرد اپنی عورت سے یا عورت اپنے مرد سے کوئی ایسی بات کرے جس میں ایک دُوسرے کو راضی اور خوش کرنا مقصود ہو۔"

یہ حدیث اس بات میں کسی شُبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتی کہ جس قسم کے خُدعَۃ کی جنگ میں اجازت دی گئی ہے، اس سے جھوٹ اور دھوکا مراد نہیں ہے بلکہ وہ باتیں مراد ہیں جو بعض اوقات جنگی تدابیر کے طور پر اختیار کرنی ضروری ہوتی ہیں اور جو ہر قوم اور ہر مذہب میں جائز سمجھی گئی ہیں۔

کعب بن اشرف کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد ابن ہشام نے یہ روایت نقل کی ہے کہ کعب کے قتل کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اب جس یہودی پر تم قابو پاؤ اُسے قتل کر دو چنانچہ ایک صحابی محیصہ نامی نے ایک یہودی پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دیا تھا اور یہی روایت ابوداؤد[1] نے نقل کی ہے اور دونوں روایتوں کا منبع ابن اسحاق ہے۔ علمِ روایت کی رُو سے یہ روایت کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہے کیونکہ ابن ہشام نے تو اسے بغیر کسی قسم کی سند کے لکھا ہے اور ابوداؤد نے جو سند دی ہے وہ کمزور اور ناقص ہے۔ اس سند میں ابن اسحاق یہ بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے یہ واقعہ زید بن ثابت کے ایک آزاد کردہ غلام سے سُنا تھا اور اس نامعلوم الاسم غلام نے محیصہ کی ایک نامعلوم الاسم لڑکی سے سُنا تھا اور اس لڑکی نے اپنے باپ سے سُنا تھا۔[2] اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کی روایت جس کے دو راوی بالکل نامعلوم الاسم اور مجہول الحال ہوں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی اور درایت کے لحاظ سے بھی غور کیا جاوے تو یہ قصہ درست ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طریق عمل اس بات کو قطعی طور پر جھٹلاتا ہے کہ آپؐ نے اس قسم کا عام حکم دیا ہو۔ علاوہ ازیں اگر کوئی عام حکم ہوتا تو یقیناً اس کے نتیجہ میں کئی قتل واقع ہو جاتے مگر روایت میں صرف ایک قتل کا ذکر ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی عام حکم نہیں تھا اور پھر جب صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ دُوسرے دن ہی یہود کے ساتھ نیا معاہدہ ہو گیا تھا تو اس صورت میں یہ ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا کہ اس معاہدہ کے ہوتے ہوئے اس قسم کا حکم دیا گیا ہو اور اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا تو یہودی لوگ اس کے متعلق ضرور واویلا کرتے، مگر کسی تاریخی روایت سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہود کی طرف سے کبھی کوئی اس قسم کی شکایت کی گئی ہو۔ پس روایت اور درایت دونوں طرح سے یہ قصہ غلط ثابت ہوتا ہے اور اگر اس میں کچھ حقیقت بھی سمجھی جا سکتی ہے تو صرف اس قدر کہ جب کعب بن اشرف کے قتل کے بعد مدینہ میں ایک شور پیدا ہوا اور یہودی لوگ جوش میں آ گئے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کی طرف سے خطرہ محسوس کر کے صحابہ سے یہ فرمایا ہو گا کہ جس یہودی کی طرف سے تمہیں خطرہ

---

[1] : سنن ابوداؤد کتاب الخراج ۔
[2] : ابوداؤد و ابن سعد ۔

ہو اور تم پر حملہ کرے تم اسے دفاع میں قتل کر سکتے ہو، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالت صرف چند گھنٹے رہی تھی۔ کیونکہ دُوسرے دن ہی یہود کے ساتھ از سرِ نو معاہدہ ہو کر امن وامان کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ واللہ اعلم

کعب بن اشرف کے قتل کی تاریخ کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے۔ ابن سعد نے اسے ربیع الاوّل ۳ھ ہجری میں بیان کیا ہے، لیکن ابن ہشام نے اسے سریہ زید بن حارثہ کے بعد رکھا ہے جو مسلّم طور پر جمادی الآخرۃ میں واقع ہوا تھا۔ مَیں نے اس جگہ ابن ہشام کی ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔

حفصہؓ بنت عمرؓ کی شادی شعبان ۳ھ

حضرت عمرؓ بن خطاب کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام حفصہ تھا، وہ خنیس بن حذافہ کے عقد میں تھیں جو ایک مخلص صحابی تھے اور جنگِ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ بدر کے بعد مدینہ واپس آنے پر خنیس بیمار ہو گئے اور اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکے[1] ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد حضرت عمرؓ کو حفصہ کے نکاح ثانی کا فکر دامنگیر ہوا۔ اس وقت حفصہ کی عمر بیس سال سے اُوپر تھی[2] حضرت عمرؓ نے اپنی فطرتی سادگی میں خود عثمان بن عفان سے ملکر ان سے ذکر کیا کہ میری لڑکی حفصہ اب بیوہ ہے، آپ اگر پسند کریں تو اس کے ساتھ شادی کر لیں، مگر حضرت عثمان نے ٹال دیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ذکر کیا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے بھی خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہیں دیا[3] اس پر حضرت عمرؓ کو بہت ملال ہوا اور انھوں نے اسی ملال کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ سے ساری سرگزشت عرض کر دی۔ آپؐ نے فرمایا۔ عمرؓ کچھ فکر نہ کرو۔ خدا کو منظور ہوا تو حفصہ کو عثمان وابوبکر کی نسبت بہتر خاوند مل جائے گا اور عثمان کو حفصہ کی نسبت بہتر بیوی ملے گی[4] یہ آپؐ نے اس لیے فرمایا کہ آپؐ حفصہ کے ساتھ شادی کر لینے اور اپنی لڑکی اُمّ کلثوم کو حضرت عثمان کے ساتھ بیاہ کر دینے کا ارادہ کر چکے تھے جس سے حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان دونوں کو اطلاع تھی اور اسی لیے انھوں نے حضرت عمر کی تجویز کو ٹال دیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان سے اپنی صاحبزادی اُمّ کلثوم کی شادی فرما دی جس کا اوپر ذکر گذر چکا ہے اور اس کے بعد آپؐ نے خود اپنی طرف سے حضرت عمر کو حفصہ کے لیے پیغام بھیجا۔ حضرت عمرؓ کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے تھا۔ انھوں نے نہایت خوشی سے اس رشتہ کو قبول کیا[5] اور شعبان ۳ھ میں حضرت حفصہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آکر حرمِ نبوئی میں داخل ہو گئیں[6] جب یہ رشتہ ہو گیا تو حضرت ابوبکر نے حضرت عمر سے کہا کہ

---

[1] اصابہ وزرقانی [2] اصابہ وزرقانی حالات حفصہؓ

[3] بخاری کتاب النکاح باب عرض الانسان ابنتہ [4] زرقانی حالات حفصہؓ [5] بخاری کتاب النکاح

[6] طبری حالات ۳ھ

شاید آپ کے دل میں میری طرف سے کوئی ملال ہو۔ بات یہ ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے سے اطلاع تھی، لیکن مَیں آپؐ کی اجازت کے بغیر آپؐ کے راز کو ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ ہاں اگر آپؐ کا یہ ارادہ نہ ہوتا تو مَیں بڑی خوشی سے حفصہ سے شادی کر لیتا۔[1]

حفصہ کے نکاح میں ایک تو یہ خاص مصلحت تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں جو گویا حضرت ابوبکرؓ کے بعد تمام صحابہ میں افضل ترین سمجھے جاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقربین خاص میں سے تھے۔ پس آپس کے تعلقات کو زیادہ مضبوط کرنے اور حضرت عمرؓ اور حفصہ کے اس صدمہ کی تلافی کرنے کے واسطے جو خنیس بن حذافہ کی بے وقت موت سے ان کو پہنچا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ حفصہ سے خود شادی فرمالیں اور دُوسری عام مصلحت یہ مدنظر تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی زیادہ بیویاں ہوں گی اتنا ہی عورتوں میں جو بنی نوع انسان کا نصف حصہ بلکہ بعض جہات سے نصف بہتر حصہ ہیں دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا کام زیادہ وسیع پیمانے پر اور زیادہ آسانی اور زیادہ خُوبی کے ساتھ ہو سکے گا۔

تعدد ازدواج کے مسئلہ کے متعلق اصولی بحث ہم حضرت عائشہؓ کی شادی کے بیان میں کرچکے ہیں۔ اجگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں لیکن اس قدر ذکر اس جگہ بے موقعہ نہ ہوگا کہ جو پابندیاں تعدد ازدواج کے متعلق اسلام عائد کرتا ہے اور جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود عملاً کاربند تھے ان کے ماتحت ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ شادی کرنا ہرگز عیش و عشرت کا ذریعہ نہیں بن سکتا بلکہ حق یہ ہے کہ ان شرائط کے ماتحت تعدد ازدواج ایک بہت بڑی قربانی ہے جو مرد اور عورت دونوں کو اپنے ذاتی یا خاندانی یا قومی یا ملکی یا دینی مصالح کے ماتحت اختیار کرنی پڑتی ہے اور اس قربانی کو اختیار کرنے والا شخص خانگی عیش و عشرت اور خانگی راحت و خوشی سے اس شخص کی نسبت بہت زیادہ دُور ہوتا ہے جس کے مال اور جس کی توجہ اور جس کے وقت اور جس کی ظاہری محبت کی مالک صرف ایک عورت ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جو شخص عیش و عشرت کے خیال سے زیادہ شادیاں کرتا ہے، وہ لازماً اپنی بیویوں کی خوراک اور پوشش اور رہائش وغیرہ کا خاص خیال رکھتا ہے اور ان کے لیے ہر طرح کا سامان عیش و عشرت مہیا کرتا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بالکل اس کے خلاف نظارہ نظر آتا ہے۔ دُور نہ جاؤ قرآن ہی کو کھول کر دیکھو کہ جو مسلّم طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح میں صحیح ترین صحیفہ ہے کہ ایک موقعہ پر جبکہ باہر سے اموال کی آمد آمد شروع ہوگئی تھی اور صحابہ کسی قدر خوشحال ہو رہے تھے آپؐ کی بیویوں نے آپؐ سے عرض کیا کہ اب اس فراخی سے کچھ حصہ ہمیں بھی ملنا چاہئیے اور اب تک جو تنگی کے دن کاٹے ہیں اس کا

---

[1] بخاری کتاب النکاح۔

کچھ ازالہ ہونا چاہیئے تو اس پر آپ نے فرمایا:

إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيْمًا [1]

یعنی" اگر تم دُنیا کی زندگی اور اس کے مال و متاع کو پسند کرتی ہو تو آؤ میں تمہیں دُنیا کے اموال دیئے دیتا ہوں، مگر اس صورت میں تم میری بیویاں نہیں رہ سکتیں (کیونکہ میں اپنی زندگی کو دُنیا کے اموال کی آلائش سے پاک رکھنا چاہتا ہوں) اور اگر میری بیویاں رہنا چاہتی ہو تو محض خدا کی خاطر اور میرے منصب رسالت کی خاطر اور آخرت کی خاطر میرے ساتھ رہو۔ اُس صورت میں تم کو خدا کی طرف سے وُہ عظیم الشان اجر ملے گا جو نیکو کاروں کے لیے مقدر ہے۔"

آپؐ کے اس فرمان کو سُنکر سب ازواج نے بالاتفاق عرض کیا کہ ہمیں خدا اور اُس کا رسول بس ہیں۔ دُنیا کے اموال درکار نہیں[2]۔ کیا اس زبردست تاریخی شہادت کے ہوتے ہوئے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعدد ازدواج نعوذ باللہ عیش و عشرت کا ذریعہ تھا؟ یقیناً یقیناً ہر نئی بیوی جو آپؐ کے گھر آتی تھی وُہ آپؐ کی خانگی تنگی کو زیادہ کرنے والی ہوتی تھی اور یہ آپؐ کی عظیم الشان قربانی کی رُوح تھی جس کی وجہ سے آپؐ نے اپنے دین اور اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر ان تنگیوں کو خوشی کے ساتھ برداشت کیا اور اپنی زندگی کے امن اور قرار کو برباد کر کے ایک بالکل درویشانہ اور مسافرانہ زندگی اختیار کی۔

آپؐ کے پیش کردہ مسئلہ تعدد ازدواج میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اس سے وہ علائق کمزور ہو جائیں جو دُنیا میں انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دُنیا میں انسان کے بہت سے تعلقات ہیں جنکو اسے نبھانا پڑتا ہے۔ مثلاً والدین ہیں۔ بھائی بہن ہیں۔ بیوی ہے۔ اولاد ہے۔ دوست ہیں۔ ہمسائے ہیں۔ وغیر ذالک۔ اور ان سارے علائق میں سے جذباتی رنگ میں سب سے زیادہ گرم جوشی اور حدت حِس کا رشتہ بیوی کا رشتہ ہے۔ مرد کی محبت اپنی بیوی سے بعض اوقات ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے جسے عرفِ عام میں عشق کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور بعض اوقات جذبات کی تیزی اس عشق کو ایک گونہ جنون کی حد تک بھی پہنچا دیتی ہے اور پھر ایسی حالت میں انسان سوائے اس عشق کے مظاہرے میں زندگی گذارنے کے اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ حالانکہ یہ مسلّم ہے کہ دُنیا کی زندگی کے بہترین کام وہ ہیں جو انفرادی زندگی کے ساتھ نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ پس چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان کے اندر ان فرائض کے پورا کرنے کے

---

[1] سورۃ احزاب: ۲۹، ۳۰
[2] بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ احزاب

لیے بہترین قابلیت پیدا کرنا چاہتے تھے جو بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اس لیے آپ نے بعض حالات میں خاص شرائط کے ماتحت تعددِ ازدواج کی اجازت دیکر مرد اور عورت کے اس رشتے کو ایسی صورت دیدی کہ اس کے اندر محویت کا عالم نہ پیدا ہو سکے۔ اور اس اصل کے ماتحت آپ کا تعددِ ازدواج پر عمل کرنا علائقِ خانگی کو کمزور کرنے کی غرض سے تھا نہ کہ انہیں مضبوط کرنے کے واسطے؛ چنانچہ آپ کا وہ جواب جو آپ نے اپنی بیویوں کو اُن کی طرف سے مال کا مطالبہ ہونے پر دیا اس پر شاہد ہے اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ آپ نہ صرف خود اپنی توجہ کو خدا کے لیے اور اپنے منصبِ رسالت کے لیے وقف رکھنا چاہتے تھے بلکہ اپنی بیویوں کے متعلق بھی آپ کے دل میں یہی خواہش تھی کہ ان کا آپ کے ساتھ تعلق محض خدا کے لیے اور آپ کے منصبِ رسالت کے لیے اور آخرت کے لیے ہو الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعددِ ازدواج دینی اور قومی اور ملکی مفاد کے ماتحت تھا اور ان حالات میں یقیناً یہ ایک شخصی مفاد کی بہت بڑی قربانی تھی جو آپ نے اختیار کی کیونکہ آپ نے اپنی خانگی زندگی میں ایک سخت درجہ تلخی اور تنگی پیدا کر کے اپنے ان فرائض کے انجام دینے کے لیے آسانی پیدا کی جو ایک شارع اور دینی مصلح اور لیڈر کی حیثیت میں آپ پر عائد ہوتے تھے اور اس لیے آپ کا یہ فعل ہر اس شخص کے شکریہ کا مستحق ہے جو جنگل کے وحشی جانوروں کی طرح صرف اپنی جسمانی خواہشات اور شخصی اور انفرادی مفاد کا خیال نہیں رکھتا بلکہ اخلاقی اور رُوحانی اور قومی اور اجتماعی زندگی کی اصلاح اور ترقی کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔

حضرت حفصہؓ کی عمر شادی کے وقت قریباً اکیس سال تھی اور بوجہ اس کے کہ حضرت عائشہؓ کے بعد وہ صحابہ میں سے ایک افضل ترین شخص کی صاحبزادی تھیں۔ ازواجِ مطہرات میں ان کا ایک خاص درجہ سمجھا جاتا ہے اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ بھی اُن کا بہت جوڑ تھا اور سوائے کبھی کبھار کی کش مکش کے جو ایسے رشتہ میں ہو جایا کرتی ہے، وہ دونوں آپس میں بہت محبت کے ساتھ رہتی تھیں۔ حضرت حفصہؓ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، چنانچہ حدیث میں ایک روایت آتی ہے کہ انھوں نے ایک صحابی عورت شفاء بنت عبداللہ سے لکھنا سیکھا تھا۔[1] اُن کی وفات ۴۵ھ ہجری میں ہوئی جبکہ اُن کی عمر کم و بیش تریسٹھ سال کی تھی۔

ولادتِ امام حسنؓ رمضان ۳ھ

۲ ہجری کے واقعات میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے نکاح کا ذکر گذر چکا ہے۔ ان کے ہاں رمضان ۳ ہجری میں یعنی نکاح کے قریباً دس ماہ بعد ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنؓ رکھا۔ یہ وہی حسنؓ ہیں جو بعد میں مسلمانوں میں امام حسن علیہ الرحمۃ کے نام سے ملقب ہوئے۔ حسنؓ اپنی شکل و صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ملتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح اپنی اولاد حضرت فاطمہ سے بہت محبت تھی اسی

---

[1] ابوداؤد کتاب الطب باب ماجاء فی الرقی

طرح حضرت فاطمہ کی اولاد سے بھی آپؐ کو خاص محبت تھی۔ کئی دفعہ فرماتے تھے۔ خدایا مجھے ان بچوں سے محبت ہے تو بھی ان سے محبت کر اور ان سے محبت کرنیوالوں سے محبت کر۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ نماز میں ہوتے تو حسنؓ آپؐ سے لپٹ جاتے۔ رکوع میں ہوتے تو آپؐ کی ٹانگوں میں سے راستہ بنا کر نکل جاتے۔ بعض اوقات جب صحابہ انہیں روکتے تو آپؐ صحابہ کو منع فرما دیتے کہ روکو نہیں۔ دراصل چونکہ اُن کا لپٹنا آپؐ کی توجہ کو منتشر نہیں کرتا تھا۔ اس لیے آپ اُن کی معصوم محبت کے طفلانہ مظاہرہ میں مزاحم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ امام حسنؓ کے متعلق ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ میرا یہ بچہ سید یعنی سردار ہے اور ایک وقت آئیگا کہ خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا۔ چنانچہ اپنے وقت پر یہ پیشگوئی پوری ہوئی[1]

---

[1] استیعاب و اصابہ و اسد الغابہ و بخاری

ایک مصیبت کا دھکّہ • قانون وِرثہ • حُرمتِ شراب • کفّار کی غدّاری • اور دو دردناک واقعات

جنگِ اُحد، شوال ۳ھ مطابق مارچ ۶۲۴ء

جنگِ بدر کے نتیجے میں جو ماتمِ عظیم مکّہ میں بَرپا ہوا تھا اس کا ذکر جنگِ بدر کے حالات میں کیا جا چکا ہے۔ سردارانِ قریش نے قسمیں کھائی تھیں کہ جب تک مقتولینِ بدر کا انتقام نہ لیں گے اسوقت تک چین نہ لیں گے۔ اُن کے اِس جذبۂ انتقام کو مدینہ کے بدعہد یہود کی خفیہ اشتعال انگیزیوں نے اور بھی زیادہ بھڑکا دیا تھا؛ چنانچہ بدر کے بعد قریشِ مکّہ نے دُوسرے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بہت سخت اکسانا شروع کر دیا اور خود بھی برابر اس تاک میں رہے کہ جب بھی موقعہ ملے مسلمانوں پر حملہ کر کے انہیں کچل ڈالیں۔ بنوسلیم اور بنو غطفان کا مدینہ پر حملہ آور ہونے کی غرض سے بار بار جمع ہونا جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے زیادہ تر قریشِ مکّہ ہی کی اشتعال انگیزیوں کا نتیجہ تھا۔ غزوہ سویق بھی جس میں ابوسفیان نے مدینہ پر شبخون مارنے کی تجویز کی تھی اسی زنجیر کی ایک کڑی تھی اور چونکہ خدا کے فضل سے اس غزوہ میں قریش کو ذِلّت کا مُنہ دیکھنا پڑا تھا، اس لیے اُن کا جوشِ انتقام اور بھی زیادہ ہو گیا تھا اور گو اس وقت انہوں نے عرب کے سامنے اپنی عزت رکھنے کے لیے یہ کہہ دیا تھا کہ ہماری قسم پُوری ہو گئی ہے، لیکن ان کے دل اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ غزوہ سویق نے ان کے ماتھے پر ذِلّت کا ایک اور دھبّہ لگا دیا تھا۔ لہٰذا اس کے بعد اُنھوں نے آگے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ جنگ کی تیاری شروع کی؛ چنانچہ غزوۂ اُحد جس کا ہم اب ذکر کرنے لگے ہیں اسی تیاری کا نتیجہ تھا۔

جس تجارتی قافلہ کا ذکر جنگِ بدر کے حالات میں گذر چکا ہے اس کے منافع کا روپیہ جس کی مالیت پچاس ہزار دینار تھی[1] رؤسائے مکّہ کے فیصلہ کے مطابق ابھی تک دارالندوہ میں مسلمانوں کے خلاف حملہ

---

[1] ابن سعد

کرنے کی تیاری کے واسطے محفوظ پڑا تھا[1] اب اس روپے کو نکالا گیا اور بڑے زور شور سے جنگ کی تیاری شروع ہوئی[2] مسلمانوں کو اس تیاری کا علم بھی نہ ہوتا اور لشکرِ کفار مسلمانوں کے دروازوں پر پہنچ جاتا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیدار مغزی نے تمام ضروری احتیاطیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یعنی آپؐ نے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کو جو دل میں آپؐ کے ساتھ تھے مکہ میں ٹھہرے رہنے کی تاکید کر رکھی تھی اور وہ قریش کی حرکات و سکنات سے آپؐ کو اطلاع دیتے رہتے تھے[3] چنانچہ عباس بن عبدالمطلب نے اس موقعہ پر بھی قبیلہ بنو غفار کے ایک تیز رو سوار کو بڑے انعام کا وعدہ دے کر مدینہ کی طرف روانہ کیا اور ایک خط کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے اس ارادے سے اطلاع دی[4] اور اس قاصد کو سخت تاکید کی کہ تین دن کے اندر اندر آپ کو یہ خط پہنچا دے۔ جب یہ قاصد مدینہ پہنچا تو اتفاق سے اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے حوالی قبا میں تشریف لے گئے ہوئے تھے؛ چنانچہ یہ قاصد آپؐ کے پیچھے وہیں قبا میں پہنچا۔ اور آپؐ کے سامنے یہ بند خط پیش کر دیا۔ آپؐ نے فوراً اپنے کاتب خاص اُبَیّ بن کعب انصاری کو یہ خط دیا اور فرمایا کہ اسے پڑھ کر سناؤ کہ کیا لکھا ہے اُبیؓ نے خط پڑھ کر سنایا تو اس میں یہ وحشت ناک خبر درج تھی کہ قریش کا ایک جرار لشکر مکہ سے آرہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خط سنکر اُبَیّ بن کعب کو تاکید فرمائی کہ اس کے مضمون سے کسی کو اطلاع نہ ہو[5] اور پھر آپؐ نے مدینہ میں واپس تشریف لا کر اپنے دو صحابیوں کو لشکرِ قریش کی خبر رسانی کے لیے مکہ کے راستہ کی طرف روانہ فرما دیا۔ غالباً اسی موقعہ پر آپ نے مسلمانوں کی تعداد و طاقت معلوم کرنے کے لیے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مدینہ کی تمام مسلمان آبادی کی مردم شماری کی جاوے چنانچہ مردم شماری کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک کل پندرہ سو مسلمان مُتنفس ہیں۔ اس وقت کے حالات کے ماتحت اسی تعداد کو بہت بڑی تعداد سمجھا گیا؛ چنانچہ بعض صحابہ نے تو اس وقت خوشی کے جوش میں یہاں تک کہدیا کہ کیا اب بھی جبکہ ہماری تعداد ڈیڑھ ہزار تک پہنچ گئی ہے ہمیں کسی کا ڈر ہو سکتا ہے؟ مگر انہی میں سے ایک صحابی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم پر ایسے ایسے سخت وقت آئے کہ بعض اوقات ہمیں نماز بھی چھُپ کر ادا کرنی پڑتی تھی[6] ایک موقعہ پر اس سے پہلے بھی آپؐ نے مسلمانوں کی مردم شماری کروائی تھی تو اس وقت چھ اور سات سو کے درمیان تعداد نکلی تھی[7]

غالباً رمضان ۳ہجری کے آخر یا شوال کے شروع میں قریش کا لشکر مکہ سے نکلا۔ لشکر میں دوسرے قبائل عرب کے بہت سے بہادر بھی شامل تھے[8] ابوسفیان سردارِ لشکر تھا۔ لشکر کی تعداد تین ہزار

---

[1] ابن سعد [2] ابن سعد و ابن ہشام [3] زرقانی جلد ا صفحہ ۴۴۸ [4] ابن سعد [5] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۱
[6] بخاری کتاب الجہاد باب کتابۃ الامام و فتح الباری شرح حدیث مذکور [7] مسلم کتاب الایمان باب جواز الاستسرار للخائف۔ [8] ابن ہشام۔

تھی جس میں سات سَو زرہ پوش سپاہی تھے۔ سواری کا سامان بھی کافی تھا۔ یعنی دو سو گھوڑے اور تین ہزار اُونٹ تھے[1] اور سامانِ حرب بھی کافی وشافی مقدار میں تھا۔ عورتیں بھی ساتھ تھیں جن میں ہند زوجہ تھی جس میں سات سو زرہ پوش سپاہی تھے۔ سواری کا سامان بھی کافی تھا۔ عورتیں بھی ساتھ تھیں جن میں ہند زوجہ ابوسفیان۔ عکرمہ بن ابوجہل۔ صفوان بن امیہ۔ خالد بن ولید اور عمرو ابن العاص کی بیویاں اور مصعب بن عمیر صحابی کی مشرکہ ماں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[2]۔ یہ عورتیں عرب کی قدیم رسم کے مطابق گانے بجانے کا سامان اپنے ساتھ لائی تھیں تا اشتعال انگیز اشعار گا کر اور دفیں بجا کر اپنے مردوں کو جوش دلاتی رہیں۔

قریش کا یہ لشکر دس گیارہ دن کے سفر کے بعد مدینہ کے پاس پہنچا اور چکر کاٹ کر مدینہ کے شمال کی طرف اُحد کی پہاڑی کے پاس ٹھہر گیا۔ اس جگہ کے قریب ہی عریض کا سرسبز میدان تھا جہاں مدینہ کے مویشی چرا کرتے تھے اور کچھ کھیتی باڑی بھی ہوتی تھی۔ قریش نے سب سے پہلے اس چراگاہ پر حملہ کر کے اُس میں مَن مانی غارت مچائی[3]۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مخبروں سے لشکرِ قریش کے قریب آجانے کی اطلاع موصول ہوئی تو آپؐ نے اپنے ایک صحابی حباب بن منذر کو روانہ فرمایا کہ وہ جا کر دشمن کی تعداد اور طاقت کا پتہ لائیں[4] اور آپؐ نے انہیں تاکید فرمائی کہ اگر دشمن کی طاقت زیادہ ہو اور مسلمانوں کے لیے خطرہ کی صورت ہو تو واپس آکر مجلس میں اس کا ذکر نہ کریں بلکہ علیحدگی میں اطلاع دیں تاکہ اس سے کسی قسم کی بددلی نہ پھیلے۔ حباب خفیہ خفیہ گئے اور نہایت ہوشیاری سے تھوڑی دیر میں ہی واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سارے حالات عرض کر دیئے[5]۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور اب لشکرِ قریش کی آمد کی خبر مدینہ میں پھیل چکی تھی اور عریض پر جو اُن کا حملہ ہوا تھا اس کی اطلاع بھی عام ہو چکی تھی اور گو عامۃ الناس کو لشکرِ کفار کے تفصیلی حالات کا علم نہیں دیا گیا تھا، مگر پھر بھی یہ رات مدینہ میں سخت خوف اور خطرہ کی حالت میں گذری۔ خاص خاص صحابہ نے ساری رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے اردگرد پہرہ دیا[6]۔ صبح جمعہ کا دن تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جمع کر کے اُن سے قریش کے اس حملہ کے متعلق مشورہ مانگا کہ آیا مدینہ میں ہی ٹھہرا جاوے یا باہر نکل کر مقابلہ کیا جاوے[7]۔ اس مشورہ میں عبداللہ بن اُبی بن سلول بھی شریک تھا جو دراصل تو منافق تھا، مگر بدر کے بعد بظاہر مسلمان ہو چکا تھا اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مشورہ میں شرکت کی دعوت دی۔ مشورہ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے حملے اور اُن کے خونی ارادوں کا ذکر فرمایا اور فرمایا کہ "آج رات مَیں نے خواب میں ایک گائے دیکھی ہے اور نیز مَیں نے دیکھا کہ میری تلوار کا سرٹوٹ گیا ہے[8] اور پھر مَیں نے دیکھا کہ وہ گائے ذبح کی جا رہی ہے اور مَیں نے دیکھا کہ مَیں نے اپنا ہاتھ ایک محفوظ اور مضبوط زرہ کے اندر ڈالا ہے[9]۔ اور ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہوا ہے کہ آپؐ نے

---

[1] ابن سعد [2] ابن سعد و ابن ہشام [3] ابن ہشام [4] ابن سعد [5] ابن سعد [6] واقدی [7] ابن سعد
[8] بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب باب وامرھم شوریٰ [9] بخاری حالات اُحد [10] ابن ہشام۔

فرمایا کہ "مَیں نے دیکھا ہے کہ ایک مینڈھا ہے جس کی پیٹھ پر مَیں سوار ہوں"[1] صحابہ نے دریافت کیا۔ یارسول اللہ! آپؐ نے اس خواب کی کیا تعبیر فرمائی ہے؟ آپؐ نے فرمایا "گائے کے ذبح ہونے سے تو مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے صحابہ میں سے بعض کا شہید ہونا مُراد ہے اور میری تلوار کے کنارے کے ٹوٹنے سے میرے عزیزوں میں سے کسی کی شہادت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے[2] یا شاید خود مجھے اس مہم میں کوئی تکلیف پہنچے[3] اور زرہ کے اندر ہاتھ ڈالنے سے مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ اس حملہ کے مقابلہ کے لیے ہمارا مدینہ کے اندر ٹھہرنا زیادہ مناسب ہے"[4] اور مینڈھے پر سوار ہونے والے خواب کی آپؐ نے یہ تاویل فرمائی کہ اس سے کفار کے لشکر کا سردار یعنی علمبردار مراد ہے جو انشاء اللہ مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔[5] اس کے بعد آپؐ نے صحابہ سے مشورہ طلب فرمایا کہ موجودہ صورت میں کیا کرنا چاہیئے۔ بعض اکابر صحابہ نے حالات کے اُونچ نیچ کو سوچ کر اور شاید کسی قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب سے بھی متاثر ہو کر یہ رائے دی کہ مدینہ میں ہی ٹھہر کر مقابلہ کرنا مناسب ہے یہی رائے عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس المنافقین نے دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی رائے کو پسند فرمایا اور کہا کہ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم مدینہ کے اندر رہ کر ان کا مقابلہ کریں، لیکن اکثر صحابہ نے اور خصوصاً ان نوجوانوں نے جو بدر کی جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے اور اپنی شہادت سے خدمتِ دین کا موقعہ حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے بڑے اصرار کے ساتھ عرض کیا کہ شہر سے باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرنا چاہیئے[6] ان لوگوں نے اس قدر اصرار کے ساتھ اپنی رائے کو پیش کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوش کو دیکھ کر ان کی بات مان لی اور فیصلہ فرمایا کہ ہم کھلے میدان میں نکل کر کفار کا مقابلہ کریں گے اور پھر جمعہ کی نماز کے بعد آپؐ نے مسلمانوں میں عام تحریک فرمائی کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے اس غزوہ میں شامل ہو کر ثواب حاصل کریں۔ اس کے بعد آپؐ اندرون خانہ تشریف لے گئے جہاں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مدد سے آپؐ نے عمامہ باندھا اور لباس پہنا اور پھر ہتھیار لگا کر اللہ کا نام لیتے ہوئے باہر تشریف لے آئے۔ لیکن اتنے عرصہ میں حضرت سعد بن معاذ رئیس قبیلہ اوس اور دُوسرے اکابر صحابہ کے سمجھانے سے نوجوان پارٹی کو اپنی غلطی محسوس ہونے لگی تھی کہ رسُول خدا کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے تھا اور اب اکثر ان میں سے پشیمانی کی طرف مائل تھے۔

جب ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہتھیار لگائے اور دُوہری زرہ اور خود وغیرہ پہنے ہوئے تشریف لاتے دیکھا تو اُن کی ندامت اور بھی زیادہ ہوگئی اور انھوں نے قریباً یک زبان ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم نے آپؐ کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پر اصرار کیا۔ آپؐ جس طرح مناسب خیال فرماتے ہیں اُسی طرح کارروائی فرمائیں۔ انشاء اللہ اُسی میں برکت ہوگی[7] آپؐ نے فرمایا۔

---

[1] ابن ہشام [2] ابن سعد [3] ابن ہشام [4] ابن سعد
[5] زرقانی و ابنِ سعد [6] ابنِ ہشام و ابن سعد [7] ابن سعد و زرقانی

"خدا کے نبی کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ہتھیار لگا کر پھر اُسے اُتار دے قبل اس کے کہ خدا کوئی فیصلہ کر دے۔[1]
پس اب اللہ کا نام لیکر چلو اور اگر تم نے صبر سے کام لیا تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہارے ساتھ ہوگی"[2] اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلامی کے تین جھنڈے تیار کروائے۔ قبیلہ اوس کا جھنڈا اسید بن الحضیر کے سپرد کیا گیا اور قبیلہ خزرج کا جھنڈا حباب بن منذر کے ہاتھ میں دیا گیا اور مہاجرین کا جھنڈا حضرت علی کو دیا گیا اور پھر مدینہ میں عبداللہ بن ام مکتوم کو امام الصلوٰۃ مقرر کر کے آپؐ صحابہ کی ایک بڑی جماعت کے ہمراہ نمازِ عصر کے بعد مدینہ سے نکلے۔ قبیلہ اوس اور خزرج کے رؤساء سعد بن معاذ اور سعد بن عبادۃ آپ کی سواری کے سامنے آہستہ آہستہ دوڑتے جاتے تھے اور باقی صحابہ آپؐ کے دائیں اور بائیں اور پیچھے چل رہے تھے۔[3]
اُحد کا پہاڑ مدینہ سے شمال کی طرف قریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کے نصف میں پہنچ کر اس مقام میں جسے شیخین کہتے ہیں آپؐ نے قیام فرمایا اور لشکرِ اسلامی کا جائزہ لیے جانے کا حکم دیا۔ کم عمر بچے جو جہاد کے شوق میں ساتھ آگئے تھے واپس کئے گئے۔[4] چنانچہ عبداللہ بن عمر۔ اسامہ بن زید۔ ابوسعید خدری وغیرہ سب واپس کئے گئے۔ رافع بن خدیج انہیں بچوں کے ہم عمر تھے مگر تیراندازی میں اچھی مہارت رکھتے تھے انکی اس خوبی کی وجہ سے اُن کے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کی سفارش کی کہ ان کو شریکِ جہاد ہونے کی اجازت دی جاوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رافع کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ سپاہیوں کی طرح خوب تن کر کھڑے ہو گئے تاکہ چست اور لمبے نظر آئیں؛ چنانچہ اُن کا یہ داؤ چل گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ساتھ چلنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ اس پر ایک اور بچہ سمرۃ بن جندب نامی جسے واپسی کا حکم مل چکا تھا اپنے باپ کے پاس گیا اور کہا کہ اگر رافع کو لیا گیا ہے تو مجھے بھی اجازت ملنی چاہیئے۔ کیونکہ میں رافع سے مضبوط ہوں اور اُسے کشتی میں گرا لیتا ہوں۔ باپ کو بیٹے کے اس اخلاص پر بہت خوشی ہوئی اور وہ اُسے ساتھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے بیٹے کی خواہش بیان کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ اچھا رافع اور سمرۃ کی کشتی کرواؤ تاکہ معلوم ہو کہ کون زیادہ مضبوط ہے؛ چنانچہ مقابلہ ہوا اور واقع میں سمرۃ نے پل بھر میں رافع کو اُٹھا کر دے مارا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمرۃ کو بھی ساتھ چلنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس معصوم بچے کا دل خوش ہو گیا۔[5] اب چونکہ شام ہو چکی تھی اس لیے بلال نے اذان کہی اور سب صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز ادا کی اور پھر رات کے واسطے مسلمانوں نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے پہرے کے لئے محمد بن مسلمہ کو منتظم مقرر فرمایا جنھوں نے پچاس صحابہ کی جماعت کے

---

[1] بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب باب امرھم شوریٰ [2] ابن سعد [3] ابن سعد و طبری [4] ابن سعد
[5] ابن ہشام و طبری ؛

ساتھ رات بھر لشکرِ اسلامی کے ارد گرد چکر لگاتے ہوئے پہرہ دیا۔[1]

دوسرے دن یعنی ۱۵ شوال ۳ھ ہجری[2] مطابق ۳۱ مارچ ۶۲۴ء[3] بروز ہفتہ سحری کے وقت لشکرِ اسلامی آگے بڑھا اور راستے میں نماز ادا کرتے ہوئے صبح ہوتے ہی اُحد کے دامن میں پہنچ گیا۔ اس موقعہ پر بدباطن عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس المنافقین نے غداری کی اور اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ مسلمانوں کے لشکر سے ہٹ کر یہ کہتا ہوا مدینہ کی طرف واپس لوٹ گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بات نہیں مانی اور ناتجربہ کار نوجوانوں کے کہنے میں آکر باہر نکل آئے ہیں، اس لیے میں ان کے ساتھ ہو کر نہیں لڑ سکتا۔ بعض لوگوں نے بطور خود اُسے سمجھایا بھی کہ یہ غداری ٹھیک نہیں ہے، مگر اس نے ایک نہ سُنی اور یہی کہتا گیا کہ یہ کوئی لڑائی ہوتی تو میں بھی شامل ہوتا۔ مگر یہ کوئی لڑائی نہیں ہے بلکہ خود ہلاکت کے مُنہ میں جانا ہے۔[4] اب اسلامی لشکر کی تعداد صرف سات سو نفوس پر مشتمل تھی۔ جو کفار کے تین ہزار سپاہیوں کے مقابلہ میں ایک چہارم سے بھی کم تھی اور سواری اور سامان حرب کے لحاظ سے بھی اسلامی لشکر قریش کے مقابلہ میں بالکل کمزور اور حقیر تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی فوج میں صرف ایک سو زرہ پوش اور فقط دو گھوڑے تھے۔[5] اس کے بالمقابل کفار کے لشکر میں سات سو زرہ پوش اور دو سو گھوڑے اور تین ہزار اُونٹ تھے۔ اس کمزوری کی حالت میں جسے مسلمان خوب محسوس کرتے تھے عبداللہ بن ابی کے تین سو آدمی کی غداری نے بعض کمزور دل مسلمانوں میں ایک بے چینی اور اضطراب کی حالت پیدا کر دی تھی اور ان میں سے بعض متزلزل ہونے لگ گئے، چنانچہ جیسا کہ قرآن شریف[6] میں بھی اشارہ کیا گیا ہے اسی گھبراہٹ اور اضطراب کی حالت میں مسلمانوں کے دو قبائل بنو حارثہ اور بنو سلمہ نے مدینہ کی طرف واپس لوٹ جانے کا ارادہ بھی کر لیا، مگر چونکہ دل میں نورِ ایمان موجود تھا پھر سنبھل گئے اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے موت کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی اپنے آقا کے پہلو کو نہ چھوڑا۔[7] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے آگے بڑھے اور اُحد کے دامن میں ڈیرہ ڈال دیا۔ ایسے طریق پر کہ اُحد کی پہاڑی مسلمانوں کے پیچھے کی طرف آگئی اور مدینہ گویا سامنے رہا۔ اور اس طرح آپ نے لشکر کا عقب محفوظ کر لیا۔ عقب کی پہاڑی میں ایک درّہ تھا جہاں سے حملہ ہو سکتا تھا۔ اُس کی حفاظت کا آپؐ نے یہ انتظام فرمایا کہ عبداللہ بن جبیر کی سرداری میں پچاس تیرانداز صحابی وہاں متعین فرما دیئے اور ان کو تاکید فرمائی کہ خواہ کچھ ہو جاوے وہ اس جگہ کو نہ چھوڑیں اور دشمن پر تیر برساتے جائیں۔ آپؐ کو اس درّہ کی حفاظت کا اس قدر خیال تھا کہ آپؐ نے عبداللہ بن جبیر سے بہ تکرار فرمایا کہ دیکھو یہ درّہ کسی صورت میں خالی نہ رہے۔

---

[1] ابن سعد [2] ابن ہشام [3] توفیقات [4] ابن ہشام و ابن سعد
[5] طبری [6] سورۃ آل عمران: ۱۲۳ [7] بخاری حالات غزوہ اُحد

حتیٰ کہ اگر تم دیکھو کہ ہمیں فتح ہو گئی ہے اور دشمن پسپا ہو کر بھاگ نکلا ہے، تو پھر بھی تم اس جگہ کو نہ چھوڑنا اور اگر تم دیکھو کہ مسلمانوں کو شکست ہو گئی ہے اور دشمن ہم پر غالب آ گیا ہے تو پھر بھی تم اس جگہ سے نہ ہٹنا[1] حتیٰ کہ ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ "اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمارا گوشت نوچ رہے ہیں تو پھر بھی تم یہاں سے نہ ہٹنا حتیٰ کہ تمہیں یہاں سے ہٹ آنے کا حکم جاوے[2]" اس طرح اپنے عقب کو پوری طرح مضبوط کر کے آپؐ نے لشکر اسلامی کی صف بندی کی اور مختلف دستوں کے جُدا جُدا امیر مقرر فرمائے۔ اس موقعہ پر آپؐ کو یہ اطلاع دی گئی کہ لشکرِ قریش کا جھنڈا طلحہ کے ہاتھ میں ہے۔ طلحہ اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو قریش کے مورث اعلیٰ قُصَیّ بن کلاب کے قائم کردہ انتظام کے ماتحت جنگوں میں قریش کی علمبرداری کا حق رکھتا تھا۔ یہ معلوم کر کے آپؐ نے فرمایا "ہم قومی وفاداری دکھانے کے زیادہ حق دار ہیں چنانچہ آپ نے حضرت علی سے مہاجرین کا جھنڈا لے کر مصعب بن عُمیر کے سپرد فرما دیا جو اُسی خاندان کے ایک فرد تھا جس سے طلحہ تعلق رکھتا تھا[3]۔

دوسری طرف قریش کے لشکر میں بھی صف آرائی ہو چکی تھی۔ ابوسفیان امیرالعسکر تھا۔ میمنہ پر خالد بن ولید کمانڈر تھا۔ اور میسرہ پر عکرمہ بن ابوجہل تھا۔ تیرانداز عبداللہ بن ربیعہ کی کمان میں تھے[4]۔ عورتیں لشکر کے پیچھے دفیں بجا بجا کر اور اشعار گا گا کر مردوں کو جوش دلاتی تھیں[5]۔

سب سے پہلے لشکرِ قریش سے ابوعامر اور اس کے ساتھی آگے بڑھے۔ اس شخص کا ذکر اوپر گذر چکا ہے کہ یہ قبیلہ اوس میں سے تھا اور مدینہ کا رہنے والا تھا اور راہب کے نام سے مشہور تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو اس کے کچھ عرصہ بعد یہ شخص بغض و حسد سے بھر گیا اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مکہ چلا گیا اور قریشِ مکہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف اکساتا رہا چنانچہ اب جنگِ اُحد میں وہ قریش کا حمایتی بنکر مسلمانوں کے خلاف شریکِ جنگ ہوا۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ ابوعامر کا بیٹا حنظلہ ایک نہایت مخلص مسلمان تھا اور اس جنگ کے موقعہ پر اسلامی لشکر میں شامل تھا اور نہایت جانبازی کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہوا۔ ابوعامر چونکہ قبیلہ اوس کے ذی اثر لوگوں میں سے تھا۔ اس لئے اسے یہ پختہ امید تھی کہ اب جو میں اتنے عرصہ کی جدائی کے بعد مدینہ والوں کے سامنے ہونگا تو وہ میری محبت میں فوراً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر میرے ساتھ آملیں گے اِسی اُمید میں ابوعامر اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لیکر سب سے پہلے آگے بڑھا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا "اے قبیلہ اوس کے لوگو! میں ابوعامر ہوں" انصار نے یک زبان ہو کر کہا "دُور ہو جا اے فاسق! تیری آنکھ ٹھنڈی نہ ہو" اور ساتھ ہی پتھروں

---

[1] بخاری کتاب المغازی حالات اُحد ۔ [2] بخاری کتاب الجہاد باب ما یکرہ من التنازع ۔
[3][4] ابن سعد ۔ [5] ابن ہشام وابن سعد [6] ابن ہشام [7] ابن سعد

کی ایک ایسی باڑ ماری کہ ابو عامر اور اس کے ساتھی بدحواس ہوکر پیچھے کی طرف بھاگ گئے[1] اس نظارہ کو دیکھ کر قریش کا علمبردار طلحہ بڑے جوش کی حالت میں آگے بڑھا اور بڑے متکبرانہ لہجہ میں مبارز طلبی کی حضرت علی آگے بڑھے اور دو چار ہاتھ میں طلحہ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد طلحہ کا بھائی عثمان آگے آیا۔ اور ادھر سے اس کے مقابل پر حضرت حمزہ نکلے اور جاتے ہی اُسے مار گرایا۔ کفار نے یہ نظارہ دیکھا تو غضب میں آکر عام دھاوا کر دیا۔ مسلمان بھی تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے اور دونوں فوجیں آپس میں گتھم گتھا ہوگئیں غالبًا اسی موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لیکر فرمایا" کون ہے جو اسے لیکر اس کا حق ادا کرے"؛ بہت سے صحابہ نے اس فخر کی خواہش میں اپنے ہاتھ پھیلائے[2] جن میں حضرت عمر اور زبیرؓ بلکہ بعض روایات کی رُو سے حضرت ابوبکر و حضرت علی بھی شامل تھے[3] مگر آپؐ نے اپنا ہاتھ روکے رکھا اور یہی فرماتے گئے "کوئی ہے جو اس کا حق ادا کرے"؟ آخر ابودجانہ انصاری نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور عرض کیا "یا رسول اللہ! مجھے عنایت فرمایئے"؛ آپؐ نے یہ تلوار انہیں دے دی اور ابودجانہ اُسے ہاتھ میں لیکر تبختر کی چال سے اکڑتے ہوئے کفار کی طرف آگے بڑھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا خدا کو یہ چال بہت ناپسند ہے، مگر ایسے موقعہ پر ناپسند نہیں[4] زبیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار لینے کے سب سے زیادہ خواہشمند تھے اور قرب رشتہ کی وجہ سے اپنا حق بھی زیادہ سمجھتے تھے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگے کہ کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ تلوار نہیں دی اور ابودجانہ کو دیدی اور اپنی اس پریشانی کو دُور کرنے کے لیے انھوں نے دل میں عہد کیا کہ میں اس میدان میں ابودجانہ کے ساتھ ساتھ رہونگا اور دیکھونگا کہ وہ اس تلوار کے ساتھ کیا کرتا ہے؛ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ابودجانہ نے اپنے سر پر ایک سُرخ کپڑا باندھا اور اس تلوار کو لیکر حمد کے گیت گنگناتا ہوا مشرکین کی صفوں میں گھس گیا اور میں نے دیکھا کہ جدھر جاتا تھا گویا موت بکھیرتا جاتا تھا اور میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا جو اس کے سامنے آیا ہو اور پھر وہ بچا ہو۔ حتیٰ کہ وہ لشکر قریش میں سے اپنا راستہ کاٹتا ہوا لشکر کے دوسرے کنارے نکل گیا جہاں قریش کی عورتیں کھڑی تھیں۔ ہند زوجہ ابوسفیان جو بڑے زور شور سے اپنے مردوں کو جوش دلا رہی تھی اس کے سامنے آئی اور ابودجانہ نے اپنی تلوار اُس کے اوپر اُٹھائی۔ جس پر ہند نے بڑے زور سے چیخ ماری اور اپنے مردوں کو امداد کے لیے بلایا۔ مگر کوئی شخص اس کی مدد کو نہ آیا، لیکن میں نے دیکھا کہ ابودجانہ نے خود بخود ہی اپنی تلوار نیچی کر لی اور وہاں سے ہٹ آیا۔ زبیر روایت کرتے ہیں کہ اس موقعہ پر میں نے ابودجانہ سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ پہلے تم نے تلوار اٹھائی

---

[1] ابن سعد ؛ [2] مسلم باب فضائل ابودجانہ و ابن ہشام ؛
[3] زرقانی ؛ [4] ابن ہشام ؛

اور پھر نیچی کر لی۔ اُس نے کہا میرا دل اس بات پر تیار نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار ایک عورت پر چلاؤں اور عورت بھی وہ جس کے ساتھ اس وقت کوئی مرد محافظ نہیں۔ زبیر کہتے ہیں میں نے اُس وقت سمجھا کہ واقعی جو حق رسول اللہ کی تلوار کا ابو دجانہ نے ادا کیا ہے وہ شاید میں نہ کر سکتا اور میرے دل کی خلش دُور ہو گئی[1]

الغرض قریش کے علمبردار کے مارے جانے کے بعد دونوں فوجیں آپس میں گتھم گتھا ہو گئیں اور سخت گھمسان کا رن پڑا اور ایک عرصہ تک دونوں طرف سے قتل و خون کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر آہستہ آہستہ اسلامی لشکر کے سامنے قریش کی فوج کے پاؤں اُکھڑنے شروع ہوئے۔

چنانچہ مشہور انگریز مؤرخ سر ولیم میور لکھتے ہیں :-

"مسلمانوں کے خطرناک حملوں کے سامنے مکی لشکر کے پاؤں اکھڑنے لگ گئے۔ قریش کے رسالے نے کئی دفعہ یہ کوشش کی کہ اسلامی فوج کے بائیں طرف عقب سے ہو کر حملہ کریں، مگر ہر دفعہ اُن کو ان پچاس تیراندازوں کے تیر کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہاں خاص طور پر متعین کئے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے اُحد کے میدان میں بھی وہی شجاعت و مردانگی اور موت و خطر سے وہی بے پروائی دکھائی گئی جو بدر کے موقعہ پر انھوں نے دکھائی تھی۔ مکہ کے لشکر کی صفیں پھٹ پھٹ جاتی تھیں۔ جب اپنی خود کے ساتھ سرخ رومال باندھے ابو دجانہ اُن پر حملہ کرتا تھا اور اُس تلوار کے ساتھ جو اُسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دی تھی چاروں طرف گویا موت بکھیرتا جاتا تھا۔ حمزہ اپنے سر پر شتر مرغ کے پروں کی کلغی لہراتا ہوا ہر جگہ نمایاں نظر آتا تھا۔ علی اپنے لمبے اور سفید پھریرے کے ساتھ اور زبیر اپنی شوخ رنگ کی چمکتی ہوئی زرد پگڑی کے ساتھ بہادرانِ ایلیڈ کی طرح جہاں بھی جاتے تھے دشمن کے واسطے موت و پریشانی کا پیغام اپنے ساتھ لے جاتے تھے یہ وہ نظارے ہیں جہاں بعد کی اسلامی فتوحات کے ہیرو تربیت پذیر ہوئے[2]"

غرض لڑائی ہوئی اور بہت سخت ہوئی اور کافی وقت تک غلبہ کا پہلو مشکوک رہا، لیکن آخر خدا کے فضل سے قریش کے پاؤں اکھڑنے لگے اور ان کے لشکر میں بدنظمی اور ابتری کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ قریش کے علمبردار ایک ایک کر کے مارے گئے اور ان میں سے قریباً نو شخصوں نے باری باری اپنے قومی جھنڈے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ مگر سارے کے سارے باری باری مسلمانوں کے

---

[1] ابن ہشام و زرقانی و خمیس ٭

[2] لائف آف محمد صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲ ٭

ہاتھ سے قتل ہوئے[1] آخر طلحہ کے ایک حبشی غلام صوآب نامی نے دلیری کے ساتھ بڑھ کر علم اپنے ہاتھ میں لے لیا، مگر اس پر بھی ایک مسلمان نے آگے بڑھ کر وار کیا اور ایک ہی ضرب میں اس کے دونوں ہاتھ کاٹ کر قریش کا جھنڈا خاک پر گرادیا، لیکن صواب کی بہادری اور جوش کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر گرا اور جھنڈے کو اپنی چھاتی کے ساتھ لگا کر اسے پھر بلند کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس مسلمان نے جو جھنڈے کے سرنگوں ہونے کی قدر و قیمت کو جانتا تھا اوپر سے تلوار چلا کر صواب کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد پھر قریش میں سے کسی شخص کو یہ جرأت اور ہمت نہیں ہوئی کہ اپنے علم کو اٹھائے۔[2] اُدھر مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پاکر تکبیر کا نعرہ لگاتے ہوئے پھر زور سے حملہ کیا اور دشمن کی رہی سہی صفوں کو چیرتے اور منتشر کرتے ہوئے لشکر کے دوسرے پار قریش کی عورتوں تک پہنچ گئے اور مکہ کے لشکر میں سخت بھاگڑ پڑ گئی[3] اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان قریباً صاف ہوگیا۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے لیے ایسی قابلِ اطمینان صورتِ حال پیدا ہوگئی کہ وہ مالِ غنیمت کے جمع کرنے میں مصروف ہوگئے۔[4]

جب عبداللہ بن جبیر کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اب تو فتح ہو چکی ہے تو انھوں نے اپنے امیر عبداللہ سے کہا کہ اب تو فتح ہو چکی ہے اور مسلمان غنیمت کا مال جمع کر رہے ہیں آپ ہم کو اجازت دیں کہ ہم بھی لشکر کے ساتھ جا کر شامل ہو جائیں۔ عبداللہ نے انہیں روکا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکیدی ہدایت یاد دلائی، مگر وہ فتح کی خوشی میں غافل ہو رہے تھے اس لیے وہ باز نہ آئے[5] اور یہ کہتے ہوئے نیچے اتر گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ مطلب تھا کہ جب تک پورا اطمینان نہ ہولے درہ خالی نہ چھوڑا جائے اور اب چونکہ فتح ہو چکی ہے اس لیے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور سوائے عبداللہ بن جبیر اور اُن کے پانچ سات ساتھیوں کے درہ کی حفاظت کے لیے کوئی نہ رہا۔[6] خالد بن ولید کی تیز آنکھ نے دُور سے درہ کی طرف دیکھا تو میدان صاف پایا جس پر اس نے اپنے سواروں کو جلدی جلدی جمع کر کے فوراً درہ کا رُخ کیا اور اس کے پیچھے پیچھے عکرمہ بن ابوجہل بھی رہے سہے دستہ کو ساتھ لیکر تیزی کے ساتھ وہاں پہنچا اور یہ دونوں دستے عبداللہ بن جبیر اور ان کے چند ساتھیوں کو ایک آن کی آن میں شہید کر کے اسلامی لشکر کے عقب میں اچانک حملہ آور ہو گئے[7] مسلمان جو فتح کے اطمینان میں غافل اور منتشر ہو رہے تھے اس بلائے ناگہانی سے گھبرا گئے۔ مگر پھر بھی سنبھلے اور پلٹ کر کفار کے حملہ کو روکنا چاہا اس وقت کسی چالاک معاند نے یہ آواز دی کہ اے مسلمانو! دوسری طرف سے بھی کفار کا دھاوا ہو گیا ہے[8]

---

[1] ابن سعد ؎ [2] ابن ہشام ؎ [3] طبری ؎ [4] ابن سعد
[5] بخاری حالات اُحد ؎ [6] ابن سعد و زرقانی ؎ [7] ابن سعد
[8] زرقانی

مسلمانوں نے سراسیمہ ہو کر پھر پلٹا کھایا اور گھبراہٹ میں بے دیکھے بھالے اپنے آدمیوں پر ہی تلوار چلانی شروع کر دی[1]۔ دوسری طرف مکہ کی ایک بہادر عورت عمرۃ بنت علقمہ نے جب یہ نظارہ دیکھا تو جھٹ آگے بڑھ کر قریش کا علم جو ابھی تک خاک میں پڑا تھا اٹھا کر بلند کر دیا جسے دیکھتے ہی قریش کا منتشر لشکر پھر جمع ہو گیا[2] اور اس طرح مسلمان حقیقۃً چاروں طرف سے دشمن کے نرغہ میں گھر گئے اور اسلامی فوج میں ایک خطرناک کھلبلی کی صورت پیدا ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایک بلند جگہ پر کھڑے ہوئے یہ سب نظارہ دیکھ رہے تھے مسلمانوں کو آواز پر آواز دی، مگر اس شور شرابے میں آپ کی آواز دب دب کر رہ جاتی تھی[3]۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ اتنے قلیل عرصہ میں ہو گیا کہ اکثر مسلمان بالکل بدحواس ہو گئے۔ حتیٰ کہ اس بدحواسی میں بعض مسلمان ایک دوسرے پر وار کرنے لگ گئے اور اپنے پرائے میں امتیاز نہ رہا؛ چنانچہ خود مسلمانوں کے ہاتھ سے بعض مسلمان زخمی ہو گئے اور حذیفہ کے والد یمان کو تو مسلمانوں نے غلطی سے شہید ہی کر دیا۔ حذیفہ اس وقت قریب ہی تھے وہ چلاتے رہ گئے کہ اے مسلمانو! یہ میرے والد ہیں مگر اس وقت کون سنتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں مسلمانوں کی طرف سے یمان کا خون بہا ادا کرنا چاہا مگر حذیفہ نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنے باپ کا خون مسلمانوں کو معاف کرتا ہوں[4]۔

حضرت حمزہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ہونے کے علاوہ آپ کے رضاعی بھائی بھی تھے[5] نہایت بہادری کے ساتھ لڑ رہے تھے اور جدھر جاتے تھے اُن کے سامنے قریش کی صفیں پھٹ پھٹ جاتی تھیں مگر دشمن بھی اُن کی تاک میں تھا اور جبیر بن مطعم اپنے ایک حبشی غلام وحشی نامی کو خاص طور پر آزادی کا وعدہ دیکر اپنے ساتھ لایا تھا کہ جس طرح بھی ہو حمزہ کو جنہوں نے جبیر کے چچا طعیمہ بن عدی کو بدر کے موقعہ پر تلوار کی گھاٹ اُتارا تھا قتل کر کے اس کے انتقام کو پورا کرے؛ چنانچہ وحشی ایک جگہ پر چھپ کر اُن کی تاک میں بیٹھ گیا اور جب حمزہ کسی شخص پر حملہ کرتے ہوئے وہاں سے گذرے تو اُس نے خوب تاک کر اُن کی ناف کے نیچے اپنا چھوٹا سا نیزہ مارا جو لگتے ہی بدن کے پار ہو گیا[6]۔ حمزہ لڑکھڑاتے ہوئے گرے مگر پھر ہمت کر کے اُٹھے اور ایک جست کر کے وحشی کی طرف بڑھنا چاہا مگر پھر لڑکھڑا کر گرے اور جان دیدی اور اس طرح اسلامی لشکر کا ایک مضبوط بازو ٹوٹ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حمزہ کے قتل کی اطلاع ملی تو آپ کو سخت صدمہ ہوا اور روایت آتی ہے کہ غزوۂ طائف کے بعد جب حمزہ کا قاتل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو آپ نے

---

[1] بخاری کتاب المغازی حالات اُحد و نیز ابن سعد ۔ [2] ابن ہشام ۔ [3] سورۃ آل عمران: ۱۵۲ تا ۱۵۶ ۔
[4] بخاری کتاب المغازی حالات اُحد ۔ [5] ابن ہشام ۔ [6] مسلم ابواب الرضاع ۔ [7] بخاری کتاب المغازی حالات اُحد ۔

اُسے معاف تو فرما دیا، مگر حمزہ کی محبت کا احترام کرتے ہوئے فرمایا کہ وحشی میرے سامنے نہ آیا کرے۔ اُس وقت وحشی نے اپنے دل میں یہ عہد کیا کہ جس ہاتھ سے مَیں نے رسولِ خدا کے چچا کو قتل کیا ہے۔ جب تک اُسی ہاتھ سے کسی بڑے دشمنِ اسلام کو تہِ تیغ نہ کر لوں گا چین نہ لُوں گا؛ چنانچہ حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت میں اس نے جنگِ یمامہ میں نبوت کے جھوٹے مدعی مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے اپنے عہد کو پورا کیا[1]۔ اس گھمسان کے موقعہ پر وہ مسلمان عورتیں بھی جو اس غزوہ میں ساتھ تھیں پوری تندہی اور جانفشانی سے اپنے کام میں مصروف تھیں اور اِدھر اُدھر بھاگ کر صحابہ کو پانی پلانے اور زخمیوں کی خبرگیری کرنے اور اسی قسم کی دُوسری خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ ان خواتین میں حضرت عائشہ اور اُمِ سلیم اور اُمِ سلیط کے اسماء صحابہ کو پانی لا لا کر پلانے کی خدمت کی ضمن میں خاص طور پر مذکور ہوتے ہیں[2]۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے یہ وقت مسلمانوں کے واسطے سخت پریشانی کا وقت تھا۔ قریش کے لشکر نے قریباً چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا تھا اور اپنے پے در پے حملوں سے ہر آن دباتا چلا آتا تھا۔ اس پر بھی مسلمان شاید تھوڑی دیر بعد سنبھل جاتے مگر غضب یہ ہوا کہ قریش کے ایک بہادر سپاہی عبداللہ بن قمئہ نے مسلمانوں کے علمبردار مصعب بن عمیر پر حملہ کیا اور اپنی تلوار کے وار سے اُن کا دایاں ہاتھ کاٹ گرایا۔ مصعب نے فوراً دوسرے ہاتھ میں جھنڈا تھام لیا اور ابن قمئہ کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھے مگر اس نے دوسرے وار میں ان کا دوسرا ہاتھ بھی قلم کر دیا۔ اس پر مصعب نے اپنے دونوں کٹے ہوئے ہاتھوں کو جوڑ کر گرتے ہوئے اسلامی جھنڈے کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اُسے چھاتی سے چمٹا لیا۔ جس پر ابن قمئہ نے اُن پر تیسرا وار کیا اور اب کی دفعہ مصعب شہید ہو کر گر گئے[3]۔ جھنڈا تو کسی دوسرے مسلمان نے فوراً آگے بڑھ کر تھام لیا۔ مگر چونکہ مصعب کا ڈیل ڈول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا تھا ابن قمئہ نے سمجھا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مار لیا ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی طرف سے یہ تجویز محض شرارت اور دھوکا دہی کے خیال سے ہو۔ بہرحال اس نے مصعب کے شہید ہو کر گرنے پر شور مچا دیا کہ مَیں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مار لیا ہے[4]۔ اس خبر سے مسلمانوں کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ اور ان کی جمعیت بالکل منتشر ہو گئی اور بہت سے صحابی سراسیمہ ہو کر میدان سے بھاگ نکلے۔

اُس وقت مسلمان تین حصوں میں منقسم تھے[5]۔ ایک گروہ وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سُن کر میدان سے بھاگ گیا تھا، مگر یہ گروہ سب سے تھوڑا تھا[6]۔ ان لوگوں میں حضرت عثمان بن عفان بھی شامل تھے[7]۔ مگر جیسا کہ قرآن شریف میں ذکر آتا ہے اُس وقت کے خاص حالات

[1] بخاری کتاب المغازی حالات اُحد ۔ [2] بخاری حالات غزوہ اُحد ۔ [3] زرقانی ۔
[4] ابن ہشام ۔ [5] زرقانی [6] زرقانی ۔ [7] بخاری حالات احد ۔

اوران لوگوں کے دلی ایمان اور اخلاص کو مدِنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمادیا[1] ان لوگوں میں سے بعض مدینہ تک جا پہنچے اور اس طرح مدینہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خیالی شہادت اور لشکرِ اسلام کی ہزیمت کی خبر پہنچ گئی جس سے تمام شہر میں ایک کہرام مچ گیا اور مسلمان مرد، عورت بچے بوڑھے نہایت سراسیمگی کی حالت میں شہر سے باہر نکل آئے اور اُحد کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور بعض تو جلد جلد دوڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں پہنچے اور اللہ کا نام لے کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ دُوسرے گروہ میں وہ لوگ تھے جو بھاگے تو نہیں تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سُن کر یا تو ہمت ہار بیٹھے تھے اور یا اب لڑنے کو بیکار سمجھتے تھے اور اس لیے میدان سے ایک طرف ہٹ کر سرنگوں ہوکر بیٹھ گئے۔ تیسرا گروہ وُہ تھا جو برابر لڑرہا تھا۔ ان میں سے کچھ تو وہ لوگ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد جمع تھے اور بے نظیر جاں نثاری کے جوہر دکھا رہے تھے اور اکثر وہ تھے جو میدانِ جنگ میں منتشر طور پر لڑ رہے تھے۔ ان لوگوں اور نیز گروہ ثانی کے لوگوں کو جوں جوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ موجود ہونے کا پتہ لگتا جاتا تھا یہ لوگ دیوانوں کی طرح لڑتے بھڑتے آپؐ کے اردگرد جمع ہوتے جاتے تھے[2]۔ اس وقت جنگ کی حالت یہ تھی کہ قریش کا لشکر گویا سمندر کی مہیب لہروں کی طرح چاروں طرف سے بڑھا چلا آتا تھا اور میدانِ جنگ میں ہر طرف سے تیر اور پتھروں کی بارش ہورہی تھی۔ جاں نثاروں نے اس خطرہ کی حالت کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد گھیرا ڈال کر آپؐ کے جسم مبارک کو اپنے بدنوں سے چھپالیا، مگر پھر بھی جب کبھی حملہ کی رو اُٹھتی تھی تو یہ چند گنتی کے آدمی اِدھر اُدھر دھکیل دیئے جاتے تھے اور ایسی حالت میں بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریباً اکیلے رہ جاتے تھے۔ کسی ایسے ہی موقعہ پر حضرت سعد بن ابی وقاص کے مُشرک بھائی عتبہ بن ابی وقاص کا ایک پتھر آپؐ کے چہرہ مبارک پر لگا۔ جس سے آپؐ کا ایک دانت ٹوٹ گیا اور ہونٹ بھی زخمی ہوا[3]۔ ابھی زیادہ وقت نہ گذرا تھا کہ ایک اور پتھر جو عبداللہ بن شہاب نے پھینکا تھا اس نے آپؐ کی پیشانی کو زخمی کیا اور تھوڑی دیر کے بعد تیسرا پتھر جو ابن قمئہ نے پھینکا تھا آپؐ کے رُخسار مبارک پر آکر لگا جس سے آپؐ کے مغفر (خُود) کی دو کڑیاں آپؐ کے رخسار میں چبھ کر رہ گئیں[4]۔ سعد بن ابی وقاص کو اپنے بھائی عتبہ کے اس فعل پر اس قدر غصہ تھا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے کبھی کسی دشمن کے قتل کے لیے اتنا جوش نہیں آیا جتنا مجھے اُحد کے دن عُتبہ کے قتل کا جوش تھا[5]۔

اس وقت نہایت خطرناک لڑائی ہورہی تھی اور مسلمانوں کے واسطے ایک سخت ابتلاء اور امتحان کا وقت تھا اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سُنکر

---

[1] سورۃ آل عمران: ۱۵۶ ۔ [2] زرقانی ۔ [3] ابن ہشام ۔ [4] ابن ہشام و زرقانی ۔ [5] طبری ۔

بہت سے صحابہ ہمت ہار چکے تھے اور ہتھیار پھینک کر میدان سے ایک طرف ہو گئے تھے۔ انہی میں حضرت عمرؓ بھی تھے؛ چنانچہ یہ لوگ اسی طرح میدانِ جنگ کے ایک طرف بیٹھے تھے کہ اوپر سے ایک صحابی انس بن نضرؓ انصاری آگئے اور ان کو دیکھ کر کہنے لگے "تم لوگ یہاں کیا کرتے ہو؟" انھوں نے جواب دیا۔ "رسول اللہؐ نے شہادت پائی۔ اب لڑنے سے کیا حاصل ہے؟" انس نے کہا۔ یہی تو لڑنے کا وقت ہے تا جو موت رسول اللہ نے پائی وہ ہمیں بھی نصیب ہو اور پھر آپؐ کے بعد زندگی کا بھی کیا لطف ہے؟ اور پھر ان کے سامنے سعد بن معاذ آئے تو انھوں نے کہا "سعد مجھے تو اس پہاڑی سے جنّت کی خوشبو آرہی ہے" یہ کہہ کر انس دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔ جنگ کے بعد دیکھا گیا تو ان کے بدن پر اسّی سے زیادہ زخم تھے۔ اور کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ کس کی لاش ہے۔ آخر اُن کی بہن نے اُن کی اُنگلی دیکھ کر شناخت کیا۔[1]

جو صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع تھے انھوں نے جو جان نثاریاں دکھائیں تاریخ ان کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔ یہ لوگ پروانوں کی طرح آپؐ کے اردگرد گھومتے تھے اور آپؐ کی خاطر اپنی جان پر کھیل رہے تھے۔ جو وار بھی پڑتا تھا صحابہ اپنے اوپر لیتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچاتے تھے اور ساتھ ہی دشمن پر بھی وار کرتے جاتے تھے۔ حضرت علیؓ اور زبیرؓ نے بے تحاشا دشمن پر حملے کئے اور ان کی صفوں کو دھکیل دھکیل دیا۔ ابوطلحہ انصاری نے تیر چلاتے چلاتے تین کمانیں توڑیں اور دشمن کے تیروں کے مقابل پر سینہ سپر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کو اپنی ڈھال سے چھپایا۔[2] سعد بن وقاص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تیر پکڑاتے جاتے تھے اور سعدؓ یہ تیر دشمن پر بے تحاشا چلاتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ نے سعدؓ سے فرمایا "تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ برابر تیر چلاتے جاؤ۔"[3] سعدؓ اپنی آخری عمر تک آپؐ کے ان الفاظ کو نہایت فخر کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ ابودجانہؓ نے بڑی دیر تک آپؐ کے جسم کو اپنے جسم سے چھپائے رکھا اور جو تیر یا پتھر آتا تھا اُسے اپنے جسم پر لیتے تھے حتیٰ کہ اُن کا بدن تیروں سے چھلنی ہو گیا، مگر انھوں نے اُف تک نہیں کی تا ایسا نہ ہو کہ ان کے بدن میں حرکت پیدا ہونے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کا کوئی حصّہ ننگا ہو جاوے اور آپؐ کو کوئی تیر آ لگے۔[4] طلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لیے کئی وار اپنے بدن پر لیے اور اسی کوشش میں اُنکا ہاتھ شل ہو کر ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔[5] مگر یہ چند گنتی کے جاں نثار اس سیلابِ عظیم کے سامنے کب تک ٹھہر سکتے تھے جو ہر لحظہ مہیب موجوں کی طرح چاروں طرف سے بڑھتا چلا آتا تھا۔ دشمن کے

---

[1] ابن ہشام [2] بخاری حالات غزوہ اُحد و [3] بخاری حالات اُحد

[4] بخاری حالات غزوہ اُحد [5] ابن ہشام و زرقانی [6] بخاری حالات اُحد

ہر حملہ کی ہر لہر مسلمانوں کو کہیں کا کہیں بہا کر لے جاتی تھی مگر جب ذرا زور تھمتا تھا مسلمان بیچارے لڑتے بھڑتے پھر اپنے محبوب آقا کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات تو ایسا خطرناک حملہ ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عملاً اکیلے رہ جاتے تھے۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ آپؐ کے ارد گرد صرف بارہ آدمی رہ گئے اور ایک وقت ایسا تھا کہ آپؐ کے ساتھ صرف دو آدمی ہی رہ گئے۔[1] ان جان نثاروں میں حضرت ابوبکرؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعدؓ بن وقاص، ابودجانہ انصاری، سعدؓ بن معاذ اور طلحہؓ انصاری کے نام خاص طور پر مذکور ہوئے ہیں۔ ایک وقت جب قریش کے حملہ کی ایک غیر معمولی لہر اٹھی تو آپؐ نے فرمایا "کون ہے جو اس وقت اپنی جان خدا کے رستے میں نثار کر دے؟" ایک انصاری کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو وہ اور چھ اور انصاری صحابی دیوانہ وار آگے بڑھے اور اُن میں سے ایک ایک نے آپؐ کے ارد گرد لڑتے ہوئے جان دیدی۔[2] اس پارٹی کے رئیس زیاد بن سکن تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دھاوے کے بعد حکم دیا کہ زیادؓ کو اُٹھا کر میرے پاس لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دیا۔ اُس وقت زیادؓ میں کچھ کچھ جان تھی، مگر وہ دم توڑ رہے تھے۔ اس حالت میں انھوں نے بڑی کوشش کے ساتھ اپنا سر اُٹھایا اور اپنا مُنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دیدی۔[3] ایک مسلمان خاتون جس کا نام ام عمارہ تھا تلوار ہاتھ میں لے کر مارتی کاٹتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی اس وقت عبداللہ بن قمئۃ آپؐ پر وار کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ مسلمان خاتون نے جھٹ آگے بڑھ کر وہ وار اپنے اوپر لے لیا اور پھر تلوار تول کر اُس پر اپنا وار کیا، مگر وہ دوہری زرہ پہنے ہوئے مرد تھا۔ اور یہ ایک کمزور عورت۔ اس لیے وار کاری نہ پڑا[4] اور ابن قمئۃ ڈراتا ہوا اور مسلمانوں کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے آیا اور صحابہ کے روکتے روکتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا اور پہنچتے ہی اس زور اور بے دردی کے ساتھ آپؐ کے چہرہ مبارک پر وار کیا کہ صحابہ کے دل دہل گئے۔ جاں نثار طلحہ نے لپک کر اپنے ننگے ہاتھ پر لیا، مگر ابن قمئۃ کی تلوار اُن کے ہاتھ کو قلم کرتی ہوئی آپ کے پہلو پر پڑی۔ زخم تو خدا کے فضل سے نہ آیا کیونکہ آپؐ نے اوپر تلے دو زرہیں پہنی ہوئی تھیں اور وار کا زور بھی طلحہ کی جاں نثاری سے کم ہو چکا تھا، مگر اس صدمہ سے آپ چکر کھا کر نیچے گرے اور ابن قمئۃ نے پھر خوشی کا نعرہ لگایا کہ مَیں نے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مار لیا ہے۔[5]

ابن قمئۃ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وار کر کے خوشی کا نعرہ لگاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور اپنے زعم میں یہ سمجھا کہ مَیں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مار لیا ہے، مگر جونہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گرے حضرت علی اور طلحہ

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب اِذْ ھَمَّتْ طَائِفَتَانِ عن ابی عثمان۔ [2] مسلم ذکر غزوہ اُحد۔ [3] ابن ہشام وطبری
[4] ابن ہشام [5] ابن سعد و ابن ہشام ؛

نے فوراً آپ کو اوپر اٹھالیا۔ اور یہ معلوم کر کے مسلمانوں کے پژمردہ چہرے خوشی سے تمتا اٹھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ سلامت ہیں[1]۔ اب آہستہ آہستہ لڑائی کا زور بھی کم ہونا شروع ہوگیا۔ کیونکہ ایک تو کفار اس اطمینان کی وجہ سے کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے کہ محمد رسول اللہ شہید ہو چکے ہیں اور اس لیے انھوں نے لڑائی کی طرف سے توجہ ہٹا کر کچھ تو اپنے مقتولین کی دیکھ بھال اور کچھ مسلمان شہیدوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرنے کی طرف پھیر لی تھی۔ اور دوسری طرف مسلمان بھی اکثر منتشر ہو چکے تھے۔ جب قریش ذرا پیچھے ہٹ گئے اور جو مسلمان میدان میں موجود تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان کر آپ کے اردگرد جمع ہو گئے تو آپ اپنے ان صحابہ کی جمعیت میں آہستہ آہستہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر ایک محفوظ درہ میں پہنچ گئے[2]۔ راستہ میں مکہ کے ایک رئیس اُبَیّ بن خلف کی نظر آپ پر پڑی اور وہ بغض و عداوت میں اندھا ہوکر یہ الفاظ پکارتا ہوا آپ کی طرف بھاگا کہ لَا نَجَوْتُ اِنْ نَجَا "اگر محمد (صلعم) بچ کر نکل گیا تو گویا میں تو نہ بچا"[3]۔ صحابہ نے اُسے روکنا چاہا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اُسے چھوڑ دو اور میرے قریب آنے دو۔ اور جب وہ آپ پر حملہ کرنے کے خیال سے آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے ایک نیزہ لیکر اس پر ایک وار کیا جس سے وہ چکر کھا کر زمین پر گرا اور پھر اُٹھ کر چیختا چلّاتا ہوا واپس بھاگ گیا اور گو بظاہر زخم زیادہ نہیں تھا مگر مکہ پہنچنے سے پہلے وہ پیوند خاک ہوگیا[4]۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درہ میں پہنچ گئے تو قریش کے ایک دستے نے خالد بن ولید کی کمان میں پہاڑ پر چڑھ کر حملہ کرنا چاہا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عمرؓ نے چند مہاجرین کو ساتھ لے کر اُس کا مقابلہ کیا اور اُسے پسپا کر دیا[5]۔

درہ میں پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کی مدد سے اپنے زخم دھوئے اور جو خود کی کڑیاں آپ کے رُخسار میں چبھ کر رہ گئی تھیں وہ ابو عبیدہ بن الجراح نے بڑی مشکل سے اپنے دانتوں کے ساتھ کھینچ کھینچ کر باہر نکالیں۔ حتیٰ کہ اس کوشش میں اُن کے دو دانت بھی ٹوٹ گئے۔ اس وقت آپ کے زخموں سے بہت خون بہہ رہا تھا۔ اور آپ اس خون کو دیکھ کر حسرت کے ساتھ فرماتے تھے۔ كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالدَّمِ وَهُوَ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ[6]۔ "کس طرح نجات پائے گی وہ قوم جس نے اپنے نبی کے مُنہ کو اس کے خون سے رنگ دیا۔ اس جُرم میں کہ وہ انہیں خدا کی طرف بلاتا ہے۔" اس کے بعد آپ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور پھر فرمایا اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ[7] یعنی "اے میرے اللہ! تو میری قوم کو معاف کر دے۔

---

[1] ابن ہشام [2] ابن ہشام و طبری [3] ابن سعد و ابن ہشام [4] ابن ہشام
[5] طبری و ابن ہشام [6] مسلم حالات اُحد و نیز زرقانی جلد ۲ صہ ۴۹

کیونکہ ان سے یہ قصور جہالت اور لاعلمی میں ہوا ہے۔ روایت آتی ہے کہ اسی موقعہ پر یہ قرآنی آیت نازل ہوئی کہ لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ۔ یعنی عذاب وعفو کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں خدا جسے چاہے گا معاف کریگا اور جسے چاہے گا عذاب دیگا۔[1] فاطمۃ الزہراؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق وحشتناک خبریں سُنکر مدینہ سے نکل آئی تھیں وہ بھی تھوڑی دیر کے بعد اُحد میں پہنچ گئیں اور آتے ہی آپؐ کے زخموں کو دھونا شروع کر دیا، مگر خون کسی طرح بند ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ آخر حضرت فاطمہؓ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر اس کی خاک آپؐ کے زخم پر باندھی تب جا کر کہیں خون تھما۔[2] دوسری خواتین نے بھی اس موقعہ پر زخمی صحابیوں کی خدمت کر کے ثواب حاصل کیا۔

اِدھر مسلمان اپنی مرہم پٹی میں مصروف تھے تو اُدھر دُوسری طرف یعنی نیچے میدانِ جنگ میں مکہ کے قریش مسلمان شہیدوں کی نعشوں کی نہایت بے دردانہ طور پر بے حرمتی کر رہے تھے۔ مُثلہ کی وحشیانہ رسم پوری وحشت کے ساتھ ادا کی گئی اور مُسلمان شہیدوں کی نعشوں کے ساتھ مکہ کے خونخوار درندوں نے جو کچھ بھی ان کے دل میں آیا وہ کیا۔ قریش کی عورتوں نے مسلمانوں کے ناک کان کاٹ کر اُن کے ہار پروئے اور پہنے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند حضرت حمزہؓ کا جگر نکال کر چبا گئی۔[3] غرض بقول سر ولیم میور "مسلمانوں کی نعشوں کے ساتھ قریش نے نہایت وحشیانہ سلوک کیا۔"[4] اور مکہ کے رؤساء دیر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعش میدان میں تلاش کرتے رہے اور اس نظارے کے شوق میں ان کی آنکھیں ترس گئیں مگر جو چیز کہ نہ پانی تھی نہ پائی۔ اس تلاش سے مایوس ہو کر ابوسفیان اپنے چند ساتھیوں کو ساتھ لیکر اس دَرّہ کی طرف بڑھا جہاں مسلمان جمع تھے اور اس کے قریب کھڑے ہو کر پکار کر بولا "مسلمانو! کیا تم میں محمدؐ ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کوئی جواب نہ دے، چنانچہ سب صحابہ خاموش رہے۔ پھر اُس نے ابوبکرؓ و عمرؓ کا پوچھا، مگر اس پر بھی آپ کے ارشاد کے ماتحت کسی نے جواب نہ دیا جس پر اُس نے بلند آواز سے فخر کے لہجہ میں کہا کہ یہ سب لوگ مارے گئے ہیں کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ اس وقت حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا اور وہ بے اختیار ہو کر بولے۔ اے عدو اللہ تو جھوٹ کہتا ہے۔ ہم سب زندہ ہیں اور خدا ہمارے ہاتھوں سے تمہیں ذلیل کرے گا۔[5] ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کی آواز پہچان کر کہا۔ "عمر! سچ سچ بتاؤ کیا محمدؐ زندہ ہے؟" حضرت عمرؓ نے کہا "ہاں ہاں! خدا کے فضل سے وُہ زندہ ہیں اور تمہاری یہ باتیں سُن رہے ہیں۔" ابوسفیان نے کسی قدر دھیمی آواز میں کہا۔ "تو پھر ابن قمئہ نے جھوٹ کہا ہے کیونکہ میں تمہیں اس سے زیادہ سچا سمجھتا ہوں۔"[6] اس کے بعد ابوسفیان نے نہایت بلند آواز سے پکار کر کہا۔ اُعْلُ ھُبَلْ یعنی "اے ہبل![7] تیری بلندی ہو۔"

---

[1] بخاری حالات غزوہ اُحد [2] بخاری کتاب المغازی حالات اُحد [3] ابن ہشام و طبری [4] لائف آف محمدؐ [5] بخاری کتاب المغازی حالات اُحد نیز کتاب الجہاد [6] ابن ہشام [7] قریش کا ایک بڑا بُت تھا۔

"صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا خیال کر کے خاموش رہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنے نام پر تو خاموش رہنے کا حکم دیتے تھے۔ اب خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں بُت کا نام آنے پر بیتاب ہو گئے اور فرمایا "تم جواب کیوں نہیں دیتے؟" صحابہ نے عرض کیا "یارسول اللہ! کیا جواب دیں؟" آپؐ نے فرمایا: کہو اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ یعنی "بلندی اور بزرگی صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔" ابوسفیان نے کہا لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ "ہمارے ساتھ عزّٰی ہے[1] اور تمہارے ساتھ عزّٰی نہیں ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہو اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ۔ عزّٰی کیا چیز ہے۔ "ہمارے ساتھ اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارے ساتھ کوئی مددگار نہیں۔" اس کے بعد ابوسفیان نے کہا "لڑائی ایک ڈول کی طرح ہوتی ہے جو کبھی چڑھتا اور کبھی گرتا ہے۔ پس یہ دن بدر کے دن کا بدلہ سمجھو اور تم میدانِ جنگ میں ایسی لاشیں پاؤ گے جن کے ساتھ مثلہ کیا گیا ہے۔ مَیں نے اس کا حکم نہیں دیا، مگر جب مجھے اس کا علم ہوا تو مجھے اپنے آدمیوں کا یہ فعل کچھ بُرا بھی نہیں لگا۔[2] اور ہمارے اور تمہارے درمیان آئندہ سال انہی ایام میں بدر کے مقام میں پھر جنگ کا وعدہ رہا۔ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے ماتحت جواب دیا کہ: "بہت اچھا۔ یہ وعدہ رہا۔[3]"

یہ کہہ کر ابوسفیان اپنے ساتھیوں کو لیکر نیچے اُتر گیا اور پھر جلد ہی لشکرِ قریش نے مکہ کی راہ لی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ باوجود اس کے کہ قریش کو اس موقعہ پر مسلمانوں کے خلاف غلبہ حاصل ہوا تھا اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے وہ اگر چاہتے تو اپنی اس فتح سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے اور مدینہ پر حملہ آور ہونے کا راستہ تو بہرحال اُن کے لیے کھُلا تھا، مگر خدائی تصرف کچھ ایسا ہوا کہ قریش کے دل باوجود اس فتح کے اندر ہی اندر مرعوب تھے اور اُنھوں نے اسی غلبہ کو غنیمت جانتے ہوتے جو اُحد کے میدان میں ان کو حاصل ہوا تھا مکہ کو جلدی جلدی لوٹ جانا ہی مناسب سمجھا، مگر بایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید احتیاط کے خیال سے فوراً ستر صحابہ کی ایک جماعت جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زبیرؓ بھی شامل تھے تیار کر کے لشکرِ قریش کے پیچھے روانہ کر دی۔[4] یہ بخاری کی روایت ہے۔ عام مؤرخین یوں بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے حضرت علیؓ یا بعض روایات کی رُو سے سعد بن وقاص کو قریش کے پیچھے بھجوایا اور ان سے فرمایا کہ اس بات کا پتہ لاؤ کہ لشکرِ قریش مدینہ پر حملہ کرنے کی نیت تو نہیں رکھتا اور آپؐ نے اُن سے فرمایا اگر قریش اونٹوں پر سوار ہوں اور گھوڑوں کو خالی چلا رہے ہوں تو سمجھنا کہ وہ مکہ کی طرف واپس جا رہے ہیں مدینہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ نہیں رکھتے اور اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہوں تو سمجھنا ان کی نیت بخیر نہیں۔ اور آپؐ نے ان کو

---

[1] ایک اور بُت کا نام ہے۔ [2] بخاری کتاب المغازی حالات اُحد۔ [3] ابن ہشام
[4] بخاری حالات غزوہ اُحد۔

تاکید فرمائی کہ اگر قریش کا لشکر مدینہ کا رُخ کرے تو فوراً آپؐ کو اطلاع دی جاوے اور آپؐ نے بڑے جوش کی حالت میں فرمایا کہ اگر قریش نے اس وقت مدینہ پر حملہ کیا تو خدا کی قسم ہم اُن کا مقابلہ کرکے انہیں اس حملہ کا مزا چکھا دینگے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے آدمی آپؐ کے ارشاد کے ماتحت گئے اور بہت جلد یہ خبر لیکر واپس آگئے کہ قریش کا لشکر مکّہ کی طرف جارہا ہے[1]

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی میدان میں اُتر آئے ہوئے تھے اور شہداء کی نعشوں کی دیکھ بھال شروع تھی۔ جو نظارہ اسوقت مسلمانوں کے سامنے تھا وُہ خون کے آنسو رُلانے والا تھا۔ ستّر مسلمان خاک و خون میں لتھڑے ہوئے میدان میں پڑے تھے[2] اور عرب کی وحشیانہ رسمِ مُثلہ کا مہیب نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ان مقتولین میں صرف چھ مہاجر تھے اور باقی سب انصار سے تعلق رکھتے تھے[3]۔ قریش کے مقتولوں کی تعداد تیئس تھی[4]۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا اور رضاعی بھائی حمزہ بن عبدالمطلب کی نعش کے پاس پہنچے تو بے خود ہو کر رہ گئے کیونکہ ظالم ہند زوجہ ابوسفیان نے اُن کی نعش کو بُری طرح بگاڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو آپؐ خاموشی سے کھڑے رہے اور آپؐ کے چہرہ سے غم وغصہ کے آثار نمایاں تھے۔ ایک لمحہ کے لیے آپؐ کی طبیعت اس طرف بھی مائل ہوئی کہ مکّہ کے ان وحشی درندوں کے ساتھ جب تک انہی کا سا سلوک نہ کیا جائے گا وہ غالباً ہوش میں نہیں آئیں گے۔ مگر آپؐ اس خیال سے رُک گئے اور صبر کیا۔ بلکہ اس کے بعد آپؐ نے مُثلہ کی رسم کو اسلام میں ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار دیدیا اور فرمایا کہ دشمن خواہ کچھ کرے تم اس قسم کے وحشیانہ طریق سے بہرحال باز رہو اور نیکی اور احسان کا طریق اختیار کرو[5]۔ آپؐ کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب اپنے بھائی حمزہ سے بہت محبت رکھتی تھیں۔ وہ بھی مسلمانوں کی ہزیمت کی خبر سُن کر مدینہ سے نکل آئی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے صاحبزادے زبیر ابن العوام سے فرمایا کہ اپنی والدہ کو ماموں کی نعش نہ دکھانا مگر بہن کی محبت کب چین لینے دیتی تھی۔ انھوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ مجھے حمزہ کی نعش دکھا دو۔ مَیں وعدہ کرتی ہوں کہ صبر کروں گی اور کوئی جزع فزع کا کلمہ مُنہ سے نہیں نکالوں گی؛ چنانچہ وُہ گئیں اور بھائی کی نعش کو دیکھ کر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ پڑھتی ہوئی خاموش ہو گئیں[6]۔ قریش نے دُوسرے صحابہ کی نعشوں کے ساتھ بھی کم وبیش یہی وحشیانہ سلوک کیا تھا؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن جحشؓ کی نعش کو بھی بُری طرح بگاڑا گیا تھا۔ جُوں جُوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک نعش سے ہٹ کر دُوسری نعش کی طرف جاتے تھے۔ آپؐ کے چہرہ پر غم والم کے آثار زیادہ ہوتے جاتے تھے۔ غالباً اسی موقعہ پر آپؐ نے فرمایا کہ کوئی جاکر دیکھے کہ سعد بن الربیع رئیسِ انصار کا کیا حال ہے۔

---

[1] طبری و ابن ہشام [2] بخاری حالات اُحد [3] زرقانی [4] ابن سعد
[5] ابن ہشام و طبری [6] ابن ہشام

آیا وہ زندہ ہیں یا شہید ہو گئے ؟ کیونکہ میں نے لڑائی کے وقت دیکھا تھا کہ وہ دشمن کے نیزوں میں بری طرح گھرے ہوئے تھے۔ آپؐ کے فرمانے پر ایک انصاری صحابی اُبَیّ بن کعب گئے اور میدان میں اِدھر اُدھر سعد کو تلاش کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر انھوں نے اونچی اونچی آوازیں دینی شروع کیں اور سعد کا نام لے لے کر پکارا مگر پھر بھی کوئی سراغ نہ ملا۔ مایوس ہو کر وہ واپس جانے کو تھے کہ انہیں خیال آیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیکر تو پکاروں۔ شاید اس طرح کچھ پتہ چل جاوے؛ چنانچہ انھوں نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔ سعد بن ربیع کہاں ہیں مجھے رسُول اللہ نے ان کی طرف بھیجا ہے۔ اس آواز نے سعد کے نیم مُردہ جسم میں ایک بجلی کی لہر دوڑا دی اور انھوں نے چونک کر مگر نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا "کون ہے۔ میں یہاں ہوں" اُبَیّ بن کعب نے غور سے دیکھا تو تھوڑے فاصلہ پر مقتولین کے ایک ڈھیر میں سعد کو پایا جو اس وقت نزع کی حالت میں جان توڑ رہے تھے۔ اُبَیّ بن کعب نے اُن سے کہا کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے بھیجا ہے کہ میں تمہاری حالت سے آپؐ کو اطلاع دوں۔ سعد نے جواب دیا کہ رسول اللہ سے میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ خدا کے رسولوں کو جو ان کے متبعین کی قربانی اور اخلاص کی وجہ سے ثواب ملا کرتا ہے خدا آپؐ کو وہ ثواب سارے نبیوں سے بڑھ چڑھ کر عطا فرمائے اور آپؐ کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرے اور میرے بھائی مسلمانوں کو بھی میرا سلام پہنچانا اور میری قوم سے کہنا کہ اگر تم میں زندگی کا دم ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف پہنچ گئی تو خدا کے سامنے تمہارا کوئی عذر نہیں ہو گا۔ یہ کہہ کر سعد نے جان دے دی[1]

اُحد کے شہداء میں ایک صاحب مصعب بن عمیر تھے۔ یہ وہ سب سے پہلے مہاجر تھے جو مدینہ میں اسلام کے مبلغ بنکر آئے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں مصعب مکہ کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ خوش پوش اور بانکے سمجھے جاتے تھے اور بڑے ناز و نعمت میں رہتے تھے[2] اسلام لانے کے بعد اُن کی حالت بالکل بدل گئی چنانچہ روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اُن کے بدن پر ایک کپڑا دیکھا جس پر کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ آپؐ کو ان کا وہ پہلا زمانہ یاد آ گیا تو آپؐ چشم پُر آب ہو گئے[3] اُحد میں جب مصعب شہید ہوئے تو اُن کے پاس اتنا کپڑا بھی نہیں تھا کہ جس سے ان کے بدن کو چھپایا جا سکتا۔ پاؤں ڈھانکتے تھے تو سر ننگا ہو جاتا تھا اور سر ڈھانکتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سر کو کپڑے سے ڈھانک کر پاؤں کو گھاس سے چھپا دیا گیا[4]

نعشوں کی دیکھ بھال کے بعد تکفین کا کام شروع ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو

---

[1] مؤطا کتاب الجہاد و زرقانی و ابن ہشام ؛ [2] اصابہ حالات مصعب ؛ [3] ترمذی ابواب الزہد
[4] بخاری حالات اُحد ؛

کپڑے شہداء کے بدن پر ہیں وہ اسی طرح رہنے دیئے جائیں اور شہداء کو غسل نہ دیا جاوے؛ البتہ کسی کے پاس کفن کے لیے زائد کپڑا ہو تو وہ پہنے ہوئے کپڑوں کے اوپر لپیٹ دیا جاوے۔ نماز جنازہ بھی اُس وقت ادا نہیں کی گئی؛ چنانچہ بغیر غسل دیئے اور بغیر نماز ادا کئے شہداء کو دفنا دیا گیا۔ اور عموماً ایک ایک کپڑے میں دو دو صحابیوں کو اکٹھا کفنا کر ایک ہی قبر میں اکٹھا دفن کر دیا گیا جس صحابی کو قرآن شریف زیادہ آتا تھا اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت لحد میں اُتارتے ہوئے مقدم رکھا جاتا تھا[1] گو اس وقت نمازِ جنازہ ادا نہیں کی گئی لیکن بعد میں زمانہ وفات کے قریب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر شہداء اُحد پر جنازہ کی نماز ادا کی اور بڑے درد دل سے اُن کے لیے دُعا فرمائی۔ آپؐ اُحد کے شہداء کو خاص محبت اور احترام سے دیکھتے تھے۔[2] ایک دفعہ آپؐ اُحد کے شہداء کی قبروں کے پاس سے گذرے تو فرمایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ایمان کا میں شاہد ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! کیا ہم ان کے بھائی نہیں ہیں؟ کیا ہم نے اُنہیں کی طرح اسلام قبول نہیں کیا؟ کیا ہم نے انہی کی طرح خدا کے رستے میں جہاد نہیں کیا؟ آپؐ نے فرمایا۔ ”ہاں! لیکن مجھے کیا معلوم ہے کہ میرے بعد تم کیا کیا کام کرو گے۔“ اس پر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور بہت روئے اور عرض کیا۔ یارسول اللہ! کیا ہم آپؐ کے بعد زندہ رہ سکیں گے۔[3] صحابہ بھی اُحد کے شہداء کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُحد کی یاد کو ایک مقدس چیز کے طور پر اپنے دلوں میں تازہ رکھتے تھے؛ چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوف کے سامنے افطاری کا کھانا آیا جو غالباً کسی قدر پُر تکلف تھا۔ اس پر انہیں اُحد کا زمانہ یاد آگیا جب مسلمانوں کے پاس اپنے شہداء کو کفنانے کیلئے کپڑا تک نہیں تھا اور وہ ان کے بدنوں کو چھپانے کے لیئے گھاس کاٹ کاٹ کر ان پر لپیٹتے تھے اور اس یاد نے عبدالرحمن بن عوف کو ایسا بے چین کر دیا کہ وہ بے تاب ہو کر رونے لگ گئے اور کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے حالانکہ وہ روزے سے تھے۔[4]

سارے انتظامات سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شام کے قریب مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں عقیدت کیش دُور دُور تک آگے آئے ہوئے تھے۔ ایک انصاری عورت سخت گھبراہٹ کی حالت میں گھر سے نکل کر اُحد کے راستہ پر آرہی تھی کہ راستہ میں اُسے وہ صحابی ملے جو اُحد سے واپس آرہے تھے اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ صحابہ نے اُسے اطلاع دی کہ تمہارا باپ اور بھائی اور خاوند سب اُحد میں شہید ہوئے۔ مخلص خاتون جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت سُننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی بے چین ہو کر بولی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ رسولِ خدا کا کیا حال ہے؟ اُنھوں نے کہا۔ رسول اللہ

---

[1] بخاری حالات غزوہ اُحد و زرقانی [2] بخاری حالات اُحد [3] مؤطا امام مالک کتاب الجہاد
[4] بخاری حالات غزوہ اُحد

تو خدا کے فضل سے بخیریت ہیں اور یہ تشریف لا رہے ہیں۔ جب اس کی نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی، تو بے اختیار ہو کر بولی۔ کُلُّ مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ جَلَلٌ "اگر آپ زندہ ہیں تو پھر سب مصیبتیں ہیچ ہیں"[1] جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں پہنچے اور انصار کے گھروں کے پاس سے گذرے تو گھر گھر سے رونے چلانے کی آواز آتی تھی اور عورتیں عرب کی قدیم رسم کے مطابق نوحہ کر رہی تھیں۔ آپ نے یہ نظارہ دیکھا تو مسلمانوں کی تکلیف کا خیال کر کے آپ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پھر آپ نے ان کو تسلی دینے کے خیال سے فرمایا۔ لٰکِنْ حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ یعنی ہمارے چچا اور رضاعی بھائی حمزہ بھی شہید ہوئے ہیں مگر کسی عورت نے اس طرح ان کا ماتم نہیں کیا۔" رؤسائے انصار سمجھے کہ آپ شاید اس حسرت کا اظہار فرما رہے ہیں کہ اس غریب الوطنی کی حالت میں حمزہ کو کوئی رونے والا نہیں۔ وہ فوراً اپنی عورتوں کے پاس گئے اور کہا کہ بس اب اپنے مردوں پر رونا بند کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر جا کر حمزہ کا ماتم کرو (اللہ اللہ! اس غلط فہمی میں بھی کیا جذبۂ اخلاص مخفی تھا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مکان پر ماتم کا شور سنا تو پوچھا یہ کیسا شور ہے؟ عرض کیا گیا۔ انصار کی عورتیں حمزہ کا نوحہ کرتی ہیں۔ آپ نے اُن کی محبت کی قدر کرتے ہوئے ان کے واسطے دُعائے خیر فرمائی لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ اس طرح نوحہ کرنا اسلام میں منع ہے[2] اور آئندہ کے لیے نوحہ کی رسم یعنی بین کرنا یا پیٹنا یا بال نوچنا وغیر ذالک اسلام میں ممنوع قرار دیدی گئی[3] ایک نوجوان صحابی آپ کے سامنے آئے اور آپ نے دیکھا کہ ان کا چہرہ اپنے باپ کی شہادت پر مغموم ہے۔ فرمایا جابر کیا میں تمہیں ایک خوشی کی خبر سناؤں؟ جابر نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا۔ جب تمہارے والد شہید ہو کر اللہ کے حضور پیش ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے بے حجاب ہو کر کلام فرمایا اور فرمایا کہ جو مانگنا چاہتے ہو مانگو۔ تمہارے باپ نے عرض کیا۔ اے میرے اللہ! تیری کسی نعمت کی کمی نہیں ہے، لیکن خواہش ہے کہ پھر دنیا میں جاؤں اور تیرے دین کے رستہ میں پھر جان دُوں۔ خدا نے فرمایا ہم تمہاری اس خواہش کو بھی ضرور پورا کر دیتے لیکن ہم یہ عہد کر چکے ہیں کہ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ یعنی "کوئی مردہ پھر زندہ ہو کر اس دُنیا میں نہیں آسکتا"۔ جابر کے والد نے کہا تو پھر میرے بھائیوں کو میری اطلاع دے دی جاوے تاکہ ان کی جہاد کی رغبت ترقی کرے۔ اس پر یہ آیت اُتری کہ جو لوگ خدا کے رستے میں شہید ہوتے ہیں انہیں مُردہ نہ سمجھا کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے خدا کے پاس خوشی کی زندگی گذار رہے ہیں[4] حضرت سعد بن معاذ رئیس قبیلہ اوس نے اپنی بوڑھی والدہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اُن سے اُن کے لڑکے عمرو بن معاذ کی شہادت پر اظہار ہمدردی کیا۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ

---

[1] ترمذی و ابن ماجہ بحوالہ زرقانی [2] تاریخ خمیس [3] ابن سعد
[4] ترمذی و ابن ماجہ بحوالہ زرقانی

جب آپ سلامت ہیں تو ہمیں کیا غم ہے۔"[1]

غزوہ حمراء الاسد

یہ رات مدینہ میں ایک سخت خوف کی رات تھی کیونکہ باوجود اس کے کہ بظاہر لشکرِ قریش نے مکہ کی راہ لے لی تھی یہ اندیشہ تھا کہ ان کا یہ فعل مسلمانوں کو غافل کرنے کی نیت سے نہ ہو اور ایسا نہ ہو کہ وہ اچانک لوٹ کر مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں لہٰذا اس رات کو مدینہ میں پہرہ کا انتظام کیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا خصوصیت سے تمام رات صحابہ نے پہرہ دیا۔[2] صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ اندیشہ محض خیالی نہ تھا کیونکہ فجر کی نماز سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ قریش کا لشکر مدینہ سے چند میل جا کر ٹھہر گیا ہے اور رؤسا قریش میں یہ سرگرم بحث جاری ہے کہ اس فتح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیوں نہ مدینہ پر حملہ کر دیا جاوے اور بعض قریش ایک دوسرے کو طعنہ دے رہے ہیں کہ نہ تم نے محمدؐ کو قتل کیا اور نہ مسلمان عورتوں کو لونڈیاں بنایا اور نہ اُن کے مال و متاع پر قابض ہوئے، بلکہ جب تم ان پر غالب آئے اور تمہیں یہ موقعہ ملا کہ تم اُن کو ملیا میٹ کر دو تو تم انہیں یونہی چھوڑ کر واپس چلے آئے تاکہ وہ پھر زور پکڑ جاویں۔ پس اب بھی موقعہ ہے واپس چلو اور مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کی جڑ کاٹ دو۔ اس کے مقابل میں دوسرے یہ کہتے تھے کہ تمہیں ایک فتح حاصل ہوئی ہے، اسے غنیمت جانو اور مکہ واپس لوٹ چلو ایسا نہ ہو کہ یہ شہرت بھی کھو بیٹھو۔ اور یہ فتح شکست کی صورت میں بدل جاوے کیونکہ اب اگر تم لوگ واپس لوٹ کر مدینہ پر حملہ آور ہو گے تو یقیناً مسلمان جان توڑ کر لڑیں گے اور جو لوگ اُحد میں شامل نہیں ہوئے تھے وہ بھی میدان میں نکل آئیں گے۔[3] مگر بالآخر جوشیلے لوگوں کی رائے غالب آئی اور قریش مدینہ کی طرف لوٹنے کے لیے تیار ہو گئے۔[4] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فوراً اعلان فرمایا کہ مسلمان تیار ہو جائیں مگر ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ سوائے ان لوگوں کے جو اُحد میں شریک ہوئے تھے اور کوئی شخص ہمارے ساتھ نہ نکلے۔[5] چنانچہ اُحد کے مجاہدین جن میں سے اکثر زخمی تھے اپنے زخموں کو باندھ کر اپنے آقا کے ساتھ ہو لیے۔ اور لکھا ہے کہ اس موقعہ پر مسلمان ایسی خوشی اور جوش کے ساتھ نکلے کہ جیسے کوئی فاتح لشکر فتح کے بعد دشمن کے تعاقب میں نکلتا ہے۔ آٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے آپؐ حمراء الاسد میں پہنچے[6] جہاں دو مسلمانوں کی نعشیں میدان میں پڑی ہوئی پائی گئیں اور تحقیقات پر معلوم ہوا کہ یہ وُہ جاسوس تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے پیچھے روانہ کئے تھے، مگر جنہیں قریش نے موقعہ پا کر قتل کر دیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہداء کو ایک قبر کھدوا کر اُس میں اکٹھا دفن کروا دیا۔ اور اب چونکہ شام ہو چکی

---

[1] تاریخ خمیس [2] ابن سعد [3] زرقانی و خمیس [4] ابن ہشام

[5] ابن ہشام و ابن سعد [6] ابن سعد

تھی آپ نے یہیں ڈیرا ڈالنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میدان میں مختلف مقامات پر آگ روشن کردی جاوے؛ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے حمراء الاسد کے میدان میں پانچ سو آگیں شعلہ زن ہوگئیں جو ہر دُور سے دیکھنے والے کے دل کو مرعوب کرتی تھیں[1]۔ غالباً اسی موقعہ پر قبیلہ خزاعہ کا ایک مشرک رئیس معبد نامی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے اُحد کے مقتولین کے متعلق اظہار ہمدردی کی اور پھر اپنے راستہ پر روانہ ہوگیا۔ دُوسرے دن جب وہ مقام روحاء میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ قریش کا لشکر وہاں ڈیرا ڈالے پڑا ہے۔ اور مدینہ کی طرف واپس چلنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ معبد فوراً ابوسفیان کے پاس گیا اور اسے جاکر کہنے لگا کہ تم کیا کرنے لگے ہو۔ واللہ میں تو ابھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کو حمراء الاسد میں چھوڑ کر آیا ہوں اور ایسا بارعب لشکر میں نے کبھی نہیں دیکھا اور اُحد کی ہزیمت کی ندامت میں اُن کو اتنا جوش ہے کہ تمہیں دیکھتے ہی بھسم کر جائیں گے۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں پر معبد کی اِن باتوں سے ایسا رُعب پڑا کہ وہ مدینہ کی طرف لوٹنے کا ارادہ ترک کرکے فوراً مکہ کی طرف روانہ ہوگئے[2]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکرِ قریش کے اس طرح بھاگ نکلنے کی اطلاع موصول ہوئی تو آپ نے خدا کا شکر کیا۔ اور فرمایا کہ یہ خدا کا رُعب ہے جو اُس نے کفار کے دلوں پر مسلط کر دیا ہے[3]۔

اس کے بعد آپ نے حمراء الاسد میں دو تین دن اور قیام فرمایا اور پھر پانچ دن کی غیر حاضری کے بعد مدینہ میں واپس تشریف لے آئے۔ اس مہم میں قریش کے دو سپاہی جن میں سے ایک غدار اور دوسرا جاسوس تھا مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوئے اور چونکہ قوانین جنگ کے ماتحت اُن کی سزا قتل تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ اُن میں سے ایک مکہ کا مشہور شاعر ابوعزّہ تھا جو بدر کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوا تھا اور پھر اس کے معافی مانگنے اور یہ وعدہ کرنے پر کہ وہ پھر کبھی مسلمانوں کے خلاف لڑائی کے لیے نہیں نکلے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے بلا فدیہ چھوڑ دیا تھا، مگر وُہ غداری کر کے پھر مسلمانوں کے خلاف شریکِ جنگ ہوا اور نہ صرف خود شریک ہوا بلکہ اُس نے اپنے اشتعال انگیز اشعار سے دُوسروں کو بھی اُبھارا۔ چونکہ ایسے آدمی کی غداری مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ہوسکتی تھی۔ پس اب جب وہ دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے قتل کیے جانے کا حکم دیا۔ ابوعزّہ نے پھر پہلے کی طرح زبانی معافی سے رہائی حاصل کرنی چاہی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے انکار فرما دیا کہ لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَیْنِ۔ "یعنی مومن ایک سوراخ میں سے دو دفعہ نہیں کاٹا جاتا۔"[4] دوسرا قیدی معاویہ بن مغیرہ تھا۔ یہ شخص حضرت عثمان بن عفان کے رشتہ داروں میں سے تھا، مگر سخت معاندِ اسلام تھا۔ جنگِ اُحد کے بعد وُہ خفیہ خفیہ مدینہ کے گرد و نواح میں گھومتا رہا

---

[1] ابن سعد [2] طبری و ابن ہشام [3] زرقانی [4] ابن ہشام۔

مگر صحابہ نے اُسے دیکھ لیا اور پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپؐ نے اسے حضرت عثمان کی سفارش پر یہ وعدہ لے کر چھوڑ دیا کہ تین دن کے اندر اندر وہاں سے رُخصت ہو جائے ورنہ اسے جاسُوسی کی سزا میں قتل کر دیا جائے گا۔ معاویہ نے وعدہ کیا کہ میں تین دن تک چلا جاؤں گا۔ مگر جب یہ میعاد گذر گئی تو پھر بھی وہ وہیں خفیہ خفیہ پھرتا ہوا پایا گیا جس پر اُسے قتل کر دیا گیا[1] تاریخ میں یہ مذکور نہیں ہوا کہ اس کی نیّت کیا تھی۔ مگر اس طرح خفیہ خفیہ مدینہ کے علاقہ میں رہنا اور باوجود متنبہ کر دیئے جانے کے مقررہ میعاد کے بعد بھی ٹھہرے رہنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی خطرناک ارادے سے وہاں ٹھہرا ہوا تھا اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ اُحد کے میدان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچ جانے پر پیچ و تاب کھاتا ہوا مدینہ میں آپؐ کے خلاف کوئی بدارادہ لے کر آیا ہو اور یہود یا منافقینِ مدینہ کی سازش سے کوئی مخفی وار کرنا چاہتا ہو، مگر خدا تعالیٰ نے حفاظت فرمائی اور اس کی تجویز کارگر نہ ہوئی۔

جنگِ اُحد کے نتائج

مستقل نتائج کے لحاظ سے تو جنگِ اُحد کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں اور بدر کے مقابل میں یہ جنگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن وقتی طور پر ضرور اس جنگ نے مسلمانوں کو بعض لحاظ سے نقصان پہنچایا۔ اوّل اُن کے ستر آدمی اس جنگ میں شہید ہوئے جن میں سے بعض اکابر صحابہ میں سے تھے اور زخمیوں کی تعداد تو بہت زیادہ تھی۔ دوسرے مدینہ کے یہود اور منافقین جو جنگِ بدر کے نتیجہ میں کچھ مرعوب ہوگئے تھے اب کچھ دلیر ہوگئے۔ بلکہ عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں نے تو کھلم کھلا تمسخر اڑایا اور طعنے دیئے[2] تیسرے قریش مکہ کو بہت جرأت ہوگئی اور انہوں نے اپنے دل میں یہ سمجھ لیا کہ ہم نے نہ صرف بدر کا بدلہ اُتار لیا ہے بلکہ آئندہ بھی جب کبھی جتھہ بنا کر حملہ کریں گے مسلمانوں کو زیر کر سکیں گے۔ چوتھے عام قبائلِ عرب نے بھی اُحد کے بعد زیادہ جرأت سے سر اُٹھانا شروع کر دیا[3] مگر باوجود ان نقصانات کے یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ جو نقصان قریش کو جنگِ بدر نے پہنچایا تھا جنگِ اُحد کی فتح اس کی تلافی نہیں کر سکتی تھی۔ جنگِ بدر میں مکہ کے تمام وہ رؤساء جو درحقیقت قریش کی قومی زندگی کی رُوح تھے ہلاک ہوگئے تھے اور جیسا کہ قرآن شریف بیان کرتا ہے اس قوم کی صحیح معنوں میں جڑ کاٹ دی گئی تھی اور یہ سب کچھ ایک ایسی قوم کے ہاتھوں ہوا تھا جو ظاہری سامان کے لحاظ سے ان کے مقابلہ میں بالکل حقیر تھی۔ اس کے مقابلہ میں بے شک مسلمانوں کو اُحد کے میدان میں نقصان پہنچا، لیکن وہ اس نقصان کے مقابلہ میں بالکل حقیر اور عارضی تھا جو بدر میں قریش کو پہنچا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو اسلامی سوسائٹی کے مرکزی نقطہ تھے اور جو قریش کی معاندانہ کارروائیوں کا اصل نشانہ تھے خدا کے فضل سے زندہ موجود تھے۔ اس کے علاوہ اکابر صحابہ بھی سوائے

---

[1] ابن ہشام [2] طبری [3] لائف آف محمد مصنفہ سر ولیم میور

ایک دو کے سب کے سب سلامت تھے اور پھر مسلمانوں کی یہ ہزیمت ایسی فوج کے مقابلہ میں تھی جوان سے تعداد میں کئی گنے زیادہ اور سامانِ حرب میں کئی گنے مضبوط تھی پس مسلمانوں کے لیے بدر کی عظیم الشان فتح کے مقابلہ میں اُحد کی ہزیمت ایک معمولی چیز تھی اور یہ نقصان بھی مسلمانوں کے لیے ایک لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ اُن پر یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوگئی کہ رسُول اللہ کے منشاء اور ہدایت کے خلاف قدم زن ہونا کبھی بھی موجب فلاح اور بہبودی نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ٹھہرنے کی رائے دی اور اس کی تائید میں اپنا ایک خواب بھی سُنایا مگر انھوں نے باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اُحد کے ایک درہ میں متعین فرمایا اور انتہائی تاکید فرمائی کہ خواہ کچھ ہو جاوے اس جگہ کو نہ چھوڑنا مگر وہ غنیمت کے خیال سے اسجگہ کو چھوڑ کر نیچے اُتر آئے اور گو یہ عملی کمزوری ایک محدود طبقہ کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی مگر چونکہ انسانی تمدّن سب کو ایک لڑی میں پرو کر رکھتا ہے اس لیے اس کمزوری کے نتیجہ میں نقصان سب نے اُٹھایا جیساکہ اگر کوئی فائدہ ہوتا تو وہ بھی سب اُٹھاتے۔ پس اُحد کی ہزیمت اگر ایک لحاظ سے موجب تکلیف تھی تو دوسری جہت سے وہ مسلمانوں کے لیے ایک مفید سبق بھی بن گئی۔ اور تکلیف ہونے کے لحاظ سے بھی مسلمان اس سیلاب عظیم کی طرح جو کسی جگہ رُک کر اور ٹھوکر کھا کر زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ نہایت سُرعت کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ قرآن شریف میں جنگِ اُحد کا ذکر زیادہ تر سورۃ آلِ عمرانؔ[1] میں آتا ہے جہاں اس جنگ کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مسلمانوں کو آئندہ کے لیے بعض اصولی ہدایتیں دی گئی ہیں۔

اسلامی قانون ورثہ

جنگِ اُحد کے بیان میں سعد بن الربیع کی شہادت کا ذکر گذر چکا ہے۔ سعدؓ ایک متمول آدمی تھے اور اپنے قبیلہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی صرف دو لڑکیاں تھیں اور بیوی تھی۔ چونکہ ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تقسیم ورثہ کے متعلق کوئی جدید احکام نازل نہیں ہوئے تھے اور صحابہ میں قدیم دستورِ عرب کے مطابق ورثہ تقسیم ہوتا تھا یعنی متوفی کی نرینہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں اس کے جدّی اقرباء جائیداد پر قابض ہو جاتے تھے اور بیوہ اور لڑکیاں یونہی خالی ہاتھ رہ جاتی تھیں۔ اس لیے سعد بن الربیع کی شہادت پر اُن کے بھائی نے سارے ترکہ پر قبضہ کر لیا اور ان کی بیوہ اور لڑکیاں بالکل بے سہارا رہ گئیں۔ اس تکلیف سے پریشان ہو کر سعد کی بیوہ اپنی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ساری سرگذشت سُنا کر اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرتِ صحیحہ کو اس درد کے قصہ نے ایک ٹھیس لگائی مگر چونکہ ابھی تک اس معاملہ میں خدا کی

---

[1] رکوع ۱۳ تا ۱۸

طرف سے آپؐ پر کوئی احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا تم انتظار کرو۔ پھر جو احکام خدا کی طرف سے نازل ہونگے اُن کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا؛ چنانچہ آپؐ نے اس بارہ میں توجہ فرمائی اور ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ آپؐ پر ورثہ کے معاملہ میں بعض وہ آیات نازل ہوئیں جو قرآن شریف کی سورۃ نساء[1] میں بیان ہوئی ہیں۔ اس پر آپؐ نے سعدؓ کے بھائی کو بُلایا اور اس سے فرمایا کہ سعدؓ کے ترکہ میں سے دو ثُلث ان کی لڑکیوں اور ایک ثُمن اپنی بھاوج کے سُپرد کردو اور جو باقی بچے وہ خود لے لو[2] اور اس وقت سے تقسیم ورثہ کے متعلق جدید احکام کی ابتداء قائم ہوگئی جس کی رُو سے بیوی اپنے صاحبِ اولاد خاوند کے ترکہ میں آٹھویں حصّہ کی اور بے اولاد خاوند کے ترکہ میں چہارم حصّہ کی اور لڑکی اپنے باپ کے ترکہ میں اپنے بھائی کے حصّہ کی نسبت نصف حصّہ کی اور اگر بھائی نہ ہو تو سارے ترکہ میں سے حالات کے اختلاف کے ساتھ دو ثُلث یا نصف کی اور ماں اپنے صاحبِ اولاد لڑکے کے ترکہ میں چھٹے حصّہ کی۔ اور بے اولاد لڑکے کے ترکہ میں تیسرے حصّہ کی حقدار قرار دی گئی اور اسی طرح دوسرے ورثاء کے حصّے مقرر ہوگئے[3] اور عورت کا وہ فطری حق جو اس سے چھینا جاچکا تھا اُسے واپس مِل گیا۔

اِس موقعہ پر یہ نوٹ کرنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ نے طبقۂ نسواں کے تمام جائز اور واجبی حقوق کی پوری پوری حفاظت فرمائی ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ دُنیا کی تاریخ میں آپؐ سے پہلے یا آپؐ کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں گذرا جس نے عورت کے حقوق کی ایسی حفاظت کی ہو جیسی آپؐ نے کی ہے؛ چنانچہ وِرثہ میں۔ بیاہ شادی میں خاوند بیوی کے تعلقات میں، طلاق و خلع میں۔ اپنی ذاتی جائیداد پیدا کرنے کے حق میں۔ اپنی جائیداد کے استعمال کرنے کے حق میں۔ تعلیم کے حقوق میں۔ بچوں کی ولایت و تربیت کے حقوق میں۔ قومی اور ملکی معاملات میں حصّہ لینے کے حق میں۔ شخصی آزادی کے معاملہ میں۔ دینی حقوق اور ذمہ داریوں میں۔ الغرض دین و دُنیا کے ہر اس میدان میں جس میں عورت قدم رکھ سکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے تمام واجبی حقوق کو تسلیم کیا ہے اور اسکے حقوق کی حفاظت کو اپنی امت کیلئے ایک مقدس امانت اور فرض کے طور پر قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کی عورت آپؐ کی بعثت کو اپنے لیے ایک نجات کا پیغام سمجھتی تھی۔ مجھے اپنے رستہ سے ہٹنا پڑتا ہے ورنہ میں بتاتا کہ عورت کے معاملہ میں آپؐ کی تعلیم حقیقۃً اس اعلیٰ مقام پر قائم ہے جس تک دُنیا کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں پہنچا اور یقیناً آپؐ کا یہ پیارا قول ایک گہری صداقت پر مبنی ہے کہ حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمُ النِّسَاءُ وَالطِّیْبُ وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ[4] یعنی دُنیا کی چیزوں

---

[1] رکوع ۱ و ۲ [2] ترمذی و ابوداؤد کتاب الفرائض و ابن جریر سورۃ نساء [3] سورۃ نساء ع ۲۰۱
[4] نسائی و مسند احمد بروایت الجامع الصغیر سیوطی جلد ۱ صفحہ ۱۲۲

میں سے میری فطرت کو جن چیزوں کی محبت کا خمیر دیا گیا ہے۔ وہ عورت اور خوشبو ہیں مگر میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز یعنی عبادتِ الٰہی میں رکھی گئی ہے۔

شراب کی حرمت

یہ بیان گذر چکا ہے کہ عرب میں شراب کثرت کے ساتھ پی جاتی تھی بلکہ شراب نوشی عربوں کے قومی اخلاق کا ایک حصہ بن چکی تھی اور کوئی مجلس شراب کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ خاص فیشن کے لوگوں میں شراب نوشی کے لیے خاص خاص اوقات مقرر تھے۔ جب وہ مجلسیں جما جما کر بدمستیاں کرتے تھے۔ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فطری سعادت کے ماتحت خود کبھی شراب نہیں پی اور نبوت سے قبل بھی اس بدعادت سے ہمیشہ مجتنب رہے اور بعض صحابہ بھی ابتداء سے ہی تارکِ شراب تھے، لیکن چونکہ اس وقت تک مذہبی طور پر شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے صحابہ میں بہت سے لوگ شراب پیتے تھے اور بعض اوقات شراب نوشی کے بدنتائج بھی صحابہ میں رونما ہو جاتے تھے، چنانچہ حدیث میں روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت حمزہؓ نے شراب کے نشہ میں حضرت علیؓ کے اونٹ ذبح کر دیئے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سمجھانے کے لیے گئے تو انہوں نے آپ کو بھی نہیں پہچانا اور آپؐ سے بے اعتنائی کی[1] اسی طرح روایت آتی ہے کہ ایک دعوت میں ایک صحابی نے کسی قدر زیادہ شراب پی لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس کے بعد وہ نماز پڑھانے کے لیے اہلِ مجلس کے امام بنے تو قرأت میں اصل آیت کی بجائے کچھ کا کچھ پڑھ گئے[2] اس قسم کے واقعات کی وجہ سے بعض صحابہ جن میں حضرت عمرؓ کا نام خاص طور پر مذکور ہوا ہے۔ اپنی جگہ پیچ و تاب کھاتے تھے کہ شراب نوشی کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ ہونا چاہیئے۔ لیکن گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اس عادت کو بہت مکروہ اور ضرر رساں سمجھتے تھے مگر چونکہ ابھی تک اس بارہ میں کوئی خدائی حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے آپؐ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

بالآخر غزوہ اُحد کے بعد ۳ سنہ ہجری کے آخر یا ۴ سنہ ہجری کے شروع میں خدائی وحی نازل ہوئی اور شراب نوشی اسلام میں قطعی طور پر حرام قرار دیدی گئی[3] اس حُرمت کے حکم کو صحابہ کرام نے جس انشراح اور رضا کے ساتھ قبول کیا وُہ اس روحانی اثر کی ایک بہت دلچسپ مثال ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک صُحبت نے اُن کے دلوں میں پیدا کیا تھا۔ حدیث میں انس بن مالک سے ایک روایت آتی ہے کہ جب شراب کی حُرمت کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان فرمایا اور پھر آپؐ نے ایک صحابی سے ارشاد فرمایا کہ وہ مدینہ کی گلی کوچوں میں چکر لگا کر اس کی منادی کر دیں۔ انسؓ کہتے ہیں کہ اس

---

[1] بخاری ابواب غزوہ بدر و مسلم کتاب الاشربہ [2] ابو داؤد کتاب الاشربہ
[3] زرقانی حالات غزوہ اُحد

وقت مَیں ایک مکان میں ابوطلحہ انصاری اور بعض دُوسرے صحابیوں کو شراب پلا رہا تھا۔ ہم نے اس منادی کی آواز سُنی تو ابوطلحہ نے مجھ سے کہا کہ دیکھو یہ شخص کیا منادی کر رہا ہے۔ مَیں نے پتہ لیا تو معلوم ہوا کہ شراب حرام کر دی گئی ہے۔ جب مَیں نے واپس آکر اہلِ مجلس کو اس کی اطلاع دی تو اُسے سُنتے ہی ابوطلحہ نے مجھ سے کہا اُٹھو اور شراب کے مٹکے زمین پر بہا دو۔[1] انسؓ کہتے ہیں کہ اس دن مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی ہوئی نظر آتی تھی۔[2] اور اسی باب کی ایک دُوسری روایت میں ہے کہ اُس شخص کی منادی سُن کر کسی نے یہ نہیں کہا کہ پہلے تحقیق تو کر لو کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ۔ بلکہ فوراً سب نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور شراب نوشی سے دفعۃً رُک گئے۔[3] شراب نوشی کی سی عادت کو اور عادت بھی وہ جو گویا عرب کی گھٹی میں تھی یکلخت ترک کر دینا اور ترک بھی ایسی حالت میں کرنا کہ شراب کا دَور عملاً چل رہا ہو اور پینے والے اُس کے نشہ میں متوالے ہو رہے ہوں ضبطِ نفس کی ایک ایسی شاندار مثال ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ گو جیسا کہ بخاری کی بعض روایات میں اشارہ پایا جاتا ہے شراب کی قطعی حرمت کا حکم غزوۂ اُحد کے بعد نازل ہوا۔ مگر اس سے پہلے بھی بعض قرآنی آیات اس مضمون کی نازل ہو چکی تھیں جن میں شراب کی برائی بیان کی گئی تھی؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ سب سے پہلے جو آیت شراب کے بارے میں نازل ہوئی وہ یہ تھی کہ بیشک شراب میں بعض فوائد ہیں مگر اس کے نقصانات اس کے فوائد پر غالب ہیں۔[4] اس پر حضرت عمرؓ نے جنہیں شراب کے خلاف غالباً سارے صحابہ میں سے زیادہ جوش تھا دُعا کی کہ اے خدا! ہمیں شراب کے معاملہ میں کوئی زیادہ کھلا کھلا حکم عطا کر۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اے مومنو! جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز میں شامل نہ ہوا کرو۔[5] اس پر حضرت عمرؓ نے پھر یہی دُعا کی کہ خدایا کوئی قطعی حکم نازل فرما۔ جس پر بالآخر یہ آیت اُتری کہ "اے مسلمانو! شراب اور جُوا ناپاک اور ضرر رساں افعال ہیں جن سے شیطان تمہارے اندر عداوت اور دشمنی پیدا کرنا چاہتا اور ان کے ذریعہ تمہیں خدا کے ذکر اور نماز سے غافل کرتا ہے پس تم ان چیزوں سے مجتنب رہو۔[6] جب یہ آیت اُتری تو مسلمانوں کی تسلی ہو گئی اور وہ شراب کو قطعی طور پر حرام سمجھ کر اس سے باز آ گئے۔[7] بلکہ اس کے بعد اُنہیں شراب سے ایسی دُوری پیدا ہو گئی کہ جو مسلمان ایسی حالت میں غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تھے کہ اُنھوں نے شراب پی ہوئی تھی انہیں ان شہداء کے متعلق بے چینی پیدا ہونے لگی کہ اُن کا کیا حشر ہوگا جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ حُرمت سے پہلے پہلے لوگوں نے جو کچھ کھایا پیا ہے اُس کی وجہ سے اُن پر کوئی ملامت نہیں۔[8] الغرض ۳ سنہ ہجری کے آخر یا ۴ سنہ ہجری

---

[1] بخاری تفسیر سورۃ مائدہ و مسلم کتاب الاشربہ [2] بخاری تفسیر سورۃ مائدہ [3] بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ مائدہ
[4] سورۃ بقرہ: ۲۲۰ [5] سورۃ نساء: ۴۵ [6] سورۃ مائدہ: ۹۱ [7] ابوداؤد کتاب الاشربہ
[8] بخاری تفسیر سورۃ مائدہ

کے شروع میں مگر بہرحال غزوہ اُحد کے بعد شراب نوشی اسلام میں قطعی طور پر حرام ہوگئی اور شراب کی تعریف میں ہر وہ چیز شامل قرار دی گئی جو نشہ پیدا کرتی اور انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے [۱] اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کی جڑ پر تبر رکھ دیا جو صحیح طور پر بدیوں کی ماں کہلاتی ہے۔

اس جگہ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ از روئے عقل شراب نوشی کیسی ہے۔ قرآن نے خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ شراب میں بعض فوائد بھی ہیں، مگر یہ کہ اس کے نقصانات اس کے فوائد سے زیادہ ہیں اور اصولی طور پر انسانی عقل اس مسئلہ پر اس سے زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتی۔ اور یہ ایک خوشی کا مقام ہے کہ ہزاروں سالوں کے تلخ تجربات کے بعد آج دُنیا اسی حقیقت کی طرف آرہی ہے جو اسلام نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے آشکارا کی تھی اور ہر ملک میں شراب نوشی کے سدباب کے لیے سوسائیٹیاں بن رہی ہیں، بلکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تو شراب کے خلاف ایک قانون بھی نافذ ہو چکا ہے جس کی تقلید میں بعض دوسرے ممالک میں بھی تحریک شروع ہے۔

بنو اسد کی شرارت اور سریہ ابو سلمہ محرم ۴ سنہ ہجری

جنگِ اُحد میں جو ہزیمت مسلمانوں کو پہنچی اس نے قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف سر اُٹھانے پر آگے سے بھی زیادہ دلیر کر دیا؛ چنانچہ ابھی جنگِ اُحد پر زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا اور صحابہ ابھی اپنے زخموں کے علاج سے بھی پوری طرح فارغ نہ ہوئے تھے کہ محرم ۴ سنہ ہجری میں اچانک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں یہ اطلاع پہنچی کہ قبیلہ اسد کا رئیس طلیحہ بن خویلد اور اس کا بھائی سلمہ بن خویلد اپنے علاقہ کے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں [۲] اس خبر کے ملتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے ملک کے حالات کے ماتحت اس قسم کی خبروں کے خطرات کو خوب سمجھتے تھے فوراً ڈیڑھ سو صحابیوں کا ایک تیز رو دستہ تیار کر کے اس پر ابو سلمہ بن عبد الاسد کو امیر مقرر فرمایا اور اُنہیں تاکید کی کہ یلغار کرتے ہوئے پہنچیں اور پیشتر اس کے کہ بنو اسد اپنی عداوت کو عملی جامہ پہنا سکیں انہیں منتشر کر دیں؛ چنانچہ ابو سلمہ نے تیزی مگر خاموشی کیساتھ بڑھتے ہوئے وسط عرب کے مقام قطن میں بنو اسد کو جا لیا، لیکن کوئی لڑائی نہیں ہوئی بلکہ بنو اسد کے لوگ مسلمانوں کو دیکھتے ہی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ اور ابو سلمہ چند دن کی غیر حاضری کے بعد مدینہ میں واپس پہنچ گئے [۳] اِس سفر کی غیر معمولی مشقت سے ابو سلمہ کا وہ زخم جو اُنہیں اُحد میں آیا تھا اور اب بظاہر مندمل ہو چکا تھا پھر خراب ہو گیا اور باوجود علاج معالجہ کے بگڑتا ہی گیا اور بالآخر اسی بیماری میں اس مخلص اور پرانے صحابی نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی تھے وفات پائی [۴] بنو اسد کا رئیس طلیحہ جس کا ذکر

---

[۱] بخاری و مسلم کتاب الاشربہ [۲] ابن سعد [۳] ابن سعد و زرقانی [۴] اصابہ حالات ابو سلمہ۔

اُوپر کیا گیا ہے بعد میں مسلمان ہوگیا، لیکن پھر مُرتد ہوگیا بلکہ نبوت کا جھوٹا مدعی بنکر فتنہ وفساد کا موجب بنا مگر بالآخر شکست کھا کر عرب سے بھاگ گیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ تائب ہوا اور آخر کئی اسلامی جنگوں میں حصّہ لیکر اسلام پر وفات پا گیا[1]

بنولحیان کی شرارت اور سفیان کا قتل۔ محرم ۴ سنہ ہجری

قریش کی اشتعال انگیزی اور اُحد میں مسلمانوں کی وقتی ہزیمت اب نہایت سُرعت کے ساتھ اپنے خطرناک نتائج ظاہر کر رہی تھی، چنانچہ انہی ایام میں جن میں بنواسد نے مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تیاری کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قبیلہ بنولحیان کے لوگ اپنے سردار سفیان بن خالد کی انگیخت پر اپنے وطن عرنہ میں جو مکہ سے قریب ایک مقام تھا ایک بہت بڑا لشکر جمع کر رہے ہیں اور اُن کا ارادہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کا ہے[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نہایت موقع شناس اور مختلف قبائل عرب کی حالت اور ان کے رؤساء کی طاقت واثر سے خوب واقف تھے اس خبر کے موصول ہوتے ہی سمجھ لیا کہ یہ ساری شرارت اور فتنہ انگیزی بنولحیان کے رئیس سفیان بن خالد کی ہے اور اگر اس کا وجود درمیان میں نہ رہے تو بنولحیان مدینہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے اور یہ بھی آپ جانتے تھے کہ سفیان کے بغیر اس قبیلہ میں فی الحال کوئی ایسا صاحب اثر شخص نہیں ہے جو اس قسم کی تحریک کا لیڈر بن سکے۔ لہٰذا یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر بنولحیان کے خلاف کوئی فوجی دستہ روانہ کیا گیا تو غریب مسلمانوں کے واسطے موجب تکلیف ہونے کے علاوہ ممکن ہے کہ یہ طریق ملک میں زیادہ کشت وخون کا دروازہ کھول دے۔ آپ نے یہ تجویز فرمائی کہ کوئی ایک شخص چلا جائے اور موقعہ پاکر اس فتنہ کے بانی مبانی اور اس شرارت کی جڑ سفیان بن خالد کو قتل کر دے؛ چنانچہ آپ نے اس غرض سے عبداللہ بن انیس انصاری کو روانہ فرمایا۔ اور چونکہ عبداللہ نے کبھی سفیان کو دیکھا نہیں تھا اس لیے آپ نے خود ان کو سفیان کا سارا حُلیہ وغیرہ سمجھا دیا اور آخر میں فرمایا کہ ہوشیار رہنا، سفیان ایک مجسّم شیطان ہے؛ چنانچہ عبداللہ بن انیس نہایت ہوشیاری کے ساتھ بنولحیان کے کیمپ میں پہنچے (جو واقعی مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری میں سرگرمی سے مصروف تھے) اور رات کے وقت موقعہ پاکر سفیان کا خاتمہ کر دیا۔ بنولحیان کو اس کا علم ہوا تو اُنھوں نے عبداللہ کا تعاقب کیا مگر وہ چھپتے چھپاتے ہوئے بچ کر نکل آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب عبداللہ بن انیس آئے تو آپ نے ان کی شکل دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ کامیاب ہوکر آئے ہیں؛ چنانچہ آپ نے اُنہیں دیکھتے ہی فرمایا اَفْلَحَ الْوَجْهُ یہ چہرہ تو بامُراد نظر آتا ہے۔ عبداللہ نے عرض کیا اور کیا خوب عرض کیا" اَفْلَحَ وَجْهُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" یارسول اللہ

---

[1] زرقانی حالات سریہ ابوسلمہ واصابہ حالات طلیحہ بن خویلد [2] ابن سعد وزرقانی

سب کامیابی آپ کی ہے۔" اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کا عصا عبداللہ کو بطور انعام کے عطا فرمایا اور فرمایا "یہ عصا تمھیں جنت میں ٹیک لگانے کا کام دے گا"۔ عبداللہ نے یہ مبارک عصا نہایت محبت و اخلاص کے ساتھ اپنے پاس رکھا اور مرتے ہوئے وصیت کی کہ اُسے اُن کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خوشی سے جس کا اظہار آپ نے عبداللہ کی بامُراد واپسی پر فرمایا اور اس انعام سے جو انہیں غیر معمولی طور پر عطا فرمایا۔ پتہ لگتا ہے کہ آپ سفیان بن خالد کی فتنہ انگیزی کو نہایت خطرناک خیال فرماتے تھے اور اس کے قتل کو امنِ عامہ کے لیے ایک موجبِ رحمت سمجھتے تھے۔[2]

کفار کی غداری اور واقعہ رجیع صفر ۴ھ

یہ دن مسلمانوں کے لیے سخت خطرہ کے دن تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چاروں طرف سے متوحش خبریں آرہی تھیں، لیکن سب سے زیادہ خطرہ آپ کو قریش مکہ کی طرف سے تھا جو جنگِ اُحد کی وجہ سے بہت دلیر اور شوخ ہو رہے تھے اس خطرہ کو محسوس کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ صفر ۴ سنہ ہجری میں اپنے دس صحابیوں کی ایک پارٹی تیار کی اور اُن پر عاصم بن ثابت کو امیر مقرر فرمایا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ خفیہ خفیہ مکہ کے قریب جا کر قریش کے حالات دریافت کریں اور ان کی کارروائیوں اور ارادوں سے آپ کو اطلاع دیں۔[3] لیکن ابھی یہ پارٹی روانہ نہیں ہوئی تھی کہ قبائل عضل اور قارۃ کے چند لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے قبائل میں بہت سے آدمی اسلام کی طرف مائل ہیں آپ چند آدمی ہمارے ساتھ روانہ فرمائیں جو ہمیں مسلمان بنائیں اور اسلام کی تعلیم دیں۔[4] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ خواہش معلوم کر کے خوش ہوئے اور وہی پارٹی جو خبر رسانی کے لیے تیار کی گئی تھی ان کے ساتھ روانہ فرما دی۔[5] لیکن دراصل جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ لوگ جھوٹے تھے اور بنو لحیان کی انگیخت پر مدینہ میں آئے تھے۔ جنھوں نے اپنے رئیس سفیان بن خالد کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یہ چال چلی تھی کہ اس بہانہ سے مسلمان مدینہ سے نکلیں تو اُن پر حملہ کر دیا جاوے اور بنو لحیان نے اس خدمت کے معاوضہ میں عضل اور

---

[1] ابن سعد و زرقانی [2] سفیان بن خالد کے قتل کا واقعہ ابن ہشام میں بھی ہے مگر ابن ہشام نے اسے تاریخ کی تعیین کے بغیر اپنی سیرۃ کے آخر میں بیان کیا ہے نیز ابن ہشام نے مقتول کا نام بجائے سفیان بن خالد کے خالد بن سفیان لکھا ہے باقی تفصیل عملاً وہی ہے دیکھو ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸۳۔

[3] بخاری کتاب الجہاد باب ھل یستاسر الرجل و کتاب المغازی حالات رجیع و فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۹۱ [4] ابن ہشام و ابن سعد

[5] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۶۵

قارہ کے لوگوں کے لیے بہت سے اُونٹ انعام کے طور پر مقرر کئے تھے[1] جب عضل اور قارۃ کے یہ غدار لوگ عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو انھوں نے بنولحیان کو خفیہ خفیہ اطلاع بھجوادی کہ مسلمان ہمارے ساتھ آ رہے ہیں تم آجاؤ۔ جس پر قبیلہ بنولحیان کے دو سو نوجوان جن میں سے ایک سو تیر انداز تھے مسلمانوں کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے اور مقام رجیع میں ان کو آدبایا۔ دس آدمی دو سو سپاہیوں کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن مسلمانوں کو ہتھیار ڈالنے کی تعلیم نہیں دی گئی تھی۔ فوراً یہ صحابی ایک قریب کے ٹیلہ پر چڑھ کر مقابلہ کے واسطے تیار ہو گئے۔ کفار نے جن کے نزدیک دھوکا دینا کوئی معیوب فعل نہیں تھا ان کو آواز دی کہ تم پہاڑی پر سے نیچے اُتر آؤ ہم تم سے پختہ عہد کرتے ہیں کہ تمہیں قتل نہیں کریں گے۔ عاصم نے جواب دیا کہ "ہمیں تمہارے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے ہم تمہاری اس ذمہ داری پر نہیں اتر سکتے" اور پھر آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر کہا "اے خدا! تُو ہماری حالت کو دیکھ رہا ہے۔ اپنے رسُول کو ہماری اس حالت سے اطلاع پہنچا دے"۔ غرض عاصم اور اس کے ساتھیوں نے مقابلہ کیا بالآخر لڑتے لڑتے شہید ہوتے۔

جب سات صحابہ مارے گئے اور صرف خبیب بن عدی اور زید بن دثنہ اور ایک اور صحابی باقی رہ گئے تو کفار نے جن کی اصل خواہش ان لوگوں کو زندہ پکڑنے کی تھی۔ پھر آواز دیکر کہا کہ اب بھی نیچے اُتر آؤ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ اب کی دفعہ یہ سادہ لوح مسُلمان ان کے پھندے میں آکر نیچے اتر آئے مگر نیچے اُترتے ہی کفار نے ان کو اپنی تیر کمانوں کی تندیوں سے جکڑ کر باندھ لیا۔ اس پر خبیب اور زید کے ساتھی سے جن کا نام تاریخ میں عبداللہ بن طارق مذکور ہوا صبر نہ ہو سکا اور انھوں نے پکار کر کہا "یہ تمہاری پہلی بدعہدی ہے" اور نہ معلوم تم آگے چل کر کیا کرو گے اور عبداللہ نے ان کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ جس پر کفار تھوڑی دُور تک تو عبداللہ کو گھسیٹتے ہوئے اور زدوکوب کرتے ہوئے لے گئے اور پھر انہیں قتل کر کے وہیں پھینک دیا اور چونکہ اب ان کا انتقام پُورا ہو چکا تھا۔ وہ قریش کو خوش کرنے کے لیے نیز روپے کی لالچ سے خبیب اور زید کو ساتھ لیکر مکہ کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر انہیں قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا[2] چنانچہ خبیب کو تو حارث بن عامر بن نوفل کے لڑکوں نے خرید لیا۔ کیونکہ خبیب نے بدر کی جنگ میں حارث کو قتل کیا تھا[3] اور زید کو صفوان بن اُمیہ نے خرید لیا[4]

ابھی یہ دونوں صحابی قریش کے پاس غلامی کی حالت میں قید تھے کہ ایک دن خبیب نے حارث کی لڑکی سے اپنی ضرورت کے لیے ایک اُسترا مانگا اور اُس نے دیدیا۔ جب یہ اُسترا خبیب کے ہاتھ میں تھا تو بنت حارث کا ایک خورد سالہ بچہ کھیلتا ہوا خبیب کے پاس آگیا اور خبیب نے اُسے اپنی ران پر

---

[1] واقدی حالات واقعہ رجیع و زرقانی [2] بخاری کتاب المغازی حالات رجیع و نیز کتاب الجہاد
[3] بخاری [4] ابن ہشام و ابن سعد

بٹھالیا۔ ماں نے جب دیکھا کہ خبیب کے ہاتھ میں اُسترا ہے اور ران پر اس کا بچہ بیٹھا ہے تو وہ کانپ اُٹھی اور اس کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ خبیب نے اُسے دیکھا تو اس کے خوف کو سمجھتے ہوئے کہا "کیا تم یہ خیال کرتی ہو کہ مَیں اس بچے کو قتل کر دوں گا؟ یہ خیال نہ کرو۔ مَیں انشاء اللہ ایسا نہیں کروں گا۔" ماں کا کملایا ہوا چہرہ خبیب کے ان الفاظ سے شگفتہ ہو گیا۔ یہ عورت خبیب کے اعلیٰ اخلاق سے اس قدر متاثر تھی کہ وہ بعد میں ہمیشہ کہا کرتی کہ "مَیں نے خبیب کا سا اچھا قیدی کوئی نہیں دیکھا۔" وہ یہ بھی کہا کرتی تھی کہ "مَیں نے ایک دفعہ خبیب کے ہاتھ میں ایک انگور کا خوشہ دیکھا تھا جس سے وہ انگور کے دانے توڑ توڑ کر کھاتا تھا، حالانکہ ان دنوں میں مکہ میں انگوروں کا نام و نشان نہیں تھا اور خبیب آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ مَیں سمجھتی ہوں کہ یہ خدائی رزق تھا جو خبیب کے پاس آتا تھا۔[1]"

مگر رؤسائے قریش کی قلبی عداوت کے سامنے رحم و انصاف کا جذبہ خارج از سوال تھا، چنانچہ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ بنو الحارث کے لوگ اور دُوسرے رؤسا قریش خبیب کو قتل کرنے اور اس کے قتل پر جشن منانے کے لیے اسے ایک کھلے میدان میں لے گئے۔ خبیب نے شہادت کی بُو پائی تو قریش سے اِلحاح کے ساتھ کہا کہ مرنے سے پہلے مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو۔ قریش نے جو غالباً اسلامی نماز کے منظر کو بھی اس تماشہ کا حصہ بنانا چاہتے تھے اجازت دیدی اور خبیب نے بڑی توجہ اور حضورِ قلب کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کی اور پھر نماز سے فارغ ہو کر قریش سے کہا کہ "میرا دل چاہتا تھا کہ مَیں اپنی نماز کو اور لمبا کروں، لیکن پھر مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ مَیں موت کو پیچھے ڈالنے کے لیے نماز کو لمبا کر رہا ہوں۔" اور پھر خبیب یہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے جُھک گئے۔

وَمَا اَنْ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا ؛ عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِیْ

وَذَالِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَشَاءْ ؛ یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعٖ

یعنی "جبکہ میں اسلام کی راہ میں اور مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے یہ پروا نہیں ہے کہ مَیں کس پہلو پر قتل ہو کر گروں۔ یہ سب کچھ خدا کے لیے ہے۔ اور اگر میرا خدا چاہے گا تو میرے جسم کے پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکات نازل فرمائے گا۔" غالباً ابھی خبیب کی زبان پر ان اشعار کے آخری الفاظ گونج ہی رہے تھے کہ عقبہ بن حارث نے آگے بڑھ کر وار کیا اور یہ عاشقِ رسولؐ خاک پر تھا۔[2] دوسری روایت میں یہ ہے کہ قریش نے خبیب کو ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیا تھا اور پھر نیزوں کی چوکیں دے دے کر قتل کیا۔ اس مجمع میں ایک شخص سعید بن عامر بھی شریک تھا۔ یہ شخص بعد میں مسلمان ہو گیا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت تک اس کا یہ حال تھا کہ جب کبھی اسے خبیب کا واقعہ یاد آتا تھا تو اُس پر غشی کی حالت

---

[1] بخاری کتاب الجہاد و کتاب المغازی [2] بخاری کتاب المغازی و کتاب الجہاد

طاری ہو جاتی تھی[1]

دُوسری طرف صفوان بن اُمیہ اپنے قیدی زید بن دثنہ کو ساتھ لیکر حرم سے باہر گیا۔ رؤسارِ قریش کا ایک مجمع ساتھ تھا۔ باہر پہنچ کر صفوان نے اپنے غلام نسطاس کو حکم دیا کہ زید کو قتل کر دو۔ نسطاس نے آگے بڑھ کر تلوار اٹھائی۔ اسوقت ابوسفیان بن حرب رئیس مکّہ نے جو تماشائیوں میں موجود تھا آگے بڑھ کر زید سے کہا " سچ کہو کیا تمہارا دل یہ نہیں چاہتا کہ اس وقت تمہاری جگہ ہمارے ہاتھوں میں محمدؐ ہوتا جسے ہم قتل کرتے اور تم بچ جاتے اور اپنے اہل و عیال میں خوشی کے دن گذارتے " ؟ زید کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور وُہ غصہ میں بولے " ابوسفیان تم یہ کیا کہتے ہو۔ خدا کی قسم میں تو یہ بھی نہیں پسند کرتا کہ میرے بچنے کے عوض رسُول اللہ کے پاؤں میں ایک کانٹا تک چبھے " ابوسفیان بے اختیار ہو کر بولا " واللہ میں نے کسی شخص کو کسی شخص کے ساتھ ایسی محبت کرتے نہیں دیکھا جیسی کہ اصحابِ محمدؐ کو محمدؐ سے ہے " اسکے بعد نسطاس نے زید کو شہید کر دیا[2]

اِسی واقعہ رجیع کی ضمن میں یہ روایت بھی آتی ہے کہ جب قریشِ مکّہ کو یہ اطلاع ملی کہ جو لوگ بنو لحیان کے ہاتھ سے رجیع میں شہید ہوئے تھے ان میں عاصم بن ثابت بھی تھے۔ تو چونکہ عاصم نے بدر کے موقعہ پر قریش کے ایک بڑے رئیس کو قتل کیا تھا، اس لیے انھوں نے رجیع کی طرف خاص آدمی روانہ کئے اور اُن آدمیوں کو تاکید کی کہ عاصم کا سر یا جسم کا کوئی عضو کاٹ کر اپنے ساتھ لائیں تاکہ انہیں تسلّی ہو اور اُن کا جذبۂ انتقام تسکین پائے[3] ایک اور روایت میں آتا ہے کہ جس شخص کو عاصم نے قتل کیا تھا اس کی ماں نے یہ نذر مانی تھی کہ وُہ اپنے بیٹے کے قاتل کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پیئے گی[4] لیکن خدائی تصرّف ایسا ہوا کہ یہ لوگ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ زنبوروں اور شہد کی نر مکھیوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ عاصم کی لاش پر ڈیرہ ڈالے بیٹھے ہیں اور کسی طرح وہاں سے اُٹھنے میں نہیں آتے۔ ان لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ یہ زنبور اور مکھیاں وہاں سے اُڑ جائیں مگر کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر یہ لوگ خائب و خاسر واپس لوٹ گئے[5] اس کے بعد جلد ہی بارش کا ایک طوفان آیا اور عاصم کی لاش کو وہاں سے بہا کر کہیں کا کہیں لے گیا۔ لکھا ہے کہ عاصم نے مسلمان ہونے پر یہ عہد کیا تھا کہ آئندہ وہ ہر قسم کی مشرکانہ چیز سے قطعی پرہیز کریں گے حتّٰی کہ مشرک کے ساتھ چھوئیں گے بھی نہیں۔ حضرت عمرؓ کو جب اُن کی شہادت اور اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو کہنے لگے " خدا بھی اپنے بندوں کے جذبات کی کتنی پاسداری فرماتا ہے موت کے بعد بھی اس نے عاصم کے عہد کو پورا کروایا اور مشرکین کے مَس سے اُنہیں محفوظ رکھا[6]

---

[1] ابنِ ہشام [2] ابنِ ہشام و ابن سعد [3] بخاری حالات رجیع [4] فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۹۵
[5] بخاری حالات رجیع و فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۹۵ [6] ابن ہشام

واقعہ رجیع کی خبر سے جو صدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو پہنچ سکتا تھا وہ ظاہر ہے مگر پیشتر اس کے کہ یہ المناک خبر مدینہ میں پہنچتی ایک اور خطرناک واقعہ پیش آگیا۔ اس لیے قبل اس کے کہ ہم واقعہ رجیع کے متعلق کوئی تبصرہ کریں اس واقعہ کا بیان کر دینا ضروری ہے کیونکہ یہ دونوں واقعات ایک ہی نوعیت کے تھے اور ان کی اطلاع بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہی وقت میں موصول ہوئی تھی[1]۔

واقعہ بئر معونہ صفر ۴ھ

قبائل سلیم و غطفان وغیرہ کی شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں کا ذکر اوپر گذر چکا ہے یہ قبائل عرب کے وسط میں سطح مرتفع نجد پر آباد تھے اور مسلمانوں کے خلاف قریش مکہ کے ساتھ ساز باز رکھتے تھے اور آہستہ آہستہ ان شریر قبائل کی شرارت بڑھتی جاتی تھی اور سارا سطح مرتفع نجد اسلام کی عداوت کے زہر سے مسموم ہوتا چلا جا رہا تھا چنانچہ ان ایام میں جن کا ہم اس وقت ذکر کر رہے ہیں ایک شخص ابو براء عامری جو وسط عرب کے قبیلہ بنو عامر کا ایک رئیس تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا آپ نے بڑی نرمی اور شفقت کے ساتھ اُسے اسلام کی تبلیغ فرمائی اور اس نے بھی بظاہر شوق اور توجہ کے ساتھ آپ کی تقریر کو سُنا مگر مسلمان نہیں ہوا؛ البتہ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ اپنے چند اصحاب نجد کی طرف روانہ فرمائیں جو وہاں جا کر اہلِ نجد میں اسلام کی تبلیغ کریں اور مجھے اُمید ہے کہ نجدی لوگ آپ کی دعوت کو رد نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا مجھے تو اہلِ نجد پر اعتماد نہیں ہے۔ ابو براء نے کہا کہ آپ ہرگز فکر نہ کریں۔ مَیں ان کی حفاظت کا ضامن ہوتا ہوں۔ چونکہ ابو براء ایک قبیلہ کا رئیس اور صاحبِ اثر آدمی تھا آپ نے اُس کے اطمینان دلانے پر یقین کر لیا اور صحابہ کی ایک جماعت نجد کی طرف روانہ فرما دی[2]۔

یہ تاریخ کی روایت ہے۔ بخاری میں آتا ہے کہ قبائل رعل اور ذکوان وغیرہ (جو مشہور قبیلہ بنو سلیم کی شاخ تھے) ان کے چند لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کا اظہار کر کے درخواست کی کہ ہماری قوم میں سے جو لوگ اسلام کے دشمن ہیں ان کے خلاف ہماری امداد کے لیے (یہ تشریح نہیں کی کہ کس قسم کی امداد، آیا تبلیغی یا فوجی) چند آدمی روانہ کیے جائیں جس پر آپ نے یہ دستہ روانہ فرمایا[3] اور اسی کی تائید میں ابنِ سعد نے بھی ایک روایت نقل کی ہے گو اسے دوسری روایت کے مقابل میں ترجیح نہیں دی[4] مگر بدقسمتی سے بئر معونہ کی تفصیلات میں بخاری کی روایات

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۷۹ آخر حالات بئر معونہ [2] ابن ہشام و ابن سعد

[3] بخاری کتاب الجہاد باب العون بالمدد و کتاب المغازی ابواب رجیع و بئر معونہ روایت عن قتادہ عن انسؓ [4] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۳۸

میں بھی کچھ خلط واقع ہوگیا ہے جس کی وجہ سے حقیقت پوری طرح معین نہیں ہوسکتی[1] مگر بہرحال اس قدر یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر قبائل رعل اور ذکوان وغیرہ کے لوگ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تھے اور اُنھوں نے یہ درخواست کی تھی کہ چند صحابہ ان کے ساتھ بھجو
ان دونوں روایتوں کی مطابقت کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ رعل اور ذکوان کے لوگوں کے ساتھ ابوبراء عامری رئیس قبیلہ عامر بھی آیا ہو اور اس نے ان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بات کی ہو۔ چنانچہ تاریخی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ مجھے اہلِ نجد کی طرف سے اطمینان نہیں ہے اور پھر اس کا یہ جواب دینا کہ آپ کوئی فکر نہ کریں میں اس کا ضامن ہوتا ہوں کہ آپ کے صحابہ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ابوبراء کے ساتھ رعل اور ذکوان کے لوگ بھی آئے تھے جن کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فکر مند تھے۔ واللہ اعلم

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفر ۴ ہجری میں منذر بن عمرو انصاری کی امارت میں صحابہ کی ایک پارٹی روانہ فرمائی[2] یہ لوگ عموماً انصار میں سے تھے اور تعداد میں ستر تھے اور قریباً سارے کے سارے قاری یعنی قرآن خوان تھے۔ جو دن کے وقت جنگل سے لکڑیاں جمع کرکے ان کی قیمت پر اپنا پیٹ پالتے اور رات کا بہت سا حصہ عبادت میں گذار دیتے تھے[3] جب یہ لوگ اس مقام پر پہنچے جو ایک کنوئیں کی وجہ سے بئر معونہ کے نام سے مشہور تھا تو ان میں سے ایک شخص حرام بن ملحان جو انس بن مالک کے ماموں تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دعوتِ اسلام کا پیغام لے کر قبیلہ عامر کے رئیس اور ابوبراء عامری کے بھتیجے عامر بن طفیل کے پاس آگے گئے اور باقی صحابہ پیچھے رہے۔ جب حرام بن ملحان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کے طور پر عامر بن طفیل اور اس کے ساتھیوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے شروع میں تو منافقانہ طور پر آؤ بھگت کی لیکن جب وہ مطمئن ہوکر بیٹھ گئے اور اسلام کی تبلیغ کرنے لگے تو اُن میں سے بعض شریروں نے کسی آدمی کو اشارہ کرکے اس بے گناہ ایلچی کو پیچھے کی طرف سے نیزہ کا وار کرکے وہیں ڈھیر کردیا۔ اُس وقت حرام بن ملحان کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ یعنی اللہ اکبر کعبہ کے رب کی قسم! میں تو اپنی مراد کو پہنچ گیا[4] عامر بن طفیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کے قتل پر ہی اکتفاء نہیں کی بلکہ اس کے بعد اپنے قبیلہ بنو عامر کے لوگوں کو اکسایا

---

[1] فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۹۶ و ۳۰۱ شرح حالات بئر معونہ
[2] ابن سعد و ابن ہشام [3] بخاری کتاب الجہاد باب العون بالمدد
[4] بخاری کتاب الجہاد باب من ینکب او یطعن و کتاب المغازی ابواب رجیع و بئر معونہ روایت ابی طلحہ عن انسؓ و روایت عبداللہ بن انسؓ و روایت عروۃ مخلوطاً

کہ وُہ مُسلمانوں کی بقیہ جماعت پر حملہ آور ہو جائیں مگر اُنھوں نے اس بات سے انکار کیا اور کہا کہ ہم ابو براء کی ذمہ داری کے ہوتے ہوئے مسلمانوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس پر عامر نے قبیلہ سلیم میں سے بنو رعل اور ذکوان اور عصیہ وغیرہ کو (یہ وہی ہیں جو بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد بنکر آئے تھے) اپنے ساتھ لیا اور یہ سب لوگ مسلمانوں کی اس قلیل اور بے بس جماعت پر حملہ آور ہو گئے۔[1] مسلمانوں نے جب ان وحشی درندوں کو اپنی طرف آتے دیکھا، تو اُن سے کہا کہ ہمیں تم سے کوئی تعرض نہیں ہے۔ ہم تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک کام کے لیے آئے ہیں اور ہم تم سے لڑنے کے لیے نہیں آئے۔ مگر انھوں نے ایک نہ سُنی اور سب کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔[2] ان صحابیوں میں سے جو اس وقت وہاں موجود تھے صرف ایک شخص بچا جو پاؤں سے لنگڑا تھا اور پہاڑی کے اوپر چڑھ گیا ہوا تھا۔[3] اس صحابی کا نام کعب بن زید تھا اور بعض روایات سے پتہ لگتا ہے کہ کفار نے اس پر بھی حملہ کیا تھا جس سے وہ زخمی ہوا اور کفار اُسے مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے مگر دراصل اس میں جان باقی تھی اور وہ بچ گیا۔[4]

صحابہ کی اس جماعت میں سے دو شخص یعنی عمرو بن امیہ ضمری اور منذر بن محمد اس وقت اُونٹوں وغیرہ کے چرانے کے لیے اپنی جماعت سے الگ ہو کر اِدھر اُدھر گئے ہوئے تھے اُنھوں نے دُور سے اپنے ڈیرہ کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ وہ ان صحرائی اشاروں کو خوب سمجھتے تھے، فوراً تاڑ گئے کہ کوئی لڑائی ہوئی ہے۔ واپس آئے تو ظالم کفار کے کشت وخون کا کارنامہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ دُور سے ہی یہ نظارہ دیکھ کر اُنھوں نے فوراً آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ایک نے کہا کہ ہمیں یہاں سے فوراً بھاگ نکلنا چاہیئے اور مدینہ میں پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دینی چاہیئے۔ مگر دُوسرے نے اس رائے کو قبول نہ کیا اور کہا کہ مَیں تو اس جگہ سے بھاگ کر نہیں جاؤں گا جہاں ہمارا امیر منذر بن عمرو شہید ہوا ہے؛ چنانچہ وُہ آگے بڑھ کر لڑا اور شہید ہوا۔[5] اور دُوسرے کو جس کا نام عمرو بن امیہ ضمری تھا کفار نے پکڑ کر قید کر لیا۔[6] اور غالباً اسے بھی قتل کر دیتے مگر جب اُنہیں معلوم ہوا کہ وہ قبیلہ مضر سے ہے تو عامر بن طفیل نے عرب کے دستور کے مطابق اس کے ماتھے کے چند بال کاٹ کر اُسے رہا کر دیا اور کہا کہ میری ماں نے قبیلہ مضر کے ایک غلام کے آزاد کرنے کی مِنّت مانی ہوئی ہے مَیں تجھے اس کے بدلے میں چھوڑتا ہوں۔ گویا ان ستر صحابہ میں صرف

---

[1] ابن ہشام وابن سعد [2] بخاری ابواب حالات بئر معونہ روایت عبدالعزیز عن انسؓ
[3] بخاری ابواب بئر معونہ روایت ابو طلحہ عن انسؓ [4] ابن ہشام وابن سعد
[5] ابن ہشام [6] بخاری حالات بئر معونہ روایت ہشام بن عروہ عن عروۃ

دُو شخص بچے۔ ایک یہی عمرو بن امیہ ضمری اور دُوسرے کعب بن زید جسے کفار نے مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔[1] بئرِ معونہ کے موقعہ پر شہید ہونے والے صحابہ میں حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام اور اسلام کے دیرینہ فدائی عامر بن فہیرہ بھی تھے۔[2] انہیں ایک شخص جبار بن سلمیٰ نے قتل کیا تھا۔[3] جبار بعد میں مسلمان ہوگیا اور وہ اپنے مسلمان ہونے کی وجہ یہ بیان کرتا تھا کہ جب مَیں نے عامر بن فہیرہ کو شہید کیا تو ان کے مُنہ سے بے اختیار نکلا فُزْتُ وَاللّٰہِ۔ یعنی "خدا کی قسم مَیں تو اپنی مراد کو پہنچ گیا ہوں۔" جبار کہتے ہیں کہ مَیں یہ الفاظ سُن کر متعجب ہوا کہ مَیں نے تو اس شخص کو قتل کیا ہے اور وُہ یہ کہہ رہا ہے کہ مَیں مراد کو پہنچ گیا ہُوں۔ یہ کیا بات ہے؛ چنانچہ مَیں نے بعد میں لوگوں سے اس کی وجہ پُوچھی تو مجھے معلوم ہوا کہ مسلمان لوگ خدا کے رستے میں جان دینے کو سب سے بڑی کامیابی خیال کرتے ہیں اور اس بات کا میری طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ آخر اسی اثر کے ماتحت مَیں مسلمان ہوگیا۔[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کو واقعہ رجیع اور واقعہ بئرِ معونہ کی اطلاع قریباً ایک ہی وقت میں ملی۔[5] اور آپؐ کو اس کا سخت صدمہ ہوا۔ حتیٰ کہ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ ایسا صدمہ نہ اس سے پہلے آپؐ کو کبھی ہوا تھا اور نہ بعد میں کبھی ہوا۔[6] واقعی قریباً اَسّی[7] صحابیوں کا اس طرح دھوکے کے ساتھ اچانک مارا جانا اور صحابی بھی وہ جو اکثر حفاظِ قرآن میں سے تھے اور ایک غریب بے نفس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عرب کے وحشیانہ رسم و رواج کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بھی کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو یہ خبر گویا اسّی بیٹوں کی وفات کی خبر کے مترادف تھی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، کیونکہ ایک رُوحانی انسان کے لیے رُوحانی رشتہ یقیناً اس سے بہت زیادہ عزیز ہوتا ہے جتنا کہ ایک دُنیا دار شخص کو دُنیاوی رشتہ عزیز ہوتا ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حادثات کا سخت صدمہ ہوا مگر اسلام میں ہر صورت صبر کا حکم ہے آپؐ نے یہ خبر سُن کر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور پھر یہ الفاظ فرماتے ہوئے خاموش ہوگئے کہ ھٰذَا عَمَلُ اَبِیْ بَرَاءٍ وَقَدْ کُنْتُ لِھٰذَا کَارِھًا مُتَخَوِّفًا۔ یعنی "یہ ابو براء کے کام کا ثمرہ ہے ورنہ مَیں تو ان لوگوں کے بھجوانے کو پسند نہیں کرتا تھا اور اہلِ نجد کی طرف سے ڈرتا تھا۔"[8]

واقعات بئرِ معونہ اور رجیع سے قبائلِ عرب کے اس انتہائی درجہ کے بغض و عداوت کا پتہ چلتا ہے جو وہ اسلام اور متبعینِ اسلام کے متعلق اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کو اسلام کے خلاف

---

[1] ابن ہشام [2] بخاری حالات بئرِ معونہ روایت عائشہ [3] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۸۰ [4] ابن ہشام حالات بئرِ معونہ و اسد الغابہ حالات جبار بن سلمیٰ [5] زرقانی [6] بخاری کتاب الجہاد باب دعاء الامام علیٰ من نکث [7] دس رجیع کے اور ستر بئرِ معونہ کے [8] ابن ہشام

ذلیل ترین قسم کے جھوٹ اور دغا اور فریب سے بھی کوئی پرہیز نہیں تھا اور مسلمان باوجود اپنی کمال ہوشیاری اور بیدار مغزی کے بعض اوقات اپنی مومنانہ حسن ظنی میں ان کے دام کا شکار ہو جاتے تھے۔ حفاظِ قرآن۔ نماز گذار تہجد خوان مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر اللہ کا نام لینے والے اور پھر غریب مفلس فاقوں کے مارے ہوئے یہ وہ لوگ تھے جن کو ان ظالموں نے دین سیکھنے کے بہانے سے اپنے وطن میں بلایا اور پھر جب مہمان کی حیثیت میں وہ اُن کے وطن میں پہنچے تو انکو نہایت بے رحمی کے ساتھ تہ تیغ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات کا جتنا بھی صدمہ ہوتا کم تھا۔ مگر اُس وقت آپؐ نے رجیع اور بئر معونہ کے خونی قاتلوں کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں فرمائی، البتہ اس خبر کے آنے کی تاریخ سے لے کر برابر تیس دن تک آپؐ نے ہر روز صبح کی نماز کے قیام میں نہایت گریہ وزاری کے ساتھ قبائل رعل اور ذکوان اور عصیہ اور بنو لحیان کا نام لے لے کر خدا تعالیٰ کے حضور یہ دُعا کی اے میرے آقا تو ہماری حالت پر رحم فرما اور دشمنانِ اسلام کے ہاتھ کو روک جو تیرے دین کو مٹانے کے لیے اس بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ بے گناہ مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں [1]

---

[1] بخاری ابواب بئر معونہ روایت ابو طلحہ عن انسؓ

یہود کی دوسری غدّاری۔ جمع و ترتیبِ قرآن حضرت زینبؓ کی شادی۔ واقعۂ افک اور منافقین کی فتنہ پردازی

اخراجِ بنونضیر۔ ربیع اوّل ۴ ہجری

جب کسی قوم کے بُرے دن آتے ہیں تو پھر اس کی بینائی کم ہو جاتی ہے اور واقعات سے سبق اور عبرت حاصل کرنے کی طرف وہ توجہ نہیں کرتی، چنانچہ بنو قینقاع کے جلا وطن کئے جانے پر بجائے اس کے کہ یہود کے باقی ماندہ دو قبیلے عبرت حاصل کرتے اور اپنی شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں سے باز آجاتے اور مسلمانوں کو اُمن کی زندگی بسر کرنے دیتے اور خود بھی اُمن کے ساتھ رہتے، اُنھوں نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا اور مسلمانوں کے خلاف اندر ہی اندر فتنے کے شرارے پیدا کرتے رہے اور قریش مکہ کے ساتھ بھی ان لوگوں نے برابر ساز باز جاری رکھی۔ بلکہ بنو قینقاع کے بعد اُن کی عداوت اور بھی ترقی کر گئی اور ان کے منصوبے دن بدن زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتے گئے، چنانچہ ابھی واقعات رجیع اور بئر معونہ پر زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ حالات نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود حفاظتی کے خیال سے مجبور ہو کر بنو نضیر کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی جس کے نتیجہ میں بالآخر یہ قبیلہ بھی مدینہ سے جلا وطن ہو گیا۔ اس غزوہ کا سبب بیان کرتے ہوئے اربابِ حدیث و سِیَر مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں اور اس اختلاف کی وجہ سے اس غزوہ کے زمانہ کے متعلق بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ ابنِ اسحاق اور ابنِ سعد جن کی اتباع میں نے اس جگہ بلا کسی خاص تحقیق کے اختیار کی ہے۔ غزوۂ بنو نضیر کو غزوہ اُحد اور واقعہ بئر معونہ کے بعد بیان کرتے ہیں اور اس کا سبب یہ لکھتے ہیں کہ عمرو بن امیہ ضمری جنھیں کفار نے بئر معونہ کے موقعہ پر قید کر کے چھوڑ دیا تھا۔ وہ جب واپس مدینہ کی طرف آرہے تھے تو انہیں راستہ میں قبیلہ بنو عامر کے دو آدمی ملے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کر چکے تھے، چونکہ عمرو کو اس

عہد و پیمان کا علم نہیں تھا اس لیے اُس نے موقعہ پاکر ان دو آدمیوں کو شہداء بیر معونہ کے بدلے میں قتل کر دیا جن کے قتل کا باعث قبیلہ بنو عامر کا ایک رئیس عامر بن طفیل ہوا تھا۔ گو جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے خود قبیلہ بنو عامر کے لوگ اس قتل و غارت سے دست کش رہے تھے۔ جب عمرو بن اُمیہ مدینہ پہنچے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سارا ماجرا عرض کیا اور ان دو آدمیوں کے قتل کا واقعہ بھی سُنایا۔ آپؐ کو جب ان دو آدمیوں کے قتل کی اطلاع ہوئی تو آپؐ عمرو بن اُمیہ کے اس فعل پر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ وہ تو ہمارے معاہد تھے۔ اور آپؐ نے فوراً ان ہر دو مقتولین کا خون بہا ان کے ورثاء کو بھجوا دیا لیکن چونکہ قبیلہ بنو عامر کے لوگ بنو نضیر کے بھی حلیف تھے اور بنو نضیر مسلمانوں کے حلیف تھے اس لیے معاہدہ کی رُو سے اس خون بہا کا بار حصہ رسدی بنو نضیر پر بھی پڑتا تھا؛ چنانچہ آپؐ اپنے چند صحابیوں کو ساتھ لیکر بنو نضیر کی آبادی میں پہنچے اور ان سے یہ سارا واقعہ بیان کر کے خون بہا کا حصہ مانگا۔ انھوں نے بظاہر آپؐ کے تشریف لانے پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپؐ تشریف رکھیں ہم ابھی اپنے حصہ کا روپیہ ادا کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ مع اپنے چند اصحاب کے ایک دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے اور بنو نضیر باہم مشورہ کے لیے ایک طرف ہو گئے اور ظاہر یہ کیا کہ ہم روپے کی فراہمی کا انتظام کر رہے ہیں لیکن بجائے روپے کا انتظام کرنے کے انہوں نے یہ مشورہ کیا کہ یہ ایک بہت ہی اچھا موقعہ ہے۔ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) مکان کے سایہ میں دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے ہیں کوئی شخص دوسری طرف سے مکان پر چڑھ جاوے اور پھر ایک بڑا پتھر آپؐ کے اوپر گرا کر آپؐ کا کام تمام کر دے[1]۔ یہود میں سے ایک شخص سلام بن مشکم نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اور کہا کہ یہ ایک غداری کا فعل ہے اور اس عہد کے خلاف ہے جو ہم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر چکے ہیں مگر ان لوگوں نے نہ مانا[2] اور بالآخر عمرو بن جحاش نامی ایک یہودی ایک بہت بھاری پتھر لے کر مکان کے اوپر چڑھ گیا اور قریب تھا کہ وہ اس پتھر کو اوپر سے لڑھکا دیتا۔ مگر روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے یہود کے اس ارادے سے بذریعہ وحی اطلاع دے دی۔ اور آپؐ جلدی سے وہاں سے اُٹھ آئے اور ایسی جلدی میں اُٹھے کہ آپؐ کے اصحاب نے بھی اور یہود نے بھی یہ سمجھا کہ شاید آپؐ کسی حاجت کے خیال سے اُٹھ گئے ہیں؛ چنانچہ وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھے ہوئے آپؐ کا انتظار کرتے رہے، لیکن آپؐ وہاں سے اُٹھ کر سیدھے مدینہ میں تشریف لے آئے۔ صحابہ نے تھوڑی دیر آپؐ کا انتظار کیا، لیکن جب آپؐ واپس تشریف نہ لائے تو وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھے اور آپؐ کو ادھر اُدھر تلاش کرتے ہوئے بالآخر خود بھی مدینہ پہنچ گئے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہود کی اس خطرناک سازش کی اطلاع دی[3] اور پھر قبیلہ اوس کے ایک رئیس محمد بن مسلمہ کو

---

[1] ابن ہشام و ابن سعد [2] ابن سعد [3] ابن ہشام و ابن سعد

بُلا کر فرمایا کہ تم بنو نضیر کے پاس جاؤ اور ان کے ساتھ اس معاملہ کے متعلق بات چیت کرو اور ان سے کہو کہ چونکہ وہ اپنی شرارتوں میں بہت بڑھ گئے ہیں اور ان کی غداری انتہا کو پہنچ گئی ہے اس لیے اب انکا مدینہ میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ وہ مدینہ کو چھوڑ کر کہیں اور جا کر آباد ہو جائیں اور آپ نے انکے لیے دس دن کی میعاد مقرر فرمائی۔

محمد بن مسلمہ جب اُن کے پاس گئے تو وہ سامنے سے بڑے تمرد سے پیش آئے اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہدو کہ ہم مدینہ سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہیں تم نے جو کرنا ہو کر لو۔ جب ان کا یہ جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا تو آپ نے بے ساختہ فرمایا۔ "اللہ اکبر یہود تو جنگ کے لیے تیار بیٹھے ہیں" اس کے بعد آپ نے مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا اور صحابہ کی ایک جمعیت کو ساتھ لیکر بنو نضیر کے خلاف میدان میں نکل آئے۔[1]

یہ وہ روایت ہے جس کی اکثر مؤرخین نے اتباع کی ہے۔ حتیٰ کہ یہی روایت تاریخ میں عام طور پر شائع اور متعارف ہو گئی ہے، لیکن اس کے مقابل پر امام زہری کی یہ روایت صحیح احادیث میں مروی ہوئی ہے کہ جنگِ بدر کے بعد مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خاص طور پر کس سال اور کس ماہ میں مکہ کے رؤسا نے بنو نضیر کو یہ خط لکھا تھا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرو، ورنہ ہم تمہارے خلاف جنگ کریں گے اس پر بنو نضیر نے باہم مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ کسی حکمتِ عملی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے اور اس کے لیے انھوں نے یہ تجویز کی کہ آپ کو کسی بہانہ سے اپنے پاس بلائیں اور وہاں موقعہ پا کر آپ کو قتل کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو کہلا بھیجا کہ ہم آپ کے ساتھ اپنے علماء کا مذہبی تبادلہ خیالات کروانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم پر آپ کی صداقت ظاہر ہو گئی تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ پس آپ مہربانی کر کے اپنے کوئی سے تیس اصحاب کو ساتھ لے کر تشریف لے آئیں۔ ہماری طرف سے بھی تیس علماء ہوں گے اور پھر باہم تبادلہ خیالات ہو جائیگا[2] ایک طرف تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیغام بھیجا اور دوسری طرف یہ تجویز پختہ کر کے اس کے مطابق پوری پوری تیاری کر لی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو یہی یہودی "علماء" جن کے پاس خنجر پوشیدہ ہوں موقعہ پاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں مگر قبیلہ بنو نضیر کی ایک عورت نے ایک انصاری شخص کو جو رشتہ میں اس کا بھائی لگتا تھا اپنے قبیلہ والوں کے اس بدارادے سے بروقت اطلاع دیدی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو ابھی گھر سے نکلے ہی تھے یہ اطلاع پاکر واپس تشریف لے آئے[3] اور فوراً تیاری

---

[1] ابن سعد و ابن ہشام [2] وہ یہ خوب سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حرکت دینے کے لیے سب سے زیادہ آسان اور پختہ ذریعہ مذہبی تبلیغ کا بہانہ ہو سکتا ہے۔

[3] ابوداؤد کتاب الخراج باب النضیر [4] ابن مردویہ بحوالہ زرقانی حالات بنو نضیر

کا حکم دیا اور صحابہ کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر بنونضیر کے قلعوں کی طرف روانہ ہوگئے اور جاتے ہی اُن کا محاصرہ کر لیا اور پھر ان کے رؤسار کو پیغام بھیجا کہ جو حالات ظاہر ہوتے ہیں اُن کے ہوتے ہوئے میں تمہیں مدینہ میں رہنے نہیں دے سکتا۔ جب تک کہ تم از سرِ نو میرے ساتھ معاہدہ کرکے مجھے یقین نہ دلاؤ کہ آئندہ تم بدعہدی اور غداری نہیں کرو گے۔ مگر یہود نے معاہدہ کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اس طرح جنگ کی ابتداء ہوگئی اور بنونضیر نہایت متمردانہ طریق پر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ دُوسرے دن آپ کو یہ اطلاع ملی یا آپ نے قرآئن سے خود معلوم کر لیا کہ یہود کا دوسرا قبیلہ بنو قریظہ بھی کچھ بگڑ بیٹھا ہے؛ چنانچہ آپ صحابہ کے ایک دستہ کو ساتھ لیکر بنو قریظہ کے قلعوں کی طرف روانہ ہوتے اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ بنو قریظہ نے جب دیکھا کہ راز کھل گیا ہے تو وہ ڈر گئے اور معافی کے خواستگار ہو کر از سرِ نو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُمن و امان اور باہمی اعانت کا معاہدہ کر لیا جس پر آپ نے ان کا محاصرہ اُٹھا لیا اور پھر بنونضیر کے قلعوں کی طرف تشریف لے آئے لیکن بنونضیر بدستور اپنی ضد اور عداوت پر اڑے رہے اور ایک باقاعدہ جنگ کی صورت پیدا ہوگئی[1]

یہ دُو مختلف روایتیں ہیں جو غزوہ بنونضیر کے باعث کے متعلق بیان کی گئی ہیں اور گو تاریخی لحاظ سے مؤخر الذکر روایت زیادہ دُرست اور صحیح ہے اور دُوسری احادیث میں بھی زیادہ تر اسی روایت کی تائید پائی جاتی ہے لیکن چونکہ پہلی روایت کو مؤرخین نے زیادہ کثرت کے ساتھ قبول کیا ہے اور بعض صحیح احادیث میں بھی اس کی صحت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے؛ چنانچہ امام بخاری نے باوجود زہری کے قول کو ترجیح دینے کے قبیلہ عامر کے دو مقتولوں کی دِیت کا بھی ذکر کیا ہے[2] اس لیے ہماری رائے میں اگر دونوں روایتوں کو صحیح سمجھ کر ملا لیا جاوے تو کوئی ہرج لازم نہیں آتا؛ البتہ اس غزوہ کے زمانہ کے متعلق ان روایتوں میں سے کسی ایک روایت کو ترجیح دینی پڑے گی۔ کیونکہ زمانہ کے لحاظ سے ہر دُو روایات کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنونضیر کی طرف سے مختلف مواقع پر مختلف اسباب جنگ کے پیدا ہوتے رہے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُنہیں ڈھیل دیتے رہے اور دَرگذر سے کام فرمایا۔ لیکن جب آخری سبب بئر معونہ کے واقعہ کے بعد ہوا، تو آپ نے اُنہیں ان کی ساری کارروائیاں جتلا کر ان کے خلاف فوج کشی فرمائی۔ گویا یہ جتنے مختلف اسباب بیان ہوتے ہیں یہ سب اپنی اپنی جگہ دُرست تھے مگر آخری تحریکی سبب وہ تھا جو بنو عامر کے دُو مقتولوں کی دِیت کے مطالبہ کے وقت پیش آیا ــــــ واللہ اعلم بالصواب۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کعب بن اشرف جس کے قتل کا ذکر اوپر گذر چکا ہے

---

[1] ابوداؤد کتاب الخراج باب خبر النضیر

[2] بخاری حالات غزوہ بنونضیر

اور جس نے مسلمانوں کے خلاف گویا ایک آگ بھڑکا رکھی تھی وُہ بھی بنو نضیر سے تعلق رکھتا تھا۔

بہرحال یہود کے قبیلہ بنو نضیر نے خلاف عہدی اور غداری کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے قتل کا منصوبہ باندھا اور جب اُن سے یہ کہا گیا کہ ان حالات میں تمہارا مدینہ میں رہنا ٹھیک نہیں ہے تم یہاں سے چلے جاؤ تو انھوں نے تمرّد اور سرکشی سے کام لیا اور تجدید معاہدہ سے انکار کر کے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ اس لیے مجبوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی ان کے خلاف میدان میں نکلنا پڑا؛ چنانچہ آپؐ نے اپنے پیچھے مدینہ کی آبادی میں ابن مکتوم کو امام صلوٰۃ مقرر فرمایا اور خود صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ مدینہ سے نکل کر بنو نضیر کی بستی کا محاصرہ کر لیا اور بنو نضیر اس زمانہ کے طریق جنگ کے مطابق قلعہ بند ہو گئے۔ غالباً اسی موقعہ پر عبداللہ بن اُبَی بن سلول اور دُوسرے منافقین مدینہ نے بنو نضیر کے روساء کو یہ کہلا بھیجا کہ تم مسلمانوں سے ہرگز نہ دبنا، ہم تمہارا ساتھ دینگے اور تمہاری طرف سے لڑینگے لیکن جب عملاً جنگ شروع ہوئی تو بنو نضیر کی توقعات کے خلاف اِن منافقین کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ کھلم کھلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف میدان میں آئیں[1] اور نہ بنو قریظہ کو یہ ہمت پڑی کہ مسلمانوں کے خلاف میدان میں آکر بنو نضیر کی برملا مدد کریں۔ گو دل میں وہ ان کے ساتھ تھے اور دَرپردہ ان کی امداد بھی کرتے تھے جس کا مسلمانوں کو علم ہو گیا تھا[2] بہرحال بنو نضیر کھلے میدان میں مسلمانوں کے مقابل پر نہیں نکلے اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے، لیکن چونکہ اُن کے قلعے اس زمانہ کے لحاظ سے بہت مضبوط تھے اس لیے ان کو اطمینان تھا کہ مسلمان ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے اور آخر خود تنگ آکر محاصرہ چھوڑ جائیں گے اور اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت ایسے قلعوں کا فتح کرنا واقعی ایک بہت مشکل اور پُر از مشقت کام تھا اور ایک بڑا طویل محاصرہ چاہتا تھا؛ چنانچہ کئی دن تک مسلمان برابر محاصرہ کئے رہے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ جب محاصرہ پر چند دن گذر گئے اور کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بنو نضیر بدستور مقابلہ پر ڈٹے رہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حکم صادر فرمایا کہ بنو نضیر کے اُن کھجوروں کے درختوں میں سے جو قلعوں کے باہر تھے بعض درخت کاٹ دیئے جائیں[3] یہ درخت جو کاٹے گئے لینہ قسم کی کھجور کے درخت تھے[4] جو ایک ادنیٰ قسم کی کھجور تھی جس کا پھل عموماً انسانوں کے کھانے کے کام نہیں آتا تھا[5] اور اس حکم میں منشاء یہ تھا کہ تا ان درختوں کو کٹتا دیکھ کر بنو نضیر مرعوب ہو جائیں۔ اور اپنے قلعوں کے دروازے کھول دیں۔ اور اس طرح چند درختوں کے نقصان سے بہت سی انسانی جانوں کا نقصان اور ملک کا فتنہ و فساد رُک جاتے؛ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور

---

[1] ابن ہشام [2] بخاری حدیث بنی النضیر و مسلم باب اخراج الیہود

[3] ابن ہشام و ابن سعد [4] قرآن شریف سورۃ حشر: ۶

[5] الروض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام

ابھی صرف چھ درخت ہی کاٹے گئے تھے[1] کہ بنونضیر نے غالباً یہ خیال کرکے کہ شاید مسلمان ان کے سارے درخت ہی جن میں پھلدار درخت بھی شامل تھے، کاٹ ڈالیں گے آہ و پکار شروع کردی۔ حالانکہ جیسا کہ قرآن شریف میں تشریح کی گئی ہے صرف بعض درخت اور وہ بھی لینہ قسم کے درخت کاٹنے کی اجازت تھی اور باقی درختوں کے محفوظ رکھنے کا حکم تھا[2] اور ویسے بھی عام حالات میں مسلمانوں کو دشمن کے پھلدار درخت کاٹنے کی اجازت نہیں تھی[3]۔ بہرحال یہ تدبیر کارگر ہوئی اور بنونضیر نے مرعوب ہوکر پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد اس شرط پر قلعہ کے دروازے کھول دیئے کہ ہمیں یہاں سے اپنا ساز و سامان لے کر امن و امان کے ساتھ جانے دیا جائے[4] یہ وہی شرط تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود پہلے پیش کرچکے تھے اور چونکہ آپ کی نیت محض قیام امن تھی آپ نے مسلمانوں کی اس تکلیف اور ان اخراجات کو نظرانداز کرتے ہوئے جو اس مہم میں ان کو برداشت کرنے پڑے تھے اب بھی بنونضیر کی اس شرط کو مان لیا اور محمد بن مسلمہ صحابی کو مقرر فرمایا کہ وہ اپنی نگرانی میں بنونضیر کو امن و امان کے ساتھ مدینہ سے روانہ کردیں[5]۔ چنانچہ بنونضیر بڑے ٹھاٹھ اور شان و شوکت سے اپنا سارا ساز و سامان حتّٰی کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مکانوں کو مسمار کرکے ان کے دروازے اور چوکھٹیں اور لکڑی تک اکھیڑ کر اپنے ساتھ لے گئے[6] اور لکھا ہے کہ یہ لوگ مدینہ سے اس جشن اور دھوم دھام کے ساتھ گاتے بجاتے ہوئے نکلے کہ جیسے ایک برات نکلتی ہے[7]۔ البتہ ان کا سامانِ حرب اور جائیداد غیر منقولہ یعنی باغات وغیرہ مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور چونکہ یہ مال بغیر کسی عملی جنگ کے ملا تھا اس لیے شریعت اسلامی کی رُو سے اس کی تقسیم کا اختیار خالصتًہ رسولُ اللہ کے ہاتھ میں تھا اور آپ نے یہ اموال زیادہ تر ان غریب مہاجرین میں تقسیم فرما دیئے[8] جن کے گذارہ جات کا بوجھ ابھی تک اس ابتدائی سلسلہ مواخات کے ماتحت انصار کی جائیدادوں پر تھا اور اس طرح بالواسطہ انصار بھی اس مالِ غنیمت کے حصہ دار بن گئے[9]۔

جب بنونضیر محمد بن مسلمہ صحابی کی نگرانی میں مدینہ سے کوچ کر رہے تھے تو بعض انصار نے ان لوگوں کو ان کے ساتھ جانے سے روکنا چاہا جو درحقیقت انصار کی اولاد سے تھے مگر ان کے منّت ماننے کے نتیجہ میں یہودی ہوچکے تھے اور بنونضیر ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، لیکن چونکہ انصار کا یہ مطالبہ اسلامی حکم لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ[10]۔ یعنی (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہ ہونا چاہیئے) کے خلاف تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے خلاف اور یہود کے حق میں فیصلہ کیا

---

[1] زرقانی [2] قرآن شریف سورۃ حشر: ۶ [3] موطا امام مالک کتاب الجہاد
[4] ابن ہشام و ابن سعد [5] ابن سعد [6] زرین بحوالہ تلخیص الصحاح جلد ۱ سورۃ حشر [7] طبری
[8] ابوداؤد باب خبر النضیر [9] ابن ہشام
[10] قرآن شریف سورۃ بقرہ: ۲۵۷

اور فرمایا کہ جو شخص بھی یہودی ہے اور جانا چاہتا ہے ہم اُسے نہیں روک سکتے[1] البتہ بنو نضیر میں سے دو آدمی خود اپنی خوشی سے مسلمان ہو کر مدینہ میں ٹھہر گئے[2]

ایک روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کے متعلق یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ شام کی طرف چلے جائیں۔ یعنی عرب میں نہ ٹھہریں۔ لیکن باوجود اس کے اُن کے بعض سردار مثلاً سلام بن ابی الحقیق اور کنانہ بن ربیع اور حُیی بن اخطب وغیرہ اور ایک حصہ عوام کا بھی حجاز کے شمال میں یہودیوں کی مشہور بستی خیبر میں جا کر مقیم ہو گیا اور خیبر والوں نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی[3] اور جیسا کہ آگے چل کر اپنے موقعہ پر بیان ہو گا یہ لوگ بالآخر مسلمانوں کے خلاف خطرناک فتنہ انگیزی اور اشتعالِ جنگ کا باعث بنے۔ بنو قریظہ جنہوں نے اس جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غداری کر کے اور اپنے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ کر بنو نضیر کی اعانت کی تھی اُن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کیا اور معاف فرما دیا[4] مگر ان بدبختوں نے اس احسان کا جو بدلہ دیا اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

غزوہ بنو نضیر کا واقعہ قرآن کریم کی سورۃ حشر میں بیان ہوا ہے جو قریباً ساری کی ساری سورۃ اسی غزوہ کے متعلق ہے۔

حضرت اُمّ المؤمنین زینبؓ بنت خزیمہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک پھوپھی زاد بھائی تھے جن کا نام عبداللہ بن جحش تھا۔ وہ جنگِ اُحد میں شہید ہو گئے اور ان کی بیوی زینب بنت خزیمہ بیوگی کی حالت میں بے سہارا رہ گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صلہ رحمی میں ایک بے نظیر نمونہ رکھتے تھے خود اپنی طرف سے زینب بنت خزیمہ کو نکاح کا پیغام بھیجا اور ان کی طرف سے رضامندی کا اظہار ہونے پر ان کو اپنے عقد میں لے لیا۔ اس وقت زینب بنت خزیمہ کی عمر کم و بیش تیس سال کی تھی مگر ان کی شادی پر ابھی صرف چند ماہ ہی گذرے تھے کہ ربیع الآخر ۴ھ میں وہ انتقال کر گئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جنت البقیع میں دفن فرمایا۔ زینب بنت خزیمہ ایک بہت نیک اور پارسا بی بی تھیں اور اپنے صدقہ و خیرات اور غرباء پروری کی وجہ سے عام طور پر اُمّ المساکین کے نام سے مشہور تھیں[5]

ولادتِ حسینؓ شعبان ۴ھ

اسی سال ماہِ شعبان میں حضرت فاطمہؓ کے ہاں دوسرا بچہ پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حُسینؓ رکھا۔ حسین بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح عزیز تھے جیسا کہ ان کے بھائی حسن تھے۔ چنانچہ بعض اوقات

---

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد [2] ابن ہشام [3] طبری [4] بخاری حدیث بنی النضیر و مسلم باب اجلاء الیہود

[5] زرقانی جلد ۳ حالات زینب بنت خزیمہ نیز اصابہ فی معرفۃ الصحابہ

آپؐ محبت میں ان دونوں کو اپنے دو پھول کہہ کر یاد فرمایا کرتے تھے[1] یہ وہی امام حسین رضی اللہ عنہ ہیں جو یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کے زمانہ میں ۶۱ھ کے ماہِ محرم کی دسویں تاریخ کو ایک مظلوم حالت میں شہید ہو کر اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے[2] اور جن کی شہادت کی یاد میں شیعہ لوگ آج تک ماتم کرتے اور تعزیئے نکالتے ہیں۔

غزوہ بدر الموعد ذوقعدہ ۴ھ

جنگِ اُحد کے حالات میں یہ ذکر گذر چکا ہے کہ میدان سے لوٹتے ہوئے ابوسفیان نے مسلمانوں کو یہ چیلنج دیا تھا کہ آئندہ سال بدر کے مقام پر ہماری تمہاری جنگ ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیلنج کو قبول کرنے کا اعلان فرمایا تھا۔ اس لیے دُوسرے سال یعنی ۴ھ ہجری میں جب شوال کے مہینہ کا آخر آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ ہزار صحابہ کی جمعیت کو ساتھ لے کر مدینہ سے نکلے اور آپؐ نے اپنے پیچھے عبداللہ بن عبداللہ بن اُبَیّ کو امیر مقرر فرمایا۔[3]

دُوسری طرف ابوسفیان بن حرب بھی دو ہزار قریش کے لشکر کے ساتھ مکہ سے نکلا مگر باوجود اُحد کی فتح اور اتنی بڑی جمعیت کے ساتھ ہونے کے اس کا دل خائف تھا اور اسلام کی تباہی کے درپے ہونے کے باوجود وُہ چاہتا تھا کہ جب تک بہت زیادہ جمعیت کا انتظام نہ ہو جاوے وہ مسلمانوں کے سامنے نہ ہو۔ چنانچہ ابھی وُہ مکہ میں ہی تھا کہ اُس نے ایک شخص نعیم نامی کو جو ایک غیر جانبدار قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، مدینہ کی طرف روانہ کر دیا اور اُسے تاکید کی کہ جس طرح بھی ہو مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر اور جھوٹ سچ باتیں بنا کر جنگ سے نکلنے کے لیے باز رکھے، چنانچہ یہ شخص مدینہ میں آیا اور قریش کی تیاری اور طاقت اور ان کے جوش و خروش کے جھوٹے قصّے سُنا سُنا کر اُس نے مدینہ میں ایک بے چینی کی حالت پیدا کر دی حتّٰی کہ بعض کمزور طبیعت لوگ اس غزوہ میں شامل ہونے سے خائف ہونے لگے۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکلنے کی تحریک فرمائی اور آپؐ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہم نے کفار کے چیلنج کو قبول کر کے اس موقعہ پر نکلنے کا وعدہ کیا ہے، اس لیے ہم اس سے تخلّف نہیں کر سکتے اور خواہ مجھے اکیلا جانا پڑے میں جاؤں گا اور دشمن کے مقابل پر اکیلا سینہ سپر ہوں گا، تو لوگوں کا خوف جاتا رہا اور وہ بڑے جوش اور اخلاص کے ساتھ آپؐ کے ساتھ نکلنے کو تیار ہو گئے۔[4]

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور دُوسری طرف ابوسفیان اپنے دو ہزار سپاہیوں کے ہمراہ مکہ سے نکلا، لیکن خدائی تصرف کچھ ایسا ہوا کہ مسلمان تو بدر میں

---

[1] بخاری باب فضائل [2] اصابہ
[3] ابن ہشام [4] ابن سعد

اپنے وعدہ پر پہنچ گئے۔ مگر قریش کا لشکر تھوڑی دُور آکر پھر مکہ کو واپس لوٹ گیا۔ اور اس کا قصہ یوں ہوا کہ جب ابوسفیان کو نعیم کی ناکامی کا علم ہوا تو وہ دل میں خائف ہوا اور اپنے لشکر کو یہ تلقین کرتا ہوا راستہ سے لوٹا کر واپس لے گیا کہ اس سال قحط بہت ہے اور لوگوں کو تنگی ہے اس لیے اس وقت لڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ جب کشائش ہوگی تو زیادہ تیاری کے ساتھ مدینہ پر حملہ کریں گے[1]

اسلامی لشکر آٹھ دن تک بدر میں ٹھہرا اور چونکہ وہاں ماہ ذوقعدہ کے شروع میں ہر سال میلہ لگا کرتا تھا۔ ان ایام میں بہت سے صحابیوں نے اس میلہ میں تجارت کر کے کافی نفع کمایا حتیٰ کہ انہوں نے اس آٹھ روزہ تجارت میں اپنے راس المال کو دوگنا کر لیا۔ جب میلے کا اختتام ہوگیا اور لشکرِ قریش نہ آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے کوچ کر کے مدینہ میں واپس تشریف لے آئے اور قریش نے مکہ میں واپس پہنچ کر مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں[2] یہ غزوہ غزوہ بدر الموعد کہلاتا ہے۔

تزوج اُمّ سلمہؓ شوال ۴ھ

اسی سال ماہ شوال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّ سلمہؓ سے شادی فرمائی[3] اُمّ سلمہؓ قریش کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور اس سے پہلے ابوسلمہ بن عبدالاسد کے عقد میں تھیں جو ایک نہایت مخلص اور پرانے صحابی تھے اور اسی سال فوت ہوئے تھے۔ جب اُمّ سلمہ کی عدت (یعنی وہ میعاد جو اسلامی شریعت کی رُو سے ایک بیوہ یا مطلقہ عورت پر گذرنی ضروری ہوتی ہے پیشتر اس کے کہ وہ نکاح ثانی کرے) گذر گئی تو چونکہ اُمّ سلمہ ایک نہایت سمجھدار باسلیقہ اور قابل خاتون تھیں اس لیے حضرت ابوبکر کو ان کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش پیدا ہوئی[4] مگر اُمّ سلمہ نے انکار کیا۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے لیے اُن کا خیال آیا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُمّ سلمہ کی ذاتی خوبیوں کے علاوہ جن کی وجہ سے وہ ایک شارع نبی کی بیوی بننے کی اہل تھیں وہ ایک بہت بڑے پائے کے قدیم صحابی کی بیوہ تھیں اور پھر صاحب اولاد بھی تھیں جس کی وجہ سے ان کا کوئی خاص انتظام ہونا ضروری تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ ابوسلمہ بن عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی تھے[5] اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پسماندگان کا خاص خیال تھا۔ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّ سلمہؓ کو اپنی طرف سے شادی کا پیغام بھیجا۔ پہلے تو اُمّ سلمہؓ نے اپنی بعض معذوریوں کی وجہ سے کچھ تامل کیا اور یہ عذر بھی پیش کیا کہ میری عمر اب بہت زیادہ ہوگئی ہے اور مَیں اولاد کے قابل نہیں رہی[6] لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض

---

[1] ابن ہشام و ابن سعد ۔ [2] ابن سعد [3] طبری و زرقانی جلد ۳ حالات اُمّ سلمہؓ
[4] نسائی کتاب النکاح باب انکاح الابن امہ ۔ [5] بخاری کتاب النکاح باب و ان تجمعوا بین الاختین
[6] نسائی بحوالہ اصابہ و زرقانی جلد ۳ و ابن سعد جلد ۸ حالات اُمّ سلمہؓ

اور تھی اس لیے بالآخر وہ رضامند ہوگئیں اور اُن کی طرف سے اُن کے لڑکے نے ماں کا ولی ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن کی شادی کر دی۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے۔ اُمّ سلمہ ایک خاص پائے کی خاتون تھیں اور نہایت فہیم اور ذکی ہونے کے علاوہ اخلاص وایمان میں بھی ایک اعلیٰ مرتبہ رکھتی تھیں اور ان لوگوں میں سے تھیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ابتداءً حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ مدینہ کی ہجرت میں بھی وہ سب مستورات سے اوّل نمبر پر تھیں[1] حضرت اُمّ سلمہؓ پڑھنا بھی جانتی تھیں[2] اور مسلمان مستورات کی تعلیم و تربیت میں انھوں نے خاصہ حصّہ لیا؛ چنانچہ کتب حدیث میں بہت سی روایات اور احادیث ان سے مروی ہیں اور اسی جہت سے ان کا درجہ ازواج النبی میں دُوسرے نمبر پر اور کُل صحابہ (مرد و زن) میں بارھویں نمبر پر ہے۔ حضرت اُمّ سلمہؓ نے بہت لمبی عمر پائی اور یزید بن معاویہ کے زمانہ میں ۸۴ سال کی عمر میں فوت ہوئیں[3]۔ اور وُہ امہات المومنین میں سب سے آخری فوت ہونے والی تھیں[4]۔ چونکہ حضرت اُمّ سلمہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سب سے بڑی عمر کی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ شادی کیوقت اولاد پیدا کرنے کے بھی ناقابل ہوچکی تھیں اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جو دورہ آپؐ اپنی بیویوں کے گھروں میں دریافت خیریت کے لیے روزانہ عصر کی نماز کے بعد فرمایا کرتے تھے اس میں سب سے پہلے آپؐ حضرت اُمّ سلمہؓ کے پاس تشریف لے جاتے اور سب سے آخر میں حضرت عائشہؓ کے گھر میں جاتے تھے جو عمر میں سب سے چھوٹی تھیں اور پھر اس کے بعد جس بیوی کی باری ہوتی تھی اسکے گھر تشریف لے جاتے تھے[5]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتبِ خاص اور عبرانی کی تعلیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خط و کتابت کا سلسلہ اب وسیع ہو رہا تھا اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ آپؐ کا کوئی مخلص صحابی عبرانی سے بھی واقفیت پیدا کرے تاکہ یہود کے ساتھ خط و کتابت اور معاہدات وغیرہ کی تکمیل میں آسانی ہو اور دھوکے وغیرہ کا احتمال نہ رہے چنانچہ اس غرض سے آپؐ نے اپنے ایک نوجوان صحابی زید بن ثابت انصاری سے جنھوں نے جنگِ بدر کے قیدیوں سے عربی لکھنا پڑھنا سیکھا تھا اور جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبِ خاص یا پرائیویٹ سیکرٹری کا کام کرتے تھے، ارشاد فرمایا کہ وہ عبرانی کا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیں۔ چنانچہ زید نے جو خاص طور پر ذہین واقع ہوئے تھے صرف پندرہ دن کی محنت سے عبرانی سیکھ لی[6]۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ وہی زید بن ثابت ہیں، جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں ان کے حکم کے ماتحت قرآن شریف کو

---

[1] زرقانی و اصابہ [2] بلاذری باب امر الخط [3] ابن سعد جلد ۸ و تہذیب التہذیب [4] زرقانی و اصابہ حالات اُمّ سلمہؓ [5] زرقانی جلد ۳ حالات حضرت اُمّ سلمہؓ [6] اصابہ و خمیس

ایک مصحف یعنی کتاب کی صورت میں جمع کر کے لکھا لیے

جمع قرآن

ہم نے جو اوپر یہ لکھا ہے کہ زید بن ثابت انصاری نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں قرآن کریم کو مصحف کی صورت میں جمع کر کے لکھا تھا۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس سے پہلے قرآن مجید جمع نہیں تھا بلکہ حق یہ ہے کہ قرآن کریم جُوں جُوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا جاتا تھا، آپ الٰہی تفہیم کے ماتحت اُسے ترتیب دیکر نہ صرف خود اُسے یاد کرتے جاتے تھے بلکہ بہت سے دوسرے صحابہ کو بھی یاد کرا دیتے تھے اور جو صحابہ اس معاملہ میں زیادہ ماہر تھے اُن کا آپ نے یہ فرض مقرر کیا تھا کہ وُہ دوسروں کو سکھائیں[2] اور مزید احتیاط کے طور پر آپ اُسے ساتھ ساتھ لکھواتے بھی جاتے تھے؛ چنانچہ حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ یہی زید بن ثابت جنھوں نے بعد میں قرآن شریف کو ایک جلد کی صورت میں اکٹھا کر کے لکھا اور جو ایک غیر معمولی طور پر ذہین آدمی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآنی وحی کے قلمبند کرنے پر مامور تھے[4] اور ان کے علاوہ بعض اور اصحاب بھی اس خدمت کو سرانجام دیتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت علیؓ۔ زبیرؓ بن العوام۔ شرحبیلؓ بن حسنہ۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔ اُبَیؓ بن کعب۔ عبداللہؓ بن رواحہ وغیرہ[5]۔ غرض قرآن مجید کے جمع و ترتیب کا حقیقی کام سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی آپ کی ہدایت کے ماتحت ہوگیا تھا۔ اور یہ صرف ایک قیاس ہی نہیں ہے بلکہ حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر آتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس سے روایت آتی ہے کہ حضرت عثمان بن عفان خلیفہ ثالث فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ جب آپ پر کوئی وحی نازل ہوتی تھی تو آپ اپنے کاتب وحی کو بُلوا کر اُسے وہ وحی لکھوا دیتے تھے اور ساتھ ہی یہ فرما دیتے تھے کہ اُسے فلاں سورۃ میں فلاں موقعہ پر رکھو۔ اسی طرح

---

[1] بخاری باب جمع القرآن [2] یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف کا نزول قریباً تیئیس سال زیادہ صحیح طور پر ساڑھے بائیس سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ ہوا تھا۔ اور گو درمیان میں بعض ناغے ہو جاتے تھے اور بعض ایام میں زیادہ حصہ اکٹھا نازل ہو جاتا تھا۔ لیکن اگر حسابی طور پر قرآن شریف کی مجموعی آیات کو جو قریباً چھ ہزار دو سو چونتیس (۶۲۳۴) ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت کے دنوں پر جو قمری حساب سے قریباً سات ہزار نو سو ستر (۷۹۷۰) بنتے ہیں پھیلا کر دیکھا جاوے تو فی یوم صرف ۰٫۸ یعنی ایک آیت سے بھی کم کا حساب نکلتا ہے اور یہی اس قرآنی آیت کی عملی تفسیر ہے کہ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (سورۃ فرقان: ۳۳) یعنی ہم نے قرآن کو یکلخت نہیں اُتارا بلکہ بہت آہستہ آہستہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُتارا ہے۔

[3] بخاری فضائل القرآن [4] بخاری کتاب فضائل القرآن باب کاتب النبی صلعم۔

[5] فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹، زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۱۱ تا ۳۲۶

آپؐ خود ہی سُورتوں کی ترتیب بھی فرما دیتے تھے[1] اور یہ طریق آپؐ کا ابتدا دعویٰ نبوت سے تھا؛ چنانچہ کتاب کے حصہ اوّل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ جب مکہ کے ابتدائی سالوں میں حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے تو اُنہیں اسلام کی تحریک قرآن کی تلاوت سے ہی ہوئی تھی جو خباب بن الارت ایک لکھے ہوئے صحیفہ سے حضرت عمر کی بہن اور بہنوئی کو پڑھ کر سُنا رہے تھے[2] الغرض قرآن شریف شروع سے ہی ساتھ ساتھ ضبطِ تحریر میں آکر مرتب ہوتا اور جمع ہوتا گیا تھا۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ اپنی نمازوں میں قرآن شریف کی باقاعدہ تلاوت فرمایا کرتے تھے اور بعض اوقات نمازوں میں لمبی لمبی قرآتیں پڑھتے تھے؛ چنانچہ ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے ایک ہی تہجد یعنی نصف شب کی نماز میں قرآن شریف کی پہلی پانچ سورتوں کی جو مجموعی طور پر قرآن کریم کے پنجم حصہ کے برابر بنتی ہیں اکٹھی اور بالترتیب قرأت فرمائی تھی[3] اور یہی وہ لمبے قیام ہیں جن کی وجہ سے بسا اوقات آپؐ کے پاؤں متورم ہو جاتے تھے[4] اور بعض روایتوں سے پتہ لگتا ہے کہ آپؐ ہر سال ماہِ رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن شریف کا دَور فرمایا کرتے تھے اور آخری سال دو دفعہ مکمل دور فرمایا[5] یہ سب باتیں اس بات کو یقینی طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ قرآن شریف کی ترتیب اور جمع کا حقیقی کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ پس زید بن ثابت کے جمع کرنے سے صرف یہ مراد ہے کہ اُنھوں نے حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اوّل کے حکم اور ان کی نگرانی کے ماتحت قرآن مجید کو ایک مصحف یعنی جلد یا کتاب کی صورت میں اکٹھا کر کے لکھا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتب کردہ قرآن کی ایک مستند اور یکجائی کاپی ضبط میں آجاوے اور روایات سے پتہ لگتا ہے کہ پھر اُسی مصحف سے بعد میں حضرت عثمان خلیفہ ثالث نے متعدد مصدقہ نقلیں تیار کرا کے انہیں اس وقت کی اسلامی دنیا کے مختلف علاقوں میں بھجوا دیا اور پھر انہی مصدقہ نقول سے آگے مزید اشاعت ہوتی گئی[6] علاوہ ازیں ہر زمانہ میں ہزاروں بلکہ لاکھوں حفّاظ نے قرآن کریم کو اپنے سینوں میں لفظ بلفظ محفوظ کر کے اس کی حفاظت کا ایک مزید ظاہری سبب مہیا کیا۔ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کہ مسلمانوں کو قرآن شریف کے حفظ کرنے کا کس قدر شوق رہا ہے صرف یہ روایت کافی ہے کہ جب ایک دفعہ کسی غرض سے حضرت عمرؓ کو قرآن کے حفاظ کے پتہ لینے کی ضرورت پیش آئی تو معلوم ہوا کہ اس وقت کی اسلامی افواج کے صرف ایک دستہ میں تین سو سے زائد حافظ قرآن تھے[7] موجودہ زمانہ میں بھی جبکہ لوگوں میں دین کا شوق بہت کم ہو گیا ہے اسلامی دُنیا میں حفاظ قرآن کی تعداد یقیناً لاکھوں سے کم نہیں ہوگی۔

---

[1] ابوداؤد و ترمذی و مسند احمد بحوالہ مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن و فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹، ۲۰ و صفحہ ۳۹ [2] ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰ و زرقانی جلد ۱ صفحہ ۲۷۳، ۲۷۴ [3] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب مایقول الرجل فی رکوعہ

[4] بخاری ابواب التہجد [5] بخاری کتاب فضائل قرآن باب کان جبریل یعرض القرآن

[6] بخاری کتاب فضائل قرآن باب جمع القرآن و فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۸ [7] کنز العمال باب فی القرآن فصل فی فضائل القرآن۔

ترتیبِ قرآن یہ سوال کہ قرآن شریف کی موجودہ ترتیب کسی اصول پر قائم ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس پر؟ تاریخ سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی ایک تاریخی تصنیف میں اس قسم کے سوال کا تشریحی جواب دیا جا سکتا ہے مگر اس جگہ اس کے متعلق ایک مختصر سا اشارہ کر دینا غالباً بے سود نہ ہوگا۔ سو جاننا چاہئے کہ جیسا کہ دوست و دشمن میں مسلّم ہے اور تاریخ و حدیث اس کے حوالوں سے بھری پڑی ہیں کہ قرآنِ شریف کی موجودہ ترتیب اس کے نزول کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے بلکہ وہ ایک جُداگانہ ترتیب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خدائی تفہیم کے مطابق مقرر فرمائی تھی؛ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ[1] یعنی "قرآن کا جمع کرنا خود ہمارے ذمہ ہے اور ہم ہی اس کام کو سرانجام دیں گے" اور ظاہر ہے کہ جمع قرآن کا کام خصوصاً جبکہ اُسے نزول کی ترتیب سے ہٹا کر دُوسری ترتیب میں جمع کیا گیا ہو ترتیب کے ساتھ لازم و ملزوم کے طور پر ہے اور جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ حدیث میں تو صراحت کے ساتھ ذکر آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر آیت کے نزول پر اور ہر سُورۃ کے مکمل ہونے پر خود ہدایت فرماتے تھے کہ اس آیت یا سُورۃ کو فلاں جگہ رکھو[2] اندریں حالات خواہ کسی شخص کو موجودہ قرآنی ترتیب سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس بات میں کوئی شُبہ نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن میں کوئی نہ کوئی اصولِ ترتیب ضرور مقصود ہے۔ دراصل غور کیا جاوے تو اصل نزول کی ترتیب کو چھوڑنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ نئی ترتیب میں کوئی نہ کوئی اصول ضرور مدِّنظر رکھا گیا ہے؛ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ نزول کی ترتیب کو ترک کر کے کوئی اور ترتیب اختیار کی جاتی۔ مثلاً ایک ہال میں چند آدمی یکے بعد دیگرے داخل ہوتے ہیں۔ اب اگر ہال کا منتظم اُن آدمیوں کے متعلق خاص اہتمام کے ساتھ یہ انتظام کرتا ہے کہ وہ داخل ہونے کی ترتیب سے نہ بیٹھیں بلکہ انہیں کسی اور ترتیب کے ساتھ بٹھاتا ہے تو اس کا یہی فعل اس بات کی دلیل ہوگا کہ خواہ اس کا اصولِ ترتیب کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو، مگر اس کے مدّنظر کوئی نہ کوئی اصول ضرور ہے؛ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ داخلہ کی ترتیب کو تبدیل کیا جاتا۔ کیونکہ کوئی ہوش و حواس رکھنے والا انسان یونہی لغو طور پر بلاوجہ کوئی کام نہیں کرتا۔

اس موقعہ پر اکثر یورپین محققین یہ کہا کرتے ہیں کہ ہال کے منتظم نے داخلہ کی ترتیب کو بدل کر سائزنگ کے اصول پر لوگوں کو بٹھا دیا ہے۔ یعنی قرآنی سورتوں کو ان کی لمبائی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مگر یہ ایک سراسر بے بنیاد اور غلط خیال ہے۔ کیونکہ اوّل تو ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ جمع و ترتیب کا کام خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدائی تفہیم کے ماتحت سرانجام دیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے انسان کی طرف اس قسم کا عبث فعل کبھی بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا فعل وہی شخص کر سکتا ہے جو عقل و خرد سے

---

[1] سورۃ قیامۃ: ۱۸ [2] ابوداؤد و احمد بحوالہ فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹، ۲۰ و صفحہ ۳۹

بالکل عاری ہو۔ نزول کی ترتیب جس سے کم ازکم بعض تاریخی فوائد کے حصول میں آسانی ہو سکتی تھی اسے محض اس وجہ سے ترک کرنا کہ قرآنی سورتیں لمبے اور چھوٹے ہونے کے لحاظ سے ترتیب دی جاسکیں جس میں کوئی بھی علمی فائدہ متصوّر نہیں ہے، ایک ایسا فعل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو درکنار ایک معمولی عقل کا آدمی بھی اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو اس سے بہت ہی بالا و ارفع ہے۔ دوسرے۔ سورتوں کا وجود ہی جس کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کسی ترتیب کا نتیجہ ہے کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں قرآن شریف سورتوں کی صورت میں نازل نہیں ہوا بلکہ آیات کی صورت میں بہت آہستہ آہستہ نازل ہوا ہے اور سورتیں آیات کے جمع ہونے سے عالم وجود میں آئی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات عملاً بھی بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے کہ قرآن میں سورتوں کے لمبا چھوٹا ہونے کی ترتیب مدِّنظر رکھی گئی ہے اور قرآنی سورتوں کی آیات کی تعداد کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس کی تردید کے لیے کافی ہے کیونکہ بیسیوں مثالیں ایسی ہیں کہ بعض لمبی سورتیں ہیں جو پیچھے رکھی گئی ہیں اور بعض چھوٹی سورتیں ہیں جو پہلے آگئی ہیں اور نہ معلوم مغربی محققین اس معاملہ میں اس قدر کوتاہ نظری اور فاش غلطی کے مرتکب کس طرح ہوتے ہیں۔

الغرض اس بات میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اوّل قرآن شریف کی موجودہ ترتیب اس کے نزول کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ دوم۔ نہ ہی یہ ترتیب سورتوں کے طول و قصر کے لحاظ سے ہے بلکہ سوم۔ یہ کوئی اور ہی ترتیب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خدائی ارشاد کے ماتحت مقرر فرمائی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترتیب کیا ہے؟ اس کے جواب میں اس جگہ صرف اس قدر اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن شریف جو خدا کا قول ہے اس میں اسی قسم کا اصولِ ترتیب مدِّنظر رکھا گیا ہے جو خدا کے فعل یعنی صحیفۂ قدرت میں پایا جاتا ہے یعنی جس طرح اس جسمانی عالم میں دنیا کی مادی زندگی اور ترقی و بہبودی کے سامان و ذرائع مہیا کیے جاکر اس میں ایک ترتیب رکھی گئی ہے اسی طرح کی خدا کے قول یعنی قرآن شریف میں ایک ترتیب ہے جو علم النفس کے ان ابدی اصول کے ماتحت قائم کی گئی ہے جو دنیا کی اخلاقی اور تمدنی اور روحانی زندگی اور اصلاح و ترقی کے لیے بہترین اثر رکھتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جس طرح بعض لوگوں کو اس عالم جسمانی میں کوئی ترتیب نظر نہیں آتی اسی طرح روحانی بینائی سے محروم لوگوں کو قرآنی ترتیب بھی نظر نہیں آتی۔ مگر جو لوگ گہرے مطالعہ کے عادی ہیں اور روحانی کلام کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنے اندر ضروری بینائی اور تقدس و طہارت رکھتے ہیں وہ اس ترتیب کو علیٰ قدرِ مراتب سمجھتے اور اس کے اثر کو اپنے نفوس میں محسوس کرتے ہیں۔

اس جگہ اگر یہ سوال پیدا ہو کہ اگر موجودہ ترتیب ہی اصلاح و تربیت اور روحانی تاثیر کے لحاظ سے بہترین تھی تو پھر اسی کے مطابق قرآن کا نزول کیوں نہ ہوا تاکہ صحابہ کی جماعت بھی جو قرآنی تعلیم کی سب سے پہلی حامل بنتی تھی ان اثرات سے متمتع ہوتی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کے حالات اور بعد میں آنیوالے

مسلمانوں کے حالات میں اختلاف ہے صحابہ کے لیے وہی ترتیب بہترین تھی جس کے مطابق قرآن شریف نازل ہوا۔ مگر جب ایک ابتدائی جماعت قائم ہوگئی تو پھر آئندہ کے لیے مستقل طور پر وہ ترتیب بہترین تھی جو موجودہ قرآن میں پائی جاتی ہے اور یہ اختلاف دو اصول کے ماتحت ہے۔

اوّل تو یوجہ اس کے کہ صحابہ کی جماعت وہ پہلی جماعت تھی جو اسلامی شریعت کے مطابق قائم ہوئی اور اس سے پہلے کوئی جماعت اسلامی شریعت کی حامل نہیں تھی اور نہ ہی دُنیا میں اسلامی شریعت کا وجود تھا۔ اور قرآن کے ذریعہ سے پہلے طریق وتمدّن کو مٹا کر ایک بالکل ہی نئے طریق وتمدّن کی بنیاد پڑنی تھی، اس لیے ضروری تھا کہ اس وقت کے لوگوں کے سامنے ان کی ذہنیت اور ماحول کے مناسب حال قرآنی احکامات کا نزول ہوتا تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو بدلنے اور نئی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے میں آسانی پاتے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے بہترین صورت یہ تھی کہ سب سے پہلے اس قسم کی آیات کا نزول ہوتا جن میں صرف عقیدہ کی درستی مدِّ نظر ہے اور مشرکانہ خیالات کو مٹا کر توحید کو قائم کیا گیا ہے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اسلامی طریق عبادات اور اسلامی طریق معاملات اور اسلامی طریق تمدّن اور اسلامی طریق سیاست کے متعلق اُدامر ونواہی نازل ہوتے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا[1] لیکن جب ایک جماعت اسلامی شریعت کی حامل تیار ہوگئی اور آئندہ پھیلاؤ اور ترقی کے لیے ایک وجود بطور تخم کے یعنی ایک نیوکلیس (NUCLEUS) تیار ہوگیا تو اب اس تخم یا نیوکلیس کی آئندہ ترقی کے لیے وہ ابتدائی ترتیب نزول غیر طبعی اور ناموزوں تھی۔ اس لیے اسے بدل کر وہ ترتیب دے دی گئی جو اس کیلئے مناسب تھی، چنانچہ قرآن شریف کی موجودہ ترتیب بالکل اس اصول کے ماتحت ہے جو ایک تیار شدہ جماعت کے استحکام۔ اس کے پھیلاؤ اور ترقی کے لیے موزوں ترین ہے۔

دُوسرا اصول نزول کی ترتیب کو بدل کر دُوسری ترتیب کے اختیار کرنے میں یہ مدِّ نظر تھا کہ نزول کی ترتیب زیادہ تر ان حالات کے مطابق چلتی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو پیش آتے تھے۔ مثلاً چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں ابھی کفار پر اتمام حجت ہو رہا تھا اور مسلمانوں کو صبر وشکیب کے سانچے میں ڈھال کر نکالنا مقصود تھا۔ اس لیے مکی آیات میں جہاد کی تعلیم نہیں دی گئی۔ بلکہ صبر و برداشت کی تعلیم پر زور ہے۔ لیکن جب اتمام حجت ہو چکا اور صحابہ بھی صبر و برداشت کے سانچے میں ڈھل چکے اور کفار کے مظالم سے مسلمانوں کو اپنا وطن تک چھوڑنا پڑا اور ظالم کی سزا کا وقت آگیا تو اس وقت جہاد کی آیات نازل ہوئیں اسی طرح مکہ میں چونکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت بصورت جمعیت نہیں تھی اور کفار کے مظالم نے انہیں بالکل منتشر کر رکھا تھا۔ یعنی ان کی کوئی اجتماعی زندگی نہیں تھی اس لیے مکہ میں اسلامی طریق تمدّن و معاملات کے متعلق آیات نازل نہیں ہوئیں لیکن جب

---

[1] بخاری کتاب فضائل القرآن باب تالیف القرآن و فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۳۴

مدینہ میں مسلمانوں کو ایک اجتماعی زندگی نصیب ہوئی تو اس کے مناسب حال آیات کا نزول ہوا اگر اس نزول میں حالات کی مناسبت اور مطابقت کو ملحوظ نہ رکھا جاتا، تو یقیناً ابتدائی مسلمانوں کے لیے نئی شریعت کو اپنے اندر جذب کرنا اور اس پر صحیح طور پہ عامل ہونا سخت مشکل ہو جاتا۔ لہٰذا قرآن کے نزول کو حتی الوسع حالات پیش آمدہ کے ساتھ ساتھ چلایا گیا تھا تاکہ اس کی تعلیم صحابہ میں جذب ہوتی جاوے، لیکن جب سب نزول ہو چکا اور ایک جماعت قرآنی شریعت کی حامل وجود میں آگئی تو پھر اس ترتیب کو قائم رکھنا ضروری نہ تھا، بلکہ پھر اس بات کی ضرورت تھی کہ آئندہ کی مستقل ضروریات کے مطابق اُسے ترتیب دی جاوے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اگر اس جگہ کسی کو یہ اعتراض پیدا ہو کہ نزول کی ترتیب بدلنے سے قرآن کی تاریخی حیثیت ضائع ہو گئی ہے تو یہ ایک بودا اور فضول اعتراض ہوگا کیونکہ اول تو جب حدیث و تاریخ میں قرآنی آیات کی نزول کی ترتیب بیشتر طور پر محفوظ ہے اور ذرا سی محنت اور توجہ کے ساتھ اس بات کا پتہ لگ سکتا ہے کہ کوئی آیت یا سورۃ کب نازل ہوئی تھی تو اس صورت میں ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن کی تاریخی حیثیت ضائع ہو گئی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ وُہ پوری طرح محفوظ ہے اور دوست و دشمن نے اُسے تسلیم کیا ہے صرف فرق یہ پیدا ہوا ہے کہ اگر قرآن کو اُس کے نزول کے مطابق ترتیب دیا جاتا، تو اس کی تاریخی حیثیت بدیہی اور عیاں ہوتی اور اب وہ محنت اور توجہ کے ساتھ نکالنی پڑتی ہے۔

دوسرے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن شریف کی اصل غرض و غایت تاریخ کی حفاظت نہیں ہے بلکہ اس قانون کا بہترین صورت میں مہیا کرنا ہے جو لوگوں کی تمدنی اور اخلاقی اور رُوحانی ترقی کے لیے ضروری ہے اور جو بندہ کو خدا تک پہنچا سکتا ہے۔ پس اس کی ترتیب میں بھی انہی اُصول کا مدنظر رکھا جانا ضروری تھا جو ان اغراض کو بہترین صورت میں پورا کر سکتے تھے اور اگر اس کی ترتیب میں ان اصولوں کو قربان کر کے تاریخی پہلو کو ترجیح دی جاتی تو یہ ایک نہایت غیر حکیمانہ فعل ہوتا۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن شریف کی موجودہ ترتیب بھی اس رنگ کی ترتیب نہیں ہے جس میں عام کتب کی طرح بابوں اور فصلوں اور پیروں وغیرہ میں مضمون کو تقسیم کیا گیا ہو۔ کیونکہ اس قسم کی ترتیب قرآن کی غرض وغایت کے منافی تھی۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ سب اقوام اور سب زمانوں کے لیے ایک شریعت لایا ہے[1] اور اس میں علوم کے خزانے مخفی ہیں جو بقدر ضرورت ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے[2] اور حدیث میں آتا ہے کہ قرآن کی تحقیق سے علماء کبھی سیر نہیں ہوں گے اور نہ اس کے عجائب کبھی ختم ہوں گے[3] اور ایک دُوسری حدیث میں آتا ہے کہ قرآنی آیات کے صرف ظاہری معانی پر ہی

---

[1] سورۃ فرقان: ۲، سورۃ سبا ع ۲۹، سورۃ انعام: ۱۳ [2] سورۃ بنی اسرائیل: ۹۰ سورۃ حجر: ۲۲ [3] ترمذی ابواب القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۴۹

حصر نہیں ہے بلکہ اس کی ہر آیت کے نیچے متعدد بطون ہیں اور ہر بطن آگے متعدد شاخیں رکھتا ہے[1]۔ بالفاظ دیگر اسلام قرآن شریف کو ایک رُوحانی عالم کے طور پر پیش کرتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح یہ دُنیا ایک جسمانی عالم ہے پس اس کی ترتیب کے اُصول کو سمجھنے کے لیے بھی بہترین مثال اس دُنیا کی ہوسکتی ہے جس طرح اور جس رنگ میں اس دُنیا میں ترتیب پائی جاتی ہے کہ ہر چیز باوجود ایک دوسرے سے بظاہر جدا اور لاتعلق نظر آنے کے دراصل اپنی گہرائیوں میں ایک دوسرے سے پیوست اور مربوط ہے اور ایک مخفی زنجیر بلکہ مختلف جہات سے کئی مخفی زنجیریں اس کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے منسلک کئے ہوتے ہیں اسی طرح قرآن کی گہرائیوں میں ربط و اتحاد کی کڑیاں چلتی ہیں۔ اور ٹھیک جس طرح اس جسمانی عالم میں محققین اور سائنس دان اپنی اپنی اہلیت اور اپنی اپنی تحقیق کے مطابق علوم کے جواہر نکالتے رہتے ہیں اسی طرح قرآن کے رُوحانی عالم کے سمندر میں غوطہ لگانے والوں کے لیے بھی کسی زمانہ میں رُوحانی موتیوں کی کمی نہیں رہی اور نہ آئندہ ہوگی۔ اور یہ بات قرآن کریم کے سب سے بڑے معجزوں میں سے بڑا معجزہ ہے کہ اس کے الفاظ اور اس کی ترتیب کو ایسے طور پر رکھا گیا ہے کہ وہ باوجود حجم میں ساری آسمانی کتابوں میں سے چھوٹا ہونے کے اپنے اندر روحانی علوم کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ رکھتا ہے جو حسبِ تحقیق محققین اور حسب ضرورتِ زمانہ ہمیشہ ظاہر ہوتے رہے ہیں اور ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے[2] اور یہی وجہ ہے کہ اس کی ترتیب کو عام کتب کی طرح معین مضمون کے ٹکڑوں میں تقسیم کرکے بابوں اور فصلوں اور پیروں وغیرہ کی صورت میں نہیں رکھا گیا۔ کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اس کے معانی کی ساری وسعت کھوئی جاتی۔ اور اس کا مفہوم ایک محدود اور معین صورت اختیار کرکے اپنی ظاہری اور بدیہی صورت میں بالکل مقید ہوجاتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ قرآن شریف اس بات کا مدعی ہے کہ اس کے اندر علوم کے بے انتہا خزانے مخفی ہیں جو ہمیشہ بقدر ضرورت ظاہر ہوتے رہیں گے اور اس کی تحقیق کا میدان کبھی ختم نہیں ہوگا اور قرآن کی یہ حیثیت اور اس کے نزول کی یہ غرض یقیناً فوت ہوجاتی اگر اس کی ترتیب کو عام کُتب کی طرح بابوں اور فصلوں وغیرہ میں مضمون وار تقسیم کرکے ایک ٹھوس صورت میں جکڑ دیا جاتا۔ پس جہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن ایک نہایت مرتب اور منظم کتاب ہے اور یہ بالکل غلط ہے کہ اس میں کوئی ترتیب نہیں ہے وہاں یہ بات بھی کبھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ اس کی ترتیب عام کتب کی طرح نہیں ہے بلکہ اس جسمانی عالم کے اُصول پر ہے جس میں معانی کی بے شمار گہرائیاں مخفی ہیں اور ان گہرائیوں میں ربط و اتحاد کی لاتعداد زنجیریں ایک جال کے طور پر پھیلی ہوئی ہیں جن سے ہر شخص اور ہر زمانہ اپنی کوشش اور اپنی استعداد اور اپنی ضرورت اور اپنے حالات کے مطابق فائدہ اٹھاتا اور اٹھا سکتا ہے۔ ہمارا یہ مختصر نوٹ اس جگہ بے شک ایک دعویٰ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس ہے کہ اس تاریخی تصنیف میں اس

---

[1] شرح السنۃ بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم فصل ثانی وطبرانی کبیر بحوالہ جامع الصغیر سیوطی جلد ۱ صفحہ ۹۱۔ [2] ازالہ اوہام صفحہ ۳۰۵ تا ۳۱۷

وسیع اور علمی مضمون کے لیے اس مختصر اشارے سے زیادہ کی گنجائش نہیں ورنہ اس دعویٰ کے ثبوت میں دلائل کا ایک سُورج چڑھایا جا سکتا ہے۔اب ہم اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بین الاقوام قاضی کی حیثیت میں

اس بین الاقوام معاہدہ نے جو ہجرت کے بعد مدینہ میں ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرح مدینہ کی مختلف اقوام میں ایک پولیٹیکل لیڈر اور انتظامی حاکم کی حیثیت دے دی تھی۔اور آپ اس بین الاقوام جمہوری سلطنت کے گویا صدر قرار پاتے تھے جو مدینہ میں ہجرت کے بعد قائم ہوئی تھی۔اس پوزیشن میں اہم مقدمات بھی آپ ہی کے سامنے پیش ہونے لگ گئے تھے۔اور آپ ہر قوم کے ضابطہ عدالت کے ماتحت ان کا فیصلہ فرماتے تھے۔چنانچہ روایت آتی ہے کہ ۴ سنہ ہجری کے آخر میں آپ کے سامنے ایک یہودی مرد اور یہودی عورت کا ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں اُن کے خلاف زنا کا الزام ثابت کیا گیا تھا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی علماء سے پوچھا کہ اس بارہ میں موسوی شریعت کیا فتویٰ دیتی ہے۔انہوں نے دھوکے اور افتراء کے طریق پر یہ جواب دیا کہ جو شخص زنا کرے اسے ہمارے ہاں مُنہ کالا کرکے اور سواری پر اُلٹا سوار کرکے پھرایا جاتا ہے۔اس وقت عبداللہ بن سلام جو ایک یہودی عالم تھے اور اب مسلمان ہو چکے تھے پاس ہی بیٹھے تھے۔انہوں نے عرض کیا۔یارسول اللہ! یہ لوگ غلط کہتے ہیں۔تورات میں زنا کی سزا سنگسار کرنا لکھی ہے۔چنانچہ تورات منگوائی گئی۔اور گو یہودیوں نے بہت پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔حتّٰی کہ بہانے بہانے سے اس آیت پر ہاتھ رکھ کر اُسے چھپانا بھی چاہا۔مگر عبداللہ بن سلام نے یہ صاف طور پر دکھا دیا کہ از روئے تورات زنا کی سزا رجم ہے اور ان کو شرمندہ ہونا پڑا اور چونکہ یہ معاہدہ تھا کہ ہر قوم کے مقدمات اس کے اپنے قانون کے مطابق فیصلہ کئے جائیں گے اور اسلام میں تو ابھی تک زنا وغیرہ کی حدود کے متعلق احکام بھی نازل نہیں ہوتے تھے اس لئے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہودی شریعت کے مطابق ان دونوں کو سنگسار کر دیا جاوے چنانچہ وہ دونوں مرد و عورت سنگسار کر دیئے گئے۔یہ ۴ سنہ ہجری کے آخر کا واقعہ ہے[1]

حضرت علیؓ کی والدہ کی وفات

اسی سال ۴ سنہ ہجری کے آخر میں حضرت علیؓ کی عمر رسیدہ والدہ نے جن کا نام فاطمہ بنت اسد تھا مدینہ میں انتقال کیا۔یہ بزرگ خاتون گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ماں کی قائم مقام تھیں۔کیونکہ آپ کے دادا عبدالمطلب کی وفات کے بعد انہوں نے ہی آپ کو اپنے گھر میں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا اور ویسے بھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت رکھتی تھیں اس لیے ان کی وفات کا آپ کو بہت صدمہ ہوا اور ان کی نعش کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں۔وفورِ محبت میں آپؐ نے اپنی قمیص اُتار کر انہیں پہنائی اور خود ان کی قبر میں اترے اور سب تکفین و تدفین کا

---

[1] بخاری کتاب المحاربین و تاریخ الخمیس حالات ۴ سنہ ھ

انتظام خود کیا۔ اور جب وہ قبر میں اُتاری گئیں تو آپؐ نے رقت بھری آواز میں فرمایا: "جَزَاكِ اللّٰهُ مِنْ أُمٍّ خَيْرًا لَقَدْ كُنْتِ خَيْرَ أُمٍّ" "خدا تعالیٰ تمہیں میری طرف سے میری ایک بہت اچھی ماں بننے کی بہترین جزا دے تم حقیقتاً ایک نہایت ہی اچھی ماں تھیں۔" کتاب کے حصہ اوّل میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ فاطمہ بنت اسد اور ابوطالب کی نرینہ اولاد چاروں لڑکوں یعنی طالب۔ عقیل۔ جعفر اور حضرت علی پر مشتمل تھی اور ایک لڑکی تھی جس کا نام اُمّ ہانی تھا۔

غزوہ دومۃ الجندل اور اسلامی جنگوں میں ایک نیا اضافہ ربیع الاوّل ۵ ہجری

اب تک جو جنگی کارروائیاں کی گئی تھیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ محض دفاع کے طور پر تھیں۔ اسی دفاع کا حصہ وہ مہمیں تھیں جو بعض قبائل عرب کے ساتھ امن و امان کے معاہدے کرنے کے لیے اختیار کی گئیں۔ نیز اس وقت تک جو سفر اختیار کئے گئے تھے وہ سب مرکزی حجاز اور نجد کے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اب یہ میدان وسیع ہونے لگا چنانچہ دومۃ الجندل جس کے غزوہ کا ہم اس وقت ذکر کرنے لگے ہیں۔ وہ شام کی سرحد کے قریب واقع تھا اور مدینہ سے اس کا فاصلہ پندرہ سولہ دن کی مسافت سے کم نہ تھا۔[1]

اس غزوہ کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ دومۃ الجندل میں بہت سے لوگ جمع ہو کر لوٹ مار کر رہے ہیں اور جو مسافر یا قافلہ وغیرہ وہاں سے گذرتا ہے اس پر حملہ کر کے اُسے تنگ کرتے اور اس کا مال و متاع لوٹ لیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں یہ لوگ مدینہ کا رُخ کر کے مسلمانوں کے لیے موجب پریشانی نہ ہوں۔[2] چونکہ آنحضرت ﷺ کی جنگی کارروائیوں کی ایک اہم غرض قیامِ امن بھی تھی اس لئے باوجود اس کے کہ ان لوگوں کی اس لوٹ مار سے مدینہ کے مسلمانوں کو حقیقتاً کوئی زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ آپ نے صحابہ میں تحریک فرمائی کہ اس ڈاکہ زنی اور ظلم کے سلسلہ کو روکنے کے لیے وہاں چلنا چاہیئے چنانچہ آپؐ کی تحریک پر ایک ہزار صحابی اس دور و دراز کے تکلیف دہ سفر کو اختیار کر کے آپ کے ساتھ ہو لئے[3] اور آپ ہجرت کے پانچویں سال ماہ ربیع الاوّل میں مدینہ سے روانہ ہوئے[4] اور پندرہ سولہ دن کی طویل اور پُر از مشقت مسافت طے کرنے کے بعد دومۃ الجندل کے قریب پہنچے۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہ لوگ مسلمانوں کی خبر پا کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے اور گو آنحضرت ﷺ وہاں چند دن تک ٹھہرے اور آپ نے چھوٹے چھوٹے دستے بھی اِدھر اُدھر روانہ فرمائے تاکہ ان مفسدین کا پتہ چلے مگر وہ کچھ ایسے لاپتہ ہوئے کہ ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ البتہ اُن کا ایک چرواہا مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہو کر آنحضرت ﷺ کی تبلیغ سے مسلمان ہو گیا۔ اور آپؐ چند دن کے قیام کے بعد مدینہ کی

---

[1] تاریخ الخمیس جلد ۱ صفحہ ۵۲۶۔ [2] ابن سعد و معجم البلدان۔ [3] ابن سعد۔ [4] ابن سعد۔

[5] ابن ہشام

طرف واپس تشریف لے آئے[1]

جیساکہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے یہ غزوہ اس رنگ میں پہلا غزوہ تھا کہ اس کی غرض یا کم از کم بڑی غرض ملک میں امن کا قیام تھی۔ اہل دومہ کا مسلمانوں کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا وہ مدینہ سے اتنی دُور تھے کہ اُن کی طرف سے بظاہر یہ اندیشہ کسی حقیقی خطرہ کا موجب نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اتنے لمبے سفر کی صعوبت برداشت کرکے مدینہ میں مسلمانوں کی پریشانی کا موجب ہونگے۔ پس ان کے مقابلہ کیلئے پندرہ سولہ دن کا تکلیف دہ سفر اختیار کرنا حقیقتہً سوائے اس کے اور کسی غرض سے نہیں تھا کہ انہوں نے جو اپنے علاقہ میں لوٹ مار کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور بے گناہ قافلوں اور مسافروں کو تنگ کرتے تھے اسکا سدِّباب کیا جاوے۔ پس مسلمانوں کا یہ سفر محض رفاہ عام اور ملک کی مجموعی بہبودی کے لیے تھا جس میں ان کی اپنی کوئی غرض مدِّنظر نہیں تھی۔ اور یہ ایک عملی جواب ہے، ان لوگوں کا جنہوں نے سراسر ظلم اور بے انصافی کے ساتھ مسلمانوں کی ابتدائی جنگی کارروائیوں کو جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ماتحت اختیار کیں جارحانہ یا خود غرضانہ قرار دیا ہے۔

اس غزوہ کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ اہل دومہ مرعوب ہوکر اپنی ان مفسدانہ کارروائیوں سے باز آگئے اور مظلوم مسافروں کو اس ظلم سے نجات مل گئی اور دوسرے شام کی سرحد میں جہاں ابھی تک مسلمانوں کا صرف نام ہی پہنچا تھا اور لوگ اسلام کی حقیقت سے بالکل ناآشنا تھے اسلام کا ایک گونہ انٹروڈکشن ہوگیا اور اس علاقہ کے لوگ مسلمانوں کے طریق و تمدن سے ایک حد تک واقف ہوگئے۔

دومۃ الجندل کے قرب وجوار میں بعض عیسائی بھی آباد تھے[2] مگر روایات میں یہ مذکور نہیں ہے کہ آیا یہ مفسدین جن کے خلاف یہ مہم اختیار کی گئی۔ عیسائی تھے یا کہ بُت پرست مشرک۔ مگر حالات سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً یہ لوگ مشرک ہونگے۔ کیونکہ اگر یہ مہم عیسائیوں کے خلاف ہوتی تو مؤرخین ضرور اس کا ذکر کرتے۔ واللہ اعلم

ابھی آپ واپس نہیں پہنچے تھے کہ آپ کے پیچھے مدینہ میں سعد بن عبادۃ رئیس قبیلہ خزرج کی ماں کا انتقال ہوگیا[3] جب آپ واپس آئے تو آپ نے اُن کی قبر پر جاکر دُعا فرمائی اور جب سعد نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری ماں اچانک بیہوشی کی حالت میں فوت ہوگئی ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر انہیں بولنے کا موقع ملتا تو وہ ضرور کچھ صدقہ وخیرات کرتیں۔ کیا اس صورت میں اب ان کی طرف سے مَیں صدقہ کرسکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ "ہاں! بیشک ان کی طرف سے صدقہ کردو۔[4]" اور سعد کے دریافت کرنے پر کہ کونسا صدقہ بہتر ہوگا آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کے آرام کے لیے کوئی کنواں لگوا دو۔ چنانچہ سعد نے ایک کنواں لگوا کر اسے رفاہ عام

---

[1] ابن سعد۔ [2] معجم البلدان۔ [3] ابن سعد۔ [4] تاریخ خمیس

کے لیے وقف کر دیا[1]۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ سعد کی والدہ بیہوشی کی حالت میں تو فوت نہیں ہوئی تھیں مگر چونکہ سعد خود مدینہ سے غیر حاضر تھے اور تمام جائیداد سعد کی تھی اس لیے سعد کی والدہ باوجود خواہش کے صدقہ نہیں کر سکی تھیں۔ اس کے بعد جب سعد واپس آئے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے اپنی ماں کی طرف سے ایک باغیچہ خدا کی راہ میں صدقہ کر دیا[2]

مدینہ میں خسوفِ قمر اور صلوٰۃ خسوف

اسی سال ماہ جمادی الآخر میں مدینہ میں چاند کو گرہن لگا[3] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ نماز کے لیے جمع ہو جائیں۔ چنانچہ آپؐ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ اُس وقت تک نماز میں مصروف رہے کہ چاند کھل گیا اور اس وقت سے اسلام میں چاند گرہن کی نماز باقاعدہ مشروع ہو گئی۔ جب ایک طرف مسلمان نماز میں مصروف تھے تو دوسری طرف یہود یہ سمجھ کر اپنے برتن وغیرہ بجا رہے تھے کہ چاند کو کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح شور کرنے سے جاتا رہے گا[4]

اس موقعہ پر یہ ذکر نامناسب نہ ہو گا کہ اسلام کی یہ ایک بڑی خصوصیت ہے کہ اس نے نہ صرف بےجا توہمات کو مٹایا ہے بلکہ ہر ایسے موقعہ پر جہاں بیجا تو ہمات کا دروازہ کھل سکتا تھا ایسی عبادات مقرر کر دی ہیں جو فوراً انسان کو خدا کی طرف متوجہ کر کے مشرکانہ خیالات کا سدباب کر دیتی ہیں۔ چنانچہ خسوف وغیرہ کے موقعہ پر عبادت مقرر کرنے میں بڑی حکمت یہی ہے کہ تا مسلمانوں کو اس بات کی طرف توجہ پیدا ہو کہ دنیا کی زندگی میں جو نُور اور روشنی بھی انسان کو پہنچتی ہے اس کا ظاہری آلہ خواہ کوئی چیز ہو مگر دراصل اس کا منبع ذات باری تعالیٰ ہی ہے اور اس لیے اگر کسی وجہ سے اس روشنی میں کوئی روک پیدا ہو جاوے تو خواہ یہ روک عام طبعی قوانین کے ماتحت ہی ہو اسے اس موقعہ پر خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ دراصل اسلام نے انسان کی زندگی کے ہر حرکت و سکون اور اس کے ماحول کے ہر تغیر کے ساتھ ذکر الٰہی کو وابستہ کر دیا ہے تاکہ کوئی گھڑی اس پر غفلت کی نہ آئے۔ مگر یہ ایک الگ مذہبی بحث ہے جس میں پڑنا ایک مؤرخ کا کام نہیں۔

مکہ کا قحط اور قریش کیساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمدردی

غزوہ بدر الموعد کے بیان میں مکہ کے قحط کا بھی ذکر گذر چکا ہے یہ قحط ابھی تک جاری تھا۔ قریش مکہ اس قحط سے بہت تکلیف میں مبتلا ہو گئے اور غرباء کو تو سخت مصیبت کا سامنا ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی اس تکلیف کی اطلاع ہوئی تو آپ نے از راہِ ہمدردی مکہ کے غرباء کے لیے اپنی طرف سے کچھ چاندی بھجوائی[5]۔ اور اس طرح آپ نے اس بات کا ایک عملی ثبوت دیا کہ آپ کا دل آپ کے سخت ترین

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔ [2] موطا باب صدقۃ الحی عن المیت۔ [3] تاریخ الخمیس جلد ۱ صفحہ ۵۲۸ بروایت ابن حبان۔ [4][5] تاریخ الخمیس جلد ۱ صفحہ ۵۲۸

دشمنوں کے ساتھ بھی ایک گہری اور حقیقی ہمدردی رکھتا ہے۔ اور یہ کہ آپؐ کی مخالفت صرف عقائد و خیالات کے ساتھ تھی نہ کہ کسی انسان کے ساتھ۔

بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور موقعہ پر بھی مکّہ والے قحط میں مبتلا ہوتے تھے تو انکی طرف سے ابوسفیان بن حرب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تھا اور رشتہ داری اور قرابت کا واسطہ دیکر تحریک کی تھی کہ اُن کے لیے اس قحط کے دُور ہونے کی دُعا کی جاوے[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مکّہ کے جذبات آنحضرت ﷺ کے متعلق مخلوط قسم کے تھے۔ یعنی وہ آپ کی ذاتی نیکی اور تقویٰ وطہارت کے بھی قائل تھے۔ مگر آپ کی تعلیم کو اپنے قدیم طریق عمل اور مشرکانہ خیالات کے خلاف پاتے ہوتے اُسے مٹانے کے بھی درپے تھے۔ خیالات میں اس قسم کا خلط علم النفس کے اُصول کے ماتحت ناممکن نہیں ہے۔

زینب بنت جحش کی شادی ۵ ہجری

اسی سال یعنی ہجرت کے پانچویں سال میں غزوہ بنی مصطلق سے کچھ عرصہ پہلے جو شعبان ۵ ہجری میں واقع ہوا آنحضرت ﷺ نے زینب بنت جحش سے شادی فرمائی۔ بعض مؤرخین مثلاً ابن اثیر اور صاحب خمیس وغیرہ نے زینب بنت جحش کی شادی کو غزوہ بنی مصطلق کے بعد رکھا ہے مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ کیونکہ یہ بات صحیح بخاری[2] سے ثابت ہے کہ جس وقت حضرت عائشہؓ پر اتہام لگایا گیا تھا اس وقت زینب بنت جحش کی شادی ہو چکی تھی اور حضرت عائشہؓ کے خلاف الزام لگائے جانے کا واقعہ مسلّمہ طور پر غزوہ بنی مصطلق کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ حضرت زینب آنحضرت ﷺ کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی صاحبزادی تھیں اور باوجود نہایت درجہ نیک اور متقی ہونے کے ان کی طبیعت میں اپنے خاندان کی بڑائی کا احساس بھی کسی قدر پایا جاتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کی طبیعت اس قسم کے خیالات سے بالکل پاک تھی اور گو آپ خاندانی حالات کو تمدنی رنگ میں قابلِ لحاظ سمجھتے تھے مگر آپ کے نزدیک بزرگی کا حقیقی معیار ذاتی خوبی اور ذاتی تقویٰ وطہارت پر مبنی تھا۔ جیسا کہ قرآن شریف فرماتا ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[3] یعنی "اے لوگو! تم میں سے جو شخص زیادہ متقی ہے وہی زیادہ بڑا صاحب عزت ہے۔" پس آپ نے بلا کسی تامل کے اپنی اس عزیزہ یعنی زینب بنت جحش کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام اور متبنّٰی زید بن حارثہ کے ساتھ تجویز فرما دی۔ پہلے تو زینب نے اپنی خاندانی بڑائی کا خیال کرتے ہوتے اسے ناپسند کیا۔ لیکن آخرکار آنحضرت ﷺ کی پُرزور خواہش کو دیکھ کر رضامند ہو گئیں[4]۔ بہرحال آنحضرت ﷺ کی خواہش اور تجویز کے مطابق زینب اور زید کی شادی ہو گئی۔ اور گو زینب نے ہر طرح شرافت سے نبھاؤ کیا۔ مگر زید نے اپنے طور پر یہ محسوس کیا کہ زینب کے دل میں ابھی تک یہ خلش مخفی ہے کہ میں ایک معزز خاندان کی لڑکی اور آنحضرت ﷺ کی قریبی

---

[1] بخاری ابواب الاستسقاء۔ [2] کتاب المغازی حدیث افک۔ [3] سورۃ حجرات ۱۴:۲

[4] ابن جریر وطبرانی بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۴۵ نیز ابن سعد جلد ۸ حالات زینب بنت جحش

رشتہ دار ہوں اور زید ایک محض آزاد شدہ غلام ہے اور میرا کفو نہیں۔ دوسری طرف خود زید کے دل میں بھی زینب کے مقابلہ میں اپنی پوزیشن کے چھوٹا ہونے کا احساس تھا۔ اور اس احساس نے آہستہ آہستہ زیادہ مضبوط ہوکر ان کی خانگی زندگی کو بے لطف کر دیا اور میاں بیوی میں ناچاقی رہنے لگی۔ جب یہ ناگوار حالت زیادہ ترقی کرگئی تو زید بن حارثہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور بزعم خود زینب کے سلوک کی شکایت کرکے انہیں طلاق دے دینے کی اجازت چاہی[۱] اور ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ انہوں نے یہ شکایت کی کہ زینب سخت زبانی سے کام لیتی ہے اس لیے میں اسے طلاق دینا چاہتا ہوں[۲] آنحضرت ﷺ کو طبعاً یہ حالات معلوم کرکے صدمہ ہوا مگر آپ نے زید کو طلاق دینے سے منع فرمایا۔ اور غالباً یہ بات محسوس کرکے کہ زید کی طرف سے نبھاؤ کی کوشش میں کمی ہے آپ نے انہیں نصیحت فرمائی کہ اللہ کا تقوٰی اختیار کرکے جس طرح بھی ہو نبھاؤ کی کوشش کرو[۳]۔ چنانچہ قرآن شریف میں بھی آپ کے یہ الفاظ مذکور ہوتے ہیں کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ[۴] یعنی اے زید! "اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ اور خدا کا تقوٰی اختیار کرو۔"

آپ کی اس نصیحت کی وجہ یہ تھی کہ اول تو اصولاً آنحضرت ﷺ طلاق کو ناپسند فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا۔ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ[۵] یعنی "ساری حلال چیزوں میں سے طلاق خدا کو زیادہ ناپسند ہے۔" اور اسی لیے اسلام میں صرف انتہائی علاج کے طور پر اس کی اجازت دی گئی ہے۔ دوسرے جیسا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام زین العابدین علی بن حسینؓ کی روایت ہے اور امام زہری نے اس روایت کو مضبوط قرار دیا ہے[۶] چونکہ آنحضرت ﷺ کو پہلے سے یہ وحی الٰہی ہو چکی تھی کہ زید بن حارثہ بالآخر زینب کو طلاق دے دینگے اور اس کے بعد زینب آپ کے نکاح میں آئینگی اس لیے آپ اس معاملہ میں اپنا ذاتی تعلق سمجھتے ہوتے بالکل غیر متعلق اور غیر جانب دارانہ رویہ رکھنا چاہتے تھے اور اپنی طرف سے اس بات کی پوری پوری کوشش کرنا چاہتے تھے کہ زید اور زینب کے تعلق کے قطع ہونے میں آپ کا کوئی دخل نہ ہو۔ اور جب تک نبھاؤ کی صورت ممکن ہو نبھاؤ ہوتا رہے اور اسی خیال کے ماتحت آپ نے بڑے اصرار کے ساتھ زید کو یہ نصیحت فرمائی کہ تم طلاق نہ دو اور خدا کا تقوٰی اختیار کرکے جس طرح بھی ہوسکے نبھاؤ کرو۔ آپ کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر زید کی طلاق کے بعد زینب آپ کے عقد میں آئیں تو لوگوں میں اس کی وجہ سے اعتراض ہوگا کہ آپ نے اپنے متبنّٰی کی مطلقہ سے شادی کرلی ہے اور

---

[۱] بخاری کتاب التوحید باب كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ۔ [۲] فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۴۰۳

[۳] بخاری کتاب التوحید و فتح الباری جلد ۸ و حاکم بروایت لباب النقول باب تفسیر سورۃ احزاب [۴] سورۃ احزاب: ۳۸

[۵] ابوداؤد کتاب الطلاق۔ [۶] زرقانی جلد ۳ حالات زینب بنت جحش و فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۴۰۳

خواہ نخواہ ابتلاء کی صورت پیدا ہوگی۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ[1]

یعنی "اے نبی! تو اپنے دل میں چھپاتے ہوتے تھا وہ بات جسے خدا نے آخر ظاہر کرنا تھا۔ اور تو لوگوں کی وجہ سے ڈرتا تھا۔ اور یقیناً خدا اس بات کا بہت زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جاوے۔"

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو تقوی اللہ کی نصیحت کرکے طلاق دینے سے منع فرمایا اور آپ کی اس نصیحت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوتے زید خاموش ہوکر واپس آگئے مگر اکھڑی ہوئی طبیعتوں کا ملنا مشکل تھا اور جو بات نہ بنی تھی نہ بنی اور کچھ عرصہ کے بعد زید نے طلاق دیدی۔ جب زینب کی عدت ختم ہوچکی تو اُن کی شادی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پھر وحی نازل ہوئی کہ آپ کو انہیں خود اپنے عقد میں لے لینا چاہیئے! ور اس خدائی حکم میں علاوہ اس حکمت کے کہ اس سے زینب کی دلداری ہوجاتے گی اور مطلقہ عورت کے ساتھ شادی کرنا مسلمانوں میں عیب نہ سمجھا جائیگا یہ حکمت مدِّ نظر تھی کہ چونکہ زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متبنّٰی تھا اور آپ کا بیٹا کہلاتا تھا۔ اس لیے جب آپ خود اس کی مطلقہ سے شادی فرمائیں گے تو اس بات کا مسلمانوں میں ایک عملی اثر ہوگا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہوتا اور نہ اس پر حقیقی بیٹوں والے احکام جاری ہوتے ہیں۔ اور آئندہ کے لیے عرب کی جاہلانہ رسم مسلمانوں میں پورے طور پر مِٹ جاتے گی۔ چنانچہ اس بارہ میں قرآن شریف جو تاریخ اسلامی کا سب سے زیادہ صحیح ریکارڈ ہے یُوں فرماتا ہے:۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝[2]

یعنی "جب زید نے زینب سے قطع تعلق کرلیا تو ہم نے زینب کی شادی تیرے ساتھ کردی۔ تاکہ مومنوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی روک نہ رہے۔ بعد اس کے کہ وہ منہ بولے بیٹے اپنی بیویوں سے قطع تعلق کرلیں اور خدا کا یہ حکم اسی طرح پورا ہونا تھا۔"

الغرض اس خدائی وحی کے نازل ہونے کے بعد جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی خواہش اور خیال کا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ آپ نے زینب کے ساتھ شادی کا فیصلہ فرمایا اور پھر زید کے ہاتھ ہی زینب کو شادی کا پیغام بھیجا۔[3] اور زینب کی طرف سے رضامندی کا اظہار ہونے پر ان کے بھائی ابواحمد بن جحش نے ان کی طرف سے ولی ہو کر چار سو درہم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نکاح کردیا[4] اور اس طرح وہ قدیم رسم جو عرب کی سرزمین میں راسخ

---

[1] سورۃ احزاب: ۳۸ - [2] مسلم کتاب النکاح باب ازواج زینب بنت جحش - [3] سورۃ احزاب: ۳۸

[4] مسلم کتاب النکاح باب زواج زینب بنت جحش - [5] سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ حالات ازواج

ہو چکی تھی آنحضرت ﷺ کے ذاتی نمونہ کے نتیجہ میں اسلام میں بیخ وبُن سے اکھیڑ کر پھینک دی گئی۔

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ عام مورخین ومحدثین کا یہ خیال ہے کہ چونکہ زینب کی شادی کے متعلق خدائی وحی نازل ہوئی تھی اور خدا کے خاص حکم سے شادی وقوع میں آئی اس لیے ظاہری طور پر ان کے نکاح کی رسم ادا نہیں کی گئی۔ مگر یہ خیال درست نہیں ہے۔ بے شک خدا کے حکم سے یہ شادی ہوئی اور کہا جا سکتا ہے کہ آسمان پر نکاح پڑھا گیا۔ مگر اس وجہ سے شریعت کی ظاہری رسم سے جو وہ بھی خدا ہی کی مقرر کردہ ہے آزادی حاصل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ابن ہشام کی روایت جس کا حوالہ اوپر درج کیا گیا ہے اور جس میں ظاہری رسم نکاح کا واقع ہونا بتایا گیا ہے اس معاملہ میں واضح ہے اور کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہنے دیتی۔ اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ دوسری اُمہات المومنین کے مقابلہ میں زینب یہ فخر کیا کرتی تھیں کہ "تمہارے نکاح تمہارے ولیوں نے زمین پر پڑھاتے ہیں اور میرا نکاح آسمان پر ہوا ہے" اس سے بھی یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ زینب کے نکاح کی ظاہری رسم ادا نہیں ہوئی۔ کیونکہ باوجود ظاہری رسم کی ادائیگی کے ان کا یہ فخر قائم رہتا ہے کہ اُن کا نکاح خدا کے خاص حکم سے آسمان پر ہوا مگر اس کے مقابل پر دوسری اُمہات المومنین کی شادیاں عام اسباب کے ماتحت محض ظاہری رسم کی ادائیگی کے ساتھ وقوع میں آئیں۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ بغیر اذن کے زینب کے پاس تشریف لے گئے تھے اور اس سے بھی یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ان کے نکاح کی ظاہری رسم ادا نہیں ہوئی۔ مگر غور کیا جاوے تو اس بات کو بھی ظاہری رسم کے ادا ہونے یا نہ ہونے کے سوال سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ آنحضرت ﷺ زینب کے گھر بغیر اجازت چلے گئے تھے تو یہ غلط اور خلاف واقعہ ہے کیونکہ بخاری کی صریح روایت میں یہ ذکر ہے کہ شادی کے بعد زینب آنحضرت ﷺ کے گھر میں رُخصت ہو کر آئی تھیں نہ آپ ان کے گھر گئے تھے[1] اور اگر اس روایت سے یہ مراد ہے کہ جب وہ رُخصت ہو کر آپ کے گھر آگئیں تو اس کے بعد آپ ان کے پاس بغیر اذن کے تشریف لے گئے تو یہ کوئی غیر معمولی اور خلافِ دستور بات نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ آپ کی بیوی بن کر آپ کے گھر آگئی تھیں تو پھر آپ نے بہرحال ان کے پاس جانا ہی تھا اور آپ کو اذن کی ضرورت نہیں تھی۔ پس اذن نہ لینے والی روایت کا قطعاً کوئی تعلق اس سوال سے نہیں ہے کہ آپ کے اس نکاح کی ظاہری رسم ادا کی گئی یا نہیں اور حق یہی ہے کہ جیسا کہ ابن ہشام[2] کی روایت میں تصریح کی گئی ہے باوجود خدائی حکم کے اس نکاح کی باقاعدہ رسم ادا کی گئی تھی اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہوا ہو کیونکہ اوّل تو عام قاعدہ میں استثناء کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اور دوسرے جبکہ اس نکاح میں ایک رسم کا توڑنا اور اس کے اثر کو زائل کرنا مقصود تھا تو اس بات کی بدرجہ اولیٰ ضرورت تھی کہ یہ نکاح بڑے اعلان کے ساتھ علی رؤس الاشہاد وقوع میں آتا۔

---

[1] بخاری کتاب التفسیر باب سورۃ احزاب۔ [2] جلد ۳ حالات ازواج النبیؐ

پردے کے احکام کا نزول

نکاح کے دوسرے یا تیسرے دن آنحضرت ﷺ نے اپنے مکان میں صحابہ کی دعوت ولیمہ فرمائی۔ اور چونکہ اس نکاح میں خاص طور پر اعلان مقصود تھا اس لیے آپ نے اپنی ساری بیویوں میں حضرت زینب کا ولیمہ زیادہ بڑے پیمانہ پر کیا[1]۔ اس وقت تک چونکہ پردے کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے صحابہ بے تکلف آپ کے گھر کے اندر ہی آ گئے اور ان میں بعض لوگ کھانے سے فارغ ہو کر بھی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو کر وہیں بیٹھے رہے جس سے آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہوئی۔ مگر چونکہ آپ کی طبیعت میں حیا کا مادہ بہت تھا آپ شرم کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے اور ان صحابہ کو باتوں کی مصروفیت میں خود خیال نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت دیر ہو گئی اور آنحضرت ﷺ کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو گیا۔ آخر آپ خود اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کو اُٹھتے دیکھ کر اکثر صحابہ بھی ساتھ ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور آپ سے رُخصت ہو کر مکان سے نکل گئے لیکن تین شخص پھر بھی بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ کے حجرے کی طرف تشریف لے گئے لیکن جب تھوڑی دیر کے بعد آپ واپس تشریف لاتے تو ابھی تک یہ لوگ وہیں بیٹھے تھے اسی طرح آپ کو دو تین دفعہ آنا جانا پڑا۔ اور آخر کار جب یہ لوگ آپ کے مکان سے چلے گئے تو آپ واپس تشریف لے آئے۔ بعض اوقات الٰہی احکام کے نزول کے لیے بھی محرکات پیدا ہو جاتے ہیں یعنی حکم نے تو بہر حال نازل ہونا ہوتا ہے مگر کوئی واقعہ اس کا وقتی محرک بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہی واقعہ پردے کے ابتدائی احکامات کے نزول کا تحریکی سبب بن گیا اور پردے کے متعلق وہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات پر پردے کی پابندی عائد کی گئی اور آنحضرت ﷺ کے گھروں میں غیر محرم لوگوں کی آزادانہ آمد و رفت رُک گئی[2]۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ پردے کے متعلق مزید احکامات نازل ہوتے رہے حتّٰی کہ بالآخر اس نے وہ صورت اختیار کر لی جو اس وقت قرآن شریف و حدیث میں موجود ہے[3]۔ اور جس کی رُو سے مسلمان عورت کی جائز اور ضروری آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے عورت کو غیر محرم مردوں کے سامنے اپنے بدن اور لباس کی زینت کے برملا اظہار سے منع فرمایا گیا ہے۔ نیز غیر محرم مرد و عورت کا ایک دوسرے کے ساتھ خلوت میں اکیلے ملاقات کرنا ناجائز قرار دے دیا گیا ہے اور اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جاتے تو یہ وہ قیود ہیں جو ایک طرف تو عورت کی صحت اور اس کی علمی ترقی اور قومی اور ملکی کاموں میں اس کے حصہ لینے اور دوسرے معاملات میں اس کی جائز آزادی میں کوئی روک نہیں بنتیں اور دوسری طرف غیر محرم مرد و عورت کے بالکل آزادانہ اور بے حجابانہ میل جول سے جو خلاف اخلاق اور مضرت رساں نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اور جو بے پردہ ملکوں میں عموماً پیدا ہوتے رہتے ہیں اُن کا ان قیود سے سدِ باب ہو جاتا ہے۔

---

[1] بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ حق۔ [2] بخاری کتاب التفسیر باب سورۃ احزاب۔ [3] قرآن شریف سورۃ نور ۲۲:۴ سورۃ احزاب: ۳۴ و ۶۰ بخاری تفسیر سورۃ نور و تفسیر سورۃ احزاب و تفسیر سورۃ ممتحنہ و کتاب النکاح

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو صورت پردے کی مسلمانوں میں رائج ہے وہ بالعموم صحیح اسلامی احکام کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کہیں ناواجب سختی سے کام لے کر بیچاری عورت کو اسکے گھر کی چار دیواری میں قریباً قریباً ایک قیدی کی طرح بند رکھا جاتا ہے جس سے اس کی صحت اور تعلیم و تربیت اور اس کا تمدن وغیرہ تباہ ہو رہے ہیں تو کہیں مغرب کی کورانہ تقلید میں اُسے ناواجب آزادی دے دی گئی ہے جس سے سوسائٹی کے اخلاق و عادات پر ضرررساں اثر پڑ رہا ہے۔ اور یہ ہر دو رستے افراط و تفریط کے رستے ہیں۔ جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی تعلیم کی رُو سے عورت اپنی زینت کے برملا اظہار سے رُکتے ہوئے تمام قسم کی جائز تفریحات اور جائز کاموں میں حصہ لے سکتی ہے مگر اُسے بالکل کُھلے منہ پھرنے اور غیر محرم مردوں کے ساتھ خلوت میں اکیلے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ طریق اپنے اندر فتنے کے احتمالات رکھتا ہے جس کا سدباب ضروری ہے۔ یورپ کے بعض ممالک میں بھی جہاں پردے کی حدود کو بالکل توڑ دیا گیا ہے اعلیٰ طبقہ کے شرفاء کے گھروں میں اس قدر احتیاط ضرور برتی جاتی ہے کہ عام طور پر جوان لڑکیاں بغیر کسی محرم مرد یا مُعمّر رفیق عورت کے بالکل آزادانہ طور پر اِدھر اُدھر نہیں آتی جاتیں۔ اور نہ غیر محرم مردوں کے ساتھ خلوت میں آزادانہ ملاقات کرتی ہیں۔ اور جو لڑکیاں اس معاملہ میں زیادہ آزادی دکھاتی ہیں انہیں عموماً شریف سوسائٹی میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی بالکل غیر مقید اور بے حجابانہ آزادی کو یورپ جیسی بے حجاب سرزمین میں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا اور یہی وہ اُصول ہے جسے اسلام نے زیادہ جامعیت اور زیادہ خوبی کے ساتھ اختیار کر کے اور اس کے ساتھ زینت کے چُھپانے کے اُصول کو شامل کر کے پردے کے احکام جاری کئے ہیں اور اس معاملہ میں افراط و تفریط کے رستوں سے بچ کر ایک میانہ روی کا طریق قائم کر دیا ہے۔

دراصل اگر غور کیا جاوے تو پردہ پر سارا اعتراض اس عملی طریق کی وجہ سے ہے جو آجکل اسلامی ممالک اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں میں رائج ہے اور جو زیادہ تر اسلامی سلطنتوں کی کمزوری کے زمانہ میں سیاسی حالات کے ماتحت مجبوراً مسلمانوں کو اختیار کرنا پڑا تھا۔ مگر بعد میں ایک رسم کے طور پر ایک مستقل اور زیادہ سخت صورت اختیار کر گیا۔ ورنہ اس معاملہ میں اصل اسلامی حکم جو قرآن و حدیث سے پتہ لگتا ہے اور ابتدائی مسلمانوں کا اصل تعامل جو تاریخ و حدیث سے ثابت ہوتا ہے وہ ہرگز ایسا نہیں کہ اس پر کوئی معقول اعتراض ہو سکے بلکہ ہر شخص جو ٹھنڈے طور پر غور کرنے کا عادی ہے اس کی خوبی کا قائل ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسلامی پردہ کا لبِ لباب صرف یہ ہے کہ: اوّل غیر محرم مرد و عورت ایک دوسرے کے سامنے اپنی نظروں کو نیچا رکھیں اور عورت اپنے چہرہ اور بدن اور لباس کی زینت کو کسی غیر محرم مرد پر نظر یا لمس وغیرہ کے ذریعہ ظاہر نہ کرے[1] دوم یہ کہ غیر محرم مرد و عورت کسی ایسی جگہ میں جو دوسروں کی نظر سے اوجھل ہو خلوت میں اکیلے ملاقات نہ کریں[2] ان دو حد بندیوں کو ملحوظ رکھتے

---

[1] قرآن شریف سورۃ نور : ۳۲ و بخاری تفسیر سورۃ ممتحنہ

[2] بخاری کتاب النکاح باب لَا یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ وَبَابُ مَا یَجُوْزُ اَنْ یَخْلُوَ

ہوئے جن میں سراسر سوسائٹی کی بہبودی اور اخلاق کی حفاظت مدنظر ہے۔ ایک مسلمان عورت پردہ کے معاملہ میں ہر طرح آزاد ہے۔ وہ درسگاہوں میں تعلیم حاصل کر سکتی ہے اور تعلیم دے سکتی ہے۔ وہ ورزش اور سیر و تفریح کے لیے گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ وہ خرید و فروخت کر سکتی ہے وہ پبلک جلسوں وغیرہ میں شریک ہو سکتی ہے۔ وہ غیر محرم مردوں سے ملاقات کر سکتی ہے اور ان کی بات سُن سکتی ہے اور ان کو اپنی بات سُنا سکتی ہے۔ وہ محنت و مزدوری کر سکتی ہے۔ وہ دفاتر اور محکموں اور شفاخانوں اور کارخانوں میں کام کر سکتی ہے۔ وہ قومی اور ملکی کاموں میں حصہ لے سکتی ہے۔ وہ جنگوں میں مناسب خدمت سرانجام دینے کیلئے شریک ہو سکتی ہے۔ غرض اسلامی پردہ عورت کی تعلیم و تربیت۔ اس کی نشو و نما۔ اس کے ضروری مشاغل۔ اس کی جائز تفریحات میں ہرگز کوئی روک نہیں ہے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانہ میں مسلمان عورتیں تمام ان جائز کاموں میں حصہ لیتی تھیں جو اس زمانہ میں پیش آتے تھے۔ وہ تعلیم حاصل کرتی اور تعلیم دیتی تھیں۔ وہ نمازوں میں مسلمان مردوں کے ساتھ شامل ہوتی تھیں۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریریں اور خطبات سُنتی تھیں۔ وہ قومی کاموں میں مشورہ دیتی تھیں وہ حج میں مردوں کے پہلو بہ پہلو مراسم حج ادا کرتی تھیں۔ وہ سفروں میں مردوں کے ساتھ جاتی تھیں۔ وہ غیر محرم مردوں کے ساتھ ضرورت پیش آنے پر ملاقات کرتی اور ان کی بات سنتیں اور اپنی بات سُناتی تھیں۔ وہ سواری کرتی تھیں۔ وہ تفریحی تماشے دیکھتی تھیں۔ وہ جنگوں میں شریک ہوتی اور زخمیوں کی تیمارداری اور نرسنگ کی خدمت سرانجام دیتی تھیں اور ضرورت پڑتی تو میدانِ جنگ میں تلوار بھی چلا لیتی تھیں[1]۔ پس پردہ پر جتنے بھی اعتراض ہوتے ہیں وہ درحقیقت اصل اسلامی پردہ پر نہیں ہیں۔ بلکہ موجودہ زمانہ کے بگڑے ہوئے پردہ پر ہیں جس نے عورت کو گھر کی چار دیواری میں قریباً ایک حیوان کی طرح قید کر رکھا ہے۔ مگر اس نقص کے دُور کرنے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ایک انتہا سے ہٹ کر دوسری انتہا کو اختیار کر لیا جاوے کیونکہ یہ دونوں ضلالت و ہلاکت کی راہیں ہیں اور سلامت روی کا وہی رستہ ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔ اور جو انسانی فطرت کی سچی آواز ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ عورت کے کام کی اصل جگہ گھر ہے جہاں اس کے ہاتھوں میں قوم کے نونہال پلتے ہیں جن پر آئندہ چل کر قومی اور ملکی کاموں کا بوجھ پڑنا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا نازک اور وسیع اور عظیم الشان کام ہے کہ اگر عورت صرف اسی کام کو خیر و خوبی کے ساتھ سرانجام دے اور اس کے لیے اپنے آپ کو اہل بنائے تو اُس کی توجہ کی مصروفیت کے لیے یہی کافی ہے اور اسی سے وہ ملک و قوم کی بہترین محسنہ بن سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے اسلامی پردہ ممد ہے نہ کہ خلاف۔

حضرت زینب کی شادی کے بقیہ حالات

حضرت زینب بنت جحش کی عمر شادی کے وقت

---

[1] ان سب باتوں کے حوالے اس کتاب میں متفرق طور پر گذر چکے ہیں اور بعض اپنے موقعہ پر آگے آئیں گے۔

پینتیس سال کی تھی[1] اور عرب کے حالات کے لحاظ سے یہ عمر ایسی تھی جسے گویا ادھیڑ کہنا چاہیئے۔ حضرت زینب ایک نہایت متقی اور پرہیز گار اور مخیر خاتون تھیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ آنحضرت ﷺ کی تمام بیویوں میں صرف زینب ہی وہ بیوی تھیں جو حضرت عائشہ کے ساتھ مقابلہ کرتی اور اُن کی ہمسری کا دم بھرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ ان کے ذاتی تقویٰ وطہارت کی بہت مداح تھیں[2] اور اکثر کہا کرتی تھیں کہ مَیں نے زینب سے زیادہ نیک عورت نہیں دیکھی۔ وہ بہت متقی بہت راست گو بہت صلہ رحمی کرنے والی بہت صدقہ وخیرات کرنے والی اور نیکی اور تقرب الٰہی کے اعمال میں نہایت سرگرم تھیں۔ بس اتنی بات تھی کہ ان کی طبیعت ذرا تیز تھی مگر تیزی کے بعد وہ جلد ہی خود نادم ہو جایا کرتی تھیں[3]۔" صدقہ وخیرات میں تو ان کا یہ مرتبہ تھا کہ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ہم سے فرمایا۔ اَسْرَعُکُنَّ لِحَاقًا بِیْ اَطْوَلُکُنَّ یَدًا[4]۔ یعنی تم میں سے جو سب سے زیادہ لمبے ہاتھوں والی ہے وہ میری وفات کے بعد سب سے پہلے فوت ہو کر میرے پاس پہنچے گی۔" حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ہم نے اس سے ظاہری ہاتھ سمجھے اور آپس میں اپنے ہاتھ ناپا کرتی تھیں لیکن جب آنحضرت ﷺ کے بعد سب سے پہلے زینب بنت جحش کا انتقال ہوا تو تب جا کر ہم پر یہ راز کھلا کہ ہاتھ سے مراد صدقہ وخیرات کا ہاتھ تھا نہ کہ ظاہری ہاتھ۔

جیسا کہ اندیشہ کیا جاتا تھا حضرت زینب کی شادی پر منافقین مدینہ کی طرف سے بہت اعتراضات ہوئے اور انہوں نے برملا طور پر طعن کئے کہ محمد ﷺ نے اپنے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کر کے گویا اپنی بہو کو اپنے اوپر حلال کر لیا ہے[5] لیکن جبکہ اس شادی کی غرض ہی عرب کی اس جاہلانہ رسم کو مٹانا تھی تو ان مطاعن کا سُننا بھی ناگزیر تھا۔

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ابن سعد اور طبری وغیرہ نے حضرت زینب بنت جحش کی شادی کے متعلق ایک سراسر غلط اور بے بنیاد روایت نقل کی ہے اور چونکہ اس سے آنحضرت ﷺ کی ذات والا صفات کے خلاف اعتراض کا موقعہ ملتا ہے اس لیے بعض مسیحی مؤرخین نے اس روایت کو نہایت ناگوار صورت دے کر اپنی کُتب کی زینت بنایا ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے زینب بنت جحش کی شادی زید کے ساتھ کر دی تو اس کے بعد آپ کسی موقعہ پر زید کی تلاش میں ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس وقت اتفاق سے زید اپنے مکان پر نہیں تھے۔ چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر زید کو آواز دی تو زینب نے اندر سے جواب دیا کہ وہ مکان پر نہیں ہیں اور ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کی آواز پہچان کر وہ لپک کر اُٹھیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ اندر تشریف لے آئیں۔ لیکن آنحضرت

---

[1] اصابہ [2] بخاری حدیث الافک [3] مسلم جلد ۲ باب فضل عائشہ [4] بخاری ومسلم۔ بحوالہ اصابہ حالات زینب بنت جحش [5] ترمذی۔ بحوالہ زرقانی جلد ۳

ﷺ نے انکار فرمایا اور واپس لوٹنے لگے مگر چونکہ حضرت زینب گھبرا کر ایسی حالت میں اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں کہ ان کے بدن پر اوڑھنی نہیں تھی اور مکان کا دروازہ کُھلا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی نظر اُن پر پڑ گئی اور آپ نعوذ باللہ ان کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر یہ الفاظ گنگناتے ہوئے واپس لوٹ گئے کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ سُبْحَانَ اللّٰہِ مُصَرِّفِ الْقُلُوْبِ۔ پاک ہے وہ اللہ جو سب بڑائی والا ہے اور پاک ہے وہ اللہ جس کے ہاتھ میں لوگوں کے دل ہیں جدھر چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے؟ جب زید بن حارثہ واپس آتے۔ تو زینب نے اُن سے آنحضرت ﷺ کے تشریف لانے کا قصہ بیان کیا۔ اور زید کے دریافت کرنے پر کہ آپ کیا فرماتے تھے انہوں نے آپ کے یہ الفاظ بھی بیان کئے۔ اور کہا میں نے تو عرض کیا تھا کہ آپ اندر تشریف لے آئیں مگر آپ نے انکار فرمایا اور واپس تشریف لے گئے۔ یہ سُن کر زید آنحضرت صلعم کی خدمت میں گئے اور کہا یا رسول اللہ! شاید آپ کو زینب پسند آ گئی ہے اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اُسے طلاق دیتے دیتا ہوں اور پھر آپ اس کیسا تھ شادی فرمالیں۔ آپ نے فرمایا "زید خدا کا تقویٰ کرو اور زینب کو طلاق نہ دو"۔ مگر اس کے بعد زید نے زینب کو طلاق دیدی۔ یہ وہ روایت ہے جو ابن سعد اور طبری وغیرہ نے اس موقعہ پر بیان کی ہے اور گو اس روایت کی ایسی تشریح کی جا سکتی ہے جو چنداں قابلِ اعتراض نہیں رہتی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ قصہ از سرتا پا محض غلط اور جھوٹ ہے اور روایت و درایت ہر دو طرح سے اس کا جھوٹا ہونا ظاہر ہے۔ روایتہً تو اس قدر جاننا کافی ہے کہ اس قصہ کے راویوں میں زیادہ تر واقدی اور عبداللہ بن عامر اسلمی کا واسطہ آتا ہے اور یہ دونوں شخص محققین کے نزدیک بالکل ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہیں[1] حتیٰ کہ واقدی تو اپنی کذب بیانی اور دروغ بافی میں ایسی شہرت رکھتا ہے کہ غالباً مسلمان کہلانے والے راویوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی[2] اور اس کے مقابلہ میں وہ روایت جو ہم نے اختیار کی ہے جس میں زید کا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر زینب کی بدسلوکی کی شکایت کرنا بیان کیا گیا ہے اور اس کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ذکر کیا گیا ہے کہ "تم خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور طلاق نہ دو"۔ وہ بخاریؒ کی روایت ہے جو دوست اور دشمن کے نزدیک قرآن شریف کے بعد اسلامی تاریخ کا صحیح ترین ریکارڈ سمجھی گئی ہے اور جس کے خلاف کبھی کسی حرف گیر کو انگشت نمائی کی جرأت نہیں ہوئی پس اصول روایت کی رُو سے دونوں روایتوں کی قدر و قیمت ظاہر ہے اسی طرح عقلاً بھی غور کیا جاوے تو ابن سعد وغیرہ کی روایت کے غلط ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا۔ کیونکہ جب یہ بات مسلم ہے کہ زینب آنحضرت ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں حتیٰ کہ آپ ہی نے اُن کے ولی بن کر زید بن حارثہ سے اُن کی شادی کی تھی۔ اور دوسری طرف اس بات سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اب تک مسلمان عورتیں

---

[1] تہذیب التہذیب حالات واقدی و عبداللہ بن عامر [2] تہذیب التہذیب حالات واقدی و زرقانی جلد ۱

[3] صحیح بخاری کتاب التوحید

پردہ نہیں کرتی تھیں بلکہ پردہ کے متعلق ابتدائی احکام حضرت زینب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے بعد نازل ہوتے تھے تو اس صورت میں یہ خیال کرنا کہ زینب کو آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا صرف اسوقت اتفاقی نظر پڑ گئی اور آپ ان پر فریفتہ ہو گئے ایک صریح اور بدیہی البطلان جھوٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا یقیناً اس سے پہلے آپ نے ہزاروں دفعہ زینب کو دیکھا ہوگا اور انکے جسم کا حُسن و قبح جو کچھ بھی تھا آپ پر عیاں تھا اور گو اوڑھنی کیساتھ دیکھنا اور اوڑھنی کے بغیر دیکھنا کوئی فرق نہیں رکھتا لیکن جب رشتہ اسقدر قریب تھا اور پردہ کی رسم بھی نہیں تھی اور ہر وقت کی میل ملاقات تھی تو اغلب یہ ہے کہ آپ کو کئی دفعہ انہیں بغیر اوڑھنی کے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہوگا۔ اور زینب کا آپ کو اندر تشریف لانے کے لیے عرض کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت ان کے بدن پر اتنے کپڑے ضرور تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہونے کے لیے تیار تھیں۔ پس جس جہت سے بھی دیکھا جاوے یہ قصہ ایک محض جھوٹا اور بناوٹی قصہ قرار پاتا ہے جس کے اندر کچھ بھی حقیقت نہیں۔ اور اگر ان دلائل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کامل درجہ مقدس اور زاہدانہ زندگی کو بھی مدنظر رکھا جاوے جو آپ کی ہر حرکت و سکون سے عیاں تھی تو پھر تو اس واہیات اور فضول روایت کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ محققین نے اس قصہ کو قطعی طور پر جھوٹا اور بناوٹی قرار دیا ہے۔ مثلاً علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں۔ علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں۔ علامہ زرقانی نے شرح مواہب میں وضاحت کے ساتھ اس روایت کو سراسر جھوٹا قرار دے کر اس کے ذکر تک کو صداقت کی ہتک سمجھا ہے اور یہی حال دوسرے محققین کا ہے۔ اور محققین پر ہی بس نہیں بلکہ ہر شخص جسے تعصب نے اندھا نہیں کر رکھا ہمارے اس بیان کو جو ہم نے قرآن شریف اور احادیث صحیحہ کی بناء پر مرتب کر کے ہدیہ ناظرین کیا ہے اس لچر اور ناقابل التفات قصہ پر ترجیح دے گا جسے بعض منافقین نے اپنے پاس سے گھڑ کر روایت کیا۔ اور مسلمان مؤرخین نے جن کا کام صرف ہر قسم کی روایات کو جمع کرنا تھا اسے بغیر کسی تحقیق کے اپنی تاریخ میں جگہ دیدی اور پھر بعض غیر مسلم مؤرخین نے مذہبی تعصب سے اندھا ہو کر اسے اپنی کتب کی زینت بنایا ہے۔

اس بناوٹی قصہ کے ضمن میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ زمانہ اسلامی تاریخ کا وہ زمانہ تھا جبکہ منافقینِ مدینہ اپنے پورے زور میں تھے اور عبداللہ بن اُبی بن سلول کی سرکردگی میں اُن کی طرف سے ایک باقاعدہ سازش اسلام اور بانیٔ اسلام کو بدنام کرنے کی جاری تھی۔ اور ان کا یہ طریق تھا کہ جھوٹے اور بناوٹی قصے گھڑ گھڑ کر خفیہ خفیہ پھیلاتے رہتے تھے۔ یا اصل بات تو کچھ ہوتی تھی اور وہ اسے کچھ کا کچھ رنگ دے کر اور اس کے ساتھ سو قسم کے جھوٹ شامل کر کے اس کی در پردہ اشاعت شروع کر دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن شریف کی سورۃ احزاب میں جس جگہ حضرت زینب کی شادی کا ذکر ہے اس کے ساتھ ساتھ منافقین مدینہ کا بھی خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور ان کی شرارتوں کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ

بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا[1] یعنی "اگر منافق لوگ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینہ میں جھوٹی اور فتنہ انگیز خبروں کی اشاعت کرنے والے لوگ اپنی کارروائیوں سے باز نہ آئے تو پھر اے نبی! ہم تمہیں ان کے خلاف ہاتھ اُٹھانے کی اجازت دینگے اور پھر یہ لوگ مدینہ میں نہیں ٹھہر سکیں گے مگر تھوڑا۔" اس آیت میں صریح طور پر اس قصہ کے جھوٹا ہونے کی طرف اصولی اشارہ کیا گیا ہے۔ پھر جیسا کہ آگے چل کر ذکر آتا ہے اسی زمانہ کے قریب قریب حضرت عائشہ کے خلاف بہتان لگائے جانے کا خطرناک واقعہ بھی پیش آیا اور عبداللہ بن ابی اور اس کے بد باطن ساتھیوں نے اس افترا کا اس قدر چرچا کیا اور ایسے ایسے رنگ دے کر اس کی اشاعت کی کہ مسلمانوں پر ان کا عرصہ عافیت تنگ ہو گیا۔ اور بعض کمزور طبیعت اور ناواقف مسلمان بھی ان کے اس گندے پروپیگنڈا کا شکار ہو گئے۔ الغرض یہ زمانہ منافقوں کے خاص زور کا زمانہ تھا اور ان کا سب سے زیادہ دل پسند حربہ یہ تھا کہ جھوٹی اور گندی خبریں اڑا اڑا کر آنحضرت ﷺ اور آپ کے متعلقین کو بدنام کریں۔ یہ خبریں ایسی ہوشیاری کے ساتھ پھیلائی جاتی تھیں کہ بعض اوقات آنحضرت ﷺ اور آپ کے اکابر صحابہ کو تفصیلی علم نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تردید کا موقعہ بھی نہیں ملتا تھا اور اندر ہی اندر اُن کا زہر پھیلتا جاتا تھا۔ ایسی صورتوں میں بعد میں آنے والے مسلمان جو زیادہ تحقیق و تدقیق کے عادی نہیں تھے انہیں سچا سمجھ کر اُن کی روایت شروع کر دیتے تھے۔ اور اس طرح یہ روایتیں واقدی وغیرہ کے ٹائپ کے مسلمانوں کے مجموعہ میں راہ پاگئیں مگر جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے صحیح احادیث میں ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا اور نہ محققین نے انہیں قبول کیا ہے۔

حضرت زینب بنت جحش کے قصہ میں سر ولیم میور صاحب نے جن سے یقیناً ایک بہتر ذہنیت کی اُمید کی جاتی تھی واقدی کی غلط اور بناوٹی روایت کو قبول کرنے کے علاوہ اس موقعہ پر یہ دلآزار طعن بھی کیا ہے کہ گویا بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ کی نفسانی خواہشات بھی ترقی کرتی جاتی تھیں اور آپ کے حرم کی توسیع کو میور صاحب اسی جذبہ پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ میں بہ حیثیت ایک مؤرخ کے کسی مذہبی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا مگر تاریخی واقعات کو ایک غلط راستے پر ڈالا جاتا دیکھ کر اس ناگوار اور غیر منصفانہ طریق کے خلاف آواز بلند کرنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ بیشک یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں اور یہ بات بھی مسلمہ تاریخ کا حصہ ہے کہ علاوہ حضرت خدیجہ کے آپ کی ساری شادیاں اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں جسے بڑھاپے کا زمانہ کہا جا سکتا ہے مگر بغیر کسی تاریخی شہادت کے بلکہ صریح تاریخی شہادت کے خلاف یہ خیال کرنا کہ آپ کی یہ شادیاں نعوذ باللہ جسمانی خواہشات کے جذبہ کے ماتحت تھیں ایک مؤرخ کی شان سے بہت بعید ہے اور ایک شریف انسان کی شان سے بعید تر۔ میور صاحب اس حقیقت سے

---

[1] سورۃ احزاب: ۶۱

بے خبر نہیں تھے کہ آنحضرت ﷺ نے پچیس ۲۵ سال کی عمر میں ایک چالیس ۴۰ سالہ ادھیڑ عمر کی بیوہ عورت (حضرت خدیجہؓ) سے شادی کی اور پھر پچاس سال کی عمر تک اس رشتہ کو اس خوبی اور وفاداری کے ساتھ نبایا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی[1] اور اس کے بعد بھی آپ نے پچپن سال کی عمر تک عملاً صرف ایک بیوی رکھی۔ اور یہ بیوی (حضرت سودہؓ) بھی حسن اتفاق سے ایک بیوہ اور ادھیڑ عمر کی خاتون تھیں[2] اور اس تمام عرصہ میں جو جذبات نفسانی کے ہیجان کا مخصوص زمانہ ہے آپ کو کبھی دوسری شادی کا خیال نہیں آیا۔ میور صاحب اس تاریخی واقعہ سے بھی ہرگز ناواقف نہیں تھے کہ جب مکہ والوں نے آپؐ کی تبلیغی مساعی سے تنگ آکر اور ان کو اپنے قومی دین کا مخرب خیال کر کے آپ کے پاس عتبہ بن ربیعہ کو بطور ایک وفد کے بھیجا اور آپ سے پُرزور استدعا کی کہ آپؐ اپنی ان کوششوں سے رُک جائیں اور دولت اور ریاست کی طمع دینے کے علاوہ ایک یہ درخواست بھی پیش کی کہ اگر آپؐ کسی اچھی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے ہم سے خوش ہو سکتے ہیں اور ہمارے دین کو بُرا بھلا کہنے اور اس نئے دین کی تبلیغ سے باز رہ سکتے ہیں تو آپ جس لڑکی کو پسند کریں ہم آپ کے ساتھ اس کی شادی کئے دیتے ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر بھی کوئی ایسی زیادہ نہیں تھی۔ پھر جسمانی طاقت بھی بعد کے زمانہ کی نسبت یقیناً بہتر حالت میں تھی۔ مگر جو جواب آپ نے رؤسائے مکہ کے نمائندہ کو دیا وہ تاریخ کا ایک کھلا ہوا ورق ہے جس کے دہرانے کی اس جگہ ضرورت نہیں[3] یہ تاریخی واقعہ بھی میور صاحب کی نظر سے اوجھل نہیں تھا کہ مکہ کے لوگ آپ کو آپ کی بعثت سے قبل یعنی چالیس سال کی عمر تک ایک بہترین اخلاق والا انسان سمجھتے تھے[4] مگر باوجود ان سب شہادات کے میور صاحب کا یہ لکھنا کہ پچپن سال کی عمر کے بعد جب ایک طرف آپ کی جسمانی طاقتوں میں طبعاً انحطاط رونما ہونے لگا اور دوسری طرف آپ کے مشاغل اور ذمہ داریاں اس قدر بڑھ گئیں جو ایک مصروف سے مصروف انسان کے مشاغل کو شرماتی ہیں تو آپ عیش و عشرت میں مبتلا ہو گئے ہرگز کوئی غیر متعصبانہ ریمارک نہیں سمجھا جا سکتا! کہنے کو تو کوئی شخص جو کچھ بھی کہنا چاہے کہہ سکتا ہے اور اس کی زبان اور قلم کو روکنے کی دوسروں میں طاقت نہیں ہوتی۔ مگر عقلمند آدمی کو چاہیئے کہ کم از کم ایسی بات نہ کہے جسے دوسروں کی عقل سلیم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ میور صاحب اور ان کے ہم خیال لوگ اگر اپنی آنکھوں سے تعصب کی پٹی اتار کر دیکھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ محض یہ بات ہی کہ آنحضرت ﷺ کی یہ شادیاں آپ کے بڑھاپے کی عمر کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جسمانی اغراض کے ماتحت نہ تھیں بلکہ ان کی تہ میں کوئی دوسری اغراض مخفی تھیں۔ خصوصاً جبکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آپ نے اپنی جوانی کے ایام ایک ایسی حالت میں گذارے جس کی وجہ سے آپ نے اپنوں اور بیگانوں سے امین کا خطاب حاصل کیا۔ مجھے اس

---

[1] اصابہ و زرقانی حالات حضرت خدیجہ نیز میور صفحہ ۲۴، ۱۰۲ [2] اصابہ و زرقانی حالات سودہ نیز میور صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰

[3] سیرت حلبیہ جلد ا صفحہ ۳۲۳ نیز طبرانی و ابن ابی حاتم بحوالہ لباب النقول تفسیر سورۃ کافرون [4] میور صفحہ ۱۸، ۲۰

بات کے مطالعہ سے ایک روحانی سرور حاصل ہوتا ہے کہ آپ کی عمر کے جس زمانہ میں آپؐ کی یہ شادیاں ہوئیں وہ وہ زمانہ ہے جب کہ آپ پر آپ کے فرائض نبوت کا سب سے زیادہ بار تھا اور اپنی ان لاتعداد اور بھاری ذمہ واریوں کی ادائیگی میں آپ بالکل محو ہو رہے تھے۔ اور میرے نزدیک اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر انصاف پسند شریف انسان کے نزدیک محض یہ منظر ہی اس بات کی ایک دلیل ہے کہ آپ کی یہ شادیاں آپ کے فرائض نبوت کا حصہ تھیں جو آپ نے اپنی خانگی خوشی کو برباد کرتے ہوئے تبلیغ و تربیت کی اغراض کے ماتحت کیں۔ ایک بُرا آدمی دوسرے کے افعال میں بُری نیت تلاش کرتا ہے اور اپنی گندی حالت کی وجہ سے بسا اوقات دوسرے کی نیک نیت کو سمجھ بھی نہیں سکتا مگر ایک شریف انسان اس بات کو جانتا اور سمجھتا ہے کہ بسا اوقات ایک ہی فعل ہوتا ہے جسے ایک گندہ آدمی بُری نیت سے کرتا ہے مگر اسی کو ایک نیک آدمی نیک اور پاک نیت سے کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ میں اس موقعہ پر یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں شادی کی غرض یہ نہیں ہے کہ مرد اور عورت اپنی نفسانی خواہشات کے پورا کرنے کے لیے اکٹھے ہو سکیں۔ بلکہ گو نسلِ انسانی کے بقا کے لیے مرد و عورت کا اکٹھا ہونا نکاح کی ایک جائز غرض ہے مگر اس میں بہت سی اور پاکیزہ اغراض بھی مدنظر ہیں۔ پس ایک ایسے انسان کی شادیوں کی وجہ تلاش کرتے ہوئے جس کی زندگی کا ہر حرکت و سکون اس کی بے نفسی اور پاکیزگی پر ایک دلیل ہے گندے آدمیوں کی طرح گندے خیالات کی طرف مائل ہونے لگنا اس شخص کو تو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جس کے متعلق رائے لگائی جاتی ہے مگر رائے لگانے والے کے اپنے اندرونہ کا آئینہ ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔ پس اس سے زیادہ میں اس اعتراض کے جواب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا یَصِفُوْنَ۔

کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مفید مطلب وحی اُتار لیا کرتے تھے؟

میور صاحب اور مارگولیس صاحب نے اس موقعہ پر یہ طعن بھی کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر اپنے مفید مطلب وحی اُتار لی یعنی جب زینب کے ساتھ شادی کی خواہش پیدا ہوئی تو اُسے جائز کرنے اور لوگوں کے اعتراض سے بچنے کے لیئے الہام کی آڑ لے لی اور اس میں ان کا اشارہ یہ ہے کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے وحی و الہام وغیرہ نہیں ہوتے تھے بلکہ نعوذ باللہ آپؐ خود ہی اپنی طرف سے الہام بنا کر خدا کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ اِس سوال کے مذہبی پہلو سے تو بحیثیت مؤرخ ہونے کے میرا کوئی سروکار نہیں ہے مگر یہ خیال تاریخی طور پر غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ اپنے مفید مطلب وحی ہو جایا کرتی تھی۔ آپ کی زندگی اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ بسا اوقات آپ کی ذاتی خواہش کے خلاف وحی نازل ہوتی تھی۔ چنانچہ یہی قصہ اس کی ایک روشن مثال ہے۔ قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زینب کے ساتھ شادی کرنے سے خائف تھے اور اسے حتی الوسع ٹالنا چاہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے حکماً آپ کو اس طرف مائل کیا بلکہ ایک گونہ تادیب بھی فرمائی کہ تَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ

اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ[1] یعنی "اے نبی! تم لوگوں کی وجہ سے خائف ہو حالانکہ صرف ہم ہی اس بات کے حقدار ہیں کہ ہم سے ڈرا جاوے"۔ پس غور کیا جاوے تو جس قصہ کے ضمن میں میور صاحب نے ایک جھوٹی روایت پر بناء رکھ کر یہ اعتراض اُٹھایا ہے وہی اُسے جھوٹا ثابت کر رہا ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں آتا ہے کہ جب غزوۂ تبوک کے موقعہ پر آنحضرت صلعم نے بعض منافقوں کو پیچھے رہنے کی اجازت دیدی تو اس پر یہ وحی الٰہی نازل ہوئی کہ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ[2] یعنی "اے نبی! خدا تمہیں معاف فرمائے تم نے انہیں کیوں اجازت دی؟ ہم تو اس موقعہ پر مومن و منافق میں امتیاز پیدا کرنا چاہتے تھے"۔ اسی طرح جب آنحضرت صلعم نے عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول رئیس المنافقین کا جنازہ پڑھ دیا اور آپ کی رائے تھی کہ اس میں کوئی حرج نہیں تو اس پر یہ وحی الٰہی نازل ہوئی کہ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ[3] یعنی "آیندہ ان منافقوں میں کسی کا جنازہ نہ پڑھو۔ اور نہ کسی کی قبر پر دُعا مانگو۔ کیونکہ دراصل وہ کافر ہیں اور خدا کی نافرمانی کی حالت میں مرتے ہیں"۔ اسی طرح بخاری میں آتا ہے کہ جب آپ نے غزوۂ اُحد میں زخمی ہونے پر ایسے طریق پر دُعا کی جو قریش کے خلاف ایک گونہ بددُعا کا رنگ رکھتا تھا تو اس پر یہ قرآنی آیت اُتری کہ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ۔ یعنی "تمہیں اس معاملہ میں سروکار نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم کسے چھوڑتے اور کسے عذاب دیتے ہیں[4]"۔ اسی طرح جب آپ کی بیویوں کی تعداد اس حد کو پہنچ گئی جو خدائی علم میں ضروری تھی تو آپ پر یہ وحی نازل ہوئی کہ اب اس کے بعد تمہیں کسی اور شادی کی اجازت نہیں ہے[5]۔ الغرض یہ ایک بالکل غلط اور بے بنیاد خیال ہے کہ آپ اپنی مرضی کے مطابق وحی اُتار لیا کرتے تھے اور یہ اعتراض وہی شخص کر سکتا ہے جو تاریخ اسلامی سے قطعاً نابلد ہے۔ پھر زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ میور صاحب اور مارگولیس صاحب تو زینب کی شادی کے موقعہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے مفید مطلب وحی اُتار لی۔ مگر حدیث میں یہ آتا ہے کہ چونکہ اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء اور ارادے کے بالکل خلاف وحی نازل ہوئی تھی اس لیے اگر آنحضرت ﷺ نے اپنی کوئی وحی چھپانی ہوتی تو ضرور اس وحی کو چھپاتے جو آپ کی مرضی کے خلاف ہونے کے علاوہ ایک گونہ عتاب کا بھی رنگ رکھتی تھی۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں لَوْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَاتِمًا شَيْئًا لَكَتَمَ هٰذِهٖ[6]۔ یعنی "اگر آنحضرت ﷺ اپنی کسی وحی کو چھپانے والے ہوتے تو ضرور اس وحی کو چھپاتے"۔ پس اپنے مفید مطلب وحی اُتار لینے کا اعتراض بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے خیال کے مطابق وحی نازل ہو جاتی تھی۔ سو یہ درست ہے۔ مگر یہ ہرگز جائے اعتراض نہیں بلکہ یہی بات آپ کی صداقت

---

[1] سورۃ احزاب: ۳۸ [2] سورۃ توبۃ: ۴۳ [3] سورۃ توبۃ: ۸۴ [4] بخاری حالات اُحد و کتاب التفسیر
[5] سورۃ احزاب: ۵۳ [6] بخاری کتاب التوحید

اور کمال کی دلیل ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا[1] یعنی "اے نبی! تو اس خدائی دین اسلام پر راستی اور سداد کے ساتھ قائم ہو جا جس کی بناوٹ انسانی فطرت کے مطابق بنائی گئی ہے۔" اور عقلاً بھی غور کیا جاوے تو یہی ہونا چاہیئے تھا کہ فطرتِ انسانی شریعت کے مطابق بنائی جاتی۔ یا بالفاظ دیگر شریعت کو فطرتِ انسانی کے مطابق اُتارا جاتا۔ پس فطرتِ صحیحہ اور شریعتِ اسلامی کا توارد تو ضروری ہے اور جتنی جتنی کسی شخص کی فطرت زیادہ صاف اور بیرونی اثرات سے زیادہ پاک ہوتی ہے اتنا ہی وہ شریعت کی رُوح کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ دوسرے انسانوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طبعی میلانات شریعتِ اسلامی کے زیادہ قریب ہوتے۔ اور عام حالات میں آپ کی رائے اسی رستے پر چلتی جس رستے پر شریعت کا نزول ہونا تھا۔ مگر یہ بالکل درست نہیں کہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا کیونکہ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے اور بشری لوازمات کے ماتحت ضروری تھا کہ کہیں کہیں اختلاف بھی ہو جاتا۔ علاوہ ازیں چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات واضح کرنا منظور تھی کہ جو وحی آپ پر نازل ہوتی ہے وہ آپ کے دل و دماغ سے ایک بالا منبع رکھتی ہے اور ایک وَراء الوَرا ہستی کی طرف سے آتی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے حکیمانہ تصرف کے ماتحت ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں رہنے دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال کچھ تھا اور وحی کچھ اور نازل ہوئی یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کچھ تھی اور وحی کچھ اور نازل ہوتی۔ پس میور صاحب اور مارگولیس صاحب کا اعتراض بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

غزوہ بنو مصطلق اور واقعہ افک شعبان ۵ ہجری

قریش کی مخالفت دن بدن زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی وہ اپنی ریشہ دوانی سے عرب کے بہت سے قبائل کو اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف کھڑا کر چکے تھے لیکن اب ان کی عداوت نے ایک نیا خطرہ پیدا کر دیا اور وہ یہ کہ حجاز کے وہ قبائل جو مسلمانوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتے تھے اب وہ بھی قریش کی فتنہ انگیزی سے مسلمانوں کے خلاف اٹھنے شروع ہو گئے[2] اس معاملہ میں پہل کرنے والا مشہور قبیلہ بنو خزاعہ تھا جنکی ایک شاخ بنو مصطلق نے مدینہ کے خلاف حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی[3] اور ان کے رئیس حرث بن ابی ضرار نے اس علاقہ کے دوسرے قبائل میں دورہ کر کے بعض اور قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا[4] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے مزید احتیاط کے طور پر اپنے ایک صحابی بریدہ بن حصیب نامی کو دریافت حالات کے لیے بنو مصطلق کی طرف روانہ فرمایا اور ان کو تاکید فرمائی کہ بہت جلد واپس آکر حقیقۃ الامر سے آپ کو اطلاع دیں۔ بریدہ گئے تو دیکھا کہ واقعی ایک بہت بڑا اجتماع ہے اور نہایت زور شور سے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ انہوں نے فوراً واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی[5]۔ اور آپ نے

---

[1] سورۃ روم: ۳۱ [2] میور صفحہ ۲۸۶ [3] ابن ہشام و ابن سعد [4] ابن سعد [5] ابن سعد

حسب عادت مسلمانوں کو پیش قدمی کے طور پر دیار بنو مصطلق کی طرف روانہ ہونے کی تحریک فرمائی اور بہت سے صحابہ آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے بلکہ ایک بڑا گروہ منافقین کا بھی جو اس سے پہلے اتنی تعداد میں کبھی شامل نہیں ہوتے تھے ساتھ ہو گیا[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے ابوذر غفاریؓ یا بعض روایات کی رو سے زید بن حارثہؓ کو مدینہ کا امیر مقرر کر کے اللہ کا نام لیتے ہوئے شعبان ۵ ھ میں مدینہ سے نکلے[2] فوج میں صرف تیس گھوڑے تھے۔ البتہ اونٹوں کی تعداد کسی قدر زیادہ تھی اور انہی گھوڑوں اور اونٹوں پر مل جل کر مسلمان باری باری سوار ہوتے تھے۔ راستہ میں مسلمانوں کو کفار کا ایک جاسوس مل گیا جسے انہوں نے پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا اور آپ نے اس تحقیق کے بعد کہ وہ واقعی جاسوس ہے اُس سے کفار کے متعلق کچھ حالات وغیرہ دریافت کرنے چاہے مگر اُس نے بتانے سے انکار کیا اور چونکہ اس کا رویہ مشتبہ تھا اس لیے مروجہ قانونِ جنگ کے ماتحت حضرت عمرؓ نے اُسے قتل کر دیا۔ اور اس کے بعد لشکرِ اسلام آگے روانہ ہوا۔ بنو مصطلق کو جب مسلمانوں کی آمد آمد کی اطلاع ہوئی اور یہ خبر بھی پہنچی کہ ان کا جاسوس مارا گیا ہے تو وہ بہت خائف ہوئے۔ کیونکہ اصل منشاء ان کا یہ تھا کہ کسی طرح مدینہ پر اچانک حملہ کرنے کا موقعہ مل جاوے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیدار مغزی کی وجہ سے اب ان کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے پس وہ بہت مرعوب ہو گئے اور دوسرے قبائل جو ان کی مدد کے لیے اُن کے ساتھ جمع ہو گئے تھے وہ تو خدائی تصرف کے ماتحت کچھ ایسے خائف ہوئے کہ فوراً ان کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے[3] مگر خود بنو مصطلق کو قریش نے مسلمانوں کی دشمنی کا کچھ ایسا نشہ پلا دیا تھا کہ وہ پھر بھی جنگ کے ارادے سے باز نہ آئے اور پوری تیاری کے ساتھ اسلامی لشکر کے مقابلہ کے لیے آمادہ رہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مریسیع میں پہنچے جس کے قریب بنو مصطلق کا قیام تھا اور جو ساحل سمندر کے قریب مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام کا نام ہے تو آپ نے ڈیرہ ڈالنے کا حکم دیا اور صف آرائی اور جھنڈوں کی تقسیم وغیرہ کے بعد آپ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ آگے بڑھ کر بنو مصطلق میں یہ اعلان کریں کہ اگر اب بھی وہ اسلام کی عداوت سے باز آجائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کو تسلیم کر لیں تو اُن کو امن دیا جائے گا۔ اور مسلمان واپس لوٹ جائیں گے مگر انہوں نے سختی کے ساتھ انکار کیا اور جنگ کے واسطے تیار ہو گئے[4] حتیٰ کہ لکھا ہے کہ سب سے پہلا تیر جو اس جنگ میں چلایا گیا وہ انہی کے آدمی نے چلایا[5] جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ حالت دیکھی تو آپ نے بھی صحابہ کو لڑنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر تک فریقین کے درمیان خوب تیر اندازی ہوئی جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یکلخت دھاوا کر دینے کا حکم دیا۔ اور اس اچانک دھاوے کے نتیجے

---

[1] ابن سعد [2] ابن ہشام [3] ابن سعد [4] ابن سعد و زرقانی جلد ۲ صفحہ ۹۶ [5] ابن سعد و زرقانی

[6] ابن سعد [7] زرقانی حالات غزوہ مریسیع [8] زرقانی

میں کفار کے پاؤں اکھڑ گئے مگر مسلمانوں نے ایسی ہوشیاری کے ساتھ ان کا گھیرا ڈالا کہ ساری کی ساری قوم محصور ہو کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔ اور صرف دس کفار اور ایک مسلمان کے قتل پر اس جنگ کا جو ایک خطرناک صورت اختیار کر سکتا تھا خاتمہ ہو گیا[1]

اس موقعہ پر یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ اسی غزوہ کے متعلق صحیح بخاری میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مصطلق پر ایسے وقت میں حملہ کیا تھا کہ وہ غفلت کی حالت میں اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے[2] مگر غور سے دیکھا جاوے تو یہ روایت مؤرخین کی روایت کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ درحقیقت دو روایتیں دو مختلف وقتوں سے تعلق رکھتی ہیں یعنی واقعہ یوں ہے کہ جب اسلامی لشکر بنو مصطلق کے قریب پہنچا تو اس وقت چونکہ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مسلمان بالکل قریب آ گئے ہیں (گو انہیں اسلامی لشکر کی آمد آمد کی اطلاع ضرور ہو چکی تھی) وہ اطمینان کے ساتھ ایک بے ترتیبی کی حالت میں پڑے تھے اور اسی حالت کی طرف بخاری کی روایت میں اشارہ ہے، لیکن جب ان کو مسلمانوں کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنی مستقل سابقہ تیاری کے مطابق فوراً صف بند ہو کر مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ اور یہ وہ حالت ہے جس کا ذکر مؤرخین نے کیا ہے۔ اس اختلاف کی یہی تشریح علامہ ابن حجر اور بعض دوسرے محققین نے کی ہے اور یہی درست معلوم ہوتی ہے[3]

جنگ کے اختتام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند دن تک مریسیع میں قیام فرمایا مگر اس قیام کے دوران منافقین کی طرف سے ایک ایسا ناگوار واقعہ پیش آیا جس سے قریب تھا کہ کمزور مسلمانوں میں خانہ جنگی تک نوبت پہنچ جاتی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موقعہ شناسی اور مقناطیسی اثر نے اس فتنہ کے خطرناک نتائج سے مسلمانوں کو بچا لیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ حضرت عمر کا ایک نوکر جہجاہ نامی مریسیع کے مقامی چشمہ پر سے پانی لینے کے لیے گیا اتفاقاً اسی وقت ایک دوسرا شخص سنان نامی بھی جو انصار کے حلیفوں میں سے تھا پانی لینے کے لیے وہاں پہنچا۔ یہ دونوں شخص جاہل اور عامی لوگوں میں سے تھے۔ چشمہ پر یہ دونوں شخص آپس میں جھگڑ پڑے اور جہجاہ نے سنان کو ایک ضرب لگا دی۔ بس پھر کیا تھا سنان نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا کہ اے انصار کے گروہ! میری مدد کو پہنچو کہ میں پٹ گیا۔ جب جہجاہ نے دیکھا کہ سنان نے اپنی قوم کو بلایا ہے تو اس نے بھی اپنی قوم کے لوگوں کو پکارنا شروع کر دیا کہ اے مہاجرین بھاگیو دوڑیو![4] جن انصار و مہاجرین کے کانوں میں یہ آواز پہنچی وہ اپنی تلواریں لے کر بے تحاشا اس چشمہ کی طرف لپکے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک اچھا خاصہ مجمع ہو گیا اور قریب تھا کہ بعض جاہل نوجوان ایک دوسرے پر حملہ آور ہو جاتے مگر اتنے میں بعض سمجھدار اور مخلص مہاجرین و انصار بھی موقعہ پر پہنچ گئے۔ اور انہوں نے فوراً لوگوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے صلح صفائی کروا دی[5] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابن سعد [2] بخاری کتاب العتق [3] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۹۸ [4] ترمذی تفسیر سورۃ منافقون و ابن ہشام و ابن سعد حالات غزوہ مریسیع [5] ابن سعد

کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا "یہ ایک جاہلیت کا مظاہرہ ہے اور اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا[1]۔ اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن جب منافقین کے سردار عبداللہ بن اُبی بن سلول کو جو اس غزوہ میں شامل تھا اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو اُس بدبخت نے اس فتنہ کو پھر جگانا چاہا۔ اور اپنے ساتھیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف بہت کچھ اُکسایا۔ اور کہا یہ سب تمہارا اپنا قصور ہے کہ تم نے ان بے خانماں مسلمانوں کو پناہ دے کر ان کو سر پر چڑھا لیا ہے۔ اب بھی تمہیں چاہیئے کہ ان کی اعانت سے دست بردار ہو جاؤ پھر یہ خود بخود چھوڑ چھاڑ کر چلے جائیں گے اور بالآخر اس بدبخت نے یہاں تک کہہ دیا کہ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْھَا الْاَذَلَّ ۔ یعنی "دیکھو تو اب مدینہ میں جا کر عزت والا شخص یا گروہ وہ ذلیل شخص یا گروہ کو اپنے شہر سے باہر نکال دیتا ہے یا نہیں[2]؟ اُس وقت ایک مخلص مسلمان بچہ زید بن ارقم بھی وہاں بیٹھا تھا اُس نے عبداللہ کے منہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ الفاظ سُنے تو بے تاب ہو گیا۔ اور فوراً اپنے چچا کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت عمرؓ بھی بیٹھے تھے۔ وہ یہ الفاظ سُن کر غصہ و غیرت سے بھر گئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! آپ مجھے اجازت دیں کہ مَیں اس منافق فتنہ پرداز کی گردن اُڑا دوں۔ آپ نے فرمایا "عمر! جانے دو۔ کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ لوگوں میں یہ چرچا ہو کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرواتا پھرتا ہے"۔ پھر آپ نے عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں کو بلوا بھیجا اور اُن سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ سب قسمیں کھا گئے کہ ہم نے کوئی ایسی بات نہیں کی[3]۔ بعض انصار نے بھی بطریق سفارش عرض کیا کہ زید بن ارقم کو غلطی لگی ہوگی[4]۔ آپ نے اس وقت عبداللہ بن اُبی اور اُس کے ساتھیوں کے بیان کو قبول فرما لیا۔ اور زید کی بات رد کر دی جس سے زید کو سخت صدمہ ہوا مگر بعد میں قرآنی وحی نے زید کی تصدیق فرمائی اور منافقین کو جھوٹا قرار دیا[5]۔ ادھر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی وغیرہ کو بلا کر اس بات کی تصدیق شروع فرما دی اور اُدھر آپ نے حضرت عمرؓ سے ارشاد فرمایا کہ اسی وقت لوگوں کو کوچ کا حکم دیدو۔ یہ وقت دوپہر کا تھا جبکہ آنحضرتؐ عموماً کوچ نہیں فرمایا کرتے تھے کیونکہ عرب کے موسم کے لحاظ سے یہ وقت سخت گرمی کا وقت ہوتا ہے اور اس میں سفر کرنا نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے مگر آپ نے اس وقت کے حالات کے مطابق یہی مناسب خیال فرمایا کہ ابھی کوچ ہو جاوے۔ چنانچہ آپ کے حکم کے ماتحت فوراً سارا اسلامی لشکر واپسی کے لیے تیار ہوگیا۔ غالباً اسی موقعہ پر اسید بن حضیر انصاری جو قبیلہ اوس کے نہایت نامور رئیس تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ تو عموماً ایسے وقت میں سفر نہیں فرمایا کرتے۔ آج کیا معاملہ ہے؟

---

[1] بخاری و ترمذی تفسیر سورۃ منافقون [2] بخاری و ترمذی تفسیر سورۃ منافقون و ابن ہشام و ابن سعد حالات مریسیع [3] بخاری و ترمذی [4] ابن ہشام [5] قرآن سورۃ منافقون و بخاری و ترمذی [6] ابن سعد

آپ نے فرمایا "اسید! کیا تم نے نہیں سُنا کہ عبداللہ بن ابی نے کیا الفاظ کہے ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ "ہم مدینہ چل لیں۔ وہاں پہنچ کر عزت والا شخص ذلیل شخص کو باہر نکال دیگا۔" اسید نے بے ساختہ عرض کیا۔ ہاں یارسول اللہ آپ چاہیں تو بے شک عبداللہ کو مدینہ سے باہر نکال سکتے ہیں کیونکہ واللہ عزت والے آپ ہیں اور وہی ذلیل ہے۔" پھر اسید بن حضیر نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ آپ کے تشریف لانے سے قبل عبداللہ بن ابی اپنی قوم میں بہت معزز تھا اور اس کی قوم اس کو اپنا بادشاہ بنانے کی تجویز میں تھی جو آپ کے تشریف لانے سے خاک میں مل گئی۔ پس اس وجہ سے اس کے دل میں آپ کے متعلق حسد بیٹھ گیا ہوا ہے اس لیے آپ اس کی اس بکواس کی کچھ پروا نہ کریں اور اس سے درگذر فرماویں[1]۔ تھوڑی دیر میں عبداللہ بن ابی کا لڑکا جس کا نام حباب تھا مگر آنحضرت ﷺ نے اُسے بدل کر عبداللہ کر دیا تھا اور وہ ایک بہت مخلص صحابی تھا گھبرایا ہوا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ یارسول اللہ مَیں نے سُنا ہے کہ آپ میرے باپ کی گستاخی اور فتنہ انگیزی کی وجہ سے اس کے قتل کا حکم دینا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو آپ مجھے حکم فرمائیں مَیں ابھی اپنے باپ کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں لا ڈالتا ہوں مگر آپ کسی اور کو ایسا ارشاد نہ فرمائیں۔ کیونکہ مَیں ڈرتا ہوں کہ کوئی جاہلیت کی رگ میرے بدن میں جوش مارے اور مَیں اپنے باپ کے قاتل کو کسی وقت کوئی نقصان پہنچا بیٹھوں اور خدا کی رضا چاہتا ہوا بھی جہنم میں جا گروں۔" آپ نے اسے تسلی دی اور فرمایا کہ ہمارا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے بلکہ ہم بہر حال تمہارے والد کے ساتھ نرمی اور احسان کا معاملہ کرینگے[2]۔ مگر عبداللہ بن عبداللہ بن ابی کو اپنے باپ کے خلاف اتنا جوش تھا کہ جب لشکرِ اسلامی مدینہ کی طرف لوٹا تو عبداللہ اپنے باپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا خدا کی قسم میں تمہیں واپس نہیں جانے دُونگا جب تک تم اپنے مُنہ سے یہ اقرار نہ کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معزز ہیں اور تم ذلیل ہو اور عبداللہ نے اس اصرار سے اپنے باپ پر زور ڈالا کہ آخر اُس نے مجبور ہو کر یہ الفاظ کہہ دیئے جس پر عبداللہ نے اس کا راستہ چھوڑ دیا[3]۔

جب واپسی کا کوچ شروع ہوا تو اس دن کا بقیہ حصہ اور ساری رات اور اگلے دن کا ابتدائی حصہ لشکرِ اسلامی برابر لگاتار چلتا رہا۔ اور جب بالآخر ڈیرہ ڈالا گیا تو لوگ اس قدر تھک کر چُور ہو چکے تھے کہ مقام کرتے ہی ان میں سے اکثر گہری نیند سو گئے[4] اور اس طرح آنحضرت ﷺ کی بیدار مغزی سے لوگوں کی توجہ اس ناگوار واقعہ کی طرف سے ہٹ کر ایک لمبے وقفہ تک دوسری طرف لگی رہی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو منافقین کی فتنہ انگیزی سے بچا لیا۔ دراصل منافقین مدینہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے مسلمانوں میں خانہ جنگی اور باہمی انشقاق کی صورت پیدا کر دیں۔ نیز اگر ممکن ہو تو ان کی نظر میں آنحضرت ﷺ کی عزت کو کم کر دیں۔ مگر اسلام اور آنحضرت ﷺ کی مقناطیسی شخصیت نے مسلمانوں میں ایسا رشتۂ اتحاد پیدا کر دیا تھا کہ کوئی

---

[1] ابن ہشام [2] ابن ہشام وطبری [3] ترمذی و ابن سعد [4] ابن ہشام

سازش اس میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتی تھی اور آنحضرت ﷺ کی ذات کے متعلق تو مسلمانوں کے دلوں میں عزت و احترام اخلاص و ایمان اور محبت و عشق کے وہ جذبات راسخ ہو چکے تھے کہ انہیں متزلزل کرنا کسی بشر کی طاقت میں نہیں تھا۔ چنانچہ اسی موقعہ پر دیکھ لو کہ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین نے دو عامی مسلمانوں کے ایک وقتی جھگڑے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کس طرح صحابہ میں اختلاف و انشقاق کا بیج بونے اور آنحضرت ﷺ کی محبت و رُعب کو صدمہ پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر اسے کیسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور خدا نے اُسے خود اس کے بیٹے کے ہاتھوں سے وہ ذلت کا پیالہ پلایا جو اُسے غالباً مرتے دم تک نہ بھولا ہوگا۔

واقعہ افک

مگر نہ معلوم منافقین مدینہ کی مٹی میں کس فتنہ کا خمیر تھا کہ کوئی واقعہ اُن کی آنکھوں کو نہ کھولتا تھا۔ بلکہ ہر ناکامی ان کی شرارت اور فتنہ پردازی کو اور بھی زیادہ کر دیتی تھی چنانچہ اسی سفر کی واپسی میں ان کی طرف سے ایک اور خطرناک فتنہ کھڑا کیا گیا جو اپنی نوعیت اور مفسدانہ اثر کے لحاظ سے اس فتنہ سے بھی بہت زیادہ خطرناک تھا جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ یہ واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ پر تہمت لگائے جانے کا واقعہ ہے جو اسی غزوہ کے سفر واپسی میں پیش آیا[1] یہ تہمت اسی نوعیت کی تھی جیسی کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم اور رامچندر جی کی بیوی سیتا پر بد باطن لوگوں نے لگائی اور بہتر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کے اپنے الفاظ میں اسے بیان کیا جاوے کیونکہ وہ ایک بہت مفصل اور دلچسپ بیان ہے جس سے اصل واقعہ کے متعلق یقینی علم حاصل ہونے کے علاوہ اس زمانہ کے تمدن اور طریق واطوار پر بھی بہت روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عائشہ کی طرف سے جو روایت بیان ہوئی ہے اس کے ضروری ضروری اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ:۔

"آنحضرت ﷺ کا یہ طریق تھا کہ جب آپ کسی سفر پر جانے لگتے تھے تو اپنی ازواج میں قرعہ ڈالتے تھے پھر جس کا نام نکلتا تھا اُسے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک غزوہ کے موقعہ پر اسی طرح قرعہ ڈالا تو میرا نام نکلا۔ چنانچہ مجھے آپ اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے کہ جب پردہ کے احکام نازل ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس سفر میں میں ہودہ کے اندر بیٹھی تھی اور لوگ میرے ہودَہ کو اُٹھا کر اُونٹ پر رکھ دیتے تھے اور جہاں قیام کرنا ہوتا تھا وہاں میرے ہودَہ کو اُتار کر نیچے رکھ دیتے۔ جب آنحضرت ﷺ اس غزوہ سے فارغ ہو کر واپس لوٹے اور ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو ایک دن آپ نے رات کے وقت کوچ کا حکم دیا۔ جب میں نے یہ اعلان سُنا تو میں حوائج انسانی سے فارغ ہونے کے لیے لشکر سے باہر نکل کر ایک طرف کو گئی اور فارغ ہو کر واپس لوٹ آئی۔ جب میں اپنے اونٹ کے قریب پہنچی

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ بنی مصطلق و ابن ہشام و طبری و ابن سعد

تو مَیں نے معلوم کیا کہ میرے گلے کا ہار غدار دہے۔ اُس کی تلاش میں مَیں پھر واپس گئی اور اس تلاش میں مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ اس اثناء میں وہ لوگ جو میرا ہودہ اُٹھانے پر متعین تھے آئے اور یہ خیال کر کے کہ مَیں ہودہ کے اندر ہوں انہوں نے میرا ہودہ اُٹھا کر اونٹ کے اوپر رکھ دیا اور لشکر کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ چونکہ اس زمانہ میں بوجہ کم خوری اور تنگی معیشت کے عورتیں بہت دُبلی پتلی ہوتی تھیں اور ان کے بدنوں پر گوشت نہیں آتا تھا اس لیے ہودہ اُٹھانے والوں کو ہودہ کے ہلکا ہونے کا شبہ نہیں گذرا۔ اور پھر میری عمر بھی اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ بہرحال جب مَیں ہار کی تلاش کر لینے کے بعد واپس آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ لشکر جا چکا ہے اور میدان خالی پڑا ہے۔ مَیں سخت پریشان ہوئی مگر مَیں نے دل میں سوچا کہ مجھے اپنی جگہ پر ٹھہرے رہنا چاہیئے کیونکہ جب لوگوں کو میرے پیچھے رہ جانے کا علم ہوگا تو وہ ضرور واپس آئینگے۔ پس مَیں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی اور بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آ گئی۔ اب واقعہ یوں ہوا کہ صفوان بن معطل ایک صحابی تھا جس کی ڈیوٹی یہ مقرر تھی کہ وہ لشکر اسلامی کے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ (تاکہ گری پڑی چیز وغیرہ کی حفاظت ہو سکے) وہ جب پیچھے سے آیا اور صبح کے قریب میری جگہ پر پہنچا تو اس نے مجھے وہاں اکیلے سوتے ہوتے دیکھا۔ اور چونکہ وہ پردہ کے احکام کے نازل ہونے سے قبل مجھے دیکھ چکا تھا اُس نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ جس پر اس نے گھبرا کر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہا[1] اس کی اس آواز سے مَیں جاگ اُٹھی اور مَیں نے اُسے دیکھتے ہی جھٹ اپنا مُنہ اپنی اوڑھنی سے ڈھانک لیا۔ اور خدا کی قسم اُس نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی اور نہ مَیں نے اس کلمہ کے سوا اس کے منہ سے کوئی اور الفاظ سُنے۔ اس کے بعد وہ اپنے اونٹ کو آگے لایا۔ اور میرے قریب اُسے بٹھا دیا۔ اور اس نے اونٹ کے دونوں گھٹنوں پر اپنا پاؤں رکھ دیا (تاکہ وہ اچانک نہ اُٹھ سکے) چنانچہ مَیں اونٹ کے اوپر سوار ہو گئی اور صفوان اس کے آگے آگے اُس کی مہار تھامے ہوتے چلنے لگ گیا۔ حتٰی کہ ہم چلتے چلتے اس جگہ آ پہنچے جہاں لشکرِ اسلامی ڈیرہ ڈالے ہوتے تھا۔ بس یہ وہ قصہ ہے جس پر ہلاک ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے ہلاک ہونا تھا۔ اور اس بُہتان کا بانی مبانی عبداللہ بن اُبی بن سلول (رئیس المنافقین) تھا۔

اِس کے بعد ہم لوگ مدینہ میں پہنچ گئے اور اتفاق ایسا ہوا کہ مَیں وہاں جاتے ہی بیمار ہو گئی اور برابر ایک ماہ تک بیمار رہی۔ اور اس عرصہ میں لوگوں میں بہتان لگانے والوں کی باتوں کے متعلق بہت چرچا رہا۔ اور ہر طرح کی چہ میگوئی ہوتی رہی۔ مگر اس وقت تک مجھے اس تہمت کے متعلق قطعاً کوئی خبر نہیں تھی۔ البتہ یہ بات ضرور تھی کہ مجھے اپنی اس بیماری کے ایام میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے وہ شفقت و مہربانی نظر نہیں آتی تھی جو آپؐ عموماً مجھ پر فرمایا کرتے تھے اور اس کا مجھے سخت قلق تھا۔ رسول اللہ ﷺ

---

[1] سورۃ بقرہ: ۱۵۷۔ یعنی ہم خدا ہی کے ہیں اور خدا ہی کی طرف لوٹیں گے۔ یہ کلمہ مسلمان مصیبت کے موقعہ پر کہا کرتے ہیں۔

میرے پاس آتے تھے تو بس سلام کہہ کر صرف اتنی بات فرماتے تھے کہ اب کیا حال ہے ؟ اور پھر لوٹ جاتے تھے اور آپ کے اس طریق سے مجھے دل ہی دل میں سخت تکلیف ہوتی تھی۔ میں اسی بے خبری کی حالت میں پڑی رہی حتیٰ کہ میری بیماری نے مجھے سخت نڈھال اور کمزور کر دیا۔ انہی ایام میں مجھے ایک دن ایک عورت اُم مسطح سے جو دُور سے ہماری رشتہ دار بھی تھی اتفاقی طور پر بہتان لگانے والوں کا قصہ معلوم ہوا اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان الزام لگانے والوں میں اُم مسطح کا لڑکا مسطح بھی شامل تھا۔ جب میں نے یہ باتیں سُنیں تو مجھے تو گویا اپنی اصل بیماری بھول کر ایک نئی بیماری لگ گئی۔ اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب عادت تشریف لا کر یہ دریافت فرمایا کہ "اب کیا حال ہے ؟" تو میں نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ اجازت دیں تو میں چند دن کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں۔ آپ نے اجازت دے دی اور میں اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ اس سے دراصل میرا منشاء یہ تھا کہ والدین کے گھر جا کر میں اس خبر کے متعلق تحقیق کرونگی کہ کیا واقعی میرے متعلق اس قسم کی باتیں کی جارہی ہیں چنانچہ میں نے وہاں جا کر اپنی والدہ سے دریافت کیا۔ میری ماں نے کہا۔ بیٹی! تو پریشان نہ ہو۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب ایک شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی ہیں اور وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ زیادہ محبت کرتا ہے تو ایسی عورت کے متعلق دوسری عورتیں خواہ نخواہ باتیں بنانے لگ جاتی ہیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہا سبحان اللہ سُبحان اللہ! کیا لوگ میرے متعلق واقعی یہ باتیں کر رہے ہیں ؟ پھر میں رونے لگ گئی اور ساری رات میرے آنسو نہیں تھمے اور نہ میں سوئی۔ اور جب صبح ہوئی تو اُس وقت بھی میرے آنسو جاری تھے۔

"اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ بن ابی طالب اور اسامہؓ بن زید کو مشورہ کے لیے بلایا۔ کیونکہ وحی کے نزول میں بہت وقفہ پڑ گیا تھا (اور آپ اس معاملہ میں بہت فکرمند تھے) آپ نے ان دونوں سے میرے متعلق مشورہ پوچھا کہ ان حالات میں کہ اس قسم کی باتیں کی جارہی ہیں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ آیا میں عائشہ سے قطع تعلق کر لوں ؟ اسامہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! عائشہ آپ کی بیوی ہیں (یعنی خدا تعالےٰ نے جو عائشہ کو آپ کی بیوی بننے کے لیے چُنا ہے تو انہیں اس کا اہل جان کر چنا ہے) اور خدا کی قسم ہم تو عائشہ کے متعلق سوائے نیکی کے اور کچھ نہیں جانتے۔ مگر علیؓ نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے) یہ جواب دیا کہ "یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں فرمائی اور عائشہ کے سوا عورتوں کی کمی بھی نہیں ہے (مگر میں اصل واقعہ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا) آپ گھر کی خادمہ سے دریافت فرمالیں شائد اُسے کچھ علم ہو۔ اور وہ صحیح صحیح بات بتا سکے"۔ اس پر آپ نے اپنی خادمہ بریرہ کو بلایا۔ اور اس سے پوچھا کہ کیا تم نے عائشہ میں کوئی ایسی بات دیکھی ہے جس سے کسی قسم کا شبہ پیدا ہوتا ہو ؟ بریرہ نے جواب دیا کہ "مجھے خدا کی قسم ہے جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کہ میں نے اپنی بی بی میں کوئی بُری بات نہیں دیکھی سوائے اس کے کہ خورد سالی کی وجہ سے وہ کسی قدر بے پروا ضرور ہیں چنانچہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آٹا گوندھا ہوا کھُلا

چھوڑ کر سو جاتی ہیں اور بکری آتی ہے اور آٹا کھا جاتی ہے۔

پھر اُسی دن آنحضرت ﷺ نے مسجد میں ایک تقریر کی اور فرمایا کہ "مجھے میرے اہل کے بارے میں بہت دُکھ دیا گیا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی ہے جو اس کا سدِ باب کر سکے؟ اور خدا کی قسم مجھے تو اپنی بیوی کے متعلق سوائے خیر و نیکی کے اور کوئی علم نہیں ہے۔ اور جس شخص کا اس معاملہ میں نام لیا جاتا ہے اُسے بھی میں اپنے علم میں نیک خیال کرتا ہوں۔ اور وہ کبھی میرے گھر میں میری غیر حاضری میں نہیں آیا۔" آپ کی اس تقریر کو سُنکر سعد بن معاذ رئیس قبیلہ اوس کھڑے ہو گئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں اس کا سدِ باب کرتا ہوں۔ اگر تو یہ شخص ہمارے قبیلہ میں سے ہے تو ہمارے نزدیک وہ واجب القتل ہے۔ ہم ابھی اس کی گردن اُڑا دیتے ہیں اور اگر وہ ہمارے بھائیوں یعنی قبیلہ خزرج میں سے ہے تو پھر بھی جس طرح آپ حکم فرمائیں ہم کرنے کو تیار ہیں۔ اس پر قبیلہ خزرج کے رئیس سعد بن عُبادہ کھڑے ہوتے اور وہ ایک صالح آدمی تھے مگر اُس وقت انہیں جاہلانہ غیرت آگئی۔ اور وہ سعد بن معاذ کو مخاطب ہو کر کہنے لگے "تم نے جھوٹ کہا ہے۔ خدا کی قسم! تم ہرگز ہمارے کسی آدمی کو قتل نہیں کر سکو گے اور نہ تم میں یہ طاقت ہے کہ ایسا کرو۔ اور اگر وہ تمہارے قبیلہ میں سے ہوتا تو تم ایسی بات نہ کہتے۔" اس پر اُسید بن حضیر رئیس اوس جو سعد بن معاذ کے چچا زاد بھائی تھے اُٹھے اور سعد بن عُبادہ سے کہنے لگے کہ "سعد بن معاذ جھوٹا نہیں ہے بلکہ تم جھوٹے ہو اور تم منافق ہو کہ منافقوں کی طرف سے ہو کر لڑتے ہو۔" اِن باتوں سے اوس و خزرج کے بعض لوگوں کو جوش آگیا اور قریب تھا کہ لڑائی ہو جاتی مگر آنحضرت ﷺ نے جو ابھی تک منبر پر ہی تشریف رکھتے تھے سمجھا بجھا کر سب کو ٹھنڈا کیا اور پھر آپ منبر سے اُتر کر گھر تشریف لے گئے۔ اور میرا بدستور وہی حال تھا کہ آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ اور نیند حرام ہو رہی تھی اور برابر دو رات اور ایک دن میرا یہی حال رہا۔ اور میں سمجھتی تھی کہ میرا جگر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا۔

اسی حالت میں میں اپنے والدین کے پاس بیٹھی رو رہی تھی کہ ایک انصاری عورت اجازت لے کر اندر آئی اور میرے پاس بیٹھ کر ہمدردی کے طریق پر وہ بھی رونے لگ گئی۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور یہ پہلا دن تھا کہ آپ اس اتہام کے بعد میرے پاس بیٹھے تھے اور ایک مہینہ ہو گیا تھا کہ میرے متعلق خدائی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بیٹھے ہوئے کلمہ تشہد پڑھا۔ اور خدا کو یاد کیا۔ پھر مجھے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ عائشہ! مجھے تمہارے متعلق اس قسم کی باتیں پہنچی ہیں۔ اگر تو تم بے گناہ ہو تو مجھے اُمید ہے کہ خدا ضرور تمہاری بریت ظاہر فرمائے گا اور اگر تم سے کوئی لغزش ہو گئی ہے تو تمہیں چاہیئے کہ خدا سے مغفرت مانگو اور اس کی طرف جھکو۔ کیونکہ جب بندہ خدا کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوا جُھک جاتا ہے تو خدا اس کی توبہ کو قبول کرتا اور اس پر رحم فرماتا ہے۔ جب رسول اللہ نے یہ تقریر فرمائی تو میں نے دیکھا کہ میرے آنسو بالکل خشک ہو گئے اور

اُن کا نام و نشان تک نہ رہا۔ اس وقت مَیں نے اپنے والد اور والدہ سے کہا کہ آپ رسول اللہ سے اس بات کا جواب عرض کریں۔ انہوں نے کہا "خدا کی قسم ہمیں تو کچھ نہیں سوجھتا کہ ہم کیا جواب دیں"۔ اس وقت مَیں ایک کم عمر لڑکی تھی اور مجھے قرآن بھی زیادہ نہیں آتا تھا مگر والدین کی طرف سے مایوس ہو کر مَیں نے خود آپؐ سے عرض کیا کہ "خدا کی قسم مَیں جانتی ہوں کہ آپ لوگوں کو وہ باتیں پہنچی ہیں جو بعض لوگ میرے متعلق کر رہے ہیں اور آپ کے دل پر ان باتوں کا اثر ہے پس اگر مَیں یہ کہوں کہ مَیں بے گناہ ہوں تو آپ میری بات میں شک کریں گے۔ اور اگر مَیں اپنے آپ کو اس معاملہ میں گناہ گار مان لوں حالانکہ میرا خدا جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ مجھے سچا جانیں گے خدا کی قسم مجھے تو اپنا معاملہ یوسف کے باپ کا سا نظر آتا ہے جس نے یہ کہا تھا کہ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ۔ پس میرے لیے بھی صبر ہی بہتر ہے اور مَیں صرف خدا ہی کی مدد چاہتی ہوں ان باتوں کے متعلق جو یہ لوگ کر رہے ہیں"۔ یہ کہہ کر مَیں اپنی جگہ پر دوسری طرف مُنہ کر کے لیٹ گئی اور اس وقت میرے دل میں یہ یقین تھا کہ مَیں چونکہ بے گناہ ہوں اللہ تعالیٰ ضرور جلد میری بریّت ظاہر فرمائے گا۔ مگر مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ میری بریّت میں کوئی قرآنی وحی نازل ہو گی اور خدا تعالیٰ اپنے صریح کلام میں میرے بے گناہ ہونے کو ظاہر فرمائے گا بلکہ مَیں سمجھتی تھی کہ شائد اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ کو کوئی رؤیا وغیرہ دکھائی جاوے مگر خدا کی قسم آپ ابھی اس مجلس سے اُٹھنے نہیں پائے تھے اور نہ گھر کا کوئی اور شخص اُٹھ کر باہر گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وہ حالت طاری ہو گئی جو وحی کے وقت ہوا کرتی تھی اور باوجود سردی کے آپ کے چہرہ سے پسینہ کے قطرے ٹپکنے لگ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ حالت جاتی رہی اور آپؐ نے تبسم فرماتے ہوئے میری طرف دیکھا اور فرمایا۔ عائشہ! خدا نے تمہاری بریّت ظاہر فرما دی ہے جس پر میری ماں بے اختیار ہو کر بولیں۔ عائشہ! اُٹھو! اور رسول اللہ کا شکریہ ادا کرو"۔ (میرا دل چونکہ اس وقت خدا کے شکر سے لبریز تھا) مَیں نے کہا۔ مَیں کیوں آپ کا شکریہ ادا کروں۔ مَیں تو صرف اپنے رب کی شکر گذار ہوں جس نے میری بریّت ظاہر فرمائی ہے۔ اُس وقت سورۃ نور کی وہ دس آیات نازل ہوئی تھیں جو اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْکِ سے شروع ہوتی ہیں۔

جب میری بریّت ظاہر ہو گئی تو میرے والد ابوبکرؓ نے جو بوجہ غربت اور رشتہ داری کے مسطح بن اثاثہ کی باقاعدہ امداد کیا کرتے تھے قسم کھائی کہ جب مسطح نے عائشہ پر جھوٹا اتہام باندھنے میں حصہ لیا ہے تو مَیں آئندہ اس کی مدد نہیں کروں گا۔ مگر اس پر جلد ہی یہ خدائی وحی نازل ہوئی کہ ایسا کرنا بالکل پسندیدہ نہیں ہے جس پر ابوبکرؓ نے وہ وظیفہ پھر جاری کر دیا بلکہ یہ عہد کیا کہ آئندہ میں کبھی یہ وظیفہ بند نہیں کرونگا۔ نیز جبکہ ابھی تک میری بریّت ظاہر نہیں ہوئی تھی آنحضرت ﷺ نے میرے متعلق زینب بنت جحش کی رائے بھی دریافت کی تھی اور زینبؓ نے یہ جواب دیا تھا کہ "یا رسول اللہ! مَیں تو عائشہ کو ایک نیک اور متقی عورت سمجھتی ہوں"۔ حالانکہ رسول اللہ کی تمام بیویوں میں سے زینبؓ ہی وہ بیوی تھیں جو میرا مقابلہ کرتیں اور مجھ سے رقابت سے پیش

آتی تھیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بوجہ ان کی پرہیزگاری کے اس گناہ کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا۔[1]"

مَیں نے حضرت عائشہ صدیقہ کی یہ طویل روایت اس خیال سے درج کی ہے کہ اوّل تو اس معاملہ میں یہ روایت ساری روایتوں سے مفصل اور مربوط ہے اور جو باتیں دوسرے راویوں کی روایات سے الگ الگ ٹکڑوں کی صورت میں ملتی ہیں وہ اس روایت میں یکجا طور پر جمع ہیں۔ علاوہ ازیں اس روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی پر ایک ایسی بصیرت افزا روشنی پڑتی ہے جسے کوئی مورخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اور صحت کے لحاظ سے بھی یہ روایت ایسے اعلیٰ ترین مقام پر واقع ہوئی ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں سمجھی جاسکتی اب غور کا مقام ہے کہ یہ کس قدر خطرناک فتنہ تھا جو منافقین کی طرف سے کھڑا کیا گیا۔ اس میں صرف ایک پاک دامن اور نہایت درجہ متقی اور پرہیزگار عورت کی عصمت پر ہی حملہ کرنا مقصود نہ تھا بلکہ بڑی غرض بالواسطہ مقدس بانیٔ اسلام کی عزت کو برباد کرنا اور اسلامی سوسائٹی پر ایک خطرناک زلزلہ وارد کرنا تھی۔ اور منافقین نے اس گندے اور کمینے پراپیگنڈا کو اس طرح پر چرچا دیا تھا کہ بعض سادہ لوح مگر سچے مسلمان بھی ان کے دامِ تزویر میں اُلجھ کر ٹھوکر کھا گئے۔ ان لوگوں میں حسان بن ثابت شاعر اور حمنہ بنت جحش ہمشیرہ زینب بنت جحش اور مسطح بن اثاثہ کا نام خاص طور پر مذکور ہوا ہے[2] مگر حضرت عائشہؓ کا یہ کمال اخلاق ہے کہ انہوں نے ان سب کو معاف کردیا اور ان کی طرف سے اپنے دل میں کوئی رنجش نہیں رکھی۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ اس کے بعد جب کبھی حسان بن ثابتؓ حضرت عائشہؓ سے ملنے آتے تھے تو وہ بڑی کشادہ پیشانی سے اُن سے ملتی تھیں۔ ایک دفعہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت ایک مسلمان مسروق نامی بھی وہاں موجود تھے مسروق نے حیران ہو کر کہا کہ "ہیں! آپ حسان کو اپنی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت دیتی ہیں! حضرت عائشہؓ نے جواب دیا "جانے دو بیچارہ آنکھوں کی مصیبت میں مبتلا ہوگیا ہے۔ یہ کیا کم عذاب ہے۔ پھر میں اس بات کو نہیں بھول سکتی کہ حسان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں اور کفّار کے خلاف شعر کہا کرتا تھا۔" چنانچہ حسان کو اجازت دی گئی اور وہ اندر آکر بیٹھ گئے۔ اور حضرت عائشہؓ کی تعریف میں یہ شعر کہا ؎

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيبَةٍ ✤ وَتُصْبِحُ غَرْثَى مِنْ لُحُومِ الْغَوَافِلِ

یعنی "وہ ایک پاکدامن عفیفہ خاتون ہیں اور صاحب عقل ودانش ہیں اور ان کی پوزیشن شک وشبہ کے مقام سے بالا ہے۔ اور وہ غافل بے گناہ عورتوں کا گوشت نہیں کھاتیں یعنی اُن پر اتہام نہیں لگاتیں اور نہ ان کی غیبت فرماتی ہیں۔"

حضرت عائشہؓ نے یہ شعر سُنا تو فرمایا۔ وَلٰكِنْ اَنْتَ۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ لَسْتَ كَذَالِكَ یعنی

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک نیز کتاب التفسیر تفسیر سورۃ نور

[2] بخاری حدیث افک

"تمہارا اپنا کیا حال ہے تم تو اس خوبی کے مالک ثابت نہیں ہوتے" یعنی تم نے تو مجھ بے گناہ کے خلاف الزام لگانے میں شمولیت اختیار کی[1] میور صاحب کی عربی دانی یا تعصب کی مثال ملاحظہ ہو کہ اس شعر کے بالکل غلط اور خلاف قواعد عربی معنی کر کے لکھتے ہیں کہ حسان نے عائشہؓ کے نازک بدن کی تعریف کی تھی جس پر عائشہ نے شوخی کے ساتھ ان کی فربہی پر طعن کیا[2]

برین عقل و دانش بباید گریست!

میور صاحب نے اس قصہ کے بیان کرنے میں اور بھی فاش غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ صفوانؓ اور عائشہؓ راستے میں فوج کو نہ پہنچ سکے اور پھر بعد میں برسرِ منظر عام مدینہ میں داخل ہوئے[3] حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور قطعاً بے بنیاد ہے۔ کیونکہ حدیث و تاریخ سے متفقہ طور پر ثابت ہے کہ صفوان اور حضرت عائشہؓ چند گھنٹے کے بعد راستہ میں ہی اسلامی لشکر میں آملے تھے[4] مگر اس قدر غنیمت ہے کہ اصل اتہام کے متعلق میور صاحب نے حضرت عائشہؓ کی معصومیت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"عائشہؓ کی قبل اور بعد کی زندگی بتاتی ہے کہ وہ اس اتہام سے بری تھیں"[5]

گو عقلی اور نقلی طور پر یہ اتہام بالکل غلط اور جھوٹ قرار پاتا ہے کیونکہ سوائے اس سراسر اتفاقی واقعہ کے کہ حضرت عائشہؓ لشکرِ اسلامی کے پیچھے رہ گئی تھیں اور پھر صفوان کے ساتھ بعد میں پہنچیں اتہام لگانے والوں کے ہاتھ میں قطعاً کوئی بات نہیں تھی یعنی نہ کوئی شہادت تھی اور نہ ہی کوئی اور ثبوت تھا اور ظاہر ہے کہ جب تک کوئی الزام ثابت نہ ہو اسے ہرگز سچا نہیں سمجھا جا سکتا خصوصاً ایسے لوگوں کے متعلق جن کی زندگی ان کی طہارتِ نفس پر شاہد ہو مگر مسلمانوں کے مزید اطمینان کے لیے اور نیز اس غرض سے کہ آئندہ کے لیے ایسے معاملات میں ایک اُصولی قاعدہ مقرر ہو جاوے خدائی وحی نازل ہوئی جس نے نہ صرف اس اتہام کو سراسر جھوٹا قرار دیکر حضرت عائشہؓ اور صفوان بن معطل کی بریت ظاہر فرمائی بلکہ آئندہ کے لیے اس قسم کے واقعات کے متعلق ایک ایسا اُصولی قانون دُنیا کے سامنے پیش فرمایا جس پر افراد کی عزت و آبرو اور سوسائٹی کے امن و امان اور ملت کے اخلاق کی حفاظت کا بڑی حد تک دار و مدار ہے۔ اِس قانون کی بنا۔ ان اصول پر ہے کہ:۔

اوّل ہر انسان کے متعلق اصل قیاس عصمت و عفت کا ہونا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ ہر انسان عفیف سمجھا جانا چاہیئے جب تک اس کی عصمت و عفت کے خلاف کوئی یقینی اور قطعی ثبوت موجود نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ انسان کی عزت و آبرو ایک نہایت ہی قیمتی چیز ہے جس کی حفاظت دُنیا کی تمام دوسری چیزوں سے زیادہ ضروری ہے۔

---

[1] بخاری تفسیر سورۃ نور [2] میور صفحہ ۲۹۴ [3] میور صفحہ ۲۹۰ [4] بخاری حدیث الافک وطبری وابن ہشام

[5] میور صفحہ ۲۹۴

تیسرے یہ کہ فحشاء کا چرچا بدی کے رُعب کو مٹاتا اور سوسائٹی کے اخلاق کو تباہ کر دیتا ہے اس لیے اس کا سدباب ہونا ضروری ہے۔

چوتھے یہ کہ جہاں یہ نہایت ضروری ہے کہ زنا کا مُجرم عبرتناک سزا پاتے وہاں یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ جھوٹا الزام لگانے والا بغیر سخت سزا کے نہ چھوڑا جاوے۔

اِن اصول کے ماتحت قرآن شریف مندرجہ ذیل قانون پیش فرماتا ہے :-

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ --------

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ ۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [1]

"یعنی جو شخص کسی دوسرے پر زنا کا الزام لگاتے اس کا فرض ہے کہ اس الزام کے ثبوت میں کم از کم چار معتبر چشم دید گواہ پیش کرے۔ اگر وہ ایسے گواہ پیش کر دے تو جرم ثابت سمجھا جاوے اور مجرم کو ایک سو دُرّوں کی سزا دی جاوے اور اس سزا میں ہرگز کوئی نرمی اور رعایت نہ کی جاوے اور نیز یہ سزا علی الاعلان پبلک کے سامنے دی جاوے تاکہ دوسروں کے لیے موجب عبرت ہو۔ لیکن اگر الزام لگانے والا اپنے الزام کو مذکورہ بالا طریق پر ثابت نہ کر سکے تو ملزم کو بے گناہ سمجھا جاوے اور الزام لگانے والے کو جھوٹا الزام لگانے کی سزا میں اسّی دُرّوں کی سزا دی جاوے۔ اور آئندہ جب تک ایسے لوگ اپنی اصلاح نہ کریں کسی معاملہ میں اُن کی شہادت قبول نہ کی جاوے۔"

اس آیت کریمہ میں جو سزا زانی کی مقرر کی گئی ہے اس کا استحقاق تو ظاہر ہی ہے اور اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جھوٹا الزام لگانے والے کی سزا کا سوال بعض سادہ مزاج انسانوں کے لیے قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ایسی سخت سزا کیوں تجویز کی گئی ہے۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ دراصل اس معاملہ میں کسی پر جھوٹا اتہام باندھنا ایک نہایت خطرناک اور ضرر رساں فعل ہے کیونکہ اس میں ایک بے گناہ انسان کی سب سے زیادہ قیمتی چیز پر ناجائز اور مفتریانہ حملہ ہونے کے علاوہ سوسائٹی کے اخلاق پر بھی ایک نہایت گندہ اثر پیدا ہوتا ہے اور وہ اس طرح پر کہ جب اس قسم کی باتوں کے متعلق کسی سوسائٹی میں آزادانہ چرچا ہوگا تو

---

[1] سورۃ نور: ۳ تا ۶

لازماً زنا کی بدی کا رُعب طبائع سے کم ہونے لگے گا اور کمزور طبیعتیں گندے خیالات کی طرف مائل ہونے لگیں گی اور ملک اور قوم کی اخلاقی فضا ۔ زہر آلود ہو جائیگی ۔ پس ضروری تھا کہ اس معاملہ میں جھوٹے الزام لگانے والوں کے واسطے سخت سزا تجویز کی جاتی تاکہ سوائے سچے آدمی کے کسی کو اس قسم کے الزام لگانے کی جرأت نہ پیدا ہو اور صرف وہی شخص اتہام لگانے میں آگے آسکے جو واقعی اپنے پاس یقینی ثبوت رکھتا ہو ۔ اور اگر کسی کو یہ شُبہ گذرے کہ اسلام نے اس معاملہ میں ثبوت کے متعلق ناواجب سختی سے کام لیا ہے یعنی چار چشم دید گواہوں کو ضروری قرار دیکر ثبوت کے قیام کو بہت ہی مشکل بنا دیا ہے تو یہ ایک عامیانہ شُبہ ہوگا ۔ جب ہر جرم کے ثبوت کے لیے کوئی نہ کوئی تسلی بخش طریق ثبوت مقرر کیا جانا ضروری ہوتا ہے تو پھر ایک ایسے الزام کے ثبوت کے لیے جس میں انسان کی سب سے زیادہ قیمتی چیز پر حملہ ہو اور جس کے غلط اور جھوٹے استعمال سے سوسائٹی کے امن وامان اور قوم کے اخلاق و عادات پر ایک سخت خطرناک اور گندہ اثر پڑتا ہو ایک نہایت زبردست اور یقینی طریق ثبوت کیوں نہ مقرر کیا جاتا ۔ خصوصاً جبکہ دُنیا بھر میں قانون سازی کا یہ ایک مسلّم اُصول ہے کہ کسی بے گناہ کے مجرم قرار پا جانے سے یہ بہت بہتر ہوتا ہے کہ ایک مجرم بے گناہ سمجھا جاوے ۔

اس جگہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ زنا کے مجرم کے لیے بدنی سزا کیوں تجویز کی گئی ہے ۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں سزاؤں کا فلسفہ اس اُصول پر مبنی ہے کہ جس نوعیت کا جُرم ہو اسی نوعیت کی سزا ہونی چاہیئے تاکہ سزا کی بڑی غرض جو اصلاح ہے پوری ہو سکے ۔ پس چونکہ زنا کا جرم خاص طور پر بدنی شہوات کے غلبہ اور ان کے بے قابو ہو جانے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اس لیے ضروری تھا کہ اس جرم میں بدنی سزا مقرر کی جاتی تاکہ بدنی طاقتوں کو صدمہ پہنچنے سے مجرم کو اپنی اصلاح کی طرف توجہ پیدا ہو اور الزام لگانے والوں کے لیے بدنی سزا اس لیے رکھی گئی ہے کہ جو شخص دوسرے پر زنا کا جھوٹا الزام لگا کر اسے ذلیل کرنا چاہتا ہے اور بدنی سزا دلوانا چاہتا ہے اسے اسی قسم کی سزا دے کر وہ جو ایک بے گناہ کو دلوانا چاہتا تھا ہوش میں لایا جاوے اور نیز تا اس قسم کی سزا دوسروں کے لیے موجبِ عبرت ہو اور ملک و قوم گندے اثرات سے محفوظ رہیں ۔ واللہ اعلم

جویریہ بنت حارث کی شادی

قبیلہ بنو مصطلق کے جو قیدی گرفتار ہوتے تھے اُن میں اس قبیلہ کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی برّہ بھی تھی جو مسافع بن صفوان کے عقد میں تھی جو غزوہ مریسیع میں مارا گیا تھا[1] ان قیدیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب دستور مسلمان سپاہیوں میں تقسیم فرما دیا تھا اور اس تقسیم کی رو سے برّہ بنت حارث ایک انصاری صحابی ثابت بن قیس کی سپردگی میں دی گئی تھی[2] برّہ نے آزادی حاصل کرنے کے لیے ثابت بن قیس کے ساتھ مکاتبت کے طریق پر یہ سمجھوتہ کیا کہ وہ اگر اسے اس قدر رقم فدیہ کے طور پر ادا کر دے تو آزاد سمجھی جاوے ۔ اس سمجھوتہ کے بعد برّہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] اصابہ و زرقانی حالات جویریہ ۔ [2] ابن سعد و ابو داؤد کتاب العتق

خدمت میں حاضر ہوئی اور سارے حالات سُناتے۔ اور یہ جتلا کر کہ مَیں بنو مصطلق کے سردار کی لڑکی ہوں فدیہ کی رقم کی ادائیگی میں آپ کی اعانت چاہی۔ اس کی کہانی سے آنحضرت ﷺ بہت متاثر ہوئے اور غالباً یہ خیال کرکے کہ چونکہ وہ ایک مشہور قبیلہ کے سردار کی لڑکی ہے۔ شاید اس کے تعلق سے اس قبیلہ میں تبلیغی آسانیاں پیدا ہو جائیں آپ نے ارادہ فرمایا کہ اسے آزاد کرکے اس کے ساتھ شادی فرمالیں۔ چنانچہ آپ نے اسے خود اپنی طرف سے پیغام دیا۔ اور اس کی طرف سے رضامندی کا اظہار ہونے پر آپ نے اپنے پاس سے اس کے فدیہ کی رقم ادا فرما کر اس کے ساتھ شادی کرلی[1] صحابہ نے جب یہ دیکھا کہ اُن کے آقا نے بنو مصطلق کی رئیس زادی کو شرف ازدواجی عطا فرمایا ہے تو انہوں نے اس بات کو خلاف شانِ نبوی سمجھا کہ آنحضرت ﷺ کے سسرال والوں کو اپنے ہاتھ میں قید رکھیں۔ اور اس طرح ایک سو گھرانے یعنی سینکڑوں قیدی بلا فدیہ یک لخت آزاد کر دیئے گئے۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہ فرمایا کرتی تھیں کہ جویریہ (آنحضرت صلعم نے برّہ کا نام بدل کر جویریہ کر دیا تھا) اپنی قوم کے لیے نہایت مبارک وجود ثابت ہوئی ہے[2] اس رشتہ اور اس احسان کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنو مصطلق کے لوگ بہت جلد اسلام کی تعلیم سے متاثر ہو کر آنحضرت ﷺ کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے۔

برّہ کا نام بدلنے میں یہ حکمت تھی کہ چونکہ برّہ کے معنی نیکی کے ہیں آنحضرت ﷺ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ کبھی جب برّہ گھر میں نہ ہوں اور کوئی شخص ان کے متعلق یہ دریافت کرے کہ آیا برّہ گھر میں ہیں یا نہیں تو اسے یہ جواب ملے کہ برّہ گھر میں نہیں ہے جس کے بظاہر یہ معنی ہیں کہ گویا نیکی اور برکت گھر سے اُٹھ گئی ہے[3] یہ ایک بہت چھوٹی سی بات ہے مگر اس سے اس محبت پر بہت روشنی پڑتی ہے جو نیکی اور طہارت کیلئے آنحضرت ﷺ اپنے قلب میں رکھتے تھے۔

حضرت جویریہ کی شادی کے متعلق ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ جب ان کے والد انہیں چھڑانے کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ کے فیض صحبت سے مسلمان ہو گئے۔ اور پھر آنحضرت ﷺ کی طرف سے پیغام ملنے پر انہوں نے خود برضاء و رغبت آنحضرت ﷺ کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دی[4] اور ایک روایت میں یہ ہے کہ جویریہ کے والد حارث نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ مَیں سردارِ قوم ہوں میری لڑکی اس طرح قید میں نہیں رکھی جاسکتی۔ آپ نے فرمایا کہ جویریہ سے پوچھا جاوے اگر وہ آزاد ہو کر واپس جانا چاہے تو ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں اور اگر ہمارے پاس ٹھہرنا چاہے تو ہمارے پاس ٹھہرے۔ جویریہ سے پوچھا گیا تو اس نے مسلمان ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کیا جس پر آپ نے اسے آزاد کرکے اس کے

---

[1] ابن ہشام و ابو داؤد کتاب العتق [2] ابن ہشام حالات غزوہ مصطلق و ابو داؤد کتاب العتق و زرقانی جلد ۳ حالات جویریہ

[3] ابن سعد جلد ۸ حالات جویریہ [4] زرقانی جلد ۳ حالات جویریہ نیز ابن ہشام جلد ۳ حالات ازواج

ساتھ شادی فرمالی[1]

عزل یعنی برتھ کنٹرول کی اجازت

اس غزوہ یعنی غزوہ بنو مصطلق میں آنحضرت ﷺ نے بعض صحابہ کے دریافت کرنے پر عزل یعنی برتھ کنٹرول کے متعلق فرمایا کہ میں اسے ناجائز نہیں کہتا یعنی بالفاظ دیگر آپ نے اس بات کو جائز قرار دیا کہ کوئی شخص کسی ضرورت و مصلحت سے کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے کہ اس کی بیوی کو اس کی مجامعت سے حمل نہ ٹھہرے[2]

اِس فتویٰ کی رو سے ایک مسلمان کے لیے جائز ہوگا کہ اپنی بیوی کی صحت و تندرستی یا اولاد کی صحت و تندرستی یا کسی اور جائز مصلحت سے برتھ کنٹرول کے اصول پر عمل پیرا ہو۔ مگر جیسا کہ ایک قرآنی آیت سے استدلال ہوتا ہے اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ غربت اور مالی تنگی کے اندیشہ سے برتھ کنٹرول کا طریق اختیار کیا جاوے[3] اور نہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ بیوی کی رضامندی کے بغیر یہ طریق اختیار کیا جاوے[4] یہ مسئلہ گو اُس زمانہ کے لحاظ سے ایک بالکل غیر اہم سا مسئلہ تھا مگر موجودہ زمانہ میں اس نے خاصی اہمیت اور دلچسپی اختیار کر لی ہے۔

---

[1] اصابہ جلد ۸ حالات جویریہ [2] بخاری حالات غزوہ بنو مصطلق و موطا امام مالک و ترمذی باب ماجاء فی العزل
[3] قرآن مجید سورۃ بنی اسرائیل : ۳۲ [4] ابن ماجہ بحوالہ مشکوۃ کتاب النکاح باب المباشرت فصل ثالث۔

مدینہ کا محاصرہ اور مسلمانوں کی نازک حالت

کفّار کی نامرادی۔ حقیقتِ معجزہ

جنگ احزاب یعنی غزوۂ خندق

شوال ۵ ہجری مطابق فروری و مارچ ۶۲۷ء

اب ہم تاریخ اسلامی کے اس حصہ میں داخل ہوتے ہیں جبکہ اسلام کے خلاف قبائل عرب کی دشمنی نہ صرف انتہاء کو پہنچ گئی بلکہ انہوں نے ایک متحدہ تدبیر کے ماتحت اپنی طاقتوں کو جمع کر کے اسلام کی بیخ کنی کا تہیہ کر لیا۔ مگر قدرتِ الٰہی کا ایسا تصرف ہوا کہ ان کے اس اتحاد میں ہی ناکامی کا تخم پیدا ہو گیا۔ اور ابھی یہ عمارت پوری طرح کھڑی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو کر گرنی شروع ہو گئیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مکہ کے قریش اور نجد کے قبائل غطفان وسلیم گو پہلے سے ہی مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور آئے دن مدینہ کے خلاف حملہ آوری کی فکر میں رہتے تھے مگر ابھی تک انہوں نے اپنی طاقتوں کو اسلام کے خلاف ایک میدان میں مجتمع نہیں کیا تھا۔ لیکن جب یہود کے قبیلہ بنو نضیر کے لوگ اپنی غداری اور فتنہ انگیزی کی وجہ سے مدینہ سے جلاوطن کئے گئے تو ان کے رؤساء نے اس شریفانہ بلکہ محسنانہ سلوک کو فراموش کرتے ہوئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا تھا آپس میں یہ تجویز کی کہ عرب کی تمام منتشر طاقتوں کو ایک جا جمع کر کے اسلام کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کی جاوے[1] اور چونکہ یہودی لوگ بڑے ہوشیار و چالاک تھے اور اس قسم کے سازشی کاموں میں خوب مہارت رکھتے تھے اس لیے ان کی مفسدانہ کوششیں بارآور ہوئیں اور قبائل عرب ایک جان ہو کر مسلمانوں کے خلاف میدان میں نکل آئے۔

یہودی رؤساء میں سے سلام بن ابی الحقیق۔ حیی بن اخطب اور کنانہ بن الربیع نے اس اشتعال انگیزی میں خاص طور پر حصہ لیا[2] چنانچہ ان فتنہ پردازوں نے اپنے نئے وطن خیبر سے نکل کر حجاز اور نجد کے قبائل کا دورہ کیا اور سب سے پہلے مکہ میں پہنچ کر قریش کو اپنے ساتھ گانٹھا[3] اور رؤساء قریش کو خوش کرنے کے لیے اس بات تک کے کہنے سے دریغ نہیں کیا کہ مسلمانوں کے دین سے تمہارا دین (شرک و بُت پرستی) اچھا ہے[4] اس کے بعد انہوں نے نجد میں جا کر قبیلہ غطفان کو اپنے ساتھ ملایا۔[5] اور اس قبیلہ کی شاخہائے

---

[1] ابن سعد ؛ [2] ابن ہشام ؛ [3] ابن ہشام و ابن سعد ؛ [4] ابن ہشام

[5] ابن سعد و ابن ہشام

فزارہ اور مرہ اور اشجع وغیرہ کو اپنے ساتھ نکلنے کے لیے تیار کر لیا[1] پھر قریش اور غطفان کی انگیخت سے قبائل بنو سلیم اور بنو اسد بھی اس مخالفِ اسلام اتحاد کی کڑی میں منسلک ہو گئے[2] اور دوسری طرف یہود نے اپنے حلیف قبیلہ بنو سعد کو پیغام بھیج کر اپنی اعانت کے لیے کھڑا کر لیا[3] اس زبردست اتحاد کے علاوہ قریش نے اپنے گرد و نواح کے قبائل میں سے بھی بہت سے لوگوں کو جو اُن کے توابع میں سے تھے اپنے ساتھ ملا لیا[4] اور پھر پوری تیاری کے بعد صحرائے عرب کے یہ خونخوار قبائل مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کے ارادے سے ایک سیل عظیم کی طرح مدینہ پر اُمڈ آئے۔ اور یہ عزم کیا کہ جب تک اسلام کو صفحۂ دُنیا سے مٹا نہیں لیں گے واپس نہیں لوٹیں گے۔

کفار کے اس عظیم الشان لشکر کا اندازہ دس ہزار نفوس[5] سے لے کر پندرہ ہزار[6] بلکہ بعض روایات کی رُو سے چوبیس ہزار تک لگایا گیا ہے۔ اگر دس ہزار کے اندازے کو ہی صحیح تسلیم کیا جاوے تو پھر بھی اس زمانہ کے لحاظ سے یہ تعداد اتنی بڑی تھی کہ غالباً اِس سے پہلے عرب کے قبائلی جنگوں میں اتنی بڑی تعداد کبھی کسی جنگ میں شامل نہیں ہوئی ہوگی۔ جنگ کی کمان کا انتظام یہ تھا کہ سارے لشکر کا قائد اعظم یعنی سپہ سالار ابوسفیان بن حرب تھا[7] جو سپہ سالار ہونے کے علاوہ اپنے قبیلہ قریش کا امیر العسکر بھی تھا[8] قبائل غطفان کی مجموعی کمان عُیینہ بن حصن فزاری کے ہاتھ میں تھی اور اس کے ماتحت ہر قبیلہ کا الگ الگ کمانڈر تھا۔ بنو سُلیم کا کمانڈر سفیان بن عبد شمس تھا اور بنو اسد اپنے رئیس طلیحہ بن خویلد کی کمان میں تھے[9] سامان خورد و نوش اور سامانِ جنگ بھی ہر طرح کافی و شافی تھا۔ اس طرح یہ لشکر شوال ۵ ہجری مطابق فروری و مارچ ۶۲۷ء میں مدینہ کی طرف بڑھنا شروع ہوا[10]

اتنے بڑے لشکر کی نقل و حرکت کا مخفی رکھنا کفار کے لیے مشکل تھا اور پھر آنحضرت ﷺ کا جاسوسی کا انتظام بھی نہایت پختہ تھا۔ چنانچہ ابھی قریش کا لشکر مکہ سے نکلا ہی تھا کہ آنحضرت ﷺ کو ان کی خبر پہنچ گئی۔ جس پر آپ نے صحابہ کو جمع کر کے اس کے متعلق مشورہ فرمایا۔ اس مشورہ میں ایران کے ایک مخلص صحابی سلمان فارسی بھی شریک تھے جن کے اسلام لانے کا ذکر اوپر گذر چکا ہے چونکہ سلمان فارسی عجمی طریقِ جنگ سے واقف تھے انہوں نے یہ مشورہ پیش کیا کہ مدینہ کے غیر محفوظ حصہ کے سامنے ایک لمبی اور گہری خندق کھود کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا جاوے۔ خندق کا خیال عربوں کے لیے بالکل نیا تھا، لیکن یہ معلوم کر کے کہ یہ طریقِ جنگ دیارِ عجم میں عام طور پر کامیابی کے ساتھ رائج ہے آنحضرت ﷺ نے اس تجویز کو منظور فرمایا[11] اور چونکہ مدینہ کا شہر

---

[1] ابن ہشام ؛ [2] ابن سعد و خمیس ؛ [3] خمیس ؛ [4] ابن سعد ؛ [5] ابن ہشام و ابن سعد ؛ [6] زرقانی
[7] فتح الباری بحوالہ سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۳۸۶ ؛ [8] ابن سعد ؛ [9] ابن ہشام ؛ [10] ابن سعد ؛ [11] ابن ہشام
[12] طبری و ابن سعد و روض الانف۔

تین طرف سے ایک حد تک محفوظ تھا یعنی مکانات کی مسلسل دیواروں اور گھنے درختوں اور چٹانوں کے سلسلے کی وجہ سے یہ اطراف لشکر کفار کے اچانک حملہ سے محفوظ تھیں اور صرف شامی طرف ایسی تھی جہاں دشمن ہجوم کرکے مدینہ پر حملہ آور ہوسکتا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غیر محفوظ طرف میں خندق کے کھودے جانے کا حکم دیا[1] اور آپ نے خود اپنی نگرانی میں موقعہ پر نشان لگاکر تقسیم کار کے اُصول کے ماتحت خندق کو دس دس ہاتھ یعنی پندرہ پندرہ فٹ کے ٹکڑوں میں تقسیم کرکے ہر ٹکڑہ دس دس صحابیوں کے سپرد فرمادیا[2]

ان پارٹیوں کی تقسیم میں یہ خوشگوار اختلاف رونما ہوا کہ سلمان فارسی کس گروہ میں شمار ہوں۔ آیا وہ مہاجر سمجھے جائیں یا بوجہ اس کے کہ وہ اسلام کی آمد سے پہلے ہی مدینہ میں آتے ہوئے تھے انصار میں شمار ہوں بوجہ اس کے کہ سلمان اس طریق جنگ کے محرک تھے اور ویسے بھی ایک مستعد اور باوجود بوڑھے ہونے کے مضبوط آدمی تھے ہر فریق ان کو اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ آخر یہ اختلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور آپ نے فریقین کے دعاوی سُن کر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ سلمان دونوں میں سے نہیں ہے بلکہ سَلْمَانُ مِنَّا اَھْلَ الْبَیْتِ یعنی "سلمان میرے اہل بیت میں شمار کئے جائیں"[3] اس وقت سے سلمان کو یہ شرف حاصل ہوگیا کہ وہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے آدمی سمجھے جانے لگے۔

الغرض خندق کی تجویز پختہ ہونے کے بعد صحابہ کی جماعت مزدوروں کے لباس میں ملبوس ہوکر میدانِ کارزار میں نکل آئی۔ کھدائی کا کام کوئی آسان کام نہیں تھا اور پھر یہ موسم بھی سردی کا تھا جس کی وجہ سے ان ایام میں صحابہ نے سخت تکالیف اُٹھائیں۔ اور چونکہ دوسرے کاروبار بالکل بند ہوگئے تھے اس لیے وہ لوگ جن کا کام روز کی روٹی روز کمانا تھا اور صحابہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی اُن کو تو اُن دنوں میں بھوک اور فاقہ کشی کی مصیبت بھی برداشت کرنی پڑی اور چونکہ صحابہ کے پاس نوکر اور غلام بھی نہ تھے اس لیے سب صحابہ کو خود اپنے ہاتھ سے کام کرنا پڑتا تھا[4]

جو دس دس کی ٹولیاں مقرر ہوئی تھیں انہوں نے اپنے کام کی اندرونی تقسیم اس طرح کی تھی کہ کچھ آدمی کھدائی کرتے تھے اور کچھ کھدی ہوئی مٹی اور پتھروں کو ٹوکریوں میں بھر بھر کر اپنے کندھوں پر لاد کر باہر پھینکتے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بیشتر حصہ اپنے وقت کا خندق کے پاس گذارتے تھے اور بسا اوقات خود بھی صحابہ کے ساتھ ملکر کھدائی اور مٹی کی ڈھلائی کا کام کرتے تھے اور ان کی طبیعتوں میں شگفتگی قائم رکھنے کے لیے بعض اوقات آپ کام کرتے ہوئے شعر پڑھنے لگ جاتے تھے جس پر صحابہ بھی آپ کے ساتھ سُر ملاکر وہی شعر دہراتے تھے۔ چنانچہ روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقعہ پر مندرجہ ذیل شعر پڑھنا خصوصیت کے

---

[1] تاریخ الخمیس و زرقانی [2] بیہقی بحوالہ فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۳۰۵ [3] طبری [4] بخاری حالات غزوہ احزاب

کے ساتھ مذکور ہوا ہے ؎

اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْعَیْشَ عَیْشُ الْاٰخِرَہ   فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُھَاجِرَہ[1]

یعنی "اے ہمارے مولا! اصل زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے پس تو اپنے فضل سے ایسا سامان کر کہ انصار و مہاجرین کو آخرت کی زندگی میں تیری بخشش اور عطا نصیب ہو جاوے۔"

اس شعر کے جواب میں بعض اوقات صحابہ یہ شعر پڑھتے تھے کہ ؎

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا   عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا[2]

یعنی "ہم وہ ہیں کہ ہم نے محمدؐ کے ہاتھ پر یہ عہد کیا ہے کہ ہم ہمیشہ جب تک کہ ہماری جان میں جان ہے خدا کے رستے میں جہاد کرتے رہیں گے۔"

اور کبھی آپ اور صحابہ عبداللہ بن رواحہ انصاری کے یہ اشعار پڑھتے تھے ؎

اَللّٰھُمَّ لَوْلَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا   وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا

فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا   وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَیْنَا

اِنَّ الْاُلٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا   اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَۃً اَبَیْنَا[3]

یعنی "اے ہمارے مولا! اگر تیرا فضل نہ ہوتا تو ہمیں ہدایت نصیب نہ ہوتی اور ہم صدقہ و خیرات کرنے اور تیری عبادت کرنے کے قابل نہ بنتے۔ پس اے خدا! جب تُو نے ہمیں اس حد تک پہنچایا ہے تو اب اس مصیبت کے وقت میں ہمارے دلوں کو سکینت عطا کر۔ اور اگر دشمن سے مقابلہ ہو تو ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ۔ تو جانتا ہے کہ یہ لوگ ہمارے خلاف ظلم اور تعدی کے رنگ میں حملہ آور ہو رہے ہیں اور اُن کی نیت ہمیں اپنے دین سے بے دین کرنا ہے مگر اے ہمارے خدا! تیرے فضل سے ہمارا یہ حال ہے کہ جب وہ ہمیں بے دین کرنے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرتے ہیں تو ہم اُن کی تدبیر کو دُور سے ہی ٹھکرا دیتے ہیں اور ان کے فتنہ میں پڑنے سے انکار کرتے ہیں۔"

آنحضرتؐ جب آخری مصرعہ پر پہنچتے تھے تو اپنی آواز کو بلند فرما دیتے تھے۔ ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں نے آنحضرتؐ کو ایسے وقت میں یہ اشعار پڑھتے ہوئے سُنا کہ آپ کا جسم مبارک مٹی اُٹھانے کی وجہ سے گرد و غبار سے بالکل ڈھکا ہوا تھا۔[4] بھوک اور فاقہ کشی کا یہ عالم تھا کہ اور صحابیوں کا کیا کہنا ہے خود سرورِ کائناتؐ پر کئی کئی وقت کا فاقہ آجاتا تھا اور آپ اس کی تکلیف سے بچنے کیلئے پیٹ پر

---

[1] بخاری حالات غزوۂ خندق   [2] بخاری حالات خندق   [3] بخاری حالات خندق

[4] بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ احزاب و کتاب الجہاد

پتھر باندھے پھرتے تھے۔[1]

اسی تنگی اور شدت کی حالت میں خندق کھودتے کھودتے ایک جگہ سے ایک پتھر نکلا جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہ آتا تھا اور صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ تین دن کے مسلسل فاقہ سے سخت نڈھال ہو رہے تھے۔ آخر تنگ آکر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کیا کہ ایک پتھر ہے جو ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ اس وقت آپ کا بھی یہ حال تھا کہ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا مگر آپؐ فوراً وہاں تشریف لے گئے اور ایک کدال لے کر اللہ کا نام لیتے ہوئے اس پتھر پر ماری۔[2] لوہے کے لگنے سے پتھر میں سے ایک شعلہ نکلا جس پر آپ نے زور کے ساتھ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا۔ اور فرمایا کہ مجھے مملکتِ شام کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ اور خدا کی قسم اس وقت شام کے سُرخ محلات میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اس ضرب سے وہ پتھر کسی قدر شکستہ ہو گیا۔ دوسری دفعہ آپ نے پھر اللہ کا نام لے کر کدال چلائی اور پھر ایک شعلہ نکلا جس پر آپ نے پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا۔ اور فرمایا۔ اِس دفعہ مجھے فارس کی کنجیاں دی گئی ہیں اور مدائن کے سفید محلات مجھے نظر آرہے ہیں۔ اس دفعہ پتھر کسی قدر زیادہ شکستہ ہو گیا۔ تیسری دفعہ آپؐ نے پھر کدال ماری جس کے نتیجہ میں پھر ایک شعلہ نکلا اور آپ نے پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا اور فرمایا۔ اب مجھے یمن کی کنجیاں دی گئی ہیں اور خدا کی قسم صنعاء کے دروازے مجھے اس وقت دکھائے جا رہے ہیں۔ اس دفعہ وہ پتھر بالکل شکستہ ہو کر اپنی جگہ سے گر گیا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقعہ پر بلند آواز سے تکبیر کہی اور پھر بعد میں صحابہ کے دریافت کرنے پر آپ نے یہ کشوف بیان فرمائے[3] اور مسلمان اس عارضی روک کو دُور کر کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ نظارے عالم کشف سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا اس تنگی کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں کی آئندہ فتوحات اور فراخیوں کے مناظر دکھا کر صحابہ میں امید و شگفتگی کی رُوح پیدا فرمائی مگر بظاہر حالات یہ وقت ایسا تنگی اور تکلیف کا وقت تھا کہ منافقین مدینہ نے ان وعدوں کو سُن کر مسلمانوں پر پھبتیاں اُڑائیں کہ گھر سے باہر قدم رکھنے کی طاقت نہیں اور قیصر و کسریٰ کی مملکتوں کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔[4] مگر خدا کے علم میں یہ ساری نعمتیں مسلمانوں کے لیے مقدر ہو چکی تھیں چنانچہ

---

[1] عربوں میں قاعدہ تھا کہ بھوک کی سخت شدت کے وقت جبکہ کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا پیٹ پر حجر یعنی پتھر باندھ لیتے تھے جس سے جسم ضعف کی وجہ سے جُھکنے سے محفوظ رہتا تھا اور غالباً اسی رسم سے اردو میں بھی یہ محاورہ قائم ہو گیا ہے کہ فلاں شخص پیٹ پر پتھر باندھے پھرتا ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ حجر سے مراد کمر کا پٹکا ہو کیونکہ عربی میں حجر کپڑے کو بھی کہتے ہیں دیکھو مجمع البحار۔ واللہ اعلم

[2] بخاری کتاب المغازی حالات غزوۂ خندق ۔ [3] احمد و نسائی و طبرانی و بیہقی بحوالہ فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۳۰۴ و ۳۰۵ و نیز زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰ ۔ [4] ابن ہشام

یہ وعدے اپنے اپنے وقت پر یعنی کچھ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں اور زیادہ تر آپ کے خلفاء کے زمانہ میں پورے ہو کر مسلمانوں کے ازدیادِ ایمان و امتنان کا باعث ہوتے۔

اسی موقعہ پر ایک مخلص صحابی جابر بن عبداللہ نے آپ کے چہرہ پر بھوک کی وجہ سے کمزوری اور نقاہت کے آثار دیکھ کر آپ سے اپنے گھر جانے کی اجازت لی۔ اور گھر آ کر اپنی بیوی سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی شدت کی وجہ سے سخت تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ کیا تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں کچھ جَو کا آٹا ہے اور ایک بکری ہے۔ جابر کہتے ہیں کہ اس پر میں نے بکری کو ذبح کیا اور آٹے کو گوندھا اور پھر اپنی بیوی سے کہا کہ تم کھانا تیار کرو۔ میں رسول اللہ کی خدمت میں جا کر عرض کرتا ہوں کہ تشریف لے آئیں۔ میری بیوی نے کہا۔ دیکھنا مجھے ذلیل نہ کرنا۔ کھانا تھوڑا ہے۔ رسول اللہ کے ساتھ زیادہ لوگ نہ آئیں۔ جابر کہتے ہیں کہ میں گیا اور میں نے آہستگی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس کچھ گوشت اور جَو کا آٹا ہے جن کے پکانے کے لیے میں اپنی بیوی سے کہہ آیا ہوں آپ اپنے چند اصحاب کے ساتھ تشریف لے چلیں اور کھانا تناول فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ کھانا کتنا ہے میں نے عرض کیا کہ اس اس قدر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ بہت ہے۔ پھر آپ نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈال کر بلند آواز سے فرمایا۔ اے انصار و مہاجرین کی جماعت! چلو جابر نے ہماری دعوت کی ہے چل کر کھانا کھالو۔ اس آواز پر کوئی ایک ہزار فاقہ مست صحابی آپ کے ساتھ ہو لئے۔ آپؐ نے جابر سے فرمایا کہ تم جلدی جلدی جاؤ اور اپنی بیوی سے کہہ دو کہ جب تک میں نہ آلوں ہنڈیا کو چولھے پر سے نہ اُتارے، اور نہ ہی روٹیاں پکانا شروع کرے۔ جابر نے جلدی سے جا کر اپنی بیوی کو اطلاع دی اور وہ بیچاری سخت گھبرائی کہ کھانا تو صرف چند آدمیوں کے اندازہ کا ہے اور آرہے ہیں اتنے لوگ! اب کیا ہوگا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پہنچتے ہی بڑے اطمینان کے ساتھ ہنڈیا اور آٹے کے برتن پر دُعا فرمائی اور پھر فرمایا۔ اب روٹیاں پکانا شروع کر دو۔ اس کے بعد آپ نے آہستہ آہستہ کھانا تقسیم کرنا شروع فرما دیا۔ جابر روایت کرتے ہیں کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اسی کھانے میں سب لوگ سیر ہو کر اُٹھ گئے اور ابھی ہماری ہنڈیا اسی طرح اُبل رہی تھی۔ اور آٹا اسی طرح پک رہا تھا۔[1]

معجزہ کی حقیقت

یہ واقعہ بخاری کے علاوہ اور بھی بہت سی کُتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ میں بیان ہوا ہے اور چونکہ اصولِ شہادت و روایت کے لحاظ سے یہ واقعہ بالکل صحیح قرار پاتا ہے اور اس کے تمام راوی ہر طرح قابلِ اعتماد ہیں اور ابتدائی راوی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں اس لیے باوجود اس کے کہ اس روایت میں ایک ایسی بات بیان کی گئی ہے جو عام اور معروف قانونِ قدرت کے خلاف ہے

---

[1] بخاری کتاب المغازی حالات غزوۂ احزاب و فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۳۰۴ تا ۳۰۷

مَیں نے اسے اپنے اس تاریخی بیان میں درج کرنے میں تامل محسوس نہیں کیا۔ دراصل اس قسم کے واقعات کے متعلق عقلاً اور شرعاً اصل قابل تحقیق باتیں چار ہوتی ہیں :۔

اوّل یہ کہ واقعہ کا وقوع معتبر اور چشم دید شہادت سے پوری طرح ثابت ہو یعنی یہ کہ اس کے وقوع کے متعلق اصول شہادت کے لحاظ سے کوئی معقول شبہ نہ کیا جا سکے[1]

دوسرے یہ کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیئے جو خدا تعالیٰ کی کسی بیان کردہ سنت یا اس کے کسی غیر مشروط وعدے یا کسی مسلمہ صفت کے خلاف ہو[2] کیونکہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خدا کی طرف سے ایسے معجزات وخوارق ظاہر ہوں جن کی وجہ سے کسی نہ کسی رنگ میں خود اُسی کی ذات پر اعتراض وارد ہوتا ہو۔

تیسرے یہ کہ اس کی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس میں کسی نہ کسی جہت سے انسانی علم اور انسانی قدرت سے کوئی بالا چیز پائی جاتی ہو تا کہ وہ اس بات کی علامت سمجھی جا سکے کہ اس کا منبع انسانی دل و دماغ نہیں ہے بلکہ کوئی بالا ہستی ہے[3]

چوتھے یہ کہ اس میں ایک حد تک اخفاء کا رنگ بھی پایا جاتا ہو یعنی ایسی صورت نہ ہو جو خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے مرسلین کی صداقت وغیرہ کے متعلق گویا مشاہدہ کا مرتبہ پیدا کردے اور حقیقت ایسی کھل جائے کہ اُس میں امکانی طور پر بھی کسی قسم کے شک پیدا کرنے کی گنجائش نہ رہے جیسا کہ مثلاً سورج کے وجود کے متعلق کسی انسان کے لیے شک کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اگر ایسے معجزات ظاہر ہوں تو اس سے ایمان کی غرض فوت ہو جاتی ہے اور ایمان لانا کارِ ثواب نہیں رہتا[4]

آخر الذکر امر کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ معجزات میں جو اخفاء کا پردہ رکھا جاتا ہے۔ اس کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ یعنی بعض معجزات میں اخفاء کا پردہ زیادہ ہوتا ہے اور بعض میں نسبتاً کم ہوتا ہے اور اس جہت سے معجزات کی قسمیں موٹے طور پر دو سمجھی جا سکتی ہیں۔

اوّل وہ معجزات جو غیر مومنین کی ہدایت اور اُن پر اتمامِ حجت کرنے کیلئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ اُن میں جیسا کہ خدا تعالیٰ کی سنّت سے پتہ لگتا ہے اور عقل بھی یہی چاہتی ہے اِخفاء کا پردہ زیادہ رکھا جاتا ہے۔ یعنی اس قسم کے معجزات میں صرف اس قدر روشنی دکھائی جاتی ہے جو محض ایک دُھندلے طریق پر راستہ دکھا سکے چنانچہ محققین نے لکھا ہے کہ عام طور پر معجزہ کی مثال ایسی ہے جیسے چاندنی رات کی روشنی جس کے کچھ حصہ میں بادل بھی ہو۔ اس قسم کی روشنی پیدا ہونے پر وہ لوگ جن کی آنکھوں میں بینائی کا نور باقی ہوتا ہے راستہ

---

[1] سورۃ حجرات : ۷، سورۃ تحریم : ۴، سورۃ توبہ : ۱۲۰ [2] سورۃ بنی اسرائیل : ۷۸، سورۃ احزاب : ۶۳ سورۃ روم : ۷، سورۃ ھود : ۶۲ تا ۶۶، سورۃ حشر : ۱۹ تا ۲۵، سورۃ اعراف : ۱۸۱ [3] سورۃ لقمان : ۱۲ تا ۱۱، سورۃ شوریٰ : ۲۰ تا ۱۱

[4] سورۃ بقرہ : ۴، سورۃ حدید : ۲۶، سورۃ نساء : ۱۶، سورۃ یونس : ۸۸ تا ۹۱ و ۹۳

دیکھ لیتے ہیں مگر وہ لوگ جن کی آنکھوں میں بینائی کا نور مر چکا ہوتا ہے یا شب کور ہوتے ہیں یا جنہوں نے تعصبات کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھی ہوتی ہے وہ راستہ کی طرف ہدایت نہیں پاتے[1]۔ اس لیے باوجود اس قسم کے معجزات دکھاتے جانے کے سعید اور شقی میں امتیاز قائم رہتا ہے اور ایمان کا ثواب ضائع نہیں جاتا۔ دوم وہ معجزات جو مومنین کے لیے دکھائے جاتے ہیں جو قسم اول کے معجزات سے روشنی پا کر صحیح راستہ اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے طبعاً اخفاء کے پردے کم کر دیئے جاتے ہیں۔ اور لبسا اوقات انہیں ایسے معجزات دکھاتے جاتے ہیں جو حقیقی مشاہدہ کا رنگ تو نہیں رکھتے مگر ان میں اخفاء کا پردہ صورت اول کی نسبت بہت کم ہوتا ہے اور اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ تا یہ لوگ ایمان و عرفان کے اعلیٰ مراتب کی طرف ترقی کر سکیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایمان کی ابتداء غیب سے شروع ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ انسان حسب استعداد صالحیت اور شہیدیت اور صدیقیت اور نبوت کے مراتب کی طرف ترقی کرتا جاتا ہے[2] اور لازماً جوں جوں ایمان کا مرتبہ ترقی کرتا ہے معجزات کی نوعیت بھی ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے اور اخفاء کے پردے کم ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ شہید تو کہتے ہی اُسے ہیں جس کے لیے اخفاء کے پردے کم کر دیئے گئے ہوں۔

اب اگر اس اُصولی قاعدہ کے ماتحت اوپر والے واقعہ کے متعلق غور کیا جاوے تو کوئی حقیقی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ اُصولِ شہادت و روایت کے لحاظ سے اس واقعہ کا وقوع پوری طرح ثابت ہے اور کسی معقول شبہ کی گنجائش نہیں کی جا سکتی بلکہ وہ خدا کی کسی بیان کردہ سنت یا کسی غیر مشروط وعدے یا کسی مسلمہ صفت کے بھی خلاف نہیں ہے اور پھر اگر ایک طرف اُس میں انسانی طاقت سے بالا قدرت کا مظاہرہ پایا جاتا ہے تو دوسری طرف گو اس وجہ سے کہ یہ واقعہ صرف مومنین کے سامنے وقوع میں آیا اور اُنہی کے ایمان کی زیادتی اس کی غرض و غایت تھی اس میں اخفاء کا پردہ کم نظر آتا ہے۔ مگر بہر حال وہ ایسے مشاہدہ کا مرتبہ پیدا نہیں کرتا جس میں امکانی طور پر بھی کوئی جہت تاویل کی باقی نہ رہے اور نصف النہار کے سورج کی طرح حقیقت ظاہر ہو جاوے۔ کیونکہ مثلاً امکانی طور پر ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی مخفی تغیر کے ماتحت انسانی معدہ پر کسی وقت ایسا غیر معمولی تصرف ہو کہ وہ اپنے معمول کی نسبت بہت تھوڑی غذا کھانے سے ہی شکم سیری محسوس کرنے لگے۔ وغیر ذالک۔

اب رہا یہ امر کہ اس حدیث میں ایک ایسی بات بیان کی گئی ہے جو ہمارے عام مشاہدہ اور معروف قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو قانون قدرت کی حد بندی ایک نہایت ہی مشکل چیز ہے بلکہ حقیقتاً ناممکن ہے اور یقینی اور قطعی طور پر یہ قرار دے دینا کہ یہ بات قانونِ قدرت میں

---

[1] براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۴۳ [2] سورۃ فاتحہ: ۶، ۷ و سورۃ نساء: ۷۰

شامل ہے اور یہ بات شامل نہیں ہے ایک بہت ہی بڑا دعویٰ ہے جس کی کوئی عقل مند شخص جرأت نہیں کرسکتا اور حق یہ ہے کہ جب ایک بات عملاً وقوع پذیر ہو جاوے اور سمجھدار اور صادق القول لوگوں کی ایک جماعت اس کی شاہد ہو تو پھر وہی بات قانونِ قدرت کا حصہ سمجھی جانی چاہیئے اور ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ گو عام طور پر قانونِ قدرت اِس اِس رنگ میں ظاہر ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی کسی ایسے مخفی تغیّر کی وجہ سے جسے ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے اس میں اِس اِس رنگ میں استثناء بھی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ معجزات کی بڑی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ تا خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے مرسلین کی صداقت کے متعلق ایسے نشانات قائم کئے جائیں جن سے سعید لوگ حق کی طرف یقینی راہ پانے اور پھر اس راہ پر ترقی کرنے میں آسانی محسوس کریں اور دُنیا کی تاریکیوں میں ان کے لیے روشنی کی چمک پیدا ہو جاوے اس لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی رنگ میں معجزات میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جو انسانی قدرت وعلم سے بالا بھی جاسکے۔ پس جہاں ایک طرف ایمان کی غرض وغایت کا یہ تقاضا ہے کہ کم از کم ابتداء میں مشاہدہ کا رنگ نہ پیدا ہو اور اخفاء کا پردہ قائم رہے وہاں دوسری طرف زندہ ایمان پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اخفاء کے پردوں کو ایک حد تک کم کرکے کبھی کبھی حقیقت کی جھلک بھی دکھادی جاوے اور انہی دو نقطوں کی وسطی حالت کے مظاہرہ کا نام معجزہ ہے جسے اس کی حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی محاورہ میں آیت یعنی نشان اور علامت کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

دراصل خدا کی ہستی ایسی وراء الوراء ہے (اور اپنے مقام کے لحاظ سے وہ وراء الوراء ہی ہونی چاہیئے) کہ اس پر ایمان لانے اور اسے پہچاننے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے محض ذہنی اور قیاسی استدلالات ہرگز انسان کے دل میں وہ یقین پیدا نہیں کرسکتے جو زندہ ایمان کی بنیاد بننے کے لیے ضروری ہے جس کے نتیجہ میں خدا کا وجود ایک محض خیالی فلسفے کا حصہ نہیں رہتا بلکہ اسی طرح محسوس ومشہود ہو جاتا ہے جیسا کہ اس دُنیا کی چیزیں محسوس ومشہود ہیں گو نوعیت میں اس سے بہت مختلف۔ اور انسان خدا کے ساتھ ایک ذاتی تعلق پیدا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جو اس کی زندگی کا مقصدِ اعلیٰ ہے۔ پس ضروری تھا کہ خدا کی طرف سے ایسے سامان مہیا کئے جاتے جو انسان کے دل میں اس قسم کا ایمان پیدا کرسکیں اور انہیں سامانوں کا ایک حصہ آیات ومعجزات وخوارق ہیں جو خدا کے انبیاء وصلحاء کے ذریعہ ہر زمانہ میں ظاہر ہوتے رہے ہیں اور جس کی مثالیں ہر قوم وملت میں پائی جاتی ہیں۔

اس جگہ اگر کسی شخص کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ عام معروف قانونِ قدرت کے خلاف کوئی امر ظاہر ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب یہ ایک امر واقع ہے کہ اس قسم کے امور ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور کثیر التعداد عقلمند معتبر لوگوں کی شہادت اسے سچا ثابت کرتی ہے اور یہ شہادت ہر زمانہ اور ہر قوم میں پائی جاتی ہے تو کوئی عقلمند اس قسم کے واقعات کی سچائی کے متعلق شبہ نہیں کرسکتا۔ علاوہ ازیں

کم ازکم ان لوگوں کیلئے جو فی الجملہ اس دنیا کا کوئی خالق مانتے ہیں اور اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ یہ دنیا خود بخود اپنے آپ سے نہیں ہے بلکہ ایک بالا ہستی کی قدرتِ خلق سے عالم وجود میں آئی ہے۔ اور یہ کہ وہی بالا ہستی اب اس کارخانۂ عالم کو چلا رہی ہے اور تمام خواص الاشیاء اور قوانین قدرت اسی وراء الوراء ہستی کے حکم کے ماتحت جاری ہیں اِس بات کے سمجھنے میں کوئی روک نہیں ہوسکتی کہ وہی بالا و قادر ہستی اپنے عام قانون میں کسی خاص وقت میں کسی خاص مصلحت کے ماتحت کوئی تبدیلی یا استثناء بھی کرسکتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ [1] یعنی "اللہ اپنے حکم پر بھی غالب اور حکمران ہے مگر اکثر لوگ سمجھتے نہیں"۔ یعنی یہ نہ سمجھو کہ ہم نے دُنیا کا قانون بنا دیا تو بس اب ہمارے ہاتھ بندھ گئے بلکہ ہم اپنے قانون پر بھی حکمران اور غالب ہیں اور جب مناسب سمجھیں اس میں تبدیلی یا استثناء کرسکتے ہیں۔ اسی لیے محققین نے لکھا ہے کہ دراصل خدا کی طرف سے دُنیا میں دو تقدیریں جاری ہیں ایک تو یہی عام معروف قانونِ قدرت ہے جسے تقدیرِ عام کہتے ہیں اور جس کے ماتحت یہ کارخانۂ عالم اپنے عام حالات میں جاری نظر آتا ہے۔ دوسرے وہ خاص قانون ہے جو خاص اوقات میں خاص مصالح کے لیے جاری ہوتا ہے جسے تقدیرِ خاص کہتے ہیں جو آیات و معجزات کے طریق پر رونما ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ خدا کا وجود تقدیرِ عام کی نسبت بہت زیادہ روشن صورت میں انسان کے سامنے آجاتا ہے [2]

مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آیات و معجزات کا ظہور صرف تقدیرِ خاص کے ذریعہ سے ہی ہوتا ہے اور تقدیرِ عام کے ذریعہ سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ بسا اوقات آیات کا ظہور اس رنگ میں بھی ہوتا ہے کہ چند تقادیرِ عام غیر معمولی طور پر ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں یا چند تقادیرِ عام ایک غیر معمولی ترتیب کے ساتھ رونما ہوتی ہیں اور اس غیر معمولی اجتماع یا غیر معمولی ترتیب کے نتیجہ میں ایک رنگ آیت و معجزہ کا پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ایک وسیع اور نازک مضمون ہے جس کے تفصیلی بیان کی اس جگہ گنجائش نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیات و معجزات کا سلسلہ برحق ہے اور ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ اور جابر بن عبداللہ کی دعوت کا واقعہ اسی مقدس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور چونکہ یہ معجزہ صرف مومنین کو دکھایا گیا تھا اس لیے سنت اللہ کے ماتحت اس میں اخفاء کا پردہ نسبتاً کم تھا اور آنحضرت ﷺ کی زندگی کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ واقعہ ایک منفرد واقعہ نہیں ہے بلکہ آپ کی زندگی میں اس قسم کے بہت سے واقعات پائے جاتے ہیں جو صحیح روایات سے ثابت ہیں۔ اور انشاء اللہ ان میں سے بعض آگے چل کر اپنے موقعہ پر بیان کئے جائیں گے مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا کہ معجزات کی غرض و غایت سے ظاہر ہے اور جیسا کہ قرآن شریف

---

[1] سورۃ یوسف: ۲۲ [2] تقدیر الٰہی صفحہ ۱۲۴ تا ۱۴۳

کی متعدد آیات سے بھی ثبوت ملتا ہے معجزات میں رسول کی ذات صرف ایک ذریعہ اور واسطہ ہوتی ہے اور اصل متصرف ہستی خدا کی ہوتی ہے یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ ایک رسول جب اور جس طرح چاہے اپنی مرضی سے کوئی معجزہ دکھاوے بلکہ معجزات کا معاملہ صرف خدا کی مرضی اور مصلحت پر موقوف ہوتا ہے۔ وہ جب اور جس طرح چاہتا ہے اپنے کسی رسول کے ذریعہ سے معجزات کا اظہار فرماتا ہے اور گو رسول کی توجہ اور دُعا معجزات کی جاذب اور محرک ضرور ہوتی ہے مگر حکم خدا کی طرف سے آتا ہے اور اس کی مخفی قدرت رسول کے اندر سے ہو کر اپنا کام کرتی ہے۔ اور جب خدا کا حکم نہ ہو تو رسول کی ذاتی طاقت کوئی معجزہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کا حکم تبھی ہوتا ہے جب کوئی حقیقی ضرورت اور حقیقی مصلحت اس کی متقاضی ہوتی ہے۔

اس جگہ یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ چونکہ معجزات کے متعلق عموماً جھوٹی اور بناوٹی روایات یا مبالغہ آمیز باتیں بھی کثرت کے ساتھ مشہور ہو جایا کرتی ہیں۔ اس لیے اس معاملہ میں روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اور صرف ان روایات کو قبول کرنا چاہیئے جو اصولِ روایت و درایت کے مطابق صحیح ثابت ہوں۔ اور ان اُصولی شرائط کے مطابق پوری اتریں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں یعنی اُصولِ شہادت کے لحاظ سے وہ قابلِ اعتماد ہوں وہ خدا کی کسی سنت یا وعدے یا صفت کے خلاف نہ ہوں۔ اُن میں انسانی علم اور انسانی قدرت سے کوئی بالا چیز پائی جاتی ہو۔ اور اُن میں اخفا کا پردہ اس قدر کم نہ ہو کہ جو ایمان بالغیب کے اصول کے خلاف سمجھا جاسکے۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ غلط اور بناوٹی قصّے صحیح تاریخ کا حصہ قرار پاکر حقیقت کو بالکل مستور کر دیں گے اور دنیا میں معجزات و خوارق کا ایک غلط مفہوم قائم ہو جائیگا جو بجائے ہدایت کا باعث ہونے کے ضلالت و گمراہی کا موجب بن جائیگا۔ اس مختصر اور ضمنی نوٹ کے بعد ہم اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

غزوہ خندق کے بقیہ حالات

کم و بیش بیس ایام[1] یا ایک روایت کی رُو سے چھ شبانہ روز[2] کی مسلسل محنت سے یہ طویل خندق تکمیل کو پہنچی۔ اور اس غیر معمولی محنت و مشقت نے صحابہ کو بالکل نڈھال کر دیا۔ مگر ادھر یہ کام اختتام کو پہنچا اور اُدھر یہود اور مشرکینِ عرب کا لاؤ لشکر اپنی تعداد اور طاقت کے نشہ میں مخمور اُفقِ مدینہ میں نمودار ہوگیا۔ سب سے پہلے ابو سفیان نے اُحد کی پہاڑی کی طرف رُخ کیا۔ مگر اس جگہ کو ویران و سنسان پاکر وہ مدینہ کی اس سمت کو بڑھا جو شہر پر حملہ کرنے کے لیے موزوں تھی مگر جس کے سامنے اب خندق کھود دی گئی تھی۔ جب کفار کا لشکر اس جگہ پہنچا تو خندق کو اپنے رستہ میں حائل پاکر سب لوگ حیران و پریشان ہوگئے اور اس بات پر مجبور ہوئے کہ خندق کے پار کھلے

---

[1] موسیٰ بن عقبہ بروایت زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۱۰ [2] ابن سعد

میدان میں ڈیرے ڈال دیں۔ دوسری طرف لشکر کفار کی آمد آمد کی خبر پاکر آنحضرت ﷺ بھی تین ہزار مسلمانوں کو ساتھ لے کر شہر سے نکلے اور خندق کے پاس پہنچکر شہر اور خندق کے درمیان سلع پہاڑی کو اپنے عقب میں رکھتے ہوئے ڈیرے ڈال دیئے[1] اور چونکہ خندق زیادہ فراخ نہیں تھی اور بعض حصے یقیناً ایسے تھے کہ مضبوط اور ہوشیار سوار انہیں پھاند کر شہر کی طرف آسکتے تھے۔ اور پھر مدینہ کے وہ اطراف جہاں خندق نہیں تھی اور صرف مکانات اور باغات اور بے ترتیب چٹانوں کی روک تھی ان کی حفاظت بھی ضروری تھی تاکہ دشمن اس طرف سے مکانوں کو نقصان پہنچا کر یا کسی اور حکمت سے تھوڑے تھوڑے آدمیوں کی لائنوں میں ہوکر شہر پر حملہ آور نہ ہو جاوے اس لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو مختلف دستوں میں منقسم کرکے خندق کے مختلف حصوں پر اور مدینہ کی دوسری اطراف میں مناسب جگہوں پر پہرے کی چوکیاں مقرر فرما دیں اور تاکید فرمائی کہ دن ہو یا رات کسی وقت میں یہ پہرہ سُست یا غافل نہ ہونے پائے[2] دوسری طرف جب کفار نے یہ دیکھا کہ بوجہ خندق کی روک کے کھلے میدان کی باقاعدہ لڑائی یا شہر پر عام دھاوے کا حملہ ناممکن ہوگئے ہیں تو انہوں نے بھی محاصرہ کے رنگ میں مدینہ کا گھیرا ڈال لیا اور خندق کے کمزور حصوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقعہ تلاش کرنے لگ گئے۔

اِس کے علاوہ ابوسفیان نے یہ چال چلی کہ قبیلہ بنو نضیر کے یہودی رئیس حیی بن اخطب کو یہ ہدایت دی کہ وہ رات کی تاریکی کے پردے میں بنو قریظہ کے قلعہ کی طرف جاوے اور ان کے رئیس کعب بن اسد کے ساتھ مل کر بنو قریظہ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے[3]۔ چنانچہ حیی بن اخطب موقعہ لگا کر کعب کے مکان پر پہنچا۔ شروع شروع میں تو کعب نے اس کی بات سُننے سے انکار کیا اور کہا کہ محمد (ﷺ) کے ساتھ ہمارے عہدو پیمان ہیں اور محمد (ﷺ) نے ہمیشہ اپنے عہدو پیمان کو وفاداری کے ساتھ نبھایا ہے اسلئے میں اس سے غداری نہیں کرسکتا۔ مگر حیی نے اسے ایسے سبز باغ دکھائے اور اسلام کی عنقریب تباہی کا ایسا یقین دلایا اور اپنے اس عہد کو جب تک ہم اسلام کو مٹا نہ لیں گے مدینہ سے واپس نہیں جائینگے اس شدومد سے بیان کیا کہ بالآخر وہ راضی ہوگیا[4] اور اس طرح بنو قریظہ کی طاقت کا وزن بھی اس پلڑے کے وزن میں آکر شامل ہوگیا جو پہلے سے ہی بہت جُھکا ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو جب بنو قریظہ کی اس خطرناک غداری کا علم ہوا تو آپ نے پہلے تو دو تین دفعہ خفیہ خفیہ زبیر بن العوام کو دریافت حالات کے لیے بھیجا[5] اور پھر باضابطہ طور پر قبیلہ اوس و خزرج کے رئیس سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ اور بعض دوسرے بااثر صحابہ کو ایک وفد کے طور پر بنو قریظہ کی طرف روانہ فرمایا اور ان کو یہ تاکید فرمائی کہ اگر کوئی تشویشناک خبر ہو تو واپس آکر اس کا برملا اظہار نہ کریں بلکہ اشارہ کنایہ سے کام لیں تاکہ لوگوں میں تشویش نہ پیدا

---

[1] ابن ہشام [2] ابن سعد و زرقانی [3] ابن سعد [4] ابن ہشام [5] بخاری حالات غزوہ خندق نیز زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۱۹

ہو۔ جب یہ لوگ بنو قریظہ کے مساکن میں پہنچے اور ان کے رئیس کعب بن اسد کے پاس گئے تو وہ بدبخت ان کو نہایت مغرورانہ انداز سے ملا۔ اور سعدین کی طرف سے معاہدہ کا ذکر ہونے پر وہ اور اس کے قبیلہ کے لوگ بگڑ کر بولے کہ "جاؤ محمد (ﷺ) اور ہمارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے۔" یہ الفاظ سن کر صحابہ کا یہ وفد وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔ اور سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مناسب طریق پر آنحضرت ﷺ کو حالات سے اطلاع دی[1]۔

اس وقت مدینہ کا مطلع ظاہری اسباب کے لحاظ سے سخت تاریک و تار تھا۔ شہر کے چاروں طرف ہزارہا خونخوار دشمن ڈیرہ ڈالے پڑے تھے جو ہر وقت اس تاک میں تھے کہ کوئی موقعہ ملے تو مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر ان کو ملیامیٹ کر دیں۔ شہر میں مسلمانوں کے پہلو میں غدار بنو قریظہ تھے جن کے سینکڑوں مسلح نوجوان اپنی ذات میں ایک جری لشکر سے کم نہ تھے اور جو جس وقت چاہتے یا موقعہ پاتے عقب کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اور مسلمان خواتین اور بچے جو شہر میں تھے وہ تو گویا ہر وقت ان کا شکار ہی تھے۔ اس صورت حال نے جس کی حقیقت کسی سمجھدار شخص پر مخفی نہیں رہ سکتی تھی کمزور مسلمانوں میں سخت پریشانی اور سراسیمگی پیدا کر دی اور منافق طبع لوگ تو برملا کہنے لگے کہ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا۔[2] یعنی "معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے وعدے مسلمانوں کی فتح و کامرانی کے متعلق یونہی جھوٹے ہی تھے۔" بعض منافقین نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو ہو کر یہ کہنا شروع کیا کہ یا رسول اللہ! شہر میں ہمارے مکانات بالکل غیر محفوظ ہیں آپ اجازت دیں تو ہم اپنے گھروں میں ٹھہر کر اُن کی حفاظت کریں۔ جس کے جواب میں خُدائی وحی نازل ہوئی کہ وَمَا هِیَ بِعَوْرَةٍ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا[3] یعنی "یہ غلط ہے کہ ان لوگوں کو اپنے گھروں کے غیر محفوظ ہونے کا خیال ہے بلکہ بات یہ ہے کہ وہ میدان کارزار سے بھاگنے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔" مگر یہی وقت مخلص مسلمانوں کے ایمان کے اظہار کا تھا۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے۔ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا[4] "جب مومنوں نے کفار کے اس لاؤ لشکر کو دیکھا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو سب کچھ خدا اور اس کے رسول کے وعدوں کے مطابق ہے اور خدا اور رسول ضرور سچے ہیں۔ پس اس حملہ سے بھی ان کے ایمان و تسلیم میں زیادتی ہی ہوئی۔ مگر موقعہ کی نزاکت اور حالات کے خطرناک پہلو کا سب کو یکساں احساس تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ٥ هُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا[5] یعنی یاد کرو

---

[1] ابن ہشام [2] سورۃ احزاب: ۱۳ [3] سورۃ احزاب: ۱۴ [4] سورۃ احزاب: ۲۳ [5] احزاب: ۱۱، ۱۲

جبکہ کفار کا لشکر تمہارے اوپر اور تمہارے نیچے کی طرف سے ہجوم کر کے تم پر آگیا۔ جبکہ گھبراہٹ میں تمہاری آنکھیں پتھرانے لگیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم لوگ (اپنے اپنے رنگ میں یعنی کوئی کسی رنگ میں اور کوئی کسی رنگ میں) خدا کے متعلق مختلف خیالات میں پڑ گئے۔ وہ وقت واقعی مومنوں کے لیے ایک سخت امتحان کا وقت تھا اور مسلمانوں پر ایک نہایت شدید زلزلہ وارد ہوا تھا۔"

ایسے خطرناک وقت میں مسلمانوں کی قلیل جمعیت جن میں بعض کمزور طبیعت لوگ اور بعض منافق بھی شامل تھے کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ ان کے پاس تو اتنے آدمی بھی نہ تھے کہ کمزور مواقع پر خاطر خواہ پہرے کا انتظام کر سکیں۔ چنانچہ دن رات کی سخت ڈیوٹی نے مسلمانوں کو چور کر رکھا تھا۔ دوسری طرف بنو قریظہ کی غداری کی وجہ سے شہر کی گلی کوچوں کے پہرے کو زیادہ مضبوط کرنا بھی ضروری تھا تاکہ مستورات اور بچے محفوظ رہ سکیں۔ کفار کے سپاہی مسلمانوں کو ہر رنگ میں پریشان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی وہ کسی کمزور جگہ پر یورش کر کے جمع ہو جاتے اور مسلمان اس کی حفاظت کے لیے وہاں اکٹھے ہونے لگتے جس پر وہ فوراً رُخ پلٹ کر کسی دوسرے موقعہ پر زور ڈال دیتے اور مسلمان بیچارے بھاگتے ہوئے وہاں پہنچتے کبھی وہ ایک ہی وقت میں دو دو تین تین جگہوں پر دھاوا کر کے پہنچتے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی جمعیت منتشر ہو کر ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی اور بعض اوقات حالات بہت نازک صورت اختیار کر لیتے۔ اور قریب ہوتا کہ کسی کمزور موقعے سے فائدہ اُٹھا کر لشکرِ کفار حدودِ شہر کے اندر داخل ہو جاوے۔ ان دھاووں کا مقابلہ مسلمانوں کی طرف سے عموماً تیروں کے ذریعہ کیا جاتا تھا مگر بعض اوقات کفار کے سپاہی یہ طریق اختیار کرتے کہ ایک دستہ تو مسلمانوں پر تیروں کی باڑ مار مار کر انہیں پیچھے رکھتا اور دوسرا دستہ یورش کر کے خندق کے کسی کمزور حصہ پر دھاوا کر کے آجاتا اور اسے کود کر عبور کرنا چاہتا۔[1] یہ طریق جنگ صبح سے لیکر شام تک بلکہ بعض اوقات رات کے حصوں میں بھی جاری رہتا تھا۔ چنانچہ سر ولیم میور اس جنگ کے دو دن کے واقعات کو مندرجہ ذیل الفاظ میں سپردِ قلم کرتے ہیں:-

"مسلمانوں کے پہرے کی ہوشیاری اتحادیوں کی فوج کے حملوں کو روکے ہوتے تھی۔۔۔۔ اتحادی فوج نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو خندق پر دھاوا کر کے اسے عبور کر جائیں اور اس غرض سے انہوں نے خندق کے ایک کمزور اور تنگ حصہ کو منتخب کر کے اس پر ایک عام دھاوا کر دیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض جانباز سپاہی عکرمہ بن ابوجہل کی کمان کے ماتحت اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگاتے ہوتے خندق کے اس حصہ پر یورش کر کے آتے اور اپنے تیز گھوڑوں کو اُڑاتے ہوتے خندق کے اوپر سے کود کر مسلمانوں کے سامنے آگئے۔ ادھر سے علیؓ اپنے ایک دستہ کو

---

[1] ابن سعد و خمیس و زرقانی

ساتھ دے کر ان کی طرف لپکے اور اس پارٹی نے بڑی ہوشیاری سے عکرمہ کے دستے کا چکر کاٹ کر ان کے پیچھے ہٹنے کا راستہ بند کر دیا۔ اس موقعہ پر عکرمہ کا ایک جہاں دیدہ سپاہی عمرو بن عبدوُدّ اپنی پارٹی سے آگے نکل کر انفرادی جنگ کا طالب ہوا۔ حضرت علیؓ فوراً اس کے مقابلہ میں نکلے اور تھوڑی دیر کے لئے یہ دونوں جنگجو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ پھر عمرو اپنے گھوڑے سے اُترا اور اس کی کونچیں کاٹ کر اسے نیچے گرا دیا اور اس عزم کے ساتھ علیؓ کی طرف بڑھا کہ یا تو فتح پاتے گا یا مارا جاتے گا۔ پھر دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اور ان کے قدموں کی گرد نے ان کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا، لیکن ابھی زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ اس گرد کے بادل میں سے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کی گرج نکلی اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ علیؓ نے عمرو کو مار لیا ہے۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کی توجہ کو دوسری طرف مصروف پا کر عکرمہ اور اس کے ساتھی اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر پھر دوسرے پار کود گئے۔ سوائے نوفل کے جو کودنے کی کوشش میں گر گیا اور زبیر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ قریش نے عمرو کی لاش[1] حاصل کرنے کے لیے بہت سا روپیہ مسلمانوں کو دینا چاہا۔ مگر آنحضرت ﷺ نے نفرت کے ساتھ اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔ اور عمرو کی لاش اتحادیوں کے یونہی مفت حوالہ کر دی۔"

"اس دن اس کے سوا اور کوئی کارروائی نہیں ہوئی لیکن یہ رات بڑی تیاریوں میں گذری اور دوسرے دن صبح کو محمد (ﷺ) نے تمام اتحادی لشکر کو اپنے سامنے صف آرا پایا اتحادیوں کے ہوشیاری کے حملوں سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو ہر وقت چوکس رہنا پڑتا تھا کسی وقت تو وہ ایک عام دھاوے کی صورت بنا کر حملہ آور ہونے لگتے۔ اور کسی وقت مختلف دستوں میں تقسیم ہو کر ایک ہی وقت میں مختلف موقعوں پر زور ڈال دیتے اور پھر ایک جگہ سے ہٹ کر یکلخت دوسری جگہ پر جا کودتے اور بالآخر اپنی تمام طاقت کو جمع کر کے کمزور ترین مقام پر حملہ آور ہو جاتے اور تیروں کی خطرناک بوچھاڑ کی آڑ میں خندق کو عبور کرنے کی کوشش کرتے۔ کئی دفعہ خالد بن ولید اور عمرو بن العاص جیسے نامور لیڈروں نے شہر پر حملہ آور ہونے کے لیے اسی طرح زور شور سے دھاوا کیا۔ اور ایک دفعہ تو خود محمد (ﷺ) کا خیمہ بھی خطرہ کی حالت میں ہو گیا تھا لیکن مسلمانوں کے بہادرانہ مقابلہ اور تیروں کی بارش نے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔ یہ حالت سارا

---

[1] یہ روایت درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ واقعہ نوفل بن عبداللہ کی لاش کے متعلق گذرا تھا جو آنحضرت ﷺ کے قتل کیلئے آگے بڑھا تھا مگر زبیر بن العوام کے ہاتھ سے خود قتل ہو کر گرا۔ کفار نے اس کی لاش کے معاوضہ میں دس ہزار درہم مسلمانوں کو دینا چاہے مگر آنحضرت ﷺ نے روپیہ لینے سے انکار فرما دیا اور لاش یونہی واپس فرما دی۔ دیکھو زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۱۴۔

دن جاری رہی اور چونکہ محمد (ﷺ) کی فوج تعداد میں ایسی قلیل تھی کہ شہر کی حفاظت کے واسطے بمشکل کافی ہوسکتی تھی اس لیے مسلمانوں کو یہ سارا دن مسلسل طور پر مصروف رہنا پڑا۔ بلکہ رات پڑنے پر بھی خالد کے دستے نے اس خطرہ کو جاری رکھا اور مسلمان اپنی ڈیوٹی سے فارغ نہیں ہوسکے، لیکن دشمن کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ یعنی وہ اس بات پر قادر نہیں ہوسکا کہ کسی بڑی تعداد میں خندق کو عبور کرسکے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے پانچ آدمی مارے گئے اور اسی دن سعد بن معاذ رئیس قبیلہ اوس کو بھی ابن العرقہ کے تیر نے مہلک طور پر کلائی میں زخمی کیا۔۔۔۔۔ اس کے مقابلہ میں اتحادیوں کے صرف تین آدمی قتل ہوئے۔ اس دن کے مقابلہ کی سختی اور مسلسل مصروفیت کی وجہ سے مسلمان اپنی نمازیں بھی وقت پر ادا نہیں کرسکے۔ چنانچہ جب رات کا ایک حصہ گذر چکا اور دشمن کا بیشتر حصہ آرام کرنے کے لیے اپنے کیمپ کی طرف لوٹ گیا۔ اُس وقت مسلمانوں نے جمع ہوکر سارے دن کی نمازیں اکٹھی ادا کیں۔ اور اس وقت محمد (ﷺ) نے کفّار پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ہمیں نمازوں سے روکا ہے خدا ان کے پیٹوں اور ان کی قبروں کو جہنم کی آگ سے بھرے[1]"

میور صاحب کے اس دلچسپ نوٹ میں جو یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اُس دن مسلمانوں کی ساری نمازیں وقت پر ادا نہیں ہوسکیں یہ درست نہیں ہے بلکہ جیسا کہ صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے بات صرف یہ ہوئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک صلوٰۃِ خوف شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے بوجہ مسلسل خطرے اور مصروفیت کے صرف ایک نماز یعنی عصر بے وقت ہوگئی تھی جو مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھی گئی[2] اور بعض روایات کی رُو سے صرف ظہر و عصر کی نماز بے وقت ادا ہوئی تھی[3]

علاوہ ازیں حضرت علیؓ اور عمرو بن عبدِ وُدّ کے مقابلہ کے متعلق میور صاحب کا بیان بہت مختصر ہے تاریخ میں یہ لڑائی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور اس کے بعض حصے نہایت دلچسپ ہیں۔ دراصل عمرو ایک نہایت نامور شمشیر زن تھا اور اپنی بہادری کی وجہ سے اکیلا ہی ایک ہزار سپاہی کے برابر سمجھا جاتا تھا[4] اور چونکہ وہ بدر کے موقعہ پر خائب و خاسر ہوکر واپس گیا تھا۔ اس لیے اس کا سینہ مسلمانوں کے خلاف بغض و انتقام کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے میدان میں آتے ہی نہایت مغرورانہ لہجے میں مبارز طلبی کی[5] بعض صحابہ اس کے مقابلہ سے کتراتے تھے مگر آنحضرت ﷺ کی اجازت سے حضرت علیؓ اس کے مقابلہ کے لیے آگے نکلے[6]

---

[1] لائف آف محمدؐ مصنفہ سر ولیم میور صفحہ ۳۰۰ و ۳۰۱ [2] صحیح بخاری حالات غزوہ خندق و نیز مسلم و ترمذی و ابوداؤد و نسائی بحوالہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۲۲ و ۱۲۳ [3] مؤطا و احمد و نسائی بحوالہ زرقانی [4] خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۴۷

[5] ابن ہشام [6] خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۴۸

اور آنحضرت صلعم نے اپنی تلوار ان کو عنایت فرمائی اور ان کے واسطے دُعا کی [1]

حضرت علیؓ نے آگے بڑھ کر عمرو سے کہا۔ مَیں نے سُنا ہے کہ تم نے یہ عہد کیا ہوا ہے کہ اگر قریش میں سے کوئی شخص تم سے دو باتوں کی درخواست کریگا تو تم اُن میں سے ایک بات ضرور مان لوگے۔ عمرو نے کہا۔ ہاں۔ حضرت علی نے کہا "تو پھر مَیں پہلی بات تم سے یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ہوجاؤ۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مان کر خُدائی انعامات کے وارث بنو۔" عمرو نے کہا یہ نہیں ہوسکتا۔ حضرت علی نے کہا۔ اگر یہ بات منظور نہیں ہے تو پھر آؤ۔ میرے ساتھ لڑنے کو تیار ہوجاؤ۔ اس پر عمرو ہنسنے لگ گیا۔ اور کہنے لگا۔ مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی شخص مجھ سے یہ الفاظ کہہ سکتا ہے [2] پھر اس نے حضرت علی کا نام ونسب پوچھا اور ان کے بتانے پر کہنے لگا۔ "بھتیجے! تم ابھی بچے ہو۔ مَیں تمہارا خون نہیں گرانا چاہتا اپنے بڑوں میں سے کسی کو بھیجو [3]۔ حضرت علی نے کہا تم میرا خون نہیں گرانا چاہتے مگر مجھے تمہارا خون گرانے میں تامل نہیں ہے [4]۔ اس پر عمرو جوش میں اندھا ہوکر اپنے گھوڑے سے کُود پڑا اور اس کی کونچیں کاٹ کر اسے نیچے گرا دیا۔ اور پھر ایک آگ کے شعلہ کی طرح دیوانہ وار حضرت علی کی طرف بڑھا اور اس زور سے حضرت علی پر تلوار چلائی کہ وہ ان کی ڈھال کو قلم کرتی ہوئی ان کی پیشانی پر لگی۔ اور انہیں کسی قدر زخمی کیا مگر ساتھ ہی حضرت علی نے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کا نعرہ لگاتے ہوئے ایسا وار کیا کہ وہ اپنے آپ کو بچا نہ سکا اور حضرت علی کی تلوار اُسے شانے پر سے کاٹتی ہوئی نیچے اُتر گئی اور عمرو تڑپتا ہوا گرا اور جان دے دی [5]

لیکن اس جزوی اور وقتی غلبہ کا عام لڑائی پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اور یہ دن مسلمانوں کے لیے نہایت تکلیف اور پریشانی اور خطرے کے دن تھے اور جُوں جُوں یہ محاصرہ لمبا ہوتا جاتا تھا مسلمانوں کی طاقت مقابلہ لازماً کمزور ہوتی جاتی تھی اور گو ان کے دل ایمان واخلاص سے پُر تھے مگر جسم جو مادی قانون اسباب کے ماتحت چلتا ہے مضمحل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حالات کو دیکھا تو آپؐ نے انصار کے رؤساء سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کو بُلا کر انہیں سارے حالات جتلائے اور مشورہ مانگا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور ساتھ ہی اپنی طرف سے یہ ذکر فرمایا کہ اگر تم لوگ چاہو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قبیلہ غطفان کو مدینہ کے محاصل میں سے کچھ حصّہ دینا کرکے اس جنگ کو ٹال دیا جاوے۔ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ نے یک زبان ہوکر عرض کیا کہ "یارسول اللہ! اگر آپ کو اس بارہ میں کوئی خدائی وحی ہوئی ہے تو سرِ تسلیم خم ہے اس صورت میں آپ بے شک خوشی سے اس تجویز کے مطابق کارروائی فرمائیں۔" آپ نے فرمایا۔ "نہیں نہیں مجھے اس معاملہ میں وحی کوئی نہیں ہوئی مَیں تو صرف آپ لوگوں کی تکلیف کی وجہ سے

---

[1] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۴۹ [2] ابن ہشام [3] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۱۴ [4] خمیس جلد ا صفحہ ۵۴۷ و زرقانی [5] ابن ہشام
[6] خمیس و زرقانی و ابن ہشام

مشورہ کے طریق پر پوچھتا ہوں۔" سعدین نے جواب دیا کہ "پھر ہمارا یہ مشورہ ہے کہ جب ہم نے شرک کی حالت میں کبھی کسی دشمن کو کچھ نہیں دیا تو اب مسلمان ہو کر کیوں دیں۔ واللہ ہم انہیں تلوار کی دھار کے سوا کچھ نہیں دینگے۔"[1] چونکہ آنحضرت ﷺ کو انصار ہی کی وجہ سے فکر تھا جو مدینہ کے اصل باشندہ تھے اور غالباً اس مشورہ میں آپ کا مقصد بھی صرف یہی تھا کہ انصار کی ذہنی کیفیت کا پتہ لگائیں کہ کیا وہ ان مصائب میں پریشان تو نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پریشان ہوں تو ان کی دلجوئی فرمائیں۔ اس لیے آپ نے پوری خوشی کے ساتھ ان کے اس مشورہ کو قبول فرمایا۔ اور جنگ جاری رہی۔

جنگ کے دوران میں مسلسل مصروفیت اور پریشانی کی وجہ سے صحابہ اور آنحضرت ﷺ کو کئی کئی وقت کا فاقہ بھی ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دن بعض صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے فاقہ کشی کی شکایت کی اور عرض کیا کہ ہم کئی دن سے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھے پھرتے ہیں۔ اس پر آپ نے اپنے شکم مبارک پر سے کپڑا ہٹا کر دکھایا تو دو پتھر باندھے ہوتے تھے۔[2] ان فاقہ کشیوں کے ساتھ جنگ کے دوسرے مصائب نے مل کر مسلمانوں کے لیے نہایت تکلیف دہ حالات پیدا کر رکھے تھے اور ہر وقت کے خطرے کے اندیشے کی وجہ سے جو اثر ان کے دل و دماغ اور اعصاب پر پڑتا تھا وہ مزید براں تھا۔ اور طبعاً اس مصیبت کا سب سے زیادہ بوجھ آنحضرت ﷺ پر تھا۔ چنانچہ اُم سلمہ روایت کرتی ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ بہت سے غزوات میں رہی ہوں، لیکن آنحضرت ﷺ کے لیے جس قدر سخت غزوہ خندق تھا ایسا کوئی اور غزوہ نہیں گذرا۔ اس غزوہ میں آپ کو بے انتہا تکلیف اور پریشانی برداشت کرنی پڑی اور صحابہ کی جماعت کو بھی سخت مصائب کا سامنا ہوا۔ اور یہ دن بھی سخت سردی اور مالی تنگی کے دن تھے۔[3]

دوسری طرف شہر میں مستورات اور بچوں کا یہ حال تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو عموماً شہر کے ایک خاص حصہ میں جو ایک گونہ قلعہ کا رنگ رکھتا تھا جمع کروا دیا[4] مگر ان کی خاطر خواہ حفاظت کے لیے کافی مسلمان فارغ نہیں کئے جا سکتے تھے اور خصوصاً ایسے اوقات میں جبکہ میدانِ جنگ میں دشمن کے حملوں کا زیادہ زور ہوتا تھا مسلمان خواتین اور بچے قریباً بالکل غیر محفوظ حالت میں رہ جاتے تھے اور ان کی حفاظت کے لیے صرف ایسے مرد رہ جاتے تھے جو کسی وجہ سے میدانِ جنگ کے قابل نہ ہوں۔ چنانچہ کسی ایسے ہی موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر یہودیوں نے شہر کے اس حصہ پر حملہ آور ہو جانے کی تجویز کی جس میں مستورات اور بچے جمع تھے اور جاسوسی کی غرض سے انہوں نے اپنا ایک آدمی اپنے آگے آگے اس محلہ میں بھیجا۔ اس وقت اتفاق سے عورتوں کے قریب صرف ایک صحابی حسان بن ثابت شاعر موجود تھے جو[5] دل کی غیر معمولی کمزوری

---

[1] ابن ہشام و ابن سعد و زرقانی [2] ترمذی ابواب الزہد [3] تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۴۶

[4] ابن ہشام و ابن سعد و خمیس [5] خمیس و ابن ہشام

کی وجہ سے میدانِ جنگ میں جانے کے قابل نہیں تھے۔ عورتوں نے جب اس دشمن یہودی کو ایسے مشتبہ حالات میں اپنے جاتے قیام کے آس پاس چکر لگاتے دیکھا تو صفیہ بنت عبد المطلب نے جو آنحضرت ﷺ کی پھوپھی تھیں۔ حسان سے کہا کہ یہ شخص معاند یہودی ہے اور یہاں جاسوسی اور شرارت کے لیے چکر لگا رہا ہے اسے قتل کر دو تاکہ واپس جا کر وہ کسی فتنہ کا موجب نہ بنے۔ مگر حسان کو اس کی ہمت نہ ہوئی جس پر حضرت صفیہ نے خود آگے نکل کر اس یہودی کا مقابلہ کیا اور اسے مار کر گرا دیا[1] اور پھر انہی کی تجویز سے یہ قرار پایا کہ اس یہودی جاسوس کا سر کاٹ کر قلعہ کی اس سمت میں گرا دیا جاوے جہاں یہودی جمع تھے تاکہ یہودیوں کو مسلمان عورتوں پر حملہ آور ہونے کی ہمت نہ پڑے اور وہ یہ سمجھیں کہ ان کی حفاظت کے لیے اس جگہ کافی مرد موجود ہیں۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور اس موقعہ پر یہودی لوگ مرعوب ہو کر واپس چلے گئے[2]

یہ وقت مسلمانوں پر ایک سخت مصیبت کا وقت تھا۔ چنانچہ اس مصیبت کی سختی سے گھبرا کر چند صحابہؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جو صورتِ حال ہے وہ آپ پر عیاں ہے ہمارا تو کلیجہ مُنہ کو آ رہا ہے۔ آپ خدا سے خاص طور پر دُعا فرمائیں کہ وہ اس مصیبت کو دُور فرماتے اور ہمیں بھی کوئی دُعا سکھائیں جو ہم اس موقعہ پر خدا سے مانگیں۔ آپ نے انہیں تسلّی دی اور فرمایا کہ تم خدا سے یہ دُعا کیا کرو کہ وہ تمہاری کمزوریوں پر پردہ ڈالے۔ اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور تمہاری گھبراہٹ کو دُور فرمائے[3] اور پھر آپ نے خود یہ دُعا فرمائی کہ اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتٰبِ سَرِیْعَ الْحِسَابِ اِھْزِمِ الْاَحْزَابَ اَللّٰھُمَّ اھْزِمْھُمْ وَانْصُرْنَا عَلَیْھِمْ وَزَلْزِلْھُمْ[4] اور ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ آپ نے یہ دُعا فرمائی کہ یَا صَرِیْخَ الْمَکْرُوْبِیْنَ یَا مُجِیْبَ الْمُضْطَرِّیْنَ اِکْشِفْ ھَمِّیْ وَغَمِّیْ وَکَرْبِیْ فَاِنَّکَ تَرٰی مَا نَزَلَ بِیْ وَبِاَصْحَابِیْ[5] یعنی "اے دُنیا میں اپنے احکام کو جاری کرنے والے خدا! اور اے حساب لینے میں دیر نہ کرنے والے! تو اپنے فضل سے کفّار کے ان احزاب کو پسپا فرما۔ اے میرے قادر! تو ضرور ایسا ہی کر اور کفّار کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما اور ان کی طاقت پر زلزلہ وارد کر۔ اے تکلیف میں مبتلا لوگوں کی آہ و پکار کو سُننے والے! اے مضطر لوگوں کی دُعاؤں کو قبول کرنے والے! تو ہمارے غم اور فکر اور بے چینی کو دُور فرما کیونکہ جو مجھ پر اور میرے اصحاب پر اس وقت مصیبت وارد ہے وہ تیرے سامنے ہے۔"

حسنِ اتفاق سے اسی وقت یا اس کے قریب قریب ایک شخص نعیم بن مسعود جو قبائل غطفان کی

---

[1] ابن ہشام [2] الخمیس جلد ا صفحہ ۵۵۰ [3] مسند احمد بحوالہ زرقانی [4] بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ خندق [5] زرقانی

شاخ قبیلہ اشجع سے تعلق رکھتا تھا جو اس جنگ میں مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے تھے مدینہ میں پہنچ گیا۔ یہ شخص دل میں مسلمان ہو چکا تھا مگر ابھی تک کفار کو اس کے مسلمان ہونے کی اطلاع نہیں تھی۔ اس حالت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس نے کمال ہوشیاری سے ایسی تدبیر اختیار کی جس سے کفار میں پھوٹ پیدا ہو گئی [1]

سب سے پہلے نعیم بن مسعود قبیلہ بنو قریظہ کے پاس گیا۔ اور چونکہ ان کے ساتھ اس کے پُرانے تعلقات تھے وہ ان کے رؤساء سے مل کر کہنے لگا کہ میرے خیال میں تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدعہدی کر کے قریش و غطفان کے ساتھ مل گئے ہو۔ قریش و غطفان تو یہاں مدینہ میں صرف چند دن کے مہمان ہیں۔ مگر تم لوگوں نے بہر حال یہاں رہنا ہے کیونکہ تمہارا یہ وطن ہے اور یہاں مسلمانوں کے ساتھ ہی تمہارا واسطہ پڑنا ہے۔ اور تم یہ یاد رکھو کہ قریش وغیرہ یہاں سے جاتے ہوتے تمہارا کوئی خیال نہیں کریں گے اور تمہیں یونہی مسلمانوں کے رحم پر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ پس تم کم از کم ایسا کرو کہ قریش و غطفان سے کہو کہ بطور یرغمال کے اپنے کچھ آدمی تمہارے حوالے کر دیں تاکہ تمہیں اطمینان رہے کہ تمہارے ساتھ کوئی غداری نہیں ہو گی۔ رؤساء بنو قریظہ کو نعیم کی یہ بات سمجھ آ گئی اور وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ قریش سے یرغمالوں کا مطالبہ کریں تاکہ بعد میں انہیں کسی مصیبت کا سامنا نہ ہو۔ اس کے بعد نعیم بن مسعود قریش کے رؤساء کی طرف گیا اور جا کر کہنے لگا کہ بنو قریظہ خائف ہیں کہ کہیں تمہارے چلے جانے کے بعد انہیں کسی مصیبت کا سامنا نہ ہو اس لیے وہ تمہارے اس اتحاد میں متزلزل ہو رہے ہیں اور یہ ارادہ کر رہے ہیں کہ بطور ضمانت کے تم سے چند یرغمالوں کا مطالبہ کریں۔ مگر تم ان کو ہرگز یرغمال نہ دینا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے غداری کر کے تمہارے یرغمال مسلمانوں کے حوالہ کر دیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح اس نے اپنے قبیلہ غطفان کے پاس جا کر اسی قسم کی باتیں کہیں [2] اب خدا کی طرف سے اتفاق ایسا ہوا کہ قریش و غطفان پہلے سے ہی یہ تجویز کر رہے تھے کہ مسلمانوں پر پھر ایک متحدہ حملہ کیا جاوے اور یہ حملہ شہر کے چاروں اطراف میں ایک ہی وقت میں

---

[1] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۴۹ و ۵۳۔ اس موقعہ پر ابن ہشام نے یہ روایت کی ہے کہ نعیم بن مسعود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور پھر خود آپ نے اسے اس ڈیوٹی پر لگایا تھا کہ کسی طرح حُسنِ تدبیر سے کفار کو واپس لوٹا دے۔ اگر ایسا ہوا ہو تو اُصولاً یہ قابل اعتراض نہیں ہے۔ مگر اصول روایت کی رو سے یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اوّل تو ابن ہشام نے اس واقعہ کو بغیر سند کے بیان کیا ہے مگر اس کے مقابلہ میں ابن سعد نے اپنی روایت کی سند دی ہے (دیکھو ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۵۳) علاوہ ازیں ابن ہشام والی روایت کو جسے محدث شیرازی نے القاب میں نقل کیا ہے محققین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (دیکھو الجامع الصغیر للسیوطی جلد ۲ صفحہ ۲) پس صحیح واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ نعیم نے بطور خود یہ تدبیر کی تھی۔ واللہ اعلم

[2] ابن ہشام

کیا جاوے تاکہ مسلمان اپنی قلتِ تعداد کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہ کر سکیں اور کسی نہ کسی جگہ سے ان کی لائن ٹوٹ کر حملہ آوروں کو راستہ دے دے۔ اس ارادے کے ماتحت انہوں نے بنو قریظہ کو کہلا بھیجا کہ "محاصرہ لمبا ہو رہا ہے اور لوگ تنگ آرہے ہیں۔ پس ہم نے یہ تجویز کی ہے کہ سب قبائل مل کر کل کے دن ایک متحدہ حملہ مسلمانوں پر کریں اس لیے تم بھی کل کے حملہ کے واسطے تیار ہو جاؤ۔ بنو قریظہ نے جن کے ساتھ نعیم بن مسعود کی پہلے سے بات ہو چکی تھی یہ جواب دیا کہ کل تو ہمارا سبت کا دن ہے اس لیے ہم معذور ہیں اور ویسے بھی جب تک آپ لوگ اس ضمانت کے طور پر کہ آپ کی طرف سے بعد میں ہمارے ساتھ غداری نہیں ہو گی اپنے کچھ آدمی ہمارے حوالے نہ کر دیں ہم اس حملہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ جب قریش و غطفان کو بنو قریظہ کا یہ جواب گیا تو وہ حیران رہ گئے۔ اور کہنے لگے کہ واقعی نعیم نے سچ کہا ہے کہ بنو قریظہ ہماری غداری پر تلے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف جب بنو قریظہ کو قریش و غطفان کا یہ جواب گیا کہ ہم یرغمال نہیں دیتے۔ تم نے مدد کو آنا ہے تو ویسے آؤ۔ تو بنو قریظہ نے کہا کہ واقعی نعیم نے ہمیں ٹھیک مشورہ دیا تھا کہ قریش و غطفان کی نیت بخیر نہیں ہے اور اس طرح نعیم کی حسن تدبیر سے کفار کے کیمپ میں انشقاق و اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی[1]

یہ وہ تدبیر ہے جو نعیم نے اختیار کی مگر نعیم کا یہ کمال ہے کہ اس نے ایسے نازک مشن کی ادائیگی میں بھی حتی الوسع کوئی ایسی بات اپنے مُنہ سے نہیں نکالی جو معیّن طور پر کذب بیانی کے نام سے موسوم کی جا سکے باقی لطائف الحیل کے طریق پر کوئی تدبیر اختیار کرنا یا کوئی ایسا داؤ چلنا جس سے انسان دشمن کے شر سے محفوظ ہو سکے سو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے بلکہ جنگی فن کا ایک نہایت مفید حصہ ہے جس سے ظالم دشمن کو خائب و خاسر کرنے اور بے جا کُشت و خون کے سلسلے کو روکنے میں بہت مدد لی جا سکتی ہے۔

ممکن ہے کہ نعیم بن مسعود کی اس امن پسند کوشش کا نتیجہ ضائع چلا جاتا اور ایک عارضی لغزش و تزلزل کے بعد کفار میں پھر اتحاد و ثبات کی رُوح پیدا ہو جاتی مگر خدا کی طرف سے ایسا اتفاق ہوا کہ ان واقعات کے بعد رات کو ایک نہایت سخت آندھی چلی[2] جس نے کفار کے وسیع کیمپ میں جو ایک کھلی جگہ میں واقع تھا ایک خطرناک طوفانِ بے تمیزی برپا کر دیا۔ خیمے اُکھڑ گئے۔ قناتوں کے پردے ٹوٹ ٹوٹ کر اُڑ گئے۔ ہنڈیاں اُلٹ اُلٹ کر چولھوں میں گر گئیں[3] اور ریت اور کنکر کی بارش نے لوگوں کے کانوں اور آنکھوں اور نتھنوں کو بھر دیا اور پھر سب سے بڑھ کر غضب یہ ہوا کہ وہ قومی آگیں جو عرب کے قدیم دستور کے مطابق رات کے وقت نہایت التزام کے ساتھ روشن رکھی جاتی تھیں اِدھر اُدھر خس و خاشاک

---

[1] ابن ہشام [2] ابن ہشام و زرقانی [3] ابن سعد

کی طرح اُڑ کر بجھنے لگ گئیں[1] ان مناظر نے کفار کے وہم پرست قلوب کو جو پہلے ہی محاصرہ کے تکلیف دہ طول اور اتحادیوں کی باہمی بے اعتمادی کے تلخ تجربے سے متزلزل ہو رہے تھے ایک ایسا دھکا لگایا کہ پھر وہ سنبھل نہ سکے۔ اور صبح سے پہلے پہلے مدینہ کا اُفق لشکرِ کفار کے گرد و غبار سے صاف ہو گیا۔

چنانچہ ایسا ہوا کہ جب اس آندھی کا زور ہوا تو ابوسفیان نے اپنے آس پاس کے قریشی رؤساء کو بُلا کر کہا کہ ہماری مشکلات بہت بڑھ رہی ہیں۔ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم واپس چلے جائیں اور مَیں تو بہرحال جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دیا اور پھر اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا مگر گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ اونٹ کے پاؤں تک کھولنے یاد نہ رہے اور سوار ہونے کے بعد اونٹ کے حرکت نہ کرنے سے یہ یاد آیا کہ اونٹ کے پاؤں ابھی تک نہیں کھولے گئے[2] اس وقت عکرمہ بن ابوجہل ابوسفیان کے پاس کھڑا تھا اُس نے کسی قدر تلخی سے کہا کہ ابوسفیان! تم امیر العسکر ہو کر لشکر کو چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہو اور تمہیں دوسروں کا خیال تک نہیں ہے۔ اس پر ابوسفیان شرمندہ ہوا اور اُونٹ سے اُتر کر کہنے لگا لو مَیں ابھی نہیں جاتا مگر تم لوگ جلدی تیاری کرو اور جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے نکل چلو[3] چنانچہ لوگ جلد جلد تیاری میں لگ گئے۔ اور ابوسفیان تھوڑی دیر کے بعد اپنے اونٹ پر سوار ہو کر واپس روانہ ہو گیا۔ اس وقت تک بنو غطفان اور دوسرے قبائل کو قریش کے اس فرار کا علم تک نہیں تھا۔ مگر جب قریش کا کیمپ سرعت کے ساتھ خالی ہونا شروع ہوا تو دوسروں کو بھی اس کی اطلاع ہوئی جس پر انہوں نے بھی گھبرا کر کوچ کا اعلان کر دیا[4] اور بنو قریظہ بھی اپنے قلعوں کے اندر چلے گئے[5] اور بنو قریظہ کے ساتھ بنو نضیر کا رئیس حُیَیّ بن اخطب بھی اُن کے قلعوں میں چلا آیا[6] اور اس طرح صبح کی سفیدی نمودار ہونے سے پہلے پہلے سارا میدان خالی ہو گیا۔ اور ایک فوری اور محیّر العقول تغیّر کے طور پر مسلمان مفتوح ہوتے ہوتے فاتح بن گئے۔

اسی رات جبکہ کفار اس طرح خود بخود میدانِ جنگ سے بھاگ رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارد گرد کے صحابہ کو مخاطب فرما کر آواز دی کہ تم میں سے کوئی ہے جو اس وقت جائے اور لشکرِ کفار کا حال معلوم کرے[7]؟ لیکن صحابہ روایت کرتے ہیں کہ اس وقت سردی کی اس قدر شدت تھی اور پھر خوف اور تھکان اور بھوک کا یہ عالم تھا کہ ہم میں سے کوئی شخص اپنے اندر یہ طاقت نہیں پاتا تھا کہ جواب میں کچھ عرض کر سکے یا اپنی جگہ سے حرکت کرے[8] آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نام لے کر حذیفہ بن یمان کو بلایا جس پر وہ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اُٹھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے[9] آپ نے کمال شفقت

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۲۲ و خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۵۲ [2] ابن ہشام و ابن سعد و طبری [3] سیرۃ حلبیہ [4] ابن ہشام [5] خمیس و زرقانی [6] ابن ہشام حالات غزوہ بنو قریظہ [7] مسلم کتاب الجہاد [8] ابن ہشام و طبری [9] مسلم حالات غزوہ خندق

سے اُن کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرا اور اُن کے لیے دُعا تے خیر فرمائی اور فرمایا تم بالکل ڈرو نہیں اور اطمینان رکھو انشاء اللہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بس تم چپکے چپکے کفار کے کیمپ میں چلے جاؤ اور کسی سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرو۔ اور نہ اپنے آپ کو ظاہر ہونے دو[1] حذیفہ کہتے ہیں کہ جب میں روانہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے بدن میں سردی کا نام و نشان تک نہیں تھا بلکہ میں نے یوں محسوس کیا کہ گویا ایک گرم حمام میں سے گذر رہا ہوں[2] اور میری گھبراہٹ بالکل جاتی رہی[3] اس وقت رات کی تاریکی پورے طور پر اپنی حکومت جمائے ہوئے تھی۔ میں بالکل نڈر ہو کر چپکے چپکے کفار کے اندر پہنچ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ابوسفیان ایک جگہ کھڑا ہوا آگ سینک رہا تھا۔ میں نے اُسے دیکھ کر جھٹ اپنی تیر کمان سیدھی کر لی اور قریب تھا کہ میں اپنا تیر چلا دیتا مگر پھر مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد آگیا اور تیر چلانے سے رُک گیا اور اگر اس وقت میں تیر چلا دیتا تو ابوسفیان اس قدر قریب تھا کہ وہ یقیناً بچ نہ سکتا[4] اس وقت ابوسفیان اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دے رہا تھا اور پھر وہ میرے سامنے ہی اونٹ پر سوار ہو گیا مگر گھبراہٹ کی وجہ سے اسے اپنے اونٹ کے پاؤں تک کھولنے یاد نہیں رہے۔ اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔

جب میں اپنے کیمپ میں پہنچا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے میں نے آپ کے فارغ ہونے تک انتظار کیا اور پھر آپ کو سارے واقعہ کی اطلاع دی جس پر آپ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور فرمایا کہ یہ ہماری کسی کوشش یا طاقت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض خدا کے فضل کی وجہ سے ہے جس نے اپنے دم سے اُحزاب کو پسپا کر دیا۔ اس کے بعد کفار کے فرار ہونے کی خبر فوراً سارے مسلمان کیمپ میں مشہور ہو گئی[5] غالباً اسی موقعہ پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اَلْآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا[6] یعنی "آئندہ ہم قریش کے خلاف نکلیں گے مگر انہیں ہمارے خلاف نکلنے کی ہمت نہیں ہوگی۔"

الغرض کم و بیش بیس دن کے محاصرہ کے بعد کفار کا لشکر مدینہ سے بے نیل و مرام واپس چلا گیا اور بنو قریظہ جو ان کی مدد کے لیے نکلے تھے وہ بھی اپنے قلعہ میں واپس آگئے[7] اِس لڑائی میں مسلمانوں کا جانی نقصان زیادہ نہیں ہوا یعنی صرف پانچ چھ آدمی شہید ہوئے مگر قبیلہ اوس کے رئیس اعظم سعد بن معاذ کو ایسا کاری زخم آیا کہ وہ بالآخر اس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور یہ نقصان مسلمانوں کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ کفار کے لشکر میں سے صرف تین آدمی قتل ہوئے، لیکن اس جنگ میں قریش کو کچھ ایسا دھکا لگا کہ اس کے بعد ان کو پھر کبھی مسلمانوں کے خلاف اس طرح جتھہ بنا کر نکلنے یا مدینہ پر حملہ آور ہونے کی ہمت نہیں ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی لفظ بلفظ پوری ہوئی۔

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۱۸ و خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۵۲ [2] ابن ہشام [3] مسلم حالات غزوہ خندق [4] زرقانی [5] مسلم حالات غزوہ خندق

[6] ابن ہشام و طبری و زرقانی [7] بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ خندق [8] خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۵۳

لشکرِ کفار کے چلے جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے بھی صحابہ کو واپسی کا حکم دیا اور مسلمان میدانِ کارزار سے اُٹھ کر مدینہ میں داخل ہو گئے لیکن ابھی آپ اپنے گھر میں پہنچے ہی تھے کہ بنو قریظہ کے ساتھ لڑائی کی صورت پیدا ہو گئی۔ اور بغیر اس کے کہ آپ مدینہ میں ایک رات بھی آرام کی گذار سکیں آپ کو ان کے مقابلہ کے لیے گھر سے نکلنا پڑا مگر اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

جنگ خندق یا احزاب جو اس طرح غیر متوقع اور ناگہانی طور پر اختتام کو پہنچی ایک نہایت ہی خطرناک جنگ تھی۔ اس سے بڑھ کر کوئی ہنگامی مصیبت اس وقت تک مسلمانوں پر نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس کے بعد آنحضرت ﷺ کی زندگی میں کوئی اتنی بڑی مصیبت ان پر آئی۔ یہ ایک خطرناک زلزلہ تھا جس نے اسلام کی عمارت کو جڑ سے ہلا دیا اور جس کے مہیب مناظر کو دیکھ کر مسلمانوں کی آنکھیں پتھرا گئیں اور اُن کے کلیجے مُنہ کو آنے لگ گئے اور کمزور لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس اب خاتمہ ہے۔ اور اس خطرناک زلزلے کے دھکے کم و بیش ایک ماہ تک اُن پر آتے رہے اور کئی ہزار خونخوار درندوں نے اُن کے گھروں کا محاصرہ کر کے ان کی زندگیوں کو تلخ کئے رکھا اور اس مصیبت کی تلخی کو بنو قریظہ کی غداری نے دُگنا کر دیا اور اس سارے فتنہ کی تہ میں بنو نضیر کے وہ محسن کُش یہودی تھے جن پر آنحضرت ﷺ نے احسان کر کے ان کو مدینہ سے امن و امان کے ساتھ نکل جانے کی اجازت دیدی تھی۔ یہ انہی یہودی رؤساء کی اشتعال انگیزی تھی جس سے صحرائے عرب کے تمام نامور قبیلے عداوت اسلام کے نشے میں مخمور ہو کر مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کے لیے مدینہ پر جمع ہو گئے تھے اور یہ قطعی طور پر یقینی ہے کہ اگر اس وقت ان وحشی درندوں کو شہر میں داخل ہو جانے کا موقع مل جاتا تو ایک واحد مسلمان بھی زندہ نہ بچتا اور کسی پاکباز مسلم خاتون کی عزت ان لوگوں کے ناپاک حملوں سے محفوظ نہ رہتی۔ مگر یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی قدرت کا غیبی ہاتھ تھا کہ اس ٹڈی دَل کو بے نیل مرام واپس ہونا پڑا اور مسلمان شکر و امتنان کے ساتھ امن و اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنے گھروں میں واپس آ گئے۔ مگر بنو قریظہ کا خطرہ ابھی تک اسی طرح قائم تھا۔ یہ لوگ نہایت خطرناک صورت میں اپنی غداری کا مظاہرہ کر کے اب امن و امان کے ساتھ اپنے قلعوں میں محفوظ ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ اب کوئی شخص ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن بہرحال ان کے فتنہ کا سدِباب ضروری تھا کیونکہ ان کا وجود مدینہ میں مسلمانوں کے لیے ہرگز ایک مارِ آستین سے کم نہ تھا۔ اور دوسری طرف بنو نضیر کا تجربہ بتاتا تھا کہ یہ سانپ ایسا ہے کہ اسے گھر سے باہر نکالنا بھی ایسا ہی خطرناک ہے جیسا کہ اسے اپنے گھر میں رہنے دینا۔

بنو قریظہ کی غدّاری اور مدینہ میں یہود کا خاتمہ

قانون شادی وطلاق

◎

غزوہ بنو قریظہ ذوقعدہ ۵ھ
مطابق مارچ واپریل ۶۲۷ء

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خندق سے فارغ ہو کر شہر میں واپس تشریف لاتے تو ابھی آپ بمشکل ہتھیار وغیرہ اُتار کر نہانے دھونے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آپ کو خدا کی طرف سے کشفی رنگ میں یہ بتایا گیا کہ جب تک بنو قریظہ کی غداری اور بغاوت کا فیصلہ نہ ہو جاتا آپ کو ہتھیار نہیں اُتارنے چاہیئے تھے۔ اور پھر آپ کو یہ ہدایت دی گئی کہ آپ بلاتوقف بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اس پر آپ نے صحابہ میں عام اعلان کروا دیا کہ سب لوگ بنو قریظہ کے قلعوں کی طرف روانہ ہو جائیں اور نماز عصر وہیں پہنچ کر ادا کی جاوے[1] اور آپ نے حضرت علیؓ کو صحابہ کے ایک دستے کے ساتھ فوراً آگے روانہ کر دیا۔

جب حضرت علیؓ وہاں پہنچے تو بجائے اس کے کہ بنو قریظہ (جن میں غزوہ خندق کے بعد بنو نضیر کا رئیس اعظم اور فتنہ کا بانی مبانی حُیَیّ بن اخطب بھی اپنے وعدہ کے مطابق آکر شامل ہو گیا تھا۔) اپنی غداری و بغاوت پر اظہار ندامت کر کے عفو و رحم کے طالب بنتے انہوں نے برملا طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیں[2]۔ اور کمال بے حیائی اور کمینگی کے طریق پر ازواج مطہرات کے متعلق بھی نہایت ناگوار بدزبانی کی[3]۔

حضرت علیؓ اور اُن کے دستے کے روانہ ہو چکنے کے تھوڑی دیر بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلح ہو کر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت آپؐ ایک گھوڑے پر سوار تھے اور صحابہ کی ایک بڑی جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ جب آپ بنو قریظہ کے قلعوں کے قریب پہنچے تو حضرت علیؓ نے جو تھوڑی دُور تک آپ کے استقبال کے لیے واپس آگئے تھے آپ سے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! میرے خیال میں آپ کو خود آگے تشریف لے جانے کی ضرورت نہیں ہے ہم لوگ انشاء اللہ کافی ہوں گے[4]۔" آپ سمجھ گئے اور فرمانے لگے "کیا بنو قریظہ نے میرے متعلق کوئی بدزبانی کی ہے؟" حضرت علی نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا۔ خیر ہے چلو قَدْ اُوْذِیَ مُوْسٰی

---

[1] بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ قریظہ [2] ابن ہشام وطبری [3] سیرۃ حلبیہ

[4] حضرت علیؓ کا منشاء یہ تھا کہ آپ کو بنو قریظہ کی گالیاں سُنکر خواہ نخواہ ملال ہوگا اس لیے آپ نہ جائیں تو بہتر ہے۔

بِاَكْثَرَ مِنْ هٰذَا - یعنی "موسٰیؑ کو ان لوگوں کی طرف سے اس سے بھی زیادہ تکالیف پہنچی تھیں[1]۔" غرض آپ آگے بڑھے اور بنو قریظہ کے ایک کنوئیں پر پہنچ کر ڈیرہ ڈال دیا[2]۔

شروع شروع میں تو یہودی لوگ سخت تمرد اور غرور ظاہر کرتے رہے۔ حتّٰی کہ چند مسلمان جو ان کے قلعہ کی دیوار کے پاس ہو کر ذرا آرام کرنے بیٹھے تھے اُن پر ایک یہودی عورت بنانہ نامی نے قلعہ کے اوپر سے ایک بھاری پتھر پھینک کر ان میں سے ایک آدمی خلاد نامی کو شہید کر دیا اور باقی مسلمان بچ گئے لیکن جُوں جُوں وقت گذرتا گیا انکو محاصرہ کی سختی اور اپنی بے بسی کا احساس ہونا شروع ہوا اور بالآخر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اس مشورہ میں اُن کے رئیس کعب بن اسد نے ان کے سامنے تین تجاویز پیش کیں۔ اور کہا کہ "ان میں سے جو بھی تمہیں پسند ہو اُسے اختیار کر لو۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ ہم محمدؐ پر ایمان لا کر مسلمان ہو جائیں کیونکہ اگر سچ پوچھا جاوے تو محمدؐ کی صداقت عیاں ہو چکی ہے اور ہماری کُتب میں بھی اس کی تصدیق پائی جاتی ہے۔ اور جب ہم مسلمان ہو جائیں گے تو لازماً یہ جنگ رُک جائیگی۔" مگر لوگوں نے اس تجویز کو سختی کے ساتھ ردّ کر دیا اور کہا ہم ایسا کبھی نہیں کریں گے جس پر کعب نے کہا کہ "پھر میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کر دیں اور پھر عواقب کی طرف سے بے فکر ہو کر تلواریں لیں اور میدان میں نکل جائیں اور پھر جو ہو سو ہو۔" لوگوں نے کہا یہ بھی ہمیں منظور نہیں کیونکہ بچوں اور عورتوں کو مار کر ہماری زندگی کیا رہے گی۔ کعب نے جواب دیا کہ "اچھا اگر یہ بھی منظور نہیں تو میری آخری تجویز یہ ہے کہ آج سبت کی رات ہے اور محمدؐ اور اس کے اصحاب آج اپنے آپ کو ہماری طرف سے امن میں سمجھتے ہوں گے پس آج رات ہم قلعہ سے نکل کر محمدؐ اور اس کے ساتھیوں پر شبخون ماریں اور بعید نہیں کہ ان کی غفلت کی وجہ سے ہم انہیں مغلوب کر لیں۔" مگر بنو قریظہ نے اس تجویز کے ماننے سے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ آگے ہی ہماری قوم سبت کی بے حرمتی کی وجہ سے مسخ کی جا چکی ہے۔ پس اب ہم مزید بے حرمتی کر کے اپنی تباہی کا خود بیج نہیں بو سکتے۔ اس طرح کعب کی ساری تجاویز ردّ ہو گئیں۔ اور معاملہ وہیں کا وہیں رہا[3]۔

آخر جب بنو قریظہ محاصرہ کی سختی سے تنگ آ گئے تو انہوں نے یہ تجویز کی کہ کسی ایسے مسلمان کو جو اُن سے تعلقات رکھتا ہو اور اپنی سادگی کی وجہ سے ان کے داؤ میں آ سکتا ہو اپنے قلعہ میں بُلائیں اور اس سے یہ پتہ لگانے کی کوشش کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے متعلق کیا ارادہ ہے تاکہ وہ اس کی روشنی میں آئندہ طریق عمل تجویز کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ایلچی روانہ کر کے یہ درخواست کی کہ ابو لبابہ بن منذر انصاری کو ان کے قلعہ میں بھجوایا جاوے تاکہ وہ اس سے مشورہ کر سکیں۔ آپ نے ابو لبابہ کو اجازت دی اور وہ ان کے قلعہ میں چلے گئے۔ اب رؤساء بنو قریظہ نے یہ تجویز کی ہوئی تھی کہ جونہی کہ

---

[1] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۵۵، ۵۶ [2] ابن ہشام و خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۵۹ و طبری ۱۵۰۱ [3] ابن ہشام و نیز طبری صفحہ ۱۴۸۷، ۱۴۸۸

ابولبابہ قلعہ کے اندر داخل ہو سب یہودی عورتیں اور بچے روتے اور چلّاتے ہوتے ان کے اردگرد جمع ہو جائیں اور اپنی مصیبت اور تکلیف کا اُن کے دل پر پُورا پُورا اثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتے چنانچہ ابولبابہ پر یہ داؤ چل گیا اور وہ قلعہ میں جاتے ہی ان کی "مصیبت" کا شکار ہو گئے اور بنو قریظہ کے اس سوال پر کہ اے ابولبابہ تُو ہمارا حال دیکھ رہا ہے کیا ہم محمدؐ کے فیصلہ پر اپنے قلعوں سے اُتر آویں۔ ابولبابہ نے بے ساختہ جواب دیا "ہاں" مگر ساتھ ہی اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر اشارہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے قتل کا حکم دینگے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً کوئی ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا مگر انکی مصیبت کے مظاہرہ سے متاثر ہو کر ابولبابہ کا خیال آلام ومصائب کی رَو میں ایسا بہا کہ موت سے ورے ورے نہیں ٹھہرا۔ اور ابولبابہ کی یہ غلط ہمدردی (جس کی وجہ سے وہ بعد میں خود بھی نادم ہوتے اور اس ندامت میں انہوں نے اپنے آپ کو جاکر مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ حتّٰی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں معاف کرتے ہوتے خود جاکر انہیں کھولا) بنو قریظہ کی تباہی کا باعث بن گئی۔ اور وہ اس بات پر ضد کرکے جم گئے کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر نہیں اُتریں گے[1]

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ جاری رہی اور آخر کم وبیش بیسؔ دن کے محاصرہ کے بعد یہ بدبخت یہود ایک ایسے شخص کو حَکَم مان کر اپنے قلعوں سے اُترنے پر رضامند ہوتے جو باوجود ان کا حلیف ہونے کے ان کی کارروائیوں کی وجہ سے ان کے لیے اپنے دل میں کوئی رحم نہیں پاتا تھا اور جو گو عدل وانصاف کا مجسمہ تھا مگر اس کے قلب میں رحمۃ للعالمین کی سی شفقت اور رأفت نہیں تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قبیلہ اوس بنو قریظہ کا قدیم حلیف تھا اور اس زمانہ میں اس قبیلہ کے رئیس سعد بن معاذ تھے جو غزوہ خندق میں زخمی ہو کر اب مسجد کے صحن میں زیرِ علاج تھے۔ اس قدیم جتھہ داری کا خیال کرتے ہوتے بنو قریظہ نے کہا کہ ہم سعد بن معاذ کو اپنا حَکَم مانتے ہیں۔ جو فیصلہ بھی وہ ہمارے متعلق کریں وہ ہمیں منظور ہوگا۔"[2]

لیکن یہود میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے اس قومی فیصلہ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو مجرم یقین کرتے تھے اور دل میں اسلام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔ ایسے لوگوں میں سے بعض آدمی جن کی تعداد تاریخی روایات میں تین بیان ہوتی ہے بطیب خاطر اسلام قبول کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے[3] ایک اور شخص تھا وہ مسلمان تو نہیں ہوا مگر وہ اپنی قوم کی غداری پر اس قدر شرمندہ تھا کہ جب بنو قریظہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کی ٹھانی تو وہ یہ کہتا ہوا کہ "میری قوم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت غداری کی ہے میں اس غدّاری میں شامل نہیں ہو سکتا" مدینہ چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا تھا[4] مگر باقی قوم آخر تک اپنی ضد پر

---

[1] طبری صفحہ ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰ و خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۵۶ [2] ابن ہشام وطبری وابن سعد نیز بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ قریظہ
[3] ابن ہشام و بخاری کتاب المغازی باب خبر التفسیر [4] طبرانی صفحہ ۱۴۹۰

قائم رہی اور سعد کو اپنا ثالث بنانے پر اصرار کیا۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اسے منظور فرمایا۔ اور اس کے بعد آپ نے چند انصاری صحابیوں کو سعد کے لانے کے لیے روانہ فرمایا۔ سعد سوار ہو کر آتے اور راستہ میں قبیلہ اوس کے بعض لوگوں نے ان سے اصرار کے ساتھ اور بار بار یہ درخواست کی کہ قریظہ ہمارے حلیف ہیں جس طرح خزرج نے اپنے حلیف قبیلہ بنو قینقاع کے ساتھ نرمی کی تھی تم بھی قریظہ سے رعایت کا معاملہ کرنا اور انہیں سخت سزا نہ دینا۔ سعد بن معاذ پہلے تو خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنتے رہے۔ لیکن جب ان کی طرف سے زیادہ اصرار ہونے لگا تو سعد نے کہا کہ "یہ وہ وقت ہے کہ سعد اس وقت حق وانصاف کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کر سکتا۔"[1] یہ جواب سن کر لوگ خاموش ہو گئے۔

جب سعد آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچے تو آپ نے صحابہ سے فرمایا قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ یعنی "اپنے رئیس کے لیے اُٹھو اور سواری سے نیچے اُترنے میں انہیں مدد دو۔"[2] جب سعد سواری سے اُتر کر آنحضرت ﷺ کی طرف آگے بڑھے تو آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا "سعد! بنو قریظہ نے تمہیں حکم مانا ہے اور اُن کے متعلق جو تم فیصلہ کرو انہیں منظور ہوگا۔" اس پر سعد نے اپنے قبیلہ اوس کے لوگوں کی طرف نظر اُٹھا کر کہا عَلَیْکُمْ بِذَالِکَ عَھْدُ اللّٰہِ وَ مِیْثَاقُہٗ اِنَّ الْحُکْمَ فِیْھِمْ بِمَا حَکَمْتُ "کیا تم خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ پختہ عہد کرتے ہو کہ تم بہر حال اس فیصلہ پر عمل کرنے کے پابند ہو گے جو میں بنو قریظہ کے متعلق کروں؟" لوگوں نے کہا۔ ہاں ہم وعدہ کرتے ہیں۔ پھر سعد نے اس جہت کی طرف اشارہ کرتے ہوتے جہاں آنحضرت ﷺ تشریف رکھتے تھے کہا۔ وَعَلٰی مَنْ ھٰھُنَا۔ یعنی "وہ صاحب جو یہاں تشریف رکھتے ہیں کیا وہ بھی ایسا ہی وعدہ کرتے ہیں کہ وہ بہر حال میرے فیصلہ کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہوں گے؟"[3] آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔[4]

اِس عہد و پیمان کے بعد سعد نے اپنا فیصلہ سنایا جو یہ تھا کہ "بنو قریظہ کے مقاتل یعنی جنگجو لوگ قتل کر دیئے جائیں اور ان کی عورتیں اور بچے قید کر لیے جائیں اور ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔" آنحضرت ﷺ نے یہ فیصلہ سنا تو بے ساختہ فرمایا۔ لَقَدْ حَکَمْتَ بِحُکْمِ اللّٰہِ[5] یعنی "تمہارا یہ فیصلہ ایک خُدائی تقدیر ہے۔" جو ٹل نہیں سکتی۔ اور ان الفاظ سے آپ کا یہ مطلب تھا کہ بنو قریظہ کے متعلق یہ فیصلہ ایسے حالات میں ہوا ہے کہ اس میں صاف طور پر خُدائی تصرف کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس لیے آپ کا جذبہ رحم اسے روک نہیں سکتا۔ اور یہ واقعی درست تھا کیونکہ بنو قریظہ کا ابولبابہ کو اپنے مشورہ کے لیے بلانا اور ابولبابہ کے

---

[1] طبری صفحہ ۱۴۹۲ [2] بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ بنو قریظہ عن ابی سعید خدری

[3] مورخین لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے یہ وعدہ لیتے ہوتے سعد کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ آپ کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھیں یا آپ سے مخاطب ہو کر دریافت کریں۔ [4] ابن ہشام وطبری وکتاب الخراج ابو یوسف صفحہ ۱۲۲ [5] بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ قریظہ

مُنہ سے ایک ایسی بات نکل جانا جو سراسر بے بنیاد تھی اور پھر بنو قریظہ کا آنحضرت ﷺ کو حکم ماننے سے انکار کرنا اور اس خیال سے کہ قبیلہ اوس کے لوگ ہمارے حلیف ہیں اور ہم سے رعایت کا معاملہ کرینگے سعد بن معاذ رئیس اوس کو اپنا حَکَم مقرر کرنا۔ پھر سعد کا حق و انصاف کے رستے میں اس قدر پختہ ہو جانا کہ عصبیت اور جتھہ داری کا احساس دل سے بالکل محو ہو جاوے اور بالآخر سعد کا اپنے فیصلہ کے اعلان سے قبل آنحضرت ﷺ سے اس بات کا پختہ عہد لے لینا کہ بہرحال اس فیصلہ کے مطابق عمل ہوگا۔ یہ ساری باتیں اتفاقی نہیں ہوسکتیں اور یقیناً ان کی تہ میں خُدائی تقدیر اپنا کام کر رہی تھی اور یہ فیصلہ خدا کا تھا نہ کہ سعد کا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو قریظہ کی بدعہدی اور غداری اور بغاوت اور فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کی وجہ سے خدائی عدالت سے یہ فیصلہ صادر ہو چکا تھا کہ ان کے جنگجو لوگوں کو دُنیا سے مٹا دیا جاوے۔ چنانچہ ابتداءً آنحضرت ﷺ کو اس غزوہ کے متعلق غیبی تحریک ہونا بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک خُدائی تقدیر تھی۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ اس کے رسول کے ذریعہ سے یہ فیصلہ جاری ہو۔ اور اس لیے اس نے نہایت پیچ در پیچ غیبی تصرفات سے آنحضرت ﷺ کو بالکل الگ رکھا۔ اور سعد بن معاذ کے ذریعہ اس فیصلہ کا اعلان کروایا اور فیصلہ بھی ایسے رنگ میں کروایا کہ اب آنحضرت ﷺ اس میں بالکل دخل نہیں دے سکتے تھے کیونکہ آپ وعدہ فرما چکے تھے کہ آپ بہرحال اس فیصلہ کے پابند رہیں گے۔ اور پھر چونکہ اس فیصلہ کا اثر بھی صرف آپ کی ذات پر نہیں پڑتا تھا بلکہ تمام مسلمانوں پر پڑتا تھا اس لیے آپ اپنا یہ حق نہیں سمجھتے تھے کہ اپنی رائے سے خواہ وہ کیسی ہی عفو و رحم کی طرف مائل ہو اس فیصلہ کو بدل دیں یہی خُدائی تصرف تھا جس کی طاقت سے متاثر ہو کر آپ کے منہ سے بے اختیار طور پر یہ الفاظ نکلے کہ قَدْ حَكَمْتَ بِحُكْمِ اللّٰهِ یعنی "اے سعد! تمہارا یہ فیصلہ تو خدائی تقدیر معلوم ہوتی ہے"۔ جس کے بدلنے کی کسی کو طاقت نہیں۔

یہ الفاظ کہکر آپ خاموشی سے وہاں سے اُٹھے اور شہر کی طرف چلے آتے اور اس وقت آپ کا دل اس خیال سے دردمند ہو رہا تھا کہ ایک قوم جس کے ایمان لانے کی آپ کے دل میں بڑی خواہش تھی اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے ایمان سے محروم رہ کر خدائی قہر و عذاب کا نشانہ بن رہی ہے اور غالباً اسی موقعہ پر آپ نے یہ حسرت بھرے الفاظ فرمائے کہ لَوْ اٰمَنَ بِیْ عَشَرَۃٌ مِنَ الْیَهُوْدِ لَاٰمَنَتْ بِیَ الْیَهُوْدُ یعنی "اگر یہود میں سے مجھ پر دس آدمی (یعنی دس بارسوخ آدمی) بھی ایمان لے آتے۔ تو میں خدا سے اُمید رکھتا تھا کہ یہ ساری قوم مجھے مان لیتی"۔ اور خُدائی عذاب سے بچ جاتی[1]

وہاں سے اُٹھتے ہوتے آپ نے یہ حکم دیا کہ بنو قریظہ کے مَردوں اور عورتوں اور بچوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جاوے۔ چنانچہ دونوں گروہوں کو علیحدہ علیحدہ کرکے مدینہ میں لایا گیا اور شہر میں دو الگ الگ مکانات میں جمع کر دیا گیا اور آنحضرت ﷺ کے حکم کے ماتحت صحابہ نے (جن میں سے غالباً کئی لوگ خود بھوکے رہے ہونگے)

---

[1] بخاری باب اتیان الیہود النبی صلعم

بنو قریظہ کے کھانے کے لیے ڈھیروں ڈھیر پھل مہیا کیا اور لکھا ہے کہ یہودی لوگ رات بھر پھل نوشی میں مصروف رہے[1]

دوسرے دن صبح کو سعد بن معاذ کے فیصلہ کا اجراء ہونا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مستعد آدمی اس کام کی سرانجام دہی کے لیے مقرر فرما دیئے اور خود بھی قریب ہی ایک جگہ میں تشریف فرما ہو گئے[2] تاکہ اگر فیصلہ کے اجراء کے دوران میں کوئی بات ایسی پیدا ہو جس میں آپ کی ہدایت کی ضرورت ہو تو آپ بلا توقف ہدایت دے سکیں۔ نیز یہ کہ اگر کسی مجرم کے متعلق کسی شخص کی طرف سے رحم کی اپیل ہو تو اس میں آپ فوراً فیصلہ صادر فرما سکیں۔ کیونکہ گو سعد کے فیصلہ کی اپیل عدالتی رنگ میں آپ کے سامنے پیش نہیں ہو سکتی تھی مگر ایک بادشاہ یا صدرِ جمہوریت کی حیثیت میں آپ کسی فرد کے متعلق کسی خاص وجہ کی بناء پر رحم کی اپیل ضرور سُن سکتے تھے۔ آپ نے بتقاضائے رحم یہ بھی حکم صادر فرمایا کہ مجرموں کو ایک ایک کر کے علیحدہ علیحدہ قتل کیا جاوے۔ یعنی ایک کے قتل کے وقت دوسرے مجرم پاس موجود نہ ہوں۔ چنانچہ ایک ایک مجرم کو الگ الگ لایا گیا[3] اور بموجب فیصلہ سعد بن معاذ قتل کیا گیا۔

جب حُیَیّ بن اخطب رئیس بنو نضیر آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ کر کہنے لگا کہ "اے محمدؐ مجھے یہ افسوس نہیں ہے کہ میں نے تمہاری مخالفت کیوں کی لیکن بات یہ ہے کہ جو خدا کو چھوڑتا ہے خدا بھی اُسے چھوڑ دیتا ہے۔" پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "خدا کے حکم کے آگے کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ اسی کا حکم اور اسی کی تقدیر ہے[4]" جب کعب بن اسد رئیس قریظہ کو میدانِ قتل میں لایا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے اشارۃً مسلمان ہو جانے کی تحریک کی۔ اُس نے کہا۔ "اے ابوالقاسم! میں مسلمان تو ہو جاتا مگر لوگ کہیں گے موت سے ڈر گیا۔ پس مجھے یہودی مذہب پر ہی مرنے دو[5]۔"

ایک شخص زبیر بن باطیا رؤسائے قریظہ میں سے تھا۔ اس نے ایک مسلمان ثابت بن قیس نامی پر کسی زمانہ میں کوئی احسان کیا تھا۔ ثابت نے اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی کہ اسے چھوڑ دیا جاوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بہت اچھا! اِسے چھوڑ دو۔" ثابت نے جا کر زبیر کو خوشخبری دی کہ تجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری سفارش پر چھوڑ دیا ہے۔ زبیر نے کہا۔ میرے بیوی بچے تو قید میں ہیں میں قتل سے بچ کر کیا کروں گا۔ ثابت پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور کہا کہ زبیر یوں کہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "اس کے بیوی بچوں کو بھی آزاد کر دو۔" ثابت نے جا کر زبیر کو پھر خوشخبری دی۔ جس پر اُس نے کہا۔ میرا مال تو مسلمانوں کے قبضہ میں جا چکا ہے میں صرف بیوی بچوں کو لے کر کیا کروں گا۔ ثابت نے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۳۶ [2] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۳۶ [3] ابن ہشام وابن سعد وطبری [4] طبری وابن ہشام

[5] سیرۃ حلبیہ حالات غزوہ قریظہ

اور آپ نے زبیر کے مال کے بھی واپس دیئے جانے کا حکم دیدیا۔ اب ثابت بہت خوش خوش زبیر کے پاس گیا کہ لو اب تمہارا مال بھی تمہیں واپس مل جائے گا۔ اس نے کہا۔ یہ بتاؤ کہ ہمارے سردار کعب بن اسد اور یہودانِ عرب کے رئیس حُیَیّ بن اخطب کا کیا حال ہے۔ ثابت نے کہا وہ تو قتل کئے جاچکے۔ اس نے کہا۔ جب یہ لوگ قتل ہوگئے تو پھر میں نے زندہ رہ کر کیا کرنا ہے۔ چنانچہ مقتل میں گیا اور تلوار کے سامنے اپنی گردن رکھدی[1]

ایک اور یہودی رفاعہ نامی تھا اس نے ایک رحم دل مسلمان خاتون کی منت سماجت کرکے اُسے اپنی سفارش میں کھڑا کرلیا۔ اور آنحضرت ﷺ نے اس مسلمان خاتون کی سفارش پر رفاعہ کو بھی معاف فرمادیا[2] غرض اس وقت جس شخص کی بھی سفارش آپؐ کے پاس کی گئی آپ نے اُسے فوراً معاف کردیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ سعدؓ کے فیصلہ کی وجہ سے مجبور تھے ورنہ آپ کا قلبی میلان ان کے قتل کئے جانے کی طرف نہیں تھا۔

مقتولین میں ایک یہودی عورت بھی تھی جس نے محاصرہ کے وقت قلعہ پر سے ایک پتھر گرا کر ایک مسلمان کو شہید کیا تھا۔ پس چونکہ اس نے اس باغیانہ جنگ میں عملی حصہ لیا تھا اور سعدؓ کا یہ فیصلہ تھا کہ جنگ میں حصہ لینے والوں کو قتل کیا جاوے[3] اور چونکہ اس عورت کی طرف سے اپنی غداری اور بغاوت اور فعل قتل کے متعلق اظہار ندامت بھی نہیں ہوا اور نہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کوئی رحم کی اپیل ہوئی اس لیے اُسے بھی سعدؓ کے حکم کے مطابق مقتل میں لاکر قتل کیا گیا[4] غرض اس طرح کم و بیش چار سو آدمی اس دن سعدؓ کے فیصلہ کے مطابق قتل کئے گئے[5] اور آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو حکم دے کر ان مقتولین کو اپنے انتظام میں دفن کروا دیا۔

بچے اور عورتیں جو سعد کے فیصلہ کے مطابق قید کرلئے گئے تھے ان کے متعلق بعض روایات سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو نجد کی طرف بھجوا دیا تھا جہاں بعض نجدی قبائل نے ان کا فدیہ ادا کرکے انہیں چھڑا لیا تھا اور اس رقم سے مسلمانوں نے اپنی جنگی ضروریات کے لیے گھوڑے اور ہتھیار خریدے تھے[6] اگر ایسا ہوا ہو تو کوئی بعید نہیں کیونکہ نجدی قبائل اور بنوقریظہ آپس میں حلیف تھے اور غزوہ قریظہ سے صرف چند دن قبل ہی وہ غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف اکٹھے لڑچکے تھے اور دراصل اہلِ نجد ہی کی انگیخت پر بنوقریظہ نے آنحضرت ﷺ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ پس اگر نجد والوں نے اپنے حلیف

---

[1] طبری و ابن ہشام [2] ابن ہشام [3] دیکھو صحیح بخاری حالات بنوقریظہ جہاں سعد کے فیصلہ میں مقاتل یعنی جنگ میں حصہ لینے والے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ [4] طبری و ابن ہشام [5] ترمذی ابواب الجہاد والسیر و ابن ہشام فی ذکر امر محیصۃ وحویصۃ [6] طبری و ابن ہشام

بنو قریظہ کے قیدیوں کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھڑا لیا ہو تو جائے تعجب نہیں۔ لیکن صحیح روایات سے پتہ لگتا ہے کہ یہ قیدی مدینہ میں ہی رہے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حسب دستور مختلف صحابیوں کی نگرانی میں تقسیم فرما دیا تھا[1] اور پھر اُن میں سے بعض نے اپنا فدیہ ادا کرکے رہائی حاصل کرلی تھی[2] اور بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یونہی بطور احسان کے چھوڑ دیا تھا[3] اور پھر یہ لوگ بعد میں آہستہ آہستہ بطیب خاطر خود مسلمان ہو گئے چنانچہ ان میں سے عطیہ قرظی اور عبدالرحمٰن بن زبیر بن باطیا اور کعب بن سلیم اور محمد بن کعب کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں اور یہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ اور ان میں مؤخر الذکر شخص تو ایک بڑے پایہ کا مسلمان گذرا ہے[4]

ریحانہ کا غلط واقعہ

بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ بنو قریظہ کے قیدیوں میں ایک عورت ریحانہ تھی جسے آنحضرتؐ نے لونڈی کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اسی روایت کی بناء پر سر ولیم میور نے اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت دلآزار طعن کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اوّل تو صحیح بخاری کی محولہ بالا روایت[5] جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے قیدیوں کو صحابہ میں تقسیم فرما دیا تھا اس روایت کو غلط ثابت کرتی ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی قیدی عورت اپنے گھر کے لیے الگ کر لی تھی تو طبعاً اس موقعہ پر بخاری کی روایت میں اس کا ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر بخاری میں اس کا اشارہ تک نہیں ہے۔ علاوہ ازیں دوسری صحیح روایات سے معیّن طور پر ثابت ہے کہ ریحانہ ان قیدیوں میں سے تھی جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور احسان کے چھوڑ دیا تھا اور اس کے بعد ریحانہ مدینہ سے رخصت ہو کر اپنے میکے کے خاندان (بنو نضیر) میں چلی گئی تھی اور پھر وہیں رہی اور علامہ ابن حجر نے جو اسلام کے چوٹی کے محققین میں سے ہیں، اسی روایت کو صحیح قرار دیا ہے[6] لیکن اگر یہ تسلیم بھی کیا جاوے کہ ریحانہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا تو تب بھی یقیناً وہ آپ کی بیوی تھی نہ کہ لونڈی۔ چنانچہ جن مؤرخین نے ریحانہ کے متعلق یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا ان میں سے اکثر نے ساتھ ہی یہ صراحت کی ہے کہ آپ نے اُسے آزاد کر کے اس کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ چنانچہ ابن سعد نے ایک روایت خود ریحانہ کی زبانی نقل کی ہے جس میں وہ بیان کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آزاد کر دیا تھا اور پھر میرے مسلمان ہو جانے پر میرے ساتھ شادی فرمائی تھی اور میرا مہر بارہ اُوقیہ مقرر ہوا تھا اور ابن سعد نے اس روایت کے مقابلہ میں اس دوسری

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب حدیث بنی النضیر و خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۷۰ [2] سیرۃ حلبیہ جلد ۲ صفحہ ۳۷۱

[3] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۵۴ [4] دیکھو تہذیب التہذیب۔ اصابہ۔ اسد الغابہ و استیعاب حالات اشخاص مذکورہ

[5] بخاری کتاب المغازی باب حدیث بنی النضیر [6] اصابہ جلد ۱۰ صفحہ ۵۹۳ ذکر ریحانہ

روایت کو جس پر سرولیم میور نے بنیاد رکھی ہے صراحت کے ساتھ غلط اور خلاف واقعہ قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہی اہل علم کی تحقیق ہے[1]

الغرض اوّل تو جیسا کہ بخاری کی روایت سے استدلال ہوتا ہے اور اصابہ میں تصریح کی گئی ہے آنحضرت ﷺ نے ریحانہ کو اپنی سرپرستی میں لیا ہی نہیں بلکہ اسے آزاد کر دیا تھا جس کے بعد وہ اپنے خاندان میں جاکر آباد ہو گئی تھی۔ دوسرے اگر اس روایت کو تسلیم بھی کیا جاوے کہ آنحضرت ﷺ نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا تو تب بھی آنحضرت ﷺ نے اسے آزاد کر کے اس کے ساتھ شادی فرمائی تھی اور اُسے لونڈی کے طور پر نہیں رکھا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ریحانہ کے نام اور حسب نسب اور قبیلہ وغیرہ کے متعلق روایات میں اس قدر اختلاف ہے[2] کہ اس کے وجود ہی کے متعلق شبہ کرنا غالباً غیر معقول نہیں سمجھا جاسکتا۔ خصوصاً جبکہ اس بات کو مدنظر رکھا جاوے کہ اسے ایک ایسے شخص کی بیوی کہا جاتا ہے جو دنیا میں یقیناً سب سے زیادہ تاریخی شخص ہے۔ واللہ اعلم

بنو قریظہ کا واقعہ اور غیر مسلم مؤرخین

بنو قریظہ کے واقعہ کے متعلق بعض غیر مسلم مؤرخین نے نہایت ناگوار طریقے پر آنحضرت ﷺ کے خلاف حملے کئے ہیں اور ان کم و بیش چار سو یہودیوں کی سزائے قتل کی وجہ سے آپ کو ایک نعوذ باللہ ظالم و سفاک فرمانروا کے رنگ میں پیش کیا ہے اس اعتراض کی بنا محض مذہبی تعصب پر واقع ہے جس سے جہاں تک کم از کم اسلام اور بانیٔ اسلام کا تعلق ہے بہت سے مغربی روشنی میں تربیت یافتہ مؤرخ بھی آزاد نہیں ہوسکے۔

اس اعتراض کے جواب میں اوّل تو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بنو قریظہ کے متعلق جس فیصلہ کو ظالمانہ کہا جاتا ہے وہ سعدؓ بن معاذ کا فیصلہ تھا آنحضرت ﷺ کا ہرگز نہیں تھا۔ اور جب وہ آپ کا فیصلہ ہی نہیں تھا تو اس کی وجہ سے آپ پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ دوّم یہ فیصلہ حالات پیش آمدہ کے ماتحت ہرگز غلط اور ظالمانہ نہیں تھا۔ جیسا کہ ابھی ثابت کیا جائے گا۔ سوّم یہ کہ اس عہد کی وجہ سے جو سعدؓ نے فیصلہ کے اعلان سے قبل آپ سے لیا تھا آپ اس بات کے پابند تھے کہ بہر حال اس کے مطابق عمل کرتے۔ چہارم یہ کہ جب خود مجرموں نے اس فیصلہ کو قبول کیا اور اس پر اعتراض نہیں اُٹھایا اور اسے اپنے لیے ایک خُدائی تقدیر سمجھا جیسا کہ حُیَیّ بن اَخطب کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے جو اس نے قتل کئے جانے کے وقت کہے تو اس صورت میں آپ کا یہ کام نہیں تھا کہ خواہ نخواہ اس میں دخل دینے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ سعد کے فیصلہ کے بعد اس معاملہ کے ساتھ آپ کا تعلق صرف اس قدر تھا کہ آپ اپنی حکومت

---

[1] دیکھو ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۹۳ حالات ریحانہ و زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۳۷ [2] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۸۳ و ۲۸۴

کے نظام کے ماتحت اس فیصلہ کو بصورت احسن جاری فرماویں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ آپ نے اُسے ایسے رنگ میں جاری فرمایا کہ جو رحمت و شفقت کا بہترین نمونہ سمجھا جا سکتا ہے یعنی جب تک تو یہ لوگ فیصلہ کے اجراء سے قبل قید میں رہے آپ نے ان کی رہائش اور خوراک کا بہتر سے بہتر انتظام فرمایا۔ اور جب ان پر سعدؓ کا فیصلہ جاری کیا جانے لگا تو آپ نے اسے ایسے رنگ میں جاری کیا جو مجرموں کے لیے کم سے کم موجب تکلیف تھا۔ یعنی اوّل تو ان کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے آپ نے یہ حکم دیا کہ ایک مجرم کے قتل کے وقت کوئی دوسرا مجرم سامنے نہ ہو۔ بلکہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ جن لوگوں کو مقتل میں لایا جاتا تھا ان کو اس وقت تک علم نہیں ہوتا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں جب تک وہ عین مقتل میں نہ پہنچ جاتے تھے[1] اس کے علاوہ جس شخص کے متعلق بھی آپ کے سامنے رحم کی اپیل پیش ہوئی آپ نے اسے فوراً قبول کر لیا اور نہ صرف ایسے لوگوں کی جان بخشی کی بلکہ ان کے بیوی بچوں اور اموال وغیرہ کے متعلق بھی حکم دے دیا کہ انہیں واپس دیئے جائیں۔ اس سے بڑھ کر ایک مجرم کے ساتھ رحمت و شفقت کا سلوک کیا ہو سکتا ہے؟ پس نہ صرف یہ کہ بنو قریظہ کے واقعہ کے متعلق آنحضرت ﷺ پر قطعاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ یہ واقعہ آپ کے اخلاق فاضلہ اور حسن انتظام اور آپ کے فطری رحم و کرم کا ایک نہایت بیّن ثبوت ہے۔

اب رہا اصل فیصلہ کا سوال۔ سو اس کے متعلق بھی ہم بلا تأمل کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ہرگز کسی قسم کے ظلم و تعدّی کا دخل نہیں تھا بلکہ وہ عین عدل و انصاف پر مبنی تھا اس کے لیے سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ بنو قریظہ کا جرم کیا تھا اور وہ جرم کن حالات میں کیا گیا۔ سو تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ جب شروع شروع میں آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لاتے تو اُس وقت مدینہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے یعنی بنو قینقاع۔ قبیلہ بنو نضیر اور قبیلہ بنو قریظہ۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے بعد جو پہلا سیاسی کام کیا وہ یہ تھا کہ ان تینوں قبیلوں کے رؤساء کو بُلا کر اُن کے ساتھ امن و امان کا ایک معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی شرائط یہ تھیں کہ مسلمان اور یہودی امن و امان کے ساتھ مدینہ میں رہیں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں گے اور ایک دوسرے کے دشمنوں کو کسی قسم کی مدد نہیں دیں گے اور نہ ایک دوسرے کے دشمنوں کے ساتھ کوئی تعلق رکھیں گے۔ اور اگر کسی بیرونی قبیلہ یا قبائل کی طرف سے مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں گے اور اگر معاہدہ کرنے والوں میں سے کوئی شخص یا کوئی گروہ اس معاہدہ کو توڑے گا یا فتنہ و فساد کا باعث بنے گا تو دوسروں کو اس کے خلاف ہاتھ اُٹھانے کا حق ہوگا۔ اور تمام اختلافات اور تنازعات محمد ﷺ کے سامنے پیش ہونگے اور

---

[1] دیکھو طبری و ابن ہشام

آپ کا فیصلہ سب کے لیے واجب التعمیل ہوگا مگر یہ ضروری ہوگا کہ ہر شخص یا قوم کے متعلق اسی کے مذہب اور اسی کی شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جاوے[1]

اِس معاہدہ پر یہود نے کس طرح عمل کیا؟ اس سوال کا جواب گذشتہ اوراق میں تفصیل کیساتھ گذر چکا ہے۔ سب سے پہلے قبیلہ بنو قینقاع نے بدعہدی کی اور دوستانہ تعلقات کو قطع کرکے مسلمانوں سے جنگ کی طرح ڈالی۔ اور مسلمان عورتوں کی بےحرمتی کا کمینہ طریق اختیار کیا اور پھر آنحضرت ﷺ کی اس صدارتی پوزیشن کو جو بین الاقوام معاہدہ کی رُو سے آپ کو حاصل تھی نہایت متمردانہ انداز میں ٹھکرا دیا۔ مگر جب وہ مسلمانوں کے سامنے مغلوب ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے انہیں معاف فرما دیا اور صرف اس قدر احتیاطی تدبیر پر اکتفا کی کہ بنو قینقاع مدینہ سے نکل کر کسی دوسری جگہ جا کر آباد ہو جائیں تاکہ شہر کا امن برباد نہ ہو اور مسلمان ایک مارِ آستین کے شر سے محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ قبیلہ بنو قینقاع کے لوگ بڑے امن وامان کے ساتھ اپنے اموال اور بیوی بچوں کو اپنے ہمراہ لے کر مدینہ سے نکل کر دوسری جگہ آباد ہو گئے۔

مگر اس واقعہ سے یہود کے باقی دو قبائل نے سبق حاصل نہ کیا بلکہ آپ کے رحم نے ان کو اور بھی ناواجب جرأت دلا دی اور ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ یہود کے دوسرے قبیلہ بنو نضیر نے بھی سر اُٹھایا اور سب سے پہلے ان کے ایک رئیس کعب بن اشرف نے معاہدہ کو توڑ کر قریش اور دوسرے قبائل عرب کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف سازباز شروع کی اور عرب کے ان وحشی درندوں کو آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کے خلاف خطرناک طور پر اُبھارا اور مسلمانوں کے خلاف ایسے ایسے اشتعال انگیز شعر کہے کہ جس سے ملک میں مسلمانوں کے لیے ایک نہایت خطرناک صورتِ حال پیدا ہو گئی اور پھر اس بدبخت نے معزز مسلمان عورتوں کا نام لے لیکر اپنے اشعار میں اُن پر پھبتیاں اُڑائیں اور بالآخر آنحضرت ﷺ کے قتل کی سازش کی اور جب آنحضرت صلعم کے حکم سے یہ شخص اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا تو اس کا قبیلہ یک جان ہو کر مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا اور اس دن سے بنو نضیر نے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں کے خلاف سازباز شروع کر دی اور بالآخر سارے قبیلہ نے مل کر آنحضرت ﷺ کے قتل کا منصوبہ باندھا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو آپ کو زندہ نہ چھوڑا جاوے۔ اور جب ان کے ان خونی ارادوں کا علم ہونے پر آنحضرت ﷺ نے اُن کی تنبیہہ اور سزا کا طریق اختیار کیا تو وہ نہایت مغرورانہ انداز میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کو تیار ہو گئے اور اس جنگ میں بنو قریظہ نے ان کی اعانت کی[2] مگر جب بنو نضیر مغلوب ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے بنو قریظہ کو تو بالکل ہی معاف فرما دیا[3] اور بنو نضیر کو بھی مدینہ سے امن وامان کے ساتھ چلے جانے کی اجازت دیدی البتہ اس قدر کیا کہ انہیں ان کے اسلحہ ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی۔ مگر اس احسان کا

---

[1] ابن ہشام ذکر معاہدہ یہود [2] بخاری حدیث بنی النضیر [3] بخاری حدیث بنی النضیر

بدلہ بنونضیر نے یہ دیا کہ مدینہ سے باہر جا کر ان کے رؤسا نے تمام عرب کا چکر لگایا اور مختلف قبائل عرب کو خطرناک طور پر اشتعال دیکر ایک ٹڈی دل لشکر مدینہ پر چڑھا لاتے اور سب سے یہ پختہ عہد لیا کہ اب جب تک اسلام کو نیست و نابود نہ کرلیں گے واپس نہیں جائیں گے۔

ایسے خطرناک وقت میں جس کا ایک مختصر خاکہ اوپر گذر چکا ہے۔ یہود کے تیسرے قبیلہ بنو قریظہ نے کیا کیا؟ اور یہ قبیلہ وہ تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بنونضیر کے موقع پر ان کی غداری کو معاف کر کے خاص احسان کیا تھا۔ اور پھر دوسرا احسان ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تھا کہ باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت صلعم کی ہجرت سے قبل بنونضیر سے مرتبہ اور حقوق میں ادنیٰ سمجھے جاتے تھے یعنی اگر بنونضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو قاتل کو قصاص میں قتل کیا جاتا تھا، لیکن اگر بنو قریظہ کا کوئی آدمی بنونضیر کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو محض دیت کی ادائیگی کافی سمجھی جاتی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کو دوسرے شہریوں کے ساتھ برابری کے حقوق عطا کئے[1] مگر باوجود ان عظیم الشان احسانوں کے بنو قریظہ نے پھر بھی غداری کی۔ اور غداری بھی ایسے نازک وقت میں کی جس سے زیادہ نازک وقت مسلمانوں پر کبھی نہیں آیا۔ بنو قینقاع کی مثال ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ بنونضیر کا واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ انہوں نے اس سے سبق حاصل نہیں کیا اور کیا تو کیا کیا؟ یہ کیا کہ اپنے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کو فراموش کر کے عین اس وقت جبکہ تین ہزار مسلمان نہایت بے سروسامانی اور بے بسی کی حالت میں کفار کے دس پندرہ ہزار جرار اور خونخوار لشکر سے گھرے ہوئے بیٹھے تھے اور اپنی بیچارگی کو دیکھ کر ان کے کلیجے منہ کو آرہے تھے اور موت انہیں اپنے سامنے دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے قلعوں میں سے نکلے اور مسلمان مستورات اور بچوں پر عقب سے حملہ آور ہو گئے اور مسلمانوں کے اتحاد سے منحرف ہو کر اس خونی اتحاد کی شمولیت اختیار کی جس کا اصل الاصول اسلام اور بانیٔ اسلام کو نیست و نابود کرنا تھا ہاں اس بانیٔ اسلام کو جس کا مدینہ میں آنے کے بعد پہلا کام یہ تھا کہ اس نے ان یہود کو اپنا دوست اور مُعاہد بنایا اور یہود کا پہلا کام یہ تھا کہ انہوں نے اسے اپنا دوست اور مُعاہد مان کر اسے اپنی جمہوریت کا صدر تسلیم کیا۔ اندریں حالات بنو قریظہ کا یہ فعل صرف ایک بدعہدی اور غداری ہی نہیں تھا بلکہ ایک خطرناک بغاوت کا بھی رنگ رکھتا تھا اور بغاوت بھی ایسی کہ اگر ان کی تدبیر کامیاب ہو جاتی تو مسلمانوں کی جانوں اور ان کی عزت و آبرو اور ان کے دین و مذہب کا یقیناً خاتمہ تھا۔ پس بنو قریظہ کسی ایک جرم کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ وہ بے وفائی اور احسان فراموشی کے مرتکب ہوئے۔ بدعہدی اور غداری کے مرتکب ہوئے۔ بغاوت اور اقدام قتل کے مرتکب ہوئے۔ اور ان جرموں کا ارتکاب انہوں نے ایسے

---

[1] ابوداؤد بحوالہ تلخیص الصحاح جلد ا باب سورۃ مائدہ

حالات میں کیا جو ایک جرم کو بھیانک سے بھیانک صورت دے سکتے ہیں۔ اور دُنیا کی کوئی غیر متعصب عدالت اِن کے مقدمہ میں موجباتِ رعایت کا عنصر نہیں پا سکتی۔

ایسے حالات میں ان کی سزا سوائے اس کے کیا ہو سکتی تھی جو دی گئی۔ ظاہر ہے کہ امکانی طور پر صرف تین سزائیں ہی دی جاسکتی تھیں۔ اول مدینہ میں ہی قید یا نظر بندی۔ دوسرے جلاوطنی جیسا کہ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے معاملہ میں ہوا۔ تیسرے جنگجو آدمیوں کا قتل اور باقیوں کی قید یا نظر بندی۔ اب انصاف کے ساتھ غور کرو کہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت مسلمانوں کے لیے کونسا طریق کُھلا تھا۔ ایک دشمن قوم کا اپنے شہر میں قید رکھنا اس زمانہ کے لحاظ سے بالکل بیرون از سوال تھا۔ کیونکہ اول تو قید کے ساتھ ہی قیدیوں کی رہائش اور خوراک کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی تھی جس کے برداشت کرنے کی ان میں ہرگز طاقت نہیں تھی۔ دوسرے اس زمانہ میں کوئی جیل خانے وغیرہ بھی نہیں ہوتے تھے اور قیدیوں کے متعلق یہی دستور تھا کہ وہ فاتح قوم کے آدمیوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ جہاں وہ عملاً بالکل آزاد رہتے تھے۔ ایسے حالات میں ایک پرلے درجہ کے معاند اور سازشی گروہ کا مدینہ میں رہنا اپنے اندر نہایت خطرناک احتمالات رکھتا تھا اور اگر بنو قریظہ پر یہ فیصلہ جاری کیا جاتا تو یقیناً اس کے معنے یہ ہوتے کہ فتنہ انگیزی اور مفسدہ پردازی اور شرارت اور خفیہ سازباز کے لیے تو ان کو وہی آزادی حاصل رہتی جو پہلے تھی البتہ ان کے اخراجات کی ذمہ داری مسلمانوں پر آجاتی یعنی پہلے اگر وہ اپنا کھاتے تھے اور مسلمانوں کا گلا کاٹتے تھے تو آئندہ وہ کھاتے بھی مسلمانوں کا (جن کے پاس اس وقت اپنے کھانے کے لیے بھی نہیں تھا) اور گلا بھی مسلمانوں کا کاٹتے۔ اور مسلمانوں کے گھروں میں اور ان کے ساتھ مخلوط ہو کر رہنے سہنے کی وجہ سے جو دوسرے خطرات ہو سکتے تھے وہ مزید برآں تھے۔ اندریں حالات میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی عقلمند شخص یہ رائے رکھ سکتا ہے کہ بنو قریظہ کو یہ سزا دی جاسکتی تھی۔

اب رہی دوسری سزا یعنی جلاوطنی۔ سو یہ سزا بے شک اس زمانہ کے لحاظ سے دشمن کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ایک عمدہ طریق سمجھی جاتی تھی مگر بنو نضیر کی جلاوطنی کا تجربہ بتاتا تھا کہ کم از کم جہاں تک یہود کا تعلق تھا یہ طریق کسی صورت میں پہلے طریق سے کم خطرناک نہیں تھا۔ یعنی یہود کو مدینہ سے باہر نکل جانے کی اجازت دیدینا سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا کہ نہ صرف یہ کہ عملی اور جنگجو معاندینِ اسلام کی تعداد میں اضافہ ہو جاوے بلکہ دشمنانِ اسلام کی صف میں ایسے لوگ جاملیں جو اپنی خطرناک اشتعال انگیزی اور معاندانہ پراپیگنڈا اور خفیہ اور سازشی کارروائیوں کی وجہ سے ہر مخالفِ اسلام تحریک کے لیڈر بننے کیلئے بے چین تھے۔ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ یہود کے سارے قبائل میں سے بنو قریظہ اپنی عداوت میں بڑھے ہوئے تھے[1] پس

---

[1] زاد المعاد حالات بنو قریظہ

یقیناً بنو قریظہ کی جلاوطنی اس سے بہت زیادہ خطرات کا موجب ہوسکتی تھی جو بنو نضیر نے غزوہ احزاب کو برپا کر کے مسلمانوں کے لیے پیدا کئے اور اگر مسلمان ایسا کرتے تو اس زمانہ کے حالات کے ماتحت ان کا یہ فعل ہرگز خودکشی سے کم نہ ہوتا۔ مگر کیا دُنیا کے پردے پر کوئی ایسی قوم ہے جو دشمن کو زندہ رکھنے کے لیے آپ خودکشی پر آمادہ ہوسکتی ہے؟ اگر نہیں تو یقیناً مسلمان بھی اس وجہ سے زیرِالزام نہیں سمجھے جاسکتے کہ انہوں نے بنو قریظہ کو زندہ رکھنے کے لیے خودکشی کیوں نہیں کی۔

پس یہ ہر دو سزائیں ناممکن تھیں اور ان میں سے کسی کو اختیار کرنا اپنے آپ کو یقینی تباہی میں ڈالنا تھا۔ اور ان دو سزاؤں کو چھوڑ کر صرف وہی رستہ کُھلا تھا جو اختیار کیا گیا۔ بیشک اپنی ذات میں سعدؓ کا فیصلہ ایک سخت فیصلہ تھا اور فطرت انسانی بظاہر اس سے ایک صدمہ محسوس کرتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بغیر کوئی اور راستہ کُھلا تھا جسے اختیار کیا جاتا۔ جب ایک سرجن اپنے کسی بیمار کا جس کے لیے وہ اس قسم کا اپریشن ضروری خیال کرے ہاتھ کاٹ دیتا ہے یا ٹانگ جُدا کر دیتا ہے یا کسی اور عضو کو جسم سے علیحدہ کر دینے پر مجبور ہوجاتا ہے تو ہر شریف انسان کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا یعنی اگر حالات کی مجبوری اُسے ضروری نہ قرار دیتی تو اچھا تھا مگر حالات کی مجبوری کے سامنے جُھکنا پڑتا ہے بلکہ ایسے حالات میں سرجن کا یہ فعل قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے کہ اس نے تھوڑے یا کم قیمتی حصّہ کی قربانی سے زیادہ قیمتی چیز کو بچا لیا۔ اِسی طرح بنو قریظہ کے متعلق سعدؓ کا فیصلہ گو اپنی ذات میں سخت تھا مگر وہ حالات کی مجبوری کا ایک لازمی نتیجہ تھا جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مارگولیس جیسا مؤرخ بھی جو ہرگز اسلام کے دوستوں میں سے نہیں ہے اس موقعہ پر اس اعتراف پر مجبور ہوا ہے کہ سعدؓ کا فیصلہ حالات کی مجبوری پر مبنی تھا جس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ مسٹر مارگولیس صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"غزوہ احزاب کا حملہ جس کے متعلق محمدؐ صاحب کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ محض خُدائی تصرفات کے ماتحت پسپا ہوا وہ بنو نضیر ہی کی اشتعال انگیز کوششوں کا نتیجہ تھا یا کم از کم یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور بنو نضیر وہ تھے جنہیں محمدؐ صاحب نے صرف جلاوطن کر دینے پر اکتفا کی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا محمدؐ صاحب بنو قریظہ کو بھی جلاوطن کر کے اپنے خلاف اشتعال انگیز کوششیں کرنے والوں کی تعداد اور طاقت میں اضافہ کر دیں؟ دوسری طرف وہ قوم مدینہ میں بھی نہیں رہنے دی جاسکتی تھی جس نے اس طرح برملا طور پر حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا۔ ان کا جلاوطن کرنا غیر محفوظ تھا مگر ان کا مدینہ میں رہنا بھی کم خطرناک نہ تھا۔ پس اس فیصلہ کے بغیر چارہ نہ تھا کہ ان کے قتل کا حکم دیا جاتا۔"[1]

---

[1] محمدؐ مصنفہ مارگولیس صفحہ ۳۳۳

پھر یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ مدِنظر رکھنی چاہیئے کہ بنو قریظہ آنحضرت ﷺ کے صرف حلیف اور معاہد ہی نہیں تھے بلکہ وہ اپنے ابتدائی معاہدہ کی رُو سے مدینہ میں آپ کی حکومت کو تسلیم کر چکے تھے یا کم از کم آپ کی سوورینیٹی کو انہوں نے قبول کیا تھا پس ان کی حیثیت صرف ایک غدار حلیف یا معمولی دشمن کی نہیں تھی بلکہ وہ یقیناً باغی بھی تھے اور باغی بھی نہایت خطرناک قسم کے باغی۔ اور باغی کی سزا خصوصاً جنگ کے ایام میں سوائے قتل کے کوئی اور نہیں سمجھی گئی۔ اگر باغی کو بھی انتہائی سزا نہ دی جاوے تو نظامِ حکومت بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور شریر اور مفسدہ پرداز لوگوں کو ایسی جرأت حاصل ہو جاتی ہے جو امنِ عامہ اور رفاہِ عام کے لیے سخت مُہلک ثابت ہوتی ہے اور یقیناً ایسے حالات میں باغی پر رحم کرنا دراصل ملک پر اور ملک کے امن پسند لوگوں پر ظلم کے ہم معنی ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام متمدن حکومتیں اس وقت تک ایسے باغیوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت قتل کی سزا دیتی چلی آتی ہیں۔ اور کسی عقلمند انسان نے کبھی ان پر اعتراض نہیں کیا۔ پس سعدؓ کا فیصلہ بالکل منصفانہ اور عدل وانصاف کے قواعد کے بالکل مطابق تھا اور آنحضرت ﷺ بوجہ اپنے عہد کے اس فیصلہ کے متعلق رحم کے پہلو کو کام میں نہیں لاسکتے تھے سوائے افراد کے اور اس کے لیے آپ نے ہر ممکن کوشش کی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے اس شرم سے کہ انہوں نے آپ کو حَج ماننے سے انکار کر دیا تھا آپ کی طرف رحم کی اپیل کی صورت میں زیادہ رجوع نہیں کیا۔ اور ظاہر ہے کہ بغیر اپیل ہونے کے آپ رحم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جو باغی اپنے جُرم پر ندامت کا اظہار بھی نہیں کرتا اُسے خود بخود چھوڑ دینا سیاسی طور پر نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

ایک اور بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ جو معاہدہ آنحضرت ﷺ اور یہود کے درمیان ابتداء میں ہوا تھا اس کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر یہود کے متعلق کوئی امر قابل تصفیہ پیدا ہوگا تو اس کا فیصلہ خود انہیں کی شریعت کے ماتحت کیا جائے گا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ اس معاہدہ کے ماتحت آنحضرت ﷺ ہمیشہ یہود کے متعلق شریعتِ موسوی کے مطابق فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔ اب ہم تورات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں اِس قسم کے جرم کی سزا جس کے مرتکب بنو قریظہ ہوتے بعینہٖ وہی لکھی ہوئی پاتے ہیں جو سعد بن معاذ نے بنو قریظہ پر جاری کی۔

چنانچہ بائبل میں یہ خُدائی حکم درج ہے کہ:۔

"اور جب تو کسی شہر کے پاس اُس سے لڑنے کے لیے آپہنچے تو پہلے اُس سے صُلح کا پیغام کر۔ تب یُوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور اور دروازہ تیرے لیے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جاوے تیری خراج گزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی اور اگر وہ تجھ سے صُلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو اس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دیوے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر مگر عورتوں

اور لڑکوں اور مواشی کو۔ اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لئے لے[1]"

یہودی شریعت کا یہ حکم محض ایک کاغذی حکم نہیں تھا جس پر کبھی عمل نہ کیا گیا ہو بلکہ بنو اسرائیل کا ہمیشہ اسی پر عمل رہا ہے اور یہودی قضیئے ہمیشہ اسی اصل کے ماتحت تصفیہ پاتے رہے ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:۔

"اور انہوں نے (یعنی بنو اسرائیل نے) مدیانیوں سے لڑائی کی جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا تھا اور سارے مردوں کو قتل کیا۔ اور انہوں نے ان مقتولوں کے سوا آوی اور رقم اور صور اور حور اور ربع کو جو مدیان کے پانچ بادشاہ تھے جان سے مارا اور باعور کے بیٹے بلعام کو بھی تلوار سے قتل کیا اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے مواشی اور بھیڑ بکری اور مال و اسباب سب لوٹ لیا .... اور انہوں نے ساری غنیمت اور سارے اسیر انسان اور حیوان لئے اور وے قیدی اور غنیمت اور لوٹ موسیٰ اور الیعزر کاہن اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس خیمہ گاہ میں مواب کے میدانوں میں یردن کے کنارے جو یریحو کے مقابل ہے، لائے[2]"

حضرت مسیح ناصری کو (جو وہ بھی بنو اسرائیل میں سے ہی تھے) گو اپنی زندگی میں حکومت نصیب نہیں ہوئی اور نہ جنگ و جدال کے موقعے پیش آتے جن میں اُن کا طریق عمل ظاہر ہو سکتا۔ مگر ان کے بعض فقروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شریر اور بد باطن دشمنوں کے متعلق ان کے کیا خیالات تھے۔ چنانچہ اپنے دشمنوں کو مخاطب کر کے حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں:۔

"اے سانپو! سانپوں کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے[3]؟"

یعنی اے لوگو! تم زہریلے سانپوں کی طرح بن کر ہلاک کئے جانے کے قابل ہو گئے ہو لیکن مجھے یہ طاقت حاصل نہیں ہے کہ تمہیں سزا دوں مگر تم خدا سے ڈرو اور جہنم کی سزا کا ہی خیال کر کے اپنی بدکرداریوں اور شرارتوں سے باز آجاؤ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب حضرت مسیح کے متبعین کو دُنیا میں طاقت حاصل ہوئی تو انہوں نے حضرت مسیح کی اس تعلیم کے ماتحت کہ شریر اور بدکردار دشمن سانپوں اور بچھوؤں کی طرح ہلاک کئے جانے کے قابل ہے جسے بھی بدکردار اور شریر سمجھا اور اپنے ارادوں میں رخنہ انداز پایا اسے ہلاک کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ چنانچہ مسیحی اقوام کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ سعدؓ کا فیصلہ گو اپنی ذات میں سخت سمجھا جاوے مگر وہ ہرگز عدل و انصاف کے خلاف نہیں تھا۔ اور یقیناً یہود کے جرم کی نوعیت اور مسلمانوں کی حفاظت کا سوال دونوں اسی کے مقتضی تھے کہ یہی

---

[1] استثناء باب ۲۰ آیت ۱۰ تا ۱۵ [2] گنتی باب ۳۱۔ آیت ۷ تا ۱۲ [3] متی باب ۲۳ آیت ۳۳

فیصلہ ہوتا اور پھر یہ فیصلہ بھی یہودی شریعت کے عین مطابق تھا بلکہ اس ابتدائی معاہدہ کے لحاظ سے ضروری تھا کہ ایسا ہی ہوتا کیونکہ اس کی رُو سے مسلمان اس بات کے پابند تھے کہ یہود کے متعلق انہی کی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں۔ مگر جو کچھ بھی تھا یہ فیصلہ سعدؓ بن معاذ کا تھا آنحضرت ﷺ کا نہیں تھا۔ اور سعدؓ پر ہی اس کی پہلی اور آخری ذمہ واری عائد ہوتی تھی اور آنحضرت ﷺ کا تعلق بحیثیت صدر حکومت کے اس سے، صرف اس قدر تھا کہ آپ اس فیصلہ کو اپنی حکومت کے انتظام کے ماتحت جاری فرماویں۔ اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ آپ نے اسے ایسے رنگ میں جاری فرمایا جو موجودہ زمانہ کی مہذب سے مہذب اور رحم دل سے رحم دل حکومت کے لیے بھی ایک بہترین نمونہ سمجھا جاسکتا ہے۔

انصار کے رئیس اعظم کی وفات اور نعماء جنت کی حقیقت

حضرت سعدؓ بن معاذ رئیس قبیلہ اوس کی کلائی میں جو زخم غزوہ خندق کے موقعہ پر آیا تھا وہ باوجود بہت علاج معالجہ کے اچھا ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اور مندمل ہو ہو کر پھر کھل کھل جاتا تھا۔ چونکہ وہ ایک بہت مخلص صحابی تھے اور آنحضرت ﷺ کو ان کی تیمارداری کا خاص خیال تھا اس لیے آپ نے غزوہ خندق کی واپسی پر ان کے متعلق ہدایت فرمائی تھی کہ انہیں مسجد کے صحن میں ایک خیمہ میں رکھا جاوے تا آپ آسانی کے ساتھ ان کی تیمارداری فرماسکیں۔ چنانچہ انہیں ایک مسلمان عورت رفیدہ نامی کے خیمہ میں رکھا گیا جو بیماروں کی تیمارداری اور نرسنگ میں مہارت رکھتی تھی اور عموماً مسجد کے صحن میں خیمہ لگا کر مسلمان زخمیوں کا علاج کیا کرتی تھی[1] مگر باوجود اس غیر معمولی توجہ کے سعدؓ کی حالت روبہ اصلاح نہ ہوئی اور اسی دوران میں بنو قریظہ کا واقعہ پیش آگیا جس کی وجہ سے سعدؓ کو غیر معمولی مشقت اور کوفت برداشت کرنی پڑی اور ان کی کمزوری بہت بڑھ گئی۔ انہی ایام میں ایک رات سعدؓ نے نہایت گریہ وزاری سے یہ دُعا کی کہ " اے میرے مولا تو جانتا ہے کہ میرے دل میں یہ خواہش کس طرح بھری ہوئی ہے کہ میں اس قوم کے مقابل میں تیرے دین کی حفاظت کے لیے جہاد کروں جس نے تیرے رسول کی تکذیب کی اور اُسے اس کے وطن سے نکال دیا۔ اے میرے آقا! میرے خیال میں اب ہمارے اور قریش کے درمیان لڑائی کا خاتمہ ہو چکا ہے، لیکن اگر تیرے علم میں کوئی جنگ ابھی باقی ہے تو مجھے اتنی مہلت دے کہ میں تیرے رستے میں اُن کے ساتھ جہاد کروں، لیکن اگر اُن کے ساتھ ہماری جنگ ختم ہو چکی ہے تو مجھے اب زندگی کی تمنا نہیں ہے مجھے اس شہادت کی موت مرنے دے۔" لکھا ہے کہ اُسی رات سعدؓ کا زخم کُھل گیا اور اس قدر خون بہا کہ خیمے سے باہر نکل آیا اور لوگ گھبرا کر خیمہ کے اندر گئے تو سعدؓ کی حالت دگرگوں تھی آخر اسی حالت میں سعدؓ نے جان دیدی[2]

---

[1] طبری وابن سعد [2] بخاری کتاب المغازی باب مَرْجِعُ النَّبِيِّ مِنَ الْأَحْزَابِ

آنحضرت ﷺ کو سعد کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور واقعی اس وقت کے حالات کے ماتحت سعدؓ کی
وفات مسلمانوں کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھی۔ سعد کو انصار میں قریباً وہی حیثیت حاصل
تھی جو مہاجرین میں ابوبکرؓ صدیق کو حاصل تھی۔ اخلاص میں قربانی میں خدمتِ اسلام میں عشقِ رسول میں یہ
شخص ایسا بلند مرتبہ رکھتا تھا جو کم ہی لوگوں کو حاصل ہوا کرتا ہے۔ اور اس کے ہر حرکت وسکون سے یہ
ظاہر ہوتا تھا کہ اسلام اور بانیٔ اسلام کی محبت اس کی روح کی غذا ہے اور بوجہ اس کے کہ وہ اپنے
قبیلہ کا رئیس تھا اس کا نمونہ انصار میں ایک نہایت گہرا عملی اثر رکھتا تھا۔ ایسے قابل روحانی فرزند کی
وفات پر آنحضرت ﷺ کا صدمہ ایک فطری امر تھا مگر آپ نے کامل صبر سے کام لیا اور خدائی مشیت کے
سامنے تسلیم ورضا کا سر جھکا دیا۔

جب سعدؓ کا جنازہ اُٹھا تو سعدؓ کی بوڑھی والدہ نے بتقاضائے محبت کسی قدر بلند آواز سے اُن کا
نوحہ کیا اور اس نوحہ میں زمانہ کے دستور کے مطابق سعدؓ کی بعض خوبیاں بیان کیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس
نوحہ کی آواز سُنی تو گو آپ نے اُصولاً نوحہ کرنے کو پسند نہیں کیا مگر فرمایا کہ نوحہ کرنے والیاں بہت جھوٹ
بولا کرتی ہیں لیکن اس وقت سعدؓ کی ماں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ کہا ہے یعنی جو خوبیاں سعدؓ میں بیان
کی گئی ہیں وہ سب درست ہیں[1] اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی اور دفنانے کے
لیے خود ساتھ تشریف لے گئے اور قبر کی تیاری تک وہیں ٹھہرے رہے اور آخر وہاں سے دعا کرنے کے
بعد تشریف لائے[2]

غالباً اسی دوران میں کسی موقعہ پر آپ نے فرمایا۔ اِھْتَزَّ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ لِمَوْتِ سَعْدٍ[3]۔ یعنی
"سعد کی موت پر خدائے رحمان کا عرش جھومنے لگ گیا ہے۔" یعنی عالم آخرت میں خدا کی رحمت نے خوشی
کے ساتھ سعدؓ کی روح کا استقبال کیا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد جب آپ کو کسی جگہ سے کچھ ریشمی پارچات
ہدیۃً آئے تو بعض صحابہ نے انہیں دیکھ کر ان کی نرمی اور ملائمت کا بڑے تعجب کے ساتھ ذکر کیا اور اسے
ایک غیر معمولی چیز جانا۔ آپ نے فرمایا "کیا تم ان کی نرمی پر تعجب کرتے ہو۔ خدا کی قسم جنت میں سعد کی
چادریں ان سے بہت زیادہ نرم اور بہت زیادہ اچھی ہیں[4]۔"

نعمائے جنت کی حقیقت

آپ کا یہ کلام ایک استعارے کے رنگ میں تھا جس میں سعدؓ کے
اس راحت کے مقام کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا جو انہیں جنت میں
حاصل ہوا تھا۔ ورنہ جیسا کہ قرآن شریف اور احادیث سے اُصولی طور پر پتہ لگتا ہے جنت کی نعمتوں کا اس
دُنیا کی نعمتوں پر قیاس نہیں ہو سکتا اور نہ جنت کی نعمتیں ہماری اصطلاح کے لحاظ سے مادی کہلا سکتی

---

[1] و [2] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۴۱ [3] بخاری ابواب مناقب انصار [4] بخاری باب مَاجَاءَ فِی صِفَةِ الْجَنَّةِ

ہیں اور حق یہی ہے کہ جو الفاظ قرآن وحدیث میں بیان ہوئے ہیں ان میں صرف استعارہ اور تشبیہ کے طور پر نعمتوں کے کمال کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ اُصولی طور پر فرماتا ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ۔ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ[1] یعنی کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا کہ نیک لوگوں کے اعمال کے بدلے میں اُن کے لیے جنّت میں کس قسم کا آنکھ کی ٹھنڈک کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔" اور اس کی تفسیر میں حدیث میں آتا ہے لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ[2] یعنی جنت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ کبھی کسی انسان کی آنکھ نے انہیں نہیں دیکھا اور کبھی کسی انسان کے کان نے انہیں نہیں سُنا اور نہ ان کا تصوّر کبھی کسی بشر کے دل میں گذرا ہے"۔ پس لازماً ماننا پڑیگا کہ جنّت کی نعمتیں وہ نعمتیں نہیں جو ہم اس دُنیا میں دیکھتے ہیں یعنی جنّت کے پھل وہ پھل نہیں جو ہم اس دُنیا میں کھاتے ہیں اور جنّت کے دودھ اور شہد وہ دودھ اور شہد نہیں جو ہم اس دُنیا میں پیتے ہیں۔ اور جنّت کی حوریں وہ حوریں نہیں جو ہم اس دُنیا میں خوبصورت عورت کے معنوں میں سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ کچھ اور ہی چیزیں ہیں جن کو بطریق استعارہ اس دنیا کی چیزوں کا نام دے دیا گیا ہے مگر جن کا وہم وتصوّر بھی ہمارے خیال میں نہیں آسکتا۔ لیکن اس قدر بہر حال یقینی ہے کہ جنّت کی سب نعمتیں خواہ وہ انسانی رُوح کے واسطے ہوں یا جسم کے لیے وہ خالص پاکیزگی اور طہارت پر مبنی ہیں اور ہر قسم کی بدی اور ناپاکی کے عنصر سے کلیتہً پاک ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف فرماتا ہے لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ[3] یعنی "جنت وہ مقام ہے کہ اس میں کوئی عنصر بے ہودگی اور بدی اور ناپاکی کا نہیں ہوگا"۔

۵ ہجری کے بعض متفرق واقعات

اس سال میں بعض متفرق واقعات بھی ہوئے جن کی معیّن تاریخ روایات میں مذکور نہیں ہوئی۔ ان میں سے ایک واقعہ ایک زلزلہ کا آنا ہے۔ جب یہ دھکا مدینہ میں محسوس ہوا تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو نصیحت فرمائی کہ یہ قدرت کے واقعات ہیں جن سے ایک مومن کو نصیحت حاصل کرنی چاہیئے اور اللہ تعالیٰ بعض اوقات اس قسم کے واقعات لوگوں کے بیدار کرنے کے لیے پیدا کر دیتا ہے اور ان کو ہوشیار و چوکس رکھنا چاہتا ہے[4]

بعض روایات کے مطابق اسی سال حج فرض ہوا لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ روایات درست نہیں ہیں۔ بلکہ حج کی باقاعدہ مشروعیت کا زمانہ بعد کا ہے۔ گو جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے عید اضحیٰ جو حج کے ساتھ لازم وملزوم کے طور پر ہے ۲ ہجری میں ہی مشروع ہوگئی تھی اور صحیح روایات سے یہ بھی پتہ چلتا

---

[1] قرآن شریف سورۃ السجدہ: ۱۸ [2] بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ تنزیل السجدۃ [3] سورۃ طور: ۲۴
[4] خمیس جلد ا صفحہ ۵۶۵

ہے کہ مسلمان شروع سے ہی خانہ کعبہ کی حرمت کا خیال رکھتے تھے اور نفل وغیرہ کے طریق پر کعبۃ اللہ کا طواف بھی موقع پاکر کرتے رہتے تھے مگر فریضۂ حج کی باقاعدہ اور بالتفصیل مشروعیت غالباً بعد میں ہوئی تھی[1] اس لیے ہم اس بحث کو اس جگہ ترک کرتے ہیں۔ اسی سال یعنی ۵ھ ہجری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ گھوڑے پر سے گر گئے اور آپ کی پنڈلی اور ران وغیرہ پر چوٹیں آئیں جس کی وجہ سے آپ پانچ دن بیٹھ کر نماز ادا فرماتے رہے[2]

فنونِ سپاہ گری کی طرف آپکی توجہ

اسی سال آپ نے جنگی ضروریات کے ماتحت بعض گھڑ دوڑیں کروائیں[3] اور ویسے یہ تحریک تو آپ صحابہ میں ہمیشہ فرماتے رہتے تھے کہ وہ گھوڑے رکھیں اور سواری کے فن میں کمال پیدا کریں اور جہاد کی غرض وغایت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ اسے ایک بڑا کارِ ثواب خیال فرماتے تھے[4] چنانچہ جن صحابہ کو توفیق تھی وہ خاص شوق کے ساتھ گھوڑے پالتے تھے اور ایک روایت میں یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ صحابہ کرام گھوڑوں کی کدائی کی مشق بھی کیا کرتے تھے[5] اسی طرح آپ اونٹوں کی دوڑ بھی کروایا کرتے تھے چنانچہ خود آپ کی اپنی ایک اونٹنی تھی جو عموماً سب سے آگے رہتی تھی[6]

دراصل آپ کا یہ عام طریق تھا کہ آپ جسمانی ورزش اور تحصیل فنونِ سپاہ گری کی طرف اپنے صحابہ کو بہت توجہ دلاتے رہتے تھے اور بعض اوقات اُن میں جوش پیدا کرنے کے لیے خود بھی ایسے موقعوں میں حصّہ لیتے تھے۔ چنانچہ بعض اوقات آپ نے اپنے سامنے تیر اندازی اور تلوار اور نیزے کے کرتبوں کے مقابلے کراتے[7] آپ یہ بھی تحریک فرماتے تھے کہ مسلمانوں کو چُست ہو کر اور تیز تیز چلنا چاہیئے[8] تاکہ دشمن پر ان کی مضبوطی اور چستی کا رُعب پڑے اور خود بھی ان میں چُستی کا احساس پیدا ہو۔ جنگی ضروریات کے لیے بعض صحابہ تیز دوڑنے کی بھی مشق کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس معاملہ میں ایک صحابی سلمہ بن اکوع خاص طور پر ماہر تھے حتّیٰ کہ بعض روایات سے پتہ لگتا ہے کہ بعض اوقات وہ گھوڑوں سے بھی آگے نکل جاتے تھے[9] دو ایک دفعہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ کیا تھا[10] اور گو یہ خوش مزاجی کے طریق پر ہو مگر اس سے اس زندہ اور چُست رُوح کے اندازہ کرنے کا موقعہ ملتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ میں کام کرتی تھی اور جس سے ان کی مستورات بھی خالی نہیں تھیں۔

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۴۳۔ نیز زاد المعاد جلد ا صفحہ ۱۸۰ [2] خمیس جلد ا صفحہ ۵۶۵ و موطا باب صلوٰۃ الامام وَ ہُوَ جَالِسٌ۔

[3] خمیس جلد ا صفحہ ۵۶۵۔ نیز بخاری کتاب الجہاد باب غایۃ السبق الخیل۔ [4] بخاری کتاب الجہاد باب من احتبس فرساً

[5] ″ ″ ″ ″ [6] بخاری کتاب الجہاد باب ناقۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [7] بخاری کتاب الجہاد باب التحریض علی الرمی و باب الدرق

[8] بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء۔ [9] اصابہ بحالات سلمہ بن اکوع [10] ابوداؤد باب السبق

اسلامی قانون شادی وطلاق

شادی اور طلاق وغیرہ کے مسائل کے متعلق بھی بہت سے اسلامی احکام اِسی سال نازل ہوتے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر ایک مختصر سا خاکہ شادی اور طلاق کے مسائل کے متعلق اسلامی تعلیم کا پیش کر دیا جاوے۔ سو سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام سے قبل عربوں میں کوئی خاص قانون شادی وطلاق مقرر نہیں تھا بلکہ محض ایک رسم یا طریق عمل کی صورت تھی اور اس کی پابندی بھی ہر شخص کی اپنی مرضی پر موقوف تھی۔ اور اسی لیے ملک کے مختلف حصوں اور مختلف قبائل میں یہ طریق عمل مختلف صورتیں رکھتا تھا۔

عام طور پر یہ سمجھنا چاہیئے کہ عرب میں جائز و ناجائز رشتوں میں زیادہ حد بندی نہیں تھی حتیٰ کہ سوتیلی ماں تک سے شادی کرنے میں پرہیز نہیں تھا[1] قریبی رشتہ دار کی بیوہ پر بغیر اس کی مرضی کے زبردستی قبضہ کر لینے کی رسم بھی پائی جاتی تھی[2] نکاح کے طریق مختلف تھے اور ان میں سے چار زیادہ شائع و متعارف تھے۔ ان میں سے ایک تو یہی رسمی نکاح تھا جو بعد میں زیادہ پاک وصاف ہو کر اسلام میں قائم ہوا لیکن باقی تین ایسے گندے اور ناپاک تھے کہ ان کے ذکر تک سے انسانی طبیعت رُکتی ہے[3] تعددِ ازدواج کی کوئی حد بندی نہیں تھی بلکہ بیویوں کی تعداد ہر شخص کی ذاتی ضرورت۔ دولت اور شوق پر منحصر تھی[4] بیویوں کے درمیان عدل و انصاف کا کوئی ضابطہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے متعلق خاوند پر کوئی پابندی تھی۔ مرد کے عورت پر اور عورت کے مرد پر کوئی مقررہ حقوق نہیں تھے بلکہ سارا دار ومدار مرد کی مرضی پر تھا۔ طلاق کا کوئی قانون نہیں تھا۔ مرد جب اور جس طرح چاہتا تھا عورت کو طلاق دیکر الگ کر دیتا تھا۔ اگر مرد کی مرضی نہ ہو تو عورت کے لیے طلاق حاصل کرنے کا کوئی رستہ نہیں تھا۔ طلاق کے بعد بھی جابر لوگ اپنی مطلقہ عورت پر حکومت رکھتے تھے اور اسے دوسری جگہ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے[5] عدّت کا قانون بھی کوئی نہیں تھا بلکہ ادھر جُدائی ہوتی تھی اور اُدھر عورت دوسرے شخص کے ساتھ شادی کے لیے آزاد سمجھی جاتی تھی[6] الغرض شادی وطلاق کے معاملہ میں عرب میں کوئی قانون نہیں تھا بلکہ سارا دار ومدار مرد کی مرضی پر تھا۔ اور مرد عموماً اپنی بیویوں کے ساتھ نہایت جابرانہ سلوک کرتے تھے اور عورت کے لیے کوئی داد رسی کی جگہ نہیں تھی۔ اسلام آیا تو اس نے گویا ایک نیا عالم پیدا کر دیا۔ اور محض انتظامی فرق کے سوا کہ جو لابدی تھا اصولاً عورت اور مرد کے مساویانہ حقوق تسلیم کئے[7] اور ان حقوق کی حفاظت و نگہداشت کا کام مرد پر نہیں

---

[1] قرآن شریف سورۃ نساء: ۲۳ [2] سورۃ نساء: ۲۰ [3] بخاری کتاب النکاح باب مَنْ قَالَ لَانِکَاحَ اِلَّابِوَلِیٍّ [4] ترمذی ابواب النکاح باب مَاجَاءَ فِی الرَّجُلِ یَسْلِمُ وَعِنْدَہٗ عَشْرُ نِسْوَۃٍ

[5] سورۃ البقرۃ: ۲۳۳ [6] مؤطا امام مالک کتاب النکاح باب جَامِعُ مَالَا یَجُوْزُ مِنَ النِّکَاحِ

[7] سورۃ البقرۃ: ۲۲۹

چھوڑا بلکہ حکومت کے ہاتھ میں دیا۔ اور حکومت کا یہ فرض مقرر کیا کہ وہ خاوند و بیوی کے حقوق میں ایک دوسرے کی دست درازی کو روکے اور خصوصاً ضعیف طبقہ نساء کی حفاظت کرے۔ اور دوسری طرف اسلام نے اپنے روحانی اور اخلاقی اثر کے ماتحت مردوں کو یہ پُرزور سفارش کی کہ وہ عورتوں کے ساتھ نہ صرف عدل و انصاف بلکہ شفقت و احسان کا معاملہ کریں۔ اور اس معاملہ میں اسلام نے اتنا زور دیا کہ بعض صحابہ میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اسلام نے تو گویا عورت کو آزاد کر دیا ہے۔[1]

اسلامی قانون شادی و طلاق کا اصل الاصول یہ ہے کہ نکاح مرد و عورت کے درمیان ایک سوِل معاہدہ کا رنگ رکھتا ہے[2] جسے گو عام معاہدات کی نسبت بہت زیادہ محبت اور وفاداری اور تقدس اور دوام کا عنصر دیا گیا ہے[3] مگر انتہائی حالات میں وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے[4] اور اسی ٹوٹنے کا نام اسلامی اصطلاح میں طلاق یا خلع یا فسخِ نکاح ہے۔ یہ سوِل معاہدہ کس طرح قائم ہو سکتا اور کس طرح ٹوٹ سکتا ہے اس کے متعلق اسلامی قانون کا ڈھانچہ حسب ذیل ہے۔ پہلے ہم قانونِ شادی کو لیتے ہیں:۔

۱۔ نکاح کرنا اسلام میں ہر اس مسلمان پر جو اس کی طاقت رکھتا ہو فرض ہے اور تبتّل سے منع کیا گیا ہے[5]

۲۔ نکاح کی اغراض تعددِ ازدواج کی بحث میں دوسری جگہ مفصّل بیان کی جا چکی ہیں اس جگہ اعادہ کی ضرورت نہیں[6]

۳۔ جن جگہوں میں رشتہ منع ہے ان کا اسلام نے صراحت و تعیین کے ساتھ ذکر کر دیا ہے باقی سب کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔ کوئی قومی یا نسلی حد بندی نہیں ہے۔ ممنوع رشتے اصولاً یہ ہیں۔ باپ کی بیوی۔ ماں۔ رضاعی ماں۔ بیٹی۔ بیوی کی بیٹی۔ بہن۔ رضاعی بہن۔ خالہ۔ پھوپھی۔ بھتیجی۔ بھانجی۔ ساس۔ بہو۔ ہر خاوند والی عورت۔ اور دو بہنوں کا ایک وقت میں جمع کرنا[7] اس حکم کی مزید تشریح حدیث میں کر دی گئی ہے[8]

۴۔ نکاح چونکہ مرد و عورت کے ایک معاہدہ کا نام ہے اور انہوں نے ہی اسے نباہنا ہوتا ہے۔ اس لیے

---

[1] مسلم کتاب النکاح باب فی الایلاء و ابوداؤد کتاب النکاح باب فی ضربِ النساءِ [2] سورۃ بقرہ ۲۳۳: ۲۲۸ و ۲۳۸ و سورۃ نساء ۲۱ و ۲۲ نیز بخاری کتاب النکاح باب الشُّرُوطُ فِی النِّکَاحِ [3] بخاری کتاب النکاح باب الشُّرُوطُ فِی النِّکَاحِ [4] سورۃ طلاق ع ۱ و ابوداؤد کتاب الطلاق [5] سورۃ نساء ۴: ۲ سورۃ نور ۳۱ تا ۳۳ و بخاری کتاب النکاح بابُ الترغیب فی النکاح و باب مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْکُمُ الْبَاءَۃَ وَبَابُ مَایُکْرَہُ مِنَ التَّبَتُّلِ [6] دیکھو کتاب ہذا بحث تعدد ازدواج واقعات ۲ سنہ ہجری [7] سورۃ نساء ۴: ۲۲، ۲۸ تا ۳۲ [8] بخاری کتاب النکاح ابواب ۲۱ تا ۲۸ نیز دیکھو زاد المعاد فصول متعلقہ

نکاح میں فریقین کی رضامندی ضروری ہے یعنی لڑکا اور لڑکی یا مرد و عورت دونوں اس تعلق کے قائم کرنے پر رضامند ہونے چاہئیں۔ اور ان کی رضامندی کے بغیر یہ رشتہ قائم نہیں ہوسکتا۔[۱]

۵۔ باوجود پردہ کی حد بندیوں کے اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی تحریک کرتا ہے کہ نکاح سے پہلے مرد و عورت ایک دوسرے پر نظر ڈال لیں تاکہ شکل وغیرہ کا سوال بعد میں موجب خلش نہ بنے[۲]

۶۔ اسلام میں نکاح اعلان کے ساتھ علیٰ رؤس الاشہاد ہونا ضروری ہے اور خفیہ نکاح کی اجازت نہیں ہے[۳]۔ اسی اعلان کی غرض سے اسلام میں یہ طریق مقرر کیا گیا ہے کہ جب خاوند بیوی اکٹھے ہوں تو اس خوشی میں خاوند ایک دعوت دے جس میں حسب توفیق اعزہ و احباب اور ہمسائے وغیرہ بُلائے جائیں۔ اس دعوت کو اصطلاحی طور پر ولیمہ کہتے ہیں[۴]

۷۔ اگر کسی مصلحت کے ماتحت کسی لڑکے یا لڑکی کا ولی یعنی گارڈین اس کے بچپن کی حالت میں ہی یعنی اس کے بالغ ہونے سے پہلے اس کی شادی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے[۵] کیونکہ بعض اوقات استثنائی صورتوں میں خاص مصالح کے ماتحت ایسا کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے جس کے لیے قانونی طور پر دروازہ کھلا رہنا چاہیے۔ مگر ایسی صورت میں لڑکے کو تو حق ہے ہی۔ لڑکی کو بھی لازماً بالغ ہونے پر حاکم کے ذریعہ اس رشتہ کے منقطع کرنے کا حق ہوگا اور اس کی رضامندی کے بغیر یہ رشتہ قائم نہیں رہ سکے گا[۶] اس حق کو اسلامی اصطلاح میں خِیَارُ الْبُلُوْغ کہتے ہیں۔ مگر یہ خیال رہے کہ ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ استثنائی حالات میں نابالغی کے زمانہ میں بھی رشتہ ہوسکتا ہے اس سے مراد صرف عقدِ نکاح ہے۔ زناشوئی کے تعلقات مراد نہیں

---

[۱] سورۃ نساء: ۲۰ و ۲۱ ۔ نیز بخاری کتاب النکاح باب لَا يُنْكِحُ الْأَبُ وَغَيْرُهُ الْبِكْرَ وَالثَّيِّبَ إِلَّا بِرِضَاهَا و مسلم کتاب النکاح باب اِسْتِيذَانُ الثَّيِّبِ فِي النِّكَاحِ بِالنُّطْقِ وَالْبِكْرِ بِالسُّكُوْتِ ۔ [۲] سورۃ نساء: ۲ / ۴ نیز بخاری کتاب النکاح باب اَلنَّظْرُ إِلَى الْمَرْأَةِ قَبْلَ التَّزْوِيْجِ و ترمذی ابواب النکاح باب مَا جَاءَ فِي النَّظْرِ إِلَى الْمَخْطُوْبَةِ ۔

[۳] ترمذی ابواب النکاح باب مَا جَاءَ فِي إِعْلَانِ النِّكَاحِ و موطا امام مالک کتاب النکاح باب جَامِعُ مَالَا يَجُوْزُ مِنَ النِّكَاحِ ۔ [۴] بخاری کتاب النکاح از باب اَلْوَلِيْمَةُ حَقٌّ تا باب إِجَابَةُ الدَّاعِي فِي الْعُرْسِ ۔

[۵] سورۃ طلاق: ۵ و بخاری کتاب النکاح بَابُ النِّكَاحِ الرَّجُلِ وَلَدَهُ الصِّغَارِ

[۶] اس حق کا اصل الاصول تو قرآن شریف میں ہے جہاں یہ تصریح کی گئی ہے کہ نکاح میں عورت اپنے خاوند سے ایک پختہ عہد لیتی ہے دیکھو سورۃ نساء: ۲۰ تا ۲۲ اور یہ منشاء پورا نہیں ہوسکتا جب تک کہ بچپن کی شادی کی صورت میں لڑکی کو بالغ ہونے پر عقدِ نکاح کے قائم رکھنے یا فسخ کرنے کا حق نہ ہو۔ نیز دیکھو ترمذی ابواب النکاح باب مَا جَاءَ فِي إِكْرَاهِ الْيَتِيْمَةِ عَلَى التَّزْوِيْجِ

کیونکہ زناشوئی کے تعلق کے لیے ہر دو کا بالغ ہونا ضروری ہے[1]

۸۔ گو نکاح کے عقد میں اصل رضامندی فریقین کی ہے اور ان کی رضامندی کے بغیر نکاح قائم نہیں رہ سکتا اور اگر کسی خاص مصلحت سے بچپن میں نکاح ہو بھی جاوے تو نارضامندی کی صورت میں بالغ ہونے پر وہ قائم نہیں رہ سکتا، لیکن چونکہ لڑکی اور خصوصاً کنواری لڑکی طبعاً زیادہ سادہ مزاج اور بھولی ہوتی ہے اور دُنیا کا تجربہ بھی اُسے نسبتاً کم ہوتا ہے اور وہ ان باتوں سے بھی زیادہ آگاہ نہیں ہوتی جن پر اہلی زندگی کی حقیقی خوشی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اور پھر فطرتاً عورت کے اندر قلبی جذبات کا مادہ بھی زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات جذبۂ عقل مستور ہو جاتا ہے اس لیے اسے کسی غلط راستہ پر پڑنے اور چالاک اور شاطر مَردوں کے دھوکے سے بچانے کے لیے اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ جب کسی کنواری لڑکی کے رشتہ کا سوال ہو تو اس کا باپ یا باپ نہ ہو تو کوئی اور قریبی رشتہ دار بطور ولی کے اس کے ساتھ رہے اور اس کے مشورہ کے بغیر رشتہ قائم نہ ہو[2] لیکن اگر لڑکی اور ولی میں اختلاف ہو جاوے تو ترجیح لڑکی کی رائے کو دی جائیگی[3] مگر اس صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ اس اختلاف کو حاکم کے نوٹس میں لایا جاوے تاکہ اگر لڑکی کسی دھوکے کا شکار ہو رہی ہو تو اس کا سدّباب کیا جا سکے[4] بیوہ عورت چونکہ کنواری کی نسبت شادی کے اونچ نیچ سے بہت واقف ہو چکی ہوتی ہے اور ان امور کو سمجھ چکی ہوتی ہے جن پر اہلی تعلقات بہترین صورت میں چل سکتے ہیں اس لیے اِس کے معاملہ میں گو ولی کا ساتھ رہنا پسندیدہ ہے مگر ولی کی رضامندی ضروری نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنے اختیار سے فیصلہ کر سکتی ہے[5]

یہ مسئلہ ولایت جس کا عنصر تو کم و بیش اکثر مذاہب میں پایا جاتا ہے مگر جسے اسلام نے ایک معیّن اور تفصیلی قانون کی صورت دیدی ہے ایک نہایت ہی مفید اور بابرکت نظام ہے۔ کیونکہ اس سے لڑکیوں کے نکاح کے معاملہ میں بہت سے دھوکوں کا سدّباب ہو جاتا ہے اور شریر اور شاطر لوگ سادہ طبع لڑکیوں کو سبز باغ دکھا کر اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کا موقعہ نہیں پاتے۔ مغربی ممالک میں جہاں آجکل لڑکیوں کو نکاح کے معاملہ میں بہت زیادہ آزادی حاصل ہے وہاں اس قسم کے واقعات نہایت کثرت کے ساتھ ہوتے رہتے

---

[1] سورۃ بقرہ: ۲۲۴ تا ۲۲۹ نیز ترمذی تفسیر سورۃ بقرۃ زیر آیت نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ روایت ابن عباسؓ

[2] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی الولی و ترمذی ابواب النکاح باب ما جاء لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ۔ [3] بخاری کتاب النکاح باب لَا يُنْكِحُ الْاَبُ وَغَيْرُهٗ الْبِكْرَ وَالثَّيِّبَ اِلَّا بِرِضَاءِهَا۔ نیز ابوداؤد کتاب النکاح باب فِي الْبِكْرِ يُزَوِّجُهَا اَبُوْهَا وَلَا يَسْتَامِرُهَا۔ [4] ترمذی ابواب النکاح باب ما جاء لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ و ابوداؤد کتاب النکاح باب فِي الْوَلِيِّ

[5] مسلم کتاب النکاح باب اِسْتِئْذَانُ الثَّيِّبِ فِي النِّكَاحِ بِالنُّطْقِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ۔ نیز ابوداؤد کتاب النکاح باب فی الثیب۔

ہیں کہ شاطر لوگ بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنی چرب زبانی اور شہوانی محبت کے مظاہروں سے متاثر کر کے انکے گارڈینوں کی مرضی اور اطلاع کے بغیر اُن کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں اور جب وہ اُن کے دام میں آجاتی ہیں تو پھر دھوکے کا چولہ اُترنا شروع ہو جاتا ہے اور شہوانی محبت بھی آہستہ آہستہ سرد پڑنے لگ جاتی ہے اور زیادہ عرصہ نہیں گذرتا کہ وہ گھر جس کے اندر ان لڑکیوں نے جنت سمجھ کر قدم رکھا تھا اُن کے لیے ایک دوزخ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ابتداءً بے اتفاقی اور پھر بے اتفاقی اور پھر لڑائی اور اس کے بعد جُدائی اور بالآخر طلاق تک نوبت پہنچتی ہے۔

علاوہ ازیں اس ولایت کے انتظام میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس طرح نکاح کی بنیاد صرف جذبات پر قائم نہیں ہوتی بلکہ دوسرے امور بھی جو رشتہ نکاح میں دیکھنے نہایت ضروری ہوتے ہیں مدِّ نظر رہتے ہیں مثلاً اخلاقی اور دینی حالت۔ خاندانی حالت۔ مالی حالت۔ تمدنی مناسبت۔ طبائع کی موافقت۔ عمر۔ صحت وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اگر دو نوجوانوں کو بغیر کسی قسم کے مشورہ اور ولایت کے سہارے کے یونہی اکیلا چھوڑ دیا جاوے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے طور پر شادی کر لیں تو چونکہ نوجوانوں میں عموماً جذبات کا زور ہوتا ہے اور مستثنیات کو الگ رکھتے ہوئے یہ جذبات بھی زیادہ تر شہوانی محبت کا رنگ رکھتے ہیں اس لیے دوسرے امور کا نظر انداز ہو جانا بالکل اغلب ہوتا ہے اور عملاً سارا معیار صرف وقتی جذبات پر آ جاتا ہے جس کا نتیجہ اکثر خطرناک نکلتا ہے۔ لیکن ولایت کے انتظام میں یہ خطرہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔ کیونکہ لڑکی کے جذبات کے ساتھ ساتھ ولی کے عقل و تجربہ کی شمع بھی اپنا کام کرتی ہے پس ولایت کا انتظام ایک نہایت ہی مبارک انتظام ہے جس میں ایک طرف تو عورت کی جائز آزادی اور اس کا حق انتخاب قائم رہتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ شریر اور شاطر لوگوں کے دام تزویر میں پھنسنے یا محض جذباتی رَو میں بہ کر عقل و تجربہ کے مشورے کو خیر باد کہہ دینے کے بد نتائج سے بچ جاتی ہے۔

۹۔ اسلامی نکاح میں مہر ایک ضروری شرط ہے یعنی مرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق کوئی رقم یا جائیداد یا چیز جس کا فیصلہ فریقین کی رضا مندی پر موقوف ہوتا ہے عورت کو دے[1]۔ یہ مہر خاوند کے ذمہ ایک قانونی قرض کا رنگ رکھتا ہے اور اس کی مالک اور متصرف کلیتہً عورت ہوتی ہے۔ نیز یہ مہر اس حصہ کے علاوہ ہوتا ہے جو عورت کو اس کے خاوند کی وفات پر بطور ورثہ کے ملتا ہے۔ گویا اسلام میں عورت کو تین مختلف ذریعوں سے مال پہنچتا ہے۔ اوّل اس کے والدین وغیرہ کی طرف سے بطور ورثہ کے[2] دوسرے اس کے خاوند کی طرف سے بطور ورثہ کے[3] تیسرے مہر کے ذریعہ سے اور اس پر لطف یہ ہے

---

[1] سورۃ نساء: ۲۵، ۲۶ - سورۃ بقرہ: ۲۳۸ نیز مشکوٰۃ کتاب النکاح باب الصداق

[2] سورۃ نساء: ۱۲، ۱۳ [3] سورۃ نساء: ۱۳

کہ عورت کے ذمہ خرچ کوئی نہیں ہوتا۔

۱۰۔ خاوند اپنی حیثیت کے مطابق اپنی بیوی کے ضروری اخراجات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہے[۱] اور یہ خرچ مہر وغیرہ کے علاوہ ہوتا ہے۔

۱۱۔ اگر عورت و مرد نکاح کے وقت آپس میں کوئی خاص معاہدہ یا شرائط کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں اور اس کی پابندی دونوں پر واجب ہوگی[۲] مگر وہ کوئی ایسی شرائط نہیں کر سکتے جن سے شریعت کے کسی حکم کا بطلان لازم آتے[۳] اور نہ کوئی ایسی شرط کر سکتے ہیں جو اخلاقاً قابلِ اعتراض ہو یا جس کے نتیجہ میں کسی تیسرے فریق پر سختی لازم آتی ہو[۴] اس اصل کے ماتحت اسلام میں اس بات کی اجازت سمجھی جائیگی کہ اگر کوئی عورت اپنے لیے سوکن کے وجود کو ناقابلِ برداشت یقین کرتی ہے تو وہ نکاح کے وقت خاوند کے ساتھ یہ شرط کر لے کہ اس کے ہوتے ہوئے خاوند دوسری شادی نہیں کرے گا یعنی یا تو وہ دوسری شادی بالکل ہی نہیں کرے گا یا پہلے اسے طلاق دے کر جُدا کرلے گا تو پھر دوسری شادی کریگا۔ اور چونکہ اسلام میں تعددِ ازدواج کا حکم نہیں ہے بلکہ صرف خاص حالات کے لیے اجازت ہے اور ایسی شرط سے کسی تیسرے شخص پر بھی کوئی ناواجب اثر نہیں پڑتا اس لیے ایسا معاہدہ ناجائز نہ ہوگا[۵]

۱۲۔ اس انتظامی فرق کے سوا کہ خاوند نظامِ اہلی کا امیر ہوتا ہے۔ اسلام میں عورت و مرد کے مساویانہ حقوق تسلیم کئے گئے ہیں[۶] اور اس اہلی امارت میں بھی خاوند بالکل آزاد نہیں ہے بلکہ اُسے حکم ہے کہ اپنی بیوی کیساتھ محبت اور خوش اخلاقی اور ولداری اور عفو کا سلوک کرے[۷] اور گو اسے گھر کا امیر ہونے کی حیثیت میں تادیب کا بھی حق ہے۔ مگر یہ تادیب مناسب اور واجبی ہونی چاہیئے[۸] بیوی کے ساتھ حسن سلوک کا اس قدر تاکیدی حکم ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ[۹] یعنی " اے مسلمانو! تم میں سے سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ سلوک کرنے میں سب سے اچھا ہے " اور آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ عورت کی مثال پسلی کی ہڈی کی ہے جو خِلقتاً خمدار ہوتی ہے اور جسے اگر کوئی انسان سیدھا کرنے

---

۱ سورۃ بقرہ: ۲۳۴ و سورۃ نساء: ۳۵ و سورۃ طلاق: ۸ نیز بخاری ابواب النفقات و مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی صلعم و ابوداؤد کتاب النکاح باب فِی حَقِّ الْمَرْأَۃِ عَلٰی زَوْجِھَا۔ ۲ بخاری کتاب النکاح باب الشروط فی النکاح و باب الشروط الّتی لَا تَحِلُّ۔ نیز ترمذی ابواب النکاح باب ماجاء فی الشرط عند عقدہ النکاح۔ ۳ بخاری کتاب البیوع باب اذا اشترط شروطاً فی البیع لاتحل ۴ بخاری کتاب النکاح باب الشروط التی لاتحل۔ ۵ مؤطا کتاب النکاح مَالَا یَجُوْزُ مِنَ الشُّرُوْطِ فِی النِّکَاحِ نیز چشمہ معرفت مصنفہ مقدس بانی سلسلہ احمدیہ صفحہ ۲۲۷ و ۲۲۸ ۶ سورۃ بقرہ: ۲۲۴ تا ۲۲۷ ۷ سورۃ نساء: ۲۰، ۲۱ نیز بخاری کتاب النکاح باب حسن المعاشرت مع الاہل ۸ سورۃ نساء: ۳۵ و بخاری کتاب النکاح باب مایکرہ من ضرب النساء والبوداؤد کتاب النکاح باب فی حق المرأۃ علی زوجہا

۹ ترمذی و ابن ماجہ بحوالہ مشکوۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء فصل ثانی

کی کوشش کرے تو وہ اپنا کام نہیں دے سکیگی جو اس کے خمدار ہونے کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور یہ بھی نتیجہ ہوگا کہ وہ ٹوٹ جائیگی۔ اسی طرح عورت بھی فطرتاً خمدار ہے۔ یعنی اسکی طبیعت میں بعض خاص ادائیں رکھی گئی ہیں جو ہیں تو بظاہر کجیاں مگر حقیقتہً انثیت کی جان ہیں۔ اگر اسس کے اس فطری خم کو کوئی شخص سیدھا کرنا چاہیے گا تو وہ اُسے سیدھا تو نہیں کر سکے گا مگر یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ پسلی کی ہڈی کی طرح عورت ٹوٹ جائے گی[1] یعنی یا تو وہ اپنے خاوند کے گھر میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر ہلاک ہوجائے گی اور یا جدائی اور طلاق تک نوبت آئے گی۔ پس انسان کو چاہیئے کہ عورت کے اس فطری خم کو جو اس کی انثیت کے ساتھ لازم وملزوم کے طور پر ہے سیدھا کرنے کی بے سود کوشش نہ کرے بلکہ اسی خم کے ساتھ اس کے ساتھ نبھاؤ کرے۔ اور آپ نے فرمایا اِنَّ اَعْوَجَ شَیْءٍ فِی الضِّلَعِ اَعْلَاہُ[2] "پسلی کا سب سے ٹیڑھا حصہ ہی سب سے اونچا ہوتا ہے۔" یعنی حقیقتہً عورت کا یہ نظری خم ہی اسس کی نوع کا کمال ہے اور ایک عورت اپنی انثیت میں جتنی کامل ہوگی اتنا ہی اس میں یہ فطری خم زیادہ ہوگا کیونکہ یہ اسس کی مخصوص نوعیت کی جان ہے اس نہایت درجہ حکیمانہ ارشاد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کی ذہنیت کو عورت کے ساتھ سلوک کرنے کے معاملہ میں ایک نہایت صحیح اور فطری بنیاد پر قائم فرمادیا ہے۔ اور یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین فرمائی ہے کہ اگر عورت کے بعض مخصوص انداز غلط استعمال یا غلط اظہار کی وجہ سے بعض اوقات تمہارے لیے تکلیف و پریشانی کا موجب ہو جائیں تو ان کی مناسب اصلاح تو کرو مگر ان کی وجہ سے گھبرا کر ان کو بالکل مٹا دینے کی کوشش نہ کرو کیونکہ وہ عورت کی فطرت کا حصہ ہیں اور اگر وہ صحیح حدود کے اندر رہیں گے تو وہی تمہاری اعلیٰ خوشی کی بنیادیں بن جائیں گے۔

۱۳۔ عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام جائز امور میں خاوند کی اطاعت کرے اس کے ساتھ محبت و امتنان اور وفاداری کا نبھاؤ کرے۔ اس کے مال اور اس کی عزت کی حفاظت کرے۔ اس کے بچوں کی تربیت کرے اور اس کے خانگی امور کا انتظام کرے[3]

۱۴۔ چونکہ عورت کے حقوق مرد پر اور مرد کے حقوق عورت پر اسلام میں ایک قانونی رنگ رکھتے ہیں اس لیے ان کے باہمی تنازعات عدالت میں جاسکتے ہیں[4] چنانچہ حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسلمان عورتیں اپنے خاوندوں کی شکایتیں لایا کرتی تھیں اور آپ ان میں فیصلہ فرماتے تھے[5] اور

---

[1] مسلم کتاب الرضاع باب الوصیۃ بالنساء۔ [2] بخاری کتاب النکاح باب الوصاۃ بالنساء۔ [3] سورۃ نساء: ۳۵ نیز بخاری کتاب النکاح باب الی من نکح واتی النساء خیر و باب کفران العشیر و باب المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجہا و باب لا تطیع المرأۃ زوجہا فی معصیۃ نیز دیکھو مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء۔ [4] سورۃ بقرہ: ۲۳۰ تا ۲۳۲

[5] دیکھو مشکوٰۃ کتاب النکاح

ان کے حقوق ان کو دلواتے اور ہر طرح ان کی دلداری فرماتے تھے۔ حتّٰی کہ ان حقوق اور اس قسم کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے صحابہ میں یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ اسلام نے تو گویا عورتوں کو آزاد کر دیا ہے[1]

۱۵۔ تعددِ ازدواج اور دیگر متعلقہ مسائل کے متعلق چونکہ دوسرے موقعہ پر مفصل بحث گذر چکی ہے اس لیے اس جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں[2]

طلاق کے قانون کا ڈھانچہ اس طرح پر سمجھنا چاہیئے کہ:۔

۱۔ چونکہ نکاح ایک سِوِل معاہدہ ہے اس لیے وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے مگر اسلام نے صرف انتہائی حالات میں اس کے توڑنے کی اجازت دی ہے جبکہ کوئی اور چارہ نہ رہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ[3] یعنی جن باتوں کو خاص مصالح کے ماتحت خدائی شریعت میں جائز اور حلال قرار دیا گیا ہے اُن میں طلاق خدا کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ اس اصل کے ماتحت اسلام نے ازدواجی رشتہ کو گویا ایک گونہ تقدّس اور دوام کا رنگ دیدیا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ رشتۂ نکاح کے منقطع کرنے میں کبھی بھی جلدی نہ کریں بلکہ انتہائی احتیاط سے کام لیں۔ مگر ایک جامع اور عالمگیر شریعت کی حیثیت میں اسلام نے اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ مرد و عورت کے تعلقات میں ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے ہوتے ہوتے اس رشتہ کا خوشگوار صورت میں قائم رہنا محال ہو جاتا ہے۔ اور نہ صرف خاوند و بیوی دونوں کی خانگی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس تلخی کا اثر لازماً ان کے دوسرے کاموں پر بھی پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ایک افسوس کرتے ہوتے دل کے ساتھ اس رشتہ کو منقطع کر دیا جاوے۔ چنانچہ اسی قسم کے انتہائی حالات کو مدّنظر رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ نے اسلام میں طلاق کا قانون جاری فرمایا ہے۔

۲۔ اس قانونِ طلاق کو (خلافِ شریعت اور ناجائز نکاح کی صورتوں کو الگ رکھتے ہیں جنہیں اصطلاحاً نکاحِ باطل یا نکاحِ فاسد کہتے ہیں) موٹے طور پر تین حصوں میں تقسیم شدہ سمجھنا چاہیئے۔ اوّل فسخِ نکاح کی صورت، جس کے اندر میں فقہ کی اصطلاح سے کسی قدر ہٹ کر لعان وغیرہ کی صورت کو بھی شامل کرتا ہوں۔ یعنی تمام وہ صورتیں جبکہ عقدِ نکاح کا قائم رہنا ناجائز ہو جاوے۔ دوّم طلاق یعنی وہ صورت جبکہ علیحدگی کی خواہش اور جُدائی کی تحریک خاوند کی طرف سے ہو۔ سوّم خلع یعنی وہ صورت جبکہ علیحدگی کی خواہش اور جُدائی کی تحریک بیوی کی طرف سے ہوئے[4] اِن تینوں صورتوں کے لیے اسلام نے الگ الگ ضابطہ مقرر فرمایا ہے۔

---

[1] مسلم کتاب الرضاع باب فی الاِیْلَاء عن عائشہ۔ و ابوداؤد کتاب النکاح باب فِی ضَرْبِ النِّسَاءِ

[2] دیکھئے کتاب ہذا حالات ۵ہجری [3] ابوداؤد ابواب الطلاق باب فِی کَرَاھِیَۃِ الطَّلَاقِ

[4] دیکھئے مشکوٰۃ کتاب النکاح و کتاب الطلاق وغیرہ۔ نیز دیکھئے زاد المعاد فصول متعلقہ

۳۔ فسخ نکاح کی صورت اس وقت پیش آتی ہے جبکہ نکاح کا قائم رہنا ناجائز ہو جاوے۔ مثلاً لڑکی اپنا حق خیار البلوغ استعمال کرے[1] جس کی کسی قدر تشریح اوپر گذر چکی ہے۔ یا مثلاً خاوند کو اپنی بیوی کی عصمت کے خلاف یقین ہو جاوے مگر وہ اُسے شرعی طور پر ثابت نہ کر سکے جس صورت میں اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ مرد و عورت ایک دوسرے کے خلاف مؤکد بعذاب حلف اُٹھائیں اور پھر ان میں علیحدگی کرا دی جاوے۔ اس صورت کو اسلامی اصطلاح میں لعان کہتے ہیں[2]

۴۔ طلاق کی صورت میں اسلامی حکم یہ ہے کہ جب مرد و عورت میں ایسے حالات پیدا ہو جاویں کہ خاوند اپنی بیوی کو علیحدہ کرنے کی طرف مائل ہو جاوے تو پیشتر اس کے کہ وہ طلاق دے فریقین کے متعلقین کو ایک موقعہ مصالحت کی کوشش کا ملنا چاہیئے[3] اگر یہ کوشش کامیاب ہو جاوے تو فبہا لیکن اگر وہ کامیاب نہ ہو تو اس صورت میں خاوند کو خود اپنے اختیار سے بغیر عدالت میں جانے کے طلاق دینے کا حق ہے[4] مگر یہ طلاق ایسے طہر میں ہونی چاہیئے جس میں خاوند بیوی اکٹھے نہ رہتے ہوں[5] تاکہ یہ کام جلد بازی کے طریق پر نہ ہو کہ جب جی میں آیا طلاق دیدی اور تا عورت کی مخصوص کشش خاوند کو اس کے اس ارادے سے روکنے کے لیے آزاد رہے۔

۵۔ گو خاوند بیوی کی جُدائی ایک طلاق سے بھی ہو سکتی ہے مگر دو طلاقوں تک خاوند کو رجوع کا حق رہتا ہے اور کامل جدائی کے واسطے یہ ضروری ہے کہ طلاق تین دفعہ تین مختلف وقتوں میں دی جاوے تاکہ مکمل علیحدگی کے لیے کسی عارضی ناراضگی میں قدم نہ اُٹھایا جا سکے اور خاوند کو اپنے ٹھنڈے لمحات میں اونچ نیچ کے سوچنے کا موقعہ مل جاوے۔ اگر کوئی شخص جوش میں آکر ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دیتا ہے تو وہ ناجائز ہوگا اور صرف ایک طلاق شمار ہوگی[6]

۶۔ طلاق کی صورت میں خاوند کا فرض ہے کہ اگر وہ اپنی بیوی کا مہر پہلے نہیں ادا کر چکا تو طلاق کے وقت اسے ادا کرے اور اگر کوئی اور مال اُس نے اپنی بیوی کو دے رکھا ہے تو وہ بھی واپس نہ لے بلکہ ممکن ہو تو اپنے پاس سے کچھ اور بھی دیدے اور بڑی خوش معاملگی اور احسان کے طریق پر اس کام کو سرانجام دے[7]

---

[1] ہدایۃ المجتہد و زاد المعاد فصول متعلقہ۔ [2] سورۃ نور: ۷ تا ۹ نیز بخاری کتاب الطلاق ابواب اللعان

[3] سورۃ نساء: ۳۶ [4] سورۃ بقرہ: ۲۳۰ تا ۲۳۲ و سورۃ نساء: ۲۲ و سورۃ طلاق: ۱ تا ۵

[5] بخاری کتاب الطلاق باب اول۔ نیز بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ طلاق [6] سورۃ بقرہ: ۲۳۰ تا ۲۳۲ نیز ابوداؤد کتاب النکاح باب فی البتۃ و بخاری کتاب الطلاق باب وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ و نسائی عن محمود بن لبید۔ بحوالہ مشکوٰۃ باب الخلع والطلاق فصل ثانی [7] سورۃ بقرہ: ۲۳۰ تا ۲۳۲ و سورۃ طلاق: ۱ تا ۸

۷۔ طلاق کے بعد بھی جب تک عورت دوسری شادی کے لیے آزاد نہ ہو جاوے خاوند اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنی مطلّقہ بیوی کے ضروری اخراجات کا بوجھ اٹھاتے[1] اور اگر کوئی خوردسالہ اولاد ہے جو ماں سے جُدا نہیں ہو سکتی تو وہ بھی ماں کے پاس رہے گی۔ اور اس کے ضروری اخراجات کا ذمہ دار باپ ہو گا۔[2]

۸۔ خلع کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ چونکہ خانگی نظام کی امارت خاوند کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی از روئے شریعت اور از روئے عقل وہ نہ صرف بیوی کے اخراجات کا ذمہ وار ہے بلکہ فیملی کا ہیڈ بھی وہی ہے اور پھر دوسری طرف عورت ہوتی بھی نسبتاً سادہ مزاج ہے اور چالاک لوگوں کے دھوکے میں زیادہ آسانی کے ساتھ آسکتی ہے۔ اس لیے بیوی کو خود بخود علیحدہ ہو جانے کا حق نہیں ہے بلکہ اس صورت میں اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے عورت اپنے خاوند کے ساتھ نبھاؤ کو ناممکن خیال کرے اور دوسری طرف خاوند اسے الگ کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو وہ حاکم کے ذریعہ علیحدگی حاصل کر سکتی ہے[3] اور حاکم کا یہ کام مقرر کیا گیا ہے کہ اگر عورت کی طرف سے حقیقی خواہش علیحدگی کی موجود ہو اور وہ کسی دھوکے اور شرارت کا شکار نہ ہو رہی ہو تو علیحدگی کا حکم دیدے اور اس سوال میں زیادہ نہ پڑے کہ عورت کی علیحدگی کی خواہش مناسب یا پسندیدہ ہے یا نہیں[4] اس اصل کے ماتحت اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی دوسری شادی کو اپنے لیے واقعی ناقابل برداشت پاتی ہے تو وہ محض اسی بناء پر خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے[5]

۹۔ اگر خاوند اپنی بیوی کو کوئی مال یا جائیداد علاوہ از اخراجاتِ زندگی دے چکا ہو اور وہ اس کی واپسی کا مطالبہ کرے تو خلع کی صورت میں عدالت اس کی واپسی کا بوجھ مناسب حد تک عورت پر ڈال سکتی ہے[6]

۱۰۔ فسخ نکاح اور طلاق اور خلع کی ان صورتوں میں جن میں خاوند اور بیوی کے اکٹھے ہونے کے بعد علیحدگی ہوئی ہو عورت کو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے جب تک کہ اس کی علیحدگی پر ایک مقررہ میعاد

---

[1] سورۃ بقرہ: ۲۴۲ و سورۃ طلاق: ۱ تا ۸۔ نیز دیکھو بخاری کتاب الطلاق باب قصۃ فاطمۃ و بدایۃ المجتہد و زاد المعاد فصول متعلقہ [2] سورۃ بقرہ: ۲۳۴ نیز موطا و ابوداؤد باب من احق بالولد و بدایۃ المجتہد و زاد المعاد فصول متعلقہ [3] سورۃ بقرہ ۲۳۰، ۲۳۱ نیز بخاری کتاب النکاح باب الخلع و مشکوٰۃ باب الخلع و باب المولی فی النکاح نیز دیکھو ہدایۃ المجتہد و زاد المعاد فصول متعلقہ [4] بخاری کتاب الطلاق باب الخلع و ابوداؤد ابواب الطلاق باب الخلع [5] چشمہ معرفت صفحہ ۲۳۸ و کشتی نوح صفحہ ۲۷ [6] سورۃ بقرہ: ۲۳۰، ۲۳۱ نیز بخاری کتاب النکاح باب الخلع نیز دیکھو مشکوٰۃ باب الخلع

جسے موٹے طور پر تین ماہ کہہ سکتے ہیں نہ گذر جاوے یا حمل کی صورت میں وضع حمل نہ ہو جاوے۔ اس میعاد کو شریعت کی اصطلاح میں عدّت کہتے ہیں[1]

یہ اس قانونِ شادی و طلاق کا ڈھانچہ ہے جو آنحضرت ﷺ نے خُدائی حکم کے ماتحت مسلمانوں کے واسطے مقرر فرمایا۔ اس نظام میں اسلامی قانونِ شادی کی خوبی تو ہمیشہ ہی اہل عقل و خرد کے نزدیک مسلّم رہی ہے مگر یہ ایک شکر کا مقام ہے کہ صدیوں کی ٹھوکروں کے بعد اب دُنیا آہستہ آہستہ اسلامی قانونِ طلاق کی طرف بھی آ رہی ہے۔ چنانچہ مختلف مسیحی ممالک میں کم و بیش اسی لائن پر طلاق کا قانون بنتا چلا جا رہا ہے جو اسلام نے پیش کی ہے گو مغربی ممالک کی روش میں یہ اندیشہ بھی ضرور پایا جاتا ہے کہ کہیں طلاق زیادہ عام نہ ہو جاوے یعنی اس معاملہ میں لوگوں کے لیے حدِ اعتدال سے زیادہ آزادی کا دروازہ نہ کھول دیا جاوے کیونکہ جہاں ایک طرف طلاق کے دروازے کو بالکل بند کر دینا یا ایسی ناواجب شرائط کے ساتھ مشروط کر دینا جو عملاً بند کر دینے کے مساوی ہو سخت نقصان دہ ہے وہاں اسے ناواجب طور پر زیادہ کھول دینا بھی کم ضرر رساں نہیں اور یقیناً اصلاح کا رستہ وہی ہے جو اسلام نے اعتدال پر قائم رہتے ہوئے پیش کیا ہے۔

اس جگہ یہ ذکر بھی بے موقعہ نہ ہوگا کہ میور صاحب نے[2] اسلامی قانونِ طلاق پر یہ دلآزار طعن کیا ہے کہ اس کی رُو سے دو طلاقوں تک تو خاوند کو اپنی بیوی کی طرف رجوع کرنے کا حق ہوتا ہے لیکن تیسری طلاق ہو چکنے کے بعد اُسے یہ حق صرف اس صورت میں ہے کہ عورت کسی اور شخص کے نکاح میں آکر پھر اس سے علیحدگی حاصل کرے اور اس کے بعد میور صاحب نہایت جرأت کے انداز میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں اس بات کو جائز رکھا گیا ہے کہ ایک کرایہ دار مرد کی خدمات حاصل کر کے اس کے ساتھ ایسی عورت کو اس شرط کے ساتھ بیاہ دیا جاوے کہ وہ اُسے نکاح کے بعد طلاق دے دیگا تاکہ وہ عورت اپنے اصل خاوند کی طرف لوٹ سکے۔ یہ اعتراض میور صاحب کے پرلے درجہ کے تعصب اور اگر تعصب نہیں تو پرلے درجہ کی لاعلمی پر مبنی ہے۔ اسلام ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا کہ سابق خاوند کے واسطے عورت کو جائز کرنے کے لیے یہ حیلہ کیا جاوے کہ عورت کو کسی اور آدمی سے بیاہ کر پھر اس سے علیحدگی حاصل کی جاوے بلکہ حق یہ ہے کہ اسلام اس قسم کے حیلہ کو ایک سخت ناپاک اور لعنتی فعل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ لَعَنَ اللّٰہُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَہٗ[3] "یعنی وہ شخص خدا کی لعنت کے نیچے ہے جو کسی عورت کے ساتھ اس نیت سے نکاح کرتا ہے کہ تا بعد میں اسے طلاق دیکر اس کے سابقہ خاوند کے لیے اُسے جائز کرے

---

[1] سورۃ بقرہ : ۲۲۹ و سورۃ احزاب : ۵۰، ۵۲، ۵۳ و سورۃ طلاق : ۲، ۸ [2] لائف آف محمدؐ مصنفہ سر ولیم میور صفحہ ۳۲۵، ۳۲۶ - [3] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی التحلیل و ترمذی ابواب النکاح

اور اسی طرح وہ شخص بھی خدا کی لعنت کے نیچے ہے جو کسی دوسرے شخص سے اپنی سابقہ بیوی کا اس غرض سے نکاح کرواتا ہے کہ تا وہ شخص اس سے طلاق حاصل کرے پھر اس کے نکاح میں آسکے۔" اور حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی تو یہاں تک فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص اس قسم کا فعل کرے گا تو میں اُسے زنا کی سزا دوںگا۔[1] اندریں حالات اس سے بڑھ کر دیدہ دلیری کیا ہوگی کہ اسلام کی طرف اس ناپاک طریق کو منسوب کیا جاوے۔

اسلامی تعلیم کا منشاء جسے میور صاحب نے نہیں سمجھا یا نہیں سمجھنا چاہا صرف یہ ہے کہ جب تین طلاقیں ہو چکیں تو اس کے بعد مرد و عورت اکٹھے نہیں ہو سکتے سوائے اس کے کہ عورت اپنی جائز ضرورت و غرض کے ماتحت کسی اور آدمی کے نکاح میں آتے اور اس کے بعد وہ اپنے لیے نئے خاوند کی وفات یا کسی حقیقی اختلاف کی بناء پر طلاق کی وجہ سے نہ اس غرض سے کہ وہ اپنے پہلے خاوند کی طرف لوٹ سکے پھر شادی کے لیے آزاد ہو جاوے تو اس صورت میں باہم رضامندی کے ساتھ پہلا خاوند اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے۔ اور اس قانون میں حکمت یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو یکے بعد دیگرے تین دفعہ طلاق دے چکتا ہے تو اس بلیے تجربہ کے بعد یہی سمجھا جائے گا کہ اب ان کی اہلی زندگی کسی صورت میں خوشگوار نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اب انہیں پھر اکٹھے ہو کر ایک مزید تلخ تجربہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ کامل طور پر علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے ہونے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے، لیکن اگر اس کے بعد عورت کسی اور مرد کے نکاح میں آئے اور اس کے ساتھ متاہلانہ زندگی گذارے اور پھر کسی حقیقی اور جائز وجہ سے اس نئے خاوند سے اس کی علیحدگی ہو جائے یا اس کا نیا خاوند فوت ہو جائے اور اس کے بعد وہ اور اس کا سابقہ خاوند باہم رضامندی کے ساتھ پھر اکٹھے ہونا چاہیں تو ان کے رستے میں کوئی روک نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ علاوہ اس کے کہ ان کی شادی میں کوئی امر اصولاً مانع نہیں ہے ایسی صورت میں یہ اُمید کرنا ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ اب وہ ایک دوسرے کے ساتھ نبھاؤ کر سکیں گے کیونکہ ایک عرصہ تک ایک دوسرے سے الگ رہنے اور اس عرصہ میں ایک تیسرے شخص کے ساتھ معاملہ پڑنے کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر پیدا ہو جانا بالکل ممکن اور قرین قیاس ہے اور یہ مسئلہ بھی دراصل اسلام نے اس غرض سے خاص طور پر بیان کیا ہے کہ اگر ایک طرف اہلی زندگی کے تلخ تجربات کے سلسلہ کو محدود کیا جاوے تو دوسری طرف لوگوں میں اس خیال کا بھی سدباب کیا جاوے کہ گویا تین طلاقوں کا وجود اپنی ذات میں کوئی حرمت کی وجہ ہے اور یہ کہ تین طلاقوں کے بعد خاوند بیوی کے اکٹھے ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں تین طلاقوں کے بعد بھی تجدید نکاح کا دروازہ کھلا رکھنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ تا اس سے لوگوں میں نکاح کے تقدس اور دوام کا احساس پیدا کیا جاوے اور یہ خیال قائم کیا جاوے کہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر بحث آیت حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ

جب دو مرد و عورت کا ایک دفعہ آپس میں ازدواجی تعلق قائم ہو جاوے تو پھر انتہائی کوشش اس تعلق کے نبھانے کی ہونی چاہیئے اور اگر کسی وجہ سے درمیان میں یہ تعلق ٹوٹ بھی جاوے اور اس کا پھر قائم ہونا محال بھی ہو جاوے تو پھر بھی آئندہ چل کر کوئی ایسا موقعہ جبکہ جائز طور پر اس تعلق کے دوبارہ جوڑے جانے کی اُمید ہو سکے ضائع نہیں جانے دینا چاہیئے۔ پس میور صاحب نے جس مسئلہ کو ایک غلط اور ناپاک صورت دے کر اس پر اعتراض کیا ہے وہ دراصل اپنی حقیقی صورت میں اسلامی تعلیم کی ایک بہت بڑی خوبی ہے جسے افسوس ہے کہ سر ولیم کی آنکھ دیکھ نہیں سکی۔

مدنی زندگی کے پہلے دَور کا خاتمہ

اور

اسلامی طریق حکومت

ایک نئے دَور کا آغاز غزوہ بنو قریظہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی مدنی زندگی کے پہلے دَور اور ہماری کتاب کی دوسری جلد کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ دَور کن حالات میں گذرا؟ اسلام کی حفاظت کے لیے آنحضرت ﷺ کو کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا؟ مسلمانوں پر کیسی کیسی نازک گھڑیاں آئیں؟ اندرونی اور بیرونی خطرات نے کیا کیا مہیب صورتیں اختیار کیں؟ ان سوالات کا کسی قدر مفصل جواب اوپر گذر چکا ہے۔ یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کی مدنی زندگی کا پہلا دَور ایک مسلسل زلزلہ کا رنگ رکھتا تھا جو پانچ سال کے طویل عرصہ میں جسے مصائب نے احساسی طور پر اور بھی لمبا کر دیا تھا مدینہ کی سرزمین کو خطرناک طور پر جنبش دیتا رہا اور اس زلزلہ کے بعض دھکّے اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسے تباہ کن تھے کہ اگر خدا کی خاص نصرت شاملِ حال نہ ہوتی تو یقیناً یہ دھکّے مدینہ کی سرزمین کو بالکل تہ و بالا کر کے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے خاک میں سُلا دیتے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس زلزلہ کے آتش فشاں منبع کی ایک شاخ یہود کے قلعوں میں ہو کر عین مدینہ کی دیواروں کے نیچے پہنچی ہوئی تھی۔ اس زلزلہ کا سب سے بڑا دھکّا غزوۂ احزاب میں پیش آیا جبکہ خونخوار اتحادیوں کے جنگی نعروں اور ان کے عربی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے مدینہ کی زمین گویا لفظاً لرزہ کھا گئی تھی اور مسلمانوں کے کلیجے مُنہ کو آنے لگے تھے اور اس زلزلہ کو بدعہد یہود کی غداری نے اور بھی زیادہ خطرناک صورت دے دی تھی۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ حملہ کفارِ مکہ کی عداوت کا آخری نقطہ ثابت ہوا جس کے بعد گو ان کی دلی عداوت اور فتنہ انگیزی تو اسی طرح قائم رہی مگر انہیں مدینہ پر حملہ آور ہونے کی توفیق نہیں ملی۔ اور آنحضرت ﷺ کی یہ پیشگوئی کہ اَلْآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا یعنی ان لوگوں کی فتنہ انگیزی اور دشمنی کی وجہ سے آئندہ ہمیں تو ان کے خلاف فوج کشی کے موقعے ملتے رہیں گے مگر انہیں ہمارے خلاف مدینہ پر چڑھائی کرنے کی توفیق نہیں ملے گی حرف بحرف پوری ہوئی۔ اور اس طرح مدنی زندگی کے پہلے اور دوسرے دَور میں ایک مابہ الامتیاز قائم ہو گیا۔ علاوہ ازیں چونکہ بنو قریظہ کے خاتمہ کے ساتھ مدینہ میں

یہودی آبادی کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا اور اس کے بعد مدینہ کے شہر میں سوائے مسلمانوں یا مسلمان کہلانے والے منافقوں یا مسلمانوں کے توابع کے اور کوئی قوم باقی نہیں رہی تھی جو مسلمانوں کے مقابل پر کھڑی ہو سکتی یا آنحضرت ﷺ کے حکم سے برملا سرتابی کرنے کی جرأت کرتی۔ اس لیے اس وقت سے مدینہ میں ایک خالص اسلامی حکومت کی بنیاد بھی قائم ہو گئی۔ گویا اس نئے دَور کی جو غزوہ بنو قریظہ کے بعد سے شروع ہوا، دو نمایاں خصوصیات تھیں۔ اوّل کفار کے ان حملوں کا جو مدینہ کے خلاف ہوتے تھے ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے نتیجہ میں میدانِ کارزار مدینہ کے قرب وجوار سے ہٹ کر دور دراز کے علاقوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ دوم مدینہ کا شہر سیاست وحکومت کے لحاظ سے ایک خالص اسلامی سلطنت کی صورت اختیار کر گیا جس میں کسی غیر حکومت یا غیر قوم یا غیر مذہب کا دخل نہیں تھا۔ اور پھر یہی مرکزی حکومت آہستہ آہستہ وسعت اختیار کر کے بالآخر دُنیا کے ایک بڑے حصہ پر چھا گئی۔

یہ محیّر العقول تغیّر پانچ سال کے قلیل عرصہ میں کس طرح ممکن ہو گیا؟ اس سوال کا حقیقی جواب اس دُنیا کے مادی علوم کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا اور اسے پوری طرح وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو رُوحانی تصرفات کا علم رکھتا ہو اور اس خُدائی سنّت سے واقف ہو جو قدیم سے نبیوں کے ساتھ رہی ہے مگر یہ امور تاریخ کا حصہ نہیں ہیں۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے جو باتیں مسلمانوں کی اس بے نظیر کامیابی کا باعث سمجھی جا سکتی ہیں اُن میں مندرجہ ذیل باتیں خاص طور پر نمایاں اثر رکھتی تھیں: مسلمانوں کا اتحاد۔ انکی تنظیم۔ اُن کا اپنے مقصد کے لیے بے نظیر استقلال۔ اُن کی قربانی کی رُوح۔ اُن کا یہ کامل یقین کہ ہم حق وصداقت کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ اُن کا یہ گہرا احساس کہ ہم اس قدر بے سروسامان ہیں کہ جب تک ہم اپنی انتہائی طاقت کو بے دریغ صرف کر دینے کے لیے تیار نہیں ہونگے ہماری حفاظت کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اور پھر آنحضرت ﷺ کی بے نظیر مقناطیسی شخصیت اور اعلیٰ درجہ کی جنگی تدابیر وغیر ذالک۔ ان تاثیرات نے مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت میں وہ طاقت بھر دی تھی جسے عرب کی لاتعداد افواج کا نہایت وحشیانہ مظاہرہ بھی مغلوب نہیں کر سکا اور اس پانچ سالہ جنگ کے نتیجہ میں کفارِ عرب نے اس بات کو یقینی طور پر سمجھ لیا کہ اب مدینہ پر حملہ آور ہو کر اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو ملیا میٹ کر دینے کا خیال ایک خیالِ باطل ہے جو کبھی بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ اب انہیں مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے لیے اور تدابیر سے کام لینا چاہیئے۔ کفار کی یہ ذہنی تبدیلی اسلام کے لیے ایک نئے دَور کے آغاز کا نشان تھی۔

اسلامی طریقِ حکومت چونکہ اس نئے دَور کی دو نمایاں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت مدینہ میں خالص اسلامی حکومت کا قیام تھی اس لیے اس موقعہ پر اس اُصولی تعلیم کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہو گا جو بانیٔ اسلام نے حکومت کے طریق کے متعلق پیش فرمائی ہے۔ اس کے متعلق سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیئے کہ جیسا کہ دوسرے دُنیاوی امور میں اسلام کا طریق ہے اس معاملہ میں اسلام

نے صرف ایک اُصولی تعلیم دی ہے اور تفصیلات کے تصفیہ کو ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر قوم کے حالات پر چھوڑ دیا ہے۔ اور دراصل اس قسم کے معاملات میں یہی طریق عقلمندی اور میانہ روی کا طریق ہے کہ صرف اُصولی ہدایت پر اکتفاء کی جاوے اور تفصیلات میں دخل نہ دیا جاوے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو اور حالات کے اختلاف کا لحاظ رکھنے کے بغیر ہر زمانہ میں ہر قوم پر ایک ہی ٹھوس غیر مبدل اور تفصیلی قانون جاری کر دیا جاوے تو ظاہر ہے کہ قانونِ شریعت رحمت کی بجائے ایک زحمت ہو جاوے اور ہدایت کی بجائے ضلالت کا سامان پیدا کر دے۔ پس اسلام نے کمال دانشمندی کے ساتھ اس معاملہ میں صرف ایک اُصولی ہدایت دی ہے۔ جو تفصیلات کے مناسب اختلاف کے ساتھ سب قسم کے حالات پر یکساں چسپاں ہوتی ہے۔

حکومت کا اصل حق صرف جمہور کو حاصل ہے اور جمہور کی طرف سے افراد کو پہنچتا ہے

وہ اُصولی ہدایت یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین کے معاملہ کو الگ رکھتے ہوتے جنہیں خدا کی طرف سے اس کے اَزلی حق میں سے حکومت کا حق پہنچتا ہے۔ سب لوگ حکومت کے حق میں برابر ہیں یعنی اصل حکومت جمہور کی ہے اور اس حق میں کسی شخص کو دوسروں کی نسبت فائق حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن چونکہ نظامِ حکومت کے چلانے کے لیے ایک محدود انتظامی حکومت کا ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت کی انتہائی باگ ڈور ایک حاکم اعلیٰ یعنی صدرِ حکومت کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ لوگوں کو چاہیئے کہ باہم مشورہ کے ساتھ جس شخص کو حکومت کے لیے سب سے زیادہ اہل سمجھیں اُسے اپنا امیر مقرر کر لیا کریں۔ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ[1] یعنی "اے لوگو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ حکومت کی امانت تم اس کے اہل لوگوں کے سپرد کیا کرو۔ اور پھر جو لوگ اس طرح حاکم منتخب ہوں انہیں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ وہ لوگوں میں عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کریں"۔ اس اصولی آیت میں حکومت کے حق کو امانت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ دراصل حکومت کا حق سب لوگوں کا مشترکہ حق ہے۔ اور خاص افراد کو جمہور کی طرف سے ایک امانت کے طور پر ملتا ہے پس جس شخص کو حکومت ملے اُسے سمجھنا چاہیئے کہ یہ ایک امانت ہے جو لوگوں کی طرف سے اسے ملی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ابوذر صحابی نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے کسی علاقہ کا امیر مقرر فرما دیں۔ اس پر آپ

---

[1] سورۃ نساء: ۵۹

نے فرمایا:۔
يَا أَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ ضَعِيفٌ وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا[1] یعنی "اے ابوذر! تم ایک ضعیف انسان ہو اور حکومت ایک امانت ہے اور قیامت کے دن وہ ذلت و ندامت کا موجب ہوگی۔ سوائے اس شخص کے جو اس کے پورے پورے حقوق ادا کرے"۔ اس حدیث میں حکومت کو امانت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی یہ کہ حکومت کا حق صرف جمہور کو حاصل ہے اور کسی خاص فرد کو اس کا حق جمہور کی طرف سے صرف ایک امانت کے طور پر ملتا ہے۔

چونکہ حکومت ایک امانت ہے اس لیے حاکم اعلیٰ کا تقرر تو الگ رہا ماتحت حکام کے تقرر میں بھی اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ کسی ایسے شخص کو حاکم مقرر نہ کیا جاوے جو خود حکومت کا خواہشمند ہو۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:۔

إِنَّا وَاللهِ لَا نُوَلِّي هٰذَا الْعَمَلَ أَحَدًا سَأَلَهُ وَلَا أَحَدًا حَرِصَ عَلَيْهِ[2] یعنی "خدا کی قسم ہم کبھی کسی ایسے شخص کو حکومت کا کوئی عہدہ نہیں دینگے جو خود اس عہدہ کو طلب کرے یا اس کا خواہشمند ہو"۔

حکومت کے لیے مشورہ ضروری ہے

جو لوگ لوگوں کے مشورہ سے حاکم منتخب ہوں انکی ہدایت کے لیے اسلام یہ اصولی تعلیم ارشاد فرماتا ہے:۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ[3] یعنی "مومنوں کا یہ کام ہے کہ وہ خدا کی پوری پوری فرمانبرداری اختیار کریں اور اس کی عبادت پر قائم رہیں۔ اور حکومت کے امور باہم مشورہ کے ساتھ طے کریں اور جو اموال خدا نے انہیں دیتے ہیں انہیں لوگوں پر خرچ کریں"۔ اس آیت میں حاکم کا یہ فرض مقرر کیا گیا ہے کہ وہ امیر منتخب ہونے کے بعد خود مختارانہ اور جابرانہ طریق اختیار نہ کرے بلکہ اس اصول کو یاد رکھتے ہوتے کہ اس کی حکومت اس کے پاس محض ایک امانت کے طور پر ہے رائے عامہ کو معلوم کرتا رہے اور لوگوں کے مشورہ کے ساتھ حکومت کے فرائض سرانجام دے۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ سے بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ[4] یعنی "اے نبی تم حکومت کے معاملات میں لوگوں سے مشورہ لیا کرو۔ مگر مشورہ کے بعد جب تم کوئی رائے قائم کرلو تو پھر اللہ پر توکل

---

[1] صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب کراہیۃ الامارۃ [2] مسلم کتاب الامارۃ باب النَّهْيُ عَنْ طَلَبِ الْاِمَارَةِ۔
[3] سورۃ شوریٰ: ۳۹ [4] سورۃ آل عمران: ۱۶۰

کرو۔" یہ ہدایت قرآنی محاورہ کے مطابق صرف آپ ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ آپ کے خلفاء اور متبعین کے لیے بھی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ طریق حکومت کے معاملہ میں اسلام صرف دو اُصولی ہدایتیں دیتا ہے۔ اول یہ کہ حکومت کا حق سب لوگوں کا مشترک حق ہے اور ایسی صورت میں لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے میں سے بہترین شخص کو باہم مشورہ کے ساتھ امیر منتخب کیا کریں۔ دوسرے یہ کہ جو شخص امیر بنے اور حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آئے اس کا فرض ہے کہ اس امانت کو حق و انصاف کے ساتھ ادا کرے اور سیاست و حکومت کے جملہ اہم امور لوگوں کے مشورہ کے ساتھ سرانجام دے۔ گویا حکومت کے معاملہ میں اسلام نے ورثہ کے حق کو قطعاً تسلیم نہیں کیا اور نہ اس بات کو جائز رکھا ہے کہ کوئی حاکم رائے عامہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اور مشورہ کے طریق کو چھوڑ کر حکومت میں استبدادی اور خود مختارانہ طریق اختیار کرے۔ لیکن جیسا کہ موجودہ زمانہ میں بھی یہ اُصول ویٹو وغیرہ کی صورت میں عام طور پر مسلّم ہے۔ اسلام نے استثنائی حالات میں امیر کے لیے یہ حق تسلیم کیا ہے کہ وہ اگر ضروری سمجھے تو کثرتِ رائے کے مشورہ کو رد کر دے[1] مگر اسلامی شریعت کی رُو سے امیر بہرحال اس بات کا پابند قرار دیا گیا ہے کہ کوئی اہم معاملہ مشورہ لینے کے بغیر طے نہ کرے۔ حتّٰی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے جو اسلامی سیاسیات میں نہایت ماہر سمجھے گئے ہیں یہاں تک فرمایا ہے کہ :-

لَاخِلَافَةَ اِلَّا بِالْمَشْوَرَةِ[2] یعنی "کوئی اسلامی حکومت مشورہ کے انتظام کے بغیر جائز تسلیم نہیں کی جا سکتی"۔

یہ وہ اُصولی ہدایتیں ہیں جو اسلام نے حکومت کے طریق کے متعلق جاری فرمائی ہیں لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اسلام نے ان اُصولی ہدایات کے سوا اس مسئلہ کی تفصیلات میں کوئی دخل نہیں دیا۔ مثلاً اس قسم کے سوالات کے متعلق اسلام نے کوئی معیّن ہدایات نہیں دیں کہ امیر یعنی صدر حکومت کے انتخاب کے متعلق کس طریق پر مشورہ ہونا چاہیئے اور مجلس شوریٰ کی تقویم کونسے اُصول پر مبنی ہو۔ اور جب کوئی امیر منتخب ہو جاوے تو وہ امور مملکت میں پبلک سے مشورہ لینے کے متعلق کیا طریق اختیار کرے اور مشورہ میں کس قسم کے امور پیش ہوں۔ اور نظام حکومت کی جزئیات کیا ہوں وغیر ذالک۔ یہ باتیں اور اسی قسم کی دوسری تفصیلات ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ کے حالات پر چھوڑ دی گئی ہیں۔

حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کس طرح قائم ہوئی؟

اس جگہ بعض لوگوں کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اسلامی تعلیم کی

---

[1] سورۃ آل عمران : ۱۶۰ [2] اِزَالَةُ الْخِفَاءِ عَنْ خِلَافَةِ الْخُلَفَاءِ

رُو سے امیر یا خلیفہ کا تقرر مشورہ اور انتخاب کے طریق پر ہونا ضروری ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کا تقرر اس طریق پر نہیں ہوا؟ بلکہ انہیں حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ اوّل نے خود مقرر کر دیا تھا۔ اور پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ خلیفۂ ثالث کا تقرر بھی رائے عامہ کے ساتھ نہیں ہوا؟ بلکہ حضرت عمرؓ نے اس حق کو چھ سات صحابہؓ تک محدود کر دیا تھا اور بالآخر کیا وجہ ہے کہ امراء بنی اُمیہ اور بنی عباس وغیرہ ہمیشہ اپنا ولی عہد خود مقرر کر دیتے تھے جو عموماً کوئی بیٹا یا قریبی رشتہ دار ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات یہ فیصلہ کر جاتے تھے کہ ہمارے بعد فلاں شخص امیر ہو اور اس کے بعد فلاں اور اس کے بعد فلاں! اور ان کے زمانہ میں کبھی بھی مشورہ اور انتخاب کے طریق پر امیر کا تقرر نہیں ہوا؟

اس شبہ کے جواب میں پہلے ہم حضرت عمرؓ کی خلافت کے سوال کو لیتے ہیں۔ سو جاننا چاہیئے کہ بیشک اسلام میں خلافت و امارت کے قیام کے لیے مشورہ اور انتخاب کا طریق ضروری ہے مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں مشورہ اور انتخاب کے طریق کی نوعیت اور اس کی تفاصیل کے متعلق اسلام نے کوئی خاص شرط یا حد بندی مقرر نہیں کی بلکہ اس قسم کے فروعی سوالات کو وقتی حالات پر چھوڑ دیا ہے اور ظاہر ہے کہ مختلف قسم کے حالات میں مشورہ اور انتخاب کی صورت مختلف ہو سکتی ہے اور اس اصل کے ماتحت اگر نظر غور سے دیکھا جاوے تو حضرت عمرؓ کی خلافت کا قیام بھی درحقیقت مشورہ اور انتخاب کے اصول کے ماتحت ہی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کا معاملہ یوں طے ہوا تھا کہ جب حضرت ابوبکرؓ جو ایک منتخب شدہ خلیفہ تھے فوت ہونے لگے تو چونکہ اس وقت تک ابھی فتنہ ارتداد کے اثرات پوری طرح نہیں مٹے تھے اور خلافت کا نظام بھی ابھی ابتدائی حالت میں تھا حضرت ابوبکرؓ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ آئندہ خلافت کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور اہل شخص حضرت عمرؓ ہیں اور یہ کہ اگر خلیفہ کے انتخاب کو رائے عامہ پر چھوڑ دیا گیا۔ تو ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی طبیعت کی ظاہری سختی کی وجہ سے انتخاب میں نہ آسکیں۔ اور اُمتِ محمدیہ میں کسی فتنہ کا دروازہ کھل جاوے، اہل الرائے صحابہ کو بُلا کر اُن سے مشورہ لیا اور اس مشورہ کے بعد حضرت عمرؓ کو جن کا حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا بلکہ قبیلہ تک جُدا تھا اپنا جانشین مقرر کر دیا[1] حالانکہ اس وقت حضرت ابوبکرؓ کے اپنے صاحبزادے اور دیگر اعزہ و اقارب کثرت کے ساتھ موجود تھے۔ اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ صورت ایسی ہے کہ اسے ہرگز مشورہ اور انتخاب کی رُوح کے منافی نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ اوّل تو حضرت ابوبکرؓ نے یہ فیصلہ خود بخود نہیں کیا بلکہ اہل الرائے صحابہ کے مشورہ کے بعد کیا تھا۔ دوسرے حضرت ابوبکرؓ خود ایک منتخب شدہ خلیفہ تھے جس کی وجہ سے گویا ان کا ہر فیصلہ قوم کی آواز کا رنگ رکھتا تھا۔ اور پھر انہوں نے اپنے کسی عزیز کو خلیفہ

---

[1] طبری و تاریخ کامل ابن اثیر حالات ۱۳ھ نیز مؤطا مالک بحوالہ تلخیص الصحاح باب فی ذکر الخلفاء الراشدین

نہیں بنایا بلکہ ایک بالکل غیر شخص کو خلیفہ بنایا جس کے معاملہ میں یہ امکان نہیں ہو سکتا تھا کہ لوگ خلیفہ وقت کی قرابت کا لحاظ کر کے مشورہ میں کمزوری دکھائیں گے۔ اس صورت میں ہرگز یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ مشورہ اور انتخاب کے طریق کو توڑا گیا ہے۔ بلکہ یہ صورت بھی درحقیقت مشورہ کی ایک قسم سمجھی جائیگی۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کی خلافت کے متعلق آنحضرت ﷺ کی ایک صریح پیشگوئی بھی تھی[1] جس کی وجہ سے کسی مسلمان کو ان کی خلافت پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ بلکہ سب نے کمال انشراح کے ساتھ اسے قبول کیا۔

دوسرا سوال حضرت عثمانؓ کی خلافت کا ہے۔ سو اوّل تو ان کا انتخاب خود محدود مشورہ سے ہی ہوا ہو مگر بہرحال وہ بطریق مشورہ[2] تھا اور ان کی خلافت کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سابقہ خلیفہ کے حکم سے قائم ہوئی تھی۔ اور چونکہ اسلام نے مشورہ اور انتخاب کے طریق کی تفاصیل میں دخل نہیں دیا بلکہ تفاصیل کے تصفیہ کو وقتی حالات پر چھوڑ دیا ہے اس لیے محدود مشورہ کا طریق جو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے متعلق اختیار کیا گیا وہ ہرگز اسلامی تعلیم کے خلاف نہیں سمجھا جا سکتا۔ خصوصاً جبکہ اس بات کو بھی مدِ نظر رکھا جاوے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جو اس شوریٰ کے صدر تھے جس نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کا فیصلہ کیا اپنے طور پر بہت سے اہل الرائے صحابہ سے مشورہ کر لیا تھا اور رائے عامہ کو ٹٹولنے کے بعد خلافت کا فیصلہ کیا گیا تھا[3] اور پھر یہ کہ اس وقت حالات ایسے تھے کہ اگر اس معاملہ کو کھلے طریق پر رائے عامہ پر چھوڑا جاتا تو ممکن تھا کہ کوئی فتنہ کی صورت پیدا ہو جاتی۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ نے یہ بھی تصریح کر دی تھی کہ گو میرے لڑکے کو مشورہ میں شامل کیا جاوے مگر اُسے خلافت کا حق نہیں[4] ہوگا۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت عمرؓ کی طرح حضرت عثمانؓ کی خلافت کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی تھی[5] اس لیے اُن کی خلافت پر کسی مسلمان کو اعتراض نہیں ہوا۔

بنو اُمیہ کی خلافت صحیح اسلامی خلافت نہ تھی

اب رہا ملوکِ بنو امیہ اور بنو عباس کا سوال۔ سو ان کا طریق خلافت واقعی اسلامی طریق کے خلاف تھا اور محققینِ اسلام نے کبھی بھی ان کی امارت کو اسلامی طریق کی امارت نہیں سمجھا اس لیے وہ قابل

---

[1] بخاری و مسلم الواب فضائل اصحاب فضائل حضرت عمرؓ ۔ [2] بخاری کتاب فضائل اصحاب باب قصة البیعة والاتفاق علی عثمان عن عمرو بن میمون ۔ نیز بخاری و مسلم عن معدان بن ابی طلحہ و بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی عن ابن عمر بحوالہ تخلیص الصحاح باب فی ذکر الخلفاء الراشدین [3] بخاری کتاب الاحکام باب کَیْفَ یُبَایِعُ الْاِمَامُ ۔ نیز طبری و تاریخ کامل حالات استخلاف حضرت عثمانؓ [4] بخاری کتاب فضائل باب قصة البیعة عن عمرو بن میمون [5] مسلم باب من فضائل عثمان و ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ باب مناقب عثمان۔

حجت نہیں ہے۔ تاریخ و حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر آتا ہے کہ جب امیر معاویہ نے بعض غلط مشورں میں آکر پہلی دفعہ اسلام میں یہ بدعت جاری کرنی چاہی یعنی جمہور سے حق انتخاب عملاً چھین کر اپنے بیٹے یزید کو اپنی زندگی میں ہی اپنا جانشین مقرر کر دینا چاہا تو ان کبار صحابہ میں سے اکثر نے جو اس وقت زندہ تھے ان کی مخالفت کی۔ اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ طریق اسلامی تعلیم کے خلاف ہے کہ خلیفہ کی زندگی میں ہی اس کے بیٹے کے لیے بیعت کا عہد لیا جا رہا ہے[1] مگر امیر معاویہ نے نہ مانا اور عوام کا سہارا ڈھونڈ کر یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب امیر معاویہ فوت ہو گئے تو جو تھوڑے بہت صحابہ اس وقت بقیدِ حیات تھے وہ گو فتنہ کے خیال سے خاموش رہے مگر جیسا کہ تاریخ و حدیث میں اشارے ملتے ہیں انہوں نے دل میں یزید کی امارت کو قبول نہیں کیا بلکہ حضرت امام حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے تو اس طریق کو اسلامی تعلیم کے اس قدر خلاف سمجھا کہ باوجود نہایت درجہ کمزوری کی حالت میں ہونے کے وہ یزید کے مقابلہ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے اور بالآخر اسی جنگ میں امام حسینؓ تو یزید کے زمانہ میں ہی اور عبداللہ بن زبیرؓ کچھ عرصہ بعد شہید ہو گئے[2] مگر انہوں نے اس استبدادی حکومت کے سامنے جسے وہ اسلامی طریق کے خلاف سمجھتے تھے گردن نہیں جھکائی۔ لیکن امیر معاویہ کی یہ غلطی بعد میں آنے والوں کے لیے ایک مثال بن گئی اور اس وقت سے بادشاہی رنگ میں ولی عہدی کا طریق جاری ہو گیا۔

اس بات کا ثبوت کہ امیر معاویہ اور ان کے بعد آنے والے امراء کی امارت صحیح اسلامی خلافت نہیں تھی بلکہ صرف ایک بادشاہت تھی اس بات سے بھی ملتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ میرے بعد صحیح اسلامی خلافت صرف تیس سال رہے گی اور اس کے بعد بادشاہت کا طریق جاری ہو جائے گا۔[3] اور اگر حساب کیا جاوے تو حضرت علیؓ یا امام حسنؓ کی خلافت تک یہ تیس سالہ میعاد پوری ہو جاتی ہے اور امیر معاویہ کے زمانہ سے وہ میعاد شروع ہوتی ہے جسے بادشاہت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

جانشین مقرر کرنے کی شرائط

خلاصہ کلام یہ کہ اصل اسلامی تعلیم اور صحیح اسلامی تعامل یہی ہے کہ خلافت و امارت کا قیام لوگوں کے مشورہ سے ہونا چاہیئے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اسلام کے پہلے خلیفہ کے معاملہ میں ہوا[4] لیکن اگر کوئی خلیفہ اپنا جانشین خود مقرر کر جانے کی ضرورت محسوس کرے تو بعض حالات میں اس طریق کے اختیار کرنے کی اجازت تو ہے مگر

---

[1] بخاری تفسیر سورۃ احقاف و فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۴۴۲ و ۴۴۳ نیز تاریخ کامل جلد ۳ صفحہ ۲۱۴ تا ۲۱۸ و طبری حالات ۵۶ھ

[2] طبری و تاریخ کامل ابن اثیر حالات ۶۰ھ و ۶۱ھ و نیز حالات خلافت ابن زبیر۔

[3] ترمذی و ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الفتن فصل ثانی عن سفینۃ۔

[4] بخاری و مسلم وغیرہ عن ابن عمر بحوالہ تلخیص باب فی ذکر خلفاء الراشدین

جیسا کہ اسلامی تعلیم کی روح اور خلفاءِ اربعہ کی سنت سے ثابت ہوتا ہے اس کے لیے پانچ شرطیں ضروری ہیں اوّل یہ کہ اس وقت کوئی ایسے خاص حالات موجود ہونے چاہئیں جن کی وجہ سے عام طریق کو چھوڑ کر اس طریق کا اختیار کرنا مناسب ہو۔ دوم یہ کہ جانشین کا تقرر لوگوں کے مشورہ کے ساتھ کیا جاوے۔ سوم یہ کہ یہ تقرر صرف آئندہ خلیفہ یا امیر تک محدود رہے۔ یہ نہیں کہ کوئی خلیفہ یہ حکم دے جاوے کہ میرے بعد فلاں شخص امیر ہو اور اس کے بعد فلاں اور اس کے بعد فلاں کیونکہ یہ طریق آئندہ آنے والی نسلوں سے حق انتخاب چھین لینے کے مترادف ہے۔ چہارم یہ کہ یہ جانشین خلیفہ وقت کے قریبی رشتہ داروں میں سے نہ ہو۔ پنجم یہ کہ جانشین مقرر کرنے والا خلیفہ خود منتخب شدہ خلیفہ ہونا چاہیئے۔ واللہ اعلم

کیا امارت سے دستبرداری کی جاسکتی ہے ؟

یہ سوال کہ کوئی خلیفہ یا امیر باقاعدہ طور پر منتخب یا مقرر ہونے کے بعد خود بعد میں کسی مصلحت کی بناء پر خلافت سے دست بردار ہو سکتا ہے یا نہیں؟ ایک ایسا سوال ہے جس کے متعلق اسلامی شریعت میں کوئی نص نہیں پائی جاتی مگر ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں دنیوی امراء کے متعلق تو کوئی امر مانع نہیں سمجھا جا سکتا۔ البتہ دینی خلفاء کا سوال قابلِ غور ہے۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ جب حضرت عثمان خلیفہ ثالث سے اُن کے زمانہ کے باغیوں نے یہ درخواست کی کہ آپ خود بخود خلافت سے دست بردار ہو جائیں ورنہ ہم آپ کو جبراً الگ کر دیں گے یا قتل کر دینگے تو اس پر حضرت عثمانؓ نے یہ جواب دیا کہ جو عزت کی قمیص خدا نے مجھے پہنائی ہے میں اسے خود اپنی مرضی سے کبھی نہیں اُتاروں گا[1] جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف اشارہ تھا جو آپ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا تھا کہ خدا انہیں ایک قمیص پہنائے گا اور لوگ اسے اُتارنا چاہیں گے مگر تم اُسے نہ اُتارنا۔[2] لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت امام حسنؓ کا یہ فعل ہے کہ انہوں نے اُمتِ محمدیہ کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری اختیار کر لی[3] اور روایت آتی ہے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ میرے اس نواسے کے ذریعہ خدا دو مسلمان گروہوں میں صلح کروائے گا[4] گویا امام حسنؓ کے اس فعل کو مقام مدح میں سمجھا گیا ہے کہ اُن کی اس دستبرداری کے نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئی پوری ہوئی جس میں آپ نے امام حسنؓ کی ایک امتیازی خوبی بیان کی تھی۔ اور اُمتِ محمدیہ پھر ایک نقطہ پر جمع ہو گئی۔ ان دو مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دستبرداری کا سوال حالات پر چھوڑا گیا ہے یعنی یہ کہ اگر خلافت کا استحکام ہو چکا ہو جیسا کہ حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں ہو چکا

---

[1] طبری و تاریخ کامل ابن اثیر حالات قتل حضرت عثمانؓ۔ نیز رزین عن عبد اللہ بن سلام بحوالہ تلخیص الصحاح باب فی ذکر الخلفاء الراشدین

[2] ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ باب مناقب عثمانؓ۔ [3] بخاری عن حسن بصری کتاب الصلح نیز طبری و تاریخ کامل ابن اثیر حالات ۴۱ ہجری

[4] بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب مناقب اہل بیت و فتح الباری شرح حدیث مذکور

تھا یا یہ کہ اگر دست برداری کے متعلق لوگوں کی طرف سے خواہش یا مطالبہ ہو تو وہ ناپسندیدہ بلکہ ناجائز ہے۔ لیکن اگر قبل استحکامِ خلافت جیسا کہ امام حسنؓ کے معاملہ میں پایا جاتا ہے کسی اعلیٰ غرض کے حصول کے لیے خود خلیفہ اپنی خوشی سے اپنی خلافت سے دست بردار ہو جانا مناسب خیال کرے تو اس کے لیے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اِس جگہ یہ ذکر ضروری ہے کہ یہ خیال جو ہم نے یہاں ظاہر کیا ہے یہ اسلام کا کوئی فیصلہ شدہ عقیدہ نہیں ہے بلکہ محض ایک رائے ہے جو واقعات سے نتیجہ نکال کر قائم کی گئی ہے۔ واللہ اعلم

عزل اور میعادی انتخاب کا سوال

اور دینی اور دنیوی امراء میں فرق

یہ سوال کہ آیا امیر یا خلیفہ کا انتخاب میعادی بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؛ نیز یہ کہ آیا کوئی شخص امیر یا خلیفہ منتخب ہونے کے بعد کسی نقص یا کمزوری کی وجہ سے اپنے عہدہ سے معزول بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؛ ایک نہایت قابلِ غور سوال ہے۔ اس معاملہ میں اسلام نے دینی اور دنیاوی امراء میں ایک امتیاز رکھا ہے۔ دینی امراء سے مراد وہ امراء ہیں جن کے ہاتھ میں دینی سیاست یا دینی اور دنیوی سیاست مخلوط طور پر ہو اور دنیوی امراء سے وہ امراء مراد ہیں جن کا تعلق محض دنیوی سیاست کے ساتھ ہو۔ اوّل الذکر امراء کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [1] یعنی " اے مومنو! اللہ تعالیٰ وعدہ کرتا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے (اعلیٰ) ایمان لائیں اور (اعلیٰ قسم کے) نیک اعمال کریں کہ ضرور انہیں دنیا میں خلیفہ مقرر کرے گا جیسا کہ اس نے تم سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا اور اللہ ان خلفاء کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے ان کے ذریعہ سے طاقت وقوت عطا کرے گا اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دیگا یہ لوگ ہمیشہ میری عبادت کرینگے اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کرینگے اور جو لوگ ان خلفاء کی اطاعت سے منحرف ہونگے وہ بدعہد اور باغی سمجھے جائیں گے"۔ اس آیت کریمہ سے پتہ لگتا ہے کہ دینی خلفاء کی خلافت خدا تعالیٰ کے خاص تصرّف اور خاص منشاء کے ماتحت قائم ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت اُن کے شاملِ حال رہتی ہے اور ان کے ذریعہ سے دینی سیاست کی تقویت اور مضبوطی مقصود ہوتی ہے اور اسی لیے ان کی اطاعت سے خارج ہونے والا شخص خدا کی نظر میں فاسق و باغی سمجھا جاتا ہے۔ اس آیت کی عملی تشریح میں ایک حدیث آتی ہے کہ:۔

---

[1] سورۃ نور: ۵۶

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فِیْ مَرَضِہٖ لَقَدْ هَمَمْتُ اَوْ اَرَدْتُ اَنْ اُرْسِلَ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ وَ ابْنِہٖ حَتّٰی اَکْتُبَ کِتَابًا فَاَعْهَدَ اَنْ یَتَمَنَّی الْمُتَمَنُّوْنَ وَیَقُوْلُ قَائِلٌ اَنَا اَوْلٰی ثُمَّ قُلْتُ یَاْبَی اللّٰہُ وَیَدْفَعُ الْمُؤْمِنُوْنَ اَوْ یَدْفَعُ اللّٰہُ وَیَاْبَی الْمُؤْمِنُوْنَ[1]

یعنی حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جس مرض میں آنحضرت ﷺ فوت ہوتے اس کے ابتدا میں آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ تمہارے باپ اور بھائی کو بُلا کر ابوبکرؓ کی خلافت کے متعلق وصیت کر جاؤں تاکہ میرے بعد کوئی دوسرا شخص خلافت کی تمنا میں کھڑا نہ ہو جاوے اور یہ دعویٰ نہ کر دے کہ میں ابوبکرؓ کی نسبت خلافت کا زیادہ حقدار ہوں مگر پھر میں نے اس خیال سے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ مومنوں کی جماعت ابوبکرؓ کے سوا کسی اور شخص کی خلافت پر رضامند نہ ہوگی اور نہ ہی خدا کسی اور شخص کی خلافت کو قائم ہونے دے گا۔" اس حدیث سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ گو دینی خلفاء کا انتخاب بظاہر لوگوں کے مشورہ سے ہوتا ہے مگر درحقیقت ان کے انتخاب میں خدا کا دستِ غیبی کام کرتا ہے اور یہی اسلامی خلافت کا سچا فلسفہ ہے کہ بظاہر انتخاب مومن کرتے ہیں مگر حقیقۃً تصرف خدا کا ہوتا ہے یعنی ایک مرسل و مامور کی بعثت کے زمانہ کی طرح خدا خود تو سامنے نہیں آتا مگر اس کی مخفی تاریں لوگوں کے قلوب کو کھینچ کھینچ کر خلافت کے اہل شخص کی طرف مائل کر دیتی ہیں۔[2] اندریں حالات دینی خلفاء کے متعلق خواہ ان کا انتخاب بظاہر مشورہ ہی کے طریق پر ہوتا ہے میعادی انتخاب کا سوال یا انتخاب کے بعد عزل کا سوال بالکل خارج از بحث ہے اور اسی لئے خدا نے ایسے خلفاء کی اطاعت میں داخل نہ ہونیوالوں یا داخل ہو کر اطاعت سے خارج ہونیوالوں کو باغی قرار دیا ہے اور عقلاً بھی غور کیا جاوے تو دینی خلفاء کا انتخاب میعادی نہیں ہونا چاہیئے اور نہ انتخاب کے بعد ان کے عزل کا سوال اُٹھنا چاہیئے کیونکہ دینی تعلق کی بنیاد عقیدت اور اخلاص پر ہوتی ہے۔ اور دینی خلیفہ امام کا مرتبہ رکھتا ہے اور گو وہ احکام شریعت کے ماتحت ہوتا ہے اور ان میں کسی قسم کی کمی بیشی کرنے کا حق نہیں رکھتا مگر شریعت کی تشریح اور نفاذ کا کام اسی سے تعلق رکھتا ہے اور دینی سیاست کلیتہً اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اعمال میں بھی وہ اُمت کے لیے گویا ایک نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ پس اس قسم کے روحانی تعلق کو میعادی قرار دینا یا لوگوں کے لیے ایسے تعلق کے قطع کر دینے کو جائز کر دینا مذہب کی رُوح کے بالکل منافی ہے اور اس کے نتیجہ میں روحانی تعلق اور صلحاء کی بیعت وصحبت کی غرض وغایت بالکل فوت ہو جاتی ہے اور مذہب میں ایک ایسی ناجائز آزادی کا دروازہ کھل جاتا ہے جس کا آخری نتیجہ سوائے لامذہبی اور بے دینی کے اور کچھ نہیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں دنیوی امراء کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے ان کے تعلق کی بنیاد عقیدت و اخلاص پر نہیں ہوتی۔ بلکہ محض سیاسی مصالح پر ہوتی ہے اور نہ ان کے میعادی انتخاب یا عزل سے کوئی

---

[1] بخاری کتاب الاحکام باب الاستخلاف و مسلم باب من فضائل ابی بکرؓ مخلوطاً [2] آجکل کی سیاسی اصطلاحات کی رو سے کہہ سکتے ہیں کہ گویا اس معاملہ میں خدا تعالیٰ وائر پُلر (WIREWPULLER) کا کام دیتا ہے۔

براہ راست دینی فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے محض سیاسی حکام کے متعلق اسلام نے کوئی خاص پابندی عائد نہیں کی یعنی اس معاملہ میں لوگ آزاد رکھے گئے ہیں کہ اگر وہ اپنے حالات کے ماتحت ضروری خیال کریں تو سیاسی حکام کے انتخاب کو میعادی کر دیں یا اگر انتہائی حالات کے پیدا ہو جانے پر ضروری سمجھیں تو مناسب طریق پر ان کے عزل کے لیے ساعی ہوں۔

اسلامی اطاعت کا معیار

لیکن چونکہ اسلام فتنوں کے سدّ باب اور امن کے قیام کا نہایت زبردست حامی ہے آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی تعلیم میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ خروج عن الطاعت اور عزل کا سوال سوائے انتہائی حالات کے نہیں اُٹھنا چاہیے اور لوگوں کے لیے لازم ہے کہ حتی الوسع اپنے امیر کی فرمانبرداری اور اطاعت کے طریق سے خارج ہونے کا خیال دل میں نہ لائیں بلکہ اس معاملہ میں یہاں تک تاکید کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے حقوق کو غصب ہوتا دیکھ کر بھی صبر سے کام لیں۔ اور اپنے امراء کی طرف سے ظلم اور تعدی تک برداشت کریں مگر بغاوت اور تفرقہ کے رستے پر قدم زن نہ ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:۔

سَتَرَوْنَ بَعْدِیْ اَثَرَةً وَّاُمُوْرًا تُنْكِرُوْنَهَا قَالُوْا فَمَا تَأْمُرُنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. قَالَ اَدُّوْا اِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ وَسَلُوا اللّٰهَ حَقَّكُمْ[1] یعنی "اے مسلمانو! میرے بعد ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ تم پر ایسے ایسے لوگ امیر بنیں گے جو تمہارے حقوق غصب کریں گے اور ایسی ایسی باتیں کریں گے جو بہت ناپسندیدہ ہوں گی اور تمہیں اوپری لگیں گی۔ صحابہ نے عرض کیا۔ تو پھر یا رسول اللہ! ایسے حالات میں آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ تم اپنے امیروں کے حقوق انہیں ادا کرو اور اپنے حقوق خدا سے مانگو۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

مَنْ خَرَجَ عَنِ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةِ فَمَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً[2] یعنی "جو شخص امیر کی اطاعت سے خروج کرتا ہے اور جماعت کے اتحاد سے علیحدگی اختیار کر کے تفرقہ کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ وہ اگر بغیر توبہ کے اسی حالت میں مر جاوے تو اُس کی موت غیر اسلامی موت ہو گی۔" مگر ساتھ ہی رعایا کو یہ تحریک کی گئی ہے کہ اگر امیر کا رویہ ظالمانہ اور غاصبانہ ہو تو وہ اسے نیک مشورہ دیکر اصلاح کی کوشش کرے اور اس کوشش کو اسلام میں ایک بہت بڑا جہاد اور نیکی کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ كَلِمَةَ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ[3] یعنی "جب کوئی امیر ظلم و تعدی کا

---

[1] بخاری کتاب الفتن باب قول النبی ﷺ سَتَرَوْنَ بَعْدِیْ۔ [2] مسلم بحوالہ مشکوۃ کتاب الامارۃ فصل اوّل

[3] ترمذی و ابو داؤد و احمد بروایت مشکوۃ باب الامارۃ

طریق اختیار کرے تو اس حالت میں سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ انسان اس امیر کو حق و انصاف کا مشورہ دیکر اُسے اس کی ناجائز اور ظالمانہ کارروائیوں سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔"

لیکن اگر اس پر بھی امیر کی اصلاح نہ ہو اور وہ اپنی ناواجب کارروائیوں پر مُصر رہے اور صریح طور پر خدائی احکام کے خلاف حکم دے تو رعایا کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ نیک اور جائز باتوں میں تو بدستور امیر کی اطاعت کرتی رہے مگر ناجائز حصّہ میں اس کی اطاعت سے انکار کر دے چنانچہ فرمایا:۔

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ وَمَالَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ [1] یعنی "ہر مسلمان پر اپنے امیر کا حکم ماننا فرض ہے خواہ وہ حکم اسے پسند ہو یا نہ ہو لیکن اگر اسے کوئی ایسا حکم دیا جاوے جس میں خدائی قانون کی صریح نافرمانی لازم آتی ہو تو ایسے حکم کا سُننا اور ماننا اُس پر فرض نہیں ہوگا۔"

اگر باوجود رعایا کے اس نیک مشورہ اور اس جزوی عدمِ اطاعت کے کسی امیر کے ناجائز احکام کا سلسلہ ترقی کرتا جاوے اور وہ برملا طور پر خُدائی قانونِ سیاست اور خدائی قانونِ شریعت کے خلاف قدم زن ہونا شروع کر دے حتیٰ کہ اس کی امارت اس حد تک ضرر رساں صورت اختیار کر لے کہ اسے توڑنے کے لیے ملک کے امن اور جماعت کے اتحاد تک کو خطرے میں ڈالنا مناسب ہو جاوے تو اس قسم کے انتہائی حالات میں لوگوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اس امیر کی اطاعت سے خروج کر کے اس کے عزل کے لیے ساعی ہوں۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِيْ مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا وَاَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَلَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ [2] یعنی آنحضرت ﷺ کے مشہور صحابی عبادہؓ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم سے بیعت میں یہ اقرار لیا کرتے تھے کہ ہم ہر حال میں اپنے امیر کی اطاعت کریں گے۔ عُسر میں اور یُسر میں۔ پسندیدگی کی حالت میں اور ناپسندیدگی کی حالت میں۔ خواہ ہمارے حقوق ہمیں ملیں یا ہم سے چھینے جائیں۔ اور یہ کہ ہم کسی حالت میں بھی اپنے امیروں کے ساتھ امارت کے معاملہ میں تنازعہ نہیں کرینگے۔ مگر آپ نے فرمایا۔ ہاں اگر تم اپنے امیر کے رویہ میں کوئی ایسا کُھلا کُھلا کُفر پاؤ یعنی خدا کے کسی اصولی قانون کی ایسی صریح نافرمانی دیکھو جس کے متعلق تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی روشن اور قطعی دلیل موجود ہو تو پھر تمہیں اس کے ساتھ امارت کے معاملہ میں تنازعہ کرنے کا حق ہے۔" اس حدیث میں جو کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سے صرف عقیدہ

---

[1] بخاری کتاب الاحکام باب السمع و الطاعۃ [2] بخاری کتاب الفتن و مسلم کتاب الامارۃ

کا کفر مراد نہیں ہے بلکہ قانونِ سیاست اور قانونِ شریعت کے کسی اصل الاصول کا توڑنا مراد ہے چنانچہ
دوسری حدیث میں آتا ہے کہ کسی بے گناہ مسلمان کا ناجائز قتل بھی کفر میں داخل ہے[1] اور محقق صحابہ نے
ان خلافِ شریعت کارروائیوں کو بھی جو حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتنہ پردازوں کی طرف سے شروع
ہوگئی تھیں کفر قرار دیا ہے[2] مگر امیر کے خلاف سر اٹھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ کفر بالکل صریح اور
کھلا کھلا ہو اور کسی اجتہادی غلطی یا مشتبہ حالات کا نتیجہ نہ ہو حتیٰ کہ امیر کی بریت کے لیے امکانی طور پر بھی
تاویل کا کوئی دروازہ کھلا نہ رہے۔ اور اس کی امارت اس حد تک خطرناک صورت اختیار کرلے کہ اسکے
توڑنے کے لیے ملک کے امن اور قوم کے اتحاد تک کو خطرے میں ڈالنا ضروری ہو جاوے۔

عزل کی کوشش حکومت کے اندر رہتے ہوئے جائز نہیں

لیکن اس حالت میں بھی اسلام اس بات کو
پسند نہیں کرتا کہ امیر کی مملکت میں رہتے
ہوئے اور اس کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن پر رکھتے ہوئے اس کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا جاوے
اور اس میں غرض یہ مدنظر ہے کہ تا ملک کے اندر سِوِل وار یعنی خانہ جنگی کی صورت پیدا نہ ہو اور یہ خطرناک
منظر نظر نہ آوے کہ ایک امیر کے ماتحت رہتے ہوتے لوگ اس کے خلاف سر اُٹھاتے ہیں۔ چنانچہ اس
قسم کے انتہائی حالات میں اسلامی طریق یہ ہے کہ جو لوگ امیر کی حکومت کو ازبس خطرناک سمجھیں انہیں
چاہیئے کہ اس کی مملکت سے نکل جائیں اور مملکت سے نکل جانے کے بعد اگر ضروری اور مناسب
خیال کریں تو اس کے عزل کے لیے ساعی ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی ہجرت بھی اسی اصل کے ماتحت
وقوع میں آئی تھی کہ آپ نے مکہ کی حکومت کے مظالم اور مذہبی دست درازیوں سے تنگ آکر بالآخر
روساء قریش کی حکومت سے خروج کا طریق اختیار کیا تھا۔ اور پھر اس کے بعد خدا نے آپ کے ذریعہ
قریش کی اس ظالمانہ حکومت کے توڑنے کی تدبیر فرمائی تھی اور قریباً یہی صورت خدائی حکم کے ماتحت
بنو اسرائیل نے فرعون کے مظالم پر اختیار کی تھی یعنی یہ کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہو کر فرعون کی حکومت
سے نکل گئے تھے[3] اور اسی صورت سے ملتی جلتی صورت امام حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے یزید بن
معاویہ بن ابی سفیانؓ کی امارت کے موقعہ پر اختیار کی تھی یعنی جب امیر معاویہ نے بعض غلط مشوروں
میں آکر خلافِ تعلیم اسلام اور خلافِ سنّتِ خلفاء الراشدین اپنی زندگی میں ہی اپنے لڑکے یزید کو اپنا
جانشین مقرر کرنا چاہا۔ تو ان اصحاب نے صاف صاف کہدیا کہ یہ طریق خلافِ تعلیم اسلام ہے، لیکن
جب امیر معاویہ نے ان کی رائے نہ مانی اور عوام کا سہارا ڈھونڈ کر یزید کو اپنا جانشین مقرر کردیا تو

۱؎ بخاری کتاب الفتن باب قول النبی ﷺ لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا ۲؎ بخاری کتاب الفتن باب
إِذَا قَالَ عِنْدَ قَوْمٍ شَیْئًا ۳؎ سورۃ طٰہٰ ۸۰، و سورۃ یونس ۸۸، ۹۱

انہوں نے ناچار خاموشی اختیار کی۔ کیونکہ اس وقت امیر معاویہ برسرِ حکومت تھے اور یہ اصحاب انکی بیعت اطاعت میں داخل تھے اس لیے ان کے لیے امیر معاویہ کی حکومت کے اندر رہتے ہوئے انکے خلاف سر اُٹھانا جائز نہیں تھا اور دوسری طرف اس وقت امیر معاویہ کی حکومت سے باہر نکل جانے کی بھی کوئی عملی صورت نہیں تھی لیکن جب امیر معاویہؓ فوت ہوگئے۔ اور یزید نے اپنی خلافت کا اعلان کیا تو اس وقت امام حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اس کی بیعت میں داخل نہیں ہوتے بلکہ اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے[1] کیونکہ ابھی تک یزید کی اطاعت اُن پر فرض نہیں ہوئی تھی۔ اس صورت میں گویا یزید کے خلاف اُٹھنا یزید کی مملکت سے باہر ہو کر مقابلہ کرنے کے مترادف تھا مگر امام حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کی یہ کوشش کوئی مستقل نتیجہ نہیں پیدا کر سکی اور بنو امیہ کی استبدادی حکومت کو فروغ حاصل ہوگیا۔ بہر حال اسلام میں کسی امیر کے ماتحت رہتے ہوتے اس کے خلاف سر اُٹھانے اور اس کے عزل کی کوشش کرنے کو پسند نہیں کیا گیا بلکہ اس صورت میں اسلامی طریق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص امیر کے رویہ کو صریح طور پر خلافِ اصولِ سیاست پاتے اور اس کی امارت کو اس حد تک ضرر رساں سمجھے کہ اس کے توڑنے کے لیے ملک کے امن اور جماعت کے اتحاد تک کو خطرے میں ڈالنا ضروری خیال کرے تو اُسے چاہیئے کہ ایسے امیر کی مملکت سے باہر نکل جاوے اور پھر جس طرح مناسب ہو اس کے عزل کے لیے ساعی ہو۔

اس جگہ طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی امیر لوگوں کو باہر نکل جانے سے جبراً روکے تو پھر کیا طریق اختیار کیا جاوے تو اس کا یہ جواب ہے کہ جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ اصولی طور پر فرماتا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا[2] یعنی "انسان صرف اس حد تک مکلّف ہے جس حد تک کہ اسکی طاقت ہے۔" اور جیسا کہ بنی اسرائیل کے واقعہ میں خدائی اشارہ پایا جاتا ہے جہاں خدا فرماتا ہے کہ فرعون کا بنی اسرائیل کے تعاقب میں جا کر ان کو خروج سے جبراً روکنے کی کوشش کرنا ناجائز اور خدائی قانون سے بغاوت کے ہم معنی تھا[3] اس قسم کی صورت میں جو خود امیر کی طرف سے پیدا کی جاوے ملک کے اندر رہتے ہوتے بھی ظالم امیر کے خلاف سر اُٹھانا جائز سمجھا جائیگا۔

کیا امارت کا حق صرف قریش کیساتھ مخصوص ہے؟

اسلامی اصولِ حکومت کی بحث کی ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسلامی تعلیم کی رو سے خلیفہ یا امیر کے لیے کسی خاص قوم میں سے ہونا تو ضروری نہیں ہے؟ یہ سوال خصوصیت سے اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بعض احادیث میں یہ مذکور ہوا ہے کہ خلفاء قریش میں سے ہونگے جس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ گویا خلیفہ یا امیر کے لیے قریشی ہونا ضروری ہے۔ مگر یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ پہلی

---

[1] طبری حالات ۶۰ھ و ۶۱ھ ہجری نیز تاریخ کامل جلد ۳ صفحہ ۲۱۴ تا ۲۱۸ و جلد ۴ صفحہ ۶ و ۷ [2] سورۃ بقرہ: ۲۸۷ [3] سورۃ یونس: ۹۱

دلیل جو اس خیال کو غلط ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ اسلام میں اصولاً قومی یا نسلی خصوصیات کو دینی یا سیاسی حقوق کی بنیاد نہیں تسلیم کیا گیا۔ بالفاظ دیگر اسلام میں اِن معنوں کے لحاظ سے کوئی ذاتیں نہیں کہ فلاں ذات کو یہ حقوق حاصل ہونگے اور فلاں کو یہ بلکہ اس میں ذاتوں اور قوموں کو صرف تعارف اور شناخت کا ایک ذریعہ رکھا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَایَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ ------ وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ[1]

یعنی "اے مسلمانو! تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر اپنی بڑائی بیان کرے یا دوسری قوم کو اپنے سے نیچا سمجھے۔ کیونکہ تمہیں کیا معلوم ہے کہ خدا کی نظروں میں کون بڑا ہے۔ ...... اور ہم نے جو تمہیں دنیا میں قوموں اور قبائل کی صورت میں بنایا ہے تو اس کی غرض صرف یہ ہے کہ تم آپس کی شناخت اور تمیز میں آسانی پاؤ۔ یہ نہیں کہ تم اس تفریق پر کسی قسم کی بڑائی یا خاص حقوق کی بنیاد سمجھو۔ کیونکہ خدا کی نظر میں تم میں سے بڑا وہ ہے جو خدائی قانون کی زیادہ اطاعت اختیار کرتا ہے خواہ وہ کوئی ہو۔"

اس واضح اور غیر مشکوک اُصولی تعلیم کے علاوہ قرآن شریف خاص خلافت و امارت کے سوال میں بھی قومی یا خاندانی حق کے خیال کو ردّ کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ[2] یعنی "خدا تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ حکومت کی باگ ڈور صرف اہل لوگوں کے سپرد کیا کرو (خواہ وہ کوئی ہوں) اور جو لوگ امیر منتخب ہوں انہیں چاہیئے کہ اپنی حکومت کو عدل و انصاف کے ساتھ چلائیں۔" اس آیت میں خلیفہ یا امیر کے لیے صرف یہ شرط رکھی گئی ہے کہ وہ حکومت کا اہل ہو اور اس کے علاوہ کوئی اور شرط نہیں لگائی گئی جو اس بات کی یقینی دلیل ہے کہ اسلام میں خلیفہ یا امیر کے لیے اہلیت کے سوا کوئی شرط نہیں ہے۔ اسی طرح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ[3] یعنی "حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اے مسلمانو! اگر تم پر ایک حبشی غلام بھی امیر بنایا جاوے تو تمہارا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرو۔" اگر اسلام میں امیر کا قریشی ہونا ضروری تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بے معنی قرار پاتا ہے بلکہ اس صورت میں آپ کو یہ

---

[1] سورۃ حجرات: ۱۲ [2] سورۃ نساء: ۵۹ [3] بخاری کتاب الاحکام باب السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ

فرمانا چاہیے تھا کہ تم ہر قریشی امیر کی فرمانبرداری کرو خواہ وہ کیسا ہی ہو۔ الغرض کیا بلحاظِ اصول کے اور کیا بلحاظِ تخصیص کے یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ اسلام میں حکومت اور خلافت کو کسی خاص قوم کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے اور اسلامی تعلیم کی رُوح اس خیال کو دُور سے دھکّے دیتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر ان احادیث کا کیا مطلب ہے جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ خلفاء اور ائمہ قریش میں سے ہونگے۔ سو ان احادیث پر ایک ادنیٰ تدبر بھی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ ایک پیشگوئی تھی نہ کہ حکم یا سفارش۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اور بہت سی باتوں کا اظہار فرمایا تھا جو آئندہ ہونے والی تھیں اسی طرح جو خلفاء آپ کے بعد ہونے والے تھے ان کے متعلق آپ کو یہ علم دیا گیا تھا کہ وہ قبیلہ قریش میں سے ہونگے اور پیشگوئی کی صورت میں قطعاً کوئی اعتراض نہیں رہتا کیونکہ بہر حال خلفاء نے کسی نہ کسی قوم یا قبیلہ میں سے ہونا تھا اور اگر اس وقت کے حالات کے ماتحت وہ سب کے سب قریش میں سے ہوتے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت قریش ہی وہ قبیلہ تھا جو حکومت کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتا تھا۔ کیونکہ اوّل تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا قبیلہ تھا جس کی وجہ سے طبعاً اسے مسلمانوں میں ایک جائز عزت حاصل تھی اور لوگ اس کے اثر کو قبول کرتے تھے۔ دوم قریش کا قبیلہ عرب کے سب سے زیادہ مرکزی شہر کا رہنے والا اور وہی کعبتہ اللہ کا بھی متولی تھا جس کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں بھی وہ سارے ملک میں خاص عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور دوسرے قبائل عرب عموماً ہر معاملہ میں قریش کی طرف دیکھتے تھے اور ان کی رہبری کو قبول کرتے تھے۔ سوم قریش کے لوگ بوجہ اس نظام کے جو اُن کے جدِ اعلیٰ قصیٰ بن کلاب نے مکّہ میں جاری کیا تھا حکومت کے نظام و طریق سے ایک حد تک واقف ہو چکے تھے۔ اور ان کے سوا کوئی دوسرا قبیلہ امورِ حکومت سے آشنا نہیں تھا۔ چہارم بوجہ اسکے کہ اسلام میں سابقین الاوّلین سب قریش میں سے تھے اور انہیں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے اور آپ کی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کا سب سے زیادہ موقعہ ملا تھا اس لیے وہ لازماً اسلامی طریق حکومت میں بھی دوسروں کی نسبت بہت زیادہ اہلیت رکھتے تھے ان وجوہات کی بناء پر اس زمانہ میں قریش کو دوسرے قبائل عرب پر ایک حقیقی اور یقینی فوقیت حاصل تھی اور انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلہ میں عنانِ حکومت کا جانا ملک کے لیے سخت ضرر رساں تھا اور یقیناً کوئی دوسرا قبیلہ اس خیر و خوبی کے ساتھ نظامِ حکومت کو چلا نہ سکتا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کے ابتدائی خلفاء نے چلایا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسلام نے قریش کو ہمیشہ کے لیے حکومت کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ چنانچہ اگر ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مروی ہوا ہے کہ میرے بعد خلفاء و ائمہ اسلام قریش میں سے ہونگے تو دوسری طرف آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بالآخر قریش حکومت کی اہلیت کو کھو بیٹھیں گے اور اسلام کی حکومت کو تباہ و برباد کرنے کا موجب بن جائیں گے چنانچہ حدیث میں آتا ہے:۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ ھَلَکَۃُ اُمَّتِیْ عَلٰی یَدَیْ غِلْمَۃٍ مِنْ قُرَیْشٍ[1]

یعنی "ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میری اُمّت کی تباہی بالآخر قریش کے نوجوانوں کے ہاتھوں سے ہوگی" یعنی جب قریش کی حالت خراب ہوجائیگی اور وہ حکومت کے اہل نہیں رہیں گے تو پھر اس کے بعد ان کے ہاتھ میں حکومت کا رہنا بجائے رحمت کے زحمت ہوجائے گا اور بالآخر قریش ہی کے ہاتھوں سے اسلامی حکومت کی تباہی کا سامان پیدا ہوجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور یہ جو بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ قریش کی امارت قیامت تک رہے گی۔ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ اُمّتِ اسلامی کی تباہی تک[2] قریش برسرِحکومت رہیں گے۔ اور پھر بالآخر انہیں کے ہاتھوں سے تباہی کا بیج بویا جاکر اسلام میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوجائے گا۔ خلاصہ کلام یہ کہ قرآن و احادیث کے مجموعی مطالعہ سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قریش کی امارت وخلافت کے متعلق جو آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے اس سے محض پیشگوئی مراد ہے حکم یا سفارش مراد نہیں اور پھر یہ پیشگوئی بھی میعادی اثر رکھتی تھی یعنی اسلام کے دَورِ اوّل کے ساتھ مخصوص تھی اور آپ کا منشاء یہ تھا کہ چونکہ اس وقت حکومت کی اہلیت سب سے زیادہ قریش میں ہے اس لیے آپ کے بعد وہی برسرِحکومت واقتدار رہیں گے لیکن جب ایک عرصہ کے بعد وہ اس اہلیت کو کھو بیٹھیں گے تو پھر اس وقت اُمّتِ محمدیہ پر ایک انقلاب آئے گا۔ اور اس کے بعد ایک نئے دَور کی داغ بیل قائم ہوجائے گی۔ الغرض یہ بات درست نہیں ہے کہ اسلام نے حکومت کے حق کو کسی خاص خاندان یا قوم کے ساتھ محدود کر دیا ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اسلام میں حکومت انتخاب سے قائم ہوتی ہے اور انتخاب میں ہر شخص کے لیے دروازہ کھلا رکھا گیا ہے۔

یہ وہ مختصر ڈھانچہ حکومت کے طریق کا ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اور ہر عقلمند اور غیرمتعصب شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک بہترین ہدایت ہے جو اس معاملہ میں دی جاسکتی تھی۔ کیونکہ اصولِ سیاست کے لحاظ سے کامل ہونے کے علاوہ یہ تعلیم ایک ایسا جامع رنگ رکھتی ہے کہ تفاصیل کے مناسب اختلاف کے ساتھ وہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے ایک شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔ اور اس زمانہ کے ترقی یافتہ مغربی ممالک کے سیاست دان بھی ابھی تک اُصولِ سیاست میں اس سے بہتر طریق دنیا کے سامنے پیش نہیں کرسکے۔ ظاہر ہے کہ سیاست کے بنیادی اُصول چار ہیں:۔ اوّل یہ کہ امیر یعنی صدرِ حکومت کا تقرر کس اصول پر مبنی ہو۔ آیا ورثہ کے حق کی بناء پر یا کسی خاندانی حق کی بناء پر یا بعض خاص لوگوں کی رائے سے یا جمہور اور عامۃ الناس کے مشورہ کے ساتھ۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی شخص امارت کے عہدہ پر قائم ہوجاوے تو اس کا طریق حکومت کیا ہونا چاہیئے آیا خود مختارانہ اور استبدادی یا کسی

---

[1] بخاری کتاب الفتن۔ [2] اسلامی اصطلاح میں بڑے انقلاب کو بھی قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قانون کے ماتحت اور لوگوں کی رائے اور مشورہ کے ساتھ۔ تیسرے یہ کہ لوگوں کا امیر کے متعلق کیا رویہ ہو آیا وہ اس کے ساتھ انتہائی حد تک تعاون اور اطاعت کا طریق اختیار کریں یا کہ ہر بات پر جو اُن کی مرضی کے خلاف ہو بگڑیں۔ اور اس کے رستے میں روکیں ڈالیں اور بزعم خود جب بھی اپنے حقوق خطرہ میں دیکھیں یا امیر کا کوئی کام قابلِ اعتراض سمجھیں تو شور کرتے ہوئے اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ چوتھے یہ کہ اگر واقعی امیر کا رویہ صریح طور پر ناجائز اور قابلِ اعتراض ہو اور وہ اپنے اس رویہ میں ناقابلِ برداشت انتہا۔ کو پہنچ جاوے اور اسے اپنے ظالمانہ طریق پر اصرار ہو تو پھر اس کے متعلق کیا طریق اختیار کیا جاوے۔ ان چاروں اُصولی مسائل میں اسلام نے وہ تعلیم پیش کی ہے جو بہترین سیاست کی جان ہے۔ اور اس میں بنی نوع انسان کی بہبودی اور دُنیا کے امن وامان کے لیے ایک ایسی بنیاد قائم کر دی گئی ہے جس پر قائم رہتے ہوئے اوّل تو حاکم و محکوم کے تعلقات بگڑ ہی نہیں سکتے اور کبھی بگڑیں بھی تو ان کے خطرناک اور ضرر رساں نتائج سے ملک محفوظ رہتا ہے اور یہ تعلیم آنحضرت ﷺ نے اس وقت دی جبکہ دُنیا میں بیشتر طور پر نسلی اور استبدادی حکومت کا دُور دورہ تھا اور اکثر ممالک نیابتی اور مشورہ کی حکومت کے خیال تک سے ناآشنا تھے۔

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اس نوٹ کو ختم کرنے سے قبل اس تعلیم کا ذکر کرنا بھی بے موقعہ نہ ہوگا جو اسلام نے غیر مسلم حکومتوں یا اسلامی حکومت کے اندر کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ معاملہ کرنے کے بارے میں دی ہے۔ سو اس معاملہ میں اسلام سب سے پہلے تو یہ اصول بیان کرتا ہے کہ عدل وانصاف کا معیار سب قوموں کے ساتھ ایک سا ہونا چاہیئے اور ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ اپنوں کے ساتھ تو عدل وانصاف کا معاملہ کیا جاوے اور جب دوسروں کا سوال ہو تو اس اُصول کو بُھلا دیا جاوے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ [1]

یعنی "اے مسلمانو! تم خدا کی خاطر دُنیا میں نیکی اور عدل کے قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور چاہیئے کہ کسی قوم کی مخالفت تمہیں عدل وانصاف کے رستے سے نہ ہٹاتے بلکہ تم سب کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو۔ کیونکہ یہی طریق تقویٰ کا تقاضا ہے پس تم متقی بنو اور یاد رکھو کہ خدا تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔"

---

[1] سورۃ مائدہ: ۹

یہ آیت غیر حکومتوں اور غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے لیے بطور ایک بنیادی پتھر کے ہے کیونکہ اس میں وہ اصل الاصول بتایا گیا ہے جس پر بین الاقوام اور بین الدُوَل تعلقات قائم ہونے چاہئیں اور غور کیا جائے تو یہ اصول ایسا زرین ہے کہ اگر فریقین کی طرف سے اس پر پورا پورا عمل ہو تو نہ صرف یہ کہ بین الاقوام تعلقات کبھی بگڑ نہیں سکتے۔ بلکہ وہ ایسی خوشگوار صورت میں قائم رہ سکتے ہیں کہ جس میں بگڑنے کا کوئی امکان ہی نہ ہو۔ مگر افسوس کہ اکثر لوگ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اس اصول کو عملاً نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اس جامع و مانع اصول کے بعد اسلام معاہدہ کے سوال کو لیتا ہے کیونکہ بین الاقوام تعلقات میں یہی سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے :۔

اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا [1] یعنی "اے مسلمانو! تم اپنے تمام عہدوں کو پورا کرو۔ کیونکہ خدا کے حضور تمہیں اپنے عہدوں کے متعلق جواب دہ ہونا پڑے گا۔" اس حکم کے ماتحت مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے معاہدات کو نہایت وفاداری اور دیانت کے ساتھ نبھائیں۔ اور کسی ایسے فعل کے مرتکب نہ ہوں جو ان کے عہد و پیمان کی رُوح یا الفاظ کے خلاف ہو۔

اسلام میں معاہدہ کی پابندی کا اس قدر تاکیدی حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر کسی مسلمان قوم کا کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ معاہدہ ہو اور پھر اس غیر مسلم قوم کے خلاف کوئی دوسری مسلمان قوم اس مسلمان قوم کو اپنی مدد کے لیے بلائے تو اسے چاہیئے کہ ہرگز اس کی مدد نہ کرے بلکہ بہر حال اپنے عہد پر قائم رہے۔ چنانچہ فرماتا ہے :۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ [2]

یعنی "جو لوگ مسلمان تو ہو گئے ہیں مگر وہ ہجرت کر کے اسلامی حکومت میں منسلک نہیں ہوئے ان کے متعلق اے مسلمانو تم پر کوئی خاص ذمہ واری نہیں ہے یہاں تک کہ وہ ہجرت کر کے تمہارے ساتھ ایک نہ ہو جائیں۔ ہاں اگر ایسے مسلمان تم سے کسی دینی معاملہ میں مدد مانگیں تو تمہارا فرض ہے کہ انکی مدد کرو۔ لیکن اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کے خلاف تم سے مدد مانگیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو پھر تم ہرگز انکی مدد نہ کرو اور بہر حال اپنے عہد پر قائم رہو۔ اور جانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔" کیا اس سے بڑھکر ایفائے عہد اور عدل و انصاف کی کوئی تعلیم ہوگی ؟

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل : ۳۵ [2] سورۃ انفال : ۷۳

اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ[1] یعنی "جو مسلمان کسی ایسے غیر مسلم کے قتل کا مرتکب ہوگا جو کسی (لفظی یا عملی) معاہدہ کے نتیجہ میں اسلامی حکومت میں داخل ہو چکا ہے وہ (علاوہ اس دُنیا کی سزا کے) قیامت میں جنّت کی ہوا سے محروم رہے گا۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا اَوِ انْتَقَصَهُ اَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ اَوْ اَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسِهِ فَاَنَا حَجِيْجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ[2] یعنی "جو مسلمان کسی ایسے غیر مسلم پر جس کے ساتھ اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے کوئی ظلم کرے گا یا اسے کسی قسم کا نقصان پہنچاتے گا یا اس پر کوئی ایسی ذمہ داری یا ایسا کام ڈالے گا جو اس کی طاقت سے باہر ہے یا اس سے کوئی چیز بغیر اس کی دلی خوشی اور رضامندی کے لے گا تو اے مسلمانو سُن لو کہ میں قیامت کے دن اس غیر مسلم کی طرف سے ہو کر اس مسلمان کے خلاف خدا سے انصاف چاہونگا۔"

مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام صرف منفی قسم کے سلوک تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتا یعنی وہ صرف یہ نہیں کہتا کہ کسی غیر مسلم کی حق تلفی نہ کرو اور بس۔ بلکہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور احسان کا بھی حکم دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ[3] یعنی "اے مسلمانو! خدا نے جو تمہیں ان ظالم کافروں کے ساتھ دوستی لگانے سے منع فرمایا ہے جو تمہارے دین کو مٹانے کیلئے تمہارے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان غیر مسلموں کے ساتھ جو تمہارے دین کو جبراً مٹانے کے درپے نہیں اور تم پر ظلم نہیں کرتے تعلق نہ رکھو۔ بلکہ تمہیں چاہیئے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی اور عدل و احسان کا معاملہ کرو کیونکہ عدل و احسان کرنے والوں کو خدا پسند کرتا ہے۔"

مذہبی رواداری مذہبی آزادی اور دینی رواداری کے متعلق اسلامی تعلیم کا نمونہ جہاد کی بحث میں گذر چکا ہے۔ قرآن شریف نے اپنی متعدد آیات میں اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ دین کا معاملہ ہر شخص کی ضمیر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ پس دین میں قطعاً کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہونا چاہیئے[4] اور یہ تعلیم صرف کاغذوں کی زینت یا منبروں کی سجاوٹ نہیں تھی بلکہ اس پر نہایت دیانتداری

---

[1] بخاری کتاب الجہاد [2] ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ باب الصلح [3] سورۃ ممتحنہ : ۹

[4] سورۃ بقرہ : ۲۵۷

کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلا معاہدہ جو اسلام میں کیا یعنی وہ معاہدہ جو ہجرت کے بعد مدینہ کی یہودی آبادی کے ساتھ کیا گیا اس کی بنیاد مذہبی آزادی اور مذہبی رواداری کے اُصول پر ہی قائم کی گئی تھی[1] ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ جب بنو نضیر کو ان کی غداری اور فتنہ انگیزی کی سزا میں مدینہ سے جلا وطن کیا گیا اور اس وقت انہوں نے اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی لے جانا چاہا جو انصار کی اولاد تھے مگر انصار کے منّت ماننے کے نتیجہ میں یہودی بنا دیئے گئے تھے تو انصار نے انہیں مدینہ میں روک لینا چاہا۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ کے سامنے یہ اختلاف پیش ہوا تو آپ نے یہ فرماتے ہوتے کہ دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہوسکتا انصار کے خلاف فیصلہ فرمایا اور بنو نضیر کو اجازت دی کہ وہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے جائیں[2] آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی آگے چل کر یہ واقعات بھی ہمارے سامنے آئیں گے کہ جب خیبر کے یہودی اور نجران کے عیسائی اسلامی حکومت میں داخل ہوتے تو آنحضرت ﷺ نے عقیدہ اور عمل دونوں میں انہیں کامل آزادی عطا کی[3] بلکہ روایت آتی ہے کہ جب نجران کے عیسائی مدینہ میں آتے تو آنحضرت ﷺ نے انہیں مسجد نبوی کے اندر اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت عطا فرمائی اور جب بعض صحابہ نے انہیں روکنا چاہا تو آپ نے ان صحابہ کو منع فرما دیا۔ چنانچہ ان عیسائیوں نے مشرق رو ہو کر عین مسجد نبوی میں اپنی عبادت کے مراسم ادا کئے[4]

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی خلفاء اربعہ نے مذہبی رواداری کا ایک کامل نمونہ قائم کیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق روایت آتی ہے کہ وہ جب کبھی بھی کوئی اسلامی فوج روانہ فرماتے تھے تو اس کے امیر کو خاص طور پر یہ ہدایت فرماتے تھے کہ غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں اور ان کے مذہبی بزرگوں کا پورا پورا احترام کیا جاوے[5] اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام کا ملک فتح ہوا تو جو معاہدہ وہاں کی عیسائی آبادی کے ساتھ مسلمانوں کا قرار پایا۔ اُس میں مذہبی آزادی اور مذہبی رواداری کی روح سارے اُمور پر غالب تھی[6]

جزیہ کا مسئلہ

جزیہ کا مسئلہ بعض لوگوں کو قابلِ اعتراض نظر آتا ہے حالانکہ وہ محض ایک ٹیکس تھا جو نظامِ حکومت کے چلانے کے لیے غیر مسلم رعایا سے لیا جاتا تھا اور جس کا فائدہ بالواسطہ خود ٹیکس دینے والوں کو ہی پہنچتا تھا۔ کیونکہ اس روپے سے حکومت انکے حقوق کی حفاظت ان

---

[1] سیرۃ ابن ہشام معاہدہ یہود بعد ہجرت [2] ابوداؤد کتاب الجہاد [3] بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ خیبر و قصہ اہل نجران۔ و ابوداؤد کتاب الخراج باب فی اخذ الجزیۃ و کتاب الخراج ابو یوسف فصل قصہ نجران و زرقانی جلد ۳ حالات غزوہ خیبر و جلد ۴ حالات وفد نجران [4] زرقانی جلد ۴ حالات وفد نجران [5] موطا امام مالک کتاب الجہاد [6] دیکھو تاریخ طبری۔ ابن جریر و تاریخ کامل ابن اثیر و فتوح البلدان بلاذری و کتاب الخراج ابو یوسف و فتوح الشام واقدی حالات فتح شام

کے آرام و آسائش اور ان کی بہبودی کا انتظام کرتی تھی اور ان کے جان و مال کی حفاظت کے لیے افواج مہیا کرتی تھی اور اگر یہ اعتراض ہو کہ یہ ٹیکس غیر مسلم رعایا کے ساتھ مخصوص کیوں تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ ٹیکس فوجی خدمت کا معاوضہ سمجھا جاتا تھا جو مسلمان سپاہی سرانجام دیتے تھے مگر جس سے غیر مسلم رعایا آزاد رکھی گئی تھی یعنی جہاں ہر مسلمان گویا جبری بھرتی کے قانون کے ماتحت تھا وہاں غیر مسلم رعایا اس پابندی سے آزاد تھی۔ اس صورت میں یہ انصاف کا تقاضا تھا کہ اسلامی حکومت کے فوجی اخراجات کا بوجھ ایک حد تک غیر مسلم رعایا پر بھی ڈالا جاتا اور یہی جزیہ تھا۔ علاوہ ازیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل اسلام میں ٹیکس کے معاملہ کو تین شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

اوّل وہ ٹیکس جو صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص تھے مثلاً زکوٰۃ۔ دوم وہ ٹیکس جو صرف غیر مسلموں کے ساتھ خاص تھے مثلاً جزیہ۔ سوم مشترک ٹیکس جو حسب حالات سب پر لگائے جا سکتے تھے مثلاً زمین کا مالیہ۔ اس تقسیم و تفریق کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی حکومت کو بعض ایسے کام بھی کرنے پڑتے تھے جو مسلمانوں کے دینی مصالح کے ساتھ خاص تھے اور یہ انصاف سے بعید تھا کہ ان کا بوجھ غیر مسلم رعایا پر ڈالا جاتا لہٰذا کمال دیانت داری کے ساتھ اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے بعض ٹیکس جُدا جُدا کر دیئے۔ چنانچہ جہاں مسلمانوں کے مخصوص ٹیکس یعنی زکوٰۃ میں دینی اور سیاسی اغراض ہر دو مخلوط طور پر شامل کر دی گئیں[1] وہاں غیر مسلموں کے مخصوص ٹیکس یعنی جزیہ کے مصارف میں کوئی دینی غرض شامل نہیں کی گئی بلکہ اسے عام رکھا گیا ہے[2] یہی وجہ ہے کہ بیشتر صورتوں میں زکوٰۃ کا ٹیکس جو مسلمانوں کے لیے خاص ہے جزیہ کے ٹیکس سے بھاری ہوتا ہے کیونکہ اس کے مصارف زیادہ ہیں پس غور کیا جاوے تو جزیہ کے ٹیکس کا غیر مسلموں کے ساتھ مخصوص کر دیا جانا اسلام اور بانیٔ اسلام کی اعلیٰ درجہ کی دیانت کا ثبوت ہے مگر افسوس ہے کہ نادان لوگوں نے اسی کو ایک اعتراض کی بنیاد بنا لیا ہے۔

اب رہا جزیہ کی تشخیص و تحصیل کا سوال۔ سو اس معاملہ میں بھی اسلام نے ایک ایسا اعلیٰ نمونہ قائم کیا ہے جس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اس کے متعلق سب سے پہلی بات تو یہ جاننی چاہیئے کہ اسلام نے جزیہ کے ٹیکس کی کوئی شرح معیّن نہیں کی بلکہ اسے ہر زمانہ اور ہر قوم کے حالات پر چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے مختلف قبائل کے ساتھ جزیہ کے متعلق مختلف صورتیں اور مختلف شرحیں اختیار کی تھیں۔ چنانچہ مثلاً نجران کے عیسائیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجموعی طور پر دو ہزار چادریں اور بعض ضروری چیزیں سالانہ مقرر کی تھیں[3] مگر اس کے مقابل پر یمن کے لوگوں سے

---

[1] سورۃ توبہ: ۶۰ [2] سورۃ توبہ: ۲۹ [3] بخاری بحوالہ فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۷۳ و ابوداؤد کتاب الخراج باب فی اخذ الجزیۃ و کتاب الخراج قاضی ابویوسف

اوسطاً ایک[1] دینار فی کس سالانہ مقرر ہوا تھا[2]۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء نے بھی یہی طریق جاری رکھا کہ ہر قوم کے مناسب حال اُن سے جزیہ کا ٹیکس وصول کیا جاتا تھا اور افراد پر اس ٹیکس کی تقسیم ایسے رنگ میں کی جاتی تھی کہ ہر شخص پر اس کی مالی طاقت کے مطابق بوجھ پڑتا تھا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ خلفاء اربعہ کے زمانہ میں جزیہ کے ٹیکس کی صورت عموماً یہ تھی کہ خوشحال لوگوں سے اڑتالیس درہم[3] سالانہ لیا جاتا تھا۔ اور متوسط الحال لوگوں سے چوبیس درہم سالانہ اور ان سے کم حیثیت لوگوں سے صرف بارہ درہم سالانہ لیا جاتا تھا[4]۔

یہ خفیف ٹیکس بھی ساری غیر مسلم آبادی پر نہیں لگایا جاتا تھا بلکہ مندرجہ ذیل اقسام کے لوگ اس سے مستثنیٰ تھے۔

۱۔ تمام وہ لوگ جو مذہب کے لیے اپنی زندگی وقف رکھتے تھے۔

۲۔ تمام عورتیں اور بچے۔

۳۔ تمام بوڑھے اور معمر لوگ جو کام کے ناقابل تھے۔

۴۔ تمام نابینا لوگ اور اسی قسم کے دوسرے معذور لوگ جو کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔

۵۔ تمام مساکین اور غرباء جن کی مالی حالت جزیہ کی ادائیگی کے قابل نہ تھی[5]۔

جزیہ کی تحصیل میں یہ اُصول مدنظر رکھے جاتے تھے:۔

(الف) جزیہ دینے والے کو اختیار تھا کہ خواہ نقد ادا کرے یا اس کی قیمت کے اندازے پر کوئی چیز دے دے۔

(ب) جزیہ کی وصولی کے متعلق تاکیدی حکم تھا کہ اس معاملہ میں کسی قسم کی سختی سے کام نہ لیا جاوے اور بالخصوص بدنی سزا سے منع کیا گیا تھا۔

(ج) اگر کوئی شخص ایسی حالت میں مرجاتا تھا کہ اس کے ذمہ جزیہ کی کوئی رقم واجب الادا ہوتی تھی تو وہ معاف کر دی جاتی تھی اور مرنے والے کے ورثاء اور ترکہ کو اس کا ذمہ وار نہیں قرار دیا جاتا تھا[6]۔

کیا یہ مراعات آج کوئی قوم کسی دوسری قوم سے کرتی ہے؟ پھر یہی نہیں کہ جزیہ کی تشخیص میں نرمی سے کام لیا جاتا تھا بلکہ اگر جزیہ واجب ہو جانے کے بعد بھی کسی شخص کی مالی حالت جزیہ ادا کرنے کے قابل نہ رہتی تھی تو اُسے جزیہ کی رقم معاف کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ ذیل کا تاریخی واقعہ اس کی ایک دلچسپ

---

[1] عرب کا ایک معمولی سونے کا سکہ تھا [2] ابوداؤد کتاب الخراج باب فی اخذ الجزیۃ [3] عرب کا ایک معمولی چاندی کا سکہ تھا۔
[4] کتاب الخراج قاضی ابویوسف فصل فِی مَنْ تَجِبُ عَلَيْهِ الْجِزْيَةُ ۔ [5] کتاب الخراج فصل فِی مَنْ تَجِبُ عَلَيْهِ الْجِزْيَةُ [6] ایضاً

مثال ہے۔ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ ایک ایسی جگہ سے گذرے جہاں بعض غیر مسلموں سے جزیہ وصول کرنے میں کچھ سختی کی جا رہی تھی۔ یہ دیکھکر حضرت عمرؓ فوراً رُک گئے اور غصہ کی حالت میں دریافت فرمایا کہ "یہ معاملہ کیا ہے"؟ عرض کیا گیا کہ "یہ لوگ جزیہ ادا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی طاقت نہیں ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان پر وہ بوجھ ڈالا جاوے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتے۔ انہیں چھوڑ دو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو شخص دنیا میں لوگوں کو تکلیف دیتا ہے وہ قیامت کے دن خدا کے عذاب کے نیچے ہوگا۔ چنانچہ ان لوگوں کا جزیہ معاف کر دیا گیا۔"[1]

حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تاکیدی ارشادات کے ماتحت اپنی غیر مسلم رعایا کا اس قدر خیال تھا کہ انہوں نے فوت ہوتے ہوتے خاص طور پر ایک وصیت کی جس کے الفاظ یہ تھے:۔ "میں اپنے بعد میں آنے والے خلیفہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا سے بہت نرمی اور شفقت کا معاملہ کرے۔ ان کے معاہدات کو پورا کرے ان کی حفاظت کرے۔ ان کے لیے ان کے دشمنوں سے لڑے اور ان پر قطعاً کوئی ایسا بوجھ یا ذمہ داری نہ ڈالے جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو۔"[2]

عام سلوک اور سیاسی تعلقات

عام سلوک اور سیاسی تعلقات کے معاملہ میں بھی اسلام نے ایسا نمونہ قائم کیا جس کی مثال کسی دوسری قوم میں نہیں ملتی۔ خیبر کے یہودیوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدہ کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محاصل کی بٹائی کے لیے اپنے صحابی عبداللہؓ بن رواحہؓ کو بھیجا کرتے تھے۔ آپ کی تعلیم کے ماتحت عبداللہ بن رواحہؓ فصل کی بٹائی میں اس قدر نرمی سے کام لیتے تھے کہ فصل کے دو حصے کرکے یہودیوں کو اختیار دے دیتے تھے کہ اب ان حصوں میں سے جو حصہ بھی تم پسند کر لو لے لو اور پھر جو حصہ پیچھے رہ جاتا تھا وہ خود لے لیتے تھے۔[3] حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام فتح ہوا تو معاہدہ کی رو سے مسلمانوں نے شام کی عیسائی آبادی سے ٹیکس وغیرہ وصول کیا۔ لیکن اس کے تھوڑے عرصہ بعد رومی سلطنت کی طرف سے پھر جنگ کا اندیشہ پیدا ہو گیا جس پر شام کے اسلامی امیر حضرت ابو عبیدہؓ نے تمام وصول شدہ ٹیکس عیسائی آبادی کو واپس کر دیا اور کہا کہ جب جنگ کی وجہ سے ہم تمہارے حقوق ادا نہیں کر سکتے تو ہمارے لیے جائز نہیں کہ یہ ٹیکس اپنے پاس رکھیں۔ عیسائیوں نے یہ دیکھکر بے اختیار مسلمانوں کو دُعا دی اور کہا "خدا کرے تم رومیوں پر فتح پاؤ اور پھر اس ملک کے حاکم بنو۔" چنانچہ جب مسلمانوں نے دوبارہ فتح حاصل کی

---

[1] کتاب الخراج فصل فی مَنْ تَجِبُ عَلَیْہِ الْجِزْیَة [2] کتاب الخراج صفحہ ۷۲ [3] ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الْمُسَاقَاة و باب فی الخرص نیز دیکھو مؤطا مالک کتاب المساقاۃ

نوعلاقہ کی عیسائی آبادی نے بڑی خوشی منائی اور واپس شدہ ٹیکس پھر مسلمانوں کو ادا کیے۔[1] یہ اسی قسم کے حُسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی شام میں تشریف لے گئے تو وہاں کے عیسائی لوگ گاتے اور بجاتے ہوئے ان کے استقبال کے لیے نکلے اور ان پر تلواروں کا سایہ کیا اور پھولوں کی بارش برسائی۔[2]

ملکی عہدوں کے معاملہ میں بھی غیر مسلم رعایا کے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک عیسائی ابو زبید نامی کو ایک جگہ کا عامل مقرر فرمایا تھا۔[3]

آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور تعامل کے ماتحت حضرت عمرؓ کو اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کے حقوق اور ان کے آرام و آسائش کا اتنا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنے گورنروں کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ ذمیوں کا خاص خیال رکھیں اور خود بھی ان سے پوچھتے رہتے تھے کہ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ذمیوں کا ایک وفد حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش ہوا۔ تو حضرت عمرؓ نے اُن سے پہلا سوال یہی کیا کہ مسلمانوں کی طرف سے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ انہوں نے جواب دیا مَا نَعْلَمُ اِلَّا وَفَاءً وَّحُسْنَ مَلَكَةٍ[4] یعنی "ہم نے مسلمانوں کی طرف سے حُسن وفا۔ اور حُسن سلوک کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔"

عدل وانصاف

محکمہ قضاء و عدالت میں مسلم اور غیر مسلم رعایا کے حقوق قانونی رنگ میں تو مساوی تھے ہی مگر عملاً بھی انصاف کا ترازو کسی طرف جھکنے نہیں پاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب بنو نضیر کی جلا وطنی کے موقعہ پر انصار اور یہود کے درمیان اختلاف پیدا ہوا یعنی یہودی لوگ انصار کی اولاد کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے اور انصار انہیں روکتے تھے تو اس پر آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کے خلاف اور یہود کے حق میں فیصلہ فرمایا۔[5] اسی طرح روایت آتی ہے کہ جب ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک یہودی اور مسلمان کا مقدمہ پیش ہوا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ حق یہودی کے ساتھ ہے مسلمان کا مقدمہ خارج کر کے یہودی کے حق میں ڈگری دی۔[6] انہی کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک یہودی قتل ہو گیا اور اس کے قاتل کا کوئی سُراغ نہیں چلتا تھا۔ حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ گھبرا کر گھر سے نکل آئے اور صحابہ کو مسجد میں جمع کر کے منبر پر چڑھ گئے اور ایک نہایت زوردار خُطبہ دیا جس میں کہا کہ "خدا نے مجھے خلیفہ بنایا اور حکومت اسلامی کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں دی۔ اب کیا میرے ہوتے ہوئے مخلوقِ خدا کا اس طرح خون ہو گا۔ تم لوگوں کو خدا کی قسم ہے کہ جسے اس واقعہ کے متعلق کچھ علم ہو وہ مجھے بتائے" اس پر ایک صحابی بکر بن شداخ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "یا امیرالمومنین! یہ قتل مجھ سے سرزد ہوا ہے"۔ حضرت

---

[1] کتاب الخراج ابو یوسف صفحہ ۸۰، ۸۱، ۸۲ [2] فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۴۶ [3] اصابہ جلد ۹ صفحہ ۱۴۷ حالات ابوزبید الطائی الشاعر [4] طبری جلد ۵ صفحہ ۲۵۶۰ [5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام
[6] موطا امام مالک کتاب الاقضیۃ باب الترغیب فی القضاء بالحق

عمرؓ نے جواب دیا۔ "اللہ اکبر! تم اس کے قاتل ہو! تم سے قصاص لیا جائیگا۔ ورنہ کوئی بریت ہے تو پیش کرو۔"[1]

غریب ذمیوں کی امداد

اسلامی حکومت میں غریب اور نادار غیر مسلم رعایا کی مالی امداد کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اس سے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ اُس نے کہا۔ بوڑھا ہو گیا ہوں اور نظر کمزور ہے۔ کام ہو نہیں سکتا اور جزیہ کی رقم بھی ابھی مجھ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ بے چین ہو گئے۔ فوراً اسے اپنے ساتھ لیا اور اپنے گھر لا کر مناسب امداد دی اور پھر بیت المال کے افسر کو بلا کر کہا کہ یہ کیا بے انصافی ہے کہ ایسے لوگوں پر جزیہ لگایا جاتا ہے! ہمیں تو حکم ہے کہ غربا۔ کی امداد کریں نہ کہ اُلٹا ان پر ٹیکس لگائیں۔ اس کے بعد ایک عام حکم جاری فرمایا کہ ایسے لوگوں پر جزیہ نہ لگایا جاوے بلکہ اس قسم کے مستحق لوگوں کو بیت المال سے وظیفہ دیا جاوے[2] ذمیوں کی امداد تو الگ رہی اسلام میں حربی دشمنوں کی امداد کی مثالیں بھی مفقود نہیں ہیں چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب ۸ھ ہجری میں مکہ میں قحط پڑا تو آنحضرت ﷺ نے اپنے پاس سے مکہ والوں کی امداد کے لیے کچھ چاندی بھجوائی حالانکہ ابھی تک قریش مکہ اسلام کے خلاف برسرپیکار تھے۔

احساسات کا احترام

جذبات و احساسات کا رشتہ نہایت نازک ہوتا ہے اور فاتح اور غالب اقوام عموماً اس معاملہ میں بہت بے اعتنائی دکھاتی ہیں کیونکہ اس کا دارومدار کسی قانون پر نہیں ہوتا بلکہ صرف اس رُوح پر ہوتا ہے جو قلوب میں مخفی ہوتی ہے اور جس پر کوئی مادی قانون حکومت نہیں کر سکتا۔ مگر آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ اپنے غلبہ اور حکومت کے زمانہ میں بھی غیر مسلموں کے احساسات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مدینہ میں ایک یہودی نوجوان بیمار ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ اور اُس کی حالت کو نازک پا کر آپ نے اسے اسلام کی تبلیغ فرمائی۔ وہ آپ کی تبلیغ سے متأثر ہوا مگر چونکہ اس کا باپ زندہ تھا اور اس وقت پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ ایک سوال کی ہیئت بنا کر باپ کی طرف دیکھنے لگ گیا۔ باپ نے کہا۔ "بیٹے! اگر تمہیں تسلی ہے تو بیشک، ابوالقاسمؐ[3] کی بات مان لو۔" لڑکے نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا جس پر آنحضرت ﷺ بہت خوش ہوتے اور فرمایا "خدا کا شکر ہے کہ ایک رُوح آگ کے عذاب سے نجات پا گئی[4]"

جب شام کا ملک فتح ہوا اور وہاں کی عیسائی آبادی اسلامی حکومت کے ماتحت آگئی تو ایک دن جبکہ آنحضرت ﷺ کے صحابی سہل بن حنیف اور قیس بن سعد قادسیہ کے شہر میں کسی جگہ بیٹھے ہوتے تھے

---

[1] اسد الغابہ ذکر بکر بن شداخ نیز اس غلط خیال کی تردید کے لیے کہ ایک مسلمان کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا دیکھو طحاوی باب المومن یقتل الکافر متعمداً۔ [2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف فصل فی من تجب علیہ الجزیہ صفحہ ۷۲ [3] تاریخ الخمیس جلد ا صفحہ ۵۲۸

[4] آنحضرت ﷺ کی کنیت تھی۔ [5] بخاری ابواب الجنائز باب اذا اسلم الصبی

ان کے پاس سے ایک عیسائی کا جنازہ گذرا یہ دونوں اصحاب اسے دیکھکر تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوتے ۔ ایک مسلمان نے جو آنحضرت ﷺ کا صحبت یافتہ نہیں تھا اور ان اخلاق سے نا آشنا تھا جو اسلام سکھاتا ہے یہ دیکھکر بہت تعجب کیا اور حیران ہوکر سہل اور قیس سے کہا کہ یہ تو ایک ذمّی کا جنازہ ہے ۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں ! ہم جانتے ہیں مگر آنحضرت ﷺ کا یہی طریق تھا کہ آپ غیر مسلموں کے جنازہ کو دیکھکر بھی کھڑے ہوجاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ کیا ان میں خدا کی پیدا کی ہوئی جان نہیں ہے؟[۱]"

دوسری اقوام کے مذہبی بزرگوں کا احترام

بین الاقوام مناقشات کی تہ میں بیشتر طور پر یہ جذبہ کام کرتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے مذہبی پیشواؤں کا احترام نہیں کرتی اور اپنے بزرگوں کے سوا باقی سب کو جھوٹا اور مفتری اور مفسد فی الارض قرار دیتی ہے اس معاملہ میں اسلام یہ تعلیم پیش کرتا ہے کہ خدا کسی ایک قوم یا ایک ملک کا خدا نہیں ہے بلکہ وہ ساری دنیا کا خدا ہے پس جس طرح اُس نے دُنیا کی جسمانی زندگی کے لیے ایسے سامان پیدا کئے ہیں جو کسی ایک قوم کے ساتھ خاص نہیں ۔ اسی طرح اس کی ازلی رحمت نے دُنیا کی رُوحانی زندگی کے لیے بھی سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ[۲] وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ[۳] یعنی ہم نے ہر قوم میں اپنا رسول بھیجکر لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ صرف خدا کی پرستش کرو اور شیطانی رستوں کے قریب نہ جاؤ ، لیکن افسوس کہ صرف بعض نے ہماری نصیحت کو مانا اور بعض نے گمراہی کا رستہ اختیار کر لیا مگر ہم نے اپنی طرف سے سب کے ساتھ ایک سا سلوک کیا کیونکہ دُنیا کی ایک قوم بھی ایسی نہیں جس کی طرف ہم نے کوئی نصیحت کرنے والا بھیج کر اس کے لیے ہدایت کا سامان نہ پیدا کیا ہو " اس آیت کریمہ کے ماتحت ایک مسلمان کے لیے دُنیا کی ہر قوم کا مذہبی بانی ایک مقدس ہستی بن جاتا ہے اور وہ اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہر قوم کے مذہبی پیشوا کو خدا کے ایک نبی اور رسول کی حیثیت میں قبول کرے ۔ اس کے لیے ہندوؤں کے کرشن ۔ بدھ مذہب والوں کے گوتم بدھ چینیوں کے کنفوشس ۔ پارسیوں کے زرتشت ۔ یہودیوں کے موسیٰ اور عیسائیوں کے مسیح علیہم السلام سب ایک ہی واحد آسمانی خدا کے مقدس پیغامبر ہیں ۔ جن کے ذریعہ سے دُنیا نے اپنے اپنے وقت میں ہدایت کا نور پایا۔

اس مبارک تعلیم کے ماتحت آنحضرت ﷺ کو دوسری اقوام کے مذہبی پیشواؤں کی عزت کا اس قدر خیال تھا کہ ایک دفعہ جب ایک صحابی نے کسی یہودی کے سامنے آنحضرت ﷺ کی حضرت موسیٰ پر ایسے رنگ

---

[۱] بخاری ابواب الجنائز باب مَنْ قَامَ لِجَنَازَةِ يَهُوْدِيٍّ [۲] سورۃ نحل : ۳۷ [۳] سورۃ فاطر : ۲۵

میں فضیلت بیان کی جس سے اس یہودی کے دل کو صدمہ پہنچا تو آپ نے اس صحابی کو ملامت فرمائی اور فرمایا کہ تمہارا یہ کام نہیں کہ خدا کے نبیوں میں اس طرح بعض کو بعض سے افضل بیان کرتے پھرو اور پھر آپ نے حضرت موسیٰ کی ایک جزوی فضیلت بیان کر کے اس یہودی کی دلداری فرمائی۔[1] ایک دوسرے موقعہ پر جبکہ آپ طائف سے مکہ کو واپس آرہے تھے آپ کو ایک عداس نامی شخص ملا جس نے آپ سے ذکر کیا کہ میں نینوا کا رہنے والا ہوں۔ آپ نے بے ساختہ فرمایا "نینوا! یونس بن متی کا شہر! یونس میرے بھائی تھے میں اسی خدا کا رسول ہوں جس نے یونس کو مبعوث کیا تھا۔"[2] یہ ذہنیت کیسی مبارک کیسی دلکش اور اخوت اور امن کے جذبات سے کیسی معمور ہے! مگر افسوس کہ دنیا نے اس کی قدر نہیں کی۔

یہ اس ضابطہ اخلاق کا مختصر نقشہ ہے جو غیر قوموں کے ساتھ تعلقات رکھنے کے متعلق مقدس بانی اسلام نے پیش کیا اور جس پر آپ کے صحابہ اور آپ کے خلفاء نے عملاً کاربند ہو کر یہ بتا دیا کہ یہ تعلیم صرف کاغذوں کی زینت یا منبروں کی سجاوٹ نہیں بلکہ سیاستِ اسلامی کا ایک ضروری اور عملی حصہ ہے جس کے بغیر کوئی حکومت جو اسلام کی طرف منسوب ہوتی ہے صحیح معنوں میں اسلامی حکومت نہیں کہلا سکتی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

اس جگہ سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ دوم ختم ہوا۔

◎

---

[1] بخاری کتاب بدء الخلق باب قول اللہ تعالیٰ وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۔ [2] سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۴۷

سیرتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

حصہ سوم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ   نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

عرض حال

سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ سوم کا پہلا جزو ہدیہ ناظرین کرتے ہوئے میری طبیعت میں اس وجہ سے کافی تامل ہے کہ یہ حصہ اس احتیاط کے ساتھ نہیں لکھا گیا جس احتیاط سے کہ سابقہ حصے لکھے گئے تھے اور اس کا آخری حصہ تو گویا بالکل قلم برداشتہ ہی لکھا گیا اور یہ انداز ایک تاریخی تحقیق کے لئے یقیناً مناسب نہیں۔ اسی طرح اس حصہ کی نظر ثانی بھی ایسے حالات میں ہوئی ہے کہ میں اس کے متعلق کسی طرح تسلی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ قادیان سے باہر آنے کے بعد کتابوں کا بہت سا ذخیرہ تو قادیان میں ہی رہ گیا اور جو حصہ پاکستان میں پہنچا وہ لاہور اور چنیوٹ اور ربوہ اور احمد نگر وغیرہ میں منتشر پڑا ہے اس لئے حوالوں کی آخری چھان بین بلکہ بعض صورتوں میں تو ابتدائی چھان بین بھی تسلی بخش صورت میں نہیں ہو سکی اور مجھے اکثر جگہ حوالہ در حوالہ پر اکتفا کرنی پڑی ہے۔ مثلاً اگر زرقانی نے یہ لکھا ہے کہ ابن سعد نے فلاں بات یوں بیان کی ہے تو میں اسے موجودہ تصنیف میں قبول کر لیتا رہا ہوں حالانکہ اس سے پہلے اصل ماخذ کی طرف رجوع کر کے ذاتی پڑتال کے بعد اندراج کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ آخری حصہ لاہور میں آکر بہت جلدی میں لکھنا پڑا ہے اس لئے دلجمعی کی نظر ثانی کے نتیجہ میں جو اصلاح اور تصحیح ممکن ہو سکتی ہے وہ اسے میسر نہیں آئی۔ مگر بہر حال جو کچھ بھی موجودہ حالات کی مجبوریوں کے ماتحت لکھا جا سکا ہے وہ دوستوں کے اس مشورہ کے نتیجہ میں کہ موجودہ مواد بہر حال شائع ہو جانا چاہئے ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اگر خدا نے توفیق دی تو انشاء اللہ طبع ثانی کے وقت ضروری اصلاح کی جاسکے گی۔

جیسا کہ میں الفضل میں اعلان کر چکا ہوں یہ حصہ مکمل نہیں ہے بلکہ صرف غزوہ بنو قریظہ کے بعد کے حالات سے لے کر آنحضرت ﷺ کے تبلیغی خطوط کے زمانہ تک محدود ہے اسی لئے میں نے اس کا نام "سیرۃ خاتم النبیین حصہ سوم جزو اول" رکھا ہے۔ جب بقیہ جزو شائع ہو گی تو انشاء اللہ حصہ سوم مکمل ہو جائے گا۔ اس حصہ میں آنحضرت ﷺ وسلم (فداہ نفسی) کے اس خط کا بلاک فوٹو بھی درج کیا جا رہا ہے جو آنحضرت ﷺ نے مصر کے بادشاہ مقوقس کو لکھا تھا۔ اگرچہ ان ساڑھے تیرہ سو سال کے عرصہ میں عربی کے رسم الخط میں کافی تبدیلی آچکی ہے لیکن غور کرنے سے بیشتر الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں اور یہ الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو اسلامی روایتوں سے اس خط کے ثابت ہوتے ہیں۔ پس میں نے نہ صرف تبرک کے خیال سے بلکہ اس خیال سے بھی کہ اس خط کی دریافت احادیث اور تاریخ اسلام کی صحت کا ایک زندہ ثبوت ہے اس خط کا فوٹو کتاب میں درج کر دیا ہے اور میرا دل اس نقشہ کو تصور میں لا کر خاص روحانی سرور حاصل کرتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اپنے منتخب صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے یہ مبارک الفاظ املاء فرما رہے ہوں گے اور صحابہ کے دل اس مقدس انتظار کی کیفیت سے معمور ہوں گے کہ دیکھئے ان روحانی آبشاروں کے چھینٹوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

دوست دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کتاب کے بقیہ حصہ یا حصوں کی تکمیل کی بھی توفیق عطا کرے اور اسے دنیا کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

خاکسار

مرزا بشیر احمد آف قادیان حال رتن باغ۔ لاہور۔ ۲ر اپریل ۱۹۴۹ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

مَدَنی زندگی کے دوسرے دَور کا آغاز

صُلح حُدیبیہ سے پہلے کا زمانہ

جیساکہ اِس کتاب کے حصّہ دوم کے آخر میں بیان کیا جا چکا ہے ۵ھ کی ابتداء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے دوسرے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نئے دَور کی نمایاں خصوصیات تین تھیں:۔

اوّل یہ کہ اب مدینہ کا شہر غیر مُسلم عنصر سے عملاً پاک ہو چکا تھا اور گو منافقین کا گروہ اب تک مدینہ میں موجود تھا اور یہ لوگ اپنی قلبی عداوت اور مخفی چالبازیوں میں اِس وقت غالباً آگے سے بھی زیادہ جوش و خروش میں تھے مگر بہرحال وہ اپنے آپ کو مُسلمان کہتے تھے اور جہاں تک ظاہری نظام کا تعلق ہے وہ اسلامی سوسائٹی کا حصّہ تھے۔

دوم۔ گو قریشِ مکّہ ابھی تک اسلام کے خلاف میدانِ عمل میں تھے مگر غزوۂ احزاب کی ناکامی سے اُنہیں ایسا دھکا لگ چکا تھا کہ اب وہ اسلام کی عداوت کا مرکزی نقطہ نہیں رہے تھے۔

سوم۔ میدانِ کارزار اب مدینہ سے ہٹ کر عرب کے مختلف اطراف میں پھیل گیا تھا۔ اس مؤخّر الذکر تبدیلی کی وجہ سے مسلمانوں کی بیرونی مہمّیں بھی لازماً زیادہ کثرت اور زیادہ تنوّع اختیار کر گئی تھیں۔ اور اُن کا حلقہ آگے سے بہت زیادہ وسیع ہو کر گوناگوں معرکوں کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ ہجرت کا چھٹا سال جس میں ہم اب داخل ہو رہے ہیں مسلمانوں کے لیے غیر معمولی نقل و حرکت کا سال تھا[1] جس میں اُنہیں کم و بیش اٹھارہ

[1] میور ایڈیشن ۱۹۲۳ء صفحہ ۳۴۱

مرتبہ مدینہ سے نکلنا پڑا اور ان مہمات میں سے ایک مہم (یعنی غزوہ حُدیبیہ) تو خاص طور پر نہایت اہم اور نہایت وسیع الاثر تھی۔

دراصل گو عرب کے قبائل غزوۂ احزاب میں جو اواخر ۵ ہجری میں ہوا اپنا انتہائی زور لگا دینے کے بعد اس خیال سے تو عملاً مایوس ہو چکے تھے کہ مدینہ پر حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو اُن کے گھر میں ہی ملیامیٹ کیا جاسکتا ہے مگر ابھی تک عداوتِ اسلام کی آگ اُن کے سینوں میں اُسی طرح شعلہ زن تھی۔ بلکہ غزوۂ احزاب کی ذلّت بھری ناکامی نے اُن کی دلی عداوت کو اَور بھی بھڑکا دیا تھا۔ اس لیے اب اگر ایک طرف عرب کے وحشی اور خونخوار قبائل نے مدینہ پر باقاعدہ حملہ کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئی پوری ہوگئی تھی کہ غزوۂ احزاب کے بعد یہ لوگ مدینہ پر حملہ آور نہیں ہوں گے تو دوسری طرف وہ اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان میں نکل رہے تھے چنانچہ اس زمانہ میں اُنہوں نے تین تدابیر اختیار کیں۔

اوّل اُنہوں نے یہ تجویز کی کہ مدینہ سے باہر جن جن قبائل میں اسلام کا اثر پہنچ رہا تھا یا جن میں اثر پہنچنے کا احتمال تھا وہاں اسلام کی اشاعت کو جبراً روک دیا جاوے تاکہ کوئی نیا شخص مسلمان ہو کر اور مدینہ کی طرف ہجرت کر کے مسلمانوں کی تقویت کا باعث نہ بنے۔

دوسرے یہ کہ مدینہ کے مضافات پر خُفیہ خُفیہ چھاپے مار کر مسلمانوں کے جان و مال کو نقصان پہنچایا جاوے۔

تیسرے یہ کہ کسی مخفی تدبیر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نظامِ اسلام کا مرکزی نقطہ تھے قتل کروا دیا جاوے[1]

ہرچند کہ یہ تینوں تجاویز ایک حد تک پہلے سے کفّار کے مدِّنظر تھیں اور وہ عملاً ان کے لیے کوشاں بھی رہتے تھے مگر اب اُنہوں نے دوسری طرف سے خیال ہٹا کر گویا اپنا سارا زور انہی تجاویز کے کامیاب بنانے میں صَرف کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ مہمات جن کا ذکر اب شروع ہوتا ہے اُن کا باعث زیادہ تر کفارِ عرب کی یہی تدابیر تھیں ہم ان میں سے خاص خاص غزوات و سرایا کا ذکر کسی قدر تفصیلاً اور باقی کا مجملاً ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

سریہ قُرطا

محرم ۶ ہجری مطابق مئی جون ۶۲۷ء

ابھی ۶ ہجری شروع ہی ہوا تھا اور قمری سال کے پہلے مہینہ یعنی محرّم کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اہلِ نجد کی طرف سے خطرہ کی اطلاعات پہنچیں۔ یہ اندیشہ قبیلہ قُرطا کی طرف سے تھا جو قبیلہ بنو بکر کی ایک شاخ تھا اور نجد کے علاقہ میں بمقام ضَریّہ آباد تھا

---

[1] تاریخ میں ان تجاویز کا اس رنگ میں صراحت سے ذکر نہیں آتا لیکن بعد کے واقعات سے انکے متعلق یقینی استدلال ہوتا ہے۔

جو مدینہ سے سات یوم کی مسافت پر واقع تھا۔[1] یہ خبر پاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً تیس۳۰ سواروں کا ایک ہلکا سا دستہ اپنے ایک صحابی محمد بن مسلمہ انصاری کی کمان میں نجد کی طرف روانہ فرما دیا مگر اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں میں کچھ ایسا رُعب پیدا کر دیا کہ وہ معمولی سے مقابلہ کے بعد ہی بھاگ نکلے اور گو اُس زمانہ کے طریقِ جنگ کے مطابق مسلمانوں کے لیے یہ موقعہ تھا کہ وہ دشمن کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیتے کیونکہ دشمن اُنہیں چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا مگر محمد بن مسلمہ نے عورتوں اور بچوں سے کوئی تعرّض نہیں کیا اور عام سامانِ غنیمت لے کر جو اونٹوں اور بکریوں پر مشتمل تھا۔ مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔[2]

ثمامہ بن اُثال رئیس یمامہ کا اسلام لانا محرم ۶ھ

اِس مہم کی واپسی پر ثمامہ بن اُثال کے قید کئے جانے کا واقعہ پیش آیا۔[3] یہ شخص یمامہ کا رہنے والا تھا اور قبیلہ بنو حنیفہ کا ایک بہت با اثر رئیس تھا اور اسلام کی عداوت میں اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ہمیشہ بے گناہ مسلمانوں کے قتل کے درپے رہتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایلچی اُس کے علاقہ میں گیا تو اُس نے تمام قوانینِ جنگ کو بالائے طاق رکھ کر اُس کے قتل کی سازش کی۔[4] بلکہ ایک دفعہ اُس نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا بھی ارادہ کیا تھا۔[5] جب محمد بن مسلمہ کی پارٹی ثمامہ کو قید کر کے لائی تو اُنہیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ کون شخص ہے بلکہ اُنہوں نے اُسے محض شُبہ کی بنا پر قید کر لیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ثمامہ نے بھی کمال ہوشیاری کے ساتھ اُن پر اپنی حقیقت ظاہر نہیں ہونے دی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مَیں اسلام کے خلاف خطرناک جرائم کا مرتکب ہو چکا ہوں اور اگر اسلام کے اِن غیرت مند سپاہیوں کو یہ پتہ چل گیا کہ مَیں کون ہوں تو وہ شاید مجھ پر سختی کریں یا قتل ہی کر دیں مگر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ بہتر سلوک کی توقع رکھتا تھا۔ چنانچہ مدینہ کی واپسی تک محمد بن مسلمہ کی پارٹی پر ثمامہ کی شخصیت مخفی رہی۔

مدینہ پہنچ کر جب ثمامہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؐ نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور محمد بن مسلمہ اور اُن کے ساتھیوں سے فرمایا۔ جانتے ہو یہ کون شخص ہے؟ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا جس پر آپؐ نے اُن پر حقیقتِ حال ظاہر کی۔ اس کے بعد آپؐ نے حسبِ عادت ثمامہ کے ساتھ نیک سلوک کئے جانے کا حکم دیا اور پھر اندرونِ خانہ تشریف لے جا کر گھر میں ارشاد فرمایا کہ جو کچھ کھانے کے لیے تیار ہو ثمامہ کے لیے باہر بھجوا دو۔[6] اس کے ساتھ ہی آپؐ نے صحابہ سے یہ ارشاد فرمایا کہ ثمامہ کو کسی دوسرے مکان میں رکھنے کی بجائے مسجد نبوی کے صحن میں ہی کسی ستون کے ساتھ باندھ کر قید رکھا جائے جس سے

---

[1] اِس زمانہ کے طریقِ سفر کے لحاظ سے یہ فاصلہ قریباً ڈیڑھ سو میل سمجھنا چاہیئے۔ [2] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۵۶ و زرقانی جلد ۲ حالات سریہ قُرطا۔ [3] زرقانی حالات سریہ قُرطا۔ [4] ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۴۰۱

[5] اصابہ جلد ۱ صفحہ ۲۱۴۔ [6] ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۱۹۱ ۰

آپ کی غرض یہ تھی کہ تا آپ کی مجالس اور مسلمانوں کی نمازیں ثمامہ کی آنکھوں کے سامنے منعقد ہوں اور اُس کا دل اِن رُوحانی نظاروں سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہو جائے[1]

ان ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز صبح کے وقت ثمامہ کے قریب تشریف لے جاتے اور حال پُوچھ کر دریافت فرماتے کہ "ثمامہ! بتاؤ اب کیا ارادہ ہے؟" ثمامہ جواب دیتا "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ مجھے قتل کر دیں تو آپ کو اس کا حق ہے کیونکہ میرے خلاف خون کا الزام ہے لیکن اگر آپ احسان کریں تو آپ مجھے شکرگزار پائیں گے۔ اور اگر آپ فدیہ لینا چاہیں تو میں فدیہ دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔" تین دن تک یہی سوال و جواب ہوتا رہا۔ آخر تیسرے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ "ثمامہ کو کھول کر آزاد کر دو۔" صحابہؓ نے فوراً آزاد کر دیا اور ثمامہ جلدی جلدی مسجد سے نکل کر باہر چلا گیا۔ غالباً صحابہ یہ سمجھے ہوں گے کہ اب وہ اپنے وطن کی طرف واپس لَوٹ جائے گا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ چکے تھے کہ ثمامہ کا دل مفتوح ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ ایک قریب کے باغ میں گیا اور وہاں سے نہا دھو کر واپس آیا اور آتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ ایک وقت تھا کہ مجھے تمام دُنیا میں آپ کی ذات سے اور آپ کے دین سے اور آپ کے شہر سے سب سے زیادہ دشمنی تھی، لیکن اب مجھے آپ کی ذات اور آپ کا دین اور آپ کا شہر سب سے زیادہ محبوب ہیں۔"[2]

اس دن شام کو جب حسبِ دستور ثمامہ کے لیے کھانا آیا تو اُس نے تھوڑا سا کھانا کھا کر چھوڑ دیا جس پر صحابہ نے تعجب کیا کہ آج صبح تک تو ثمامہ بہت زیادہ کھاتا رہا ہے اور گویا پیٹو تھا لیکن اب اُس نے بہت تھوڑا کھانا کھایا ہے۔ یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے فرمایا۔ "صبح تک ثمامہ کافروں کی طرح کھانا کھاتا تھا اور اب اُس نے ایک مسلمان کی طرح کھایا ہے۔" اور آپ نے اس کی تشریح یوں فرمائی کہ "کافر سات آنتوں میں کھانا کھاتا ہے مگر مسلمان صرف ایک آنت میں کھاتا ہے۔"[3] اس سے آپ کی مُراد یہ تھی کہ جہاں ایک کافر کو دُنیوی لذات میں انہماک ہوتا ہے اور گویا وہ اسی میں غرق رہتا ہے وہاں ایک سچا مسلمان اپنی جسمانی ضروریات کو صرف اُس حد تک محدود رکھتا ہے جو زندگی کے قیام کے لیے ضروری ہے کیونکہ اُسے حقیقی لذت صرف دین میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس جگہ سات کے عدد سے حسابی عدد مُراد نہیں ہے بلکہ عربی محاورہ کی رُو سے سات کا عدد کثرت اور تکمیل کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے[4] گویا مراد یہ ہے کہ ایک کافر دُنیوی لذات میں غرق رہتا ہے اور اس کی ساری توجہ

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۴۵۔ [2] بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ و مسلم کتاب الجہاد باب ربط الاسیر۔

[3] ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۹۱۔ [4] تاج العروس

دُنیا میں صَرف ہوتی ہے مگر ایک مومن اپنے آپ کو دنیوی لذات سے روک کر رکھتا ہے اور ضرورتِ حقّہ کی حد سے آگے نہیں گذرتا کیونکہ اُس کی حقیقی لذات کا میدان اَور ہے۔ یہ تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فطری میلان اور آپؐ کے ذاتی خُلق کا ایک نہایت سچا آئینہ ہے۔

مسلمان ہونے کے بعد ثمامہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! جب آپؐ کے آدمیوں نے مجھے قید کیا تھا تو اس وقت میں خانہ کعبہ کے عُمرہ[1] کے لیے جا رہا تھا اب مجھے کیا ارشاد ہے؟" آپؐ نے اسکی اجازت مرحمت فرمائی اور دُعا کی اور ثمامہ مکہ کی طرف روانہ ہو گیا[2] وہاں پہنچ کر ثمامہ نے جوشِ ایمان میں قریش کے اندر برملا تبلیغ شروع کر دی۔ قریش نے یہ نظارہ دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا اور انہوں نے ثمامہ کو پکڑ کر ارادہ کیا کہ اُسے قتل کر دیں۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ وہ یمامہ کے علاقہ کا رئیس ہے اور یمامہ کے ساتھ مکّہ کے گہرے تجارتی تعلّقات ہیں وہ اِس ارادہ سے باز آگئے اور ثمامہ کو بُرا بھلا کہہ کر چھوڑ دیا[3] مگر ثمامہ کی طبیعت میں سخت جوش تھا اور قریش کے وہ مظالم جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ پر کرتے رہے تھے وہ سب ثمامہ کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اُس نے مکّہ سے رخصت ہوتے ہوتے قریش سے کہا "خدا کی قسم آئندہ یمامہ کے علاقہ سے تمہیں غلہ کا ایک دانہ نہیں آئے گا۔ جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسکی اجازت نہ دیں گے"[4]

اپنے وطن میں پہنچ کر ثمامہ نے واقعی مکّہ کی طرف یمامہ کے قافلوں کی آمد و رفت روک دی اور چونکہ مکہ کی خوراک کا بڑا حصّہ یمامہ کی طرف سے آتا تھا اس لیے اِس تجارت کے بند ہو جانے سے قریشِ مکہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے اور ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ انہوں نے گھبرا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خط لکھا کہ آپ ہمیشہ صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں اور ہم آپ کے بھائی بند ہیں۔ ہمیں اِس مصیبت سے نجات دلائیں[5]۔ اس وقت قریشِ مکہ اِس قدر گھبرائے ہوتے تھے کہ انہوں نے صرف اس خط پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے رئیس ابوسفیان بن حرب کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھجوایا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر زبانی بھی بہت آہ و پُکار کی اور اپنی مصیبت کا اظہار کر کے رحم کا طالب ہوا۔ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ بن اُثال کو ہدایت بھجوا دی کہ قریش کے ان قافلوں کی جن میں اہلِ مکہ کی خوراک کا سامان ہو روک تھام نہ کی جاوے۔ چنانچہ اس تجارت کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا اور مکہ والوں کو اس مصیبت سے نجات ملی[6]

---

[1] عُمرہ حج کی ایک قسم ہے جس میں حج کے بعض مراسم اور شرائط کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک نفلی عبادت ہے جسکی ادائیگی فرائض میں داخل نہیں۔ آجکل انگریزی محاورہ میں اسے چھوٹا حج کہتے ہیں۔ [2] بخاری و مسلم۔ [3] ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۹۲
[4] بخاری و مسلم۔ [5] ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۹۲۔ [6] نسائی و حاکم و بیہقی بحوالہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۴۶ حالات سریہ قُرطا ❖

یہ واقعہ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شفقت اور رحم اور عفو کا ایک بیّن ثبوت ہے وہاں اس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ شروع شروع میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے قافلوں کی روک تھام کا سلسلہ شروع کیا تھا تو اُس کی اصل غرض و غایت یہ نہیں تھی کہ قریش کو قحط میں مبتلا کر کے تباہ کیا جاتے بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ مدینہ کے قُرب و جوار کو قریش کے خطرہ سے محفوظ کر لیا جائے۔ اِس واقعہ سے یہ بھی استدلال ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیم کی رُو سے حربی دشمن کے متعلق بھی یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ عام حالات میں اس کے سلسلہ رسل و رسائل کو اس حد تک بند کر دیا جاتے کہ وہ نانِ جویں تک سے محروم ہو جاتے۔ ہاں سامانِ حرب کی آمد و رفت یا ضروری سامانِ خور و نوش کے علاوہ دوسری اشیاء کی برآمد و درآمد کا سلسلہ جنگی ضروریات کے ماتحت روکا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ صورت ہو کہ دشمن مسلمانوں کی خوراک کے سلسلہ کو روکے تو پھر قرآن کی اُصولی تعلیم جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا[1] کے ماتحت اُس کے اِس سلسلہ کو بھی روکنا جائز ہوگا۔

جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا ہے ثمامہ بن اُثال اپنے علاقہ کا ایک ذی اثر رئیس تھا۔ اُس کی پُرجوش تبلیغ کے ذریعہ یمامہ کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے شروع میں مسیلمہ کذاب جھوٹے مدعی نبوت کے پیچھے لگ کر یمامہ کے بہت سے بادیہ نشین اسلام سے مُرتد ہو گئے تو ثمامہ نہ صرف خود نہایت پختگی کے ساتھ اسلام پر قائم رہا بلکہ اُس نے اپنی والہانہ جد و جہد سے بہت سے لوگوں کو مسیلمہ کے شر سے محفوظ کر کے اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع رکھا اور مسیلمہ کے فتنہ کے مٹانے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں[2]

غزوہ عُکاشہ بن محصن ربیع الاوّل ۶ھ

اسی سال ماہ ربیع الاوّل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک مہاجر صحابی عُکاشہ[3] بن محصن کو چالیس مُسلمانوں پر افسر بنا کر قبیلہ بنی اسد کے مقابلہ کے لیے روانہ فرمایا۔ یہ قبیلہ اس وقت ایک چشمہ کے قریب ڈیرہ ڈالے پڑا تھا جس کا نام غمر تھا جو مدینہ سے مکّہ کی سمت میں چند دن کے فاصلہ پر واقع تھا۔ عُکاشہ کی پارٹی جلدی جلدی سفر کر کے غمر کے قریب پہنچی تا کہ انہیں شرارت سے روکا جا سکے تو معلوم ہوا کہ قبیلہ کے لوگ مسلمانوں کی خبر پا کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔ اِس پر عُکاشہ اور اُس کے ساتھی مدینہ کی طرف واپس لوٹ آتے اور کوئی لڑائی نہیں ہوئی[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں سے ستّر ہزار آدمی بلاحساب جنّت میں جائیں گے۔

عُکاشہ فضلا صحابہ میں سے تھے اور اہلِ مکّہ کے حلیف تھے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جنگِ مُرتدین میں شہید ہوئے[5] یہ وہی بزرگ ہیں جنکے

---

[1] سورۃ الشوریٰ: ۴۱۔ [2] طبقات ابن سعد و اسد الغابہ حالات ثمامہ بن اُثال و زرقانی حالات سریہ قُرطاء
[3] یہ نام عُکاشہ یعنی کاف کی تشدید سے بھی آتا ہے۔ [4] ابنِ سعد۔ [5] اسد الغابہ

متعلق حدیث میں ذکر آتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں ذکر فرمایا کہ میری اُمّت میں سے ستر ہزار لوگ بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے یعنی وہ ایسے رُوحانی مرتبہ پر فائز ہوں گے اور اُن کے لیے خُدائی فضل وکرم اسقدر جوش میں ہوگا کہ اُن کے حساب کتاب کی ضرورت نہیں سمجھی جائے گی۔ اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ان لوگوں کے چہرے قیامت کے دن اِس طرح چمکتے ہوں گے جس طرح کہ چودھویں رات کے آسمان پر چاند چمکتا ہے۔ اس پر عُکاشہ نے عرض کیا" یارسول اللہ! دُعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مجھے بھی ان لوگوں میں سے کردے۔" آپ نے اُسی وقت دعا فرمائی کہ اے خدا تُو اپنے فضل سے عُکاشہ کو بھی ان لوگوں میں سے کردے۔ اس کے بعد ایک انصاری شخص نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! میرے لیے بھی یہ دُعا فرمائیں اس پر آپؐ نے فرمایا:۔

سَبَقَكَ بِهَا عُكَاشَةُ

یعنی" اب تو عکاشہ تم پر اِس معاملہ میں بازی لے جا چکا ہے"۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا یہ ایک بظاہر چھوٹا سا واقعہ اپنے اندر بہت سے معارف کا خزانہ رکھتا ہے کیونکہ اوّل تو اس سے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ اُمّتِ محمدیہ پر اللہ تعالیٰ کا اِس درجہ فضل وکرم ہے اور آنحضرتؐ کا رُوحانی فیض اِس کمال کو پہنچا ہوا ہے کہ آپؐ کی اُمّت میں سے ستر ہزار آدمی[2] ایسا ہوگا جو اپنے نمایاں رُوحانی مقام اور خُدا کے خاص فضل وکرم کی وجہ سے گویا قیامت کے دن حساب وکتاب کی پریشانی سے بالا سمجھا جائے گا۔ دوسرے اِس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایسا قرب حاصل ہے کہ آپؐ کی رُوحانی توجہ پر خدا تعالیٰ نے فوراً بذریعہ کشف یا القاء آپؐ کو یہ علم دیدیا کہ عُکاشہ بھی اس ستر ہزار کے پاک گروہ میں شامل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عکاشہ پہلے اس گروہ میں شامل نہ ہو مگر آپؐ کی دُعا کے نتیجہ میں خدا نے اُسے یہ شرف عطا کردیا ہو۔ تیسرے اِس واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا اِس درجہ ادب ملحوظ تھا اور آپ اپنی اُمّت میں جہد وعمل کو اِس درجہ ترقی دینا چاہتے تھے کہ جب عکاشہ کے بعد ایک دوسرے شخص نے آپؐ سے اسی قسم کی دُعا کی درخواست کی تو آپؐ نے اس شخص رُوحانی مقام کے پیشِ نظر جو اس پاک گروہ کو حاصل ہے مزید انفرادی دُعا سے انکار کردیا تاکہ مسلمانوں کو تقویٰ اور ایمان اور عملِ صالح میں ترقی کرنے کی طرف توجہ رہے۔ چوتھے اس سے آپؐ کے اعلیٰ اخلاق پر بھی غیر معمولی روشنی پڑتی ہے کیونکہ آپؐ نے انکار ایسے رنگ میں نہیں کیا جس سے سوال کرنے والے

---

[1] بخاری کتاب الرقاق باب يَدْخُلُ الْجَنَّةَ سَبْعُوْنَ اَلْفًا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ [2] یہ بھی ممکن ہے کہ ستر ہزار سے معیّن تعداد مُراد نہ ہو، بلکہ غیر معمولی طور پر بھاری جماعت مُراد ہو کیونکہ عربی زبان میں ستّر کا لفظ بھاری کثرت یا کامل تعداد کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

انصاری کی دل شکنی ہو بلکہ ایک نہایت لطیف رنگ میں بات کو ٹال گئے۔

سریہ محمد بن مسلمہ

بطرف ذوالقصہ ربیع الآخر سنہ ۶ ھ

ربیع الآخر کے مہینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن مسلمہ انصاری کو ذوالقصہ کی طرف روانہ فرمایا جو مدینہ سے چوبیس[۲۴] میل کے فاصلہ پر تھا اور جہاں اُن ایام میں بنو ثعلبہ آباد تھے۔ محمد بن مسلمہ اور اُن کے دس ساتھی رات کے وقت وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس قبیلہ کے ایک سَو نوجوان جنگ کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ صحابہؓ کی جماعت سے یہ پارٹی تعداد میں دس گنے زیادہ تھی مگر تعداد کا فرق اسلامی ضابطہ حرب میں چنداں قابلِ لحاظ نہیں تھا۔ محمد بن مسلمہ نے فوراً اس لشکر کے سامنے صف آرائی کر لی اور فریقین کے درمیان رات کی تاریکی میں خوب تیراندازی ہوئی۔ اسکے بعد کفار نے صحابہ کی اِس مُٹھی بھر جماعت پر دھاوا بول دیا اور چونکہ اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی ایک آن کی آن میں یہ دس فدایانِ اسلام خاک پر تھے۔ محمد بن مسلمہ کے ساتھی تو سب کے سب شہید ہو گئے مگر خود محمد بن مسلمہ بچ گئے۔ کیونکہ کفار نے اُنہیں دوسروں کی طرح مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا اور اُن کے کپڑے وغیرہ اُتار کر لے گئے۔ غالباً محمد بن مسلمہ بھی وہاں پڑے پڑے فوت ہو جاتے مگر حُسنِ اتفاق سے ایک مسلمان کا وہاں سے گذر ہو گیا اور اُس نے محمد بن مسلمہ کو پہچان کر انہیں اُٹھا کر مدینہ پہنچا دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اِن حالات کا علم ہوا تو آپؐ نے ابوعبیدہؓ بن الجراح کو جو قریش میں سے تھے اور کبار صحابہ میں شمار ہوتے تھے محمد بن مسلمہ کے انتقام کے لیے ذوالقصہ کی طرف روانہ فرمایا اور چونکہ اِس عرصہ میں یہ بھی اطلاع موصول ہو چکی تھی کہ قبیلہ بنو ثعلبہ کے لوگ مدینہ کے مضافات پر حملہ کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے آپؐ نے ابوعبیدہؓ کی کمان میں چالیس مستعد صحابہ کی جماعت بھجوائی اور حکم دیا کہ راتوں رات سفر کر کے صبح کے وقت وہاں پہنچ جائیں۔ ابوعبیدہؓ نے تعمیل ارشاد میں یلغار کر کے عین صبح کی نماز کے وقت اُنہیں جا دبایا اور وہ اِس اچانک حملہ سے گھبرا کر تھوڑے سے مقابلہ کے بعد بھاگ نکلے اور قریب کی پہاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ ابوعبیدہؓ نے مالِ غنیمت پر قبضہ کیا اور مدینہ کی طرف واپس لَوٹ آئے[۱]۔

اِس مہم میں جن دو صحابہ کا ذکر ہے یعنی محمد بن مسلمہ اور ابوعبیدہؓ بن الجرّاح وہ دونوں کبار صحابہ میں سے تھے۔ محمد بن مسلمہ اپنے ذاتی اوصاف اور قابلیت کے علاوہ قتل کعب بن اشرف یہودی کے ہیرو تھے کیونکہ یہ مُفسد انہی کے ہاتھ سے اپنے کیفر کردار کو پہنچا تھا۔ محمد بن مسلمہ انصار کے قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت عمرؓ کی خلافت میں اُن کے خاص معتمد سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ عموماً انہی کو اپنے عُمّال کی شکایتوں کی تحقیق کے لیے بھجوایا کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد جب مسلمانوں میں اندرونی فتنوں کا دروازہ کُھلا تو محمد بن مسلمہ نے اپنی تلوار کو ایک پتھر پر توڑ کر اپنے ہاتھ میں صرف ایک چھڑی لے لی اور

---

[۱] ابن سعد جلد ۲ حالات سریہ ذوالقصہ

جب کسی نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مَیں نے یہی سُنا ہوا ہے کہ جب مسلمانوں کے اندر باہمی قتل وغارت کا دروازہ کھلے تو تم تلوار کو توڑ کر گھر میں اِس طرح دبک کر بیٹھ جانا جس طرح کسی کمرہ میں اُس کا فرش پڑا ہوا ہوتا ہے[1] یہ حکم غالباً محمد بن مسلمہ کے لیے یا اس فتنہ کے لیے خاص تھا ورنہ بعض اوقات اندرونی فتنوں کا مقابلہ بھی ایک اعلیٰ دینی خدمت کا رنگ رکھتا ہے۔

دوسرے صحابی ابوعبیدہؓ بن الجراح تھے۔ یہ چوٹی کے صحابہ میں سے تھے اور قریشی تھے۔ اُن کی رفعتِ شان اِس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں امین الملت کا خطاب عطا فرمایا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جن دو صحابہ کو خلافت کا اہل سمجھا تھا اُن میں سے ایک یہ بھی تھے۔ ابوعبیدہؓ حضرت عمرؓ کے عہد میں مرضِ طاعون سے وفات پا کر شہید ہوئے[2]

سریہ زید بن حارثہ بطرف بنی سُلَیم۔ ربیع الآخر ۶ ھ

اِسی ماہ ربیع الآخر ۶ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام اور سابق متبنّٰی زید بن حارثہ کی امارت میں چند مسلمانوں کو قبیلہ بنی سلیم کی طرف روانہ فرمایا۔ یہ قبیلہ اُس وقت نجد کے علاقہ میں بمقام جموم آباد تھا اور ایک عرصہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برسرِ پیکار چلا آتا تھا۔ چنانچہ غزوۂ خندق میں بھی اِس قبیلہ نے مسلمانوں کے خلاف نمایاں حصہ لیا تھا[3] جب زید بن حارثہ اور اُن کے ساتھی جموم میں پہنچے جو مدینہ سے قریباً پچاس میل کے فاصلہ پر تھا تو اُسے خالی پایا۔ مگر انہیں قبیلہ مزینہ کی ایک عورت حلیمہ نامی سے جو مخالفینِ اسلام میں سے تھی اس جگہ کا پتہ لگ گیا جہاں اس وقت قبیلہ بنو سُلَیم کا ایک حصہ اپنے مویشی چرا رہا تھا۔ چنانچہ اس اطلاع سے فائدہ اُٹھا کر زید بن حارثہ نے اُس جگہ پر چھاپا مارا۔ اس اچانک حملہ سے گھبرا کر اکثر لوگ تو اِدھر اُدھر بھاگ کر منتشر ہو گئے مگر چند قیدی اور مویشی مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے جنہیں وہ لے کر مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔ اتفاق سے اِن قیدیوں میں حلیمہ کا خاوند بھی تھا اور ہرچند کہ وہ حربی مخالف تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلیمہ کی اس امداد کی وجہ سے نہ صرف حلیمہ کو بلا فدیہ آزاد کر دیا بلکہ اُس کے خاوند کو بھی احسان کے طور پر چھوڑ دیا اور حلیمہ اور اس کا خاوند خوشی خوشی اپنے وطن کو واپس چلے گئے[4]

---

[1] اسد الغابہ حالات محمد بن مسلمہ۔ [2] اسد الغابہ زیر نام ابوعبیدہ۔ [3] زرقانی۔ [4] ابن سعد جلد ۲

سریہ زید بن حارثہ بطرف عِیص۔ جمادی الاولیٰ ۶ھ

زید بن حارثہ کو اس مہم سے واپس آتے زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمادی الاولیٰ کے مہینہ میں اُنہیں ایک سو ستّر صحابہ کی کمان میں پھر مدینہ سے روانہ فرمایا۔ اِس مہم کی وجہ اہلِ سِیَر نے یہ لکھی ہے کہ شام کی طرف سے قریشِ مکّہ کا ایک قافلہ آرہا تھا اس کی روک تھام کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دستہ کو روانہ فرمایا تھا۔ قافلوں کی روک تھام کے متعلق ہم غزوات کے ابتداء میں[۱] ایک اُصولی بحث درج کر چکے ہیں۔ اِس جگہ اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ صرف اِس قدر اشارہ کافی ہے کہ قریش کے قافلے ہمیشہ مسلّح ہوتے تھے اور مکّہ اور شام کے درمیان آتے جاتے ہوئے وہ مدینہ کے بالکل قریب سے گذرتے تھے جس کی وجہ سے اُن کی طرف سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ابتدائی بحث میں ذکر کیا جا چکا ہے یہ قافلے جہاں جہاں سے گذرتے تھے۔ قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف اُکساتے جاتے تھے جس کی وجہ سے سارے مُلک میں مسلمانوں کے خلاف عداوت کی ایک خطرناک آگ مشتعل ہو چکی تھی اس لیے اُن کی روک تھام ضروری تھی۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلہ کی خبر پاکر زید بن حارثہ کو اس طرف روانہ فرمایا اور وہ اِس ہوشیاری سے گھات لگاتے ہوئے بڑھے کہ بمقام عِیص قافلہ کو جا دبایا۔ عِیص ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے چار دن کی مسافت پر سمندر کی جانب واقع ہے چونکہ یہ اچانک حملہ تھا اہلِ قافلہ مسلمانوں کے حملہ کی تاب نہ لا سکے اور اپنے ساز و سامان کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ زید نے بعض قیدی پکڑ کر اور سامانِ قافلہ اپنے قبضہ میں لے کر مدینہ کی راہ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے[۲]

آنحضرت ﷺ کے داماد ابوالعاص کا مسلمان ہونا

ان قیدیوں میں جو سریہ بطرف عِیص میں پکڑے گئے ابوالعاص بن الربیع بھی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے اور حضرت خدیجہؓ مرحومہ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔ اس سے قبل وہ جنگِ بدر میں بھی قید ہو کر آتے تھے مگر اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اِس شرط پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ مکّہ پہنچ کر آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو مدینہ بھجوا دیں۔ ابوالعاص نے اِس وعدہ کو تو پورا کر دیا تھا مگر وہ خود ابھی تک شرک پر قائم تھے۔ جب زید بن حارثہ اُنہیں قید کر کے مدینہ میں لائے تو رات کا وقت تھا مگر کسی طرح ابوالعاص نے حضرت زینبؓ کو اطلاع بھجوا دی کہ میں اِس طرح قید ہو کر یہاں پہنچ گیا ہوں تم اگر میرے لیے کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔ چنانچہ عین اُس وقت کہ

---

[۱] دیکھئے سیرۃ خاتم النبیین حصّہ دوم۔ [۲] ابن سعد جلد ۲

آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہ صبح کی نماز میں مصروف تھے زینبؓ نے گھر کے اندر سے بلند آواز سے پکار کر کہا کہ "اے مسلمانو! مَیں نے ابوالعاص کو پناہ دی ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوتے تو صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "جو کچھ زینب نے کہا ہے وہ آپ لوگوں نے سُن لیا ہوگا۔ واللہ مجھے اِس کا علم نہیں تھا۔ مگر مؤمنوں کی جماعت ایک جان کا حکم رکھتی ہے اگر ان میں سے کوئی کسی کافر کو پناہ دے تو اس کا احترام لازم ہے[1]" پھر آپؐ نے زینبؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "جسے تم نے پناہ دی ہے اُسے ہم بھی پناہ دیتے ہیں۔" اور جو مال اِس مہم میں ابوالعاص سے حاصل ہوا تھا وہ اُسے لوٹا دیا۔ پھر آپؐ گھر میں تشریف لاتے اور اپنی صاحبزادی زینبؓ سے فرمایا۔ "ابوالعاص کی اچھی طرح خاطر تواضع کرو۔ مگر اُس کے ساتھ خلوت میں مت ملو کیونکہ موجودہ حالت میں تمہارا اُس کے ساتھ ملنا جائز نہیں ہے۔" چند روز مدینہ میں قیام کر کے ابوالعاص مکہ کی طرف واپس چلے گئے مگر اب اُن کا مکہ میں جانا وہاں ٹھہرنے کی غرض سے نہیں تھا کیونکہ اُنہوں نے بہت جلد اپنے لین دین سے فراغت حاصل کی اور کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر مسلمان ہوگئے[2] جس پر آپؐ نے حضرت زینبؓ کو اُن کی طرف بغیر کسی جدید نکاح کے لوٹا دیا یعنی زینبؓ کو اجازت دیدی کہ اب وہ اُن کے ساتھ ازدواجی تعلقات رکھ سکتی ہیں[3]

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اُس وقت حضرت زینبؓ اور ابوالعاص کا دوبارہ نکاح پڑھا گیا تھا مگر پہلی روایت زیادہ مضبوط اور صحیح ہے[4]

ایک مسلمان اور کافر کے ازدواجی تعلق کے متعلق اسلامی تعلیم

اس جگہ ضمناً یہ ذکر خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ ایک مسلمان اور کافر کے باہمی نکاح کے بارے میں قرآنی احکام تین مختلف موقعوں پر درجہ بدرجہ نازل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ہجرت کے کچھ عرصہ بعد سورۃ بقرہ کی آیات نازل ہوئیں جن میں یہ حکم دیا گیا کہ کوئی مسلمان کسی مُشرک عورت کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتا اور نہ کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی مُشرک مَرد کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے۔

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ...... وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا[5]

---

[1] مُراد یہ ہے کہ عام حالات میں ایسا ہونا چاہیئے ورنہ خاص حالات میں جب کہ مثلاً کسی بالا افسر کا کوئی اور حکم موجود ہو یا پناہ دینے والا بدنیتی یا فساد کی غرض سے یہ طریق اختیار کرے وغیر ذلک تو ایسے حالات میں یہ فعل جائز نہیں سمجھا جائیگا۔ واللہ اعلم

[2] طبقات ابن سعد و زرقانی حالات سریہ عیص۔ [3] ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ۔ [4] زرقانی۔ [5] سورۃ البقرۃ: ۲۲۲

یعنی "اے مسلمانو! تم مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کیا کرو یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں...... اور نہ ہی تم مسلمان عورتوں کا نکاح مشرک مَردوں کے ساتھ کیا کرو حتّٰی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔"

لیکن اس حکم میں یہ تصریح نہیں تھی کہ اگر نکاح پہلے سے ہو چکا ہو تو پھر کیا کیا جائے۔ سو اس کے متعلق صُلح حُدیبیہ کے بعد سورۃ ممتحنہ والی آیات نازل ہوئیں جن میں یہ حکم دیا گیا کہ ایک مسلمان عورت کا کسی صورت میں بھی ایک مُشرک مرد کے ساتھ نکاح قائم نہیں رہ سکتا اور نہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی مُشرک عورت کو اپنے نکاح میں رکھے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:-

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ.....
.... فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ..... وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ [1]

یعنی "اے مسلمانو! اگر تمہارے پاس مومن عورتوں میں سے بعض عورتیں ہجرت کر کے پہنچیں ...... تو تم انہیں کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد وہ کافروں کیلئے جائز نہیں رہیں۔ اور نہ کافر مرد مسلمان عورتوں کے لیے جائز ہیں..... اور اگر اے مسلمانو! تمہارے نکاح میں کوئی کافر (مُشرک) عورت ہو تو تم اُس کے عقدِ نکاح کو بھی قائم نہیں رکھ سکتے۔"

اِس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایّام میں سورۃ مائدہ والی آیات نازل ہوئیں۔ جن میں اِس بات کی صراحت کی گئی کہ ایک اہلِ کتاب عورت (یعنی یہودی یا عیسائی وغیرہ) کے ساتھ مُسلمان مرد کا نکاح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے:-

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ...... الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ [2]

یعنی "اے مسلمانو! تمہارے لیے پاک دامن مسلمان عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے اور اسی طرح اُن پاک دامن عورتوں کے ساتھ بھی تمہارا نکاح جائز ہے جو ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں تم سے پہلے کوئی شریعت کی کتاب دی گئی۔"

اِس آخری حُکم کے ذریعہ اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب کے درمیان نمایاں امتیاز قائم کر دیا گیا۔ یعنی جہاں ایک مسلمان مرد کے لئے غیر مسلم اہلِ کتاب عورت کا نکاح جائز قرار دیا گیا وہاں ایک ایسی مشرک عورت کا نکاح جو کسی الہامی کتاب کو نہیں مانتی ہر حال میں ناجائز رکھا گیا۔

---

[1] سورۃ الممتحنہ : ۱۱ - [2] سورۃ المائدۃ : ۶

اب اگر اس جگہ یہ سوال پیدا ہو کہ جب سریہ عیص جس میں ابوالعاص قید ہو کر آئے تھے صلح حدیبیہ سے پہلے ہوا تھا تو پھر یہ کس طرح ممکن ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حُدیبیہ کے بعد نازل ہونیوالے حکم مندرجہ سورۃ ممتحنہ کو سریہ عیص کے موقع پر چسپاں فرمایا ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک سرسری نظر میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ اعتراض دو طریق پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اوّل اس طرح کہ بیشک سورۃ ممتحنہ والا حکم جس میں مُشرک عورتوں کا نکاح ہر حال میں ناجائز قرار دیا گیا ہے بعد میں نازل ہوا مگر بہر حال سورۃ بقرہ والا حکم تو (جس میں کم از کم آئندہ کے لیے مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح روک دیا گیا تھا) پہلے نازل ہو چکا تھا اور اغلباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکم پر قیاس کر کے احتیاط کا رستہ اختیار کرتے ہوئے حضرت زینبؓ کو ہدایت فرما دی ہو گی کہ جب تک ابوالعاص مسلمان نہ ہو جائیں تم اُن کے ساتھ ازدواجی تعلقات نہ رکھنا اور پھر بعد میں اسی کے مطابق حکم بھی نازل ہو گیا۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے سریہ عیص اور ابوالعاص کے قید ہونے کا واقعہ دراصل صُلح حُدیبیہ کے بعد ہوا ہو، لیکن مورخین نے غلطی سے اسے صُلح حدیبیہ سے پہلے رکھدیا ہو۔[1] مگر ہمارے نزدیک مقدم الذکر تشریح زیادہ صحیح اور قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ابوالعاص کے کُفر کی وجہ سے حضرت زینبؓ کا نکاح فسخ سمجھا گیا تھا تو پھر اُن کے مسلمان ہونے پر بلا نکاح جدید اُنہیں کیوں اکٹھا ہونے کی اجازت دیدی گئی ؟ اس کا جواب ایک فریق نے تو اس طرح دیا ہے کہ بلا نکاح والی روایت قابلِ عمل نہیں بلکہ اس کے مقابل پر وہ روایت زیادہ سند کے قابل ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت زینبؓ کا دوبارہ نکاح پڑھا گیا تھا، لیکن اصل جواب یہ ہے کہ بے شک نکاح فسخ ہو چکا تھا، لیکن چونکہ ابھی تک حضرت زینبؓ کی دوسری جگہ شادی نہیں ہوئی تھی اس لیے جب اس عرصہ میں ابوالعاص مسلمان ہو گئے تو نئے نکاح کی ضرورت نہ سمجھی گئی گویا یہ ایک معلق قسم کی صورت تھی یعنی اگر اس عرصہ میں حضرت زینب کا دوسری جگہ نکاح ہو جاتا تو وہ جائز تھا، لیکن چونکہ وہ ابھی تک آزاد تھیں اس لیے سابقہ خاوند کے مسلمان ہونے پر انہیں اس کی طرف بلا نکاح لوٹا دیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ ایک مفقود الخبر انسان کی ہوتی ہے جس پر ایک معیّن عرصہ گذرنے پر اُسکی بیوی دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کے لیے آزاد ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر قبل شادی اُس کا اصل خاوند آجائے تو سابقہ نکاح ہی قائم رہتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس ضمن میں اس حکمت کا بیان کرنا بھی مناسب ہو گا کہ اسلام میں غیر مسلم مَرد کے نکاح میں مسلمان لڑکی کا دینا یا مسلمان مرد کے نکاح میں غیر اہلِ کتاب کی لڑکی لینا کیوں حرام قرار دیا گیا۔ سو جاننا چاہیئے کہ مقدم الذکر صورت یعنی غیر مسلم مرد کے ساتھ نکاح نہ کرنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ ایک مسلمان لڑکی کو غیر مسلم مرد

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۵۷

کی شادی میں دینے کے یہ معنی ہیں کہ لڑکی کے دین کو خود اپنے ہاتھ سے خطرہ میں ڈالا جاوے اور اسلام کو ترقی دینے کی بجائے اس کے تنزّل کا راستہ کھولا جائے جسے اسلام کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اور غیر اہلِ کتاب کافر کی لڑکی لینے سے اس لیے روکا گیا ہے کہ چونکہ ایسی لڑکی اُصول مذہب سے بالکل بے بہرہ ہوگی اس لیے وہ نہ صرف بچوں کی تربیت کے لحاظ سے خطرناک ہوگی بلکہ خاوند کے ساتھ بھی اگر وہ سچا مسلمان ہے اُس کا دل نہیں مل سکے گا اور خانگی زندگی حقیقی خوشی سے محروم رہے گی۔ اس کے مقابل پر اہلِ کتاب کی لڑکی لینے کی اجازت دینے میں یہ مصلحت ہے کہ اوّل تو بین الاقوام تعلقات کی توسیع کا راستہ کُھلا رہے دوسرے ایسی لڑکی اُصولِ مذہب سے واقف ہونے کی وجہ سے ایک حد تک بچوں کی تربیت میں ممد ہوسکتی ہے اور تیسرے یہ کہ اُس کے لیے خاوند کے مشفقانہ اثر کے ماتحت اسلام کی طرف کھنچے آنے کی زیادہ توقع کی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مگر بایں ہمہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن وحدیث دونوں میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اہلِ کتاب کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا بھی اسلام میں ایک استثنائی رنگ رکھتا ہے جس کی صرف خاص حالات کے ماتحت خاص مصالح کے پیشِ نظر اجازت دی گئی ہے اور عام حالات میں بہتر یہی سمجھا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح حتی الوسع مسلمان عورت کے ساتھ ہو۔[1]

ابوالعاص کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی

یہ ذکر ہوچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص بن الربیع حضرت خدیجہؓ مرحومہ کے قریبی رشتہ دار یعنی حقیقی بھانجے تھے اور باوجود مُشرک ہونے کے اُن کا سلوک اپنی بیوی سے بہت اچھا تھا اور مسلمان ہونے کے بعد بھی میاں بیوی کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جہت سے ابوالعاص کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے کہ اُس نے میری لڑکی کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔[2] ابوالعاص حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں ۱۲ھ میں فوت ہوئے مگر اُن کی زوجہ محترمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی فوت ہوگئیں۔ اُن کی لڑکی امامہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز تھی۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں مگر اولاد سے محروم رہیں۔[3]

غزوہ بنو لحیان
جمادی الاولیٰ ۶ھ مطابق ستمبر ۶۲۷ء

اصحابِ رجیع کا المناک واقعہ ۴ھ کے واقعات میں بیان کیا جاچکا ہے۔ اس موقع پر دس بے گناہ مسلمان جو اسلام کی پُرامن تبلیغ کیلئے

---

[1] سورۃ البقرۃ: ۲۲۲ وسورۃ نُور: ۳۳ وبخاری کتاب النکاح۔ [2] بخاری ابواب مناقب۔ [3] طبقات ابنِ سعد حالات ابوالعاص وزرقانی حالات حضرت زینبؓ۔

بھجوائے گئے تھے نہایت بے دردی اور دھوکے کے ساتھ قتل کر دیئے گئے تھے اوراس سارے فتنہ کی تہ میں بنو لحیان کا ہاتھ تھا جو اُس زمانہ میں مکہّ اور مدینہ کے درمیان وادی غُرآن میں آباد تھے۔ طبعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس واقعہ کا سخت صدمہ تھا اور چونکہ بنو لحیان کا رویہ ابھی تک اسی طرح معاندانہ اور مفسدانہ تھا اور اُن کی طرف سے آئندہ کے لیے بھی اندیشہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کسی مزید فتنہ انگیزی کا باعث نہ بنیں اس لیے آپؐ نے انتظامی لحاظ سے مناسب خیال فرمایا کہ اُن کی کسی قدر گوشمالی ہو جاتے تاکم از کم آئندہ کے لیے مسلمان ان کے فتنوں سے محفوظ ہو جائیں اس خیال سے آپ دوسو صحابہ کی جمعیت کو ساتھ لیکر ماہ جمادی الاولی ۶ ہجری میں مدینہ سے نکلے[1] اور اس خیال سے کہ اس سفر کی غرض وغایت مخفی رہے تاکہ بنو لحیان خبر پاکر ہوشیار نہ ہو جائیں۔ آپؐ نے مدینہ سے نکل کر شروع میں شمال کا رُخ کیا اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جنوب کی طرف گھوم گئے[2] مگر باوجود اِس احتیاط کے دشمن کسی طرح خبر پاکر ہوشیار ہو چکا تھا اور پیشتر اس کے کہ آپؐ وادی غُران میں پہنچتے بنو لحیان کے لوگ اردگرد کی پہاڑیوں میں منتشر ہو کر غائب ہو چکے تھے[3]

آپؐ نے منزلِ مقصود پر پہنچ کر وہاں کچھ وقت قیام فرمایا اور روایت آتی ہے کہ جب اس سفر میں آپؐ اُس مقام پر پہنچے جہاں آپؐ کے صحابہؓ شہید کیے گئے تھے تو آپؐ پر سخت رقّت طاری ہوگئی اور آپؐ نے نہایت الحاح کے ساتھ ان شہداء کے لیے دُعا مانگی[4] پھر آپؐ مقام عسفان کی طرف آگے بڑھے جو اس جگہ سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر مکّہ کی جانب واقع تھا اور اپنے اصحاب کی متفرق پارٹیاں اِدھر اُدھر روانہ فرمائیں جن میں سے ایک پارٹی کے امیر حضرت ابوبکرؓ بھی تھے جو مکّہ کی سمت میں بھیجی گئی تھی مگر ان میں سے کسی پارٹی کو بھی لڑائی پیش نہیں آئی اور چند دن کی غیر حاضری کے بعد آپؐ مدینہ میں واپس تشریف لے آئے[5]

سفر سے واپسی کی دُعا

واپسی سفر کے دوران میں آپؐ نے ایک دُعا فرمائی جسے بعد میں مسلمان اپنے اہم سفروں سے واپسی کے موقع پر عموماً پڑھا کرتے تھے۔ وہ دُعا یہ ہے:۔

آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ۔

یعنی "ہم لوگ اپنے خدا کی طرف لَوٹنے والے ہیں۔ اُسی کی طرف جُھکنے والے۔ اُسی کی عبادت کرنیوالے۔ اُسی کے سامنے گرنے والے اور اپنے رب کی تعریف کے گیت گانے والے"۔

---

[1] ابن ہشام وطبری حالات غزوہ بنو لحیان۔ ابن سعد نے اس غزوہ کی تاریخ ربیع الاوّل بیان کی ہے۔ واللہ اعلم

[2] ابن سعد وابن ہشام۔ [3] ابن ہشام۔ [4] ابن سعد [5] ابن ہشام طبری وابن سعد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اپنے بعد کے سفروں میں عموماً یہ دُعا فرمایا کرتے تھے اور بعض اوقات اس کے ساتھ یہ الفاظ زیادہ فرماتے تھے کہ:۔

صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ

یعنی "ہمارے خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور دشمن کے لشکروں کو خود اپنے دم سے پسپا کر دیا"[1]

یہ دُعا جو غزوہ بنو لحیان کے تعلق میں اہلِ سیر نے بیان کی ہے اور محدثین نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اپنے اندر ایک خاص کیفیت کی حامل ہے اور اس کے مطالعہ سے ان جذبات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے جو اس پُر آشوب زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فِدَاہُ نَفْسِی کے قلبِ مطہر میں موجزن تھے اور جنہیں آپؐ اپنے صحابہ کے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس دُعا میں یہ تڑپ مخفی ہے کہ دشمن کی طرف سے جو روک مسلمانوں کی عبادت گذاری اور اسلام کی پُر امن تبلیغ کے رستے میں ڈالی جارہی ہے اللہ تعالیٰ اُسے دُور فرمائے اور جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اس روک کو دُور کیا ہے اس پر شکر گذاری کا گیت گایا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے ایک نہایت دل پسند کام میں منہمک ہو اور پھر یکلخت کوئی دوسرا شخص اُس کے کام میں مخل ہو کر اُس کی توجہ کو منتشر کر دے۔ مگر کچھ وقت کے بعد خدائی فضل کے ماتحت یہ روک دُور ہو جائے اور وہ شخص پھر اپنے محبوب مشغلہ میں مصروف ہونے کا موقع پالے۔ ایسے موقع پر جو جذبات اُس شخص کے دل میں اُٹھیں گے وہی اس دُعا میں مخفی ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم اس سفر کی عارضی رخنہ اندازی سے آزاد ہو کر پھر اس کیفیت کی طرف واپس آرہے ہیں کہ جس میں ہم اپنے خُدا کی یاد میں وقت گذار سکیں گے اور اُس کی حمد کے گیت گانے کا موقع پائیں گے۔ ہاں وہی خدا جو اس سے پہلے بھی متعدد موقعوں پر ہمیں دشمن کے فتنہ سے محفوظ کر کے امن عطا کرتا رہا ہے۔ یہ جذبہ کیسا مبارک اور کیسا دلکش اور کیسا پُر امن ہے! مگر افسوس کہ پھر بھی بعض دشمنانِ اسلام اعتراض سے باز نہیں آتے اور یہی کہتے چلے جاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کی اصل غرض جارحانہ فوج کشی اور دُنیا طلبی تھی۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

غزوہ بنو لحیان کی تاریخ کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ ابن سعد نے اسے ربیع الاول ۶ھ میں بیان کیا ہے مگر ابن اسحاق اور طبری نے تصریح کی ہے کہ وہ جمادی الاولیٰ ۶ھ میں ہوا تھا۔ مَیں نے اس جگہ ابن اسحاق کی پیروی کی ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] بخاری کتاب الجهاد باب مَا يَقُوْلُ اِذَا رَجَعَ مِنَ الْغَزْوِ وَبَابُ التَّكْبِيْرِ اِذَا عَلَا شَرَفًا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق توریہ کا الزام

غزوہ بنو لحیان[1] کے ذکر میں ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ پردہ رکھنے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شروع میں شمال کی طرف تشریف لے گئے تھے اور بعد میں مدینہ سے کچھ فاصلہ پر جا کر جنوب کی طرف گھوم گئے۔ اسی قسم کے واقعات بعض دوسرے غزوات کے متعلق بھی بیان ہوتے ہیں کہ دشمن سے اپنی حرکات و سکنات کو مخفی رکھنے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں سفر کا مقصد ظاہر نہیں فرمایا اور مدینہ سے نکلتے ہوئے اصل جہت کو چھوڑ کر دوسری جہت کی طرف تشریف لے گئے مگر کچھ فاصلہ پر جا کر پھر اصل جہت کی طرف گھوم گئے وغیر ذالک۔ اس قسم کے واقعات کی بنا پر جو عربی محاورہ کے مطابق تَوریة کہلاتے ہیں بعض کوتہ اندیش لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ نعوذ باللہ یہ افعال چالاکی اور دھوکے میں داخل ہیں جو ایک نبی کی شان سے بعید ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں ہمیں زیادہ تفصیل کیساتھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس قسم کے اعتراضات زیادہ سمجھدار طبقہ کی طرف سے نہیں ہوتے بلکہ عموماً کم علم اور کم فہم لوگوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ گذشتہ انبیاء اور صلحاء کے حالات سے واقف نہیں بلکہ موقع اور محل کو سمجھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ اور نیکی صرف اِسی بات کو سمجھتے ہیں کہ انسان اول تو دُنیا کی کسی بات میں حصہ نہ لے اور اگر کبھی بصورتِ مجبوری حصہ لینا پڑے تو اُس کے لیے کوئی مادی تدبیر اختیار نہ کرے اور اگر کبھی کوئی تدبیر اختیار کرنی پڑے تو وہ نہایت سادہ اور بھونڈے طریق پر کی جائے اور ہر صورت میں ہر بات برملا ہو اور کبھی کسی بات میں اخفا اور رازداری کا طریق اختیار نہ کیا جائے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر نیکی اِسی کا نام ہے تو بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض افعال اعتراض کا نشانہ بنتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی نیکی کی یہی تعریف ہے اور کیا اس تعریف کی رُو سے دُنیا کا کوئی نبی اور کوئی مُصلح ایسا ہے جو ایسے اعتراضوں سے بچ سکتا ہے؟

دُور نہ جاؤ حضرت مسیح ناصری کو ہی لے لو جنہیں اِس زمانہ میں یورپ و امریکہ کی ترقی یافتہ اقوام عرشِ اُلوہیت پر بٹھائے ہوئے ہیں اور ہر نیک کام کو اُن کے اقوال و افعال کے پیمانے سے ناپتی ہیں۔ مگر کیا یہ درست نہیں کہ جب اُن کے خلاف یہ الزام لگایا گیا کہ وہ حکومتِ وقت کے خلاف تعلیم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حکومت کو خراج نہ دو اور اس طرح انہیں حکومت کی نظروں میں معتوب کرنا چاہا تو انہوں نے صاف اور سیدھا جواب دینے کی بجائے ایک رائج الوقت سکہ منگایا اور اُس پر قیصرِ روما کی تصویر دیکھ کر کہا کہ یہ تو قیصر کی تصویر ہے۔ تو پھر جو قیصر کی چیز ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کی چیز ہے وہ خدا کو دو۔ اور اس طرح ایک غیر حقیقی سا جواب دیکر بات کو ٹال دیا[2] اسی طرح ہندوؤں کی مذہبی کتب

---

[1] یہ نام لِحیان اور لَحیان دونوں طرح آتا ہے۔

[2] لُوقا باب ۲۰ آیت ۱۹ تا ۲۶ و متی باب ۲۲ آیت ۱۵ تا ۲۲ و مرقس باب ۱۲ آیت ۱۳ تا ۱۷

میں ذکر آتا ہے کہ شری کرشن جی مہاراج (جو ہندوؤں کے سب سے بڑے اوتار گذرے ہیں) اور ان کے بعض مقدس ساتھی ایک راجہ کو قتل کرنے کی غرض سے بھیس بدل کر اس کے قلعہ میں داخل ہوئے اور ایک انتقامی غرض کے حصول کے لیے اپنی اصل شناخت کو چھپایا اور لوگوں کے خیال کو غلط رستے پر ڈال دیا[1] اسی طرح سکھوں کی کتب میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب شاہی فوج نے گورو گوبند جی کا محاصرہ کر لیا جو سکھوں کے ایک نہایت نامور اور ممتاز گورو گذرے ہیں تو انہوں نے اپنے ایک ہمشکل شخص کو اپنا لباس پہنا کر اُسے اپنی جگہ بٹھا دیا اور خود اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ مسلمان حاجیوں کا لباس پہنکر حملہ آوروں کی آنکھوں میں خاک ڈالتے ہوئے نکل گئے[2] اگر یہ مذہبی پیشوا باوجود اپنے اِس قسم کے افعال کے پاک اور مقدس شمار ہوسکتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک بالکل جائز جنگی تدبیر اختیار کرنے کی وجہ سے کس طرح اعتراض ہوسکتا ہے؟

حق یہ ہے کہ اِس زمانہ میں اکثر لوگوں کے دلوں میں نیکی اور صداقت کا ایک نہایت ہی غلط مفہوم قائم ہو گیا ہے حالانکہ حقیقی نیکی یہ نہیں کہ انسان عقل و خرد سے عاری ہو کر بیوقوفی کی حرکات کرے اور خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا بیج بوئے بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان اگر ایک طرف جھوٹ اور غداری سے بچے اور کوئی کام صداقت اور دیانتداری کے خلاف نہ کرے تو دوسری طرف پوری پوری ہوشیاری کے ساتھ اور ہر پہلو سے چوکس رہتے ہوئے اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے دینی اور دُنیوی ترقیات کے راستے کھولے اگر ایک شخص ہوشیار اور چوکس ہے مگر جھوٹ اور غداری سے پرہیز نہیں کرتا اور خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ یقیناً نیک کہلانے کا مستحق نہیں۔ اِسی طرح اگر ایک شخص صداقت اور وفاداری کو تو اختیار کرتا ہے مگر اپنے کاموں میں عقل و خرد اور ہوشیاری اور بیدار مغزی نہیں دکھاتا تو اُسے بھی ہرگز اعلیٰ درجہ کا نیک نہیں سمجھا جاسکتا۔ کیونکہ نیکی کی حقیقی تعریف یہ ہے کہ انسان کا خُدا کے ساتھ تعلق ہو اور اگر خدا کا تعلق جو ساری دانائیوں کا سرچشمہ ہے انسان کے اندر عقل و خرد پیدا نہیں کرسکتا تو اَور کونسی چیز پیدا کریگی اور یقیناً اِس صورت میں یہ خدا کا حقیقی تعلق نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسی لیے اسلام نے نیکی کی تعریف میں کسی خاص فعل کو داخل نہیں کیا بلکہ اصل نیکی دل کے تقویٰ کو قرار دیا ہے اور صرف اُسی فعل کو نیک شمار کیا ہے جو دل کے تقویٰ کے ساتھ خدا کی رضا اور مخلوق کی بہتری کو مدِنظر رکھتے ہوتے حالاتِ پیش آمدہ کے مطابق اختیار کیا جائے۔ مثلاً اگر دوستوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا سوال ہو تو اُس کے مناسب حال اعلیٰ اخلاق دکھائے جائیں۔ دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا سوال ہو تو اُس کے مطابق اچھے اخلاق ظاہر کئے جائیں۔ امن کا ماحول ہو تو اُس کے مطابق بہتر سے بہتر اخلاق کا اظہار کیا جاتے اور جنگ کا موقع ہو تو اُس کے مناسب حال اعلیٰ اخلاق دکھائے جائیں۔ غرض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور مخلوقِ خدا کی بہتری کو مدِنظر رکھتے

---

[1] یوگیشور کرشن مصنفہ پنڈت چموپتی صفحہ ۸۶ و ۸۷ ۔ [2] پنتھ پرکاش مصنفہ گیانی گیان سنگھ صفحہ ۲۰۲

ہوتے جو بھی اعلیٰ اور کامل اخلاق دل کے تقویٰ کے ساتھ اختیار کئے جائیں وہی نیکی ہے اور اسلام نے ہر موقع اور ہر ماحول کے مناسب حال علیحدہ علیحدہ اخلاق کی تعیین فرما دی ہے اور یہی وہ صحیح تعریف ہے جو نیکی کی قرار دی جا سکتی ہے اور اسلام کے لیے یہ جائے فخر ہے کہ اس کے مقدس بانی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی دُنیا میں نیکی کی صحیح تعریف قائم کی ہے اور وہی وہ بزرگ ہستی ہے جس نے ہر میدان میں اعلیٰ ترین اخلاق کا اظہار کیا ہے اور اعتراض کرنے والے محض جہالت اور کوتہ بینی سے اعتراض کرتے ہیں۔

جنگ میں اپنی نقل و حرکت کو دشمن سے چُھپانا یا کامیاب نتائج پیدا کرنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا نہ صرف ایک بالکل جائز فعل ہے بلکہ فنونِ جنگ کے لحاظ سے نہایت ضروری اور واجبی ہے اور اگر کوئی جرنیل ایسی تدابیر اختیار نہیں کرتا تو وہ اعلیٰ اخلاق کا مالک تو پھر بھی نہیں کہلا سکتا مگر یقیناً وہ پرلے درجہ کا بے وقوف جرنیل ضرور سمجھا جائے گا جسے بالکل ابتدائی اور اصولی تدابیرِ جنگ کا بھی علم نہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی تدابیر اختیار نہ فرماتے اور جنگوں میں مخفی رکھنے والی تدابیر کو کُھلے بندوں کرتے تو پھر یہی معترض لوگ آپ پر یہ اعتراض کرتے کہ آپؐ فنونِ جنگ سے بالکل بے بہرہ اور حُسنِ تدبیر کی صفت سے بالکل محروم تھے۔ یہ ایک قیاس ہی نہیں بلکہ بعض غیر مسلم مؤرخین نے بعض اسلامی مہموں کی ظاہری ناکامی پر واقعی اس قسم کے اعتراضات کئے ہیں کہ بعض موقعوں پر مسلمانوں کا ایسی حالت میں دشمن کی قیام گاہ تک پہنچنا کہ وہ ان کی خبر پاکر پہلے سے منتشر ہو چکا ہوتا تھا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی مہموں میں سُوئے تدبیر سے کام لیا جاتا تھا۔ حالانکہ کبھی کسی مہم میں ایسا ہو جانا سُوئے تدبیر کی علامت نہیں بلکہ صرف اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دشمن بھی اپنی جگہ ہوشیار اور چوکس تھا اور باوجود مسلمانوں کی ہوشیاری اور بیدار مغزی کے وہ کبھی کبھی شرارت کر کے اپنی شرارت کی سزا سے بچ جاتا تھا۔ مگر پھر بھی مجموعی نتیجہ بہر حال اسلام کے حق میں پیدا ہو رہا تھا۔ مخالفینِ اسلام کی یہ ذہنیت اس بات کے سوا کچھ ثابت نہیں کرتی کہ انہوں نے ہر حال میں اعتراض کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یعنی مسلمان اگر بیدار مغزی اور حُسنِ تدبیر کا اظہار کریں تو تب یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام ہوشیاری اور چالاکی کی تعلیم دیتا ہے اور اگر وہ کبھی دشمن کی ہوشیاری اور چالاکی کا نشانہ بن جائیں تو تب یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اسلام میں بیدار مغزی اور حُسنِ تدبیر کا فقدان تھا۔ اس ذہنیت کا علاج سوائے خدا کے اور کسی کے پاس نہیں۔ مگر یہ ایک شکر کی بات ہے کہ اس قسم کے جاہلانہ اعتراض صرف بے وقوف اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں اور سمجھدار لوگ اس بات کو جانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ سچا مذہب رُوحانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی عقل کو بھی تیز کرتا ہے اور یہ کہ اسلام کا مقدس بانی صداقت اور دیانت کے ساتھ ساتھ حُسنِ تدبیر کا بھی مجسمہ تھا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلِّمْ۔

خلاصہ کلام یہ کہ جنگ میں اپنی حرکات و سکنات کو چُھپا کر یا اسی قسم کی اور مناسب احتیاطی تدابیر

اختیار کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً کسی ناجائز یا خلافِ اخلاق بات کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ حق یہ ہے کہ یہ تدابیر آپؐ کی دُور اندیشی اور بیدار مغزی کی دلیل ہیں اور جو شخص اِن باتوں پر اعتراض کرتا ہے۔ وہ خود اپنی جہالت کا ثبوت دیتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تَوریہ (یعنی پردہ رکھنا) اور کذب بیانی (یعنی جھوٹ بولنا) میں زمین آسمان کا فرق ہے اور کوئی عقلمند ان دونوں کو ایک نہیں قرار دے سکتا۔ تَوریہ کے معنی چھپانے کے ہیں یعنی ایسے رنگ میں بات کرنا کہ مصلحتِ وقت کے ماتحت کسی بات کو پردہ میں رکھا جاتے تاکہ فتنہ کی صورت پیدا نہ ہو۔ لیکن کذب کے معنی خلافِ واقعہ بات بیان کرنے اور جھُوٹ بولنے کے ہیں اور ان دونوں مفہوموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہر شخص اپنی روزمرہ کی زندگی میں سینکڑوں باتوں کو چھُپاتا ہے۔ کسی کو شرم و حجاب کی وجہ سے اور کسی کو فتنہ کی روک تھام کی بنا پر اور کسی کو اَور کسی جائز غرض کے ماتحت۔ لیکن آج تک کسی عقلمند نے اس طریق پر اعتراض نہیں کیا بلکہ اِسے ایک بہت اچھا خُلق سمجھا جاتا ہے مگر کذب بیانی اور دروغ گوئی بالکل اور چیز ہے جو ہر شریف انسان کے نزدیک ایک مکروہ اور ناجائز فعل ہے اور اسلام نے تو اسے نہایت سختی سے روکا اور حرام قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پُوچھا کہ یا رسول اللہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ اُس وقت آپؐ ایک مجلس میں تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ آپؐ نے پہلے شرک اور والدین کی نافرمانی کا ذکر فرمایا اور پھر بڑے جوش کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اُٹھکر بیٹھ گئے کہ:-

اَلَا وَقَوْلَ الزُّوْرِ۔ اَلَا وَقَوْلَ الزُّوْرِ [1]

یعنی "کان کھول کر سُن لو! ہاں پھر کان کھول کر سُن لو کہ ان کے بعد سب سے بڑا گناہ جھُوٹ بولنا ہے۔"

راوی کہتا ہے کہ آپؐ نے یہ الفاظ اِس جوش کے ساتھ بار بار دہرائے کہ ہم نے آپؐ کی تکلیف کا خیال کرکے دل میں کہا کہ کاش آپؐ اب خاموش ہو جائیں اور اِس نصیحت کے دُہرانے میں اتنی تکلیف نہ اُٹھائیں۔

سریہ زید بن حارثہ بہ جانب طرف جمادی الآخرۃ ۶ھ

غزوہ بنو لحیان کے کچھ عرصہ بعد جمادی الآخرۃ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کی کمان میں پندرہ صحابیوں کا ایک دستہ طَرَف کی جانب روانہ فرمایا جو مدینہ سے چھتیس ۳۶ میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور اس جگہ ان ایام میں بنو ثعلبہ کے لوگ

---

[1] بخاری کتاب الشہادات

آباد تھے۔ مگر قبل اس کے کہ زید بن حارثہ وہاں پہنچتے اس قبیلہ کے لوگ بروقت خبر پاکر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اور زید اور اُن کے ساتھی چند دن کی غیر حاضری کے بعد مدینہ میں واپس لوٹ آئے۔ اِس سریہ میں مسلمانوں کا جنگی شعار اَمِتْ اَمِتْ تھا۔[1]

سریہ زید بطرف حِسْمٰی جمادی الآخرۃ ۶ ھ

اسی ماہ جمادی الآخرۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو پانچ سو مسلمانوں کے ساتھ حِسْمٰی کی طرف روانہ فرمایا جو مدینہ کے شمال کی طرف بنو جذام کا مسکن تھا۔ اس مہم کی غرض یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی جن کا نام دحیہ کلبی تھا شام کی طرف سے قیصر روم کو مل کر واپس آرہے تھے[2] اور اُن کے ساتھ کچھ سامان بھی تھا جو کچھ تو قیصر کی طرف سے خلعت وغیرہ کی صورت میں تھا[3] اور کچھ تجارتی سامان تھا۔ جب دحیہ بنو جذام کے علاقہ کے پاس سے گذرے تو اس قبیلہ کے رئیس ہنید بن عارض نے اپنے قبیلہ میں سے ایک پارٹی کو اپنے ساتھ لیکر دحیہ پر حملہ کر دیا اور سارا سامان چھین لیا حتّٰی کہ دحیہ کے جسم پر بھی سوائے پھٹے ہوئے کپڑوں کے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ جب اس حملہ کا علم قبیلہ بنو ضُبَیب کو ہوا جو قبیلہ بنو جذام ہی کی ایک شاخ تھے اور ان میں سے بعض لوگ مسلمان ہو چکے تھے[4] تو انہوں نے بنو جذام کی اس پارٹی کا پیچھا کر کے اُن سے لوٹا ہوا سامان واپس چھین لیا اور دحیہ اس سامان کو لیکر مدینہ میں واپس پہنچے۔ یہاں آکر دحیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے حالات سے اطلاع دی جس پر آپؐ نے زید بن حارثہ کو روانہ فرمایا اور دحیہ[5] کو بھی زید کے ساتھ بھجوا دیا۔

زید کا دستہ بڑی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ دن کو چھپتا ہوا اور رات کے وقت سفر کرتا ہوا حِسْمٰی کی طرف بڑھا اور عین صبح کے وقت بنو جذام کے لوگوں کو جا دبایا۔ بنو جذام نے مقابلہ کیا مگر مسلمانوں کے اچانک حملہ کے سامنے اُن کے پاؤں نہ جم سکے اور تھوڑے سے مقابلہ کے بعد وہ بھاگ نکلے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور زید بن حارثہ بہت سا سامان اور مال مویشی اور ایک سو کے قریب قیدی پکڑ کر واپس لوٹ آئے۔

مگر ابھی زید مدینہ میں پہنچے نہیں تھے کہ قبیلہ بنو ضُبَیب کے لوگوں کو جو قبیلہ بنو جذام کی شاخ تھے زید کی اس مہم کی خبر پہنچ گئی اور وہ اپنے رئیس رفاعہ بن زید کی معیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور ہماری بقیہ قوم کے لیے امن کی تحریر ہو چکی ہے تو پھر ہمارے قبیلہ کو اس حملہ میں کیوں شامل کیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں یہ درست ہے

---

[1] [2] [3] ابن سعد۔ [4] ابن اسحاق بحوالہ زرقانی حالات سریہ حِسْمٰی۔ [5] زرقانی۔

[5] وہی دحیہ کلبی ہیں جن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے جبرئیل ان کی شکل میں نظر آتے تھے۔

مگر زید کو اس کا علم نہیں تھا اور پھر جو لوگ اس موقع پر مارے گئے تھے اُن کے متعلق آپ نے بار بار افسوس کا اظہار کیا۔ اس پر رفاعہ کے ساتھی ابوزید نے کہا یا رسول اللہ! جو لوگ مارے گئے ہیں اُن کے متعلق ہمارا کوئی مطالبہ نہیں یہ ایک غلط فہمی کا حادثہ تھا جو ہوگیا۔ مگر جو لوگ زندہ ہیں اور جو سازوسامان زید نے ہمارے قبیلہ سے پکڑا ہے وہ ہمیں واپس مل جانا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا ہاں یہ بالکل درست ہے اور آپؐ نے فوراً حضرت علیؓ کو زید کی طرف روانہ فرمایا اور بطور نشانی کے انہیں اپنی تلوار عنایت فرمائی اور زید کو کہلا بھیجا کہ اس قبیلہ کے جو قیدی اور اموال پکڑے گئے ہیں وہ چھوڑ دیئے جائیں۔ زید نے یہ حکم پاتے ہی فوراً سارے قیدیوں کو چھوڑ دیا اور غنیمت کا مال بھی واپس لوٹا دیا۔[1]

اس سریہ کی تاریخ کے متعلق ایک اِشکال ہے جس کا ذکر ضروری ہے۔ ابن سعد اور اس کی اتباع میں دیگر اہل سیر نے اس سریہ کی تاریخ جمادی الآخرۃ ۶ھ لکھی ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے مگر علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں تصریح کی ہے کہ یہ سریہ ۷ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد ہوا تھا[2] اور غالباً ابن قیم کے قول کی بنیاد یہ ہے کہ اس سریہ کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ دحیہ[3] کلبی قیصر سے مل کر مدینہ کو واپس آرہے تھے کہ اُنہیں راستہ میں بنو جذام نے لُوٹ لیا اور یہ مسلّم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کو قیصر کی طرف خط دیکر صلح حدیبیہ کے بعد بھجوایا تھا اس لیے یہ واقعہ کسی صورت میں حدیبیہ سے پہلے نہیں ہوسکتا۔ یہ دلیل اپنی ذات میں بالکل صاف اور واضح ہے اور اس کی روشنی میں ابن سعد کی روایت یقیناً قابل ردّ قرار پاتی ہے مگر خاکسار کی رائے میں ایک توجیہہ ایسی ہے جسے علامہ ابن قیم نے نظر انداز کر دیا ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے کہ قیصر کی ملاقات کے لیے دحیہ شام میں دو دفعہ گئے ہوں۔ یعنی پہلی دفعہ وہ صلح حدیبیہ سے قبل ازخود تجارتی غرض کے لیے گئے ہوں اور قیصر سے بھی ملے ہوں۔ اور دوسری دفعہ صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط لیکر گئے ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قیصر کی طرف پیغامبر بننے کے لیے اسی غرض سے چنا ہو کہ وہ پہلے قیصر سے مل چکے ہیں۔ اس توجیہہ کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ اس سفر میں دحیہ کے پاس تجارتی سامان تھا اور صلح حدیبیہ کے بعد والے سفر میں بظاہر تجارتی سامان کا تعلق نظر نہیں آتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دحیہ کا یہ سفر محض تجارتی غرض سے ہو اور ابن سعد کے راوی نے اس کے دوسرے سفر کے ساتھ اس سفر کو خلط کرکے قیصر کی ملاقات اور خلعت کے ذکر کو قیاساً شامل کرلیا ہو۔ واللہ اعلم۔

سریہ زید بن حارثہ بطرف وادی القُریٰ رجب ۶ھ

سریہ حِسمیٰ کے قریباً ایک ماہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] ابن سعد و زرقانی [2] زاد المعاد مصنفہ ابن قیم جلد ا صفحہ ۳۸ [3] یہ نام دِحیہ اور دَحیہ دونوں طرح آتا ہے۔

پھر زید بن حارثہ کو وادی القُریٰ کی طرف روانہ فرمایا[1] جب زید کا دستہ وادی القُریٰ میں پہنچا تو بنو فزارہ کے لوگ ان کے مقابلہ کے لیے تیار تھے[2] چنانچہ اس معرکہ میں متعدد مسلمان شہید ہوئے اور خود زید کو بھی سخت زخم آئے مگر خدا نے اپنے فضل سے بچا لیا[3]

وادی القریٰ جس کا اس سریہ میں ذکر ہوا ہے وہ مدینہ سے شمال کی طرف شامی راستہ پر ایک آباد وادی تھی جس میں بہت سی بستیاں آباد تھیں اور اسی واسطے اس کا نام وادی القُریٰ پڑ گیا تھا یعنی بستیوں والی وادی۔ اور ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس وادی میں بعض یہودی قبائل بھی آباد تھے جو خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مفتوح ہوئے۔

زید بن حارثہ کی امارت پر لوگوں کا اعتراض اور آنحضرت ﷺ کا جواب

گذشتہ چار پانچ مہموں میں زید بن حارثہ کی کمان کا ذکر آیا ہے۔ ہمارے ناظرین جانتے ہیں کہ زید ایک آزاد کردہ غلام تھے اور قرآنی حکم کے نزول سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا اور اُن کی وفات تک جو ۸ ہجری میں غزوہ موتہ میں ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں متعدد مہموں کا امیر مقرر فرمایا اور بڑے بڑے صحابہ کو اُن کی ماتحتی میں رکھا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے اُسامہ سے بھی آپؐ کو خاص محبت تھی۔ چنانچہ اکثر صحابہ کو خیال تھا کہ اُسامہ جس بے تکلفی اور آزادی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کر لیتے ہیں، وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ اسامہ کو بھی آپؐ نے متعدد مہموں میں امیر مقرر فرمایا اور بعض بڑے بڑے صحابہ کو اُن کی ماتحتی میں رکھا اور جب اس پر بعض نو آموز مسلمانوں نے اسامہ کے نسب کی وجہ سے اعتراض کیا تو آپؐ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا تم اسامہ سے پہلے زید کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو مگر اسلام میں صرف ذاتی اہلیت دیکھی جاتی ہے۔ اور خدا کی قسم جس طرح زید امارت کا اہل تھا اسی طرح اس کا بیٹا اسامہ بھی امارت کا اہل ہے اور مجھے یہ دونوں نہایت درجہ محبوب ہیں[4] اس ارشادِ نبوی پر جو اسلام کی حقیقی مساوات کا حامل تھا صحابہ کی گردنیں جُھک گئیں اور اُنہوں نے سمجھ لیا کہ اسلام میں کسی شخص کا غلام یا غلام زادہ ہونا یا بظاہر کسی ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھنا اس کی ترقی کے رستہ میں حارج نہیں ہو سکتا۔ اور اصل معیار بہر صورت تقویٰ اللہ اور ذاتی قابلیت پر مبنی ہے۔

---

[1] ابن سعد۔ [2] ابن اسحاق۔ [3] زرقانی

[4] بخاری ابواب مناقب وطبقات ابن سعد حالات زید و اسامہ

مساواتِ اسلامی پر ایک مختصر نوٹ

اس جگہ ایک مختصر سا نوٹ اسلامی مساوات کے متعلق سُپردِ قلم کرنا بے موقع نہ ہوگا کیونکہ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس کے متعلق اکثر لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے یعنی جہاں ایک طبقہ نے اسلامی مساوات کے یہ معنی سمجھ رکھے ہیں کہ اسلام میں سب چھوٹے بڑے ہر جہت سے برابر ہیں اور اسلام کسی صورت میں کسی شخص کے امتیاز یا بڑائی کو تسلیم نہیں کرتا اور تمام امتیازات کو مٹا کر ہر شخص کو ہر لحاظ سے ایک لیول پر کھڑا کرنا چاہتا ہے وہاں ایک دوسرے طبقہ نے اسلام میں بھی اسی رنگ کے ناگوار طبقے بنا رکھے ہیں جو اکثر دوسری قوموں میں پائے جاتے ہیں اور ان طبقات کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دے دئے گئے ہیں۔ بلکہ ان طبقات کے اندر کی خلیج کو وسیع تر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ صحیح اسلامی تعلیم کی رُو سے یہ دونوں خیالات افراط و تفریط کے طریق پر غلط اور نادرست ہیں بلکہ اصل اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جہاں تک حقوق اور ذرائع ترقی کے حصول کا سوال ہے سب لوگ برابر ہیں اور کسی فرد یا کسی جماعت کو کسی دوسرے فرد یا کسی دوسری جماعت پر کسی رنگ میں فضیلت حاصل نہیں اور اس جہت سے اسلام میں قطعاً کوئی درجے یا طبقے پائے نہیں جاتے بلکہ پوری پوری مساوات ہے، لیکن دوسری طرف اگر کوئی شخص کسی جائز وجہ سے کوئی دینی یا دُنیوی ترقی اور بڑائی حاصل کر لیتا ہے تو حقوق کے معاملہ کو الگ رکھتے ہوئے جس میں بہر حال سب برابر ہیں اسلام عام تعلقات میں ایسے شخص کی حاصل شدہ بڑائی اور ترقی کو تسلیم کرتا ہے اور اُسے اُس کے جائز مرتبہ سے گرا کر ظلم اور حق تلفی کے طریق کو اختیار نہیں کرتا۔ خلاصہ یہ کہ جہاں ایک طرف اسلام نے سب بنی نوع آدم کو حقوق اور ذرائع ترقی کے حصول کے معاملہ میں ایک لیول یعنی ایک سطح پر کھڑا کیا ہے اور کسی ناواجب نسلی اور قومی یا خاندانی یا انفرادی امتیاز کو تسلیم نہیں کیا وہاں افراد اور قوموں کی حاصل شدہ بڑائی اور ترقی کو جبر و تشدد کے رنگ میں مٹایا بھی نہیں اور انہیں ان کی محنت یا خوش بختی کے ثمرہ سے محروم نہیں کیا البتہ اس صورت میں گرے ہوتے لوگوں کو اُٹھانے کے لیے مؤثر تدابیر ضرور اختیار کی ہیں اور یہی وہ اعلیٰ اور وسطی طریق ہے جسے نظر انداز کر کے دُنیا آجکل مختلف قسم کے فتنوں کا شکار بن رہی ہے اور اس زمانہ کی سرمایہ داری اور اشتراکیت انہی فتنوں سے پیدا شدہ انتہائیں ہیں جن میں سے ایک میں افراط کی صورت پیدا ہوگئی ہے اور دوسری میں تفریط کی۔

اسلامی مساوات کا اُصولی نظریہ

اسلامی مساوات کے فلسفہ کا نچوڑ اور خلاصہ چند قرآنی آیات اور چند احادیثِ نبویؑ میں آجاتا ہے۔ قرآن شریف

میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۔[1]

یعنی "اے لوگو! تم آپس کے معاملات میں خدا کا تقویٰ اختیار کیا کرو اور اسی سے ڈرتے رہو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس ایک جان سے اُس نے اُس کا جوڑا بنایا اور پھر اس جوڑے سے اُس نے دُنیا میں کثیر التعداد مرد اور عورت پھیلا دئے۔"

اس قرآنی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اُس ابدی حقیقت کی طرف توجہ دلا کر کہ وہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں دُنیا میں صحیح مساوات کی بُنیاد قائم کر دی ہے اور اس اصول کی طرف توجہ دلائی ہے کہ خواہ بعد کے حالات کے نتیجے میں مختلف انسانوں اور مختلف قوموں اور مختلف طبقات میں کتنا ہی فرق پیدا ہو جائے انہیں آپس کے معاملات میں اس بات کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ بہر حال اپنی اصل کے لحاظ سے وہ ایک ہی باپ کی نسل ہیں۔ کیا اگر ایک باپ کے بیٹوں میں سے بعض بچے دوسروں کی نسبت زیادہ دولت یا زیادہ طاقت یا زیادہ اثر و رسوخ حاصل کر لیں اور دوسرے اِن باتوں میں نسبتاً پس ماندہ رہیں تو وہ اِس فرق کی وجہ سے بھائی بھائی نہیں رہتے اور کوئی غیر چیز بن جاتے ہیں ؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ [2] ...... یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ [3] ...... یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۔[4]

یعنی "سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں ...... سو اے مسلمانو! ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ تم میں سے ایک فریق دوسرے فریق پر ہنسی اُڑائے اور اُسے ذلیل خیال کرے کیونکہ (جب سب لوگ اپنی اصل کے لحاظ سے برابر ہیں اور سب کے لیے ترقی کے رستے یکساں کھُلے ہیں تو) ہو سکتا ہے کہ وہ فریق جس پر تم آج ہنسی اُڑاتے ہو کل کو تم سے آگے نکل جائے یا

---

[1] سورۃ النسآء : ۲ [2] [3] سورۃ الحجرات : ۱۱ و ۱۲ [4] سورۃ الحجرات : ۱۴

ہوسکتا ہے کہ وہ اب بھی اپنے بعض اوصافِ حمیدہ کے لحاظ سے تم سے بہتر ہو.......اے لوگو! اچھی طرح سُن لو کہ ہم نے تم سب کو مرد و عورت کے جوڑے سے پیدا کیا ہے اور بے شک ہم نے تم میں قوموں اور قبیلوں کی تقسیم قائم کی ہے مگر یاد رکھو کہ یہ تقسیم اِس غرض سے ہرگز نہیں کہ تم ایک دوسرے کے مقابل پر تفاخر اور بڑائی سے کام لو بلکہ یہ تقسیم صرف اِس غرض سے ہے کہ تمہارے درمیان آپس میں شناخت اور تعارف کا ذریعہ قائم رہے ورنہ خدا کے نزدیک تم میں سے بڑا اور معزز وہی ہے جو ذاتی طور پر زیادہ اوصافِ حمیدہ کا مالک اور زیادہ متقی اور زیادہ پرہیزگار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون جو وہ تمہارے سامنے بیان کر رہا ہے بڑی دُوراندیشی اور بڑی حکمت پر مبنی ہے کیونکہ وہ علیم و خبیر خدا ہے۔"

اِسی طرح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ۔ أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ۔ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى۔ أَبَلَّغْتُ؟ قَالُوا قَدْ بَلَّغَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ[1]

یعنی جو خُطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر حج کے درمیانی دن میں مِنیٰ کے مقام میں دیا اس میں آپؐ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک تھا پس ہوشیار ہو کر سُن لو کہ عربوں کو عجمیوں پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ عجمیوں کو عربوں پر کوئی فضیلت ہے۔ اسی طرح سرخ و سفید رنگ والے لوگوں کو کالے رنگ والے لوگوں پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کالے لوگوں کو گوروں پر کوئی فضیلت ہے۔ ہاں جو بھی ان میں سے اپنی ذاتی نیکی سے آگے نکل جائے وہی افضل ہے۔ لوگو! بتاؤ کیا مَیں نے تمہیں خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے؟ سب نے عرض کیا۔ بیشک خدا کے رسول نے اپنی رسالت پہنچا دی ہے۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

قَدْ أَذْهَبَ اللهُ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْآبَاءِ۔ إِنَّمَا هُوَ مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ وَالنَّاسُ بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ[2]

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل [2] ترمذی ابواب المناقب

یعنی "اے مسلمانو! خداتعالیٰ نے ایمان کے ذریعہ تم میں سے زمانہ جاہلیت کے بیجا کبر و غرور اور آباؤ اجداد کی وجہ سے بے جا تفاخر کرنے کی مرض کو دُور کر دیا ہے۔ کیونکہ اسلامی پیمانہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص خدا کو ماننے والا اور نیک عمل بجالانے والا ہوتا ہے اور دوسرا بدعمل ہوتا ہے اور اچھے اوصاف سے محروم۔ اور یاد رکھو کہ سب لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوا تھا۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

اَلنَّاسُ مَعَادِنُ۔ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا[1]

یعنی "دنیا میں لوگ بھی معدنیات کی طرح ہیں۔ جو ایک ہی قسم کے عناصر ہوتے ہوتے اور ایک ہی قسم کی مٹی کے نیچے دبے ہوئے آہستہ آہستہ مختلف رنگ اور مختلف اوصاف اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر سُن لو کہ ترقی اور بڑائی کی جو معروف علامتیں اسلام سے پہلے سمجھی جاتی تھیں۔ (یعنی عقل و دانش۔ سخاوت و شجاعت۔ طاقت و اثر وغیرہ) وہی اب بھی قائم ہیں۔ اور جو لوگ ان اوصاف کی وجہ سے زمانۂ جاہلیت میں بڑے سمجھے جاتے تھے وہ اب اسلام میں بھی بڑے سمجھے جائینگے (کیونکہ اسلام کسی شخص کی حاصل شدہ بڑائی کو چھینتا نہیں) مگر شرط یہ ہے کہ وہ علمِ دین اور ذاتی نیکی اختیار کر لیں۔"

اُوپر کے حوالوں سے جو اسلامی مساوات کے نظریہ کے متعلق اُصولی رنگ رکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

۱۔ یہ کہ اپنی اصل کے لحاظ سے سب لوگ ایک باپ کی نسل اور ایک درخت کی شاخیں ہیں اور کسی فرد کو دوسرے فرد پر اور کسی قوم کو دوسری قوم پر محض نسلی فرق کی بنا پر کوئی امتیاز حاصل نہیں۔

۲۔ یہ کہ مسلمان ایک نبی کی اُمت اور ایک ایمان کے حامل ہونے کی وجہ سے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

۳۔ یہ کہ زمین کے اندر کی معدنیات کی طرح مختلف قومیں اور مختلف افراد ایک دوسرے سے مختلف اوصاف اختیار کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں مگر ان کی وجہ سے کسی فرد کو دوسرے فرد پر اور کسی قوم کو دوسری قوم پر بڑائی اور فخر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

۴۔ یہ کہ اسلام سے قبل جو اوصافِ حمیدہ قومی یا انفرادی بڑائی کی بُنیاد سمجھے جاتے تھے مثلاً عقل و دانش۔ سخاوت و شجاعت۔ طاقت و اثر وغیرہ وہ اسلام میں بھی بدستور قائم ہیں۔ مگر اسلام نے ان پر

---

[1] بخاری ابواب المناقب

اس شرط کا اضافہ کر دیا ہے کہ عام معروف اوصاف کے علاوہ دینداری کا وصف پایا جانا بھی ضروری ہے۔

۵۔ یہ کہ اسلام نے سب سے بڑا وصف دینداری اور تقویٰ اللہ کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ وصف خدائے اسلام کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور جو شخص اس وصف میں ممتاز ہوگا وہی دوسروں پر ممتاز سمجھا جائے گا۔

عام تعلقات میں مراتب کو ملحوظ رکھنے کی تلقین

اسلامی مساوات کے متعلق یہ بنیادی نظریہ بیان کرنے کے بعد اسلام اس سوال کو لیتا ہے کہ جب اصل کے لحاظ سے ایک ہونے کے باوجود مختلف لوگوں کے حالات اور اوصاف مختلف ہوسکتے ہیں تو اس ناگزیر اختلاف کی موجودگی میں مختلف مدارج کے لوگوں کے متعلق عام تمدنی معاملات میں کیا رویہ ہونا چاہیئے۔ سو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ [1]

یعنی "اے مسلمانو! تمہارے لیے ضروری ہے کہ آپس کے معاملات میں لوگوں کے معروف مرتبوں کا خیال رکھا کرو اور ان کے حالات اور درجہ کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا کرو۔"

اس حدیث کا منشاء یہ ہے کہ جو لوگ کسی دینی یا دنیوی بناء پر کوئی رتبہ یا بڑائی حاصل کرلیں تو عام معاملات میں اُن کے مرتبہ کا خیال رکھنا اور اُن کے ساتھ واجبی احترام سے پیش آنا اسلامی اخلاق کا حصہ ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی بات ہے کہ جب یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے فیصلہ کے لیے سعد بن معاذ انصاری قبیلہ اوس کے رئیس موقع پر تشریف لے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آتا دیکھ کر صحابہ سے فرمایا:۔

قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ [2]

یعنی "اپنے رئیس کے اکرام اور احترام کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔"

اسی طرح قرآن شریف سے پتہ لگتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو پیغام رسالت دیکر فرعون کی طرف بھیجا تو حضرت موسیٰؑ کو تاکید فرمائی کہ (چونکہ فرعون کو اس وقت ملک میں رُتبہ حاصل ہے اس لیے) اُس کے ساتھ نرمی اور ادب کے طریق پر بات کرنا۔[3]

عدالتی امور میں مکمل مساوات

لیکن اس کے مقابل پر عدالتی اور قضائی حقوق کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اور کن شاندار الفاظ

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب۔ [2] بخاری ابواب المناقب۔ [3] سورۃ طٰہٰ : ۴۵

میں فرماتے ہیں کہ :-

إِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا يُقِيْمُوْنَ الْحَدَّ عَلَى الْوَضِيْعِ وَ يَتْرُكُوْنَ الشَّرِيْفَ۔ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ فَعَلَتْ ذٰلِكَ لَقَطَعْتُ يَدَهَا[1]

یعنی "تم سے پہلے اِس بات نے کئی قوموں کو ہلاک کر دیا کہ جب اُن میں سے کوئی چھوٹا آدمی جرم کرتا تھا تو وہ اُسے سزا دیتے تھے اور جب کوئی بڑا آدمی جرم کرتا تھا تو وہ اُسے چھوڑ دیتے تھے۔ سو اچھی طرح کان کھول کر سُن لو کہ مجھے اُس پاک ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر میری لڑکی فاطمہ بھی چوری کرتی تو مَیں اسلامی طریق پر اُس کے بھی ہاتھ کاٹوں گا۔"

اللہ! اللہ! کیسے زور دار الفاظ ہیں اور کس جلال کے ساتھ اسلامی مساوات کو قائم کیا گیا ہے! اور یہ تعلیم وہ تھی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء نے بھی بڑی سختی کے ساتھ مدنظر رکھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے سب سے پہلے خطبہ میں فرماتے ہیں :-

اَلضَّعِيْفُ فِيْكُمْ قَوِيٌّ عِنْدِيْ حَتّٰى أُرِيْحَ عَلَيْهِ حَقَّهٗ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ وَالْقَوِيُّ فِيْكُمْ ضَعِيْفٌ عِنْدِيْ حَتّٰى آخُذَ الْحَقَّ مِنْهُ[2]

یعنی "اے مسلمانو! سُن لو کہ تم میں سے کمزور ترین شخص میرے لیے اُس وقت تک قوی ہوگا جب تک کہ مَیں اُسے اُس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تم میں سے قوی ترین شخص میرے لیے اُس وقت تک کمزور ہوگا جب تک کہ مَیں اُس سے وہ حق جو اُس نے کسی اَور کا دبایا ہوا ہو واپس نہ لے لوں۔"

اسی طرح حضرت عمر خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ شمالی عرب کے ایک بڑے رئیس جبلہ بن ایہم نامی نے جو مسلمان ہو چکا تھا کسی غریب مسلمان کو غصہ میں آکر تھپڑ مار دیا۔ جب حضرت عمرؓ کو اِس واقعہ کا علم ہوا تو آپؓ نے جبلہ کو بُلا کر فرمایا۔ جبلہ! مَیں سُنتا ہوں کہ تم نے ایک غریب مسلمان کو تھپڑ مارا ہے۔ اگر تم نے ایسی حرکت کی ہے تو خدا کی قسم تم سے اس کا بدلہ لیا جائیگا۔" اِس پر جبلہ جس میں غالباً ابھی تک جاہلیت والے تکبّر کی رگ باقی تھی مغرور ہو کر مُرتد ہو گیا[3]

ملکی عہدوں کی تقسیم میں مکمل مساوات

عدالتی حقوق کے سوال کے بعد عہدوں اور ذمہ واریوں کی تقسیم کا سوال آتا ہے اور ایک

---

[1] بخاری کتاب الحدود۔ [2] ابن ہشام امر سقیفہ بنی ساعدہ۔ [3] فتوح البلدان حالات جنگ یرموک

لحاظ سے یہ سوال سب سے زیادہ اہم ہے سو اس کے متعلق قرآن شریف فرماتا ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ[1]

یعنی "اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ قومی اور ملکی عہدوں کی تقسیم کے معاملہ میں جو خدا کے نزدیک ایک مقدس امانت کا رنگ رکھتے ہیں صرف ذاتی قابلیت اور ذاتی اہلیت کو دیکھا کرو۔ اور جو شخص بھی اپنے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے کسی عہدہ کا اہل ہو اُسے وہ عہدہ سپرد کیا کرو خواہ وہ کوئی ہو۔ اور پھر اے مسلمانو! جب تم کسی عہدہ یا ذمہ داری کے کام پر مقرر کئے جاؤ تو تمہارا فرض ہے کہ لوگوں میں کامل عدل و انصاف کا معاملہ کرو۔"

یہ زرین تعلیم ہمیشہ اسلامی حکومتوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں بعض بظاہر ادنیٰ سے ادنیٰ لوگ ترقی کر کے عروج کے کمال تک پہنچے ہیں چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو جو ایک آزاد شدہ غلام تھے کئی فوجی دستوں کا امیر مقرر فرمایا۔ اور پھر زید کی وفات کے بعد آپؐ نے اُن کے نوجوان فرزند اسامہ بن زید کو بھی ایک بڑی فوج کا امیر مقرر فرمایا جس میں بعض بڑے بڑے صحابہ شامل تھے جو قدیم دستور کے مطابق گویا عرب سوسائٹی میں پہاڑ کی طرح سمجھے جاتے تھے اور جب اس پر بعض ناسمجھ نو مسلموں میں چہ میگوئی ہوئی کہ ایک نوجوان غلام زادہ کو ایسے ایسے معمر اور جلیل القدر لوگوں پر امیر مقرر کیا گیا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت غصہ کیساتھ فرمایا کہ :۔

اِنْ تَطْعَنُوْا فِیْ اَمَارَتِهٖ فَقَدْ كُنْتُمْ تَطْعَنُوْنَ فِیْ اَمَارَةِ اَبِيْهِ مِنْ قَبْلُ وَاَيْمُ اللّٰهِ اِنْ كَانَ لَخَلِيْقًا لِلْاَمَارَةِ وَاِنْ كَانَ لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ وَاِنَّ هٰذَا لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ بَعْدَهٗ ۔[2]

یعنی "تم اسامہ کی امارت پر نکتہ چینی کرتے ہو اور اس سے قبل تم اس کے باپ زید پر بھی نکتہ چینی کر چکے ہو۔ خدا کی قسم جس طرح اس کا باپ امارت کا اہل تھا اور مجھے بہت محبوب تھا اسی طرح اس کے بعد اسامہ بھی امارت کا اہل ہے اور مجھے بہت محبوب ہے۔"

یہ اسی مبارک تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام میں ہمیشہ بظاہر ادنیٰ ترین لوگوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی حاصل کی اور کبھی کسی شخص کی غربت یا نسلی پستی اُس کی ترقی میں روک نہیں بنی۔ چنانچہ اس کی مزید مثالیں دیکھنی ہوں تو اس کتاب کے حصہ دوم کا وہ باب ملاحظہ کیا جاتے جو غلامی کی بحث سے تعلق رکھتا ہے۔

---

[1] سورۃ النساء : ۵۹ [2] بخاری ابواب مناقب

سوشل اجتماعوں میں برادرانہ اختلاط

اس جگہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ عہدوں اور ذمہ داری کے کاموں کے متعلق تو بے شک اسلام نے حقیقی مساوات کی تعلیم دی ہے اور سب کے لیے ترقی کا ایک جیسا رستہ کھول دیا ہے مگر ہو سکتا ہے کہ اس انتظامی مساوات کے باوجود تمدنی معاملات اور آپس کے میل ملاقات کے بارے میں مختلف قسم کے لوگوں میں خلیج باقی رہے اور اسلام نے اس خلیج کو دُور نہ کیا ہو۔ سو اس کے جواب میں یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام نے اس رخنہ کو بھی بڑی سختی کے ساتھ بند کیا ہے۔ چنانچہ اِس قرآنی ارشاد کے علاوہ جو اوپر گذر چکا ہے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور انہیں بھائیوں کی طرح مل کر رہنا چاہیئے[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمدنی تعلقات کے سب سے بڑے ذریعہ اور سب سے بڑے میدان یعنی آپس کی دعوتوں اور کھانے پینے کی ملاقاتوں وغیرہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُدْعٰى لَهَا الْاَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ وَمَنْ تَرَكَ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ[2]

یعنی "سب سے بُری اور سب سے زیادہ قابلِ نفرت دعوت وہ دعوت ہے جس میں صرف امیر بُلائے جائیں اور غریبوں کو نہ بُلایا جائے اور جو شخص کسی بھائی کی دعوت کا انکار کرتا ہے وہ خدا اور اُس کے رسول کا نافرمان ہے۔"

اس مبارک ارشاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سخت ناپسند فرمایا ہے کہ امیر لوگ اپنی دعوتوں وغیرہ میں صرف امیروں کو مدعو کریں اور غریبوں کو گویا کوئی اور جنس خیال کرتے ہوئے بھول جائیں۔ اور دراصل مساوات کی رُوح زیادہ تر تمدنی معاملات میں ہی بگڑنی شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کے تمدنی معاملات کا اثر براہِ راست دل پر پڑتا ہے۔ اِسی طرح آپ نے یہ تاکید بھی فرمائی ہے کہ اگر کوئی غریب کسی امیر کی دعوت کرے تو امیر کے لیے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنی امارت کے گھمنڈ میں آکر یا یہ خیال کرکے کہ غریب کے ہاں کا کھانا اُس کی عادت اور مزاج کے مطابق نہیں ہوگا۔ غریب کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دے۔ چنانچہ اس قسم کی دعوتوں کا رستہ کھولنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

لَوْ دُعِيْتُ اِلٰى كُرَاعٍ لَاَجَبْتُ[3]

یعنی "اگر کوئی غریب شخص کسی بکری یا بھیڑ کا ایک پایہ پکا کر بھی مجھے دعوت میں بُلائے تو میں اُس کی دعوت کو ضرور قبول کروں گا۔"

یاد رہے کہ اس جگہ کُراع کے معنی پائے کے نچلے حصّہ کے ہیں جو ٹخنوں سے نیچے ہوتا ہے[4] اور

---

[1] سورۃ الحجرات : ۱۱ [2] بخاری کتاب النکاح۔ [3] بخاری کتاب النکاح [4] اقرب الموارد

یقیناً وہ ایک ادنیٰ قسم کی غذا ہے کیونکہ ٹخنوں کے نیچے کا حصہ قریباً کھُری بن جاتا ہے، لیکن اگر کُراع کے معنی پُورے پائے کے بھی سمجھے جائیں تو پھر بھی عربوں کی روایات سے یہ ثابت ہے کہ قدیم زمانہ میں عرب لوگ پائے کو اچھی غذا نہیں سمجھتے تھے چنانچہ عربوں میں مشہور محاورہ تھا کہ:۔

لَا تُطْعِمِ الْعَبْدَ الْكُرَاعَ فَيَطْمَعُ فِي الذِّرَاعِ[1]

یعنی "اپنے غلام کو پایہ بھی کھانے کو نہ دو ورنہ وہ اس سے اوپر نظر اُٹھا کر دست و ران کے گوشت کی بھی طمع کرنے لگے گا۔"

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس حدیث میں اپنا ذاتی اُسوہ پیش کر کے مسلمانوں کو تحریک فرمائی ہے کہ خواہ دعوت کرنے والا کتنا ہی غریب ہو اُس کی دعوت کو غربت کی وجہ سے ردّ نہ کرو ورنہ یاد رکھو کہ تمہاری سوسائٹی میں ایسا رخنہ پیدا ہو جائے گا جو آہستہ آہستہ سب کو تباہ کر کے رکھ دیگا۔

مجلسوں میں مل کر بیٹھنے کے متعلق بھی اسلام یہی سنہری تعلیم دیتا ہے کہ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی بڑا شخص بعد میں آئے تو کسی چھوٹے شخص کو اُٹھا کر اُس کی جگہ اُسے دیدی جائے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:۔

نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّقَامَ الرَّجُلُ مِنْ مَّجْلِسِهٖ وَيُجْلَسُ فِيْهِ اٰخَرُ وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوْا وَتَوَسَّعُوْا۔[2]

یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس بات سے منع فرماتے تھے کہ کوئی شخص اپنی جگہ سے اس لیے اُٹھایا جائے کہ تا اُس کی جگہ کوئی دوسرا شخص بیٹھ جائے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر جگہ تنگ ہو اور زیادہ آدمی آجائیں تو پھر سب سمٹ سمٹ کر آنے والوں کے لیے گنجائش نکال لیا کرو۔"

یہی اُصول نمازوں کے موقع پر مسجدوں میں ملحوظ رکھا گیا ہے جہاں کسی شخص کے لیے کوئی جگہ ریزرو نہیں ہوتی۔ اگر ایک خادم پہلے آتا ہے تو وہ پہلی صف میں جگہ پائیگا اور اگر ایک آقا پیچھے پہنچتا ہے تو وہ آخری صف میں بیٹھے گا۔ غرض خدا کے گھر میں امیر و غریب۔ خادم و آقا۔ حاکم و محکوم۔ طاقتور اور کمزور سب برابر ہوتے ہیں اور کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا تھا جس میں آپؐ اپنے صحابہ کے ساتھ اس طرح مِل جُل کر بیٹھتے تھے کہ بعض اوقات ایک اجنبی شخص کے لیے آپؐ کی مجلس میں اس بات کا جاننا اور پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا کہ آپؐ کون ہیں اور کہاں بیٹھے ہیں۔[3]

---

[1] تاج العروس۔ [2] بخاری کتاب الادب۔ [3] بخاری ابواب الہجرت

خادم و آقا کے تعلقات

خادم و آقا کے تعلقات کا سوال بھی ایک بہت اہم سوال ہے، مگر چونکہ اس سوال کے متعلق کتاب ہذا کے حصہ دوم میں مسئلہ غلامی کی ذیل میں اُصولی بحث گذر چکی ہے اس لیے اِس جگہ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ خادموں اور غلاموں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بھی اسلام نے نہایت تاکیدی ہدایتیں دی ہیں۔ مثلاً آقاؤں کو ہوشیار کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اصولی رنگ میں فرماتے ہیں:۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ [1]

یعنی "تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی جہت سے بعض دوسرے لوگوں کا آقا اور افسر ہوتا ہے پس ہر شخص کو ہوشیار رہنا چاہیئے کیونکہ اُسے اُس کے سب ماتحت لوگوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔"

اور خادموں اور آقاؤں کی درمیانی خلیج کو اُڑانے کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

اِنَّ اِخْوَانَكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ كَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَاَعِيْنُوْهُمْ [2]

یعنی "تمہارے خادم تمہارے بھائی ہیں۔ پس جب کسی شخص کے ماتحت اُس کا کوئی بھائی ہو تو اُسے چاہیئے کہ اپنے خادم بھائی کو اُس کھانے میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دے جو وہ خود کھاتا ہے اور اُس لباس میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دے جو وہ خود پہنتا ہے اور اے مسلمانو! تم اپنے خادموں کو کوئی ایسا کام نہ دیا کرو جو اُن کی طاقت سے زیادہ ہو اور اگر کبھی مجبوراً انہیں کوئی ایسا کام دینا پڑے تو پھر اُس کام میں خود بھی اُن کی مدد کیا کرو۔"

یہ حدیث جیسا کہ اس کے الفاظ اور اسلوب بیان سے ظاہر ہے ایک نہایت اہم اور اصولی حدیث ہے اور "اُن کی مدد کیا کرو" کے الفاظ میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کام ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر وہ خود آقا کو کرنا پڑے تو وہ اُسے اپنے لیے موجب عار سمجھے بلکہ ایسا ہونا چاہیئے کہ جسے خود آقا بھی کر سکتا ہو اور کرنے کو تیار ہو۔ گویا اِس حدیث میں خادموں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور برادرانہ برتاؤ کی تلقین کے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الامارۃ نیز مسند احمد جلد ثانی صفحہ ۵۵

[2] بخاری کتاب العتق

علاوہ یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ کسی مسلمان کے لیے زیبا نہیں کہ وہ کسی کام کو اپنے لیے موجب عار سمجھے یا یہ خیال کرے کہ یہ کام صرف خادم کے کرنے کا ہے میرے کرنے کا نہیں۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کا کام خود اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے اور کسی کام کو عار نہیں سمجھتے تھے[1] یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اُوپر کی حدیث میں جو خَوَل کا لفظ آیا ہے وہ عربی محاورہ کے مطابق نوکروں اور خادموں اور غلاموں اور اسی قسم کے دوسرے حاشیہ نشینوں سب پر بولا جاتا ہے۔ اس طرح اِس حدیث میں گویا ایک نہایت وسیع مضمون مدنظر رکھا گیا ہے۔ بہرحال اسلام نے آقاؤں اور خادموں کے تعلقات کو بھی بہترین بنیاد پر قائم کیا ہے۔

بیاہ شادی کے معاملات میں اسلامی تعلیم

بیاہ شادی کا معاملہ بھی تمدنی تعلقات ہی کا حصہ ہے مگر افسوس ہے کہ دُنیا داروں نے اس میدان میں بھی اپنے خیال کے مطابق مختلف طبقے بنا رکھے ہیں اور غیر طبقہ میں رشتہ دینے کو موجب ہتک سمجھا جاتا ہے۔ سو اس کے متعلق ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ۔[2]

یعنی" ایک عورت کے ساتھ چار خیالات کی بناء پر شادی کی جاتی ہے۔ یا تو دولت کی وجہ سے بیوی کا انتخاب کیا جاتا ہے اور یا حسب نسب (یعنی قوم یا خاندان) کی وجہ سے انتخاب کیا جاتا ہے۔ اور یا حُسن وجمال کی وجہ سے انتخاب کیا جاتا ہے اور یا اخلاقی اور دینی حالت کی بناء پر انتخاب کیا جاتا ہے، لیکن اے مردِ مومن! تُو ہمیشہ بیوی کا انتخاب دینی اور اخلاقی بناء پر کیا کر اور ذاتی اوصاف اور ذاتی نیکی کے پہلو کو ترجیح دیا کر ورنہ یاد رکھ کہ تیرے ہاتھ ہمیشہ خاک آلود رہیں گے۔"

یہ وہ مبارک تعلیم ہے جو نہ صرف مسلمانوں کے گھروں کو جنّت کا نمونہ بنا سکتی ہے بلکہ اُن کی نسلوں کو بھی دین ودُنیا میں ترقی دینے کی بنیاد بننے کا بھاری ذریعہ ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی نمونہ بھی اس معاملہ میں یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ بنت جحش کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے ساتھ کر دی تھی اور اس معاملہ میں عربوں کے قدیم رسم ورواج اور خیالات کی قطعاً پروا نہیں کی۔ اسی طرح خود آپؐ نے عربوں کی ہر معروف قوم میں شادی کی یعنی قریش میں بھی کی

---

[1] بخاری ومسند احمد جلد ششم صفحہ ۱۰۶۔ [2] بخاری کتاب النکاح

غیر قریش میں بھی کی اور بنی اسرائیل میں بھی کی اور عرب میں یہی تین قومیں آباد تھیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل کئی مسلمان اپنی قوم سے باہر شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک سیّد اس بات پر مُصر ہوتا ہے کہ اُس کی لڑکی صرف سیّد کے گھر جاتے اور ایک راجپوت کا اس بات پر اصرار ہوتا ہے کہ اُس کی لڑکی صرف راجپوت کی بیوی بنے۔ اور ایک ککے زئی اِس بات پر ضد کرکے بیٹھ جاتا ہے کہ اُس کی لڑکی صرف ککے زئی کے ساتھ بیاہی جاتے۔ اور اِس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زرّیں تعلیم اور آپؐ کے مبارک اُسوہ کو پسِ پُشت ڈال دیا گیا ہے۔

مرد و عورت میں حقوق کی مساوات

پھر مساوات کی بحث میں مرد عورت کی مساوات کا سوال بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی جہاں آجکل ایک طبقہ عورت کو نعوذ باللہ جُوتی کی طرح اپنے پاؤں کے نیچے رکھنا چاہتا ہے تو وہاں دوسرا طبقہ اسے ایسی آزادی دینے پر تُلا ہوا ہے کہ گویا وہ انتظامی لحاظ سے بھی خاوند کی نگرانی سے باہر ہوگئی ہے۔ اور پھر یورپ کا ایک طبقہ تو اسلام کی طرف یہ تعلیم بھی منسوب کرتے ہوتے نہیں شرماتا کہ اسلام عورت میں رُوح تک کو تسلیم نہیں کرتا۔ گویا وہ صرف مشین کی طرح کا ایک جانور ہے جس کی زندگی اُس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ مگر قرآن شریف اِن سارے باطل خیالات کی تردید فرماتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ مرد عورت اپنے اعمال کی جدّوجہد اور اُن کے نتائج کے حصول میں برابر ہیں اور سب کے اعمال کا نتیجہ یکساں نکلنے والا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ۔[1]

یعنی "اے لوگو! مَیں جو تمہارا خالق و مالک ہوں مَیں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ کیونکہ تم سب ایک ہی نسل کے حصّے اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہو۔"

اور خاوند بیوی کے مخصوص حقوق کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ[2]

یعنی "جس طرح خاوندوں کے بعض حقوق بیویوں کے ذمہ ہیں اسی طرح بیویوں کے بعض حقوق خاوندوں کے ذمہ بھی ہیں۔"

---

[1] آل عمران: ۱۹۶۔ [2] البقرہ: ۲۲۹

اس قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ حقوق اور ذمہ واریوں کے معاملہ میں میاں بیوی برابر ہیں کہ کچھ پابندیاں خاوند کے ذمہ لگا دی گئی ہیں اور کچھ پابندیاں بیوی کے ذمہ لگا دی گئی ہیں اور دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کے متعلق پوچھے جائیں گے۔

مگر چونکہ انتظامی لحاظ سے گھریلو زندگی کی باگ ڈور بہرحال ایک ہاتھ میں رہنی ضروری ہے اس لیے اس جہت سے قرآن شریف فرماتا ہے :۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ ۔[1]

یعنی "گھریلو زندگی میں مردوں کو عورتوں پر امیر اور نگران رکھا گیا ہے کیونکہ خدا تعالےٰ نے فطری قویٰ میں مردوں کو فضیلت عطا کی ہے اور پھر عورتوں کے اخراجات کی ذمہ واری بھی انہی پر ہے۔ پس نیک بیویوں کو بہرحال اپنے خاوندوں کا فرمانبردار رہنا چاہیئے۔"

لیکن اس انتظامی فرق کو ایک طرف رکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیویوں کیساتھ سلوک کرنے کے متعلق فرماتے ہیں :۔

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ [2]

یعنی "تم میں سے خدا کے نزدیک بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں سب سے بہتر ہے اور خدا کے فضل سے میں تم سب میں اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والا ہوں۔"

اور اس بارے میں قرآن شریف یہ ارشاد فرماتا ہے کہ :۔

عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا [3]

یعنی "اے مسلمانو اپنی بیویوں کے ساتھ بہت نیک سلوک کیا کرو۔ اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو ناپسند بھی کرتا ہو تو پھر بھی یاد رکھو کہ ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند نہ کرو مگر خدا نے اس میں تمہارے لیے انجام کے لحاظ سے بہت بڑی خیر مقدر کر رکھی ہو۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام نے مساواتِ انسانی کے متعلق بہترین تعلیم دی ہے۔ چنانچہ (۱) سب سے پہلے اُس نے اس اصول کو بیان کیا ہے کہ سب لوگ ایک ہی جنس کی مخلوق اور ایک ہی باپ کی نسل اور

---

[1] سورۃ النسآء : ۳۵ ۔ [2] بخاری کتاب النکاح ۔ [3] سورۃ النسآء : ۲۰

ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اس لیے نسلی لحاظ سے سب کا حق برابر ہے۔ (۲) اس کے بعد اس نے اِس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ نسلی وحدت کے باوجود یہ ممکن ہے کہ جس طرح زمین کے پیٹ میں ایک ہی قسم کے عناصر مختلف قسم کی صورتیں اور مختلف قسم کے خواص اختیار کر کے مختلف قسم کی معدنیات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح مختلف انسان بھی بعد کے حالات کی وجہ سے مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو کر مختلف اوصاف اختیار کر سکتے ہیں مگر اِس فرق کی وجہ سے کسی قوم یا کسی قبیلہ یا کسی فرد کو کسی دوسرے پر بے جا فخر اور تکبر نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ممکن ہے کہ جو قوم یا جو شخص آج نیچے ہے وہ کل کو اُوپر ہو جاتے۔ (۳) اِس کے بعد اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ اِس وحدتِ نسلی کے علاوہ مسلمان خصوصیت کے ساتھ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ہی ایمان کے حامل اور ایک ہی دامنِ رسالت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی رُوحانی باپ کے بچے ہیں پس انہیں ہر حال میں بھائی بھائی بن کر رہنا چاہیئے (۴) اِس کے بعد اسلام یہ بتاتا ہے کہ بے شک مومنوں میں بھی فرق ہو سکتا ہے مگر یہ فرق اُن کے ذاتی اوصاف پر مبنی ہونا چاہیئے اور بہرحال خدا کے نزدیک زیادہ عزت والا شخص وہ ہے جو دینداری اور تقویٰ اور جذبۂ خدمت میں دوسروں سے آگے ہے (۵) اس کے بعد اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ کسی شخص کے دینی امتیاز یا دنیوی بڑائی کی وجہ سے یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ قضائی اور عدالتی معاملات میں کوئی فرق ملحوظ رکھا جاتے کیونکہ عدالتی حقوق کے میدان میں سب لوگ قطعی طور پر برابر ہیں (۶) اسکے بعد اسلام اس زرین اُصول کو بیان کرتا ہے کہ قومی عہدوں کی تقسیم میں صرف ذاتی اہلیت کو دیکھنا چاہیئے اور بلا لحاظ امیر و غریب اور بلا لحاظ نسل و خاندان جو شخص بھی کسی عہدہ کا اہل ہو اسے وہ عہدہ سُپرد کرنا چاہیئے خواہ وہ کوئی ہو۔ (۷) اِس کے بعد اسلام یہ ارشاد فرماتا ہے کہ گو کسی صاحبِ عزت شخص کا واجبی اِکرام کرنا اچھے اُخلاق کا حصّہ ہے مگر تمدّنی معاملات میں سب مسلمانوں کو آپس میں اس طرح مل جل کر رہنا چاہیئے کہ وہ ایک خاندان کے افراد نظر آئیں۔ وہ مجلسوں میں بلا لحاظ امیر و غریب مل جل کر بیٹھیں۔ اگر کوئی امیر دعوت کرے تو اُس میں غریبوں کو بھی ضرور بلاتے اور اگر کوئی غریب دعوت کرے تو امیر اُس سے انکار نہ کریں اور (۸) بالآخر اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ بیاہ شادی کے معاملات میں بیوی کا انتخاب اُس کے ذاتی اوصاف اور ذاتی نیکی کی بناء پر ہونا چاہیئے نہ کہ اس کے حسب نسب اور مال و دولت وغیرہ کی بناء پر۔

اسلام میں دولت کی تقسیم کا نظریہ

اِس کے بعد دولت کی تقسیم کا سوال آتا ہے جو آج کل کی اشتراکیت اور سرمایہ داری کی باہمی کشمکش جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ سو گو اِس بحث کا اصل موقع تو انشاء اللہ دوسری جگہ آتے گا۔ مگر اس جگہ مختصر طور پر

اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ اِس اہم سوال کے متعلق بھی اسلام نے ایک ایسی اعلیٰ اور وسطی تعلیم دی ہے جس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ کیونکہ جہاں اسلام نے عام حالات میں دولت پیدا کرنے کے انفرادی حق کو تسلیم کیا ہے وہاں اُس نے مُلکی دولت کو سمونے کے لیے ایک ایسی مشینری بھی قائم کر دی ہے کہ اگر اُسے اختیار کیا جائے تو کسی مُلک یا کسی قوم کی دولت کبھی بھی عامۃ الناس کے ہاتھوں سے نکل کر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع نہیں ہوسکتی۔ مَیں اس جگہ اختصار کے خیال سے اس مشین کے صرف چار پُرزوں کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ سب سے اوّل نمبر پر اسلامی قانونِ ورثہ ہے جس کی رُو سے ہر مرنے والے کا ترکہ صرف ایک بچے یا صرف نرینہ اولاد یا صرف اولاد کے ہاتھ میں ہی نہیں جاتا بلکہ سارے لڑکوں اور ساری لڑکیوں اور بیوی اور خاوند اور ماں اور باپ اور بعض صورتوں میں بھائیوں اور بہنوں اور دوسرے رشتہ داروں میں ایک نہایت مناسب شرح کے ساتھ تقسیم ہوجاتا ہے[1] اگر کوئی مسلمان زمیندار مرتا ہے تو اُس کی زمین اُس کے سب وارثوں میں تقسیم ہوگی۔ اگر کوئی دوکاندار مرتا ہے تو اُس کی دکان کا مال سب وارثوں کو پہنچے گا۔ اگر کوئی کارخانہ دار فوت ہوتا ہے تو اس کے کارخانہ کا حصّہ بھی سارے وارثوں میں بٹے گا وعلیٰ ہذا القیاس۔ اس طرح گویا اسلام نے دولت کی دَوڑ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بعض قدرتی روکیں یعنی ہرڈلیں (HURDLES) قائم کر دی ہیں اور ہر نسل کے خاتمہ پر ایک روک (یعنی ہرڈل) سامنے آکر اِس فرق کو کم کر دیتی ہے جو گذشتہ نسل کے دَوران میں پیدا ہوچکا ہوتا ہے۔ تقسیمِ ورثہ کا یہ قانون جس کامل اور مکمل صورت میں اسلام نے قائم کیا ہے وہ کسی اور جگہ نظر نہیں آتا اور اس قانون کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے جس کے بیان کرنے کی اس جگہ گنجائش نہیں، صاف محسوس ہوتا ہے کہ اِس نظامِ ورثہ میں صرف وُرثاء کو ورثہ پہنچانا ہی مدِنظر نہیں ہے بلکہ ملکی دولت کو سمونا بھی اس کا ایک بڑا مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر مرنے والے کو اپنے مال کے ایک ثُلث یعنی ایک تہائی کی وصیت کی اجازت بھی دی ہے اور یہ وصیت وُرثاء کے حق میں جائز نہیں رکھی گئی[2] گویا اِس ذریعہ سے اسلام نے ورثہ کی جبری تقسیم کے علاوہ اِس بات کا دروازہ بھی کھولا ہے کہ نیک دل لوگ اپنے اموال کو مزید مستحقین میں تقسیم کرنے کا موقع پاسکیں۔ مگر افسوس ہے کہ وصیت کے نظام سے فائدہ اُٹھانا تو درکنار آجکل کے مسلمانوں نے ورثہ کی جبری تقسیم والے حصّہ کو بھی پسِ پُشت ڈال رکھا ہے۔ اور سرمایہ داری کے خمار نے لڑکیوں اور بیویوں اور ماں باپ تک کو اُن کے جائز حق سے محروم کر دیا ہوا ہے۔ بہر حال اسلام کا قانونِ ورثہ ایک ایسا بابرکت نظام ہے کہ جس کے ذریعہ

---

[1] سورۃ النساء: ۱۲، ۱۳ ؛ [2] بخاری و مسلم ؛

تھوڑے تھوڑے وقفہ پر ملک کی دولت کے سمونے کا عمل جاری رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے یہ ہدایت بھی دی ہے کہ قومی نسل کو بڑھانے کے ذرائع اختیار کرتے رہو[1] پس جب ایک طرف نسل ترقی کرے گی اور دوسری طرف ورثہ وسیع ترین صورت میں تقسیم ہوگا تو ظاہر ہے کہ ملکی دولت خود بخود بٹتی چلی جائے گی۔ مگر ضرورت اِس بات کی ہے کہ مسلمان اِس مبارک تعلیم پر عمل کریں۔

۲۔ دوسرے نمبر پر اسلام کا قانونِ امدادِ باہمی ہے جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک جبری اور دوسرے طوعی۔ جبری قانون نظامِ زکوٰۃ سے تعلق رکھتا ہے جس کے ذریعہ امیر لوگوں کی دولت پر حالات کے اختلاف کے ساتھ اڑھائی (۲½) فی صدی شرح سے لے کر بیس فیصدی شرح تک خاص ٹیکس عائد کیا گیا ہے اور اس ٹیکس کے ذریعہ جو روپیہ حاصل ہوتا ہے وہ حکومتِ وقت یا نظامِ قومی کی نگرانی کے ماتحت غریبوں اور مسکینوں وغیرہ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس ٹیکس کی غرض وغایت ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ:۔

تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ[2]

یعنی "زکوٰۃ کے نظام کا مقصد یہ ہے کہ امیروں کے اموال کا ایک حصہ کاٹ کر غریبوں کی طرف لَوٹایا جائے۔"

اس حدیث میں "لوٹایا جائے" کے پُرحکمت الفاظ کے استعمال کرنے میں یہ لطیف اشارہ کرنا بھی مقصود ہے کہ زکوٰۃ کا ٹیکس کوئی صدقہ وخیرات نہیں ہے جو غریبوں کو بطور احسان دیا جاتا ہے بلکہ وہ امیروں کی دولت میں غریبوں کا ابدی حق ہے جو انہیں طبعی طریق پر حاصل ہے کیونکہ جیسا کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ ہر مال کے پیدا کرنے میں غریبوں اور مزدوروں کا بھی کافی دخل ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کے نظام کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ خدائے حکیم نے ایسے اموال پر زکوٰۃ کی شرح زیادہ مقرر فرمائی ہے جو تجارت کے چکر میں نہیں آتے چنانچہ بند ذخائر پر زکوٰۃ کی شرح بیس فیصدی رکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جہاں تجارت یا صنعت میں لگے ہوتے روپے میں سے غریب اور مزدور پیشہ لوگ دوسرے طریق پر بھی کچھ نہ کچھ حصہ لے لیتے ہیں وہاں جمع شدہ ذخائر میں انہیں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس لیے ذخائر میں زکوٰۃ کی شرح بہت بڑھا کر رکھی گئی ہے۔

امدادِ باہمی کے نظام کا دوسرا حصہ طوعی نظام کی صورت میں قائم کیا گیا ہے اور اس نظام کے ماتحت اسلام نے غریبوں اور بےکس لوگوں کی امداد پر اتنا زور دیا ہے کہ حق یہ ہے کہ ایک نیک اور خدا ترس انسان کے لیے یہ صورت بھی قریباً جبری نظام کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ گو ذاتی نیکی کے معیار کو بلند کرنے

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۳۲ و بخاری کتاب النکاح۔ [2] بخاری کتاب الزکوٰۃ

اور اخوت کے جذبات کو ترقی دینے کے لیے اسے قانون کی صورت نہیں دی گئی۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ ننگوں کو کو کپڑا پہنانا۔ مقروضوں کو قرض کی مصیبت سے نجات دلانا۔ بیماروں کے لیے علاج کا انتظام کرانا غریب مسافروں کو اُن کی منزلِ مقصود تک پہنچانا۔ یتیموں اور بیواؤں کو خاک آلود ہونے سے بچانا وغیرہ وغیرہ ایسی نیکیاں ہیں۔ جنکی تحریک و تحریص میں قرآن و حدیث بھرے پڑے ہیں اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی اُسوہ اس معاملہ میں یہ تھا کہ رمضان کے مہینہ میں جو غریبوں کی ضروریات کا خاص زمانہ ہوتا ہے اور اس کے بعد عید بھی آنے والی ہوتی ہے آپؐ کا ہاتھ غریبوں اور محتاجوں کی امداد میں اس طرح چلتا تھا کہ جس طرح ایک تیز آندھی چلتی ہے جو کسی روک کو خیال میں نہیں لاتی لے الغرض زکوٰۃ کے جبری نظام اور دوسرے صدقات کے طوعی نظام کے ذریعہ اسلام نے امیروں کی دولت کو کاٹ کر غریبوں کو دینے اور اس طرح مُلکی دولت کو سمونے کی ایک عظیم الشان مشینری قائم کر رکھی ہے۔

۳۔ تیسرے نمبر پر اسلام کا قانونِ تجارت ہے جس کی رو سے اسلام میں سُودی لین دین ممنوع قرار دیا گیا ہے ۔ آج دُنیا کا سمجھدار طبقہ اس بات کو محسوس کر چکا ہے کہ سُود ہی وہ چیز ہے جو ملکی دولت کے توازن کو برباد کرنے کی سب سے زیادہ ذمہ وار ہے کیونکہ اس کے ذریعہ غریبوں کا روپیہ سمٹ سمٹ کر آہستہ آہستہ امیروں کے خزانوں میں جمع ہو جاتا ہے لے اور غور کیا جائے تو دراصل سُود کی لعنت ہی سرمایہ داری کے پیدا کرنے کی بڑی موجب ہے۔ اگر آج سُود بند ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اول تو آہستہ آہستہ ملک کی بڑی بڑی تجارتیں یا تو حکومت کے ہاتھ میں چلی جائیں گی اور یا چھوٹی چھوٹی مناسب تجارتوں میں تقسیم ہو کر ملک کی دولت کو خود بخود سمو دینگی اور دوسرے امیروں کے لیے غریبوں کے پسینہ کی کمائی پر ڈاکہ ڈالنے کا موقع نہیں رہے گا۔ یہ خیال کہ سُودی نظام کے بند ہونے سے تجارت ناممکن ہو جائے گی بالکل غلط اور باطل ہے ایسا خیال صرف موجودہ ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جب کہ یورپ و امریکہ کے سرمایہ داروں کی نقالی کے نتیجہ میں سُود کا جال وسیع ہو چکا ہے۔ ورنہ جب سود نہیں تھا اُس وقت بھی دُنیا کی تجارت چلتی تھی اور انشاء اللہ آئندہ بھی چلے گی اور یہ خیال کہ اسلام میں صرف وہ سود حرام کیا گیا ہے جو بڑی شرح کے مطابق چارج کیا جائے یا جس میں سُود در سُود کا طریق اختیار کیا جائے محض نفس کا ایک دھوکہ ہے جو اس دَلدَل میں پھنس جانیکی وجہ سے کمزور لوگوں کے دل میں پیدا ہوتا ہے ورنہ اسلام نے ہر قسم کا سُود منع کیا ہے اور حق بھی یہی ہے کہ جو چیز ضرر رساں ہے وہ بہرحال ضرر رساں ہے خواہ وہ تھوڑی مقدار میں ہو یا بڑی مقدار میں۔

۴۔ چوتھے نمبر پر اسلام نے جُوئے کی قسم کی تمام آمدنیوں کو جن کی بنیاد محض اتفاق پر ہوتی ہے منع قرار دیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے بھی قوم اور مُلک کی دولت میں ناواجب تقسیم کا رستہ کھلتا ہے

لے صحیح بخاری۔ لے سورۃ البقرہ آیات ۲۷۵ تا ۲۸۱ و ترمذی ابواب البیوع

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ [1]

یعنی "اے مسلمانو! شراب اور جُوا اور بُتوں کے تھان اور تقسیم کے تیر یقیناً ایک شیطانی عمل ہیں پس تم ان سے بالکل دُور رہو تاکہ تم کامیاب و بامُراد ہوسکو"

اس آیت میں یہ اُصول بتایا گیا ہے کہ جُوا ان شیطانی اعمال میں سے ہے جو قوموں کی کامیاب زندگی کو تباہ کرنے والے ہیں اور اس کی یہی وجہ ہے کہ جُوئے میں دولت کے حصُول کو محنت اور ہنرمندی پر مبنی قرار دینے کی بجائے محض اتفاق پر مبنی قرار دیا جاتا ہے جو نہ صرف قومی اخلاق کے لیے مُہلک ہے بلکہ ملک میں دولت کی ناواجب تقسیم کا بھی ذریعہ بن جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا حکم نظر آتا ہے مگر اس سے اس لطیف نظریہ پر بھاری روشنی پڑتی ہے جو اسلام اپنے اقتصادی اور اخلاقی نظام کے متعلق قائم کرنا چاہتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی آمدنی محنت اور ہنرمندی پر مبنی ہونی چاہیئے نہ کہ اتفاقی حادثات پر۔ مَیْسِرْ کا لفظ بھی جو یُسْرٌ (یعنی سہولت اور آسانی) سے نکلا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے کہ جُوئے کی آمدنی محنت اور ہنرمندی پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ یونہی بیٹھے بٹھاتے آسانی سے مل جاتی ہے جو اسلام کے اقتصادی نظریہ کے سراسر خلاف ہے۔

اُوپر کی چار اُصولی باتیں صرف اختصار کے خیال سے بیان کی گئی ہیں ورنہ اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں دولت کے سمونے کے بہت سے ذریعے تجویز کئے ہیں اور اسلام کا منشاء یہ ہے کہ ایک طرف تو ذاتی جدوجہد کا سلسلہ جاری رہے اور ہر شخص کے لیے اپنی ذاتی محنت کے پھل کھانے کا رستہ کُھلا ہو کیونکہ دُنیا میں محنت اور ترقی کا یہی سب سے بڑا محرک ہے۔ اور دوسری طرف مُلکی دولت بھی ناواجب طور پر چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے محفوظ رہے۔ اور یہی وہ وسطی طریق ہے جس پر گامزن ہو کر مسلمان افراط و تفریط کے رستوں سے بچ سکتے ہیں۔

معذور لوگوں کی ذمہ واری حکومت پر ہے

لیکن اگر باوجود ان ذرائع کے ملک کا کوئی حصّہ بیماری یا بیکاری کی وجہ سے یا زیادہ کنبہ دار ہونے کے نتیجہ میں اپنی جائز ضروریات کو اپنی جائز آمدنی کے اندر اندر پورا نہ کرسکے تو اُس کے متعلق اسلام یہ

---

[1] سورۃ المائدۃ : ۹۱

ہدایت دیتا ہے کہ ایسے لوگوں کی اَقل ضرورت جو کھانے اور کپڑے اور مکان سے تعلق رکھتی ہے اُس کے پورا کرنے کی ذمہ واری حکومت پر ہے اور اس کا فرض ہے کہ اپنے ملکی محاصل سے ایسے لوگوں کی اَقل بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں یہی ہوتا تھا۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب عرب کے علاقہ بحرین کا رئیس مسلمان ہوا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے ہدایت بھجوائی کہ:۔

اَفْرِضْ عَلٰی کُلِّ رَجُلٍ لَیْسَ لَہٗ اَرْضٌ اَرْبَعَۃَ دَرَاھِمَ وَعَبَاءَۃً[1]

یعنی "جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے اُن میں سے ہر شخص کو ملکی خزانہ میں سے چار درہم اور لباس گذارہ کے لیے دیا جاتے۔"

اسی اُصول کی طرف یہ قرآنی آیت اشارہ کرتی ہے کہ:۔

" اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی ۰ وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی[2]"

یعنی "سچی بہشتی زندگی کی یہ علامت ہے کہ اے انسان! تُو اس میں بھوکا نہ رہے اور نہ ہی ضروری لباس سے محروم ہو اور نہ ہی سردی سے ٹھٹھرے اور نہ ہی پیاس کی تکلیف اُٹھائے اور نہ ہی دُھوپ کی شدت میں جلے۔"

پس ہر اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ اِس بات کا انتظام کرے کہ ملک و قوم کا کوئی فرد ان اَقل ضرورتوں کی وجہ سے تکلیف نہ اُٹھائے جو نسلِ انسانی کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ جہاں تک ملکی دولت کی تقسیم کا سوال ہے اسلام نے اوّل تو قانونِ ورثہ اور قانونِ زکوٰۃ اور قانونِ تجارت اور حرمت قمار کے ذریعہ ایسی مشینری قائم کردی ہے کہ اُسے اختیار کرنے کے نتیجہ میں مُلکی دولت کبھی بھی عامۃ الناس کے ہاتھ سے نکل کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جمع نہیں ہوسکتی اور اگر بعض استثنائی حادثات کی وجہ سے پھر بھی کوئی فرد یا خاندان زندگی کی اقل ضرورتوں سے محروم رہ جائے تو اس کے لیے اسلام اس بات کی ہدایت فرماتا ہے کہ امیروں کی دولت پر مزید ٹیکس لگا کر غریبوں کی ضرورت کو پورا کیا جائے کیونکہ ہر انسان کا جو زندگی کی جدوجہد میں کوتاہی نہیں کرتا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ بہرحال بھُوکا نہ رہے۔ ننگا نہ ہو اور سر چھپانے اور سردی گرمی کے بچاؤ سے محروم نہ ہونے پائے۔

اقتصادی مساوات کے متعلق ایک خاص نکتہ

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے کیوں نہ جبری طریق پر دولت کی تقسیم کو بھی مساوی کردیا یعنی جس طرح اسلام نے عدالتی معاملات میں پُوری پُوری مساوات قائم کی اور قومی اور مُلکی عہدوں کی تقسیم

---

[1] زرقانی بحوالہ ابن مندہ جلد ۳ صفحہ ۳۵۲۔ [2] سورۃ طٰہٰ: ۱۱۹، ۱۲۰

کے معاملہ میں پُوری پُوری مساوات قائم کی اور تمدّنی میل مُلاقات کے معاملہ میں برادرانہ مساوات کا رنگ قائم کیا اور سب انسانوں کو ایک باپ کے بیٹے اور سب مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا اُسی طرح اُس نے کیوں نہ دولت کو بھی سارے انسانوں میں برابر تقسیم کرنے کی سکیم جاری کی ؟ سو اِس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ ایسا کرنا ایک ظلم ہوتا اور اسلام ظلم کو مٹانے آیا ہے نہ کہ اُسے قائم کرنے۔ دولت کی اندھا دُھند مساویانہ تقسیم کے یہ معنی ہیں کہ ایک تو لوگوں کی ساری حاصل شدہ دولت اُن سے جبری طور پر چھین لی جائے اور دوسرے آئندہ ان سے دولت پیدا کرنے کی طاقت اور دولت پیدا کرنے کا حق بھی چھین لیا جائے اور یہ دونوں باتیں ظلم میں داخل ہیں۔ بیشک قومی حقوق کی خاطر انفرادی حقوق پر جائز پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں اور بیشک افراد سے یہ مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ قومی مفاد کی خاطر ضروری قربانی دکھائیں، مگر افراد کے حقوق کو کامل طور پر مٹا کر قوم کے نام پر اُن کے حقوق کو کلیتہً غصب کر لینا ظلم میں داخل ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں اگر غور کیا جائے تو اِس رستہ پر پڑنے سے صرف انفرادیت ہی نہیں مٹتی بلکہ بالآخر قومیت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہے اور اگر افراد کو دولت کمانے اور اس کا پھل کھانے کے حق سے محروم کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان سے دولت پیدا کرنے کا سب سے زبردست فطری محرک کھویا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس محرک کے کھوئے جانے سے وہ بالآخر دولت پیدا کرنے کی قوّت کو بھی ضائع کر دیں گے اور آہستہ آہستہ ان کے دماغی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو جائے گا۔ بے شک یہ خطرہ اِس وقت صرف ایک موہوم خطرہ نظر آتا ہے لیکن ہر شخص جو صحیح تدبّر کا مادہ رکھتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ ایک زمانہ کے بعد اس قسم کے قومی خطرات حقیقت بن جایا کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں دولت کی کامل طور پر مساویانہ تقسیم خود اشتراکی ممالک میں بھی نہیں پائی جاتی۔ مثلاً کیا مارشل سٹالن اور مسٹر مالوٹوو اور روس کے دوسرے صنادید اُسی قسم کا کھانا کھاتے ہیں جیسا کہ رُوس کا مزدور یا کسان کھاتا ہے۔ یا اُسی قسم کا کپڑا پہنتے ہیں جیسا کہ روس کا مزدور اور کسان پہنتا ہے۔ یا اُسی قسم کے مکانوں میں رہتے ہیں جس میں کہ روس کا مزدور یا کسان رہتا ہے۔ یا اُسی قسم کے حالات میں سفر کرتے ہیں جن میں کہ رُوس کا مزدور یا کسان سفر کرتا ہے ؟ جب نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر مساوات کہاں رہی ؟ صرف فرق یہ ہے کہ کسی نے سرمایہ داری کے رنگ میں مُلک کی دولت پر ہاتھ صاف کیا اور کسی نے اشتراکیت کا پردہ کھڑا کر کے خادمِ ملّت کے رنگ میں اپنے لیے خاص مراعات محفوظ کر لیں حالانکہ فطری اور طبعی طریق وہ ہے جو اسلام نے قائم کیا ہے یعنی انفرادی حقوق اور انفرادی جدوجہد بھی جاری رہے اور غریبوں کو اُوپر اُٹھانے اور امیروں کی دولت میں سے ایک حصّہ کاٹ کر غریبوں کی ضرورت کو پورا کرنے کا سلسلہ بھی قائم رہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ انتظام بھی قائم ہو کہ قومی اور مُلکی دولت

ناواجب طور پر چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے محفوظ رہے۔
دراصل سارا دھوکا اس بات سے لگا ہے کہ انسانی حقوق کی اقسام پر غور نہیں کیا گیا۔ انسانی حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) ایک وہ حقوق ہیں جو حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں جیسے کہ مثلاً عدل و انصاف کا قیام یا قومی عہدوں کی تقسیم وغیرہ۔ اور (۲) دوسرے وہ حقوق ہیں جو یا تو فطری اور قدرتی رنگ میں حاصل ہوتے ہیں جیسے جسمانی طاقتیں اور دماغی قویٰ وغیرہ اور یا وہ انفرادی کوشش اور انفرادی جدوجہد کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں جیسے دولت یا مکسوب علم وغیرہ۔ اسلام نے نہایت حکیمانہ طریق پر ان دونوں قسم کے حقوق میں اصولی فرق ملحوظ رکھا ہے یعنی جہاں تک اُن انسانی حقوق کا تعلق ہے جو حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں اسلام نے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کامل مساوات قائم کی ہے اور مختلف قوموں اور مختلف انسانوں میں قطعاً کوئی فرق پیدا نہیں ہونے دیا، لیکن جہاں دوسری قسم کے حقوق کا دائرہ شروع ہوتا ہے جو فطری قویٰ اور انفرادی جدوجہد سے تعلق رکھتے ہیں وہاں اسلام نے ایک مناسب حد تک دخل دے کر مختلف طبقات اور مختلف افراد کے فرق کو سمونے کی تو ضرور کوشش کی ہے لیکن ظلم و جبر کے رنگ میں سارے فرقوں کو یکسر مٹانے کا طریق اختیار نہیں کیا۔ اور حق یہ ہے کہ اس میدان میں سارے فرقوں کو مٹانا ممکن بھی نہیں ہے۔ مثلاً جسمانی طاقتوں کے فرق کو کون مٹا سکتا ہے؟ دماغی قوتوں کے فرق کو کون مٹا سکتا ہے؟ اور جب یہ فرق نہیں مٹائے جا سکتے تو ظاہر ہے کہ اِن فرقوں کے طبعی نتائج بھی نہیں مٹائے جا سکتے۔ ہاں چونکہ انسان مَدنی الاصل صورت میں پیدا کیا گیا ہے اور اس کی فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم جنس لوگوں کے ساتھ مل کر اور جہاں تک ممکن ہو اُن کے لیے قربانی کرتے ہوئے زندگی گذارے اس لیے اسلام نے یہ ضرور کیا ہے کہ انسان کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے اُس سے بعض قومی ضرورتوں کے لیے قربانیوں کا مطالبہ کیا ہے اور اس مطالبہ کو اُس انتہائی حد تک پہنچا دیا ہے جو ایک انسان کی انفرادیت کو مٹانے اور ظلم کا طریق اختیار کرنے کے بغیر اس کے اردگرد کے گرے ہوئے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اُوپر اُٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے سمجھ لینے کے بعد اسلامی مساوات اور اشتراکیت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے بشرطیکہ کوئی شخص دیانت داری کے ساتھ اسے سمجھنے کے لیے تیار ہو۔

اسلام ایک وسطی نظریہ پیش کرتا ہے

ایک اور اُصولی بات جو اسلام کے اقتصادی نظام کے متعلق یاد رکھنی چاہیئے یہ ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق اسلام یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ اس میں ہر وقت ایک جدوجہد کی کیفیت قائم رہنی چاہیئے اور درحقیقت زندگی ایک پیہم حرکت اور مسلسل جدوجہد کا ہی نام ہے اور انسان کی ساری ترقی اسی پیہم حرکت اور اسی مسلسل سعی کے ساتھ وابستہ ہے۔ پس اسلام کسی ایسے نظام کا مؤیّد نہیں ہو سکتا جس میں

انسان کو جدوجہد کے میدان سے نکل کر دوسرے کے کماتے ہوتے مال کو بیٹھے بیٹھے کھانے یا دوسرے کے سہارے پر کھڑے ہو کر زندگی گذارنے کا رستہ اختیار کرنا پڑے۔ بیشک اسلام بھی انفرادی زندگی کے لیے بعض خارجی سہارے مہیا کرتا اور ان سے واجبی فائدہ اُٹھانے کا سامان پیدا کرتا ہے مگر اس کا اصل زور اس بات پر ہے کہ ہر انسان خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور اپنے ہاتھ کی طاقت یا اپنے دماغ کی قوت سے اپنے لیے زندگی کا رستہ بناتے۔ وہ خارجی سہاروں کو ایک زائد امدادی حیثیت تو ضرور دیتا ہے مگر صرف انہی پر کامل تکیہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی لیے قرآن شریف ورثہ کے ذریعہ حاصل کئے ہوتے مالوں کو بیٹھ کر کھانے والوں کے متعلق فرماتا ہے:۔

تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۙ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۗ[1]

یعنی "تم لوگ فارغ بیٹھے ہوتے ورثہ کے مالوں کو کھانا چاہتے ہو اور خواہش رکھتے ہو کہ یہ جمع شدہ مال کبھی ختم نہ ہو۔ اور تم ذخیرہ شدہ مال و دولت سے عشق لگاتے بیٹھے ہو"

اس لطیف آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ خدائے اسلام کو ایسی زندگی پسند نہیں جو انسان کو جدوجہد اور سعی و عمل کے میدان سے نکال کر کسی خاص کھونٹے کے ساتھ باندھ دے۔ کیونکہ اس طرح آہستہ آہستہ انسان کے فطری قویٰ زنگ آلود ہو کر ضائع ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت یعنی کمیونزم دونوں انسان کو جدوجہد والی زندگی سے نکال کر دوسروں پر تکیہ کر کے بیٹھ جانے کا رستہ کھولتے ہیں۔ یعنی جہاں سرمایہ داری جمع شدہ روپے کا کھونٹا گاڑ کر اس کے ساتھ انسان کو باندھ دیتی ہے وہاں اشتراکیت یعنی کمیونزم دوسری انتہاء کی طرف لیجا کر اور حکومت کے کھونٹے کے ساتھ باندھ کر انسان کو گویا سُلانا چاہتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گو یہ انتہائیں جُدا جُدا ہیں مگر حقیقۃً سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں میں یہی اُصول چلتا ہے کہ انسان کو انفرادی جدوجہد کے میدان سے نکال کر کسی مضبوط کھونٹے کے ساتھ باندھ دیا جاتے جہاں وہ ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت محسوس کرنے کے بغیر آرام کی زندگی گذار سکے پس غور کیا جاتے تو یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں جن سے خدائے اسلام لوگوں کو بچا کر جدوجہد کے سرگرم میدان میں کھڑا رکھنا چاہتا ہے اشتراکیت کا اُصول کیا ہے؟ یہی ناکہ قوم کے سب افراد مل کر متحدہ زندگی گذاریں اور خواہ بعض افراد دوسروں سے کمزور ہوں اور بعض مضبوط ہوں اور خواہ بعض سُست ہوں اور بعض چوکس ہوں وہ گریں تو اکٹھے گریں اور کھڑے ہوں تو اکٹھے کھڑے ہوں۔ مگر غور کرو کہ کیا یہ بھی سرمایہ داری کی طرح

---

[1] سورۃ الفجر: ۲۰، ۲۱

ایک غیر طبعی سہارا نہیں جو انفرادی جدوجہد سے انسان کو غافل کرنے کا موجب ہو سکتا ہے؟ بیشک اسلام نے بھی کمزور افراد کے لیے مُلک و قوم کا سہارا مہیا کیا ہے مگر اُس نے کمال دانشمندی سے اس سہارے پر پُورا بھروسہ نہیں ہونے دیا اور انفرادی بوجھ کی اصل ذمہ واری افراد پر رکھی ہے اور زائد سہارا صرف جزوی امداد کے طور پر یا غیر معمولی حالات کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔ پس اسلام ہی وہ وسطی مذہب ہے جس نے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں انتہاؤں سے بچتے ہوئے ایک درمیانی رستہ کھولا ہے۔ وہ نہ تو جمع شدہ اموال کے ساتھ انسان کو باندھ کر اسے سرمایہ داری کے طریق پر بیکار کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی اسے اشتراکیت کے اُصول پر کلیتہً حکومت کے سہارے پر رکھ کر اس کی انفرادی جدوجہد کو کمزور کرتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ[1]

یعنی "اے مسلمانو! ہم نے تمہیں ایک وسطی اُمت بنایا ہے تاکہ تم ہر قسم کی انتہاؤں کی طرف جُھک جانے والی قوموں کے لیے خدا کی طرف سے نگران رہو۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں وسطی طریق اختیار کیا ہے اور اگر کوئی دل و دماغ رکھنے والا شخص اشتراکیت کے مقابلہ پر اسلام کے اقتصادی نظام کے متعلق منصفانہ غور کرنا چاہے تو اُس کے لیے اِس نکتہ میں بھی بھاری سبق ہے کہ گو انتہاؤں کا فرق ضرور ہے۔ یعنی سرمایہ داری ایک انتہاء پر واقع ہے اور اشتراکیت دوسری انتہاء پر مگر بہر حال اشتراکیت بھی ایک دوسری صورت میں اُسی مصیبت کو دُنیا کے سامنے پیش کرتی ہے جو اُس کے مقابل کی انتہاء یعنی سرمایہ داری نے پیش کر رکھی ہے۔ یعنی یہ دونوں نظام انسان کو جدوجہد کے میدان سے نکال کر کسی نہ کسی کھونٹے کے ساتھ باندھنا چاہتے ہیں اور یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے وسطی رستہ اختیار کر کے ایک طرف تو انسان کی انفرادی جدوجہد کو قائم رکھا ہے اور دوسری طرف خاص حالات کے پیشِ نظر نیز قوم میں اخوت اور اتحاد کی رُوح قائم رکھنے کے لیے بعض خارجی سہارے بھی مہیا کر دئے ہیں اور یہی وہ رستہ ہے جس سے انسان کا دماغ کُند اور منجمد ہونے سے بچ سکتا ہے ورنہ جو لعنت آج دُنیا کے سامنے سرمایہ داری نے پیدا کی ہے وہی کچھ عرصہ کے بعد ایک مختلف صورت میں اشتراکیت کے ذریعہ دُنیا کے سامنے آنے والی ہے۔

استثنائی حالات میں خوراک کی مساویانہ تقسیم

دولت کی تقسیم کے متعلق اِس حکیمانہ نظریہ کے باوجود جس میں عام حالات

---

[1] سورۃ البقرۃ: ۱۴۴

کے ماتحت جبری طریق کے اختیار کرنے کے بغیر دولت کو منصفانہ رنگ میں سمونے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ انفرادی جدوجہد کا محرک بھی قائم رہے اور ملکی دولت چند ہاتھوں میں جمع بھی نہ ہونے پاتے۔ اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسے خاص حالات پیدا ہوجائیں کہ کسی ملک یا قوم یا بستی کی خوراک کے ذخیرہ میں کمی آجائے یعنی ایک حصہ کے پاس تو زاید خوراک موجود ہو اور دوسرے حصہ کے پاس اُس کی اقل ضرورت سے بھی کم ہو یا بالکل ہی نہ ہو تو اس قسم کے ہنگامی حالات میں خوراک کی مساویانہ تقسیم کا جبری نظام بھی جاری کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ:۔

خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ غَزْوَةٍ فَاَصَابَنَا جُهْدٌ حَتّٰى هَمَمْنَا اَنْ نَنْحَرَ بَعْضَ ظَهْرِنَا فَاَمَرَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَمَعْنَا اَزْوَادَنَا [1]

یعنی "ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں نکلے مگر رستہ میں ہمیں خوراک کی سخت کمی پیش آگئی۔ حتیٰ کہ ہم نے ارادہ کیا کہ اپنی سواریوں کے بعض اونٹ ذبح کر دیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ سب لوگوں کے خوراک کے ذخیرے اکٹھے کر لیے جائیں پس ہم نے سب ذخیرے اکٹھے کر لیے۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے سب کو مساویانہ راشن بانٹنا شروع کر دیا۔"

پھر ایک اور روایت آتی ہے کہ:۔

بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَعْثًا قِبَلَ السَّاحِلِ وَاَمَّرَ عَلَيْهِمْ اَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ وَهُمْ ثَلَاثُ مِائَةٍ فَخَرَجْنَا وَكُنَّا بِبَعْضِ الطَّرِيْقِ فَنِيَ الزَّادُ فَاَمَرَ اَبُوْ عُبَيْدَةَ بِاَزْوَادِ الْجَيْشِ فَجُمِعَ فَكَانَ مِزْوَدَىْ تَمْرٍ فَكَانَ يَقُوْتُنَا كُلَّ يَوْمٍ قَلِيْلًا قَلِيْلًا حَتّٰى فَنِيَ فَلَمْ يَكُنْ يُصِيْبُنَا اِلَّا تَمْرَةٌ تَمْرَةٌ [2]

یعنی "آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی ایک پارٹی ساحل سمندر کی طرف روانہ کی اور اس سریہ کا امیر (اپنے مقرب صحابی) ابوعبیدہ بن جراح کو مقرر فرمایا اور یہ پارٹی تین سو صحابہ پر مشتمل تھی۔ راوی کہتا ہے کہ ہم اس سریہ میں نکلے لیکن (رستہ بھول جانے کی وجہ سے) ابھی ہم اس کے رستہ میں ہی تھے کہ ہمارا زاد کم ہونا شروع ہوگیا۔ اس پر ابوعبیدہ نے حکم دیا کہ سب لوگوں کی خوراک کا ذخیرہ جمع کر لیا جائے تو یہ سارا جمع شدہ ذخیرہ دو توشہ دان بنا۔ اس کے بعد

---

[1] مسلم باب استحباب خلط الازواد۔ [2] بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ سیف البحر

ابوعبیدہ ہمیں اس ذخیرہ میں سے تھوڑی تھوڑی خوراک تقسیم کرواتے تھے حتیٰ کہ یہ ذخیرہ اتنا کم ہوگیا کہ بالآخر ہمارا راشن صرف ایک کھجور فی کس پر آگیا۔"

اس روایت سے یہ بھاری اصول مستنبط ہوتا ہے کہ خاص ہنگامی حالات میں خوراک کے انفرادی ذخائر کو اکٹھا کرکے قومی ذخیرہ میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری روایت آتی ہے کہ:۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ الْاَشْعَرِیِّیْنَ اِذَا اَرْمَلُوْا فِی الْغَزْوِ اَوْ قَلَّ طَعَامُ عِیَالِھِمْ بِالْمَدِیْنَةِ جَمَعُوْا مَا کَانَ عِنْدَھُمْ فِیْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ ثُمَّ اقْتَسَمُوْا بَیْنَھُمْ فِیْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ بِالسَّوِیَّةِ فَھُمْ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْھُمْ[1]

یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اشعر قبیلہ کے لوگوں کا یہ طریق ہے کہ جب کسی سفر میں انہیں خوراک کا توٹا پڑجاتا ہے یا حضر کی حالت میں ہی ان کے اہل وعیال کی خوراک میں کمی آجاتی ہے تو ایسی صورت میں وہ سب لوگوں کی خوراک ایک جگہ جمع کرلیتے ہیں اور پھر اس جمع شدہ خوراک کو ایک ناپ کے مطابق سب لوگوں میں مساویانہ طریق پر بانٹ دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا میرے ساتھ حقیقی جوڑ ہے اور میرا ان کے ساتھ حقیقی جوڑ ہے۔"

یہ الفاظ جس بلند اور شاندار روح کا اظہار کررہے ہیں وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں مگر افسوس ہے کہ دنیا نے اپنے اس عظیم الشان محسن کی قدر نہیں کی۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام میں دولت کی تقسیم کے متعلق چار بنیادی اصول تسلیم کئے گئے ہیں:۔

اوّل:۔ تقسیم ورثہ اور نظام زکوٰۃ کے قیام اور سود اور جوئے کی حرمت کے ذریعہ ملکی دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے بچایا جائے۔

دوم:۔ مگر دولت پیدا کرنے کے انفرادی حق کو قائم رکھا جائے تاکہ کام کرنے کا ذاتی محرک بھی قائم رہے اور افراد کے دماغ منجمد نہ ہونے پائیں۔

سوم:۔ جو لوگ باوجود اِن ذرائع کے کسی خاص معذوری کی وجہ سے اپنی اقل ضروریات کا سامان بھی پیدا نہ کرسکیں اُن کی ضروریات کے پورا کرنے کا حکومت انتظام کرے۔

چہارم:۔ خاص ہنگامی حالت میں جب کہ خوراک کی خطرناک قلت پیدا ہوجائے۔ تمام انفرادی

---

[1] بخاری باب الشرکۃ فی الطعام

ذخیروں کو جمع کر کے ایک مرکزی قومی ذخیرہ قائم کر لیا جائے تاکہ سب لوگوں کو اقل خوراک کا مساویانہ راشن ملتا رہے اور یہ نہ ہو کہ ملک کا ایک حصہ تو عیش اُڑائے اور دوسرا قوت لایموت سے بھی محروم ہو۔

دینی اور رُوحانی امور میں مساوات

اِس کے بعد ہم اُس مساوات کی بحث کو لیتے ہیں جو دینی اور رُوحانی اُمور سے تعلق رکھتی ہے سو جاننا چاہیئے کہ گو لامذہب لوگوں اور دُنیا داروں کو اِس میدان کی اہمیت پر اطلاع نہ ہو مگر قُربِ الٰہی کی تڑپ رکھنے والوں اور نجاتِ اُخروی کے متلاشیوں کے نزدیک یہ میدان دُنیا کی زندگی سے بھی بہت زیادہ اہم اور بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے اور الحمد للہ کہ اس میدان میں بھی اسلامی تعلیم نے صحیح مساوات کے ترازو کو پوری طرح برابر رکھا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاں دوسرے مذاہب یہ تعلیم دیتے ہیں کہ خدا کے کلام کا نزول اور اُس کے نبیوں اور رسولوں کا ظہور صرف خاص خاص قوموں کے ساتھ ہی مخصوص رہا ہے اور دنیا کی دوسری قومیں اس عظیم الشان رُوحانی نعمت سے کلّی طور پر محروم رہی ہیں مثلاً یہودی لوگ اپنے سوا کسی دوسری قوم کو اِس رُوحانی انعام کا حقدار نہیں سمجھتے اور اسی طرح ہندو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا کلام صرف آریہ ورت تک محدود رہا ہے اور کسی دوسرے ملک اور دوسری قوم نے اس سے حصہ نہیں پایا اور عملاً عیسائی قوم بھی بنی اسرائیل کے باہر کسی نبی اور رسول وغیرہ کی قائل نہیں۔ الغرض جہاں دُنیا کی ہر قوم اس رُوحانی نعمت کو صرف اپنے آپ تک محدود قرار دے رہی ہے اور کسی دوسری قوم کو اس کا حقدار نہیں سمجھتی وہاں اسلام ببانگ بلند یہ تعلیم دیتا ہے کہ جس طرح خدا نے اپنی مادی نعمتوں کو ہر قوم اور ہر ملک پر وسیع کر رکھا ہے اور کسی ایک قوم یا ایک ملک کے ساتھ مخصوص نہیں کیا مثلاً اُس کا سُورج ساری دُنیا کو روشنی پہنچاتا ہے۔ اُس کی ہَوا سارے کُرۂ ارض کو یکساں گھیرے ہوئے ہے۔ اُس کا پانی ساری دنیا کو سیراب کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح خدا نے اپنی رُوحانی نعمتوں کو بھی کسی خاص قوم یا خاص ملک تک محدود نہیں کیا بلکہ ہر قوم اور ہر ملک کو اس سے حصہ دیا ہے۔ کیونکہ اسلام کی تعلیم کے مطابق دُنیا کا خُدا کسی خاص قوم یا خاص ملک کا خدا نہیں بلکہ ساری دُنیا اور ساری قوموں کا خدا ہے اور وہ ایک ایسا مُقسِط اور عادل حکمران ہے کہ سب مخلوق کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ [1]

یعنی "دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گذری جس کی طرف خدا نے اپنی طرف سے کوئی رسول نہ بھیجا ہو تاکہ وہ انہیں ہوشیار کر کے نیکی بدی کا رستہ دکھا دے اور ترقی کی راہیں بتاوے"۔

---

[1] سورۃ فاطر: ۲۵

یہ الفاظ کیسے مختصر ہیں مگر غور کرو تو ان کے اندر روحانی اور دینی مساوات کا ایک عظیم الشان فلسفہ مخفی ہے جس نے دُنیا کی ساری قوموں کو خدا کی توجہ کا یکساں حقدار قرار دیکر ایک لیول پر کھڑا کر دیا ہے اور اس خیال کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا ہے کہ خدا صرف بنی اسرائیل کا خدا یا صرف آریہ ورت کا خدا ہے اور دوسری قوموں کے لیے اُس کی محبت اور انصاف کی آنکھ بالکل بند ہے۔ الغرض اسلام نے رُوحانی مساوات کے میدان میں پہلا اصول یہ قائم کیا ہے کہ کلامِ الٰہی اور نبوت و رسالت کا وجود کسی خاص قوم یا خاص ملک کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اپنے اپنے وقت میں ہر قوم اس عظیم الشان رُوحانی انعام سے حصّہ پاتی رہی ہے۔ کیونکہ ہر قوم خدا کی پیدا کردہ ہے اور خدا سے یہ بعید ہے کہ ایک ظالم باپ کی طرح اپنے ایک بیٹے کو حصّہ دے اور دوسرے کو ہمیشہ کے لیے محروم کر دے۔

اسی ضمن میں نجات اور قربِ الٰہی کے حصول کا سوال آتا ہے۔ اکثر قوموں نے دُنیوی اور اُخروی اُمور میں بھی گویا ایک اجارہ داری کا رنگ اختیار کر رکھا ہے اور ایک خاص نسلی طبقہ کو خدا کا مقرب اور نجات کا مستحق قرار دیکر باقی سب کو عملاً محجوب اور ملعون گردانا ہے جسے کبھی بھی نجات اور قربِ الٰہی کی ٹھنڈی ہُوا نہیں پہنچ سکتی۔ مثلاً یہودی لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صرف ایک اسرائیلی نسل کا انسان ہی نجات کا مستحق ہے اور باقی سب لوگ خواہ وہ کیسے ہی نیک ہوں جہنّم کا ایندھن ہیں۔ اسی طرح عیسائیوں نے گو نسلی رنگ میں نجات کو محدود نہیں کیا[1] مگر بہت سے دینی حقوق و فرائض کو ایک خاص گروہ کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے جسے پریسیٹ ہُڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے چنانچہ عیسائیوں کے متعدد دینی اُمور بلکہ بعض تمدنی امور بھی ایک پریسیٹ کی وساطت کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بعض دینی حقوق کو صرف برہمن کا ورثہ قرار دیا گیا ہے اور دوسرے لوگ اس سے محروم ہیں۔ گویا ان قوموں نے نہ صرف دوسری اقوام کو نجس اور پلید قرار دیکر دھتکار دیا ہے۔ بلکہ خود اپنے اندر بھی دینی اور مذہبی امور میں ناگوار طبقات کا وجود تسلیم کرکے خدائی انعامات کو بعض خاص طبقوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے مگر اسلام کا دامن اِن سب ناپاک جنبہ داریوں کے داغ سے پاک ہے بلکہ جس طرح اس نے دُنیوی حقوق میں پوری پوری مساوات قائم کی ہے اسی طرح اُس نے دینی اُمور میں بھی انصاف اور مساوات کے ترازو کو کسی طرف جھکنے نہیں دیا چنانچہ اس بارے میں ایک اصولی قرآنی آیت اوپر کی بحث میں گزر چکی ہے جو یہ ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ[2]

---

[1] یہ صرف موجودالوقت عیسائیوں کا حال ہے ورنہ خود حضرت مسیح نے تو غیر اسرائیلی اقوام کو کُتے کہہ کر دھتکار دیا ہے۔ مثلاً دیکھئے مرقس باب ۱۵ آیت ۲۴ تا ۲۷۔

[2] سورۃ الحجرات ۱۴:۱

یعنی "اے لوگو سُن رکھو کہ تم میں سے خُدا کے نزدیک زیادہ معزّز اور زیادہ مقرب وہ شخص ہے جو زیادہ متقی اور زیادہ نیک اور زیادہ صالح ہے۔"

اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قُربِ الٰہی کے حصول کے معاملہ میں کسی قوم یا کسی طبقہ کی خصوصیت نہیں بلکہ سب گورے کالے، بڑے چھوٹے، طاقتور کمزور، مرد عورت خُدا کا قُرب حاصل کرنے کے معاملہ میں برابر ہیں اور آگے آنے کے لیے صرف ذاتی تقویٰ اور ذاتی نیکی کی ضرورت ہے۔ ان مختصر الفاظ میں خدا تعالیٰ نے یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ جب ہم بادشاہوں کے بادشاہ ہو کر سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنا قُرب عطا کرنے میں ذاتی تقویٰ و طہارت کے سوا کسی اور بات کا خیال نہیں کرتے تو پھر دوسروں کو تو بدرجہ اَولیٰ یہ چاہیئے کہ ذاتی اوصاف کے سوا کسی اَور بات پر اپنے انتخاب کی بُنیاد نہ رکھا کریں۔

پھر دینی اُمور میں جزا و سزا اور انعام و الزام کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝[1]

یعنی "جو شخص بھی خواہ وہ کوئی ہو ایک ذرہ بھر بھی نیکی کرتا ہے وہ ہم سے اس کا اجر پائے گا (اور اس کا کسی خاص طبقہ سے تعلق رکھنا اسے نیک عمل کے پھل سے محروم نہیں کر سکتا) اور اسی طرح جو شخص بھی کوئی بدی کرتا ہے وہ اس کا خمیازہ بھگتے گا (اور اس کا کسی خاص طبقہ سے تعلق رکھنا اُسے اُس کی بدی کے نتیجہ سے بچا نہیں سکتا۔)"

پھر فرماتا ہے:۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝[2]

یعنی "یہودی اور عیسائی لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی شخص یہود یا نصاریٰ کے سوا جنت میں نہیں جا سکتا۔ یہ ان لوگوں کی محض خام خیالی ہے اور ایک ہوس سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ تو انہیں کہدے کہ اگر تم اِس دعویٰ میں سچے ہو تو کوئی دلیل لاؤ۔ ہاں بے شک جس شخص نے اپنے تئیں خدا کے سُپرد کر دیا یعنی اُس پر سچا ایمان لایا اور پھر نیک عمل کئے تو وہ خواہ

---

[1] سورۃ الزلزال: ۸، ۹۔ [2] سورۃ البقرۃ: ۱۱۲، ۱۱۳

کوئی ہو خُدا سے اپنا اجر پائے گا اور ایسے لوگوں پر خدا کے حضور کوئی خوف و حُزن نہیں آئیگا۔
اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نجات پانے اور قُربِ الٰہی کے حصول کے لیے صرف قومی یا رسمی رنگ میں یہودی یا عیسائی یا کسی اَور مذہب کی طرف منسوب ہونا ہرگز کافی نہیں بلکہ نجات اور قُربِ الٰہی کے لیے سچّا ایمان اور عملِ صالح ضروری ہے پس جو شخص بھی یہ دو باتیں یعنی سچّا ایمان اور عملِ صالح اپنے اندر پیدا کرتا ہے تو پھر خواہ وہ قومی یا نسلی رنگ میں کوئی ہو وہ خدا کی طرف سے ثواب اور انعام کا مستحق ہوگا۔ یہ آیت ضمناً مسلمانوں کو بھی ہوشیار کرتی ہے کہ وہ محض مسلمان کہلانے پر تسلّی نہ پائیں کیونکہ خدا تعالیٰ کو خالی ناموں سے سروکار نہیں بلکہ اُس کی نظر حقیقت پر ہے۔
پھر دینی فرائض کی ادائیگی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَئُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ كَانُوْا فِی الْقِرَاْءَةِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ كَانُوْا بِالسُّنَّةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَاِنْ كَانُوْا فِی الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَاَكْبَرُهُمْ سِنًّا[1] وَفِیْ رِوَايَةٍ فَلْيَؤُمُّهُمْ اَحَدُهُمْ وَاَحَقُّهُمْ بِالْاِمَامَةِ اَقْرَئُهُمْ[2]

یعنی" اے مسلمانو! جب تم آپس میں فریضۂ نماز کی ادائیگی کے لیے اکٹھے ہو (جو اسلام میں سب سے اہم اور سب سے وسیع تر عبادت ہے) تو اُس وقت اپنا امام بنانے کے لیے صرف یہ دیکھا کرو کہ تم میں سے قرآن کا علم کس شخص کو زیادہ حاصل ہے۔ پس جو شخص بھی قرآنی علم میں زیادہ ہو اُسے نماز میں اپنا امام بنا لیا کرو اور اگر چند آدمی علمِ قرآن میں برابر ہوں تو پھر اُن میں سے جو شخص سُنّتِ رسولؐ کے علم میں زیادہ ہو اُسے امام بنایا کرو۔ اور اگر چند آدمی سُنّت کے علم میں بھی برابر ہوں تو پھر اُن میں سے جس شخص نے خدا کی راہ میں پہلے ہجرت کی ہو اُسے امام بنایا کرو۔ اور اگر وہ ہجرت میں بھی برابر ہوں تو پھر جو شخص عمر میں زیادہ ہو اُسے اپنا امام بنا لیا کرو۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ نمازوں میں مسلمانوں کا امام ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو اُن میں سے ہے اور کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں مگر امامت کا زیادہ حقدار وہ شخص ہے جو دین کا زیادہ علم رکھتا ہے۔"

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین و دُنیا کے ہر میدان میں حقیقی مساوات قائم فرمائی ہے، اور سوسائٹی کی ہر ناواجب کش مکش کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا ہے اور جسم اور رُوح دونوں کی اصلاح کی ہے اور یہ وہ مساوات ہے جس کی نظیر یقیناً کسی دوسرے مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی

---

[1] ترمذی کتاب الصلوٰۃ۔ [2] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ

مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ ۔مساواتِ اسلامی کے متعلق یہ نوٹ سُپردِ قلم کرنے کے بعد ہم پھر اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

سریہ دومۃ الجندل

شعبان ۶ ہجری مطابق دسمبر ۶۲۷ء

اب بڑی سرعت کے ساتھ اسلامی اثر کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا اور عرب کے دُور دراز کناروں میں بھی اسلام کی تبلیغ پہنچ رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ دُور کے علاقوں میں مخالفت بھی بڑھ رہی تھی اور جو لوگ اسلام کی طرف مائل ہوتے تھے انہیں اپنے ہم قبیلہ لوگوں کی طرف سے سخت مظالم سہنے پڑتے تھے اور ان مظالم سے ڈر کر بہت سے کمزور طبع لوگ اسلام کے اظہار سے رُکے رہتے تھے۔ اس لیے اب جنگی مہموں کی اغراض میں اس غرض کا اضافہ ہو گیا کہ ایسے قبائل کی طرف فوجی دستے روانہ کئے جائیں جن میں بعض لوگ دل میں اسلام کی طرف مائل تھے مگر مظالم کے ڈر کی وجہ سے وہ اسلام کو قبول کرنے سے رُکتے تھے۔ گویا ان دستوں کے بھجوانے کی غرض مذہبی آزادی کا قیام تھی جس پر اسلام خاص طور پر زور دیتا ہے[1]

اس غرض وغایت کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہِ شعبان ۶ ہجری میں ایک فوجی دستہ عبدالرحمن بن عوف کی کمان میں دُومۃ[2] الجندل کے دور دراز مقام کی طرف روانہ فرمایا[3] ناظرین کو یاد ہوگا کہ اسی جگہ کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ۵ ہجری میں قیامِ امن کی غرض سے تشریف لے گئے تھے اور اس طرح یہ علاقہ آج سے دو سال قبل اسلامی دائرۂ اثر میں داخل ہو چکا تھا اور وہاں کے باشندے اسلامی تعلیم سے غیر مانوس نہیں رہے تھے بلکہ غالباً ان میں سے ایک حصّہ اسلام کی طرف مائل تھا مگر اپنے رؤساء اور اہلِ قبیلہ کی مخالفت کی وجہ سے جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال آپؐ نے ہجری کے چھٹے سال میں ایک بڑا فوجی دستہ عبدالرحمن بن عوف کی امارت میں جو کبار صحابہ میں سے تھے دومۃ الجندل کی طرف روانہ فرمایا۔

اس سریہ کی تیاری اور روانگی کے متعلق ابن اسحاق نے عبداللہ ابن عمر سے یہ دلچسپ روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ جب ہم چند لوگ جن میں حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور عبدالرحمن بن عوف بھی شامل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے، ایک انصاری نوجوان نے حاضر ہو کر آپؐ سے دریافت کیا کہ "یارسول اللہ! مومنوں میں سے سب سے افضل کون ہے؟" آپؐ نے فرمایا۔ "وہ جو اخلاق میں سب سے افضل ہے۔" اُس نے کہا "اور یارسول اللہ! سب سے زیادہ متقی کون ہے؟" آپؐ نے فرمایا "وہ جو موت کو زیادہ یاد رکھتا اور اُس کے لیے وقت سے پہلے تیاری کرتا ہے۔"

---

[1] سورۃ الانفال: ۴۰ ۔ [2] یہ لفظ دال کی زبر سے بھی بولا جاتا ہے۔ [3] ابن سعد

اس پر وہ انصاری نوجوان خاموش ہوگیا اور آپؐ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا" اے مہاجرین کے گروہ! پانچ بدیاں ایسی ہیں جن کے متعلق مَیں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ کبھی میری اُمت میں پیدا ہوں کیونکہ وہ جس قوم میں رونما ہوتی ہیں اُسے تباہ کر کے چھوڑتی ہیں۔

اوّل۔ یہ کہ کبھی کسی قوم میں فاحشہ اور بدکاری نہیں پھیلی۔ اِس حد تک کہ وہ اسے برملا کرنے لگ جائیں کہ اُس کے نتیجہ میں ایسی بیماریاں اور وبائیں نہ ظاہر ہونی شروع ہوگئی ہوں جو اُن سے پہلے لوگوں میں نہیں تھیں۔

دوم۔ کبھی کسی قوم میں تول اور ناپ میں بد دیانتی کرنے کی بدی نہیں پیدا ہوئی کہ اُس کے نتیجہ میں اُس قوم پر قحط اور محنت اور شدت اور حاکمِ وقت کے ظلم و ستم کی مصیبت نازل نہ ہوئی ہو۔

سوم کبھی کسی قوم نے زکوٰۃ اور صدقات کی ادائیگی میں سُستی و غفلت نہیں اختیار کی کہ اُس کے نتیجہ میں اُن پر بارشوں کی کمی نہ ہوگئی ہو۔ حتیٰ کہ اگر خدا کو اپنے پیدا کردہ جانوروں اور مویشیوں کا خیال نہ ہو تو ایسی قوم پر بارشوں کا سلسلہ بالکل ہی بند ہو جائے۔

چہارم کبھی کسی قوم نے خدا اور اُس کے رسول کے عہد کو نہیں توڑا کہ اُن پر کوئی غیر قوم اُنکے دشمنوں میں سے مسلّط نہ کر دی گئی ہو جو اُن کے حقوق کو غصب کرنے لگ جائے۔

پنجم کبھی کسی قوم کے علماء اور ائمہ نے خلافِ شریعت فتوے دے دیکر شریعت کو اپنے مطلب کے مطابق نہیں بگاڑنا چاہا کہ اُن کے درمیان اندرونی لڑائی اور جھگڑوں کا سلسلہ شروع نہ ہوگیا ہو"۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ زرّیں تقریر قوموں کی ترقی و تنزّل کے اسباب پر بہترین تبصرہ ہے اور اگر مسلمان چاہیں تو اُن کے لیے موجودہ زمانہ میں بھی یہ ایک بہترین سبق ہے۔

اس کے بعد آپؐ اپنے مقرب صحابی عبدالرحمٰن بن عوف سے مخاطب ہوئے اور فرمایا "ابن عوف! مَیں تمہیں ایک سریہ پر امیر بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں تم تیار رہو"۔ چنانچہ دوسرے دن صبح کے وقت عبدالرحمٰن بن عوف آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے اُن کے سر پر اُنہی کا عمامہ لیکر باندھا اور بلالؓ کو حکم دیا کہ ایک جھنڈا اُن کے سپرد کر دیا جائے اور پھر آپؐ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ماتحت صحابہ کا ایک دستہ متعین کر کے اُن سے فرمایا:۔

خُذْهُ يَا ابْنَ عَوْفٍ فَاغْزُوْا جَمِيْعاً فِي سَبِيْلِ اللهِ فَقَاتِلُوْا مَنْ كَفَرَ بِاللهِ وَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تُمَثِّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا

---

[1] ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸۸ حالات سریہ دومۃ الجندل

وَلِيدًا۔ فَهٰذَا عَهْدُ اللّٰهِ وَسِيرَةُ نَبِيِّهٖ فِيكُمْ[1]

یعنی "اے ابن عوف اِس جھنڈے کو لے لو اور پھر تم سب خدا کے رستہ میں جہاد کے لیے نکل جاؤ اور کفار کے ساتھ لڑو مگر دیکھنا کوئی بد دیانتی نہ کرنا اور نہ کوئی عہد شکنی کرنا اور نہ دشمن کے مُردوں کے جسموں کو بگاڑنا اور نہ بچوں کو قتل کرنا۔ یہ خدا کا حکم ہے اور اُس کے نبی کی سُنّت ہے"

اِس روایت میں غالباً راوی نے سہواً عورتوں کا ذکر چھوڑ دیا ہے ورنہ دوسری جگہ صراحت آتی ہے کہ آپؐ جب کوئی دستہ بھجواتے تھے تو یہ بھی تاکید فرماتے تھے کہ عورتوں کو قتل نہ کرنا اور نہ بُوڑھے پیر فرتوت لوگوں کو قتل کرنا اور نہ ایسے لوگوں کو قتل کرنا جن کی زندگی مذہبی خدمت کے لیے وقف ہو۔[2] اِس کے بعد آپؐ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو ہدایت فرمائی کہ وہ دومۃ الجندل کی طرف جائیں اور کوشش کریں کہ صُلح صفائی سے فیصلہ ہو جائے۔ کیونکہ اگر وہ لوگ جنگ وجدال سے دستکش ہو کر اطاعت قبول کرلیں تو یہ سب سے اچھی بات ہے۔ اور آپؐ نے عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا کہ اِس صورت میں مناسب ہوگا کہ تم اُن لوگوں کے رئیس کی لڑکی سے شادی کر لو۔[3]

اِس کے بعد آپؐ نے اس سریہ کو رخصت فرمایا اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سات سَو صحابیوں کو ساتھ لے کر دومۃ الجندل کی طرف جو عرب کے شمال میں تبوک سے شمال مشرق کی طرف شام کی سرحد کے قریب واقع ہے، روانہ ہو گئے۔ جب یہ اسلامی لشکر دومہ میں پہنچا تو شروع شروع میں تو دومہ کے لوگ جنگ کے لیے تیار نظر آتے تھے اور مسلمانوں کو تلوار کی دھمکی دیتے تھے[4] مگر آہستہ آہستہ عبدالرحمٰن بن عوف کے سمجھانے پر وہ اِس ارادے سے باز آگئے اور چند دن کے بعد اُن کے رئیس اَصبغ بن عمر کلبی نے جو عیسائی تھا عبدالرحمٰن بن عوف کی تبلیغ سے بطیبِ خاطر اسلام قبول کر لیا اور اُس کے ساتھ اُس کی قوم میں سے بھی بہت سے لوگ جو غالباً پہلے سے دل میں اسلام کی طرف مائل ہو چکے تھے مسلمان ہو گئے اور جو لوگ اپنے دین پر قائم رہے انہوں نے بھی بشرحِ صدر اسلامی حکومت کے ماتحت آجانا منظور کر لیا۔[5] اس طرح بڑی خیر وخوبی کے ساتھ یہ مہم اختتام کو پہنچی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق عبدالرحمٰن بن عوف دومۃ الجندل کے رئیس اَصبغ بن عمر کی لڑکی تماضر کے ساتھ شادی کر کے مدینہ میں واپس لَوٹ آئے۔ اور خدا کے فضل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ

---

[1] ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸۸، ۸۹ ۔ [2] مسلم وموطا وابوداؤد وطحاوی جن کا حوالہ سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم حصہ دوم میں گذر چکا ہے۔ [3] ابن سعد۔ [4] دارقطنی بحوالہ زرقانی حالات سریہ دومۃ الجندل

[5] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۴، ۶۵

کی برکت سے عبدالرحمٰن بن عوف کے ہاں اِسی تماضر کے بطن سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہوا جو خاص فدائیان اسلام میں سے نکلا اور علم وفضل کے اِس مرتبہ کو پہنچا کہ وہ اپنے وقت میں اسلام کے چوٹی کے علماء میں سے سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نام ابوسلمہ زہری تھا۔[۱]

سریہ حضرت علیؓ بطرف فدک شعبان ۶ھ

مدینہ میں یہودی قوم پر اُن کی اپنی غداریوں اور فتنہ انگیزیوں کی وجہ سے جو تباہی آئی تھی وہ تمام عرب کے یہودیوں کے دل میں ایک کانٹا بنکر کھٹک رہی تھی اور غزوہ بنوقریظہ کے بعد سے جب کہ مدینہ میں یہود کا خاتمہ ہوگیا۔ خیبر کی بستی جو حجاز کے یہودیوں کا سب سے بڑا مرکز تھی اسلام کے خلاف خفیہ سازشوں کا اڈہ بن گئی تھی اور اِس جگہ کے یہودی جو عادۃً سخت کینہ وَر اور حاسد وظالم واقع ہوئے تھے اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے کی کوشش میں سرگرم رہتے تھے۔ چنانچہ بالآخر یہی حالات جنگِ خیبر کا باعث بن گئے جو ۷ھ کے ابتداء میں وقوع میں آئی اور جس کے نتیجہ میں خیبر کا علاقہ اسلامی حکومت میں شامل ہوگیا۔ اب جس واقعہ کا ہم ذکر کرنے لگے ہیں وہ بھی اسی سلسلہ میں منسلک ہے۔

شعبان ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قبیلہ بنوسعد بن بکر اور خیبر کے یہودیوں میں مسلمانوں کے خلاف باہم سرگوشیاں ہورہی ہیں اور یہ کہ بنوسعد اہلِ خیبر کی اعانت میں اپنی طاقتوں کو جمع کررہے ہیں۔[۲] اِس اطلاع کے ملتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی کمان میں صحابہ کا ایک دستہ روانہ فرمایا جو دن کو چھپتے اور رات کو سفر کرتے ہوئے فدک کے پاس پہنچ گئے جس کے قریب یہ لوگ جمع ہورہے تھے۔ یہاں مسلمانوں کو ایک بدوی شخص ملا جو بنوسعد کا جاسوس تھا۔ حضرت علیؓ نے اُسے پکڑ کر قید کرلیا اور اُس سے بنوسعد اور اہلِ خیبر کے حالات دریافت کئے۔ پہلے تو اُس نے بالکل لاعلمی اور بے تعلقی کا اظہار کیا مگر آخر وعدہ معافی لے کر اُس نے سارا راز کھول دیا اور پھر مسلمان لوگ اُس شخص کو اپنا گائیڈ بنا کر اُس جگہ کی طرف بڑھے۔ جہاں بنوسعد جمع ہورہے تھے اور اچانک حملہ کردیا۔ اس اچانک حملہ کی وجہ سے بنوسعد گھبرا کر میدان سے بھاگ نکلے اور حضرت علیؓ مالِ غنیمت لے کر مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے اور اس طرح یہ خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا۔[۳]

سریہ حضرت ابوبکرؓ بطرف بنوفزارہ

اِس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کا ایک دستہ حضرت ابوبکرؓ کی کمان میں بنوفزارہ کی

---

[۱] زرقانی حالات سریہ دومۃ الجندل۔ [۲] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۵

[۳] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۵ و زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۶۲

طرف روانہ فرمایا۔ یہ قبیلہ اس وقت مسلمانوں کے خلاف برسرِپیکار تھا اور اس دستہ میں سلمہؓ بن اکوع بھی شامل
ہوئے جو مشہور تیرانداز اور دوڑنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ سلمہؓ بن اکوع بیان کرتے ہیں کہ ہم صبح
کی نماز کے قریب اِس قبیلہ کی قرارگاہ کے پاس پہنچے اور جب ہم نماز سے فارغ ہوتے تو حضرت ابوبکرؓ
نے ہمیں حملہ کا حکم دیا۔ ہم قبیلہ فزارہ سے لڑتے ہوتے اُن کے چشمہ تک جا پہنچے اور مشرکین کے کئی
آدمی مارے گئے جس کے بعد وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ہم نے کئی آدمی قید کر لئے۔ سلمہؓ روایت
کرتے ہیں کہ بھاگنے والے لوگوں میں ایک پارٹی بچوں اور عورتوں کی تھی جو جلدی جلدی ایک قریب کی
پہاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اُن کے اور پہاڑی کے درمیان تیر پھینکنے شروع کئے جس پر یہ
پارٹی خائف ہو کر کھڑی ہوگئی اور ہم نے اُنہیں قید کر لیا۔ اِن قیدیوں میں ایک عمر رسیدہ عورت بھی تھی جس
نے اپنے اُوپر سُرخ چمڑے کی چادر اوڑھ رکھی تھی اور اُس کی ایک خوبصورت لڑکی بھی اُس کے ساتھ تھی۔ میں
اِن سب کو گھیر کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس لے آیا اور آپ نے یہ لڑکی میری نگرانی میں دیدی۔ پھر جب ہم مدینہ میں
آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے یہ لڑکی لے لی اور اُسے مکہ بھجوا کر اُس کے عوض میں بعض اُن
مسلمان قیدیوں کی رہائی حاصل کی جو اہلِ مکہ کے پاس محبوس تھے[1]

اُمِّ قِرفہ کے قتل کا غلط واقعہ

سریہ حضرت ابوبکرؓ کی جگہ جس کا ذکر اُوپر گذر چکا ہے
ابنِ سعد نے ایک ایسے سریہ کا ذکر کیا ہے جس میں
زید بن حارثہ امیر تھے۔ یعنی ابن سعد اس سریہ میں حضرت ابوبکرؓ کی بجائے زید بن حارثہ کو امیر بیان کرتا ہے
اور تفاصیل میں بھی کسی قدر اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ مہم بنو فزارہ کی گوشمالی کے لیے تھی جو
وادیٔ قریٰ کے پاس آباد تھے اور جنہوں نے مسلمانوں کے ایک تجارتی قافلہ پر چھاپہ مار کر اس کا سارا
مال واسباب چھین لیا تھا۔ اس مفسد گروہ کی رُوحِ رواں ایک بڑھی عورت تھی جس کا نام اُمِّ قِرفہ تھا جو
اسلام کی سخت دشمن تھی۔ جب یہ عورت اس لڑائی میں پکڑی گئی تو زید کی پارٹی کے ایک شخص قیس نامی نے
اُس عورت کو قتل کر دیا۔ اور ابن سعد اِس قتل کا قصہ یوں بیان کرتا ہے کہ اُس کے دونوں پاؤں دو مختلف
اونٹوں کے ساتھ باندھ دیئے گئے اور پھر اِن اونٹوں کو مختلف جہات میں ہنکایا گیا جس کے نتیجہ میں
یہ عورت درمیان میں سے چِر کر دو ٹکڑے ہوگئی۔ اور اس کے بعد اس عورت کی لڑکی سلمہ بن اکوع کے
سپرد کر دی گئی[2] یہی قصہ کسی قدر اختصار اور اجمال اور اختلاف کے ساتھ ابن اسحاق نے بھی بیان
کیا ہے[3]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب التنفیل و سُنن ابو داؤد بروایت زرقانی حالات سریہ زید الیٰ اُمِّ قرفہ۔

[2] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۵ ۔ [3] ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸۳

اِس روایت کی بنا پر سر ولیم میور نے جو دوسرے یورپین مؤرخین کی نسبت زیادہ تفصیل دینے کا عادی ہے اس واقعہ کو مسلمانوں کی "وحشیانہ رُوح" کی مثال میں بڑے شوق سے اپنی کتاب کی زینت بنایا ہے بلکہ سر ولیم نے اسے اپنی کتاب میں درج کرنے کی وجہ ہی یہ لکھی ہے کہ اس مہم میں مسلمان ایک ظالمانہ فعل کے مرتکب ہوتے تھے۔ چنانچہ میور صاحب لکھتے ہیں :۔

"اِس سال مسلمانوں کو بہت سی مہموں میں مدینہ سے نکلنا پڑا مگر یہ سب قابلِ ذکر نہیں ہیں البتہ میں اِن میں سے ایک مہم کے ذکر سے رُک نہیں سکتا کیونکہ اس کا انجام مسلمانوں کی طرف سے ایک نہایت ظالمانہ فعل پر ہوا تھا۔"[1]

جو مؤرخ ایک واقعہ کو دوسرے واقعات پر محض اِس وجہ سے ترجیح دیکر اُسے اپنی کتاب کی زینت بناتا ہے کہ اس میں کسی قوم کے ظلم وستم کا ثبوت ملتا ہے وہ درحقیقت ایک غیر جانبدار محقق کہلانے کا حقدار نہیں ہے کیونکہ اس سے کبھی بھی یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ اس بات کی تحقیق کی طرف توجہ کریگا کہ آیا یہ ظلم وستم کا واقعہ کوئی اصلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں کیونکہ ایسا کرنے میں اس کے ہاتھ سے اس کی ایک دلیل نکل جاتی ہے۔ بہرحال میور صاحب نے اس واقعہ کو خاص شوق کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے مگر جیسا کہ ابھی ظاہر ہوجائے گا یہ واقعہ بالکل غلط اور قطعاً بے بنیاد ہے اور نقل اور عقل ہر دو طرح سے اس کا بناوٹی ہونا ثابت ہے۔

عقلی طریق پر تو یہ جاننا چاہیئے کہ ایک عورت کو جس پر قتل کا الزام نہیں ہے قید کرکے ٹھنڈے لمحات میں قتل کرنا اور پھر قتل بھی اِس طریق پر کرنا جو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے یہ تو ایک بہت دُور کی بات ہے اِسلام تو عین جنگ کے میدان میں بھی عورت کے قتل کو سختی کے ساتھ روکتا ہے اور ہم جہاد کی اُصولی بحث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان درج کرچکے ہیں جو آپؐ نے عورتوں کے قتل کو ممنوع فرماتے ہوئے جاری فرمایا تھا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک موقع پر میدانِ جنگ میں کسی دشمن قبیلہ کی ایک عورت مقتول پائی گئی تو باوجود اس کے کہ یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت کن حالات میں اور کس کے ہاتھ سے قتل ہوئی ہے آپؐ اسے دیکھ کر بہت ناراض ہوتے اور صحابہ سے تاکیداً فرمایا کہ ایسا کام آئندہ نہیں ہونا چاہیئے[2] اسی طرح یہ ذکر بھی اُوپر گذر چکا ہے کہ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی دستہ روانہ فرماتے تھے تو منجملہ اور نصیحتوں کے صحابہ سے ایک نصیحت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ کسی عورت اور بچے کو قتل نہ کرنا[3]

---

[1] لائف آف محمدؐ حاشیہ صفحہ ۲۳۶ [2] بخاری کتاب الجہاد باب قتل الصبیان والنساء

[3] مسلم کتاب الجہاد باب تحریم قتل النساء والصبیان

اِن اُصولی ہدایات کے ہوتے ہوئے صحابہ کے متعلق اور صحابہ میں سے بھی زید بن حارثہ کے متعلق جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے آدمی تھے یہ خیال کرنا کہ انہوں نے کسی عورت کو اس طریق پر قتل کیا یا کروایا تھا جو ابن سعد نے بیان کیا ہے ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ بیشک روایت میں قتل کرنے کا فعل زید کی طرف منسوب نہیں کیا گیا بلکہ ایک دوسرے مسلمان کی طرف کیا گیا ہے لیکن جب کہ یہ واقعہ زید کی کمان میں ہوا تو بہرحال اس کی آخری ذمہ واری زید پر ہی سمجھی جائیگی اور زید کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو جانتے پہچانتے ہوئے اِس قسم کے کام کی اجازت دی ہوگی ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ بیشک اگر کوئی عورت کسی جُرم کی مرتکب ہوتی ہے تو وہ اُس جُرم کی سزا پائیگی اور کسی مذہب کی شریعت اور کسی مُلک کے قانون نے عورت کو جُرم کی سزا سے مستثنےٰ نہیں رکھا۔ اور آئے دن عورتوں کی سزا بلکہ قتل کے جُرم میں پھانسی تک کے واقعات چھپتے رہتے ہیں مگر محض مذہبی عداوت کی وجہ سے یا شرکتِ جنگ کی وجہ سے کسی عورت کو قتل کرنا اور قتل بھی اس طریق پر کرنا جو اس روایت میں بیان ہوا ہے ایک ایسا فعل ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُصولی ہدایت اور ساری اسلامی تاریخ صریح طور پر رد کرتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ عورت مجرم تھی اور جیسا کہ بعض روایتوں میں بیان ہوا ہے اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ کیا تھا[1] اس لیے اس کے خلاف جائز طور پر قتل کی سزا جاری کی جاسکتی تھی تو یہ درست ہے مگر سوال یہ ہے کہ جب صحابہ نے اُم قرفہ سے سخت اور زیادہ خونی دشمنوں اور پھر مرد دشمنوں کو بھی کبھی اس طرح قتل نہیں کیا تو یہ خیال کرنا کہ زید بن حارثہ جیسے واقف کار صحابی کی کمان میں ایک بوڑھی عورت کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہوگا ہرگز قابلِ تسلیم نہیں ہوسکتا۔ پس معقولی رنگ میں اس قصہ کا جھوٹا اور بناوٹی ہونا ظاہر وعیاں ہے اور کوئی غیر متعصب شخص اس میں شُبہ کی گنجائش نہیں دیکھ سکتا۔

اب رہا منقولی طریق سو اوّل تو ابن سعد یا ابن اسحاق[2] نے اس روایت کی کوئی سند نہیں دی اور بغیر کسی معتبر سند کے اِس قسم کی روایت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ہدایت اور صحابہ کے عام اور معروف طریق کے خلاف ہو ہرگز قبول نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے یہ کہ یہی واقعہ حدیث کی نہایت معتبر کتب صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد میں بیان ہوا ہے مگر اس میں اُم قرفہ کے قتل کئے جانے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے اور بعض دوسری تفصیلات میں بھی اس بیان کو ابن سعد وغیرہ کے بیان سے اختلاف ہے۔ اور چونکہ صحیح احادیث عام تاریخی روایات سے یقیناً اور مسلّمہ طور پر بہت زیادہ مضبوط اور قابلِ ترجیح

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۶۳۔ [2] یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ابن اسحاق نے بروایت ابن ہشام صرف یہ لکھا ہے کہ اُم قرفہ کو سختی کے ساتھ قتل کروا دیا گیا اور اس کی تفصیل نہیں دی۔ تفصیل ابن سعد نے دی ہے۔

ہوتی ہیں۔ اس لیے صحیح مسلم اور سُنن ابو داؤد کی روایت کے سامنے ابن سعد وغیرہ کی روایت کوئی وزن نہیں رکھتی۔ یہ امتیاز اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جب ہم اس بات کو مدِنظر رکھیں کہ جہاں ابن سعد اور ابن اسحاق نے اپنی روایتوں کو یونہی بلا سند بیان کیا ہے وہاں امام مسلم اور ابو داؤد نے اپنی روایتوں کو پُوری پُوری سند دی ہے اور ویسے بھی محدثین کی احتیاط کے مقابلہ میں جنہوں نے انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے مؤرخین کی عام روایت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

صحیح مسلم اور سُنن ابوداؤد میں یہ واقعہ جس طرح بیان ہوا ہے وہ اُوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں اُمّ قرفہ کے قتل کا ذکر تک نہیں ہے۔ بیشک مسلم اور ابوداؤد کی روایت میں اُمّ قرفہ کا نام مذکور نہیں ہے اور امیر کا نام بھی زید کی بجائے ابوبکر درج ہے مگر اس کی وجہ سے یہ شُبہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مہم اور ہے کیونکہ باقی جملہ اہم تفصیلات ایک ہیں۔ مثلاً :-

۱۔ دونوں روایتوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ مہم بنو فزارہ کے خلاف تھی۔

۲۔ دونوں میں یہ ذکر موجود ہے کہ بنو فزارہ کی رئیس ایک بوڑھی عورت تھی۔

۳۔ دونوں میں اس عورت کے قید کئے جانے کا ذکر ہے۔

۴۔ دونوں میں یہ ذکر ہے کہ اس عورت کی ایک لڑکی بھی تھی جو ماں کے ساتھ قید ہوئی۔

۵۔ دونوں میں یہ ذکر ہے کہ یہ لڑکی سلمہ بن اکوع کے حصّہ میں آئی تھی۔

اِس کے علاوہ اَور بھی بعض باتوں میں اشتراک ہے۔ اب غور کرو کہ کیا ان اہم اور بنیادی اشتراکات کے ہوتے ہوتے کوئی شخص شُبہ کر سکتا ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں۔ مگر ہم صرف اس عقلی استدلال پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ گذشتہ محققین نے بھی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ صحیح مسلم اور سُنن ابوداؤد میں وہی واقعہ بیان ہوا ہے جو ابن سعد نے دوسرے رنگ میں درج کیا ہے چنانچہ علامہ زرقانیؒ[1] اور امام سہیلیؒ[2] اور علامہ حلبیؒ[3] نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ وہی واقعہ ہے جو ابن سعد اور ابن اسحاق نے اُمّ قرفہ والے قصّہ میں غلط طور پر بیان کیا ہے مگر اس سے بھی بڑھ کر اس بات کا ثبوت کہ یہ وہی واقعہ ہے یہ ہے کہ طبری نے ان دونوں روایتوں کو پہلو بہ پہلو بیان کرکے اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی واقعہ ہیں[4]

الغرض یہ بات بالکل یقینی ہے کہ مسلم اور ابوداؤد کی سلمہ بن اکوع والی روایت میں وہی واقعہ بیان کیا گیا ہے جسے ابن سعد اور ابن ہشام نے اُمّ قرفہ کے سریہ کے نام سے غلط طور پر درج کیا

---

[1] شرح مواہب جلد ۲ صفحہ ۱۶۴۔ [2] الروض الانف جلد ۲ صفحہ ۳۶۱۔ [3] سیرۃ حلبیہ جلد ۳ حالات سریہ ابوبکر الیٰ بنی فزارہ

[4] طبری طبع یورپ جلد ۳ صفحہ ۱۵۵۷ تا ۱۵۵۹ نیز صفحہ ۱۵۹۲

ہے اور چونکہ صحاح کی روایت جو سند کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور ایک شریکِ واقعہ کی زبان سے مروی ہے بہرحال ابن سعد اور ابن ہشام کی غیر مستند روایت سے قابلِ ترجیح ہے اس لیے اِس بات میں ہرگز کوئی شبہ نہیں رہتا کہ اُم قرفہ کے "ظالمانہ قتل" کا واقعہ ایک بالکل جھوٹا اور بے بنیاد واقعہ ہے جو کسی مخفی دشمنِ اسلام اور منافق کی مہربانی سے بعض تاریخی روایتوں میں راہ پا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ اِس سریہ کی حقیقت اِس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں جو مسلم اور ابوداؤد نے بیان کی ہے۔ کسی غلط واقعہ کا تاریخ میں درج ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اِس قسم کی مثالیں ہر قوم اور ہر مُلک کی تاریخ میں ملتی ہیں، لیکن یہ ضرور ایک تعجب کی بات ہے کہ سر ولیم جیسا انسان اِس غلط واقعہ کو بغیر کسی تحقیق کے اپنی کتاب میں جگہ دے اور اس بات کا برملا اعتراف کرے کہ اس کے اندراج کی وجہ محض یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کے ایک ظالمانہ فعل کی مثال ملتی ہے۔

اہلِ خیبر کی شرارت اور ابورافع یہودی کا قتل رمضان ۶ھ مطابق جنوری ۶۲۸ء

جن یہودی رؤساء کی مفسدانہ انگیخت اور اشتعال انگیزی سے ۵ھ کے آخر میں مسلمانوں کے خلاف جنگِ احزاب کا خطرناک فتنہ برپا ہوا تھا اُن میں سے حیی بن اخطب تو بنو قریظہ کے ساتھ اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا، لیکن سلام بن ابی الحقیق جس کی کنیت ابورافع تھی ابھی تک خیبر کے علاقہ میں اسی طرح آزاد اور اپنی فتنہ انگیزی میں مصروف تھا۔ بلکہ احزاب کی ذلت بھری ناکامی اور پھر بنو قریظہ کے ہولناک انجام نے اُس کی عداوت کو اور بھی زیادہ کر دیا تھا۔ اور چونکہ قبائل غطفان کا مسکن خیبر کے قریب تھا اور خیبر کے یہودی اور نجد کے قبائل آپس میں گویا ہمسائے تھے اس لیے اب ابورافع نے جو ایک بہت بڑا تاجر اور امیر کبیر انسان تھا دستور بنا لیا تھا کہ نجد کے وحشی اور جنگجو قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اُکساتا رہتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں وہ کعب بن اشرف کا پُورا پُورا مثیل تھا[1] چنانچہ اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس نے غطفانیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حملہ آور ہونے کے لیے اموالِ کثیر سے امداد دی تھی۔[2] اور تاریخ سے ثابت ہے کہ ماہ شعبان میں بنو سعد کی طرف سے جو خطرہ مسلمانوں کو پیدا ہوا تھا اور اس کے سدِّباب کے لیے حضرت علیؓ کی کمان میں ایک فوجی دستہ مدینہ سے روانہ کیا گیا تھا اُس کی تہ میں بھی خیبر کے یہودیوں کا ہاتھ تھا[3] جو ابورافع کی قیادت میں یہ سب شرارتیں کر رہے تھے۔

مگر ابورافع نے اِسی پر بس نہیں کی۔ اس کی عداوت کی آگ مسلمانوں کے خون کی پیاسی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اُس کی آنکھوں میں خار کی کھٹکتا تھا۔ چنانچہ بالآخر اُس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ جنگِ احزاب کی طرح نجد کے قبائل غطفان اور دوسرے قبیلوں کا پھر ایک دورہ کرنا شروع

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۶۲۔ [2] فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۶۳۔ [3] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۵

کیا اور انہیں مسلمانوں کے تباہ کرنے کے لیے ایک لشکرِ عظیم کی صورت میں جمع کرنا شروع کر دیا[1]۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے پھر وہی احزاب والے منظر پھرنے لگ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبیلہ خزرج کے بعض انصاری حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اب اس فتنہ کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کسی طرح اِس فتنہ کے بانی مبانی ابورافع کا خاتمہ کر دیا جاوے[2]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس بات کو سوچتے ہوئے کہ ملک میں وسیع کُشت وخون کی بجائے ایک مفسد اور فتنہ انگیز آدمی کا مارا جانا بہت بہتر ہے ان صحابیوں کو اجازت مرحمت فرمائی اور عبداللہ بن عتیک انصاری کی سرداری میں چار خزرجی صحابیوں کو ابورافع کی طرف روانہ فرمایا۔ مگر چلتے ہوئے تاکید فرمائی کہ دیکھنا کسی عورت یا بچے کو ہرگز قتل نہ کرنا[3]۔ چنانچہ ۵ھ[4] کے ماہ رمضان میں[5] یہ پارٹی روانہ ہوئی اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنا کام کر کے واپس آگئی۔ اور اس طرح اِس مصیبت کے بادل مدینہ کی فضا سے ٹل گئے۔ اِس واقعہ کی تفصیل بخاری میں جس کی روایت اس معاملہ میں صحیح ترین روایت ہے مندرجہ ذیل صورت میں بیان ہوئی ہے:۔

”براء بن عازب روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہ کی ایک پارٹی ابورافع یہودی کی طرف روانہ فرمائی اور اُن پر عبداللہ بن عتیک انصاری کو امیر مقرر فرمایا۔ ابورافع کا یہ قصہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو سخت دُکھ دیا کرتا تھا اور آپؐ کے خلاف لوگوں کو اُبھارتا تھا اور اُن کی مدد کیا کرتا تھا۔ جب عبداللہ بن عتیک اور اُن کے ساتھی ابورافع کے قلعہ کے قریب پہنچے اور سورج غروب ہوگیا تو عبداللہ بن عتیک نے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑا اور خود قلعہ کے دروازے کے پاس پہنچے اور اس کے قریب اس طرح چادر لپیٹ کر بیٹھ گئے جیسے کوئی شخص کسی حاجت کے لیے بیٹھا ہو۔ جب قلعہ کا دروازہ بند کرنے والا شخص دروازہ پر آیا تو اُس نے عبداللہ کی طرف دیکھ کر آواز دی کہ اے شخص مَیں قلعہ کا دروازہ بند کرنے لگا ہوں تم نے اندر آنا ہو تو جلد آجاؤ۔ عبداللہ چادر میں لپٹے لپٹائے جلدی سے دروازہ کے اندر داخل ہو کر ایک طرف کو چھپ گئے۔ اور دروازہ بند کرنے والا شخص دروازہ بند کر کے اور اُس کی کُنجی ایک قریب کی کھونٹی سے لٹکا کر چلا گیا۔

اس کے بعد عبداللہ بن عتیک کا اپنا بیان ہے کہ مَیں اپنی جگہ سے نکلا اور سب سے پہلے مَیں نے قلعہ کے دروازے کا قفل کھول دیا تاکہ ضرورت کے وقت جلدی اور آسانی کے

---

[1] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۶ ٭ [2] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۶۲ ٭ [3] موطا کتاب الجہاد
[4] ابن ہشام ٭ [5] ابن سعد

ساتھ باہر نکلا جا سکے۔ اس وقت ابورافع ایک چوبارے میں تھا اور اس کے پاس بہت سے لوگ مجلس جمائے بیٹھے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جب یہ لوگ اُٹھ کر چلے گئے اور خاموشی ہوگئی تو مَیں ابورافع کے مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر چلا گیا اور مَیں نے یہ احتیاط کی کہ جو دروازہ میرے راستہ میں آتا تھا اُسے مَیں آگے گذر کر اندر سے بند کر لیتا تھا۔ جب مَیں ابورافع کے کمرے میں پہنچا تو اُس وقت وہ چراغ بجھا کر سونے کی تیاری میں تھا اور کمرہ بالکل تاریک تھا۔ مَیں نے آواز دیکر ابورافع کو پکارا جس کے جواب میں اُس نے کہا۔ کون ہے؟ بس مَیں اس آواز کی سمت کا اندازہ کر کے اُس کی طرف لپکا اور تلوار کا ایک زوردار وار کیا مگر اندھیرا بہت تھا اور مَیں اُس وقت گھبرایا ہوا تھا اس لیے تلوار کا وار غلط پڑا اور ابورافع چیخ مار کر چلایا جس پر مَیں کمرہ سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد مَیں نے پھر کمرہ کے اندر جا کر اپنی آواز کو بدلتے ہوئے پوچھا۔ ابورافع یہ شور کیسا ہوا تھا؟ اُس نے میری بدلی ہوئی آواز کو نہ پہچانا اور کہا۔ تیری ماں تجھے کھوئے مجھ پر ابھی ابھی کسی شخص نے تلوار کا وار کیا ہے۔ مَیں یہ آواز سُن کر پھر اُس کی طرف لپکا اور تلوار کا وار کیا۔ اس دفعہ وار کاری پڑا مگر وہ مرا پھر بھی نہیں جس پر مَیں نے اُس پر ایک تیسرا وار کر کے اُسے قتل کر دیا۔

اِس کے بعد مَیں جلدی جلدی دروازے کھولتا ہوا مکان سے باہر نکل آیا لیکن جب مَیں سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا تو ابھی چند قدم باقی تھے کہ مَیں سمجھا کہ مَیں سب قدم اُتر آیا ہوں جس پر مَیں اندھیرے میں گر گیا اور میری پنڈلی ٹوٹ گئی (اور ایک روایت میں یُوں ہے کہ پنڈلی کا جوڑ اُتر گیا) مگر مَیں اُسے اپنی پگڑی سے باندھ کر گھسٹتا ہوا باہر نکل گیا لیکن مَیں نے اپنے جی میں کہا کہ جب تک ابورافع کے مرنے کا اطمینان نہ ہو جائے مَیں یہاں سے نہیں جاؤنگا چنانچہ مَیں قلعہ کے پاس ہی ایک جگہ چھُپ کر بیٹھ گیا۔ جب صبح ہوئی تو قلعہ کے اندر سے کسی کی آواز میرے کان میں آئی کہ ابورافع تاجرِ حجاز وفات پاگیا ہے۔

اِس کے بعد مَیں اُٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے ساتھیوں میں آملا اور پھر ہم نے مدینہ میں آکر آنحضرتؐ کو ابورافع کے قتل کی اطلاع دی۔ آپؐ نے سارا واقعہ سُنکر مجھے ارشاد فرمایا کہ اپنا پاؤں آگے کرو۔ مَیں نے پاؤں آگے کیا تو آپؐ نے دُعا مانگتے ہوئے اُس پر اپنا دستِ مبارک پھیرا جس کے بعد مَیں نے یُوں محسوس کیا کہ گویا مجھے کوئی تکلیف پہنچی ہی نہیں تھی۔"[1]

---

[1] بخاری کتاب المغازی حالات قتل ابورافع

ایک دوسری روایت میں ذکر آتا ہے کہ جب عبداللہ بن عتیک نے ابورافع پر حملہ کیا تو اُس کی بیوی نے نہایت زور سے چلانا شروع کیا جس پر مجھے فکر ہوا کہ اس کی چیخ و پکار سُن کر کہیں دوسرے لوگ نہ ہوشیار ہو جائیں اِس پر مَیں نے اُس کی بیوی پر تلوار اُٹھائی مگر پھر یہ یاد کر کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے قتل کرنے سے منع فرمایا ہے مَیں اِس ارادہ سے باز آ گیا[1]

ابورافع کے قتل کے جواز کے متعلق ہمیں اِس جگہ کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ابورافع کی خون آشام کارروائیاں تاریخ کا ایک کھلا ہوا ورق ہیں اور اس سے ایک ملتے جلتے واقعہ میں ایک مفصل بحث کتاب کے حصہ دوم میں[2] کعب بن اشرف کے قتل کے بیان میں گذر چکی ہے جس کے اعادہ کی اِس جگہ ضرورت نہیں اصولاً اِس قدر یاد رکھنا چاہیئے کہ:-

۱- اس وقت مسلمان نہایت کمزوری کی حالت میں چاروں طرف سے مصیبت میں مبتلا تھے اور ہر طرف مخالفت کی آگ شعلہ زن تھی۔ اور گویا سارا مُلک مسلمانوں کو مٹانے کے لیے متحد ہو رہا تھا۔

۲- ایسے نازک وقت میں ابورافع اس آگ پر تیل ڈال رہا تھا جو مسلمانوں کے خلاف مشتعل تھی اور اپنے اثر اور رسوخ اور دولت سے عرب کے مختلف قبائل کو اسلام کے خلاف اُبھار رہا تھا اور اس بات کی تیاری کر رہا تھا کہ غزوۂ احزاب کی طرح عرب کے وحشی قبائل پھر متحد ہو کر مدینہ پر دھاوا بول دیں۔

۳- عرب میں اُس وقت کوئی حکومت نہیں تھی کہ جس کے ذریعہ دادرسی چاہی جاتی بلکہ ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد اور مختار تھا۔ پس سوائے اس کے کہ اپنی حفاظت کے لیے خود کوئی تدبیر کی جاتی اور کوئی صورت نہیں تھی۔

۴- یہودی لوگ پہلے سے اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھے اور مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ کی حالت قائم تھی۔

۵- اس وقت ایسے حالات تھے کہ اگر کُھلے طور پر یہود کے خلاف فوج کشی کی جاتی تو اس سے جان اور مال کا بہت نقصان ہوتا اور اِس بات کا اندیشہ تھا کہ جنگ کی آگ وسیع ہو کر ملک میں عالمگیر تباہی کا رنگ نہ پیدا کر دے۔

اِن حالات میں صحابہ نے جو کچھ کیا وہ بالکل درست اور بجا تھا اور حالتِ جنگ میں جب کہ ایک قوم موت و حیات کے ماحول میں سے گذر رہی ہو اس قسم کی تدابیر بالکل جائز سمجھی جاتی ہیں اور ہر قوم اور ہر ملت انہیں حسبِ ضرورت ہر زمانہ میں اختیار کرتی رہی ہے مگر افسوس ہے کہ موجودہ اخلاقی

---

[1] مؤطا امام مالک کتاب الجہاد۔ [2] ملاحظہ ہو سیرۃ خاتم النبیین صلعم حصہ دوم

پستی کے زمانے میں مُجرم کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ اس ناجائز حد تک پہنچ گیا ہے کہ ایک ظالم بھی ہیرو بن جاتا ہے اور وہ سزا جو وہ اپنے جرموں کی وجہ سے پاتا ہے عوام کی ہمدردی کی جاذب ہونے لگتی ہے اور اس کے جُرم لوگوں کو بھول جاتے ہیں مگر اسلام کے متعلق ہمیں اعتراف ہے کہ وہ ان جھوٹے جذبات کا مذہب نہیں ہے وہ مُجرم کو مجرم قرار دیتا ہے اور اس کی سزا کو ملک اور سوسائٹی کے لیے رحمت سمجھتا ہے۔ وہ ایک سڑے ہوئے عضو کو جسم سے کاٹ دینے کی تعلیم دیتا ہے اور اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ ایک متعفن عضو اچھے اور تندرست اعضاء کو خراب کر دے۔ باقی رہا طریق سزا کا سوال سو اس کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ عرب کے اس وقت کے حالات کے ماتحت اور اس حالتِ جنگ کے پیشِ نظر جو اس وقت مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان قائم تھی جو طریق اختیار کیا گیا امنِ عامہ کے لحاظ سے وہی بہتر اور مناسب تھا۔ چنانچہ ہم اِس بارے میں ایک اصولی بحث کعب بن اشرف کے معاملہ میں حصّہ دوم میں درج کر چکے ہیں جس کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہیں۔

عبداللہ بن عتیک کی پنڈلی کے شفا پانے کے متعلق بخاری کی روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ آیا یہ شفا خارق عادت رنگ میں فوری طور پر وقوع میں آگئی تھی یا یہ کہ آہستہ آہستہ اپنے طبعی کورس کو پُورا کر کے ظاہر ہوئی۔ مؤخر الذکر صورت میں یہ ایک عام واقعہ سمجھا جائے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کا اثر صرف اس قدر متصور ہوگا کہ آپؐ کی دُعا کی برکت سے اس چوٹ نے کوئی مستقل اثر نہیں چھوڑا اور کوئی خراب نتیجہ نہیں نکلا بلکہ عبداللہ کی پنڈلی نے بالآخر اپنی اصلی اور پُوری طاقت حاصل کر لی اور چوٹ کا اثر کُلیتہً زائل ہو گیا، لیکن اگر یہ شفا خارق عادت رنگ میں فوری طور پر وقوع میں آئی تھی تو یقیناً یہ واقعہ خدا تعالیٰ کی تقدیرِ خاص کا کرشمہ تھا جو اُس نے اپنے رسولؐ کی دُعا اور برکت کے نتیجہ میں ظاہر فرمایا اور اس صورت میں اس کی تشریح اس اصولی بحث کے نیچے آئے گی جو ہم اس کتاب کے حصہ دوم میں معجزہ کے عنوان کے تحت درج کر چکے ہیں[1] اور جس کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہیں۔ صرف اِس قدر اشارہ کافی ہے کہ اسلام کی تعلیم کی رو سے خدا ہر بات پر قادر ہے اور نہ صرف قادر ہے بلکہ اپنے خاص بندوں کے ذریعہ وہ اپنی تقدیرِ عام کو بدل کر اپنی خاص قدرت کا اظہار بھی کرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ہر نبی کے زمانہ میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ صرف شرط یہ ہے کہ کوئی بات خدا کی سُنّت یا وعدہ یا صفت کے خلاف نہ ہو اور اس میں شہود کا ایسا رنگ نہ پایا جائے جو ایمان کی غرض و غایت کو باطل کر دے۔

---

[1] سیرۃ خاتم النبیین حصہ دوم

ابورافع کے قتل کے زمانہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ بخاری نے زہری کی اتباع میں اسے معین تاریخ دینے کے بغیر مطلقاً کعب بن اشرف کے قتل کے بعد بیان کیا ہے جو بہرحال درست ہے اور غالباً اِن واقعات کو متصل کرکے اس لیے بیان کیا ہے کہ ان کی نوعیت ایک سی ہے۔ طبری نے اسے ۳ھ میں کعب بن اشرف کے واقعہ کے بعد رکھا ہے۔ واقدی نے ۴ھ میں بیان کیا ہے۔ ابنِ ہشام نے بروایت ابن اسحاق اسے مطلقاً غزوہ بنو قریظہ کے بعد رکھا ہے جو اواخر ۵ھ میں ہوا تھا اور اس طرح اسے اوائل ۶ھ میں سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر ابن سعد نے صراحتاً ۶ھ میں بیان کیا ہے اور عام مؤرخین نے ابن سعد کی اتباع کی ہے۔ واللہ اعلم

مدینہ میں بارش کا قحط اور آنحضرتؐ کی دعائے استسقاء

اِسی سال ماہ رمضان میں[1] مدینہ اور اُس کے گرد و نواح میں دیر تک بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط کے آثار پیدا ہونے لگے جس پر صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی تکلیف بیان کی اور درخواست کی کہ ان کے لیے بارش کی دُعا فرمائی جائے اس پر آپؐ صحابہ کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر مصلیٰ یعنی عیدگاہ میں تشریف لے گئے اور وہاں قبلہ رُخ ہو کر بارش کے لیے دُعا فرمائی اور اُس کے بعد خدا کے فضل سے بہت جلد بارش ہوگئی[2] اس کے بعد اسلام میں استسقاء کی نماز کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ اس نماز کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں عام نمازوں کی طرح امام مقتدیوں کے آگے تو کھڑا ہوتا ہے مگر قولی دُعا کے علاوہ جس میں انسانوں اور جانوروں کی تکلیف کا ذکر کرکے خُدا سے بارش کی التجا کی جاتی ہے امام ایک چادر کے کونے پکڑ کر اُسے اپنی پیٹھ پر ڈالتا ہے اور پھر اُسے اِس طرح اُلٹا دیتا ہے کہ چاروں کونے بدل جاتے ہیں[3] جو گویا زبانِ حال سے اِس بات کی استدعا ہوتی ہے کہ خدایا ہم پر سختی کے دن پوری طرح بدل جائیں اور تیری وہ رحمت جو ہر چیز کے پیچھے مخفی ہوتی ہے تکلیف کے ظاہری پہلوؤں کو کلی طور پر دبا کر باہر آجائے۔

بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور موقع پر جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے خُطبہ کے لیے منبر پر چڑھے ہوئے تھے ایک صحابی نے موسم کی سختی کا ذکر کرکے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! جانور مر رہے ہیں اور سفر کٹھن ہو رہے ہیں۔ دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ بارش برسائے۔" آپؐ نے اُسی وقت دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے اور بارش کے لیے بلند آواز سے دُعا فرمائی۔ انس بن مالک جو

---

[1] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۵۶ ؛ [2] فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۴۱۵، ۴۲۵ و خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۵
[3] بخاری ابواب الاستسقاء باب تحویل الرداء و مشکوٰۃ باب نماز استسقاء

اس روایت کے راوی ہیں اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خدمت گار تھے بیان کرتے ہیں کہ اُس وقت آسمان بالکل صاف تھا، لیکن ابھی ہم مسجد میں ہی تھے اور جُمعہ سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ ایک طرف سے بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نمودار ہوا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ سارے آسمان پر چھا گیا۔ اور پھر بارش برسنے لگی اور برابر ایک ہفتہ تک برستی رہی اور اس عرصہ میں ہم نے سورج کی شکل تک نہیں دیکھی (حالانکہ اس مُلک میں ایسی صورت بہت شاذ ہوتی ہے) پھر جب دوسرا جمعہ آیا تو ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! بارش نے تو رستے روک دیئے اور چراگاہوں کے غرقاب ہو جانے سے مویشی بھُوکے مر رہے ہیں دعا فرمائیں کہ اب اللہ تعالیٰ اس بارش کے سلسلہ کو روک دے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسّم فرمایا[1] اور پھر آپؐ نے ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی کہ:۔

اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا۔ الخ

یعنی "خدایا اب ہم پر اِس بارش کے سلسلہ کو بند فرما اور دوسری جگہ جہاں ضرورت ہو وہاں برسا۔"

انسؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم جُمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو دھوپ نکلی ہوئی تھی[2]

---

[1] اس تبسّم فرمانے میں غالباً اشارہ یہ تھا کہ انسان کسی پہلو سے بھی تسلی نہیں پاتا نیز یہ کہ اللہ کی رحمت کسی خاص چیز میں محصور نہیں بلکہ ہر چیز رحمت بن سکتی ہے اور ہر چیز ہی عذاب کا رنگ اختیار کر سکتی ہے اس لیے ہر وقت خُدا سے ڈرنا چاہیئے اور خدا سے بہر حال رحمت کو مانگتے رہنا چاہیئے۔

[2] بخاری ابواب الاستسقاء۔ باب الاستسقاء فی المسجد الجامع

اِسلام میں قبولیتِ دُعا کا مسئلہ

اس جگہ طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ بادل نہیں تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی اور بادل آگئے اور بارش ہونے لگی اور پھر جب بارش کی کثرت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کے بند ہونے کی دُعا فرمائی اور بادل چھٹ گئے اور مطلع صاف ہو گیا یعنی جب یہ باتیں عام قانونِ قدرت کے ماتحت ظہور پذیر ہوتی ہیں تو پھر اس معروف و مشہود قانونِ قدرت کے خلاف یہ بات کیونکر ہو گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے بادل نمودار ہو گئے اور پھر دُعا سے ہی بادلوں نے پھٹ کر سُورج کو رستہ دیدیا؟ سو اس کے جواب میں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ معاملہ قبولیتِ دُعا کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ ہر مذہب میں اور ہر زمانہ میں اس مسئلہ کو تسلیم کیا گیا ہے اور کم و بیش ہر قوم کے مذہبی بزرگوں کی زندگی میں قبولیتِ دُعا کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ دراصل یہ مسئلہ اپنے بیشتر پہلوؤں میں معجزات کے مسئلہ کے ساتھ مربوط ہے جس کے متعلق ایک اُصولی بحث کتاب کے حصہ دوم[1] میں گذر چکی ہے اور ہم اپنے ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس نوٹ کے ساتھ کتاب کے حصہ دوم کے متعلقہ اوراق بھی ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

دُعا کا مسئلہ مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے

بات یہ ہے کہ ایسے امور میں استدلالی براہین کو زیادہ دخل نہیں ہوتا بلکہ بحث کا مرکزی نقطہ یہ بات قرار پاتی ہے کہ آیا دُعائیں عملاً قبول ہوتی ہیں یا نہیں اور آیا کوئی بات دُعا کے نتیجہ میں عملاً وقوع میں آتی ہے یا نہیں۔ اگر دُعا کی قبولیت کا نتیجہ عملاً نظر آجاتے اور ایسی صورت میں نظر آتے کہ اس میں کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہ ہو اور سمجھدار اور معتبر اور صادق القول لوگوں کی ایک جماعت اس کی شاہد ہو اور پھر مختلف قسم کے حالات میں ایسا مشاہدہ بار بار کے تجربہ سے پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس صورت میں کوئی عقلمند انسان اس کے متعلق شبہ نہیں کر سکتا۔ جب ہم دوسرے امور میں معتبر لوگوں کی شہادت پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھتے ہیں اور ساری دُنیا اس طریق فیصلہ کو قبول کرتی ہے حتّٰی کہ سائنس کے جدید مشاہدات بھی خواہ اُن میں کس قدر ہی غیر متوقع اور عجیب و غریب حالات کا انکشاف ہو کم از کم ابتداءً سائنسدانوں کی شہادت کے ذریعہ ہی قبول کئے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سمجھدار

---

[1] ملاحظہ ہو سیرۃ خاتم النبیینؐ حصہ دوم

اور صادق القول لوگوں کی شہادت کے ہوتے ہوئے جو مختلف قوموں اور مختلف زمانوں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ دُعا کی قبولیت اور معجزات و خوارق کے وجود سے انکار کیا جاتے۔

مسئلہ دُعا اور سائنس کا مشترکہ اُصول

اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سائنس کی دریافتیں تو ایسی ہیں کہ ہر شخص جو ان کا علم حاصل کرنا چاہے اور جو رستہ اس علم کے حصول کے لیے مقرر ہے اُسے اختیار کرے اور اُن آلات اور ذرائع کو استعمال میں لاتے جو اُن اُمور کے معلوم کرنے یا تصدیق کرنے کے لیے ضروری ہیں تو وہ اُنہیں معلوم کر سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اے ہمارے بھٹکے ہوئے بھائیو! خُدا تمہاری آنکھیں کھولے بعینہٖ یہی صورت دُعا اور معجزات اور خوارق کے معاملہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی اُن پر بھی یہی ازلی قانون چسپاں ہوتا ہے کہ جو شخص اُن کی حقانیت کے تجربہ کرنے کا سچا خواہشمند ہو اور اس رستہ پر گامزن ہو جو اس علم کے حصول کا رستہ ہے اور اُن ذرائع کو استعمال کرے جو اس حقیقت کی دریافت کے لیے مقرر ہیں اور اس کوشش میں وہ کسی غلط رستہ کو اختیار کر کے بھٹک نہ جائے تو ناممکن ہے کہ وہ اُن صحیح نتائج تک پہنچنے سے محروم رہے جو ہر سچے اور صحیح طریق پر کام کرنے والے کے لیے مقدر ہیں خواہ وہ سائنس کے میدان سے تعلق رکھتا ہو یا کہ رُوحانیت کے میدان سے۔ کیونکہ دونوں کا منبع خدا کی ذات ہے اور دونوں ایک ہی ازلی حکومت کے نیچے ہیں مگر افسوس ہے کہ دُنیا کے علوم کے متعلق تو لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ بغیر صحیح کوشش اور صحیح جدوجہد کے حاصل نہیں ہو سکتے اور اس لیے وہ دن رات اس کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اپنی غلطیوں کی وجہ سے درمیان میں صدہا ناکامیاں بھی دیکھتے ہیں مگر پھر بھی ہمت نہیں ہارتے مگر رُوحانی میدان میں وہ صرف دل کی خواہش یا مُنہ سے نکل کر اُڑ جانے والے الفاظ سے تمام مراحل طے کرنا چاہتے ہیں اور جب اس طرح اُن کی خواہش پُوری نہیں ہوتی اور اُن کا مقصود اُنہیں حاصل نہیں ہوتا تو وہ مایوس ہو کر اس خواہش کو ہی خیرباد کہہ دیتے ہیں اور اس مقصود کو ایک وہمی چیز قرار دینے لگ جاتے ہیں یقیناً کسی اہم مقصد کے حاصل کرنے کا یہ طریق نہیں۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا [1]

یعنی ”جو لوگ ہمارے معاملہ میں پُوری پُوری اور صحیح صحیح کوشش کرتے ہیں ہم ضرور بالضرور اُن کے لیے اپنے رستے کھول دیتے ہیں۔“

اب ناظرین خود غور کریں کیا انہوں نے اس معاملہ میں پُوری پُوری اور صحیح صحیح کوشش سے کام لیا

---

[1] سورۃ العنکبوت: ۷۰

ہے؟ یعنی کیا اُنھوں نے کم از کم اس معاملہ میں ایسی کوشش کی ہے جو وہ دُنیا میں اہم مقاصد کے لیے کیا کرتے ہیں؟ اگر انہوں نے ایسی کوشش نہیں کی اور یقیناً نہیں کی تو انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی زبان اور قلم کو بند رکھیں اور اُن لوگوں کی شہادت کے متعلق حسنِ ظنی سے کام لیں جو اس میدان میں اپنی زندگیاں وقف رکھتے ہیں اور جن کے حالات اِس بات کے ضامن ہیں کہ وہ کم از کم مفتری یا مجنون نہیں۔

دُعا کا مسئلہ ہستی باریتعالیٰ کے مسئلہ کی فرع ہے

درحقیقت اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا واقعی اس دُنیا کا کوئی خدا ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو اس سارے کارخانۂ عالم کو اپنے دستِ قدرت سے چلا رہا ہے۔ اگر تو ایسا خدا ہے اور وہ دُنیا کو پیدا کر کے اپنے عرشِ اُلوہیت سے معزول نہیں ہو گیا اور نہ ہی اُس کی طاقتیں معطل ہوئی ہیں تو پھر دُعا کا مسئلہ کسی عقلمند کے نزدیک قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیا کوئی مخصوص دُعا عملاً قبولیت کے درجہ کو پہنچی ہے یا نہیں اور آیا اُس کا کوئی معیّن نتیجہ نکلا ہے یا نہیں؟ سو یہ بات مشاہدہ کے میدان سے تعلق رکھتی ہے جس میں استدلالی براہین کا دخل نہیں۔ مجھے اپنے اصل مضمون سے ہٹنا پڑتا ہے ورنہ میں سینکڑوں مثالیں دے کر ثابت کر سکتا ہوں[1] کہ ہمارا خدا ایک نام کا بادشاہ نہیں اور نہ ہی وہ اپنے پیدا کردہ قانون کا غلام ہے کہ اُس میں کسی صورت میں بھی کوئی تبدیلی نہ کر سکے۔ بے شک جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے وہ اپنی سنت اور وعدہ کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا مگر دوسری طرف وہ ایک زندہ اور متصرف خدا ہے جو اپنے بندوں کی دُعاؤں کو سُنتا اور اُن پر یقینی نتائج مترتب کرتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ جس طرح وہ اپنے قانون کا غلام نہیں اسی طرح وہ اپنے بندوں کا بھی غلام نہیں اور ضروری نہیں کہ ہر دُعا کو منظور کرے۔ بلکہ دُعا کی منظوری بعض خاص شرائط کے ساتھ مشروط ہے جنہیں ہم انشاء اللہ آگے چل کر درج کرینگے۔

اِس اُصولی نوٹ کے بعد ہم مسئلہ دُعا کے متعلق اپنے ناظرین کی تنویر کے لیے چند قرآنی آیات اور احادیث پیش کرتے ہیں تاکہ اُنہیں معلوم ہو سکے کہ اس بارے میں اسلامی تعلیم کا خلاصہ کیا ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ دُعا ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی کسی کو بُلانے یا پکارنے کے ہیں اور گو پکارنے اور بُلانے میں زیادہ غالب مفہوم سوال کرنے اور مانگنے کا ہوتا ہے مگر اپنے وسیع معنوں کے لحاظ سے دُعا

---

[1] یہ مثالیں کم و بیش ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں کیونکہ اپنی اصل کے لحاظ سے تمام مذاہب جن کی بنیاد الہامِ الٰہی پر ہے خدا کی طرف سے ہیں اور اپنے اپنے زمانہ میں خدائی نصرت کا مشاہدہ کر چکے ہیں گو اب وہ غلط رستہ پر پڑ کر اس نصرت سے محروم ہو چکے ہوں۔

ہر رنگ کا پکارنا شامل سمجھا جائیگا خواہ یہ پکارنا سوال یا طلب نصرت کی غرض سے ہو یا کسی اُور غرض سے ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص خدا کو محض اپنی محبت اور عبودیت کے جذبات کے اظہار کے لئے مخاطب کرتا ہے تو یہ بھی ایک نوع دُعا کی ہے خواہ اس میں کوئی پہلو سوال یا استعانت کا نہ پایا جائے مگر ان وسیع معنوں کے علاوہ دُعا کے لفظ کو اصطلاحاً ایک مخصوص اور محدود مفہوم بھی حاصل ہو گیا ہے جو سوال کرنے اور مانگنے اور طلب نُصرت سے تعلق رکھتا ہے اور اس جگہ یہی مؤخر الذکر مفہوم ہمارے مدِنظر ہے۔

دُعا کامیابی کا ایک رُوحانی ذریعہ ہے

سب سے پہلے اسلام مسئلہ دُعا کے متعلق یہ تعلیم دیتا ہے کہ دُعا صرف ایک عبادت ہی نہیں ہے بلکہ حقیقی سوال کا رنگ بھی رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ حسب حالات اس سوال کو قبول کرتا اور اس پر نتیجہ مترتب فرماتا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ کبھی اس رُوحانی ہتھیار کی طرف سے غافل نہ ہوں بلکہ اسے ہمیشہ اپنے استعمال میں رکھیں۔ دراصل اسلام میں دُعا کے متعلق نظریہ یہ ہے کہ جس طرح خدا نے دُنیا میں مختلف مقاصد کے حصول کے لیے مختلف ذرائع مقرر فرماتے ہیں اور خدا کا یہ منشاء ہے کہ لوگ حسب حالات ان ذرائع اور اسباب کو اختیار کریں اور ان سے فائدہ اُٹھائیں اور دُنیا میں ساری ترقی کا راز انہی اسباب کے استعمال میں مخفی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے ان مادی اسباب کے علاوہ ایک رُوحانی سبب بھی مقرر فرمایا ہے اور یہ رُوحانی سبب دُعا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ اُس کے بندے اپنے کاموں میں ظاہری اور مادی ذرائع کے ساتھ ساتھ دُعا یعنی رُوحانی ذریعہ کو بھی استعمال کریں۔ اور اس منشاء الٰہی میں دوہری غرض مدِنظر ہے:۔

اوّل یہ کہ تا محض مادی اسباب میں گھرے رہنے کی وجہ سے لوگوں کی نظر مادیت کے ماحول میں محصور ہو کر نہ رہ جائے اور وہ ان مادی اسباب کو ہی اپنا آخری سہارا نہ سمجھنے لگیں۔ بلکہ ان اسباب کے ساتھ ساتھ ان اسباب کے پیدا کرنے والے خدا کو بھی یاد رکھیں جس کے سہارے پر یہ سارے مادی اسباب قائم ہیں۔

دوم یہ کہ تا لوگوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ جس طرح مختلف مقاصد میں کامیابی کے لیے بعض مادی اسباب مقرر ہیں اسی طرح خدا کی ازلی تقدیر نے ایک رُوحانی سبب بھی مقرر کر رکھا ہے اور یہ رُوحانی سبب دُعا ہے جو ہمارے معاملات میں اسی طرح مؤثر ہے جس طرح کہ مادی اسباب مؤثر ہیں البتہ جس طرح قانونِ قدرت کے ماتحت ہر مادی سبب کے استعمال کا ایک طریق مقرر ہے اسی طرح رُوحانی سبب کے استعمال کا بھی ایک طریق مقرر ہے جسے اختیار کرنے کے بغیر وہ مؤثر نہیں ہوتا، لیکن جب اس طریق کو اختیار کر لیا جائے تو یہ رُوحانی سبب مادی اسباب کی نسبت

بھی زیادہ مؤثر ہوجاتا ہے کیونکہ گو مادی اور رُوحانی اسباب ہر دو کی تہ میں خدا ہی کا ہاتھ ہے اور وہی ہر چیز کی علت العلل ہے مگر چونکہ رُوحانی سبب میں گویا خدا تعالیٰ سے براہِ راست اپیل ہوتی ہے اس لیے اگر اس میں صحیح طریق کو اختیار کیا جائے تو وہ لازماً مادی اسباب کی نسبت بہت زیادہ قوی الاثر اور بہت زیادہ سریع الاثر اور بہت زیادہ وسیع الاثر ثابت ہوتا ہے۔

خُدا دُعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے

اس اصولی نوٹ کے بعد ہم مسئلہ دُعا کے متعلق بعض قرآنی آیات اور احادیث اس جگہ درج کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اسلام اس بارے میں کیا تعلیم دیتا ہے۔ سو قرآن شریف میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ۝[1]

یعنی "تمہارا پروردگار تمہیں ہدایت فرماتا ہے کہ (جب بھی تمہیں کوئی ضرورت یا حاجت پیش آیا کرے) تم مجھے پکارا کرو۔ مَیں تمہاری پکار کو سُنوں گا اور قبول کروں گا لیکن وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبّر کرتے ہیں (اور اُن کی گردنیں مجھے پکارنے کے لیے نیچی نہیں ہو سکتیں) وہ عنقریب ذلیل و رُسوا ہو کر آگ کے عذاب میں داخل کئے جائینگے۔"

پھر فرماتا ہے:۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝[2]

یعنی اے رسول! جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے پوچھیں تو تُو انہیں کہدے کہ مَیں (تم سب کے) قریب ہوں۔ مَیں پکارنے والے کی آواز کو سُنتا اور اُس کا جواب دیتا ہوں (یعنی اسے قبول کرتا ہوں) مگر میرے بندوں کو بھی چاہیئے کہ وہ میری آواز پر کان دھریں اور مجھ پر سچا ایمان لائیں تاکہ وہ (اپنی دُعاؤں میں) کامیابی کا منہ دیکھ سکیں۔"

پھر فرماتا ہے:۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ

---

[1] سورۃ المؤمن: ۶۱ ؛ [2] سورۃ البقرہ: ۱۸۷

طَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ [1]

یعنی "اے لوگو اپنے رب کو ہر حال میں پکارا کرو خواہ تم اضطراب اور گھبراہٹ کی حالت میں آہ و پکار کر رہے ہو یا ضبط اور صبر کی حالت میں خاموش ہو۔ اور جانو کہ خدا حد اعتدال سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور تمہیں چاہیئے کہ بعد اس کے کہ خدا نے دُنیا میں اس کی اصلاح کا سامان پیدا کر دیا ہے فساد نہ برپا کرو اور اپنے خدا کو خوف اور طمع ہر حالت میں پکارتے رہو (یعنی خواہ تمہیں کسی مصیبت سے رہائی پانے کی خواہش ہو یا کسی بھلائی کے حاصل کرنے کی تمنا ہو ہر حالت میں دُعا کرتے رہو) یقیناً خدا کی رحمت نیک لوگوں کے قریب ہے۔"

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں:۔

اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِيْ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اَنْ يَّرُدَّهُمَا صِفْرًا۔ [2]

یعنی "اے مسلمانو! تمہارا رب شرمیلا اور بخشش کرنیوالا آقا ہے۔ وہ اس بات سے شرماتا ہے کہ جب کوئی بندہ اس کے سامنے دُعا کے لیے ہاتھ پھیلائے تو وہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔" اللہ اللہ کیا شانِ دلربائی ہے!

کافروں کی دُعائیں

مگر اس کے مقابل پر کافروں کی دُعاؤں کے متعلق فرماتا ہے:۔

وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ [3]

یعنی "بے شک خدا اپنے بندوں کی دُعائیں سنتا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھو کہ ہر شخص کی ہر دُعا ضرور قبول ہوتی ہے بلکہ خدا کا یہ قانون ہے کہ ناشکر گذار لوگوں کی دُعائیں یا کافروں کی دُعائیں جو وہ نیک لوگوں کے خلاف مانگتے ہیں قبول نہیں ہوتیں بلکہ یونہی اِدھر اُدھر بھٹک کر ضائع ہو جاتی ہیں۔"

خدا اپنے وعدہ اور سُنّت کے خلاف دُعا قبول نہیں کرتا

اور ایک اور جگہ فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ [4]

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا [5]

---

[1] سورۃ الاعراف: ۵۶، ۵۷ ؛ [2] ترمذی۔ [3] سورۃ الرعد: ۱۵۔ [4] سورۃ آل عمران: ۱۰۔ [5] سورۃ الاحزاب: ۶۳

یعنی "اللہ تعالیٰ کسی صورت میں اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا ...... اور تم خدا کی سُنّت میں کبھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔"

پھر حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ[1]

یعنی "دُعا کو عبادت میں وہ درجہ حاصل ہے جو ایک ہڈی میں گُودے کو حاصل ہوتا ہے جو گویا ہڈی کی جان ہوتا ہے۔" پس جس عبادت میں دُعا کا عنصر شامل نہیں وہ ایک بے جان جسم سے بڑھ کر نہیں۔

مومن کی دُعا خُدائی تقدیر کو بھی بدل سکتی ہے

پھر فرماتے ہیں:-

لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ[2]

یعنی "لوگو! سُن لو کہ دُعا کو وہ طاقت حاصل ہے کہ وہ خدائی قضا و قدر کو بھی بدل دیتی ہے۔ یعنی اگر عام قانون و قدر کے ماتحت کسی فرد یا قوم پر کوئی مصیبت آنے والی ہوتی ہے تو دُعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص حکم سے اس مصیبت کو ٹال سکتا ہے" اس جگہ وہ لوگ غور کریں جو دُعا کو محض عبادت خیال کرتے ہیں۔

دُعا کی قبولیّت کی تین امکانی صُورتیں

پھر فرماتے ہیں:-

مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَدْعُوْ بِدَعْوَةٍ لَیْسَ فِیْهَا اِثْمٌ وَلَا قَطِیْعَةُ رَحِمٍ اِلَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ بِهَا اِحْدٰی ثَلَاثٍ اِمَّا یُعَجِّلُ لَهٗ دَعْوَتَهٗ وَ اِمَّا اَنْ یَدَّخِرَهَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ وَ اِمَّا اَنْ یَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا۔[3]

یعنی "جب ایک مسلمان خدا سے کوئی دُعا کرتا ہے تو بشرطیکہ وہ دُعا کسی گُناہ یا قطع رحمی پر مشتمل نہ ہو خدا اُسے تین صورتوں میں سے کسی نہ کسی ایک صورت میں ضرور قبول فرمالیتا ہے یعنی (۱) یا تو وہ اُسے اُسی صورت میں اِسی دُنیا میں قبول کرلیتا ہے اور (۲) یا اسے آخرت کے لیے دُعا کرنے والے کے واسطے ذخیرہ کرلیتا ہے اور (۳) یا (اگر اُس کا قبول کرنا کسی سنّتِ الٰہی یا مصلحتِ الٰہی کے خلاف ہو تو) اس کی وجہ سے دُعا کرنے والے سے کسی

---

[1] ترمذی جلد ثانی کتاب الدعوات۔ [2] ترمذی جلد ثانی ابواب القدر۔ [3] ترمذی

ملتی جلتی تکلیف یا بدی کو دُور فرما دیتا ہے۔" قبولیتِ دُعا کی ان تین امکانی صورتوں کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ دُعا قبول نہیں ہوتی؟

دُعا میں جلد بازی مُہلک ہے

پھر فرماتے ہیں:۔

اِنَّہٗ یُسْتَجَابُ لِاَحَدِکُمْ مَالَمْ یُعَجِّلْ فَیَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ رَبِّیْ فَلَمْ یَسْتَجِبْ لِیْ[1] وَفِیْ رِوَایَۃٍ مَالَمْ یَسْتَعْجِلْ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَاالْاِسْتِعْجَالُ قَالَ یَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ یُسْتَجَابُ لِیْ فَیَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِکَ وَیَدَعُ الدُّعَاءَ[2]۔

یعنی "دُعا میں لیے صبر و استقلال کی ضرورت ہوتی ہے اور جو انسان جلد بازی سے کام نہیں لیتا وہ بالآخر اپنی دُعا کا پھل ضرور حاصل کر لیتا ہے۔ ہاں اگر وہ خود تھک کر یہ کہنے لگ جاتے کہ میں نے تو بہت دُعائیں کر کے دیکھ لیا ہے خُدا نے میری کوئی نہیں سُنی اور پھر وہ اِس خیال کے ماتحت دُعا چھوڑ بیٹھے تو ایسے شخص کی دُعا واقعی قبول نہیں ہوتی"۔

غافل دل کی دُعا قبول نہیں ہوتی

پھر فرماتے ہیں:۔

اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ لَایَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ[3]

یعنی "جب تم دُعا کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ خدا تمہاری دُعا ضرور سُنے گا۔ اور یاد رکھو کہ خدا ایسے دل سے نکلی ہوئی دُعا ہرگز نہیں سُنتا جو غافل اور بے پروا ہے"۔

دُعا میں معیّن درخواست ہونی چاہیئے

پھر فرماتے ہیں:۔

اِذَا دَعَا اَحَدُکُمْ فَلْیَعْزِمِ الْمَسْئَلَۃَ وَلَا یَقُوْلَنَّ اَللّٰھُمَّ اِنْ شِئْتَ فَاَعْطِنِیْ فَاِنَّہٗ لَامُسْتَکْرِہَ لَہٗ[4]

یعنی "جب تم میں سے کوئی شخص دُعا کرنے لگے تو اُسے چاہیئے کہ اپنے سوال پر پختگی سے قائم ہو اور ایسے الفاظ استعمال نہ کرے کہ خدایا اگر تُو پسند کرے تو میری اس دُعا کو قبول

---

[1] صحیح بخاری و مسند احمد جلد ثانی صفحہ ۳۹۶ ۔ [2] صحیح مسلم ۔ [3] ترمذی ۔ [4] صحیح بخاری کتاب الدعوات

کرے کیونکہ خدا تو بہر حال اسی صورت میں قبول کرے گا کہ وہ اُسے پسند کرے گا کیونکہ خُدا سب کا حاکم ہے اور اس پر کسی کا دباؤ نہیں۔ پس خواہ نخواہ مشروط یا ڈھیلے ڈھالے الفاظ کہکر اپنی دُعا کے زور اور اپنے دل کی توجہ کو کمزور نہیں کرنا چاہیئے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آخری ارشاد علم النفس کے ایک بھاری اور پختہ اُصول پر مبنی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ دُعا کے لیے توجہ اور انہماک اور استغراق کی کیفیت ضروری ہے اور یہ کیفیت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ جب دُعا کرنے والا عزم اور یقین کے ساتھ ایک بات پر قائم ہو کر کسی چیز کا سوال کرے۔ لیکن اگر وہ اس قسم کے الفاظ کہے کہ خدایا تُو اگر چاہے تو میری یہ بات مان لے تو اس صورت میں اس کے اندر کبھی وہ توجہ اور وہ استغراق کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا جو دُعا کی قبولیت کے لیے ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بہر حال خدا انسان کے ماتحت تو ہے نہیں کہ ہر چیز جو انسان مانگے تو وہ ضرور اُسے دیدے اور انکار کی طاقت نہ رکھتا ہو بلکہ وہ ایک حکمران خدا ہے اور اپنے مصالح کے ماتحت قبول کرنے اور ردّ کرنے ہر دو کی طاقت رکھتا ہے تو پھر انسان کیوں اپنے دل میں ایک شک کی حالت پیدا کر کے اس عزم اور توجہ اور استغراق کے مقام سے متزلزل ہو جو سوال میں کشش اور قوتِ جذب پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔

خُدا پر ہمیشہ نیک گمان رکھو

اِس اصول کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوسری جگہ اِن الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:۔

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ[1]

یعنی "خُدا فرماتا ہے کہ میرا بندہ میرے متعلق جس قسم کا گمان رکھتا ہے مَیں اُسی کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہوں۔"

یہ نکتہ بھی بے شمار کامیابیوں کی کلید ہے مگر افسوس ہے کہ اکثر لوگ اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ بہر حال دُعا کے لیے عزم اور یقین کی کیفیت ضروری ہے اور عام حالات میں شک کے الفاظ میں دُعا کرنا جائز نہیں مگر یہ عدمِ جواز اسی صورت میں ہے کہ دُعا کرنے والا عدمِ یقین یا عدمِ توجہ کی وجہ سے ایسا طریق اختیار کرے لیکن اگر وہ خاص حالات میں توجہ اور یقین کے مقام پر قائم رہتے ہوئے پھر کسی معاملہ میں اپنے فیصلہ کو خدا پر چھوڑ دے اور اس کی وجہ سے اس کی حالت میں بے اعتمادی یا بے توجہی یا عدمِ یقین کا رنگ پیدا نہ ہو بلکہ توکّل علی اللہ اور تفویض اِلیٰ اللہ کا رنگ ہو تو ایسی صورت میں اس طریق پر دُعا کرنا بھی ناجائز نہیں ہوگا۔

---

[1] مسلم و بخاری

دُعا کے متعلق اسلامی تعلیم کا خلاصہ

مذکورہ بالا آیات واحادیث سے مسئلہ دُعا کے متعلق مندرجہ ذیل اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر حال میں خدا سے دُعا کرتا رہے خواہ اُسے خوف کی حالت درپیش ہو یا طمع کی خواہ وہ تنگی کی حالت میں ہو یا آرام میں۔ خواہ وہ کسی مصیبت سے بچنا چاہتا ہو یا کسی بھلائی کے حاصل کرنے کا آرزومند ہو۔

۲۔ دُعا ہر حالت میں ہونی چاہیئے تضرع کی حالت میں بھی اور خفیہ حالت میں بھی یعنی اُس وقت بھی کہ جب انسان پر افکار کا ایسا ہجوم ہو کہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکتا ہو اور وہ پھوٹ پھوٹ کر باہر آتے ہوں اور اُس وقت بھی کہ جب وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر صبر اور خاموشی کے ساتھ اپنی التجا کو پیش کر سکتا ہو۔

۳۔ دُعا کی قبولیت کے لیے سچا ایمان اور نیکی اور طہارت اور اطاعت اور عبودیت ضروری ہیں۔ جو لوگ خدا کی آواز پر کان دھرتے ہیں خدا بھی اُن کی آواز کو زیادہ توجہ اور زیادہ محبت کے ساتھ سُنتا ہے۔

۴۔ ناشکر لوگوں کی دُعائیں جو خدا کے انعاموں پر شکر گزاری کا طریق اختیار نہیں کرتے اور نیز ان لوگوں کی دُعائیں جو خدائی نظام کے باغی ہیں درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتیں بلکہ صدائے صحرا کی طرح فضا میں گونج کر ختم ہو جاتی ہیں۔

۵۔ دُعا میں یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ خدائی قضا و قدر کو بھی بدل سکتی ہے یعنی اگر خدا کے عام قانونِ قدرت کے ماتحت کوئی بات ہونے والی ہو اور پھر اس کا کوئی پاک بندہ اس سے اس بات کے ٹل جانے کی دُعا کرے تو خدا تعالےٰ اپنی اِس عام تقدیر کو بدل کر اپنے بندے کی دُعا کے مطابق خاص تقدیر جاری کر دیتا ہے۔

۶۔ مگر خدا کا یہ ازلی فیصلہ ہے کہ وہ اپنی کسی سُنّت یا وعدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کرتا۔ پس ایسی دُعائیں جو اُس کی کسی سُنّت یا وعدہ کے خلاف ہوں قبول نہیں ہوتیں۔ اسی طرح ایسی دُعائیں جو گناہ یا قطعِ رِحمی کا دروازہ کھولتی ہوں قبول نہیں ہوتیں۔

۷۔ دُعا کے لیے جلد بازی سّمِ قاتل ہے بلکہ صبر اور استقلال کے ساتھ دُعا میں لگے رہنا چاہیئے جو لوگ کچھ وقت دُعا کر کے پھر تھک جاتے اور اِس قسم کے الفاظ بولنے لگ جاتے ہیں کہ ہم نے بہت دُعائیں کر کے دیکھ لیا خدا ہماری نہیں سُنتا ان کی دُعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

۸۔ دُعا میں شک یا عدمِ یقین یا مایوسی کے الفاظ ہرگز استعمال نہیں کرنے چاہئیں بلکہ یقین اور عزم کے ساتھ یہ اُمید رکھتے ہوئے کہ خدا ہماری سُنے گا دُعا کرنی چاہیئے۔

۹۔ خدا دُعا کے قبول کرنے یا ردّ کرنے میں آزاد ہے۔ اُس پر کسی کا دباؤ یا جبر نہیں۔ جب وہ کسی دُعا کو قبولیت کے قابل خیال کرتا ہے تو اُسے قبول کرتا ہے اور جب قبولیت کے قابل نہیں سمجھتا تو اُسے ردّ کر دیتا ہے۔ مگر بظاہر ردّ کرنے کی صورت میں بھی اگر دُعا کرنے والا مستحق ہے تو خدا کسی اَور رنگ میں اُس کی تلافی فرما دیتا ہے خواہ اِسی دُنیا میں خواہ آخرت میں۔

۱۰۔ دُعا تمام عبادتوں کی جان اور رُوحِ رواں ہے اور جو عبادت دُعا سے خالی ہے وہ اس ردّی اور کھوکھلی ہڈی کی طرح ہے جو گُودے سے خالی ہو۔

اِس نوٹ کو ختم کرنے سے پہلے یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ اسلام نے نہ صرف دُعا کے مسئلہ کو تشریح اور تفصیل کے ساتھ بیان کر کے اس پر خاص زور دیا ہے بلکہ مسلمانوں کو دُعا کا عملی سبق دینے اور دُعا کا عادی بنانے کے لیے انسان کی ہر حرکت و سکون کے ساتھ کوئی نہ کوئی دُعا مقرر کر دی ہے تاکہ اس کی کوئی گھڑی خُدا کی یاد سے خالی نہ رہے مثلاً کسی کے پیدا ہونے۔ کسی کے وفات پانے۔ مسجد میں داخل ہونے۔ مسجد سے نکلنے۔ سفر میں جانے۔ سفر سے واپس آنے۔ سواری پر چڑھنے۔ سواری سے اُترنے۔ کھانا شروع کرنے۔ کھانا ختم کرنے۔ بستر پر جانے۔ بستر سے اُٹھنے۔ پہاڑی پر چڑھنے۔ وادی میں اُترنے۔ دوستوں سے ملنے۔ دوستوں سے جُدا ہونے۔ شادی کرنے۔ بیوی سے ملنے۔ نیا چاند دیکھنے۔ بارش کے برسنے۔ بارش کے رُکنے۔ آندھی کے چلنے۔ گھر سے نکلنے۔ گھر میں داخل ہونے۔ موسم کا پہلا پھل کھانے۔ بیمار کی تیمارداری کرنے۔ کسی مسلمان کی نعش کے پاس جانے۔ کسی مسلمان کو دفن کرنے۔ غرض زندگی کے ہر حرکت و سکون کو کسی نہ کسی دُعا کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور یہ دعا محض رسمی دُعا نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی زندہ چیز ہے جو ایک سچا مسلمان کامل یقین اور حضورِ قلب کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ کاش دُنیا اس عظیم الشان خزانہ کی قدر کرے۔

اہلِ خیبر کی طرف سے مزید خطرہ اور قتل اُسَیر بن رِزام شوال ۶ھ

ابورافع سلام بن ابی الحقیق کے قتل کے بعد خیبر کے یہودیوں نے اپنی سرداری کا تاج ایک ایسے شخص کے سر پر رکھا جو اسلام کی عداوت میں ابورافع سے کم نہیں تھا۔ اس شخص کا نام اُسیر بن رزام تھا[1] اس ظالم نے اپنے نئے عہدہ پر فائز ہوتے ہی اس کام کی تکمیل کا تہیہ کر لیا جسے ابورافع ادھورا چھوڑ کر مر گیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلا کام اُسیر نے یہ کیا کہ تمام یہودیوں کو ایک جگہ جمع کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک سخت اشتعال انگیز تقریر کی اور کہا کہ اب تک یہودی رؤساء نے جو تدابیر اسلام کے خلاف اختیار کی ہیں وہ درست نہیں تھیں اب

---

[1] ابن سعد حالات سریہ عبداللہ بن رواحہ

میں ایک نیا طریق اختیار کروں گا اور قبائل غطفان وغیرہ کی مدد سے ایک ایسی چال چلوں گا کہ محمدؐ کے گھر کی بنیاد میں نقب لگ جائے گی [1] اس کے بعد اس بدبخت نے نجدی قبائل غطفان وغیرہ کا دورہ کرنا شروع کیا اور اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے اُن میں ایسی آگ لگا دی کہ وہ پھر حملہ آور ہونے کے لیے جمع ہونے لگے [2]

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات سے اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فوراً اپنے ایک انصاری صحابی عبداللہ بن رواحہ کو تین دوسرے صحابیوں کی معیت میں خیبر کی طرف روانہ فرمایا اور انہیں تاکید فرمائی کو مخفیہ مخفیہ جائیں اور سارے حالات معلوم کر کے جلد تر واپس آجائیں [3] چنانچہ عبداللہ بن رواحہ اور ان کے ساتھی گئے اور خفیہ خفیہ تمام حالات اور کوائف کا پتہ لیکر اور یہ تصدیق کر کے کہ یہ خبریں درست ہیں واپس آگئے۔ بلکہ عبداللہ بن رواحہ اور اُن کے ساتھیوں نے ایسی ہوشیاری سے کام لیا کہ خیبر کے قلعوں کے آس پاس گھوم کر اور اُسیر بن رزام کی مجلس گاہوں کے پاس پہنچ کر خود اُسیر اور اس کے ساتھیوں کی زبانی یہ سُن لیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ یہ تدبیریں کر رہے ہیں [4]۔ انہی دنوں میں ایک غیر مسلم شخص خارجہ بن حُسَیل اتفاقاً خیبر کی طرف سے مدینہ میں آیا اور اُس نے بھی عبداللہ بن رواحہ کی تصدیق کی اور کہا کہ میں اُسیر کو ایسی حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے اپنے لاؤ لشکر کو جمع کر رہا تھا [5]

اِس تصدیق کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن رواحہ کی امارت میں تیس صحابہ کی ایک پارٹی خیبر کی طرف روانہ فرمائی اور گو روایات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس پارٹی کو کیا ہدایات دے کر روانہ فرمایا تھا مگر اس گفت وشنید سے جو خیبر میں عبداللہ بن رواحہ اور اُسیر بن رزام میں ہوئی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ تھا کہ اُسیر کو مدینہ میں بُلا کر اُس کے ساتھ کوئی ایسا سمجھوتہ کیا جاتے جس سے اِس فتنہ انگیزی کا سلسلہ رُک جاتے اور مُلک میں امن وامان کی صورت پیدا ہو۔ اِس خواہش میں آپؐ اِس حد تک تیار تھے کہ اگر اُسیر کو خیبر کے علاقہ کا امیر تک تسلیم کرنا پڑے تو تسلیم کر لیا جائے بشرطیکہ آئندہ کے لیے وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی فتنہ انگیزی سے باز آجاتے [5]

جب عبداللہ بن رواحہ کی پارٹی خیبر میں پہنچی تو سب سے پہلے انہوں نے اُسیر بن رزام سے دوران

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۷۰ حالات سریہ عبداللہ بن رواحہ۔ [2] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۶ و ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۸۲، ۸۳
[3] ابن سعد و زرقانی۔ [4] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۷۰۔ [5] زرقانی
[5] ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸۲، ۸۳ و ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۷ و سیرۃ حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۲۰۳

گفتگو کے لیے امن وامان کا عہد لیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت خطرہ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ مسلمان سمجھتے تھے کہ کہیں اِس گفت وشنید کے درمیان ہی اُسیر کی طرف سے کوئی غداری کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ اُسیر نے اقرار کیا کہ ایسا نہیں ہوگا مگر ساتھ ہی اپنی شرم رکھنے کے لیے اسی قسم کا عہد عبداللہ بن رواحہ سے بھی لیا[1] مگر عبداللہ بن رواحہ کی طرف سے اس معاملہ میں پہل ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اصل خطرہ کس کی طرف سے تھا۔ بہرحال اِس قول وقرار کے بعد عبداللہ بن رواحہ نے اُسیر سے گفتگو شروع کی جس کا مآل یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے ساتھ ایک امن وامان کا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ آپس کی جنگ رُک جائے اور اس کے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ تم خود مدینہ میں چل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ بات کرو۔ اگر اس قسم کا معاہدہ ہوگیا تو مَیں اُمید کرتا ہوں کہ رسول اللہ تمہارے ساتھ احسان کا معاملہ کریں گے اور ممکن ہے کہ تمہیں خیبر کا باقاعدہ رئیس تسلیم کر لیا جائے[2] اُسیر کو جو سخت جاہ طلب تھا، یا یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے دل میں کوئی اور نیت مخفی ہو یہ تجویز پسند آئی اور کم ازکم اُس نے یہ ظاہر کیا کہ مجھے یہ تجویز پسند ہے مگر ساتھ ہی اُس نے خیبر کے یہودی عمائد کو جمع کرکے اُن سے مشورہ مانگا کہ مسلمانوں کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی ہے اس کے متعلق کیا کیا جائے۔ یہود نے جو اسلام کے خلاف عامیانہ عداوت میں اندھے ہو رہے تھے عام طور پر اس تجویز کی مخالفت کی اور اُسیر کو اس ارادے سے باز رکھنے کی غرض سے کہا کہ ہمیں اُمید نہیں کہ محمد (ﷺ) تمہیں خیبر کا امیر تسلیم کریں۔ مگر اُسیر جو حالات سے زیادہ واقف تھا اپنی بات پر قائم رہا اور کہنے لگا "تم نہیں جانتے۔ محمدؐ اِس جنگ سے تنگ آیا ہوا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ جس طرح ہو اِس لڑائی کا سلسلہ رُک جائے"[3]

الغرض اُسیر بن رزام عبداللہ بن رواحہ کی پارٹی کے ساتھ مدینہ چلنے کے لیے تیار ہوگیا اور عبداللہ بن رواحہ کی طرح خود اُس نے بھی تیس یہودی اپنے ساتھ لے لیے[4] جب یہ دونوں پارٹیاں خیبر سے نکل کر ایک مقام قرقرہ میں پہنچیں جو خیبر سے چھ میل کے فاصلہ پر تھا[5] تو اُسیر کی نیت بدل گئی یا اگر اس کی نیت پہلے سے خراب تھی تو یوں سمجھنا چاہیئے کہ اُس کے اظہار کا وقت آگیا۔ چنانچہ اس نے باتیں کرتے کرتے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی پارٹی کے ایک معزز فرد عبداللہ بن انیس انصاری کی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عبداللہ فوراً تاڑ گئے کہ اس بدبخت کے تیور بدلے ہوتے ہیں[6] چنانچہ انہوں نے جھٹ اپنی اونٹنی کو ایڑ لگا کر اُسے آگے کر لیا اور پھر اُسیر کی طرف گھوم کر آواز دی کہ "اے دشمنِ خدا کیا تم ہمارے ساتھ غداری کرنا چاہتے ہو؟" عبداللہ بن انیس نے دو دفعہ یہ الفاظ دُہرائے، مگر اُسیر نے کوئی جواب نہیں دیا[7]

---

[1] ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۔ [2] ابن سعد و ابن ہشام و زرقانی۔ [3] سیرۃ حلبیہ جلد ۳ حالات سریہ عبداللہ بن رواحہ۔ [4] ابن سعد۔ [5] ابن ہشام

[6] ابن سعد و ابن ہشام۔ [7] ابن سعد

اور نہ ہی اُس نے اپنی کوئی بریّت کی بلکہ وہ سامنے سے جنگ کے لیے تیار تھا۔ یہ غالباً یہودیوں میں پہلے سے مقرر شدہ اشارہ تھا کہ ایسا موقع آئے تو سب مل کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ اُسی جگہ عین راستہ میں مسلمانوں اور یہودیوں میں تلوار چل گئی۔ اور گو دونوں پارٹیاں تعداد میں برابر تھیں اور یہودی لوگ پہلے سے ذہنی طور پر تیار تھے اور مسلمان بالکل بے ارادہ تھے مگر خدا کا ایسا فضل ہوا کہ بعض مسلمان زخمی تو بے شک ہوئے مگر اُن میں سے کسی جان کا نقصان نہیں ہوا، لیکن دوسری طرف سارے یہودی اپنی غداری کا مزا چکھتے ہوئے خاک میں مل گئے۔[1]

جب صحابہ کی یہ پارٹی مدینہ میں واپس پہنچی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حالات سے اطلاع ہوئی تو آپؐ نے مسلمانوں کے صحیح سلامت بچ جانے پر خُدا کا شکر کیا اور فرمایا:۔

قَدْ نَجَّاكُمُ اللّٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ[2]

"شکر کرو کہ خدا نے تمہیں اس ظالم پارٹی سے نجات دی۔"

اِس واقعہ کے متعلق بعض مسیحی مؤرخین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ گویا عبداللہ بن رواحہ کی پارٹی اُسیر وغیرہ کو خیبر سے اسی نیت سے نکال کر لائی تھی کہ رستہ میں موقع پاکر اُنہیں قتل کر دیا جائے مگر یہ اعتراض مغربی سینہ زوری کے ایک ناگوار مظاہرہ کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے تاریخ میں اِس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مسلمان اس نیت سے وہاں گئے تھے، بلکہ غور کیا جاوے تو قطع نظر دوسرے شواہد کے صرف عبداللہ بن انیس کے یہ الفاظ ہی کہ "اے دشمنِ خُدا! کیا غداری کی نیت ہے؟" اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ "شکر کرو کہ خدا نے تمہیں اس ظالم پارٹی سے نجات دی۔" اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مسلمانوں کی نیت بالکل صاف اور پُرامن تھی اور جو کچھ ہوا وہ محض اس غداری کا نتیجہ تھا جو یہودی لوگ حسبِ عادت مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہتے تھے مگر جسے خدا نے اپنے فضل سے خود اُنہی پر اُلٹا دیا۔

آنحضرتؐ کے قتل کی سازش اور سریہ عمرو بن اُمیّہ شوال ۶ ہجری

غزوۂ احزاب کی ذلّت بھری ناکامی کی یاد نے قریشِ مکہ کے تن بدن میں آگ لگا رکھی تھی اور طبعاً یہ قلبی آگ زیادہ تر ابوسفیان کے حصہ میں آئی تھی جو مکّہ کا رئیس تھا اور احزاب کی مہم میں خاص طور پر ذلّت کی مار کھا چکا تھا۔ کچھ عرصہ تک ابوسفیان اس آگ میں اندر ہی اندر جلتا رہا مگر بالآخر معاملہ اس کی برداشت سے نکل گیا اور اس آگ کے مخفی شعلے باہر آنے شروع ہو گئے۔ طبعاً کفار کی سب سے زیادہ عداوت بلکہ درحقیقت اصل عداوت آنحضرت صلی اللہ

---

[1] ابن ہشام و ابن سعد۔ [2] ابن سعد

علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ تھی۔ اس لیے اب ابوسفیان اس خیال میں پڑ گیا کہ جب ظاہری تدبیروں اور حیلوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو کیوں کسی مخفی تدبیر سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ نہ کر دیا جاتے۔ وہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرد گرد کوئی خاص پہرہ نہیں رہتا بلکہ بعض اوقات آپؐ بالکل بے حفاظتی کی حالت میں اِدھر اُدھر آتے جاتے۔ شہر کے گلی کوچوں میں پھرتے۔ مسجد میں روزانہ کم از کم پانچ وقت نمازوں کے لیے تشریف لاتے اور سفروں میں بالکل بے تکلفانہ اور آزادانہ طور پر رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ اچھا موقع کسی کرایہ دار قاتل کے لیے کیا ہو سکتا تھا؟ یہ خیال آنا تھا کہ ابوسفیان نے اندر ہی اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی تجویز پختہ کرنی شروع کر دی۔

جب وہ پورے عزم کے ساتھ اس ارادے پر جم گیا تو اُس نے ایک دن موقع پا کر اپنے مطلب کے چند قریشی نوجوانوں سے کہا کہ "کیا تم میں سے کوئی ایسا جوانمرد نہیں جو مدینہ میں جا کر خفیہ خفیہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام تمام کر دے؟ تم جانتے ہو کہ محمد کھلے طور پر مدینہ کی گلی کوچوں میں پھرتا ہے۔" ان نوجوانوں نے اس خیال کو سُنا اور لے اُڑے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ایک بدوی نوجوان ابوسفیان کے پاس آیا اور کہنے لگا "میں نے آپ کی تجویز سُنی ہے اور میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ میں ایک مضبوط دل والا اور پختہ کار انسان ہوں جس کی گرفت سخت اور حملہ فوری ہوتا ہے۔ اگر آپ مجھے اس کام کے لیے مقرر کر کے میری مدد کریں تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے کی غرض سے جانے کے لیے تیار ہوں۔ اور میرے پاس ایک ایسا خنجر ہے جو شکاری گِدھ کے مخفی پروں کی طرح رہے گا۔ سو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ کروں گا اور پھر بھاگ کر کسی قافلہ میں مل جُل جاؤنگا اور مسلمان مجھے پکڑ نہیں سکیں گے۔ اور میں مدینہ کے رستہ کا بھی خوب ماہر ہوں۔" ابوسفیان نے کہا "بس بس تم ہمارے مطلب کے آدمی ہو۔" اس کے بعد ابوسفیان نے اُسے ایک تیز رو اونٹنی اور زادِ راہ وغیرہ دیکر رُخصت کیا اور تاکید کی کہ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا۔[1]

مکہ سے رُخصت ہو کر یہ شخص دن کو چھپتا ہوا اور رات کو سفر کرتا ہوا مدینہ کی طرف روانہ ہوا اور چھٹے دن مدینہ پہنچ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ لیتے ہوئے سیدھا قبیلہ بنی عبدالاشہل کی مسجد میں پہنچا جہاں آپؐ اُس وقت تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ چونکہ اُن ایام میں نئے سے نئے آدمی مدینہ میں آتے رہتے تھے اس لیے کسی مسلمان کو اُس کے متعلق شُبہ نہیں ہوا۔ مگر جونہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے اپنی طرف آتے دیکھا آپؐ نے فرمایا "یہ شخص کسی بُری نیت سے آیا ہے۔" وہ یہ الفاظ سُنکر اور بھی تیزی کے ساتھ آپؐ کی طرف بڑھا مگر ایک انصاری رئیس اُسید بن حُضیر فوراً لپک کر اُس کے

---

[1] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۵

ساتھ لپٹ گئے اور اس جدوجہد میں اُن کا ہاتھ اُس کی چھپی ہوئی خنجر پر جا پڑا جس پر وہ گھبرا کر بولا "میرا خون میرا خون" جب اُسے مغلوب کر لیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے پوچھا کہ "سچ سچ بتاؤ تم کون ہو اور کس ارادے سے آئے ہو؟" اُس نے کہا میری جان بخشی کی جائے تو مَیں بتا دوں گا۔ آپؐ نے فرمایا ہاں اگر تم ساری بات سچ سچ بتا دو تو پھر تمہیں معاف کر دیا جائے گا جس پر اُس نے سارا قصہ من و عن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ ابوسفیان نے اُس سے اِس اِس قدر انعام کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے بعد یہ شخص چند دن تک مدینہ میں ٹھہرا اور پھر اپنی خوشی سے مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گیا۔[1]

ابوسفیان کی اِس خونی سازش نے اِس بات کو آگے سے بھی زیادہ ضروری کر دیا کہ مکہ والوں کے ارادے اور نیت سے آگاہی رکھی جائے۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے دو صحابی عمرو بن امیہ ضمری اور سلمہ بن اسلم کو مکہ کی طرف روانہ فرمایا اور ابوسفیان کی اس سازشِ قتل اور اس کی سابقہ خون آشام کارروائیوں کو دیکھتے ہوئے انہیں اجازت دی کہ اگر موقع پائیں تو بے شک اسلام کے اس حربی دشمن کا خاتمہ کر دیں مگر جب اُمیّہ اور اُن کا ساتھی مکہ میں پہنچے تو قریش ہوشیار ہو گئے اور یہ دو صحابی اپنی جان بچا کر مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔ راستہ میں اُنہیں قریش کے دو جاسوس مل گئے جنہیں رؤساء قریش نے مسلمانوں کی حرکات و سکنات کا پتہ لینے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا علم حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ یہ تدبیر بھی قریش کی کسی اَور خونی سازش کا پیش خیمہ ہو مگر خدا کا فضل ہوا کہ اُمیّہ اور سلمہ کو انکی جاسوسی کا پتہ چل گیا جس پر انہوں نے ان جاسوسوں پر حملہ کر کے انہیں قید کر لینا چاہا مگر انہوں نے سامنے سے مقابلہ کیا۔ چنانچہ اِس لڑائی میں ایک جاسوس تو مارا گیا اور دوسرے کو قید کر کے وہ اپنے ساتھ مدینہ میں واپس لے آئے۔[2]

اِس سریہ کی تاریخ کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔ ابن ہشام اور طبری اسے ۴ ہجری میں بیان کرتے ہیں مگر ابن سعد نے اسے ۶ ہجری میں لکھا ہے اور علامہ قسطلانی اور زرقانی نے ابن سعد کی روایت کو ترجیح دی ہے لہٰذا مَیں نے بھی اسے ۶ ہجری میں بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن سعد کی روایت کے مفہوم کی تائید بیہقی نے بھی کی ہے[3] مگر اس میں اِس واقعہ کے زمانہ کا پتہ نہیں چلتا۔

---

[1] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۸ و زرقانی جلد ۲ حالات سریہ عمرو بن امیہ ضمری۔

[2] ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۸ و زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۶۸ و ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸۹، ۹۰ و طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴۳۷ تا صفحہ ۱۴۴۱۔ [3] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۶۷

قبائلِ عُکل وعُرینہ کی غداری اور اسکا ہولناک انجام شوال ۶ھ

مسلمانوں کے لیے یہ دن بہت خطرناک تھے کیونکہ قریش اور یہود کی انگیخت سے سارا مُلک اُن کی عداوت کی آگ سے شعلہ زن ہو رہا تھا اور اپنی جدید پالیسی کے ماتحت اُنہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ مدینہ پر باقاعدہ حملہ کرنے کی بجائے درپردہ طریقوں سے نقصان پہنچایا جائے اور چونکہ دھوکا دہی اور غداری عرب کے وحشی قبائل کے اخلاق کا حصہ تھی اس لیے وہ ہر جائز و ناجائز طریق سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے تھے چنانچہ جس واقعہ کا ذکر ہم اب کرنے لگے ہیں وہ اسی ناپاک سلسلہ کی ایک کڑی تھی جو ایک ہولناک رنگ میں اپنے انجام کو پہنچی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ شوال ۶ھ[1] میں قبیلہ عُکل اور عرینہ کے چند آدمی[2] جو تعداد میں آٹھ تھے[3] مدینہ میں آئے اور اسلام کے ساتھ محبت اور موانست کا اظہار کر کے مسلمان ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے قیام کے بعد اُنہیں مدینہ کی آب وہوا میں معدہ اور تلی وغیرہ کی جو کچھ شکایت پیدا ہوئی تو وہ اُسے بہانہ بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی تکلیف بیان کر کے کہا کہ یا رسول اللہ! ہم جنگلی لوگ ہیں اور جانوروں کے ساتھ رہنے میں عمر گذاری ہے اور شہری زندگی کے عادی نہیں اس لیے بیمار ہو گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تمہیں یہاں مدینہ میں تکلیف ہے تو مدینہ سے باہر جہاں ہمارے مویشی رہتے ہیں وہاں چلے جاؤ اور اونٹوں کا دودھ وغیرہ پیتے رہو۔ اچھے ہو جاؤ گے[4] اور ایک روایت میں یہ ہے کہ انہوں نے خود کہا کہ یا رسول اللہ اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم مدینہ سے باہر جہاں آپ کے مویشی رہتے ہیں وہاں چلے جاتے ہیں جس کی آپؐ نے اجازت دے دی[5] بہرحال وہ آنحضرتؐ سے اجازت لیکر مدینہ سے باہر اُس چراگاہ میں چلے گئے جہاں مسلمانوں کے اونٹ رہتے تھے۔

جب ان بدبختوں نے یہاں اپنا ڈیرا جما لیا اور آگے پیچھے نظر ڈال کر سارے حالات معلوم کر لیے اور کُھلی ہوا میں رہ کر اور اونٹوں کا دودھ پی کر خوب موٹے تازے ہو گئے تو ایک دن اچانک اونٹوں کے رکھوالوں پر حملہ کر کے انہیں مار دیا اور مارا بھی اس بے دردی سے کہ پہلے تو جانوروں کی طرح ذبح کیا اور پھر جب ابھی کچھ جان باقی تھی تو اُن کی زبانوں میں صحرا کے تیز کانٹے چبھوتے تا کہ جب وہ مُنہ سے کوئی آواز نکالیں یا پیاس کی وجہ سے تڑپیں تو یہ کانٹے اُن کی تکلیف کو اور بھی بڑھا دیں[6] اور پھر ان ظالموں

---

[1] ابن سعد۔ [2] بخاری کتاب المغازی۔ [3] مسلم کتاب القسامۃ۔ [4] بخاری کتاب المغازی و کتاب المحاربین۔ [5] ابوعوانہ بروایت زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۷۳۔

[6] ابن ہشام و ابن سعد

نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ گرم سلائیاں لیکر ان نیم مُردہ مسلمانوں کی آنکھوں میں پھیر یں[1]۔ اور اس طرح یہ بے گناہ مسلمان کھلے میدان میں تڑپ تڑپ کر جان بحق ہو گئے۔ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ذاتی خادم بھی تھا جس کا نام یسار تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹوں کے چُرانے پر مقرر تھا[2]۔

جب یہ درندے اِس وحشیانہ رنگ میں مسلمانوں کا کام تمام کر چکے تو پھر سارے اونٹوں کو اکٹھا کر کے اُنہیں ہنکا لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ حالات ایک رکھوالے نے پہنچائے جو اتفاق سے بچ کر نکل آیا تھا جس پر آپؐ نے فوراً بیس صحابہ کی ایک پارٹی تیار کر کے اُن کے پیچھے بھجوا دی اور گو یہ لوگ کچھ فاصلہ طے کر چکے تھے مگر خُدا کا یہ فضل ہوا کہ مسلمانوں نے پھُرتی کے ساتھ پیچھا کر کے انہیں جا پکڑا اور رسیوں سے باندھ کر واپس لے آئے۔ اِس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ احکام نازل نہیں ہوتے تھے کہ اگر کوئی شخص اس قسم کی حرکت کرے تو اُس کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیئے چنانچہ آپ نے اپنے قدیم اُصول کے ماتحت کہ جب تک اسلام میں کوئی نیا حکم نازل نہ ہو اہل کتاب کے طریق پر چلنا چاہیئے[3] موسوی شریعت کے مطابق[4] حکم دیا کہ جس طرح اِن ظالموں نے مسلمان رکھوالوں کے ساتھ سلوک کیا ہے اُسی طرح قصاصی اور جوابی صورت میں اِن کے ساتھ کیا جاتے تا کہ یہ سزا دوسروں کے لیے عبرت ہو۔ چنانچہ خفیف تغیّر کے ساتھ اُسی رنگ میں مدینہ سے باہر کھلے میدان میں ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا مگر اسلام کے لیے خدا نے دوسری تعلیم مقدر کر رکھی تھی چنانچہ آئندہ کیلئے جوابی اور قصاصی صورت میں بھی مُثلہ کی سزا منع کر دی گئی یعنی اس بات کو ناجائز قرار دیا گیا کہ کسی رنگ میں مقتول کے جسم کو بگاڑا جاتے یا انتقامی رنگ میں اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتے وغیر ذالک[5]۔

اِس واقعہ کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ بہر حال اس معاملہ میں ظلم کی ابتداء کفار کی طرف سے تھی جنہوں نے بغیر کسی جائز وجہ کے محض اسلام کی عداوت میں بے گناہ مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کا ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا اور جو کچھ اُن کی سزا میں کیا گیا وہ محض قصاصی اور جوابی تھا اور تھا بھی ایسے حالات میں جب کہ اسلام کے خلاف سارا مُلک دشمنی اور عداوت کی آگ سے بھڑک رہا تھا۔ اور پھر یہ فیصلہ بھی موسوی شریعت کے مطابق کیا گیا تھا، لیکن پھر بھی اسلام نے اسے برقرار نہیں رکھا اور آئندہ کے لیے ایسے طریق سے منع کر دیا۔ اِن حالات میں کوئی عقل مند اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ اس موقع

---

[1] مسلم کتاب القسامۃ باب حکم المحاربین اور ترمذی کتاب الطہارۃ ماجاء فی بول مایوکل لحمہ۔ [2] ابن ہشام
[3] بخاری کتاب اللباس باب الفرق۔ [4] خروج ۲۱ و احبار ۲۴ و استثناء ۱۹
[5] بخاری کتاب المغازی قصہ عکل وعرینہ وابن سعد حالات سریہ کرز بن جابر و سر ولیم میور صفحہ ۳۵۰

پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ لوگ شروع سے ہی بُری نیت کے ساتھ مدینہ میں آئے تھے اور غالباً اپنے قبیلہ کے سکھائے ہوئے تھے کہ تا مسلمانوں میں رہ کر انہیں نقصان پہنچائیں اور ممکن ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی اُن کا کوئی بُرا ارادہ ہو مگر جب مدینہ میں رہ کر انہیں کوئی موقع نہیں مِلا تو اُنہوں نے یہ تجویز کی کہ مدینہ سے باہر نکل کر کارروائی کی جاوے۔ اُنکی اس نیت کا اِس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ اُنہوں نے مسلمانوں کے چرواہوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ خالی چوروں اور لٹیروں والا سلوک نہیں تھا بلکہ سراسر منتقمانہ رنگ رکھتا تھا۔ اگر وہ ابتدا میں سچے دل سے مسلمان ہوتے تھے اور بعد میں اونٹ دیکھ کر اُن کی نیت بدل گئی تو اس صورت میں ہونا یہ چاہیئے تھا کہ وہ اونٹ لے کر بھاگ جاتے اور اگر کوئی رکھوالا روک بنتا تو زیادہ سے زیادہ اُسے مار کر نکل جاتے مگر جس رنگ میں اُنہوں نے مسلمان چرواہوں کو قتل کیا اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر قتل کے سفاکانہ فعل کو لمبا کیا اور عذاب دے دیکر مارا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا یہ فعل اتفاقی لالچ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ سراسر معاندانہ رنگ رکھتا تھا اور دلی کینہ اور لمبے بُغض کا نتیجہ تھا۔ اور اُن کے اِس ظالمانہ فعل کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا وہ محض قصاصی اور جوابی تھا جو اسلامی احکام کے نزول سے پہلے موسوی شریعت کے مطابق کیا گیا، لیکن اس کے بعد جلد ہی اسلامی احکام نازل ہو گئے اور اِس قسم کی تعذیب انتقامی رنگ میں بھی ناجائز قرار دیدی گئی چنانچہ بخاری کے الفاظ یہ ہیں:۔

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ بَعْدَ ذٰلِکَ کَانَ یَحُثُّ عَلَی الصَّدَقَۃِ وَیَنْھٰی عَنِ الْمُثْلَۃِ [۱]

یعنی "اس واقعہ کے بعد آنحضرت ﷺ احسان اور حُسنِ سلوک کی تاکید فرمایا کرتے تھے اور ہر حال میں دشمنوں کے جسموں کے مُثلہ کرنے سے منع فرماتے تھے۔"

بعض مغربی محققین نے جن میں میور صاحب بھی شامل ہیں[۲] اس واقعہ کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے حسبِ عادت اعتراض کیا ہے کہ جس رنگ میں اِن قاتل ڈاکوؤں کو قتل کیا گیا وہ ظالمانہ اور وحشیانہ تھا، لیکن اگر سارے حالات کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو اِس معاملہ میں اسلام کا دامن بالکل پاک نظر آتا ہے کیونکہ دراصل یہ فیصلہ اسلام کا نہیں تھا بلکہ حضرت موسیٰ کا تھا[۳] جنکی شریعت کو حضرت مسیح ناصری نے منسوخ نہیں کیا بلکہ برقرار رکھا[۴] ہاں اگر ہمارے معترضین کے پیشِ نظر حضرت مسیح

---

[۱] بخاری کتاب المغازی باب قصۃ عکل ؛ [۲] میور صفحہ ۳۵۰۔ [۳] خروج باب ۲۱ آیت ۲۳ تا ۲۵ و احبار باب ۲۴ آیت ۱۹ تا ۲۱ و استثناء باب ۱۹ آیت ۲۱ ؛ [۴] متی باب ۵ آیت ۱۷ تا ۱۹

کا یہ قول ہے کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال بھی سامنے کر دو اور اگر کوئی شخص تمہارا کُرتہ لینا چاہے تو اُسے اپنا چوغہ بھی دیدو اور اگر کوئی تمہیں ایک کوس بیگار لے جانا چاہے تو دو کوس چلے جاؤ۔[1] تو بے شک ہمارے معترضین کو اس اعتراض کا حق ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ تعلیم کسی عقلمند کے نزدیک قابلِ عمل ہے اور کیا آج تک ان ساڑھے اُنیس سو سالوں میں کسی مسیحی مرد یا عورت یا کسی مسیحی جماعت یا حکومت نے اس تعلیم پر عمل کیا ہے ؟ منبروں پر چڑھ کر وعظ کرنے کے لیے بیشک یہ ایک عمدہ تعلیم ہے مگر عملی دُنیا میں اس تعلیم کو کوئی بھی وزن حاصل نہیں اور نہ کوئی عقل منداس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس قسم کے جذباتی کھلونے سامنے رکھ کر مسلمانوں کو اعتراض کا نشانہ بنانا خود اپنی جہالت کا ثبوت دینا ہے۔ ہاں حضرت موسیٰؑ کی تعلیم کو سامنے رکھ کر دیکھو جو بخلاف حضرت مسیح ایک سچے مقنن تھے اور قانون کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے یا مسیحیوں کے قول کو نہیں بلکہ اُن کے عملی کارناموں کی روشنی میں حالات کا امتحان کرو تو پھر حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عملی میدان میں کوئی مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا ہے اور اُس کے کھانے کے دانت اور دکھانے کے دانت الگ الگ نہیں ہیں اور اس کے قول و فعل ہر دو اس اعلیٰ مقام پر فائز ہیں کہ کوئی عقلمند غیر متعصب انسان ان پر اعتراض نہیں کر سکتا بلکہ دل سے اُس کی تعریف نکلتی ہے۔ نہ تو وہ موسوی شریعت کی طرح یہ کہتا ہے کہ ہر حالت میں انتقام لو اور بلا امتیازِ حالات قصاص کا تیر چلاتے جاؤ اور نہ وہ مسیحی تعلیم کے مطابق یہ ہدایت کرتا ہے کہ کسی حالت میں بھی سزا نہ دو بلکہ اگر مجرم کوئی جُرم کرے تو اس کے جُرم کے منشاء کو اپنی طرف سے مدد کر کے اَور بھی مضبوط کر دو۔ بلکہ اسلام افراط و تفریط کے رستے کو چھوڑ کر وہ وسطی تعلیم دیتا ہے جو دُنیا میں حقیقی امن کی بنیاد ہے اور وہ یہ کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ[2] یعنی "ہر بدی کی سزا اُس کے مناسبِ حال اور اُس کی شدّت کے مطابق ہونی چاہیئے، لیکن اگر حالات ایسے ہوں کہ معاف کرنے یا نرمی کرنے سے اصلاح کی اُمید ہو تو پھر معاف کرنا یا نرمی کرنا بہتر ہے اور ایسا شخص خدا کے نزدیک نیک اجر کا مستحق ہوگا۔" یہ وہ تعلیم ہے جو اسلام نے اس بارے میں دی اور کوئی عقلمند اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ایک بہترین تعلیم ہے جس میں انسانی ضروریات کے تمام پہلوؤں کو مدّنظر رکھا گیا ہے اور سزا کی صورت میں بھی اسلام نے یہ قید لگا دی ہے کہ وہ مناسب حد سے آگے نہ گذرے۔ اور مُثلہ وغیرہ کے وحشیانہ افعال کو یک قلم بند کر دیا گیا۔ اسکے مقابل پر مسیحی لوگ باوجود حضرت مسیح ناصری کی اس نمائشی تعلیم کے جو عملی نمونہ دشمنوں کیساتھ سلوک کا دکھاتے رہے ہیں اور جنگوں میں جن افعال کے مرتکب ہوتے رہے ہیں وہ تاریخ عالم کا ایک کُھلا ہوا ورق ہے جس کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہیں۔

---

[1] متی باب ۵ آیت ۳۸ تا ۴۱ [2] قرآن شریف سورۃ الشوریٰ : ۴۱

صُلح حُدیبیہ اور اُسکے عظیم الشان نتائج

(ذوقعدہ[1] سنہ ۶ ھ)

صُلح حُدیبیہ کی اہمیت

اب ہم اسلامی تاریخ کے اُس حصّہ میں داخل ہونے لگے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مَدنی زندگی کے دوسرے دَور میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میری مُراد صُلح حُدیبیہ سے ہے جس کے نتیجہ میں کفّارِ مکّہ اور مسلمانوں کے درمیان جنگ وجدال کا سلسلہ بند ہو کر اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور دُنیا کو اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع میسّر آیا کہ اسلام کی اصل طاقت صُلح میں ہے نہ کہ جنگ میں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی میں بظاہر جنگ نہیں تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ روسائ قریش کی حکومت کے ماتحت زندگی گذارتے تھے مگر قریش کی یہ حکومت جنگ سے بھی بڑھ کر مظالم ومصائب کا منظر پیش کرتی تھی کیونکہ قریش کی ساری طاقت اسلام کو مٹانے میں خرچ ہو رہی تھی۔ اس کے بعد مَدنی زندگی کا دَور آیا تو اُس کے ساتھ ہی جنگ کا آغاز ہو گیا اور بے چارے مسلمان ایک مصیبت میں سے نکل کر دوسری مصیبت اور بعض لحاظ سے بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے، اس لیے حقیقتاً آج تک اسلام کو اپنی صُلح کی طاقت کے اظہار کا موقع ہی نہیں ملا تھا، لیکن صُلح حُدیبیہ نے جس کا اب ہم ذکر شروع کرنے لگے ہیں یہ موقع میسر کرا دیا۔ اور دُنیا جانتی ہے کہ اس امتحان میں اسلام نے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت کر دی کہ اس کی صُلح کی طاقت اس کی جنگ کی طاقت سے بدرجہا بہتر اور بدرجہا افضل ہے۔ الغرض وہ تاریخی واقعہ جس کا ہم اب ذکر کرنے لگے ہیں ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اور ہم اپنے ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس واقعہ کے حالات کو نظرِ غور سے مطالعہ فرمائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب اور سفرِ حُدیبیہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے تو اس کے جلد بعد ہی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کی طرف سے بدل کر بیت اللہ کی طرف پھیر دیا تھا اور اِس تحویلِ قبلہ کے ساتھ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم بھی دیا

---

[1] مطابق فروری و مارچ سنہ ۶۲۸ء

تھا کہ اپنی توجہ کو مکّہ کی طرف لگائے رکھیں اور اس بات کو کبھی نہ بھُولیں کہ مکّہ اسلام کا مذہبی مرکز ہے جو جتنی جلدی بھی ممکن ہو مسلمانوں کے قبضہ میں آجانا چاہیئے[1]۔ اِن احکام کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ مکّہ کی طرف خیال لگا رہتا تھا اور پھر وطن ہونے کی وجہ سے بھی آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھ کے مہاجرین کو مکّہ کے ساتھ طبعاً خاص محبت تھی۔ اس پر اتفاق یہ ہوا کہ انہی دنوں میں جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھی کہ آپؐ اپنے صحابہ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں[2]۔ اس وقت ذوقعدہ کا مہینہ قریب تھا جو زمانۂ جاہلیت میں بھی اُن چار مبارک مہینوں میں سے سمجھا جاتا تھا جن میں ہر قسم کا جنگ وجدال منع تھا۔ گویا ایک طرف آپؐ نے یہ خواب دیکھی اور دوسری طرف یہ وقت بھی ایسا تھا کہ جب عرب کے طول وعرض میں جنگ کا سلسلہ تُرک کر امن واماں ہوجاتا تھا اور گو یہ حج کے دن نہیں تھے اور ابھی تک اسلام میں حج باقاعدہ طور پر مقرر بھی نہیں ہوا تھا، لیکن خانہ کعبہ کا طواف ہر وقت ہوسکتا تھا اس لیے آپؐ نے اِس خواب دیکھنے کے بعد اپنے صحابہ سے تحریک فرمائی کہ وہ عُمرہ کے واسطے تیاری کرلیں۔ عُمرہ گویا ایک چھوٹی قسم کا حج تھا جس میں حج کے بعض مناسک کو ترک کرکے صرف بیت اللہ کے طواف اور قربانی پر اکتفا کی جاتی تھی اور بخلاف حج کے اس کیلئے سال کا کوئی خاص حصّہ بھی معیّن نہیں تھا بلکہ یہ عبادت ہر موسم میں ادا کی جاسکتی تھی۔ اس موقع پر آپؐ نے صحابہ میں یہ بھی اعلان فرمایا کہ چونکہ اِس سفر میں کسی قسم کا جنگی مقابلہ مقصود نہیں ہے بلکہ محض ایک پُرامن دینی عبادت کا بجالانا مقصود ہے اس لیے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اِس سفر میں اپنے ہتھیار ساتھ نہ لیں البتہ عرب کے دستور کے مطابق صرف اپنی تلواروں کو نیاموں کے اندر بند کرکے مسافرانہ طریق پر اپنے ساتھ رکھا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی آپؐ نے مدینہ کے گرد ونواح کے بدوی لوگوں میں بھی جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے یہ تحریک فرمائی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوکر عُمرہ کی عبادت بجالائیں۔ مگر افسوس ہے کہ ایک نہایت قلیل یعنی برائے نام تعداد کے سوا ان مسلمان کہلانے والے کمزور ایمان بدوی لوگوں نے جو مدینہ کے آس پاس آباد تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلنے سے احتراز کیا کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ خواہ مسلمانوں کی نیت عُمرہ کے سوا کچھ نہیں مگر قریش بہرحال مسلمانوں کو روکیں گے اور اس طرح مقابلہ کی صورت پیدا ہوجائے گی اور وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ یہ مقابلہ مکّہ کے قریب اور مدینہ سے دُور ہوگا اس لیے کوئی مسلمان بچ کر واپس نہیں آسکے گا[3]۔ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اوپر چودہ سو صحابیوں کی جمعیت کے ساتھ ذوقعدہ سنہ ۶ھ کے شروع میں پیر کے دن بوقت صبح مدینہ سے

---

[1] سورۃ البقرہ: ۱۴۹ تا ۱۵۱۔ [2] سورۃ الفتح: ۲۸ و ابن جریر جلد ۲ ۲۶صفحہ ۶۸ و زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۷۹ و تاریخ خمیس حالات حدیبیہ

[3] سورۃ الفتح: ۱۲-۱۳ و تفسیر ابن کثیر متعلق آیات مذکورہ و ابن ہشام

روانہ ہوئے۔ اس سفر میں آپؐ کی زوجہ محترمہ حضرت اُمِّ سلمہؓ آپؐ کے ہم رکاب تھیں اور مدینہ کا امیر نمیلہ بن عبداللہ کو اور امام صلوٰۃ عبداللہ بن اُم مکتوم کو جو آنکھوں سے معذور تھے مقرر کیا گیا تھا[1]

جب آپ ذوالحلیفہ میں پہنچے جو مدینہ سے قریباً چھ میل کے فاصلہ پر مکہ کے رستہ پر واقع ہے[2] تو آپؐ نے ٹھہرنے کا حکم دیا اور نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد قربانی کے اونٹوں کو جو تعداد میں ستر تھے نشان لگاتے جانے کا ارشاد فرمایا اور صحابہ کو ہدایت فرمائی کہ وہ حاجیوں کا مخصوص لباس جو اصطلاحاً احرام کہلاتا ہے پہن لیں اور آپؐ نے خود بھی احرام باندھ لیا[3]۔ اور پھر قریش کے حالات کا علم حاصل کرنے کے لیے کہ آیا وہ کسی شرارت کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔ ایک خبر رساں بُسر بن سفیان نامی کو جو قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتا تھا جو مکہ کے قرب میں آباد تھے آگے بھجوا کر آہستہ آہستہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے[4] اور مزید احتیاط کے طور پر مسلمانوں کی بڑی جمعیت کے آگے آگے رہنے کے لئے عباد بن بشر کی کمان میں بیس سواروں کا ایک دستہ بھی متعین فرمایا[5] جب آپؐ چند روز کے سفر کے بعد عسفان کے قریب پہنچے جو مکہ سے قریباً دو منزل کے رستہ پر واقع ہے تو آپ کے خبر رساں نے واپس آکر آپؐ کی خدمت میں اطلاع دی کہ قریش مکہ بہت جوش میں ہیں اور آپ کو روکنے کا پختہ عزم کئے ہوئے ہیں[6] حتیٰ کہ اُن میں سے بعض نے اپنے جوش اور وحشت کے اظہار کے لیے چیتوں کی کھالیں پہن رکھی ہیں اور جنگ کا پختہ عزم کرکے بہر صورت مسلمانوں کو روکنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قریش نے اپنے چند جانباز سواروں کا ایک دستہ خالد بن ولید کی کمان میں جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے آگے بھجوا دیا ہے۔ اور یہ کہ یہ دستہ اس وقت مسلمانوں کے قریب پہنچا ہوا ہے اور اس دستہ میں عکرمہ بن ابوجہل بھی شامل ہے وغیرہ وغیرہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سُنی تو تصادم سے بچنے کی غرض سے صحابہ کو حکم دیا کہ مکہ کے معروف رستہ کو چھوڑ کر دائیں جانب ہوتے ہوتے آگے بڑھیں۔ چنانچہ مسلمان ایک دشوار گذار اور کٹھن رستہ پر پڑ کر سمندر کی جانب ہوتے ہوئے آگے بڑھنا شروع ہوئے[7]

جب آپؐ اس نئے رستہ پر چلتے ہوئے حُدیبیہ کے قریب پہنچے جو مکہ سے ایک منزل یعنی صرف نو میل کے فاصلہ پر ہے[8] اور حُدیبیہ کی گھاٹیوں پر سے مکہ کی وادی کا آغاز ہو جاتا ہے تو آپؐ کی اونٹنی جو القصوا کے نام سے مشہور تھی اور بہت سے غزوات میں آپؐ کے استعمال میں رہ چکی تھی یکلخت پاؤں پھیلا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اور باوجود اُٹھانے کے اُٹھنے کا نام نہ لیتی تھی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ شاید یہ تھک

---

[1] ابن سعد و ابن ہشام و طبری و زرقانی۔ [2] زرقانی۔ [3] ابن سعد۔ [4] ابن ہشام۔ [5] ابن سعد و خمیس

[6] بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الحدیبیہ عن مسور و مروان۔ [7] ابن ہشام و طبری حالات صلح حدیبیہ

[8] ابن سعد

گئی ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" نہیں نہیں یہ تھکی نہیں اور نہ ہی اس طرح تھک کر بیٹھ جانا اس کی عادت میں داخل ہے بلکہ حق یہ ہے کہ جس بالا ہستی نے اِس سے پہلے اصحاب فیل کے ہاتھی کو مکّہ کی طرف بڑھنے سے روکا تھا اُسی نے اب اس اونٹنی کو بھی روکا ہے۔ پس خدا کی قسم مکّہ کے قریش جو مطالبہ بھی حرم کی عزت کے لیے مجھ سے کریں گے مَیں اُسے قبول کروں گا۔" اس کے بعد آپؐ نے اپنی اونٹنی کو پھر اُٹھنے کی آواز دی اور خُدا کی قدرت کہ اِس دفعہ وہ جھٹ اُٹھ کر چلنے کو تیار ہوگئی۔ اِس پر آپؐ اُسے وادئ حُدیبیہ کے پرلے کنارے کی طرف لے گئے اور وہاں ایک چشمہ کے پاس ٹھہر کر اونٹنی سے نیچے اُتر آئے اور اسی جگہ آپؐ کے فرمانے پر صحابہ نے ڈیرے ڈال دیئے[1]

مسلمانوں کو پانی کی تکلیف اور تکثیر الماء کا معجزہ

ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ صحابہ کی ایک پارٹی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ چشمہ کا پانی ختم ہو کر خشک ہوگیا ہے اور اب انسان اور جانور سخت تکلیف میں ہیں۔ اِس کے لیے کیا کیا جائے؟[2] آپؐ نے ایک تیر لیا اور حُکم دیا کہ اِس تیر کو خشک شدہ چشمہ کی تہ میں نصب کر دیا جائے[3] اور آپؐ خود چشمہ کے کنارے پر تشریف لا کر وہاں بیٹھ گئے اور تھوڑا سا پانی لیکر اُسے اپنے مُنہ میں ڈالا اور پھر خُدا سے دُعا کرتے ہوئے یہ پانی اپنے مُنہ میں سے چشمہ کے اندر اُنڈیل دیا اور صحابہ سے فرمایا کہ اب تھوڑی دیر انتظار کرو۔ چنانچہ ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ چشمہ کے اندر اتنا پانی بھر آیا کہ سب نے اپنی اپنی ضرورت کے لیے استعمال کیا اور پانی کی تکلیف جاتی رہی[4]

اس پر اللہ تعالیٰ نے مزید فضل یہ فرمایا کہ اُسی رات یا اُس کے قریب بارش بھی ہوگئی۔ چنانچہ جب

---

[1] بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد

[2] اِس سے پہلے دورانِ سفر میں بھی ایک دفعہ پانی کی تکلیف ہو چکی تھی جب کہ ایک وقت ایسا آیا تھا کہ سوائے اس لوٹے کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ استعمال تھا ہر برتن پانی سے خالی ہوگیا تھا۔ اس موقعہ پر آپؐ نے صحابہ کی طرف سے پانی کی شکایت ہونے پر اپنے لوٹے کے مُنہ پر اپنا دستِ مبارک رکھا اور لوٹے کے مُنہ کو جُھکاتے ہوئے صحابہ سے فرمایا کہ اب اپنے اپنے برتن لاؤ اور بھر لو۔ راوی بیان کرتا ہے کہ اُس وقت آپؐ کی انگلیوں کے اندر سے پانی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا کہ گویا ایک چشمہ جاری ہے۔ حتّٰی کہ سب نے اپنی ضرورت کے مطابق پانی لے لیا اور مسلمانوں کی تکلیف جاتی رہی۔ بخاری کتاب المغازی روایت جابر بن عبداللہ و سیرۃ حلبیہ حالات صلح حدیبیہ۔

[3] بخاری کتاب الشروط

[4] بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الحدیبیہ عن براء بن عازب

صبح کی نماز کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو میدان پانی سے تر بتر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مسکراتے ہوئے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اس بارش کے موقع پر تمہارے خدا نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ صحابہ نے حسبِ عادت عرض کیا کہ خدا اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندوں میں سے بعض نے تو یہ صبح حقیقی ایمان کی حالت میں کی ہے مگر بعض کفر کی حالت میں پڑ کر ڈگمگا گئے۔ کیونکہ جس بندے نے تو یہ کہا کہ ہم پر خدا کے فضل و رحم سے بارش ہوئی ہے وہ تو ایمان کی حقیقت پر قائم رہا مگر جس نے یہ کہا کہ یہ بارش فلاں فلاں ستارے کے اثر کے ماتحت ہوئی ہے تو وہ بیشک چاند سورج کا تو مومن ہو گیا، لیکن خدا کا اُس نے کفر کیا۔"[1] اس ارشاد سے جو توحید کی دولت سے معمور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ سبق دیا کہ بے شک سلسلہ اسباب و علل کے ماتحت خدا نے اِس کارخانۂ عالم کو چلانے کے لیے مختلف قسم کے اسباب مقرر فرما رکھے ہیں اور بارشوں وغیرہ کے معاملہ میں اجرام سماوی کے اثر سے انکار نہیں مگر حقیقی توحید یہ ہے کہ باوجود درمیانی اسباب کے انسان کی نظر اُس وراء الوریٰ ہستی کی طرف سے غافل نہ ہو جو اِن سب اسباب کی پیدا کرنے والی اور اِس کارخانۂ عالم کی عِلّت العلل ہے اور جس کے بغیر یہ ظاہری اسباب ایک مُردہ کیڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

معجزات کے متعلق ایک مختصر اُصولی نوٹ

یہ سوال کہ اِس موقع پر عام قانونِ قدرت کے خلاف چشمہ کا پانی کس طرح زیادہ ہو گیا؟ معجزات کی بحث سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق ہم اس کتاب میں دوسری جگہ ایک اُصولی نوٹ درج کر چکے ہیں اور اس جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔[2] دراصل معجزات کی بحث دو اُصولی حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ عقلی دلائل سے تعلق رکھتا ہے جن سے معجزات کا امکان اور اُن کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ اور دوسرا حصہ مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے جس سے معجزات کا عملاً وقوع میں آنا ثابت ہوتا ہے۔ عقلی دلائل کا نتیجہ صرف اِس حد تک ہے کہ معجزہ وقوع میں آسکتا ہے اور یہ کہ انسان کی رُوحانیت کی تکمیل کے لیے اُسے وقوع میں آنا چاہیے۔ مگر اس سے آگے اس بات کے ثبوت کے لیے کہ معجزہ واقعی ہوتا بھی ہے مشاہدہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور خوش قسمتی سے اِس قسم کے مشاہدہ کا وجود ہر نبی کے زمانہ میں اور ہر قوم کی تاریخ میں ملتا ہے مگر افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ کی عالمگیر مادیت نے انسان کے روحانی کمالات اور روحانی حواس کو اس حد تک خاک میں ملا رکھا ہے کہ مادہ پرستی کے خیالات کے سوا کچھ باقی نہیں رہا اور انسانیت کے اعلیٰ کمالات زمین دوز دفینوں کی

---

[1] بخاری کتاب المغازی حالات صلح حدیبیہ و ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۔ [2] دیکھئے کتاب ہذا حصہ دوم

طرح نظروں سے دُور اور آنکھوں سے مستور ہو چکے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ خدا کا قانون دو قسم کا ہے۔ ایک وہ جو اس کی نہ بدلنے والی سُنّتوں اور اُس کے وعدوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے مثلاً یہ کہ کوئی مُردہ زندہ ہو کر اِس دُنیا میں دوبارہ واپس نہیں آسکتا[1] اور دوسرا وہ جو اِن دو دائروں کے علاوہ ہے مثلاً نیک اور بد بندوں کے ساتھ خدا کے سلوک کے اظہار کا طریق وغیرہ۔ پس جہاں تک اوّل الذکر قانون کا تعلق ہے قرآن شریف بڑے زور کے ساتھ فرماتا ہے کہ وہ بالکل اٹل ہے[2] اور نہ صرف دُنیا کی تمام علمی و عملی ترقی بلکہ خدا کی شان اور وقار کا اظہار بھی اس کے اٹل ہونے کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن مؤخر الذکر قانون حالات کے اختلاف کے ساتھ اپنی صورت بدل سکتا ہے اور اس کا بدلنا خدا کی شان کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے اور اسی تبدیلی کے غیر معمولی ظہور کا نام معجزہ ہے۔ دراصل اگر اِس دُنیا کا کوئی خدا ہے جس نے اس دُنیا کی چیزوں کو اور ان چیزوں کے خواص کو پیدا کیا ہے اور یہ خدا اپنے تختِ حکومت سے معزول و معطل نہیں ہو گیا اور اپنے قانون کا غلام نہیں بن گیا تو پھر اس خدا میں یہ قوت تسلیم کرنی پڑے گی کہ اپنی سُنّت اور وعدہ کی باتوں کو الگ رکھ کر جن میں بہرحال کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی وہ کسی حقیقی ضرورت کے وقت اپنے ایسے قانون کو جو اُس کی کسی سُنّت یا وعدہ کے دائرہ سے تعلق نہیں رکھتا خاص استثنائی رستہ پر چلا سکتا ہے یا بعض مخفی اسباب کے ذریعہ ایک ایسا ظاہری تغیر پیدا کر سکتا ہے جو بظاہر استثناء کا رنگ رکھتا ہو اور اسی استثناء یا خاص تقدیرِ الٰہی کے غیر معمولی ظہور کا نام معجزہ ہے۔

اور معجزہ کی ضرورت اِس طرح ثابت ہے کہ جیسا کہ ہر سمجھدار انسان محسوس کریگا محض عقلی دلیلوں کا وجود خدا کے متعلق اس حد تک کا ایمان ہرگز پیدا نہیں کر سکتا جو انسان کی رُوحانی زندگی کے لیے ضروری ہے کیونکہ عقلی دلیلیں زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کر سکتی ہیں کہ اس کارخانۂ عالم کا کوئی خالق و مالک ہونا چاہیئے مگر ظاہر ہے کہ یہ "ہونا چاہیئے" والا مقام محض ایک قیاس کا مقام ہے جسے قطعی اور زندہ یقین میں بدلنے کے لیے جسے ہم "ہے" کے مقام سے تعبیر کر سکتے ہیں الہامِ الٰہی اور معجزہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لیے ہر نبی اور رسول کے ساتھ معجزہ کا وجود لازم و ملزوم کے طور پر رہا ہے۔ اور اسلامی معجزات سے انکار کرنے والوں کی خود اپنی کُتب معجزات کے ذکر سے (جن میں سے افسوس ہے کہ اکثر فرضی اور بلا ثبوت اور سُنّتِ الٰہی کے خلاف ہیں) بھری پڑی ہیں۔ باقی رہا مشاہدہ کا سوال سو جن ابتدائی لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بیان کئے ہیں وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور دن رات آپؐ کی صحبت میں رہنے والے تھے انہوں نے اپنا ذاتی

---

[1] سورۃ المؤمنون : ۱۰۰ تا ۱۰۱ - [2] سورۃ الاحزاب : ۶۲، ۶۳ - [3] سورۃ آل عمران : ۵ تا ۱۰

مشاہدہ ہی بیان کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر روایت صحیح ہو اور راوی سچ بولنے والا اور سمجھدار ہو تو یہ مشاہدہ اُسی طرح قابلِ قبول ہے جس طرح کہ دُنیا کے دوسرے پختہ مشاہدات قابلِ قبول ہوتے ہیں۔ اور گو موجودہ مادی زمانہ میں رُوحانی اہلِ کمال کا وجود عُنقا کا رنگ رکھتا ہے مگر اس زمانہ میں بھی مقدس بانی سلسلہ احمدیہ نے معجزات کے متعلق معترضین کا جواب دیتے ہوئے یہ اعلان کیا ہے کہ :-

کرامت گرچہ بے نام و نشان است بیا بنگر ز غلمانِ محمدؐ!

یعنی "گو اس زمانہ میں معجزات کا وجود بے نام و نشان ہو چکا ہے مگر اسے منکرِ اسلام آ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے ہاتھ پر معجزات کا مشاہدہ کر لے۔"

ایک اَور اُصولی بات جو معجزات کے متعلق یاد رکھنی ضروری ہے اور جسے نظر انداز کرنے سے اکثر مذاہب میں بعد میں آنے والوں کی دست بُرد سے جھوٹے اور فرضی معجزات کا وجود پیدا ہو گیا ہے یہ ہے کہ معجزات کی غرض و غایت چونکہ ایمان پیدا کرنا یا پیدا شدہ ایمان کو مضبوط کرنا ہوتی ہے اور ایمان کے لیے اُس کے ابتدائی مراحل میں کسی قدر اخفاء کا پردہ ضروری ہے اور اسی لیے قرآن شریف نے اپنی ابتداء میں ہی ایمان بالغیب کے اُصول کو پیش کیا ہے[1] کیونکہ کامل مشاہدہ کے بعد ایمان کسی انعام یا تعریف کا حقدار نہیں رہتا اس لیے سُنّت اللہ اس طرح پر واقع ہوئی ہے کہ سچے معجزات کبھی بھی ایسی صورت میں ظاہر نہیں ہوتے کہ گویا بالکل شہود کا رنگ پیدا ہو جائے بلکہ کسی نہ کسی جہت سے کچھ نہ کچھ اخفاء کا پردہ باقی رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے اہل اللہ نے معجزات کی مثال دن کی تیز روشنی سے نہیں دی بلکہ ایک ایسی چاندنی رات کی روشنی سے دی ہے جس میں کسی قدر بادل بھی ہوں۔ ایسی صورت میں جہاں ایک طرف توجہ اور غور سے دیکھنے والوں کو رستہ نظر آ جاتا ہے وہاں دوسری طرف ضدی اور کجرو لوگوں کے لیے شک کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے[2] البتہ بعض اوقات ایسے معجزات ہیں جو صرف ان مومنوں کو دکھائے جاتے ہیں۔ جو ایمان کے ابتدائی مراحل سے آگے نکل چکے ہوتے ہیں کسی قدر شہود کا رنگ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک لمبا اور باریک سوال ہے جو تفصیلی بحث چاہتا ہے اور اس مختصر اور ضمنی نوٹ میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ معجزات اور آیات کا وجود برحق ہے اور اسلام اسے تسلیم کرتا اور ہر نبی اور رسول کے زمانہ میں اس کے ظہور کا دعویٰ فرماتا ہے مگر اوّل تو کوئی معجزہ خدا کی کسی نہ بدلنے والی سُنّت یا اُس کے کسی وعدہ کے خلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر ایسا ہو تو دُنیا میں اندھیر پڑ جاتے۔ اور قرآن شریف نے صراحت کے ساتھ ایسے معجزات کے وجود سے انکار کیا ہے[3] اور دوم کسی معجزہ میں

---

[1] سورۃ البقرہ : ۴۔ [2] دیکھو براہین احمدیہ حصہ پنجم مصنفہ مقدس بانی سلسلہ احمدیہ صہ ۴۳

[3] سورۃ الاحزاب : ۶۳ و سورۃ آل عمران ۱۰۱

جو منکرین کو دکھانا مقصود ہو نصف النہار والی روشنی پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ ایمان بالغیب کے اُصول کے خلاف ہے جیسے قرآن شریف نے اپنی ابتدا میں ہی بڑے زور کے ساتھ پیش کیا ہے[1] مگر ان دونوں حدود کے اندر اندر معجزہ ہو سکتا ہے اور ہر نبی کے زمانہ میں ہوتا رہا ہے اور حق یہ ہے کہ اگر ایسے معجزات کا دروازہ بند ہو جاتے تو دُنیا رُوحانی طور پر زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔

قریش کیساتھ صُلح کی گفتگو کا آغاز

معجزات کے متعلق یہ مختصر اور اُصولی نوٹ دینے کے بعد ہم پھر اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حُدیبیہ کی وادی میں پہنچ کر اس وادی کے چشمہ کے پاس قیام کیا۔ جب صحابہ اِس جگہ ڈیرے ڈال چکے تو قبیلہ خزاعہ کا ایک نامور رئیس بُدیل بن ورقا نامی جو قریب ہی کے علاقہ میں آباد تھا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے لیے آیا اور اُس نے آپؐ سے عرض کیا کہ مکّہ کے رؤساء جنگ کے لیے تیار کھڑے ہیں اور وہ کبھی بھی آپ کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپؐ نے فرمایا "ہم تو جنگ کی غرض سے نہیں آتے بلکہ صرف عُمرہ کی نیّت سے آتے ہیں اور افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ قریش مکّہ کو جنگ کی آگ نے جُلا جُلا کر خاک کر رکھا ہے مگر پھر بھی یہ لوگ باز نہیں آتے اور مَیں تو اِن لوگوں کے ساتھ اس سمجھوتہ کے لیے بھی تیار ہوں کہ وہ میرے خلاف جنگ بند کر کے مجھے دوسرے لوگوں کے لیے آزاد چھوڑ دیں۔ لیکن اگر انھوں نے میری اس تجویز کو بھی ردّ کر دیا اور بہر صورت جنگ کی آگ کو بھڑکاتے رکھا تو مجھے بھی اُس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ پھر مَیں بھی اِس مقابلہ سے اُس وقت تک پیچھے نہیں ہٹوں گا کہ یا تو میری جان اِس رستہ میں قربان ہو جائے اور یا خدا مجھے فتح عطا کرے۔" اگر مَیں ان کے مقابلہ میں آ کر مِٹ گیا تو قصہ ختم ہوا لیکن اگر خدا نے مجھے فتح عطا کی اور میرے لائے ہوئے دین کو غلبہ حاصل ہو گیا تو پھر مکّہ والوں کو بھی ایمان لے آنے میں کوئی تامّل نہیں ہونا چاہیئے۔

بُدیل بن ورقا پر آپؐ کی اِس مخلصانہ اور دردمندانہ تقریر کا بہت اثر ہوا اور اُس نے آپؐ سے عرض کیا کہ آپ مجھے کچھ مُہلت دیں کہ مَیں مکّہ میں جا کر آپ کا پیغام پہنچاؤں اور مصالحت کی کوشش کروں آپؐ نے اجازت دی اور بُدیل اپنے قبیلہ کے چند آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر مکّہ کی طرف روانہ ہو گیا[2]

جب بُدیل بن ورقا مکّہ میں پہنچا تو اُس نے قریش کو جمع کر کے اُن سے کہا کہ مَیں اِس شخص یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [عرب کا دستور تھا کہ ایسے موقعوں پر جب ایک معروف شخص کے متعلق گفتگو

---

[1] سورۃ البقرہ: ۴ - [2] بخاری کتاب الشروط

کرنی ہو تو نام لینے کی بجائے "یہ شخص" یا "اس شخص" وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے تھے] کے پاس سے آ رہا ہوں اور میرے سامنے اُس نے ایک تجویز پیش کی ہے اگر آپ اجازت دیں تو مَیں اس کا ذکر کروں۔ اِس پر قریش کے جوشیلے اور غیر ذمہ وار لوگ کہنے لگے۔ ہم اس شخص کی کوئی بات سُننے کے لیے تیار نہیں مگر اہل الرائے اور ثقہ لوگوں نے کہا۔ ہاں ہاں جو تجویز بھی ہے وہ ہمیں بتاؤ۔ چنانچہ بدیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تجویز کا اعادہ کیا۔ اِس پر ایک شخص عروہ بن مسعود نامی جو قبیلہ ثقیف کا ایک بہت بااثر رئیس تھا اور اُس وقت مکہ میں موجود تھا کھڑا ہو گیا اور قدیم عربی انداز میں قریش سے کہنے لگا۔ "اے لوگو! کیا مَیں تمہارے باپ کی جگہ نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا۔ "ہاں"۔ پھر اُس نے کہا۔ "کیا آپ لوگ میرے بیٹوں کی طرح نہیں ہیں؟" انہوں نے کہا "ہاں"۔ پھر عروہ نے کہا۔ "کیا تمہیں مجھ پر کسی قسم کی بے اعتمادی ہے؟" قریش نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔" اُس نے کہا۔ "تو پھر میری یہ رائے ہے کہ اس شخص (محمد ﷺ) نے آپ کے سامنے ایک عمدہ بات پیش کی ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ اس تجویز کو قبول کر لیں اور مجھے اجازت دیں کہ مَیں آپ کی طرف سے محمد (ﷺ) کے پاس جا کر مزید گفتگو کروں۔" قریش نے کہا "بے شک آپ جائیں اور گفتگو کریں۔"[1]

آنحضرت ﷺ کی مجلس کا ایک رُوح پرور نظارہ

عروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آپؐ کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ آپؐ نے اُس کے سامنے اپنی وہی تقریر دوہرائی جو اس سے قبل آپؐ بدیل بن ورقا کے سامنے فرما چکے تھے۔ عروہ اُصولاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے ساتھ متفق تھا مگر قریش کی سفارت کا حق ادا کرنے اور اُن کے حق میں زیادہ سے زیادہ شرائط محفوظ کرانے کی غرض سے کہنے لگا۔ "اے محمدؐ اگر آپ نے اِس جنگ میں اپنی قوم کو ملیا میٹ کر دیا تو کیا آپ نے عربوں میں کسی ایسے آدمی کا نام سُنا ہے جس نے آپ سے پہلے ایسا ظلم ڈھایا ہو۔ لیکن اگر بات دگرگوں ہوئی یعنی قریش کو غلبہ ہو گیا تو خدا کی قسم مجھے آپ کے اِردگرد ایسے مُنہ نظر آ رہے ہیں کہ اُنہیں بھاگتے ہوئے دیر نہیں لگے گی۔ اور یہ سب لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔" حضرت ابوبکرؓ جو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی بیٹھے تھے عروہ کے یہ الفاظ سُنکر غصہ سے بھر گئے اور فرمانے لگے "جاؤ جاؤ اور لات کی شرمگاہ کو چُومتے پھرو۔ کیا ہم خدا کے رسولؐ کو چھوڑ جائیں گے؟"[2] عروہ نے طیش میں

---

[1] بخاری کتاب الشروط۔ [2] لات قبیلہ بنو ثقیف کا ایک مشہور بُت تھا اور حضرت ابوبکرؓ کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ بت پرست ہو اور ہم لوگ خدا پرست ہیں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم تو بُتوں کی خاطر صبر و ثبات دکھاؤ اور ہم خدا پر ایمان لاتے ہوئے رسولِ خدا کو چھوڑ کر بھاگ جائیں؟

آکر پوچھا" یہ کون شخص ہے جو اس طرح میری بات کاٹتا ہے؟" لوگوں نے کہا" یہ ابوبکرؓ ہیں"۔ ابوبکرؓ کا نام سنکر عروہ کی آنکھیں شرم سے نیچی ہوگئیں۔ کہنے لگا۔" اے ابوبکر! اگر میرے سر پر تمہارا ایک بھاری احسان نہ ہوتا[1] تو خدا کی قسم میں تمہیں اِس وقت بتا تا کہ ایسی بات کا جو تم نے کہی ہے کس طرح جواب دیتے ہیں۔"
یہ کہہ کر عروہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوا اور اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نقطۂ نظر کی طرف کھینچ لانے کی تدبیر کرتا رہا اور گاہے گاہے عرب کے دستور کے مطابق آپؐ کی ریش مُبارک کو بھی ہاتھ لگا دیتا تھا۔ مگر جب کبھی بھی وہ ایسا کرتا ایک مخلص صحابی جن کا نام مغیرہ بن شعبہ تھا اور جو اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑے تھے (اور رشتہ میں عروہ کے بھتیجے تھے) اپنی تلوار کے نیام سے عروہ کا ہاتھ جھٹک کر پرے کر دیتے اور کہتے۔" اپنا ناپاک ہاتھ رسولِ مقبولؐ کے مبارک چہرہ سے دُور رکھو۔" چونکہ اس وقت مغیرہ کا چہرہ ایک خود کے اندر ڈھکا ہوا تھا عروہ نے انہیں نہ پہچانتے ہوئے پُوچھا۔ یہ کون شخص ہے؟ لوگوں نے کہا۔" یہ مغیرہ بن شعبہ ہے۔" عروہ نے حقارت اور غصہ سے کہا۔" اے بے وفا! کیا تجھے میرا احسان بھول گیا؟"[2] اس پر مغیرہ شرم سے جھینپ گئے۔ اُس وقت عروہ نے اپنے اردگرد فخر کی نگاہ ڈالی مگر یہی نگاہ اُسے گھائل کر گئی۔ کیونکہ عروہ نے اُس وقت صحابہ کی جماعت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد اس طرح جمع پایا جس طرح شمع کے گرد پروانے جمع ہوتے ہیں اور خود عروہ کا اپنا بیان ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے جوشِ محبت و اخلاص کا یہ عالم تھا کہ اگر پانی پیتے ہوئے آپ کے مُنہ سے کوئی قطرہ گرتا تو صحابہ اسے شوق سے اپنے ہاتھوں پر لیتے اور برکت کے خیال سے اُسے اپنے چہروں اور جسموں پر مَل لیتے۔ اور جب آپؐ کسی چیز کا ارشاد فرماتے تو لوگ آپؐ کی آواز پر اس طرح لپکتے کہ گویا ایک مقابلہ ہو جاتا تھا۔ اور جب آپؐ وضو کرتے تو صحابہؓ اس شوق سے آپؐ کو وضو کروانے کے لیے آگے بڑھتے کہ گویا اس خدمت کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے لڑ پڑیں گے۔ اور جب آپؐ گفتگو فرماتے تو صحابہ خاموش ہو کر ہمہ تن گوش ہو جاتے اور محبت اور رُعب کی وجہ سے اُن کی نظریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اُٹھ نہیں سکتی تھیں۔[3]

عروہ اِن رُوح پرور نظاروں کو دیکھ کر اور آپؐ کے ساتھ گفتگو ختم کر کے قریش کی طرف لَوٹا اور

---

[1] عُروہ ایک دفعہ بھاری قرضہ کے نیچے دب گیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پاس سے اُس کا قرضہ ادا کر کے اس کی جان چھڑائی تھی۔ [2] عُروہ نے مغیرہ کے اسلام لانے سے پہلے اُن پر یہ احسان کیا تھا کہ اُن کی طرف سے بعض قتلوں کا خون بہا ادا کیا تھا اور عربوں میں احسان کی بڑی قدر و قیمت تھی جسے اسلام نے اور بھی بڑھا دیا تھا۔
[3] بخاری کتاب الشروط۔

جاتے ہی قریش سے کہنے لگا۔" اے لوگو! مَیں نے دُنیا میں بہت سفر کیا ہے۔ بادشاہوں کے دربار میں شامل ہوا ہوں اور قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے سامنے بطور وفد کے پیش ہو چکا ہوں مگر خدا کی قسم جس طرح مَیں نے محمد (ﷺ) کے صحابیوں کو محمدؐ کی عزت کرتے دیکھا ہے ایسا مَیں نے کسی اور جگہ نہیں دیکھا۔" پھر اُس نے اپنا وہ سارا مشاہدہ بیان کیا جو اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دیکھا تھا اور آخر میں کہنے لگا۔ مَیں پھر یہی مشورہ دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) کی تجویز ایک منصفانہ تجویز ہے اسے قبول کر لینا چاہیئے۔" [1]

عروہ کی یہ گفتگو سُن کر قبیلہ بنی کنانہ کے ایک رئیس نے جس کا نام حلیس بن علقمہ تھا[2] قریش سے کہا اگر آپ لوگ پسند کریں تو مَیں محمد (ﷺ) کے پاس جاتا ہوں۔" اُنہوں نے کہا" ہاں بے شک جاؤ"۔ چنانچہ یہ شخص حُدیبیہ میں آیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دُور سے آتے دیکھا تو صحابہ سے فرمایا۔" یہ شخص جو ہماری طرف آرہا ہے ایسے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے جو قربانی کے مناظر کو پسند کرتے ہیں۔ پس فوراً اپنے قربانی کے جانوروں کو اکٹھا کر کے اُس کے سامنے لاؤ تاکہ اُسے پتہ لگے اور احساس پیدا ہو کر ہم کس غرض سے آتے ہیں۔" چنانچہ صحابہ اپنے قربانی کے جانوروں کو ہنکاتے ہوئے اور تکبیروں کی آواز بلند کرتے ہوئے اُس کے سامنے جمع ہو گئے۔ جب اُس نے یہ نظارہ دیکھا تو کہنے لگا سبحان اللہ سُبحان اللہ یہ تو حاجی لوگ ہیں۔ انہیں بیت اللہ کے طواف سے کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔" چنانچہ وہ جلدی ہی قریش کی طرف واپس لوٹ گیا اور قریش سے کہنے لگا۔" مَیں نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے جانوروں کے گلے میں قربانی کے ہار باندھ رکھے ہیں اور اُن پر قربانی کے نشان لگائے ہوئے ہیں۔ پس یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ اُنہیں طوافِ کعبہ سے روکا جائے۔" [3]

قریش میں اس وقت ایک سخت انتشار کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور لوگوں کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک پارٹی بہر صورت مسلمانوں کو واپس لوٹانے پر مُصر تھی اور مقابلہ کے خیالات پر سختی سے قائم تھی۔ مگر دوسری پارٹی اسے اپنی قدیم مذہبی روایات کے خلاف پا کر خوف زدہ ہو رہی تھی۔ اور کسی باعزت سمجھوتہ کی متمنی تھی اس لیے فیصلہ معلق چلا جا رہا تھا۔ اس موقع پر ایک اور عربی رئیس مکرز بن حفص نامی نے قریش سے کہا۔" مجھے جانے دو مَیں کوئی فیصلہ کی راہ نکالوں گا۔" قریش نے کہا۔" اچھا تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو"۔ چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دُور سے آتے دیکھا تو فرمایا خدا خیر کرے یہ آدمی تو اچھا نہیں۔ بہر حال مکرز آپؐ کے پاس آیا اور گفتگو کرنے

---

[1] بخاری کتاب الشروط۔ [2] ابن ہشام و ابن سعد۔

[3] بخاری کتاب الشروط

لگا۔ مگر ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ مکہ کا ایک نامور رئیس سہیل بن عمرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جسے غالباً قریش نے اپنی گھبراہٹ میں مکرز کی واپسی کا انتظار کرنے کے بغیر بھجوا دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل کو آتے دیکھا تو فرمایا یہ سہیل آتا ہے۔[1] اب خدا نے چاہا تو معاملہ آسان ہو جاتے گا۔[2]

کفارِ مکہ کی فتنہ انگیزی

اس موقع پر ایک ضمنی مگر اہم واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جب قریش کی طرف سے پے در پے سفیر آنے شروع ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس کر کے آپ کی طرف سے بھی کوئی فہمیدہ شخص قریش کی طرف جانا چاہیئے جو انہیں ہمدردی اور دانائی کے ساتھ مسلمانوں کا زاویہ نظر سمجھا سکے ایک شخص خراش بن اُمیّہ کو اس کام کے لیے چُنا جو قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتا تھا یعنی وہی قبیلہ جس سے قریش کے سب سے پہلے سفیر بدیل بن ورقا کا تعلق تھا اور اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خراش کو سواری کے لیے خود اپنا ایک اونٹ عطا فرمایا۔ خراش قریش کے پاس گیا مگر چونکہ ابھی یہ گفتگو کا ابتدائی مرحلہ تھا اور نوجوانانِ قریش بہت جوش میں تھے ایک جوشیلے نوجوان عکرمہ بن ابوجہل نے خراش کے اونٹ پر حملہ کر کے اُسے زخمی کر دیا جس کے عربی دستور کے مطابق یہ معنی تھے کہ ہم تمہاری نقل و حرکت کو جبراً روک سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں قریش کی یہ جوشیلی پارٹی خود خراش پر بھی حملہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر بڑے بوڑھوں نے بیچ بچاؤ کر کے اس کی جان بچائی اور وہ اسلامی کیمپ میں واپس آگیا۔[3]

قریش مکہ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے جوش میں اندھے ہو کر اس بات کا بھی ارادہ کیا کہ اب جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ مکہ سے اس قدر قریب اور مدینہ سے اتنی دور آتے ہوئے ہیں تو ان پر حملہ کر کے جہاں تک ممکن ہو نقصان پہنچایا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے اُنہوں نے چالیس پچاس آدمیوں کی ایک پارٹی حُدیبیہ کی طرف روانہ کی اور اس گفت و شنید کے پردے میں جو اس وقت فریقین میں جاری تھی اُن لوگوں کو ہدایت دی کہ اسلامی کیمپ کے اِرد گرد گھومتے ہوئے تاک میں رہیں اور موقع پا کر مسلمانوں کا نقصان کرتے رہیں[4] بلکہ بعض روایتوں سے یہاں تک پتہ لگتا ہے کہ یہ لوگ تعداد میں اسّی تھے اور اس موقع پر قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی بھی سازش کی تھی[5] مگر بہرحال خدا کے فضل سے مسلمان اپنی جگہ ہوشیار تھے۔ چنانچہ قریش کی اس سازش کا راز کھل

---

[1] سہیل کا لفظ سہل سے نکلا ہے جسکے معنی آسانی کے ہیں۔ [2] بخاری کتاب الشروط و زرقانی۔ [3] ابن ہشام و زرقانی

[4] طبری و ابن ہشام حالات حُدیبیہ۔ [5] مسند احمد و مسلم و ابوداؤد۔ بحوالہ ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۱۹۲

گیا اور یہ لوگ سب کے سب گرفتار کر لیے گئے[1] مسلمانوں کو اہلِ مکّہ کی اس حرکت پر جو اَشہُرِ حرم میں اور پھر گویا حرم کے علاقہ میں کی گئی سخت طیش تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن لوگوں کو معاف فرما دیا اور مصالحت کی گفتگو میں روک نہ پیدا ہونے دی[2] اہلِ مکّہ کی اِس حرکت کا قرآن شریف نے بھی ذکر کیا ہے چنانچہ فرماتا ہے:-

هُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ[3]

یعنی "خدا نے اپنے خاص فضل سے کفّار کے ہاتھوں کو مکّہ کی وادی میں تم سے روک کر رکھا اور تمہاری حفاظت کی اور پھر جب تم نے اُن لوگوں پر غلبہ پالیا اور انہیں اپنے قابو میں کر لیا تو خدا نے تمہارے ہاتھوں کو اُن سے روک کر رکھا۔"

مسلمانوں کی طرف سے حضرت عثمانؓ کی سفارت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی اس شرارت کو دیکھا اور ساتھ ہی خراش بن اُمیّہ سے اہلِ مکّہ کے جوش و خروش کا حال سُنا تو قریش کو ٹھنڈا کرنے اور راہِ راست پر لانے کی غرض سے ارادہ فرمایا کہ کسی ایسے با اثر شخص کو مکّہ میں بھجوائیں جو مکّہ ہی کا رہنے والا ہو اور قریش کے کسی معزّز قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو چنانچہ آپؐ نے حضرت عمرؓ بن الخطاب سے فرمایا کہ بہتر ہوگا کہ آپ مکّہ میں جائیں اور مسلمانوں کی طرف سے سفارت کا فرض سرانجام دیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ آپ جانتے ہیں کہ مکّہ کے لوگ میرے سخت دشمن ہو رہے ہیں اور اس وقت مکّہ میں میرے قبیلہ کا کوئی با اثر آدمی موجود نہیں جس کا اہلِ مکّہ پر دباؤ ہو اس لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ کامیابی کا رستہ آسان کرنے کے لیے اِس خدمت کے لیے عثمان بن عفان کو چُنا جائے جن کا قبیلہ (بنو امیہ) اِسوقت بہت با اثر ہے اور مکّہ والے عثمانؓ کے خلاف شرارت کی جُراَت نہیں کر سکتے اور کامیابی کی زیادہ اُمید ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس مشورہ کو پسند فرمایا اور حضرت عثمانؓ سے ارشاد فرمایا کہ وہ مکّہ جائیں اور قریش کو مسلمانوں کے پُرامن ارادوں اور عمرہ کی نیّت سے آگاہ کریں[4] اور آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو اپنی طرف سے ایک تحریر بھی لکھ کر دی جو رؤسا قریش کے نام تھی۔ اِس تحریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور قریش کو یقین دلایا کہ ہماری نیت صرف ایک عبادت کا بجالانا ہے اور ہم پُرامن صورت میں عمرہ بجالا کر واپس چلے جائیں گے۔ آپؐ نے

---

[1] اس واقعہ کے بارے میں روایات کسی قدر مختلف ہیں۔ ہم نے اس جگہ بغیر خاص تحقیق کے معروف روایات کو لے لیا ہے۔
[2] ابن ہشام وطبری وزرقانی۔ [3] سورۃ الفتح: ۲۵۔ [4] ابن ہشام

حضرت عثمانؓ سے یہ بھی فرمایا کہ مکہ میں جو کمزور مسلمان ہیں اُنہیں بھی ملنے کی کوشش کرنا اور اُن کی ہمت بڑھانا۔ اور کہنا کہ ذرا اور صبر سے کام لیں خدا عنقریب کامیابی کا دروازہ کھولنے والا ہے[1]

یہ پیغام لیکر حضرت عثمانؓ مکہ میں گئے اور ابوسفیان سے مِل کر جو اُس زمانہ میں مکہ کا رئیس اعظم تھا اور حضرت عثمانؓ کا قریبی عزیز بھی تھا اہلِ مکہ کے ایک عام مجمع میں پیش ہوتے۔ اِس مجمع میں حضرت عثمانؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر پیش کی جو مختلف رؤساء قریش نے فرداً فرداً بھی ملاحظہ کی مگر باوجود اس کے سب لوگ اپنی اِس ضد پر قائم رہے کہ بہرحال مسلمان اِس سال مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے[2] حضرت عثمانؓ کے زور دینے پر قریش نے کہا کہ اگر تمہیں زیادہ شوق ہے تو ہم تم کو ذاتی طور پر طواف بیت اللہ کا موقع دے دیتے ہیں مگر اس سے زیادہ نہیں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ تو مکہ سے باہر روکے جائیں اور مَیں طواف کروں؟ مگر قریش نے کسی طرح نہ مانا اور بالآخر حضرت عثمانؓ مایوس ہو کر واپس آنے کی تیاری کرنے لگے۔ اس موقع پر مکہ کے شریر لوگوں کو یہ شرارت سُوجھی کہ اُنہوں نے غالباً اس خیال سے کہ اس طرح ہمیں مصالحت میں زیادہ مفید شرائط حاصل ہو سکیں گے حضرت عثمانؓ اور اُن کے ساتھیوں کو مکہ میں روک لیا۔ اس پر مسلمانوں میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ اہلِ مکہ نے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا ہے[3]

بیعتِ رضوان

یہ خبر حدیبیہ میں پہنچی تو مسلمانوں میں سخت جوش پیدا ہوا کیونکہ عثمانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور معزز ترین صحابہ میں سے تھے اور مکہ میں لبطور اسلامی سفیر کے گئے تھے۔ اور یہ دن بھی اَشْہُرِ حرم کے تھے اور پھر مکہ خود حرم کا علاقہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً تمام مسلمانوں میں اعلان کر کے انہیں ایک ببول (کیکر) کے درخت کے نیچے جمع کیا۔ اور جب صحابہ جمع ہو گئے تو آپؐ نے اِس خبر کا ذکر کر کے فرمایا کہ "اگر یہ اطلاع درست ہے تو خدا کی قسم ہم اس جگہ سے اس وقت تک نہیں ٹلیں گے کہ عثمان کا بدلہ نہ لے لیں۔" پھر آپؐ نے صحابہ سے فرمایا "آؤ اور میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر (جو اسلام میں بیعت کا طریق ہے) یہ عہد کرو کہ تم میں سے کوئی شخص پیٹھ نہیں دکھائے گا اور اپنی جان پر کھیل جائے گا مگر کسی حال میں اپنی جگہ نہیں چھوڑیگا۔" اس اعلان پر صحابہ بیعت کے لیے اس طرح لپکے کہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے[4] اور ان چودہ پندرہ سو مسلمانوں کا (کہ یہی اس وقت اسلام کی ساری پُونجی تھی) ایک ایک فرد[5] اپنے محبوب آقا کے ہاتھ پر گویا دوسری دفعہ

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۰۔ [2] زرقانی۔ [3] ابن ہشام و ابن سعد۔ [4] یہ بیعت ایک ہی دفعہ اکٹھی نہیں ہوئی بلکہ تین دفعہ باری باری کر کے ٹکڑیوں میں ہوئی تھی۔ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۵۴۳۔ [5] سوائے شاید ایک شخص جد بن قیس کے جسکے متعلق ایک روایت آتی ہے کہ وہ منافق تھا اور بیعت کے وقت اپنے اونٹ کے پیچھے چُھپ گیا تھا۔ (ابن ہشام و اسد الغابہ)۔

رک گیا[1] جب بیعت ہو رہی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا "یہ عثمان کا ہاتھ ہے[2] کیونکہ اگر وہ یہاں ہوتا تو اس مقدس سودے میں کسی سے پیچھے نہ رہتا لیکن اس وقت وہ خدا اور اُس کے رسول کے کام میں مصروف ہے[3]" اس طرح یہ بجلی کا سا منظر اپنے اختتام کو پہنچا۔

اسلامی تاریخ میں یہ بیعت "بیعتِ رضوان" کے نام سے مشہور ہے یعنی وہ بیعت جس میں مسلمانوں نے خدا کی کامل رضامندی کا انعام حاصل کیا۔ قرآن شریف نے بھی اِس بیعت کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝[4]

یعنی "اللہ تعالیٰ خوش ہوگیا مسلمانوں سے جب کہ اے رسول! وہ ایک درخت کے نیچے تیری بیعت کر رہے تھے کیونکہ اس بیعت سے اُن کے دلوں کا مخفی اخلاص خُدا کے ظاہری علم میں آگیا سو خدا نے بھی ان پر سکینت نازل فرمائی اور انہیں ایک قریب کی فتح کا انعام عطا کیا۔"

صحابہ کرام بھی ہمیشہ اس بیعت کو بڑے فخر اور محبّت کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے اور اُن میں سے اکثر بعد میں آنے والے لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ تم تو مکّہ کی فتح کو فتح شمار کرتے ہو مگر ہم بیعتِ رضوان کو ہی فتح خیال کرتے تھے[5] اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ بیعت اپنے کوائف کے ساتھ مل کر ایک نہایت عظیم الشان فتح تھی۔ نہ صرف اس لیے کہ اس نے آئندہ فتوحات کا دروازہ کھول دیا بلکہ اس لیے بھی کہ اس سے اسلام کی اس جاں فروشانہ رُوح کا جو دینِ محمدیؐ کا گویا مرکزی نقطہ ہے ایک نہایت شاندار رنگ میں اظہار ہوا۔ اور فدائیانِ اسلام نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ وہ اپنے رسول اور اس رسول کی لائی ہوئی صداقت کے لیے ہر میدان میں اور اس میدان کے ہر قدم پر موت وحیات کے سَودے کے لیے تیار ہیں۔ اِسی لیے صحابہ کرام بیعتِ رضوان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ یہ بیعت مَوت کے عہد کی بیعت تھی یعنی اس عہد کی بیعت تھی کہ ہر مسلمان اسلام کی خاطر اور اسلام کی عزت کی خاطر اپنی جان پر کھیل جائیگا مگر پیچھے نہیں ہٹے گا[6] اور اس بیعت کا خاص پہلو یہ تھا کہ یہ عہد و پیمان

---

[1] طبری و ابن ہشام و ابن سعد۔ [2] بخاری باب مناقب عثمان۔ [3] ابن سعد۔ [4] سورۃ الفتح: ۱۹
[5] بخاری کتاب المغازی حالات صُلح حُدیبیہ۔ [6] بخاری حالات صُلح حُدیبیہ

صرف مُنہ کا ایک وقتی اقرار نہیں تھا جو عارضی جوش کی حالت میں کر دیا گیا ہو بلکہ دل کی گہرائیوں کی آواز تھی جس کے پیچھے مسلمانوں کی ساری طاقت ایک نقطۂ واحد پر جمع تھی۔

جب قریش کو اس بیعت کی اطلاع پہنچی تو وہ خوف زدہ ہو گئے۔ اور نہ صرف حضرت عثمانؓ اور اُنکے ساتھیوں کو آزاد کر دیا[1] بلکہ اپنے ایلچیوں کو بھی ہدایت دی کہ اب جس طرح بھی ہو مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر لیں مگر یہ شرط ضرور رکھی جاتے کہ اس سال کی بجائے مسلمان آئندہ سال آکر عمرہ بجالائیں اور بہرحال اب واپس چلے جائیں[2]۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتدا سے یہ عہد کر چکے تھے کہ مَیں اس موقع پر کوئی ایسی بات نہیں کرونگا جو حرم المحرم اور بیت اللہ کے احترام کے خلاف ہو۔ اور چونکہ آپؐ کو خدا نے یہ بشارت دے رکھی تھی کہ اس موقع پر قریش کے ساتھ مصالحت آئندہ کامیابیوں کا پیش خیمہ بننے والی ہے اس لیے گویا فریقین کے لحاظ سے یہ ماحول مصالحت کا ایک نہایت عمدہ ماحول تھا اور اسی ماحول میں سہیل بن عمرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور آپؐ نے اُسے دیکھتے ہی فرمایا کہ اب معاملہ آسان ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ بات روایتوں سے واضح نہیں ہوتی کہ سہیل معیّن طور پر کس مرحلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا اور آیا اُس کا آنا حضرت عثمانؓ کے مکّہ کی طرف جانے سے پہلے تھا یا کہ بعد۔ اور اس بارے میں بعض روایات میں کسی قدر اختلاف و انتشار بھی پایا جاتا ہے مگر بہرحال یہ بات مسلّم ہے کہ صلح کی وہ تحریر جس کا ہم اب ذکر کرنے لگے ہیں وہ سہیل بن عمرو کے ذریعہ ہی تکمیل کو پہنچی۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ قریش کے یہ جملہ سفرا جو یکے بعد دیگرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ سب کے سب بعد میں اسلام لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے[3] سوائے مکرز بن حفص کے جسے دیکھتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ اس شخص سے بداخلاقی اور غداری کی بُو آتی ہے[4]۔

صُلح کی گفتگو

سہیل بن عمرو نے جو گفتگو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی اور جس رنگ میں یہ اہم تاریخی معاہدہ ضبطِ تحریر میں آیا وہ اسلامی تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ ورق ہے جسے سب محدثین اور مؤرخین نے بڑے شوق اور تفصیل کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔ ہم اس جگہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق اس واقعہ کی موٹی موٹی تفاصیل ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ امام بخاری جو روایت کے لحاظ سے جملہ محدثین میں بلند ترین مقام رکھتے ہیں اس دلچسپ واقعہ کو مندرجہ ذیل صورت میں بیان کرتے ہیں۔

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۰۸۔ [2] ابن ہشام وطبری۔ [3] دیکھو اسد الغابہ حالات بدیل و عروہ و سہیل
[4] زرقانی جلد دوم صفحہ ۱۹۳ و ابن ہشام حالات حُدیبیہ

جب سہیل بن عمرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو آپؐ نے اُسے دیکھتے ہی فرمایا یہ سہیل آتا ہے اب خدا نے چاہا تو معاملہ سہل ہو جائے گا۔[۱] بہرحال سہیل آیا اور آتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگا آؤ جی (اب لمبی بحث جانے دو) ہم معاہدہ کے لیے تیار ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم بھی تیار ہیں۔ اور اس ارشاد کے ساتھ ہی آپؐ نے اپنے سیکرٹری (حضرت علیؓ) کو بلوا لیا۔ (اور چونکہ شرائط پر ایک عمومی بحث پہلے ہو چکی تھی اور تفاصیل نے ساتھ ساتھ طے پانا تھا) اس لیے کاتب کے آتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لکھو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سہیل صُلح کے لیے تو تیار تھا مگر قریش کے حقوق کی حفاظت اور اہلِ مکہ کے اکرام کے لیے بھی بہت چوکس رہنا چاہتا تھا۔ فوراً بولا یہ رحمٰن کا لفظ کیسا ہے ہم اسے نہیں جانتے جس طرح عرب لوگ ہمیشہ سے لکھتے آتے ہیں اس طرح لکھو یعنی بِاسْمِكَ اَللّٰھُمَّ دوسری طرف مسلمانوں کے لیے بھی قومی عزت اور مذہبی غیرت کا سوال تھا وہ بھی اس تبدیلی پر فوراً چونک پڑے اور کہنے لگے ہم تو ضرور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی لکھیں گے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر مسلمانوں کو خاموش کرا دیا کہ نہیں نہیں اس میں کوئی حرج نہیں جس طرح سہیل کہتا ہے اُسی طرح لکھ لو۔ چنانچہ بِاسْمِكَ اَللّٰھُمَّ کے الفاظ لکھے گئے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لکھو "یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ نے کیا ہے۔" سہیل نے پھر ٹوکا کہ یہ رسول اللہ کا لفظ ہم نہیں لکھنے دیں گے۔ اگر ہم یہ بات مان لیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں تو پھر تو یہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے اور ہمیں آپ کو روکنے اور آپ کا مقابلہ کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ بس جس طرح ہمارے ہاں طریق ہے صرف یہ الفاظ لکھو کہ محمد بن عبداللہ نے یہ معاہدہ کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آپ لوگ مانیں نہ مانیں مَیں خدا کا رسول تو ہوں" مگر چونکہ مَیں محمد بن عبداللہ بھی ہوں اس لیے چلو یہی سہی لکھو کہ محمدؐ بن عبداللہ نے یہ معاہدہ کیا ہے۔[۲]" مگر اس اثنا میں آپؐ کے کاتب حضرت علیؓ معاہدہ کی تحریر میں "محمدؐ رسول اللہ" کے الفاظ لکھ چکے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا محمدؐ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور اُن کی جگہ محمد بن عبداللہ کے الفاظ لکھ دو۔ مگر اس وقت جوش کا عالم تھا حضرت علیؓ نے غیرت میں آکر عرض کیا "یا رسول اللہ! مَیں تو آپ کے نام کے ساتھ سے رسول اللہ کے الفاظ کبھی نہیں مٹاؤں گا۔" آپؐ نے اُن کی از خود رفتہ حالت کو دیکھ کر فرمایا۔ اچھا تم نہیں مٹاتے تو مجھے دو مَیں خود مٹا دیتا ہوں۔ پھر آپ نے معاہدہ کا کاغذ (یا جو کچھ بھی وہ تھا)

---

[۱] جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اس لفظ میں ادبی خوبی یہ تھی کہ لفظ سہیل اور سہل ایک ہی رُوٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ بعض اوقات ناموں سے نیک فال لے لیا کرتے تھے۔

[۲] بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد

ہاتھ میں لیکر اور حضرت علیؓ سے اُن الفاظ کی جگہ پوچھ کر رسول اللہ کے الفاظ اپنے ہاتھ سے کاٹ دیئے اور اُن کی جگہ ابن عبداللہ کے الفاظ لکھ دیئے [1] (حاشیہ میں نوٹ ملاحظہ فرمائیں)

آنحضرتؐ کی اُمیّت

متن کی روایت میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے "محمد رسول اللہ" کے الفاظ کاٹ کر اُن کی جگہ "محمد بن عبداللہ" کے الفاظ لکھ دیئے۔ اس پر بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال گذر سکتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی یعنی ناخواندہ تھے جیسا کہ خود قرآن شریف آپ کے متعلق اُمِّیْ کا لفظ استعمال فرماتا ہے [2] تو پھر یہ کس طرح ممکن ہوا کہ آپؐ نے خود اپنے ہاتھ سے محمد رسول اللہ کے الفاظ کاٹے اور اُن کی جگہ دوسرے الفاظ لکھ دیئے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ یا تو آپ اُمّی نہیں تھے اور یا اُوپر والی روایت غلط ہے۔ سو اس اعتراض کے متعلق کتاب ہذا کے حصہ اوّل میں ایک مختصر بحث گذر چکی ہے وہ ہمارے ناظرین کی تسلی کے لیے کافی ہونی چاہیئے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک آپؐ اُمّی تھے اور جیسا کہ قرآن اور حدیث اور تاریخ کے متعدد بیان سے ثابت ہے آپؐ نے کبھی بھی درسی رنگ میں لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا مگر دوسری طرف یہ بھی درست ہے کہ باوجود اس کے کہ آپؐ اُمّی اور ناخواندہ تھے۔ چونکہ زمانۂ نبوت میں آپؐ کے سامنے کثرت کے ساتھ مراسلات وغیرہ پیش ہوتے رہتے تھے اس لیے اس زمانہ میں آپؐ کو کچھ حروف شناسی ہوگئی ہوگی اور ایک ذہین انسان کے لیے یہ بات ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ وہ باوجود ناخواندہ ہونے کے مراسلات کے بار بار سامنے آنے کی وجہ سے کچھ حروف شناسی پیدا کرلے مگر ظاہر ہے کہ ایسی حروف شناسی کے باوجود ایسے شخص کے اُمّی ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا اور بہرحال وہ ناخواندہ ہی سمجھا جائے گا اور پھر جیسا کہ اس کتاب کے حصہ اوّل میں بیان کیا جاچکا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ بخاری وغیرہ کی روایت میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "محمد بن عبداللہ" کے الفاظ لکھ دیئے اس سے مُراد لکھا دینا ہو کیونکہ عام محاورہ میں بعض اوقات "لکھنے" کا لفظ "لکھا دینے" کے معنی میں بھی آجاتا ہے۔ گویا اس صورت میں مُراد یہ ہوگی کہ "رسول اللہ" کے الفاظ تو آپؐ نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹ دیئے (اور نشان دہی کے بعد ایک ناخواندہ شخص بھی آسانی کے ساتھ لکھے ہوئے الفاظ کاٹ سکتا ہے) مگر اس کے بعد "بن عبداللہ" کے الفاظ کاتب سے لکھوا دیئے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کی اصل غیرت "رسول اللہ" کے الفاظ کاٹنے پر تھی نہ کہ اُن کی جگہ "بن عبداللہ" الفاظ لکھنے پر۔ اور حدیث میں ان کی طرف الفاظ بھی یہی منسوب کئے گئے ہیں کہ خدا کی قسم میں رسول اللہ کے الفاظ نہیں کاٹوں گا۔ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا قطعی طور پر ثابت ہے اور اسلام کا یہ ایک عظیم الشان علمی اور رُوحانی معجزہ ہے کہ خُدا کے نُور نے ایک ناخواندہ انسان کو ساری قوموں اور سارے زمانوں کا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء و کتاب الصلح و مسلم باب صلح الحدیبیہ

[2] سورۃ الاعراف: ۱۵۸، ۱۵۹۔ نیز دیکھئے سورۃ العنکبوت: ۴۹۔

اس کے بعد آپؐ نے لکھوایا کہ" معاہدہ یہ ہے کہ اہلِ مکہ ہمیں بیت اللہ کے طواف سے نہیں روکینگے"۔ سہیل فوراً بولا" خدا کی قسم اِس سال تو یہ ہرگز نہیں ہوسکے گا ورنہ عربوں میں ہماری ناک کٹ جائے گی۔ ہاں اگلے سال آپ لوگ آکر طواف کرسکتے ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا۔ اچھا یہی لکھو۔ پھر سہیل نے اپنی طرف سے لکھایا کہ یہ بھی شرط ہوگی کہ اہلِ مکہ میں سے کوئی شخص مسلمانوں کے ساتھ جاکر شامل نہیں ہوسکے گا۔ خواہ وہ مسلمان ہو۔ اور اگر ایسا کوئی شخص مسلمانوں کی طرف جائے گا تو اُسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔ صحابہ نے اس پر شور مچایا کہ سُبحان اللہ! یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہوکر آئے اور ہم اُسے لوٹا دیں۔ اسی بات پر جھگڑا ہورہا تھا کہ اچانک قریشِ مکہ کے سفیر سہیل بن عمرو کا لڑکا ابوجندل بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا اِس مجلس میں گرتا پڑتا آپہنچا۔ اِس نوجوان کو اہلِ مکہ نے مسلمان ہونے پر قید کرلیا تھا اور سخت عذاب میں مُبتلا کر رکھا تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے اِس قدر قریب تشریف لائے ہوئے ہیں تو وہ کسی طرح اہلِ مکہ کی قید سے چھُوٹ کر اپنی بیڑیوں میں جکڑا ہوا گرتا پڑتا حدیبیہ میں پہنچ گیا اور اتفاق سے پہنچا بھی اُس وقت جب کہ اُس کا باپ معاہدہ کی یہ شرط لکھا رہا تھا کہ ہر شخص جو مکہ والوں میں سے مسلمانوں کی طرف آئے وہ خواہ مسلمان ہی ہو اُسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔ ابوجندل نے گرتے پڑتے اپنے آپ کو مسلمانوں کے سامنے لا ڈالا اور دردناک آواز میں پُکار کر کہا کہ" اے مسلمانو! مجھے محض اسلام کی وجہ سے یہ عذاب دیا جارہا ہے خدا کے لیے مجھے بچاؤ"۔ مسلمان اس نظارہ کو دیکھ کر تڑپ اُٹھے مگر سہیل بھی اپنی ضِد پر اَڑ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگا۔ یہ پہلا مطالبہ ہے جو مَیں اس معاہدہ کے مطابق آپ سے کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ابوجندل کو میرے حوالہ کردیں۔ آپؐ نے فرمایا" ابھی تو معاہدہ تکمیل کو نہیں پہنچا"۔ سہیل نے کہا اگر آپ نے ابوجندل کو نہ لوٹایا تو پھر اس معاہدہ کی کارروائی ختم سمجھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" آؤ آؤ۔ جانے دو اور ہمیں احسان و مروّت کے طور پر ہی ابوجندل کو دیدو"۔ سہیل نے کہا نہیں نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا" سہیل! ضد نہ کرو۔ میری یہ بات مان لو"۔ سہیل نے کہا مَیں یہ بات ہرگز نہیں مان سکتا۔ اس موقع پر ابوجندل نے پھر پُکار کر کہا۔ اے مسلمانو!

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

معلّم اور استاد بنا دیا اور آج کے علمی زمانہ میں بھی جب کہ گویا علم کے دریا پھُوٹ پھوٹ کر بہہ رہے ہیں ہر سچے متلاشی اور ہر سچے محقق کی نظر مذہب کے میدان میں ہر علمی اُلجھن کے موقع پر آپ کی طرف اُٹھتی ہے اور وہ آپ کی ہدایت کے سوا کسی اور جگہ حقیقی تسلی نہیں پاتا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں اُمّی کے معنی ناخواندہ کے علاوہ معصوم اور پاک وصاف کے بھی ہوتے ہیں (تاج العروس) کیونکہ اُمّی کا لفظ دراصل اُمّ (یعنی ماں) سے نکلا ہوا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ گناہوں اور لغزشوں سے اس طرح بچا ہوا جس طرح ایک نوزائیدہ بچہ بچا ہوا ہوتا ہے اور یہ تعریف بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے۔

کیا تمہارا ایک مسلمان بھائی اس شدید عذاب کی حالت میں مشرکوں کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا؟[1] یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس وقت ابوجندل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپیل نہیں کی بلکہ عامۃ المسلمین سے اپیل کی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خواہ کتنا ہی درد ہو آپؐ کسی صورت میں معاہدہ کی کارروائی میں رخنہ نہیں پیدا ہونے دیں گے مگر غالباً عامۃ المسلمین سے وہ یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ شاید غیرت میں آکر اس وقت جبکہ ابھی معاہدہ کی شرطیں لکھی جارہی تھیں کوئی ایسا رستہ نکال لیں جس میں اس کی رہائی کی صورت پیدا ہو جائے مگر مسلمان خواہ کیسے ہی جوش میں تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ آپؐ نے کچھ وقت خاموش رہ کر ابوجندل سے دردمندانہ الفاظ میں فرمایا" اے ابوجندل! صبر سے کام لو اور خدا کی طرف نظر رکھو۔ خدا تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ کے دوسرے کمزور مسلمانوں کے لیے ضرور خود کوئی رستہ کھول دیگا، لیکن ہم اس وقت مجبور ہیں کیونکہ اہل مکہ کے ساتھ معاہدہ کی بات ہو چکی ہے اور ہم اس معاہدہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔"[2]

حضرت عمرؓ کا جوش و خروش

مسلمان یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور مذہبی غیرت سے اُن کی آنکھوں میں خون اُتر رہا تھا مگر رسول اللہ کے سامنے سہم کر خاموش تھے۔ آخر حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آئے اور کانپتی ہوئی آواز میں فرمایا" کیا آپؐ خدا کے برحق رسول نہیں؟" آپؐ نے فرمایا" ہاں ہاں ضرور ہوں" عمرؓ نے کہا" کیا ہم حق پر نہیں اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں؟" آپؐ نے فرمایا" ہاں ہاں ضرور ایسا ہی ہے" عمرؓ نے کہا" تو پھر ہم اپنے سچے دین کے معاملہ میں یہ ذلت کیوں برداشت کریں؟" آپؐ نے حضرت عمرؓ کی حالت کو دیکھ کر مختصر الفاظ میں فرمایا" دیکھو عمر! میں خدا کا رسول ہوں اور میں خدا کے منشاء کو جانتا ہوں اور اُس کے خلاف نہیں چل سکتا اور وہی میرا مددگار ہے" مگر حضرت عمرؓ کی طبیعت کا تلاطم لحظہ بلحظہ بڑھ رہا تھا۔ کہنے لگے" کیا آپؐ نے ہم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے؟" آپؐ نے فرمایا" ہاں میں نے ضرور کہا تھا مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ طواف ضرور اسی سال ہو گا؟" عمرؓ نے کہا" نہیں ایسا تو نہیں کہا۔" آپؐ نے فرمایا" تو پھر انتظار کرو تم انشاء اللہ ضرور مکہ میں داخل ہو گے اور کعبہ کا طواف کرو گے۔" مگر اس جوش کے عالم میں حضرت عمرؓ کی تسلی نہیں ہوئی، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص رُعب تھا اس لیے حضرت عمرؓ وہاں سے ہٹ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور اُن کے ساتھ بھی اسی قسم کی جوش کی باتیں کیں اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی اسی قسم کے جواب دیئے مگر ساتھ ہی حضرت

---

[1] بخاری کتاب الشروط۔ [2] ابن ہشام حالات صلح حدیبیہ

ابوبکرؓ نے نصیحت کے رنگ میں فرمایا۔ "دیکھو عمر سنبھل کر رہو اور رسولِ خدا کی رکاب پر جو ہاتھ تم نے رکھا ہے اُسے ڈھیلا نہ ہونے دو کیونکہ خدا کی قسم یہ شخص جس کے ہاتھ میں ہم نے اپنا ہاتھ دیا ہے بہر حال سچا ہے"۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس وقت میں اپنے جوش میں یہ ساری باتیں کہہ تو گیا مگر بعد میں مجھے سخت ندامت ہوئی اور میں توبہ کے رنگ میں اس کمزوری کے اثر کو دھونے کے لیے بہت سے نفلی اعمال بجالایا[1] یعنی صدقے کئے۔ روزے رکھے۔ نفلی نمازیں پڑھیں اور غلام آزاد کئے تاکہ میری اس کمزوری کا داغ دُھل جائے[2]

صُلح کی شرائط

بہر حال بڑی ردّ وکد کے بعد یہ معاہدہ تکمیل کو پہنچا اور قریباً ہر امر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات کو چھوڑ کر قریش کا مطالبہ مان لیا اور خدائی منشاء کے ماتحت اپنے اس عہد کو پوری وفاداری کے ساتھ پورا کیا کہ بیت اللہ کے اکرام کی خاطر قریش کی طرف سے جو مطالبہ بھی ہوگا اُسے مان لیا جائے گا اور بہر صورت حرم کے احترام کو قائم رکھا جائیگا اس معاہدہ کی شرائط حسب ذیل تھیں :-

۱۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھی اس سال واپس چلے جائیں[3]

۲۔ آئندہ سال وہ مکہ میں آکر رسمِ عمرہ ادا کر سکتے ہیں مگر سوائے نیام میں بند تلوار کے کوئی ہتھیار ساتھ نہ ہو اور مکہ میں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں[4]

۳۔ اگر کوئی مرد مکہ والوں میں سے مدینہ جائے تو خواہ وہ مسلمان ہی ہو آنحضرت ﷺ اُسے مدینہ میں پناہ نہ دیں اور واپس لوٹا دیں۔ چنانچہ اس تعلق میں صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ لَا يَأْتِيكَ مِنَّا رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ عَلَىٰ دِينِكَ إِلَّا رَدَدْتَهُ إِلَيْنَا۔ یعنی "ہم میں سے اگر کوئی مرد آپ کے پاس جائے تو آپ اسے واپس لوٹا دیں گے"[5]

لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ کو چھوڑ کر مکہ میں آجائے تو اُسے واپس نہیں لوٹایا جائے گا۔[6]
اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اگر مکہ والوں میں سے کوئی شخص اپنے ولی یعنی گارڈین کی اجازت کے بغیر مدینہ آجائے تو اُسے واپس لوٹا دیا جائے گا[7]

---

[1] بخاری کتاب الشروط ؛ [2] ابن ہشام حالات حدیبیہ ؛ [3] بخاری کتاب الشروط وکتاب الصلح

[4] بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء وکتاب الجہاد باب المصالحۃ علی ثلاثۃ ایام وکتاب الصلح باب الصلح مع المشرکین ومسلم باب صلح الحدیبیہ۔ [5] بخاری کتاب الشروط اور کتاب المغازی حالات حدیبیہ حدیث عن مروان ومسور

[6] بخاری کتاب الصلح باب الصلح مع المشرکین۔ مسلم باب صلح الحدیبیہ عن انس و ابن سعد حالات حدیبیہ

[7] سیرۃ ابن ہشام

۴۔ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ چاہے مسلمانوں کا حلیف بن جائے اور جو چاہے اہل مکہ کا۔[1]
۵۔ یہ معاہدہ فی الحال دس سال تک کے لیے ہوگا اور اس عرصہ میں قریش اور مسلمانوں کے درمیان جنگ بند رہے گی۔[2]

اِس معاہدہ کی دو نقلیں کی گئیں[3] اور بطور گواہ کے فریقین کے متعدد معززین نے اُن پر اپنے دستخط ثبت کئے۔ مسلمانوں کی طرف سے دستخط کرنے والوں میں حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ[4]۔ حضرت عثمانؓ (جو اس وقت تک مکہ سے واپس آچکے تھے) عبدالرحمٰن بن عوف۔ سعد بن ابی وقاص اور ابوعبیدہؓ[5] تھے۔ معاہدہ کی تکمیل کے بعد سہیل بن عمرو معاہدہ کی ایک نقل لے کر مکہ کی طرف واپس لوٹ گیا اور دوسری نقل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہی۔[6]

صحابہؓ میں اضطراب

جب سہیل واپس جاچکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ"لو اب اُٹھو اور یہیں اپنی قربانیاں ذبح کر کے سروں کے بال منڈوا دو (قربانی کے بعد سر کے بالوں کو منڈوایا یا کترایا جاتا ہے) اور واپسی کی تیاری کرو۔"مگر صحابہ کو اس بظاہر رسواکن معاہدہ کی وجہ سے سخت صدمہ تھا اور ساتھ ہی جب انہیں اِس طرف خیال جاتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ایک خواب کی بنا پر یہاں لائے تھے اور اللہ تعالیٰ نے خواب میں طوافِ بیت اللہ کا نظارہ بھی دکھایا تھا تو اُن کی طبیعت بہت ہی مضمحل ہونے لگتی تھی اور وہ قریباً بے جانوں کی طرح بےحس و حرکت پڑے تھے۔ انہیں خدا کے رسول پر پُورا پُورا ایمان تھا اور اس کے وعدہ پر بھی کامل یقین تھا مگر لوازماتِ بشریت کے ماتحت اُن کے دل اس ظاہری ناکامی پر غموں سے نڈھال تھے اس لیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے یہ فرمایا کہ اب یہیں قربانی کے جانور ذبح کر دو اور واپس لَوٹ چلو تو کسی صحابی نے سامنے سے حرکت نہ کی۔ اس لیے نہیں کہ وہ نعوذ باللہ اپنے رسولؐ کے نافرمان تھے کیونکہ صحابہ سے بڑھ کر دُنیا کے پردے پر کوئی فرمانبردار جماعت نہیں گذری پس اُن کی طرف سے یہ عدمِ تعمیل بغاوت یا نافرمانی کے رنگ میں نہ تھی بلکہ اس لیے تھی کہ غم اور ظاہری ذلت کے احساس نے انہیں اتنا نڈھال کر رکھا تھا کہ وہ گویا سنتے ہوتے نہ سُنتے تھے اور دیکھتے ہوتے بھی اُن کی آنکھیں کام نہ کرتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد کو دوبارہ سہ بارہ دُہرایا مگر کسی صحابی نے سامنے سے حرکت نہ کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس کا صدمہ ہوا اور آپؐ خاموش ہو کر اپنے خیمہ کے

---

[1] ابن ہشام و ابن سعد و طبری ۔ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی صلح العدو و ابن ہشام و ابن سعد۔
[3] ابن سعد و زرقانی ۔ [4] ملاحظہ ہو کہ باوجود سخت اختلاف رائے کے حضرت عمرؓ دستخط کرنے میں قطعاً متامل نہیں ہوئے۔ [5] ابن ہشام ۔ [6] ابن سعد و طبری و زرقانی

اندر تشریف لے گئے۔ اندرون خیمہ آپؐ کی حرم محترم حضرت اُم سلمہؓ جو ایک نہایت زیرک خاتون تھیں یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے موقر اور محبوب خاوند کو فکر مند حالت میں اندر آتے دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے آپؐ کے فکر و تشویش کی تفاصیل معلوم کیں تو ہمدردی اور محبت کے انداز میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ رنج نہ فرمائیں آپ کے صحابہ خدا کے فضل سے نافرمان نہیں مگر اس صُلح کی شرائط نے انہیں غم سے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ پس میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اُن سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ خاموشی کے ساتھ باہر جاکر اپنے قربانی کے جانور کو ذبح فرمادیں اور اپنے سر کے بالوں کو منڈوا دیں پھر آپ کے صحابہ خود بخود آپ کے پیچھے ہولیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تجویز پسند آئی اور آپؐ نے باہر تشریف لاکر بغیر کچھ کہے اپنے قربانی کے جانور کو ذبح کرکے اپنے سر کے بال منڈوانے شروع کر دیئے۔ صحابہ نے یہ منظر دیکھا تو جس طرح ایک سویا ہوا شخص کوئی شور وغیرہ سُنکر اچانک بیدار ہوتا ہے وہ چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور دیوانہ وار اپنے جانوروں کو ذبح کرنا شروع کر دیا اور ایک دوسرے کے سر کے بال مونڈنے لگے مگر غم نے اس قدر بے چین کر رکھا تھا کہ راوی بیان کرتا ہے کہ اُس وقت ایسا عالم تھا کہ ڈر تھا کہ مسلمان کہیں ایک دوسرے کے بال مونڈتے مونڈتے ایک دوسرے کا گلا ہی نہ کاٹ دیں[1]۔ بہرحال حضرت اُم سلمہؓ کی تجویز کارگر ہوئی اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مُبارک کے الفاظ وقتی طور پر ناکام رہے تھے وہاں آپؐ کے عمل نے سوتے ہوؤں کو چونکا کر بیدار کر دیا[2]۔

حُدیبیہ سے واپسی اور سُورۃ فتح کا نزول

قربانی وغیرہ سے فارغ ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف واپسی کا حکم دیا۔ اُس وقت آپؐ کو حُدیبیہ میں آتے کچھ کم بیس یوم ہو چکے تھے۔ جب آپؐ واپسی سفر میں عسفان کے قریب کراع الغمیم میں پہنچے اور یہ رات کا وقت تھا تو اعلان کرا کے صحابہ کو جمع کروایا اور فرمایا کہ آج رات مجھ پر ایک سُورۃ نازل ہوئی ہے جو مجھے دُنیا کی سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے اور وہ یہ ہے:-

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ

---

[1] بخاری کتاب الشروط و زرقانی۔ [2] اس موقع پر اکثر صحابہ نے تو اپنے سر کے بال منڈوا دیئے تھے مگر بعض نے صرف کتروانے پر اکتفا کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منڈوانے والوں کو مکرر سہ مکرر دُعا دی۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ نے منڈوانے والوں کو تین دفعہ دُعا دی ہے اور کتروانے والوں کے لیے صرف ایک دفعہ دعائیہ الفاظ فرماتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ بال منڈوانے والے لوگ وہ ہیں جو اس وقت شک میں مبتلا نہیں ہوئے مگر بال کتروانے والے شک میں مبتلا ہو گئے۔ ابن ہشام

ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ○ ..... لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ [1]

یعنی "اے رسول! ہم نے تجھے ایک عظیم الشان فتح عطا کی ہے تاکہ ہم تیرے لیے ایک ایسے دَور کا آغاز کرا دیں جس میں تیری اگلی اور پچھلی سب کمزوریوں پر مغفرت کا پردہ پڑ جاتے اور تا خدا اپنی نعمت کو تجھ پر کامل کرے اور تیرے لیے کامیابی کے سیدھے رستے کھول دے اور ضرور خدا تعالیٰ تیری زبردست نصرت فرماتے گا..... حق یہ ہے کہ خدا نے اپنے رسول کی اس خواب کو پُورا کر دیا جو اُس نے رسول کو دکھائی تھی۔ کیونکہ اب تم انشاء اللہ ضرور ضرور امن کی حالت میں مسجد حرام میں داخل ہو گے اور قربانیوں کو خدا کی راہ میں پیش کر کے اپنے سر کے بالوں کو منڈواؤ گے یا کترواؤ گے اور تم پر کوئی خوف نہیں ہو گا" یعنی اگر تم اِس سال مکہ میں داخل ہو جاتے تو یہ داخلہ امن کا نہ ہوتا بلکہ جنگ اور خونریزی کا داخلہ ہوتا مگر خدا نے خواب میں امن کا داخلہ دکھایا تھا اس لیے خدا نے اس سال معاہدہ کے نتیجہ میں امن کی صورت پیدا کر دی اور اب عنقریب تم خدا کی دکھائی ہوئی خواب کے مطابق امن کی حالت میں مسجد حرام میں داخل ہو گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جب آپؐ نے یہ آیات صحابہ کو سنائیں تو چونکہ بعض صحابہ کے دل میں ابھی تک صلح حدیبیہ کی تلخی باقی تھی وہ حیران ہوئے کہ ہم تو بظاہر ناکام ہو کر واپس جارہے ہیں اور خدا ہمیں فتح کی مبارکباد دے رہا ہے حتیٰ کہ بعض جلد باز صحابہ نے اس قسم کے الفاظ بھی کہے کہ کیا یہ فتح ہے کہ ہم طوافِ بیت اللہ سے محروم ہو کر واپس جارہے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو آپؐ نے بہت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ایک مختصر سی تقریر میں جوش کے ساتھ فرمایا "یہ بہت بیہودہ اعتراض ہے کیونکہ غور کیا جائے تو واقعی حدیبیہ کی صلح ہمارے لیے ایک بڑی بھاری فتح ہے۔ قریش جو ہمارے خلاف میدانِ جنگ میں اُترے ہوتے تھے انہوں نے خود جنگ کو ترک کر کے امن کا معاہدہ کر لیا ہے اور آئندہ سال ہمارے لیے مکہ کے دروازے کھول دینے کا وعدہ کیا ہے اور ہم امن و سلامتی کے ساتھ اہلِ مکہ کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ ہو کر اور آئندہ فتوحات کی خوشبو پاتے ہوتے واپس جارہے ہیں پس یقیناً یہ ایک عظیم الشان فتح ہے۔ کیا تم لوگ اُن نظاروں کو بھول گئے کہ یہی قریش اُحد اور احزاب کی جنگوں میں

---

[1] سورۃ الفتح : ۲ تا ۴ و ۲۸

کس طرح تمہارے خلاف چڑھائیاں کر کر کے آتے تھے۔ اور یہ زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہوگئی تھی اور تمہاری آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے مُنہ کو آتے تھے مگر آج یہی قریش تمہارے ساتھ امن وامان کا معاہدہ کر رہے ہیں"۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم سمجھ گئے۔ ہم سمجھ گئے۔ جہاں تک آپؐ کی نظر پہنچی ہے وہاں تک ہماری نظر نہیں پہنچی۔ مگر اب ہم نے سمجھ لیا ہے کہ واقعی یہ معاہدہ ہمارے لیے ایک بھاری فتح ہے[1]۔

حضرت عمرؓ کا مزید پیچ و تاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس تقریر سے پہلے حضرت عمرؓ بھی بڑے پیچ و تاب میں تھے۔ چنانچہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ حُدیبیہ کی واپسی پر جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت سفر میں تھے تو اُسوقت مَیں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کچھ عرض کرنا چاہا مگر آپؐ خاموش رہے۔ مَیں نے دوبارہ۔ سہ بارہ عرض کیا مگر آپؐ بدستور خاموش رہے[2] مجھے آنحضرتؐ کی اِس خاموشی پر بہت غم ہوا اور مَیں اپنے نفس میں یہ کہتا ہوا کہ عمر تُو تو ہلاک ہوگیا کہ تین دفعہ تُو نے رسول اللہؐ کو مخاطب کیا مگر آپؐ نہیں بولے چنانچہ مَیں مسلمانوں کی جمعیت میں سے سب سے آگے نکل آیا اور اِس غم میں پیچ و تاب کھانے لگا کہ کیا بات ہے؟ اور مجھے ڈر پیدا ہوا کہ کہیں میرے بارے میں کوئی قرآنی آیت نازل نہ ہو جائے۔ اتنے میں کسی شخص نے میرا نام لیکر آواز دی کہ "عمر بن خطاب کو رسول اللہؐ نے یاد فرمایا ہے"۔ مَیں نے کہا بس ہونہ ہو میرے متعلق کوئی قرآنی آیت نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ میں گھبرایا ہوا جلدی جلدی رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کر کے آپؐ کے پہلو میں آگیا۔ آپؐ نے فرمایا "مجھ پر اِس وقت ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے دُنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے"۔ پھر آپؐ نے سورۃ فتح کی آیات تلاوت فرمائیں[3] حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا یہ صُلح واقعی اسلام کی فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں یقیناً یہ ہماری فتح ہے"۔ اِس پر حضرت عمرؓ تسلی پاکر خاموش ہوگئے[4] اِس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں واپس تشریف لے آئے۔

مسلمان مہاجر عورتوں کیلئے ایک استثنائی انتظام

معاہدوں میں رخنے رہ جایا کرتے ہیں جو بعض اوقات بعد میں اہم نتائج کا باعث بن جاتے ہیں۔ چنانچہ صُلح حدیبیہ میں بھی یہ رخنہ رہ گیا تھا کہ اس میں گو مسلمان مردوں کی

---

[1] بیہقی بحوالہ زرقانی جلد دوم صفحہ ۲۱۰، ۲۱۱۔ [2] غالباً اسوقت سورۃ فتح کی آیات نازل ہو رہی ہوں گی۔ [3] بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر سورۃ فتح و کتاب المغازی عن زید بن اسلم عن ابیہ۔ [4] مسلم باب صلح الحدیبیہ عن انس

واپسی کے متعلق صراحتہً ذکر تھا مگر ایسی عورتوں کا کوئی ذکر نہیں تھا جو اہلِ مکہ میں سے اسلام قبول کر کے مسلمانوں میں آملیں۔ مگر جلد ہی ایسے حالات رونما ہونے لگے جن سے کفارِ مکہ پر اس رخنہ کا وجود کھلے طور پر ظاہر ہوگیا۔ چنانچہ ابھی اس معاہدہ پر بہت تھوڑا وقت گذرا تھا کہ مکہ سے بعض مسلمان عورتیں کفار کے ہاتھ سے چھوٹ کر مدینہ میں پہنچ گئیں۔ ان میں سب سے اوّل نمبر پر مکہ کے ایک فوت شدہ مشرک رئیس عقبہ ابن ابی معیط کی لڑکی اُمّ کلثوم تھی جو ماں کی طرف سے حضرت عثمانؓ بن عفان کی بہن بھی لگتی تھی۔ اُمّ کلثوم بڑی ہمت دکھا کر پا پیادہ مدینہ پہنچی[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ مگر اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے دو قریبی رشتہ دار بھی اُس کے پکڑنے کے لیے پہنچ گئے اور اُس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اِن لوگوں کا دعویٰ یہ تھا کہ (گو معاہدہ میں مرد کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر) دراصل معاہدہ عام ہے اور عورت مرد دونوں پر مساوی اثر رکھتا ہے۔ مگر اُمّ کلثوم معاہدہ کے الفاظ کے علاوہ اِس بنا پر بھی عورتوں کے معاملہ میں استثناء کی مدعی تھی کہ عورت ایک کمزور جنس سے تعلق رکھتی ہے اور ویسے بھی وہ مرد کے مقابلہ پر ایک ماتحت پوزیشن میں ہوتی ہے اس لیے اُسے واپس کرنا گویا رُوحانی موت کے مُنہ میں دھکیلنا اور اسلام سے محروم کرنا ہے[2] پس عورتوں کا اِس معاہدہ سے مستثنیٰ سمجھا جانا نہ صرف عین معاہدہ کے مطابق بلکہ عقلاً بھی قرینِ انصاف اور ضروری تھا اس لیے طبعاً اور انصافاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّ کلثوم کے حق میں فیصلہ فرمایا اور اس کے رشتہ داروں کو واپس لوٹا دیا اور خدا تعالیٰ نے بھی اِس فیصلہ کی تائید فرمائی چنانچہ انہی دنوں میں یہ قرآنی آیات نازل ہوئیں کہ جب کوئی عورت اسلام کا ادعا کرتی ہوئی مدینہ میں آئے تو اُس کا اچھی طرح سے امتحان کر و اور اگر وہ نیک بخت اور مخلص ثابت ہو تو پھر اُسے کفار کی طرف ہرگز نہ لوٹاؤ، لیکن اگر وہ شادی شدہ ہو تو اُس کا مَہر اُس کے مشرک خاوند کو ضرور ادا کر دو[3] اس کے بعد جب بھی کوئی عورت مکہ سے نکل کر مدینہ میں پہنچتی تھی تو اُس کا اچھی طرح سے امتحان لیا جاتا تھا اور اُس کی نیت اور اخلاص کو اچھی طرح پرکھا جاتا تھا۔ پھر جو عورتیں نیک نیت اور مخلص ثابت ہوتی تھیں اور اُن کی ہجرت میں کوئی دُنیوی یا نفسانی غرض نہیں پائی جاتی تھی۔ تو اُنہیں مدینہ میں رکھ لیا جاتا تھا اور اگر وہ شادی شدہ ہوتی تھیں تو اُن کا مَہر اُن کے خاوندوں کو ادا کر دیا جاتا تھا اس کے بعد وہ مسلمانوں میں شادی کرنے کے لیے آزاد ہوتی تھیں[4]

---

[1] اسد الغابہ حالات اُمّ کلثوم وسیرۃ حلبیہ حالات حدیبیہ

[2] سیرۃ حلبیہ جلد ۲ صفحہ ۲۹ ؛ [3] قرآن شریف سورۃ الممتحنہ : ۱۱ و بخاری وغیرہ

[4] بخاری حالات حدیبیہ و باب تفسیر سورۃ ممتحنہ و باب صلح الحدیبیہ نیز طبری حالات حدیبیہ صفحہ ۱۵۵۴ و ابن جریر جلد ۲۸ صفحہ ۴۴ ۴۵۱ و اسد الغابہ حالات اُمّ کلثوم

مشرک عورتوں کو بھی آزاد کر دیا گیا

جہاں ایک طرف مسلمان عورتوں کے لیے یہ خاص صورت تجویز کی گئی وہاں دوسری طرف اس موقع پر مشرک عورتوں کے متعلق بھی یہ خاص احکام جاری ہوئے کہ اگر کوئی مشرک عورت مسلمانوں کے نکاح میں ہو تو مسلمان اُسے آزاد کر دیں اور آئندہ کے لیے یہ حکم نافذ کیا گیا کہ کوئی مشرک عورت کسی مسلمان مرد کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ یہ احکام بھی قرآن شریف کے ذریعہ نازل ہوئے[1] اور ان آیات کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ نے جن کے نکاح میں اِس وقت تک بعض مشرک عورتیں تھیں اپنی مشرک بیویوں کو طلاق دیکر آزاد کر دیا[2]۔ اِس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسلام نے ہر غیر مسلم عورت کے ساتھ نکاح منع نہیں کیا بلکہ صرف مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح منع کیا ہے اور اہلِ کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح جائز رکھا ہے[3]۔ اِن احکام میں مصلحت یہ ہے کہ:-

اوّل تو مشرک کا مذہب اسلام سے بعید ترین ہے اور دونوں کے درمیان کوئی اتّصال کی کڑی نہیں ہے اور ایک مشرک عورت کے ساتھ نکاح میں یہ اندیشہ ہے کہ اسکی تربیت میں اولاد دین کے مبادی سے ہی بے بہرہ رہے۔

دوسرے ایک مشرک انسان کا کوئی ضابطۂ اخلاق معیّن نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اس کے ساتھ تعلقات کبھی بھی کسی معیّن اور مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتے۔ دوسری طرف خاص حالات میں تعلقات کی توسیع کی گنجائش کا رکھا جانا بھی ضروری تھا۔ پس مشرک عورتوں سے نکاح حرام قرار دیکر باقی غیر مسلم عورتوں سے نکاح کی اجازت دیدی گئی۔ دُنیا کے موجودہ مذاہب میں سے عیسائی۔ یہودی۔ ہندو وغیرہ اہلِ کتاب کی اصطلاح میں داخل ہیں۔ جن سے ایک مسلمان کا رشتہ ہو سکتا ہے۔ البتہ افریقہ وغیرہ کی اکثر وحشی اقوام اہلِ کتاب میں سے نہیں ہیں اور ان کے ساتھ رشتہ ہر صورت میں ممنوع ہے۔ چونکہ اِس مسئلہ میں کسی قدر مفصّل بحث اُوپر گذر چکی ہے اس لیے اس جگہ اِسی قدر مختصر نوٹ پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ابو بصیر کا واقعہ اور اس کے نتائج

معاہدہ حُدیبیہ کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اگر قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ کی طرف آوے تو مدینہ والے اُسے پناہ نہیں دینگے بلکہ واپس لَوٹا دیں گے، لیکن اگر کوئی مسلمان اسلام سے منحرف ہو کر مکّہ کا رُخ کرے تو مکّہ والے اُسے واپس نہیں کریں گے۔ بظاہر یہ شرط مسلمانوں کے لیے موجبِ ہتک

---

[1] قرآن شریف سورۃ الممتحنہ : ۱۱ [2] بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر سورۃ الممتحنہ وتفسیر ابن کثیر وطبری
[3] قرآن شریف ” ” ” ؛

سمجھی گئی تھی اور اسی لیے کئی مسلمان اِس پر دل برداشتہ تھے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر اور فہیم صحابی کو بھی اُس وقت کی برق زدہ فضا میں اِس شرط پر ناراضگی اور بے چینی پیدا ہوئی تھی۔ مگر اِس کے بعد جلد ہی ایسے حالات پیدا ہوگئے جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ دراصل یہ شرط قریش کیلئے کمزوری کا باعث اور مسلمانوں کی مضبوطی کا موجب تھی۔ کیونکہ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں ہی فرما دیا تھا اگر کوئی مسلمان مدینہ سے منحرف ہو کر جائے گا تو وہ ایک گندہ عضو ہوگا جس کا کاٹا جانا ہی بہتر تھا لیکن اس کے مقابل پر اگر کوئی شخص سچے دل سے مسلمان ہو کر مکہ سے نکلے گا تو خواہ اُسے مدینہ میں جگہ ملے یا نہ ملے وہ جہاں بھی رہے گا اسلام کی مضبوطی کا باعث ہوگا اور بالآخر اللہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ کھول دیگا۔[1] اس نظریہ نے جلد ہی اپنی صداقت کو ثابت کر دیا۔ کیونکہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں تشریف لاتے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ایک شخص ابوبصیر عتبہ بن اسید ثقفی جو مکہ کا رہنے والا تھا اور قبیلہ بنو زہرہ کا حلیف تھا مسلمان ہو کر اور مکہ والوں کی حراست سے بھاگ کر مدینہ پہنچا۔ قریش مکہ نے اُس کے پیچھے پیچھے اپنے دو آدمی بھجوائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے التجا کی کہ ابوبصیر کو معاہدہ کی شرائط کے مطابق اُن کے حوالہ کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبصیر کو بُلایا اور واپس چلے جانے کا حکم دیا۔ ابوبصیر نے سامنے سے واویلا کیا کہ مَیں مسلمان ہوں اور یہ لوگ مجھے مکہ میں تنگ کریں گے اور اسلام سے منحرف ہو جانے کے لیے جبر سے کام لیں گے۔ آپ نے فرمایا:"ہم معاہدہ کی وجہ سے معذور ہیں اور تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر تم خدا کی رضا کی خاطر صبر سے کام لوگے تو خدا خود تمہارے لیے کوئی رستہ کھول دیگا۔ مگر ہم مجبور ہیں اور کسی صورت میں معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔" ناچار ابوبصیر اُن لوگوں کے ساتھ واپس روانہ ہو گیا مگر چونکہ اُس کے دل میں اس بات کی سخت دہشت تھی کہ مکہ میں پہنچ کر اس پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جائیں گے اور اُسے اسلام جیسی نعمت کو چھپا کر رکھنا پڑے گا بلکہ شاید جبر و تشدّد کی وجہ سے اُس سے ہاتھ ہی دھونا پڑے اس لیے جب یہ پارٹی ذوالحلیفہ میں پہنچی جو مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر مکہ کے رستہ پر ہے تو ابوبصیر نے موقع پاکر اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو جو اس پارٹی کا رئیس تھا قتل کر دیا اور قریب تھا کہ دوسرے کو بھی نشانہ بنائے مگر وہ اپنی جان بچا کر اس طرح بھاگا کہ ابوبصیر سے پہلے مدینہ پہنچ گیا۔[2] پیچھے پیچھے ابوبصیر بھی مدینہ میں آپہنچا۔ جب یہ شخص مدینہ میں پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف رکھتے

---

[1] مسلم بحوالہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۹ [2] اس کا دوسری طرف جانے کی بجائے مدینہ کی طرف آنا اِس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کے دل میں یہ یقین تھا کہ میرے لیے مدینہ ایک محفوظ جگہ ہے اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہرحال اُس کی حفاظت فرمائیں گے اور کسی صورت میں معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

تھے۔ اس کی خوف زدہ حالت کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا معلوم ہوتا ہے اسے کوئی خوف وہراس کا سخت دھکا لگا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نے خود بھی ہانپتے کانپتے آپؐ سے عرض کیا کہ "میرا ساتھی مارا گیا ہے اور میں بھی گویا موت کے منہ میں ہوں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے واقعہ سُنا اور تسلی دی۔ اتنے میں ابوبصیر بھی ہاتھ میں تلوار تھامے آن پہنچا اور آتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ آپ نے مجھے قریش کے حوالہ کر دیا اور آپ کی ذمہ داری ختم ہو گئی مگر مجھے خدا نے ظالم قوم سے نجات دے دی ہے اور اب آپ پر میری کوئی ذمہ داری نہیں"۔ آپؐ نے بے ساختہ فرمایا:

وَيْلُ اُمِّهٖ مُسْعِرُ حَرْبٍ لَوْ كَانَ لَهٗ اَحَدٌ[1]

یعنی اس کی ماں کے لیے خرابی ہو (یہ الفاظ عربوں کے محاورہ میں لفظی معنوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ملامت یا تعجب کے موقع پر بولے جاتے ہیں) یہ شخص تو جنگ کی آگ بھڑکا رہا ہے کاش کوئی اسے سنبھالنے والا ہو۔

ابوبصیر نے یہ الفاظ سُنے تو سمجھ لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے بہرحال معاہدہ کی وجہ سے واپس جانے کا ارشاد فرمائیں گے۔ چنانچہ اس بارے میں بخاری کے الفاظ یہ ہیں:۔

فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ عَرَفَ اَنَّهٗ سَيَرُدُّهٗ اِلَيْهِمْ[2]

یعنی "جب ابوبصیر نے آنحضرت ﷺ کے یہ الفاظ سُنے تو جان لیا کہ آپؐ بہرحال اُسے مکّہ والوں کی طرف واپس بھجوا دیں گے"۔

اُس پر وہ چپکے سے وہاں سے نکل آیا اور مکّہ جانے کی بجائے جہاں اُسے جسمانی اور روحانی دونوں موتیں نظر آتی تھیں، بحیرہ احمر کے ساحل کی طرف ہٹ کر سیف البحر میں پہنچ گیا۔

جب مکّہ کے دوسرے مخفی اور کمزور مسلمانوں کو یہ علم ہوا کہ ابوبصیر نے ایک علیحدہ ٹھکانا بنا لیا ہے تو وہ بھی آہستہ آہستہ مکّہ سے نکل نکل کر سیف البحر میں پہنچ گئے۔ انہی لوگوں میں رئیس مکّہ سہیل بن عمرو کا لڑکا ابوجندل بھی تھا جس کے متعلق ہم پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حدیبیہ سے واپس لوٹا دیا تھا۔ آہستہ آہستہ اِن لوگوں کی تعداد ستّر کے قریب[3] یا بعض روایات کے مطابق تین سَو تک پہنچ گئی[4] اور اس طرح گویا مدینہ کے علاوہ ایک دوسری اسلامی ریاست بھی معرضِ وجود میں آگئی جو مذہباً تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت تھی مگر سیاستاً جُدا اور آزاد تھی۔ چونکہ ایک طرف حجاز کی حدود میں ایک علیحدہ اور آزاد سیاسی نظام کا موجود ہونا قریش کے لیے خطرہ کا باعث تھا اور دوسری طرف

---

[1] بخاری کتاب الشروط و ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الصلح العدو۔ [2] بخاری کتاب الشروط۔ [3] ابن ہشام

[4] سہیلی شرح ابن ہشام و موسیٰ بن عقبہ بحوالہ زرقانی

سیف البحر کے مہاجر قریش مکہ سے سخت زخم خوردہ تھے اس لیے ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ ان مہاجرینِ سیف البحر اور قریشِ مکہ کے تعلقات نے قریباً قریباً وہی صورت اختیار کر لی جو ابتداء میں مہاجرینِ مدینہ کے متعلق پیدا ہوئی تھی اور چونکہ سیف البحر اُس رستہ کے بالکل قریب واقع تھا جو مدینہ سے شام کو جاتا تھا اس لیے قریش کے قافلوں کے ساتھ ان مہاجرین کی مٹھ بھیڑ ہونے لگی۔ اس نئی جنگ نے جلد ہی قریش کے لیے خطرناک صورت اختیار کر لی کیونکہ اول تو قریش سابقہ جنگ کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے اور دوسرے اب وہ پہلے کی نسبت تعداد میں بھی بہت کم تھے اور اُن کے مقابل پر سیف البحر کی اسلامی ریاست جو ابوبصیر اور ابوجندل جیسے جان فروشوں کی کمان میں تھی ایمان کے تازہ جوش اور اپنے گذشتہ مظالم کی تلخ یاد میں اِس برقی طاقت سے معمور تھی جو کسی مقابلہ کو خیال میں نہیں لاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں ہی قریش نے ہتھیار ڈال دیئے اور ابوبصیر کی پارٹی کے حملوں سے تنگ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک سفارت کے ذریعہ درخواست کی اور اپنی رشتہ داری کا واسطہ دے کر عرض کیا کہ سیف البحر کے مہاجرین کو مدینہ میں بُلا کر اپنے سیاسی انتظام میں شامل کر لیں اور ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح حدیبیہ کی اس شرط کو کہ مکہ کے نومسلموں کو مدینہ میں پناہ نہیں دی جائیگی اپنی خوشی سے منسوخ کر دیا۔[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس درخواست کو منظور فرمالیا اور ابوبصیر اور ابوجندل کو ایک خط کے ذریعہ اطلاع بھجوائی کہ چونکہ قریش نے اپنی خوشی سے معاہدہ میں ترمیم کر دی ہے اس لیے اب انہیں مدینہ میں چلے آنا چاہیئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایلچی سیف البحر پہنچا تو اُس وقت ابوبصیر بیمار ہو کر صاحب فراش تھا اور حالت نازک ہو رہی تھی۔ ابوبصیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب مبارک کو بڑے شوق کے ساتھ اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا اور تھوڑی دیر بعد اسی حالت میں جان دیدی اور اِس کے بعد ابوجندل اور اس کے ساتھی اپنے اس باہمت اور جوانمرد امیر کو سیف البحر میں ہی دفن کر کے خوشی اور غم کے مخلوط جذبات کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔[2] غم اس لیے کہ اُن کا بہادر لیڈر ابوبصیر جو اِس واقعہ کا ہیرو تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی سے محروم رہا۔ اور خوشی اِس بات پر کہ وہ خود اپنے آقا کے قدموں میں پہنچ گئے اور قریش کے خونی مقابلہ سے نجات ملی۔

ابوبصیر اور اُن کے رفقاء کا دلچسپ کارنامہ صُلح حدیبیہ کے معاً بعد سے لیکر کئی ماہ کے وقفہ پر پھیلا ہوا تھا اور اس عرصہ میں بعض دوسرے واقعات بھی پیش آئے مگر ہم نے صلح حُدیبیہ سے

---

[1] بخاری کتاب الشروط و ابن ہشام و طبری و تاریخ خمیس و سیرۃ حلبیہ

[2] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۰۳ و تاریخ خمیس

تعلق رکھنے والے واقعات کو یکجا بیان کرنے کی غرض سے اسے صلح حدیبیہ کے ساتھ ہی بیان کر دیا ہے۔

صلح حدیبیہ کے تعلق میں عیسائی مؤرخین کے دو اعتراضات

غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح کا کوئی اہم واقعہ ایسا نہیں ہے جسے مسیحی مؤرخین نے بلغرِ اعتراض کے چھوڑا ہو اور صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی اسی کُلیہ کے نیچے آتا ہے۔ بعض ضمنی اور غیر اہم اعتراضات کو نظر انداز کرتے ہوئے عیسائی مصنفین نے صلح حدیبیہ کے تعلق میں دو اعتراض کئے ہیں :۔

اوّل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صلح حدیبیہ کی شرائط سے عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا یہ شرائطِ معاہدہ کی رُو سے جائز نہیں تھا۔ کیونکہ معاہدہ کے الفاظ عام تھے جس میں مرد عورت سب شامل تھے۔

دوم یہ کہ ابوبصیر کے واقعہ کے تعلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کی رُوح کو توڑا بلکہ ابوبصیر کو یہ اشارہ دیکر کہ وہ مکہ میں واپس جانے کی بجائے ایک الگ پارٹی بنا کر اپنا کام کر سکتا ہے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔

ان اعتراضوں کے جواب میں سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ معاہدہ قریشِ مکہ کے ساتھ ہوا تھا اور قریش مکہ وہ قوم تھی جو ابتداء اسلام سے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برسرِپیکار چلی آتی تھی اور بات بات پر اعتراض کرنے اور طعنہ دینے کی عادی تھی۔ اور ویسے بھی وہ کوئی دُور دراز کی غیر قوم نہ تھی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ہی قوم تھی جسے سب حالات کا پُورا پُورا علم تھا۔ اور پھر شرائطِ معاہدہ کی تمام تفصیلات اور اُن کا مکمل پس منظر بھی اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ پس جب مکہ کے قریش نے جو فریقِ معاہدہ تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فعل پر اعتراض نہیں کیا اور اُسے معاہدہ کے خلاف نہیں سمجھا تو تیرہ سو سال بعد میں آنے والے لوگوں کو جن کی آنکھوں سے بہت سی جُزئی تفاصیل پوشیدہ ہیں اور انہیں اس معاہدہ کے پس منظر پر بھی پوری طرح آگاہی نہیں اعتراض کا حق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو مُدّعی سُست گواہ چُست والا معاملہ ہوا کہ جن کے ساتھ یہ سارا قصّہ گذرا ہے وہ تو اُسے درست قرار دیکر خاموش رہتے ہیں مگر تیرہ سو سال بعد میں آنے والوں نے گویا آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ آخر یہ کیا وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ قرآن و حدیث اور عرب کی تاریخ اُن اعتراضوں سے بھرے پڑے ہیں جو کفارِ مکہ اور دوسرے کفارِ عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے، مگر یہ ذکر کسی جگہ نہیں آتا کہ مسلمانوں پر صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا ہو۔

علاوہ ازیں یہ بات مضبوط ترین شہادت سے ثابت ہے کہ جب صُلح حُدیبیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کی طرف تبلیغی خط ارسال کیا اور اُس وقت اتفاق سے ابوسفیان بن حرب رئیس مکہ بھی شام میں گیا ہوا تھا اور ہرقل شہنشاہِ روم نے اُسے اپنے دربار میں بُلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض سوالات کئے جن میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ "کیا تمہاری قوم کے اِس مُدعیٔ نبوت نے کبھی کسی معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے؟ تو اِس سوال کے جواب میں ابوسفیان نے جو اُس وقت رأس المنکرین اور اسلام کا اشد ترین دشمن تھا جو الفاظ کہے وہ یہ تھے۔

لَا۔ وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مُدَّةٍ لَا نَدْرِيْ مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيْهَا وَلَا يُمْكِنُنِيْ كَلِمَةً اَدْخُلُ فِيْهَا شَيْئًا غَيْرَ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ [1]

یعنی "نہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کسی معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی ہاں آجکل اُس کے ساتھ ہمارے ایک معاہدہ کی میعاد چل رہی ہے اور مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اِس معاہدہ کے اختتام تک اُس کی طرف سے کیا امر ظاہر ہو۔ ابوسفیان کہتا ہے کہ اس ساری گفتگو میں میرے لیے اس فقرہ کے بڑھا دینے کے سوا کوئی اور موقع نہیں تھا کہ مَیں آپؐ کے خلاف ہرقل کے دل میں کوئی امکانی شُبہ پیدا کر سکوں۔"

ابوسفیان اور ہرقل کی یہ گفتگو صلح حُدیبیہ کے معاً بعد نہیں ہوئی تھی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہرقل کے نام تبلیغی خط تیار کر کے روانہ کرنے اور پھر اس خط کے ہرقل تک پہنچنے اور پھر ہرقل کی طرف سے دربار منعقد ہونے اور ابوسفیان کو تلاش کر کے اپنے دربار میں بُلانے وغیرہ میں لازماً وقت لگا ہوگا اور قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس وقت تک ابوبصیر کے مدینہ میں بھاگ آنے اور اُمّ کلثوم وغیرہ مسلمان عورتوں کے مکّہ سے نکل کر مدینہ پہنچ جانے کے واقعات ہو چکے ہوں گے اسی لیے سب مؤرخ ابوبصیر اور اُمّ کلثوم والے واقعہ کو پہلے اور قیصرِ روم والے خط کے واقعہ کو اس کے بعد بیان کرتے ہیں مگر باوجود اس کے ابوسفیان ہرقل کے دربار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عہد شکنی کا الزام نہیں لگا سکا حالانکہ اُس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اُس کی یہ خواہش تھی کہ اگر کوئی ہاتھ پڑ سکے تو دریغ نہ کروں۔ مگر باوجود اس کے تیرہ سو سال بعد میں پیدا ہونے والے نقاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عہد شکنی کا الزام لگاتے ہوئے خُدا کا خوف محسوس نہیں کرتے۔ افسوس صد افسوس!

پھر اگر ان اعتراضوں کی تفصیل میں جائیں تو اِن کا بودا پن اَور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے مثلاً

---

[1] بخاری باب کیف کان بدأ الوحی

پہلا اعتراض یہ ہے کہ دراصل معاہدہ میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبردستی سے کام لیکر عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیدیا، لیکن جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں یہ اعتراض بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ معاہدہ کے وہ الفاظ جو صحیح ترین روایت میں بیان ہوئے ہیں اُن میں صراحتہً مذکور ہے کہ معاہدہ میں صرف مرد مُراد تھے نہ کہ مرد اور عورتیں دونوں۔ چنانچہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں صحیح بخاری میں معاہدہ کے یہ الفاظ درج ہیں:۔

لَا يَاتِيْكَ مِنَّا رَجُلٌ وَاِنْ كَانَ عَلٰى دِيْنِكَ اِلَّا رَدَدْتَهٗ اِلَيْنَا [1]

یعنی "ہم میں سے جو مرد بھی آپ کی طرف جائے گا وہ خواہ مسلمان ہی ہوگا اُسے ہماری طرف لوٹا دیا جائے گا۔"

اِن واضح اور غیر مشکوک الفاظ کے ہوتے ہوئے یہ اعتراض کرنا کہ دراصل معاہدہ میں مرد و عورت دونوں مُراد تھے صرف بے انصافی ہی نہیں بلکہ انتہائی بد دیانتی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ کی بعض روایتوں میں معاہدہ کے الفاظ میں رجل (مرد) کا لفظ مذکور نہیں بلکہ عام الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن میں مرد و عورت دونوں شامل سمجھے جاسکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو بہرحال مضبوط روایت کو مقدم سمجھا جائے گا اور جب صحیح ترین روایت میں رجل (مرد) کا لفظ آتا ہے تو لازماً اسی کو صحیح لفظ قرار دینا ہوگا علاوہ ازیں جو الفاظ تاریخی روایت میں آتے ہیں وہ بھی اگر غور کیا جائے تو اسی تشریح کے حامل ہیں جو ہم نے اُوپر بیان کی ہے۔ مثلاً تاریخ کی سب سے زیادہ مشہور اور معروف کتاب سیرۃ ابن ہشام میں یہ الفاظ آتے ہیں:۔

مَنْ اَتٰى مُحَمَّداً مِنْ قُرَيْشٍ بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهٖ رَدَّهٗ عَلَيْهِمْ [2]

یعنی "جو شخص قریش میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اپنے گارڈین کی اجازت کے بغیر پہنچے گا اُسے قریش کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا۔"

عربی کے ان الفاظ میں بیشک "مرد" کا لفظ صراحتہً بیان نہیں ہوا مگر عربی زبان کا ابتدائی علم رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ عربی میں بخلاف بعض دوسری زبانوں کے عورت اور مرد کے لیے علیحدہ علیحدہ صیغے اور علیحدہ علیحدہ ضمیریں استعمال ہوتی ہیں اور اُوپر کی عبارت میں شروع سے لیکر آخر تک مردوں والے صیغے اور مردوں والی ضمیریں استعمال کی گئی ہیں۔ پس جیسا کہ معاہدوں کی زبانوں کی تشریح کا اُصول ہے لازماً اس عبارت میں صرف مرد ہی شامل سمجھے جائیں گے نہ کہ عورت اور مرد دونوں۔ بیشک بعض اوقات عام محاورہ میں مردانہ صیغہ بول کر اس سے مرد و عورت دونوں مراد لے لیے جاتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ

---

[1] بخاری کتاب الشروط۔ [2] سیرۃ ابن ہشام ذکر صلح حدیبیہ

زیرِ بحث عبارت اِس قسم کی عبارت نہیں ہے بلکہ معاہدہ کی عبارت ہے جسے قانون کا درجہ بلکہ اس سے بھی اوپر کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر رکھا جاتا ہے اور الفاظ کا انتخاب دونوں فریقوں کی جرح اور منظوری کے بعد ہوتا ہے لہٰذا ایسی عبارت میں لازماً وہی معنی لیے جائیں گے جو محدود ترین اور مخصوص ترین پہلو رکھتے ہوں۔ پس اس جہت سے بھی بہر حال یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس معاہدہ میں صرف مرد شامل تھے نہ کہ مرد اور عورت دونوں۔

علاوہ ازیں جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے عورت جو ایک کمزور جنس ہے اور عموماً اپنے خاوند یا مرد رشتہ داروں کے رحم پر ہوتی ہے اسے واپس لَوٹانے کے یہ معنی تھے کہ اُسے اسلام لانے کے بعد پھر اپنے ہاتھوں سے کفر اور شرک کی طرف لَوٹا دیا جائے جو نہ صرف رحم و شفقت بلکہ عدل و انصاف کے جذبہ سے بھی بعید تھا۔ بیشک ایک مرد کو واپس لَوٹانے میں بھی اُس کے لیے یہ خطرہ تھا کہ مکّہ کے کفّار اُسے مختلف قسم کے عذابوں اور دُکھوں میں مبتلا کریں گے مگر مرد پھر بھی مرد ہے۔ وہ نہ صرف تکلیفوں کا زیادہ مقابلہ کر سکتا ہے بلکہ حسبِ ضرورت اِدھر اُدھر چھُپ کر یا بھاگ کر یا جتھہ وغیرہ بنا کر اپنے لیے بچاؤ کے کئی رستے کھول سکتا ہے مگر ایک بے بس عورت کیا کر سکتی ہے؟ اس کے لیے ایسے حالات میں یا تو اسلام سے جبری محرومی کی صورت تھی اور یا موت۔ اندریں حالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسی رحیم و کریم ہستی سے بالکل بعید تھا کہ بیکس اور بے بس مسلمان عورتوں کو ظالم کفار کے مظالم کی طرف لَوٹا دیتے۔ پس جو کچھ کیا گیا وہ نہ صرف معاہدہ کے الفاظ کی رو سے بالکل صحیح اور درست تھا بلکہ عدل و انصاف اور رحم و شفقت کے مسلّمہ اُصول کے لحاظ سے بھی عین مناسب اور درست تھا اور اعتراض کرنے والوں کے حصہ میں اس قابلِ افسوس شرم کے سوا کچھ نہیں آیا کہ انہوں نے مظلوم اور بے بس عورتوں کی حفاظت کے انتظام پر بھی زبانِ طعن دراز کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

دوسرا اعتراض ابوبصیر کے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر غور کرنے سے یہ اعتراض بھی بالکل بودا اور کمزور ثابت ہوتا ہے۔ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاہدہ فرمایا تھا کہ کفارِ مکّہ میں سے جو شخص یعنی جو مرد مدینہ بھاگ کر آجائے گا تو وہ خواہ مسلمان ہی ہوگا اُسے مدینہ میں پناہ نہیں دی جائیگی اور واپس لَوٹا دیا جائیگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی؟ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ آپؐ نے اس معاہدہ کے ایفاء کا ایسا کامل اور شاندار نمونہ دکھایا کہ دُنیا اُس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔ غور کرو اور دیکھو کہ ابوبصیر اسلام کی صداقت کا قائل ہو کر مکّہ سے بھاگتا ہے اور کفار کے مظالم سے محفوظ ہونے اور اپنا ایمان بچانے کے لیے چھُپتا چھُپاتا مدینہ میں پہنچ جاتا ہے مگر اُس کے ظالم رشتہ دار بھی اُس کے پیچھے پیچھے پہنچتے ہیں اور اُسے تلوار کے زور سے اسلام کی صداقت سے منحرف کرنے کے لیے جبراً واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ اس پر یہ دونوں فریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ ابوبصیر بھرائی ہوئی آواز اور سہمے ہوئے انداز میں عرض کرتا ہے کہ یا رسول اللہ! مجھے خدا نے اسلام کی نعمت سے نوازا ہے اور مکہ واپس جانے میں جو دُکھ اور خطرہ کی زندگی میرے سامنے ہے اُسے آپ جانتے ہیں خدا کے لیے مجھے واپس نہ لوٹائیں۔ مگر اس کے مقابل پر ابوبصیر کے رشتہ دار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ کا اور ہمارا معاہدہ ہے کہ ہمارا جو آدمی بھی مدینہ آئے گا اُسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔ ابوبصیر کا دُکھ اور اپنے صحابہ کی غیرت آپؐ کی آنکھوں کے سامنے ہے اور خود آپؐ کے اپنے جذبات آپؐ کے دل میں تلاطم برپا کر رہے ہیں۔ مگر یہ امانت و دیانت کا مجسمہ اپنے عہد پر چٹان کی طرح قائم رہتے ہوئے فرماتا ہے اور کن پیارے الفاظ میں فرماتا ہے:۔

يَا اَبَا بَصِيْرٍ اِنَّا قَدْ اَعْطَيْنَا هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ مَا قَدْ عَلِمْتَ وَلَا يَصْلُحُ لَنَا فِيْ دِيْنِنَا الْغَدْرُ وَاِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ لَكَ وَلِمَنْ مَعَكَ مِنَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ فَرَجًا وَّمَخْرَجًا فَانْطَلِقْ اِلٰى قَوْمِكَ[1]

یعنی "اے ابوبصیر! تم جانتے ہو کہ ہم ان لوگوں کو اپنا عہد و پیمان دے چکے ہیں اور ہمارے مذہب میں عہد شکنی جائز نہیں ہے۔ پس تم ان لوگوں کے ساتھ چلے جاؤ۔ پھر اگر تم صبر و استقلال کے ساتھ اسلام پر قائم رہو گے تو خدا تمہارے لیے اور تم جیسے دوسرے بے بس مسلمانوں کے لیے خود کوئی نجات کا رستہ کھول دیگا۔"

اِس ارشادِ نبویؐ پر ابوبصیر مکہ والوں کے ساتھ واپس چلا گیا اور جب وہ مکہ کے رستہ میں اپنے قید کرنے والوں کے ساتھ لڑائی میں غالب ہو کر پھر دوبارہ واپس آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دیکھتے ہی غصہ کے ساتھ فرمایا:۔

وَيْلُ اُمِّهٖ مُسْعِرُ حَرْبٍ لَوْ كَانَ لَهٗ اَحَدٌ[2]۔

یعنی "خرابی ہو اِس کی ماں کے لیے یہ شخص تو لڑائی کی آگ بھڑکا رہا ہے۔ کاش اسے کوئی سنبھالنے والا ہو۔"

یہ الفاظ سُنتے ہی ابوبصیر یہ یقین کر لیتا ہے کہ آپؐ اُسے بہرحال واپس لوٹا دیں گے اور مدینہ سے چُپکے چُپکے نکل آتا ہے اور ایک دُور کی علیحدہ جگہ میں اپنا ٹھکانا بنا لیتا ہے۔ اب اِس سارے واقعہ کو انصاف کی نظر سے دیکھو کہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا ذمہ واری عاید ہوتی ہے اور آپ کے خلاف کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ بلکہ حق یہ ہے کہ آپؐ نے اِس معاملہ میں اپنے جذبات کو کچلتے ہوئے معاہدہ کو پورا کیا اور نہ صرف ایک دفعہ بلکہ دو دفعہ ابوبصیر کو واپس لوٹایا اور واپس بھی ایسے شان دار الفاظ میں

---

[1] سیرۃ ابن ہشام؛ [2] [3] بخاری کتاب الشروط

لوٹایا کہ دُنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپؐ نے اپنے جذبات کو کُچلا۔ اپنے صحابہ کے جذبات کو کچلا اور ابوبصیر کے جذبات کو کچلا اور ہر حال میں معاہدہ کو پورا کیا۔ پھر اگر ابوبصیر خود اہلِ مکّہ سے آزاد ہو کر کسی اور جگہ چلا گیا تو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور معاہدہ کی وہ کونسی شرط ہے جس کے مطابق آپؐ اس بات کے پابند تھے کہ خواہ مکّہ سے بھاگا ہوا شخص کہیں بھی ہو آپؐ اُسے مکّہ میں واپس پہنچا دینے کے ذمہ دار ہوں گے۔ افسوس! افسوس!! اسلام کے دشمنوں نے کسی بھات میں بھی اسلام سے انصاف نہیں کیا۔

اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوبصیر کو اُس کے قائم کردہ کیمپ میں حکم بھجوا سکتے تھے کہ تم مدینہ واپس چلے آؤ اور یہ کہ چونکہ آپؐ نے ایسا نہیں کیا اس لیے آپؐ نے گویا معاہدہ کے الفاظ کو تو نہیں مگر اُن کی روح کو توڑا۔ سو یہ اعتراض بھی ایک سراسر جہالت کا اعتراض ہے اور خود معاہدہ کے الفاظ اور ان الفاظ کی رُوح اسے ردّ کرتے ہیں۔ معاہدہ کی یہ شرط کہ اگر کوئی مکّہ کا بسنے والا مسلمان بھاگ کر مدینہ میں پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے واپس لوٹا دیں گے صاف طور پر ثابت کرتی ہے کہ اس شرط کی غرض و غایت یہ تھی کہ ایسے شخص کو باوجود اُس کے مسلمان ہونے کے مدینہ کی اسلامی سیاست کے دائرہ میں قبول نہیں کیا جائیگا یعنی گو وہ عقیدہ کی رو سے مسلمان ہوگا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے اپنی مدنی سیاست میں شریک نہیں کریں گے۔ تو جب ایسا شخص خود معاہدہ کی شرائط کے ماتحت مدینہ کی اسلامی سیاست سے خارج قرار دیا گیا تھا تو اس کے متعلق یہ مطالبہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ وہ جہاں بھی ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے حکم دے کر واپس لوٹا دیں گے پس یہ کتنا بھاری ظلم ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کو مدینہ میں رکھتے ہیں تو آپؐ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آپ کا معاہدہ تھا کہ مسلمان ہونے کے باوجود آپؐ اُسے اپنی سیاست میں شامل نہیں کریں گے اور اگر آپ اُسے اپنی مدنی سیاست سے خارج کرکے اہلِ مکہ کے سُپرد کرتے اور مدینہ سے نکالتے ہیں تو پھر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپؐ اسے اپنی سیاست میں شامل کرکے حکم کیوں نہیں بھجواتے۔ پس سیاسی لحاظ سے یہ ایک ایسا بودا اور ایسا کمزور اور ایسا لایعنی اعتراض ہے کہ کوئی سمجھ دار شخص اسکی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ اور حق یہ ہے کہ یہ نامعقول شرط جو کفار کی طرف سے معاہدہ میں شامل کی گئی تھی کہ کسی مسلمان مہاجر کو مدینہ میں پناہ نہ دی جائے خدا نے اسی کو اُن کے لیے عذاب بنا کر بتا دیا کہ ہمارے رسولؐ نے تو بہر حال معاہدہ کی پابندی کی مگر تم نے اپنے رستہ میں خود کانٹے بوئے اور خود اپنے ہی بنائے ہوئے ہتھیار سے اپنے ہاتھ کاٹے جب تم نے خود کہا کہ مکّہ کا جو نوجوان بھی مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نہیں رکھیں گے اور یہ کہ وہ مدینہ کی سیاست سے خارج سمجھا جائے گا تو پھر اسی مُنہ سے تم یہ مطالبہ کس طرح کر سکتے ہو کہ یہ

مدنی سیاست سے خارج لوگ جہاں جہاں بھی ہوں انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیکر اُور ان پر اپنی سیاست قائم کر کے مکہ پہنچائیں ؟ تم نے خود یہ شرط پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے لوگوں کی رُوحوں پر اور اُن کے امورِ اُخروی پر تو بیشک حکومت کریں مگر اُن کی سیاست اور دُنیوی امور پر حاکم نہ نہیں۔ اور جب تم نے خود انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست سے نکال دیا تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیسا ؟ بہرحال یہ قریشِ مکہ کا اپنا مکر تھا جو خود اُنہی پر لوٹ کر گرا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن بہر صورت پاک تھا اور پاک رہا۔ آپؐ نے معاہدہ کے الفاظ کو بھی پُورا کیا اور ابوبصیر کو مکہ والوں کے سُپرد کرتے ہوئے مدینہ سے رُخصت کر دیا۔ اور پھر آپؐ نے معاہدہ کی روح کو بھی پورا کیا کہ جیسا کہ اِس شرط کا اصل منشاء تھا۔ آپؐ نے ابوبصیر اور اُس کے ساتھیوں کو اپنی سیاست کے دائرہ سے خارج رکھا۔ پس آپ ہر جہت سے سچے رہے اور کفارِ مکہ اپنے ہی پھیلاتے ہوئے جال کا خود شکار ہو کر رہ گئے اور بالآخر خود ذلیل ہو کر آپؐ کے پاس آئے کہ ہم اِس شرط کو معاہدہ سے خارج کرتے ہیں۔

اور یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کہہ کر کہ وَيْلُ اُمِّهٖ مُسْعِرُ حَرْبٍ لَوْ كَانَ لَهٗ اَحَدٌ (یعنی اس کی ماں کے لیے خرابی ہو یہ شخص تو جنگ کی آگ بھڑکا رہا ہے۔ کاش کوئی اسے سنبھالنے والا ہو) ابوبصیر کو اشارہ کیا تھا کہ تم الگ پارٹی بنا کر قریش سے جنگ شروع کر دو۔ کتنا ظلم اور کتنی گندی ذہنیت اور حالات پیش آمدہ سے کتنی جہالت ہے ! یہ الفاظ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور ناواجب جنگ سے آپؐ کی بیزاری کا بیّن ثبوت ہیں اور اِس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ آپؐ ابوبصیر کے اِس فعل سے برئیت اور بیزاری کا اظہار فرما رہے ہیں نہ یہ کہ اسے کوئی مخفی اشارہ دیکر جنگ پر اُبھارنا چاہتے ہیں۔

اور اگر کوئی شخص یہ خیال کرے جیسا کہ سر ولیم میور نے خیال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری الفاظ لَوْ كَانَ لَهٗ اَحَدٌ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ "اگر اُسے کوئی ساتھی مِل جاتے" اور اِس سے پتہ لگتا ہے کہ آپؐ کا یہی منشاء تھا کہ اگر ابوبصیر کو کوئی ساتھی مِل جاتے تو وہ جنگ کی آگ بھڑکا سکتا ہے اور اس طرح اِس کلام میں گویا جنگ کی انگیخت کا اشارہ پایا جاتا ہے تو اِس کا یہ جواب ہے کہ اوّل تو جو معنی ہم نے کئے ہیں وہ عربی محاورہ کے عین مطابق ہیں جس کی مثالیں حدیث میں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں اگر بالفرض دوسرے معنی جائز بھی ہوں تو پھر بھی عبارت کے سیاق وسباق کے ماتحت اس فقرہ کا مطلب اِس کے سوا کوئی اَور نہیں لیا جا سکتا کہ اگر ابوبصیر کو اُس کا کوئی ہم خیال ساتھی مِل جائے تو یہ جنگ کی آگ بھڑکا دے مگر شکر ہے کہ اُسے مدینہ میں کوئی ایسا ساتھی میسر نہیں۔ پس خواہ کوئی معنی لئے جائیں اس عبارت کا سیاق وسباق اور اس کے ابتدائی ٹکڑے اس بات کا کافی وشافی ثبوت

ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ابوبصیر کو ملامت کرنا تھا نہ کہ جنگ کے لیے اُبھارنا۔ کیا اپنے کلام کو اِس غصّہ اور ملامت کے الفاظ سے شروع کرنے والا شخص کہ "فلاں شخص کی ماں کے لیے خرابی ہو وہ تو جنگ کی آگ بھڑکانے والا ہے۔" اس کے معاً بعد اِس قسم کے الفاظ مُنہ پر لا سکتا ہے کہ "ہاں ہاں جنگ کی آگ بھڑکاؤ"؟ آخر اعتراض کرنے کے شوق میں عقل کو تو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے! پھر سب سے بڑی بات یہ دیکھنے والی ہے کہ خود ابوبصیر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ نے کیا اثر کیا اور اُس نے آپؐ کا کیا مطلب سمجھا۔ سو اس کے متعلق اِسی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ:۔

فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ عَرَفَ اَنَّهٗ سَيَرُدُّهٗ اِلَيْهِمْ[1]

یعنی "جب ابوبصیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ سُنے تو اُس نے سمجھ لیا کہ آپ بہرحال اُسے مکہ والوں کی طرف واپس لَوٹا دیں گے۔" جس پر وہ چُپکے سے بھاگ کر دوسری طرف نکل گیا۔

افسوس! صد افسوس!! کہ جس شخص کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے گئے وہ خود تو ان کا یہ مطلب سمجھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے اِس فعل کو ناپسند کیا ہے اور آپؐ بہرحال اُسے مکہ کی طرف واپس لَوٹا دیں گے مگر ہمارے تیرہ سو سال بعد آنے والے مہربان یہ کہہ رہے ہیں کہ دراصل آپؐ نے ابوبصیر کو الگ پارٹی بنا کر جنگ کرنے کی انگیخت کی تھی۔ تعصّب کا ستیاناس ہو۔ بے انصافی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔

اسلامی سیاست اسلام کے دینی نظام سے علیحدہ بھی ہو سکتی ہے

ابوبصیر والے واقعہ سے اسلامی اُصولِ سیاست کے متعلق بھی ایک اہم استدلال ہوتا ہے یعنی یہ کہ خاص حالات میں بعض علاقوں کے مسلمانوں کی سیاست اُن کے مشترکہ دینی نظام سے علیحدہ بھی ہو سکتی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو اپنے ایسے سیاسی نظام میں جو خود اُن کے اپنے اختیار میں ہو اسلامی اُصولوں کے ترک کر دینے کا اختیار ہے۔ کیونکہ بہرحال جو قوم بھی اسلام پر ایمان لاتی ہے اس کا فرض ہے کہ اپنی دینی اور دُنیوی زندگی کو اسلام کی تعلیم کے مطابق بنائے۔ پس میری مُراد یہ نہیں کہ مسلمانوں کا کوئی حصّہ اپنی سیاست میں دینی اُصولوں کو ترک کر دینے کا حق رکھتا ہے بلکہ مُراد یہ ہے کہ اگر مسلمان دو یا دو سے زیادہ علیحدہ علیحدہ ملکوں میں آباد ہوں، یا جغرافیائی لحاظ سے ایک مُلک میں رہتے ہوئے بھی اُن کی تنظیم ایک دوسرے سے جُدا گانہ ہو تو وہ ایک مشترکہ امام اور مقتدا کی دینی اور رُوحانی قیادت کے نیچے ہوتے ہوئے بھی اپنی علیحدہ علیحدہ سیاست

---

[1] بخاری کتاب الشروط

قائم کر سکتے ہیں بلکہ اگر اس صورت میں ایک پارٹی امام کی رُوحانی اقتدا کے علاوہ امام کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کی سیاست میں منسلک ہو تو پھر بھی دوسری پارٹی امام کی دینی اور رُوحانی اقتدا میں ہونے کے باوجود اپنا علیحدہ سیاسی نظام رکھ سکتی ہے گویا اس صورت میں جہاں ایک پارٹی دینی اور سیاسی ہر دو لحاظ سے امام کے ساتھ ہوگی وہاں دوسری پارٹی دینی لحاظ سے تو امام کے ساتھ ہوگی مگر سیاست میں علیحدہ نظام رکھے گی۔ یہ استدلال ابوبصیر کے واقعہ سے اس طرح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کی اس شرط کو قبول کیا کہ اگر مکہ کا کوئی مسلمان مدینہ میں آئے تو آپؐ اُسے مدینہ میں رکھ کر اپنی سیاست میں شامل نہیں کریں گے۔ بلکہ واپس لوٹا دیں گے اور پھر اس شرط کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً بھی ابوبصیر اور اس کی پارٹی کو اُن کے مسلمان ہونے کے باوجود مدینہ کی سیاست سے خارج رکھا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صلح کی اس شرط کو قبول کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ثابت کرتا ہے کہ آپؐ نے اس طریق کو جائز قرار دیا ہے کہ مختلف علاقوں کے مسلمان ایک دین پر قائم ہوتے ہوئے بلکہ ایک امام کے ماتحت ہوتے ہوئے بھی اپنی علیحدہ علیحدہ سیاست رکھ سکتے ہیں اور یہ ایک نہایت اہم استدلال ہے جو ابوبصیر کے واقعہ کے تعلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہوتا ہے اور دراصل اسی قسم کے حالات کے پیش نظر قرآن شریف کی یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ:۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ [1]

یعنی "اگر مومنوں میں سے دو پارٹیاں آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان صلح کرا دو پھر اگر صلح کے بعد اُن میں سے کوئی پارٹی دوسری کے خلاف سینہ زوری اور سرکشی سے کام لے (اور شرائط کو توڑے) تو پھر سب مل کر اُس پارٹی کے خلاف لڑائی کرو جو سرکشی سے کام لے رہی ہو یہاں تک کہ وہ سیدھی ہو کر خدا کے فیصلہ کے سامنے جُھک جائے۔ پھر اگر وہ سینہ زوری اور سرکشی سے باز آ کر جُھک جائے تو پھر ان دونوں پارٹیوں کے درمیان پورے عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور دیکھو عدل کے ترازو کو بہر حال برابر رکھو کیونکہ خدا عدل کرنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں افراد کی لڑائی یا ایک سیاسی نظام کے اندر رہنے والی پارٹیوں

---

[1] سورۃ الحجرات: ۱۰

کی باہم لڑائی مُراد نہیں ہے بلکہ ایسی پارٹیوں کی لڑائی مُراد ہے جو اسلام پر قائم ہونے اور دینی لحاظ سے متحد ہونے کے باوجود علیحدہ علیحدہ سیاسی نظام رکھتی ہیں۔ بلکہ یہ وہ زرّیں اُصول ہے جو صرف اسلامی پارٹیوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ دُنیا کی تمام قوموں اور تمام پارٹیوں پر یکساں چسپاں ہوتا ہے اور دراصل یہی وہ اُصول ہے جو برسرِپیکار قوموں کے درمیان حقیقی امن قائم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

اِسلام کی امن اور جنگ کی طاقت کا مقابلہ

صُلح حُدیبیہ اسلامی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں سے ہے جس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس نئے دَور کا آغاز غزوہ احزاب سے ہوا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَلْآنَ نَغْزُوْھُمْ وَلَا یَغْزُوْنَنَا[1] یعنی آئندہ قریش مکّہ پر ہم چڑھائی کریں گے مگر اُنہیں مدینہ کے خلاف چڑھائی کرنے کی ہمّت نہیں ہوگی"۔ اِس نئے دَور کی تکمیل صُلح حُدیبیہ سے ہوئی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ لڑائی کا سلسلہ ختم ہوگیا اور اُنیس ۱۹ سال کی طویل کشمکش کے بعد جو شروع میں جابرانہ تشدّد اور تعذیب کا رنگ رکھتی تھی اور آخر میں باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کے لیے کم از کم جہاں تک اہلِ مکّہ کا تعلّق تھا امن کا ماحول قائم ہوگیا۔ سو اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی اسلام کی اِس اُنیس ۱۹ سالہ خون آلود زندگی پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ ان اُنیس سالوں میں اسلام نے کس رنگ میں ترقی کی اور اس کے بعد امن کے دَور میں (امن سے مراد نسبتی امن ہے کیونکہ گو مکّہ کے ساتھ صلح ہوگئی تھی مگر عرب کی دوسری قومیں ابھی تک اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھیں) اسلام کی ترقی نے کیا صورت اختیار کی؟ یہ ایک نہایت لطیف مقابلہ ہوگا جس سے ہر انصاف پسند محقق اور مبصر کو اسلام کی امن اور جنگ کی طاقت کے موازنہ کا بہت اچھا معیار حاصل ہو سکے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ اسلام کی ابتدائی مردم شماری کا ریکارڈ موجود نہیں ہے اس لیے ہمیں لازماً اسلام کی ترقی کی رفتار کا اندازہ اس تعداد سے لگانا ہوگا جو ابتدائی اسلامی لڑائیوں میں شریک ہوتی رہی ہے اور نسبتی ترقی کو دیکھنے کے لیے یہ طریق کافی تسلّی بخش ہے۔ سو چھوٹے چھوٹے درمیانی واقعات کو چھوڑتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی سب سے پہلی لڑائی میں یعنی جنگِ بدر کے موقع پر جو ۲ سنہ ہجری میں ہوئی مسلمان مجاہدین کی تعداد باختلافِ روایت تین سو دس سے لیکر تین سو اُنیس تک تھی[2] اس کے بعد اُحد کی لڑائی ۳ سنہ ہجری میں ہوئی اور اس میں شریک ہونے والے مسلمانوں کی تعداد سات سَو تھی[3]۔ اُحد

---

[1] بخاری بحوالہ زرقانی [2] بخاری و زرقانی [3] ابن اسحاق بحوالہ زرقانی

کے بعد بڑی لڑائی غزوہ خندق تھی جو ۵ ہجری میں ہوئی۔ اِس لڑائی میں گو خندق وغیرہ کے کھودنے کے کام پر بچے اور بوڑھے سب مسلمان ملا کر کُل تعداد تین ہزار ہو گئی تھی[1] کیونکہ یہ لڑائی ہوئی بھی گویا مدینہ کے اندر تھی اور گھر سے باہر نکلنے کا سوال نہیں تھا مگر غالباً عملاً لڑائی کے وقت صرف ایک ہزار مسلمان شریک ہوئے تھے[1] اس کے بعد ۶ ہجری میں صُلح حدیبیہ کا غزوہ پیش آیا جس میں مسلمانوں کی تعداد چودہ سو بیان ہوئی ہے[2] یہ کُل اُنیس سال ہوئے کیونکہ تقریباً تیرہ سال مکّی زندگی والے اور قریباً چھ سال صلح حدیبیہ تک کی مدنی زندگی والے ملا کر کُل اُنیس سال بنتے ہیں۔ گویا ان اُنیس سالوں میں جو ابتداءً مکّہ کے جابرانہ تشدّد اور بعد میں باقاعدہ لڑائی کی حالت میں گذرے اسلام کُل چودہ سو مسلمان جوان پیدا کر سکا۔ اس کے بعد امن اور صُلح کا زمانہ آتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد نے جو ترقی کی اُس کا اندازہ اُس تعداد سے ہو سکتا ہے جو صلح حُدیبیہ کے دو سال بعد یعنی ۸ ہجری میں فتح مکّہ کے موقع پر شریک ہوئی۔ یہ تعداد مسلّمہ طور پر دس ہزار تھی[3] گویا جہاں جنگ کے زمانہ میں اُنیس سال کی طویل جدوجہد نے صرف چودہ سو مسلمان پیدا کئے وہاں اس کے بعد امن کے زمانہ میں دو سال کی پُرامن تبلیغ نے اس تعداد میں آٹھ ہزار چھ سو کا اضافہ کر دیا۔ یہ حیرت انگیز فرق اِس طرح پیدا ہوا کہ ایک طرف تو جنگ کے زمانہ میں کافروں اور مسلمانوں کے درمیان باہم میل ملاقات کا بہت کم موقع ملتا تھا اس لیے اسی نسبت سے کفّار کو اسلام کی دلکش تعلیم کے سُننے اور اُس سے متاثر ہونے کا موقع بھی بہت کم میسّر آتا تھا اور دوسری طرف جو لوگ جنگ کے زمانہ میں اسلام کی تعلیم سے متاثر ہوتے تھے اُن میں سے بھی اکثر اس زمانہ کی غیر معمولی تکالیف اور مشکلات کو دیکھتے ہوئے آگے آنے سے ڈرتے تھے، لیکن جب جنگ ختم ہونے سے صُلح کا ماحول قائم ہوا تو گویا وہ بھاری بند جو اسلام کے دریا کے بہاؤ کو روکے ہوئے تھا یکلخت ٹوٹ کر گر گیا اور اسلام کے حیات افزا پانیوں کو کُھلا رستہ ملنے سے اسلام نے وہ حیرت انگیز ترقی کی جو ہمارے سامنے ہے۔ کیا اس واضح نظارے کو دیکھتے ہوئے کوئی منصف مزاج انسان یہ اعتراض منہ پر لا سکتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟ دیکھو اور غور کرو کہ جب تلوار نیام سے باہر تھی تو اُنیس سال کی طویل جدوجہد نے صرف چودہ سو مسلمان پیدا کئے لیکن جب یہ تلوار نیام کے اندر آگئی تو دو سال کے قلیل عرصہ نے ساڑھے آٹھ ہزار انسانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لا ڈالا۔ یہ وہ ٹھوس اور بولتے ہوئے اعداد و شمار ہیں جن پر کسی متعصّب سے متعصّب انسان کا تعصّب بھی پردہ نہیں ڈال سکتا۔

آؤ اب ذرا ان اعداد و شمار کی مزید تفصیل میں جا کر پورا حساب نکالیں کہ اسلام کی امن کی طاقت کو اس کی جنگ کی طاقت کے مقابلہ پر کیا وزن حاصل ہے۔ موٹے طور پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنگ کے اُنیس

---

[1] ابن سعد و ابن اسحاق [2] تاریخ خمیس صفحہ ۲/۳ [3] بخاری

سالوں نے چودہ سو[۱۴۰۰] مسلمان پیدا کئے اور اس کے مقابل پر امن کے دو سالوں نے اس تعداد میں آٹھ ہزار چھ سو مسلمانوں کا اضافہ کیا۔ لیکن اگر زیادہ حسابی نظر سے دیکھا جائے تو جو زمانہ ہم نے اُنیس سال کا شمار کیا ہے وہ دراصل کسروں میں جا کر اٹھارہ اور اُنیس سال کے درمیان یعنی قریباً ساڑھے اٹھارہ سال بنتا ہے اسی طرح ہم نے صلح حُدیبیہ کے وقت جو تعداد چودہ سو شمار کی ہے اس کے متعلق صحیح روایات سے پتہ لگتا ہے کہ دراصل وہ چودہ سو اور پندرہ سو کے درمیان تھی[۱] یعنی اسے قریباً ساڑھے چودہ سو سمجھنا چاہیئے مگر ابھی اس کے علاوہ ایک اور فرق بھی ہے جو صحیح حسابی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے دُور کرنا ضروری ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ تاریخ وحدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دعویٰ نبوت کے ابتدائی تین سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل خاموشی کے ساتھ انفرادی تبلیغ میں گذارے تھے اور اسلام کی تبلیغ کو عام نہیں کیا تھا[۲] پس ان ابتدائی تین سالوں کو ساڑھے اٹھارہ سال کے عرصہ میں سے منہا کرنا ضروری ہے۔ اس طرح جنگ کے زمانہ میں اصل تبلیغی جدوجہد کا عرصہ ساڑھے پندرہ سال بنتا ہے۔ گویا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ والے ۱۵½ سال میں ساڑھے چودہ سو[۱۴۵۰] مرد مسلمان ہوئے اور اس کے مقابل پر امن وصلح والے دو[۲] سال میں اس تعداد پر آٹھ ہزار پانچ سو پچاس[۸۵۵۰] کا اضافہ ہوا۔ اس طرح اِن دونوں زمانوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ جنگ والے زمانہ کی رفتارِ ترقی ۱۴۵۰ ÷ ۱۵½ یعنی ۲۹۰۰/۳۱ فی سال بنی اور امن وصلح والے زمانہ کی رفتار ۸۵۵۰/۲ فی سال نکلی۔ اور اگلا حساب ایک بچہ بھی نکال سکتا ہے جو یہ ہے کہ اِن دونوں کی باہمی نسبت ایک کے مقابلہ پر چھیالیس[۴۶] بنتی ہے یعنی اگر جنگ کے زمانہ کی تبلیغی طاقت کا نتیجہ ایک ہو تو اس کے مقابل پر امن کے زمانہ کی تبلیغی طاقت کا نتیجہ چھیالیس[۴۶] ہوگا اور یہ بعینہٖ وہی نسبت ہے جو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عام مومن کے مقابلہ پر ایک نبی اللہ کی قرار دی ہے۔ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں:۔

اَلرُّؤْیَا الْحَسَنَۃُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّۃٍ وَّاَرْبَعِیْنَ جُزْأً مِنَ النُّبُوَّۃِ[۳]

یعنی ”ایک مومن کی سچی رویا ایک نبی کی نبوت کا چھیالیسواں[۴۶] حصہ ہوتی ہے۔“

اب غور کرو کہ یہ کیسی عجیب وغریب اور کیسی لطیف مطابقت ہے کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اُس کے جنگ کے زمانہ کی طاقت اس کے امن کے زمانہ کی طاقت کے مقابلہ پر بعینہٖ وہی حیثیت رکھنے والی ثابت ہوئی ہے جو ایک نبی اللہ کے مقابلہ میں عام مومن کی ہوا کرتی ہے اور یہ ایک باریک رُوحانی نکتہ ہے جس سے کئی اہم مسائل پر اصولی روشنی پڑتی ہے مثلاً:۔

۱۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی اصل روحانی طاقت امن کے زمانہ کی تبلیغ میں ہے

---

[۱] زرقانی بحوالہ بخاری۔ [۲] تاریخ خمیس [۳] بخاری کتاب التعبیر

نہ کہ جنگ کی معرکہ آرائی میں۔ اور عقلاً بھی یہی ہونا چاہیئے کیونکہ وہ پُرامن تبلیغ جس میں دلائل و براہین اور آیاتِ بیّنات کے ذریعہ اسلام کی خوبی اور برتری ثابت کی جاتے یقیناً وہی اسلام کی اندرونی قوت کی علمبردار ہے اور اس کے مقابل پر جنگ کا ماحول ایک محض خارجی چیز ہے جو صرف منکرین کی عداوت کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اصل اندرونی طاقت جو گویا اسلام کے ذاتی اور مستقل جوہر کا رنگ رکھتی ہے خارجی عنصر کے نتائج پر بہرحال غالب ہونی چاہیئے۔

۲۔ پھر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام "تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ خود اپنی رُوحانی طاقت اور اندرونی جاذبیت اور دلائل کے غلبہ سے پھیلا ہے۔

۳۔ اور پھر اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل ذاتی میلان امن و صلح کی طرف تھا نہ کہ جنگ کی طرف۔ اور جنگ کی حالت صرف منکرین کی پیدا کی ہوئی چیز تھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبوراً داخل ہونا پڑا۔

یہ وہ تین زبردست نتائج ہیں جنہیں قبول کرنے کے لیے ہر عقل مند اور منصف مزاج انسان مجبور ہے اور ان کے ذریعہ اسلام کی ابتدائی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ و سوانح پر ایک ایسی اُصولی روشنی پڑتی ہے کہ اس سے یہ سارا میدان ایک خاص قسم کے نُور سے جگمگا اُٹھتا ہے۔ بیشک جہاد بالسّیف بھی اسلامی تعلیم کا ایک ضروری حصّہ ہے کیونکہ جو قوم یا حکومت اسلام کو بزور مٹانے کے لئے "تلوار اٹھاتی ہے یا اسلام کی اشاعت کو تلوار کے زور سے روکنا چاہتی ہے اُس کے مقابلہ کے لیے اسلام بھی تلوار ہی اُٹھانے کا حکم دیتا ہے[1] اور نہ صرف تلوار اُٹھانے کا حکم دیتا ہے بلکہ ہدایت فرماتا ہے کہ ایسے ظالم دشمن کے خلاف اِس طرح ڈٹ کر لڑو کہ گویا تم ایک سیسہ پلائی ہوئی آہنی دیوار ہو[2]۔ اور اُسے ایسی مار مارو کہ صرف وہی نہیں بلکہ اُس کے پیچھے آنے والے دوسرے دشمن بھی لرزہ براندام ہو کر منتشر ہو جائیں[3] مگر ان ظالم دشمنوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے خلاف تلوار اُٹھانے میں پہل کرتے اور اسلام کو جبر و طاقت کے زور سے مٹانے کے درپے رہتے ہیں اسلام ساری قوموں کے لیے پُرامن تبلیغ کا پیغام لیکر آیا ہے اور اس کے اِس پیغام میں اس کی رُوحانی طاقت کی شان اور اس کے خداداد براہین کا غلبہ مخفی ہے۔ اور یہی وہ جہاد ہے جسے اسلام میں تلوار کے جہاد کے مقابل پر جہادِ کبیر (یعنی بڑا جہاد) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے[4]۔ اِسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ جب ایک دفعہ صحابہ کی ایک پارٹی ایک غزوہ سے واپس لوٹی تو آنحضرت ﷺ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ اب تم جہادِ اصغر سے لَوٹ کر جہادِ اکبر کی طرف آرہے ہو اور جب صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہادِ اکبر سے کیا مُراد ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا "انسان کا اپنے نفس کیساتھ جہاد کرنا"[5]

---

[1] سورۃ الحج: ۴۰ و ۴۱ ؛ [2] سورۃ الصّف: ۵ ؛ [3] سورۃ الانفال: ۵۸ ؛ [4] سورۃ الفرقان: ۵۳ ؛ [5] بیہقی

اَسود و احمر کے نام اِسلام کا پیغام

قیصر و کسریٰ کو دعوتِ حق

ہم بتا چکے ہیں کہ صُلح حُدیبیہ کے ساتھ اسلام کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نیا دَور کامل امن کا دَور تو ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ ابھی تک عرب کے بہت سے قبیلے اسلام کے خلاف برسرِپیکار تھے، لیکن ہاں چونکہ عربوں میں قریش کا قبیلہ خانہ کعبہ کا متولّی ہونے کی وجہ سے عموماً سارے قبیلوں میں زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا اور اسلام کے خلاف جنگ کی ابتدا بھی اسی قبیلہ کی طرف سے ہوئی تھی اس لیے قریش کے ساتھ صُلح کا معاہدہ ہو جانے کے نتیجہ میں ملک کے ایک حصّہ میں عارضی امن کی صورت ضرور پیدا ہوگئی تھی اور اس جزوی امن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پہلا قدم اُٹھایا وہ آپؐ کے خدا داد منصبِ نبوّت کے تبلیغی پہلو کا ایک نہایت شاندار کارنامہ تھا۔ ہماری مُراد اُن تبلیغی مُراسلات سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صُلح حُدیبیہ کے معاً بعد مختلف ملکوں کے بادشاہوں اور رئیسوں کے نام ارسال فرمائے اور اس بات کا عملی ثبوت پیش کیا کہ آپؐ کی توجہ کا مرکزی نقطہ تبلیغ اسلام ہے یعنی اس ابدی اور آخری صداقت کا اقوامِ عالم تک پہنچانا جو خداوند عالم نے آپؐ کے ذریعہ دُنیا میں نازل فرمائی۔ مگر ان عالمگیر تبلیغی خطوط کے ذکر سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے تبلیغی مذہب ہونے کے متعلق ایک اُصولی نوٹ درج کر کے ناظرین کو بتایا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی نظریہ کیا تھا اور آپؐ کی بعثت کی غرض کتنے وسیع میدان پر پھیلی ہوئی تھی۔

اسلام کا تبلیغی نظریہ

سو سب سے پہلے جاننا چاہیئے کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اور اس کے مقدس بانیؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ جو صداقت بھی اسلام کے ذریعہ آسمان سے نازل ہوئی ہے اُسے اپنے آپ تک چُھپا کر نہ رکھے بلکہ لوگوں تک پہنچائے۔ اور اس کے سارے پہلوؤں کو کھول کھول کر بیان کر دے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:۔

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ [1]

---

[1] المائدہ: ۶۸

یعنی "اے خدا کے رسول جو کچھ بھی تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اُتارا گیا ہے وہ لوگوں تک کھول کھول کر پہنچا دے اور اگر تُو نے ایسا نہ کیا (اور کسی حصّہ کو چھپا کر رکھا اور کسی کو بیان کر دیا) تو جان لے کہ اس صورت میں تُو خدا کی رسالت کو پہنچانے والا نہیں سمجھا جائے گا۔"

اور یہ فریضۂ تبلیغ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ آپؐ پر ایمان لانے والوں کا بھی یہی فرض مقرر کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کی صداقتوں کو دوسروں تک پہنچائیں چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[1]

یعنی "اے مسلمانو! تم دُنیا کی بہترین اُمّت بنا کر اقوامِ عالم کے فائدہ کیلئے قائم کئے گئے ہو۔ تمہارا یہ کام ہے کہ لوگوں کو اسلام کی نیکی کی طرف بلاؤ اور خلافِ اسلام بدی سے روکو۔"

پھر اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر حکم دیتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک حصّہ ہمیشہ تبلیغ اسلام کی خدمت کے لیے وقف رہنا چاہیئے جو گویا اپنے آپ کو کُلیتہً خدمتِ دین کے لیے وقف کر دے چنانچہ فرماتا ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[2]

یعنی "چاہیئے کہ تم میں سے مِلّت کا ایک حصّہ تبلیغ حق کے لیے وقف رہے اس کا کام لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا اور بھلائی کی تلقین کرنا اور بدی سے روکنا ہو۔ اور بات یہ ہے کہ یہی لوگ حقیقتہً بامُراد ہیں۔"

دین کے معاملہ میں جبر جائز نہیں

فریضۂ تبلیغ کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ہی قرآن شریف یہ اُصول سکھاتا ہے کہ تبلیغ ہمیشہ نہایت احسن طریق پر حکمت و دانائی کے رنگ میں ہونی چاہیئے تاکہ صداقت پسند مخاطب کے دل میں ضد اور دُوری پیدا ہونے کی بجائے اس کے دل کی کھڑکیاں سچائی کے قبول کرنے کے لیے خود بخود کھلتی چلی جائیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

---

[1] سورۃ آل عمران: ۱۱۱ ؛ [2] سورۃ آل عمران: ۱۰۵

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ[1]

یعنی "اے خدا کے رسول اپنے رب کے رستہ کی طرف حکمت اور عمدہ طریق نصیحت کے رنگ میں لوگوں کو دعوت دو۔ اور اگر کبھی بحث و مجادلہ کی صورت پیدا ہو جائے تو بحث بھی دلکش اور بہترین انداز میں کرو۔"

پھر اسی اصول کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ کا طریق کسی طرح جائز نہیں اور نہ جبر و تشدد کے نتیجہ میں سچا ایمان پیدا ہو سکتا ہے پس دلائل و براہین کیساتھ سمجھا دینے کے بعد مخاطب کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ اگر وہ چاہے تو قبول کرے اور چاہے تو انکار کر دے کیونکہ آزادانہ اقرار یا انکار کے بغیر کوئی شخص انعام یا سزا کا مستحق نہیں سمجھا جا سکتا چنانچہ فرماتا ہے۔

۱۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قف قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ[2]

یعنی "دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہو سکتا۔ ہدایت اور گمراہی کھلی کھلی چیزیں ہیں اور ہر شخص خود فیصلہ کا حق رکھتا ہے۔"

اور دوسری جگہ فرماتا ہے:۔

۲۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ قف وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا[3]

"پس جو شخص چاہے ایمان لے آئے اور جو شخص چاہے انکار کر دے۔ ہاں جو لوگ انکار کر کے ظالم بنیں گے اُن کے لیے آخرت میں ضرور آگ کا عذاب مقدر ہے۔"

پھر اسی لطیف مضمون کے دوسرے پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جبر کے نتیجہ میں پیدا شدہ ایمان قطعاً کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ وہ ایمان کہلانے کا حقدار ہی نہیں کیونکہ اس صورت میں انسان کی زبان پر کچھ اور ہوتا ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ اور انعام کا مستحق ہونا تو درکنار ایسے دو رُخے منافق دوہرے عذاب کے سزاوار ٹھہرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے کفر کے جرم کے ساتھ جھوٹ اور دھوکے بازی کے جرم کا بھی اضافہ کر لیتے ہیں۔ وہ کافر ہیں کیونکہ اُن کے دل میں کفر ہوتا ہے اور وہ جھوٹے اور دھوکے باز ہیں کیونکہ وہ اپنے دل کے یقین کے خلاف مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے زبان سے جھوٹے طور پر اسلام کا اقرار کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ[4]

---

[1] النحل: ۱۲۶۔ [2] البقرۃ: ۲۵۷۔ [3] الکھف: ۳۰۔ [4] النسآء: ۱۴۶

یعنی "منافق لوگ جو زبان سے تو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اُن کے دل میں کفر بھرا ہوتا ہے وہ آخرت میں دوزخ کی آگ کی سب سے سخت اور سب سے نیچے کی تہہ میں رکھے جائینگے۔"

اِسلام کا عالمگیر مشن

بالآخر اسلام اِس سوال کو لیتا ہے کہ گذشتہ نبیوں (یعنی حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور کرشن علیہم السلام وغیرہ) کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن صرف اپنی قوم یعنی عربوں تک ہی محدود نہیں ہے اور نہ صرف کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ دُنیا کی ساری قوموں کے لیے ہے اور سارے زمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو ساری قوموں کی طرف یکساں توجہ دینی چاہیئے۔ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ِۨ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ[1]

یعنی "اے نبی تُو لوگوں سے کہہ دے کہ خدا نے مجھے تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ہاں وہی خدا جو اس کُل کائنات یعنی آسمانوں اور زمین کا مالک و آقا ہے۔"

اور اِس ہدایت کی تشریح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عالمگیر مشن کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي. نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً۔[2] وَفِي رِوَايَةٍ بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ[3]

یعنی مجھے پانچ ایسی باتیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی اَور نبی کو نہیں دی گئیں۔ (۱) مجھے ایک ماہ کی مسافت تک خدا داد رُعب عطا کیا گیا ہے (۲) میرے لیے تمام زمین مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔ (۳) میرے لیے جنگوں میں حاصل شدہ مالِ غنیمت جائز قرار دیا گیا ہے (۴) مجھے شفاعت کا مقام عطا کیا گیا ہے اور (۵) مجھ سے پہلے ہر نبی اپنی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا مگر مجھے سب بنی نوعِ آدم کے لیے مبعوث کیا گیا ہے اور (ایک روایت میں یہ ہے کہ) میں اَسود و اَحمر کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پانچوں خصوصیات اپنے اندر نہایت شاندار پہلو رکھتی ہیں مگر اس جگہ ہمارا تعلق صرف پانچویں خصوصیت کے ساتھ ہے جس میں نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ

---

[1] الاعراف: ۱۵۹ ؛ [2] بخاری کتاب التیمم ؛ [3] مسند احمد جلد ۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کا پیغام دُنیا کی ساری قوموں کے واسطے ہے نہ کہ صرف کسی ایک قوم کے واسطے ۔

اسلام کی دائمی شریعت

پھر قرآنی شریعت کے دائمی اور ناقابلِ تنسیخ ہونے کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے :۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا [1]

یعنی " اے لوگو مَیں نے آج تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی تمام نعمتوں کے دروازے کھول دیئے اور مَیں نے تمہارے واسطے اسلام کا دین پسند کیا ہے ۔"

روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ بعض یہودیوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ لوگوں پر ایک ایسی آیت (یعنی یہی الیوم اکملت لکم دینکم ..... والی آیت) اُتری ہے کہ اگر وہ ہم پر اُترتی تو ہم اُس دن کو اپنے واسطے عید بنا لیتے ۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ہمارے لیے تو خود خدا نے اسے عید بنا رکھا ہے کیونکہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حج کے مقدس موقع پر اور عرفہ کے متبرک مقام میں نازل ہوئی تھی جبکہ اس کے بعد کا دن عید الاضحیہ کا دن تھا اور مجھے یہ ساری تفصیل یاد ہے ۔[2]

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود حدیث میں فرماتے ہیں کہ :۔

اِنِّیْ آخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَ مَسْجِدِیْ هٰذَا آخِرُ الْمَسَاجِدِ [3]

یعنی " مَیں آخری نبی ہوں (میرے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آ سکتا جو میرے دَورِ نبوّت کو منسوخ کر دے) اور میری یہ مسجد آخری مسجد ہے (جس کے بعد کوئی ایسی عبادت گاہ نہیں ہو سکتی جو میری مسجد کو منسوخ کر کے نیا طریق عبادت جاری کر دے)" ۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ الفاظ " میری یہ مسجد آخری مسجد ہے " کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میری اس مسجد کے بعد کوئی مسجد نہیں بنے گی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفاء نے بہت سی مسجدیں بنائیں اور آج تک اسلامی ممالک میں لاکھوں کروڑوں مسجدیں بنتی چلی آئی ہیں ۔ پس مُراد یہ ہے کہ آئندہ میری مسجد کے مقابل پر کوئی مسجد نہیں بنے گی بلکہ جو سچی مسجد بھی ہو گی وہ لازماً میری مسجد کی نقل اور ظلّ ہو گی ۔

اور اسی حقیقت کو ایک اَور لطیف رنگ میں یُوں بیان فرماتے ہیں کہ :۔

اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ [4]

---

[1] المائدہ : ۴ ۔ [2] بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر سورۃ مائدہ ۔ [3] صحیح مسلم ۔ [4] بخاری و مسلم

یعنی" میں اور قیامت اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں کہ جس طرح میری یہ دو انگلیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں (اور یہ الفاظ فرماتے ہوتے آپؐ نے اپنی دو انگلیاں کھڑی کرکے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر دیں)"۔

اِس لطیف حدیث کا بھی یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میری وفات کے معاً بعد قیامت آجائے گی۔ کیونکہ یہ بات نہ صرف واقعات بلکہ آپؐ کی بعثت کی غرض و غایت کے بھی خلاف ہے کہ آپؐ کے معاً بعد قیامت آجاوے۔ پس اس حدیث میں بھی یقیناً یہی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ میرا دَور شریعت قیامت تک چلے گا اور میرے بعد کوئی اَور شریعت نہیں آئیگی جو میری شریعت کو منسوخ کرکے ایک نیا دَور شروع کر دے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا داد مشن مکانی لحاظ سے وسیع اور غیر محدود ہے اور دُنیا کی کوئی قوم آپؐ کی دعوت سے باہر نہیں اسی طرح زمانی لحاظ سے بھی آپ کا مشن کسی ایک زمانہ تک محدود نہیں بلکہ قیامت تک وسیع اور غیر محدود ہے۔ اِس تمہیدی نوٹ کے بعد جو اسلام کے تبلیغی نظریہ کی وضاحت کے لیے ضروری تھا ہم اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

تبلیغی خطوط کیلئے انگوٹھی کی تیاری

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے صلح حُدیبیہ کے بعد جب کہ مکّہ والوں کے ساتھ صلح ہوجانے کے نتیجہ میں تلوار کے جہاد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قدر فرصت حاصل ہوئی تو آپؐ نے اس فرصت سے فائدہ اُٹھاتے ہوتے پہلا کام یہ کیا کہ اسلام کے عالمگیر مشن کے پیشِ نظر مختلف حکومتوں کے فرمانرواؤں کی طرف تبلیغی خطوط بھجوانے کی تجویز کی تاکہ ان فرمانرواؤں اور اُن کے ذریعہ اُن کی رعایا کو اسلام کا پیغام پہنچایا جاتے کہ یہی آپؐ کی بعثت کی اصل غرض و غایت تھی۔ چنانچہ آپؐ نے حُدیبیہ سے واپس آتے ہی اِس بارہ میں اپنے صحابہ سے مشورہ کیا اور جب اس مشورہ میں آپؐ سے یہ عرض کیا گیا کہ دُنیوی حکمرانوں کا یہ عام دستور ہے کہ وہ مُہر شدہ خط کے بغیر کسی اَور خط کی طرف توجہ نہیں دیتے تو آپؐ نے ایک چاندی کی انگوٹھی تیار کروائی جس میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے الفاظ کندہ کرواتے گئے[1] اور خدا تعالیٰ کے نام کو مقدم اور بالا رکھنے کے خیال سے آپؐ نے اِن الفاظ کی ترتیب یہ مقرر فرمائی کہ سب سے اوپر اللہ کا لفظ لکھا گیا اور درمیان میں رسول کا لفظ کندہ کیا گیا اور سب سے نیچے کی سطر میں محمّد کا لفظ رکھا گیا[2]

---

[1] بخاری جلد ا کتاب العلم صفحہ ۱۵ نیز بخاری جلد ۲ کتاب الجہاد صفحہ ۱۰ ؛ [2] فتح الباری بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۳۴ بروایت اسنوی جس کی تصدیق آنحضرت صلعم کے خط بنام مقوقس مصر سے بھی ہوتی ہے جو اصلی صورت میں دریافت ہوگیا ہے اور ہم آگے چل کر اسی کتاب میں اُس کا فوٹو درج کر رہے ہیں۔

نیز چونکہ ان تبلیغی خطوط میں اس انگوٹھی کا نقش لینا مدِنظر تھا، اس لیے یہ تدبیر بھی اختیار کی گئی کہ ان الفاظ کو سیدھے رُخ پر لکھنے کی بجائے اُلٹا لکھا گیا تاکہ جب اُس کا نقش لیا جائے تو یہ نقش پریس کی چھپائی کی طرح سیدھی صورت میں ظاہر ہو[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ انگوٹھی اس کے بعد ہمیشہ آپؐ کے ہاتھ میں رہی اور آپؐ کی وفات کے بعد اسے حضرت ابوبکر خلیفہ اولؓ نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور حضرت ابوبکرؓ کے بعد وہ حضرت عمر خلیفہ ثانیؓ کے ہاتھ میں رہی اور ان کے بعد حضرت عثمان خلیفہ ثالثؓ نے اسے پہنا حتّٰی کہ ایک دن وہ اُن کے ہاتھ سے اریس نامی کنوئیں میں گر کر کھوئی گئی[2] حضرت عثمانؓ اور اُن کے ساتھیوں نے تین دن تک اس انگوٹھی کی تلاش جاری رکھی اور کنوئیں کا سارا پانی نکال کر چھان مارا مگر وہ نہ ملی[3]

فریضۂ تبلیغ میں حُسنِ تدبیر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس تدبیر سے جو آپؐ نے صحابہ کے مشورہ سے انگوٹھی تیار کرانے میں اختیار کی اس بات پر اصولی روشنی پڑتی ہے کہ آپؐ کس طرح تبلیغ کے کام میں اُن تمام رستوں کو اختیار فرماتے تھے جو مخاطب کو اپنی طرف مائل کرنے اور اس کے دل پر اچھا اثر پیدا کرنے کے لیے ضروری تھے۔ ظاہر ہے کہ جہاں تک خالص تبلیغ کا تعلق ہے کسی مُہر کا ہونا یا نہ ہونا ایک بالکل زائد چیز ہے اور کلمۂ حق مُہر کے بغیر بھی اتنا ہی وزن رکھتا ہے جتنا کہ مُہر کے ساتھ، لیکن چونکہ آپؐ کو بتایا گیا تھا کہ اس زمانہ کے بادشاہ مُہر کے بغیر کسی خط کی طرف توجہ نہیں دیتے اور آپؐ کسی ایسے پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے جس کی وجہ سے مخاطب کے دل میں کسی جہت سے بے توجہگی کی صورت پیدا ہو اس لیے آپؐ نے اِس معمولی سی زائد تجویز کو بھی بڑے اہتمام کے ساتھ اختیار کیا تاکہ آپؐ کی تبلیغ میں کوئی ایسا رخنہ نہ رہ جائے جو تبلیغ کے اثر کو کسی جہت سے کمزور کرنے والا ہو۔ اور یہی اِس قرآنی آیت کی عملی تفسیر ہے کہ:

جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ[4]

یعنی "اے رسول دینِ حق کی تبلیغ کے معاملہ میں ہمیشہ اُس رستہ کو اختیار کرو جو مخاطب کے دل و دماغ پر اثر پیدا کرنے کے لحاظ سے بہترین ہو"

عرب کے چاروں اطراف میں تبلیغی مُہم

جو تبلیغی خطوط اس موقع پر روانہ کئے گئے وہ عرب کے چاروں اطراف کے حکمرانوں کے

---

[1] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۳۴۔ نیز ملاحظہ ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط بنام مقوقس مصر کا عکس جو اسی کتاب میں دوسری جگہ درج کیا گیا ہے جس میں محمد رسول اللّٰہ کے الفاظ کی تحریر سیدھی نظر آتی ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اصل انگوٹھی میں اُلٹی تحریر تھی۔

[2] بخاری کتاب اللباس روایت ابن عمرؓ۔ [3] مسند احمد بن حنبل۔ [4] سورۃ النحل: ۱۲۶

نام تھے۔ یعنی شمال میں روما کی مشہور سلطنت کے شہنشاہ قیصر کے نام اور شمال مشرق میں فارس کی مشہور سلطنت کے شہنشاہ کسریٰ کے نام اور عرب کے شمال مغرب میں مصر کے بادشاہ مقوقس کے نام[1]۔ اور مشرق میں یمامہ کے رئیس ہوذہ بن علی کے نام۔ اور مغرب میں حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام جو عرب کے مقابل پر براعظم افریقہ میں ایک عیسائی حکومت تھی۔ اور شمال میں عرب کی حدود کے ساتھ متصل ریاست غسّان کے حاکم کے نام جو قیصر کے ماتحت تھا۔ اسی طرح آپؐ نے ایک خط عرب کے جنوب میں یمن کے رئیس کی طرف بھجوایا تھا اور ایک خط عرب کے مشرق میں بحرین کے والی کی طرف بھی لکھا تھا وغیرہ وغیرہ[2]۔ اس طرح گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عرب کے چاروں اطراف میں اسلام کا پیغام پہنچا کر فریضۂ تبلیغ ادا کیا، لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ سارے خطوط صلح حدیبیہ کے معاً بعد ایک ہی وقت میں روانہ کئے گئے تھے کیونکہ ممکن ہے کہ بعض تو ایک ہی وقت میں روانہ کئے گئے ہوں اور بعض ایک دوسرے سے کچھ وقفہ پر بھجوائے گئے ہوں مگر بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ ان کا سلسلہ صلح حدیبیہ کے بعد شروع ہوا۔ اور غالباً سب سے پہلا خط قیصر روما یعنی ہرقل کے نام لکھا گیا تھا اور اسی سے ہم اپنے اِس نوٹ کی ابتدا کرتے ہیں۔

قیصر و کسریٰ کی باہم کشمکش اور آنحضرت ﷺ کی عظیم الشان پیشگوئی

مگر اس خط کا ذکر کرنے سے قبل قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے متعلق ایک ضمنی نوٹ درج کرنا ضروری ہے جیسا کہ سیرۃ خاتم النبیینؐ حصہ اول[3] و حصہ دوم[4] میں بتایا جاچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو عظیم الشان سلطنتیں پائی جاتی تھیں۔ یعنی ایک روما کی سلطنت تھی جس کا بادشاہ قیصر کہلاتا تھا اور دوسرے فارس یعنی ایران کی ساسانی سلطنت تھی جس کا بادشاہ کسریٰ کہلاتا تھا۔ یہ روما کی سلطنت وہی ہے جو تاریخ میں مشرقی روما کی سلطنت یا دوسرے الفاظ میں بازنطینی حکومت کہلاتی ہے[5] جسے انگریزی میں ایسٹرن رومن ایمپائر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ روما کی مغربی سلطنت کے تنزّل کے بعد روما کی مشرقی سلطنت نے جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ تھا عروج پکڑا اور جس زمانہ کا ہم ذکر

---

[1] مقوقس دراصل مصر کے گورنر کے سرکاری عہدہ کا نام تھا اور ہر گورنر مقوقس کہلاتا تھا۔ مصر کے یہ گورنر اس زمانہ میں قیصرِ روما کے ماتحت ہوا کرتے تھے مگر غالباً یہ ایک موروثی عہدہ تھا جو سوائے خاص حالات کے ایک ہی مخصوص خاندان میں ورثہ کے طور پر قائم چلا جاتا تھا۔ عرب لوگ ایسے فرمانرواؤں کو بھی مَلِک یعنی بادشاہ کہہ کر پکارتے تھے۔

[2] ابن ہشام و طبری۔ نیز زرقانی جلد ۳ و تاریخ خمیس جلد ۲ نیز لائف آف محمدؐ مصنفہ میور

[3] میور صفحات ۲۸۴، ۲۸۵ - [4] میور صفحات ۱۴۲، ۱۴۷ - [5] BYZANTINE

کررہے ہیں۔اس زمانہ میں روما کی مشرقی سلطنت اور کسریٰ کی ایرانی سلطنت دُنیا بھر میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور سلطنتیں تھیں۔ اِن دونوں سلطنتوں کی آپس میں بھاری رقابت رہتی تھی کیونکہ سیاسی حسد کے علاوہ دونوں کا مذہب اور تمدن بھی جُدا جُدا تھا۔یعنی جہاں روما کی سلطنت عیسائی مذہب کی پیرو تھی وہاں فارس کی ساسانی سلطنت آتش پرست اور مُشرک تھی۔اور جیسا کہ کتاب ہذا کے حصّہ اوّل و دوم میں بیان کیا جا چکا ہے[۱] اس زمانہ میں ان دونوں حکومتوں کے درمیان جنگ شروع تھی اور فارس کے کسریٰ نے روما کے قیصر کو اُوپر تلے شکستیں دیکر اُس کا بہت سا علاقہ چھین لیا ہوا تھا۔چونکہ مکّہ والے بھی مُشرک اور بُت پرست تھے اس لیے اُنہیں طبعًا اِس جنگ میں ایرانیوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی تھی لیکن مسلمان حضرت عیسٰیؑ پر ایمان لانے کی وجہ سے عیسائیوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی رکھتے تھے۔یہ وہ وقت تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالےٰ سے الہام پا کر وہ پیشگوئی فرمائی جو قرآن شریف کی سورۃ روم کے شروع میں بیان ہوئی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ ھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۝ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ یَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰہِ ؕ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ ھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ وَعْدَ اللّٰہِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝[۲]

یعنی "رومی لوگ قریب ترین زمین میں مغلوب کئے گئے لیکن وہ اپنی مغلوبی کے بعد عنقریب غالب آئیں گے۔یہ تغیر نو سالوں کے اندر اندر ہوگا[۳] اور اس سے پہلے اور اس کے بعد اصل حکومت تو صرف خدا ہی کی ہے۔(یعنی اس سے پہلے رُوحانی حکومت خدا کی ہے اور اس کے بعد ظاہری حکومت بھی اسلام کے غلبہ کے ذریعہ خدا ہی کی ہونے والی ہے) اور اُس دن مومن خوش ہوں گے۔اللہ کی مدد کی وجہ سے۔وہ مدد دیتا ہے جسے چاہتا ہے کیونکہ وہ طاقتور اور رحیم خُدا ہے۔یہ خدا کا پختہ وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔"

یہ قرآنی آیات اُس وقت نازل ہوئیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکّہ میں تشریف رکھتے تھے

---

[۱] نیز دیکھئے لائف آف محمد مصنفہ سر ولیم میور ایڈیشن ۱۹۲۳ء صفحات ۱۲۲،۱۲۳ و صفحات ۳۶۸،۳۶۹

[۲] سورۃ الروم:۳تا۷ [۳] بضع کا لفظ عربی زبان میں تین سے لیکر نو سال تک کے عرصہ کیلئے آتا ہے (اقرب الموارد)

اور کسریٰ کی فتوحات کا سیلاب پورے زور میں تھا حتیٰ کہ وہ قیصر کا بہت سا علاقہ چھین کر اور شام اور مصر اور ایشیائے کوچک کو تاراج کر کے قیصر کے دارالسلطنت قسطنطنیہ کے دروازے کھٹکھٹا رہا تھا مگر اس قرآنی پیشگوئی کے مطابق جنگ نے اچانک پلٹا کھایا اور چند سال کی جدوجہد کے بعد قیصر کی فوجوں نے نہ صرف اپنا سارا علاقہ واپس چھین لیا بلکہ کسریٰ کے علاقہ میں بھی یلغار کرتی ہوئی گھس گئیں۔ یہ وہ عظیم الشان پیشگوئی تھی جس کی صداقت کو غیر مسلم مؤرخین بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں چنانچہ ان واقعات کے متعلق سر ولیم میور لکھتا ہے:۔

"قریباً قریباً اس زمانہ سے لیکر جب کہ محمد (ﷺ) نے نبوت کا دعویٰ کیا روما اور فارس کی حکومتیں ایک دوسرے کے خلاف ایک خونی جنگ لڑ رہی تھیں۔ ۶۲۱ء عیسوی تک اس جنگ میں کسریٰ کی فوجوں کو مسلسل فتح حاصل ہوتی گئی۔ شام، مصر اور ایشیائے کوچک یکے بعد دیگرے تاراج کئے گئے اور خود قسطنطنیہ کا شہر بھی خطرہ میں پڑ گیا۔ بالآخر ہرقل (شہنشاہِ روم) اپنی غفلت سے بیدار ہوا اور محمد (ﷺ) کی ہجرت از مکہ کے زمانہ میں وہ دشمن کی فوجوں کو ایشیائے کوچک کی قلعہ بندیوں سے پسپا کر رہا تھا۔ اس جنگ کی دوسری مہم میں قیصر اپنی فاتح افواج کے ساتھ یلغار کرتا ہوا کسریٰ کے علاقہ کے اندر گھس گیا۔"[1]

"اس جنگ میں محمد (ﷺ) کی ہمدردی اور دُعا قیصر کے حق میں تھی۔ مسیحیت ایک الہامی مذہب تھا جس کی اسلام کے ساتھ صُلح ممکن تھی مگر ایران کے آتش پرست مشرک محمد (ﷺ) کے خیالات سے کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے۔ بہر حال ابھی کسریٰ کی فاتح فوجیں قیصر کے خلاف بہم غلبہ پاتی جا رہی تھیں کہ محمد (ﷺ) نے قرآن کی تیسویں سورت (سورۃ روم) میں یہ حکیمانہ پیشگوئی بیان کی کہ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ۔ الآیۃ (یعنی عنقریب روما کو غلبہ حاصل ہوگا) اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ پیشگوئی بعد کے واقعات کے مطابق ٹھیک نکلی۔"[2]

قیصر کی اِن غیر معمولی فتوحات کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے واقعہ کیساتھ شروع ہوا اور مسلمانوں کو قیصر کی پہلی فتح کی اطلاع اُس وقت ملی جب وہ قریش مکہ کے خلاف بدر کے میدان میں نمایاں فتح حاصل کر کے مدینہ کو واپس لوٹے تھے[3] اور کسریٰ کے خلاف قیصر کو آخری اور فیصلہ کن فتح

---

[1] لائف آف محمدؐ مصنفہ میور صفحہ ۳۶۸ ؛ [2] ایضاً صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳ ؛ [3] ترمذی جلد ۲ تفسیر سورۃ روم

صُلح حُدیبیہ کے زمانہ کے قریب حاصل ہوئی[1]

اپنی اِس غیر معمولی فتح کی خوشی اور شکرانہ میں قیصر نے حمص[2] سے لیکر ایلیا (یعنی یروشلم یا بیت المقدس) تک کا پیدل سفر کیا[3] دراصل ہرقل کا یہ سفر ایک نذر کی ایفا میں تھا جو اُس نے فتح حاصل ہونے کی صورت میں مانی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ ایڈیسیا[4] سے لیکر یروشلم تک پیدل گیا جہاں حضرت مسیح ناصریؑ کی اصلی صلیب جو اہلِ فارس سے واپس چھینی گئی تھی اپنی جگہ پر دوبارہ رکھی جانے والی تھی[5] اور یہ سفر اس شان سے کیا گیا کہ رستہ میں ہرقل جہاں جہاں سے گذرتا تھا زمین پر فرش اور فرش کے اُوپر پھولوں کی سیج بچھائی جاتی تھی[6]

ہرقل کے نام آنحضرت ﷺ کا تبلیغی خط

صُلح حُدیبیہ کے بعد غالباً سب سے پہلا تبلیغی خط ہرقل[7] قیصر روما کے نام بھجوایا گیا۔ یہ خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صُلح حُدیبیہ کے معاً بعد ماہ ذوالحجہ ۶ھ میں روانہ کیا[8] اور اس خدمت کے لیے آپؐ نے اپنے ایک ہوشیار اور مخلص صحابی دِحیہ بن خلیفۃ الکلبی کو منتخب فرمایا جو اس سے پہلے بھی شام کی طرف سفر کر چکے تھے اور اس علاقہ کے واقف تھے۔ دِحیہ ایک خوشرو نوجوان تھے جن کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ کشفی طور پر حضرت جبرائیل کو بھی دیکھا تھا[9] اور آپؐ نے اِس خط کے بھجواتے ہوتے یہ اُمید ظاہر فرمائی تھی کہ دِحیہ یا جو شخص بھی یہ خدمت بجا لائیگا خواہ وہ بظاہر اس مہم میں کامیاب ہو یا نہ ہو وہ انشاء اللہ ضرور جنت میں جائے گا[10] اِس تبلیغی خط کی تیاری اور مُہر وغیرہ لگانے کے بعد آپؐ نے دِحیہ کو ہدایت فرمائی کہ میرا یہ خط پہلے بُصریٰ[11] کے رئیس کے پاس لے جاؤ (جو عرب کے شمال میں قیصر کی طرف سے گویا موروثی گورنر یا حاکم تھا) اور پھر اُس کے توسط سے قیصر کے پاس پہنچو[12] اس وقت بُصریٰ کا گورنر حارث بن ابی شمر تھا جو اُس علاقہ میں ریاست غسّان کا والی اور حکمران تھا[13]

---

[1] لائف آف محمدؐ مصنفہ میور صفحہ ۳۶۹،۳۶۸ ؛ [2] HIMS AR EMESA ؛ [3] بخاری جلد ۱ کتاب الجہاد صفحہ ۱۰۷ ؛ [4] EDESSA مگر غالباً یہ امیسا (EMESA) یعنی حمص ہے اور غلطی سے ایڈیسیا لکھا گیا ہے جو ایک دوسرا شہر ہے۔ [5] لائف آف محمدؐ مصنفہ میور صفحہ ۳۶۹

[6] ابن اسحاق بحوالہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۳۳۵ ؛ [7] HERACLIUS [8] ابن سعد بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۳۴،۳۳۷ [9] شمائل ترمذی و مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۱۰۷ [10] زرقانی۔ [11] یہ عرب کے شمال اور شام کے جنوب میں ایک شہر تھا جسے انگریزی میں BOSRA کہتے ہیں۔ اسے عراق کے جدید شہر بصرہ کے ساتھ خلط نہیں کرنا چاہیئے۔

[12] بخاری کتاب الجہاد باب دعا النبی الی الاسلام۔ [13] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۳۳۵

بُصریٰ کے گورنر یعنی ملک غسان کا واسطہ اختیار کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دانشمندی اور حُسنِ تدبیر کا ثبوت دیا جو آپؐ اس سے قبل انگوٹھی کے تیار کرانے میں ظاہر فرما چکے تھے۔ کیونکہ غالباً آپؐ قیصر وکسریٰ کے درباروں کے متعلق یہ بات سُن چکے تھے کہ یہ لوگ اپنی دنیوی بڑائی اور عُلوِ مرتبت کی وجہ سے عموماً کوئی چھٹی براہِ راست وصول نہیں کرتے جب تک کہ وہ علاقہ کے گورنر یا رئیس کے توسط سے نہ آتے اور چونکہ آپ کی اصل غرض کلمۂ حق کی تبلیغ تھی اس لیے آپؐ نے ان درباری آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری خیال کیا تاکہ ان کی وجہ سے اصل کام میں کوئی روک نہ پیدا ہو سکے۔ ضمناً آپؐ کی یہ نیت بھی ضرور ہوگی کہ اس طرح اصل مخاطب کے علاوہ ایک درمیانی رئیس تک بھی آپؐ کا پیغام پہنچ جائے گا اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے یہی طریق آپؐ نے مملکت فارس کے کسریٰ کے متعلق اختیار کیا جسے مراسلہ بھجواتے ہوئے آپؐ نے اپنے ایلچی کو ہدایت فرمائی تھی کہ پہلے یہ خط بحرین کے رئیس کے پاس لے جانا اور پھر اُس کے توسط سے کسریٰ کے پاس پہنچانا[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکیمانہ فعل جہاں ایک طرف آپؐ کے حزم و احتیاط اور حسنِ تدبیر کی دلیل ہے وہاں وہ اِس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ دنیوی حکمرانوں کے جائز آداب کو ملحوظ رکھنا نبوت کی شان کے منافی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون کی طرف بھجوایا تو اُنہیں ہدایت فرمائی کہ :۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى[2]

یعنی "فرعون کے پاس جا کر اس کے ساتھ نرم انداز پر گفتگو کرنا شاید وہ اسی طرح نصیحت حاصل کرلے اور خدا سے ڈرنے کا رستہ اختیار کرلے۔"

غالباً ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہرقل کے نام خط روانہ کرنے کی تیاری ہی فرما رہے تھے کہ ایک غیبی نصرت کے ماتحت ہرقل کو خود بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی طرف توجہ پیدا ہوگئی۔ کیونکہ بخاری میں روایت آتی ہے جو اغلباً اسی موقع سے تعلق رکھتی ہے کہ جونہی شہنشاہ ہرقل ایلیا میں آیا[3] تو ایک صبح کو وہ بہت پریشانِ خاطر اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا جس پر اُس کے بعض مذہبی درباریوں نے اُس سے عرض کیا کہ آج آپ کی حالت کچھ پریشان نظر آتی ہے، یہ کیا بات ہے؟ اُس نے کہا میں نے آج رات ستاروں میں غور کر کے (ہرقل علم ہیئت میں کافی دسترس رکھتا تھا) معلوم کیا ہے کہ کسی

---

[1] بخاری کتاب العلم وکتاب الجہاد۔ [2] سورۃ طٰہٰ : ۴۵ [3] ایلیا بیت المقدس یعنی یروشلم کا پُرانا نام ہے اور غالباً یہ لفظ عبرانی زبان کا ہے کیونکہ عبرانی میں ایل خُدا کو کہتے ہیں گویا ایلیا کے معنے خدا کی طرف منسوب ہونے والے شہر یا بالفاظِ دیگر مقدس شہر کے ہیں اور یہی بیت المقدس کے لفظ کا مفہوم ہے۔

ختنہ کرنے والی قوم میں ایک نئے بادشاہ کا ظہور ہوا ہے۔ اور اُس نے پُوچھا کہ آج کل کون کون سی قوم ختنہ کرتی ہے؟ اُس کے درباریوں نے جواب دیا کہ ہمارے علم میں تو یہودیوں کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا اور آپ کو یہودیوں کی وجہ سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ اپنی حکومت کے مختلف شہروں میں حکم بھجوا دیں کہ یہود کو قتل کرنا شروع کر دیا جائے۔ لیکن ابھی یہ معاملہ اسی مرحلہ پر تھا کہ ہرقل کو ریاست غسان کے رئیس کی طرف سے یہ اطلاع پہنچی کہ عرب میں ایک شخص محمد نامی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور اسے مُلک میں کامیابی ہو رہی ہے۔ ہرقل نے اس خبر کے سُننے پر ہدایت دی کہ فوراً معلوم کیا جائے کہ آیا عرب لوگ ختنہ کرتے ہیں یا نہیں جس پر اُسے بتایا گیا کہ عرب لوگ ختنہ کرتے ہیں۔ ہرقل نے بے ساختہ کہا۔ تو پھر یہی اس اُمت کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے اور ہرقل نے مزید احتیاط کے طور پر اپنے ایک رفیق کو جو ایک بڑا عالم انسان تھا رومیہ میں خط لکھا اور اس معاملہ میں اُس کی بھی رائے پُوچھی لے

لیکن اس عرصہ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا خط ہرقل کو پہنچ گیا اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس جگہ بخاری کے الفاظ میں ہی یہ روایت درج کر دیں کیونکہ وہی اس تعلق میں صحیح ترین اور مفصل ترین روایت ہے۔ سو عبداللہ بن عباس جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے بیان کرتے ہیں کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر کی طرف اسلام کی دعوت کا خط لکھا اور اپنا یہ خط دحیہ کلبی کے ہاتھ بھجوایا اور آپؐ نے دحیہ کو ہدایت فرمائی کہ وہ آپؐ کے اس خط کو بُصریٰ کے رئیس کے پاس لے جائیں تاکہ وہ اُسے آگے قیصر کے پاس بھجوا دے۔ اس زمانہ میں قیصر روما سلطنتِ فارس کے خلاف فتح پانے کے شکرانے میں حمص سے ایلیا کی طرف پیدل چل کر آیا تھا اور ایلیا (بیت المقدس) میں ہی آنحضرت ﷺ کا یہ خط قیصر کو پہنچا۔ قیصر نے جب اس خط کو پڑھا تو ہدایت دی کہ اگر اس مُدعیٔ رسالت کی قوم کا کوئی شخص یہاں موجود ہو تو اُسے تلاش کر کے پیش کیا جائے۔ ابنِ عباس کہتے ہیں کہ مجھے ابوسفیان سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ان دنوں میں اپنے بعض قریش ساتھیوں کے ساتھ شام کی طرف تجارت کی غرض سے گیا ہوا تھا اور یہ صُلح حدیبیہ کے بعد کا زمانہ تھا۔ ابوسفیان نے بتایا کہ قیصر کے آدمی ہمیں تلاش کر کے ایلیا میں لے گئے اور قیصر کے سامنے پیش کیا۔ اس وقت قیصر اپنی پوری شان کے ساتھ دربار میں بیٹھا ہوا تھا اور اُس کے سر پر حکومت کا تاج تھا اور اُس کے اردگرد روما کے بڑے بڑے درباری موجود تھے۔ قیصر نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ان عرب لوگوں سے پُوچھو کہ اس مُدعیٔ رسالت

لے بخاری باب کیف کان بدء الوحی

کا سب سے قریبی رشتہ دار کون ہے۔ ابوسفیان نے عرض کیا میں ہی محمد (ﷺ) کا سب سے قریبی رشتہ دار ہوں اور وہ رشتہ میں میرے چچا کا بیٹا ہے۔ ابوسفیان بیان کرتا ہے کہ قیصر نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے ساتھیوں کو اپنے سامنے مگر میری پیٹھ کی طرف کھڑا کر دیا۔ پھر اُس نے ترجمان سے کہا کہ اُس کے ساتھیوں سے کہدو کہ میں اِس سے اُس شخص کے متعلق بعض سوالات کرنا چاہتا ہوں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ پس اگر ابوسفیان اپنے جواب میں کوئی بات غلط بیان کرے تو تم مجھے فوراً بتا دینا (ابوسفیان کہتا ہے کہ خُدا کی قسم اگر مجھے یہ شرم نہ ہوتی کہ میرے ساتھی یہ محسوس کریں گے کہ میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے تو میں اِس موقع پر ضرور کوئی نہ کوئی غلط بات کہہ جاتا مگر میں سچی سچی بات کہنے پر مجبور ہوگیا) اِس کے بعد قیصر نے ترجمان کے ذریعہ اپنے سوالات شروع کئے۔

قیصر۔ اِس مُدعی کا تمہاری قوم میں حسب نسب کیا ہے؟

ابوسفیان۔ وہ ہم میں اچھے نسب کا ہے اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

قیصر۔ کیا اِس سے پہلے تم میں سے کسی شخص نے اِس قسم کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ کیا اِس دعویٰ سے پہلے تم نے اِس مُدعی کے خلاف کبھی جھوٹ کا الزام لگتے سُنا ہے؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ کیا اس کے باپ دادوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ کیا اِس مُدعی کو بڑے بڑے لوگ مان رہے ہیں یا کہ کمزور اور غریب مزاج لوگ؟

ابوسفیان۔ کمزور اور غریب لوگ۔

قیصر۔ کیا اِس کے ماننے والے بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں؟

ابوسفیان۔ بڑھ رہے ہیں۔

قیصر۔ کیا ان میں سے کبھی کوئی شخص اُس کے دین کو بُرا سمجھتے ہوئے مُرتد ہوا ہے؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ کیا یہ شخص کبھی اپنے عہد کو توڑتا ہے؟

ابوسفیان۔ نہیں لیکن آجکل ہمارا اور اس کا ایک معاہدہ چل رہا ہے اس کے متعلق ہمیں ڈر ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔ (ابوسفیان کہتا ہے کہ مجھے اس موقع پر اس فقرہ کے سوا کوئی اور موقع نہیں مل سکا کہ میں اپنی طرف سے آپؐ کے خلاف کوئی

بات لگا سکوں۔)

قیصر۔ کیا کبھی اس کے ساتھ تمہاری کوئی جنگ ہوئی ہے؟

ابوسفیان۔ ہاں جنگ ہوئی ہے۔

قیصر۔ پھر اس جنگ کا نتیجہ کیا نکلتا رہا ہے؟

ابوسفیان۔ یہ جنگ ایک اُوپر چڑھنے والے اور نیچے گرنے والے ڈول کی طرح رہی ہے کہ کبھی اُسے غلبہ ہو جاتا ہے اور کبھی ہمیں۔

قیصر۔ یہ مدعی تمہیں کس بات کا حکم دیتا ہے؟

ابوسفیان۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کو ایک سمجھو اور شرک نہ کرو۔ اور وہ ہمیں اپنے باپ دادوں والی عبادت سے روکتا ہے اور کہتا ہے نماز پڑھو اور صدقہ دو اور بُرائیوں سے بچ کر رہو اور اپنے عہدوں کو پُورا کرو اور امانتوں میں خیانت نہ کیا کرو۔

اِس سوال و جواب کے بعد قیصر نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان سے کہو کہ جب تم سے مَیں نے اس شخص کے حسب نسب کے متعلق پُوچھا تھا تو تم نے جواب دیا تھا کہ وہ شریف خاندان سے ہے اور خُدا کے رسول ہمیشہ شریف خاندانوں میں سے مبعوث کئے جاتے ہیں۔ پھر مَیں نے تم سے پُوچھا تھا کہ کیا اِس سے پہلے تم میں سے کسی شخص نے کبھی ایسا دعویٰ کیا ہے تو تم نے یہ جواب دیا کہ نہیں۔ یہ مَیں نے اس لیے پوچھا تھا کہ اگر کسی اور نے ایسا دعویٰ کیا ہوتا تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ شاید یہ اس کی نقل کر رہا ہے۔ پھر مَیں نے تم سے پُوچھا تھا کہ کیا تم نے اُس کے دعویٰ سے پہلے کبھی کسی بات میں اس کا جھُوٹ دیکھا تو تم نے کہا کہ نہیں۔ تو مَیں نے اِس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جو شخص انسانوں پر جھوٹ نہیں بول سکتا وہ خُدا پر کیسے جھُوٹ بول سکتا ہے۔ پھر مَیں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا اسکے باپ دادوں میں سے کوئی بادشاہ گذرا ہے اور تم نے کہا کہ نہیں۔ یہ مَیں نے اس لیے پوچھا تھا کہ اگر اُس کے باپ دادوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہوتا تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ شاید وہ اپنے خاندان کی کھوئی ہوئی بادشاہت کو واپس حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پھر مَیں نے تم سے پُوچھا تھا کہ کیا اسے بڑے بڑے لوگ مان رہے ہیں یا کہ کمزور اور غریب مزاج لوگ۔ اور تم نے جواب دیا کہ کمزور اور غریب مزاج لوگ مان رہے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ (شروع شروع میں) خدا کے رسولوں کو کمزور اور غریب مزاج لوگ ہی مانا کرتے ہیں۔ پھر مَیں نے تم سے پُوچھا تھا کہ کیا اس کے ماننے والے زیادہ ہو رہے ہیں یا کہ کم ہو رہے ہیں؟ اور تم نے یہ جواب دیا کہ زیادہ ہو رہے ہیں۔ اور ایمان کا یہی حال ہوا کرتا ہے کہ جب تک کہ وہ اپنے کمال کو نہیں پہنچ جاتا وہ برابر ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر مَیں نے تم سے پُوچھا تھا کہ کیا کبھی کوئی شخص ایمان لانے کے بعد اس کے دین کو ناپسند کرنے کی وجہ سے مُرتد ہوتا ہے۔ تم نے کہا نہیں۔ اور یہی سچے

ایمان کا حال ہوتا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ دل میں داخل ہو جاتے تو کوئی شخص (خواہ کسی اور وجہ سے مُرتد ہو جاتے تو ہو جاتے مگر) اُسے بُرا سمجھ کر پیچھے نہیں ہٹتا۔ پھر مَیں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا کبھی یہ شخص بدعہدی کرتا ہے۔ اور تم نے کہا کہ نہیں۔ اور خُدا کے رسولوں کا یہی مقام ہوتا ہے کہ وہ کبھی بدعہدی نہیں کرتے۔ پھر مَیں نے تم سے پُوچھا تھا کہ کیا اس کے اور تمہارے درمیان کبھی کوئی جنگ ہوئی ہے اور تم نے اس کا جواب دیا کہ ہاں ہوئی ہے اور یہ کہ کبھی لڑائی میں اُسے غلبہ ہو جاتا ہے اور کبھی ہمیں ہو جاتا ہے۔ اور یہی خدا کے رسولوں کا حال ہوتا ہے کہ اُن کی جماعتوں پر بھی کبھی کبھی تکلیفیں آتی رہتی ہیں مگر انجام بہر حال اُن کے حق میں ہوتا ہے اور آخر کار وہی جیتتے ہیں۔ پھر مَیں نے تم سے پُوچھا تھا کہ وہ تمہیں کیا تعلیم دیتا ہے اور تم نے بتایا کہ وہ کہتا ہے کہ خدا کو ایک مانو۔ شرک نہ کرو۔ نماز پڑھو۔ صدقہ دو۔ بُری باتوں سے پرہیز کرو۔ اپنے عہدوں کو پُورا کرو اور امانتوں میں خیانت نہ کرو۔ اور یہی ایک نبی کے اوصاف ہوا کرتے ہیں۔

اِس کے بعد قیصر نے کہا۔ مَیں جانتا تھا کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے، لیکن اے عرب کے لوگو! میرا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ اور اگر وہ باتیں جو تم نے مجھ سے بیان کی ہیں درست ہیں تو مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت دُور نہیں کہ یہ شخص اِس زمین پر جو اِس وقت میرے اِن دو قدموں کے نیچے ہے ضرور قابض ہو کر رہے گا۔ اور اگر مجھے توفیق ملے تو مَیں اُس کی ملاقات کے لیے پہنچوں۔ اور اگر مَیں اُس کے پاس پہنچوں تو اُس کے قدموں کو دھو کر راحت پاؤں۔

ابوسفیان کہتا ہے کہ اس کے بعد قیصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط منگوایا اور اُسے دربار میں پڑھے جانے کا حکم دیا۔ اس خط میں یہ عبارت لکھی تھی:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ إِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ۔ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔ أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّيْ أَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ وَأَسْلِمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ۔ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ إِثْمُ الْأَرِيْسِيِّيْنَ۔ وَيَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔

(ترجمہ:۔ مَیں اللہ کے نام کے ساتھ اِس خط کو شروع کرتا ہوں جو بے مانگے رحم کرنے والا اور اعمال کا بہترین بدلہ دینے والا ہے۔ یہ خط محمدؐ خدا کے بندے اور اُس کے رسول کی

طرف سے روما کے رئیس ہرقل کے نام ہے۔ سلامتی ہو اُس شخص پر جو ہدایت کو قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد اے رئیس روما! مَیں آپ کو اسلام کی ہدایت کی طرف بلاتا ہوں۔ مسلمان ہو کر خدا کی سلامتی کو قبول کیجئے کہ اب یہی صرف نجات کا رستہ ہے۔ اسلام لائیے خدا تعالیٰ آپ کو اس کا دوہرا اجر دیگا، لیکن اگر آپ نے روگردانی کی تو یاد رکھیئے کہ آپ کی رعایا[1] کا گناہ بھی آپ کی گردن پر ہوگا۔ اور اے اہلِ کتاب! اس کلمہ کی طرف تو آجاؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان مشترک ہے یعنی ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی صورت میں خدا کا کوئی شریک نہ ٹھہرائیں اور خدا کو چھوڑ کر اپنے میں سے کسی کو اپنا آقا اور حاجت رَوا نہ گردانیں پھر اگر ان لوگوں نے روگردانی کی تو ان سے کہدو کہ گواہ رہو کہ ہم تو بہرحال خدائے واحد کے دامن کے ساتھ وابستہ اور اُس کے فرمانبردار بندے ہیں۔)

ابوسفیان روایت کرتا ہے کہ جب یہ گفتگو اور اس خط کا پڑھا جانا ختم ہوا تو دربار میں ہر طرف سے رومی رئیسوں کی آوازیں بلند ہونی شروع ہوئیں اور آپس کا کلام اونچا اور خلط ملط ہونے لگا اور مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس وقت ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم باہر چلے جائیں۔ اور جب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آیا اور مجھے اُن کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنے کا موقع ملا تو مَیں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ محمدؐ کا ستارہ تو بہت بلند ہوتا نظر آتا ہے کیونکہ روما کی حکومت کا بادشاہ اس سے خوف کھا رہا ہے۔ اس کے بعد مَیں ہمیشہ اپنے آپ کو نیچا اور ہیٹا محسوس کرتا رہا۔ اور میرا دل اس یقین سے پُر تھا کہ محمدؐ اب غالب ہو کر رہے گا۔ حتّٰی کہ میرے دل میں اسلام کی صداقت نے رستہ پالیا حالانکہ مَیں اس سے پہلے اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔"[2]

اسی سے ملتی جلتی روایت بخاری باب کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ میں بھی آتی ہے اور طبری اور ابن اسحاق اور دوسرے سب مؤرخوں کی روایتیں بھی خفیف لفظی فرق کے ساتھ اس کی مؤیّد ہیں اور یکجائی بیان کے لیے فتح الباری اور تاریخ خمیس اور زرقانی کا کوئی جواب نہیں۔

گو اس موقع پر اپنے معزز درباریوں اور خصوصاً مذہبی لیڈروں کی مخالفت کی وجہ سے ہرقل خائف ہو کر خاموش ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی طبیعت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط اور اس سے قبل اور بعد کے حالات کا گہرا اثر ہو چکا تھا کیونکہ جب وہ ایلیا سے لوٹ کر دوبارہ حمص کی طرف گیا

---

[1] اریسیں رجس کی جمع (اریسیین ہے) کے معنی کاشتکار اور زمیندار کے ہیں اور اس جگہ اس سے رعایا مُراد ہے۔

[2] بخاری کتاب الجہاد باب دُعاء النبی الی الاسلام

اور اس عرصہ میں اس کو رومیتہ کے عالم کا جواب بھی موصول ہو چکا تھا جس میں اُس نے ہرقل کی رائے کی تصدیق کی تھی کہ اِس زمانہ میں ایک نبی کا مبعوث ہونا ظاہر ہوتا ہے تو ہرقل نے ایک دفعہ پھر مملکت روم کے بڑے بڑے اہل الرائے لوگوں کو دعوت دیکر بُلایا اور اپنے حمص کے شاہی محل میں اُنہیں جمع کر کے رازداری کے خیال سے دربار کے تمام دروازے بند کروا دیئے اور پھر رؤساء روما کو مخاطب کر کے اُن سے کہا کہ اے میری مملکت کے سردارو! اگر تمہیں اپنی فلاح اور بہبودی منظور ہے اور تم تباہی سے بچ کر ترقی کا رستہ دیکھنا چاہتے ہو اور اپنے ملک کو ہلاکت سے بچانے کے خواہاں ہو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ اس نبی کو قبول کر لو جو عرب کی سرزمین میں مبعوث ہوا ہے۔ قیصر کی یہ بات سُنکر اُس کے درباری اِس طرح بھڑے جس طرح کہ جنگل میں گورخر بھڑتا ہے۔ اور قیصر کی مجلس سے بھاگ کر دروازوں سے باہر نکل جانا چاہا، لیکن قیصر کی دُور اندیشی نے پہلے سے دروازے بند کروا رکھے تھے اُس نے فوراً ان متکبر رئیسوں اور پادریوں کو واپس بُلایا اور اُن سے محبت کے انداز میں کہا کہ مَیں تو صرف تمہارے دین کا امتحان لیتا تھا اور شکر ہے کہ تم پُختہ نکلے۔ جب قیصر کے درباریوں نے اپنے بادشاہ میں یہ تبدیلی دیکھی تو وہ خوش ہو گئے اور خوشی کے جوش میں اُس کے سامنے سجدہ میں جاگرے۔ بس یہ وہ انجام تھا جس کو ہرقل شہنشاہِ روم اپنی زندگی کے اِس بھاری امتحان میں پہنچا۔[1]

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ ہرقل نے ایلیا کے دربار میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھا تھا تو دراصل یہ دوسری بار کا پڑھنا تھا۔ ورنہ اِس سے پہلے وہ ایک پرائیویٹ مجلس میں اس خط کو اپنے طور پر پڑھ چکا تھا۔[2] اس کی تفصیل یُوں بیان ہوئی ہے کہ جب پہلی دفعہ قیصر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ملا تو اُس نے اپنی پرائیویٹ مجلس میں دحیہ کو بُلایا اور اپنے چند مصاحبوں اور عزیزوں کے سامنے اس خط کو پڑھنا چاہا۔ اس وقت غالباً یہ خط پہلے ہرقل کے بھتیجے[3] کے ہاتھ میں گیا اور اُس نے ہرقل کے سامنے پیش کرنے سے قبل اس خط کو خود کھول کر دیکھنا چاہا اور خط دیکھتے ہی چلّا اُٹھا کہ یہ خط تو ہرگز قبول کرنے کے قابل نہیں کیونکہ اس میں شروع میں آپ کے نام کی بجائے لکھنے والے نے اپنا نام لکھا ہے[4] جو آپ کی ہتک ہے اور اسی طرح آپ کو شہنشاہِ

---

[1] بخاری جلد ا باب کیف کان بدأ الوحی و زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۳۹ ۔ [2] فتح الباری و زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۳۸ ۔ [3] ایک روایت میں بھائی کا نام آتا ہے، واللہ اعلم۔ [4] غالباً اُس وقت درباروں میں یہ دستور ہوگا کہ رئیس کو مخاطب کرتے ہوتے "ازطرف فلاں بنام فلاں" کی بجائے "بنام فلاں ازطرف فلاں" کے الفاظ لکھتے ہوں گے مگر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "ازطرف محمد رسول اللہ بنام ہرقل عظیم الروم" کے الفاظ لکھے تھے۔

روم لکھنے کی بجائے رئیس روما لکھا ہے اور یہ دوسری ہتک ہے، لیکن ہرقل نے اسے یہ کہہ کر چُپ کرا دیا کہ یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ ایک مُدعئ رسالت کی طرف سے خط آئے اور میں اسے پڑھے بغیر پھینک دوں؟ اور "شاہِ روما" کی بجائے "رئیس روما" کے الفاظ لکھنے میں کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اصل بادشاہت تو خُدا ہی کی ہے اور میں اور یہ مُدعی دونوں اُسی کے بندے ہیں۔ یہ کہکر اُس نے اپنے بھتیجے کے ہاتھ سے خط لے لیا اور حُکم دیا کہ پبلک دربار سے قبل دِحیہ کلبی کو سرکاری مہمان کے طور پر رکھا جائے[1] مگر بہرحال اس میں شُبہ نہیں کہ ہرقل کو اپنی بہت سی خوبیوں اور دانائیوں اور دُور اندیشیوں کے باوجود دُنیا کے خوف اور طاقت و عزت کی ہوس کی وجہ سے ہدایت نصیب نہیں ہوئی اور گویا ایمان کی چنگاری اُس کے سینہ میں روشن ہوتے ہوتے بُجھ کر رہ گئی۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اِس انکار اور محرومی کے اس کے دل کی گہرائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت گھر کر چکی تھی۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس تبلیغی خط کو ایک تبرّک کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھا[2] اور وہ کئی سو سال تک اس کے خاندان میں محفوظ رہا۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب شاہ منصور قلاوون (جو ساتویں صدی ہجری میں گذرا ہے) کے بعض سفیر ایک دفعہ مَلِک الفرنج کے پاس گئے تو اس وقت مَلِک مذکور نے انہیں دکھانے کے لئے ایک سنہری ڈبہ منگوایا اور اس کے اندر سے ایک ریشمی رومال میں لپٹا ہوا خط نکال کر انہیں دکھایا کہ میرے ایک دادا ہرقل کے نام آپ کے رسول کا ایک خط آیا تھا وہ آج تک ہمارے گھر میں ایک متبرک تحفہ کے طور پر محفوظ ہے[3] اگر شاہ منصور قلاوون کے مزید حالات دیکھنے ہوں تو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں دیکھے جائیں۔

ہرقل والے خط کے تعلق میں ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ جب پہلی دفعہ دِحیہ کلبی قیصر کے سامنے پیش ہونے لگے تو اُن سے کہا گیا کہ یہاں کا درباری آداب یہ ہے کہ قیصر کے سامنے جاتے ہی سجدہ میں گِر جاتے ہیں اور پھر جب تک وہ خود نہ کہے سر نہیں اُٹھاتے۔ دِحیہ نے کہا میں تو خُدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کر سکتا خواہ مجھے اس کے سامنے جانے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ مگر پھر خُدا نے ایسا فضل کیا کہ وہ اِس خلافِ اسلام حرکت کرنے کے بغیر ہی قیصر کے دربار میں باریاب ہو گئے[4]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خط بنام ہرقل میں ایک بات ایسی ہے جس کی بناء پر بعض عیسائی مؤرخین نے اعتراض کیا ہے اور اس کی وجہ سے خط کی صداقت کے متعلق بھی شُبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ خط میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ یَا اَھْلَ الْکِتَاب

---

[1] مواہب اللدنیہ وزرقانی۔ [2] کتاب الاموال بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۲ نیز دیکھو صفحہ ۳۳۹۔ [3] فتح الباری بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۲، ۳۴۳۔ [4] جلد ۲ صفحہ ۶۸۵ تا ۶۸۷۔ [5] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۳۵

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ۔ الآیۃ۔ یہ سورۃ آل عمران کی ابتدائی آیتوں میں سے ایک آیت ہے اور روایات سے ثابت ہے کہ سورۃ آل عمران کی ابتدائی اسّی آیتیں اُس وقت نازل ہوئی تھیں جب ۹ھ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا[1] اور چونکہ قیصر کے نام کا خط بہر حال صلح حدیبیہ کے معاً بعد کا ہے اس لیے ۹ھ ہجری میں نازل ہونے والی آیت ۶ھ یا ۷ھ میں لکھے جانے والے خط کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ خط کا قصہ سرے سے ہی درست نہیں ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جو اس موقع پر کیا گیا ہے۔ مگر یہ اعتراض کوئی نیا اعتراض نہیں خود مسلمان مؤرخوں کے سامنے یہ سوال آیا اور انہوں نے بڑی مفصّل بحث کر کے اِس کا جواب دیا ہے[2]۔ دراصل بات یہ ہے اور کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ بعض کلمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت عمرؓ کی زبان سے نکلے اور پھر کچھ عرصہ بعد اسی کے مطابق قرآنی آیات کا نزول ہو گیا۔ اور یہ صورت اعلیٰ درجہ کے تربیت یافتہ رُوحانی قلوب کے متعلق ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ وہ اپنے خاص نورِ قلب یا مخصوص رُوحانی حِس کی وجہ سے ایک الہامی صداقت کے نزول سے قبل ہی اُس کی مخفی تاروں سے متأثر ہو کر اس کا اظہار کر دیں۔ چنانچہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ سلوک اور منافقین کی نماز جنازہ اور شراب کی حُرمت اور احکام پردہ وغیرہ کے متعلق اس قسم کے متعدد واقعات تاریخ اور حدیث میں مذکور ہیں[3]۔ پس یہ ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ اِس موقع پر بھی یہ عبارت اوّلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود املاء فرمائی ہو اور پھر بعد میں وہی عبارت قرآنی آیت کی صورت میں نازل ہو گئی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سورۃ آل عمران کی شروع کی اسّی آیتیں سب کی سب وفد نجران کے وقت نازل نہ ہوئی ہوں بلکہ ان میں سے ایک آدھ آیت پہلے نازل ہو چکی ہو، لیکن اکثریت کی وجہ سے یہ کہہ دیا گیا ہو کہ پہلی اسّی آیتیں وفد نجران کے موقع پر نازل ہوئی تھیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت دو دفعہ نازل ہوئی ہو۔ ایک دفعہ اوائل ہجرت میں اور دوسری دفعہ ۹ھ میں وغیرہ وغیرہ۔

مگر غالباً اس بحث میں سب سے زیادہ یقینی ثبوت اُس اصل خط کے دریافت ہو جانے سے ملتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی زمانہ میں مقوقس مصر کو لکھ کر بھیجا۔ یہ خط اپنی اصلی صورت میں دریافت ہو چکا ہے اور ہم اس کا ایک فوٹو آگے چل کر درج کر رہے ہیں۔ اس خط میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی عبارت یَآ اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ ...... والی درج کرائی تھی۔ پس جب

---

[1] ابن سعد ؛ [2] چنانچہ ملاحظہ ہو فتح الباری و تفسیر ابن کثیر و زرقانی وغیرہ۔

[3] فتح الباری و زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۳۸

یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ عبارت مقوقس والے خط کا حصہ بھی تھی اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ مقوقس والا خط اور ہرقل والا خط ایک ہی زمانہ میں لکھے گئے تو پھر بہرحال اِن خطوں کی صداقت کا معاملہ تو کسی صورت میں مشکوک نہیں سمجھا جا سکتا۔ وَھُوَ الْمُرَادُ۔

جو تبلیغی خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کے نام لکھا وہ اپنے معانی اور الفاظ کی خوبصورتی اور جامعیّت کے لحاظ سے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی تحریر ہے۔ اِس تحریر کے الفاظ گو بہت مختصر ہیں مگر اس عبارت کا ایک ایک لفظ دلکش نگینوں کا حکم رکھتا ہے جو ایک اعلیٰ درجہ کے جڑاؤ زیور میں ایک باکمال ہنرمند نصب کرتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس مختصر سے خط میں اسلام کی تبلیغ کا اور خصوصاً اُس تبلیغ کا جو ایک مسیحی کو مخاطب کر کے ہونی چاہیئے بہترین نمونہ درج کر دیا گیا ہے اور اس میں توحید کا بھی وہ جامع سبق موجود ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور پھر اسلوبِ بیان ایسا لطیف ہے کہ گویا بشارت و انذار کی دو کامل نہریں پہلو بہ پہلو رواں ہیں۔ اور ایک طرف بلاوجہ دل دُکھانے اور دوسری طرف مداہنت کے پردہ میں حق کو چھپانے کے بغیر اسلامی صداقت کا مکمل نقشہ کھینچ دیا گیا ہے اور آخر میں اپنے اس فولادی عزم کا اظہار بھی کر دیا گیا ہے کہ تم مانو یا نہ مانو ہم تو بہرحال اسلام کی خدمت کا بیڑا اُٹھا چکے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

ہرقل والے خط کے واقعہ سے یہ بھاری سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ سچّی قربانی کی رُوح کے بغیر کوئی بڑی صداقت قبول نہیں کی جا سکتی۔ ہرقل کے وہ سوالات جو اُس نے ابوسفیان سے کئے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ایک غیر معمولی عقل و دانش کا انسان تھا جس نے سلسلۂ رسالت اور سلسلۂ ایمانیات کا کافی گہرا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ پھر اُس نے جس طرح اسلام کی صداقت سے متاثر ہو کر اپنے درباریوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی، وہ نہ صرف اُس کی حُسنِ تدبیر بلکہ ایک حد تک اُس کے جذبۂ دینداری کی بھی دلیل ہے۔ مگر پھر بھی یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ ایمان کی نعمت سے محروم رہا اور بالآخر اسلام کی فوجوں سے لڑتا ہوا اِس جہان سے رخصت ہوا۔[1] اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اُس کی رُوح اِس بھاری قربانی کے لیے تیار نہیں تھی جو سچّی دینداری کے لیے ضروری ہے۔ وہ اپنی دُنیا کی جاہ و عظمت کھونے کے بغیر اپنے درباریوں کے جُھرمٹ میں گھِرا ہوا اسلام کی طرف قدم اُٹھانا چاہتا تھا۔ وہ ایک حد تک دین کا طالب ضرور تھا مگر دُنیا کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہی کمزوری اُس کی ہلاکت کا باعث بن گئی۔ بیشک ابوبکرؓ اور عمرؓ نے بھی دُنیا کی بہترین نعمتوں اور عزتوں کا ورثہ پایا مگر اُنہوں نے اسلام کے ساتھ سَودا نہیں کرنا چاہا۔ وہ خالی ہاتھ ہو کر

---

[1] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۲

محض دین کی خاطر اسلام کی طرف آئے اور پھر خُدا نے جو کسی کا قرضہ اپنے ذمّہ نہیں رکھا کرتا انہیں وہ سلطنت عطا کی جس کے سامنے قیصر وکسریٰ کی مجموعی سلطنت بھی ماند تھی۔ مگر قیصر خالی ہاتھ ہو کر اسلام کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے ڈرا۔ اُس نے اپنا کمزور ہاتھ اسلام کی طرف بڑھایا اور مضبوط ہاتھ اپنی حکومت کے عصا پر جمائے رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بٹے ہوئے دل کو نہ تو دین ہی ملا اور نہ ہی دُنیا زیادہ دیر تک اُس کے ہاتھوں میں ٹھہر سکی۔

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بڑا نکتہ شناس تھا اور آپؐ کسی کی ذراسی نیکی کو بھی فراموش کرنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ کسریٰ نے تو آپؐ کا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہے مگر قیصر نے گو آپؐ کی دعوت کو قبول نہیں کیا لیکن بظاہر عزت اور ادب سے پیش آیا ہے تو آپؐ نے فرمایا:۔

اَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيُمَزَّقُوْنَ وَ اَمَّا هٰؤُلَاءِ فَسَيَكُوْنُ لَهُمْ بَقِيَّةٌ [1]

یعنی "ایرانی حکومت تو فوراً پاش پاش کر دی جائے گی مگر رومی حکومت کو خُدا کچھ مُہلت عطا کرے گا۔"

سو بعینہٖ یہی ہوا کہ کسریٰ کی حکومت تو چند سال کے اندر خاک میں مل گئی مگر قیصر کی سلطنت بہت سا حصہ چھینے جانے کے باوجود قسطنطنیہ اور اُس کے گردونواح میں سینکڑوں سال تک قائم رہی [2] فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِى الْاَبْصَارِ۔

کسریٰ کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا تبلیغی خط کسریٰ شہنشاہِ فارس کے نام تھا۔ جیسا کہ اُوپر بتایا جاچکا ہے کسریٰ فارس کے بادشاہوں کا سرکاری اور موروثی لقب تھا اور جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس زمانہ میں فارس کے بادشاہ کا ذاتی نام خسرو پرویز بن ہرمز تھا جو ایران کے مشہور ساسانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بادشاہ جو بڑی شان وشوکت اور جاہ و جلال کا مالک تھا۔ مذہباً آتش پرست یعنی مشرک تھا اور یہی اُس کی رعایا کا مذہب تھا جو اپنے بادشاہ کو بھی قابلِ پرستش خیال کرتی تھی۔ فارس کے کسریٰ ایک طرح سے عرب کے مُلک پر بھی گویا اپنا سیاسی حق جماتے تھے۔ کیونکہ عرب کے علاقہ بحرین اور علاقہ یمن کے رئیس دونوں کسریٰ کے ماتحت تھے اور کسریٰ کی طرف سے ان علاقوں کے والی یعنی گورنر سمجھے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کی طرف تبلیغی خط لکھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو درباری آداب کے پیشِ نظر اپنا خط پہلے رئیس

---

[1] کتاب الاموال بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۲ ‏؛ [2] خلافت اسلامیہ مصنفہ سرولیم میور

بحرین کی طرف بھیجا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ یہ خط آگے کسریٰ کے نام بھجوا دے[1]۔ اسی طرح جیساکہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے جب خسرو پرویز نے غصہ میں آکر نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے احکام صادر کئے تو ان احکام کے اجراء کے لیے اُس نے اپنے یمن کے گورنر کو ہدایت بھجوائی۔ بہرحال بحرین اور یمن پر اقتدار حاصل ہونے کی وجہ سے کسریٰ کو عرب کے معاملات میں کافی دلچسپی تھی اور وہ عرب کی ہر نئی تحریک کو طبعاً شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔

عرب کے معاملات میں کسریٰ کی دلچسپی کا دوسرا بڑا باعث عرب کے یہودی قبیلے تھے جو مدینہ اور خیبر اور وادی القریٰ وغیرہ میں کثرت سے آباد تھے۔ یہ یہودی قبیلے طبعاً اور روایتاً قیصر کی عیسائی حکومت کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ حق یہ ہے کہ وہ عیسائیوں کے سخت خلاف تھے اور دوسری طرف قیصر کی حکومت یہودیوں کے متعلق معاندانہ رویہ رکھتی تھی اور ہرقل نے تو خصومیت سے اُن کے خلاف تشدد کا دروازہ کھول رکھا تھا[2]۔ اندریں حالات عرب کے ماحول میں صرف فارس کی حکومت ہی ایسی تھی جس کے ساتھ عرب کے یہودی تعلقات رکھ سکتے تھے۔ یہ تعلقات یزدجرد اوّل کے عہد میں شروع ہوئے جس کی ایک بیوی یہودی نسل کی تھی اور پھر خسرو پرویز کے زمانہ میں اپنے کمال کو پہنچ گئے جبکہ یہودیوں اور ایرانی حکومت کے درمیان گہرے تعلقات پیدا ہو چکے تھے[3]۔ عرب کے یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کثرت کے ساتھ کسریٰ کے دربار میں جاتے رہتے تھے اور جہاں تک اُن کا بس چلتا تھا خسرو پرویز کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اُکساتے تھے۔ اس حقیقت کو سر ولیم میور نے بھی اشارۃً تسلیم کیا ہے[4]۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کے نام تبلیغی خط روانہ کیا۔ یہ خط آپؐ نے اپنے قدیم اور مخلص صحابی عبداللہ بن حذافہ سہمی کے ہاتھ بھجوایا[5]۔ اور انہیں ہدایت کی کہ آپؐ کے خط کو پہلے بحرین کے رئیس کے پاس لے جائیں اور پھر اُس کے توسط سے کسریٰ تک پہنچیں[6]۔ اس رئیس بحرین کا نام منذر بن ساوی تھا جو بحرین کے علاقہ میں کسریٰ کا نائب السلطنت تھا[7]۔ یہ خط بھی قیصر کے خط کی طرح باقاعدہ مُہر لگا کر بھیجا گیا تھا اور اس کی عبارت یہ تھی:۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ اِلٰی کِسْرٰی عَظِیْمِ

---

[1] بخاری کتاب العلم وکتاب الجہاد۔ [2] ملاحظہ ہو ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۷ صفحہ ۱۷۵۔ نیز دیکھو ہسٹری آف دی نیشنز مصنفہ ہچن سنز صفحہ ۵۵۰۔ [3] جیوایش انسائیکلو پیڈیا جلد ۹ صفحہ ۴۴۸ زیر عنوان پرشیا۔
[4] لائف آف محمد صفحہ ۳۷۱۔ [5] زرقانی وتاریخ خمیس۔ [6] بخاری کتاب العلم وکتاب الجہاد
[7] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۱

فَارِسَ۔ سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی وَاٰمَنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَ
شَھِدَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا
عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ اَدْعُوْکَ بِدِعَایَۃِ اللّٰہِ فَاِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَی النَّاسِ
کَافَّۃً لِاُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا وَیَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَی الْکَافِرِیْنَ۔
اَسْلِمْ تُسْلَمْ۔ فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَعَلَیْکَ اِثْمَ الْمَجُوْسِ[1]

یعنی "مَیں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں جو بے مانگے رحم کرنے والا اور اعمال کا بہترین بدلہ دینے والا ہے۔ یہ خط خدا کے رسول محمدؐ کی طرف سے فارس کے رئیس کسریٰ کے نام ہے۔ سلامتی ہو اُس شخص پر جو ہدایت کو قبول کرتا ہے اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاتا اور اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی شریک ہے۔ اور وہ اس بات کی بھی گواہی دیتا ہے کہ محمدؐ خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔ اے رئیسِ فارس! مَیں آپ کو خدا کی دعوت کی طرف بُلاتا ہوں۔ کیونکہ مَیں سب انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تاکہ میں ہر زندہ انسان کو ہوشیار کر دوں اور تا انکار کرنے والوں پر خُدا کا فیصلہ واجب ہو جاتے۔ اے رئیس فارس! آپ اسلام کو قبول کریں کیونکہ اب آپ کے لیے صرف اسی میں سلامتی کا رستہ ہے، لیکن اگر آپ روگردانی کریں گے تو یاد رکھیں کہ اس صورت میں (آپ کے اپنے گناہ کے علاوہ) آپ کی مجوس رعایا کا گناہ بھی آپ کی گردن پر ہوگا"۔

عبداللہ بن حذافہ کہتے ہیں کہ جب مَیں اس خط کے ساتھ کسریٰ کے دربار میں پہنچا اور اجازت ملنے کے بعد کسریٰ کے سامنے اِس خط کو پیش کیا تو اُس نے یہ خط اپنے ایک ترجمان کے سپرد کیا کہ تا وہ اُسے پڑھ کر سُنائے۔ جب ترجمان نے اس خط کو پڑھا تو کسریٰ اس کے مضمون کو سُنکر غصہ سے بھر گیا اور ترجمان کے ہاتھ سے خط لیکر اُسے یہ کہتے ہوتے ریزہ ریزہ کر دیا کہ میرا غلام ہو کر مجھے اِس طرح مخاطب کرتا ہے[2]! روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسریٰ کی اس حرکت کی اطلاع پہنچی تو آپؐ نے دینی غیرت کے جوش میں فرمایا۔ "خدا خود ان لوگوں کو پارہ پارہ کرے[3]" اور ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپؐ نے اِس موقع پر یہ الفاظ فرمائے تھے کہ اَمَا ھٰؤُلَاءِ فَیُمَزَّقُوْنَ یعنی "اب یہ لوگ خود ریزہ ریزہ کر دیتے جائیں گے"[4]۔

---

[1] تاریخ خمیس وزرقانی بروایت واقدی۔ [2] طبری وتاریخ خمیس وزرقانی
[3] بخاری کتاب العلم وکتاب الجہاد [4] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۲

کسریٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کو پھاڑنے پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ یہودی پراپیگنڈا کے گہرے تاثرات کے ماتحت اُس نے اپنے یمن کے گورنر کو جس کا نام باذان تھا ہدایت فرمائی کہ حجاز میں جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اُس کی طرف فوراً دو طاقتور آدمی بھجوا دو تاکہ وہ اُسے گرفتار کر کے ہمارے سامنے حاضر کریں۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ دو آدمی بھجوا کر اُس سے توبہ کراؤ۔ اور اگر وہ انکار کرے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ باذان نے اِس غرض کے لیے اپنے ایک قہرمان یعنی سیکرٹری کو جس کا نام بانوَیہ تھا منتخب کیا اور اُس کے ساتھ ایک مضبوط سوار مقرر کر کے مدینہ کی طرف بھجوا دیا اور اُن کے ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ایک خط بھی بھجوایا کہ آپؐ فوراً اِن لوگوں کے ساتھ کسریٰ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باذان کا خط دیکر بطریق نصیحت سمجھایا کہ بہتر ہے آپ ہمارے ساتھ چلے چلیں ورنہ کسریٰ آپ کے مُلک اور قوم کو تباہ کر کے رکھ دیگا۔ آپؐ نے اُن کی یہ بات سُن کر تبسم فرمایا اور جواب میں اسلام کی تبلیغ کی اور پھر فرمایا کہ تم آج رات ٹھہرو مَیں انشاءاللہ تمہیں کل جواب دوں گا۔ پھر جب وہ دوسرے دن آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا:-

اَبْلِغَا صَاحِبَکُمَا اَنَّ رَبِّیْ قَتَلَ رَبَّهٗ فِیْ هٰذِهِ اللَّیْلَةِ۔

یعنی "اپنے آقا (والیٔ یمن) سے جا کر کہدو کہ میرے رب یعنی خدائے ذوالجلال نے اُس کے رب (یعنی کسریٰ) کو آج رات قتل کر دیا ہے۔"

چنانچہ بانوَیہ اور اُس کا ساتھی واپس لَوٹ گئے اور باذان کے پاس جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا۔ باذان نے کہا جو بات یہ شخص کہتا ہے اگر وہ اُسی طرح ہو جائے تو پھر وہ واقعی خدا کا نبی ہوگا۔ چنانچہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ باذان کو خسرو پرویز کے بیٹے شیروَیہ کا ایک خط پہنچا جس میں لکھا تھا کہ "مَیں نے ملکی مفاد کے ماتحت اپنے باپ خسرو پرویز کو جس کا رویہ ظالمانہ تھا اور جو اپنے مُلک کے شرفاء کو بے دریغ قتل کرتا جا رہا تھا قتل کر دیا ہے۔ پس جب تمہیں میرا یہ خط پہنچے تو میرے نام پر اپنے علاقہ کے لوگوں سے اطاعت کا عہد لو۔ اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے باپ نے تمہیں عرب کے ایک شخص کے متعلق ایک حُکم بھیجا تھا اُسے اب منسوخ سمجھو اور میرے دوسرے حُکم کا انتظار کرو۔" جب باذان کو نئے کسریٰ شیروَیہ بن خسرو کا یہ فرمان پہنچا تو اس نے بے اختیار ہو کر کہا کہ پھر تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سچی نکلی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کے برحق رسول ہیں۔ اور مَیں اُن پر ایمان لاتا ہوں۔ چنانچہ اُس نے اُسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت کا خط لکھدیا اور اس کے ساتھ یمن کے کئی اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے[1] اور روایت آتی ہے کہ خسرو پرویز اُسی رات

---

[1] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۷۲ تا صفحہ ۱۵۷۴ و تاریخ خمیس

قتل ہوا تھا جس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے متعلق خدا سے اطلاع پائی تھی۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ قیصر و کسریٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوں کے ساتھ جو جو سلوک کیا اُسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے بھی اُن سے معاملہ کیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پھاڑ کر پھینک دینے کی وجہ سے کسریٰ کی بھاری سلطنت چند سال کے اندر ریزہ ریزہ کر دی گئی وہاں قیصر کی طرف سے آپؐ کے خط کے ساتھ مؤدبانہ رویہ رکھنے پر خدا تعالیٰ نے اُس کی نسل کو کافی لمبی مہلت دی اور اُس کے خاندان نے سینکڑوں سال حکومت کی۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب قیصر کا ایک تنوخی سفیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تو آپؐ نے اُسے یہ الفاظ فرمائے کہ:۔

"مَیں نے کسریٰ کو ایک خط لکھا مگر اُس نے اُسے پھاڑ دیا۔ اس کی وجہ سے مَیں یقین رکھتا ہوں کہ خدا اُسے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا اور اُس کی سلطنت جلد تباہ ہو کر رہے گی۔ مگر اس کے مقابل پر مَیں نے ایک خط تمہارے آقا قیصر کو بھی لکھا اور اُس نے اُس کے متعلق ادب کا رویہ اختیار کیا اور اُسے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ مَیں اُمید کرتا ہوں کہ جب تک اُن میں نیکی کا مادہ ہے خُدا اُس کے خاندان کی کچھ نہ کچھ طاقت ضرور قائم رکھے گا۔"[1]

تاریخ کے اوراق بتلاتے ہیں کہ بعینہٖ یہی ان دونوں حکومتوں کے ساتھ خدا کا سلوک ہوا بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے اِن دو خطوں کے علاوہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جو تبلیغی خطوط ان ایام میں لکھے اور ان خطوں کے پہنچنے پر مکتوب الیہم نے جو جو رویہ اختیار کیا اُسی کے مطابق خدائے حکیم و قدیر نے اُن کے ساتھ سلوک کیا۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی ایک بھاری دلیل ہے۔

کسریٰ والے خط کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ جہاں قدیم مؤرخین نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ خسرو پرویز نے جو حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یمن کے والی کے نام جاری کیا تھا اس کا سبب وہ خط تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے بھجوایا وہاں بعض جدید محققین نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط لکھنے کا واقعہ بعد کا ہے اور خسرو پرویز کا حکم یہودی پراپیگنڈے کی وجہ سے اِس سے پہلے جاری ہو چکا تھا۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی خط خسرو پرویز کے نام لکھا گیا تھا یا اُس کے بیٹے شیرَویہ کے نام؟ مَیں نے اِس جگہ معروف خیال کی اتباع کی ہے یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۲

کا خط خسرو پرویز کے نام تھا اور اس نے آپؐ کے خلاف احکام جاری کئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ دراصل میرے پاس اس وقت لاہور میں ان کتابوں کا پورا ذخیرہ موجود نہیں ہے جن کا مطالعہ اس قسم کے سوال کی کامل تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے فی الحال معروف خیال درج کر دیا گیا ہے اور یہ اختلاف بھی ایسا نہیں ہے کہ جو زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔ اگر خدا نے چاہا تو بصورت ضرورت بعد میں اصلاح کی جاسکے گی۔

مقوقس مصر کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا خط مقوقس والئ مصر کے نام تھا جو قیصر کے ماتحت مصر اور اسکندریہ کا والی یعنی موروثی حاکم تھا اور قیصر کی طرح مسیحی مذہب کا پیرو تھا۔ اس کا ذاتی نام جُریج بن مینا تھا اور وہ اور اس کی رعایا قبطی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خط آپؐ نے اپنے ایک بدری صحابی حاطب بن ابی بلتعہ کے ہاتھ بھجوایا اور اس خط کے الفاظ یہ تھے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلَى الْمُقَوْقِسِ عَظِيْمِ الْقِبْطِ۔ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ۔ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْقِبْطِ۔ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ[1]

یعنی "میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں جو بے مانگے رحم کرنے والا اور اعمال کا بہترین بدلہ دینے والا ہے۔ یہ خط محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے قبطیوں کے رئیس مقوقس کے نام ہے۔ سلامتی ہو اُس شخص پر جو ہدایت کو قبول کرتا ہے اس کے بعد اے والئ مصر! میں آپ کو اسلام کی ہدایت کی طرف بلاتا ہوں۔ مسلمان ہو کر خدا کی سلامتی کو قبول کیجئے کہ اب صرف یہی نجات کا رستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دوہرا اجر دیگا، لیکن اگر آپ نے روگردانی کی تو (علاوہ خود آپ کے اپنے گناہ کے) قبطیوں کا گناہ بھی آپ کی گردن پر ہوگا۔ اور اے اہلِ کتاب اِس کلمہ کی طرف تو آجاؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان مشترک ہے یعنی ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی صورت

---

[1] زرقانی و مواہب اللدنیہ

میں خدا کا کوئی شریک نہ ٹھہرائیں اور خُدا کو چھوڑ کر اپنے میں سے ہی کسی کو اپنا آقا اور حاجت روا نہ گردانیں۔ پھر اگر ان لوگوں نے رُوگردانی کی تو اُن سے کہدو کہ گواہ رہو کہ ہم تو بہرحال خُدائے واحد کے فرمانبردار بندے ہیں۔"

جب حاطبؓ بن ابی بلتعہ اسکندریہ میں پہنچے تو مقوقس کے حاجب یعنی دربان سے مل کر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پیش کیا۔ مقوقس نے خط پڑھا اور پھر حاطبؓ بن ابی بلتعہ سے مخاطب ہو کر نیم مذاقیہ رنگ میں کہا کہ اگر تمہارا یہ صاحب واقعی خدا کا نبی ہے تو (اِس خط کے بھجوانے کی بجائے) اُس نے میرے خلاف خدا سے یہ دُعا ہی کیوں نہ کی کہ خدا اُسے مجھ پر مسلط کر دے۔ حاطبؓ نے جواب دیا کہ اگر یہ اعتراض درست ہے تو وہ حضرت عیسٰیؑ پر بھی پڑتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے مخالفوں کے خلاف اِس قسم کی دُعا کیوں نہیں کی۔ پھر حاطبؓ نے مقوقس کو ازراہِ نصیحت کہا کہ آپ (سنجیدگی کے ساتھ) غور فرمائیں کیونکہ اس سے پہلے آپ کے اِسی مُلک مصر میں ایک ایسا شخص (فرعون) گذر چکا ہے جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہی ساری دنیا کا ربّ اور حاکم اعلیٰ ہے۔ جس پر خدا نے اُسے ایسا پکڑا کہ وہ اگلوں اور پچھلوں کے لیے عبرت بن گیا۔ پس مَیں آپ سے مخلصانہ طور پر عرض کروں گا کہ آپ دوسروں کے حالات سے عبرت پکڑیں اور ایسے نہ بنیں کہ دوسرے لوگ آپ کے حالات سے عبرت پکڑیں۔ مقوقس نے کہا بات یہ ہے کہ ہمیں پہلے سے ایک دین حاصل ہے اس لیے جب تک ہمیں اس سے کوئی بہتر دین نہ ملے ہم اِسے نہیں چھوڑ سکتے۔ حاطبؓ نے جواب دیا کہ اسلام وہ دین ہے جو سب دوسرے دینوں سے غنی کر دیتا ہے لیکن وہ یقیناً آپ کو اس بات سے نہیں روکتا کہ آپ حضرت مسیح ناصری پر بھی ایمان لائیں بلکہ وہ سب سچے نبیوں پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے۔ اور جس طرح حضرت موسیٰؑ نے حضرت عیسٰیؑ کی بشارت دی تھی اسی طرح حضرت عیسٰیؑ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت بھی دی ہے۔ اِس پر مقوقس کچھ سوچ میں پڑ کر خاموش ہو گیا مگر اس کے بعد ایک دوسری مجلس میں جبکہ بعض بڑے بڑے پادری بھی موجود تھے مقوقس نے حاطبؓ سے پھر کہا۔ مَیں نے سُنا ہے کہ تمہارے نبی اپنے وطن سے نکالے گئے تھے اُنہوں نے اس موقع پر اپنے نکالنے والوں کے خلاف بددعا کیوں نہ کی تاکہ وہ ہلاک کر دیئے جاتے؟ حاطبؓ نے جواب دیا کہ ہمارے نبی تو صرف وطن سے نکلنے پر مجبور ہوئے مگر آپ کے مسیح کو تو یہودیوں نے پکڑ کر صُولی کے ذریعہ ختم ہی کر دینا چاہا مگر پھر بھی وہ اپنے مخالفوں کے خلاف بددُعا کر کے انہیں ہلاک نہ کر سکے۔ مقوقس نے متاثر ہو کر کہا "تم بیشک ایک دانا انسان ہو اور ایک دانا انسان کی طرف سے سفیر بنکر آئے ہو۔" اس کے بعد کہنے لگا۔ مَیں نے تمہارے نبی کے معاملہ میں غور کیا ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ اُنہوں نے واقعی کسی بُری بات کی تعلیم نہیں دی اور نہ کسی اچھی بات سے روکا ہے۔ پھر اس نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ایک ہاتھی دانت کی ڈبیہ میں رکھکر اُس پر اپنی مُہر لگائی اور اُسے حفاظت کے لیے اپنے گھر کی ایک معتبر لڑکی کے سُپرد کر دیا[1]

اِس کے بعد مقوقس نے اپنے ایک عربی دان کاتب کو بُلایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مندرجہ ذیل خط املاء کرا کے حاطبؓ کے حوالہ کیا۔ اس خط کی عبارت یہ تھی:-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ[2] لِمُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ مِنَ الْمُقَوْقِسِ عَظِیْمِ الْقِبْطِ۔ سَلَامٌ عَلَیْكَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَرَأْتُ كِتَابَكَ وَفَهِمْتُ مَا ذَكَرْتَ فِیْهِ وَمَا تَدْعُوْ اِلَیْهِ۔ وَقَدْ عَلِمْتُ اَنَّ نَبِیًّا قَدْ بَقِیَ وَكُنْتُ اَظُنُّ اَنْ یَّخْرُجَ مِنَ الشَّامِ۔ وَقَدْ اَكْرَمْتُ رَسُوْلَكَ وَبَعَثْتُ اِلَیْكَ بِجَارِیَتَیْنِ لَهُمَا مَكَانٌ مِنَ الْقِبْطِ عَظِیْمٌ وَكِسْوَةٌ وَاَهْدَیْتُ اِلَیْكَ بَغْلَةً لِتَرْكَبَهَا۔ وَالسَّلَامُ۔

یعنی "خدا کے نام کے ساتھ جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ خط محمدؐ بن عبداللہ کے نام قبطیوں کے رئیس مقوقس کی طرف سے ہے۔ آپ پر سلامتی ہو۔ مَیں نے آپ کا خط اور آپ کے مفہوم کو سمجھا اور آپ کی دعوت پر غور کیا۔ مَیں یہ ضرور جانتا تھا کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے مگر مَیں خیال کرتا تھا کہ وہ ملک شام میں پیدا ہوگا (نہ کہ عرب میں) اور مَیں آپ کے سفیر کے ساتھ عزت سے پیش آیا ہوں اور مَیں اس کے ساتھ دو لڑکیاں بھجوا رہا ہوں جنہیں قبطی قوم میں بڑا درجہ حاصل ہے اور مَیں کچھ پارچات بھی بھجوا رہا ہوں اور آپ کی سواری کے لیے ایک خچّر بھی بھجوا رہا ہوں۔ والسلام۔"

اِس خط سے ظاہر ہے کہ مقوقس مصر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کے ساتھ عزت سے پیش آیا اور اُس نے آپؐ کے دعویٰ میں ایک حد تک دلچسپی بھی لی مگر بہر حال اُس نے اسلام قبول نہیں کیا اور دوسری روایتوں سے پتہ لگتا ہے کہ عیسائی مذہب پر ہی اُس کی وفات ہوئی[3] اس کی گفتگو کے انداز سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ بے شک مذہبی امور میں دلچسپی تو لیتا تھا مگر جو سنجیدگی اِن معاملہ میں ضروری ہے وہ اسے حاصل نہیں تھی۔ اس لیے اُس نے بظاہر مؤدّبانہ رنگ رکھتے ہوئے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ٹال دیا۔

جو دو لڑکیاں مقوقس نے بھجوائی تھیں اُن میں سے ایک کا نام ماریہ اور دوسری کا نام سیرین

---

[1] زرقانی و تاریخ خمیس۔ [2] معلوم ہوتا ہے کہ مقوقس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کی نقل میں بسم اللہ کے الفاظ لکھ دیئے ہونگے ورنہ ان میں اس کا رواج نہیں تھا۔ [3] تاریخ خمیس

تھا۔ اور یہ دونوں آپس میں بہنیں تھیں۔ اور جیسا کہ مقوقس نے اپنے خط میں لکھا تھا وہ قبطی قوم میں سے تھیں۔ اور یہ وہی قوم ہے جس سے خود مقوقس کا تعلق تھا۔ اور یہ لڑکیاں عام لوگوں میں سے نہیں تھیں بلکہ مقوقس کی اپنی تحریر کے مطابق "انہیں قبطی قوم میں بڑا درجہ حاصل تھا۔" دراصل معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں میں یہ پُرانا دستور تھا کہ اپنے ایسے معزز مہمانوں کو جن کے ساتھ وہ تعلقات بڑھانا چاہتے تھے رشتہ کے لیے اپنے خاندان یا اپنی قوم کی شریف لڑکیاں پیش کر دیتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ مصر میں تشریف لے گئے تو مصر کے رئیس نے اُنہیں بھی ایک شریف لڑکی (حضرت ہاجرہؓ) رشتہ کے لیے پیش کی تھی جو بعد میں حضرت اسماعیلؑ اور اُن کے ذریعہ بہت سے عرب قبیلوں کی ماں بنی[1]۔ بہرحال مقوقس کی بھجوائی ہوئی لڑکیوں کے مدینہ پہنچنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ کو تو خود اپنے عقد میں لے لیا اور اُن کی بہن سیرین کو عرب کے مشہور شاعر حسّان بن ثابت کے عقد میں دیدیا[2]۔ یہ ماریہ وہی مبارک خاتون ہیں جن کے بطن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم پیدا ہوتے[3] جو زمانۂ نبوّت کی گویا واحد اولاد تھی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی حاطب بن ابی بلتعہ کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئی تھیں[4]۔ جو خچر اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفہ میں آئی وہ سفید رنگ کی تھی اور اس کا نام دُلدل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اکثر سواری فرمایا کرتے تھے اور غزوۂ حنین میں بھی یہی خچر آپؐ کے نیچے تھی[5]۔

یہ سوال کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ کو زوجہ کے طور پر اپنے عقد میں لیا یا کہ صرف مِلکِ یمین کے رنگ میں اپنے عقد میں رکھا ایک اختلافی سوال ہے جس کی تفصیل میں ہمیں اس جگہ جانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال دو باتیں قطعی طور پر یقینی ہیں۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ کو شروع سے ہی پردہ کرایا[6] اور پردہ کے متعلق ثابت ہے کہ وہ صرف آزاد عورتیں اور ازواج ہی کرتی تھیں۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے بعد ایک یہودی رئیس کی بیٹی صفیہ کے ساتھ عقد کیا تو صحابہ میں اختلاف ہوا کہ کیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہیں یا کہ محض مِلکِ یمین۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں پردہ کرایا تو صحابہ نے سمجھ لیا کہ وہ زوجہ ہیں نہ کہ مِلکِ یمین[7]۔ دوسرے یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی ذاتی غلام نہیں رکھا بلکہ جو لونڈی یا غلام بھی آپؐ کے قبضہ میں آیا آپؐ نے اُسے آزاد کر دیا[8]۔ اِس

---

[1] کتاب ہذا حصہ اوّل ٭ [2] زرقانی جلد ۳ حالات ماریہ قبطیہ و اسد الغابہ حالات ماریہ و سیرین ٭
[3] اسد الغابہ ٭ [4] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۷۲ ٭ [5] تاریخ الخمیس ٭ [6] ابن سعد بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۷۲
[7] بخاری بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۵۶، ۲۵۷ ٭ [8] کتاب ہذا حصہ دوم

لحاظ سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی کے طور پر اپنے پاس رکھنا بعید از قیاس اور نا قابلِ قبول ہے۔ واللہ اعلم۔ ویسے اگر لونڈیوں کے متعلق اسلامی تعلیم کا خلاصہ ملاحظہ کرنا ہو تو کتاب ہذا کے حصہ دوم کے صفحات ۴۱۷ تا ۴۲۲ مطالعہ کئے جائیں۔

مقوقس والے خط کے متعلق ایک خاص بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ کئی سو سال پردۂ خفا میں مستور رہنے کے بعد قریباً ایک سو سال ہوا کہ اپنی اصلی صورت میں دریافت ہو چکا ہے اور ہم اس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس متبرک خط کا فوٹو یعنی عکس درج کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ رسم خط میں کافی تبدیلی ہو جانے کے باوجود اس عکس کے اکثر الفاظ نظر غور کے ساتھ پڑھے جا سکتے ہیں اور وہ بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو ہم نے اسلامی کُتب کے حوالہ سے اُوپر درج کئے ہیں۔ یہ خط ۱۸۵۸ء میں بعض فرانسیسی سیاحوں کو مصر کی ایک خانقاہ میں ملا اور اب اصل خط قسطنطنیہ میں موجود ہے۔ اور اس کا فوٹو بھی شائع ہو چکا ہے[1] اس خط کا دریافت کرنے والا مسیو ایتین برتھیمی تھا اور غالباً سب سے پہلے اس کا فوٹو مصر کے مشہور جریدہ الہلال بابت نومبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا اور پھر پروفیسر مارگولیتھ نے بھی اپنی کتاب محمدؐ اینڈ دی رائز آف اسلام[2] میں اسے شائع کیا۔ اسی طرح وہ مصر کی ایک جدید تصنیف تاریخ الاسلام السیاسی مصنفہ الدکتور حسن بن ابراہیم استاذ التاریخ الاسلامی جامعہ مصریہ[3] میں بھی چھپ چکا ہے اور بہت سے غیر مسلم محققین نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ یہ وہی اصل خط ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس مصر کو لکھا تھا۔

ضمناً اس خط کی دریافت جس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف حدیث اور تاریخ اسلامی کی روایت کے عین مطابق ہے اس بات کا بھاری ثبوت مہیا کرتی ہے کہ معتبر جامعینِ حدیث اور محقق مؤرخینِ اسلام نے روایات کے جمع کرنے میں کتنی بھاری احتیاط اور کتنی عظیم الشان امانت و دیانت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے زبانی حافظہ کی بنا پر راویوں کے ایک لمبے سلسلہ کے ساتھ اس خط کی عبارت بیان کی اور بتایا کہ فلاں موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ان الفاظ کی تحریر مقوقس کو لکھی تھی اور پھر تیرہ سو سال کے طویل زمانہ کے بعد اصل خط کے دریافت ہونے پر یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گئی کہ جو روایت ان مسلمان محدثین اور مؤرخین نے بیان کی تھی وہ حرف بحرف درست تھی۔ اس سے بڑھ کر اسلامی روایات کی صحت اور محدثین کی دیانت و امانت کا کیا ثبوت ہوگا؟ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب راوی ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہیں کیونکہ یقیناً ان میں حافظہ یا سمجھ یا دیانت کے لحاظ سے بعض کمزور راوی بھی پائے جاتے تھے لیکن جو اچھے تھے اُن کا تاریخ عالم میں جواب نہیں۔

---

[1] ریویو آف ریلیجنز قادیان بابت ماہ اگست ۱۹۰۶ء [2] صفحہ ۳۶۴ [3] صفحہ ۱۹۸

كتاب النبي صلى الله عليه وسلم إلى المقوقس عظيم القبط بمصر

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللهِ وَرَسُوْلِهِ إِلَى الْمُقَوْقِسِ عَظِيْمِ الْقِبْطِ سَلَامٌ عَلَى

مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ

يُؤْتِيْكَ اللهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ إِثْمُ كُلِّ الْقِبْطِ وَمَجْمَعِ الْقِبْطِ

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ

إِلَّا اللهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللهِ

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ

مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ

نجاشی کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی خط

کتاب ہذا کے حصہ اوّل میں بر اعظم افریقہ کی عیسائی حکومت حبشہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس حکومت کے بادشاہ کا موروثی لقب نجاشی ہوا کرتا تھا۔ یہ بات بھی کتاب کے حصہ اوّل میں گذر چکی ہے کہ جب مکہ میں مسلمانوں کے خلاف قریش کے مظالم نے زور پکڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بہت سے صحابہ کو (جن میں بعض عورتیں بھی شامل تھیں) حبشہ بھجوا دیا تھا۔ اور باوجود قریش کے پیچھا کرنے اور نجاشی کو طرح طرح سے بہکانے کے نجاشی حق وانصاف کے رستہ پر قائم رہا اور مسلمان مہاجر ایک لمبے عرصہ تک اس کی حکومت میں امن وعافیت کے ساتھ رہتے رہے[1] یہ نجاشی جس کا نام اصحمہ تھا شروع سے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت مداح تھا اور آپؐ کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتا تھا اور آپؐ کے صحابہ کے ساتھ بھی اس کا سلوک صرف منصفانہ ہی نہیں تھا بلکہ حقیقۃً مربیانہ تھا۔ لیکن بہرحال وہ ابھی تک عمومی رنگ میں خوش عقیدہ ہونے کے باوجود مسلمان نہیں ہوا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صلح حدیبیہ کے بعد مختلف بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط لکھے تو اس موقع پر ایک خط اپنے صحابی عمروؓ بن امیہ ضمری کے ہاتھ نجاشی کے نام بھی لکھ کر بھجوایا۔ اس خط کی عبارت یہ تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلَى النَّجَاشِيِّ مَلِكِ الْحَبْشَةِ سَلِمْ اَنْتَ۔ اَمَّابَعْدُ فَاِنِّيْ اَحْمَدُ اِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ۔ وَاَشْهَدُ اَنَّ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رُوْحُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ الْبَتُوْلِ ..... وَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ اِلَى اللّٰهِ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَالْمُوَالَاةِ عَلٰى طَاعَتِهٖ وَاَنْ تَتَّبِعَنِيْ وَتُؤْمِنَ بِالَّذِيْ جَاءَنِيْ فَاِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ وَجُنُوْدَكَ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَقَدْ بَلَّغْتُ وَنَصَحْتُ فَاقْبَلُوْا نَصِيْحَتِيْ وَقَدْ بَعَثْتُ اِلَيْكَ ابْنَ عَمِّيْ جَعْفَرًا وَمَعَهٗ نَفَرٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى[2]

یعنی "میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں جو بن مانگے دینے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یہ خط اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام ہے اے بادشاہ! آپ پر خدا کی سلامتی ہو۔ اس کے بعد میں آپ کے سامنے اس خدا کی حمد

---

[1] کتاب ہذا حصہ اوّل صفحہ ۱۴۶ تا ۱۵۴ ۔ [2] ابن سعد و زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۳ و ۳۴۴

بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں۔ وہی زمین و آسمان کا حقیقی بادشاہ ہے جو تمام خوبیوں کا جامع اور تمام نقصوں سے پاک ہے۔ وہ مخلوق کو امن دینے والا اور دُنیا کی حفاظت کرنے والا ہے اور مَیں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ عیسیٰ ابن مریم خدا کے کلام کے ذریعہ مبعوث ہوتے اور اس کے حکم سے عالمِ وجود میں آتے جو اس نے مریم بتول پر نازل کیا تھا۔۔۔۔ اور اے بادشاہ! مَیں آپ کو خدائے واحد کی طرف بلاتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں اور مَیں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ خدا کی اطاعت میں میرے ساتھ تعاون کریں اور میری اتباع اختیار کرتے ہوئے اس کلام پر ایمان لائیں جو مجھ پر نازل ہوا ہے کیونکہ مَیں خُدا کا رسول ہوں اور اسی حیثیت میں آپ کو اور آپ کی رعایا کو خدا کی طرف بُلاتا ہوں۔ مَیں نے آپ کو اپنا پیغام پہنچا دیا ہے اور اخلاص اور ہمدردی کے ساتھ آپ کو صداقت کی طرف دعوت دی ہے۔ پس میرے اس اخلاص اور ہمدردی کو قبول کریں۔ مَیں (اس سے قبل) آپ کی طرف اپنے چچا زاد بھائی جعفر اور اُن کے ساتھ بعض دوسرے مسلمانوں کو بھجوا چکا ہوں۔ اور سلامتی ہو ہر اُس شخص پر جو خدا کی ہدایت کو اختیار کرتا ہے۔"

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خط نجاشی کو پہنچا تو اُس نے اُسے اپنی آنکھوں سے لگایا اور ادب کے طریق پر اپنے تخت سے نیچے اُتر آیا اور کہا کہ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ خدا کے رسول ہیں۔[۱] پھر اُس نے ایک ہاتھی دانت کی ڈبیہ منگوائی اور اُس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط محفوظ کرکے رکھدیا اور کہا میں یقین رکھتا ہوں کہ جب تک یہ خط ہمارے گھرانے میں محفوظ رہے گا، اہلِ حبشہ اس کی وجہ سے خیر اور برکت پاتے رہیں گے۔[۲] تاریخ الخمیس کا مصنف لکھتا ہے کہ یہ خط آج تک حبشہ کے شاہی خاندان میں محفوظ ہے۔

اس کے بعد نجاشی نے ذیل کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لکھا:-

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - اِلٰی مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ مِنَ النَّجَاشِیِّ اَصْحَمَۃَ سَلَامٌ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُ اللّٰہِ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الَّذِیْ ھَدَانِیْ لِلْاِسْلَامِ - اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ بَلَغَنِیْ کِتَابُکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَمَا ذَکَرْتَ مِنْ اَمْرِ عِیْسٰی فَوَ رَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ لَا یَزِیْدُ مَا ذَکَرْتَ تُفْرُوْقًا وَقَدْ عَرَفْنَا مَا بَعَثْتَ بِہٖ

---

[۱] ابن سعد و زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۶ [۲] تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۳۳، ۳۴ و زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۶

اِلَیۡنَا۔ فَاَشۡھَدُ اَنَّکَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَادِقًا مَصۡدُوۡقًا وَقَدۡ بَایَعۡتُکَ وَبَایَعۡتُ ابۡنَ عَمِّکَ وَاَسۡلَمۡتُ عَلٰی یَدَیۡہِ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ ...... وَالسَّلَامُ عَلَیۡکَ وَرَحۡمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ"۔[1]

یعنی "اللہ کے نام کے ساتھ جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ خط محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نجاشی اصحمہ کی طرف سے ہے۔ یا رسول اللہ آپ پر سلامتی ہو اور اُس خدا کی طرف سے برکتیں نازل ہوں جس کے سوا کوئی قابلِ پرستش نہیں۔ اور وہی ہے جس نے مجھے اسلام کی طرف ہدایت دی ہے اس کے بعد یا رسول اللہ آپ کا خط مجھے پہنچا۔ خدا کی قسم جو کچھ آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بیان کیا ہے مَیں اُنہیں اس سے ذرّہ بھر بھی زیادہ نہیں سمجھتا۔ اور ہم نے آپ کی دعوتِ حق کو سمجھ لیا ہے اور مَیں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خُدا کے سچے رسول ہیں جن کے متعلق پہلے صحیفوں میں بھی خبر دی گئی تھی۔ پس مَیں آپکے چچا زاد بھائی جعفر کے ذریعہ آپ کے ہاتھ پر خُدا کی خاطر بیعت کرتا ہوں ...... اور اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو آپ پر اور اُس کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خط نجاشی کو لکھا اور نجاشی نے اس کا جو جواب دیا ان دونوں میں ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے جو اُوپر کے کسی اَور خط میں نظر نہیں آتی۔ یعنی ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کے الفاظ اس اُمید سے معمور نظر آتے ہیں کہ انشاء اللہ آپؐ کی تبلیغ سے نجاشی ضرور مسلمان ہو جائے گا اور دوسری طرف نجاشی کا خط اس حقیقت کا حامل ہے کہ گویا اُس کی رُوح پہلے سے صداقت کے قبول کرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ بہرحال خدا تعالیٰ نے نجاشی کو اسلام کی توفیق عطا کی۔ اور یہ وہی نجاشی ہے جو ۹ سنہ ہجری میں فوت ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے یہ فرماتے ہوئے اُس کی نمازِ جنازہ ادا کی کہ تمہارا ایک صالح بھائی نجاشی حبشہ میں فوت ہوگیا ہے۔ آؤ ہم سب مل کر اُس کی رُوح کے لیے دُعا کریں۔[2]

جو نجاشی اِس نجاشی کی وفات کے بعد حبشہ کے تخت پر بیٹھا اُس کا نام روایات میں محفوظ نہیں ہے مگر تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے بھی ایک تبلیغی خط لکھا تھا مگر بدقسمتی سے اُس نے آپؐ کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور مسیحی مذہب پر ہی فوت ہوا۔[3] غالباً یہی وجہ ہے کہ حبشہ میں اسلام زیادہ پھیل نہیں سکا۔

اس جگہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ چونکہ یکے بعد دیگرے دو نجاشیوں کو تبلیغی خط لکھے گئے

---

[1] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۴، ۳۴۵ : [2] بخاری و مسلم نیز زرقانی۔ [3] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۶ نیز صفحہ ۳۶۶

تھے یعنی ایک خط تو اصحمہ نامی نجاشی کو لکھا گیا جس کے پاس ابتدائی صحابہ پناہ لینے کی غرض سے ہجرت کر کے گئے تھے اور جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ملنے پر اسلام قبول کیا اور اسلام پر ہی ۹ سنہ ہجری میں وفات پائی۔ اور دوسرا خط اس کے بعد آنے والے نجاشی کو لکھا گیا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ اور کفر کی حالت میں ہی فوت ہوا۔ اس لیے بعض مؤرخین کو اس معاملہ میں غلطی لگ گئی ہے اور انہوں نے دونوں نجاشیوں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علیٰحدہ علیٰحدہ زمانوں میں دو علیٰحدہ نجاشیوں کو خط لکھے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کی صریح روایت آتی ہے کہ جس نجاشی کو بعد والا خط لکھا گیا وہ اس نجاشی کے علاوہ تھا جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھی تھی[1] اور زرقانی اور تاریخ خمیس نے بھی اس معاملہ میں مفصل بحث کر کے دونوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ ثابت کیا ہے[2]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے نجاشی کو تبلیغی خط ارسال کیا جس پر وہ مسلمان ہو گیا تو اُسی وقت آپؐ نے اُس کے نام ایک دوسرا خط پرائیویٹ مضمون کا بھی لکھا تھا۔ اس خط میں آپؐ نے نجاشی کو دو باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ایک یہ کہ وہ ابوسفیان کی بیٹی اُمّ حبیبہ کے ساتھ آپ کا غائبانہ نکاح پڑھ دے اور دوسرے یہ کہ حضرت جعفر بن ابی طالب[3] اور اُن کے ساتھیوں کو جنہیں حبشہ میں گئے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اپنے انتظام میں عرب واپس بھجوا دے۔ نجاشی نے اِن دونوں باتوں کی تعمیل کی۔ یعنی اولاً اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُمّ حبیبہ کے نکاح کا اعلان کیا اور پھر حضرت جعفر اور اُن کے ساتھیوں کے لیے کشتی کا انتظام کر کے انہیں عرب میں واپس بھجوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر کی فتح سے واپس آ رہے تھے اور روایت آتی ہے کہ آپؐ حضرت جعفر سے مل کر اتنے خوش ہوتے کہ فرمایا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے خیبر کی فتح سے زیادہ خوشی ہوئی ہے یا کہ جعفر اور اُس کے ساتھیوں کی آمد سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ حضرت جعفر کی زندگی نے زیادہ وفا نہیں کی اور وہ اِس کے تھوڑا عرصہ بعد ہی غزوہ موتہ میں شہید ہو گئے[4]

اُمّ حبیبہ جن کی اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شادی ہوئی وہ مکہ کے رئیس اعظم ابوسفیان بن حرب کی بیٹی اور امیر معاویہ کی بہن تھیں۔ وہ ابتدائی مسلمانوں میں سے تھیں اور ان کے خاوند عبیداللہ بن حجش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے جو حبشہ میں ہی وفات

---

[1] صحیح مسلم ؛ [2] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۴۳ نیز صفحہ ۳۶۶ و تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۳۳، ۳۴

[3] حضرت علیؓ کے بڑے بھائی۔ [4] بخاری حالات غزوۂ موتہ و اسد الغابہ و طبری و زرقانی

پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب خیال کیا کہ اُمّ حبیبہ کو اپنے عقد میں لے لیں جس میں غالباً یہ دوہری غرض تھی کہ ایک تو اس طرح شاید ابوسفیان کو اسلام کی طرف مائل کیا جا سکے اور دوسرے تا اُمّ حبیبہ کی جو آپ کے پھوپھی زاد بھائی کی بیوہ تھیں دلداری ہو جاتی۔ اُمّ حبیبہ جن کا نام رملہ تھا ۴۴ سنہ ہجری میں فوت ہوئیں۔ نکاح پڑھنے سے پہلے نجاشی نے اُمّ حبیبہ کو پیغام بھیج کر ان کی باقاعدہ اجازت لی اور پھر اُن کی طرف سے اُن کے ایک قریبی عزیز خالد بن سعید نے ولی بن کر چار سو دینار پر نکاح منظور کیا۔[1] اگر اس موقع پر اسلام کے مسئلہ تعدد ازدواج پر بحث دیکھنی ہو تو کتاب ہذا حصہ دوم صفحہ ۴۴۲ تا ۴۴۶ ملاحظہ کئے جائیں۔

گو دوسرے نجاشی نے جو غالباً ۹ سنہ ہجری میں تخت نشین ہوا اسلام قبول نہیں کیا، لیکن چونکہ پہلا نجاشی مسلمان ہو گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ایک لمبے عرصہ تک حبشہ میں پناہ لیکر امن و عافیت کی زندگی پائی تھی اس لیے مسلمانوں نے اس مُلک کے احسان کا یہ بدلہ دیا کہ جہاں دُنیا کے چاروں کونوں میں اُن کی فاتحانہ یلغار نے اسلام کی حکومت کا جھنڈا گاڑا وہاں اُنہوں نے حبشہ کے خلاف کبھی فوج کشی نہیں کی۔ اُن کی تلوار شمال میں بھی چلی اور جنوب میں بھی چلی اور پھر مشرق میں بھی چلی اور مغرب میں بھی چلی اور چین اور راس کماری کی حد سے لے کر مراکش اور سپین کے آخری کناروں تک مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے رُوئے زمین کو ہلا دیا اور قیصر و کسریٰ جیسے عظیم الشان بادشاہ اُن کے سامنے ریت کے تودوں کی طرح گِر گِر کر پیوست خاک ہو گئے مگر فتح کے اس عالمگیر سیلاب میں بھی اگر مسلمانوں کی تلوار کسی مُلک کے خلاف نہیں اُٹھی تو وہ یہی حبشہ کی چھوٹی سی ریاست تھی۔ اس کے چاروں طرف کا علاقہ مسلمانوں کے ماتحت آ چکا تھا مگر جب وہ حبشہ کے قریب پہنچتے تھے تو ہمیشہ کترا کر اِدھر اُدھر سے گذر جاتے رہے اور اس کے خلاف کبھی انگلی تک نہیں اُٹھائی۔ اس کی تہ میں یہی اعلیٰ اخلاقی جذبہ کام کر رہا تھا کہ وہ اپنی انتہائی فتح کے زمانہ میں سینکڑوں سال گذر جانے کے بعد بھی اِس چھوٹے سے احسان کو نہیں بھولنا چاہتے تھے جو حبشہ کے نجاشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابیوں کو پناہ دیکر ابتدائی مسلمانوں پر کیا تھا۔ یہ ایک بہت بھاری اخلاقی نکتہ ہے جس سے دُنیا کی قومیں سبق حاصل کر سکتی ہیں۔

رئیس غسّان کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط

پانچواں تبلیغی خط ریاست غسان کے فرمانروا حارث بن ابی شمر کے نام لکھا گیا۔ یہ وہی حارث ہے جس کا ذکر قیصر والے خط کے تعلق میں بھی آ چکا ہے۔ غسان کی ریاست عرب کے ساتھ متصل جانب

---

[1] ابن سعد و زرقانی و اسد الغابہ

شمال واقع تھی اور اس کا رئیس قیصر کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خط اپنے صحابی شجاع بن وہب کے ہاتھ روانہ فرمایا اور آپؐ نے اپنے اس خط میں حارث کو اسلام کی دعوت دی اور ساتھ ہی لکھا کہ اگر آپ اسلام قبول کریں گے تو آپ کی حکومت کو لمبی زندگی حاصل ہوگی۔ حارث اس وقت قیصر کی فتح کے جشن کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ حارث سے ملنے سے پہلے شجاع بن وہب اُس کے دربان یعنی مہتمم ملاقات سے ملے۔ وہ ایک اچھا آدمی تھا اور اُس نے شجاع کی زبانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سُنکر فی الجملہ اُن کی تصدیق کی مگر شجاع کو بتایا کہ اُسے حارث سے چنداں اُمید نہیں رکھنی چاہیئے کیونکہ وہ قیصر سے ڈرتا ہے اور اُس کی منظوری کے بغیر کچھ نہیں کرے گا۔ چند دن کے انتظار کے بعد شجاع بن وہب کو رئیس غسان کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور اُنہوں نے اُس کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پیش کیا۔ حارث نے خط پڑھ کر غصہ میں پھینک دیا اور کہنے لگا۔ مجھ سے میرا ملک چھیننے کی کون طاقت رکھتا ہے۔ بلکہ میں خود اس مُدّعی کے خلاف فوج کشی کروں گا اور اگر مجھے یمن تک بھی جانا پڑے تو اُسے پکڑ کر لاؤں گا اور اُس نے اپنے سواروں کے دستے کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اور دوسری طرف قیصر کو خط لکھا کہ مجھے حجاز کے مُدّعی نے اس قسم کا خط لکھا ہے اور میں اس کے خلاف فوج کشی کرنے لگا ہوں۔ اِس خط کا جواب قیصر نے یہ دیا کہ فوج کشی نہ کرو اور مجھے آکر دربار کی شرکت کے لیے ایلیا یعنی بیت المقدس میں ملو[1] اس کے بعد ایلیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر دحیہ کلبی کے ساتھ جو گذری اُس کا ذکر قیصر والے خط کے بیان میں کیا جا چکا ہے اور رئیس غسان والا قصہ یہیں ختم ہوگیا۔ اور وہ مسلمان نہیں ہوا[2] البتہ حدیث اور تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ مدینہ میں ایک عرصہ تک اِس بات کا خوف رہا کہ غسانی قبائل مسلمانوں کے خلاف کب حملہ کرتے ہیں[3]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کچھ عرصہ بعد حارث بن ابی شمر کا جانشین جبلہ بن ایہم جو ریاست غسان کا آخری فرمانروا تھا مسلمان ہوگیا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مدینہ میں بھی آکر رہا۔ مگر جب اُس نے ایک غریب مسلمان کو تھپڑ مار دیا اور اس پر حضرت عمرؓ نے اُسے ڈانٹا کہ حقوق کے معاملہ میں سب مسلمان برابر ہیں تم سے اِس کا بدلہ لیا جائے گا تو وہ زمانۂ جاہلیت والے تکبّر میں مبتلا ہو کر یہ کہتا ہوا بھاگ گیا کہ کیا میں اور ایک عام مسلمان برابر ہو سکتے ہیں؟ اور پھر اسی ارتداد کی حالت میں اُس کی وفات ہوئی[4]

---

[1] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۵۷ و تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۴۳۔ [2] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۶۶

[3] بخاری کتاب النکاح باب مَوْعِظَةُ الرَّجُلِ ابْنَتَهُ لِحَالِ زَوْجِهَا۔

[4] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۴۳، ۶۷

رئیس یمامہ کے نام آنحضرت ﷺ کا خط

چھٹا تبلیغی خط یمامہ کے رئیس ہوذہ بن علی کے نام بھجوایا گیا۔ اس خط کو لے جانے والے سلیط بن عمرو قرشی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خط میں ہوذہ کو اسلام کی دعوت دی مگر ہوذہ ایک متکبر مزاج انسان اور دُنیا کا بندہ تھا اُس نے بظاہر سلیط بن عمرو کی بڑی آؤ بھگت کی مگر جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہلا بھیجا کہ میرا عربوں میں بڑا مقام ہے (غالباً مراد یہ تھی کہ میرا وجود آپ کے سلسلہ کے لیے بہت مفید ہوسکتا ہے) آپ اگر میرے لیے وصیت کر جائیں کہ کچھ حکومت کا حصّہ آپ کے بعد مجھے بھی مل جائے تو میں مسلمان ہوسکتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خط پڑھ کر غصّہ سے فرمایا کہ "(یہ تو خدا کی چیز ہے) اگر ہوذہ مجھ سے کھجور کا ایک کچا دانہ بھی مانگے تو میں اسے نہیں دوں گا۔" اس کے بعد ہوذہ بن علی فتح مکہ کے بعد کفر کی حالت ہی میں مر گیا۔ اور جب آپؐ کو ہوذہ کی موت کی اطلاع پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ یمامہ کے علاقہ میں عنقریب ایک جھوٹا نبی پیدا ہوگا جو میری وفات کے بعد قتل کیا جائے گا۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ اُسے کون قتل کرے گا؟ آپؐ نے فرمایا۔ تم اور تمہارے ساتھی اور کون؟ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی مسیلمہ کذاب کے ظہور میں پوری ہوئی جو مسلمانوں کے خلاف بعض خونریز لڑائیاں لڑنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں ہلاک ہوا[1]

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمامہ کی طرف سلیط بن عمرو کو بھجواتے ہوئے اُن کے سپرد دو تبلیغی خط کئے تھے۔ ایک ہوذہ کے نام اور دوسرا ثمامہ بن اثال کے نام۔ مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ اسی کتاب میں دوسری جگہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ثمامہ اس سے پہلے ایک سریہ میں قید ہوکر مدینہ میں مسلمان ہو چکے تھے۔ پس اگر اس موقع پر ثمامہ کو کوئی خط لکھا گیا تو یقیناً وہ تبلیغ کا خط نہیں ہوگا بلکہ اس تحریک کے لیے ہوگا کہ وہ آپؐ کے خط کو ہوذہ تک پہنچانے اور اُسے تبلیغ کرنے میں سلیط بن عمرو کی امداد کرے۔ یہی وہ تشریح ہے جو علامہ زرقانی نے اس اختلاف کی کی ہے[2]

اُوپر کے چھ تبلیغی خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صُلح حدیبیہ کے معاً بعد بعض روایتوں کے مطابق ایک ہی دن میں اور دوسری روایتوں کے مطابق اُوپر تلے لکھ کر بھجوائے تھے[3] ان کے بعد جو خط لکھے گئے وہ کچھ وقفہ کے بعد لکھے گئے تھے اور ہم انہیں انشاء اللہ اپنے موقع پر بیان کریں گے۔

---

[1] زرقانی جلد ۳ و تاریخ خمیس جلد ۲ ؛ [2] دیکھو زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۶۶، ۳۶۷

[3] ملاحظہ ہو ابن سعد و طبری و زرقانی

اوپر کے چھ تبلیغی خطوط سے اِس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ صُلح ہوتے ہی اپنی پہلی فرصت میں کس درجہ مستعدی اور انہماک کے ساتھ تبلیغ کا فرض ادا کیا۔ گویا آپؐ نے ایک آن واحد میں عرب کے چاروں اطراف میں اسلام کا بیج بکھیر دیا۔ آپؐ کے اِس فعل سے آپ کے اُس قول پر بھاری روشنی پڑتی ہے جو آپؐ نے ایک جنگی مہم سے واپسی پر فرمایا کہ :-

رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ[1]

یعنی "اب ہم تلوار کے چھوٹے جہاد سے تبلیغ و عبادت کے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں۔"

حق یہ ہے کہ آپؐ کی زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ دین اور خدمتِ خلق میں خرچ ہوتا تھا اور حالات کے ماتحت جس جس قسم کے کام کی ضرورت پیش آتی تھی آپؐ کی رُوح اس کی طرف اِس طرح لپکتی تھی جس طرح ایک محبّت کے جذبات سے بھری ہوئی ماں اپنے کھوئے ہوتے بچے کے دوبارہ پانے پر اُس کی طرف لپکتی ہے۔ دُنیا آپؐ کے لیے ایک سفر کی منزل سے زیادہ نہیں تھی اور اپنے آسمانی آقا کی خدمت اور اُس کی عبادت اور اُس میں ہو کر مخلوق کی محبت سب کچھ تھی۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

بعض متفرق واقعات جُوئے اور شطرنج کی ممانعت

جو تبلیغی خطوط آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی طرف سے مختلف بادشاہوں کے نام لکھے گئے اُن کے لکھے جانے کی تاریخ کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے یعنی بعض روایات میں ان کی تاریخ ذوالحجہ ۶ہجری بیان ہوئی ہے اور بعض میں محرم ۷ھ ہجری بیان ہوئی ہے مگر بہرحال اِس بات میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ یہ چھ تبلیغی خط جو اُوپر درج کئے گئے ہیں صُلح حُدیبیہ کے معاً بعد لکھے گئے اس لیے مَیں نے اُنہیں ۶ھ ہجری کے واقعات میں درج کر دیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اتنے دُور دراز کے سفروں پر ایلچیوں کا جانا اور پھر جواب لیکر وہاں سے واپس آنا لازماً کافی وقت چاہتا تھا اس لیے خواہ یہ خطوط ۶ھ کے آخر میں لکھے گئے ہوں یا ۷ھ کے شروع میں بہرحال ان کے جوابات ۷ھ میں موصول ہوئے، لیکن سارے متعلقہ حالات کو ایک جگہ بیان کرنے کے خیال سے مَیں نے اِن خطوط کو ۶ھ کے واقعات میں درج کر دیا ہے۔

اِسی سال میں یعنی ۶ھ ہجری کے دَوران میں حضرت عائشہؓ کی والدہ اُمّ رومان کی وفات ہوئی

---

[1] بیہقی۔ نیز دیکھو سورۃ الفرقان آیت ۵۳

اُمِّ رومان جن کا نام زینب تھا[1] پہلے عبداللہ بن منجرہ کے نکاح میں تھیں اور عبداللہ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے نکاح میں آئیں اور اُنہیں کے بطن سے عبدالرحمٰن بن ابوبکر اور حضرت عائشہؓ پیدا ہوئے[2] اُمِّ رومان ایک بہت نیک مگر سادہ مزاج عورت تھیں، لیکن حضرت ابوبکر خلیفہ اوّلؓ کی بیوی اور حضرت عائشہؓ کی ماں ہونے کی وجہ سے اُنہیں تاریخ اسلام میں جو امتیاز حاصل ہوا ہے وہ کسی بیان کا محتاج نہیں۔ جب وہ قبر میں اُتاری جارہی تھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے جنت کی کوئی حُور دیکھنی ہو وہ اُمِّ رومان کو دیکھ لے"۔[3] یہ ایک بہت سادہ سا فقرہ ہے مگر اس سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جنت کی حُوروں سے مراد نازو ادا والی خوبصورت لڑکیاں نہیں تھیں جو عالمِ آخرت میں پیدا کی جا کر مومنوں کے ساتھ جنت میں رکھی جائیں گی بلکہ اس سے مُراد دُنیا کی اُن پاک عورتوں کی رُوحیں ہیں جو جنت میں نیک لوگوں کی رفیق بنیں گی اور گو جنت میں ہر روح زندگی کے کمال کی حالت میں جوان بنا کر داخل کی جاتے گی[4] مگر بہرحال اس سے ظاہر ہے کہ جنت کی جنسی رفاقت روحانی ہوگی نہ کہ جسمانی۔

شراب کی حُرمت بھی بعض لوگوں کے نزدیک ۶ ہجری میں ہوئی، لیکن جیسا کہ ہم اس کتاب کے حصّہ دوم میں بیان کر چکے ہیں ہمارے نزدیک[5] اس کی حُرمت غزوۂ اُحد کے بعد ۳ ہجری کے آخر یا ۴ ہجری کے شروع میں ہوئی تھی۔ اور یہی اکثر مسلمان محققین کا خیال ہے۔ عقلاً بھی میرے نزدیک شراب جیسی گندی چیز جو کئی دوسری بدیوں کی ماں ہے اس کی حُرمت میں ہجرت کے بعد زیادہ دیر نہیں لگی ہوگی۔[6] شراب کی حُرمت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنی تاکید فرماتے تھے کہ فرمایا کرتے تھے کہ جس دسترخوان (یا میز) پر کوئی اور شخص شراب پی رہا ہو تمہیں اُس دسترخوان پر بھی نہیں بیٹھنا چاہیئے۔[7]

اسی سال بعض اقوال کے مطابق جُوا بھی حرام کیا گیا۔ جُوئے سے مُراد اتفاق کی کھیل ہے جس میں آمدنی کی بنیاد محنت یا ہُنر پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ محض اتفاقی حالات پر مبنی ہوتی ہے اور چونکہ ایسی آمد میں وقت لگانا کیریکٹر کی تباہی کے علاوہ مُلکی دولت کے توازن کو بھی برباد کرنے کا موجب ہوتا ہے اس لیے اسلامی شریعت نے کمال دانشمندی کے ساتھ جُوا بھی حرام قرار دیا ہے[8] بیشک جلد باز انسان

---

[1] زرقانی جلد ۳ حالات حضرت عائشہؓ۔ [2] تاریخ خمیس حالات ۶ھ۔ [3] تاریخ کبیر مصنفہ امام بخاریؒ بحوالہ زرقانی حالات حضرت عائشہؓ و ابن سعد بحوالہ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۳۹۔ [4] سورۃ الواقعہ آیت ۲۳، ۲۴ و ترمذی

[5] ملاحظہ ہو کتاب ہذا حصّہ دوم صفحہ ۵۰۹ تا صفحہ ۵۱۱ [6] ابو داؤد کتاب ۲۶ باب ۱۸ و مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۲۰

[7] سورۃ المائدۃ آیت ۹۱۔ نیز تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۳۰

آزادی کی رَو میں بہہ کر ہر قسم کی پابندی سے گھبراتا ہے لیکن اِس میں ذرہ بھر بھی شُبہ نہیں کہ جو پابندیاں اسلام نے مسلمانوں پر لگائی ہیں وہ سراسر اُن کے اپنے فائدہ کے لیے ہیں اور جُوئے کی حُرمت بھی اِسی اُصول کے ماتحت آتی ہے۔[1]

اِسی سال شطرنج کی کھیل بھی ممنوع قرار دی گئی ہے[2] کیونکہ ایک تو وہ بالعموم جُوئے کا بہانہ بن جاتی ہے اور دوسرے اس میں اتنا انہماک پیدا ہوتا ہے کہ انسان زندگی کے مفید شعبوں کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسلام یقیناً انسان کو جائز تفریحوں سے نہیں روکتا لیکن وہ اِس بات سے ضرور روکتا ہے کہ انسان بالکل ہی شُتر بے مہار بن کر جو چاہے کرتا پھرے اور اپنی زندگی کے مفید پہلوؤں کو تباہ کر لے۔ اور چونکہ شطرنج کی کھیل اپنے اندر یہ دو بھاری نقصان کے پہلو رکھتی ہے یعنی ایک تو حد سے زیادہ انہماک جو شطرنج کے کھلاڑی کو گویا دُنیا و مافیہا سے غافل کر دیتا ہے اور دوسرے جُوئے کی طرف میلان کیونکہ شطرنج بھی اکثر جُوا لگا کر کھیلا جاتا ہے اس لیے کمال حکمت سے اسلام نے اس کھیل سے روک دیا ہے۔ دراصل اسلام کے فلسفہ شریعت میں صرف یہی بات داخل نہیں کہ جو چیز اپنی موجودہ صورت میں بُری ہے صرف اسی کو روکا جائے بلکہ یہ بات بھی داخل ہے کہ جو چیز خواہ وہ اپنی موجودہ صورت میں بُری نہ ہو لیکن اگر وہ عام حالات میں انسان کو بُرائی کی طرف کھینچتی ہے اور اس کی یہ کشش غیر معمولی غلبہ رکھتی ہے تو اسے بھی روک دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شراب وغیرہ کے متعلق اُصولی طور پر فرماتے ہیں کہ:۔

مَا اَسْکَرَ کَثِیْرُہٗ فَقَلِیْلُہٗ حَرَامٌ[3]

یعنی "جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرتی ہے اُس کی تھوڑی مقدار بھی جائز نہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد ایک نہایت گہرے اور لطیف نفسیاتی فلسفہ پر مبنی ہے کہ دُنیا میں بعض بدیاں ایسی ہوتی ہیں کہ اکثر انسان اُن میں ایک دفعہ قدم رکھ کر پھر آگے بڑھنے سے رُک نہیں سکتے۔ اور ہر پہلا قدم دوسرے قدم کی طرف دھکیلتا ہے مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگ اس فلسفہ کو سمجھتے یا اس کی قدر کرتے ہیں۔

(اس جگہ حصہ سوم کی جزوِ اوّل ختم ہوئی)

◎

---

[1] دیکھو کتاب ہذا حصہ سوم صفحہ ۷۰۰ ؛ [2] مسلم کتاب ۴۱ حدیث ۱۰ و مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۱۶۵ و تاریخ خمیس حالات ۶ ہجری ؛ [3] مسند احمد بن حنبلؒ ؛

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میری تصنیف سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت تک خدا تعالیٰ کے فضل سے دو جلدیں مکمل اور تیسری جلد جزواً شائع ہو چکی ہیں۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے مجھے اس کتاب کی تصنیف کی توفیق عطا فرمائی اور میری اس کوشش کو قبولیت سے نوازا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

میں نے کچھ عرصہ سے سیرۃ خاتم النبیین کی تیسری جلد کے بقیہ حصہ کے مضامین کی فہرست تیار کر کے مرتب کر رکھی تھی۔ جو اب الفضل میں شائع کرنے کی غرض سے بھجوا رہا ہوں۔ اس اشاعت کی سہ گونہ غرض ہے۔

اول یہ کہ تا مجھے اس کتاب کی تکمیل کی یاد دہانی ہوتی رہے۔

دوسرے یہ کہ اگر خدانخواستہ میں اسے اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکوں تو خدا کا کوئی اور بندہ اسے انہی لائنوں پر مکمل کر دے اور میں بھی اس کے ثواب میں حصہ دار بن جاؤں۔

اور تیسرے یہ کہ اگر کسی دوست کے خیال میں اس فہرست کی تکمیل کے متعلق کوئی مفید تجویز آئے۔ یعنی ان کی رائے میں اس فہرست میں کوئی عنوان زیادہ ہونے والا ہو یا ترتیب بدلنے والی ہو یا کوئی اور تبدیلی ضروری ہو تو وہ مجھے مطلع فرما کر اس تصنیف کے ثواب میں شریک ہو جائیں۔

بالآخر دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اس ضروری تصنیف کی تکمیل کے لئے دعا بھی فرمائیں۔ کیونکہ ہر امر حقیقتاً خدا تعالیٰ ہی کے فضل اور اس کی توفیق کے ساتھ معلق ہوتا ہے۔

خاکسار راقم آثم

مرزا بشیر احمد عفی عنہ

ربوہ ۳۱ ؍ جنوری ۱۹۵۵ء

(منقول از روزنامہ الفضل ربوہ شمارہ ۲۰ ؍ فروری ۱۹۵۵ء)
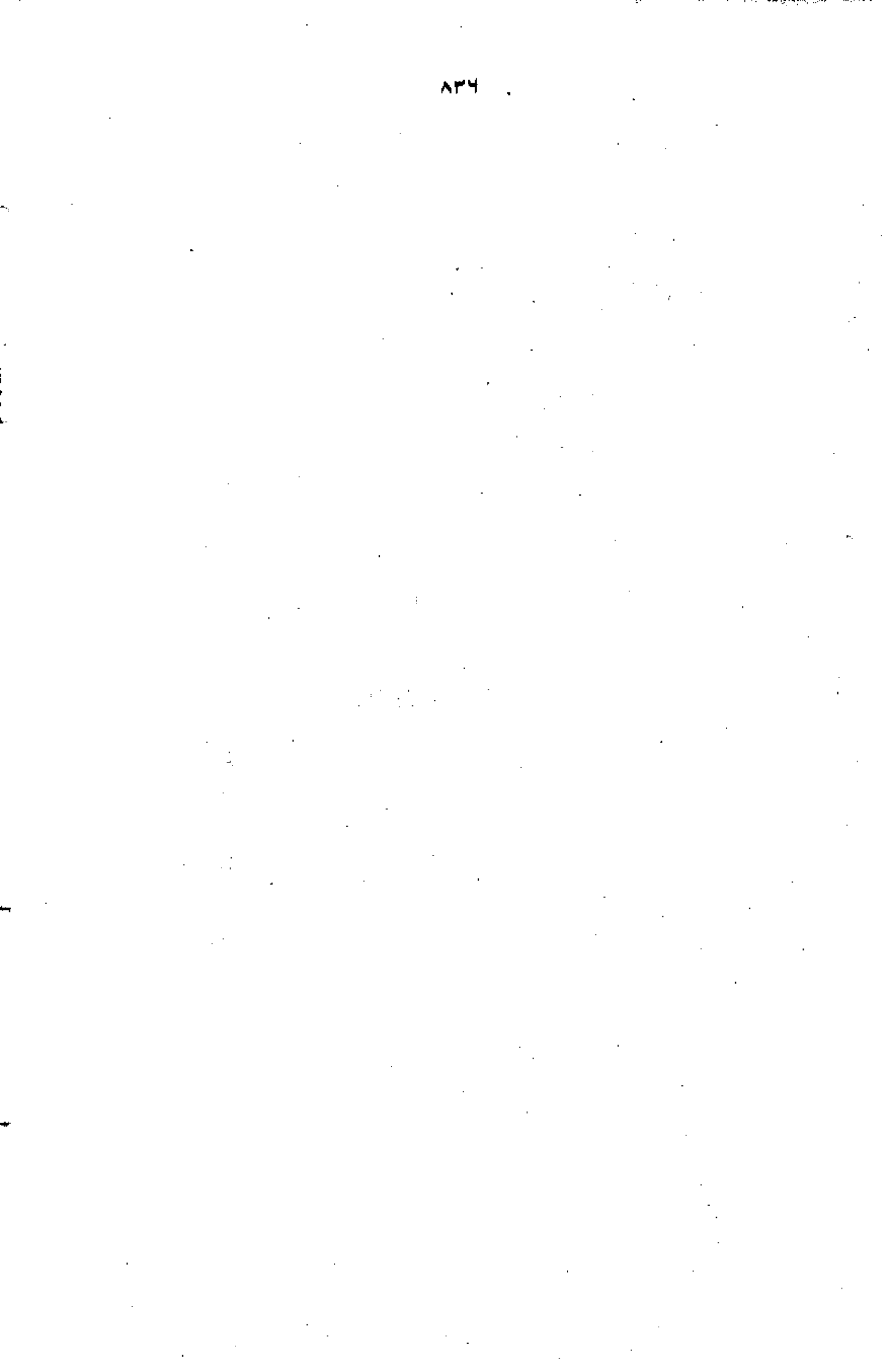
سیرت خاتم النبیینؐ کے بقیہ حصہ کے مجوزہ عناوین

از اوائل سنہ ۷ھ تا وفات

واقعات سنہ ۷ھ

ماہ	واقعہ	کیفیت
ماہ محرم سنہ ۷ھ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کا مزعومہ واقعہ اور اس کی حقیقت	
"	سریہ ابان بن سعید بطرف نجد	
"	ابوہریرہؓ کا اسلام لانا (جو روایتوں کی تعداد کے لحاظ سے حدیث کے سب سے بڑے راوی ہیں۔	
"	غزوہ ذی قرد یعنی غابہ (سلمہ بن اکوع کو رسولِ پاکؐ کا لطیف ارشاد	(عام مؤرخین اسے سنہ ۶ھ میں بیان کرتے ہیں مگر حدیث سے سنہ ۷ھ ثابت ہوتا ہے۔)
ماہ محرم و صفر (یعنی اگست ۶۲۸ء)	غزوۂ خیبر جو عرب کے یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ تھا۔	(امام مالک کے نزدیک یہ غزوہ سنہ ۶ھ میں ہوا تھا)
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیکر قتل کرنے کی ناکام کوشش	
"	کنانہ بن ابی الحقیق کے قتل کا واقعہ اور غیر مسلم مؤرخوں کے اعتراضات کا ردّ	
"	حضرت صفیہؓ کی شادی جو اسرائیلی قوم سے تھیں (حضرت صفیہؓ کی خواب اور اس کی تعبیر۔ اس خواب کا معجزۂ شق القمر سے تعلق)	
"	بعض فقہی مسائل کی تشریح یعنی پالتو گدھے کا گوشت۔ درندوں کا گوشت۔ متعہ۔ استبرا۔ بیع۔ مالِ غنیمت وغیرہ	
"	اہلِ فدک کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مصالحت (فدک کے متنازعہ مسئلہ کی تشریح)	
"	غیر مسلموں کے ارضِ حجاز میں رہنے کے بارہ میں اسلامی حکم (اور ضمناً ارضِ حرم کے متعلق احکام)	
جمادی الآخرۃ	غزوۂ وادی القریٰ	(بعض کے نزدیک یہ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ

ماہ	واقعہ	کیفیت
جمادی الآخرۃ	نمازِ فجر کا بے وقت ادا ہونا	(اس معاملہ میں اختلاف ہے۔ یہ واقعہ غزوۂ تبوک میں ہوا یا کہ حدیبیہ سے واپسی پر)
″	مہاجرین حبشہ کی واپسی (حضرت جعفر بن ابی طالب کی واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی خوشی)	
″	حضرت اُمّ حبیبہ بنت ابوسفیان کا رخصتانہ	
″	خسرو پرویز کسریٰ شاہِ ایران کا مارا جانا	
″	غزوہ ذات الرقاع	(مؤرخین میں اس کی تاریخ کے متعلق اختلاف ہے)
″	صلوٰۃ خوف اور مختلف حالات میں اس کے مختلف طریق	
″	اسلام میں ستر کے پہلو پر زور اور حالات کی رعایت ملحوظ رکھنے کے متعلق اُصولی نوٹ۔ اسلامی شریعت کے ٹھوس اور لچکدار حصے	
″	حضرت ماریہ قبطیہؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں آنا	
″	لونڈیوں کے مسئلہ پر ایک اُصولی نوٹ	
شعبان	سریہ حضرت عمرؓ بطرف تربۃ	
	سریہ بشر بن ساعد بطرف بنی مُرۃ	
رمضان	سریہ غالب بن عبداللہ لیثی بطرف میفعۃ اور حضرت اسامہؓ کا واقعہ۔ دربارہ قتل حربی مسلمان	
شوال	سریہ بشر بن ساعد بطرف یمن وجبار	
″	سریہ ابن عمر بطرف نجد	(بعض کے نزدیک سریہ ابان بن سعید اور یہ ایک ہی ہیں)
ذوقعدہ فروری ۶۲۹ء	عمرۃ القضاء جو صُلح حدیبیہ کے نتیجہ میں ادا کیا گیا۔	
″	حضرت میمونہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی (یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری شادی تھی)	

ماہ	واقعہ	کیفیت
ذوالقعدہ فروری ۶۲۹ء	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیاں اور ازواج مطہرات کے متعلق ایک مجموعی نوٹ	(مزید شادیوں پر پابندی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپکی ازواج کے متعلق یہ پابندی کہ آپ کے بعد اور کسی سے شادی نہ کریں)
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلی زندگی پر نوٹ (معاشرہ نان و نفقہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گزارہ کا ذریعہ وغیرہ)	
"	سریہ ابن ابی العوجا بطرف بنی سلیم	
بلا تعین ماہ	جبلہ ابن الایہم رئیس غسان کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی خط اور اس کا مسلمان ہونا (مگر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ شخص پھر مُرتد ہو گیا)	

واقعات سنہ ۸ھ

ماہ	واقعہ
ماہ صفر سنہ ۸ھ	خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن عاص کا اسلام لانا (خالد اور عمرو بن عاص کی تاریخ اسلام میں نمایاں حیثیت)
"	سریہ غالب بن عبداللہ بطرف بنی ملوح
"	سریہ غالب بن عبداللہ بطرف فدک
"	مسجد نبویؐ میں منبر بنانے کی تجویز اور حنین الجذع کا واقعہ (فلسفی منکرِ حنانہ است ۔ از حواس انبیاء بیگانہ است)
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شخص کو ایک شخص کے قتل کرنے کے جُرم میں قتل کی سزا دینا (یہ اسلام میں قتل کی پہلی سزا تھی) اسلامی شریعت میں قانونِ قصاص پر اُصولی نوٹ
ربیع الاوّل	سریہ شجاع بن وہب بطرف بنی عامر
"	سریہ کعب بن عمر بطرف ذات الطلاح
جمادی الاوّل ستمبر ۶۲۹ء	عرب کی شمالی سرحد میں اسلام کے خلاف پروپیگنڈا اور بیرونی ممالک کے خطرات کا آغاز

ماہ	واقعہ	کیفیت
جمادی الاوّل ستمبر ۶۲۹ء	غزوہ موتہ - (زید بن حارثہ اور جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ کی شہادت)	
جمادی الآخرۃ	سریہ عمرو بن عاص بطرف ذات سلاسل اور سریہ ابوعبیدۃ کمک کی صورت میں	
رجب (نومبر ۶۲۹ء)	سریہ ابوعبیدۃ بطرف السیف البحر (اس سریہ میں راشن بندی کی ضرورت پیش آئی اور خوراک کے متفرق ذخائر کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا)	
شعبان	سریہ ابوقتادۃ بطرف خضرۃ	
رمضان	سریہ ابوقتادہ بطرف بطن اضم	بعض مؤرخین کے نزدیک یہ دونوں ایک ہی ہیں۔
″	سریہ عبداللہ بن ابی حدرد بطرف غابہ	
	غزوہ فتح مکہ	
جنوری ۶۳۰ء	حرم کی حدود میں اسلام کا پُرامن اور شاندار داخلہ۔ عام معافی۔ بعض خاص مجرمین (جن پر قتل و غارت کا الزام تھا) کے قتل کا حکم۔ بیت اللہ کے بُتوں کا توڑا جانا۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد ابوقحافہ، ابوسفیان۔ حکیم بن حزام۔ صفوان بن اُمیہ۔ عکرمہ بن ابوجہل وغیرہ کا مسلمان ہونا۔	
″	اس بات پر نوٹ کہ فتح مکہ کے بعد بھی مکہ کے کئی لوگ کفر پر قائم رہے۔	
″	مکہ سے بعث خالد بطرف عزّا۔ عمرو بن عاص بطرف سواع سعد بن زید بطرف مناۃ۔ سریہ خالد بطرف جذیمہ	
″	اسلام کا ایک رُوحانی مذہب ہونا اور رُوحانیت پر ایک اُصولی نوٹ	
شوال	غزوہ حنین (حنین کے واقعہ میں مسلمانوں کیلئے ایک بڑا سبق تھا)	
″	سریہ ابوعامر اشعری بطرف اوطاس	
″	سریہ طفیل بن عامر بطرف ذوالکفین	
فروری ۶۳۰ء	**غزوہ طائف**	

ماہ	واقعہ	کیفیت
فروری ۶۳۰ء	جعرانہ کے مقام میں غنائم کی تقسیم بعض انصار کی طرف سے اعتراض اور اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب۔ ایک لطیف رُوحانی منظر۔ اپنے رضاعی عزیزوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی مربیانہ سلوک وغیرہ	
〃	رئیس بحرین کی طرف تبلیغی خط اور اس کا جواب	
〃	اسلام میں بیکار لوگوں کے گذارہ کا استثنائی انتظام	
〃	جزیہ پر ایک اُصولی نوٹ	
ذوالحجہ	ابراہیم ابن رسول اللہؐ کی ولادت	
(اپریل ۶۳۰ء)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف اطراف سے وفود کی ابتداء	
بلاتعین ماہ	حضرت زینب بنت رسول اللہؐ کی وفات	
〃	زکوٰۃ کا فرض ہونا	
〃	نظام زکوٰۃ کی حقیقت اور اس کی غرض وغایت	
	واقعات سنہ ۹ھ	
〃	قصہ عام الوفود یعنی سال بھر وفدوں کا مدینہ میں آتے رہنا اور اسلام کی اشاعت میں غیر معمولی توسیع	
محرم	بعث عیینہ بن حصن بطرف بنی تمیم	
محرم یا صفر	بعث ولید بن عقبہ بن ابی معیط بطرف بنی مصطلق	
〃	سریہ ابن عوسجہ بطرف بنی عمرو	
〃	بعث ثعلبہ بن عامر بطرف خثعم	
ربیع الاوّل	بعث ضحاک بطرف بنی کلاب	
	بعث علقمہ بن مجزز بطرف حبشہ	(حاکم کے نزدیک یہ ماہ صفر میں ہوا)
ربیع الآخر	بعث حضرت علیؓ بطرف فلس	
〃	بعث عکاشہ بن محصن بطرف الجباب	
	کعب بن زہیر شاعر کا مسلمان ہونا	(ماہ ربیع الثانی اور بعض کے نزدیک ۸ھ ہجری)

ماہ	واقعہ	کیفیت
ربیع الآخر	مشہور قصیدہ بردہ	
〃	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواج سے ایک ماہ ہجر کرنا	(ابن حبان کے نزدیک یہ واقعہ ۹ھ میں ہوا۔ اور ابن حجر نے بھی یہی کہا ہے)
رجب	غزوۂ تبوک جسے غزوہ عُسرہ بھی کہتے ہیں۔	
ستمبر ۶۳۰ء	(غزوہ موتہ کے بعد روم اور ایران کے ساتھ جنگ کا یہ پہلا قدم تھا)	
〃	سریہ خالد بطرف اکیدر از مقام تبوک	
〃	وفات عبداللہ ذی البجادین تبوک میں	
〃	ہرقل کے نام خط از تبوک	(یہ قیصر کے نام دوسرا خط تھا)
رمضان	منافقین کا فتنہ اور مسجد ضرار کا گرایا جانا اور منافقین کی پردہ دری	
〃	قصۂ سزا و معافی کعب بن مالک وغیرہ	
〃	قصۂ لعان اور واقعہ عویمر (مسئلہ لعان کے متعلق اسلامی حکم)	
〃	قبیلہ بنو ثقیف کا مسلمان ہونا۔	
〃	لات کے بُت کا منہدم کیا جانا	
بلا تعین ماہ	ملوکِ حمیر کے نام خط	
〃	غامدیہ عورت کا رجم	(اس واقعہ کی تاریخ قابلِ تحقیق ہے)
〃	رجم کی سزا پر ایک اُصولی نوٹ۔ (کیا رجم کی سزا حقیقۃً اسلامی سزا ہے)	
بلا تعین ماہ	نجاشی بادشاہ حبشہ کی وفات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نجاشی کا غائبانہ جنازہ پڑھنا۔	
〃	اس بات پر نوٹ کہ یہ کونسا نجاشی تھا۔	
〃	مسئلہ جنازہ کے متعلق اُصولی نوٹ	
〃	وفات اُمّ کلثومؓ بنت رسول اللہؐ	(علامہ ابن قیم کے نزدیک ان کی وفات شعبان میں ہوئی تھی)
〃	زکوٰۃ کی وصولی کے لیے عمال کا تقرر	
ذوقعدہ	عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین کی موت	

ماہ	واقعہ	کیفیت
ذوقعدہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کا جنازہ پڑھنا اور حضرت عمرؓ کا اعتراض	
"	حج کا فرض ہونا	(زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ و زادالمعاد جلد ا صفحہ ۱۸۰)
"	حج پر اصولی نوٹ	
ذوقعدہ و مارچ سنہ ۶۳۱	حضرت ابوبکرؓ کی اقتداء میں مسلمانوں کا پہلا حج	(علامہ زرقانی نے سفر کی ابتداء بھی ذوالحجہ میں لکھی ہے)
بلاتعین ماہ	اسلام میں قمری اور شمسی نظام (یعنی سہولت عامہ کے لحاظ سے کسی امر میں قمری نظام اور کسی میں شمسی)	
"	اہلِ فارس کا کسریٰ شہریار کو قتل کرکے اسکی لڑکی بوران کو تخت پر بٹھانا	
بلاتعین ماہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر نوٹ کہ عورت کو بادشاہ بنانے والی قوم کامیاب نہیں ہوگی۔	(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد انفرادی حکومت کے زمانہ کا ہے اسلئے یہ خیال نہ کیا جاتے کہ یورپ کے بعض ممالک نے عورت کے حاکموں کے زمانہ میں خاص ترقی کی ہے کیونکہ یورپ میں اصل حکومت قوم کی ہوتی ہے اور ملکہ برائے نام ہوا کرتی ہے۔ گو پھر بھی بعض نقائص پیدا ہو جاتے ہیں)۔

واقعات سنہ ۱۰ھ

ماہ	واقعہ	کیفیت
محرم	عدی بن حاتم طائی کا مسلمان ہونا	(یا شعبان سنہ ۹ھ)
ربیع الاوّل	بعث ابوموسیٰ اشعری بطرف یمن	(یا ربیع الآخر)
"	بعث معاذ بن جبل بطرف یمن	"
"	بعث خالد بن ولید۔ بطرف نجران	
" (جون سنہ ۶۳۱)	وفات ابراہیم ابن رسول اللہؐ اور کسوف شمس	
	(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اگر میرا یہ بچہ زندہ رہتا تو نبی بنتا)	

ماہ	واقعہ	کیفیت
بلاتعیین ماہ	بعث جریر بن عبداللہ بطرف ذوالکلاع	
"	بعث ابوعبیدہ بطرف نجران	
"	قصہ بدیل وتمیم الداری و ابنِ صیاد	
"	دجال کے متعلق اُصولی نوٹ	
"	جبرائیل کا تمثیلی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہو کر مسائل دریافت کرنا	
رمضان	بعث حضرت علیؓ بطرف یمن	
بلاتعیین ماہ	سود کی ممانعت	
"	اشتراکیت یعنی کمیونزم پر ایک اُصولی نوٹ	
"	ابوعامر راہب کی موت	
"	وفات باذان والیٔ یمن	
"	نزول احکام بابت استئیذان	
ذوالقعدہ وذوالحجہ (مارچ ۶۳۲ء)	حجۃ الوداع جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے قریب کے خیال سے مسلمانوں کو الوداع کہا۔	
"	آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کا نزول	
"	اسلام کی تعلیم کا خلاصہ (سابقہ مذاہب کے متعلق اسلام کا مسلک۔ پنج ارکانِ اسلام۔ مسئلہ ختم نبوت۔ اسلام کی عالمگیر شریعت۔ شریعت کے ٹھوس اور لچکدار حصے وغیرہ	
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر	
بلاتعیین ماہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جَوَامِعُ الْکَلِم عطا کئے گئے۔	
"	آپؐ کے خاص خاص امتیازی کلمات	

واقعات سنہ ۱۱ھ

ماہ	واقعہ	کیفیت
محرم	وفدنخع ازیمن (یہ آخری وفد تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا)	
	مدفونین جنت البقیع کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری دُعا (نیز اُحد میں جا کر شہدائے اُحد کے لیے دُعا)	

ماہ	واقعہ	کیفیت
صفر (مئی ۶۳۲ء)	سریہ اسامہ بن زید (یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آخری سریہ ہے گو اس کی روانگی بھی آپؐ کی وفات کے بعد ہوئی۔	
صفر یا ربیع الاول	اسود عنسی کذاب کا ظہور	
〃	مسیلمہ کذاب کا ظہور (سجاح متنبیہ کا واقعہ)	
〃	طلیحہ بن خویلد کا ظہور	
〃	الٰہی سلسلوں میں ارتداد پر ایک اُصولی نوٹ	
〃	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض الموت کا آغاز (مرض کیا تھی۔ کتنے دن رہی۔ کیا علاج کیا گیا وغیرہ وغیرہ)	
〃	قرطاس کے واقعہ کی تشریح	
〃	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ امام الصلوٰۃ مقرر کرنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہؓ سے فرمانا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق خلافت کی وصیت لکھ دوں مگر پھر اُسے خُدا اور مومنوں پر چھوڑ دیا۔	
ربیع الاول	افاقہ قبل وفات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد میں تشریف لے جاکر صحابہؓ سے باتیں کرنا	
〃	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری کلام	
〃 (جون ۶۳۲ء)	وصال اکبر	
〃	مسجد نبویؐ میں صحابہؓ کا غم و اندوہ۔ حضرت عمرؓ کا پیچ و تاب کھانا۔ حضرت ابوبکرؓ کا خُطبہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ نیز اَلَا مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ۔	
〃	اسلام کا سب سے پہلا بلکہ واحد اجماع	
〃	سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول کی ابتدائی بیعت	
〃	مسجد نبویؐ میں حضرت ابوبکرؓ کی عام بیعت	

ماہ	واقعہ	کیفیت
ربیع الاول	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غسل۔ تکفین۔ جنازہ۔ قبر اور تدفین وغیرہ	
"	کیا آنحضرتؐ کا جنازہ اکٹھا باجماعت پڑھا گیا۔ اگر نہیں تو کیوں؟	
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بحساب نظام قمری و شمسی۔	
"	آنحضرت کا ورثہ (تشریح حدیث مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ)	
"	شمائل نبویؐ کی ایک اجمالی جھلک۔	
"	محمدؐ مفلح یعنی سب نبیوں میں سے زیادہ کامیاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔	
"	کتاب کا خاتمہ	

اشاریہ

اسماء

سیرۃ خاتم النبیّن صلی اللہ علیہ وسلم

ا

ب۔پ۔ت۔ث

ج۔چ۔ح۔خ

د۔ذ۔ر۔ز

س۔ش۔ص۔ض

ع۔غ

ف۔ق

ک۔گ

ل۔م

ن۔و

ہ ـ ی

مقامات

سیرۃ خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم

ا

ب-پ-ت

س ـ ش

ص ـ ض ـ ط

ع ـ غ

ف ـ ق ـ ک ـ ل

م

ن

و—ہ—ی

جنگ ـ سرایا ـ غزوات

سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

سرایا

غزوات

جنگ

کتابیات

BIBLOGRAPHY

سیرت خاتم النّبیّن صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن کریم اور تفاسیر

۱۔ قرآن کریم

۲۔ تفسیر کبیر:۔ محمد بن عمر بن الحسین امام فخرالدین رازی (۵۴۳ھ تا۶۰۶ھ)

۳۔ البحرالمحیط:۔ الشیخ اثیرالدین ابوحیان بن محمد بن یوسف الاندلسی (وفات ۷۴۵ھ)

۴۔ تفسیر ابن کثیر:۔ حافظ عمادالدین اسماعیل بن عمر ابن کثیر الدمشقی (۷۰۰ھ تا ۷۷۴ھ)

۵۔ الاتقان فی علوم القرآن:۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر علامہ جلال الدین السیوطی (وفات ۹۱۱ھ)

۶۔ لباب النزول فی اسباب النزول:۔ " "

۷۔ ارض القرآن:۔ سید محمد سلیمان ندوی (۱۳۰۲ھ تا ۱۳۷۰ھ)

احادیث وعلوم حدیث

۱۔ جامع صحیح بخاری:۔ محمد بن اسماعیل بن ابراهیم بن مغیرہ البخاری (۱۹۴ تا ۲۵۶ھ)

۲۔ جامع صحیح مسلم:۔ ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم نیشاپوری (۲۰۲ تا ۲۶۱ھ)

۳۔ جامع صحیح ترمذی:۔ محمد بن عیسیٰ الترمذی (۲۰۹ تا ۲۷۹ھ)

۴۔ سنن ابوداؤد:۔ سلیمان بن اشعث السجستانی (۲۰۲ تا ۲۷۵ھ)

۵۔ سنن ابن ماجہ:۔ ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ (وفات ۲۸۳ھ)

۶۔ سنن نسائی:۔ ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب النسائی (۲۱۵ھ تا ۲۹۵ھ)

۷۔ مؤطا امام مالک:۔ امام مالک بن انسؓ (۹۳ تا ۱۸۹ھ)

۸۔ مسند احمد بن حنبل:۔ احمد بن محمد بن حنبل۔ ابوعبداللہ (۱۶۴ تا ۲۴۱ھ)

۹۔ کنزالعمال (فی سنن الاقوال والافعال):۔ شیخ علاؤالدین المتقی بن حسام الدین (وفات ۹۷۵ھ)

۱۰۔ سنن دار قطنی:۔ ابوالحسن علی بن عمر دار قطنی (۳۰۶ تا ۳۸۵ھ)

۱۱۔ سنن بیہقی:۔ احمد بن حسین ابوبکر بیہقی (۳۸۴ تا ۴۵۶ھ)

۱۲۔ مشکوٰۃ المصابیح:۔ شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب التبریزی (وفات ۷۴۳ھ)

۱۳۔ تلخیص الصحاح (المختصر للصحاح الستہ):۔ ابن قیم الجوزی عبدالرحمٰن بن علی بن محمد (۵۱۰ھ تا ۵۹۷ھ)

۱۴۔ جامع الصغیر:۔ علامہ جلال الدین السیوطی (وفات ۹۱۱ھ)

۱۵۔ مقدمہ ابن صلاح:۔ تقی الدین ابوعمر عثمان الشہر زوری المعروف بابن صلاح اصابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن حجر عسقلانی (۱۱۸ھ تا ۱۲۴۳ھ)

۱۶۔ تہذیب التہذیب:۔ ابن حجر عسقلانی حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر (وفات ۸۵۲ھ)

۱۷۔ میزان الاعتدال:۔ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد الذہبی (وفات ۷۴۸ھ)

۱۸۔ تاریخ کبیر فی الاحادیث والرواۃ:۔ امام بخاری محمد بن اسماعیل (۱۹۴ھ تا ۲۵۲ھ)

۱۹۔ المعجم الکبیر للطبرانی:۔ ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (۲۶۰ھ تا ۳۶۹ھ)

۲۰۔ موضوعات کبیر:۔ ملا علی بن سلطان محمد القاری (وفات ۱۰۸۵ھ)

۲۱۔ فتح الباری فی شرح صحیح بخاری:۔ ابن حجر عسقلانی شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی (وفات ۸۵۲ھ)

۲۲۔ فتح المغیث فی شرح حدیث:۔ زین الدین عبد الرحیم بن الحسین (وفات ۸۰۵ھ)

۲۳۔ اکمال شرح صحیح مسلم:۔ ابو عبد اللہ محمد بن خلفہ الوشتاتی (وفات ۸۲۸ھ)

۲۴۔ سبل السلام شرح بلوغ المرام:۔ محمد بن اسماعیل الیمنی (وفات ۵۶۴ھ)

تاریخ و سیرت

۱۔ سیرۃ ابن اسحاق:۔ محمد بن اسحاق (وفات ۱۵۱ھ)

۲۔ سیرۃ ابن ھشام:۔ ابو محمد عبد الملک بن ھشام (وفات ۲۱۳ھ)

۳۔ طبقات ابن سعد

۴۔ سیرت حلبیہ

۵۔ المواھب اللدنیہ:۔ شہاب الدین ابو العباس احمد بن محمد القسطلانی (وفات ۹۲۳ھ)

۶۔ شرح المواھب اللدنیہ:۔ محمد بن عبد الباقی الزرقانی (۱۰۲۵ھ ۔ ۱۰۹۰ھ)

۷۔ نور النبراس فی شرح عیون الاثر:۔ برہان الدین ابراہیم بن محمد الحلبی (وفات ۱۳۸ھ)

۸۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ:۔ قاضی عیاض المغربی (۴۶۳ھ ۔ ۵۲۹ھ)

۹۔ الروض الانف شرح سیرت ابن ھشام:۔ ابو القاسم عبد الرحمٰن بن عبد اللہ السہیلی (وفات ۵۸۱ھ)

۱۰۔ طحاوی:۔ احمد طحاوی (۲۳۳ھ ۔ ۳۱۳ھ)

۱۱۔ تاریخ طبری:۔ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری ۲۲۴ھ ۔ ۳۱۰ھ

۱۲۔ کتاب المغازی:۔ محمد بن مسلم بن شہاب الزھری (وفات ۱۲۴ھ)

۱۳۔ المغازی:۔ موسیٰ بن عقبہ (وفات ۱۴۱ھ)

۱۴۔ مغازی الرسول:۔ ابو عبد اللہ محمد بن عمر الواقدی (۱۳۰ھ ۔ ۲۰۷ھ)

۱۵۔ کتاب المعارف:۔ عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ (وفات ۲۷۶ھ)

۱۶۔ زاد المعاد:۔ ابن قیم الجوزی عبدالرحمن بن علی بن محمد (۵۱۰۔۵۹۷ھ)

۱۷۔ وفیات الاعیان:۔ ابن خلکان قاضی شمس الدین احمد بن محمد (وفات ۶۸۱ھ)

۱۸۔ المزھر:۔ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر السیوطی (وفات ۹۱۱ھ)

۱۹۔ تاریخ الکامل ابن اثیر:۔ عزالدین ابو حسن علی (۱۱۶۰ھ۔۱۲۳۴ھ)

۲۰۔ وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ:۔ نورالدین السمہودی (وفات ۸۸۶ھ)

۲۱۔ تاریخ مکہ:۔ ازرقی ابوالولید محمد بن عبدالکریم (وفات ۲۲۳ھ)

۲۲۔ فتوح البلدان البلاذری:۔ ابو جعفر احمد بن یحییٰ (۲۷۲ھ)

معجم البلدان یاقوت حموی:۔ شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ (وفات ۶۲۶ھ)

۲۳۔ صفۃ جزیرۃ العرب:۔ ابن حائک ابو محمد حسن بن احمد الہمدانی (وفات ۳۳۴ھ)

۲۴۔ تاریخ الاسلام السیاسی:۔ ڈاکٹر حسن بن ابراھیم مصر (۱۸۳۱ء۔۱۹۱۱ء)

۲۵۔ التوفیقات الالہامیہ (ہجری۔عیسوی کیلنڈر):۔ محمد مختار پاشا مصری (۱۲۱۵۔۱۲۷۸ھ)

اسلامیات

۱۔ مجمع البحار:۔ شیخ محمد طاہر گجراتی (۹۱۰ھ۔۹۸۶ھ)

۲۔ عوارف المعارف:۔ شیخ شہاب الدین عمر بن محمد بن عبداللہ السہروردی (وفات ۶۳۲ھ)

۳۔ تعطیر الانام (تعبیر الرؤیا):۔ عبدالغنی بن اسماعیل النابلسی (۱۰۵۰ھ۔۱۱۴۳ھ)

۴۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء:۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی (وفات ۱۱۷۶ھ)

۵۔ کشف الغمہ عن جمیع الامۃ:۔ محمد بن عبدالوہاب بن احمد الشعرانی (وفات ۹۵۳ھ)

۶۔ کتاب الخراج:۔ امام ابو یوسف یعقوب بن ابراھیم (وفات ۱۸۲ھ)

۷۔ بدایۃ المجتہد:۔ ابن رشد قرطبی ابوالولید محمد بن احمد بن رشد (۵۲۰ھ۔۵۹۵ھ)

۸۔ کشف الظنون:۔ مصطفیٰ بن عبداللہ حاجی خلیفہ کاتب چلپی

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام و خلفاء سلسلہ

۱۔ براہین احمدیہ چہار حصص:۔ ۱۸۸۰ء، ۱۸۸۴ء

۲۔ سرمہ چشم آریہ:۔ ۱۸۸۶ء

۳۔ ازالہ اوہام:۔ ۱۸۹۱ء

۴۔ کشتی نوح:۔ ۱۹۰۲ء

۵۔ براہین احمدیہ حصہ پنجم:۔ ۱۹۰۸ء

۶۔ چشمۂ معرفت:۔ ۱۹۰۸ء

۷۔ منن الرحمٰن:۔ ۱۹۱۵ء

۸۔ فصل الخطاب:۔ حضرت الحاج حکیم نور الدین خلیفۃ المسیح الاول (طبع اول ۱۹۱۱ء)

۹۔ تقدیر الٰہی:۔ تقریر حضرت المصلح الموعود مرزا بشیر الدین محمود احمد جلسہ سالانہ قادیان (۱۹۱۶ء)

عربی ادب ولغات

۱۔ تاج العروس:۔ امام محب الدین المرتضٰی (وفات ۱۸۹ھ)

۲۔ اقرب الموارد:۔ سعید الخوری الشرتونی اللبنانی

۳۔ دیوان الحماسۃ:۔ ابو تمام حبیب بن اوس الطائی (۱۸۸ھ تا ۲۳۲ھ)

۴۔ کتاب الشعر والشعراء:۔ ابن قتیبہ محمد عبد اللہ بن مسلم (۲۱۳ تا ۲۷۶ھ)

۵۔ عربی ادب کی تاریخ:۔ پروفیسر نکلسن (۱۸۶۸ تا ۱۹۴۵ء)

عیسائیت

بائیبل (عہد نامہ قدیم و جدید)
ٹیکسٹ اینڈ کینن آف نیو ٹسٹامنٹ مصنفہ سر ہنری سوٹر ایم اے
(TEXT AND CANON NEW TESTAMENT
BY SIR HENERY SOVTTAR M. A)

کتب ہندو مذہب

۱۔ پنتھ پرکاش:۔ گیانی گیان سنگھ (۱۸۴۵ء تا ۱۹۲۲ء)
۲۔ سری کرشن جی:۔ لالہ لاجپت رائے (۱۸۳۲ تا ۱۸۹۸ء)
۳۔ منو سمرتی اردو:۔ (ترجمہ منو شاستر سنسکرت ھندو دھرم) ماسٹر آتما رام جی (وفات ۱۹۱۳ء)
۴۔ منو شاستر سنسکرت:۔ از فرمودات منو مہاراج رشی
۵۔ یوگور کرشن:۔ پنڈت جوتی (وفات ۱۸۴۸ء)

انسائیکلوپیڈیاز

۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
۲۔ انسائیکلوپیڈیا بیلیکا
۳۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا
۴۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا
۶۔ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا

مستشرقین اور مغربی مصنّفین کی کتب

1- CALAPHATE BY SIR WILLIAM MUIR (1883)

2- LIFE OF MOHAMMAD BY SIR WILLIAM MUIR (1861)

3- MUHAMMAD BY MARGOLIUS SIDNY (1894)

4- MOHAMMMAD AND THE RISE OF ISLAM BY MORGOLIOUTH D.S. (1914)

5- THE HISTORY OF THE NATIONS BY HUTCHINSON (*LONDON 1886*)

6- HISTORIAN,S HISTORY OF THE WORLD BY HENRY W. SMITH (LONDON 1884)

7- THE FALL OF THE ROMAN EMPIRE BY EDWARD GIBBIN (LONDON)

اخبارات و رسائل

۱۔ الہلال مصر:۔ نومبر ۱۹۰۴ء

۲۔ ریویو آف ریلیجنز اردو:۔ قادیان

۱۔ " " " اگست ۱۹۰۶ء

۲۔ " " " اگست ۱۹۱۰ء

۳۔ " " " جنوری ۱۹۳۴ء

۳۔ ہندوستان ٹائمز دہلی:۔ مورخہ ۲۹/ اپریل ۱۹۲۸ء
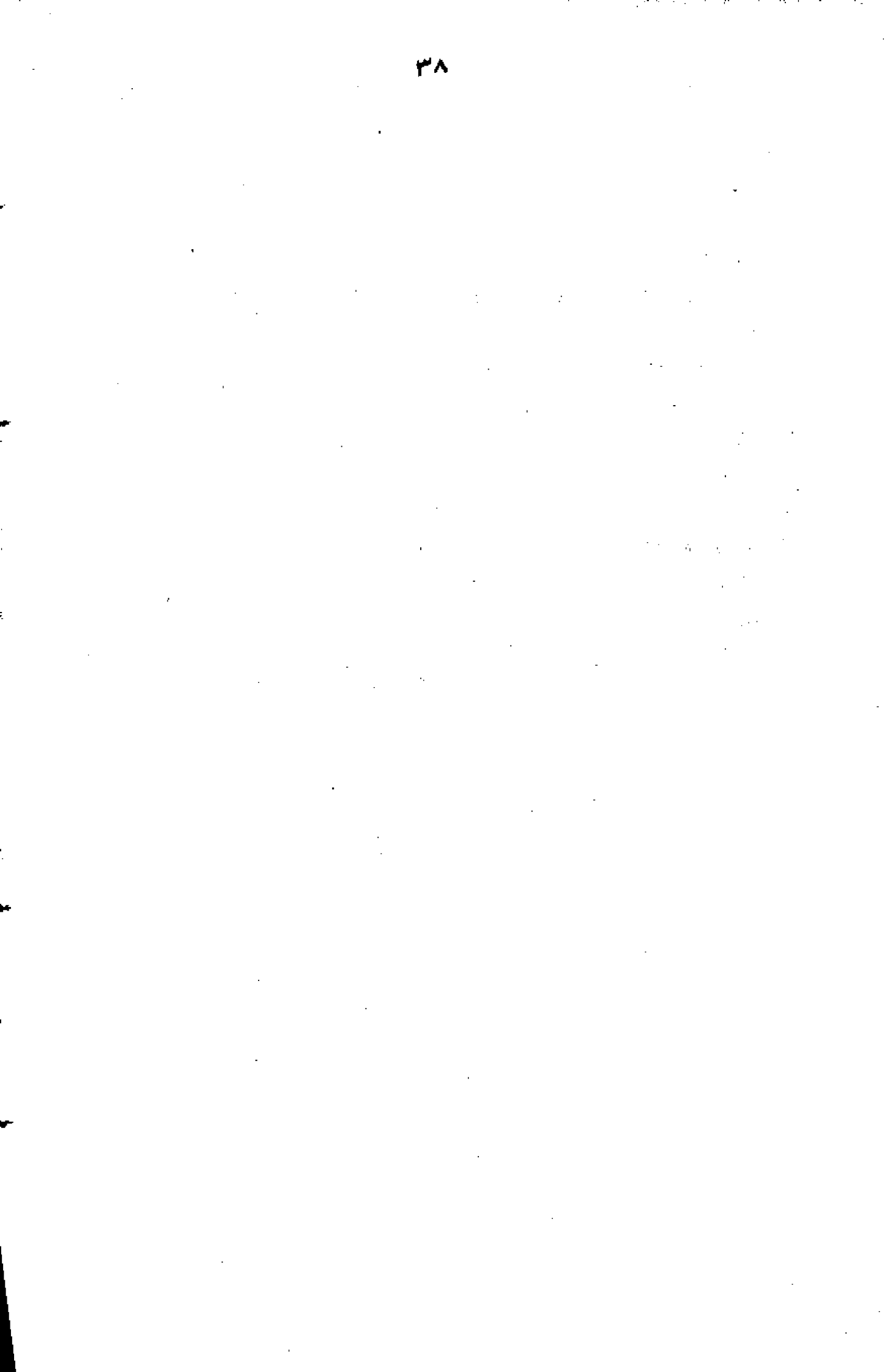
سیرۃ خاتم النبیینؐ حصہ دوم کے متعلق بعض آراء

حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح امام جماعتِ احمدیہ کی رائے

"اس سال ایک کتاب سلسلہ کی طرف سے بیش قیمت شائع ہوئی ہے جس کا نام سیرۃ خاتم النبیینؐ حصہ دوم ہے جو میاں بشیر احمد صاحب کی تصنیف ہے میں نے اس کا بہت سا حصہ دیکھا ہے اور اس کے متعلق مشورے بھی دیئے ہیں میں سمجھتا ہوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی سیرتیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے یہ بہترین کتاب ہے۔ اس تصنیف میں اُن علوم کا بھی پرتَو ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ اس کے ذریعہ انشاء اللہ اسلام کی تبلیغ میں بہت آسانی پیدا ہو جائیگی۔"

نواب سر سکندر حیات خان سابق ممبر مال گورنمنٹ پنجاب کی رائے

"سیرۃ خاتم النبیینؐ کی تکمیل غیر مذاہب تک سرورِ کائناتؐ کے صحیح معاشرتی و انتظامی حالات واضح کرنے کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ انشاء اللہ۔ بالخصوص ان بے بنیاد الزامات جنکے متعلق اکثر غیر مسلم بوجہ ناواقفیت یا تعصب بیجا نکتہ چینی کرنے کے عادی ہیں اُن کے متعلق نہایت خوبی اور وضاحت سے تاریخی واقعات کا حوالہ دیکر مسکت جواب دیا گیا ہے۔ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ہو جائے تو میرے خیال میں اسلام کی ایک بڑی بھاری خدمت ہوگی۔"

سیٹھ عبداللہ ہارون ایم۔ ایل۔ اے تاجر کراچی کی رائے

"میری رائے میں اس زمانہ میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اُن میں سے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب مسلمانانِ ہند کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگی۔"

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال بارایٹ لا۔ لاہور کی رائے

"اس تصنیف میں بعض اہم مباحث پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔"

جنابؐ مولوی الف دین ایڈووکیٹ ضلع سیالکوٹ کی رائے

"عہدِ حاضر میں سیرۃ پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور حق یہ ہے کہ" ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" مگر اس کتاب کی نسبت جو نہایت محنت اور جانفشانی سے لکھی گئی ہے اگر یہ کہا جائے کہ "گلِ سرسبد ہے" تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خدائے بلند و برتر نوجوان میرزا کی ہمت میں برکت دے کہ انہوں نے اِس مبارک تالیف سے اسلام اور اسلامیوں کی ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔"

نواب اکبر یار جنگ بہادر جج ہائیکورٹ حیدرآباد دکن کی رائے

"میری نظر میں سیرت کی اُردو تالیف میں یہ بے مثل کتاب ہے۔ جنگ غلامی۔ تعدد ازدواج پر اس قدر دل نشین اور سیر کن بحث کی گئی ہے کہ دل سے دُعا نکلتی ہے۔ ایک زمانہ میں اِن مضامین پر مَیں نے کافی غور کیا ہے اور جو کچھ اس کے متعلق مل سکتا تھا سب پڑھ ڈالا ہے۔ مَیں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے اِن مضامین کا حق ادا کر دیا ہے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے

"سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی جلد دوم موصول ہوئی۔ شکریہ۔ مباحث ضروریہ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی اس خدمت کی جزائے خیر دے۔ اور مزید سعادت عطا فرمائے۔ اختلاف و اتفاق کی بحث الگ ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ آپ نے اپنی اس تصنیف میں محنت اُٹھائی ہے۔"

ایڈیٹر رسالہ "المعارف" اعظم گڑھ (یو۔پی) کا ریویو

"سیرۃ خاتم النبیین قادیان کی جماعتِ احمدیہ کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا حصہ دوم زیرِ نظر ہے جس میں آپؐ کی مدنی زندگی ۵ ہجری تک پیش کی گئی ہے۔ کتاب کا نمایاں وصف مستشرقین اور غیر مسلم مؤرخین کے اعتراضات کا رد ہے۔۔۔۔۔۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتاب محنت اور کوشش سے لکھی گئی ہے۔"

ایڈیٹر اخبار "سچ" لکھنؤ کا ریویو

"سیرۃ خاتم النبیینؐ حصہ دوم بہت مفصّل و مشرح ہے اور اس میں علاوہ واقعاتِ تاریخی کے مسائل کا حصہ بھی کثرت سے آگیا ہے۔ قانونِ ازدواج و طلاق۔ غلامی۔ تعددِ ازدواج۔ جہاد وغیرہ کے مباحث خصوصاً مفصّل ہیں اور انگریزی خوان نوجوانوں کے حق میں مفید۔ معجزات پر بھی شافی بحث ہے۔۔۔۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان مسائل پر بحث کرتے وقت مصنف کا قلب تحقیقاتِ فرنگ سے مرعوب و دہشت زدہ نہیں معلوم ہوتا۔ جیسا کہ اکثر متکلمین حال کا حال ہے۔۔۔ سرورِ کائناتؐ کی ذات پُر جمال تو وہ ہے جس نے خدا معلوم کتنے بیگانوں تک کے دلوں کو موہ لیا ہے۔ اہلِ قادیان تو بہر حال کلمہ گو ہیں اُن کے کسی مصور کے قلم نے اگر اس حسین و جمیل کی ایسی دلکش تصویر تیار کر دی ہے تو اس پر حیرت بے محل ہے۔"